فسانۂ آزاد

جلد چہارم (حصہ اول)

رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد

جلد چہارم (حصہ اول)

رتن ناتھ سرشار

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کر چکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اُردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائرکٹر ترقی اُردو بیورو
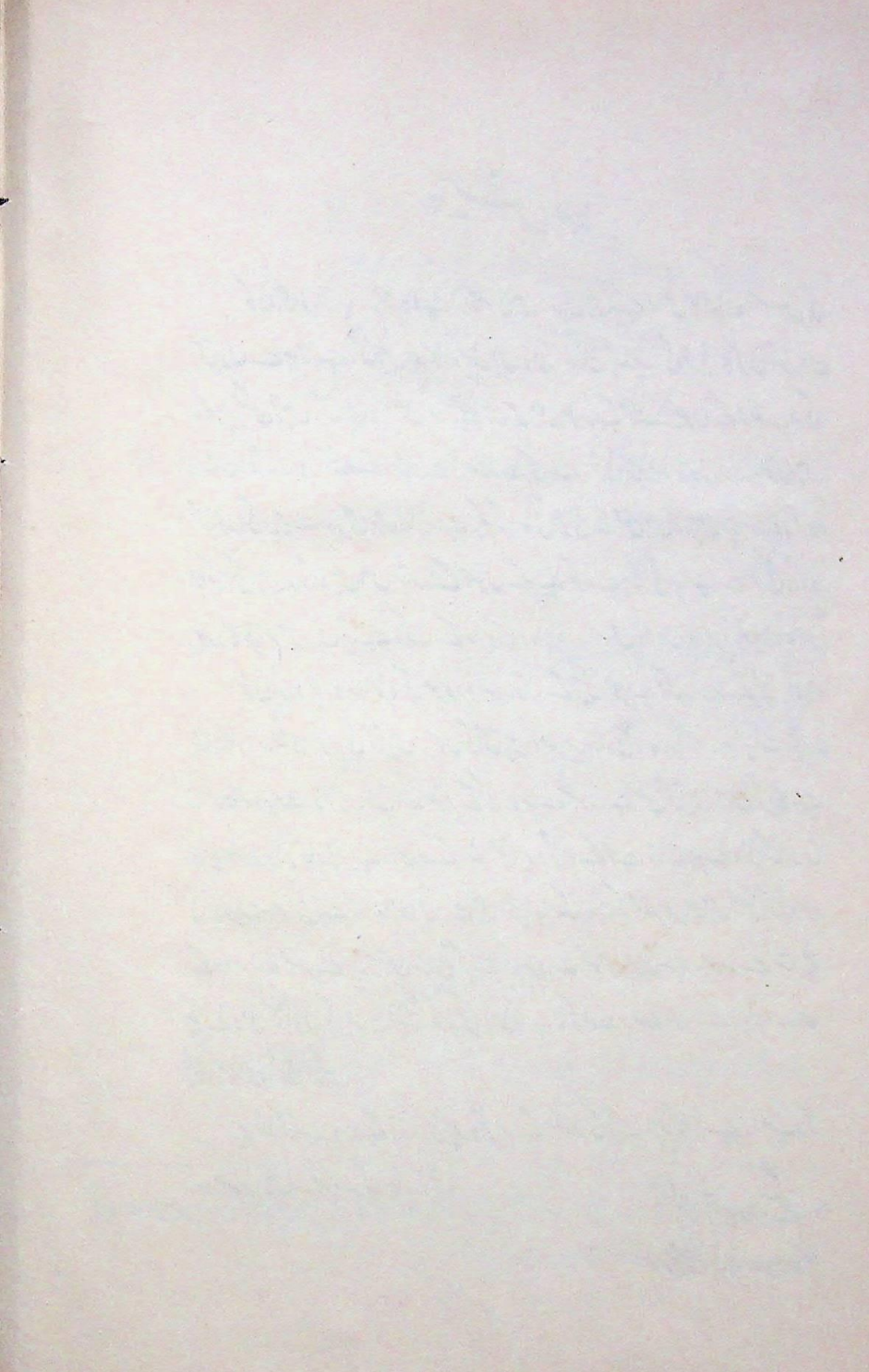
فہرست مضامین

فسانۂ آزاد (جلد چہارم)

مقدمہ

اَلعیش کہ بادِ صبح گل بو آمد   می نوش کہ آب رفتہ در جو آمد

خوش باش کہ بختِ خُفتہ سر بالا برد

دولت زنشاط تہنیت گو آمد

الہٰی یہ کس شاہدِ ناز آفریں کی سواری باغ جہاں میں آئی ہے۔ کہ حور و ملک اور پیر فلک دل کی آنکھوں سے تماشائی ہیں۔ عروسِ بہار کا خیر مقدم سُنتے ہی، عنادِل نے دھوم مچائی، کہ رندو چلو گلستانِ عالم پر گھٹا چھائی۔ موسمِ گل اور وقتِ نائے نوش ہے۔ ابر ہر یدان پیر مُغان کا پردہ پوش ہے۔

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند

جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج

بُوئے گُل جنون تاز۔ بادِ نوروزی غالیہ ساز۔ نسیم سحری بہشت کی لپٹیں آتی ہیں۔ مشامِ روح کو طبلہ عطّار بناتی ہیں۔ صوفیانِ صافی طینت بے دھڑک جام لنڈھاتے ہیں۔ اور مست ہو کر یہ شعر زبان پر لاتے ہیں۔

گردنِ شیشہ جھکا دے مرے پیمانے پر

ہُن برستا ہے ساقی ترے میخانے پر

خیر یہ تو تمہید تھی۔ اب آمدم بر سرِ مطلب کچھ کم تین سال سے فسانۂ آزاد، نذرِ ناظرینِ فرخ نہاد کیا جاتا ہے۔ اس فسانہ کی تین جلدیں عنایتِ ایزدی اور مالک مطبع کی نیک نیتی سے طبع ہو کر تیار ہو گئیں اور اب جلد رابع کی نوبت آئی۔ فسانۂ آزاد کی تعریف کرنا اپنے مُنہ آپ میاں مٹھو بننا ہے۔ اور خود ستائی یا، ڈُون کی لینا اپنا شیوہ نہیں۔ مُشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطّار گوید۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اگر اپنے قدر دانوں کی قدر دانی کا شکریہ نہ ادا کروں تو لوگ کہیں کہ احسان فراموش ہے اور کفرانِ نعمت ہمارے

مذہبِ رندانہ تک میں جائز نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر معراج ہمارے لئے اور کیا ہوگی کہ علما فُضلا، فُقرا، شعرا اور جادو طراز، انشا پردازوں۔ اَلغرض اصنافِ سخن کے کملانے مضامین فسانہ سنتے ہی آہنگِ وَجد کیا۔ گردن ہلائی۔ مصنف نے ہاتھوں ہاتھ اپنی محنت و جاں فشانی کی داد پائی۔ حضرت حق تو یہ ہے مصرع

راست می گویم و یزدان نہ پسندد جُز راست

کہ اُردو ہماری زبان تھی۔ ہندو دعوی زبانی کرے تو کافر۔ اصل میں اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، اور سچ پوچھو تو لکھنؤ اس گوہرِ نایاب کی کان ہے۔

دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے

اظہار بوی مشک غزالون کے سامنے

گو خاکسار سرشار بھی فصحائے لکھنؤ کی خدمتِ کیمیا خاصیت مین باریاب ہے۔ گو ان زبان دانوں کی صحبت مین بہت کچھ سیکھا۔ مگر ہائے پھر بھی کچھ نہ سیکھا۔ ہنوز روزِ اول ہے کوشش بلیغ کی۔ جان لڑادی، کہ مثل مسلمانون کے زباندانی کا دعوی کرسکین مگر یہ بھاری پتھر نہ اُٹھ سکا، ناچار چوم کے چھوڑ دیا۔

دولت بغلط نبود از سعی پشیمان شو

کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

جن اصحابِ قُدسی مآب نے اُردو زبان کی ماہیت پر غور کیا ہے۔ اور اس بحرِ ناپیدا کنار کی تہ کو پہنچے ہیں۔ اُن کو خوب معلوم ہے کہ اُردو عجیب قسم کی زبان ہے۔ شہر اور دیہات کی زبان میں تو خیر، سَلَف سے خَلَف تک فرق ہوتا آیا ہے، ہم کہتے ہیں خاص شہر کی زبان میں اختلاف ہے۔ اوسط درجہ کے شریف مسلمانوں مخدّرات عِصمت سِمات کی اور زبان ہے۔ محلات کی شوخی اور چٹاخ پٹاخ، تڑاق پڑاق، پیاری بول چال کا رنگ ہی جداگانہ ہے۔ علما کی اور زبان، شعرا کی اور زبان ہے۔ اس میں اصلاً شک نہیں کہ زبان کے لحاظ سے ہندو اہلِ اسلام کے مقلد ہیں۔ پس وہ اور دعوی زبان دانی!! کس برتے پر تتا پانی:

شرح مجموعۂ گُل مرغ سحر داند و بس

کہ نہ ہر کو ورقی خواند معانی دانست

لَن ترانی شیخی اپنی وضع کے خلاف ہے۔ ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ ہم نے اُردو زبان لڑکپن

میں اہلِ اسلام کی پاکدامن مخدّرات ہمسایہ، اور جوانی میں مسلمان فصحائے گرانمایہ، سے سیکھی ہے۔ مگر ہاں ہر کس وناکس کی یہ طاقت نہیں، کہ ہماری زبان پر حرف رکھ سکے۔ کیا مجال:۔

گر بد گہرے کشد دم طعن
معنی زندش طپانچۂ لعن

اور بغض وحسد تو دوسری چیز ہے مگر:

حسد چہ میبری اے سست نظم بر حافظ
قبولِ خاطر ولطفِ سخن خداداد است

حسد وہ کالی ناگن ہے، جس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ جس کا سَم اُتارے سے نہیں اُترتا۔ شیطان علیہ اللعن، عقل کی آنکھوں میں پٹی باندھ کر حاسد کو یہ پٹی پڑھا دیتا ہے، کہ محسُود کے ہُنر کو بھی ہمیشہ عیب ہی ظاہر کرے:

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبی ست
گل ست سعدی ودر چشم دشمنان خارست

خیر۔ ع۔

شکر ہے حاسد نہیں محسُود ہوں

حاسد شیطان کے حوالے:

چشم بداندیش کہ بر کندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

میرے سخن کے مدعی کے لئے قابلیت خداداد اور زباندانی شرط ہے اور یہ بخیر:

دشمنی را بھفتے شرط ست وآں دانی کہ نیست
از تو نبود نغمہ در ساز یکہ در چنگ نیست

در سخن چوں ہم زبان وہم نوائے من بود
چون دلت پر پیچ وتاب از اشک آہنگ نیست

راست می گویم من واز راست سر نتوان کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست آن ننگ نیست

ہاں ناظرینِ حق بین واعجوبہ گزین سے البتہ اس بات کی داد چاہتا ہوں، کہ جو کچھ لکھا قلم برداشتہ لکھا۔ بایں ہمہ سخندانانِ جانی مذاق نے توصیف کے پل باندھ دیئے۔ وکل اناء یترشح عاقبتہ۔

ع۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد وما ہیچ

لاریب بیشک اور بلاشبہ ایسے ایسے خدائے سخن اور مستند زبان داں اس افسانے کی توصیف میں عذب البیان ہیں کہ اگر نفسِ مطمئنہ نفس اَمّارہ کو مغلوب نہ کرتا تو میرا نفس اب تک مغرور ہو چکا ہوتا۔ لیکن یہ وہ نفس نہیں ہے، جو سرکشی پر آمادہ ہو۔ فسانۂ آزاد کا ماحصل یہ ہے کہ اس کے گلہائے مضامین، و خیالاتِ رنگین سے نشرِ رائحہ اخلاق ہو، اور ناظرین کے دماغ کو معطر کرے۔ کوئی بیان ایسا نہیں جس سے اخلاقی نتیجہ نہ نکلتا ہو۔ آزاد آزادؔ حامیِ اسلام عاشق دلدادہ، اب بمبئی سے روانہ ہوئے۔ میدانِ کارزار میں فتح وظفر اُن کی دونوں لونڈیوں کا نام تھا۔ اقبال ان کا ناخریدہ غلام تھا۔ خاتونِ مہ لقا، حسن آرا بیگم کی پاکدامنی کی قسم کھانی چاہیئے کہ اپنے قول کا تہ دل سے خیال رکھا گو رخنہ اندازوں نے تہمتیں تراشیں اور سعیِ موفور کی کہ حسن آرا کا دل آزاد کی طرف سے پھر جائے۔ مگر عشقِ صادق لڑکوں کا کھیل تھوڑا ہی ہے بیگم کی عفت کے صدقے، کیسی کیسی نازک حالتوں میں اس عفیفہ نے اپنے کو اغوائے شیطانی سے بچایا! ورنہ اس حالت میں بہتوں کا شیشۂ عصمت سنگِ ہوا و ہوس سے چکنا چور ہو گیا ہے۔ اس مطلق العنانی کو دیکھیئے، اور اس پاکدامنی کو دیکھیئے صلِّ علےٰ۔ خواجہ بدیع الزماں کی فرد لی بھی یادگار رہے۔ ایسے تیکھے اور تنومند جوان بھی کسی نے نہ دیکھے ہوں گے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

اب جلدِ رابع میں آزاد پاشا ہندوستان کو واپس آئیں گے اور گُل چھرے اُڑائیں گے۔ مس میڈا اور مس کلیر سا بھی کسی مصلحت سے آتی ہیں۔ جس کا حال ناظرین کو وقتاً فوقتاً معلوم ہوتا جائے گا۔ جس قدر بیان بے سلسلہ ہیں، وہ سب بعنوانِ مناسب ختم ہوں گے اور ہر بیان سے نتائجِ معقول نکالے جائیں گے۔ اس ناول میں جدت یہ ہے کہ اُردو کے اور فسانوں کی طرح ایشیائی خیالات سے معرا ہے۔ گو مرزا رجب علی بیگ سرورؔ مبرور، یادگارِ زمانہ، اور سخنورِ رنگین ترانہ، اُستادِ مسلّم الثبوت تھے۔ گو اس خدائے سخن کا نام سن کر اچھے اچھے زباندان متعصبوں کا ذکر نہیں، اپنے کان پکڑتے ہیں۔ مگر تحفۂ محقرہ فسانۂ آزادؔ انگریزی ناولوں کے ڈھنگ پر لکھا گیا ہے۔ جن میں کوئی امر حسبِ لیاقت یا حسبِ عقل محال نہیں۔ اُردو فسانوں سے اس کا رنگ نہیں ملتا:۔

طرزِ دگران وداغ کردم

طرزِ دگر اختراع کردم

حاشا ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ اعجاز و نیرنگ یا نسخہ ارژنگ ہے۔ مگر یہ ضرور کہیں گے کہ مشاطۂ فکر نے اس عروسِ ملک نظر فریب اور شاہدِ رعنا کو طرزِ نوی سے آراستہ کیا ہے۔ اور خوبروبیان شنگول کے حسن سے اس کا حسن دوبالا کر دیا ہے:۔

اللہ رے دماغ بتانِ حروف کا　　　تکیہ لگائے بیٹھے ہیں بین السطور کا

انیست طلسمِ جانگداز ان — نیرنگِ فسونِ عشق بازان
انگیختہ اُم گلِ جنون را — درطرزِ فسانہ بس فسون را
آن را کہ سرِ نکتہ دانی است
داند کہ زیرش معانی ست

آزاد پاشا استنبول سے روانہ ہوئے

بازیارانِ وطن را سفری درپیش ست — رہ توروان بلا را خطری درپیش ست
عاقبت ناصیۂ ماشود آئینۂ بخت — کوکب طالع مارا نظری درپیش ست
اے صبا برسرِ آفاق گلِ مژدہ بریز
کہ شب تیرہ مارا سحری درپیش ست

سرِ قافلہ سپہ سالارِ روئین تن، وسرآمدِ نام آورانِ صف شکن فرخ نہاد و عالی نژاد یعنی میاں آزاد بعد خرابی بصرہ الظفر نامی جہاز پر سوار ہوئے۔ مسخروں کی روحِ رواں خواجہ بدیع الزمان اور مس کلیریسا، نگارِ کج کلاہ۔ مس میڈا، وکشِ مہرو ماہ، ہمراہ تھیں۔ نور کے تڑکے جہاز روانہ ہوا۔ آزاد پاشا اور ان کے ہمراہیوں نے اپنے احباب اُولوالالباب کو جو ساحل بحر سے اِن مسافرانِ راہِ دور دراز کو دیکھ رہے تھے، اشاروں سے سلام کیا، اور جہاز کا لنگر کھولا گیا۔ جب تک جہاز والوں کو ساحل اور ساحل والوں کو جہاز نظر آیا حسرت اور حیرت سے دیکھا کئے۔ جب جہاز نظر سے اوجھل ہوا تو لوگوں نے دعا مانگی، کہ بارِ خدایا جہاز آسانی اور لطف کے ساتھ داخلِ منزلِ مقصود ہو۔ مس میڈا کے دل کا عجب حال تھا۔ گورے گورے گالوں کی رنگت۔ متغیر ہوئی جاتی تھی۔ کبھی باپ بھائی کبھی ماں بہن، یاد آتی تھی۔ مس کلیریسا کے عارضِ گل رنگ پر قطرہائے اشک اس طرح جھلکتے تھے جیسے برگِ گل پر شبنم۔ ساحل بحر کی طرف بصد حسرت نظر ڈالتی، اور باوصف کوششِ ضبط آنسو ٹپ ٹپ نکل پڑتے۔ خواجہ بدیع الزمان کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ مبارکباد کی غزلیں یاد آتی تھیں۔ مگر کلیریسا اور میڈا کے خیالِ ادب سے ٹال جاتے تھے۔ دل ہی دل میں مزے اُڑاتے تھے۔ بغلیں بجاتے تھے۔ آزاد پاشا تو اس درجہ خوشی تھی کہ جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ ہر سمت حسن آرا ہی نظر آتی؛ ہر گوشے سے مسرت وشادمانی، فتح وکامرانی ہی جلوہ دکھاتی تھی؛ ایک بار کان میں سپہر آرا کی آواز آئی۔ دولھا بھائی مبارک! یہ صدائے خوش آیندہ سنتے ہی بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ساتھی متحیر کہ یا للعجب یہ کیا بوالعجبی ہے۔ خود بخود بے وجہ ہنس دیئے مگر آزاد کس سے کہتے کہ ان کا دل کیا مزے لوٹ رہا تھا۔

عشوہ، رنگین ادا، مس مَیڈا کے انقباض خاطر سے آزاد کی خوشی اور مزہ کسی قدر کرکرا ہو گیا تھا۔ بلطائف الحیل سمجھایا کہ سائیں کے سو کھیل، خواستہ، خدا ہے تو اسی سال ہم تم کو قسطنطنیہ واپس لائیں گے۔ اور ہنسی خوشی تمہارے ماں باپ سے ملائیں گے۔ یہ سفر بھی چند روزہ ہے۔ انشاء اللہ صبح و شام داخل ہندوستان ہوں گے مگر اس وقت تمہاری پریشانی اور اشک افشانی نے میرے دل کے ساتھ وہ کیا، جو برق خرمن کے ساتھ کرتی ہے یا تیغ گردن کے ساتھ، خدارا ہنس دو تو گویا مول لے لیا:

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار ست

کلیدِ قفل درِ ما تبسم یار ست

مَیڈا: اے ہے۔ تم اتنا بھی نہ سمجھے۔ یہ غم کے آنسو نہیں خوشی کے اشک ہیں۔ اسوقت فرطِ طرب سے رو دی۔ غم کیسا، اَلم کیسا، اِس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہوئی کہ تم ساتھ ہو۔ منہ مانگی مراد پائی۔ دل کی تمنا بر آئی۔ اللہ نے ہماری سُن لی اور آرزو پوری کی۔ تمہاری سرکردگی میں کل عساکر روم مظفر و منصور آئے۔ غنیم نے شکستوں پر شکستیں کھائیں۔

آزاد: ایک تبسم ناز میرے دل کے ساتھ وہ کرے گا جو گلِ ناشگفتہ کے ساتھ بادِ بہاری کرتی ہے۔ ذرا ہنس دو۔

مَیڈا: بے وجہ بے سبب ہنسی یعنی چہ۔ اور یوں چاہے ہنسی بھی اب کہنے سے (ہنس کر) اے لو از خود ہنسی آ گئی۔

آزاد: ہنسی نہیں آئی۔ میری جان میں جان آئی۔

مَیڈا: خیر۔ آپ کی خاطر تو ہو گئی۔ ازیں چہ بہتر۔

آزاد: خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ شکر خدا۔ صد ہزار شکر۔

مَیڈا: جس وقت بمبئی داخل ہونے کی خبر حسن آرا بیگم سنیں گی۔ باغ باغ ہو جائیں گی۔ مگر خدا جانے ہمارا حال سُن کر اُن کا کیا حال ہو۔ سوتیا ڈاہ مشہور ہے۔ اور ہندوستان کی عورتیں خوب جانتی ہیں کہ سوتیا ڈاہ، کسے کہتے ہیں۔ اگر مس حسن آرا پڑھی لکھی ہیں، تو باہم خوب گزرے گی ورنہ میزان پٹنا معلوم۔

آزاد: جانِ من وہ حسن گلو سوز، اور نورِ عالم افروز ہے کہ نظر نہ ٹھہرے۔ بے خیرگی نگاہ، کوئی اس جمال مبین پر نظر نہیں ڈال سکتا، سراپا سانچے کا ڈھلا ہوا ہے:

نونہالِ ریاضِ حسن و شباب — گلِ نوخیز گلشنِ مہتاب

تیغ ابرو ہے قاتلِ عالم — چشم جادو ہے سحر سے ہمدم

نورِ سیما ہے روکشِ خورشید　　صبح عارض ہے رشکِ صبحِ امید
دامِ کاکل وہ رُخ پہ جلوہ پذیر　　مُرغِ دل جس میں سینکڑوں ہیں اسیر

اور تربیت و تعلیم کا حال کیا بیان کروں دیکھ ہی لو گی۔ ؎

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

اور ابھی نامِ خدا نوخیز ہے:۔

می چکد شیر ہنوز از لبِ ہمچون شکرش
گرچہ در عشوہ گری ہر مژہ اش قتالیست

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک ہندی نے آزاد پاشا کو سلام کیا، اور اُردو میں ہمکلام ہوا۔ پوچھا آزاد پاشا حضور ہی کا اسم مبارک ہے۔ فوجی نے گردن ہلا کر جی ہاں یہی ہمارے آزاد ہیں جنھوں نے جنگ کے میدان میں سب کو نیچا دکھایا۔ جو سامنے آیا اُس کو واصلِ جہنم کیا۔ ان کی تلوار خونِ آشام ہے۔

؎　نیامِ تیغِ قضائے مُبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

آزاد نے مصافحہ کر کے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کا اسمِ شریف۔ دولت خانہ کہاں ہے، فرمایا خاکسار کو محمد مہدی کہتے ہیں۔ اور غریب خانہ ایک بستی ہے بجنور۔ لکھنؤ کے پاس، بس مضافات لکھنؤ سمجھئے۔ وہیں غریب خانہ ہے۔ آپ کی تعریف اکثر اخباروں میں نظر سے گزری، جی خوش ہو گیا۔ بندہ پرسوں استنبول میں ایک ضروری کام کے لئے داخل ہوا تھا، اور آج روانہ ہوا۔ قیام اکثر بمبئی میں رہتا ہے۔ مگر سال میں ایک مرتبہ وطن ضرور جاتا ہوں، اور دو تین مہینے رہ کر پھر واپس آتا ہوں۔ آزاد نے کہا حضرت میری نسبت جو کلماتِ توصیف آپ نے بیان کئے ان کا تہ دل سے مشکور ہوں، مگر اُن کو میں حضور کی ذاتی لیاقت اور حسنِ عقیدت پر محمول کرتا ہوں، ورنہ مَن آنم کہ مَن دانم۔ کہئے کہ وطن میں تو خیریت ہے۔

محمد مہدی نے کہا۔ جی ہاں فضلِ الٰہی ہے۔ مگر ایک حادثہ نادیدنی، اور سانحہ ناشنیدنی سے ستم برپا ہو گیا۔ یہ کہہ کر محمد مہدی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، دو تین منٹ رو کر رومال سے اشک پونچھے، اور خاموش ہو رہے۔ آزاد اور خوجی کو حیرت ہوئی کہ یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ آہستہ دریافت کیا خیریت تو ہے۔ اس وقت خلجان پیدا ہو گیا۔ خدا ہی خیر کرے حضرت واسطے خدا کے فرمائیے۔ محمد مہدی نے بادلِ سرد و آہ پُر درد یوں بیان کیا آپ نے مرزا ہمایوں فر بہادر کا نام سنا ہو گا مشہور و معروف شہزادے تھے۔

آزاد: ہاں ہاں۔ شہزادے نہ۔ شہزادہ ہمایوں فر بہادر۔

خوجی: مجھ سے سُنیئے خورشید لقا بیگم کے حقیقی بھائی۔

ہمارے ملک کے شہزادوں میں بس وہی تو ایک ہیں، اور ہے کون۔ ہاں پھر اُن کو کیا ہوا وہ تو ہمارے آقا، اور مربی ہیں۔ ہنس مکھ، خندہ پیشانی۔ خوبرو، ذی مروت، عالم خوش بیان شہزادوں میں فرد ہیں۔

محمد مہدی: اُن کی نسبت ایک نواب زادی سے، کہ از بس حسینہ و جمیلہ، شیریں حرکات، و رنگین ادا، نوخیز، عنبر موہین۔ قرار پائی۔ جس نے سُنا خوش ہوا کہ دولھا دولہن چندے آفتاب، چندے مہتاب، خدا نے اپنے ہاتھ سے جوڑی بنائی ہے۔ بنا اور بنی دونوں کی بن آئی ہے۔ اس کے بعد محمد مہدی نے کہا کہ چونکہ آپ لوگ مرزا ہمایوں فر بہادر سے واقف ہیں، لہٰذا مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ خبر سُن کر سخت ملال ہوگا۔

آزاد اور خوجی دونوں نے کہا، حضرت جملہ معترضہ رہنے دیجئے۔ اصل مطلب بیان فرمایئے، کہا: ہمایوں کی والدۂ معظمہ شہزادی بیگم اور دلہن کی ماں بڑی بیگم، دونوں نے منظور کر لیا۔ رسمیں ادا ہوئیں، دُلہن کو مانجھے بٹھایا۔ مانجھا بھجوایا۔ طرفین سے جوڑے آئے، اِدھر دُلہن، اُدھر دولھا بشاش کہ چین کریں گے۔ خوب مزے اُڑیں گے۔

اب سُنیئے کہ اِن دونوں میں سچا عشق، یہ اس پر قربان، وہ اُس پر نثار، دل و جان سے عاشق۔ ایک مرتبہ مرزا ہمایوں فر نے بیگم صاحب کے باغبان سے سانٹھ گانٹھ کی۔ خوب یارانہ پیدا کیا۔ وہ شہزادے پہ مالی۔ انعام پر انعام۔ اور بیشمار روپیہ دیا۔ نوبت باینجا رسید، کہ ایک روز ہمایوں مالی بن کر شہزادۂ بہادر گئے اور گلدستہ بیگم صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ بیگم سمجھ گئیں کہ کوئی عاشق زار و جاں نثار، شہزادۂ عالی تبار ہے۔ مسکرا کر کہا یہ کون ہے۔ مالی بولا حضور میرا بھانجا ہے، مگر وہ تاڑ گئیں کہ کوئی شہزادہ ڈورے ڈالنے آیا ہے۔ اَلغرض دو چار روز کے بعد خط و کتابت شروع ہوگئی، نامہ و پیام کی نوبت آئی۔ ایک مرتبہ شہزادۂ ہمایوں فیل فلک شکوہ پر سوار ہو کر بیگم صاحب کی محل سرا کی طرف گئے اُس وقت باغ میں سب ہمجولیاں چہل پہل میں مصروف تھیں۔ یہ تاک لگائے سب کو گھور رہے تھے۔ بیگم کی نظر پڑی تو رنگ رو متغیر ہوگیا۔ ٹاٹ باڈی اوگی پانوں سے نکل پڑی۔ رزائی کاندھے سے سرک گئی، مارے بدحواسی کے عجب حال تھا، سر پیر کا ہوش نہ تھا۔

آزاد: قاعدہ ہے۔ نامحرم کی اِدھر اُدھر جا بیجا نظر پڑے تو خواہ مخواہ، عورت جھینپ ہی جائے گی۔ اور پھر کنواری عفیفہ۔

خوجی: اے ہے، واللہ بس کچھ نہ پوچھو۔ مصر میں یہی حال ایک کنواری چھوکری جھروکے سے تاک جھانک کر رہی تھی۔ این جانب جو اُدھر سے گزرے تو چار آنکھیں ہوتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ چاہا کہ دروازہ بند کردے مگر دروازہ کی عوض آنکھیں بند کریں، اس بے حواسی کے صدقے۔ واللہ ہے عجب حسنِ خداداد تھا۔ بس جیسے بمبئی والی بیگم۔ نور کا عالم اور سن کوئی پرنس میا کر کے چالیس بیالیس، انتہا تینتالیس چوالیس برس کا اور کیا۔

آزاد: (مسکرا کر) بس ابھی پالنے کے قابل ہے۔

خوجی : اور نہیں تو کیا، اور صورت واہ واہ ہے۔ تو سانولی رنگت مگر نمکینی کی کان ہے۔ واللہ ملاحت کی جان ہے۔
آزاد : دریں چہ شک۔ ہاں جناب۔ (محمد مہدی صاحب ہاں پھر کیا ہوا۔ آپ شہزادہ کا حال بیان کیجئے، پورا حال فرمائیے۔

محمد مہدی : دُلہن کے ہاں فنسون پر فنسین آنے لگیں۔ تمام شہر کی بیگمیں، شہزادیاں، نواب زادیاں، مخدرات کثرت سے جمع تھیں۔ ڈومنیاں دور دور سے بلوائی گئیں۔ دلہن کا دماغ فلکُ الافلاک پر تھا ہمجولیاں دل لگی مذاق کرتی تھیں۔ محبت و موَدتُ کا دم بھرتی تھیں۔ اُدھر دولھا کے یہاں دھما چوکڑی مچی تھی۔ طبلے پر تھاپ پڑتی تھی، اربابِ نشاط نے محفلِ رقص و سرود کو وہ رونق دی تھی کہ باید شاید۔ مرزا ہمایوں فر نے بنارس، اور آگرہ، اور جونپور، اور مرزا پور، اور دلی، اور لاہور، اور جبل پور، دور دور سے خوش گلو گانے والیاں بلائی تھیں۔ جس نے کہہ دیا کہ خداوند، فلاں مقام پر ایک گانے والی ہے اُس خوش گلو کو بغیر دیکھے سنے فوراً حکم ہوا کہ بلوالو۔ اب سُنیئے کہ شادی کے روز وہ دھوم دھام، اور وہ اژدہام تھا کہ بیان سے خارج ہے۔ مگر عین گھڑیال میں غلہ لگا۔ نوشہ جو صَرصَر تنگ پر سوار ہو کر جاتا تھا۔ کہ عین برات میں ایک شقی نے تلوار کا تُلا ہوا ہاتھ دیا۔ اور سر تن سے جدا ہوگیا۔ دھڑ سے الگ۔

آزاد : آہ آہ!! ہے ہے، توبہ توبہ! معاذاللہ، (سر پیٹ کر) افسوص صد افسوس، ہائے ستم وائے ستم۔
آزاد : اس وقت بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اُفوہ جگر دوز پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ؏

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

آزاد اور خوجی دونوں کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور محمد مہدی بھی خوب روئے۔ مس کلیر سا نے وجہ گریہ وزاری دریافت کی۔ خوجی بیان کرنے ہی کو تھے کہ آزاد نے اشارہ سے منع کیا اُردو میں کہا عجب بے تکے آدمی ہو جب ہم مردوں کو اس خبرِ وحشت اثر کے سننے سے اس درجہ رنج ہوا۔ عورتوں اور خصوصاً کم سن کا کیا حال ہوگا۔
محمد مہدی : ابھی آپ نے سُنا کیا ہے۔ اے جناب دُلہن لاشے پر آئی۔ مہندی ہاتھوں میں لگی ہوئی، سر پر تاج ہر ہفت آرائش سے مزین از سرتا پا نور رشک پری وحور اُف ہائے ہائے ستم ہوگیا۔
آزاد : للہ اب تذکرہ نہ کیجئے۔ کیوں صاحب اس وقت اُس بے چاری کا کیا حال ہوگا ہائیں نام آپ کو معلوم ہے۔
بیگم صاحب کا کیا نام ہے لڑکی کس کی ہیں۔ کس محلہ میں مکان ہے۔
محمد مہدی : دُلہن کا نام تو نہیں یاد مگر اس قدر جانتا ہوں کہ بڑی بیگم کی صاحبزادی ہیں۔ شہر سے دو کوس پر مکان ہے۔

آزاد: (کان کھڑے کرکے) کیا! کس کی! کس کی صاحبزادی ہیں۔

محمد مہدی: شہر سے دو کوس کے فاصلے پر ایک بیگم صاحب رہتی ہیں۔ بڑی بیگم اُن کا نام ہے، اور دو لڑکیاں ہیں، ہیں تو پوتیاں مگر لڑکیاں ہی مشہور ہیں۔ دونوں اس قدر خوب صورت ہیں کہ بیان سے باہر۔ صغر سنی کی حالت میں میں نے بھی اُن دونوں پریوں کو دیکھا تھا۔ بچہ حور ہیں۔ آفتاب، مہتاب دونوں گرد باللہ العظیم۔

آزاد: آپ کو اُن کے مشاہدے کا کیونکر موقع ملا۔

محمد مہدی: بجرے پر دریا کی سیر کو جایا کرتی تھیں، دو بار میں نے بھی دیکھا۔ غش آگیا۔ اپنے ہوش میں نہ رہا۔

آزاد: (کانپتے ہوے) خدا خیر کرے ہوش اُڑ گئے، یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ بجرون کا بھی ذکر کیا اور دو کنواری چھوکریاں بھی ہیں اور بڑی بیگم کا نام بھی آیا اور یہ بھی کہا کہ اصل میں پوتیاں ہیں۔ مگر لڑکیاں مشہور ہیں کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ خواجہ صاحب کچھ سُنا۔

خوجی: کیا عرض کروں پیر و مرشد میری عقل خود گُم ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ بھلا کیوں حضرت کوئی بوڑھا آدمی بھی وہاں تھا پیر مرد۔

محمد مہدی: ہاں وہ اُن دونوں صاحبزادیوں سے بہت ملتفت ہے؛ اور مثل اپنی لڑکیوں کے سمجھتا ہے۔ مگر آپ دونوں صاحبوں کے اصرار کا سبب نہ معلوم ہوا، آپ اُن کو کیا جانیں۔

آزاد اور خوجی دونوں کو شک کے عوض یقین تھا کہ حسن آرا بیگم اپنے قول سے پھر گئیں۔ آزاد اپنے دل کو لاکھ ڈھارس دیتے تھے مگر بے سود، یہ غزل ترجمان دل تھی۔

ای دل بچشم زخم حوادث فگار شو	ای چشم از تراوش دل اشک بار شو
ای خون بدیدہ در رو گداز جگر فرصت	ای دم بسینہ درد و چراغ مزار شو
ای لب بنوحہ نالہ جانکاہ سازدہ	ای سر بغصہ خاک سر رہ گزار شو
ای خاک چرخ گر نتوان زد زجا درای	ای چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو
ای نو بہار چوں تن بسمل بخون غلط	ای روزگار چوں شب بی ماہ تار شو
ای ماہتاب روے بسیلی کبود کن	ای آفتاب داغ دل روزگار شو

آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا از سر گذشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

خوجی: اس قدر تشویش کی ضرورت نہیں ہے؛ خدا جانے کس کا ذکر کرتے ہیں، پہلے دریافت تو کر لیجیے مفصل حال تو سُن لیجیے۔

آزاد: اب کچھ باقی بھی رہ گیا ہے۔ بڑی بیگم کا نام آہی گیا۔ حسن آرا بیگم اور سپہر آرا بیگم کا نام نہیں آیا۔ وہ بھی سن لیجئے گا۔

خوجی: کیوں حضرت اگر تکلیف نہ ہو تو مہربانی کر کے پھر اس واقعہ کو بیان کیجئے یہ فرمایئے کہ اس دُلہن کا نام کیا حُسن آرا بیگم ہے؟

محمد مہدی: مجھے معلوم نہیں، مگر اُس کی ماں کا نام بڑی بیگم ہے۔ مکان نہایت دلچسپ ہے۔ دریا سامنے موجزن، اِدھر اُدھر مرغزار، پُر بہار سبزے کی لہک، اور چوطرفہ کی صفائی سے آنکھوں کو وہ نور حاصل ہوتا تھا کہ میں عرض نہیں کر سکتا۔ سُبحانَ اللہ سُبحانَ اللہ۔

صفائی در روی از فیض الٰہی — بساطِ ذرّہ وی از پیمبر
نسیمش رنگ و بوی ہست گلشن — صباحش آبروی ہفت کشور
نسیمش چوں دم عیسیٰ فرح بخش — صباحش چوں کفِ موسیٰ منور
صباحش را سرشت از غازۂ حور — نسیمش را بہار از مور ثمر

دم صبحش ز مہر آئینہ در کف
نسیمش از بہاران حلّہ در بر

خوجی: بھائی جان۔ چاہے کوئی مار ڈالے ہمیں یقین نہ آئے کہ حسن آرا بیگم تمہارے خلاف ہو جائیں، اور اپنے قول سے پھر جائیں ہمیں حیرت یہ ہے کہ تمہارے دل میں یہ خیال پیدا کیونکر ہوا۔

آزاد: ہے تو ایسا ہی، مگر عورت پھر عورت ہی ہے۔ کچھ اعتبار نہیں۔

خوجی: بجا ارشاد ہوا۔ مطلب یہ کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں درست، اور ہم نے جو ایک بار یہی کہا تو حضور ہم سے کیوں بگڑے تھے۔ اور کیا کیا باتیں سُنائی تھیں۔ یاد ہیں یا بھول گئے۔ بتاؤ۔

مس مَیڈا چتون سے تاڑ گئی کہ حضرت کو اپنی محبوبہ یاد آتی ہیں؛ گو وطن چھوٹنے اور ماں باپ اعزہ اقربا اور بہنوں کی جدائی کا سخت رنج تھا، مگر عمداً اور قصداً مسکرا کر کہا۔ آپ ہمیں رخصت کیجئے۔ جب یہیں سے یہ حال ہے تو وہاں کا خدا حافظ ہے۔ بس دیکھ لیجئے بے مروتی بھی تو کتنی۔

آزاد نے مس مَیڈا کے دست سیمیں میں ہاتھ دے کر کہا۔ جانِ من تم اور یہ بدگمانی! واہ۔ جان تک تم پر نثار ہے مگر خیال آہی جاتا ہے۔ حسن آرا کی بدولت ہم نے سیر تو بہت کی، مگر جان جوکھم۔ جان کے ہر دم لالے پڑے ہوئے تھے۔ اگر برفستان بھیج دیئے جاتے تو کوئی بھی نہ پوچھتا کہ:

چرا تنہائی و صحرا نوردی — چنیں چوں سر بسر اندوہ و دردی

چہ پیش آمد ترا و حال چون ست   مگر صحرا نوردی از جنون ست

جدا چوں گشتی از یاران غم خوار

چرای ہمچو مجنوں سر بہ کہسار

یہ کہہ کر آزاد پاشا نے دل بہلانے کے لئے یوں گفتگو کی۔ دل لگی بازوں کے چٹکلے بھی غضب کے ہوتے ہیں بذلہ سنج کسی مقام پر چوکتے ہی نہیں، رنگین مزاجی اور ظریفانہ طبع نعمتِ خداداد ہے:۔

بجز رنگین مزاجی زندہ دل ہونا نہیں ممکن

کہ لطفِ زندگانی ہے بدن میں جب تلک خون ہے

میدانِ جنگ میں قلعہ قاچار کے پاس ہماری فوج کا پڑاؤ تھا۔ شب کو ہم نے ارمان نامے شہر مارا، اور صبح کو لشکر آگے بڑھا۔ تلایہ غنیم کی کیفیت دریافت کرنے گیا تھا۔ اور ہم لوگ مزے سے گپیں اڑا رہے تھے۔ علیقو پاشا اپنے خیمے سے دوڑے آئے اور ہنستے ہوئے ایک اخبار مجھے دیا۔ میں نے پڑھا تو مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ دل لگی بازوں سے خدا کی پناہ، پڑھتا ہوں تو اشتہار، مگر تمام دنیا کے اشتہاروں سے نرالا۔ مضمون سننے کے قابل ہے۔

پَریو چلو

لندن اور قرب وجوار لندن کی جتنی حسینۂ جمیلہ، گلبدن، پستہ دہن، نوخیز، کم سن، شوخ وبیباک، چست وچالاک، دوشیزہ چھوکریاں ہیں، اُن سب کو مژدہ تازہ، ونوید بے اندازہ کہ ہمارے ٹھیٹر کے لیے ایک تلو خوبصورت، اور گلفام ونازک اندام، کنواری لڑکیوں کی ضرورت ہے۔ نوجوان مسوں کو لازم ہے کہ درخواستیں بھیجیں، مگر ان شرطوں کا ضرور خیال رہے۔

۱۔ درخواست دینے والے کی عمر سترہ برس سے کم اور بیس سال سے زیادہ نہ ہو۔

ع۔ جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

۲۔ ایسی ویسی عورت درخواست نہ دے۔

۳۔ شوخی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ بقول شاعر:۔

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں

انساں نہ مجھے سمجھو میں جنت کی پری ہوں

اس شعر کے مصداق ہو۔ بلکہ اس سے بھی افزوں۔

۴۔ نظر غلط انداز، جادو کا کام کرے۔ سحر بابل کو لوگ بھول جائیں۔ کُل تماشائی یہی سمجھیں کہ یہ رشکِ پری

بصد شان دلبری ہمیں پر نظر ڈال رہی ہے۔ ہمیں کو رجھا رہی ہے۔

۵۔ خرام ناز کبک دری کو خجل کر دے۔ سرو گلشن دیکھے تو مارے شرم کے گڑ جائے، چال ایسی مستانہ ہو کہ۔

ع۔
نہ پٹے اور جھومتی جائے

مُردوں کو زندہ کر دے:۔

بہر زمین کہ چو آب حیات بخرامد
وہاں مردہ بزیر زمین آب شود

۶۔ حیا، ادب، شرم، منزلوں دور رہے۔ بیبا کی ان کے نام کی قسم کھائے۔ بالکل آزاد منش، اور بے باک روشش ہو۔

۷۔ گردن فوارۂ نور ہو۔

ع۔
گردنت صبح بہشت ست گر انصاف بود

۸۔ گورے گورے گال، شب کے وقت اس طرح چمکیں، جیسے اندھیری رات میں ماہ تاباں۔ دونوں رخسار تاباں بوسہ فریب ہوں، جو دیکھے بے اختیار جی چاہے کہ منہ چوم لے۔ اور ہر فرد بشر کی زبان پر یہ شعر ہو:۔

نگار خانہ صبح ست ایں نہ رخسارست
نگاہ کن ورق سادہ سادۂ چہ پر کارست

۹۔ ادا کی یہ کیفیت ہو کہ ادا خود اس کی ادا پر دل و جان سے قربان ہو جائے۔ ہر بات میں غمزۂ لاجوردیکا اظہار ہو۔

چشم نگر از دور بحسرت نگرانست
تا غمزۂ خوں ریز تو غارتگر جانست

۱۰۔ لگاوٹ بازی میں طاق ہو۔ مگر خالی خولی لگاوٹ ہاں اس کا ذرا خیال رہے۔

۱۱۔ اس قدر لکھ دینا ہو گا کہ بلا مرضی مہتمم تھیٹر نوکری نہ چھوڑ سکے گی۔ یہ نہیں کہ ادھر اُدھر کے ایرے غیرے پچکلیاں آ کے لے اُڑیں۔

اس طرح کی سُتّو پریاں ہمیں درکار ہیں، اور مقصد یہ ہے کہ یورپ اور ایشیا اور امریکہ ان تینوں براعظم کی سیر کر کے رنگین طبع اُمرا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹیں؛ جس وقت یہ سُتّو حوران بہشتی نژاد نکھر کے اسٹیج پر آئیں گی اور بصد ادائے دلرُبا تماشا دکھائیں گی کتا دُ ہو گا۔

اب سُنیئے کہ روزِ معہودہ کو تھیٹر کے دروازے پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ تماشابین اِس غرض سے جوق جوق جمع ہوئے کہ چل کے نوجوان سیم تنوں کو گھوریں۔ شعلہ رُو، خوبانِ عنبر مُو، سے آنکھیں سینکیں۔ صافی مذاق آدمی

دو گھڑی کی دل لگی کے لئے آئے۔ بے فکرے بگڑے دل بھی مٹر گشت کرتے ہوئے اس طرف آنکلے کہ اچھی اچھی صورتیں ہی دیکھنے میں آئیں گی۔ اخباروں کے رپورٹر پنسل اور نوٹ بک لے کے پہونچے لوکل خبر ہی ملی۔ مصوروں کی بن آئی۔ مرقع پیش نظر تھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسینہ ایک سے ایک خوبرو، اور قوس ابرو، الغرض میلا جم گیا۔ اور کئی ہزار کنواری نوخیز کم سن ٹوٹ پڑیں۔ سب نازک بدن، اور غنچہ دہن، سب زیبا اندام، اور سیم تن۔ سب نازک نگاہ، اور کج کلاہ، سب حورو ش، غیرت مہر، رشک ماہ۔ اٹھتی جوانی، عنفوان شباب، امنگوں کے دن، جوبن پھٹا پڑتا تھا۔

ایک تو یوں ہی حسن خدا ساز تھا۔ اس پر بناؤ چناؤ نے اور بھی ستم ڈھایا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ باہمی مقابلہ اور بن ٹھن کے آئیں الغرض ٹھیٹر کی سڑک پر غنچہ کھلا ہوا تھا۔ اور شہر اور گرد و نواح کی کل حسینیں جمع تھیں، اور سب نکھری ہوئیں دور تک دو رویہ پرستان ہی نظر آتا تھا۔ اندر کا اکھاڑا شرماتا تھا۔

مجمع ہے حسینوں کا یا کوئی مرقع ہے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

نوجوان تماشا بینوں کا عجب حال تھا۔ نظر ناز کرتی ہوئی گل رخسار ہی پر جاتی تھی۔ نگاہ اپنے طالع فرخ پر اتراتی تھی۔ یہ خبر سن کر بڑے بڑے امرائے ذوی الاقتدار اور شہزادگان عالی تبار تفریح طبع کے لئے اس مقام پر آئے۔ جس دوشیزہ پر نظر پڑی یہی گمان ہوا کہ کوہ قاف سے پری اتری ہے، یا جنت کی حور ہے۔ عوام نے غل مچانا شروع کیا۔ قہقہے پر قہقہے پڑتے تھے۔ بعض شریر آدمیوں نے ان پریوں سے چھیڑ چھاڑ بھی شروع کر دی۔ دو چار شوخ و بے باک عورتوں نے ان بدمعاشوں پر ہاتھ صاف کیا۔ آخر کار چار سو لیڈیوں کو ٹھیٹر والوں نے بہزار خرابی اندر بلا کر بند کر دیا۔ تاکہ عوام ان کو دق نہ کریں ان میں سے اکثر منتخب کی گئیں، اور وہ چھٹی ہوئی عورتیں ٹھیٹر میں نوکر رکھی گئی ہیں۔ اخبار میں درج تھا کہ دس آدمی اس کام کے لیے مقرر تھے کہ جن عورتوں نے ٹھیٹر میں بھرتی ہونے کی درخواست کی تھی، ان کا امتحان لیں اور دیکھیں کہ شوخی اور چستی، و چالاکی، اور بیباکی اور رنگین ادائی اور دلربائی اور حسن میں فرد ہیں یا نہیں۔

مَیڈا: جس جس نے رجھایا ہوگا، وہ ضرور مقرر کر دی گئی ہوگی، مگر دل لگی دیکھنے کے قابل تھی بڑا تماشا ہوگا۔

خوجی: اس مقام پر اگر اینجانب ہوتے تو واللہ ٹھیٹر وٹیر سب بالائے طاق رہتا۔ اور سب کی سب بندے کے دم کے ساتھ ہو جاتیں۔

راوی: دریں چہ شک۔ مگر ہم نے تو سنا تھا کہ حضور بے دُم کے ہیں۔ غرض کہ آپ بھی طرفہ رقم ہیں۔ ع۔

سب صورتِ لنگور فقط دُم کی کسر ہے

میاں آزاد کو من جملہ اور باتوں کے ایک گُر یہ بھی خوب یاد تھا کہ روتے کو ہنسا دیتے۔ گو خاتون یوسف لقامس میڈا کا دل کسی قدر بھر آیا تھا۔ مگر اس اشتہار کے مضمون کو حضرت آزاد نے ایسی لطافت اور خوبی سے ادا کیا کہ وہ بتِ شیریں حرکات، مسرور و محظوظ ہو گئی۔ خواجہ صاحب نے دیکھا میں ہی پھسڈی رہا جاتا ہوں چونک کر کہا۔ اُخاہ۔۔۔۔۔۔۔۔ خوب یاد آیا۔ لاحول ولاقوۃ لاحول ولاقوۃ۔ توبہ توبہ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا ورنہ اللہ یاد ہوتا تو ہرگز ہرگز جہاز پر سوار نہ ہوتا۔

میڈا: ہاں! خیر اب اُتر جائیے جہاز روک لیا جائے۔

آزاد: ہاں ہاں اب بھی سویرا ہے حضرت۔ جائیے جائیے۔

خوجی: اس دفعہ کا ذکر نہیں ہے۔ بھائی جان۔ جب میں وہاں سے سوار ہوتا تھا۔ تب ہی بھول گیا، ورنہ بمبئی سے روانہ ہی نہ ہوتا بے بدلہ لئے انتقام لیتا مگر مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید (پیشانی پر ہاتھ مار کر) بر کلہ خود باید زد۔ واللہ کھوپڑی بھنا گئی۔

میڈا: ان کی باتیں پہیلیاں ہوتی ہیں معمہ کہتے ہیں۔

آزاد: کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے ان کو ٹھونکا ہے۔ مگر انتقام لینا بہت جلد یاد آیا۔

خوجی: ایک دن کا ذکر ہے بندہ درگاہ، ہولی کے دن بازار میں نکلے اور شہر ہندوؤں کا۔ لوگوں نے منع کیا کہ آج باہر نہ نکلئے۔ ورنہ رنگ پڑ جائے گا۔ ہم اس زمانے میں اُوبچی بنے ہوئے تھے۔ واللہ بالکل گینڈا بنا ہوا تھا ہاتھی کی دُم پکڑلی تو ہم سے نہ سکا۔ اور ہاتھی مکنا' دیو کا بچہ نہیں' دیو کا بھی دادا پیر۔ قیں سے بول کے چاہا کہ بھاگے۔ مگر کیا مجال۔ جس نے دیکھا عش عش کرنے لگا کہ واہ پٹھے۔

آزاد: ایں! پٹھے کا ہے کے۔ ڈھانڈے نہیں کہتے۔

خوجی: بس اب آپ دل لگی پر اُتارو ہوئے تو خیر سمجھا گیا۔ آپ سے بندہ نہیں عرض کرتا۔ سنو! مس میڈا۔ بس صاحب ہم بازار میں آئے تو دیکھا ہڑبونگ ہلّڑ مچا ہوا۔ ہر ایک را ہینی آغشتہ خلاب بہیئت خراب، ہر بنیندہ راہ بجائے تعقب خندہ زن میکند۔ اے کاش بعوض ایں ہمہ افعالِ وحشیانہ، و حرکات مجنونانہ در ایام ہولی گلاب پاشی شدی، چہ خوش بدے۔

کنیزانِ گل پوش، گلفام، گل بدن پیش وپس، ار دوگرد نشینند و ہر ایک در دست خویش قمقمہ گیرد:۔

ہولی آمد بہار شد پیدا	ہر طرف لالہ زار شد پیدا
زعبیر و گلال و پچکاری	رنگ بہ روی یار شد پیدا

میڈا: پکا دیوانہ ہے۔ کچے گھڑے کی چڑھی ہے۔

خوجی: خیر صاحب خلاصہ کلام یہ کہ مجھ سے اور شہزوری کا زعم اور یہ دعویٰ کہ نمرد کی کیا اصل وحقیقت تھی۔ بس میں ہوا کھاتے اکڑتے بررتے پہونچا تو ایک مقام پر کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی سَو آدمی کے قریب جمع اور رنگ اُچھل رہا ہے۔ میرے پاس پیش قبض اور قرابینچہ۔ اور تمنچے بس کیا عرض کروں۔

آزاد: مگر قرولی نہ تھی۔ افسوس۔

خوجی: نا بھئی بات نہ کاٹو۔ میں نے کہا یارو دیکھ بھال کے ہاں مردوں پر رنگ ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔ پہلے تو وہ لوگ ذرا گڑبڑا گئے، اور میں دڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے کہا سمجھا جائے گا۔ اِن سَو کے سَو کو ایک دم میں دکھاؤں تو سہی۔ ایک پٹھان نے آگے بڑھ کر کہا میاں پہلوان تم سپاہی آدمی ہو اور گراںڈیل جوان۔

راوی: دریں چہ شک۔ کیسے کچھ۔ دیکھئے ذرا گرییتے گا نہیں ایسا نہ ہو بواز عفران کسی طرف سے صورت دکھا دیں تو غضب ہو جائے۔

آزاد: خلاصہ یہ کہ آپ آگے بڑھے ماشاء اللہ کیوں نہیں۔

خوجی: خانصاحب نے کہا کہ آپ ہیں آدمی سپاہی، گراں ڈیل جوان مسلح، ہتھیار بند، اگر آپ کو غصہ آگیا تو غضب ہو جائے گا۔ مگر میں نے ایک نہ مانی، میں نے کہا سنو بھئی تم مسلمان ہو کے رنگ اُچھالتے ہو، اُنھوں نے کہا۔ حضرت ہمارا ان لوگوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بندہ پینترے بدل کے آگے بڑھا۔ بس حضرت دو لونڈوں نے پچکاری تانی اور رنگ ڈال دیا۔ اُسی پٹھان نے پیچھے سے تان کے ایک جوتا دیا۔ تو کھوپڑی پلپلی ہو گئی۔ پھر کے جو دیکھتا ہوں تو ڈبل جوتا ڈھائی تلے کا۔ سمجھاؤں بجھاؤں۔ مسکرا کر آگے بڑھا۔

آزاد: ایں! جوتا کھا کے آگے بڑھے۔ ماشاء اللہ!

مَیڈا: اور اُس زمانے میں سپاہی بھی تھے اور مسلح بھی تھے۔ تسپر جوتا کھا کے چُپ کے ہو رہے۔ واہ ری جواں مردی۔

آزاد: چپکے ہو رہتے تو خیریت تھی۔ مسکرائے بھی۔

راوی: اور بات بھی دل لگی کی تھی۔ مسکراتے نہ تو کیا روتے۔ آدمی فہمیدہ ہیں۔

خوجی: میں تو سپاہی ہوں، تلوار سے بات کرتا ہوں۔ جوتے سے کام نہیں لیتا۔ جوتی خورے کوئی اور ہی ہوں گے۔ جی حضرت کجا تلوار، کجا جوتی پیزار، اور ہم مسلک صلح کل کے سالک ہیں۔ سب سے مل کے چلنا۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

مس کلیرسا اُس وقت آرام کر رہی تھیں۔ خواب ناز سے بیدار ہوئیں، تو منھ دھو کر مس مَیڈا کے پاس آئیں۔

یہاں قہقہے پڑ رہے تھے۔ ان سے بھی خواجہ بدیع الزماں صاحب کی پوری پوری سرگذشت بیان کی گئی، اور خواجہ صاحب اپنی بہادری اور پاپوش کاری، کا حال سن کر بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ اس علم کے صدقے کہ باوصف واقفیت جنگ جوتا کھا کے خاموش ہو رہے۔ چوں تک نہ کی۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

خواجہ صاحب اس گفتگو کے بعد یہ شعر پڑھ کر افیم گھولنے لگے۔

کھو دیا حسن مدرک نے ستم ایجادوں کا اڑ گیا رنگ دھواں بن کے پری زادوں کا

آزاد: ایک اُمیرِ وَالاتبار کی دخت پری چہرہ، پڑوس کے ایک لڑکے سے عالم طفلی میں کھیلا کرتی تھی۔ اس لڑکے کے ماں باپ غریب آدمی تھے۔ مگر شریف اور وضعدار۔ جب لڑکی سن بلوغ کو پہونچی تو پڑوس کا ڈورے ڈالنے لگا۔ وہ بھی اس پر عاشق ہو گئی۔ دونوں شادی پر راضی ہوئے۔ ایک دن لڑکے نے اس پری پیکر سے کہا۔ پیاری! میرا قصد ہے کہ جب شادی ہو تو پہلے مہینے میں ہم اور تم خوب سفر کریں، یہاں سے پارس جائیں۔ وہاں خوب گلچھرے اُڑائیں۔ پھر وہاں سے افریقہ کی سیر کریں۔ مصر کے منار دیکھیں، ہندوستان میں روضۂ تاج بی بی کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ لگے ہاتھوں وہ بھی دیکھ لیں۔ الغرض تمام دنیا کی سیاحی کر آئیں۔ وہ حور شمائل چپ چاپ سنتی گئی۔ جب یہ اولوالعزم لڑکا خاموش ہوا، تو اس نے مسکرا کر کہا۔ جان من سیر و سیاحت کرنے میں تو کچھ ہرج نہیں۔ سوال یہ ہے کہ تمہارے پاس اس قدر روپیہ بھی ہے کہ ساری خدائی کی سیر ہی کرو گے۔ لڑکے نے کہا کہ جب ہماری تمہاری شادی ہو جائے گی تو ہمیں روپیہ کی کیا ضرورت رہے گی۔ لڑکی بولی۔ یہ سچ ہے مگر ابا کہتے ہیں کہ میں اپنا روپیہ اور اپنی دولت تجھے اس وقت دوں گا جب مر جاؤں گا۔ ان کے حینِ حیات میں اس ثروت کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ یہ خبر سُن کر لڑکے نے آہ سرد بھری اور کہا اچھا جانِ جان اگر یہ بات ہے تو شادی بھی اُسی دن ہو گی۔ جب تمہارے ابا کو دفنا کے واپس آئیں گے بالفعل ملتوی رہے۔

کلیرسا: ایک کسی مجسٹریٹ نے ایک گواہ سے پوچھا کہ مدعی کی ماں تمہارے سامنے روتی تھی یا نہیں؟ گواہ نے کہا۔ جی ہاں، بائیں آنکھ سے روتی تھی۔ کانی عورت ہے۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس کی بائیں آنکھ سے آنسو جاری تھے، اور دائیں گال پر لڑھک کر دامن کی خبر لاتے تھے۔ مجسٹریٹ نے اسی بنا پر دعویٰ خارج کر دیا۔

خوجی: ہمیں کوئی بات بھلی ہی نہیں معلوم ہوتی، رہ رہ کے خیال آتا ہے۔ کہ جس شخص نے ہولی میں بے ضابطگی کی تھی اس کی قرار واقعی مرمت کروں، واللہ اگر اس وقت یاد آتا تو ہر گز ہر گز جہاز پر سوار نہ ہوتا۔ مگر مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلّہ خود باید زدُ۔

آزاد: اور فارسی عرصے سے نہیں بولی یہ کیا۔

خو: ناباہاے من بدیع منکہ پارسی زبان نمی داند، چہ داند کہ ہیچ ہم نمیداند:۔

میں ایک فارسی داں سے کہا کہ اب مجھ کو — ہوئی ہے بندشِ اشعارِ فرس ذہن نشیں
کہا یہ بعد تامل کہ دوں جواب تجھے — جو میری بات کا اے یار تجھ کو ہوئے یقیں
جو چاہے یہ کہ کہے ہند کا زبان دان شعر — تو بہتر اُس کے لئے ریختی کا ہے آئیں
وگرنہ کہہ کے وہ کیوں شعر فارسی ناحق
ہمیشہ فارسی داں کا ہو موردِ نفریں

آزاد: مگر میرزا فاخر مکیں، اور ابوالفیض فیضی فیاضی، اور شیخ ابوالفضل، اور آرزو، اور فقیر، اور غنیمت اور مرزا بیدل، اور غالب دہلوی، یہ ایسے شعرائے گرانمایہ گذرگئے ہیں کہ اپنی آپ ہی نظم تھے۔ ان کے کلام پر ایرانی بھی ایراد نہیں کرسکتے۔ مگر ہاں ایرانی لاکھ گیا گذرا ہو پھر ایرانی ہے۔

رات کی آمد آمد اور پریوں کی چہل

مغنی دگر نغمہ بر تار زن — گل از نغمۂ تر بدستار زن
بہ پردازش آں گل انشا نوائے — نگویم غم از دل از زغم ربائے
دل از خوش بردار دبر سازنہ
ہم از خویش گوشی برآوازنہ

ثریا بیگم کا پری خانہ کثرتِ حورانِ گل رخسار سے پرستان کو شرماتا تھا۔ اس اکھاڑے کو راجہ اندر بھی دیکھتے تو عش عش کرنے لگتے۔ بیچ میں دلہن مثلِ گل خنداں۔ اِدھر اُدھر ہمجولیاں۔ وہ چاند تو یہ ہالہ، وہ بدر تو یہ نجوم۔ بہار کی بدولت خوبرویانِ بنائی نہال، کہیں طاؤسانِ زمرد دیں پر وبال۔ کہیں شاخِ گل پر عنادلِ رنگین مقال، بلبلوں کے چہچہے، تدردوں کے قہقہے، ہوائے گلشنِ جنوں تاز، نسیم طرب انگیز غالیہ ساز۔ رندانِ مے آشام کے ہاتھ میں جامِ بادۂ شیراز، اور بغل میں عروسِ طناز محوِ ناز۔ محفل میں پریوں کا جھرمٹ۔ غنچہ کھلا ہوا۔ کوئی خوبانِ فرخار پر طعنہ زن، کوئی گلعذار، کوئی گلبدن، اف رے جوبن، کوئی دلربائی میں طاق۔ کوئی کج ادائی میں شہرۂ آفاق، لگاوٹ کے ہتھکنڈے یاد۔ عاشق آزاری میں اُستاد۔ حشمت بہو، قوس ابرو، جانی بیگم خوش خو، بذلہ گو، آسمان جاہ، ناوک نگاہ۔ نظیر بیگم کی سادگی میں لاکھ بناؤ تھے۔ الغرض ہر ایک اپنے طرز میں بے نظیر تھی

میاں ہا نازک وہ لبا توانا — زنادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکہ در دلہا طبیعی ست — دہن ہا رشک گلہای ربیعی ست

ادای یک گلستاں جلوہ سرشار خرامی صد قیامت فتنہ دربار

زرنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش

بہار بستر و نوروز آغوش

اب سنیئے کہ ادھر ڈومنیوں کا مجرا ہو رہا تھا۔ ایک پر تکلف اور خوشنما کمرے میں وزیر ڈومنی ناچ رہی تھی۔ وزیر حسن و جمال میں بے نظیر تھی۔ ہر ادا دلربا و دلپذیر تھی۔ تان جانستاں۔ چہرہ رشک مہر تاباں۔ دوسرے کمرے میں ایک کم سن، کافر کیش، پرکالہ آتش، ڈومنی شہزادی مجرا ہوتا تھا۔ اس کے طرز رقص پر آسمان جاہ کے میاں بہت ریجھے ہوئے تھے۔

آسمان جاہ: بیل ہم سے نہ مانگنا۔ ہمارے میاں کا تم پر دل آیا ہے۔ ان سے طلب کرو تو مالا مال کر دیں۔ دامنِ طلب زرِ مراد سے بھر دیں۔

شہزادی: (زیرِ لب مسکرا کر) بندگی۔ آپ کی عنایت۔

جانی بیگم: باچھیں کھل گئیں، کہ نواب زادے تک ان پر جان دیتے ہیں۔ اللہ رے تیرے ناز۔ اونہ! اونہ!!

آسمان جاہ: جان دیں وہ، جو ان کی طرف دیکھ نہ سکیں۔ ان کے دشمن جان دیں یوں کہو کہ اچھے اچھے شہزادوں کا دل آیا ہے۔

جانی بیگم: یہ الٹی بات ہے۔ دل گیا کہ دل آیا ع

دل گیا ہاتھ سے لوگوں کے دردِ دل آیا

آسمان جاہ: بی فیضن جان۔ تم کو تو اس اجڑے ہوئے شہر کی ڈومنیوں کا گانا کاہے کو اچھا لگتا ہوگا۔

جانی بیگم: ان کے لئے دیہات کی میراثنیں بلوا دو۔

فیضن: ہاں پھر دیہاتی تو ہم ہی ہیں۔ اس کا کہنا کیا اس فقرہ پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ گھر بھر گونج اٹھا اور فیضن سخت شرمائی۔ جانی بیگم بولیں۔ بس یہی بات تو ہمیں اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ایک تو فیضن اتنی دیر کے بعد بولیں۔ اس پر بھی سب نے مل کر ان کو بنا ڈالا۔ ثوا کے لفظ پر اور بھی قہقہہ پڑا۔ شہزادی بھی مسکرائیں۔ ان کے بعد فہمین ڈومنی آئی۔

فیضن: اس ڈومنی کا کیا نام ہے۔ فمن ہے۔

جانی بیگم: ہم گنوار نہیں فہمین کہتے ہیں۔ تم شہر کی ہو فمتن کہو۔ بس گاؤں اور شہر میں یہی تو فرق ہے۔

فہمین: (فیضن کی طرف اشارہ کر کے) بیگم صاحب بڑی سیدھی ہیں۔ تین پانچ نہیں جانتیں۔ سادہ خراج، بلکہ؟

جانی بیگم: اے ہے۔ کہیں اب بیگم صاحب نہ کہہ دینا۔ بیگم کے نام سے چڑھتی ہیں۔ بیگم اور خانم دونوں سے نفرت ہے۔ فہیمن مجرا کرنے لگی، دو کم سن عورتیں سارنگی لئے تھیں۔ ایک طبلہ بجا رہی تھی، ایک پکھیرے کی جوڑی، اس کی خوش الحانی کی شہر میں دھوم تھی (بندھن وار باندھو سب مل کے مالنیاں)۔ اس کو ایسی خوش الحانی سے ادا کیا کہ جس نے سُنا بے اختیار تعریف کی، اس کے بعد (بنا رنگیلا بنی ری چھبیلی) اس کو چھیڑا تو اور رنگ جم گیا۔ فہیمن نے آسمان جاہ، اور دلہن کی بہنوں، اور بھانجیوں کا آنچل پکڑا۔ نچھاور ملے۔ لڑ لڑ کے بیل لی۔

گو فہیمن بڑی خوش رو تھی مگر شہزادی سے زیادہ خوبرو نہ تھی۔ سبز گرنٹ کا پائجامہ، پڑا تقے دار گوٹ بناؤ چناؤ کر کے ٹھسے سے آئی تھیں۔ دروازے کے پاس سے دو رنگین مزاج چمن طبع نوجوان کان دھر کے چپکے چپکے سُن رہے تھے۔ اور ادھر شاہانے کی دھن میں کبھی فہیمن، کبھی شہزادی گا رہی تھی (بندھن وار باندھو سب مل کے مالنیاں)، ثریا بیگم کے پدر بزرگوار نے قبلہ و کعبہ کے ہاں فنس بھجوائی۔ خدمت گار سے کہا دست بستہ عرض کرنا کہ برات چل چکی ہے۔ حضور تشریف لائیں۔ دو مشعلچی اور چوبدار اور خدمت گار بھی بھیجے گئے۔ کہاروں کی وردی سُرخ بانات کی تھی۔ پشت پر کلابتوں کی پتلیاں، اور پریاں بنی ہوئیں۔ پگڑیاں چھجے دار۔ چاندی کی مچھلیاں لگی ہوئیں۔ اُن میں گھونگرو پڑے ہوئے۔ گلے میں چاندی کا ڈھولنا۔ ہاتھوں میں چاندی کے کڑے۔ شیر دہان۔ قبلہ و کعبہ کی ڈیوڑھی پر آئے، خدمت گار نے عمدہ خانم کو پکارا۔

خدمتگار: ذری حضور کو اطلاع کر دو کہ سواری بھیجی ہے۔ عرض کیا ہے کہ قبلہ و کعبہ تشریف لائیں۔ دیر نہیں ہے۔

عمدہ خانم: اچھا۔ حسینی یہ ڈیوڑھی کی لالٹین کیوں گل ہو گئی۔

حسینی: جلائے دیتی ہوں، آج ہوا بڑی تیز چلتی ہے۔

عمدہ: اے تو اندر کے چراغ اور لالٹین نہ گل ہوں۔ ہوا اسی نگوڑی لالٹین کو لگی۔ اسی ہی کو گل بھی ہونا تھا۔

چوبدار: ذری جلدی سے اطلاع کر دو۔ جلدی ہے۔

خدمتگار: وہ تو حسینی لڑ رہی ہیں، اطلاع کون کرے۔

عمدہ: اے ہے تو یہ کیا جھنجھٹ مچائی ہے۔ اوئی کیا کچھ مینھ برستا ہے، جاتے جاتے جاؤں یا گر پڑوں۔ بوکھلاہٹ کاہے کی ہے۔

خدمتگار: ہاں صاحب جاتے جاتے جاؤ۔ گر پڑیں تمہارے دشمن۔

حسینی: یہ گریں گی بھی تو کون سے۔

عمدہ خانم نے قبلہ و کعبہ کو اطلاع دی۔ بستر سے اٹھے۔ عمامہ منگوایا۔ بر وہ یمانی زیب بر، اور کپڑے پہن کر

باہر رونق افروز ہوئے۔ چوبدار نے جھک کر آداب عرض کیا۔

قبلہ وکعبہ فنس پر سوار ہوئے صندوقچہ سامنے رکھا گیا۔ دستی روشن ہوئی۔ جب دلہن کے مکان پر پہونچے، تو علیٰحدہ کمرے میں بیٹھے۔ باہر ناچ ہو رہا تھا، وہ موقوف ہوگیا۔

چوبدار: لطف علی (خدمتگار) بھنڈی خانہ میں پیچوان تیار کرو۔ جلد لاؤ۔

لطف علی: ابھی ابھی لیجئے سب سامان لیس ہے۔ فقط آگ رکھنی باقی ہے، لگے ہاتھوں پیچوان لاتا ہوں۔

چوبدار: دستی اور زیر انداز لیتے آنا۔ سمجھے؟

لطف: ہاں ہاں صاحب سمجھے۔ سمجھے۔ گنوار نہیں ہیں، کہ آپ ہمیں سکھانے آگئے ہیں۔ خوب۔ سمجھنے کی ایک ہی کہی۔

چوبدار: سوائے اپنی بڑائی کے دوسری بات نہیں۔ اور ہم کو اس سے ٹھہری نفرت۔ تو اب بنے تو کیوں کر بنے۔

نواب: اب آپس میں لڑوگے یا کام کروگے۔ قبلہ وکعبہ اتنی دیر سے تشریف رکھتے ہیں۔ پیچوان تک نہ آسکا۔

چوبدار: اس لطف علی کا قاعدہ ہے، کہ جو کام اس سے میں کہتا ہوں۔ اس میں دیر لگاتا ہے اور کام چور نوالہ حاضر۔ باتیں بہت بنانی آتی ہیں۔

ان دونوں میں بہت کم بنتی ہے، چوبدار اپنی حکومت جتاتا تھا۔ خدمتگار اپنی تئیں فرعون سمجھتا تھا۔ بنتی کیونکر۔ دوسرا خدمتگار پیچوان لایا۔ زیر انداز بچھایا۔ پدر کے کام کی عمدہ مُہنال تھی۔ قبلہ وکعبہ نے نوشِ جاں فرمائی۔ دلہن کی ماں کو معلوم ہوا کہ قبلہ وکعبہ تشریف لائے ہیں۔ کشتی میں عطر کی شیشی اور الائچی، اور بلوری ہشت پہل طشتری میں دو رخی چکنی ڈلی، قاب میں مزے دار گلوریاں لگائیں، جن میں چاندی کے ورق لپٹے تھے۔ زردکاشانی مخمل کا کشتی پوش، کلابتو کا کام کیا ہوا ترنج لگے ہوئے۔ مُبلاقن مہری کو بلایا۔ کشتی دی، وہ کشتی لے کر باہر گئی۔

بلاقن نے آداب عرض کر کے کہا، بیگم صاحب نے آداب عرض کیا ہے، اور یہ کشتی حضور کے لئے بھیجی ہے۔ کشتی پوش اٹھایا، قبلہ وکعبہ نے فرمایا ہماری طرف سے بیگم صاحب کو دعا کہہ دینا۔ مہری سلام کر کے اندر گئی، ادھر قبلہ وکعبہ نے مزے دار گلوریاں کھائیں۔ دھواں دھار مشکبار حقہ پیا۔

پرانے فیشن کے مُتقی مُتشرّع بزرگ، اور ثقات مُسن حضور و مُجتہد العَصر کے پاس بکمال ادب بیٹھے تھے۔ مگر نوجوانوں کے عیش میں خلل پڑا۔ اُن کا رنگ مختلف۔ ان کے اور خیالات، اُن کی جوانی کی اُمنگ، اِدھر تو یہ کیفیت تھی، ادھر ڈومنیوں نے زنان خانے میں خوب دھما چوکڑی مچائی۔ چہل کی گرمیٔ بازار تھی۔ یوں تو سب کے سب شوخ طبع، رنگین مزاج، اور نوعمر تھیں، مگر آسمان جاہ اور جانی بیگم کی شوخی ستم ڈھاتی تھی۔ فیضن بے چاری کے پاتھے جاتی تھی۔

بیگما بیگم: چوتھی کے دن ہم سویرے سے آئیں گے۔

جانی بیگم : اس روز تیس چالیس طوائفوں کا ناچ ہوگا۔
نظیر بیگم : کشمیری نہیں آتے۔ ہمیں ان کی باتوں میں بڑا لطف آتا ہے۔
حشمت بہو : نواب صاحب کو زنانے میں ناچ کرانے کی چڑھ ہے۔ ڈومنیوں تک مضائقہ نہیں، اور ہے بھی ایسا ہی۔
آسمان جاہ : سنو بہن! یہ سب اپنے اپنے دل کا تعلق ہے۔ جو عورت بدی پر آئے تو اس کی بات ہی اور ہے، نہیں تو شریف زادی کے لئے سب سے بڑا پردہ دل کا ہے۔
بیگما بیگم : تمہاری زبان نہ رُکے گی۔
آسمان : ان کو میری زبان ہی کی پڑی ہے۔ آئے دن میری زبان ہی کو ٹوکا کرتی ہو۔ بہن اس کے معنی۔؟
جانی بیگم : اے ہے اللہ ان کی زبان کو نظر بد سے بچائے۔ کالا دانہ منگواؤ کالہ دانہ۔ کہیں نظر نہ لگ جائے۔
فیضن : شہزادی۔ ڈال گیو کو ٹونارے یہ گیت گاؤ۔
آسمان : (قہقہہ لگا کر) کیا گاؤ۔ کیا گاؤ۔؟ گیت؟ اے واہ ہے۔ گیت کنڈے والیاں گاتی ہیں۔
جانی : اور ان کو ٹھمری، ٹپے، غزل سے کیا مطلب۔ نکٹا گاؤ کہروا ناچو، جو یہ خوش ہوں۔
شہزادی : بہت اچھا۔ گوریا نے مارا برہ بان گوریا نے مارا برہ بان (مسکرا کر) کہروا ناچنا تو ہمارا کام نہیں ہے، مگر برہا کہو تو گاؤں۔
بیگما۔ چلو دل لگی تو ہو چکی اب کوئی غزل گاؤ۔

باعثِ وحشت ہوئی بے اعتنائی آپ کی
تنکے چنوانے لگی ہم سے جدائی آپ کی

آسمان : اے ہے یہ تو بوڑھی غزل ہے۔
جانی : اور جوان غزل کیسی ہوتی ہے۔ نئے نئے محاورے تراشتی ہو بہن۔ بوڑھی غزل!!!
مبارک محل : ہم بتائیں یہ غزل یاد ہے۔

لگا نہ رہنے دے جھگڑے کو یار تو باقی — رکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلو باقی
پروں کو کھول دے ظالم جو ذبح کرتا ہے — کہ رہ نہ جائے تڑپنے کی آرزو باقی
جو ایک رات بھی سویا وہ گل گلے مل کر
تو بھینی بھینی مہینوں رہے ہے بو باقی

شہزادی نے یہ نادر اور دلربا غزل دل لگا کر گائی، تو سماں بندھ گیا۔ ہنسی مذاق غل غپاڑا، آوازے پھبتیاں

سب موقوف۔ دل کے کانوں سے سب نے غزل سُنی، اور داد دی۔ شہزادی نے موقع، وقت کو غنیمت سمجھ کر خوب بیل لی۔ جس کا آنچل پکڑا اس سے علیٰ قدر حیثیت کچھ نہ کچھ لیا، اور خدا کے فضل سے سب شہزادیاں امیرزادیاں تھیں، ایک دوسرے کی دیکھی خوب روپیہ لٹایا، اور ڈومنیوں نے بھرپور انعام پایا۔ اتنے میں مغلانی چھوکری وزیرن ڈولی سے اتری، اور آن کر برات کا حال یوں بیان کیا۔

وزیرن: ای حضور میں کیا عرض کروں، جھوٹ نہ بلائے کوئی پچاس ساٹھ تو ہاتھی ہوں گے۔ ہاتھی کیا بادشاہوں کا فیل خانہ ہے۔ باجے کی وہ دھوم کہ بیان سے باہر، اور خلقت ایک پر سو سو آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں، اس قدر کا جماؤ جو آٹھوں کے میلے میں بھی نہیں ہوتا۔ سنا کہ چوک کے کمرے دس دس، بیس بیس اشرفی کرایہ پر لوگوں نے لئے ہیں۔ چھتیں پھٹی پڑتی ہیں۔

بیگما: آج نواب صاحب دِلی حوصلہ نکالیں گے۔

جانی: کیسا کچھ۔ مگر دل کا حوصلہ تو کل رات کو نکلے گا کیوں ثریا بیگم۔

آسمان: (قہقہہ لگا کر) میرے دل کی بات کہی۔

نظیر: ہاں ہے تو یہی۔ دل کا حوصلہ تو کل رات ہی کو نکلے گا۔ چاہے دُلہن سے پوچھ لو۔

جانی: (دلہن کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر) اے ذری سر اونچا کرو۔ اُوئی۔ ایسی نگوڑی شرم بھی کیا۔

نظیر: اچھا چاہے جس طرح بیٹھو، مگر اتنا بتا دو کہ یہ بات ٹھیک ہے، یا نہیں۔ بس پھر چاہے سر کو اور جھکا دو۔

جانی: اخاہ یہ بھی نظر کر کے ہنس رہی ہیں۔ کیوں نہیں۔

وزیرن: ہنستے ہی گھر بستے ہیں، ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ بیوی اللہ کرے تمام عمر ہنسی خوشی سے بسر کرنا نصیب ہو، یہ ان کا اقبال تھا کہ ایسے گھر گئیں۔

آسمان: واہ یہ اُس دولھا کا اقبال تھا کہ ایسی جورو پائی۔

جانی: جوڑی خوب ہے۔ وہ بھی گورے چٹے یہ بھی آگ بھبُوکا، وہ ان کو دن رات گھورا کریں گے یہ ان کو۔

آسمان: تمہارے دولھا کیسے ہیں بہن؟

جانی: تم کو اس سے کیا۔ چاہے جیسے ہیں، اگر دولھا دولھا بدلو تو ہم راضی ہیں۔ بدلو بدلتی ہو، اول بدل ہو جائے۔

مبارک: خاصی بات ہے۔ تم راضی ہو نہ۔

جانی: ہاں ہاں۔ ہم تو تم تک سے دولھا بدلنے کو راضی ہیں، مگر تمہارے میاں کو ہم نے دیکھا نہیں ہے۔

آسمان: میں بتاؤں۔ میں بتاؤں۔؟ اے وہی جو اکہری دروازے کے نیچے باندھا کرتے ہیں۔ کبڑے کبڑے سے وہ ہیں نہیں؟ اس پر بے اختیار قہقہہ پڑا، اور مبارک محل کا چہرہ مارے غصے کے سُرخ ہو گیا۔ عورت

تھی متینؔ اور نستعلیقؔ یہ گفتگو بڑی بری معلوم ہوئی۔ گولاکھ ضبط کیا، مگر چہرہ ترجمانِ دل تھا۔ آسمان جاہ نے گلے لگایا۔

آسمان: بہن ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔

مبارک: نہ معاف کروں گی تو کروں گی کیا آخر۔

جانی: ایسی باتوں سے آپس میں فساد ہو جاتا ہے۔ کسی اور کو کہتیں تو وہ الٹ کے اس سے بڑھ کر کہتی ہاں! کسی کو کہنا دل لگی نہیں ہے۔

آسمان: یہ لڑواتی ہیں بہن۔ سچ کہتی ہوں۔ یہ لڑواتی ہیں بڑی ایک ہو۔

مبارک: تم دونوں ایک سی ہو۔ جیسی تم ویسی وہ۔ نہ تم کم نہ وہ کم۔ مگر شریفوں میں اور بہو بیٹیوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہو۔ آگ لگ گئی زمانہ کو۔

آسمان: (بات ٹالنے کے لئے) :-

کن ناز وادا، چندیں نے دبستاں وحامی ہم	دماغِ نازکِ من برنمیتابد تقاضا را
خیالش را بساطے بھر یا انداز می بستم	پسندیدم بہ مستی مُخمِل خوابِ زلیخا را

مبارک: پڑھ لکھ کر یہ باتیں سیکھیں واہ۔

جانی: دیکھئے تو سہی۔ اب دل میں کٹ گئی ہوں گی۔

مبارک: میں ایسیوں سے بات نہیں کرتی ہوں۔

آسمان: (تنک کر) جتنا دبو، اتنا اور دباتی ہیں۔ اور ہم کو اپنی امارت دکھاتی ہیں۔ تم بات نہیں کرتیں تو یہاں کس کو تمنا ہے۔ رونی صورت، بات کی اور رونے لگیں۔

مبارک: مہری ہماری فنس منگواؤ ہم جائیں گے۔

بیگم صاحب کو خبر ہوئی تو انھوں نے اصرار بلیغ کیا، مبارک محل کو سمجھا بجھا کر راضی کر دیا۔ آسمان جاہ سے کان میں کہا، کہ بیٹا اب ان کو نہ چھیڑو ورنہ ہمارے لئے بڑی بدنامی کا سبب ہوگا، آئندہ تمہیں اختیار ہے۔

استانی جی کی کارستانی اور سپہر آرا کی پریشانی

جانانِ مرا بمن بیارید	دینِ مردہ تنم باو سپارید
گر بوسہ زند بریں لبانم	از زندہ شوم عجب مدارید

اللہ اللہ آج کس دھوم دھام سے عروسِ بہار کی سواری، گلشنِ جہاں میں آئی ہے۔ کہ مَلک روح فلک، اور

حورِ دوراز قصور، گلزارِ جناں سے تماشائی ہے۔ نونہالانِ چمن جامے میں پھولے نہیں سماتے ہیں۔ اپنے حسنِ خدا آفریں پر اتراتے ہیں، گلبن پر بلبل کی رنگیں بیانی، اور شاخ سار پر مرغانِ خوش الحان کی غزل خوانی۔ ادھر کبکِ دری کی مستانہ چال، اُدھر طوطیانِ زمردیں پر و بال۔ عاشقِ شاد، معشوقہ پر بزاد سے ہم آغوش ہے۔ نائے موسیقار ترانہ فروش۔ کہیں ساقی توبہ شکن، طاؤسِ خرام، کہیں مریدانِ پیرِ مغاں، زنداں می آشام، قاضی وواعظ تک بے دھڑک شراب قندری ہندوستان لنڈھاتے ہیں، اور یہ شعر پڑھ کر حضرتِ خضر کو راہ پر لاتے ہیں:-

عیدست و نشاط و طرب و زمزمہ عام ست
می نوش، گنہ بر من اگر بادہ حرام ست

الٰہی یہ خوشۂ انگور ہے، یا عقدِ ثریا۔ گلشن غیرتِ باغ نعیم اشجار رشکِ طوبیٰ:-

زر سرذرۂ ہر خاک ہوائے دگرست
ہاں دہان سبزۂ نوخیز مگر ظل ہماست

بہار کا جوش مضمون کے عنوان مسرت نوآئان سے نمودار ہے۔ سرخی سے عاشق سرخرو، اور معشوقِ عنبر مو کی آرزوے دلی کا برآنا آشکار ہے۔ مرزا ہمایوں فر کا سپہر آرا بیگم کو گلے لگانا۔ گو محالات کو ممکنات کر دیکھنا ہے۔ لوگ سمجھیں گے کہ یہ ایشیائی خیالات پوچ پادر ہوا، خرفات ہیں مگر یہ غلط فہمی ہے سب واقعات ہیں ناظرینِ فسانۂ آزاد کو مژدہ تازہ، اور نویدِ بے اندازہ ہو کہ شہزادۂ خاقان کلاہ، ثریا جاہ، کی دلی آرزو برآئی۔ اور عروسِ گل بدن کو خدا نے پیارے شہزادے کی صورت زیبا دکھائی:-

بار باطرافِ باغ آتش گل در گرفت — مرغ برسم مغان زمزمہ از سر گرفت
دشت بہ بیکار ہا طرح صنم خانہ ریخت — یاد بر اطراف دشت صنعت آذر گرفت

گلبن افسردہ را روح بقالب دمید
سبزۂ پژمردہ رانامہ در بر گرفت

بارِ خدایا! کیا اسرار ہے، کہ عین فصلِ خزاں میں جوش بہار ہے۔ قالب بے جان میں ازسرِ نو جان آئی، مردے نے صورت نے دکھائی۔ یہ یقین نہیں آتا اور کیونکر یقین آئے۔ حیرت سی حیرت ہے۔ مرزا ہمایوں فرہاد نے زخم کاری کھایا۔ جنازہ اٹھا۔ مقبرہ بنا۔ اب ان کا زندہ ہونا۔ یعنی چہ۔ ساری خدائی میں مشعلِ آفتاب لے کر ڈھونڈھئے، تو ایسا کوئی انسان نہ پائیے گا، جس نے مردے کو قبر سے نکلتے دیکھا ہو، یہ نیچر کے خلاف ہے۔ حسبِ عقل و حسبِ عادت۔ دونوں طرح محال، گو بعض ضعیف الاعتقاد آدمی یہ سمجھیں کہ فقیروں کی دعا سے

مردہ جی اٹھا۔ سمجھا کریں ہم کب مانتے ہیں۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ ایسے اعتقاد کو دور ہی سے سلام ہے۔ مردوں کا نئے سرے سے زندہ کر دینا بس خدائے قادر ہی کا کام ہے، خدا کی خدائی میں کوئی دخل دے سکتا ہے، اے توبہ کیا مجال کیا طاقت:۔

نوان در بلاغت مسیحاں رسید

نہ در کنہ بیچون سبحان رسید

شیشہ، پتھر پر گر کے چکنا چور ہو جائے، پھر لاکھ سر کو پٹکو ممکن نہیں کہ تمام عالم میں کوئی اس کو جوڑ سکے۔ یہ شاید ممکن بھی ہو مگر قبر شق ہو کر وہ باہر نکلے، اور زندہ ہو جائے۔

این خیال ست ومحال ست وجنوں

چمن میں سبزہ وگلاب ہزار بار مُرجھائے، اور ہزار بار نشو ونما پائے۔ دریا میں موج وگرداب بن بن کے مٹ جائے، مگر روح جب ایک بار تن سے نکلی، پھر قالب میں آنا محال ہے؛ بعدِ مرگ زندہ ہو جانا مجنونانہ خیال ہے:۔

کس نا آمد ازاں جہاں کہ پُرسم ازو

کاحوالِ مسافرانِ عالم چوں شد

اب سنیئے کہ عروسِ دلفگار سپہر آرا، روز و شب شہزادے کی یاد میں سر دُھنتی تھی؛ جوشِ جنوں سے تنکے چنتی تھی۔ تمام عالم اس کی آنکھوں میں تیرہ و تار تھا۔ تیرِ غم کلیجے کے پار تھا۔ دن کو نالہ و زاری، رات کو اختر شماری، ہر دم بے قراری رہتی تھی۔ شہزادے کی ابدی جدائی سے کروڑوں تکلیفیں سہتی تھی۔ دل ملول تھا؛ ہمجولیوں کی فہمائش اور بھی آتشِ غم پر روغن کا کام کرتی تھی؛ ہر لحظہ، وہر آن، ٹھنڈی سانسیں بھرتی تھی۔ زبانِ حال وقال سے یہی اشعار وردِ زبان تھے:۔

کیستم دل شکستہ غم زدۂ	بے دلے خستۂ ستم زدۂ
برق بے طاقتی بجان زدۂ	آتشِ غم بجانِ ماں زادۂ
از گداز نفس تباب و تبے	در بیاباں یاس تشنہ لبے
خسِ طوفانی محیطِ بلا	سر بسر گرد کاروان فنا
درد میرے جگر گداختہ	از غم دہر زہرہ باختۂ

نہ ہمیں نالہ وفغاں بلبم

من وجاں آفریں کہ جاں بلبم

ہمجولیاں لاکھ لاکھ سمجھاتی تھیں کہ بہن اب تو ہوا، وہ ہوا۔ جہاں تک ممکن ہو دل کو ڈھارس دو سمجھاؤ۔

روح افزا: سپہر آرا خدارا ایسا غضب نہ کرنا کہ ابا جان کی کمر ایک تو اس غم نے توڑ ڈالی، رہی سہی اور بھی کمر ٹوٹ جائے۔

حسن آرا: بہن یہ تو سوچو کہ دنیا میں وہ کون شخص ہے کہ جس نے کبھی غم کی صورت نہیں دیکھی۔ جس کا کوئی عزیز بھی مرا نہ ہو۔ تمہارے پڑوس ہی میں کیسے کیسے سانحے ہوئے، ابھی کل ہی کی بات ہے اخبار میں کیا پڑھا تھا کہ دولھا دُلھن کو لے کر ریل پر بیٹھا۔ شادی کو دو ہی دن گذرے تھے کہ ایک کم بخت سفاک نے دولھا کو تلوار سے شہید کیا۔ دنیا عیش کے لئے نہیں ہے؛ دنیا دارِ محن ہے اَلدُّنْیَا دَارُ الْغُرُوْرِ وَالْعُقْبٰی دَارُ السُّرُوْرِ۔

گر کار تو نیک ست بتدبیر تو نیست — ورنیز بد ست بہ تقصیر تو نیست

تسلیم و رضا پیشہ کن و شاد بزی — کیں نیک و بد جہاں تقدیر تو نیست

سپہر: باجی جان اب ہم کو زیادہ نہ چھیڑو۔

حُسن: (اشکبار ہو کر) یا خدا ہمیں اس مصیبت سے رہائی دے، اب ہم یہ غم کسی طرح نہیں سہہ سکتے۔ یا جان جائے تو خوش ہوں یا کسی طور سے یہ غم دل سے جائے، ورنہ اس زندگی سے موت ہی اچھی، جس نے ہمیں ایسی مصیبت میں ڈالا ہے۔ جس سے ایسے عاجز ہیں جس کے ہم نوحہ خواں ہیں۔

سپہر: باجی دل اب کہاں۔ دل کے عوض غم ہے:

دارم دلی اما چہ دل صد گونہ حرماں در بغل

چشمی و غم در آستیں اشکی و طوفاں در بغل

روح: یہ سچ۔ مگر دانشمندی کے یہی معنی ہیں کہ وقتِ مصیبت انسان دل کو سنبھالے۔ جس قدر تم پریشانی ظاہر کرو گی، اسی قدر گھر بھر کا دل اُداس ہو گا۔ محلے والوں کو نیند حرام ہو جائے گی۔ اپنے بیگانوں کے عیش میں خلل واقع ہو گا، ہم پر تو جو کچھ پڑی وہ پڑی۔ افتاد۔

سپہر: (زار زار رو کر) بہن خاتونِ جنت کی قسم! جو کچھ بھی میری سمجھ میں آتا ہو، کہ تم کیا کہتی کیا ہو۔ مجھ کو سمجھاتی ہو نہ کہ میں رونا چھوڑ دوں بہن:۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو

رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

میں تو خود جانتی ہوں کہ رونے سے بجز اس کے، اور کوئی نتیجہ نہیں کہ اپنی آنکھیں کھوؤں، مگر جب اپنے بس میں ہو نہ جو شے امکان سے خارج ہو، اس کو کوئی کیا کرے۔

مغلانی: حضور سارا شہر روتا ہے۔ چھوٹے بڑے سب زار زار روتے ہیں۔ اور جس وقت دولھا کی شکل یاد آتی ہے دل ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ کل مُنّے میاں کے یہاں گئی تھی۔ وہ ہیں نہیں۔ منجھلے نواب کے پوتے، ان کی بیوی نے مجھ کو محلدار سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اپنے پاس بلایا۔ میں نے آداب عرض کیا۔ بس آنسو ان کی آنکھوں سے جاری ہو گئے، اور دیر تک رویا کیں۔ بیچاری کہنے لگیں کہ اگر کوئی میرا عزیز بھی خدانہ کردہ مرجاتا تو مجھے اس قدر ملال نہ ہوتا۔ اُن کی چھوٹی بہن نے کہا جس دن برات نکلی تھی، چقوں سے دیکھتی تھی۔ واہ۔ کس شان سے مرزا ہمایوں فر بہادر گھوڑے پر بیٹھے تھے۔ ہائے شہزادے! بادشاہی خاندان میں اُن سے زیادہ ذی وقعت اور کوئی شہزادہ نہ تھا۔

حُسن آرا، نے اشارے سے مغلانی کو منع کیا کہ ایسی باتیں نہ کرو، اور سپہر آرا نے جو یہ تقریر سُنی تو ہمایوں فر کی تصویر سامنے کھنچ گئی۔

مغلانی حسب ایمائے حُسن آرا خاموش ہوئی۔ تو سپہر آرا نے کہا۔ ہاں بی مغلانی۔ پھر کیا کہا ان باتوں سے ہمارے دل کو تسکین ہوتی ہے۔

حسن: نہیں بہن۔ تسکین نہیں ہو سکتی، اور رنج بڑھ جائے گا۔ ہائے میں تم کو کس طرح سمجھاؤں کہ ہمایوں فر کو ایسا دل سے بُھلا دو مگر سمجھاؤں کس کو؟۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اُستانی جی ڈولی سے ڈیوڑھی میں اتریں، اندر آئیں، بڑی بیگم صاحب سے ملیں۔

بڑی: استانی جی اب کوئی تدبیر بتاؤ۔ سپہر آرا کا دل کیونکر بہلے؟ مجھے یقین کہ اس کی جان بچے؛ اگر یہی لیل ونہار قائم ہے، تو دیکھ لینا بیچاری جلد مر جائے گی۔

استانی: اللہ نہ کرے، خدا نہ کرے!

ع مزن فال بد کا در د حالِ بد

میں نے وہ بات سُنی کہ آپ بھی خوش ہو جائیں۔

بڑی: (آہ سرد بھر کر) اُستانی جی ہمیں امید نہیں کہ ایسی کوئی خبر سنیں۔ اُس بیچارے کا زندہ ہونا معلوم، اور بغیر اس کے لڑکی تباہ حال کا بچنا محال۔

اُستانی: آپ سُن تو لیں، پہلے میں کیا غافل تھی؛ میں کئی فقیروں، اور کئی مجذوبوں سے پوچھ چکی ہوں؛ اور سب کی رائے ہے کہ اگر سپہر آرا بیگم مرقدِ منورہ پر جائیں تو ہمایوں فر بہادر ضرور زندہ ہو جائیں۔ اب میں ایک نہ مانوں گی اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ایک بار کوشش تو کرو۔

بڑی: حُسن آرا اور خورشید دولھا کو سمجھاؤ۔

اُستانی: مہری۔ عباسی: ذری جا کے حسن آرا بیگم کو بلا لاؤ۔

مہری: بہت خوب حضور۔ کہوں گی استانی جی نے بلایا ہے۔ عباسی جا کے حُسن آرا بیگم کو بلا لائی۔ حُسن آرا بیگم استانی جی کو بندگی کر کے ادب کے ساتھ بیٹھیں؛ انھوں نے کہا کہ بیٹا تم خوب جانتی ہو، کہ میں سست اعتقاد نہیں ہوں؛ میں بے سمجھے بوجھے کوئی بات نہیں کرتی۔ میں نے دنیا کا نشیب و فراز خوب دیکھا ہے۔ تجربہ کار ہوں تمہاری بہن کے خرمنِ عیش پر بجلی گری ہے اور تباہ کر دیا۔ اللہ ساتویں دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اسی سبب سے گھر بھر روتا ہے۔ اب تمہارے ہاں سے ہنسی اور خوشی، اور آرام اور طرب، و نشاط کوچ کر گیا ہے۔ گو ابھی تک نکاح نہیں ہوا تھا۔ سپہر آرا کی شادی ہو سکتی ہے بگر اس قدر جرأت کس میں ہے، کہ اس سے شادی کا ذکر کرے۔ خیر اب سنو کہ پہلے میری بھی رائے نہ تھی کہ سپہر آرا بیگم ہمایوں فر کی قبر پر جائیں۔ میں بھی سوچتی تھی کہ یہ سب باتیں ہیں، اگر ایسا ہوتا تو فی صدی ستر آدمی مر کے زندہ ہو جاتے۔ مگر مجھ سے دو چار ایسے لوگوں نے کہا ہے کہ اب مجھے یقین آیا ہے اور میں ایک نہ مانوں گی اس بارے میں ہرگز ہرگز دخل نہ دو، اور خورشید دولھا کو میں سمجھالوں گی۔ میرا ذمہ ہے۔

حُسن: استانی جی میں تو ایسی پریشان ہوں کہ زندگی وبال ہے، آپ کو اختیار ہے مگر سپہر آرا پھر وہاں سے زندہ نہ آئے گی؛ دل تو یوں ہی نیم جان ہے۔ رہی سہی جان اس خیال کے نذر ہوگی، اور ہمایوں کا زندہ ہو جانا تو بے ادبی معاف، سوائے دیوانوں کے اور کسی کو باور نہ ہوگا۔

استانی: بیٹا تم اتنا نہیں سمجھتیں، کہ میں کوئی دیوانی ہوں۔

حُسن: ہمایوں فر کی ماں اس کو کب جائز رکھیں گی کہ ان کے لڑکے کی قبر پر خون ہو، اور ایک جان جائے۔

اُستانی: صاحبزادی میں اس وقت شہزادی بیگم ہی کے پاس سے آتی ہوں؛ وہ کہتی ہیں اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنی جان دوں گی۔ انھوں نے مجھے اسی لئے بھیجا ہے، کہ تم جا کے میری طرف سے ہاتھ جوڑو۔ خوشامد کرو۔ واسطے خدا کے سپہر آرا بیگم کو قلعہ میں لے جائیں۔ عمر بھر بندۂ احسان رہوں گی اب تم سمجھ کے جواب دو۔

حُسن: اماجان جانیں، اور آپ جانیں۔ دولھا بھائی سے بھی مشورہ کر لیجئے۔

استانی: اچھا بس اب تم جاؤ۔ ہم خورشید دولھا کو سمجھائے لیتے ہیں۔ حسن آرا بیگم رخصت ہوئیں۔ سپہر آرا بیگم نے پوچھا کیوں بلایا تھا۔ کہا کچھ نہیں؛ یوں ہی تمہارا حال پوچھتی تھیں، میں نے کہا ر دیا کرتی ہیں کسی کا کہنا نہیں مانتیں۔ افسوس کیا کہیں بیچاری نے دعا دی، کہ اللہ ان کی مصیبت دور کرے (آہ سرد)

سپہر: ہاں! یہ مصیبت جان کے ساتھ ہے۔ وائے قسمت۔

حُسن: بہن کیا کہوں کیا۔

سپہر : یہ مجھ سے پوچھتی ہو۔

اس فقرے پر حسن آرا، اور روح افزا بے اختیار رو دیں۔ اور سپہر آرا نے گردن نیچی کر لی۔ مغلانی نے آہستہ آہستہ سمجھایا۔ کہ اگر آپ دونوں ان کے سامنے اس طرح روئیں گی تو ان کا کیا حال ہو گا۔ ان کو سمجھانا چاہیئے یا ان کے سامنے رونا چاہیئے۔ مہری جا کے پانی لائی دونوں نے منہ دھویا۔

استانی جی نے نواب صاحب کو بلوایا، اور بڑی بیگم کے سامنے ان کو سمجھایا، انھوں نے کہا اگر اس بیر سے نقشِ مراد کرسی نشین، اور تیرِ دعا، بہدفِ اجابت قریں ہو، تو فَھُوَ المُرَاد چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ مگر قیاس اس کا مقتضی نہیں آیندہ اختیار۔ بدستِ مختار، اور ہاں خوب یاد آیا یہاں سے تو سپہر آرا اس آرزو میں جائیں گی۔ وہاں سے ناکام و نامراد آئیں گی۔ تو اس کی زندگی کا خدا ہی حافظ ہے۔

استانی : اوّل تو یہ آپ نے بے سمجھے، اور بلا ثبوت کہہ دیا کہ (ناکام و نامراد آئیں گی) اب میں کہتی ہوں کہ ہر گز ہر گز ناکام و نامراد نہ آئیں گی۔ اور یہ کیا فرض ہے کہ سپہر آرا سے صاف صاف کہہ دیا جائے۔

ن : بھلا کوئی بات بھی ہے۔ کیا وہ دودھ پیتی ہیں۔ صاف سمجھ جائیں گی، کہ ہمایوں فر کی قبر ہے۔ عجب نہیں کہ قبر کے دیکھتے ہی خدانخواستہ، جان نکل جائے۔ اگر بچ بھی گئی تو اس صدمے سے زندگی اس سے دو چند زیادہ تلخ ہو جائے گی۔ خوب سوچ لیجئے۔

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں و کار آساں کن

استانی : میں سپہر آرا کو سمجھا دوں گی۔ بس! میں کہدوں گی کہ ایک دن کے لئے اس مبرور کی قبر پر چلی چلو اس سے مُردے کی روح خوش ہوتی ہے۔

ن : اچھا پھر اگر آپ کو اصرار ہے تو کیا مضائقہ! خدا کے لئے یہ نہ کہیئے گا کہ تمہارے چلنے سے ہمایوں فر زندہ ہو جائیں گے۔ اللہ ایسا نہ کہہ دینا۔ استانی جی اٹھ کر سپہر آرا کے پاس آئیں۔ سپہر آرا نے حسرت سے ان کی طرف دیکھا، اور گردن نیچی کر کے رونے لگیں۔ استانی جی نے پیشانی نورانی کا بوسہ لیا۔ اور کہا بیٹی خدا بہت جلد تمہاری مصیبت کو دور کرے گا مگر اتنا بتاؤ کہ کل یا پرسوں نرسوں تم نے کوئی خواب بھی دیکھا تھا یا نہیں۔ سپہر آرا نے آنسو پوچھ کر آہستہ سے جی ہاں پرسوں شب کو خواب دیکھا تھا کہ شہزادہ مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ جب میں شہزادے کے قریب گئی، تو ان کی زبان سے سُنا :

پس از کشتن بخوابم دید نازم بدگمانی را
بخود پیچید کہ ہے ہے وی غلط کردم فلانی را

یہ شعر پڑھ کر سپہر آرا کو غش آگیا، اور دھم سے گر پڑی، اُستانی جی نے اپنے زانو پر ان کا سر رکھا۔ مغلانیاں، مہریاں خواصین، دوڑ آئیں۔ لخلخہ و گلاب، عطر و عنبر لائیں۔ کوئی مٹی کو پانی سے تر کر کے ناک کے پاس لے جاتی تھی۔ کوئی عطر سونگھاتی تھی، تھوڑی دیر میں ہوش آیا۔ آنکھیں کھول دیں اور آنکھیں کھولتے ہی یہ شعر پڑھا:

پس از کشتن بخوابم دید نازم بدگمانی را

بخود پیچد کہ ہے ہے وی غلط کردم فلانی را

سپہر: استانی جی۔ اتنی حسرت رہ گئی کہ اس کا جواب دینے نہ پائی۔ (پس از کشتن) یہ تہمت! مگر کس سے کہوں خیر۔

بدم گفتی و خرسندم، عفاک اللہ نکو گفتی

جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعل شکر خارا

وہی دولھا کے کپڑے پہنے تھے۔ ہائے۔ لوگو کسی طرح مجھے اس کشتۂ ناز و ادا کی صورت تو دکھا دو۔

استانی۔ بیٹا۔ ہمارا کہنا مانو تو پھر دیکھو لطف، یہ سب رنج و غم دور ہو جائے چٹکیوں میں سب درد دکھ جاتا رہے، مگر جب مانو بھی۔ اگر کوئی رنجیدہ آدمی کوئی بات کہے تو اس کو ضرور ماننا چاہیئے۔

سپہر: اچھا اس کا جواب تو دیجئے کہ اس طعنے کا جواب کیا دوں:

پس از کشتن بخوابم دید نازم بدگمانی را

بخود پیچد کہ ہے ہے وی غلط کردم فلانی را

اُستانی: پھر وہی بات۔ کیا اتنا بھی نہ سمجھیں یہ طعنہ نہیں ہے جبھی کہتی ہوں کہ:

ذی لیاقت ہزار ہو بابا

ابھی ناکردہ کار ہو بابا

یہ چھیڑ چھاڑ ہے۔ ہائے اتنا بھی نہ سمجھیں۔

سپہر: (خوش ہو کر) کیا۔

اُستانی: اب یہ بتاؤ کہ دو چار روز ہماری رائے پر چلو گی یا نہیں، اگر ہمارا کہنا مانو تو خیر، ورنہ بیکار ہے۔

سپہر: ایک بات کے سوا اور سب مان لیں گے۔ بس یہ نہ مانوں گی کہ ضبط گریہ کر دن۔ یہ میرے بس میں بھی نہیں ہے۔ اور جو فرمایئے۔

اُستانی: اچھا مانا۔ خوب رو لو۔ جس میں دل کا بخار چھٹ جائے۔

سپہر: یوں نہیں جب دل بھر آتا ہے، تو آنسو امنڈنے لگتے ہیں۔ ع

اے وا دلِ من اے وا دلِ من

استانی جی نے تھوڑی دیر تک سپہر آرا سے تخلیئے میں ایسی باتیں کیں۔ جس سے سپہر آرا بیگم کو کسی قدر تشفی ہوئی۔ اُستانی جی نے کہا بیٹا وہ تدبیر سُوجی کہ تمہاری دل کی تمنا بر آئے۔ اگر خدا نے چاہا تو میں سرخرو ہوں گی۔

اس کا ہے کون جس کی مدد پر خدا نہ ہو

ڈوبے وہ ناؤ جس کا خدا ناخدا نہ ہو

تم میری خاطر سے دو چار روز میری ہی رائے پر چلو۔ پھر تم خود دیکھ لوگی کہ کیا بات حاصل ہوتی ہے؛ اور رونے کو جا ہے جس قدر روؤ، میں منع نہیں کرتی۔ تم کو اختیار ہے۔ میں چار روز تک یہاں سے کہیں نہ جاؤں گی؛ ہاں ایک صلاح اور دیتی ہوں، ذرا دل کو مضبوط کرو، تو کہوں؛ صبح کے وقت باغ سے پھول توڑو، اور اپنے ہاتھ سے توڑے ہوئے پھول، ہمایوں فر کی قبر پر چڑھاؤ؛ اتنا کہنا مانو، ادھر کلی چٹکے اُدھر پھول توڑو۔ اور قبر پر چُن دو، یا ہار بنا کے ادھر رکھ دو، تاکہ تمہارے ہاتھ کے پھولوں سے اس بے گناہ مقتول کی تربت معطر رہے۔ بڑی بیگم نے بفحوائے قہر درویش بر جان درویش سپہر آرا کا مقبرے پر جانا منظور کیا۔ اور کیا کرتیں مرتا کیا نہ کرتا۔ نواب صاحب کو بھی کہتے ہی بن پڑی کہ اچھا اگر استانی جی اس بات کی ذمہ دار ہیں تو بسم اللہ۔ حسن آرا بیگم کی ایک نہ چلی۔ تاہم سب نے اتفاق رائے کر لیا۔ کہ یہ حسرت بھی باقی نہ رہ جائے۔ استانی جی کی دوراندیشی اور حکمت علی کا کیا کہنا۔ سوچیں کہ دفعتًا اس خیال سے سپہر آرا کو قبر پرسے جانا کہ ہمایوں فرزندہ ہو جائیں گے، خلافِ مصلحت ہے۔ گو ان کو یقین واثق تھا کہ ایسا ہی ہوگا؛ مگر خیال کیا کہ سائیں کے سو کھیل۔ خدا جانے کیا اتفاق ہو؛ لہٰذا دوسرے دن صبح کو سپہر آرا بیگم کو پالکی گاڑی پر بٹھا کر قلعہ معلیٰ لے گئیں۔ حسن آرا بیگم اور روح افزا اور دو مغلانیاں اور ایک مہری ہمراہ تھی؛ جب گاڑی قلعہ معلیٰ میں داخل ہوئی، تو پردہ کرایا گیا۔ سپہر آرا بیگم باغ فرح بخش میں گئیں؛ تو دل بھر آیا۔ گو صبح کا سُہانا سماں، اور ہر برگ و بار نور افشاں، مگر مفارقتِ یارِ جانی دل پر نشتر کا کام کرتی تھی۔ نالہ وزاری کبھی آہ سرد بھرتی تھی:

بہوئیت صبح دم گریان چو شبنم در چمن رفتم

نہادم روی بر روتے گل واز خویشتن رفتم

اُستانی: بیٹی۔ چنبیلی کی بھی کتنی نازک بوباس ہوتی ہے۔

سپہر: دل کی کلی نہ کھلی نہ کھلی۔

صد غنچہ بشگفت اِلّا دلِ من

ای وا دلِ من ای وا دلِ من

استانی: صبح کا سماں۔ بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے؛ اس سے دماغ کو تازگی پہونچتی ہے۔ سامنے کے تختے میں

کیسے کیسے گل شاداب کھلے ہیں۔ ان سے آنکھوں کو تازگی حاصل ہوگی۔

سپہر: اور جو عاشق پری منظورِ نظر، آنکھوں کے نور کے ساتھ دشمنی کر گیا ہو۔ مانا کہ گل شاداب ہیں۔ چمن سرسبز و سیراب ہیں۔ کہیں ریحان ہے، کہیں ضیمران، مگر:

خوش ست سرد ولیکن دلِ فراغ کجاست

دل از گلی کہ تسلی شود بباغ کجاست

کسی کی ہوا اس وقت کشاں کشاں باغ میں لائی۔ مگر بجز اس کے کہ داغ کہن نئے ہوئے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا:

چوں موکشاں بگلشنم آرد ہوائے تو

در پائے گلبن افتم و میرم بپائے تو

استانی: پھول توڑو۔ دیکھو اس وقت تم کو تسلی ہوگی۔ جب اپنے ہاتھوں سے اس کشتۂ ناز کی قبر پر پھول چڑھاؤ گی۔

سپہر: استانی جی مجھے خدا جانے اس وقت کیا کیا یاد آتا ہے۔ مگر دل ہی دل میں روتی ہوں۔ ہائے مجھ سے وعدہ تھا کہ نکاح کے بعد دو ہفتے تک باغ میں رہیں گے، اور وہاں بمسرت وطرب زندگی کے لطف اٹھائیں گے مگر ہیچ۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

حُسن: بہن۔ جہاں تک ہو سکے، اِن باتوں کو دل سے بھلاؤ۔

سپہر: کیا دل لگی ہے، ان باتوں کی یاد جان کے ساتھ ہے۔ ان کا مٹنا میری جان کی فنا پر موقوف ہے۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی دل سے یاد نہ جائے گی:

مرے تو نشۂ الفت اتر گیا عاشق

وہ کیا شراب تھی جس کا خمار تک نہ رہا

عاشقوں کا دل بعد مرگ بھی مضطر رہتا ہے:

دلِ عاشق نمی گیرد تسلی بعد مُردن ہم

شود گر کشتہ ایں سیماب بے آرام می باشد

روح: اللہ کسی کو یہ دن نہ دکھائے!

مغلانی: بیگم صاحب سارا شہر روتا ہے۔ چھوٹے بڑے سب۔

اُستانی: اب تھوڑی دیر میں آفتاب کی کرن پھوٹے گی۔ سویرے سویرے پھول توڑ لو، تو اچھا ہے۔

سپہر آرا نے اپنے نازک نازک ہاتھوں سے پھول توڑے۔ اور دوپٹے میں رکھ کر سب کے ساتھ مرقدِ منوّر کی طرف بحسرت چلی، اور یہ کلمات زبان پر لائی۔ لوگو یہ اندھیر دیکھو! دُلہن دولہا کی قبر پر پھول لیئے جاتی ہے۔ کون دُلہن!۔ وہ دلہن جس نے دولہا کی صورت بھی اچھی طرح نہیں دیکھی تھی۔ وہ دُلہن بنی ہی نہ تھی۔ کہ بیوہ ہو گئی۔ وہ ناکام، نامراد دلہن جس کی دل کی کلی کھلنے ہی کو تھی، کہ صرصر کے جھونکوں نے اس کو مرجھا دیا:

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بے کھلے مرجھا گئے

اتنے میں باغبان آیا۔ جھک کر آداب بجا لایا۔ اور کئی ہار بدھیاں طوق سب پھولوں کے بنے ہوئے ایک طشتری میں رکھ کر سپہر آرا بیگم کو دیئے، اور ادب کے ساتھ ایک روش میں گردن جھکا کر کھڑا ہوا۔ سپہر آرا کے ادھر اُدھر ان کی دونوں بہنیں تھیں، پیچھے پیچھے مغلانیاں، اور مہری اور ایک طرف استانی جی۔ جریب ٹیکتی ہوئی جاتی تھیں۔ جب مرقدِ مطہر کے قریب پہنچیں، تو سپہر آرا کے دل کا عجب حال ہوا۔ جس کا بیان حیطۂ تحریر سے خارج ہے، اشکِ پریشاں، گل رخسار انور قطرہائے شبنم کی طرح چھلکنے لگے۔ مگر انھوں نے بہت ضبط کیا اور آنسو پونچھ کر آگے بڑھیں۔ اُستانی جی نے دعا دی:۔

گزیں خاک ریحان و سنبل دمد

دگرگونہ گوں لالہ و گل دمد

دفعتاً سپہر آرا کی نظر قبر پر پڑی، تو دیکھا کہ وصلی خوش خط منشی شمس الدین صاحب اعجاز رقم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وسط میں رکھی ہوئی ہے۔ طشتری رکھ کر وصلی کو اٹھایا۔ پڑھا تو بشاش ہو گئی۔

سپہر: استانی جی یہ تو فالِ نیک ہے۔ وصلی مژدۂ وصل دیتی ہے۔ یا خبرِ وصال۔ اگر وصال ہو تو فہو المراد۔ اور اگر وصل ہو تو دل ماشاد۔

اُستانی: اس میں کیا لکھا ہے۔ بیٹا میں پڑھ سکتی ہوں۔

سپہر: میں خود پڑھ کر سنا دوں۔ سنیئے:۔

بیا بباغ و نقاب از رخِ چمن برکش — دل عدو نہ اگر خون شود درآ بر کش

سخن بجیب فنا از نوائے مطرب ریز — تتق بروئے ہوا از بخور مجمر کش

نشاط و زور و گہر پاش شادمانی کن

جہان ستان و قلم نہ وکشائے و لشکر کش

اُستانی جی نے وصلی لے کر چوم لی، اور کہا فتح ہے۔ ادھر ان کی زبان سے فتح فتح کی آواز نکلی، اُدھر مغلانیوں نے

(آمین۔ آمین)، کی صدا بلند کی۔ حُسن آرا اور روح افزا نے وصلی کو بغور دیکھا۔ ادھر سپہر آرا نے قبر کی طرف خطاب کرکے یہ اشعار پڑھے:

ای رہ نوردِ عالم بالا چگونہٗ
ما بے در منیم تو بے ما چگونہٗ

از سایہ در غم تو سیہ پوش شد ہما
اے خفتہ در نشیمن عنقا چگونہٗ

زان پس کہ یا تو آب و ہوائے جہان ساخت
در روضۂ جہاں بتماشا چگونہٗ

بے مُطرب و ندیم و کنیزان ماہ روی
بے باغ و قلعہ و لبِ دریا چگونہٗ

اے بعد مرگ راتبہ خوار تو عالمی
پروانۂ چراغ مزارِ تو عالمی

اے شہزادۂ فرخ نہاد، و عالی نژاد، کجا وہ جلوس شاہانہ کجا یہ خاک کا کاشانہ۔ اتنی جوانی ہی میں داغ حسرت دے گئے:

داغم ز روز گار کہ شہزادۂ برنخورد
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری

سب سے بڑھ کر حسرت تو یہ ہے کہ قبر میں اکیلے ہیں۔ اور تنہائی کے عادی نہیں۔ ہائے ہائے کیسے بے چین ہوں گے۔ مصاحب نہ رفیق، خویش نہ یگانہ، اپنا نہ بیگانہ، بڑی الجھن ہوتی ہوگی۔ جس شخص کو صبح و شام، دن رات، ہزاروں آدمیوں میں بیٹھنے کی عادت ہو۔ اس کو دفعتاً یہ تنہائی ضرور کھلے گی۔

اتنے میں قبر کے کونے سے ایک پیر مرد نود سالہ نمودار ہوا۔ ریشِ مبارک بگلے کے پر کی سی سفید، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، گالوں پر جھریاں، آنکھیں گڑھے میں دھنسی ہوئیں۔ مگر با ینہمہ پیرانہ سالی، نور اور تقدس چہرہ سے نمودار تھا۔ سپہر آرا اور حسن آرا اور روح افزا، اور مغلانیاں، اور مہری ان سب کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ حسن آرا کو حیرت تھی کہ یا اللہ قبر کے کونے سے یہ کیونکر نکلا، اور باقی سب کو شک کی جگہ یقین تھا کہ کوئی فرشتہ ہے، مگر استانی جی کے چہرے سے حیرت یا گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی فوراً:

پیر بر آورد سر از جیبِ ناز
گشت بدلداری شان نکتہ ساز

مژدۂ صبح طرب آورد و گفت
رنگ تبسم بلب آورد و گفت

کاے زدگان ستمِ روزگار
آہستہ رحمتِ پروردگار

شاد شوند از غم دلدار ہند
دل شدگان داد ہوشہا دہند

رحمتِ حق آہستہ دار شما ست
وقت پذیرفتن یک یک دعا ست

از غم گردوں بہ پناہید تا ن

ہر چہ بخواہید بخواہید تا ن

سپہر: اے پیرِ مرد، ملکوتی صفات، برگزیدہ کائنات، ہم کم سنیں اول تو خائف ہوئیں کہ یہ کون ہیں اور گوشۂ قبر سے کیونکر آئے، مگر پھر ہمارا شک دور ہوگیا۔ ہمیں پورا پورا یقین ہے، کہ آپ فرشتے ہیں۔ صرف دو سوالوں کا جواب چاہتی ہوں، اور بس۔

۱۔ میری ایسی مصیبت زدہ بھی کبھی دیکھی ہے۔ ع

دوشیزۂ کہ بیوہ کنندش بدختر

ہائے ہائے۔ ستم! ستم!۔

اب اس زخم کے لئے کوئی مرہم کارگر ہے یا نہیں؟

پیر مرد: میں چاہتا ہوں کہ رنگین بیانی کے ساتھ تیرے سوالوں کا جواب دوں؛ اس وقت بحرِ طبع جوش زن ہے۔

کس قدر مغرور کرتا ہے مرا فیضِ زبان
خامہ بل کرنے لگا مثلِ مزاجِ نوجوان

گھورتی ہے زلفِ مضموں شکلِ افعی بار بار
پوچھتی ہے کون دیکھے گا مرا حسنِ نہاں

فکر کہتی ہے خیالِ پاک دامن کی قسم
مس کرے مجھ کو تصور یہ مجال اس کی کہاں

مرحبا اے جوشِ صادق ہو کوئی دم آشنا
جذبۂ اے شوق تو بہر خدا ہو مہرباں

شوخیاں دکھلا رہی ہے فکرِ رنگیں کی بہار
کثرتِ گلہائے مضموں سے ہے سینہ بوستاں

سپہر: اے پیر مرد ملکوتی صفات، مجھ بختوں جلی، غم زدہ کو اس وقت رنگین بیانی، اور شیوا زبانی نہیں بھاتی ہے۔ صاف صاف، اور راست راست، بلا کم و کاست، بتا دیجئے کہ اب کوئی علاج ہے یا نہیں؛ اگر درد لادوا ہے تو خیر، رو پیٹ کے بیٹھ رہوں۔ اگر علاج پذیر ہے، تو کوشش کروں۔ بس اور کچھ نہیں چاہتی۔

پیر مرد: دنیا میں کوئی درد لادوا نہیں ہے:

ہر چیز کہ دل بداں گراید
گر جہد کنی بدستت آید

مگر السعی منّی والاتمام من اللہ[1]

---

[1] کوشش کرنا میرا کام اور کامیاب کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

اے دُخترِ گلفام، دلارام، گو تیری مصیبت اور شاہزادے کے قتل کا سانحہ بھی ایسا سخت و جانگزا ہے، کہ سنگدلوں تک کے دِل موم ہو جائیں۔ شقی القلب آدمی بھی اس حادثۂ روح فرسا کا حال سن کر ساون بھادوں کی طرح اشکوں کے تار باندھ دیں۔ مگر دنیا میں اس سے بڑھ کر سانحے ہوئے ہیں؛ چنانچہ بطورِ مشتے از خروارے، قطرہ از بحر ناپیدا کنار، چند مثالیں دیتا ہوں۔

گوشِ دل سے سنو، ایک شہر مینو سواد، اور رُوکشِ بہشت شداد میں ایک شاہِ ذی جاہ، دارا دربان، فلک بارگاہ، کمال عدل و انصاف کے ساتھ حکمراں تھا۔ اس خدیو سکندر مرتبت، کی دخترِ پری پیکر کا بلقیس منزلت نام تھا۔ حسنِ یوسف، جمال مبین کا ادنی غلام تھا:

اگر دیدی رُخ آن حورِ پیکر
خلیلِ بت شکن می گشت آذر

ساری خدائی کے شہزادگانِ کج کلاہ، اس کے حسنِ خدا ساز، اور ناز و انداز کی توصیف سن کر عاشقِ زار تھے۔ نکاح کے لئے دل و جان سے تیار تھے۔

صدہا والیانِ مُلک، تاج و تخت کو چھوڑ کر حکمرانی و بادشاہی سے منہ موڑ کر، دید کے مشتاق تھے۔ ہزاروں بندۂ درم ناخریدہ، لاکھوں عشاق تھے۔ سب آرزومند کہ اس گلِ گلزارِ خوبی، و غنچۂ شاخسارِ محبوبی کے بُلبل ہوں، عقدِ نکاح میں لائیں۔ دل کی حسرت نکالیں۔ لطف اٹھائیں؛ اس بُتِ سفاک نے سب کو ناوکِ نگاہ سے گھائل کیا۔ سب کو اپنی طرف مائل کیا۔ لیکن فرطِ غرور سے کسی کو خلوت یا جلوت میں بار نہ دیا۔ سب نخچیرِ تیرِ الم تھے:

غرورِ حُسن اجازت مگر نداد اے گل
کہ پرسشی نکنی عندلیب شیدا را

ایک روز مرغانِ خوش الحان کی نازک آواز اور بادِ نوروزی کی غالیہ سازی نے صبح دم اس حور وش کو خواب ناز سے بیدار کیا۔ بستر سے بصد نزاکت اٹھی:

جاگی مُرغِ سحر کے غُل سے
اٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

دیکھا کہ شاخِ گل پر عنادل کا ہجوم ہے۔ چمن میں مرغانِ خوش نوا کی دھوم ہے۔ ہر سر پر صَلصَل بیشمار۔ ع

بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

عنادل کی زمزمہ سنجی نے ایسا مست و مسرور کیا، کہ جھومتی ہوئی بستر سے چلی، خواصوں سے پوچھا، یہ بُلبُلیں کیوں متوالی ہو رہی ہیں؛ کیا ان کی مستی اور جنون پرستی کے یہی دن ہیں۔ ایک بیباک و آزمودہ کار نوجوان،

خواص نے کہا۔ حضور اگر جان بخشی ہو تو لونڈی عرض کرے، مگر خوف معلوم ہوتا ہے، کہ مُبادا جواب ناگوار طبع نازک ہو۔ شہزادی نے درخواست منظور کی۔ خواص نے تین بار قول کیا۔ اور یوں جواب دیا۔

قربان جاؤں لونڈی نے ہر قسم کی صحبت۔ سینکڑوں کنوؤں کا پانی پیا ہے۔ حسن و عشق کے امور سے واقف ہوں، ایک بھدیسل ہے، کہ جس کے گھر میں بیر کا درخت ہوگا، وہاں ڈھیلے ضرور آئیں گے۔ حضور حُسن خدا کی امانت ہے۔ حسن کے ساتھ رحم دلی بھی چاہیئے۔ گل بے وفا ہیں۔ بلبل بے چاری فصل بہار میں سر پٹکا کرتی ہے، وفورِ غم سے نوحہ خواں ہے۔ جوشِ جنوں سے تنکے چنتی ہے۔ سر دھنتی ہے۔ مگر گوشِ گل تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ ایسا ہی انسان کا بھی حال ہے۔

شہزادی سمجھ گئی، کہ میری طرف اس خواص نے خطاب کیا۔ فوراً حکم دیا کہ آج شہر میں منادی کردو، کہ جو جو شہزادے میرے عاشق زار ہیں۔ وہ اس شہر سے نکل جائیں، ورنہ کل صبح کو بے رحم جلادوں کے ہاتھ سے مقتول ہوں گے۔ یہ خبر پاتے ہی نام کے عاشق، شہوت کے بندے، ہوا ہوس کے پتلے، شہر بدر ہو گئے۔ مگر ایک عاشق صادق جو شہزادۂ عالم و عالمیان تھا۔ اس خبر سے خوش ہوا۔ لوگوں سے پوچھا یارو اگر آج نہ گئے تو کل قتل ہوں گے۔ مگر قاتل کون ہے۔ جلاد کی کیا تاب و طاقت، کہ شہزادوں پر ہاتھ اٹھائے۔ ان کی گردن پر تلوار چلائے۔ ہاں اگر وہ بتِ سفاک قتل کرے، تو گردن حاضر ہے۔ لوگوں نے کہا میاں شہزادگی وزیر زادگی، سب رکھی رہے گی۔ کہیں کسی اور خیال میں نہ رہنا۔ کل صبح کو گردن ماری جائے گی دیدار جاناں نصیب امر محال ہے۔ شہزادہ کھِل کھِلا کر ہنسا، اور ایک کاغذ پر ایک شعر لکھ کر اس نے اہلِ شہر کی خوشامد کی۔ خدارا شہزادی تک کوئی یہ پرچہ پہنچا دے۔ ایک دل لگی باز مسخرے نے جو شہزادی کی ڈیوڑھی پر مقرر تھا، کاغذ لے لیا، اور اس خواص سلیقہ شعار کو دے کر کہا۔ کہ حضور کی خدمت میں پیش کردو۔ کہنا ایک دیوانہ نے دیا ہے۔ خواص نے وہ کاغذ اپنے پاس رکھا۔ جب دیکھا کہ شہزادی کا مزاج بحال ہے، تو وہ کاغذ پیش کر کے عرض کی۔ حضور یہ پرچہ شہر میں کسی دیوانے نے لکھ کر حضور کی خدمت میں ملاحظے کے لئے پیش کیا ہے، اگر مرضی مبارک ہو تو بسم اللہ، ملاحظہ فرمائیے۔

شہزادی نے وہ پرچہ لیا اور پڑھا تو یہ شعر لکھا تھا:

شاد باش ای دل کہ فردا روز بازارِ جزا

مژدۂ قتل ست گرچہ وعدۂ دیدار نیست

شہزادی پڑھ کر کمال مسرور و محظوظ ہوئی، حکم دیا کہ اس دیوانے کو حاضر کرو۔ اسی دَم شہزادہ حاضر کیا گیا۔

شہزادی: دیوانے۔ تیرا کہاں مکان ہے۔

شہزادہ: بالفعل تو بے خانما ہوں۔

شہزادی: کہیں جگہ ملے تو رہے یا نہ رہے۔
شہزادہ: ہاں ایسی بانوے جہاں کے دل میں جگہ ملے تو کیوں نہ رہوں۔
شہزادی: مگر دیوانے، سڑی سودائی خبطی کا کون ٹھکانا۔
شہزادہ: سُنا نہیں: ؎

دیوانہ بکار خویش ہشیار

شہزادی: باتوں سے تاڑ گئی کہ شاہزادہ عالی تبار اور عاشق زار ہے۔ ترچھی چتون کر کے بصد ناز پوچھا:

کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے
ہے کون سا گل چمن کدھر ہے

شہزادے نے ٹھنڈی سانس بھر کر یوں جواب دیا:

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں — غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام — کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام

خواصیں بھی بخوبی سمجھ گئیں، کہ کسی بڑی سلطنت کا صاحبِ تاج ہے۔ مگر عشق نے خانما خراب کر دیا۔

الغرض شہزادی زہرہ تمثال کو اُس جادو جمال نے لبھایا۔ عقد کا وعدہ ہوا، اور شہزادہ شب کو وہیں رہا۔ مقربانِ سلطانی نے حضورِ شاہ کی خدمت میں اطلاع دی، جہاں پناہ ایک بات ضروری عرض کرنی ہے۔ مگر کہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے۔ شہزادی کے محلِ معلیٰ میں ایک اجنبی کا گذر ہوا، اور وہ ابھی تک وہیں ہے۔ اگر باور نہ آئے تو حضور خود بنفس نفیس چل کر دیکھ لیں۔ چنانچہ بادشاہ نے بے خبری میں جا کر دیکھا، تو خبر سچ نکلی۔ فوراً حکم دیا کہ یہ شخص قتل کیا جائے۔ اور شہزادی کی اس پر جان جاتی تھی۔ قدموں پر گر پڑی۔ کہ واسطے خدا کے اس کو قتل نہ کرو، اس کا دامن لوثِ عصیاں سے پاک ہے۔ مگر بادشاہ نے ایک نہ سُنی۔ وہ بے گناہ قتل کیا گیا تو اس کا سر شہزادی کے پاس بھجوایا۔ ہے ہے۔ اس سفاکی پر خدا کی مار، وہ بیچاری پاک دامن تمام عمر کے لئے سختی کے ساتھ قید کی گئی۔

اس سے بڑھ کر ایک واقعہ جگر دوز سُناؤں، ایک راجپوت بڑا کرارا جوان، اور نامی پہلوان آزمودہ کار سپاہی اور جیوٹ کا آدمی تھا۔ ایک شب کو ڈاکوؤں نے اس کا گھر جو ایک گاؤں میں تھا، گھیر لیا، دروازہ توڑ ڈالا اندر گھس آئے۔ اس کی جورو نے بڑی خوشامد کی۔ کہ ان ڈاکوؤں سے نہ بھڑو، مگر چھتری آدمی تلوار کے منہ مرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ اس نے ایک نہ مانی۔ اور غضب یہ کہ اس کی بیوی کو وضع حمل ہوئے دو ہی روز ہوئے تھے۔ راجپوت نے ڈاکوؤں کا خوب مقابلہ کیا۔ مگر وہ تیس یہ اکیلا۔ آخر کار زخمی ہو کر تیورا کے گرا۔ اس کی بیوی اپنے

ننھے سے بچے کو گود سے لگائے ہوئے زار زار رو رہی تھی۔ زخم ایسا کاری لگا کہ راجپوت اسی وقت راہی ملک بقا ہوا۔ ڈاکوؤں نے بکمال سفاکی و بزدلی' عورت بے چاری پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ عورت گری تو میاں کی نعش بے کفن کے قریب۔ اس وقت اس مصیبت زدہ کے کیا خیالات ہوں گے۔ شوہر مردہ پڑا ہے۔ دو دن کا لڑکا گود میں اور خود شوہر کی لاش کے پہلو بہ پہلو سسک رہی تھی' اس معصوم بچے کی بے کسی پر حسرت سے نظر ڈالتی تھی۔ کہ ہائے اب اس کا کون ہے۔ باپ مردہ پڑا ہے۔ ماں نزع کی حالت میں۔ گھر میں تیسرا آدمی نہیں۔ کہ اس دو دن کے بچے کی خبر لے۔ وائے افسوس۔ ہے ہے !!! اس روایت نے سب کو بدرجہ اتم ملول کر دیا۔ پیر مرد نے کہا۔ بس تھوڑی دیر میں وہ عورت بھی بلک بلک کر مر گئی۔ مرتے دم تک کبھی بچے کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی شوہر کی لاش کی طرف اُف اُف :

ایک دن آخر کو سب اُٹھ جائیں گے	کچھ نہ نیک و بد سوا لے جائیں گے
کیا ہوئے وہ بادشاہ نامور	کیا ہوئے وہ اہلِ جاہ و اہلِ زر
کیا ہوا اسکندرِ صاحب قِراں	کیا ہوا جمشید دارائے جہاں
کیا ہوئے یوسفؑ عزیزِ دو جہاں	کیا ہوئے یعقوبؑ پیرِ ناتواں

چھوڑنا دنیا کا اِک دن ہے ضرور
چار دن کو رنج ہو یا ہو سرور

یہ کہہ کر اُس پیر مرد نے استانی جی سے مصافحہ کیا؛ سپہر آرا کا ہاتھ لے کر اس پیرزن خوش سیرت کے سپرد کیا؛ اور رخصت ہوا۔

اُستانی: بیٹا ذری آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے بند کر لو۔

حسن: استانی جی یہ کون تھے۔ فرشتے ہیں نہ۔

روح: چاہے تم کو یقین نہ آئے مگر ہم تو ان کو فرشتے سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ چہرہ نورانی۔ باتیں حقانی خدا ترس۔

سپہر: وہ فرشتے ہوں یا انسان۔ مگر میرے لئے تو ان کی تقریر نے مرہمِ زخم جگر کا کام کیا۔ افسوس ہے کہ اس قدر جلد چلے گئے۔

مغلانی: کیسی تول تول کے باتیں کرتے تھے۔ کہ واہ جی واہ۔

دوسری: جب ہماری سپہر آرا بیگم کے دل کو تشفی ہوئی تو فرشتے سے بھی بڑھ کر تھے۔ دیکھا کیا جلال چہرہ سے برستا تھا۔ اُفوہ۔

مہری: جلالُ تو جلالُ اور دُرعابُ کیسا ہے) سپہر آرا نے پھول ہاتھ میں لئے، اور قبر کو کئی بار بوسہ دے کر

کہا، باجی جان میں اس کو متبرک سمجھ کر بوسہ نہیں دیتی ہوں۔ یہ تو پتھر ہے، مگر میں نے اس سبب سے پوچھا، کہ رنج وغم کا بھاری پتھر مجھ سے نہ اُٹھ سکا؛ پھر یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے پیارے شہزادہ بہادر کی قبر ہے۔ میں اس کو پھولوں سے بساؤں گی، اور عطر و گلاب کے قرابے کے قرابے اس پر لنڈھاؤں گی اور خوب روؤں گی:

فوارہ دار اشک زفرقم جہد مگر
گم کردہ راہ چشم بہ شبہا گریستن

یہ کہہ کر پھولوں اور پھولوں کے ہار سے قبر کو رشکِ گلستان کر دیا۔ اور ان اشعارِ حسرت یار کو ترجمانِ دل بنایا:

شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را	در بزمِ عیش نوحہ سرا کرد روزگار
شاخی کہ بود موسم آتش کہ بردہد	از نخل عمر شاہ جدا کرد روزگار
مرگ ایں چنیں تن و رخ نازک نمی بود	کام اجل بہ عہد یہ روا کرد روزگار
شہزادہ خورد سال بدورِ وزگار پیر	شوخی بشاہزادہ چرا کرد روزگار
فرزندِ بادشہ نشاسد معانقہ	آغوشِ گور بھرچہ وا کرد روزگار

آں سرد سایہ دار کہ بارش نبود کو
واں نو گل شگفتہ کہ خارش نبود کو

سپہر آرا نے اس کے بعد کہا۔ اُستانی جی چو طرفہ سناٹا ہی سناٹا نظر آتا ہے۔ عالم ہو ہے۔ اُداسی ہی اداسی چھائی ہے۔ اس کے بعد کہا کہ آج ہم کھانا بھی یہیں کھائیں گے۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ تھوڑی دیر اور شہزادے کی قبر کو دیکھ لیں۔ گو وہ بیچارہ تہ خاک ہے، مگر اس کی خاک سے بھی ویسی ہی اُلفت ہے جیسے اس سے تھی۔ استانی جی نے حکم دیا کہ ایک آدمی فوراً گھر پر بھیجا جائے، ہم سب کے واسطے کھانا لائے۔ حکم پاتے ہی آدمی روانہ ہوا، اور ادھر اُستانی جی سپہر آرا کے دل کو تسلی دینے لگیں۔

استانی: دیکھ لینا بیٹا۔ شہزادہ ضرور اٹھ کھڑا ہوگا۔

سپہر: استانی جی ایسا آج تک کبھی ہوا ہی نہ ہوگا۔

استانی: جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ تم نے ابھی دیکھا کیا ہے۔ میرا ذمہ آج کے ساتویں دن، تم اور وہ ایک جگہ نہ بیٹھے ہو تو سہی۔ جس بات کو تم جانتی ہی نہیں ہو، اس میں دخل کیوں دیتی ہو۔ بھلا اگر ریل گاڑی تم نے اپنی آنکھوں نہ دیکھی ہوتی، تو کبھی ہزار برس بھی یقین نہ آتا کہ بے گھوڑے بیل اونٹ ہاتھی کے سو سو گاڑیاں صرف ہوا کے زور سے اڑتی جاتی ہیں، اور چٹکیوں میں منزلیں طے کر جاتی ہیں؛ مہینوں کے راستے گھنٹوں میں طے ہوتے ہیں۔ یا اگر تار برقی کا حال کوئی تم سے کہتا تو تم باور کرتیں۔ برسوں کی راہ پر ایک دن میں خبر جاتی ہے۔ لنڈن کی خبر گھنٹوں میں آتی ہے۔

اُفوہ۔ اسی طرح اور بہت سی باتیں ہیں۔ فراش کا حال سُنا ہی ہوگا۔ مارڈالو مگر وہ ہرگز حال نہ بتائیں گے۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ میں پوچھتی ہوں، آخر اس کا سبب کیا ہے۔ وہ لوگ وہاں کا حال کیوں نہیں بتاتے۔ کروڑوں فراسن ہیں، مگر چاہے کوئی قتل کرڈالے۔ تکے تکے کرے۔ وہ ایک بات بھی بتائیں گے۔ ہرگز ہرگز نہیں بتاتے۔ بمبئی میں ایک خاتونِ عصمت مآب رُوس سے آئی ہیں۔ ان کا نام میڈم بلوٹیسکی ہے۔ ایک روز شملہ میں دس پانچ فرنگنوں اور فرنگیوں کے ساتھ کہ بڑے با اعزاز اور مشہور لوگ ہیں، یہ خاتون اس باغ میں مصروف گل گشت تھی۔ ایک لیڈی نے کہا آپ اکثر کہا کرتی ہیں، کہ آپ عاملہ ہیں۔ اور غیب کی بات بتا سکتی ہیں اور ہمالیہ پہاڑ کے لوگوں سے روز آپ سے خط و کتابت ہے۔ مگر کبھی کسی بات کا ثبوت نہ دیا۔ جب جانیں کہ ان امور کو ثابت کر دیجئے میڈم موصوفہ نے کہا۔ میں کوئی شعبدہ باز تو ہوں نہیں، مگر تمہاری خاطر سے کچھ دکھاؤں گی۔ ایک میم صاحب ہے جو ان باتوں کی قائل نہ تھیں۔ پوچھا کہ اگر کوئی شے تم سے کھو گئی ہو، تو ہمیں بتاؤ۔ کہ کوئی چیز تم نے کسی کو دی ہو، اور وہ پھر نہ ملی ہو یا تمہیں یاد نہ ہو کہ فلاں کہاں گئی تو میں بتا دوں گی۔ اور منگوا دوں گی۔ اس نے کہا ہاں ایک جگنو جس کو میں بہت عزیز رکھتی تھی۔ ایک کرنل صاحب کی میم نے نمونہ کے طریق پر مجھ سے لیا تھا مگر پھر مجھے یاد نہیں کہ واپس ملا یا نہیں ملا، اور وہ ولایت چلی گئیں۔ روس کی معزز خاتون نے ایک کاغذ پر اپنا نام لکھا اور اس کی پشت پر اس لیڈی سے نام لکھوا دیا اور کہا کہ اس کو جیب میں رہنے دو، آدھ گھنٹے کے بعد ایک روش میں جاکر اُس عورت سے کہا کہ سامنے والا پتا تو اٹھا دو۔ وہ جو پتا اٹھانے گئی تو دیکھا وہی کاغذ ہے۔ اُٹھایا تو اس میں جگنو موجود جو گم ہو گیا تھا۔ باغ میں جتنے انگریز، اور جس قدر میمیں تھیں سب دنگ ہو گئیں، اور اس میم نے بیان کیا کہ سات برس سے اس جگنو کا پتہ نہیں تھا اب یہ کیا بات ہے۔

سپہر: استانی جی۔ اندھا جب تپیائے جب آنکھیں پائے یوں تو ایسے ایسے صدہا قصے پڑھ ڈالے، مگر اپنی آنکھوں دیکھیں تو پتیائیں، ورنہ مصیبت تو پڑی ہی ہے۔ مگر کتنے جلد شہزادے بہادر چل بسے:

طرارہ بھرتے ہی پہونچا عدم میں
سمندِ عمر کیا چالاک نکلا

استانی: اب اس کا تو خیال ہی نہ کرو۔ یہ تو خیال ہی فضول ہے۔ اس سے واسطہ کیا۔ بات ساری یہ ہے کہ جس امر کو انسان سمجھ نہیں سکتا، اس میں شک کرتا ہے۔ جب شک ہوا تو اس کو غلط تصور کرتا ہے۔

سپہر: آخر آپ کا منشا کیا ہے۔ کچھ معلوم تو ہو۔ کیا آپ کے نزدیک یہ قبر اسی طرح بنی رہے گی اور ہمایوں فرزند ہو جائیں گے۔

استانی: زندہ ہو جائیں گے کیا معنی۔ ان کو مردہ کون کہتا ہے۔ اے وہ مرے ہی کب۔ وہ زندہ ہیں۔

سپہر۔ ہاں ان کا نام تو اب تک زندہ ہے:

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل
گرچہ بسی گذشت کہ نوشیرواں نماند

ہے ہے شہزادی بیگم کے نازوں پالا۔ گیسوؤں والا، اس بھاری پتھر کے نیچے دبا پڑا ہے۔ جو فرش گل و فرش مخمل پر آرام کرنے کا عادی تھا، وہ اب خاک پر بستر جما کر سو رہا ہے؛ جو ہر وقت ہزاروں آدمیوں میں زندگی بسر کرتا تھا، وہ اب دنیا سے الگ تھلگ پڑا ہے۔ بوئے گل کی طرح باغ جہاں سے چل بسے۔ اس خاکدان سے عالم قدس کو سدھارے۔ اب ہمیں عیش، راحت، آرام سے کیا سروکار ہے:

بے یار منہ سے خاک نہ ساغر لگائیے — شیشوں کو تاک تاک کے پتھر لگائیے
راحت کی جا کہیں بھی نہ پائی بجز عدم — ہر سو برنگ برق تپاں ڈھونڈتے پھرے

عین لطف کے دن، خرمن جمعیت خاطر پر بجلی گری:

شب غم اور خاک تیرہ ہے
اے فلک کون یہ دتیرہ ہے

استانی جی آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ یہاں آنے سے میرے دل کو ایک طرح کی ڈھارس ہوئی۔ اب میں روز نور کے تڑکے آیا کروں گی۔

نزع میں سن لو وصیت عاشق رنجور سے — پاس آؤ کیا تماشا دیکھتے ہو دور سے
اے جنوں دشت جنوں میں ہو مری مٹی عزیز — باز آیا میں کفن سے غسل سے کافور سے

استانی: کیوں حسن آرا بیگم۔ ہم نے کیا کہا تھا ان کو وہیں لے چلو۔ جان بابا ابھی تم تجربہ کار کیونکر ہو سکتی ہو ہے کہ نہیں؟ سپہر آرا!

سپہر: استانی جی ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ:

دل لگانا عذاب ہوتا ہے
آدمی کیا خراب ہوتا ہے

خدا کسی کو غم فراق نہ دے۔ جدائی انسان کی دشمن ہے:

ہجر میں تڑپا ہوں میں صورت بسمل کیا کیا — دیکھنے کو ترے لوٹا ہے مرا دل کیا کیا
غم کدہ بزم طرب ہو گی ترے اٹھنے سے — کف افسوس ملیں گے نہ جلا جل کیا کیا
نقش پا جو ہے مرا ہے وہ لہو کا چشمہ — خوں رولاتی ہے مجھے دوری منزل کیا کیا

استانی جی جب سپہر آرا بیگم کو لے کر گھر پہ واپس آئیں، تو دیکھا کہ لڑکی اب اس قدر ملول نہیں، جس قدر پیشتر تھی۔ جناب باری کا شکریہ ادا کیا۔

سپہر آرا نے کہا، اماں جان، ہم آج بڑی دیر تک شہزادے کی قبر کو پھولوں سے آراستہ کیا کی۔ سچ کہتی ہوں اماں جان قبر سے بھی دولھاپن برستا ہے، آپ کو یقین نہ آئے تو چل کے دیکھ لیجئے۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب آواز آئی، اور اب آواز آئی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ قبر کے کونے سے ایک پیر مرد نمودار ہوا، بوڑھا آدمی ہے۔ بھوں تک کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ دانت سب کے سب چوہے کی نذر کر چکا ہے۔ پہلے تو میں بہت ڈری، مگر اس کا نورانی چہرہ دیکھ کر خوف کافور ہو گیا۔ اس نے دو روایتیں ایسی بیان کیں، کہ دل بھر آیا۔ سوچتی رہی کہ دنیا میں آکے خوشی کی بات سے خوش ہونا، یا ماتم میں رونا، بیکار ہے۔ خوش تو وہ ہو، جو سمجھے کہ تمام عمر ہنسی خوشی میں بسر ہوگی۔ ایسا آدمی کروڑوں میں شاید ایک ہوگا۔ جس نے کوئی غم نہ دیکھا ہوگا۔

چوں حاصل آدمی دریں جائے دو دور — جز درد دل و جان جانیست دگر
خرم دل آنکہ یک نفس زندہ نبود — واسودہ کسی کہ او نزاد از مادر

اور روئے وہ جو یہ سمجھے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا، اور دنیا کے مصائب سہے گا۔ رنج و غم دونوں میرے نزدیک فضول ہیں۔

مجھے نہ اب رنج ہے، اور نہ کبھی تمام عمر کسی امر کی خوشی ہوگی۔ لازمۂ انسانی یہ ہے، کہ خدا کو نہ بھولے۔ وقتِ مصیبت تو اکثر زندیق اور ملحد تک خدا کو یاد کرتے ہیں، مگر خدا ترسی کے یہ معنی ہیں کہ آرام اور عیش، اور فارغ البالی کے وقت اس کی یاد سے غافل نہ ہو، ورنہ پرستش خود غرض ہے اور بس خدا کو ہر وقت حافظ و ناصر سمجھے:

در پائے گنہ شد دل بیمارم پست — یارب چہ شود اگر مرا گیری دست
گر درِ علم انچہ ترا باید نیست — اندر کرمت آنچہ مرا باید ہست

استانی جی اس تقریر سے کمال محظوظ ہوئیں، اور بڑی بیگم کی باچھیں کھل گئیں۔ کہ لڑکی اس دانشمند پیرزن کی بدولت راہ راست پر آگئی۔ روح افزا اور بہار النسا اور حسن آرا بھی دل ہی دل میں مسرور تھیں، کہ آرزوئے دلی بر آئی۔ جس بات کی ہرگز امید نہ تھی، وہ ظہور پذیر ہوئی۔ بہنیں باہم چپکے چپکے باتیں کرنے لگیں۔

بہار: یہ استانی جی نے کیا گھول کے پلا دیا۔ گئی کس حالت زار میں تھیں، کہ خدا دشمن کو بھی نہ نصیب کرے اور اب کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ استانی جی کا یہ احسان کبھی نہ بھولیں گی۔

حسن: روح افزا بہن سے پوچھو کہ دو باتوں میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی، اور ایک بوڑھا آدمی بھی قبر کی طرف سے آیا۔ اس نے بھی دو روایتیں بیان کیں، کہ میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ سپہر آرا بھی غور سے سنا کی، اور دو چار

دفعہ اسی طرح گئیں تو یقین ہے کہ غم دور ہو جائے۔ استانی جی بڑی تجربہ کار عورت ہیں۔
روح : یہ سب انھیں کے سبب سے اور انھیں کی کوشش سے ہوا یا کچھ اور۔ اور کیسی شیریں کلامی سے سمجھاتی تھیں کہ جی خوش ہو جاتا تھا۔ نصیحت کے معنی بھی یہی ہیں۔
بہار : وہاں روئی تو نہ تھی سپہر آرا۔
روح : بہت روئیں کہاں تک ضبط کرتیں۔ قبر کو دیکھا تو دل بھر آیا؛ ہم لوگوں نے دیکھا سمجھایا، مگر فہمایش کارگر نہ ہوئی۔ پھر استانی جی نے سمجھایا۔ اونچ نیچ دکھایا۔
بہار : مجھے ڈر تھا کہ مبادا کہیں طبیعت نصیب اعدا، زیادہ بے چین ہو جائے، مگر اندر آئی تو دیکھا پہلے سے کسی قدر سکون ہے۔
حسن : راہ میں بھی اچھی طرح سے باتیں کیں، اور وعدہ کرتی آئی کہ اب رنج و غم کے پاس نہ جاؤں گی۔ خوشی اور رنج دونوں سے مجھے اب کچھ واسطہ نہیں ہے۔ خدا جانے اسی وقت تک یہ بات تھی یا اب بھی ویسا ہی خیال رہے گا۔
مغ : حضور وہاں کا جانا اکسیر ہو گیا۔
مہری : روز سویرے سویرے وہاں جایا کریں تو اچھا صبح کو جائیں، تو دس بجے چلی آئیں۔
حسن : اُفوہ آج ذرا طبیعت خوش ہوئی۔ نہیں میں تو سمجھتی تھی کہ بہن ہاتھ سے گئی۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی؛ دن رات کڑھا کرتی تھی۔
سپہر آرا نے بڑی بیگم سے کہا۔ امّاں جان ہمیں چاندی کی دو عمدہ تشتریاں بنوا دیجیے، تو ہم انھیں میں پھول توڑ توڑ کے رکھیں، اور جب دونوں تشتریاں بھر جائیں تو پھولوں سے قبر کو مُعطّر کروں۔ بڑی بیگم بولیں بابا بنوانے کی کیا ضرورت ہے، اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں، ایک چھوڑ سو تشتریاں لو۔ سپہر آرا نے کہا نہیں امّاں جان ہم ایسی تشتری چاہتے ہیں جو اچھوتی ہو۔
بڑی بیگم نے فوراً حکم دیا کہ دو چاندی کی، اور دو گنگا جمنی تشتریاں بنوائی جائیں۔ ایک آدمی مقرر ہو کہ سُنار سے بہت جلد بنوالے؛ اسی روز بارہ بجے رات کو چار تشتریاں آئیں۔ دوسرے روز نور کے تڑکے سپہر آرا اور حُسن آرا اور بہار النسا، نے نماز پڑھی، اور اُستانی جی کے ساتھ گاڑی پر سوار ہو کر پھر قلعہ کی طرف گئیں۔ شب کو کسی قدر بارش ہوئی تھی، اس سبب سے دوسری اور بھی چمک گئی، اور روشوں میں ناز کے ساتھ پھرنے لگیں۔
حسن : آج بڑی خنکی ہے۔ کل مینھ برسا تھا نہ۔
سپہر : کل رات کو؟ سچ؟ ہمیں معلوم ہی نہیں۔

بہار : تم سوگئی تھیں، اور اُسی وقت تمہاری آنکھ لگی تھی۔ اس وجہ سے میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔
مہری : اور حضور اس وقت سے غافل سو رہی تھیں۔ سوئیں دیر سے، اور تھکی بھی بہت تھیں۔ بس تھکاوٹ کے مارے آنکھ لگ گئی۔
سپہر : جب ہی آج سیلن بہت ہے، اور ہوا کے سبب سے سردی اور چمک گئی۔ کیا دیر تک برستا تھا؟
حسن : اے نہیں یہی کوئی پندرہ منٹ بونداباندی ہوئی تھی۔
سپہر : مگر کتنا سُہانا سماں ہے۔ اہاہا۔ اور مرزا ہمایوں فر کی قبر پر کیسا نور برس رہا ہے۔

کو کیہ ہیں وعلم وکوشش وتائی — پرچم رقصندہ بفرق توائی
حاجب وسرہنگ ادوان پیش پیش — فوج رواں از پس کشورکشائی
چشم قسم خوردہ برفتار ہیل — گوش زخود رفتہ ببانگ درائی
بوکہ دریں روز کراید بمن — شاہ عدو بند قلمروکشائی

آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا زگذشت
تنہا ز سر مگو کہ زدیوار ودر گذشت

حسن : اب پھول تو توڑو بہن۔
سپہر : پھولوں کو توڑ کے بلبلوں کا دل دکھاؤں :

بگوائے عاشقِ صادق چرا گلدستہ آوردی
دل بلبل شکستی غنچہ را سر بستہ آوردی

بہار : بلبل کو گل کی کمی کیا ہے۔
حسن : یہ سب پھول ہی لگے ہیں، یا کچھ اور، بلبل کو گلستاں میں پھولوں کی کمی ہو، یہ عجب بات ہے۔

گلوں کا قحط نہیں بلبلوں کا کال نہیں

سپہر : جس گل کو دیکھتی ہوں خنداں ہے۔ مگر نہیں ہے تو میرا غنچۂ دل۔ اس پر ہمیشہ اوس ہی پڑی رہتی ہے :

عشق از چہ شگفتہ ماجرائیست
رسوائی عشق بد بلائیست

خدا وہ دن جلد دکھائے کہ میں اپنے پیارے شہزادے کو بغل میں لے کر عیش کروں، اور بوس وکنار سے لطف زندگی حاصل ہو۔

چوں گل بشگفت در گلستاں — مرغان بنواز نند دستان

سپہر آرا نے بہار النسا کے کان میں کہا۔ اس وقت مارے غم کے اس قدر مجنوں کا زور ہے، کہ استانی جی کا بھی مطلق خیال نہیں۔ کچھ پروا نہیں، کہ یہ ساتھ ہیں یا نہیں۔ بہار النسا بولی، بہن دل پر چوٹ ہے۔ نہ مجنوں کی سی کیفیت ہے۔ خدا جانے اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ مگر جہاں تک ہوسکتا ہے سب مل کے سمجھاتے ہیں۔

الغرض دو گھنٹے بعد سپہر آرا ہنسی خوشی گاڑی پر سوار ہوئی، اور استانی جی سے کہا اب اس وقت کیا معلوم کیا سبب ہے، کہ طبیعت آپ ہی آپ بحال ہوگئی۔ دونوں بہنیں خوش ہوئیں، کہ وہ پریشانی اس قدر عرصے کے بعد خدا خدا کر کے دور ہوئی۔ استانی جی الحمد للہ، کہہ کر گاڑی پر سوار ہوئیں، اور بگھی چلی۔ راہ میں سپہر آرا بیگم نے بیقراری نہیں ظاہر کی۔ مگر:

ہر جا گل و بلبلے بہم دید	دل غرقہ بخون از اں صنم دید
بر سینۂ غنچہ داغ می سوخت	گل از جگر و دماغ می سوخت

برات کی تیاریاں

ثریا بیگم کا مکان برات کے دن پری خانہ تھا۔ بڑے ٹھسّے سے پریاں نکھر نکھر کے متمکن تھیں، سب کو یہی خیال تھا کہ ہم کسی سے دب کے نہ رہیں۔ حسن و جمال، نکھار سنگار، جوبن میں سب سے بڑھ چڑھ کے ہوں۔ چہل کی باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ آسمان جاہ، کی شوخی و شرارت، جانی بیگم کا چلبلاپن، اور ذرا اچپلاہٹ۔ مبارک محل کی نستعلیق گفتگو ڈومنیوں کی نازک آوازی، اور بوڑھی مغلانی کے لطیفے، اور ہمسنوں، ہمجولیوں کی چہل سے عجب لطف تھا، خوشی در و دیوار سے برستی تھی۔ یوں تو سب طرح دار تھیں۔ مگر آسمان جاہ، اور جانی بیگم کا نمبر بڑھا ہوا تھا۔ یہ سب کو بات بات میں چھپاتی تھیں۔

بیگم: فراشوں کو حکم دو، کہ بارہ دری کو فرش مکلف، اور جھاڑ کنول سے دلہن کی طرح سجائیں۔ جگمگانے لگے۔ ہر کمرے اور دالان، اور شہ نشین میں صاف شفاف چاندنیاں بچھیں اور ان پر اونی اور چینی غالیچے ہوں ایسا نہ ہو ہنسی ہو۔

مہری: اے حضور یہ سب انتظام تو کل ہی سے ہوگیا ہے۔

بیگم: ہاں چلو خیر۔ میرے حواس اس وقت ٹھکانے نہیں ہیں۔ اتنا کر کرا کے کہیں ہیٹی نہ ہو جائے۔ کہ پھر لوگوں کو ہنسی کا موقع ملے، منجھلے آغا کو ذری باہر سے بلا لاؤ۔

مہری: حضور وہ تو اس وقت میرے فرشتے خاں کی بھی نہ سنیں گے۔ جو کوئی بولتا ہے اس کو پھاڑ کھاتے ہیں۔

بیگم : اچھا تم جا کے دیکھو سب انتظام ٹھیک ہے، یا نہیں۔

مہری : (باہر سے آن کر) حضور سب سامان لیس ہے، بارہ دری اس وقت دلہن بنی ہوئی ہے۔ فرش فروش، سب چوکس۔ دریچوں میں سوزنیاں بچھی ہیں۔

بیگم : آبدار خانے والے سے کہو کہ مٹکے اور عظیم اللہ خانی حُقّے اور دو رُخے اور پیچوان تیار رکھے۔ تمباکو کہاں سے آیا ہے۔ مہری : حضور آغا صاحب نے حکم دیا تھا کہ دو سیر تمباکو محمد علی کی دوکان سے لے آؤ۔ اور پیچوان ناندوں میں بھگو دیئے گئے ہیں۔ گھڑے کورے، جھجر صراحیاں، جھجریاں سب تیار ہیں۔ پانی کیوڑے سے وہاں بھی بسایا ہے۔

بیگم : تم اتنا جا کے کہدو کہ عملے کے لئے پانچ مٹکے الگ بھروا رکھیں۔

مغ : قربان جاؤں حضور اللہ رے خیال۔ اندر باہر، ادنٰی ادنٰی باتوں کا خیال ہے۔ واہ واہ۔

مہری : آغا صاحب نے سب باتوں کا بندوبست کر لیا ہے۔

بیگم : اچھا یہ لو گجراتی الائچیاں، چو گھڑے کی، اور دو رخی ڈوبیاں لے جاؤ۔ اِن پر چاندی کے ورق لگے ہیں۔ یہ الگ رہیں۔ وہ ہار بھی لیتی جانا، اور حشمت بہو سے عطر کے کنٹر نکلوا لو۔ باہر کسی کو حکم دو، کہ شیشوں میں عطر بھرے اور شیشیوں کے منھ پر سنہری گوٹا باندھو۔ کشتیوں میں عطر اور ڈلی اور الائچی اور گلوریاں لگی رہیں۔

مہری نے باہر جا کر منتظموں کو کشتیاں دیں اور کہا بیگم صاحب فرماتی ہیں کہ ان میں عطر پان سب تیار رہیں۔ آغا صاحب جھلے اور بھلے آدمی تھے، کہا۔ ہاں ہاں صاحب سُنا سُنا۔ بیگم صاحب سے کہو یا تو ہم کو انتظام کرنے دیں، یا خود ہی باہر چلی آدیں۔ آخر ہم کو کوئی گنوار سمجھی ہیں۔ کل سے انتظام کرتے کرتے ہم شل ہو گئے، اور جب برات آنے کا وقت قریب آیا تو صلاح دینے لگیں کہ یہ کرو وہ کرو۔ جا کے کہہ دو کہ باہر کا انتظام ہمارے متعلق ہے۔ آپ کیوں خواہ مخواہ دخل دیتی ہیں، آپ خاطر جمع رکھیں۔ ہم اپنے بندوبست کریں گے۔

مہری نے بیگم صاحب کو اطلاع دی کہ آغا صاحب فرماتے ہیں، ہم سیکھے سکھائے ہیں، ہم کو کسی امر کے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضور روشنی کا تو ایسا انتظام ہوا ہے کہ شہزادوں کے ہاں بھی نہیں ہے۔ جھاڑ کنول مردنگ جھاڑ دو شاخے اس طرح روشن ہیں، کہ دن معلوم ہوتا ہے، زربفت کی مسند بچھی ہے، اشرفی بوٹی کا گاؤ تکیہ، اغل بغل دو اور مسندیں ہیں۔ زرد کاشانی مخمل کی رضائیں، اس پر کارچوبی کام ہے۔ بائیں طرف سبز مخمل کی مسند قرینے کے ساتھ بچھی ہوئی ہے۔ دوسری مہری نے بیان کیا، کہ بارہ دری کے پھاٹک پر نوبت خانہ ہے۔ اور نوبت خانہ پر کارچوبی جھول پڑی ہے۔ کہیں کنول اور گلاس۔ کہیں سبز اور سُرخ ہانڈیاں۔ چھاپے خوش نمائی کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں، اور سبز سُرخ زرنگاری اُودے قمقمے بڑی بہار دکھاتے ہیں، دو ڈوں میں دیہاتیں

کھڑی ناچ رہی ہیں۔ شکل صورت تو اچھی ہے۔ پوشاک بھی بری نہیں، مگر شین قاف درست نہیں ہے۔ بس اتنی کسر ہے۔ آسمان۔ بی فیضن کو کسی طرح ان کا ناچ دکھا دو۔ یہ بیچاری جب سے آئی ہیں تڑپ رہی ہیں۔ کئی بار پوچھ چکی ہیں، کہ کوئی دیہاتن بھی ناچنے آئی ہیں یا نہیں۔

فیضن : ہم تو نا ہیں پوچھا۔ جو چاہو لگاؤ۔

آسمان : (قہقہہ لگاؤ) اور تو کیا لگائیں۔ بس بے اختیار قہقہہ لگانے کو جی چاہتا ہے۔ (ہم تو نا ہیں پوچھا۔

جانی بیگم : بڑی دیر کے بعد بولی تھیں، مگر زبان سے لہنا نہیں ہے۔

حشمت بہو : (آہستہ سے) بڑے بوڑھوں کے آگے تو زبان کو روکا کرو۔ ہمجولیوں میں چاہے جیسی گفتگو کر لو۔ کچھ بات نہیں، مگر بزرگوں کا تو کچھ خیال رکھا کرو۔

آسمان : آپ بھی بولیں۔ شانِ خدا۔ ان کو بڑا خیال رہتا ہے۔ آئیں وہاں سے۔ نصیحت دینے۔ خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت۔

مبارک : جو بولے وہی دھر لی جائے۔ بات کرنا دوبھر ہے۔

آسمان : (دھر لی جائے) واہ بہن۔ جواب تو اس کا ہم ضرور دیتے مگر مبارک محل بہن ہماری باتوں سے خفا ہو جاتی ہیں، اور ہم سیدھی سادھی عورت۔

جانی : دریں چہ شک۔ دو ہی تو سیدھی سادھی ہیں۔ ایک تم دوسرے ہم اور باقی سب کی زبان اس فراٹے سے چلتی ہے، جیسے ساون بھادوں کے دنوں میں پرنالے۔

فیضن : شہر والیاں تو ان کے آگے آگے بول ہی نہیں سکتیں۔

جانی : ان سے شہر والیاں اور دیہاتنیں سب جھکتی ہیں۔

آسمان : بی فیضن سے ہماری بھی کور دبتی ہے۔

حشمت : کیا جانے دروازے پر کیسی روشنی ہے۔

مہری : دروازے پر کیا، اے بیگم صاحب سارے محلے بھر میں روشنی ہے۔ دوائی معلوم ہو ۔ ۔ ۔ ، جدھر نکل جاؤ یہی معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ پھیلی ہوئی ہے، بارہ دری سے بازار تک دورویہ کاٹھ کے ۔ ۔ ۔ یئے دا کٹہرے پر گلاس روشن ہیں۔ فیضن بولی۔ گلاسوں میں کڑوا تیل جلایا میٹھا۔ میٹھا تیل جلا کے کیا دو ۔ ۔ ۔ بالنا ہے۔ کسی نے کہا تیل کہاں ہمارے شہر میں تیل کے عوض پانی جلتا ہے۔ مہری مسکرا کر بولی ناریل کا تیل ہے، اور ہر موڑ پر برج بنے ہوئے ہیں، ایسے چمکتے ہیں کہ میں کیا بیان کروں۔ سوئی گر پڑے تو کوس بھر سے نظر آئی دے۔ دکانیں بھی بہت سی آئی ہیں۔ تنبولی سرخ کپڑے پہنے ہوئے ٹھتے کے ساتھ دکان پر بیٹھی ہیں۔ ہاتھوں

میں چاندی کے کٹورے، تھالیوں میں سفید عمدہ پان، اور میڑے صافی پر رکھے ہوئے۔ ایک تھالی میں چھوٹی الائچیاں تھیں، ایک میں ڈلیاں کتھ معطر بسا ہوا۔ پھرتی اور صفائی کے ساتھ گلوریاں بنا رہا تھا۔ تماشا بین ڈٹے ہوئے گلوریاں خرید رہے تھے۔ دوکان کے سامنے لیمپ روشن تھا۔ ایک سمت ساقنوں کی دکانیں تھیں، پیاری کا جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ اما من کی لگاوٹ بازی اور جمال مبین پر ہزاروں غش تھے۔

وہ ترا حسن خداداد ہے ماشاءاللہ

تجھ سے خورشید کو بھی حسن کا دعویٰ نہ ہوا

اونچی دکان پر طشت، اور دیگچے رکھے ہوئے۔ سامنے برنجی حقے، اُن پر نقش کیا ہوا۔ اُلٹی چین اور سالوا اور کلابتوں کے نیچے۔ ایک سمت ڈھاک منڈیاں سلگ رہی ہیں۔ بگڑے دل دموں پر دم لگاتے ہیں۔ لو آسمان کی خبر لاتی ہے۔ بے فکرے ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کسی نے کہا: ع

بی بی ساقن دموں کی خیر ہے

کوئی بولا۔ دم برقرار، آج تو سالبجہاں کے دم لگواؤ۔ آدمی چلموں پر تمبا کو جما رہے ہیں، بی ساقن کے سامنے پاندان رکھا ہے، دوسری جانب صندوقچہ اسپر اطلس کا غلاف، نگیرہ ایک جانب شان کے ساتھ سوت کی ڈوریوں سے تنا ہوا ہے۔ چھولداری میں دھواں دار دم پڑ رہے ہیں۔ غول کے غول دکان پر اُمڈے آتے ہیں

ایک: ہم تو سالبجہاں پر مٹے ہوئے ہیں، واللہ!

دوسرے: اور بندے بھدیاں کے عاشق ہیں سالبجہاں کی ایسی تیسی۔ وہ نشے جمتے ہیں کہ واہ جی واہ۔

تیسرے: اور ہم یک رنگ آدمی، جب دم لگایا چیتوی کا۔

چوتھا: نو سکھے ہو بچہ۔ ارے سالبجہاں میں وہ قدرت ہے کہ ایک دم لگاتے ہی ہوش و حواس ہوا ہو جائیں، یہاں سے اور کلکتہ تک اس کی دھوم ہے، نیپال کی ترائی میں اشرفیوں کے مول بکتی ہے۔ ایک پاؤں رکاب میں، اور دم لگائے گھوڑے کی پیٹھ پر جاتے ہی جاتے لے اُڑے۔ جی۔ ع

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

دُلہن کے دروازے پر میلہ جما ہوا تھا۔ اور اس قدر چہل پہل کہ بیان سے باہر، جو فرد بشر اس طرف سے گزرتا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ کشتِ زعفران میں پہنچا۔ ہر سمت عیش و عشرت ہی نظر آتی تھی۔ ہر طرف نشاط اور خوشی ہی جلوہ دکھاتی تھی:

در بہاراں چمن از عیش نشاطی دارد — برگ ہر نخل کہ بینی رگ جانے دارد

غنچہ شکیں نفس و لالہ بخورش گاوے — انجمن مجمرۂ غالیہ دلنے دارد

باد چوں نوسفراں در دمِ رفتن رقصد
آب چوں نکتہ دراں طبع روانے دارد

محلسرا کے اندر چہل پہل ہو رہی تھی۔

آسمان: گو اللہ نے ہماری صورت بُری بنائی ہے۔ مگر شکر ہے کہ ہم نے طبیعت بڑی مزے دار پائی ہے بی فیضن اس وقت ناک بھوں چڑھائے بیٹھی ہیں۔ گھر سے لڑ کے آئی ہو۔ بہن کیا؟ صورت ہی ایسی ہے۔

جانی: ان کا چپ ہی رہنا اچھا۔ بنائی یہ جاتی ہیں اور خفیف ہمیں ہونا پڑتا ہے۔ مشکل تو یہ ہے۔

آسمان: تمہاری کون ہے۔ کیا کوئی دور دراز کا رشتہ قائم کیا۔ تمہاری تو سالی ہیں نہ۔

حشمت: چہ خوش۔ ان کی سالی کیونکر ہو سکتی ہے۔ ان کے بہنوئی ہوں، تو ہوں۔ کیوں جانی بیگم۔

جانی: دل لگی کرتی ہو نہ بہنوئی، نہ سالی، یہ ہمارے دوگانا ہیں۔ ہو نہ بہن۔ کیوں۔

فیضن: (بگڑ کر)، دوگانا کوئی اور ہوگی۔ گالیاں نہ بکا کرو۔ ہم سے نہ بولیں، نہ چالیں کسی سے۔

اس پر بے اختیار کل شہزادیوں کو ہنسی آئی۔ بی فیضن سمجھیں کہ دوگانہ گالی ہے۔ جبھی بد دماغ ہو گئیں۔

حشمت: ہاں آسمان جاہ تم میں یہ بڑی بُری عادت ہے۔ کہ ہماری بی بی فیضن کو گالیاں دیتی ہو۔ دگانا ہوں اُن کے دشمن جو ان کی طرف دیکھ نہ سکیں، اے واہ۔ بڑی وہ بن کے آئی ہیں۔ وہ بیچاری تو گردن جھکائے بیٹھی ہیں۔ اور تم چھیڑ خانی سے باز نہیں آتیں۔

آسمان: لڑواؤ۔ وہ تو سیدھی سادی ہیں۔ شاید تمہارے بھروں میں آ بھی جائیں؛ مگر میرے اوپر فقرے چست کرنا قیامت ہے۔ مجھ سے بری کوئی نہیں، یوں تو مجھ سے زیادہ پاک باز پاک نظر پاک دامن ہونا ذری مشکل ہے مگر ان سب صفتوں کے علاوہ مجھے اس کا بڑا خیال رہتا ہے۔ کہ حیا کا دامن ہاتھ سے چھٹنے نہ پائے۔ حیا داری میں آسمان جاہ سے سر بر ہونا معلوم۔ ثریا بیگم از برائے خدا باتیں کرو۔

جانی بیگم سے ایک بی بی نے کہا کیسی باتیں کرتی ہو۔ تمہاری طرح سے بک بک کیا کریں۔ دلہن کی طرح بیٹھنا چاہئے۔ یا چہل دل لگی کرنا۔ اچھی صلاح دیتی ہو۔ کیا ہنسواؤ گی۔ ہمجولیوں میں۔ کیا خاصی بات کہی اس وقت سے کہہ رہی ہو۔ دلہن تمہارا کہنا مانتی بھی ہے کہ تم کہتی ہی ہو۔ یہی حیا داری ہے۔ اس حیا کے صدقے (آہستہ سے)، پھٹے سے منھ۔

حشمت: آسمان جاہ محفل کی رونق ہیں جس محفل میں یہ نہ ہوں وہ بالکل سونی معلوم ہو۔ ان کے سبب سے خوب، قہقہے بازی ہوتی ہے۔

آسمان: پھر، تو ہی ہے۔ محفل عاشق ہے، تو میں روئے نگار، عاشق کو معشوق کی صورت سے تسلی اور تشفی ہوتی

ہی ہے۔ ہم سے مبارک محل بہن ناحق خفا ہوگئیں۔ کوئی میل کروادے۔

مبارک: نہیں بہن۔ تم بڑی منہ پھٹ ہو۔ اور یہ عیب ہے۔

آسمان: اب صاف صاف کہوں تو بُرا نہ مانو، اور میرے کون جھگڑا مول لے؛ ذری ذری سی بات میں چھنچھی ہو۔ یہ کون بات ہے۔ آپس میں ہنسی مذاق ہوا ہی کرتی ہے۔ کسی کی نرم گرم بات سے بگڑنا کیا:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

فیضن بُرا مانیں تو ہمیں حیرت نہ ہو۔ یہ بیچاری دیہات میں رہتی ہیں قصباتی بولی قصباتی راہ و رسم جانیں۔ ان کو یہاں کی چہل سے کیا لگاؤ۔ مگر تم اتنی بڑی شہزادی ہو کے بات بات میں روئے دیتی ہو۔ تم سے البتہ ایسا تعجب ہے۔ فیضن ان باتوں کو سمجھ سکیں یہ بے خبر۔ اور دل تو میرا صاف ہے۔ مثالِ آئینہ، مگر میں اپنی شوخ چتون کو کیا کروں، اور ہاں حاضر جواب بھی ہوں، مگر جانی بیگم کی طرح زبان دراز نہیں۔

جانی: (مسکرا کر) اب میری طرف جھکیں۔ ادھر عنایت ہوئی۔

حشمت: چونکھا لڑتی ہیں۔ چونکھا۔ اف ری شوخی۔

آسمان جاہ نے کہا لڑکپن میں میں بالکل الڑھ تھی، اور بات تک کرنا نہیں جانتی تھی۔ مگر خدا بی ہمسائی کا بھلا کرے، جنھوں نے مجھے چاق چوبند کر دیا۔ ایک دن سہ پہر کو میں نہا کے کوٹھے پر بال سکھا رہی تھی۔ سردی کے دن تھے۔ دھوپ میں آکے بال سکھانے لگی۔ بچپنا۔ کوئی مسا کر کے بارھواں برس۔ بس بی ہمسائی نے مجھے دیکھا۔ تب تک ہم سے ان سے بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے سعادت گنج میں اُن کی اِملاک تھی۔ اب کچھ دن سے پڑوس میں آکے رہی ہیں۔ پاس پڑوس میں رہنے سہنے سے میل ہو ہی جاتا ہے۔ خیر مجھے جو انھوں نے دیکھا، تو سوچیں کہ بھائی کے ساتھ نکاح ہو۔ تو خوب بات ہے؛ ان کا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ کوئی انیسواں سال۔ بس دوسرے دن وہ ہمارے ہاں آئیں۔ امی جان سے ملیں۔ پھر آمد و رفت شروع ہوگئی تو رفتہ رفتہ ان کی طرف سے مشاط پیغام لائی۔ مگر امی جان نے کہا کہ ہمیں اور تو کوئی عذر نہیں ہے، لڑکا پڑھا لکھا۔ سعادت مند، معقول پسند، ہونہار لیکن ہمارے ہاں غیر جگہ شادی آج تک کسی نے کی ہے۔ خیر آئی گئی بات ہوگئی۔ مجھے ٹوہ کہ دیکھوں لڑکا کیسا ہے۔ میں نے مہری کی چھوکری سے جو میری ہمجولی تھی کہا۔ ہمیں کسی ترتیب سے پڑوسن کا لڑکا دکھا دو۔ بس ایک دن کوئی دو گھڑی دن رہے، وہ دوڑی آئی، اور میرے کان میں کہا۔ بیوی چلیئے وہ کھڑے ہیں؛ میں دوڑ کے اوپر گئی۔ کھڑکی میں چقیں پڑی تھیں۔ میں نے دیکھا تو کوئی انیس برس کا سن۔ اٹھتی جوانی کے دن اور ایسا کہ میں کیا کہوں۔ انگریزی کپڑے پہنادو تو بالکل ولایتی معلوم ہونے لگے۔

جانی: بال بھورے تھے یا سیاہ یہ بتاؤ پہلے۔

آسمان: بھورے نہیں بالکل شب رنگ جھلکتے ہوئے۔

جانی: خیر۔ اور آنکھیں۔

آسمان: آنکھیں اور کان دیدنہ شنید (مسکرا کر) افسوس کن گنوارنوں میں بیٹھی ہوں۔ آ کے۔ میں نے کہا آنکھیں اور کان دیدنہ شنید کوئی سمجھ دار ہی نہیں۔

جانی: بس ایک تم سمجھ دار ہو، اور سمجھ دار کی ہر جگہ خرابی۔ اب بات ختم کرو۔ ہاں تم نے وہ لڑکا دیکھا پھر۔

آسمان: بڑی دیر تک میں گھوراکی، اور میں نے دعا مانگی کہ یا خدا باجی جان کا دل پھر جائے اور اس نوجوان خوبرو کے ساتھ ہماری شادی ہو تو عمر بھر ہنسی خوشی بسر کریں۔ چھریرا بدن۔ دراز قامت۔ ہنس مکھ، دیدارو جوان اور خوب صورتی کا حال تو بیان ہی کر چکی ہوں، مہری کی چھوکری نے کان میں چپکے سے کہا۔ حضور یہ شعر بھی کہتے ہیں، اور حکیم صاحب کے پاس جاتے ہیں۔ شعروں تک تو خیریت تھی جب حکیم صاحب کا نام لیا تو میں کیسی ڈر کر چونکی۔ ایں یہ حکیم کی دربارداری کیوں کرتے۔ کیا خدانخواستہ کوئی عارضہ ہے۔ اُس نے میری تشفی کی۔ معلوم ہوا کہ وہاں جا کے طب سیکھتے ہیں، خیر ڈھارس ہوئی۔ تھوڑی دیر میں وہ چوک کی طرف چلا گیا، اور میں تڑپتی رہی۔

جانی: لگی بُری ہوتی ہے بہن۔ ہاں!۔

مبارک: اور تمہیں شرم نہیں آتی کہ صاف صاف سب باتیں کر رہی ہو، کچا چٹھا بیان کر دیا۔ اے واہ، واہ، واہ۔

جانی: تو کیا کہا گیا۔ یہی کہا نہ کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ شادی ہو، پھر اس میں کون گناہ ہے یہ بھی کوئی عیب ہے بھلا، اور اپنے سن والیوں میں بیان کیا تو کیا برا کیا۔ تم تو بوڑھیوں کی سی بات کرتی ہو۔

آسمان جاہ نے اس تقریر کے بعد سلسلہ سخن یوں شروع کیا۔ رات پہاڑ ہو گئی۔ کاٹے نہ کٹی۔ کروٹیں بدلاکی، مگر اس کا خیال دل سے نہ گیا، ایک بجے کے وقت چاندنی نے کھیت کیا، ایسی نکھری ہوئی چاندنی کہ سوئی دور سے نظر آئے۔ مہتاب معشوقوں کی طرح منظر فلک سے جلوہ افگن ہوا تو میں گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ مگر مفلس کی جوانی اور جاڑے کی چاندنی۔ چاندنی چھٹکتی ہے طبیعت تو خوش ہو گئی مگر ایک ساعت کے لئے۔ میری چچازاد بہن نے جو میری یہ کیفیت دیکھی تو پریشان ہو گئیں، پلنگ سے پلنگ ملا تھا۔ کہا کیوں کیوں، آسمان خیریت تو ہے آج کیا ہے کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر کروٹیں بدل رہی ہو۔ میں نے کہا کچھ نہیں۔ کیا جانے کیا سبب ہے کہ آج نیند نہیں آئی، اور طبیعت بھی کسی قدر بے چین ہے۔ اتنا میرا کہنا تھا کہ انھوں نے گھر بھر میں کھلبلی مچا دی۔

مغلانیوں کو جگایا۔ پیش خدمتوں کو آواز دی۔ یہاں تک کہ امی جان بھی اپنے کمرے سے نکلیں، اور پھپھی جان بھی دوڑی آئیں۔ خیر ہے خیر ہے۔ کیسی طبیعت ہے بیٹا۔ کوئی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی تھی۔ اُف۔ کیسا جل رہا ہے۔ کوئی نبض پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ خفیف خفیف تپ بھی ہے۔ کسی نے کہا، پان پنڈا ٹھنڈا ہے۔ اب میں کس سے کہوں کہ مجھے نہ بخار ہے، نہ ماتھا جلتا ہے، نہ کوئی عارضہ ہے۔ نہ کسی قسم کا مرض۔ میں عشق میں گرفتار ہوں۔ اماں جان نے فرمایا، چوبدار کو حکم دو کہ میانہ نکلوائے، اور مسجد کے پاس جو حکیم صاحب رہتے ہیں۔ ان سے کہئے کہ بیگم صاحب نے بلایا ہے۔ چلئے بڑا ضروری کام ہے۔ میں لاکھ لاکھ سمجھاتی ہوں، کہ اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ میں اچھی ہوں، مگر گھر بھر ایک طرف کہ حکیم صاحب کو ضرور بلانا چاہیئے؛ میری ایک نے نہ سنی مگر نہیں نہیں۔ ہاں ہاں کیا ہی کی مہری نے چوبدار کو حکم دیا۔ کہاروں نے میانہ اٹھایا، اور حکیم صاحب کے یہاں داخل ہو گئے۔

حکیم صاحب آئے نبض دیکھی، سمجھ گئے، کہ لڑکی خاصی اچھی بھلی چنگی ہے، مگر وہ باتیں کیں، کہ توبہ ہی بھلی۔ میں دل ہی دل میں بہت ہنسی۔ حکیم صاحب نے دو نسخے لکھے۔ لمبے چوڑے۔ پانچ ہزار روپے دیئے گئے۔ بڑے اصرار سے قبول کیا۔ گلوریاں چکھیں۔ الائچی کھائی، عطر ملا۔ چلتے وقت فرمایا کہ خیر۔ بیگم صاحب کی خاطر سے میں نے اس وقت پانچ روپیہ قبول کر لئے۔ لیکن جس روز صاحبزادی کا غسل صحت ہو گا۔ اس روز لڑ دوں گا۔ حکیم صاحب تشریف لے گئے تو میں نے امی جان سے کہا خدا کے لئے مجھ کو اس دوا سے بچاؤ۔ اللہ جانے کیا گھانس پھونس لکھ گئے ہوں گے، اور میں عنایتِ ایزدی سے چنگی ہوں۔ مجھے کسی طرح کی شکایت نہیں میں تو کہتی ہی تھی کہ حکیم صاحب کو ناحق بلاتی ہو، مگر آپ نے نہ مانا۔ اب مجھے اس دوا سے معاف رکھیے؛ امی جان نے کہا اچھا اگر تم کو اس قدر خیال ہے تو خیر جانے دو۔ مطلب تو تمہاری صحت سے ہے۔ فقط مہری کی چھوکری میرا دلی حال جانتی ہے، اور کسی کو نہیں معلوم تھا۔ دس بارہ روز تک میں ہر روز اس کو دیکھا کی، اور بی ہمسائی نے بھی آنا جانا شروع کیا۔ شادی تو اس کی ساتھ نہیں ہوئی۔ مگر بی ہمسائی نے ہمیں برق کر دیا:

الٰہی دے اثر ایسا مری بینائیِ دل میں
چلے آئیں کلیجہ تھام کر وہ میری محفل میں

اس شعر کو آسمان جاہ نے نازک آوازی کے ساتھ آہستہ آہستہ ادا کیا تو سب نے تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ آسمان جاہ نے کہا کہ بی شاہزادی کو سامنے بٹھا دو۔ بھلا گائیں تو ہمارے مقابلے میں جو آواز بھی نکل سکے۔

شہزادی: (زنانہ کے ساتھ ہنس کر) اے حضور ہماری کیا طاقت ہے۔ حضور کتنا نور کا گلا پایا ہے کہ واہ۔

آسمان: یقین نہیں آتا۔ ع

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

شہزادی: اے لو اور سنو۔ اللہ جانتا ہے۔ میں تو خود ہی کہتی ہوں کہ آواز حضور نے اچھی پائی ہے۔ گلا پیارا ہے
آسمان: اچھا یہ غزل گاؤ مگر ذری دل لگا کے:

اس کا ہے کون جس کی مدد پر خدا نہ ہو — ڈوبے وہ ناؤ جس کا ناخدا نہ ہو
اوج و حضیض لازم و ملزوم ہیں کہاں — کوئی بھلا بڑھا ہے کہ آخر گھٹا نہ ہو

راحت فزا نہیں ہے برائی میں تو ل پھر
سب کا بھلا ہو اور کسی کا بُرا نہ ہو

شہزادی: یہ غزل تو آپ کی زبانی سُنی اور جو کوئی غزل یاد ہو۔ کہیئے تو گاؤں:

تازہ ہے چمن حمد خدائے دو جہاں کا
کچھ دخل نہیں گلشنِ قدرت میں خزاں کا

حشمت بہو: ہاں بس یہی گاؤ۔ یہ ہمیں بہت پسند ہے۔ اِسی میں تو یہ شعر ہے (دیکھو صدفِ جسم میں عالم دُرِ جاں کا)

اب دولھا کے ہاں کا ذکر سُنیئے! وہاں دُلھن کے گھر سے زیادہ دھوم دھام تھی۔ نوجوان شہزادے اور نواب زادے جمع تھے۔ دولھا سے برابر والے دل لگی کر رہے تھے۔

ایک: ارے یار آج تو بے سُرور جائے جانا فضول ہے۔
دوسرا: نوشہ کو ایک جام ضرور پلا دینا بھئی۔
تیسرا: خدا کے لئے اس مردار مینا بازار کی رہنے والی کا نام زبان پر نہ لاؤ۔ عجب قَطعُ کے آدمی ہو۔ لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ۔
دولھا: (آہستہ سے) یہ دونوں پی کے آئے ہیں۔
ایک: ارے میاں خدا سے ڈرو۔ پینے والے کی ایسی تیسی۔
دوسرا: ہونھ! یہاں پینے والے کو کچھ کہتے ہیں۔
دولھا: ضرور پی کے آئے ہیں۔ اور دونوں کے دونوں غین ہوں گے۔ یہ مردک جب پیتے ہیں قسم کھا لیتے ہیں کہ یا تو بیہوش ہو جائیں گے یا گر پڑیں گے۔ اے لعنتِ خدا۔ پھٹے منہ۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ۔ آپ ہماری برات کے ساتھ نہ چلیئے۔

اِن صاحب نے کہا۔ آپ شراب کے لطف کیا جانیئے۔ مرزا نوشہ غالب۔ سرور خوب کہہ گئے ہیں:

براست انچہ ہندوستاں کشند از قند — ہم از فرنگ بہار ارنباشد از شیراز

دیوان خانے میں ثقات مسن بزرگ لوگ حضرت آدم کے ہمسر بیٹھے تھے۔ آصف الدولہ نصیر الدین حیدر کے وقت کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک مولانا صاحب اب وہ زمانہ ہے نہ وہ وقت ہے نہ وہ لوگ ہیں۔ بس خانہ نشینی اختیار کرلی۔ ہمارے ایک پُرانے آشنا تھے۔ ان کے پاس کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ مگر اب کس کے پاس کیا جائیں کوئی ملنے کے قابل ہی نہیں۔ ملاقات کس سے کریں (مولانا) حق ہے اور علم فضل کی تو اب قدر ہی نہیں۔ لکھے پڑھے آدمی کو کوئی پوچھتا کاہے کو ہے، نہ منطق کی قدر، نہ علم ادب سے واسطہ، نہ شعر شاعری کا چرچا۔ میں کیا عرض کروں خواجہ صاحب وہ لوگ نظر ہی نہیں آتے۔ یا الٰہی یہ کیا ہوا۔ یہ کیسی ہوا بندھی، اور جناب آج کل وہ زمانہ ہے کہ ایک گالی کھائے مگر جواب نہ دے۔ بھل منسی اسی میں ہے ورنہ دوسرے روز عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوگا۔ (خواجہ) لابُد۔ بے شک، اصل بات ہے۔ ایسا ہی ہے، جناب والا بڑا نازک وقت آگیا ہے۔

ایک صاحب نے کہا اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اُس زمانے میں دس بیس تیس چالیس کی عموماً نوکریاں تھیں، مگر واہ ری برکت۔ ایک بھائی گھر میں نوکر ہے، اور دس بھائی اس کے سبب سے کھانا کھاتے ہیں۔ بارہ دری میں ناچ ہو رہا تھا۔ نوجوان اور رنگین طبع، اور رنگیلے آدمی بارہ دری میں ڈٹے ہوئے تھے۔ دولھا کے والد ماجد بزرگوں کے پاس بیٹھے۔

اتنے میں دولھا کی ماں نے مہری بھیجی۔ مہری نے خدمتگار سے کہا کہ دولھا کو اندر بھیجو۔ میاں سے کہدو کہ اندر سے کہلا بھیجا ہے، کہ نوشہ کو اب بھیجئے۔ رات زیادہ آئی ہے۔ نہانے کے لئے بلایا ہے۔ نوشہ مُعا محلسرا میں چلے خدمت گار نے بلوری آگا دکھایا۔ دربان نے محل کا پردا اٹھایا۔ اندر داخل ہوئے۔ منڈھے کے چاروں طرف منقش بند منوار بندھا ہوا تھا۔ آم اور امرود اور نارنگیاں لٹک رہی تھیں۔ نیچے ایک سوا ایک گورا کھڑا تھا۔ ایک لنگی پر اکیس ٹونٹی کا بدھنا رکھا تھا، بدھنے میں جَو لگے ہوئے تھے۔ دولھا کی ماں نے باآواز بلند کہا، لڑکیوں کو منع کردو، کہ کوئی چھینکے وینکے نہیں، خبردار کوئی چھینکنے نہ پائے، گھر بھر میں بچوں کو منع کردیا کہ جس کو چھینک آئی ہو ضبط کرے۔ اب دل لگی دیکھئے کہ اس ٹوکنے سے سب کو چھینک آنے لگی۔ کسی نے ناک کو انگلی سے دبایا، کوئی لپک کر باہر چلا گیا، اور بیگم صاحب کا نادری حکم کہ خبردار کوئی چھینکے گا تو وہ جانے گا۔ دولھا تے لُنگی باندھی، چوکی پر آئے۔ بدن میں اُبٹنا ملا گیا۔ سر میں بیسن ڈالا۔ دولھا کی بہن سر میں پانی ڈالنے لگیں

دولھا: اُفوہ۔ کتنا سرد پانی ہے، اور ہوا بھی اس قدر تیز ہے کہ مَعاذاللہ مَعاذاللہ ٹھٹھرا جاتا ہوں۔

مغلانی: (بوڑھی) پھر حضور شادی کرنا کچھ دل لگی ہے۔

بیگم: (عزیز) اور نہیں تو کیا۔ سردی کیا ہے اور ہوا کیا ہے۔ جوڑی پانا دل لگی بازی ہے۔

دولھا: اُفوہ۔ قسم خدا کی آج بڑی ٹھٹھرن ہے۔

بیگم: (عزیزنسا دل میں تو خوش ہوں گے۔ ظاہر داری بھی تو کتنی، اور آج تمہیں بھلا سردی لگے گی۔ توبہ۔ توبہ۔

جب غسل سے فراغت پائی، تو دولھا نے کھڑاؤں پہنی۔ چادر اوڑھی۔ کمرے میں آئے۔ خواص کشتی میں خلعت لگا کر لائی، دولھا نے کپڑے پہنے، مشروع کا پائجامہ، انگرکھا جامدانی کا۔ اس پر جامہ تمامی کا بیش قیمت کارچوبی خلعت زیب بر کیا۔ سر پر دستار، صیغہ، کلغی لگائی گئی۔ کلغی کے اردگرد گوہر آبدار، اور بیچ میں زمرد کا خوش رنگ نگینہ۔ کمر میں شالی پٹکا کشمیر کا بنا ہوا۔ پگڑی پر پھولوں کا سہرہ، یاقوت زمردی پٹرھن لگی ہوئیں۔ اس کے بعد دوشالہ سبز رنگ اوڑھا۔ ہاتھ میں سرخ ریشمی رومال۔ اکے روشن ہوئے۔ ٹاٹ بافی پھندنے دار قیمتی بوٹ پہنا، اور اندر سے تشریف لے چلے۔ ماں بہنوں اور خواصوں نے کہا بسم اللہ، نوشہ خوش باہر تشریف لے گئے۔ بیگم صاحب نے لڑکیوں اور اعزہ سے کہا۔ اب چلنے کے تیاریاں کرو۔ برات تھوڑی دیر میں جانے والی ہے۔ ہم کو پہلے سے پہونچ جانا چاہیے۔ مہری ان سے جاکے کہو پہلے سواریاں سوار ہولیں، پھر برات جائے۔

ادھر دولھا کی بہنیں نواب بیگم، اور خورشید بیگم، اپنے اپنے کمرے میں گئیں، اور نکھرنے لگیں، خواصوں کو حکم دیا کہ کپڑے لاؤ۔ پائجامہ گرنٹ کا پر بہار۔ گوٹ کنی دار۔ اس پر تھل ٹکے ہوئے۔ بیل بنی ہوئی۔ گاج کا دوپٹا۔ بیچ میں فروی بوٹی کے ستارے کی چمک۔ انگوری بیل کی جھلک۔ موتیوں کی کارچوبی، بنت فوق البھڑک۔ بادلے کے آنچل بیش بہا، نایاب خوش نما حسن دان، آئینہ سامنے رکھا ہوا ہے۔ چوٹی گندھ رہی ہے۔ شیشیاں آئیں۔ عطر لگایا۔ پیش خدمتوں نے صندوقچے سے زیور پہنایا، یہ تو نواب بیگم کے ٹھاٹھ تھے خورشید بیگم نے فیروزی گرنٹ کا پائجامہ پہنا۔ کلیوں پر چٹکی اور لوزات کی گوٹ لگی ہوئی۔ گوٹ پر گوکھرو کی تحریر لاجواب بے نظیر۔ دوپٹا ڈھاکے کی ململ کا۔ پیازی رنگا ہوا ہلکا۔ انھوں نے بھی زیور بیش قیمت سے جوبن کی آگ کو بھڑکایا، اور طرّہ اس پر یہ کہ مست کرنے والا عطر لگایا۔ خواصوں مغلانیوں پیش خدمتوں مہریوں، اصلیوں کو حکم ہوا کہ کپڑے بدلو۔

احمدی خانم نے پٹارہ، دست بقچہ، صندوقچہ، ہرکاروں کے سپرد کیا۔ انھوں نے بہنگی پر رکھوایا۔ دونوں بہنیں ہر ہفت آرایش سے مزین ہو کر آئیں، تو ایک ٹھٹھول منجھلی نے کہا، اُنھ اُنھ! آج تو عالم ہی اور ہے یہ فوق البھڑک لباس اور یہ عطر روح کی بوباس۔

بیگم: (دولھا کی ماں) ان سے کہو پہلے لڑکیوں کے لیے سواریاں بھیجیں۔

مہری: (باہر جاکر) حضور صاحبزادیاں سمدھیانے جانے کے لیے تیار ہیں۔ سواریاں بھجوائیے۔ وہاں ہماری کوئی سنتا ہی نہیں۔ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

نواب :۔ (دولھا کے باپ) سکھ پال اور جھپان نکالو، اور دروازہ پر لاکر لگاؤ۔ کہہ دو بہت جلد نکالیں فوراً لائیں۔

مہری : (اندر جاکر) حضور سواریاں نکالیں گئیں۔ چلیئے۔

مہریوں نے سکھپال اٹھایا۔ نواب بیگم ادائے دلربا کے ساتھ سوار ہوئیں، ان کے بعد جھپان آیا۔ چھوٹی بہن بصد ناز و کرشمہ متمکن ہوئیں۔ بسم اللہ کہہ کر کہار چلے۔

دائیں بائیں مہریاں۔ مشعلچیوں کے ہاتھ ہیں دستیاں کپیاں۔ آگے آگے خاص بردار، سلیقہ شعار سپاہی اور خدمت گار، پگڑیاں سرخ سرخ گولہ دار۔ مقیش کے پھندنے لٹکتے ہوئے۔ جس طرف سے سواری مثل باد بہاری نکل گئی، ہر کوچہ و برزن عطر کی بوباس سے بس گیا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ پریوں کا اُڑن کھٹولا ہے مہریاں چھکی ہوئی جاتی تھیں۔ جوبن اور شوخی پر اتراتی تھیں۔ اس کے بعد بیگم صاحب نے حکم دیا کہ اوراغرہ کے لیے فنس لگاؤ۔ سب سوار ہوئیں۔ فنسوں پر کم خواب زربفت، سبز گرنٹ، زنگاری اطلس کے چھتکے۔ بنّت لگی ہوئی۔ مغلانیاں پیش خدمتیں اور آبدار خانہ کی عورتیں، جو پہلوں پر سوار ہوئیں فینسوں کے بغل ہیں، مہریوں کے ہاتھ میں اِتّے، اور ایک ایک بُرق دم مہری فنس کا پایہ پکڑے ہوئے ساتھ تھی، دو دو چپراسی اور دو دو ہرکارے اور مشعلچی دستیاں روشن کیے، ہر فنس کے ساتھ چلے، ماماؤں، اصیلوں، جشنو گرجنوں کے لیے رتھ لگائی گئی۔ بہت تیار ناگوری بیل جتے ہوئے۔ گلے میں گھنگرو و پٹرے ہوئے، ماتھا اور پاؤں مہندی سے، اور سینگ سیندور سے رنگے ہوئے، دس پانچ پنج تناخے والے ساتھ ہو لیے۔

بیگم : (مادرِ نوشہ) سب سوار ہوگئیں اچھی طرح سے۔؟

مہری : ہاں حضور۔ مہریاں ادھر اُدھر ساتھ ہیں۔

بیگم : لڑکیاں تو اب پہنچ گئی ہوں گی۔ سمدھیانے ؟

مہری : جی ہاں سرکار۔ کہار سکھ پال لے کے ہوا ہوئے۔

بیگم : کپڑے نکالو۔ ہم بھی چلیں اب دیر ہوتی ہے۔ گرنٹا کا آسمانی پائجامہ۔ ململ کا ہلکا رنگا ہوا بادامی دوپٹا ہاتھوں میں ہیرے کے سادے کڑے۔ کانوں میں تین تین انٹیاں۔ فیروزہ، زمرد کی انگوٹھیاں پہنیں۔ فنس پر سوار ہوئیں۔

اب سُنیئے، کہ نوشہ کے باہر آتے ہی۔ ہم سنوں، عزیزوں، دوست احباب نے مذاق شروع کیا۔ حضرت آج تو آسمان پر دماغ ہے، واہ آسمان کی ایک کہی یہ نہیں کہتے کہ فلک الافلاک پر ہے، اور کیوں نہ۔ دلھن بھی عنایت ایزدی سے ایسی پائی ہے کہ لاکھوں میں انتخاب، کروڑوں ہیں لاجواب۔ آپ تو اس طرح تعریف کرتے کہ گویا دیکھ ہی آئے ہوں۔ تو کیا کچھ ڈر ہے۔ دولھا کی طرف مخاطب ہوکر کیوں بھائی جان ہمیں ایک نظر دیکھنے دو گے۔ بولو بھئی۔ اللہ رے تیرے غرور اب اس وقت

بول چکے ذرا قطع شریف تو دیکھئے۔ ماشاء اللہ بھئی نہ ہنسواؤ۔ خدا کے واسطے نہ ہنسواؤ۔ آج نوشہ بنے ہیں۔ کل پیٹ بھر کے چھیڑ لینا۔ کل تو اور بھی زمین پر قدم نہ رکھیں گے کل ان کا پتا کہاں ملے گا۔ شام ہی سے داخل دفتر۔ لاکھ بلاؤ آتا کون ہے۔ سر پھوڑ ڈالو، سنتا کون ہے۔ اس پر ایک صاحب نے کہا۔ حضرت اب دل لگی ہو چکی۔ آخر دل لگی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ وہ تو بول نہیں سکتے اور آپ چھیڑ خانی سے باز نہیں آتے۔ کل دل لگی مذاق کیجئے، تو پھر سیر دیکھئے، ہمارے نواب بھی وہ فقرے چست کہیں کہ سب کے سب بند ہو جائیں۔ ماشاء اللہ لفاظ فقرہ باز، خوش مذاق، ظریف، لطیفہ گو بذلہ سنج کل کا دن بدلو نہ پھر۔ اب بیچارے کو کیوں جھپاتے ہو خواہ مخواہ۔

دولھا مسکرا مسکرا کر خاموش ہو رہتا تھا۔ آدمی تھے طبیعت دار، جی چاہتا تھا کہ جواب دیں، مگر ادب مانع تھا۔ سو، ادب کا خیال اجازت نہیں دیتا تھا۔ کہ جواب دیں۔ دولھا کے پدر بزرگوار نے مہتموں سے پوچھا کہ جلوس سب آ گیا۔ کیا کچھ باقی ہے۔ دولھا کے والد ماجد بارہ دری کے باہر جلوس دیکھنے آئے، کہا کہاں کہاں کا جلوس آنا باقی ہے۔ تاکید کرو۔ روتوں، ہرکاروں، چوبداروں، کو دوڑا دو۔ کہو صاحب اب دیر ہوتی ہے۔ جلوس بھیجئے۔ ایک چوبدار نے عرض کیا کہ خداوند نواب تجمل علی خاں بہادر کے ہاں سے ابھی ہاتھی نہیں آئے۔ حکم ہوا کہ ان کے داروغہ سے کہو فیل خانے والوں کو فوراً تاکید کرے۔ کل ہم نواب صاحب کو خود لکھیں گے۔

اتنے میں نواب تجمل علی خاں بصد زیب و تجمل مع رُفقا تشریف لائے۔

نواب: دولھا کے باپ یا دش بخیر۔ آداب عرض ہے۔

تجمل علی خاں: تسلیم۔ تسلیم۔ اب کیا دیر ہے حضرت، کے بجے؟

ن: دیر فقط حضور ہی کی تھی، اور کسی کی دیر نہیں ہے۔ آپ کے ہاں سے ہاتھی ابھی تک نہیں آئے۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ اور اُوپر سے آپ بھی ہمیں کو للکارتے ہیں معقول۔ شانِ خدا۔

تجمل: بجا۔ دونوں موجود ہیں۔ ہاتھی بھی اور پاٹھا بھی۔

ن: سبحان اللہ۔ ہاتھی اور پاٹھے کی ایک ہی کہی۔

تجمل: لاحول ولا قوۃ۔ ہاتھی نہیں ہتھنی سہی۔

میرزا: (سہی) کی ایک ہی کہی۔ کہئے آپ کی ہاتھی اچھی رہی یا ہتھنی۔ آپ نے خریدا یا نہیں خریدا۔

تجمل: اب برات کی تیاری ہو حضرت۔

میرزا: سب لیس ہے۔ دیکھئے کیسی برات نکلتی ہے۔

پہلے دولھا کی بہنوں کی سواریاں پہونچیں۔ پردہ گرایا گیا۔ نواب بیگم، اور خورشید بیگم اُتریں۔ دُلہن کی بہنیں تا درِ خانہ پیشوائی کے لئے آئیں۔ ہنسی خوشی استقبال کیا۔

حشمت بہو: اے ہے۔ کس قدر پھونک پھونک کے قدم رکھتی ہو۔
خورشیدی: زمانہ ہی ایسا نازک آگیا ہے بہن۔
حشمت: سچ! اور تم تو اگلے وقتوں کی ہو۔
نواب بیگم: کیسی کچھ بوڑھی ہوگئیں۔ بیچاری اب۔
حشمت: گھنٹوں سے آپ کی آمد آمد لگی۔ اب آتی ہیں۔ اب آتی ہیں۔ بارے خدا خدا کر کے تشریف لائیں۔
ایک سجا سجایا کمرہ ان کے لئے تجویز آگیا تھا۔ دونوں بہنیں جا کے بیٹھیں۔ پیش خدمتیں، خواصیں وغیرہ آئیں۔ کمرہ خوش رنگ سبز رنگا ہوا۔ فرش صاف۔ دری چاندنی غالیچہ چینی۔ سُرخ چھت گیری۔ اِدھر اُدھر چاندی کی پلنگڑیاں۔ حشمت بہو سے باتیں ہوتی ہی تھیں، کہ کسی نے آہستہ سے یہ شعر گاتے ہوئے کمرے کے دروازے پر ہاتھ مارا۔ آواز سے معلوم ہوا کہ کوئی کم سن اور خوش گلو عورت ہے۔

بہرِ دعائے وصل نمازیں پڑھا کئے
اللہ سے جھکے بُت مغرور کے کئے

اتنے میں آسمان جاہ کمرے میں تشریف لائیں، اور مسکرا کر کہا بندگی۔ دولھا کی بہنوں نے بندگی کا ہاتھ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ پوچھا یہ آہستہ آہستہ کون گا رہی تھیں۔ آسمان جاہ کب باز رہنے والی تھیں، کیوں۔ جسے گانا آتا ہے، وہ ضرور گائے گا۔ اگر تم کو اس میں دخل ہو تو کوئی ٹھمری سناؤ۔ اس وقت سننے کو چاہتا ہے۔ حشمت بہو نے اشارہ سے منع کیا اور آخر کار جھلا کر اٹھی کہ تم بڑی بدتمیز ہو۔ نہ موقع دیکھو نہ محل جو منھ پر آیا بک دیا۔ ان کے پاس بیٹھو۔ خاطر کرو۔ دولھا کی بہنیں ہیں۔ آسمان جاہ نے کہا کیا خفا ہوگئیں بہن اللہ جانتا ہے ہم نے سیدھے پن سے کہا تھا۔ بُرا نہ ماننا بہن۔ خدارا روٹھنا نہیں کہ آ گئی گئی میرے ماتھے جا۔ نواب بیگم نے ہنس کر جواب دیا۔ اے بہن روٹھنا منانا کیسا۔ اور تم نے کہا ہی کیا، جو ہم خواہی نخواہی منھ پھلائیں۔ حشمت بہو کی طرف مخاطب ہو کر بولیں۔ تم نے کاہے سے جانا بہن کہ اِن کی باتوں سے ہم بُرا مان گئے۔ مگر بے ادبی معاف، اگر ہرج نہ ہو تو وہی شعر اس طرح گائیے۔
آسمان: یہ میں نے دولھا کے حسبِ حال کہا۔ برسوں خدا سے دعا مانگی ہوگی، جب جا کے کہیں ایسی چاند سی دلہن ملی۔ چاند میں داغ ہے ان میں داغ نہیں۔ لاکھ دو لاکھ میں ایک ہے:

از باغ رخش بہار خارے
بر برگِ گلشن چمن نشارے

ایسی صورتِ زیبا پائی ہے کہ میں کیا کہوں۔ اب جب دولھا دیکھیں گے تو رُعبِ حسن سے بات کرنی مشکل ہو

جائے گی۔

خورشیدی بیگم: دولھا کیا کم ہیں۔ اللہ کے فضل سے مردوں میں ایسا خوبصورت بھی کم ہوگا۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔

آسمان: تو میاں بیوی کیا چاند سورج کی جوڑی ہو۔ ع

چندے خورشید چندے مہتاب

آسمان: دولھا کو چاہیئے کہ ایسی دلہن پائے تو دل سے خدا کا شکریہ ادا کرے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دولت ہوگی۔ روپیہ پیسہ، زر و زیور، جواہرات سب اس کے آگے ہیچ ہے۔ حسین بیوی بڑے خوش قسمت میاں کو ملی ہے۔

نواب بیگم: (حشمت بہو سے) ان کا نام کیا ہے۔

حشمت: ان کو نہیں جانتی ہو۔ واہ۔ آسمان جاہ۔

نواب: کیا! آسمان جاہ! واہ۔ یہ تو مردانہ نام ہے۔ آسمان جاہ، سلیمان جاہ، کسی بیگم کا نام نہیں سُنا۔

حشمت: اصل میں تو ان کا نام نازک ادا بیگم ہے، مگر ان کو یہی نام پسند ہے۔ ان کی ہمجولیاں سب ان کو آسمان جاہ کہتی ہیں۔

نواب: مگر ماشاء اللہ سے بڑی خوش تقریر ہیں۔

آسمان: چشم بد دور، چشم بد دور۔ دیکھنا کہیں نظر نہ لگ جائے خوش تقریر ہیں۔ خوب صورت ہیں! ادا کتنی پیاری ہے کہ ادا اس پر خود لوٹ ہو جائے۔ ایسی ویسی تھوڑا ہی ہیں کچھ۔

نواب: یہ تم کس کی تعریف کر رہی ہو۔ میں تو تمہاری تعریف کرتی تھی (مسکرا کر) اپنے منھ آپ۔

آسمان: (خورشیدی بیگم کی طرف اشارہ کر کے) اور میں اُن کی تعریف کرتی تھی، کیا میں نہیں اس لائق ہوں۔

اتنے میں ایک مہری نے کہا سمدھنیں آگئیں۔ سواریاں اُتر رہی ہیں؛ بڑی بیگم صاحب استقبال کو گئی ہیں۔ دلہن کی ماں نے دولھا کی ماں کی پیشوائی کی۔ ایک کمرے میں بصد تعظیم و توقیر بٹھایا۔ پوچھا لڑکیاں آگئیں۔ احمدی خانم، داروغہ بھنڈی خانہ نے کہا ہاں حضور اس کمرے میں صاحبزادیاں تشریف رکھتی ہیں۔ کہا لڑکیوں سے جا کے دریافت کرو کہ کچھ کہنا تو نہیں ہے؛ اس نے واپس آن کر کہا۔ حضور بڑی صاحبزادی نے فرمایا کہ میں کل رات کی تھکی ہوں؛ اور آج دن کو بھی سونے کی نوبت نہیں آئی۔ ذرا آرام کر لوں، تو حاضر ہوں۔ مگر چھوٹی صاحبزادی نازک ادا بیگم صاحب سے باتیں کر رہی ہیں۔ دلہن کی ماں بولی۔ واہ یہ نہ ہوگا کہ آن کے سو رہیں۔ ان کو بُلوا لیجئے۔ احمدی خانم بلا لو۔ کہو یہاں محفل میں آن کے بیٹھے۔ آج گانا سُنئے، ناچ دیکھئے۔

ہنسنے بولنے کا دن ہے، یا سو رہنے کا۔ کل دن کو جس قدر جی چاہے سو لیں۔ محفل میں وہ مسندیں لگی ہوئی تھیں؛ ایک طرف زرد کاشانی مخملی مسند۔ اس پر کار چوبی کام۔ دوسری جانب سبز۔ نواب بیگم اور خورشیدی بیگم چھم چھم کرتی ہوئی تشریف لائیں۔ حشمت بہو اور نازک ادا بیگم ہمراہ تھیں؛ اِن دونوں نے دولھا کی بہنوں کو مسند پر بٹھا دیا۔ حکم ہوا کہ ڈومنیوں کو بلاؤ۔ کہو ناچ شروع ہو۔ محفل قابل دید تھی۔ بلکہ دید تھی نہ شنید تھی۔ غنچہ کھلا ہوا تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ پریاں قاف سے آئی ہیں۔ حورانِ جنّت کی کیا حقیقت تھی۔ دلہن کج کلاہ؛ خوش نگاہ؛ حشمت بہو، مشکیں مو۔ نازک ادا بیگم (دیٹی آسمان جاہ) گلفام غیرت مہر و ماہ۔ جانی بیگم شگفتہ رو؛ مبارک محل پسندیدہ خو۔ بی فیضن سادہ مزاج۔ مگر یہ سادگی بھی جوبن سے کم نہ تھی۔

اب دولھا کے ہاں کا ذکر سنئے۔ مہتمان سلیقہ شعار نے برات معشوقوں کی طرح سجائی۔ سب کے آگے نشانِ فیل کوہ شکوہ پر پھریرا اڑ رہا ہے۔ گویا زبان حال سے کہتا تھا کہ فتح و ظفر ہم رکابِ نوشاہ قدسی مآب ہے نشان کے ہاتھی کے سامنے انار اور ہزارے چھٹ رہے تھے، اور جا بجا مہتابیں روشن تھیں۔ سفید مہتاب کے مقابل میں چاندنی گرد تھی۔ سُرخ مہتاب سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یاقوتِ احمر پیس کر ہوا میں ملا دی گئیں ہیں، اور سبز مہتاب یہ دیکھ کر تماشائی کہتے تھے، چاندنی کا سبزہ میں کھیت کرنا اسے کہتے ہیں۔ انگریزی باجے والوں کی دھوم دورویہ بازاروں، اور چھتوں پر تماشائیوں کا ہجوم۔ گھوڑے صرصر تک، صبا رفتار۔ عنبریں دم، ضیغم شکار تیز و سبک زیور سے از سرتا پا لدے ہوئے۔ سائیس سلیقے سے باگ لئے ہوئے۔ دو سپاہی اِدھر اُدھر ساتھ۔ کلغی زیب سر طرارے پھیرتے جاتے ہیں۔ تماشائی انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ کوئی سُرنگ کوئی مشکی کوئی نقرۂ خنگ۔ لمعۂ مشرق چشمکِ برق۔

گلگوں فرسان عنبریں موی	دربا گہراں آتشیں خوی
پیچیدہ ہوا بعنبریں دم	پے کردہ صبا باہنیں سُم

گھوڑوں اور ہواداروں پر نواب زادے، شہزادے، سوار کم سن، مگر شوخ طبع سمجھ دار۔ ادھر فرس غوغا دم نے کنوتی بدلی، اور انھوں نے شہسواروں کی طرح ران پڑی جمائی۔ اِس پر بھی شرارت کی تو مار کھائی۔ چابک اٹھایا اور شراب سے جمایا۔ نوشہ کے سامنے شہنائی جس نے سُنا گردن ہلاتی۔ واہ میاں غوثی کیوں نہ ہو۔ اپنے فن کے تم بھی یکتا ہو۔ لاجواب بے ہمتا ہو۔ ایک ایک لفظ صاف سُنائی دیتا ہے۔ راگ اور راگنی کو اپنا کئے لیتا ہے الغرض۔

گلگوں تھا کسی کا بادِ رفتار	گلرنگ کسی کا تھا ہوا دار
ہاتھی تھے تو بستیوں کی دھت تھی	گھوڑے تھے تو چابکی کی لت تھی

نشانوں کے ہاتھی کے ساتھ ایک نواب صاحب منتظم تھے۔ اور اُن کے ہمراہ اُن کے کئی ہم سن دوست احباب باہم دل لگی ہوتی جاتی تھی۔ بات بات پر چھیڑ چھاڑ تھی۔

ایک: بھئی اچھی برات سجائی، اور خوب آتشبازی بنائی۔

دوسرا: حضرت آتشبازی کیا بنوائی ہے یوں کہئے کہ چاندی گلوائی اور چاندی جلائی۔

ایک: انار تو آسمان کی خبر لاتا ہے۔ مگر دھواں آسمان کے بھی پار ہو جاتا ہے۔ محمود آتش باز اپنے فن کا یکتا ہے۔ یہ آپ کی زبان ہے۔ یا پھلجڑی چھوٹ رہی ہے۔

دوسرا: آپ بھی واللہ دم چور ہیں۔

ایک: ماشاء اللہ۔ نوشاہ کی برات میں دم چور کا کیا کام ہے۔ اور تو اور، ہم اس کے قائل ہیں۔ کہ گندھک کا پتا ہی نہیں یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی، کہ گندھک کیا ہوئی، کچھ تو ہوئی۔ شاباش ہے محمود"۔ میاں محمود کی ہر سمت تعریف ہوتی تھی۔ واہ بھئی محمود واہ۔ کیوں نہ ہو۔ سبحان اللہ محمود دو ہاتھوں سے سلام کرتے جاتے تھے اور باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ آرائش کے تختوں کا وہ جوبن کہ جس نے دیکھا عش عش کرنے لگا۔ ایک ہاتھی ایسا نادر بنا تھا کہ نقل کو اصل کر دکھایا تھا۔ ہتھنی نے دھوکا کھایا۔ سونڈ سے سر کو سہلایا۔ جانور تو جانور بعض بعض تخت انسانوں کو مغالطہ دیتے تھے۔ خصوصًا چانڈو بازوں کا تخت تو ایسا بنایا تھا کہ چانڈو والوں کو شرمایا۔ ایک چانڈو باز نے جھلا کر کہا۔ اِن کمہاروں کو ہم سے عداوت ہے یہاں کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ مردودوں نے کیسی اوندھی اوندھی صورتیں بنائی ہیں۔ خدا ان سے سمجھے، ایک محفل کی تصویر ازبس دلچسپ اور خوشنما تھی، فرش مکلف پر لوگ بیٹھے ناچ دیکھ رہے ہیں۔ صدر میں مسند بچھی ہے اور نوشاہ تکیہ لگائے بیٹھا ہے۔ اور سامنے طائفے کا ناچ ہو رہا ہے۔ سارنگی والے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے مہری ساتھ ہے، نوجوانان رنگیں مزاج چوک کے کمروں کو تکتے جاتے تھے۔ نشان کے ہاتھی سے لے کر آخری ہاتھی تک برات کا اس قدر پھیلاؤ تھا کہ کسی نے کم دیکھا ہوگا۔ نوشہ بصد کر و فر، گلگوں زرّیں سُم پر سوار تھا۔ چہرہ سے دبدبۂ خسروی نمودار تھا:

فرزانہ شہے فلک شکوہ ہے — دانشِ منشے خرد پژوہ ہے
لطفش بہ بہارِ شادمانی — قہرش بسموم مہرگانی

اور شبدیز سبک خیر کی اٹکھیلیوں کا حال کچھ نہ پوچھیئے۔ جولانیوں پر تھا۔

بہم چشمی حور ساغر سمے — بہمدوشے حور گیسو دمے
سبک خیزیش خندہ زن بر نسیم — کہ در جنبش انگیز داز گل شمیم

ہم از بادِ صبحی شبک خیز تر
ہم از نکہتِ گل دلاویز تر

ہر سمت عیش و طرب کا سامان۔ ہر در، و دیوار نور افشاں؛ جامہ دری کی بہار تھی۔ عروسِ باغ پر نکھار۔ نو بہار، اور جوشِ جنوں۔

پیچھے ایک ہاتھی پر شہدوں اور غربا کے لئے ایک شخص روپیہ لٹاتا آتا تھا۔ شہدے غل مچاتے تھے، کہ لاَ بے او نواب! تیرا باپ تو زر دبیٹ کرتا تھا۔ تو سفید بیٹ کرتا ہے؛ مطلب یہ کہ نوشہ کے دادا نے ایک دفعہ اشرفیاں لٹائیں تھیں؛ یہ اس کا حوالہ دیا۔ صدہا شہدا ساتھ۔ ایک ایک پر دس دس گرے پڑتے تھے۔ جان پر کھیل کے باہم لڑتے تھے۔ وہ شور کہ کان پڑی آواز کا سننا محال تھا۔ اَبے اِدھر۔ اَبے اِدھر او موذی۔ ابے تجھ سے اللہ سمجھے۔ کچھ بچالے جائے، او کنجوس۔ خیر دولھا دلہن دعا مانگتے جاتے ہیں کہ الٰہی کہیں جلدی سے سویرا ہو، اور سویرا ہوتے ہی، شام ہو جائے۔ کہیں لیلیٰ شب صورت دکھائے۔ بغل گرم، اور دل شاد ہو۔ گھر آباد ہو۔ ثریا بیگم ہاتھ آئیں۔ نصیب جاگ جائیں۔ قمر طلعت معشوق ہو اور ہم ہوں:

جادو صنمی صنم فریبی
نگذاشتہ در جہاں شکیبی

اور دلہن یہ دعا مانگتی تھی، کہ یا خدا کہیں اس جھنجھٹ سے چھٹکارا پاؤں، تو لطف زندگی اٹھاؤں؛ اب تک ہمیشہ مصیبتیں ہی جھیلی ہیں؛ کچھ اور تو گو نہ عاقبت میں اماں پاؤں۔ مگر خدا کا شکر کہ پڑھا لکھا، اور شایستہ اور خوبرو شوہر پایا۔

در حسن بدلبری یگانہ	در عشق بہ بیدلی فسانہ
حسنی و بہارِ دلفریبی	عشقے و جہاں جہاں شکیبی

سہانا سماں نور کا تڑکا۔ سپیدۂ صبح نمودار ہی ہونے کو تھا، اور جوشے تھی درجۂ اعتدال۔ ہوا یں نہ اس قدر برودت کہ انسان گھنگر بن جائے۔ نہ اس قدر حرارت کہ انسان بھک جائے۔ جوشے تھی اعتدال پر تھی؛ چمنستان اور گلزار پُر بہار اور لالہ زار، اور باغ و راغ سب پر جوبن تھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر:

طاؤس چمن بجلوہ سازی	بلبل زجنوں بشعلہ بازی
خضرائے زمین شگفتہ گل گل	در سایۂ گل دمید سنبل
سنبل کفِ ہای سرد بستاں	خلخال بپائے نو عروساں

گل برگ چکاند چشمۂ نوش
رہ غنچۂ آتشیں جوش

بوی گل خاطر آویز۔ رائحہ باغ مشک ریز۔ عاشق شاد کی بغل میں معشوق پری زاد۔ خزاں روپوش ہے۔ ہنگامِ نوشا نوش ہے:

خون در رگِ لالہ جوش در جوش　　ریحان و بنفشہ دوش بر دوش
دریا دریا ز عنبر تر　　صحرا صحرا از مشک اذفر

یہ وہی ثریا بیگم ہیں، جو ابھی کل تک اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی تھیں۔ جن کا ساری خدائی میں ٹھکانا ہی نہ تھا اپنا نہ پرایا۔ جن کو معلوم نہ تھا کہ کہاں جائیں، اور کس کے پاس رہیں۔ کیونکر زندگی بسر کریں، وہی ثریا بیگم آج اس ٹھسّے سے دلہن بن کے بیٹھی ہیں۔ اور اس کرّ و فر سے ان کی برات آتی ہے۔ مفت کی ماں بھی اُن کو ملی، اور مفت کا باپ بھی انھوں نے پایا، اور مفت کی بہنیں بھی ہاتھ آئیں۔ کبھی چند روز اچھی طرح سے ایک مقام پر نہیں جمنے پائیں۔ مزاج میں وحشت انتہا سے زیادہ تھی؛ جنوں کے ہاتھ بک گئیں؛ دو دن ایک مقام پر رہیں، مگر جنون کے آتے ہی وہ مقام بھی چھوڑا۔:

پھر چلے دامنِ صحرا کی طرف آئی بہار
پھر ہوا جوشِ جنوں دستِ گریباں ہم سے

کبھی اس درجہ عفت نے مزاج میں دخل پایا کہ حوریں ان کے دامن پر نماز پڑھیں۔ اچھے اچھے صُلحا اُس کی پاکدامنی کی قسم کھائیں، اور کبھی وحشت نے یہ پٹی پڑھائی، کہ زنانِ بازاری کی طرح رہنے لگی؛

کیا خوب مزاج کا طریقہ ہے واہ　　کہ خضر کہے رہزنِ گم کردہ راہ
اے بندہ نواز تلوّن کیسا　　لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ

ناظرین کو یاد ہو گا کہ عین صغر سنی کے عالم میں اِس بُتِ نادان کے خود مطلب والدین نے ایک پیر فرتوت کے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی؛ صرف اس طمع سے کہ بوڑھا مالدار ہے؛ آج مرا کل دوسرا دن۔ مرے سے دولت ہمارے حصّے میں آئے گی چین کریں گے۔ بوڑھے میاں نے شادی کے دوسرے ہی دن شہر چھوڑا اور بی بی سے کہہ گئے کہ میں جوانی کی فکر میں جاتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد آؤں گا۔ ثریا بیگم تو ایسا دولھا چاہتی تھیں جیسے نواب صاحب ہیں۔ جوان خوش رو، خوش وضع، پیر مرد سے انھیں لطف کیا۔ ان سے تو کہا اللہ کرے بہت جلد واپس آؤ، مگر دل میں دعا مانگی کہ کل مرتے ہو تو آج ہی مر جاؤ۔ خیر ایک تو یہ زمانہ تھا، اس وقت میں بھی ثریا بیگم مغموم و ملول تھیں کہ بڈھا بہت جیا، برس چھ مہینے۔ سو وہ بھی بے حیائی سے۔ پھر اس کی دولت

ہماری ہو جائے گی۔ اس کے بعد ثریا بیگم نے رنگ بدلا۔ ثریا بیگم سے بی اللہ رکھی بھٹیاری ہوئیں۔ سرا میں رہنے لگیں۔ میاں آزاد پر عاشق ہو کر نکاح کی خواستگار ہوئیں۔ کچھ عرصہ تک سرا میں رہیں۔ بعد ازاں پھر رنگ بدلا۔ آزاد کے فراق میں جوگن ہو گئیں۔ اس حالت میں بالکل یکہ و تنہا۔ یک بینی دو گوش، سب سے الگ تھلگ رہنے لگیں۔ یہاں ایک وحشی نے ایسا ناک میں دم کر دیا کہ بھاگتے ہی بن پڑی، استانی جی کے ہاں رہنا شروع کیا۔ استانی جی کی تعلیم و تلقین نے ان کے دل پر بڑا اثر کیا، مگر تھانہ دار لاگ دانٹ کے سبب سے بیچاری کو یہاں سے بھی بھاگنا پڑا، اب شبو جان کا روپ اختیار کیا۔ ناظرین کو سلار و خدمتگار، اور وہ روئینو انجنٹ یاد ہوں گے۔ وہاں سے بھاگیں۔ چوٹوں اور ڈاکوؤں کے پلے پڑیں، یہاں بیٹرن کے نام سے مشہور ہوئیں۔ پھر ایک پولیس انسپکٹر سے سابقہ پڑا، آخر کار پادری صاحب کے ہاں آئیں اور مس پالیس نام ہوا۔

ان سب باتوں کے بعد اب نواب ثریا بیگم شوخ کی شادی ایک امیر ذوی الاحترام و عالی مقام کے ساتھ قرار پائی۔ وہ دُلہن بنی سر جھکائے ہوئے بیٹھی ہیں۔ اللہ رے انقلاب، یہ وہی اللہ رکھی ہیں، جو سرا میں بے حجاب رہتی، شہر بھر کے چکر لگایا کرتی تھیں۔ جو آزاد کے عشق کا دم بھرتی ہیں۔ یہ وہی شبو جان ہیں، جو رو ییو انجنٹ کے ہاں سے شب کو بھاگی تھیں، یہ وہی جوگن ہے جو میدان بیابان میں بالکل اکیلی رہتی تھی۔ جس کے ہاں ہر قسم کے مرد اور عورتیں بے دھڑک آیا کرتی تھیں۔ وہی ثریا بیگم آج حیا کے سبب سے گردن نیوڑائے سر جھکائے بیٹھی ہیں۔ سامنے شہزادیں، اور نواب زادیاں، اور امیر زادیاں چہل کر رہی ہیں۔ نہ نواب صاحب شگار گاہ سے جاتے نہ ثریا بیگم اس درجہ کو پہونچتیں۔ اِدھر نواب صاحب گھوڑے پر سوار تزک و احتشام کے ساتھ آتے ہیں۔ اِدھر یہ دلہن بنی ہوئی آن بان سے بیٹھی، دل میں دُعا مانگ رہی ہیں۔

واں زلف نے کھائے پیچ پر پیچ — طرفہ کلغی پہ یاں تھا سیر پیچ
آنچل ہوئے واں نقاب عارض — سہرا ہوا یاں حجاب عارض
واں گل سے بہار بوستاں تھی — آرایش تختِ گل یہاں تھی
بادل سے وہ واں گرج رہے تھے — یاں دھوم سے باجے بج رہے تھے

الماس کے واں تھے جھاڑ فانوس
یاں جلوہ فروش تختِ طاؤس

ثریا بیگم کے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے تھے۔ یا خدا! کہیں یہاں کسی کو نہ معلوم ہو جائے کہ مس پالیس ہے۔ یا خدا کوئی یہ نہ سن لے کہ سرا میں اس نے بود و باش اختیار کی تھی، تو پھر بڑی فضیحتی ہو۔ یا الٰہی کسی کو

کانوں کان نہ معلوم ہو، کہ بھٹیاری اللہ رکھی اسی کا نام ہے۔ ہے ہے ایسا نہ ہو۔ کوئی اس زمانے کی جان پہچان آجائے۔ ہے ہے میں تو پھر کسی مصرف ہی کی نہ رہوں۔ پھر تو کہیں کی نہ رہوں۔ اِدھر کی رہوں نہ اُدھر کی رہوں۔ یا خدا مجھ کو بچائے۔ شادی ہو جائے۔ پھر جو کچھ ہو گا سمجھا جائے گا۔ نازک ادا بیگم کی چھوٹی بہن، سر سیما جو اپنی سسرال سے برات کے ٹھاٹھ دیکھ کر آئیں تو تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ محفل میں آن کر کہا باجی جان۔ ایسی برات واللہ کبھی آج تک دیکھی نہ تھی۔ محل دار جب ہمیں فنس سے اتروانے آئی، تو ہاتھ جوڑنے لگی کہ میں بھی وہاں سے جا کے برات دیکھ آؤں۔ سانڈنی سوار اتنے ہیں، کہ میں کیا کہوں۔ سب سانڈنیوں کے پاؤں میں گھونگرو۔ اور تلنگوں کی کئی کمپنیاں ہیں۔ کالی کالی وردیاں جن سے دشمنوں کا منہ کالا ہو۔ اونچی اونچی جھنڈیاں جن سے براتیوں کا بول بالا ہو۔ باجے والوں کی بہت سی بلادریاں ہیں؛ اور لونڈے ٹٹوؤں پر وردیاں پہنے بیٹھے ہیں۔ کڑم دُھم، کڑم دَھم کر رہے ہیں۔ آوازِ دُہل و قرنا۔ اُفوہ کان کے پردے پھٹے جاتے تھے، ایک نئی بات دیکھی۔ کم سن کم سن چھوکریوں، مزدورنیوں کے ہاتھ میں کنول ہیں۔ اور اس قدر کی تیز اور صاف روشنی ہے، کہ میں کیا کہوں۔ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہاتھیوں پر شہر بھر کے شہزادے ہیں۔ شاید ہی کوئی آج نہ آسکا ہو:

بھالے والے بہت سجیلے جوان — برچھی بردار سب نکیلے جوان
ہاتھیوں پر امیریوں سارے — جیسے فیل فلک پہ سیارے
امرا شاہزادے سب ہمراہ — جلوہ گر اُن میں اس طرح نوشاہ

جیسے گل بلبلوں میں فوج میں شاہ
شمع پروانوں میں ستاروں میں ماہ

حشمت: تو بڑی دھوم سے آتی ہے، برات کیوں ؟

مہر سیما: برات کیا ایک طلسمات کا سماں نظر آتا ہے۔

آسمان: اور دولھا کیسا ہے۔ پہلے یہ تو بتاؤ ہمیں۔

مہر سیما: چندے آفتاب چندے مہتاب۔ ایسا خوب صورت گبھرو دیکھا نہ سُنا۔ یہ سینہ جیسے شیر کا۔ کمر چیتے کی سی۔ آنکھ بالکل ہرن کی سی۔ ہزار دو ہزار مردوں میں ایک ہے۔ دیکھنا کیسا جوبن ہے

آسمان: مجھ چھٹ، اور سب کے سب اس پر جان دینے لگیں۔ اس پر فرمائشی قہقہہ پڑا۔ حشمت آرا نے منع کیا۔ کہا واسطے خدا کے اب یہ باتیں رہنے دو۔ دولھا کی ماں بہنیں سب آگئی ہیں۔ اب ذری ان باتوں کو تہ کر رکھو۔

آسمان: لے لوچہ خوش۔ اے بی تم تو بات کرتے زبان پکڑتی ہو۔ واہ واصاحب۔ جب کی سند ہے کہ خود تمہارے کلیجے پر چوٹ لگے۔ اور بہنوئی کے گھر پر جاؤ تب کی سند ہے۔ جی دل لگی نہیں ہے۔

حشمت: بڑی بے دھڑک، اور منہ پھٹ ہو بہن، جو منہ پر آیا بک دیا۔ جو میں ابھی کچھ کہوں تو آپ بے مزا ہوں۔

آسمان: وجہ۔ بے مزا کیوں ہونے لگے۔ ہم تو خدا لگتی کہتے ہیں۔ چاہے کسی باشد۔ صاف تو یہ ہے۔ حشمت بہو نے بہت سمجھایا، اور ہاتھ جوڑے کہ للہ اس وقت نہ ہنساؤ کام کا وقت ہے۔ پھر کل دن بھر ہنسا کرنا چاہے۔ نازک ادا بیگم بولیں۔ اچھا خیر خاطر ہے تمہارے۔ تم بھی کیا یاد کروگی۔ شیخی خوری میرے مزاج میں نہیں ہے۔ سچ کہتی ہوں جو اپنی والی پر آئی تو ایک کام نہ کرنے دوں گی۔ اے سنو تو بہن۔ یہ خورشیدی بیگم کو تو ہم نے آج دیکھا کیا صورت پائی ہے۔

حشمت بہو نے کہا میں ہزاروں باری دیکھ چکی ہوں۔ دونوں بہنیں اچھی ہیں۔ اور ان کے بھائی کے حسن کی تو شہر بھر میں تعریف ہے۔ جس کی زبان پر دیکھو، اُن کی توصیف ہے۔ نازک ادا بیگم نے گلوریاں کھا کر سب کو صلاح دی کہ چلو اب چل کے محفل میں بیٹھو۔ سب کی سب اٹھ کھڑی ہوئیں۔

نازک ادا: اس وقت ہم تو یہ فرمائش کریں گے ڈومنی سے۔

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ آئینے کو یاد کرتے ہیں

اب سُنئے! کہ اُدھر بارات دروازے کے قریب آئی، اور اِدھر دُلہن گر پڑی، اور بیہوش ہو گئی۔ مغلانیاں، مامائیں، اصلیں، آنون دواجی، خواصیں، اور بیگمات سب نے دلہن کو گھیر لیا۔ ارے خیر تو ہے، یہ ہوا کیا۔ کوئی پانی لائی۔ چھینٹے دیئے۔ کسی نے عطر، کسی نے مٹی پر پانی ڈال کے سنگھایا، مگر ہوش نہ آیا۔ دُلہن کی ماں گھبرائی ہوئی اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔

حشمت: اے یہ ہوا کیا اتا جان۔ یہ ہوا کیا۔

نازک ادا: ابھی خاصی اچھی بچھی تھیں۔ غش آ گیا کیا۔

نواب بیگم: کیا کبھی غش آجاتا تھا۔ پہلے بھی آتا تھا۔

راوی: یہ کس کو معلوم۔ پہلے یہ تو پوچھو کہ اس کے پہلے بھی گھر میں کسی نے ثریا بیگم کو دیکھا تھا۔ اپنے مطلب کے لئے بیٹی بنائی۔ کوئی اُن کے مزاج کا حال کیا جانے۔ تجویز ہوئی کہ فوراً حکیم صاحب بلائے جائیں۔

دلہن کا شہید خنجر ناز شہزادۂ جمشید فرجوان طناز کے مرقد منور و مطہر پر سر کھولے ہوئے جانا۔ دولھا کا گلگوں سندانِ جگر پر آنا، اور عروسِ حور وش کو گلے سے لگانا:

گذشت عہد سموم دوزید بادِ خنک
زجان بہ تن وگرازتن بجان مبارک باد

ادب آموز ہو تو استانی جی کی سی۔ یہ پیرزن آسمان میں تھگلی لگاتی، تو عجب کا مقام نہ تھا۔ ان کی عقلِ دور بیں کے صدقے۔ گمراہوں کے لئے خضر تھیں۔ مار گزیں کو تریاق اور عاشق کو وصلِ معشوق سیم ساق سے وہ تسلی نہ ہوتی جو ان کی نصائح دلپذیر، اور پند سود مند، سے سپہر آرا بیگم کے قلب کو حاصل ہوئی۔ شہر بھر کی رائے تھی کہ سپہر آرا بیچاری تابِ فراق نہ لائے گی۔ سسک سسک کے شہزادے کی یاد میں جاں گنوائے گی۔ کسی کو اس نوخیز امیر زادی کی زندگی پر ترس آتا تھا۔ کوئی بڑی بیگم کی پیرانہ سالی پر رحم کھاتا تھا۔ کسی کو اس پری پیکر کے حسنِ خدا آفریں، اور ادائے دل نشیں، کا خیال تھا۔ کسی کو اس رشکِ قمر کی بے قراری، اور اختر شماری کا ملال تھا۔ کوئی آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔ کوئی رو رو کے آنکھیں کھوتا تھا۔ چھوٹے بڑے، بڑھے بے بڑھے، سب کو یقین تھا کہ یہ بیچاری مصیبت کی ماری اب کوئی دم کی مہمان ہے۔ کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ سپہر آرا کو سمجھائے یا تسکین دے۔ ڈرتے ڈرتے اگر کسی نے تشفی دی بھی تو وہ اور بھی زار زار روتی، اور کہتی کہ کیا اب تمہاری یہ مرضی ہے، کہ میں دل کا بخار بھی نہ چھاٹوں۔ اندر ہی اندر گھُٹ گھُٹ کے مروں۔ ہائے کیسے سنگ دل لوگ ہیں۔

نہ تو نالے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھُٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

لیکن واہ ری اُستانی جی بڑے گاڑھے وقت آڑے آئیں۔ سپہر آرا تو کسی کے فرشتے خاں کی بھی نہ سنتیں۔ یہ کسی کے ماں کی نہ تھیں۔ مگر مانا تو استانی جی کو۔ خدا جانے انھوں نے کیا افسوں پھونک دیا کہ ہر ایک بات مان لی۔ واللہ اُعلم۔ کیسا منتر پڑھا کہ انھیں کا دم بھرنے لگیں جو کچھ حکم دیا اس پر بخوشی عمل کرنے لگیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ دو دن برابر سپہر آرا بیگم قلعہ معلی تشریف لے گئیں، اور گلہائے نو شگفتہ اپنے گورے گورے ہاتھوں سے توڑ کر اپنے عاشق دلدادہ کی قبر پر چنے۔ کبھی دریائے غم جوش پر آیا، تو تربتِ عنبریں کو جوئی اشکِ اضطراب فروش سے تر کر دیا، کبھی پیارے پیارے ہاتھوں سے قبر کو پھولوں کی بُو باس سے معطر کر دیا۔ کبھی جھک کر سرہانے کی سمت پیار سے بوسے لئے۔ کبھی وفورِ اَلَم سے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعا مانگی، کہ اے میرے خدا بحق رسولؐ و آلِ رسولؐ میرے شہزادے بہادر کی صورت دکھادے، کچھ نہیں تو مجھ نصیبوں جلی کو اس سوختہ داغِ مہجوری کے کفن کی خوشبو ہی سنگھا دے۔ اے پاک پروردگار میری آرزو بر لا۔ خواب ہی میں اس کی صورتِ زیبا دکھا۔

پیاسا ہوں ساقیا مے کوثر کا، خم کی خیر
بھر دے خدا کی راہ میں کاسا فقیر کا

کبھی آپ ہی آپ مسکراتی۔ کبھی ہنس دیتی تھی۔ کبھی قبر کی چٹ چٹ بلائیں لیتی تھی، ایک آنکھ سے ہنستی ایک آنکھ سے روتی تھی، کبھی انتہا کی محظوظ، کبھی کمال مغموم ہوتی تھی، اعزہ اقربا دنگ کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کسی نے کہا دماغ میں مارے رنج کے خلل ہو جائے گا۔ کسی کی رائے تھی کہ طائرِ روح کا شکار شہبہٗ اجل ہو جائے گا۔

تیسرے روز حسب معمول اُستانی جی نے جو اس گم کردہ راہ کے دل کے ساتھ خضرِ فرخ پے کا کام کرتی تھیں سپہر آرا، اور اس کی بہنوں کو ساتھ لیا۔ بگھی پر سوار ہوئیں، اور دم کے دم میں داخل قلعۂ معلّٰی۔ نور کے تڑکے وہاں پہونچیں۔ ہری بھری شاخوں پر طیورِ ذی شعور غزل خوان۔ طاؤسانِ زمرد یں پر و بال صحنِ گلشن میں رقصاں۔ شمشاد پر قمری، سرو پر، فاختہ دستک زن۔ گلبن بر گل، گلوں پر جوبن، نسیم غالیہ بار سن سن چل رہی تھی۔ وایۂ بہار بوستان، نونہالان چمن کو آہستہ آہستہ پنکھے جھل رہی تھی۔

بہار در چمن انداز گل فشانی کرد
بشاخ نخل تمنا ثمر مبارک باد

سپہر آرا بیگم پائنچے اٹھائے ہوئے، روشوں کی سیر کر رہی تھیں۔ گلوں پر ہجوم عنادِل دیکھ کر ایک مقام پر کھڑی ہو گئیں۔ استانی جی کی طرف مخاطب ہو کر کہا، اُستانی جی۔ اِن بلبلوں کی خوش قسمتی پر ہمیں رشک آتا ہے، لپنے اپنے معشوق کو بغل میں لئے کس مزے سے بیٹھی ہیں۔ ساری خدائی کے جھگڑوں سے سروکار نہیں۔ قید رنج سے آزاد۔ بغل میں معشوقِ حور نژاد پھر عاشق کا دل کیوں نہ شاد ہو، اور ایک ہم ہیں، اللہ نہ کرے کہ ایسا کوئی بھی نامراد ہو:

لگائے ٹھٹھ کھڑی ہے نامرادی
تمنائے دلی نکلے کدھر سے

مگر واہ میں تو اس کشتۂ خنجر فراق کی قائل ہوں کہ مرتے دم تک اُف بھی نہ کی۔ جواں مردی اسے کہتے ہیں۔ استقلال اس کا نام ہے۔ بلبلوں کو دیکھو کس قدر دھوم مچاتی ہیں۔ اک ذری سے درد میں انسان تڑپنے لگتا ہے، نہ کہ زخم کھائے اور لب تک نہ ہلائے۔ اور مرتے دم کلمہ زبان پر لائے، اور جان آفریں کو جانِ شیریں سونپ کر اس اٹھتی جوانی میں اٹھ جائے:

بات رکھ لی دلِ ناکام نے مرتے مرتے
تا لب گور زبان پر نہ شکایت آئی

استانی جی نے کہا۔ بیٹا! دنیا اسی کا نام ہے۔ بلبل کی خوشی، اور مستی، ترانہ سنجی، اور جنوں پرستی بھی دو روزہ ہے۔ فصلِ خزاں آئی اور اس کے خرمنِ دل پر بجلی گرائی۔ دو دن بہار کے، تو دس دن پت جھاڑ کے۔ کوئی بھی اس جہان فانی میں ایسا ہے جو سدا خوش ہی رہا ہو۔ کروڑوں، پدموں میں تو ایک ایسا ڈھونڈھ نکالو۔ جہاں گل ہے وہاں خار ہے۔ تو ام خزاں و بہار ہے۔ یہ سب انسان کے دل کے ساتھ ہے۔ ورنہ کس کی خوشی اور کہاں کا غم۔ دونوں یکساں ہیں۔ دو دن کی حباب سے بھی زیادہ بے ثبات ہے۔ پس یہی تو ہیچ کی بات ہے، آج دیکھتی ہو کہ ہر روش میں گل خنداں ہیں۔ ہر کیاری میں بلبلیں شادماں ہیں۔ ہر شاخ طیور پر چہچہ زناں ہیں۔ کل دیکھو تو نہ گل ہوگا، نہ بلبل۔ نہ جوشِ بہار، نہ ترانہ ہزار۔ خزاں کا عمل ہوگا، ہر شے خار سے بھی زیادہ خشک نظر آئے گی۔ سپہر آرا کے دل پر نصیحت نے بڑا اثر کیا، اس گل نصائح کی شمیم رُوح افزا نے ان کے دل کے دماغ کو معنبر کیا۔ کہ ذرا تشفی اور تسلی ہوئی۔ تو حسن آرا بیگم کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا۔ باجی جان تم تو دعا کی قائل ہی نہیں ہو، ورنہ میں ہاتھ جوڑ کے عرض کرتی کہ خدائے پاک سے دولھا بھائی کے واپس آنے کی دعا مانگو۔ اب ہم آزاد نہ کہیں گے۔ دولھا بھائی کہا کریں گے۔

حُسن آرا نے دانتوں کے تلے انگلی دبائی۔ کہا ہا۔ خدارا اب ایسا نہ کہنا۔ بہن زمانہ کا حال دیکھتی جاتی ہو، کہ فلک سے کیسے انگارے برس رہے ہیں۔ دم کا کیا بھروسہ۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ آزاد کو خدا صد و اسی سال کی عمر عطا کرے۔ جہاں ہوں خوش ہوں، اور جہاں رہیں خوش رہیں۔

سپہر آرا نے بات ٹال کے تھوڑی دیر کے بعد پھر اُسی کا اعادہ کیا۔ مگر اب کی اور طرح پر ظاہر کیا۔ باجی جان ایسے میں اگر دولھا بھائی آجائیں، تو ہمارا دردِ دل ذرا دور ہو۔ اور اللہ نے چاہا تو آیا ہی چاہتے ہیں۔ صبح و شام داخل ہی ہوا چاہتے ہیں۔ یا خدا جلد صورت دکھا دے۔

حسن: آج ویسی خنکی نہیں ہے، جیسی کل سویرے تھی۔

سپہر: دن تو کل بھی ٹھنڈا تھا، مگر آج ذرا کم خنکی ہے۔

حسن: کسی دن انّا جان کو بھی لائیں گے، جو وہ منظور کر لیں۔

سپہر: ہم کہہ دیں گے۔ میں بڑا اصرار کروں گی کہ چلئے۔ کل سویرے سویرے آجائیں اور ٹھنڈے ہی ٹھنڈے یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

اُستانی: کل نہیں پرسوں سعدِ اکبر ہے، پرسوں ساتھ لیتی آنا۔

سپہر: استانی۔ اگر میں یہیں ہفتہ دو ہفتہ رہوں، تو کیسا۔

اُستانی: بیٹا۔ تم ہو کس فکر میں، جمعرات کے دن دیکھو تو اللہ نے چاہا کیا ہوتا ہے۔ پرسوں ہی تو جمعرات ہے۔

بس آج کا دن بھر اور کل کا دن۔ دو دن بات کہتے کٹتے ہیں ہے کہ نہیں۔

سپہر: خوشی کا تو ایک مہینہ بھی کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ مگر رنج کی ایک رات پہاڑ ہو جاتی ہے۔ رنج کی ایک گھڑی کاٹے نہیں کٹتی۔ اچھا دو دن یہ بھی سہی۔ شاید آپ ہی کا کہنا سچ نکلے۔ خدا چاہے تو ایسا ہی ہو۔

حسن: استانی جی جو کہیں گی، سمجھ بوجھ کے کہیں گی۔ بے سمجھے بوجھے نہ فرمائیں گی۔ شاید اللہ کو اس غم کے بعد خوشی دکھانی منظور ہو۔

سپہر آرا ایک کیاری میں جا کر پھول توڑنے لگی۔ گلہائے نودمیدہ کی بوباس سے مشام جہاں معطر ہو گیا تھا۔ گنگا جمنی چھوٹی تشتریاں دونوں ہاتھوں میں تھیں۔ ایک تشتری سبزے پر رکھ دی، اور پھول توڑ توڑ کے دوسری میں رکھنے لگی۔ حسن آرا اور بہار النسا، حسرت سے اس درخت گلفام، صَیدِ مصائب و آلام پر نظر ڈالتی تھیں۔ روح افزا اور استانی جی علیحدہ باتیں کر رہی تھیں۔

جب سپہر آرا اپنے دستِ نازک سے پھول توڑ چکی تو استانی جی نے کہا پہلے یہ پھول لے جاؤ پھر اور توڑنا۔ جلدی کیا ہے۔ سپہر آرا تشتری لے کر قبر کی طرف چلی۔

حسن: آج پھولوں میں بڑی خوشبو ہے۔ واہ واہ وا۔

روح: میں اتنی دور کھڑی ہوں مگر دماغ بس گیا۔

استانی: سویرے کا وقت ہے۔ ہوا کے جھوکوں سے خود خوشبو آتی ہے۔ پھول بھی ابھی کے ٹوٹے ہوئے ہیں

رُوح: انگریزی پھولوں میں ذرا بھی خوشبو نہیں آتی۔

حسن: مگر دیکھنے میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ خوشنما اور خوش رنگ۔

روح: خالی خربوزہ کس کام کا۔ خوشبو ہی نہ ہوئی تو کیا۔

سپہر: پھول تو دو ایک روز ہنس بھی لیتے ہیں۔ مگر جو کلیاں بن کھلے مرجھاتی ہیں۔ ان پر ہمیں بڑی رقت آتی ہے۔

حسن: ہاے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سپہر: بڑی رقت آئی ہے، مگر یہ ہمارے ہی حال کا نقشہ کھینچا ہے۔ ع
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اُستانی: جو کھِلے انھوں نے کیا پایا۔ وہ بھی مرجھا ہی گئے۔ اور جو نہیں کھلے وہ بھی مرجھا گئے۔ بات تو جب تھی

کہ پھول کھلتے تو پھر حشر تک نہ مرجھاتے۔ آج کھلے کل مرجھا گئے۔ سوکھ گئے تو کیا ایسا ہی انسان کا حال۔ ؏

مند دل برین کاخ خرم ہوا

دلاتا کے دربن کاخِ مجازی

کنی مانند طفلان خاک بازی

جن لوگوں نے کبھی کوئی غم نہیں دیکھا، وہ بھی آخر میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ جن لوگوں نے دیکھا، وہ بھی ایک دن چل بسے۔

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

رفت و منزل بہ دیگرے پرداخت

انسان یہ سمجھتا ہے کہ کبھی موت آئے گی ہی نہیں۔ مکان بنوائے گا تو سوچ گا کہ خدا کرے ہزار برس تک اس کی بنیاد ایسی ہی رہے۔ کپڑے بنوائے گا تو ایسے جو برسوں کی خبر لائیں۔ روپیہ صرف کرتے ہوئے جان نکلتی ہے۔ کہ ایسا نہ ہو پھر اسی زر کے سبب سے محتاج ہوں، پریشانی میں زندگی بسر کریں۔ لیکن یہ خبر ہی نہیں۔ کہ ؏

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

سب سے اچھے وہ طیّبُ النفس لوگ ہیں جن کو رنج سے رنج، نہ غم سے غم ہوتا ہے۔ ان سے زیادہ خوش اور کوئی نہیں۔ اور جن لوگوں کو دنیا کی زیادہ فکر ہے ان دنیا پرستوں کو سب سے زیادہ رنج ہے۔ سب سے اچھے وہ جو خدا کی راہ پر مٹے ہوئے ہیں:

دنیا طلبا چہ گویمت رنجوری	عقبیٰ طلبا چہ گویمت مزدوری
مولا طلبا کہ داغ مولیٰ دارد	در ہر دو جہاں مظفر و منصوری

دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ بلطف و نرمی پیش آئے۔ کسی کا کبھی بُرا نہ چاہے۔ اپنے پرائے سب سے مل کے رہے۔ کسی کا دل نہ دکھائے۔ اس سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں ہے۔

آسایش دوگیتی تفسیر ایں دوحرفست

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

جس وقت سپہر آرا بیگم اپنے پیارے ہاتھ میں تشتری لے کر قبر کی طرف اٹھلاتی ہوئی گئیں ان کے دل کا عجب حال تھا۔ کبھی سوچتی تھیں کہ یا خدا میں اس وقت شہزادہ ہمایوں فر کی قبر کے پاس کھڑی ہوں۔ وہ شہزادہ جس کو میں دل و جان سے عزیز رکھتی تھی جو میری روح سے زیادہ مجھے عزیز تھا۔ جس کو میں پیار کرتی تھی جس نے مدتوں کی کوشش کے بعد وہ سعید دن دکھایا کہ دولھا بنے ہوئے اشہب صبا رفتار پر سوار، دلھن کے ہاں

آتا تھا۔ مگر خلعت کے عوض کفن پہنایا۔ دلہن تاج کے عوض سر کھولے ہوئے مرقدِ منور پر آئی۔ کہاں بناؤ چناؤ کے ساتھ دلہن بنی، سر جھکائے بیٹھی تھی، کہاں اس کی نعش بے کفن پر آئی۔ جس سے ملنے کی برسوں سے آرزو تھی۔ ہائے جیغہ الگ، پیریچ جدا۔ خلعت سے خون کے شراٹے بہ رہے ہیں؛ داہنے ہاتھ میں مہندی لگی ہوئی، اور اسی ہاتھ سے خون کا دریا رواں ہوا، تو آٹھ آٹھ آنسو رونا آتے یا نہ آتے۔ لوگوں کسی نے آج تک یہ بھی دیکھا ہے کہ دلہن اپنے پیارے دولھا کی لاش کو دیکھے۔ شہزادۂ بہادر خدا کے لئے کچھ تو جواب دو تم نہیں مرے مجھے قتل کر گئے۔ میں زندہ در گور ہوں۔ تم مجھ سے اچھے ہو ہائے تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ سپہر آرا کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ کون سپہر آرا۔ وہ سپہر آرا جس کے دیدار کے لئے تم ہمایوں مالی بن کر آئے تھے، یاد ہے کہ تم نے ایک گلدستہ مجھے دیا تھا۔ میں تو اسی دم سمجھ گئی کہ ہمایوں مالی نہیں، کوئی شہزادہ عاشق مزاج ہے۔ کوئی ایسا فلک بارگاہ ثریا جاہ شہزادہ ہے جس کے تیر نگاہ نے میرے دل کو نخچیر کر دیا۔ جس کے سرو قد نے مجھے فاختہ بنایا۔ وہ گل، تو میں بلبل، وہ شمع تو میں پروانہ؛ وہ شمشاد، تو میں قمری؛ اور اسی کی قبر کے پاس میں کھڑی ہوں۔ لوگو میرے دل کو کیا ہو گیا ہے ہے جو مجھ سے بھی کوئی اتنا بھی کہتا کہ ہمایوں فر تجھے داغ حسرت دے جائیں گے۔ تجھے چھوڑ کے جنت کو سدھاریں گے تو مر جاتی۔ کانوں اور سینے میں آتشِ حسد مشتعل ہے۔ کہ جس کو ہم پیار کرتے تھے وہ حوروں کی بغل میں ہو۔ حوریانِ جنت اس سے بغل گرمائیں۔ اور میں منہ تکتی رہ جاؤں۔ واہ ہمایوں فر، واہ شرط محبت یہی تھی۔ ع

جانیے بس خوب الفت آزمائی آپ کی

کیوں حضور۔ کوٹھے سے اشارہ بازی اسی لئے ہوتی تھی کہ دغا دے جاؤ گے۔ فیل کوہ شکوہ پر سوار ہو کر اسی غرض سے آئے تھے کہ خون رلاؤ گے۔ عباسی کے ہاتھ اور زبانی پیام اسی سے بھیجتے تھے کہ ایک دن اپنی قبر پر بلاؤ گے۔ مگر میں تو اپنی سنگدلی اور سخت جانی کی قائل ہوں، کہ بخار تک نہ آیا۔ کس کس صفت کو یاد کر کے میں روؤں۔ رزم میں بہادر جنگ، بزم میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر:

بنعش آن برق کہ خوں بازان است — دستش آن ابر کہ زرافشان ست

ذات او عقلِ مجسم آمد — راے او صائب و محکم آمد

نور قلبش ز علوم نافع — مہر جرأت ز جبینش ساطع

سردر لشکرِ اہلِ اسلام

روح در پیکر اہلِ اسلام

ایسا شاہزادہ فریدوں مرتبت، دارا منزلت، اور اس طرح دنیا سے اُٹھ جائے۔ لوگو اتنا بتا دو،

کہ دنیا میں انسان کے لئے وہ کون صفت ہے، جو اس بیچارے میں نہ تھی۔ وہ کون نعمت ہے۔ جس سے ہمایوں فر محروم تھا۔ اخلاق، فیاضی، سخاوت، ہمت، علم، فضل۔ حیا، وفا، ایک ہو تو اس کو روؤں کس کس کو روؤں، یا میرے پروردگار!

چشم او بود حیا آلودہ

دلِ او بود وفا آلودہ

مگر اب وہ آنکھ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ ہاں اس قدر البتہ کہوں گی، کہ حیا اب تک باقی ہے۔ مجھے کیا ہو گیا۔ ہمایوں فر کو اور میں دکھیا بدبخت باوفا کیوں، اف اف مگر میرے استقلال اور ضبط کو خدا ہی جانتا ہے:

بہ غم سے بیتی کہ بس نیلا کر دیا منھ کو	لہو یہ روئی کہ گل رنگ سب کیا منھ کو
مگر نہ نالہ کیا شرم سے سیا منھ کو	بنے کی لاش جو آئی چھپا لیا منھ کو

رونے سے تو ناچار تھی۔ رونا تو ضبط نہ ہو سکا، اور کیونکر ضبط ہوتا، جب دل کباب ہو جائے۔ تو بو کیوں نہ بلند ہو۔ مگر بنے کی لاش پر بے حجاب و برافگندہ نقاب گئی۔ اور اس نعش بے کفن اس نعش خونیں، اس نعشِ گلگوں کی سینکڑوں بلائیں لیں۔

سپہر آرا فرطِ جنوں سے یہ کہہ رہی تھی کہ دفعتاً ایک مرغ زمردیں پر و بال، گنبد مزار شہزادۂ فرخ گہر پر آن بیٹھا، اور چہکارنے لگا۔ سپہر آرا نے اس طائرِ ذی شعور کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا:

تو اے کبوتر بام چہ میدانی

طپیدنِ دلِ مرغاں رشتہ برپا

اس شعر کو ایسی حسرت سے سپہر آرا نے ادا کیا کہ استانی جی تک کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ حسن آرا اور روح افزا تو ڈھاڑیں مار مار کر روتی تھیں۔ بہار النسا سکتے کے عالم میں تھی۔ روتی تھی نہ کچھ کہتی تھی۔ سپہر آرا نے ہنس کر کہا واہ استانی جی واہ۔ کہاں تو مجھ کو سمجھاتی تھیں اور کہاں خود رونے لگیں۔ استانی جی کے دل پر اس تقریر کا ایسا اثر ہوا کہ سپہر آرا کو گلے لگایا۔ اور ایک گھنٹے تک سمجھایا کیں۔ سبزۂ نو دمیدہ پر دونوں بیٹھ گئیں۔ سپہر آرا سر جھکائے ہوئے ان کی نصیحت سنا کی۔ تھوڑی دیر کے بعد استانی جی نے حال یوں صاف صاف بیان کیا۔

استانی: بیٹا جو وعدہ میں نے کیا اس کو پورا کروں گی۔

سپہر: استانی جی میں سچ کہتی ہوں مجھے باور نہیں آتا۔

استانی: اب صاف صاف کہوں۔ باور آئے یا نہ آئے بات نہ کاٹنا۔ آج کے دوسرے روز تو یہ۔ کل سے مطلب ہے۔ کل ہمایوں فر تمہاری بغل میں نہ بیٹھے ہو تو سہی۔

سپہر: تمہارے منہ میں گھی شکر۔ خدا ہمچنیں کند۔

حسن: کل بھی کچھ دور نہیں ہے۔ جب اتنے دن تک صبر کیا، تو کل کون دور ہے۔ کل بھی آیا ہی داخل ہے۔

سپہر: باجی جان۔ کس موئی نگوڑی کو ذرا بھی باور آتا ہو۔ اور جو کل بھی کچھ نہ ہوا تو دل کے پرزے پرزے، اور جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ انتظار کا بھی آخر ٹھکانا ہے:

ایسا کیا ضعیف غمِ انتظار نے
آنکھوں کو میری بار ہے خواب گراں تلک

حسن: کیوں اُستانی جی۔ دیکھا میں کیا کہتی تھی۔ آپ سے۔

سپہر: پھر مجھ سے کوفت نہ کھایا جائے گا۔ اب کی علیل ہوئی تو مرض کی جڑ ہی گھر جائے گی۔ جالینوس بھی آئے، تو جی چھوٹ جائے، اور اس جھنجھٹ سے تو یہی بہتر ہے کہ موت آجائے۔

ہیں اس قیدِ الم سے تو رہائی ہوتی
شبِ ہجراں کے عوض موت ہی آئی ہوتی

ایک بوڑھی مغلانی نے آن کے تسلی دی، کہا اللہ نے چاہا تو اُستانی جی کی بات صحیح نکلے گی۔ نمک کی قسم کھا کے کہتی ہوں میرا دل گواہی دیتا ہے، کہ شہزادہ بہادر حضور کو صورت ضرور دکھائیں اور ہنسی خوشی شادی ہوگی۔ سپہر آرا نے مغلانی کی طرف دیکھ کر یوں جواب دیا۔ اے بُوا کدھر تمہارا خیال ہے۔ سست اعتقادی بھی تو کتنی۔ بھلا، آج تک کسی نے یہ بھی سُنا ہے کہ مُردہ قبر توڑ کے نکل آئے۔ توبہ۔ توبہ۔ ایسے بھروں میں نہ آنے کی۔ یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ قبر کے پاس سے قہقہے کی آواز آئی۔ حسن آرا کے کان کھڑے ہوئے۔ روح افزا اور بہار النسا جھجکیں۔ اُستانی جی غور سے دیکھنے لگیں۔ مغلانیاں متحیر کہ یہ قہقہہ کس نے لگایا۔ سپہر آرا نے مسکرا کر کہا یہ سناٹا کیسا پڑ گیا۔ قبر سے آواز قہقہہ آئی یہی حیرت ہے نہ۔ بس سُنا نہیں:

ہم دو کشتہ ہوں تیغِ نرگس مخمور کا
ہر دہاں زخم میں یاں خندۂ مستانہ ہے

قبر کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کیوں بندہ پرور خود تو ہنسئے اور ہمیں رُلائیے۔ ہنس ہنس کر رُلانا حضور ہی کا کام ہے۔ اس خندہ زنی کا جواب اب کیا دوں۔ کوئی سامنے ہوں تو کہوں۔ دغا بازوں سے کسی کا بس نہیں چلتا۔ بے وفاؤں کا کوئی کیا کرے۔ اس وقت ہوا کے جھونکوں سے سپہر آرا کی زلف پریشان اور بھی پریشان

ہوئی جاتی ہے۔ موئے مشک بو شبرنگ، گلِ رخسار کے بوسے لیتے تھے۔

کھول دی ہے زلف کس نے پھول سے رخسار پر
چھا گئی کالی گھٹا سی آن کر گلزار پر

اُستانی جی نے سپہر آرا، کو سینکڑوں واسطے دلائے۔ از برائے خدا، تم ان باتوں کا کل تک ذرا بھی خیال نہ کرو۔ آج کا دن تو کسی شمار قطار میں نہیں ہے۔ کل شب کو یہاں آؤ اگر ہمایوں فر دولھا بنے، خلعت پہنے، جیغہ پر پیچ زیب سر کئے ان سے ملیں تو ہماری صورت سے نفرت کرنا، اور کبھی ہماری بات کا ذرا بھی یقین نہ کرنا۔ دس بجے کے وقت استانی جی ان سب کو لے کر روانہ ہوئیں۔ گھر میں آئیں تو بڑی بیگم نے کہا۔ آج سویرے ادھر تمہاری گاڑی روانہ ہوئی۔ ادھر مہری نے آن کر کہا حضور ایک شاہ جی آئے ہیں۔ داروغہ صاحب فرماتے ہیں کہ بڑے باکمال پہنچے ہوئے فقیر ہیں۔ وہ تو ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے اللہ کی عنایت سے زندہ ہیں۔

اُستانی جی نے کہا۔ آمین۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔

سپہر آرا نے غور سے سُنا۔ گو حسن آرا کی صحبت میں فقرا وغیرہ کا اعتقاد جاتا رہا تھا مگر اہل الغرض مجنوں مثل مشہور ہے۔ غم والم نے ان کو اس درجہ سراسیمہ کر دیا تھا کہ شہزادے کی نسبت جو کچھ مژدہ کوئی سُناتا فوراً باور کر لیتیں۔ لیکن ظاہر میں آہ سرد بھر کر خاموش ہو رہتی تھیں۔ بڑی بیگم نے فقیر کی اس قدر تعریف کی کہ استانی جی نے نہایت مشتاق ہو کر اصرار کیا کہ شاہ جی پھر بلوائے جائیں۔ ان سے کہا جائے کہ پھر تکلیف کر کے تشریف لائیے۔ بڑی بیگم نے کہا ان کو تو میں نے خود ٹکا دیا ہے۔ باہر ٹکے ہیں۔ استانی جی کے اصرار اور خواہش کے بموجب بڑی بیگم صاحب نے مہری کو حکم دیا کہ شاہ جی صاحب سے کہو اگر تکلیف نہ ہو تو از راہِ عنایت پردے تک تشریف لائیں۔ مہری نے ادب کے ساتھ عرض کیا۔ حضور اگر تکلیف نہ ہو تو ذرا ڈیوڑھی تک چلے چلئے۔ بڑی بیگم صاحب نے فرمایا ہے، کہ شاہ صاحب سے جا کے کہو کہ صاحبزادی آگئی ہیں۔ وہ بھی اپنے کانوں سے سُن لیں۔ شاہ صاحب نے کھڑاؤں پہنی۔ تہ بند باندھا اور ڈیوڑھی پر آئے۔ اُستانی جی اور بڑی بیگم اور سپہر آرا اور ان کی بہنیں اور پیش خدمتیں سب پردے کے اس طرف کھڑی تھیں۔

اُستانی: شاہ صاحب۔ آپ کو اس وقت بڑی تکلیف ہوئی۔ مگر ہم کیا کریں۔ ہم ایسی ہی مصیبت میں گرفتار ہیں، اللہ کسی کو یہ مصیبت نہ دکھائے، یا خدا ساتویں دشمن کو بھی یہ دن نصیب نہ ہو مگر اس میں انسان کا چارہ کیا ہے۔ ہاں ایک بڑے کامل فقیر نے دعویٰ کیا ہے کہ کل کچھ خوشخبری سننے میں آئے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

شاہ صاحب: مشیتِ ایزدی میں انسان کا کچھ بس نہیں

بے رضائے تو یکے برگ سخبند ردرخت

خدا کی مرضی۔ ہر چہ مرضی مولیٰ از ہمہ اُولیٰ۔

استانی: اب کچھ دعائے خیر ہمارے حق میں دیجئے۔

روئے مقصود کہ شاہان بدعا می طلبند
سببش بندگی حضرت درویشان ست

شاہ: حقائق و معارف آگاہ، شیخ سیف اللہ۔ اَنَا اللہ بُرہانہٗ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ سب ایک چیز ہے، اور اضافت اسما ساقط ہے۔ اللہ عید اسقاطُ الاضافات ہے نہ آسمان ہے نہ زمین ہے۔ نہ مکان ہے۔ نہ مکیں۔ نہ نور ہے، نہ ظلمت۔ نہ اندوہ ہے نہ کلفت۔ نہ رنج ہے نہ راحت۔ نہ سیاہ ہے، نہ سفید نہ خوف ہے، نہ امید؛ نہ گھر ہے، نہ بازار، نہ یار ہے نہ اغیار، نہ دنیا ہے نہ آخرت۔ نہ ذلت ہے نہ مفاخرت؛ نہ دوزخ ہے نہ بہشت؛ نہ غلمان ہے نہ حور، نہ طوبیٰ ہے نہ قصور، نہ زمہریر نہ سلسبیل، نہ کوثر نہ زنجبیل، یہ سب وجود وہمی ہے۔ وجودِ حقیقی نہیں ہے۔

پیش ایں شادی وغم بر نقش نیست	ایں غم وشادی کہ اندر حطیہٴ است
تا ازاں صورت شود معنی درست	صورتِ غمگیں ونقش از بہر تست

نقشہائے کان دریں حمام ہاست
از برونِ جامہ کن چوں جامہ ہاست

خدا کی کنہ حقیقت میں دخل دینا، چھوٹا منھ بڑی بات ہے۔ انسان کی یہ تاب وطاقت! کیا مجال۔ خدا گو قہار ہے مگر غفار بھی ہے، ایسی کنواری دوشیزہ، معصومہ، پر خدا کا قہر نہیں ہوسکتا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ مرزا ہمایوں فرؔ زندہ ہیں، اور کل شب کو ضرور نظر آئیں گے۔ بادی النظر میں یہ بات مُحالُ و مُطلق معلوم ہوتی ہے، مگر انسان کیا، اور اُس کی فہم کیا۔ مشتِ خاک ذرہٴ بے مقدار۔ مضغہٴ گوشت، اتنا تو انسان کو معلوم ہے نہیں کہ میں ہوں کیا۔ پھر خدا کے رموز کو بھلا کیا پہچانے گا۔

استانی: آپ ابھی تو یہیں رہیں گے نہ شاہ صاحب؟

شاہ: میں اس وقت یہاں سے رخصت ہوؤں گا۔ جب دولھا کے ہاتھ میں دلہن کا ہاتھ ہوگا۔ ہائے اس دوشیزہٴ معصومہ کو سہاگ کے عوض سوگ نصیب ہوا۔ مگر یہ سوگ نشین نہیں۔ یہ دلہن ہے۔ آگ کو خدا نے گلزار کردیا۔ کبھی کسی نے سُنا ہے کہ آگ باغ ہوجائے۔ مگر خدا کی قدرت۔

شاہ صاحب نے اس طرز کی باتیں کیں، کہ اُن کے تقدس اور اُن کی بزرگی کا نقش بڑی بیگم کے لوح دل

خوبی مرتسم ہوگیا۔ حسن آرا کی طرف دیکھ کر کہا اگر کوئی شاہ صاحب کی بات کو باور نہ کرے گا تو میری نظروں سے
گر جائے گا۔ اور میں پھر کبھی اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہ رہوں گی۔ حُسن آرا آپ جلیئے۔ طبیعت دار معًا
سمجھ گئی کہ اسی طرف اشارہ کیا۔ کہا اماں جان مجھے ان کی باتوں سے خود یقین اور کامل یقین ہوگیا ہے، کہ شاہ
صاحب رسیدہ ہیں۔ شاید انہی کی دعائے خیر سے ہماری مصیبت رفع ہو جائے۔ دنیا میں بہت سی باتیں
ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ عورتیں توام کے عوض تین تین بچے جنتی ہیں۔ کسی کے دو مُنہ کا
لڑکا ہوا ہے۔ کسی کے دو ناک کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ خدا کی خدائی میں دم نہیں مار سکتے۔ جب بڑے بڑے
مشہور فلسفی اور علماء کی عقل دنگ ہے تو ہم کس شمار میں ہیں۔

شاہ صاحب کی دعا کو خدا اثر قبول دے آمین۔

اُستانی جی نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا حضور خوب جانتے ہیں کہ عیش و عشرت کا زمانہ دم کے دم
میں ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ایک ہفتے تک برابر ڈومنیوں کا ناچ رہے اور رات دن دھما چوکڑی مچے تو بھی وقت
نہ معلوم ہو مگر رنج کی ایک گھڑی پہاڑ ہو جاتی ہے۔ صاحبزادی کو ان باتوں کا کم یقین آتا ہے اور کیونکر
آئے۔ دل تو صید الم ہے۔ جب شہباز کے پنجے سے طائر دل رہائی پائے۔ تب تو باور آئے۔ حضور
ان کو کچھ کمال دکھائیں تاکہ آپ کا دم بھرنے لگیں۔ اور کل تک خوش رہیں۔

شاہ صاحب نے کہا یہ کون بڑی بات ہے۔ تھوڑے سے ماش منگوائیے۔ ماش آئے۔ کچھ پڑھ کر
شاہ صاحب نے سب کے سامنے ایک چُلّو پانی لے کر ماش پر چھڑکا اور پھر کچھ پڑھ کر زور سے زمین پر ماش
پھینکے، اور کہا آپ سب ہٹ جائیں۔ اس مقام کی زمین بہت جلد شق ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
ایک گھنٹے میں زمین شق ہوئی اور ڈھیلے سوا گز کے قریب اونچے ہو کر اِدھر اُدھر گرے۔

بڑی بیگم: اب اس سے بڑھ کر کمال اور کیا ہو گا بھلا۔

سپہر: اماں جان۔ اب میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ان کے دُعائے خیر سے نقش مراد کرسی نشین، اور
تیر دُعا بہدف اجابت فرمان ہو گا۔ اس زور سے زمین کا شق ہونا انوکھی بات ہے جیسے زلزلہ سا آگیا۔ یہ
کیا بات تھی باجی جان۔

مغلانی: حضور میں سمجھی بھونچال آگیا! اس زور کی زمین ہلی۔

بہار: فقیر ہیں نہیں تو دنیا کیونکر قائم ہے۔ اتنا تو سمجھو۔

روح: جس وقت مٹی اڑی میں دھکے سے رہ گئی۔ اللہ اللہ کیوں حسن آرا تم نے کیفیت دیکھی تھی۔

حسن: جی ہاں۔ مجھے خود حیرت ہے کہ یہ کیا اسرار ہے خداوندا۔

سپہر: اب تو درویشوں کے کمال کی قائل ہوئیں۔ باجی جان!

اُستانی: ہاں ہاں بیٹا۔ اس میں شک کیا ہے۔ فقیر فقرا کا کوئی بھی آج تک مقابلہ کر سکا ہے۔ یہ لوگ بادشاہی کی کیا اصل و حقیقت سمجھتے ہیں، بادشاہی پیران کے گدا کو شرف ہے۔

عباسی: عقل نہیں کام کرتی ہے۔ ماش پڑھ کر پھینکے اور زمین پھٹ کے چاروں طرف مٹی اچھل پڑی۔ یہ کیا ہوا؟

استانی: اور سب سمجھ چکے اب ایک تو باقی رہ گئی ہے۔

شاہ صاحب نے فرمایا، اِن باتوں سے متحیّر وہی ہوں گے جو فقرائے کامل، اور درویشانِ قدسی آب کی عظمت اور ان کے تقدّس سے واقف نہیں ہیں۔ ورنہ فقرا نے مُردوں کو زندہ کر دیا ہے۔ منزلوں سے باہم باتیں کی ہیں۔ غیب کا حال بتا دیا ہے۔

راست گویم بادشاہی در جہاں پیدا شود

نام او تیمور شہ صاحبِ قرآں پیدا شود

دو سو برس پیشتر ایک عارف باللہ وَلیِ حقّ آگاہ نے حکم لگایا تھا، اور ویسا ہی ہوا۔ مشہور بات ہے۔ اب سُنیئے کہ بڑی بیگم نے اپنے کُل اعزا اقربا کو بلوایا۔ اور یہ مژدۂ روح افزا سنایا، کہ ایک درویش معارف آگاہ برکت کی دعا سے سحری و نیم شبی سے شہزادۂ جنت آرام گاہ زندہ ہو جائے گا اور ہنسی خوشی سپہر آرا کو عقد نکاح میں لائے گا۔ بعض ضعیفُ الاعتقادوں کو یقین آیا، کہ فقیرِ کامل اور خدا شناس کی دعا سے مردے کا زندہ ہونا محال نہیں، ممکن ہے۔ مگر جو لوگ عقلِ سلیم سے بہرۂ وافی رکھتے تھے، انھوں نے اس پیشین گوئی کو قبول نہیں کیا۔ بڑی بیگم کو تو حقُ الیقیں تھا کہ درویش کی دُعا ضرور اثر دکھلائے گی۔ دوسرے روز انھوں نے خوب تیاریاں کیں۔ گھر بھر میں صرف حسن آرا کے چہرہ سے رنج نمودار تھا۔۔ باقی سب خوش و خرم کہ منھ مانگی مراد پائی۔ حسن آرا کو خوف تھا کہ مبادا سپہر آرا کی جان جائے۔ ہمایوں فر کے زندہ ہونے کی ان کو ذرا بھی امید نہ تھی۔ مگر خیال یہ تھا کہ ایسا نہ ہو اس پھیر میں سپہر آرا کی جان کے لالے پڑیں۔ جاتی تو اس خوشی میں ہے کہ شہزادۂ جمشید فر فریدوں کمر کے ساتھ آئے گی۔ اور وہاں سے نیم جان ہو کر آئے؛ تو اور بھی ستم ہو جائے۔ ایسا ہو تو یہی شعر خدانخواستہ صادق آئے:

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ خرماں رفتم

ہائے وہ وقت خوب یاد ہے! جب ہمارے ہاں گانا ہو رہا تھا، دفعتہً گولا آگے۔ اُف۔ ہائے ہائے!۔

شہزادہ کی رُوح زبانِ حال سے یہی کہتی ہوگی۔

منم آن سبز زجان کشتۂ باتیغ وکفن

بدر خانۂ جلاد غزل خوان رفتم

حُسن آرا کے اِن خیالات سے کوئی واقف نہ تھا، اور نہ مارے خوف کے کوئی ظاہر کرسکتا تھا مگر دل ہی دل میں کڑھتی تھیں، اور سپہر آرا پر حسرت سے نظر ڈالتی تھیں۔

مہری: (آپس میں) عباسی، اور سب تو خوش ہیں، مگر حسن آرا بیگم اُداس سی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کیا وجہ؟

عباسی: اللہ جانے۔ ہاں روز سے زیادہ اُداس ہیں آج۔

مغلانی: سوچتی ہوں گی کہ دیکھئے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ وہ تو دور اندیش ہیں نہ۔ اللہ کو شاید کچھ اچھا ہی کرنا منظور ہو تمام شہر میں یہ خبر مشہور ہوگئی اور جمعرات کو چار گھڑی دن رہے سے میلا جما۔ قلعہ معلّٰی کے اندر صحن دلکش میں وہ بھیڑ بھڑ کا کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا۔ ایک طرف تنبولیوں کی دکانیں آراستہ۔ تنبولنیں کم سن نوساختہ۔ پیارے پیارے ہاتھوں سے عطر یا مشک بو گلوریاں بنا رہی ہیں۔ عاشق تنوں کو لبھا رہی ہیں۔ چونا صبح جلا سے زیادہ سفید۔ چکنی ڈلی خالِ عارض خوباں فرخارُ پر طعنہ زَن۔ جس سبز تخت نے ایک بیڑہ کھایا۔ سرخرو ہوگیا۔ سولہ سنگار کیے ٹھسے سے تخت پر متمکن ہے۔ بگڑے دل بے فکرے ڈٹے ہوئے آوازے کس رہے ہیں۔ واہ بی منی واہ۔ تمہارے ہی دم کا ظہورا ہے۔ (ظہورا) ایک سمت حلوا ہی حلوائی۔ حلوائیوں کی میٹھی میٹھی بول چال، اور وہ شیریں ادائی، الٰہی دکان ہے یا شکرستان۔ ہنگام تو زبانِ طوطی شکرِ خانہ بن جائے، یوسف مصری دیکھے تو عشق چرائے۔ شیریں دہن شیریں کار شکر لب شکرما۔ ایک طرف مہر دیانِ خورشید جلوہ۔ عطر روح پرور کی شیشیاں اور کنٹر لئے بیٹھی ہیں۔ الٰہی یہ دوکان مُشکبار ہے۔ یا ختن[1] وتاتار ہے۔ دماغ روح لخلخہ پیرا ہے۔ اور آگے بڑھے۔

مالنیں آٹھ دس بہت کم سن — پیاری پیاری ادا غضب کے دن

گفتگو کتنی شُستہ و رفتہ — مگر ایک ایک دُرِ بسفتہ

گوندھتی ہے کھڑی ہوئی کوئی ہار

گیند بازی میں ہے کوئی سرشار

اور مزارِ منور کا تو عالم ہی اور تھا۔ جھاڑ اور کنول سے ہر در و دیوار پر غضب کا جوبن تھا۔ مزار کے

---

[1] ختن۔ اور تاتار چینی ترکستان کے دو مشہور مقامات ہیں۔ جہاں کے مشکی ہرن مشہور ہیں۔

دروازہ پر دلہن کا گمان ہوتا تھا۔

حُسن میں ذرّہ ہے باغِ رضواں کا

بابِ پنجم ہے یا گلستاں کا

نُور کے تڑکے سے چھڑکاؤ کا بندوبست ہوا تھا۔ نہریں کیوڑے اور گلاب سے چھلک رہی تھیں۔ روشیں جھلک رہی تھیں؛ جابجا فوارے لطفِ خداداد دکھا رہے تھے۔ نونہالانِ چمن اپنے اپنے جوبن پر اترا رہے تھے:

باغ تھا یا کہ تھا وہ باغِ مراد	کھل گیا غنچۂ دلِ ناشاد
ہر گلِ تر سے آئی بوئے امید	نغمۂ عندلیب نے دی نوید
پائی بو باس یار کی گل میں	زُلف کی وضع دیکھی سنبل میں

سرو ہیں مثلِ قامتِ خوباں

گل ہیں رشکِ عذارِ محبوباں

جس تاریخ سے قلعہ معلّٰی کی تعمیر ہوئی یہ چہل پہل اس میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جس سمت نظر جاتی تھی گل وغنچۂ بہار و سبزہ زار، اور پری پیکر، رشکِ قمر، نوجوان، خوبرو عورتیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ شام سے روشنی کا انتظام کما حقہٗ کیا گیا۔ سوئی گرتی تو دور سے نظر آتی۔ قلعہ کے پھاٹک کے سامنے صدہا خوانچہ والے صدا دے رہے تھے۔ خریدار خصوصًا افیمی سودا لے رہے تھے۔ شہزادگان ذوی الاقتدار نوابانِ گردوں مدار، اور امرا و عمائد شہر اور احکام، اہل عملہ جوق در جوق جمع تھے؛ جو آتا تھا قلعہ معلّٰی کا جوبن دیکھ دیکھ کر عش عش کرتا تھا۔

ایک: ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ شہزادہ آج زندہ ہو جائے گا۔

دوسرا: دریں چہ شک۔ اتنی بڑی بات کہیں غلط ہوتی ہے۔

تیسرا: اور ایسے زبردست اور کامل فقیر کی۔ جس کا آج ثانی نہیں ہے۔ جو حکم لگایا، وہی ہوا۔ سبحان اللہ سبحانَ اللہ۔

چوتھا: بندھیاچل پہاڑ کی چوٹی پر برسوں نیم کی پتیاں اُبال کر نمک کے ساتھ کھائی ہیں۔ قسم خدا کی اس میں ذرا جھوٹ نہیں۔

پانچواں: سلطان علی کی بہو تین دن تک خون تھوکا کی۔ پھر بید بھی آئے اور حکیم بھی آئے، اور دنیا بھر کے لوگ جمع ہوئے کچھ بھی نہ ہوا۔ خون گھنٹے میں دو تین بار آتا ہی گیا۔ بس میں جا کے شاہ صاحب کو بلا لایا۔

چھٹا: اِنہی شاہ صاحب کو جنھوں نے یہ حکم لگایا ہے۔

دو: جی ہاں۔ انہی کو۔ بس یہ گئے۔ ایک نظر اس کو دیکھا، کہا لڑکی جوان، اور خوب صورت ہے۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے، کہ سب یہاں سے ہٹ جائیں۔ صرف میں اور یہ ہیں۔ لڑکی کے باپ کو شاہ صاحب پر بڑا اعتقاد تھا کہا فوراً۔ ابھی اسی دم۔ اتنے میں شاہ صاحب ہنسے، اور کہا۔ نہیں کسی کے ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خون اس کو نہیں آتا اچھی ہے۔ لوگوں نے آمین آمین۔ خدا ایسا ہی کرے از یں چہ بہتر۔ خدا ہم چنیں کند۔ اور حضور کی زبان سے نکلا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔ بس جناب شاہ صاحب نے ایک بار اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ وہ وقت ہے اور یہ وقت ہے جب سے خون نہیں آیا۔ فقیر ہیں۔ بھائی۔ فقیر کا گھر بڑا۔ دو مہینے قبر میں مردہ رہا۔ اور فقیر نے قبر دیکھ کر کہا یہ زندہ ہے۔ کھدواتے ہیں تو مردے نے آنکھیں کھول دیں۔

دو: میاں فقرا ہی سے دنیا قائم ہے بس اس کو یاد رکھو۔

ٹھٹول: (قدم لے کر) کیا بات کہی ہے بس لاکھ روپیے کی بات ہے۔ واہ حضرت واہ۔ آپ بھی یادگار ہیں۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

مسخرہ: ڈبیا میں بند کرنے کے قابل ہیں۔ ایسے آدمی پیدا کہاں ہوتے ہیں، اور جو پیدا بھی ہوئے تو اتنی عمر تک زندہ نہیں رہتے۔ جو بے حیائی سے جئے بھی تو نکٹا جئے برے احوال۔

ظریف: واقعی حضرت کیا نکتہ ارشاد کیا ہے۔ فقرا ہی سے دنیا قائم ہے۔ واللہ واہ۔ کیوں نہ ہو۔ آپ کی ذات بھی غنیمت ہے۔ مولا صاحب حضور کا دولت خانہ کس بستی میں ہے۔ پیر و مرشد۔

مولانا: (بگڑ کر) جی ہاں ہے تو کرسی میں۔ کسی کے باپ کا اجارہ ہے۔ کرسی کا رئیس ہوں۔ پشت ہا پشت سے یہیں دولت خانہ ہے۔

اتنے میں خبر ہوئی کہ سپہر آرا بیگم عنقریب گھر سے روانہ ہونے والی ہیں، یوروپین جنٹلمین، اور لیڈیاں بھی سیر دیکھنے آئی تھیں، ایک نواب صاحب نے جو منتظم تھے ان کے واسطے شامیانہ نصب کرا دیا۔ ایک میم صاحب نے منتظم سے ہم کلام ہو کر چند سوال کئے۔

میم: ول کیا آپ لوگ سمجھتا کہ اس میں (قبر) سے مردہ جیتا۔ ایسا نہ ہونے سکتا۔ کبھی دیکھا ہے کہ مر کے جئے۔

منتظم: حضور خدا کی قدرت اور صاحب لوگوں کا اقبال۔

اِس پر کل لیڈیوں اور جنٹلمینوں نے قہقہہ لگایا۔

میم: ول صاحب لوگ بڑا اِکبال۔ مردہ جیئے۔

منتظم: ہاں حضور بڑا اقبال ہے، اور ایسا ہی اقبال ہے۔

میم: ول ہمارے باپ چرچ یارڈ میں سوئے۔

منتظم: حضور یقین ہے کہ شہزادہ جی اٹھے۔

ادھر یہ باتیں ہوتی تھیں، اب اُدھر کا حال سنیئے۔

عروس بستہ لب خورشید غبغب، مہر سیما، سپہر آرا بیگم، بھی اپنے کمرے میں گئیں۔ اور وہاں دلہنوں کی طرح لمھرنا شروع کیا۔ مشاطگان نادر فن کی کارستانی سے جوبن اور بھی دوبالا ہوگیا۔ خوبرویان فرخار جنگل کا حسن ن کے جمالِ تحیر سوز کے مقابل میں گرد تھا۔ ہاتھوں میں رنگِ حنا اور پور پور چھلّے۔ پوشاک گراں بہا زیب تن زیور نے سنِ خداساز کی آگ پر روغن کا کام کیا زلفِ چلیپا کو ایسا سنوارا تھا کہ زاہد صد سالہ بھی دم بھرنے لگتا۔ اول تو سن۔ دوسرے امنگ کے دن۔ اٹھتا جوبن۔ غضب کا پھبن۔ عنفوانِ شباب۔ بُعدِ مشکیں کا پیچ وتاب اور یامت یہ کہ بوٹا قد اور اس پر چھریرا بدن:

جوبنوں پر شباب امنگ کے دن	ستم انداز و ناز قہر کا سن
انکھڑیاں قہر کی لگاوٹ باز	دلربا بات بات کے انداز
سامری تاب کیا جو آنکھ ملائے	چشم ہاروت جن سے آنکھ ملائے
خشمگیں برق خرمنِ دل وجاں	چتونِ رہزنِ متاعِ تواں

سروجس پر فدا وہ قامت ہے

نازپروردۂ قیامت ہے

نہ جوبن تھا کہ زہاد بھی ڈوری ڈالے۔ ناز وادا کے ساتھ پائنچے اٹھاتی ہوئی کمرے سے اُتری تو بڑی بیگم صاحب نے فرمایا۔ لو بیٹی اللہ نے دلی آرزو پوری کی مراد پائی۔ اب خدا نے چاہا تو فتح ہے۔ بس اب ہمیں ذرا شک نہیں رہا۔ سپہر آرا بڑی بیگم کے قریب گئی۔ انھوں نے چھاتی سے لگایا۔ سپہر آرا نے کہا اتا جان بس اب یا ادھر یا اُدھر۔ یا شہزادہ کو لے کے ہنسی خوشی لوٹوں گی یا اُسی کی قبر کے پاس دفنائی جاؤں گی۔

بڑی بیگم: ماں صدقے۔ بیٹی اس وقت بدشگونی کی باتیں نہ کرو۔

سپہر: اتا جان دودھ تو بخش دو۔ سائیں کے سو کھیل۔ اللہ جانے کیا ہویا تو۔ شاید اللہ کو کچھ اچھا ہی کرنا ہو۔ آج ایک دفعہ اور نصیب آزمالیں۔ اما جان یہ آخری دیدار ہے۔ آبدیدہ ہو کر باجی جان چلتے ہیں۔ بہارالنسار بہن کہا سُنا معاف۔ خدا کے لئے میرا ماتم نہ کرنا۔ میری تصویر آبنوس کے صندوقچے میں ہے۔ وہ دیکھ لیا کرنا۔ جب تم سب مل کے ہنسو بولو تو میری تصویر بھی سامنے رکھ لیا کرو۔ اے ہے اتا جان تم روتی کیوں ہو۔ میں تو اجل سے دوچار ہونے جاتی ہوں، اور تم چاہتی ہو کہ اپنے دل کی بات بھی نہ کہنے پاؤں۔ خیر یہی مرضی ہو تو خیر۔

بہار : (گلے لگا کر) کیسی باتیں کرتی ہو سپہر آرا۔ واہ۔

روح : (رو کر) بہن جو ایسا ہی ہے تو نہ جاؤ۔ چاہے جو ہو۔

استانی : اے ہے واہ کیا اچھی بات سکھاتی ہو۔ واہ واہ۔

بڑی : حسن آرا۔ بیٹا بہن کو سمجھاؤ۔ ہم کیا کچھ ایسے قصاب ہیں کہ جان بوجھ کے اتنی بڑی برابر کی لڑکی کو مار ڈالیں گے۔

حُسن : اماں۔ ام۔ مجھے۔

استانی : ہچکی بندھ گئی روتے روتے۔ اب میں اس کس طرح اس کو سمجھاؤں۔

بڑی : یا اللہ یہ ہوتا کیا ہے۔ حُسن آرا۔ حُسن آرا بیٹا ادھر دیکھو۔

حسن : اماجان۔ ہم۔ ہمیں اب نہ۔ چھیڑو۔

رُوح : کیا ہمارا نصیب ہے۔ لوگ کہتے تھے۔ ان کی ارنی بلند ہے۔

حسن : ہاں! بلند ہو چکی۔ یا پاک پروردگار ہماری مصیبت دور کر

پیش خدمتیں : آمین آمین۔ اللہ آمین۔ خدا دعا میں برکت دے۔ اللہ بڑا کریم ہے۔ دم کے دم میں فقیر کنگال کو بادشاہ کر دیتا ہے۔ اس میں یہ قدرت ہے۔ تیری کریمی کے صدقے۔

اُستانی : اس کی مہر ہو جائے تو کون بڑی بات ہے۔

دریائے کریمی میں ہیں اس طرح کے جلوے
دیکھو صدفِ جسم میں عالم دُرِ جان کا

سپہر : اماں جان اب ضبط محال ہے۔ اتنا تو ضرور کہوں گی کہ میری قبر اسی کی قبر کے پاس بنانا نہیں۔ جب تک تم اپنے منھ سے نہ کہو گی تب تک میں باہر قدم نہ رکھوں گی۔

بڑی : بیٹا۔ اس خیالِ فاسد کو دل سے دور کرو۔ کہا مانو۔

سپہر : اماں جان۔ ہرگز ہرگز، تو مانوں گی نہیں اس میں چاہے جو ہو۔

بڑی : بھلا میری زبان سے یہ کلمہ نکلے گا۔ لوگو اس کو کیا ہوا۔ ہائے۔ اس کے غم نے اس کو سودائی کر دیا۔ ہائے ہائے!۔

سپہر : آپ فقط اس قدر قبول دیں کہ اگر میں مرگئی، تو میری قبر ہمایوں فر کی قبر کے پاس بنے گی۔

بڑی : (سر پیٹ کر) ارے لوگو آخرش اس کو اب کون سمجھائے، اس غضب کو دیکھنا کہ ماں کے منہ سے کیا مقبولہ کراتی ہے۔ نا بیٹا میری زبان سے یہ کلمہ نہ نکلے گا۔

استانی: (تم فقط ہاں کر دو) یا اچھا کہہ دو۔ بس۔

سپہر: اچھا وچھا میں نہیں چاہتی۔ جو میں کہوں وہ کہیئے۔

اُستانی: (بڑی بیگم سے) پھر دل کو مضبوط کر کے کہہ دو صاحب۔

بڑی بیگم: اے ہے۔ نا بہن۔ ہم سے نہ کہا جائے گا۔

حسن: سپہر آرا جو تم کہتی ہو، وہی ہوگا، جو خدا نخواستہ ایسی نوبت آئی اللہ وہ گھڑی نہ دکھائے۔ بس اب ہٹ نہ کرو۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ جیسا اناجان ویسا ہمارا کہنا۔

سپہر: کیوں باجی تم اکیلی بہت گھبراؤگی:

فنا ہے سب کے لئے مجھ پہ کچھ نہیں موقوف
یہ رشک ہے کہ رہے گا اکیلا تو باقی

اچھا ذرا کان میں کچھ سن لو۔ دو دو باتیں کرلیں۔ حسن آرا بیگم نے بہن کا ہاتھ پکڑا اور علیحدہ لے گئیں۔۔۔ سپہر آرا نے گلے سے مل کر کہا۔ باجی جان۔ از برائے خدا تم میرے بعد مجھے دل سے بالکل بھلا دینا۔ میں سوچتی ہوں کہ تمہارا دل کیونکر بہلے گا۔ مگر میری ہی بھتی کھائے جو۔

اس قدر سپہر آرا کہہ چکی تھی کہ حسن آرا زار زار رونے لگیں۔ بھتی کھانے کے لفظ پر اس کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ بالکل بے قابو ہوگئی۔ سوچی کہ اللہ اللہ یہاں سے تو کہہ کے جاتی ہے کہ اس کے دشمن مرنے جاتے ہیں اور با اینہمہ یہ کہتی ہے کہ ہماری بھتی کھائے۔ حضرات ناظرین کیسا نازک وقت ہے۔ ہائے افسوس۔ اس کے بعد سپہر آرا نے کہا۔ باجی جان آزاد کو ہماری طرف سے آداب عرض کر دینا اور کہہ دینا کہ مرتے دم تک تم کو نہیں بھولی بلکہ یہ شعر زبان پر تھا:

اس عشق میں ہم تو ہیں مخار دکوئی دم ہیں
اللہ سلامت رکھے ان کو وہ جہاں ہیں

دونوں بہنیں خوب زور سے گلے ملیں، اور دونوں آٹھ آٹھ آنسو روئیں اس کے بعد روح افزا، اور بہار النسا اور جہاں آرا اور گیتی آرا، اور کل پیش خدمتوں اور مغلانیوں وغیرہ سے علیحدہ علیحدہ ملی۔ اتنے میں اُستانی جی نے کہا اب سوار ہونا چاہیئے۔ سپہر آرا نے چلتے چلتے کہا از برائے خدا ہمارے کمرے میں کنول ضرور جلایا کرنا اس پر پھر کہرام مچا۔ اور استانی جی نے سپہر آرا کو سوار کرایا۔ ایک بگھی پر بڑی بیگم اور سپہر آرا اور حسن آرا اور روح افزا دوسری پر جہاں آرا اور گیتی آرا، اور دو اور بیگمات۔ عصمت سماست۔ تیسری پر بہار النسا اور خورشید لقا۔ چوتھی پر شہزادی بیگم اور مہ لقا بیگم اور دو اور کم سن بیگمیں پیچھے مغلانیاں وغیرہ۔ الغرض سولہ

بگھیاں یہاں سے روانہ ہوئیں۔ مشعلچی، خاص بردار، سپاہی، مہربان، نوکر چاکر سب ساتھ تھے۔ گھوڑوں پر اور اعزّہ اور اقربا، ان کے پیچھے بھیڑ کی بھیڑ جب قلعہ معلّیٰ کے پھاٹک پر سواریاں پہونچیں تو شاہ صاحب نے حکم دیا کہ دلہن سمند گھوڑے پر سوار ہو۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے میں داخل ہوں۔ اس وقت شاہ صاحب کا حکم گویا بمنزلہ وحیٔ آسمانی تھا۔ بڑی بیگم نے حکم دیا کہ فوراً سمند سیاہ زانو حاضر ہو۔ سپہر آرا بیگم۔ مخملی چیدہ میان، خوشخرام، آہنجتہ گوش، زرّیں لگام، پر بصد ناز معشوقانہ خوش ادائی، اور دلربائی کے ساتھ سوار ہو کر قلعہ میں داخل ہوئیں، اور گلگوں فراغ، نعل کوتاہ سُم، آہو شکار، باریک دم کو، روشوں اور سبزے پر کڑکڑا دیا:

بر سبزہ و گل سمند رانان	میزد قدمی بہوی جانان
میافت ز ناد نگہت دوست	پر بود ز عشق مغز تا پوست
فارغ ز بہار بوی باغش	پیچیدہ وصال در دماغش
مبادنسیم مژدۂ بار	می کرد نشاط و درویش کار
میشد برہ امید پویان	می برفت سرود شوق گویان
صد باد بہار ہم عنانش	وز بوے نگار مست جانش

میزاند فرس جو کامرانان
نادیدہ سواد شہر حُبّ جانان

چہل پہل اور نورِ موفور، اور خلقِ خدا کی جماعت اور تماشائیوں کی کثرت دیکھ کر اس عروسِ خورشید طلعت کو امید ہوتی تھی کہ جام دل شراب آرزو سے پُر ہو گا۔ جوں جوں گلگوں آتش مزاج ہوا نہاد گرماتا تھا اور بھی تیزی پر آتا تھا اور سپہر آرا کی آتش شوق بھی بڑھتی جاتی تھی۔

می گشت بھر قدم دران راہ
امید و آرزو راہ کوتاہ

جب سپہر آرا قبر کے قریب آئی اور دیکھا کہ تربت عنبریں جگمگا رہی ہے، تو آنکھوں کو نورِ موفور حاصل ہوا

افروخت زدو دیدۂ مرادش
افزود سواد بر سوادش

تماشائیوں نے نعرے پر نعرے بلند کئے اس قدر شور و غل مچایا کہ آسمان سر پر اُٹھایا۔ سپہر آرا نے قبر کے پاس گھوڑا روک کر کہا۔ اب حکم ہوتا ہے۔ خود جاگو گے یا ہم کو بھی یہیں سلاؤ گے۔ ہم ہر طرح راضی ہیں

اگر طالع بیدار نے یاری اور مددگاری کی تو جاگ اٹھو گے ورنہ میں بھی بخت خفتہ کی بدولت یہیں سو رہوں گی، اور اس طرح سوؤں گی کہ پھر عمر بھر نہ جاگوں گی۔ قسم کھاؤں گی کہ حشر تک سوتی رہوں گی۔ دل اندوہ پرور دو ہی طرح مانے گا۔ یا تو موت آئے۔ یا شہزادے کا حسن عالم آشوب دیکھنے میں آئے یا جان کا چھٹکارا ہو یا وصلِ شہزادہ ہو۔

ہمایوں فر ذرا آنکھ تو کھولو۔ دیکھو معشوقۂ سرو قامت پستہ دہن سیمیں بر غنچہ دہن مرقد منور پر ناز کرتی ہوئی آئی ہے۔ زلف مشک اندوہ سے تمہاری روح کا دماغ تازہ ہو جائے تو زہے نصیب، اس بے وفائی کے صدقے بے وجہ بے سبب روٹھ گئے اور تیر خوش پیکاں پولاد سائے کا ہمارے دل کو نشانہ بنایا۔ خدا کے لئے ذرا آنکھ تو کھولو۔ دیکھو کیا سماں ہے۔ قلعۂ معلیٰ نور افشاں ہے نیچے چمن زار۔ اوپر ابر مسرت گھر بار جامہ دری کی بہار ہے۔ کہیں گل خنداں، کہیں ترانہ ہزار ہے:

پھر چلے دامنِ صحرا کی طرف آئی بہار
پھر ہوا جوشِ جنوں دستِ گریباں ہم سے

اتنے میں اُستانی جی اور بڑی بیگم اور ان کی صاحبزادیاں، اور شہزادی بیگم اور کل بیگمات آئیں۔ چاروں طرف مہریاں پردہ کئے ہوئے تھیں۔ قبر سے دور تک آدمی ہٹا دیئے گئے، اور تین سمت قنات گھیری گئی۔ فرش بچھا۔ شاہ صاحب بُلوائے گئے اُس وقت تماشائیوں کے اشتیاق اور جوش اور ولولے کی انتہا نہ تھی الانتظار اشکت من الموت کا نقشہ تھا ہر کہ ہر دست بدُعا تھا۔ کہ یا خدایا قبر شق ہو جاوے، اور شاہزادۂ سلیمان حضرت سکندر مرتبت صورت دکھائے۔

شاہ صاحب تشریف لائے اور یہ اشعار آبدار باآواز بلند پڑھنے لگے۔

بے ترے حکم اے الٰہ العالمیں — ایک پتا ہل نہیں سکتا کہیں
خاک کے پتلے کو تو گویا کرے — قطرۂ ناچیز کو دریا کرے
نار کو دم میں گلستاں تو کرے
مور کو دم میں سلیماں تو کرے

یہ سب تیری ہی قدرت کا کھیل ہے۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ۔ وحدہٗ لاشریک، تیرا کوئی ثانی نہیں۔ تیری قدرت کی ہر شے گواہ ہے:

سب کو تجھ سے ملی وجود کی راہ
تیری قدرت پہ تیری صنع گواہ

ہم لوگ تیرے احکام پر نہیں چلتے ہم لوگ تیری خدائی میں شک کرتے ہیں مگر تو گبرو ترسا تک کو رزق پہنچاتا ہے۔ شرمندۂ گناہگار پُر تقصیر ہیں۔ ع

روز و شب بندہ معصیت میں اسیر

ہم لوگوں نے تجھ کو نہیں پہچانا۔ تیری حقیقت کو نہیں جانا۔

اے میرے کارساز بندہ نواز　　مغفرت پر ہے تری سب کو ناز

مرہم زخم سینہ ریشاں ہے　　تو انیس دل غریباں ہے

یہ کہہ کر شاہ صاحب گر پڑے۔ دو ایک آدمی اُن کے اٹھانے کو گئے۔ مگر مریدوں نے منع کیا، اور کہا خبر ان کے قریب نہ آنا اس وقت اور ہی عالم ہے، اِدھر اُس سیم بر پری پیکر نے گھوڑے پر سوار ہو کر قبر منور کا طواف کیا اور بآواز بلند یوں زمزمہ سنج ہوئی۔ میرا کعبہ بھی ہے۔ مجھے اس وقت ہر در و دیوار اور ہر برگ و بار سے شہزادے کی صورتِ نورانی نظر آتی ہے: ع

جا ہر دیکھتی ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

اتنی تو دیدۂ عشق کی تاثیر دیکھئے

جس سمت دیکھئے تری تصویر دیکھئے

اُفوہ۔ آج ہمایوں فر نے معجزہ دکھایا۔ باجی جان سچ کہتی ہوں، ہزاروں ہمایوں فر نظر آتے ہیں، ایک دو نہیں ہزاروں۔

ہر سمت ہمایوں فر ہی ہمایوں فر ہیں۔ اور کتنا سہانا سماں ہے یہ رات روز روشن پر خندہ زناں ہے:

نغمہ زا ہیں نالہائے عندلیب خوش بیاں　　نوجوانانِ چمن استادہ ہیں چالاک و چست

چہچہے ہیں طائرانِ خوش نوا کے ہر زباں　　ابر ہے اٹکھیلیوں پر برق ہے بیتاب جان

کوئی مینا در بغل کوئی سبو بر پاسباں　　ہے کہیں لطفِ تبسم ہیں کسی جا قہقہے

حسرتوں سے آج تو خالی کوئی دم ہو کنار

کھول دے بند نقاب روئے معنی بیاں

شاہ صاحب اللہ اکبر کہہ کر اٹھ بیٹھے، اور بہت زور سے قہقہہ لگا کر فرمایا، لو مبارک فتح ہی فتح ہے۔

اتنا سننا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک تمام شہر میں مختلف خبریں مشہور ہو گئیں، ایک محلے میں یہ گپ اُڑی کہ ادھر سپہر آرا بیگم ہاتھی پر سوار ہو کر قلعے کے پھاٹک میں آئیں اُدھر بجلی زور سے کوندی اور بجلی کے ساتھ شہزادہ آسمان سے گرا اور گرتے ہی اُچک کر سپہر آرا کے ہاتھی پر سوار ہو گیا

اس جھوٹ میں کیا سچ۔ دوسرے محلے میں یار لوگوں نے یہ بٹی۔ سپہر آرا کو شاہ صاحب نے ایک اِندارے میں ڈھکیل دیا تو اندارے کا پانی اُبلا، اور اس کے ساتھ ہی طوفان آگیا۔ قلعے کی دیوار سے دو ہاتھی پانی اونچا ہوا مگر مجال کیا کہ کوئی آدمی غرق ہوسکے، جب طوفان فرد ہوا، تو دیکھا کہ قبر پر ہمایوں فر اور سپہر آرا میں میٹھی میٹھی باتیں ہورہی ہیں۔ واہ رے سچ۔ سچے مرنے جاتے ہیں، اور جھوٹوں کو کبھی بخار بھی نہیں آتا۔ محلے میں فقرہ بازوں نے یہ فقرہ چست کیا۔ شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے اپنا سر کاٹ ڈالا، اور پھر اسی حالت میں ایک بکری کا سر کاٹا۔ اپنے دھڑ پر بکرے کا سر رکھا، اور بکرے پر اپنا سر۔ دونوں میں خوب لڑائی۔ خوب ہی گتھم گتھا ہوا۔ دونوں کے سر سے ایک شے زرد رنگ کی گرتی تھی، جو نہایت ہی چمکیلی تھی۔ اس طرح کی چمک کہ میں کیا کہوں۔ بس کچھ نہ پوچھو گوہر شب تاب سے بھی زیادہ چمکتی تھی۔ اس سے رفتہ رفتہ ڈھیر بن گیا۔ اور اُس ڈھیر کو ایک ہُما نے آکے کھا لیا (راوی)، بجا ارشاد ہوا ہم نے تو سنا کہ عنقا نے نگل لیا (اس جھوٹ پر خدا کی مار) بس جناب ہُما کو شاہ صاحب نے پکڑ کر بھونا اور کباب کر ڈالا۔ اتنے میں جو دیکھتے ہیں تو شاہ صاحب کے سر پر خاص انہی کا سر تھا۔ جب کباب پک چکے تو شاہ صاحب نے ماش پڑھ کے پھینکے اور کباب کے ٹکڑے باہم ملا کر آدمی بن گئے ... اور وہ شہزادے ہیں۔ واہ بھئی واہ تم سب سے بڑھ گئے۔

یہ گپ تو اُڑ رہی تھی۔ اب سُنیے کہ چانڈو بازوں کو جو خبر ہوئی تو انھوں نے اپنے طرز پر مشہور کیا۔

رامو: ارے یاراں۔ ہُمایوں فر جی اُٹھے میاں۔

دُنی: ابے جا۔ آیا وہاں سے۔ ہونہہ۔ کیا دل لگی ہے۔

رامو: بدتے ہو کچھ کچھ۔ آؤ بدلو۔ آئیے بس آئیے۔

دُنی: ہم بد کے پاس نہیں کھڑے ہوتے۔ اور تو کیا بدے گا۔

رامو: نکل جائے اُس پر نعلت (لعنت) آؤ ہارو۔

دُنی: اچھا آؤ ایک ایک پونڈا بدتے ہیں بمبئی کا پونڈا۔

رامو: واہ۔ دوالہ نکلوا دے گا۔ چلا وہاں سے ایک پونڈا بدنے، ایک ایک پھاندی بدو، تو بات ہے۔

فقیرے (پونڈا چھیلتے ہوئے) ارے میاں کچھ اور بھی سُنا بھئی۔ شہزادے صاحب جی اُٹھے۔ قسم خدا کی۔ شہر بھر میں ہُلڑ ہے، اور لوگ دیکھ آئے ہیں۔

رامو: لو ہم کہتے تھے تو کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اب تو یقین آیا۔ کہتے ہیں کہ ہم شہر خبرے ہیں۔

نورا: (دُمک لے کے) اجی خدا خدا کرو۔ کہیں جی نہ اٹھے ہوں کیا دل لگی ہے۔ سیر سیر بھر کھٹیاں بدتے

رامو: بیش۔ لاؤ ہاتھ۔ (ہاتھ پر ہاتھ مار کر) نکل جائے اس کی ایسی تیسی۔ مگر کپتان کے کنویں کی کھٹیاں ہوں۔

نورا: منظور۔ بلا سے سیر بھر کھٹیاں ہی یاروں کے کھانے میں آئیں گی۔ صریح شیخ جی کی زبانی سن آئے ہیں مگر یہ مانتے ہی نہیں تو اس کو کوئی کیا کرے۔ بے بھلا وہم کی دوا لقمان کے پاس نہیں۔

رامو: شیخ جی کون باپ تمہارے آخر معلوم تو ہو۔

نورا: اجی وہ جو مسجد میں پھونک ڈالتے ہیں۔ ناٹے ناٹے ہیں یا نہیں۔ بوڑھے سے آدمی۔ وہ خود دیکھ کے آئے ہیں۔ کہتے ہیں سپہر آرا کو شاہ صاحب نے چانڈو پلایا۔ پہلے ہی چھینٹے میں گر پڑی پھر افیم کھلائی۔ پھر پلائی بیہوش ہو گئی۔ پھر کچھ پڑھا، اس کے بعد قبر پر چانڈو رکھ دیا۔ بس جانڈوں کا رکھنا تھا کہ قبر شق ہو گئی۔ اور شہزادہ ہمایوں فر بہادر کفن پوش قبر سے نکلے۔

یہ تو سب گپ تھی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ جب خاتون ماہ لقا سپہر آرا بیگم گلگوں فراخ نعل پر سوار ہو کر مرقد منور کے ارد گرد اٹھلاتی تھیں، سامنے ایک روشنی نمودار ہوئی۔ اس طرح کا نور کہ سب کی نظر جھپک گئی بھیڑ چھنٹ گئی تماشائی دورویہ کھڑے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ دیکھا کہ ایک بیش قیمت بادصبا رفتار ضیغم شکار، شبدیز عربی، اٹھکھیلیاں کرتا چلا آتا ہے۔ نعرۂ خوشی بلند ہوا اور گلگوں سبک خیز قریب آیا لوگوں نے مرحبا مرحبا کا غل مچایا۔ تمام قلعہ معلّٰی گونج اٹھا کسی نے کہا ہمارے ملک کا شہزادہ وہ جاتا ہے، کوئی بولا احسنت مرحبا۔ سپہر آرا بیگم انگشت حیرت بدنداں کہ خداوندا یہ کیا اسرار ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا دلہن کو لاؤ۔ ادھر سپہر آرا ادھر ہمایوں فر گھوڑے سے اترے، اور جوش مستی میں دونوں بے حجاب گلے ملے۔

اس وقت ہر طرف سے یہی صدا آتی تھی کہ جوڑی برقرار، یا خدا یہ چاند سورج کی جوڑی اس وقت تک قائم رہے جب تک شمس و قمر، جلوہ گر رہیں؛ جب لوگوں نے شہزادہ کو اپنی آنکھوں دیکھا تو سخت استعجاب ہوا۔ شاہ صاحب کی بڑی شہرت ہوئی، انھوں نے حکم دیا تھا کہ دو گھنٹے کامل تک شاہزادہ اور سپہر آرا باہم ہمکلام ہوں۔ تیسرا آدمی اُن سے نہ ملنے پائے۔ چنانچہ قلعہ معلّٰی کی ایک عمارت میں جو پہلے ہی سے آراستہ کر دی گئی تھی، دونوں عاشق و معشوق بیٹھے۔ دو خواصیں خدمت کے لئے ہمراہ تھیں۔ آپس کی گفتگو سننے کے قابل ہے۔

سپہر: واہ بندہ پرور واہ۔ ع

جائیے بس خوب الفت آزمائی آپ کی

اچھی عنایت کی تھی۔

شہزادہ: معقول۔ اُلٹی آپ شاکی ہوں، خدا جانے کس کس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ آپ نے خمیازہ اس کا ہم کو اُٹھانا پڑتا ہے۔

سپہر: اللہ نے تمہاری صورت دکھائی۔ ہم تو یہی سمجھے تھے کہ کوئی دم میں خود بھی چل بسیں گے۔ مگر زندگی تھی بچ گئے۔

شہزادہ: خدا کو اچھا ہی کرنا منظور تھا۔

ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

وہ وقت یاد ہے جب ہاتھی پر سوار ہو کر باغ کے پاس گیا تھا، اور تم مجھے دیکھ کر اس قدر شرمائیں اور لجائی تھیں کہ جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ گورے گورے گالوں کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔

سپہر: ایک بات ہو تو یاد رہے۔ حسن و عشق کے جھگڑوں برسوں فیصل نہیں ہوتے مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم کو یا نوں دکھایا۔

خدایا زبانی کہ بخشیدہ　　به نیروئے جانی کہ بخشیدہ

دمادم بجنبش گر آید ہمی　　ز راز تو حرفی سیر آید ہمی

خرد را سگالم کہ نیرو دہد　　خود از راز من حیرتی رو دہد

بھر پردہ دمساز کس جز و نیست

شناسندہ راز کس جز و نیست

سپہر آرا فرطِ طرب سے رونے لگی۔ ہمایوں فر نے آنسو پونچھے، اور سمجھایا، گلے لگایا۔ پانی منگوایا۔ منھ دھویا۔

شہزادہ: اب آج تو رونے سے سروکار نہیں ہے۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔ عید سے زیادہ سعید یہ روز ہے:

غنچہ مشکیں نفس ولالہ بجوش خوشبوے　　انجمن مجمرہ وغالیہ دانی دارد

باد را زادہ بخلوت کدۂ غنچہ چراست　　گرنہ باشاہ گل راز نہانی دارد

سبزۂ رانا سیہ انداختہ بادے دہر　　بر خود از ہمسری سرو گمانی دارد

گریہ ہر چند ز شادی ست ولی ابر بہار

نیز چوں من مژہ اشک فشانی دارد

سپہر آرا بیگم نے شہزادہ جمشید مرتبت کے گلے میں پیارے پیارے ہاتھ ڈال کر کہا تمہیں خدا کا واسطہ سچ سچ بتا دو یہ کیا اسرار ہے۔ اور تو اور باجی جان کو سخت تعجب ہوگا، اور سچ کہوں کل تک بلکہ آج شام تک

میرا دل بھی نہیں قبول کرتا تھا کہ ایسا ہوگا، اور کیونکر قبول کرتا۔ کوئی بات بھی ہے آج تک ایسا کبھی بھی ہوا تھا۔ کبھی نہیں۔ دیکھا نہ سُنا۔ مگر جتنا خدا نے رلایا تھا۔ اس سے زیادہ ہنسایا بھی۔ اس کی کریمی کے قربان، بڑا مسبّبُ الْاَسْبَابُ ہے۔

شہزادہ: ابھی اس ہنسی کا کیا بھروسہ ہے۔ ایسا نہ ہو پھر رُلائے۔

سپہرؔ: (سہم کر) ہے ہے۔ برائے خدا کبھی ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالنا۔ انا جان تو ذری سی باتوں میں شک کرتی ہی تھیں۔ میں اب اُن سے بھی زیادہ شکی ہوگئی، وہ سچ کہتی ہیں کہ۔ ؏

مزن فال بد کا ورد حالِ بد

شہزادہ: (مسکرا کر) جانِ جان خدا کو اچھی ہی کرنا منظور تھا، جو محبت ہم میں تم میں اب ہوگی وہ پہلے نہ ہوگی۔ گو تم مجھ پر ہزار جان سے عاشق ہو، اور میں تم پر مرتا ہوں، مگر اب تو جان گنوا کے تم کو پایا، اور تمہاری آس بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ تمہارے نزدیک اس پیر مرد شاہ جی نے مردہ زندہ کر دیا۔ خدا نے چاہا تو ہم اور تم اسطرح زندگی بسر کریں، کہ آج تک کسی میاں بیوی کو ابتدائے آفرینش سے نصیب نہ ہوئی۔

سپہر: ہمارا کہنا مانو تو باغ میں چل کے رہیں۔

شہزادہ: (مسکرا کر) ہمارا کہا مانو، کی ایک ہی کہی۔

سپہر: اللہ جانتا ہے میں تمہاری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ جو کہو وہ دل و جان سے منظور۔

شہزادہ: سنو تو۔ یہ باتیں تو کل تک کیا معنی برسوں نہ ختم ہوں گی اور شاہ صاحب نے کچھ سمجھ ہی کر ہم کو تم کو یہاں تخلیئے میں بھیجا ہے۔

سپہر: (شرما کر) اب بہت باتیں نہ بنایئے بس۔

شہزادہ: معقول۔ باتیں بنانے کی ایک ہی کہی۔ قسم خدا کی۔

شاہ صاحب بُرا مان جائیں گے۔ تو پھر لینے کے دینے پڑیں گے۔ اچھا دریافت کر لو۔

سپہر آرا: (لجا کر) کیوں بے شرم کرتے ہو۔ واہ۔

شہزادہ: ایک گنواری بھندلیل مثل ہے کہ سن بھائے موتر یا ہلائے۔

سپہر: چلئے خیر۔ ایسا ہی سہی۔ حضور کی بلا سے۔ بس۔

شہزادہ: اچھا تم کسی پیش خدمت کو بھیج کر شاہ صاحب سے دریافت کروا لو، دیکھو کیا کہتے ہیں۔ ہم سے زیادہ کوئی واقف نہ ہوگا۔

سپہر: اچھا ہم اُستانی جی سے پُچھوا بھیجتے ہیں۔

سپہر آرا بیگم نے ایک مہری کو بلایا۔ اُستانی جی سے جا کے کہہ دو کہ شہزادۂ بہادر نے سلام کہلا ہے اور دریافت کیا ہے، کہ ہم کو سب سے الگ تھلگ یہاں بھیج دیا ہے۔ ہم کو بھیجا تو دُلہن کو کیوں ساتھ بھیجا۔ مہری ہنستی ہوئی استانی جی کے پاس گئی مگر کہتے ہوئے جھجکی۔ مغلانی سے کہا۔ اس وقت شہزادے نے باتوں باتوں میں کہا کہ ہم کو تم کو جو شاہ صاحب نے یہاں تنہا بھیجا ہے۔ تو خالی خولی بتولوں ہی کے لئے نہیں بھیجا ہے۔ سپہر آرا شرمائیں، جب شہزادہ نے اصرار کیا تو انھوں نے کہا ہم اُٹھ کے چلے جائیں۔ آخرش دولھا نے مجھے بلایا کہا استانی جی سے جا کر کہو کہ شاہ صاحب سے دریافت کر دیں۔ مغلانی نے استانی جی سے صاف صاف کہہ دیا۔ استانی جی نے شاہ صاحب کو پردے کے پاس بلایا، اور یوں ہمکلام ہوئیں۔

استانی: شہزادے ایک بات دریافت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں آگ اور پھوس کا ساتھ کیا۔ اب اسے حضور ہی سمجھیں۔

شاہ: ہاں ان سے کہہ دو کہ شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا:

نشیں ترش تو از گردشِ ایام کہ صبر
گرچہ تلخست ولیکن برِ شیریں دارد

یہ تو آج کل کے لئے ہے اور پرسوں اور بات ہے:

غنچۂ محبوب را چاک گریباں یار کرد
گر بدست شیر خود نازو صبا میر پردش

اس وقت باہم پیار اور محبت کی باتیں کریں، یہ گلوری بنائیں، ان کو کھلائیں۔ وہ بیڑے لگائیں، تھوڑی دیر میں غربا کو سیم و زر خیرات کرنا ہوگا۔ آج تمام رات سونے نہ پائیں گے۔ شہزادہ فرخ بخت تمام عمر شادمانی اور کامرانی کے ساتھ زندگی بسر کرے گا۔ جاہ و جلال اور عظمت و اقبال کی روز بروز ترقی ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ:

نہے با شوکتش فرخندہ آثارے جہانگیری	نمے ما دولتش آمادہ اسبابِ جہاں بانی
گرامی سنمیش را طالع اقبال جمشیدی	ہمایوں مسندش را پایۂ اورنگِ سلطانی
ہمش ما خلق گوناگوں سوارش در حق اندیشی	ہمش با خویش رنگارنگ نازش در خدادانی

طرب در بزم عیشش بردہ خوران را برقاضی
کرم برخوان فیضش خواندہ رضواں را بمہانی

استانی: حضور اگر تکلف نہ ہو تو ایک پرچے پر آپ اپنے ہاتھ سے خود جواب لکھ دیں۔ بس ان کی تشفی ہو جائے گی۔

شاہ: اچھا ایک فقرہ لکھوں گا وہ خود سمجھ جائیں گے۔

استانی: مگر ایسا جامع ہو کہ دم نہ مار سکیں۔

شاہ صاحب نے ایک کاغذ پر یہ فقرہ لکھ دیا (اَلتَّعجِیلُ مِنَ الشَّیطَانِ وَالتَّاخِیر مِنَ الرَّحمٰن) سُنا نہیں۔ ع

کہ تعجیل کارِ شیاطین بود

اُستانی جی نے مہری کو یہ پرچہ دیا اور شہزادہ کے پاس گئی۔ شہزادہ نے یہ فقرا پڑھا، تو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ سپہر آرا نے دیکھا تو مارے ہنسی کے اُچھل پڑیں۔

سپہر: اچھا جواب دیا۔ میں خوش میرا خدا خوش۔

شہزادہ: دل میں تو کہتی ہوں گی کہ شاہ جی نے کیا غضب کیا۔ مگر ظاہر میں خوشی دکھاتی ہیں۔ دنیا میں کس قدر زمانہ سازی ہے، کہ اَلاَماں۔

سپہر: واہ۔ یہ زمانہ سازی، اور دغا بازی، مردوں ہی کو مبارک رہے؛ ہم اس کے قریب نہیں پھٹکتے۔ زمانہ سازی۔

شہزادہ: بھلا قسم تو کھاؤ کہ شاہ صاحب کے جواب سے تم خوش ہوئیں؛ کھاؤ قسم، دل میں کچھ زبان میں کچھ۔ ہو نہ ہو۔

سپہر: یہ کیوں یہ کیوں۔ آخر کیا کچھ کسی کی چوری ہے۔

شہزادہ: چوری نہیں ہے تو صاف صاف کہہ دو۔

سپہر: میں یہ باتیں کیا جانوں بھلا۔ کبھی ایسی ایسی ہمجولیوں کی صحبت ہی نہیں رہی، جو اس طرح کی باتیں سکھائیں مگر ہاں سُنا ہے کہ خورشید لقا بیگم ان باتوں میں بہت برق ہیں، اور میں تو ابھی کل تک یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ چوٹی کیونکر گوندھی جاتی ہے:

کبھی چوٹی کی خبر تھی نہ تھا کنگھی کا خیال	بارہا اُلجھے ہی رہتے تھے مرے سر کے بال
خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے مجھے	ہکر تھا یاد خبر تھی نہ بہلانے سے مجھے

شہزادہ: بجا۔ مگر میں نے جب دیکھا پٹیاں ہی جمی ہوئی دیکھیں۔ جب نظر پڑی بناؤ چناؤ کے ساتھ اور سُنتا تھا کہ حضور ہر دم چوٹی کنگھی سے لیس رہتی تھیں۔ یہ آج آپ کی زبانی معلوم ہوا کہ پولی حیران ہیں۔

سپہر: پُولی حیران آپ کے ہاں ہوتی ہوں گی۔

شہزادہ: یا الٰہی۔ آخر کچھ کہوں بھی یا نہ کہوں۔

سپہر: (مسکرا کر) درست۔ یا تو کچھ کہیئے ہی نہیں اور اگر کچھ کہیئے تو فرض ہے کہ گالیاں ہی دیجئے خیر بندہ نواز

اختیار ہے۔

شہزادہ: اُف۔ سپہر آرا۔ تمہیں امید تھی کہ مجھ کو اس حالت میں دیکھو گی، اور مجھ سے تم سے مذاق ہوگا، اور ہم تم زانو بزانو بیٹھے ہوں گے مگر خدا کی شان۔

صدقے اس بندہ نوازی کے تری میں جاؤں
باپ ماں ہوتے ہیں کب ایسے شفیق و اشفق

سپہر: اللہ جانتا ہے۔ ہمیں تو یقین واثق ہوگیا تھا کہ اب حشر میں تمہاری صورت دیکھیں گے۔ مگر خدا کی قدرت کل تک بلکہ میں نے کہا نہ آج شام تک باور نہیں آتا تھا کہ تم کو زندہ دیکھوں گی۔

دو گھنٹے کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ اب مرزا ہمایوں فر بہادر، اور سپہر آرا یہاں آئیں، اور سب کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں۔ اُستانی جی نے کہا میں اِس کا مطلب نہیں سمجھتی۔ ہمایوں فر اور سپہر آرا یہاں آئیں، یہاں کے کیا معنی، اور سب کے پاس بیٹھ کر باتیں کون کرے۔ یہ سب باتیں آپ صاف صاف بیان کردیں تو آپ کے حکم کی تعمیل کی جاوے۔

شاہ: دولھا اور دُلہن اس مقام پر آن بیٹھیں جہاں اِن کے ماں باپ بہنیں اعزہ اَقربا سب بیٹھے ہیں؛ اب آپ سمجھیں!۔ پھر میں نے یہ کہا تھا کہ ہمایوں فر اور سپہر آرا سب کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں۔ وہ سب کون؟ اُن دونوں کے اعزہ، اب بھی اگر نہ سمجھو تو مجبوری ہے مگر ایک گھنٹے کے عرصے میں اِس حکم کی تعمیل کی جائے۔

اُستانی: ایک گھنٹا! ابھی ابھی۔ دس منٹ میں۔

شاہ: جو حکم دوں فوراً بجا لاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہے۔

بڑی: شاہ جی یہ باتیں نہ فرمائیے۔ ہمایوں اور سپہر آرا ابھی حاضر ہوتی ہیں۔ آپ کے فرمانے کی دیر تھی۔

بڑی بیگم ایک تو یوں ہی ضعیف الاعتقاد تھیں۔ ستم اس پر یہ ہوا کہ تمام عمر سامنے ہی سامنے دیکھے، اور اس سے زیادہ ستم یہ ہوا کہ اس بوڑھوتی وقت میں داماد مر گیا، اور کم سن لڑکی بیوہ ہوگئی۔ گو نکاح ابھی نہیں ہوا تھا مگر بڑی بیگم لڑکی کو بیوہ سمجھتی تھیں۔ شاہ صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ (ورنہ اچھا نہیں ہے) بس بڑی بیگم صاحبہ کانپ اُٹھیں۔ شاہ صاحب کی کمال خوشامد کی، اور قدموں پر سر رکھا۔ ہاتھ جوڑے، اور رو رو کر کہا شاہ صاحب احسان کر کے مٹانا اچھا نہیں۔ جو حکم دیجئے وہ بجا لاؤں۔ لونڈی کو ذرا عذر نہیں ہے۔ بہار النساء نے بھی اُن کی رائے سے اتفاق کیا۔ مگر ہمایوں فر کی والدہ اور ان کی بہنیں اس قسم کی باتیں ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ نہ استانی جی کی باتوں سے اس طرح کا کوئی امر ظاہر ہوتا تھا۔ حُسن آرا بیگم کا عجب حال تھا۔ خورشید لقا بیگم نے حُسن آرا کے

ہاتھ میں ہاتھ دیا، اور کہا بہن ذری دو دو باتیں کرلیں۔ اس وقت ہم اور تم دونوں ایک حالت میں ہیں۔ جیسی تم ہو ویسی میں ہوں۔ تم دُلہن کی بہن میں دولھا کی بہن۔ مگر میں ایک بات دیکھتی ہوں کہو کہوں۔ کہو نہ کہوں۔

حسن: بہن۔ اس وقت دماغ آسمان کے اوپر ہے، اور کیوں نہ ہو۔ بات ہی ایسی ہوئی، مگر سچ کہوں انتہائے حیرت ہے۔

خورشید لقا: ہاں۔ بس یہی میں کہنا چاہتی تھی۔ ایک بات سچ سچ کہنا۔ مگر تم قسم کھاؤ کہ سچ سچ بیان کردوگی

حسن: سنو بہن، میں تو قسم وسم کو نہیں مانتی۔ مگر ہاں میں اپنے ایمان سے کہتی ہوں کہ میں سچ سچ اور صاف صاف کہہ دوں گی۔

خورشید: بس میں یہی چاہتی تھی۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہیں کچھ تعجب ہوا یا نہیں۔ یہاں اس وقت تم ہو یا نہیں ہو۔ میرا بھائی ہے۔ حقیقی بھائی، اور تمہارا بہنوئی۔ تمہاری حقیقی بہن کا دولھا۔ نہ میں کوئی لفظ اس کے خلاف کہوں گی نہ تم کہوگی۔ بس۔ بھلا آج تک تم نے یہ بھی سنا تھا کہ مُردہ جی اُٹھے۔

حسن: ہے ہے۔ مجھ سے کہتی ہو۔ مُردہ جی اُٹھے تو اور بات ہے۔ کون مُردہ جس کی قبر بن گئی ہو، اور جس کو مرے ہوئے ہفتے گذر گئے ہوں۔ میں کیا کہوں بہن بعض بات کہنے کے قابل نہیں ہوتی ہے۔ بس گومگو کا معاملہ ہے۔ تم بتاؤ کہ تم نے اپنے بھائی کو دیکھا یا نہیں۔ میں نے تو ہمایوں فر کو ابھی نہیں دیکھا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ وہی ہمایوں فر ہے یا کوئی اور ہے۔ دیکھو میں نے صاف صاف بیان کردیا۔ جیسی ہمایوں فر کی تمہیں محبت ہے ویسے ہی مجھے بھی محبت ہے۔ ہے کہ نہیں؟ مگر تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تب ہمیں یقین آئے۔

خورشید: بہن میں سچ کہتی ہوں میں نے بھائی کو بخوبی دیکھا۔ میرا وہی بھائی ہے۔ وہی ہمایوں فر۔ وہی۔ وہی مگر تعجب سے بھی درجہ بڑھ گیا۔ سوچو تو ماجرا کیا ہے۔

حسن: کیا کہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یا اللہ کیا بات ہے۔

خورشید: بس یہیں پر ہماری عقل بھی کام نہیں کرتی۔

حسن: تم اچھی طرح کہہ سکتی ہو کہ ہمایوں فر ہی ہیں؟

خورشید: اب میں کیوں کر کہوں۔ اور کیا کہوں۔ مجھے ہمایوں فر ہی کی قسم ہے، یہ میرا بھائی ہے، اور دوسرا کوئی نہیں ہے۔

حسن: بس اب ہمیں تسلی ہوئی۔ گو میں نے ہمایوں فر سے خود باتیں کیں۔ مگر پھر بھی یقین نہیں آتا کہ وہی ہیں۔

خورشید لقا بیگم نے کہا بہن تم ہم سے کچھ نہ کہلواؤ۔ اس میں ایک بھید ہے۔ جس طرح فرامشن[1] کے لوگ کسی کو اپنا راز نہیں بتاتے۔ اسی طرح ہم بھی نہ بتائیں گے۔ نواب مرزا فرامشن ہو گئے۔ لاکھ لاکھ قسمیں

دیں نہ بتایا نہ بتایا۔ مگر اتنا کہے دیتی ہوں کہ یہ ہمایوں فر ہی ہیں۔

اب سنیئے کہ دور دور تک شہر میں اس خبر کی شہرت ہوئی، اور شہر بھر میں چٹکیوں میں معلوم ہو گیا کہ فقیر کامل کی دعائے خیر سے مرزا ہمایوں فر بہادر زندہ ہو گئے۔ سب انگشت حیرت بدنداں تھے، کہ یا باری تعالیٰ یہ کیا اسرار ہے۔ علمائے اَجلّ و فضلائے اکمل میدانِ فکر میں عقل کے گھوڑے دوڑاتے تھے۔ مگر ذرا بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کمندِ وَہم کنگرۂ قصرِ رمزِ الٰہی تک نہیں پہونچتی تھی:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

و ز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

شانِ خدا کہہ کر سب خاموش ہو رہتے تھے۔ عوام کو انتہا سے زیادہ حیرت تھی کہ یا خدا مردہ اتنے دن کے بعد کیونکر زندہ ہو گیا۔ اکثر آدمیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ خبر صحیح ہے۔ ہزار ہا آدمی بمجردِ اِستماعِ خبر حیرت اثر قلعہ معلّٰی گئے۔ کہ مرزا ہمایوں فر بہادر کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اکثر ایسے بھی تھے جنھوں نے یہ خبر سُن کر قہقہہ لگایا، اور کہا کہ کیا پھیڑیا دھسان خلقت ہے۔ جس نے جو کچھ کہہ دیا فوراً یقین آ گیا۔ اس خوش اعتقادی کے صدقے۔ ع

بریں فہم و دانش بباید گریست

سُست اِعتقاد تو شاہ صاحب کا ایمان لائے تھے۔ اچھے اچھے تربیت یافتہ، اور صائب رائے کہتے تھے کہ آج ہماری برسوں کی ہَٹ مٹ گئی اللہ اللہ اس قدر عرصے تک ہمایوں فر بہادر قبر میں رہیں، اور پھر زندہ موجود۔ ڈاکٹروں حکیموں نے بعد امتحان کہہ دیا کہ جان مطلق باقی نہیں ہے۔ قبر میں دفنائے گئے۔ قبر چُنی گئی۔ اس پر مقبرہ بنا۔ اور وہ اسپ صرصر تک پر سوار سامنے سے آن موجود ہوئے۔ شانِ پروردگار، شانِ پروردگار۔

اب سُنیئے کہ رُوح افزا، اور بہار النسا، اور جہاں آرا وغیرہ تو انتہا سے زیادہ خوش تھیں، مگر حُسن آرا اُنگلی دانت کے تلے دبائے ہوئے سکتے کے عالم میں کہ یا اللہ میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔ کیا سچ مُچ یہ ہمایوں فر ہی ہیں۔ بڑی بیگم بار بار سجدے کرتی تھیں۔ پیش خدمتیں جامے میں پھولے نہیں سماتی تھیں، مگر اِستعجاب سب کو تھا کہ یہ کیا بُوالعجبی ہے۔ حیرت نہیں تھی تو اُستانی جی کو یا دولھا کی طرف کی دو چار مخدرات کو۔ شہزادی بیگم، ہمایوں فر بہادر کی مادرِ مہربان کے چہرہ سے ذرا بھی حیرت نہیں برستی تھی۔ قِس علیٰ ہٰذا۔ اُن کی بہنیں خورشید لقا بیگم اور مہ لقا بیگم کے بشرے سے بھی استعجاب نہیں ظاہر ہوتا تھا۔ آپس میں اَنواع و اَقسام باتیں کرتی تھیں۔

خورشید: (اَخوہ) ہمایوں فر نے کتنے بار دھوکا دیا۔

مہ لقا: ہے ہے۔ جب دشمنوں کے ڈوبنے کی خبر آئی تھی (کانپ کر) یا اللہ وہ دن دشمن بلکہ ساتویں دشمن

کو بھی نہ دکھائے۔

مہری: حضور غضب کا سامنا تھا۔ اُس روز۔ ہے ہے۔

بڑی: بیو بو۔ از برائے خدا اس وقت ایسی لفظیں زبان سے نہ نکالو۔ جو کچھ ہوتا تھا وہ ہوا، اب گذشتہ را صَلوٰۃ۔

حُسن: اتا جان۔ کیا ہمایوں فرہی ہیں۔ ذری غور سے دیکھو۔

بڑی: اے لو اور سُنو۔ ابھی ان کو اس میں شک ہے۔ واہ لڑکی واہ۔ بیٹا فقیر کا گھر بڑا ہے۔ ابھی کل تو تم پیدا ہوئیں اور آج بڑوں کی باتوں میں دخل در معقولات دینے لگیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ تمہارے آگے تو کوئی سر بھی پھوڑ ڈالتا تو تم یہی بکے جاتیں، کہ ایسا نہیں ہو سکتا اُف آج جان میں جان آئی۔ اب اللہ سے دُعا ہے کہ میں بھی ٹھنڈے ٹھنڈے اپنی راہ لوں۔ اب بے حیائی کی زندگی ہے۔ ایسے ایسے صدمے سہے، کہ کمر ٹوٹ گئی۔ یا اللہ اب مجھے بلالے۔ بس زندگی سے سیر ہو گئی ہوں۔

عبّاسی: اے حضور ایسی بات نہ فرمائیے۔ حُسن آرا بیگم اور سپہر آرا بیگم کے نولڑکے کھلا لیجئے۔ حضور کا سایہ صاحبزادیوں پر قائم رہے اور حضور اُن کے پوتے پڑ وتے دیکھیں۔

پیش خدمتیں: (آمین آمین، کہتی جاتی تھیں، خورشید لقا بیگم بولیں (حسن آرا کی طرف مخاطب ہو کر) اللہ نے جیسی مصیبت ہم پر ڈالی تھی۔ آج تک کسی پر ویسی مصیبت نہیں پڑی اور جیسا کرم ہم پر کیا ایسا کرم بھی آج تک کسی پر نہیں کیا ہوگا۔ اس کی کریمی کے صدقے بڑا کریم ہے۔ جب دیتا ہے۔ تو یوں ہی دیتا ہے۔ کس کو امید تھی کہ یہ دن دیکھیں گے۔ توبہ۔ توبہ۔ مگر اس کی شان۔ صدقے۔ اپنے پاک پروردگار کے اس وقت جی چاہتا ہے، کہ اسی جگہ پر شہر بھر کی ڈومنیاں جمع ہوں، اور رات بھر ناچ دیکھیں۔ آج رت جگا کریں۔

مغلانی: کیا اس میں بھی کچھ کلام ہے۔ حضور مرزا ہمایوں فراز سرِ نو زندگی پائیں۔ اور ہم رت جگا نہ کریں۔

مہری: اس میں کیا شک ہے۔ سارے شہر نے سوگ لیا تھا۔

بڑی: پھر وہی باتیں شروع کیں۔ میں کیونکر ان کو سمجھاؤں کسی کا کہنا کوئی مانتا ہی نہیں۔ یہ عجب اُن لوگوں کی خاصیت ہے لاکھ سمجھاؤں سمجھتے ہی نہیں۔ ع

مزن فالِ بد کاورد حالِ بد

اِدھر باتیں ہوتی تھیں، اُدھر شاہ صاحب کے اِرد گرد ٹھٹھ ٹھٹھ جمع تھے۔ ہزار ہا آدمیوں کا ہجوم کوئی قدموں پر ٹوپی رکھتا تھا۔ کوئی پاؤں چومتا تھا۔ کوئی دور سے دعائیں دیتا تھا اور شاہ صاحب بڑے غرور کے ساتھ آواز بنا کر یہ اشعار ادا کرتے تھے:۔

اے خداوندِ کار سازِ کریم ملک و صانع و قدیم و حکیم
خیمہ بر پا کن سپہر بلند آسمان ساز اور زمین پیوند
نقش پرداز کارگاہ جہاں کاتب نسخۂ زمین و زماں
تونے برپا کئے ہیں یہ افلاک خاک کو تونے دی ہے صورتِ پاک

تیری صناعی کا ہے سب یہ اثر
نخل میں شاخ شاخ میں ہے ثمر

ایک: سب حضور ہی کی دعا کی برکت ہے۔ شاہ صاحب۔

دوسرا: سچ۔ اس میں کسی کو شک ہے، دریں چہ شک ست۔

تیسرا: حضور نے ریاض بھی بڑا کیا ہے۔ برسوں نیم کی پتیاں کھا کھا کر بسر کی ہے۔ پتیاں اُبالیں ملک ملا کر کھالیں۔

چوتھا: اے سبحان اللہ۔ بہت مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے۔ جب ایسے ہیں تب ایسے ہیں۔ یوں نے کو تو کون نہ مرے گا۔ کیا کوئی بچ بھی جائے گا اے توبہ کیا مجال۔ ایک دن سب مریں گے۔

کیا ہوا اسکندر صاحبقراں کیا ہوا جمشید دارائے جہاں
کیا ہوا رستم ہوا کیا پیروزال کیا ہوا وہ کر و فر وہ جاہ و مال

کیا ہوئے یوسفؑ عزیز دو جہاں
کیا ہوئے یعقوبؑ پیر ناتواں

دنیا ایک دن چھوڑنی ہوگی۔ یہ سب جانتے ہیں، مگر ہم لوگوں کو ہمایوں فر کے مرنے سے جو رنج ہوا تھا، اس کا حال ناگفتہ بہ۔ بہرکیف انجام اچھا ہوا۔ شب کو قلعہ معلّی میں اس درجہ چہل پہل تھی کہ اچھے اچھے میلوں میں نہیں ہوتی ہے۔ تمام دنیا کی نعمت موجود تھی۔ ہر قسم کی دوکانیں سجی سجائی۔ ہزاروں تماشائی۔ زن و مرد بشاش کہ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ دولھا کو دلہن سے ملایا۔ خوشی کے شادیانے بجتے تھے۔ چوک میں دکاندار ٹھٹے سے دُکانیں سجتے تھے۔ مرزا ہمایوں فر سے شہر بھر خوش تھا۔ ان کو کل رعایا بادشاہ سمجھتی تھی۔ ان کی سخاوت، ان کی فیاضی، ان کی رحم دلی، کا نقش سب کے لوحۂ دل پر منقوش تھا۔ گھر گھر رت جگا۔ پچھلے کو مرزا ہمایوں فر بہادر سپہر آرا کو ساتھ لے کر فنس پر سوار ہوئے۔ اور اپنے گھر گئے۔ خورشید لقا بیگم اور شہزادی بیگم دونوں نے بلائیں لیں۔ شاہ صاحب کے حکم کے بموجب اس شب کو سپہر آرا، اور ہمایوں فر الگ تھلگ رہے۔ صبح کو نکاح ہوا۔ شاہ صاحب نے کہہ دیا تھا کہ خبردار خبردار شرعی رسوم کے علاوہ اور کوئی رسم نہ ادا کی جائے۔ لہٰذا

ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ صبح کو چُپ چپاتے نکاح ہو گیا۔ نکاح کے وقت حُسن آرا، اور بہار النسا، اور رُوح افزا نے کئی بار دولھا کو چھیڑا، اور ہمایوں فر بھی دل لگی سے باز نہیں آئے۔ نکاح کے بعد حسن آرا اور شہزادے سے دیر تک میٹھی میٹھی باتیں ہوا کیں۔

شہزادہ: بعد مدت آج آرزو بر آئی۔ برسوں کوٹھے پر دھوپ کھائی۔ مصیبت اٹھائی۔ تب جا کے آج شاہدِ تمنا سے ہم آغوش ہوا۔ ابتدا تو وہی تھی، جب میں عاشق النسا بن کے آیا تھا۔ وہ دن بھی تمام عمر یاد رہے گا۔

حسن: جس وقت مہری تمہاری تصویر لائی۔ ہم نے دانت کے تلے انگلی دبائی۔ پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ سپہر آرا بہت گھبرائیں، اور کہا باجی یہ تو بڑی بے ڈھپ ہوئی۔ اب کیا کریں۔

شہزادہ: میری خوش نصیبی تھی کہ ان سے تو ملے ہی۔ شکر ہے کہ آپ سے بھی گلے مل چکا ہوں۔ اس سے بڑھ کر خوش قسمتی اور کیا ہوگی؛ کہ ایسی خوب صورت شریف زادی کو بن بیلے گلے لگاؤں۔

حسن: (گردن نیچی کر کے) کیا ہوا۔ چھوٹے ہو کہ نہیں؟

شہزادہ: اچھا اگر یہ ہے تو پھر اب پھر ایک بار سہی۔

حسن: (شرما کر) اب یہ کافی ہیں۔

اس فقرے پر روح افزا نے ہنس کر کہا۔ واہ اچھی باتیں ہو رہی ہیں۔ سالی بہنوئی تو میں دیکھتی ہوں بہت بے تکلف ہیں۔ سپہر آرا اس وقت کیسی گردن جھکائے بیٹھی ہوئی ہیں۔ گویا کچھ جانتی ہی نہیں۔ بڑی سیدھی بن جاتی ہیں۔

شہزادہ: اُن کو اس وقت بولنے کا مَنصب نہیں ہے۔ تو ان سے (حسن آرا کی طرف مخاطب ہو کر) باتیں کرتے ہیں۔ ہاں حضور تو آپ نے کیا فرمایا۔ چھوٹا بہنوئی جو سالی سے گلے ملے، تو ہرج نہیں ہے۔ پھر بسم اللہ تب تک تو سالی بہنوئی کا کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ اب ہم آپ کے خرد ہیں اور سالی تو آدھی جورو ہوتی ہے۔

حسن: وہ کوئی اور ہوتی ہوں گی تو کوئی ایسی جورو ڈھونڈھی ہوتی جس کی بہنیں شوخ اور چرپانک اور بے باک ہوں۔

شہزادہ: حضور کی شوخی کیا کم ہے۔ ہم تو آپ کو بھی شوخ طبع سمجھتے ہیں۔ رگ رگ میں شوخی بھری ہے:

خوبرو ینتے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی
ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی

حسن: خیر میری رگ رگ میں شوخی ہو یا نہ ہو مگر تمہاری رگ رگ میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک دفعہ کیا دیکھتی ہوں کہ پتنگ آکے مہتابی پر گرا۔ پڑھتی ہوں تو ایک شعر:

از عاشقان صادقت اے دلستان منم
اول کسی کہ بر تو فدا شد ز جان منم

سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو پڑوس کا شیطان ہوگا۔

شہزادہ : اب مجھ سے بھی گستاخی ہوگی۔ دیکھئے میں نے عرض کر دیا۔ آپ مانئے یا نہ مانیئے۔ آپ کو اختیار ہے۔ مگر پھر شکایت نہ کیجئے گا۔ ہاں۔ ہمایوں فر نے حُسن آرا سے کہا۔ قسم خدا کی میری جان جاتی تھی، جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اس طرح کوٹھا مجھے کھینچتا تھا۔ جب دیکھو کوٹھے ہی پر۔ دھوپ میں کوٹھے پر۔ گرمی میں کوٹھے پر سردی میں کوٹھے پر۔ مینہ برسے تو بھی کوٹھے سے جانے کو جی نہ چاہے۔ شب کو شبنم ہی میں سو رہے۔ مگر مہتابی کا سامنا نہ چھوڑا نہ چھوڑا۔ جو کسی دن قسمت نے یاوری کی، اور تم دونوں پریوں میں سے کوئی نظر آئی تو کروروں روپیہ مل گیا۔ ایک دن سپہر آرا ہمارے رجھانے کے لئے اِس بناؤ چناؤ کے ساتھ مہتابی پر آئیں، کہ جان نکل گئی، جی چاہا کہ اڑ کے پہنچوں۔ مگر سٹپٹا کے رہ گیا اور حضور کی بھی ہم پر نظر پڑتی تھی۔ چاہیئے اب نہ کہیئے۔

حسن : اُنہہ۔ اُونہہ! ایسے ہی تو آپ بڑے حسین ہیں۔ چشم بد دور۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ ذری آئینے میں صورت تو دیکھوں، واہ کیا قطع شریف ہے۔

شہزادہ : اگر بُرے ہیں تو بہن کیوں بیاہی آپ نے۔

حسن : تمہاری خوش نصیبی۔ تم اور ایسی حسین بیوی پاؤ، اور دیکھنا خدمت نہ کرو تو سہی۔ تمہاری تو قسمت کھل گئی۔ آپ اور باتیں بنائیں۔ شانِ خدا۔

روح : ہاں سپہر آرا کے تو تلوؤں کو نہیں پہنچتے۔

حسن : اس میں کیا شک ہے۔ بہن سپہر آرا لاکھوں میں لا جواب ہے۔ اگر ایسی تھی نہیں تو یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں۔ شرماتے نہیں ہو، اور اوپر سے باتیں بناتے ہو۔

شہزادہ : ہمارے بھائیوں اور ہماری بہنوں سے پوچھو، تو وہ البتہ ہمارا اور دلہن کا مقابلہ کریں۔

گیتی آرا : (قہقہہ لگا کر) اے ہے تو عورت ہی پیدا ہوئے ہوتے۔ مردُوے کیوں ہوئے۔ داڑھی مونچھ لگا کر چلے ہیں دلہن سے مقابلہ کرنے۔ واہ بندہ پرور واہ۔ اللہ جانتا ہے کہیں اور کہو گے تو ہنسے جاؤ گے۔ اور چلے ہیں دُلہن سے مقابلہ کرنے۔ کاہے میں دلہن سے مقابلہ کرو گے۔

شہزادہ : اب جواب تو اس کا میں ضرور دیتا، مگر تمہاری بہن چٹکیاں لے رہی ہیں۔

روح : جھوٹے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ اُس بیچاری کا تو ہاتھ الگ ہے۔ یہ تہمتیں تراشتے ہو۔ کیوں صاحب اس جھوٹ کے صدقے اس تہمت کے قربان۔

شہزادہ : تم سب تو اپنی بہن کی سی کہا چاہو۔ ہماری طرف کا کوئی ہوتا تو ہمارا جنبہ کرتا۔ اچھا تم دلہن ہی سے پوچھ لو۔

روح : سپہر آرا تمہیں ہمارے سر کی قسم سچ سچ بتانا۔ تم نے چٹکی لی تھی یا نہیں۔ بولو صاف صاف۔ اس میں چوری کاہے کی ہے؛ نہ بتاؤ گی تو ہمیں رنج ہوگا۔ یہاں کوئی بڑی بوڑھی تھوڑا ہی ہے۔ بولو تمہیں اللہ کی قسم جو نہ بتاؤ۔

شہزادہ : واہ بتا چلیں۔ اے لو پھر چٹکی لی۔

سپہر آرا نے رُوح افزا کے کان میں کہا مجھ سے چاہے جس کی قسم لو میں نے چُٹکی وُٹکی تو نہیں لی، مگر ہاں شیطان دور سے اُن کو صورت دکھاتا ہو تو میں نہیں جانتی۔

رُوح افزا بولی۔ اہا۔ جبھی چونک چونک اٹھتی ہیں۔ میں بھی کہتی تھی یا خدا کیا سبب ہے۔ یہ آج معلوم ہوا لو صاحب اب تو ہماری بہن نے بھی آپ کو جھوٹا بنایا۔ اب تو ذرا شرماؤ۔ مگر پھیری منہ پر کوئی تو کیا کرے گا کوئی۔ بے حیا کے بسیوں بسوے، شہزادے۔ شہزادہ نے کہا یوں تو یہاں جتنی ہیں سب شوخ و شنگ، پری چہرہ، دلربا، شیریں ادا، حاضر جواب، تیز طبیعت، زبان دراز ہیں۔ مگر رُوح افزا بیگم سب سے بڑھ کے معلوم ہوتی ہیں، اِن کی باتیں بڑی گرما گرم ہیں۔ اُف ری شوخی، سیماب کو شاید قرار بھی ہو۔ حضور کو قرار نہیں۔ بے ادبی مُعاف ایک ایک بوٹی پھڑکتی ہے : ع

زچشم بد رُخ خوب ترا خدا حافظ

حسن آرا بیگم تو اس کو معیوب نہیں سمجھتیں کہ بڑی سالی چھوٹے بہنوئی کے گلے، آپ اپنی کہیئے۔

روح : آپ ہیں بڑے بھلے مانس۔ بس اور تو کیا کہوں اور یہ تو میں آپ کی باتوں ہی سے سمجھ گئی تھی۔

شہزادہ : کیا کہنا ہے۔ آپ کی سمجھ کا کیا کہنا ہے :

خوشا لطافت اندازۂ ادا فہمی

زہے نزاکتِ اندازہ مدعا دانی

رُوح : آپ اپنے نزدیک بڑے لفاظ اور لستان ہیں۔ اور ابھی ہم سب لحاظ کرتی ہیں کہ جو کوئی اپنے گھر میں مہمانی کے لئے آئے، اس کو کیا ستائیں، مگر یہ سر ہی چڑھے جاتے ہیں۔

بہار : پھر کیا ان کے لفاظ ہونے میں کسی کو شک بھی ہے۔

بہار : ہیں لستان۔ تم نہ کہو ہٹ دھرمی سے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔

روح : تم تو باجی ابھی آئی ہو۔ جو پہلے سے آئی ہوتیں۔ تو دیکھ لیتیں کہ یہ کیا باتیں کر رہے تھے۔

شہزادہ : بھلا آپ کو یقین ہے۔ کہ میرا سا سیدھا سادہ، اور ایسی ویسی باتیں کرے۔ توبہ۔ توبہ۔ کیا مجال۔ ان کا

جو جی چاہے سو کہہ لیں۔

بہار: ایسے سیدھے سادھے تو آپ نہیں ہیں۔ (دوپٹے سنبھال کر)، آپ بھی بہت دور ہیں۔ جی۔ (زُلفِ عنبر یار پر ہاتھ پھیر کر)

حسن: (رُوح اُفزا کے کان میں) بہارُالنسا بہن اس وقت خوب نکھر کے، بن ٹھن کے آئی ہیں۔ خبط ہے ان کو۔

روح: تم نے دیکھا نہیں، پہلے دوپٹے کو دو چار بار سنبھالا۔ پھر چوٹی کو درست کیا، اور سنوارا۔ پھر آئینے کے سامنے بیٹھیں ان کو تو مرض ہے یہ۔ امی جان تس پر ٹوکتی رہتی ہیں۔

بہار: کیا باتیں ہوتی ہیں چپکے چپکے۔ ہم بھی کچھ سنیں۔ میرا ہی ذکر ہوگا۔ یہ حُسن آرا بڑی ایک ہیں۔

حسن: (ہنستے ہوئے) بہن آج آئینے کے پاس آپ کم بیٹھیں۔

بہار: یہ میں تو سمجھ ہی گئی تھی۔

شہزادہ: آخاہ۔ بہار النسا بیگم ہیں۔ برسوں بعد دیکھا یاد ہے۔ جب ہم تم ساتھ کھیلا کرتے تھے یا بھول گئیں

بہار: ہمیں تو سب یاد ہے۔ مگر شکر ہے کہ آپ کو بھی یاد ہے۔ ایک دن سیر ہوئی۔ مولوی صاحب نے ان کو تین شعر برزبان یاد کرائے، اور میں بھی سنتی جاتی تھی۔ دوسرے دن جو مولوی صاحب نے پوچھا تو ان کو شعر یاد نہیں نکلیں، اور میں پردے کے پاس سے سُن رہی تھی۔ لڑکپن کا زمانہ تو تھا ہی میں نے وہیں سے شعر پڑھ دیئے۔ بس مولوی صاحب نے ان کو بہت شرم دلائی۔ یاد ہے۔

شہزادہ: اس فقرہ بازی کا کیا جواب دوں۔ بھلا وہ کون شعر تھے۔ جب آپ اس قدر ذہین ہیں، تو شعر ضرور یاد ہوں گے۔

بہار: ہاں ہاں عمر بھر یاد رہیں گے۔ آپ کی طرح ہمارا حافظہ خراب نہیں ہے۔ تم ہمیشہ سے اپنے حافظہ کی شکایت کرتے ہو

شہزادہ: دیکھئے درپردہ آپ نے مجھے جھوٹا بنایا۔ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ یہ درپردہ پھبتی آپ نے کہی۔ خیر اچھا شعر تو سُنا دیجئے۔ آپ کے حافظہ کی کیفیت تو دیکھ لوں۔

بہار: اے لو۔ ہمارے حافظے کی کیفیت اب دیکھیں گے آپ:

فکرِ مُعادو یاں جسے شام و سحر نہیں — حیوان سمجھتے ہیں ہم اُسے دود بشر نہیں

سرکش کو باغ دہر میں نیکی کا پھل کہاں — دیکھو کہ سرو میں کبھی ہوتا ثمر نہیں

انسان گہر ہے علم و فن اس میں ہے آب و تاب — بے آبرو ہے آدمی کو علم گر نہیں

ہیں یہی تینوں شعر ہیں، کہ نہیں۔

شہزادہ: (مسکراکر) بجا۔ کس نامعقول نے کبھی اور یہ شعر سُنے بھی ہوں۔ آج ہی سُنے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ اب فقرہ باز بھی ہوگئی ہیں۔ (اور اردو) میں نے کبھی کسی سے پڑھی ہی نہیں۔

بہار: اللہ رے جھوٹ۔ اُف رے جھوٹ۔

روح: اس کے تو حضور بادشاہ ہیں۔ ایک سچ تو ننانوے غلط۔ ابھی کہتے تھے کہ سپہر آرا مجھے چٹکی لیتی ہیں۔ قسمیں دے کر پوچھا تو سپہر آرا نے بالکل انکار کیا، اب ان سے جھگڑے کون۔ نور کے تڑکے۔

چوں از دمِ بادِ نو بہاری	گل بر سر شعلہ زد عماری
بر دستِ صبا نگار بستند	پیرایۂ نو بہار بستند
دوران بہار رنگ و بو داد	گلدستہ بدست آرزو داد
سیراب دار مغز دانا	دوران چو مزاجِ دل توانا

گل کرد بہار عشق سازاں

چو شمید دماغ عشق بازاں

سالیاں شہزادۂ فلک بارگاہ، نوشاہِ کج کلاہ، سے چہل کرتی تھیں، محبت کا دم بھرتی تھیں، کہ سپیدۂ صبح نمودار ہوا۔ شاہ صاحب کے حکم کے بموجب دولھا دُلہن دونوں ایک پالکی گاڑی میں سوار ہوئے۔ جس میں چار سمندرِ سوار برق کردار جتے ہوئے تھے۔ قطعی ممانعت تھی کہ رخصت کے وقت بھی کوئی رسم بجز رسومِ شرعی کے نہ ادا ہو۔ دولھا دُلہن کی سواری کے ساتھ پچاس سپاہی اور بیس خاص بردار تھے، بس باقی (اللہ اللہ خیر صلاح) شہزادے کے دو رفیق خاص مسلح گاڑی کے اِدھر اُدھر گھوڑوں پر سوار، ہمراہ ہوئے۔ دم کے دم میں شہزادے کے محل میں سواری پہونچی۔ وہاں بھی کوئی رسم ادا نہیں ہوئی۔ شاہ صاحب نے کہہ دیا تھا کہ ایک ہفتے تک پرنس ہمایوں فر بہادر گھر کے باہر نہ آئیں۔ گو شہزادہ نے کئی بار خواہش کی کہ اپنے احباب سے ملیں، مگر خورشید لقا بیگم نے بھائی کو نہ اٹھنے دیا۔ کہا اگر تم باہر جاؤ گے تو میں ساتھ چلوں گی۔ مجبور ہو کر شہزادے نے احباب کے ملنے سے انکار کیا۔ شب کو وہ سامان ہوئے کہ چشمِ فلک نے آج تک نہ دیکھے ہوں گے۔ ان کا مفصل حال معرض بیان میں آئے گا۔

خواجہ بدیع بدیع

اُخاہ حضور ہیں۔ آئیے آئیے۔ بعد مدت حضور کی زیارت ہوئی، یہ آپ بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں۔ کہیے

صورت ہی ایسی ہے۔ دریں چہ شک، یہ تو ظاہر ہے۔ قطع مبارک اس قابل ہے کہ فوٹو لے اور جہاں تماشا گاہ ہو فوراً بھیجیے۔ ایک ایک تصویر دنیا بھر کے عجائب خانوں میں رکھی جائے۔ یہ حضور اب تک تھے کہاں ؟ ناظرین کو یاد ہو گا کہ خواجہ بدیع الزماں کو ہم نے جہاز پر چھوڑا تھا۔ خیر۔ خدا خدا کر کے مع الظفر داخل سوئز ہوا، اسکندریہ میں آزاد پاشا مس مَیڈا کے اصرار سے ایک ہفتے تک مقیم رہے۔ جس ہوٹل میں پہلے فروکش ہوئے تھے وہیں وہیں اب بھی ٹکے۔ خواجہ بدیع الزماں اکڑتے ہوئے اِن کے پاس آئے۔ اور کہا آزاد اب یہاں ذرا ہمارے ٹھاٹھ دیکھئے گا۔ پہلے تو لوگوں سے دریافت کر لو کہ ہم نے کشتی نکالی تھی یا نہیں۔ مارا چاروں شانے چت، اٹھا اٹھا کے دے دے مارا۔ اٹھایا اور دے پٹکا۔ اور کس کو۔ اس پہلوان کو جو تمام مصر میں فرد تھا۔ جس کا نام لے کر مصر کے پہلوانوں کے استاد کان پکڑتے تھے۔ میاں سچ ہے تو ہے، اور اس کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں۔ کسی کا بدن چور ہوتا ہے اس کا قد چور ہے۔ پہلے تو مجھے ریلتا ہوا اکھاڑے کے باہر لے گیا اور میں بھی چپ چاپ چلا گیا۔ بس بھائی پھر تو میں نے قدم جما کے جو ریلا دیا، تو بول گیا۔ اب بے چینی ہونے لگی۔ تو بڑے بڑے جوڑوں میں پھپتی کم ہوتی ہے مگر وہ استاد اور میں جگت استاد۔ اس نے پیچ کیا میں نے توڑ کیا۔ وہ پشت پر آیا، مگر میں نے بتا بتایا۔ اُس نے دستی کھینچی، میں بغلی ڈوبا۔ اس نے ڈنڈا لگایا۔ میں نے اُچک کے کاٹ کھایا۔

راوی : سبحان اللہ۔ یہ سب سے بڑھ کر پیچ ہے۔ آپ نے اتنی تکلیف کیوں گوارا کی۔ حضرت چکت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ بھلا بیٹھ کے کوسنا کیوں نہ شروع کر دیا۔ کاٹ کھانے کی بات پر آزاد اور مس گلیرسا اور مس مَیڈا کو بڑی ہنسی آئی، اور خواجہ صاحب بھی مسکرائے کہ جو کارِ نمایاں سرزد ہوئے تھے ان کے حالات سُن کر یہ سب بشاش ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے فرمایا، بس جناب دو گھنٹے تک برابر کی لڑائی رہی۔ وہ کرارا چنگا کڑیل جوان، گرانڈیل موٹا تازہ پھپّا۔ یہ نیچے اور قد میں کیا بتاؤں کاہے سے تشبیہ دوں۔ بس جیسے حسین آباد کا سنکھنڈا سو وہ بھی چو کھنڈا بن کے رہ گیا ہے۔ اس کا قد اس سے بھی نکلتا ہے۔ اس میں قوت اور یہاں استادی کرتب میں نے اس کو ہنپا ہنپا کے مار ڈالا۔ جب اس کا دم ٹوٹ گیا، تو چُرمُر کر ڈالا۔ ہات تیرے گیدی کی۔ بس جناب قلعہ جنگ کے پیچ پر ارا تو چاروں شانے چت۔ اور کوئی پچاس ہزار آدمی دیکھ رہا تھا۔ تمام شہر میں مشہور تھا کہ ہند کا پہلوان آیا۔ آزاد نے کہا کہ بھائی جان سُنو! اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی سند نہیں ہے۔ جب جانے کہ ہمارے سامنے پٹخنی دو، اور پہلے پہلوان کو بھی دیکھ لیں، کہ کیسا ہے۔ تمہاری اس کی جوڑ ہے یا نہیں۔ فرض کرو تم سے کم ہوا یا اٹھارہ بیس کا فرق ہوا۔ تم بیس ہو وہ اٹھارہ، تو پھر دے مارنا کون بات ہے، اس کی سند نہیں۔ خواجہ صاحب بگڑ کر بولے، کچھ عجب آدمی ہیں۔ آپ سارے بیان کہتے جاتے ہیں پھپّا جو گرانڈیل۔ یقین ہی نہیں آتا، تو ہم اس کو کیا کریں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، دیکھ لیجئے۔ اتنے میں ہوٹل کے

دو ایک آدمی خوجی کے ارد گرد جمع ہوئے۔ ان سے کہنے لگے۔

خوجی: کیوں یہاں ہم نے ایک کشتی نکالی تھی یا نہیں؟

مصری: واہ ہمارے ہوٹل کے بونے نے البتہ اٹھا کے دے پٹکا، واہ چلے وہاں سے کشتی نکالنے یہاں گدا کھا گئے ہو اور باتیں کرتے ہو۔

خو: او گیدی جھوٹ بولنا سور کا کھانا برابر ہے۔

مصری: ہاتھ پاؤں توڑ کے دھر دے گا۔ آپ اور کشتی۔

خو: جی ہاں، جی ہاں، ہم اور کشتی! کوئی آئے۔ تب نہیں۔ اب سہی۔ بسم اللہ میں بند نہیں ہوں۔ (خم ٹھونک کے) بلواؤ اُس پہلوان کو۔

اتنے میں بونا سامنے آن کھڑا ہوا اور آتے ہی چڑھانے لگا۔ خواجہ صاحب بگڑ کھڑے ہوئے۔ آزاد کی طرف اشارہ کیا، کہ یہی پہلوان ہے، جس کی کشتی ہم نے نکالی تھی۔ آزاد بہت ہنسے۔ کہا بس ٹائیں ٹائیں فش، بونے سے کشتی نکالی تو کیا۔ کسی برابر والے سے کشتی نکالتے تو جانتے۔ اسی پر اس قدر ناز تھا، یا الٰہی کان سنتے سنتے تھک گئے۔ یہاں جو آن کے دیکھتے ہیں تو وہی ڈھاک کے تین پات، لاحول ولا قوۃ۔ خواجہ صاحب نے گردن ہلا کر کہا کہنے اور کرنے میں فرق ہے۔ جناب اگر حضور اس سے ہاتھ پاؤں ملائیں تو ظاہر ہو جائے کہ لوہے کے ہاتھ پاؤں فولاد کے ہیں۔ آپ کی نرم نرم انگلیاں، اور نازک نازک کلائیاں دکھنے لگیں گی۔ بونا خم ٹھونک کے سامنے آن کھڑا ہوا، اور خواجہ صاحب پینترے بدل کے پہنچے، آزاد پاشا، اور مس کلیرسا، اور مس میڈا، اور ہوٹل کے اکثر آدمی، ان دونوں کے گرد ٹھٹھ لگا کے کھڑے ہوئے۔

خوجی: بچہ چڈا گل خیر و آج بھی گدا دوں گا۔

بونا: (سمجھا خاک نہیں) آج تمہاری کھوپڑی ہے، اور میرا جوتا۔

خوجی: ایسا گدا دوں کہ یاد کرو۔ عمر بھر یاد رہے، تو سہی۔

بونا: انعام تو ملے ہی گا، پھر ہمارا کیا ہرج ہے۔

خوجی: ماشاء اللہ، وہ گدا دوں گا کہ یاد کرو گے: ع

من کہ ہاشم کہ بر آن خاطر عاطر گذرم

بندہ، نرا مُلّا ہی نہیں ہے اس وقت۔

اب سُنیے کہ ادھر خواجہ صاحب، اُدھر بونا پہلوان، دونوں گندے تول تول کے رہ جاتے تھے۔ خواجہ صاحب نے گھونسا تانا۔ بونے نے منہ چڑھایا۔ یہ چپٹے اس نے گُدا مارنے کا قصد کیا۔ خوجی نے جھلا کر چپت جمائی۔ بونے

نے دھول لگائی۔ اور لطف یہ کہ دونوں کی چاند گھٹی گھٹائی چکنی۔ اس زور کی آواز آتی تھی، کہ سُننے والوں اور دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جاتا تھا۔

مَیڈا : خوب آواز آئی تراق۔ ہاں ایک اور

کلیرسا : اس وقت اس قدر ہنسی آتی ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔

خو : جی ہاں ہنسی کیوں نہ آئے گی جس کی کھوپڑی پر گذرتی ہے۔ اُس کا ہی دل جانتا ہے۔

آزاد : ارے یار زور زور سے چپت بازی ہو۔

خو : دیکھئے تو دم کے دم میں بے دم کئے دیتا ہوں کہ نہیں۔

آزاد : مگر یار اس کا قد تو بہت ہی پست ہے۔

خو : ہائے افسوس۔ بھئی تم ابھی بالکل ناتجربہ کار ہو۔ واللہ جو ذرا بھی تجربہ ہو بس اور تو کیا کہوں، ارے کمبخت اس کا قد چور ہے۔ جس طرح میرا بدن چور ہے۔

راوی : کیا خوب آپ کا بدن تو ضرور ہی چور ہے۔

خو : یوں دیکھنے میں تو کچھ نہیں معلوم ہوتا، مگر اکھاڑے میں اور چٹ لنگوٹ باندھ کے کھڑا ہوا، بس پھر دیکھئے بدن کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ تہ بہ تہ بالکل گینڈا بنا ہوا۔ کوئی کہتا ہے دُم کٹا بھینسا ہے۔ کوئی کہتا ہے ہاتھی کا پاٹھا ہے۔ کوئی کہتا ہے ناگوری بیل ہے۔ کوئی کہتا ہے جمنا پاری بکرا ہے، اور میں اِدھر اُدھر شانے کو دیکھتا بربر جاتا ہوں، کوئی دو جوتے بھی مارے تو کچھ پروا نہیں، تو وجہ کیا، وجہ یہ کہ مُستغنی ہوں، یہ جانتا ہوں کہ کوئی بولا، اور میں نے اٹھا کے دے مارا۔ ذرا غصہ آیا۔ انجر پنجر الگ کر دیئے۔ طاقت کا بھی کیا کہنا ہے۔

خواجہ صاحب نے کئی بار جھلا جھلا کر چپتیں لگائیں۔ ایک بار اتفاق سے اسکے ہاتھ میں ان کی گردن آگئی۔ اور اس زور سے گردن پکڑ لی، اور لٹک گیا۔ تو خوجی کسی قدر جھُکے اُن کا جھکنا کہ اس نے اور بھی زور سے مُکّا دیا تو منہ کے بل زمین پر۔ دو تین لپڑ سہی کمر کے بونا بھاگا۔ اور خواجہ صاحب اس کی دُم کے ساتھ۔ اس نے جاتے کے ساتھ ہی دروازہ بند کر لیا۔ خواجہ صاحب نے پٹخنی کھائی، تو تماشائیوں نے قہقہہ لگایا۔ اور اتفاق سے مس کلیرسا نے تالیاں بجائیں۔ اے ہے۔ بس ان کے غصے کی کچھ نہ پوچھیے۔ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ او گیدی بودے، بزدل، گیدی اگر شریف زادہ ہے تو آجا مقابلے پر۔ گیدی پر گرا تو بھاگ کھڑا ہوا۔

راوی : کیا گر پڑا! اجی حضرت کون گر پڑا ہوش کی خیر۔ آپ نے پٹخنی کھائی یا اس نے۔ چہ خوش چرا نباشد۔

آزاد : (بناوٹ کی راہ سے) ارے میاں آخر یہ ہوا کیا۔ کون گرا، کون جیتا، ہم تو اس طرف دیکھ رہے تھے۔ معلوم نہیں ہوا کہ کس نے دے مارا۔

خو: (اکڑ کر ہاتھ)! ایسی بات آپ کاہے کو دیکھنے لگے تھے۔ انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے گیدی کے۔ مگر اس کا قد چور ہے۔ دیکھنے میں بونا ہے۔ مگر باون گز سے کم اُس کا قد نہیں ہے؛ واللہ کشتی دیکھنے کے قابل تھی۔ میں نے ایک نیا پینچ نکالا آج بھی چاروں شانے چت گرا۔ اور اس کے گرنے کے وقت ایسی آواز آئی کہ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑ پھٹ پڑا، آپ نے سنا ہی ہوگا۔

آزاد: وہ ہے کہاں۔ کیا کھود کے زمین میں دفنا دیا آپ نے۔

خو: نہیں مردم آزاری سے منزلوں بھاگتا ہوں، اور قسم ہے واللہ پورا زور نہیں کیا ورنہ کیا میرے مقابلہ میں ٹھہرتا۔ توبہ توبہ ہاتھ پاؤں توڑ کے چُرمُر کر ڈالتا۔ میں وہ جن ہوں۔ گرتے ہی میں چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور خم ٹھونک کے سرخرو اٹھ کھڑا ہوا۔ نانی ہی تو مر گئی مردک کی۔ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

خون خشک ہوگیا۔ بس روتا ہوا بھاگا۔

آزاد: مگر خواجہ صاحب گرا تو وہ اور یہ آپ کی پشت پر گرد کیوں اتنی لگی ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟

خو: ہاں! (غور کر کے) یہیں پر ہم بھی قائل ہو گئے۔ حضرت۔

کلیرسا: بس اسی طرح اُس دفعہ بھی تم نے کشتی نکالی ہوگی۔

خو: سچ کہوں اس مرتبہ میں اپنے زعم میں آپ ہارا، اور پورا زور بھی تو نہیں کیا۔ میں نے۔ ورنہ لاش پھڑکتی ہوتی اور اب بھی۔ ع

چور جاتے رہے کہ اندھیاری

میڈا: بڑے شرم کی بات ہے، ذرا سا بونا نہ گرایا گیا ان سے۔

خو: (سر پیٹ کر) جی چاہتا ہے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹوں۔ بس اور کچھ نہیں غضب خدا کا کہتا جاتا ہوں کہ اُس گیدی کا قد چور ہے۔ آخر میرا بدن چور ہے یا نہیں۔ اس وقت میرے تن پر انگرکھا یا و کلا کچھ نہیں ہے۔ اس وقت ذرا میرے ڈنڈ دیکھئے گا اور ابھی کپڑے پہن لوں تو پدی معلوم ہونے لگوں۔ جیسے چتھا بٹیر بس یہی فرق سمجھ لو، اگر آزاد داد نہ دیں گے تو رنج ہو جائے گا۔ اوّل تو میں گرا نہیں، اس نے مجھے نہیں پچھاڑا۔ اپنا لنگر میں اپنے آپ نہ اُٹھا سکا۔ اپنے زعم میں آپ ہارا۔ دوسرے اُس کا قد چور ہے۔ باون گز زمین میں اُس کا دھڑ رہتا ہے لنکا کی فوج کا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا وہاں گز کا ہوتا ہے۔ دوسرے روز آزاد اُن دونوں پری زادوں کو لے کر بازار خاص کی ایک کوٹھی سے باہر آتے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خواجہ بدیع الزماں صاحب افیون کی پینک میں اونگتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ سامنے سے ساٹھ ستر ڈُنبے جاتے تھے۔ ڈُنبے والے نے

پکارا ہٹو، بٹو، بچو بچو، وہ آپے میں ہوں، تو بچیں۔ وہاں سُنتا کون ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ڈبے سے دھکا لگا اور دھم سے سڑک پر آ رہے۔ گرتے ہی چونک کے غُل مچایا۔ اُوگیدی کوئی ہے لانا قرولی۔ آج اس بہروپیے کی جان اور اپنی جان ایک کروں گا۔ خدا جانے اس کو میرے ساتھ کیا عداوت پڑگئی۔ آنکھ کھول کر دیکھتے ہیں، تو ڈبے مگر نشے جمے ہوئے تھے فرماتے ہیں کیا ہیں اور سُنیئے۔ واہ بے بہروپیے واہ۔ اچھا گیدی۔ بھلا بھلا آج چلا شُتر بان بن کے آئے ہیں۔ آج ہمارے مقابلہ کے لئے سانڈنیاں لائے ہیں۔ ابے یہاں ہر وقت چوکنا رہتے ہیں۔ مگر استاد یہ شتر غمزے اچھے نہیں۔ کبھی عورت بن کے آئے ہم کو رجھایا۔ خیر دو گھڑی بغل ہی گرم ہوئی سہی۔ ایک دفعہ بزاز کی دکان پر بھی آیا۔ مگر اُس روز اور کچھ نہیں تو مٹھائی کھانے میں آئی۔ آج یہ ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے سے کیا ملا گھٹنے سب لہو لہان ہو گئے۔ اچھا بچہ اب تو میں ہوشیار ہو گیا ہوں۔ اب کی سمجھوں گا۔ وہی مثل ہے کہ

ابر کے اندر جو کچھ ہے نور و تاب
ہے وہ نور آفتاب و مہتاب

راوی: سبحان اللہ حضرت سبحان اللہ۔ کیا برجستہ شعر آپ نے پڑھ دیا۔

آزاد اور اُن دونوں مہ وشانِ حور نژاد، کو دیکھا تو بہت ہی خفیف ہوئے۔ آزاد نے کہا، کیا پھر پٹخنی کھائی اس لفظ بہت جھلائے۔ پھر کیا معنی۔ کیا کبھی اور بھی پٹخنی کھائی تھی۔ الغرض یہاں سے کرایہ کی سواری پر آزاد نے ہوٹل ان کو پہونچایا۔

شادی کے ٹھاٹھ

ناظورۂ ناہید تن، گل پیرہن مشکیں مو، پسندیدہ، جو ثریا بیگم کے پری خانے کے حال میں لکھا گیا تھا کہ برات کے وقت دلہن کو غش آ گیا۔ اور گھر بھر میں کھل بلی پڑ گئی۔ دُلہن کی ماں الگ بدحواس، بہنیں الگ پریشان۔ مہمان براتی دنگ کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا گل کھلا۔ مگر دلہن کے بیہوش ہونے کا سبب کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مہمانوں نے ان کی ماں سے سبب دریافت کیا۔ پوچھا کہ کیا کبھی غش آ جاتا تھا۔ اب وہ بیچاری کیا کہے کہ ثریا بیگم کی صورت بھی کبھی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ نواب صاحب نے دُلہن کی کیفیت پر آگہی پائی، تو ان کی بھی طبیعت گھبرائی۔ اس عروس طاؤس زیب، صنم فریب، پر جان جاتی تھی۔ ہزار جان سے اس کے گلِ رخسار پر عاشق تھے۔ ہمسنوں سے کہا، یارو ذرا دریافت تو کرو۔ آخر یہ باعث کیا ہے۔ غش کیوں آیا۔ کسی نے نخلخہ سونگھایا، یا نہیں۔ یا مارے بدحواسی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مہریوں نے اطلاع دی کہ دُلہن نے آنکھ کھول دی، مگر ابھی تک گھبراہٹ اور بے چینی کم نہیں ہوئی، اور کہتی ہیں کہ مارے گرمی کے خدانخواستہ بدن پھُکا جاتا ہے۔ دو دو خواصیں

پنکھے جھل رہی ہیں؛ مگر گرمی ذرا کم نہیں ہوتی۔ اور جسم سے شعلے نکل رہے ہیں۔

نواب صاحب نے اپنی مہری کو بلوایا اور سمجھایا کہ جا کے خورشیدی بیگم سے کہو کہ دُلہن کی دلجوئی کریں، اور منھ پر پانی کے خوب چھینٹیں دیں، اور اگر زیادہ ضرورت ہو تو ڈاکٹر صاحب کو بُلوالوں۔ مہری نے باہر آن کر عرض کیا۔ حضور اب ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ طبیعت بحال ہے مگر پسینے آرہے ہیں اور پانی پانی کرتی ہیں۔ لیکن کوئی بات گھبرانے کی نہیں ہے۔ فضلِ الٰہی ہے۔ نواب صاحب کے جان میں جان آئی۔ بار بار طبیعت کا حال دریافت کرتے تھے۔ پورے ایک گھنٹے میں دُلہن اپنی اصلی حالت پر آئی۔ ہمجولیوں نے دِق کرنا شروع کیا۔ کہ غش کا سبب کیا تھا۔ خصوصًا نازک ادا بیگم (آسمان جاہ)، اور جانی بیگم نے ناک میں دم کر دیا۔ صد ہا اینڈے بینڈے سوال کئے۔

جانی بیگم : آخرش یہ غش کا سبب کیا تھا۔ ہمیں یہ نہ معلوم ہوا کہ غش کیوں آیا۔ اللہ اللہ اب سمجھے۔ حُسن کی یہ تاثیر ہے کہ ہنوز صورت دیکھی ہی نہیں۔ ابھی باہر ہی ہیں کہ اُن کو غش آ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دولہا پری چہرہ ہے۔ اللہ رکھے۔

نازک ادا : اے نہیں۔ کیا جانے اگلی پچھلی کون بات یاد آ گئی۔

جانی : صورت سے تو خوشی برستی ہے۔ وہ ہنسی آئی۔ اے لو پھر گردن جھکا دی۔ ایسی شرم بھی نگوڑی اجیرن ہو جاتی ہے۔ ذری پھر ہنس دو۔ وہ ہنسیں۔ ؏

وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتی ہو

حشمت بہو : یہاں تو پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ خون خشک ہو گیا کہ یہ کیا ہوا۔ ابھی خاصی بھلی چنگی بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیہوش ہو گئی۔ بارے بخیر گذشت۔

مبارک محل : اُن سے دور قرآن درمیان ایسا ہی مُنّے نواب کی لڑکی کا حال بھی ہوا تھا مگر وہ اور ہی بات ہے اور پھر وہ بیچاری۔ خدا نہ کرے وہ بات نہ تھی۔

جانی : ہم بتائیں۔ ثریا بیگم بیچاری ننھی ہیں ابھی۔ جب سُنا کہ برات دروازے پر آئی تو سہم گئیں کہ پرایا مرُدوا اور ہمارا میاں بنے۔ مگر اب اتنی دیر میں کچھ سوچ سمجھ کے تشفی ہو گئی۔

نازک ادا : سیر تو جب ہوتی کہ نکاح کے وقت دلہن کو غش آتا۔ میاں کو بناتے تو کہ واہ اچھے سبز قدم ہو۔

بیگم : (مادرِ عروس) اے یہ کون گفتگو ہے بھلا۔ واہ۔

نازک ادا : جانی بیگم ذرا ان کا نام بھی فہرست میں لکھ لو بہن۔

بیگم بوڑھی عورت ایک تو قوتِ سامعہ سے بے بہرہ، دوسرے نازک ادا بیگم رگ وپے سے واقف۔ جب

نازک ادا یعنی آسمان جاہ نے اس پیرزن پر آوازہ کسا۔ اور کھلی کھلی کہی تو وہ وہاں سے ہٹ گئیں۔ سوچیں کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ مغلانیاں کھڑی سُن رہی تھیں۔ کسی نے دانتوں کے تلے انگلی دبائی۔ کسی نے کہا بڑی ڈھیٹ ہیں۔ برابر والیوں، ہمسنوں، ہمجولیوں میں جو چاہیں کہہ لیں، یہ تو بڑے بوڑھوں سے بھی نہیں چوکتیں۔ حشمت بہو نے نازک ادا بیگم اور جانی بیگم کو سمجھایا۔ کہ اب کہیں نوشہ کے ساتھ پھکڑ نہ لڑنے لگنا۔ اور ذری ہاتھا پائی دھینگا مشتی سے باز رہنا۔ ہمارے گھر کا یہ دستور نہیں ہے۔ جانی بیگم نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ اے واہ ہے۔ بڑی بی تو بڑی چھوٹی بی سبحان اللہ۔ اس گھر میں نئی نئی گھڑت کی عورتیں نظر آتی ہیں۔ گنوارن ہو۔ کون دولھا گھر میں برات کے دن آئے اور سالیاں بے چھیڑے رہیں۔ کوئی تمہاری ہی سی سالی سالیاں ہوتی ہوں گی ہم تو انگلیوں پر تگنی کا ناچ نچائیں اور بے ڈھول لگائے تو رہا ہی نہ جائے۔ ہاتھ پھوک پھوک کے چپت گاہ کو سہلائیں۔ مگر تم کہیں دیہات کی ہو بی۔ نہ۔ گنوار وپن کی۔ اور سُنیے کہ آج کا دن ہی تو سالی بہنوئی کو ہنسنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ سالیوں کو گھورتا ہے، اور سالیاں اس کو۔

اب سُنیے کہ گو محل سرا سے مہری پر مہری آتی ہے اور تشفی دیتی جاتی ہے کہ اب طبیعت خدا کے فضل سے روبراہ لائی ہے، مگر نواب صاحب کو چین نہیں آتا تھا۔ انھوں نے اپنے احباب سے کہہ دیا کہ جب تک ڈاکٹر صاحب نہ آئیں گے اور اپنی آنکھ سے مریضہ کو نہ دیکھیں گے تب تک مجھے تسلّی نہ ہوگی۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب تشریف لائے نواب صاحب نے اعزہ میں سے ایک صاحب کو سمجھا دیا کہ ڈاکٹر صاحب سے کُل حال بیان کردو۔ دلہن کے پدر بزرگوار اور ایک بھائی نے پردہ کرایا۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے۔ نبض دیکھی، حال پوچھا کہا گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ فضلِ الٰہی ہے مریضہ کے اعزہ اقربا کی تسلّی کے لئے نسخہ لکھ دیا۔ مگر کسی کو ان کے بیان سے تشفی نہ ہوئی اور نہ دوا کی کچھ ضرورت تھی۔ غش کا سبب ہی اور تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا محلسرا میں داخل ہونا تھا کہ دُلہن کی ہمجولیوں نے دریچوں چھتوں، دروازوں، مختلف مقاموں سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھنا شروع کیا۔ شامتِ اعمال سے یہ صاحب سیاہ فام، بھدّے، بدقطع تھے، اور اس وقت کپڑے بھی عجیب طرح کے پہنے تھے، ان ٹھٹھول ہنسوڑ شوخ طبع نوجوانوں نے ڈاکٹر صاحب پر آوازے کسنے شروع کئے۔

ایک : اے بُوا ذری قطع تو دیکھو۔ آدمی کیا مُوا دھونسا کا دھونسا ہے۔ سُونس ہے کہ آدمی ہے۔ اچھے بھد بھد کو بُلایا۔

دوسری : توند کیا چار آنے والا فرخ آبادی تربوز ہے۔

تیسری : یہ تمباکو کا پنڈا ہے، یا آدمی ہے۔ افوہ حد بھر کالا اس کے آگے تو چراغ ماند پڑ جائے۔ کالے

کے آگے تو چراغ نہیں جلتا۔

چوتھی : آبنوس کا کُندا ہے اُلٹا توا نگوڑا۔

پانچویں : اور اس کالی کالی صورت پر یہ لال لال ٹوپی ماشاء اللہ سے کسقدر زیب دیتی ہے۔ آچھیں آچھیں۔

چھٹی : یہ دھوتیا پرشاد دہندوا بھلا کیا علاج کرے گا۔ اے دداجی ذری جا کے اُمّی جان کو سمجھاؤ تو کہ اس نگوڑے لنگور سے کیا علاج ہو گا۔ کوئی اچھا حکیم بلائیں۔ اس جنگلی ہُوش (وحشی) کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔

ساتویں : کینڈا کتنا سڈول ہے۔ خیر سے۔ ہاتھ پاؤں کیسے چھوٹے چھوٹے ہیں ننھے ننھے۔ خدا کی مار ایسے موئے آدمی پر۔

آٹھویں : نوبت کے دھونسے کی اچھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کرسی پر متمکن ہوئے۔ آدمی تھے سیدھے۔ اور تازہ وارد، اُردو زبان ہیں واجبی ہی واجبی لیاقت۔ بیٹھتے ہی بے تکی اُڑائی۔

ڈاکٹر : دار دو (درد) ہوتے۔ کون جگوں (جگہ) ہوتے۔

راوی : یہ فقرہ سنتے ہی سب بیگمات کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور اس زور سے قہقہہ لگایا کہ ڈاکٹر صاحب بھی چونک پڑے۔

خواص : نہیں حکیم صاحب۔ وہ۔ ڈاکٹر صاحب دَرد وَرد تو نہیں بتاتی ہیں۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے بیہوش ہو گئیں غش آ گیا اللہ جانے کیا بات ہوئی۔

ڈاکٹر : گاش کیس کو بُولتے۔ غش کس کو کہتے ہیں۔

خواص : حضور میں سمجھتی نہیں۔ گانس کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ڈاکٹر : گاش کیس کو بُولتے (غُش کس کو کہتے ہیں)

ڈاکٹر : تم لوگ تو بھائی گول مال کرنے مانگتا۔ تم ہمارے کو پھانکی نہیں دینے سکے گا۔ ہم جُبان دیکھے۔ جُبان جُبان جُبان

راوی : یہ اُدھر جُبان جُبان کہتے تھے اور ادھر قہقہہ پر قہقہہ پڑتا تھا۔ شوخ طبع نوجوانوں کو ہنسنے کا اچھا موقع ملا۔

نازک ادا : اُوئی نوج ایسا حکیم ہو۔ ڈاکٹر کی دُم بنا ہے۔

جانی بیگم : دنیا بھر کی باتیں پوچھے گا۔ مگر نبض پر ہاتھ نہ رکھے گا۔ اے بوا کہو نبض دیکھے۔ اچھے جانگلو کو پھانس لائے ہیں۔

ڈاکٹر : نابج کیسا بات۔ ہم لوگ نابج دیکھنا نہیں مانگتا۔ جُبان دکھائے گا۔ جُبان جُبان۔ اس ماپھک (موافق) جب ڈاکٹر صاحب نے دیکھا (جبان)، کا لفظ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو منہ کھول کے زبان باہر نکالی۔ اس پردہ

فرمائشی قہقہہ پڑا کہ ساری بارہ دری گونج اُٹھی۔

نازک ادا : مبارک قدم دیکھتی کیا ہے۔ منہ میں خاک دھول جھونک دے۔

جانی : منہ کاہے کو گھنٹا بیگ کی گڑھیا ہے۔

حشمت بہو : میں بھی حیران تھی کہ یا اللہ یہ جبان کون چیز ہے۔

نہ بانو منہ کھولتا نہ جُبان دیکھتے۔ ذری ایک دفعہ پھر منہ کھولے تو میں پنکھے کی ڈنڈی حلق میں ڈال دوں

ڈاکٹر : جس ماپھک ہم جُبان دکھایا۔ اس ماپھک دیکھنا مانگتا۔

مبارک محل دیکھنا مانگتا۔ ہم ہنسنے مانگتا۔

ڈاکٹر : شاب مائی لوگ کھلی کرتا۔ جُبان نہیں دکھانے مانگتا۔

نازک ادا : اے زبان دکھا دو ثریا بیگم۔ کیا۔ کچھ ہرج ہے۔

ثریا : (آہستہ سے) واہ اس نگوڑے نامحرم کو میں زبان دکھاؤں، مجھ سے یہ ہونے کا۔ اِن سے کہو ٹھنڈے ٹھنڈے ہوا کھائیں۔

ڈاکٹر : جبان کے دکھانے میں کون کیا ہٹ (قباحت) ہے گا۔

نازک : تیرا سر قباحت ہے گا۔ تو سڑی ہے گا یا سودائی۔ اِن دونوں میں کون ہے گا (ہنس کر) اچھے موئے گنوار کو علاج کے لئے بھیجا ہے۔ نواب صاحب سے کہو پہلے اس کے دماغ کا علاج کریں۔ جب سے آیا جُبان ہی جُبان پکارتا ہے۔ جُبان کے دکھانے میں کون قباحت ہے گا۔ گنوار کا لٹھ ہے مُوا۔

جانی : اے ہے بہن قباحت نہیں۔ کباہت کہو۔ خالی کباہت ہی نہیں۔ کباہت۔ مبارک قدم کہتی کیوں نہیں کہ زبان کیا دیکھو گے نبض دیکھو۔

مبارک قدم : اے حضور کس سے۔ کوئی آدمی ہو تو اُس سے کہوں۔

الغرض : دُلہن کے باپ اور بھائی نے اصرار کیا کہ ثریا بیگم زبان دکھاویں، مگر انھوں نے نہ مانا نہ مانا۔ کہا چلے اچھی ہوں چاہے اچھی نہ ہوں میں ہرگز ہرگز زبان نہ دکھاؤنگی جب زبان دیکھ لی تو باقی کیا رہا۔ زبان دیکھی تو چہرہ پہلے دیکھا۔ اللہ اللہ۔ کیا انقلاب ہے۔ وہی اللہ رکھی ہیں جو بے حجاب کھلم کُھلا سرائے میں رہتی تھیں۔ جن میں اور بھٹیاروں میں ذرا فرق نہ تھا۔ جو آزاد کے ساتھ اُونٹنی پر سوار ہو کر تماشا دیکھنے جاتی تھیں، اور بڑی مطلق العنانی سے مردوں میں جا کے بیٹھتی تھیں۔ وہی اللہ رکھی اب ثریا بیگم شوخ کے نام سے مشہور ہیں، اور دُلہن بنی بیٹھی ہیں۔ وہی ثریا بیگم جو گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی تھیں، اور وہی ثریا بیگم اب ڈاکٹر کو زبان نہیں دکھلاتی۔ اللہ اللہ۔ الغرض بڑی محبت اور تکرار کے بعد جناب ڈاکٹر صاحب نے ایک ہاتھ کی نبض دیکھی، اور نواب صاحب سے

کہانا بج) تو اچھا ہے، بانج میں کیا ہت ہے۔ سو نہیں۔ کوچھ کوچھ دھیرج سے چلنے مانگتے۔ کیا ہت ہوا اس میں۔ سو نہیں ہے۔ ہاں جری جری سارا دھیرج رہے۔ سو ہم پر سکریش لکھنا۔ گوپال بابو کی دکان سے آئے گا۔ ایک شوخ مغلانی نے ان کے بنانے کے لئے کہا۔ بابو شاہب نابج تو ایک ہی ہاتھ کا دیکھا، ہم دونوں ہاتھ کا نابج دیکھنے مانگتا۔ اس پر قہقہہ پڑا۔ اور بابو صاحب نے یوں جواب دیا۔ ہم لوگ نابج ایک ہاتھ کا دیکھ شاب بچار کریں سکتا۔ دوسرے ہاتھ کا نابج ہم دیکھنے مانگتا نہیں۔ ایک نابج کے بیچ میں سب بات۔

مغلانی: (آہستہ سے) اللہ سمجھے تجھ سے (مخاطب ہو کر) ہاں حضور کیوں نہیں۔ یہ تو اپنا اپنا کمال ہے بعض حکیم صرف قارورہ دیکھ کے حال بتا دیتے ہیں۔ بعض صورت دیکھ کے۔

ڈاکٹر: سو بات نہیں۔ تمہارا حکیم لوگ کرورا دیکھنے جانتا کیا ہے ہم کرورے کے سّتو دو سّتو ٹکرے کرتا۔ سب الگ الگ۔

مغ: جی ہاں حضور بجا ہے (آہستہ سے) تمہاری نانی کی آنکھ۔ اب آپ نسخہ لکھیے جس میں چھٹ پٹ دوا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھا۔ مغلانی نے پانچ روپیہ دیئے۔ رخصت ہوئے۔ تو دُلہن ماں نے میاں کو بلایا۔ کہا یہ کس کو لائے تھے گھڑی گھڑی کہے مُجبان دکھاؤ مُجبان دکھاؤ۔ اور نبض کو کہے نابج ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ انہوں نے کہا بڑی بُری عادت ہے کہ ایک بھلا مانس تو علاج کرنے آیا اور تم لوگوں نے بنا ڈالا۔ اور شریف کے ہاں اس طرح کی پھکڑ بازی کیا معنی۔ میں دل میں کٹ کٹ جاتا تھا۔ مگر اس وقت بجز خاموشی کے اور کیا موقع تھا۔ بنگالی آدمی، اور تازہ وارد، اردو کیا جانے بھلا وہ بولیں۔ واہ۔ ایک انوکھا یہی بنگالی ہے، وہ جس بابو کو پہلے لائے تھے اُس دن۔ وہ بھی تو آخر بنگالی ہی ہے۔ پھر کس طرح نبض دیکھی۔ سب حال پوچھا۔ دلجوئی کی۔ آدمیت سے پیش آیا۔ نہ تو اُس نے نابج کہا نہ "گول مال" کیا نہ "مُجبان" دیکھی۔

ثریا بیگم بولیں چاہے سر ٹیک کے مر جاتا میں ہرگز ہرگز زبان نہ دکھاتی۔ اس فقرے پر ناظرین کو ضرور ہنسی آئے گی۔ جوگن کی حالت میں انھیں کس نے نہیں دیکھا۔ اللہ رکھی سے کون واقف نہیں۔ جب شبّو جان بنی تھیں، جب کہاں کی پردہ نشین تھیں۔ مگر آج ٹھاٹھ ہی اور ہیں۔

ناظرین کو حیرت ہو گی کہ برآت کے آتے ہی ثریا بیگم دفعتاً بیہوش کیوں ہو گئیں۔ اب سُنیئے کہ اِدھر دروازہ پر برات آئی اُدھر ثریا بیگم نے دیکھا کہ مغلانی ایک ادھیڑ عورت سے باتیں کر رہی ہے۔ اس عورت کو انہوں نے کسی قدر پہچانا مگر کچھ کچھ شک تھا۔

اتنے میں مغلانی نے کہا تم تو اپنی ہی کہتی ہو مولا) ہماری نہیں سنتیں۔ مولا کا لفظ سننا تھا کہ ان کے ہوش اڑ گئے۔ اور ستم اس پر یہ ہوا کہ مولا نے ایک فقرہ اور چست کیا۔ کہا کوئی لاکھ پردوں میں اپنے کو چھپائے ممکن نہیں

کہ بھانپ نہ لیں سُنا نہیں۔

جانتے ہیں حالِ دل عاقل قیافہ دیکھ کر
خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

ثُریا بیگم کا رنگ فق ہوگیا۔ وجہ یہ کہ عورت مولا ان سے بخوبی واقف تھی۔ اِن کے میکے میں برسوں رہ چکی تھی، اور یہ شعر اُس کو وردِ زبان تھا۔ ہوش اُڑ گئے کہ یہ کہاں سے آگئی۔ اُس عورت نے ان کو سرا میں بھی دیکھا تھا۔ سوچیں کہ مبادا میرا اگلی حال سب دے تو بڑی ہی بے عزتی ہو۔ اِدھر کی رہوں نہ اُدھر کی۔ ان خیالات نے اس کو ایسا پریشان کیا کہ ہوش اُڑ گئے۔

مولا کو ثریا بیگم ہنسا کرتی تھیں کہ تو ہر جائی ہے۔ آج ایک کے پاس کل دوسرے کی بغل میں۔ پرسوں تیسرے سے سانٹھ گانٹھ۔ اور آج وہی مولا اُن کو ایک نئے مقام پر دیکھتی ہیں، یہ وہی ثریا بیگم جن کی ماں ان کی دوسری شادی نہیں منظور کرتی اور اب دلہن بنی بیٹھی ہیں؛ اور دروازے پر برات آئی ہے۔ مولا نے ان کو سرا میں باہر دیکھا تھا اور اب اسی مُولا کے سامنے کہتی ہیں کہ میں تو ہرگز ہرگز زبان نہ دکھاتی۔ آنکھ کے اشارہ سے مولا نے پوچھا یہاں کیا ہے۔ ثریا بیگم نے گردن پھیر لی کچھ جواب نہ دیا مگر وہ ایک شریر آوازہ کسنے لگی ایک لڑکے کو گود میں لے کر اُس کے ساتھ کھیلنے لگی اور باتوں باتوں میں در پردہ اِن کو ستاتی تھی، ہم کسی کو پہچانتے ہیں ہم بخوبی جانتے ہیں۔ سرا میں بھی دیکھا تھا محل میں بھی دیکھا تھا۔ بوڑھا میاں تھا، اِن فقروں پر بچہ اتفاق سے ہنس پڑا۔ تو مولا نے کہا۔ وہ ہنسی آئی۔ وہ ہونٹوں پر ہنسی آئی۔ وہ مسکرائیں۔ ہاں ہنس دو۔ ہنس دو ذرا ہنس دو۔ دوسرا یا دے۔ اللہ رکھی نام تھا اِن فقروں نے ثریا بیگم کو نہایت ہی بے چین کر دیا۔ رنگ فق ہوگیا۔ چہرہ پر زردی چھائی۔ ہمجولیوں نے یہ کیفیت دیکھ کر ان کی ماں کو بلایا۔ کہا ڈاکٹر کی دوا سے ایک ساعت کے لئے آرام ہوا مگر اب پھر طبیعت کا وہی حال ہے۔ دیکھو چہرہ کیسا اتر گیا ہے۔ اِن کی ماں کو تشویش ہوئی۔ دولہا کی بہنوں نے کہا اب کے حکیم کو بُلواؤ ڈاکٹری دوا سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

ثریا بیگم: اماں جان ہمارا جی چاہتا ہے کہ لیٹ رہیں ذرا۔

بیگم: اچھا اچھا بیٹا کیا ہرج ہے سو رہو نہ جی بے چین ہے۔

ثریا بیگم: اندھیرا ہوا تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔

خورشیدی بیگم: ایک گھڑی بھر آنکھ لگے تو بے چینی جاتی رہے۔ بیٹھے بیٹھے یہ ہوا کیا اللہ۔ ڈاکٹر کو پھر بلاؤ۔ مگر مُوا جانگلو، گنوار نہ ہو کہ آتے ہی کہے (زبان دکھاؤ نا بج نہ دکھاؤ شیطان کی پھٹکار موئے گنوار پر۔ نبض نہیں دیکھتا زبان دیکھنے کو موجود۔ الغرض سب کی رائے ہوئی کہ حکیم صاحب بلوائے جائیں اور ثریا بیگم

تھوڑی دیر کے لئے آرام فرمائیں۔ مولا سوچی کہ اب زیادہ چھیڑتی ہوں تو دُلہن دشمن ہی ہو جائے گی۔ لہٰذا خاموش ہو رہی، اور دلہن نے آرام کیا۔ کمرے کے دروازے بند ہو گئے۔ حکم تھا کہ کوئی چوں تک نہ کرے کچی ایک گھڑی ہوئی ہوں گی کہ آنکھ کھل گئی۔ کہا اب کچھ کچھ آرام ہے۔ دلہن کی ماں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور حکم دیا کہ کچھ روپیہ خیرات کیا جائے۔ بہت کچھ روپیہ تھا جو اُن پر تقسیم کیا گیا۔

اب سنیئے کہ دلہن کی علالت کا حال سُن کر براتی بہت گھبرائے۔ مگر رسوم کا ادا کرنا فرض تھا۔ طشت آیا۔ دولھا کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے پانی ڈالا گیا۔ نواب سنجر سطوت صاحب پشت توسن سے اترے اور محفل میں مسند پر بصد طنطنہ و دبدبہ متمکن ہوئے۔

دلہن کے پدر بزرگوار نے بصرف زر خطیر طائفے بلوائے تھے۔ خوش گلو، خوبرو۔ پاکیزہ خو۔ اب محفل رقص و سرود کا حال سنیئے۔ فرش مکلف دری چاندنی غالیچے صاف و شفاف۔ بارہ دری دلہن کی طرح سجی سجائی۔ نوجوانوں کی طبیعتیں جولانیوں پر ڈٹے بیٹھے ہیں، کہ کوئی پری چہرہ محفل میں آئے آنکھیں سیکنے کا موقع ملے۔

ساقیا آج تو جھکا دینا کوئی جامِ جہاں نُما دینا

پر ہو وہ جام غیرت خورشید آبرو ریز ساغر جمشید

ایک پرکالۂ آتش، کافر کیش، برق کردار، نغز گفتار، خوش الحان، نوجوان حسینہ چھم چھم کرتی اٹھلاتی اور نزاکت کے ساتھ قدم دھرتی ہوئی محفل میں آئی۔ نوخیز جوانوں نے منھ مانگی مراد پائی۔ ایک پیرِ فرتوت نے پوپلے منھ سے کہا (خدا خیر کرے) اس پر محفل نے قہقہہ لگایا اور وہ پری وش ناز و ادا کے ساتھ زیرِ لب مسکرا کر بولی، بوڑھے منہ مہاسے اس بوڑھوتی وقت میں بھی عاشق تن بننے کا شوق چرایا ہے۔ آپ نے ہنس کر جواب دیا بیوی ہم بھی کسی زمانہ میں جوان تھے۔ ہمارے بھی چاہنے والے تھے اب بوڑھے ہو گئے تو کیا ہوا۔ ولولہ نہیں دل تو وہی ہے۔

پیری کہ دم ز عشق زند بس غنیمت ست

وز شاخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت ست

اس نے مسکرا کر کہا بجا۔ زبانی داخلہ تو یہی ہے۔ دن کو اونٹ نہ سوجھتا ہوگا۔ گالوں پر کروروں جُھریاں پڑی ہیں۔ منھ بچق۔ مگر طبیعت رنگین مزیدار پائی ہے اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ پیرِ فرتوت۔ بس اس وقت کچھ نہ پوچھو تم کو دیکھتے ہی:

ناوکِ عشق دل کے پار ہوا

طائرِ ہوش تک شکار ہوا

یہ آفتِ جان بلائے بے درماں، ناچنے کھڑی ہوئی تو ستم ڈھایا۔ ایسا ایسا چکر لگایا کہ نوجوانوں اور رنگین طبع لوگوں کے دل کو نخچیر تیرِ عشق بنایا۔ ہنگامِ رقص دوپٹہ جو کبھی کبھی ہٹ جاتا تھا۔ تو گوری گوری گردن قیامت بپا کرتی تھی۔ تمام محفل اس حور وش کا دم بھرتی تھی۔ نوجوان باہم آہستہ آہستہ اس گل بدن کے حسن و جمال کی تعریف اور جوشِ شوق کا اظہار کرتے تھے۔

ایک: بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گردن کو جا کے چوم لوں۔

دوسرا: اب یہ ہم سے بچ کے کہاں جائے گی۔ اجی یاد رکھو۔ ہمارے گھر کل ہی پرسوں نہ پڑ جائے تو اپنا نام بدل ڈالوں دیکھ لینا۔

تیسرا: قسم خدا کی کتنی صورت زیبا پائی ہے۔ کیا مکھڑا ہے۔ میں تو اس کی غلامی کرنے کو حاضر ہوں۔ دریافت تو کرو کہاں سے آئی ہے۔ دیہاتن تو نہیں معلوم ہوتی ہے۔ شہر کی وضع سے معلوم ہوتا ہے۔

چوتھا: شین قاف تو درست ہے، اور وضع بھی اچھی ہے۔

پانچواں: ہم سے پوچھو مراد آباد سے آئی ہے۔ تمام ہندوستان میں اس کی دھوم ہے۔ گانا ناچنا بتانا ان سب میں فرد ہے۔

اب سنیئے کہ کئی نواب زادے، اور کئی نوجوان اُس نگارِ گلعذار پر لٹو ہو گئے، اور جن صاحب نے بیڑا اٹھایا تھا کہ اس عروس نو خاستہ کو گھر ڈال لیں گے وہ سب سے زیادہ لٹو تھے۔ اس معشوق گل پیرہن نے شاعر عدیم العدیل مرزا محمد حسین متخلص قتیلؔ کی ایک ایسی بے نظیر غزل گائی کہ تمام محفل نے وجد کیا۔ گردن ہلائی:۔

غمِ عشق تو پایانی ندارد — چہ درد ست ایں کہ درمانی ندارد
جنوں راگو کہ سوئے ما نباید — کسے ایں جا گریبانی ندارد
چہ داند رتبۂ خارِ مغیلاں — سیہ زورے کہ دامانی ندارد
اثر در گریہ مجنوں مجوئید — کہ لیلیٰ چشم گریانی ندارد
ز نعش کشتۂ ناز تو پیدا است — چہ حیر تہا کہ پایانی ندارد
سوالِ بوسہ شاید داشت از تو — لبش می جنبد و جانی ندارد

مسلمانانِ مسلمانش مگوئید
قتیلؔ کافر ایمانی ندارد

اس غزل نے کل حاضرین و سامعین کو مست اور بے خود کر دیا۔ سب کی زبان پر بار بار یہ شعر

آتا تھا اور انتہا سے زیادہ بیخود کرتا تھا۔

غم عشق تو پایانے ندارد

چہ درد ست ایں کہ درمانے ندارد

ایک صاحب کی آنکھوں سے بے اختیار اشک جاری ہو گئے۔ یہ وہی صاحب تھے کہ جنھوں نے ٹھان لی تھی کہ گھر ڈال لیں گے۔ اِن کے احباب نے سمجھایا کہ اس گریہ وزاری اور اشک باری سے کیا مطلب نکلے گا یہ کوئی گھر گرہست یا کسی شریف کی بہو بیٹی تو ہے نہیں۔ کون مشکل بات ہے۔ کل ہی تشیالراؤ۔ ہم درمیانی بنیں گے مگر اس وقت تو خدا کے لئے آنسو نہ بہاؤ۔ ورنہ لوگ ہنسیں گے۔ انھوں نے کہا بھائی جان:

آنکھوں پہ اختیار ہے اچھا نہ روئیں گے

کچھ آپ میرے دل کو بھی سمجھائے جاتے ہیں

دل کو کیا کروں۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ اظہار رازِ دل نہ ہو مگر وہ کمبخت خود ظاہر کر دے تو میرا کیا قصور ہے:

دل میرود ز دستم صاحبدلان خدارا

دردا کہ رازِ پنہان خواہد شد آشکارا

حضرات ناظرین اس قسم کے جلسوں سے یہ نتیجے پیدا ہوتے ہیں، اب ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ گھر بار چھوڑ دیں تو عجب نہیں۔ مگر دنیا میں کوئی ملک کوئی بر اعظم ایسا نہیں جہاں رقص و سرود کی گرمی بازار نہ ہو۔ وحشیوں کے ملکوں میں بھی ناچ رنگ کی گرم بازاری ہے۔ شایستہ قوموں میں بھی اس کا رواج ہے۔

اب سُنئے کہ دو چار رنگین مزاج، بہار طبع نوابوں نے دو گھڑی کی دل لگی کے لئے دو ایک طائفوں کو عین محفل میں اپنے پاس بلا کر بغل میں بٹھایا اور ان شیریں حرکات حسینوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔

نواب : آپ کے دماغ تو اب آسمان پر ہیں جی۔ صاحب۔

حسینہ : پھر ہوا ہی چاہیں۔ اللہ نے ہمیں حسن ہی ایسا دیا ہے کہ تم ایسے ہزاروں بلکہ تم سے اچھے اچھے سری ٹیک کرتے ہیں۔

نواب : کیوں نہیں۔ آپ ایسی ہی ہیں۔ مگر غریبوں کے ساتھ تو اتنی لن ترانی کی نہ لیا کیجئے۔

حسینہ : ہم کو لن ترانی زیبا ہے جو کہیں بجا ہے:

بے جا نہیں حسینوں کی ہیں لن ترانیاں

اے غافلو یہ حُسن امانت خدا کی ہے

لالہ : آپ فارسی زبان میں بھی برق معلوم ہوتی ہیں۔

حسینہ : جی نہیں مجھے کیا تمیز ہے۔ آپ لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر کچھ شُد بُد جاننے لگی ورنہ ہمیں کیا آتا ہے :

جمالِ ہمنشیں در مَن اثر کرد

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اکثر اصحاب نے ان کی تعریف کی۔ ایک صاحب نے فرمایا یہ ہمارے شہر کی ناک ہیں۔ دوسرے صاحب بولے۔ اس میں شک نہیں خلق میں طاق۔ خوش خوئی میں شہرۂ آفاق۔ علم موسیقی میں باکمال۔ صاحبِ حسن وجمال رنگین ادا، باوفا، ملنسار، باغ وبہار، بذلہ سنج، مرنجان مرنج، تیسرے صاحب نے اِن کی تائید کی۔ اے حضرت دور دور تک ان کی شہرت ہے۔ اب اس شہر میں جو کچھ ہیں یہی ہیں اگر مشعلِ آفتاب لے کر ڈھونڈھیے تو نظیر نہ پائیے۔ اس پر اکثر احباب نے قہقہہ لگایا اور داد دی۔ کہ واہ حضرت یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ نظیر کا لفظ کیا خوب لائے۔ ان کا نظیر نام تھا۔ لہٰذا اس لطیفے کو لوگوں نے پسند کیا، اور مدّاح ہوئے۔ اس جلسے میں دو چار دیہاتی بھی بیٹھے تھے۔ مُنّے میاں، چھٹّن میاں۔ حسین علی۔ گجراج سنگھ۔ ان کو نظیر کا پاس اگر بیٹھنا سخت ناگوار ہوا۔ چاہا کہ اعتراض کریں مگر کچھ دیر جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار نہ رہا گیا اور بآوازِ بلند یوں فرمانے لگے۔

مُنّے : واہ اچھا طریقہ شہر کا ہے۔ پتُریا کو سامنے بٹھایا۔

چھٹّن : شہر کے لوگوں کا یہی قاعدہ ہے۔ ہمارے دیہات میں اگر کوئی محفل کے بیچ میں بٹھائے تو سب بھائی بند اٹھ جائیں۔

گجراج سنگھ : پتُریا بیٹھے کاہے کو نہیں نہ کھائے۔

نواب : بجا ہے حضور۔ شہر والے بڑے ہی بدتمیز ہوتے ہیں۔

آغا : دیہاتیوں کی سی لیاقت ہم بیچارے کہاں سے لائیں۔

لالہ : اور علم مجلس میں دیہاتی بھائی سے ہم لوگ کیونکر مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اے توبہ یہ وہ شائستہ تربیت یافتہ صحبت یافتہ، باتمیز لوگ۔ ہم شہر کے رہنے والے بدتمیز۔ بدحقیقت۔

آغا : (مسکرا کر) یہ صاحب اس وقت بہت بگڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

گجراج : ہونہ ! بگڑنے کی بات ہی ہے ہم لوگ اِجّت دار (عزت دار) رہیں گے۔ شہر کے آدمی چاہے جو سمجھیں ہم اُن کو کیا سمجھتے ہیں۔

آغا : تو جناب آپ شہر کی محفل میں کیوں تشریف لائے۔

گجراج : کاہے کا بلایا۔ ہم لوگ بن بلائے آئے۔

نواب : اچھا پھر اب قصور ہوا وہ ہوا آئندہ احتیاط رہے گی۔ اس وقت تو معاف فرمائیے۔ اب ایسی

خطا نہ ہوگی۔

آغا: اب آپ سب صاحب غصّہ کو تھوک دیجئے۔ اتنی مہربانی کیجئے اور اگر اس قدر سخت قصور ہوا ہے کہ معافی کے قابل نہیں تو بندہ حاضر ہے گردن مارئے۔ پھانسی دیجئے۔ اِن سب میں میاں حسین علی ذرا فہیدہ تھے۔ گو ناگواران کو بھی ہوا مگر اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ لڑنے جھگڑنے سے کیا واسطہ ہے جو ہوا وہ ہوا۔ گجراج سنگھ نے رائے دی کہ سب کے سب اُٹھ کھڑے ہو، چل دو مگر حسین نے سمجھایا کہ اِس سے اور بھی ملال بڑھے گا۔ اگر چلنا ہے تو دم بھر کے بعد اٹھ جائیں گے۔ ابھی بے موقع ہے۔ اضطراب کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ جھگڑا طے ہوگیا اور اس خوش الحان حسینہ نے دو ایک ٹھمریاں ختم کیں، تو لوگوں نے فرمایش کی کہ فارسی کی کوئی غزل پھر گاؤ۔ اور اس ناظورۂ دل فریب نے خسرو کی یہ غزل شروع کی اور بہت خوش ادائی کے ساتھ گائی۔

بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی　　　بملک دلبری پایندہ باشی

نواب: (گردن ہلاکر) کیا خوش آواز ہے سبحان اللہ۔

حسینہ: (بندگی کرکے) آج آواز کسی قدر خستہ ہے۔

لالہ: واہ۔ واہ۔ خستہ ہو یا نہ ہو۔ آپ رنگ جمالیتی ہیں۔

راوی: جب بزرگوں نے لڑکوں اور کم سنوں کے سامنے بے دھڑک اِن بیسواؤں سے گفتگو اور چہل کی تو خود بھی بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے لگے انھوں نے آزادی اور مُطلق العنانی کے ساتھ گفتگو کی۔ کسی نے آوازہ کسا۔ کسی نے پھبتی کہی جب اُس نے یہ شعر گایا۔

جہاں سوزی اگر درغمزہ آئی
شکر ریزی اگر درخندہ باشی

تو ایک کم سن نواب زادے نے، جو پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھا بآواز بلند کہا۔ واہ جانِ من کیوں نہ ہو۔ یہ شعر تو ہم کو تمہاری طرف مخاطب ہوکر کہنا چاہیئے نہ کہ تم ہماری طرف مخاطب ہوکر کہو! اور لطف یہ کہ اِن صاحبزادے کے والد بزرگوار بھی محفل میں بیٹھے تھے، اور وہ کسی قدر لٹھ آدمی تھے۔ ایک دل لگی باز مسخرہ آدمی نے کہا شاباش میاں صاحبزادے شاباش۔ باپ نے ماری پیدڑی اور بیٹا تیر انداز۔ ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

مگر اس ڈھیٹ اور بد تمیز لڑکے کو اب بھی شرم نہ آئی ذرا چنوں پر میل نہیں، اس حسینہ نے یہ شعر پڑھا تو میاں صاحبزادے نے پھر آوازہ کسا۔

زقیدِ دو جہاں آزادہ باشم　　　اگر تو ہمنشین بندہ باشی

آپ نے فرمایا۔ انشاء اللہ۔ ہم آج ہی سے ہمنشینی کی فکر میں ہیں۔ مصاحب بھیجتے ہیں کہ کل مدارج طے کرے۔ انشاء اللہ۔

حسینہ : بہت خوب ایسے رئیسوں کا کیا کہنا اگر بھول نہ جائیے گا۔

نواب زادہ : بھولنا کیسا۔ اب طبیعت آئی سو آئی۔ مگر تم بھی وعدہ حتمی کرلو۔ ہم دل دیتے ہیں۔ تم قول ہی دو :

زبان آپ نے دی تھی کہ بوسہ کل دیں گے

کچھ اور اب تو نہیں اس میں گفتگو باقی

نواب صاحب نے جو صاحبزادے کی یہ کیفیت دیکھی تو مارے غصّے کے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ صاحبزادے نے آہستہ سے کہا (خس کم جہاں پاک)، تمام محفل اس بدتمیز ناخلف کی اس حرکت ناشائستہ سے اس کو بنظر حقارت دیکھنے لگی۔ سب نے کہا کہ ایسا گستاخ لڑکا ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔

طائفہ بدلا گیا۔ اب کی ایک پری چہرہ، سمن رو، عنبریں مو، عجب ناز معشوقانہ سے محفل میں آئی اور آتے ہی بیٹھ گئی۔ پیچھے سازندے۔

نواب : این الٰہی خیر۔ اے صاحب ناچئے۔ گائیے۔

جواب : کل سے طبیعت بے مزہ ہے۔ دو ایک چیزیں آپ کی خاطر سے کہئے تو گا دوں، ایمان کی قسم طبیعت بے مزہ ہے۔

نواب : اچھا رنگ لائیں۔ واہ واہ واہ۔

جواب : کچھ جھوٹ بولنے سے فائدہ ہے۔ کبھی آپ کے ہاں ناچی نہیں ہوں۔

نواب : مزہ کرکرا کر دیا۔ تمہارے ناچ کی بہت تعریف سُنی ہے لوگوں نے یہاں تک مبالغہ کیا کہ جن سے سیکھتے ہیں ان کے بھی کان کاٹتی ہیں۔

ڈو برس سے ناچ نہیں دیکھا ہے؛ تمہارا کمال اشتیاق ہے۔

جواب : میری بدقسمتی مگر سچ کہتی ہوں، کہ آج ناچنے کے قابل نہیں ہوں۔ گانے دیتی ہوں، اس میں عذر نہیں ہے۔ انھوں نے پہلے ٹھمری شروع کر دی، ایک مصاحب نے اس نوجوان نواب زادے کے کان میں کہا حضور یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ حضرت نے آہ سرد بھر کر کہا۔ ہم تو اسی کے چاہنے والے ہیں۔ حُور بھی ہو تو بھولے سے آنکھ نہ ڈالیں :

ہوں میں اس رشک ماہ کا ہالا اس پری کا ہوں چاہنے والا

کہ جو موسیٰ کو کوہِ تمکیں ہے عیسیٰ آسمان تزئیں ہے

جو عزیزِ دلِ زلیخا ہے | یوسفِ مصر حُسن زیبا ہے
ہے وہ سر حلقۂ سمن رویاں | ہے وہ سردارِ عنبریں مویاں
سرورِ خیلِ گل رخاں ہے وہ | بلبلِ بوستانِ جان ہے وہ

بادشاہ جہانِ حسن ہے وہ
یوسفؑ کاروانِ حسن ہے وہ

الغرض محفلِ رقص و سرود میں گل بدنوں، گل پیرہنوں نے ایسا رنگ جمایا کہ سب کو اپنا شیفتہ و شیدا بنایا۔ ہر سمت حسین و زہرہ جبیں طائفے ٹھٹے بیٹھے تھے۔ بارہ دری میں دو جگہ ناچ ہوتا ہے۔

چیدہ چیدہ وہ شہر بھر کے حسیں | غیرت افزائے حسن لُعبت چیں
نور کے طائفے نفیس نفیس | رشک افزائے زہرہ و برجیس

کتنی آراستہ وہ صحبت تھی
کس تکلف کی زیب و زینت تھی

تمام محفل میں مشک بو، دھواں دھار، تمباکو کی خوشبو بس گئی تھی۔ پیچوانوں کے بیش بہا جوڑ زیر انداز مُغرق۔ دستیاں جھلکتی تھیں روشنی سے بارہ دری جگمگاتی تھی۔

نور بیز اس طرح سے فرشی پہاڑ | جیسے تابندہ طور کا تھا پہاڑ
طُرفہ دیوار گیریوں کی بہار | دل شمس و قمر بھی جن پہ نثار
روشنی میں ہر ایک شمع لگن | آتش طور پر تھی چشمک زن
روبرو نور شمع کے اصلا | شمع مہتاب کو فروغ نہ تھا

روشنی بزم کی جو دینے آئے
آتش طور رشک سے جل جائے

جب وہ گل رخ گا چکی، تو ایک صاحب نے مذاق کی راہ سے کہا۔ آپ کی گانے کی تعریف کرنا ہی فضول ہے۔ آپ ایسا گاتی ہیں کہ جو تعریف کرے وہ احمق۔ ایسا اچھا گلا ہے۔ وہ مسکرا کر بولی۔ تعریف کے قابل تو میں نہیں ہوں، مگر آپ نے زبردستی ناحق تعریف کی۔ میں کس قابل ہوں۔ یہ آپ اپنی ہی تعریف کرتے ہیں، مگر یہ آپ کو کیا سوجھی کہ تعریف کرنے والوں کی شان میں احمق کا لفظ استعمال کیا۔ یہ اپنے منھ آپ میاں مٹھو بننا کیا معنی۔ اس کے جواب میں فرمایا (آپ کی حاضر جوابی دیکھنا چاہتا تھا) واللہ: اس کے کہنے کی کیا ضرورت تھی) اس (واللہ:) پر لوگوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور یہ حضرت کسی قدر خفیف ہوئے۔ تو

اس تیز طبیعت زبان دراز نے کہا۔ اچھا ہوا تم کو محفل میں بولنے کو کس نے کہا ہے۔ بولے اور بنائے گئے :

نا مرد سخن نہ گفتہ باشد

عیب و ہنرش نہفتہ باشد

خواہی مخواہی شخصیت جتانے سے انسان ذلیل ہوتا ہے۔ اب اور کچھ فرمائیے۔ ذری گھڑی بھر دل لگی تو رہے آپ کیا آئے گویا بھانڈ آ گئے۔ آپ کے بغیر محفل سوئی تھی۔ اب تو کبھی محفل میں بولنے کا قصد نہ کرو گے مگر بے حیا کی بلا دور۔ بات کرنے کی تمیز نہیں، اور چلے ہیں ہم کو چھپانے۔ واہ۔ لاکھ بنو، چہرہ کا رنگ اڑا ہوا ہے۔

قبلہ و کعبہ محل سرا میں تشریف لے گئے۔ وہاں پردہ کیا گیا جہاں دُلہن کا پلنگ تھا، وہاں متمکن ہوئے۔ خواص نے لگایا اور جھک کر آداب عرض کیا۔ چکنی ڈلی الائچی گلوریاں کا خاصدان پیش کیا۔ عطر کی شیشیاں ادب کے ساتھ سامنے رکھیں۔ قبلہ و کعبہ آہستہ آہستہ حقہ پینے لگے۔

بیگم : (دلہن کی ماں) آداب عرض ہے۔

قبلہ و کعبہ: بندگی۔ خدا تم کو مبارک کرے۔ اس کی اولاد دیکھو۔

بیگم : خدا آپ کی دُعا کو تاثیر دے اور آپ کی برکت قدم سے ایسا ہی ہو۔ شکر ہے کہ اس تقریب کی بدولت مجھے آپ کی زیارت حاصل ہوئی۔ زہے نصیب۔

قبلہ و کعبہ: (دلہن سے) نواب سنجر سطوت جو مرزا سلیمان سطوت کے لڑکے ہیں، ان سے تمہارا نکاح ہوگا۔ تم اجازت دیتی ہو کہ میں تمہارا وکیل بنوں تم نے مجھے اپنی طرف سے وکیل کیا۔

اس کے جواب میں آواز نہ آئی۔ دُلہن شرما کر خاموش ہو رہی۔ قبلہ و کعبہ نے پھر پوچھا مگر صدائے برنخاست۔

قبلہ و کعبہ : اجازت ہے۔ میں وکالت کروں یا نہیں۔

دُلہن : (گردن جھکا کر خاموش ہو رہی) جواب ندارد۔

بیگم : بیٹی آہستہ سے کہہ دو۔ سب کہتے ہیں کیا نئی بات ہے۔

دلہن : پھر گردن جھکا کر خاموش ہو رہی۔ جواب ندارد۔

قبلہ و کعبہ : (بیگم صاحب سے) اب آپ سمجھاویں وقت جاتا ہے۔

بیگم : میں تو کئی باری کہہ چکی اب کیا کروں۔ کہہ دو بیٹی۔

قبلہ و کعبہ: ان کی ہمجولیوں سے کہئے کہ سمجھائیں۔ رات بہت کم ہے۔

دلہن کی ماں نے حشمت بہو سے کہا۔ تم سمجھاؤ بیٹی۔ حشمت بہو کان میں کہنے کو تھیں کہ نازک ادا اور جانی بیگم چٹکتی ہوئی آئیں۔ نازک ادا نے کان میں کہہ دو بہن ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ کسی اور سے وعدہ ہو گیا ہے۔

یہ نہیں پسند ہے۔ جانی بیگم نے کہا کیوں سب کو دق کرتی ہو۔ جی تو چاہتا ہو گا کہ بے نکاح ہی چل دوں، مگر نخروں سے باز نہیں آتی ہو۔ بڑی دیر کے بعد دُلہن نے سب کے اصرار سے نہایت ہی آہستہ سے کہا (ہوں) دلہن کی ماں بولیں۔ قبلہ و کعبہ نے سُنا۔ انھوں نے کہا نہیں مطلق آواز نہیں آئی۔ جس شہ نشین میں دلہن کا پلنگ تھا اس میں کھچا کھچ عورتیں بھری تھیں، سب دلہن کو گھیرے ہوئے تھیں۔ دلہن کی ماں نے کہا بی بیو ذری غل نہ مچاؤ۔ تاکہ قبلہ و کعبہ لڑکی کی آواز سن لیں۔ جب سب خاموش ہو گئیں تو پھر نہایت آہستہ سے دلہن نے (ہوں) کہا۔ کون دلہن ثریا بیگم اور وہی ثریا بیگم جو اللہ رکھی کے نام سے مشہور تھیں۔ جو آزاد پاشا کے ساتھ اونٹنی پر سوار ہو کر شہر بھر کا چکر لگاتی تھیں۔ جس پر بگڑے دل آوازے کستے تھے۔ جن کو ہر کس و ناکس چھیڑتا تھا، جو جوگن ہو کر آزاد کے فراق میں زندگی بسر کرنے کو تھیں، جو شبو جان کے نام سے رونیو ایجنٹ کے ہاں رہیں۔ جن پر لوگوں نے بیٹرن کی تہمت لگائی، جو س پالیس کا لقب پا کر پادری صاحب کے بنگلے پر براجیں۔ وہی ثریا بیگم اب اقبال نکاح کرتے ہوئے شرماتی تھیں۔ یہ وہی ثریا بیگم شوخ ہیں جو نواب سنجر سطوت صاحب کے ہمراہ ہاتھی پر سوار ہو کر جنگل میں شیر کے شکار کے لئے گئی تھیں۔ اور آج حضرت مجتہد العصر والزمان کے سامنے (ہوں) کرنے سے انکار ہے۔ الغرض جب (ہوں) کی آواز آئی تو قبلہ و کعبہ نے دلہن کی ماں سے دریافت کیا کہ اُسی کی آواز تھی۔ یا کسی اور کی دلہن کی ماں نے کہا حضور اُسی کی آواز ہے۔ پھر مکرر پوچھا تو بھی تشفی نہ ہوئی۔ پھر اور عورتوں سے شہادت طلب کی۔ سب نے کہا واقعی دُلہن کی آواز تھی۔ اس میں ذرا شک نہیں۔ قاضی صاحب بسم اللہ کر کے محلسرا کے باہر تشریف لائے۔ یہاں مفتی صاحب دولھا کی طرف سے وکالت کرنے کو آئے تھے۔ اس اثنا میں دولھا کے احباب نے نواب صاحب (دولھا) سے مذاق کرنا شروع کیا۔

ایک : میاں سُنتے ہو۔ جس وقت تم سے پوچھا جائے کہ نکاح منظور ہے یا نہیں تم گھنٹہ بھر تک جواب نہ دینا خبردار خبردار۔

دوسرا : اور نہیں تو کیا فوراً کہہ دیں گے (ہاں) ایسا نہیں ہو سکتا۔

تیسرا : جب مفتی صاحب اصرار کریں اعزہ اقربا ہاتھ جوڑیں تب بہت آہستہ سے کہنا (بہت خوب منظور)۔

چوتھا : منظور کے بعد اتنا ضرور کہہ دینا کہ بدرجہ مجبوری منظور ہے۔

دولھا : (آہستہ سے) یارو خدارا اس وقت نہ ہنساؤ۔

احباب : تو ہم کو اس قدر تشفی دے دو، کہ اپنے تئیں سب کے سامنے نہ ہنسوانا۔ سمجھے۔ ایسا نہ ہو تم فوراً منظور کر لو اور دلہن کی طرف والے خواہ مخواہ ہم کو ہنسیں اور پھر جھینپنا پڑے۔

دولھا : (آہستہ سے) دولھا نہیں بنے تھے۔ مگر براتیں تو بہت سی دیکھی تھیں۔ دولھا سے وہ بات چاہتے ہو

جو دُلہن کو کرنی چاہیئے۔ اچھا صاحب (مسکرا کر) اگر یہ مرضی ہے تو دو گھنٹے میں منظور کروں گا۔

احباب: آپ ایک اُستاد ہیں مفتی صاحب پورا سوال کرنے بھی نہ پائیں گے کہ آپ گردن ہلا دیں گے اور یہ بڑا۔ مفتی صاحب نے دولھا سے حسبِ دستور دریافت کیا تو انھوں نے کہا مہر زیادہ ہے۔ دلہن کے بھائی نے جو وہاں موجود تھا کہا۔ اس سے کم نہ بندھے گا۔ جس قدر ماں کا مہر ہے اس سے کم نہ ہوگا۔ دولھا کے باپ نے کہا اس جھگڑے سے کیا فائدہ اُن سے کہو اور بڑھا دیں۔ وہ چار لاکھ کہتے ہیں منظور۔ بلکہ چار لاکھ اور میری طرف سے بڑھا دیں آٹھ لاکھ کر دیں۔ شرفا میں مہر باندھنا شرع کی پابندی ہے۔ الغرض نکاح شروع ہوا۔ دلہن کی جانب سے قبلہ و کعبہ دولھا کی طرف مفتی صاحب، دولھا سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے نکاح فوڑا منظور کر لیا اور ان کے احباب مسکرا کر ان کی طرف دیکھنے لگے بعد نکاح کشتیاں آئیں کسی میں دوشالہ رومال۔ کسی میں بھاری بھاری ہار۔ پلیٹوں میں چکنی ڈلی الائچی۔ پان۔ بلوری ہشت پہل شیشوں میں عطر روح پرور۔ کسی میں نُقل اور مصری اور قند کے کوزے، دولھا کے ایک دوست نے کان میں کہا بس جاؤ بھی دُلہن نے تو دو گھنٹے میں منظور کیا مگر حضور ایسے ریجھے کہ ذرا بھی انکار نہ کیا، اور اس قدر دیر تک سمجھا چکے تھے۔ جب قبلہ و کعبہ رخصت ہونے لگے تو دولھا نے پانچ اشرفیاں نذر دکھائیں۔ مفتی صاحب اور قبلہ و کعبہ کو خلعت دیا گیا۔ حکم ہوا کہ کشتیاں ساتھ بھیج دو۔ دولھا نے ہاتھ چومے اور لوگوں نے مصافحہ کیا۔ فنس تک اکثر صاحب آئے۔ قبلہ و کعبہ سوار ہوئے تو محفل میں پھر وہی دھما چوکڑی مچی۔ سب طائفوں نے ملکر مبارکباد گائی۔

شادیانہ غرض بجے اسدم — طائفوں نے بھی جمع ہو کے بہم
بھیر دیں کے سروں میں بادلِ شاد — گائی اس نور کی مبارک باد

ہو گئے مست اہلِ بزم تمام
جھولیاں بھر کے لے گئے انعام

اس کے بعد محلسرا سے تھالی جوڑ آیا۔ شربت آیا۔ شربت پلائی کی اکیس اشرفیاں دیں۔ دلہن کی طرف کا خدمت گار جو لے کے آیا تھا اس نے پانچ اشرفیاں پائیں۔ پہلے پانچ اشرفیاں لینے سے انکار کیا کہا۔ دوشالہ دلوائیے حضور۔ مگر لوگوں کے سمجھانے سے انعام قبول کیا۔ دُلہن کے لئے جھوٹا شربت بھیجا گیا۔ ادھر اہل محفل کو شربت پلایا گیا۔ ہار کی کشتیاں آئیں ادھر شربت پلایا گیا۔ اُدھر ہار گلے میں ڈالا، عطر لگایا، چکنی ڈلی الائچی پان کھلایا۔ اتنے میں اندر سے آدمی آیا کہ دولھا کو بلایا ہے۔ دولھا یہاں سے خوش خوش روانہ ہوئے۔ جب ڈیوڑھی پہنچے تو ان کی بہنوں نے آنچل ڈالا۔ اور دولھا کو لے جا کر دلہن کے پاس مسند پر بٹھایا:

زیبِ مسند ہوئے جو دولھا دلہن — کچھ عجب وقت تھا عجب جوبن

وہ بساوٹ دلہن کی وہ بوباس — وہ مہک عطر کی وہ سوہالباس

وہ لپٹ ہار پھول کی ہر سُو — بھینی بھینی وہ مہدی کی خوشبو

وہ مبارک سلامت اور وہ رسوم — اور وہ میراثنوں کے گانے کی دھوم

گالیاں سمدھنوں کو دینا گاہ

ناز غمزے سے بیل لینا گاہ

(نازک ادا سے) لایئے میری نچھاور تو لائیے۔ اور پھر پورا نیگ دلوایئے۔ حضور یہی تو ہمارے جھگڑنے کا وقت ہے۔

ڈومنیوں نے ریت رسم شروع کی۔ پہلے آرسی مصحف کی رسم ادا کی۔ مصحف لائے، آئینہ آیا۔ بیچ میں رکھے گئے۔ سر پر سُرخ دوشالہ ڈالا۔ نواب صاحب نے گھونگھٹ اُلٹا۔

نازک ادا: کہو بیوی منہ کھولو، میں تمہارا غلام ہوں۔

نواب: بیوی منہ کھولو میں تمہارے غلام کے تلام کا چولام ہوں۔ اس پر فرمایشی قہقہہ پڑا۔ اور نازک ادا نے دولھا کے چٹکی لے کر کہا۔ خوشامد کرد پھر وہی کہو۔

نواب: بیوی میں تمہارا زر خرید غلام ہوں منہ تو کھولو۔

حشمت بہو: جب تک ہاتھ نہ جوڑو گے منہ نہ کھولیں گی۔

راوی: اللہ اللہ یہ وہی ثریا بیگم ہیں جو برافگندہ نقاب و حجاب شکار کھیلنے گئی تھیں۔ اور بنگالی بابوؤں کو ہنستی تھیں۔ آج یہ نخرے ہیں کہ نواب سنجر سطوت بہادر غلام بنتے ہیں، اور شنوائی ہی نہیں ہوتی۔ اللہ اللہ کیا تجاہل ہے۔

مبارک محل: اوپر کے دل سے غلام بنتے ہو۔ دل سے کہو تو آنکھیں کھول دیں ورنہ گھنٹوں تک ترسا کرو گے صاف صاف تو یہ ہے۔

نواب: یا الٰہی۔ اب اور کیونکر کہوں۔ خط غلامی لکھے دیتا ہوں۔ بیوی۔ خدا را ذرا جمال مبین دکھا دو۔ آنکھیں کھول دو۔

دولھا نے ایک دفعہ دل لگی دل لگی میں غل مچا دیا کہ وہ آنکھ کھولی۔ سالیوں نے کہا۔ جھوٹ کہتے ہو ہرگز آنکھ نہیں کھولی کون کہتا ہے آنکھ کھولی کہیں کھولی نہ ہو۔

ڈومنی: (دلہن سے) میں واری اب آنکھیں کھولئے۔ بیچارے غلام بنتے بنتے تھک گئے اب رحم کی جا ہے منہ نہ تھکایئے۔ آپ ان کی طرف نہ دیکھیں آپ فقط آنکھ کھول دیں، وہ آپ کو دیکھیں آپ چاہے نہ دیکھیں۔

نازک ادا: واہ دولہا تو چاہے پیچھے دیکھے یہ پہلے ہی کھولیں گی۔

ڈومنی: میں واری آپ آنکھیں کھول دیں اب کب تک تھکائے گا۔

کس لئے دیکھئے کسی کی طرف

دیکھئے آپ آرسی کی طرف

اتنے میں دلہن نے ذرا آنکھ کھولی، اور نواب صاحب سے چار آنکھیں ہوتے ہی شرما کے گردن نیچی کرلی۔ آنکھ جھکالی۔

نازک ادا: دل میں تو کہتے ہوں گے کہ بیشک اسی قابل ہے کہ اس کے غلام بنیں، کیا جانے دُلہن نے میاں کی صورت دیکھی یا نہیں۔ کیوں ثریا بیگم۔

دلہن نے لجا کے گردن اور بھی جھکا دی۔ جواب کیا دیتی۔

دولہا: جی ہاں دیکھی۔ پھر آپ فرمایئے۔ کچھ فرمایئے۔

نازک ادا: ایسے ڈھیٹ دولہا بھی نہیں دیکھے ابھی ناحق دلہن نے آنکھیں کھولیں۔ جب قدموں پر ٹوپی رکھتے تب کھولتیں۔ دولہا نے اکیس پان کا بیڑا کھایا، پائجامے میں ایک ہاتھ سے ازار بند ڈالا۔ دولہا نے ساس کو سلام کیا۔

ساس نے خلعت بیش بہا دیا، اور گلے میں موتیوں کا ہار ڈالا۔ اب نبات چنوانے کی رسم ادا ہوئی۔ ڈومنی نے کہا۔ حضور اب تو نوبات چنوائی جائے۔ دلہن کے شانے گھٹنے ہاتھ وغیرہ پر مصری کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں رکھی گئیں اور جھک جھک کے دولہا نے کھائیں اس وقت نازک ادا کا خندہ شکر آمیز اور حشمت بہو کا تبسم نمک ریز، لطف دیتا تھا۔ عروسِ پاکیزہ رُو، عنبریں مو، کے نبات چننے کے وقت ایک قسم کی گدگدی ظاہر کرتی تھی۔ سالیاں دولہا کو چھیڑ رہی تھیں۔ کسی نے چٹکی لی۔ کسی نے گدی پر ہاتھ پھیرا۔ یہ بیچارے اِدھر اُدھر دیکھ دیکھ کے رہ جاتے تھے

ڈومنیوں نے رہنے کا دل بنی سے لاگا، گانا شروع کیا ایک شاخ سمن پستہ دہن ڈومنی نے دولہا کے ہاتھ میں موم کی گولی دی۔ کہا پوچھو تو یہ کیا ہے۔ پہلے خاک نہ سمجھی، مگر ہاتھ سے گولی دبائی تو مسکرا کر کہا موم ہے۔ ڈومنیاں بولیں اللہ کرے دلہن کی طرف سے دولہا کا دل موم ہو جائے۔ دُلہن کی ماں اور بڑی بوڑھی عورتیں ذرا دُلہن کے کمرے سے اِدھر اُدھر گئیں، اور ہمجولیوں نے چہل شروع کر دی۔

جانی بیگم: ایسی چربانک سالی بھی نہ دیکھی ہوگی۔

نواب: ایک چربانک ہو تو کہوں۔ یہاں تو جو ہے شوخ و شنگ ہے۔ اور نازک ادا بیگم تو معاذ اللہ سوار کو گھوڑے پر سے اتار لیں۔ زبان تو رکھتی ہی نہیں۔ زبان کیا کترنی ہے۔

نازک ادا : (بندگی کرکے) کیا تعریف کی ہے، واہ واہ۔

جانی بیگم : کیا کچھ جھوٹ ہے تمہارے زبان کی مسلمانی کرنا چاہیئے۔

مبارک محل : اور تم اپنی کہو زمانے بھر کی چھتیسی مردوے کو آنکھوں میں پیے لیتی ہو۔ دولھا کو اس وقت سے گھور رہی ہو۔

مبارک محل : جبھی اِن دونوں میں خوب بنتی ہے۔ وہ چرباںگ یہ چھتیسی۔ دونوں اچھی ملیں گے۔

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

نازک ادا : ایک ہوئی یا در کھیئے گا۔ جی ہاں۔

حشمت بہو : کیسی کھڑی بولی ہے، جیسے مرد بول رہا ہے۔

نازک ادا : یہاں اس وقت اتنی کھڑی ہیں، اور ایک سے ایک حسین، کم سن، جو ہے پری۔ مگر اِن کی نظر جب بھی پڑتی ہے جانی بیگم ہی پر۔

جانی بیگم : پھر۔ پڑا ہی چاہیے۔ پہلے اپنی صورت تو دیکھو۔ شانِ خدا۔ آپ اور ہمارا مقابلہ کریں اے تیری قدرت

نازک ادا : یہ تو اپنی اپنی طبیعت ہے۔ ع

محبت میں سبھی یکساں ہیں جس کی جس سے بن آئی

ہمارے چاہنے والوں سے کوئی پوچھے، تو حال معلوم ہو۔ تمہاری طرف کبھی تھوکیں بھی نہیں۔

مبارک محل : (دانت کے تلے انگلی دبا کر) بس حد ہوگئی۔ ایک بوڑھی خانم صاحب نازک ادا بیگم اور جانی بیگم کی باتیں سُن کر بولیں۔ اقوہ۔ دونوں کس غضب کی لڑکیاں ہیں۔ تلے تیس، اوپر بیس، اور دونوں کیسی تڑ بڑ تڑ بڑ باتیں کرتی ہیں۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ اس وقت نازک ادا نے آہستہ سے کہا نہیں اماں جان ایسا نہ کہو، یہ بیچاری کبھی کہیں جاتی ہیں نہ آتی ہیں۔ (مبارک محل کی طرف مخاطب ہو کر) آپ اِن کو بے نقط سُناتی ہیں۔ خانم صاحب بے اختیار ہنس پڑیں۔ اور کہا تم بڑی شوخ ہو۔ کہیں پر چپ نہیں رہتیں۔

جانی بیگم : جی ہاں ان کے دیدے کا پانی ڈھل گیا ہے۔ کہتی تو آپ ان کو تھیں اور وہ مبارک محل کو بنانے لگیں۔

خانم : اور تم خود کیا کم ہو۔ خود را فضیحت و دیگران را نصیحت۔ جیسی تم ویسی نازک ادا بیگم۔ دونوں کلاں ہو

آسمان جاہ : میرے دل کی کہی۔ کیا نکلی جاتی تھیں۔

جانی : چلو بی تم بھی تو اس تعریف میں شریک ہو۔

آسمان : ہم تو ہنسی ہیں۔ مگر تم کیسی نیک بنی جاتی تھیں۔

جانی : اے گردن نیچی رکھو ذری۔ تھوڑی دیر گردن جھکا کے نہیں بیٹھا جاتا ہے۔ واہ۔ دلہن بنی ہیں۔

نازک ادا : ہاں دیکھتی ہو کیسی تنی ہوئی بیٹھی ہے۔

حشمت : تم بیٹھی رہو ثریا بیگم ان کو کہنے دو، ان کا مزاج ہی ٹٹھول ہے۔ خاصی اچھی طرح تو بیٹھی ہو چھیڑنے سے مطلب۔

نازک ادا : کل یہ خوب گا رہی تھیں :

نہیں روزن جو قصر یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں

اس شعر کو ایک گھنٹے تک گایا کیں۔

جانی : گانا تو خیر۔ بتاتی خوب ہیں۔

نازک ادا : اور ناچتے نہیں دیکھا تم نے کوئی کتھک ان کے مقابلے میں کیا ناچے گا۔ کہو ایک گھنگرو بولے، کہو دونوں بولیں۔ اور تلوار پر ایسا ناچتی ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھو۔

جانی : کیا معلوم کس سے تعلیم پائی سُنا کوئی کتھک تھا اس نے دل لگا کے ناچنا سکھایا ہے۔ نواب سنجر سطوت کی چاندی ہے روز مفت کا ناچ دیکھیں گے۔ نون نہ پھٹکری، اور رنگ چوکھا۔ اپنی اپنی قسمت ہے خدا کی دین، اس میں کسی کا کیا۔

حشمت بہو : ان کی بے حیائی زیبا نہیں ہے۔ ہنسی دل لگی کا بھی ایک موقع ہوتا ہے، اور وہ بھی جیسی شریفوں میں جائز ہے۔ یہ نہیں کہ بے شرمی، بدگمانی سے جو چاہا کہہ دیا۔ واہ۔

نازک : ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ کون سا وقت ہے۔ جس وقت ہنسی دل لگی جائز ہوتی ہے۔ برات کے دن ہنسنا بولنا ناجائز ہوگا۔ کیوں اب رہی یہ بات کہ کیسی چہل بہو بیٹیوں میں ہونی چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے فقط اتنا کہا کہ دلہن ناچتی اچھا ہیں۔ پھر کیا کچھ جھوٹ ہے یہ تو نہیں ہم نے کہا کہ خدانخواستہ مجرے کو جاتی ہیں۔ اتنے میں دلہن کی ماں نے دلہن سے کہا میں واری بیٹی اب نہ نہ بول کھلوانا۔ ذری دل کو قابو میں رکھو، اس وقت میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کہ یا پروردگار! خیر کیجیو! بارے اس کی کریمی کے صدقے کہ بخیر گذشت مغلانی نے کہا حضور اب فضلِ الٰہی ہے۔ اب آپ اس کا خیال نہ کریں، کیا وہ نہیں سمجھتیں سلامتی سے سیانی ہیں سمجھدار ہیں۔ بیگم صاحب نے ہنس کر کہا۔ نازک ادا بیگم کہاں ہیں اب۔ نوشہ کو بہت دق نہ کرنا۔ وہ شوخ گل طرار بولی کہ اب اسوقت ہم آپ کی نہ سنیں گے۔ پھر دلہن کی ماں دوسرے کمرے میں گئیں، تو نازک ادا نے ثریا بیگم کو پھر چھیڑنا شروع کیا، اور یوں تقریر کی۔

نازک : دُلہن میں سب باتیں اچھی ہیں۔ شکل صورت اچھی، نک سُک سے درست۔ چہرے مہرے سے درست، مگر ذرا بخیل ہیں۔ بخیل نہ ہوتیں تو تورہ بندی توان کے ہاں ہوتی۔ سب کے ہاں حقے بٹتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ بٹتے مگر پلاؤ زردے کے لوازمے میں دام بھی خرچ ہوتے ہیں، اور وہ یہ خرچہ نہ چاہیں۔ چہرہ شاہی نہ نکلنے پائیں۔ (دولہا کی طرف مخاطب ہو کر) تم فضول خرچ، اور یہ جزرس۔ نبھے گی کیونکر۔

دولہا : خیر میں اپنی نپٹ لوں گا۔ سمجھا جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ میں جزرس بیوی چاہتا تھا۔ اب خوش ہوئیں۔

نازک ادا : (تنک کر) سُن لیا ہے نہ کہ دلہن گوری چٹی ہے۔ مگر جب دیکھو گے، تو قلعی کھل جائے گی معلوم ہوگی حقیقت۔

نواب : تمہارے کولے پر ہیکل کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے، سبحان اللہ۔!

نازک ادا : اے ہے۔ یہ کہئے۔ کہیں ہمارے میاں کے سامنے نہ کہہ دینا۔

نواب : تم اِن کو کیا مانتی ہو۔ تم کسی کو کب ماننے لگیں۔

نازک : اب دیکھیں یہ (دلہن کی طرف اشارہ کر کے) تم کو مانتی ہیں یا نہیں۔ دو ہی دن میں ہم کو معلوم ہو جائے گا۔

نواب : جدھر دیکھتا ہوں رنگین مزاج، چمن طبع، شوخ چست ہی نظر آتی ہیں، پرستان میں بیٹھا ہوں، اور آپ تو سب سے بڑھ کر حاضر جواب، اور تیز طبیعت ہیں:

شوخ و رنگین مزاج باتیں قہر
گرم و حاضر جواب فتنۂ دہر

حشمت : اگر ان کی سی دو ایک اور ہوتیں تو اس وقت بالکل بے حیائی کی باتیں ہونے لگتیں۔ ذرا شرم چھو نہیں گئی ہے آپ کو۔

مبارک : اچھا اس وقت کی معاف ہے۔ اس وقت جو چہل کریں میز بہ دمگر۔ ہاں یہ عورت کیا آگ بھبوکا ہیں۔

نازک ادا : جانی بیگم دولہا خالی خولی بیٹھا رہے۔ یہ کیا بات۔

جانی : پھر تم کیا کرتی ہو۔ دولہا کوئی شرمیلا ہو، تو تو چھیڑیں۔ وہ خود شمشیر برہنہ ہیں۔ (مسکرا کر) خوش ہو گئے۔

نواب : خیر انصاف تو کیا، ہم تو منصف مزاجوں کے قائل ہیں۔

نازک ادا : یہ بات میں تو پہلے سمجھی تھی کہ ہر پھر کے جب نظر پڑتی ہے، انہیں پہ پڑتی ہے۔ ان کی سی تو کہا نہ پوچھا

جانی : اب بار بار ایسی باتیں کہنے سے کیا فائدہ۔

نازک : (مبارک محل کی ماں ہیں) بہن چور کلی ذری نکل گئی ہے، جاکر پائجامہ بدل ڈالو۔ کہا مانو۔

مبارک : مجھے بھی کوئی فیضن مقرر کیا ہے۔ تم پہلے اپنی تو خبر لو۔

نازک : خوب یاد دلایا۔ یہ بی فیضن نہیں نظر آئیں، یہ کدھر اڑن چھو ہو گئیں۔ بی خلانی ذری دیکھو تو بی فیضن کدھر جا پڑیں۔

جانی : اے ہے تم نے نہیں سُنا، وہ تو چُھپ رہیں۔ بہت بگڑی ہوئی ہیں۔ شہر والیوں کو بارہ بارہ سے باتیں سُنا رہی ہیں۔ کہ یہ بڑی ڈھیٹ ہوتی ہیں۔ نوشہ ہو یا کوئی ہو کسی غیر کے سامنے جانا کیا معنی، لاکھ لاکھ کہا نہ آئیں، وہی تو ایک پردہ نشیں ہیں۔ اور کیا کسی کو پردہ کا خیال ہے۔ سب پر حُرف رکھتی ہیں۔

نازک : مجھے اس کا حال ہی نہیں معلوم تھا۔ دیکھو میں جاکے لاتی ہوں، نہ آئیں گی تو کچھ سنیں گی بھی مجھ سے۔

دولھا نے یہ تقریر سنی تو ان کو بھی شوق ہوا کہ فیضن کو دیکھیں۔ نازک ادا بیگم سے کہا۔ آخر ان میں کیا بات ہے، جو باہر نہیں آتیں، نوشہ سے بھی کوئی پردہ کرتا ہے۔ نازک ادا بیگم بولیں۔ تم اپنے مطلب کی بات کہا ہی چاہو۔ کیوں نوشہ سے پردہ کیوں نہیں کرتی ہیں، کون کہتا ہے نوشہ سے پردہ نہیں ہوتا، اچھا دیکھو میں جا کے لئے آتی ہوں۔

یہ کہہ کر نازک ادا بیگم اس کمرے میں گئیں، جہاں فیضن بیٹھی تھیں۔

نازک : یہ یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ بہن کیا آدمیوں سے نفرت ہے، سب وہاں بیٹھے ہیں۔ تم یہاں گھس کے بیٹھی ہو۔ واہ وا۔ یہ اچھی ادا ہے۔

فیضن : ہم نہ جاب (گھبرا کر) میں نہ جاؤں گی۔

نازک : پھر گنوارپن کی لی نہ۔ ہم نہ جاب، نہ جاب، سوائے وہی گنوارپنے کے اور کوئی بات نہیں۔

فیضن : اچھا پھر ہم تو نہ جائیں گے۔ میرے قصبے میں جو سُنے گا وہ الہنا دے گا۔ اور ہم کو سب مل کے ہنسیں گے۔

نازک : تم کسی کو کہو کاہے کو۔ بس چھٹی ہوئی۔

فیضن : ہم جھوٹ نہ بولیں گے نا مکر ہونا اچھا نہیں۔

اس کے بعد دولھا محفل میں بُلائے گئے، اور اُدھر عورتوں میں شربت پلائی شروع ہوئی۔ ڈومنیوں نے سمدھنوں کو خوب گالیاں دیں۔ اس طرف والی ہنستی اور قہقہے لگاتی تھیں۔ اس طرف کی عورتیں شرماتی تھیں اتنے میں دولھا کی ماں نے سمدھن سے کہا اب دن زیادہ آگیا ہے۔ دولھا کو بُلوائیے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ جہیز نکلے، باورچی خانے کے داروغہ سے کہا گیا کہ کھانا تیار ہے۔ اس نے کہلا بھیجا کہ بھوڑے کا کھانا سب تیار ہے۔ صرف حکم کی دیر ہے۔ جو جو اسباب جہیز محل سرا سے نکلتا جاتا تھا۔ دیوان جی کاغذ پر قلمبند کرتے جاتے تھے۔ جب فہرست تیار ہوئی۔ تو دولھا کے باپ سے کہا۔ پیرو مرشد کسی داروغہ یا معتبر آدمی کو حکم ہو

فہرست کے مطابق کل اشیار کو جانچ لے؛ داروغہ نے بمقابلہ فہرست کل سامان جانچ لیا۔ دولھا اندر آئے۔ لاؤ اور مسند پر دُلہن کے پاس بیٹھاؤ دلہن دل ہی دل میں کہتی تھی، کہ یا خدا کہیں وہ عورت پھر نہ آجائے۔ مثل مشہور ہے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ اِدھر ہمجولیاں دولھا سے چہل کرتی تھیں، ادھر دلہن کے دل میں طرح طرح کے خیالات جاں گزیں تھے۔ کبھی سوچتی تھی کہ آزاد جب روم سے واپس آئیں گے تو خدا جانے اپنے دل میں کیا سمجھیں گے۔ ساری کی کرائی محنت رائیگاں کردی۔ اتنے دن تک جوگن بنی رہی۔ اس کا حال آزاد کو بھلا کیونکر معلوم ہوگا۔ میں اس کے واپس آنے کی خبر کیونکر سنوں گی۔ آزاد سے کون کہے گا کہ تیرے دردِ فراق میں اس قدر عرصے تک مصیبت جھیلی۔ اوّل تو روم سے واپس آکر حسن آرا کے ساتھ شادی ہوگی مجھے بھلا کیوں یاد کرنے لگے۔ کبھی خیال آیا بھی تو انھیں معلوم کیونکر ہوگا، کہ کہاں ہے۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ ان کا نواب سنجر سطوت کے ساتھ نکاح ہوا۔ یہی سمجھیں گے کہ بد وضع عورت تھی، کہیں نکل گئی۔ خیر وہ جو چاہے خیال کریں۔ خدا کرے جہاں ہوں اچھے رہیں۔ اور خوش و خرم رہیں۔ دولھا کو کیا معلوم کہ دلہن اس وقت کس فکر میں ہیں۔

اب سنیئے کہ نازک ادا بیگم پھر اُس کمرے میں گئیں۔ جہاں بی فیضن چھپی بیٹھیں تھیں۔ ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگیں۔

نازک ادا : کیا اب عورتوں سے بھی پردہ کرتی ہو بہن۔

فیضن : کیوں کیا دولھا باہر ہے۔ اندر نہیں آوا۔ (آیا۔)

نازک : ایں! دولھا محفل میں گیا اب کوئی آدھ گھنٹے میں پھر آئے گا۔

فیضن : ہم سے کوؤ کہن ناہیں، تو چلو پھر چلیں۔

نازک : اب تو ہم ذرا لیٹیں گے۔ بالکل شل ہوگئے۔

فیضن : اب جب بارات (برات) بدا ہو جائے تپ لیٹو۔

نازک : اچھا چلو پھر وہیں چل کے بیٹھیں؛ یہاں اکیلے میں آنکھ لگ جائے گی۔ اے تم نے دولھا کی صورت بھی دیکھی ہے، یا نہیں۔

فیضن : ہاں دیکھی کا ہے ناہیں۔ گورے گورے ہیں۔ ہیں نہ۔

نازک : ہاں سچ بتانا بہن تمہارے میاں کیسے ہیں۔ گورے ہیں یا سانولے۔ سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں پیار کرتے ہیں تم سے محبت ہے؟

فیضن : (شرما کر) جیسے ہیں تیسے ہیں، اور کوئی کو کیا۔

نازک : ایسے تیسے ہیں، یہ تو تم اپنے منہ سے کہو۔ مجھ سے کیا سروکار۔ اس میں آخر شرم کی کون سی بات ہے۔ ہم اپنے میاں کا حال بتا دیں، ہمارے میاں کا چھریرا بدن ہے۔ بہت خوب صورت، سرخ و سفید آدمی ہیں۔ گورے چٹے۔ میانہ قد۔ چہرے پر داڑھی نہیں ہے۔ صوفیانہ کپڑے پہنتے ہیں۔ وضع بانکی ہے۔ شعر کہتے ہیں۔ تین سو روپیہ ماہواری کا وثیقہ ہے، اور دکانوں کا کرایہ کوئی ستر بہتر روپیہ ماہواری آتا ہے۔ ہمارا ایک سو نوے روپیہ کا وثیقہ ہے۔ ایک بہودن کو انھوں نے گھر ڈال لیا ہے؛ مگر وہ مالدار ہے۔ اس کے پاس بھی جائداد اچھی، زیور وغیرہ ملا کے کوئی پچیس چھبیس ہزار کے پیٹے میں ہے، اور ہمارے میاں ایک دم کی بھی ہماری جدائی گوارا نہیں کرتے۔ دل و جان سے ہم پر عاشق ہیں۔ بغیر ہمارے ان کو ایک دم چین نہیں۔

فیضن : اچھا پھر کہد یب، چلو وہیں چل کے بیٹھیں۔

نازک : یہ بتاؤ کوئی تمہارے میاں کو لئے بھاگتا ہے۔ آخر خوف کاہے کا ہے۔ آؤ۔ اچھا چلو دلہن کے پاس چل بیٹھیں۔

فیضن کو لے کر نازک ادا بیگم دُلہن کے شہ نشین میں آئیں۔ چق اٹھائی تو فیضن نے دولھا کو دیکھا، اور دیکھتے ہی جھجک کے بھاگنے کو تھی، کہ نازک ادا بیگم نے ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا۔ اے واہ کیا بھاگی تھیں۔ جب میں جانے بھی دوں ایک تمہیں بڑی پردہ دار ہو۔ فیضن نے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ تو جانی بیگم نازک ادا کی مدد کو اٹھیں۔ دونوں نے پکڑ کے چہرہ کھول دیا۔ فیضن دیہاتن نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود۔ آخر کار رو دی اور ان کے رونے پر کل شہر والیوں نے قہقہہ لگایا۔ دولھا بھی ان کی بے قراری اور وحشت دیکھ کر ہنسنے لگا۔ مگر چونکہ ساس اور کئی اور بوڑھی عورتیں وہاں بیٹھی تھیں؛ اس سبب سے رومال منھ کے پاس لے جا کر آہستہ آہستہ ہنسے۔ مبارک محل بولیں۔ اے آخر اس وحشت کا کچھ ٹھکانا بھی ہے۔ جس طرح سب بیٹھی ہیں۔ اس طرح تم بھی بیٹھو چھٹی ہوئی۔ تم کو اتنا پردے کا خیال کیوں ہے۔ فیضن کو بدرجہ مجبوری وہاں بیٹھنا پڑا، تو ہمجولیاں چپ کے چپ کے آوازے کسنے لگیں۔ ایک نے کہا ان کا گورا پنڈا ہے دوسری بولی۔ تم شہر کی عورتیں ان کی سی تمیز کہاں سے لاؤ گی ...
بات چیت کیسی دُرست ہے۔ گفتگو شُستہ، بول چال، صاف، تیسری نے مسکرا کر کہا شین قاف درست۔ چوتھی بولی اس وقت ہم سے پوچھتی تھیں، کہ ٹونا کسے کہتے ہیں۔ اور کئی رسموں کا نام لیا۔ کہ وہ ریت نہیں ہوئی۔ ہم نے کہا ہمیں نہیں معلوم۔ ہم نے ان رسموں کا کبھی نام ہی نہیں سنا حشمت بہو نے فیضن سے کہا۔ بہن ہم کو یہاں آنے میں کیا عذر تھا، آج کے دن پردہ کیسا، اور تم کو دولھا کیا جانیں، کہ کون ہو اب جو اتنے نخروں کے بعد آئیں، تو ہم سب سے کہہ دیں گے کہ یہ فلاں شخص کی بیوی ہیں۔ اور فلاں مقام میں رہتی ہیں۔ صاف صاف ہم سب سے کہہ دیں گے نہیں تو اچھی طرح شگفتہ ہو کے بیٹھو۔

فیضن : ہم کا اب جانے دو۔ اب ہم جاب۔
نازک ادا : کہاں اب جاب تنک بتاؤ۔ جاب کہاں۔
جانی بیگم : تم لاکھ بناؤ تم سے گنواری بولی ہرگز ہرگز نہ بولی جائے گی۔ وہ تو جس کی زبان ہے وہی خوب بول سکتا ہے۔
بیگم : (دولھا کی ماں) تو اس بیچاری کو تم سب کی سب کیوں دق کرتی ہو۔ خواہ مخواہ۔ اس نے کیا قصور کیا ہے تمہارا نہ۔
حشمت بہو : آپس میں ہنستے ہیں یہ برا تھوڑا ہی مانتے ہیں۔
بیگم : اب رو دیں اس سے زیادہ برا اور کیا مانیں گی۔
نازک ادا : جی نہیں آنکھ میں درد ہے۔ اور زکام ہے اس سے آنسو آگئے۔ رونے والی نہیں ہیں۔

اب چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ حکم دیا گیا کہ سواری منگواؤ دلہن کی ماں بہنیں ہمسائی۔ اعزہ اقربا سب رونے لگیں۔ دلہن کی ماں نے سمدھن سے کہا بہن۔ لونڈی دیتی ہوں۔ اس پر مہربانی کی نظر رہے، وہ بولیں۔ واہ کیا کہتی ہو اولاد سے زیادہ ہے۔

جس طرح خورشیدی اور نواب بیگم کی محبت اور خاطر کرتی ہوں۔ اسی طرح اس کو عزیز رکھوں گی۔ تم نے ہمارا گھر آباد کیا ہے۔ جیسی اور اولاد ویسی ہی میرے نزدیک یہ بھی ہے۔ شربت پلائی کے جس قدر روپے تھے ان میں کچھ اور بڑھا کر سلام کے وقت ساس نے دولھا کو دیئے تو نوشاہ نے دلہن کو گود میں اٹھایا سکھپال پر سوار کیا :

الغرض آکے جس گھڑی نوشاہ — لے چلا گود میں اٹھا کے وہ ماہ
پھر تو ہر سو تھا جوش رقت کا — اور دلہن کو بھی رنج فرقت کا

باہر اندر چلو چلو کی وہ دھوم
سمدھنوں کا درِ محل پہ ہجوم

سمدھنیں رخصت ہوئیں۔ جوشِ رقت کی یہ تاثیر تھی کہ دلہن بھی رونے لگی۔ گو گھر بھر سے ان کو واسطہ نہ تھا۔ جس کو ماں کہتی تھی اس کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھتی تھی۔ جو باپ بنے تھے۔ ان سے مطلق رشتہ نہ تھا۔ حشمت بہو کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ مگر وہ وقت ہی ایسا تھا کہ بے اختیار رونے لگیں۔ سکھپال دروازہ پر لگایا گیا تھا، بارہ مہریاں ساتھ ہوئیں۔ چھ اِدھر چھ اُدھر، سونے کی مچھلیاں جھلکتی جاتی تھیں۔ فوق البھڑک پوشاکیں ستم ڈھاتی تھیں۔

براتِ رخصت ہوئی، نوشہ خلعت پہنے ہوئے بشاش کہ چاند سی دلہن پائی:۔

زیبِ رخ موتیوں کا وہ سہرا — آپ سے صاف اس کی پیدا تھا
روئے مہ پر ہجوم پر دیں ہے — باغ رُخ پر شگفتہ نسریں ہے
موتیوں کا وہ گوشوارہ تھا — ہر گُہر صبح کا ستارہ تھا

جیغہ الماس کار لاقیمت
اور سرپیچ کی وہ زینت

برات دولھا کے گھر پر آئی۔ عروس کا محافہ کہاروں کے کندھوں پر تھا۔ ایک بکرا محافہ کے گرد پھرا کر تصدق کیا گیا۔ بعد ازاں کہاریاں۔ محافے کو اٹھا کر زنانی ڈیوڑھی پرلے گئیں۔ دولھا کی بہن آئیں۔ دُلہن کے پاؤں محافے سے لگا کے طشت میں دودھ سے دھوئے اور کفِ پا میں ورقِ نقرہ لگائے۔ دولھا نے عروسِ رنگین ادا کو گود میں اٹھایا، اور مسند پر لے جا کر بٹھایا۔ دولھا باہر جانے کو تھے کہ ان کی بھاوج نے کہا۔ ہائیں کہاں چلے۔ دامن پر نماز پڑھی۔ پھر شیر برنج آئی۔ پہلے دلہن کے ہاتھ پر رکھ کر دولھا کو کھلائی۔ اس شکر لب، شیریں حرکات کے دستِ سیمیں سے جو کھیر کھائی، تو دماغ آسمان پر تھا۔ کہ اللہ اللہ ایسی مہ پارہ بیوی ہاتھ آئی۔ بھاوج ڈھکاتی تھی۔ ادھر نوشہ نے منھ لپکایا۔ اُدھر بھاوج نے ہاتھ ہٹایا۔ تھوڑی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ بعد ازاں دولھا کے ہاتھ پر شیر برنج رکھی گئی، اور دلہن سے کہا کھاؤ وہ شرمانے لگی، دولھا کی بہنیں، دولھا کا ہاتھ عروس کے منہ تک لے گئیں۔ کھیر کھانے کو گویا مسمیٰ ہوگیا۔ شرم نے اجازت نہ دی کہ دولھا کے ہاتھ سے کھیر کھائے۔ دولھا باہر آیا۔ خورشیدی بیگم اور نواب بیگم اور دولھا کی بھاوج، اور بہنیں، اور ان کی ہمجولیاں، اور خواصیں، پیش خدمتیں، مغلانیاں، سب دلہن کو گھیر کر بیٹھیں۔ وہ شرمائی جاتی تھی۔ یہ صورت دیکھنے کا انتہا سے زیادہ اشتیاق ظاہر کرتی تھیں۔ دلہن کے ساتھ کئی عورتیں اس کے میکے سے آئی تھیں۔ بی بی مبارک، دوانی بیبیو گھبراتی کیوں ہو، دو چار روز میں اچھی طرح سے دیکھنا ان کو، یہاں خوش و خرم رہنا، خدا نصیب کرے۔ مگر انہوں نے ایک نہ سُنی۔ گھونگھٹ اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگیں۔ اور شرمیلی دلہن اور بھی شرماتی تھی۔

دولھا کے احباب نے جن سے بے تکلفی تھی کہا۔ حضرت مبارک ہو، مگر سچ بتاؤ تمہاری طبیعت کے موافق دُلھن ہے۔ دولھا نے کہا بس ہیں اور کچھ نہیں جانتا۔ اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ خدا کا کمال شکر گزار ہوں۔ اس پر قہقہہ پڑا۔ دولھا کے احباب نے کہا، بھائی خدا کے لئے اس نگارِ شوخ کو بلوا دیجئے۔ کل

سمدھیانے میں قتیل کی غزل گائی تھی۔

غم ہجر تو پایانے ندارد

چہ دردست ایں کہ درمانے ندارد

نواب صاحب نے کہا واہ۔ اب بندہ اس پھیر میں نہیں پڑتا۔ مجرد اور متاہل میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اور تجرید کے عالم میں بھی مقدس لوگ مُنہیات و مُعصیات سے بری رہتے ہیں۔ لوثِ معصیت سے ان کا دامن پاک رہتا ہے نہ کہ جب شادی ہوگئی ہو، برس میں دو ایک دفعہ کسی تقریب میں ناچ ہو، تو عجب نہیں، ورنہ اب بندہ درگاہ ان اُمورِ قبیحہ سے احتراز و اجتناب کریں گے۔

احباب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ یہ کہیئے کہ اب آپ تائب ہوگئے۔ ستر چوہے کھا کے بلی حج کو چلیں۔ نواب صاحب نے جواب دیا۔ سُنا نہیں التَّائِبُ مِنَ الذَّنبِ کَمَا لَا ذَنبَ لَہٗ در توبہ باز ست۔ اکثر شائستہ قوموں میں یہ قاعدہ ہے کہ اگر مجرد اس قسم کے افعال کا مرتکب ہو تو چنداں برا نہیں سمجھتے۔ مگر متاہل سے اس قسم کے حرکات سرزد ہوں، تو نظرِ حقارت سے دیکھا جائے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔ اگر اس پر ہماری قوم کار بند ہو تو بہت سے گناہوں سے بچیں، یہ عیاشی اور بدمعاشی ہی کا نتیجہ ہے، کہ میاں بیوی میں نہیں بنتی، اور انواع و اقسام کے امراض میں ہم لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ دیکھ لیجئے گا ایں جانب اب کیسے پاک دامن ہو جاتے ہیں۔ تم سب کو یقین نہیں آتا ہے، مگر دیکھ لینا۔ ان بد وضع آدمیوں کی صحبت سے اب ہمیں نفرت ہے۔

آزاد کے واپس آنے کی خبر

اب سُنیئے کہ مرزا ہمایوں فر بہادر جمشید مرتبت، دارا منزلت، کے زندہ ہوتے ہی شہزادی بیگم اور بڑی بیگم نے اپنے اپنے اعزہ و اقربا کو اس مژدۂ طرب خیز اور نویدِ بہجت انگیز کی بذریعہ تار برق اطلاع دی جس نے سُنا خوش ہوا کہ جس چیز کی مطلق امید نہ تھی وہ ظہور پذیر ہوئی۔ بمبئی کی بیگم کے نام بھی تار بھیجا گیا۔ سُنتے ہی باغ باغ ہوگئیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ میاں آزاد روانگی کے وقت بمبئی میں ایک مرزا صاحب کے ہاں فروکش ہوئے تھے جن کی بیوی حُسن آرا، سپہر آرا کی بہن تھیں۔ ان بیگم صاحب کو میاں آزاد سے ایک قسم کا عشقِ صادق تھا جب

آزاد رخصت ہو کر روانہ ہوئے نواب کا دل بھر آیا تھا۔ اس شوخ و شنگ، برق کردار نغز گفتار نے جو ہمایوں فر کے زندہ ہونے کا حال سنا تو جامے میں پھولی نہ سمائی۔ بار بار تار برقی پڑھوائی، مرزا صاحب اُس وقت کہیں باہر گئے تھے۔ خواصوں نے ایک پڑوسی سے جو انگریزی خواں تھے تار کا کاغذ پڑھوایا۔ بیگم صاحب نے فوراً میاں کو بلوایا اور چمک کر کہا۔ تُو مبارک۔ ہمایوں فر کے مرنے کی خبر غلط تھی۔ مرزا صاحب نے تار برقی خود پڑھی خوش تو ہوئے مگر دل کو تسکین نہیں ہوتی تھی۔ سوچے کہ مُردے کا زندہ ہونا یعنی چہ۔ یہ محض لغویات ہے۔ کسی فقرہ باز نے بھیجدیا ہوگا۔ مگر اس کی تحقیقات بخوبی ہو سکتی ہے۔

مرزا:۔ خدا کرے سچی ہی ہو۔ مگر دل نہیں مانتا۔

بیگم:۔ یہ کاہے سے۔ یہ کاہے سے۔ کیا تعجب کی بات ہے۔

مرزا:۔ اور نہیں بھی ہے کبھی ایسا سُنا ہے۔ ہم بھی یہاں سے تار بھیجتے ہیں دیکھیں اس کا جواب کیا آتا ہے۔

بیگم:۔ وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔

مرزا:۔ کسی فقرہ باز کی کارستانی ہے۔ کوئی بے فکرے ہیں۔

بیگم:۔ ایسے بے فکرے نہیں ہوا کرتے جو روپیہ کا روپیہ صرف کریں اور بیوقوف کے بیوقوف بنیں۔ تم چاہے مانو چاہے نہ مانو۔ ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ بیشک مرزا ہمایوں فر زندہ ہو گئے۔ گو اپنی آنکھ سے دیکھی ہوئی بات سے زیادہ، اور کسی چیز کا انسان کو یقین نہیں آسکتا۔ مگر یہ سوچتی ہوں کہ آخر کسی کا سر پھر گیا تھا کہ خواہی نخواہی اپنا روپیہ خرچ کرتا اور بیوقوف بنتا۔ اور خدا کی شان سے کیا بعید ہے۔ وہ کون شے ہے جو خدا کی قدرت سے باہر ہے۔ آگ کو گلزار کر دیا ہے۔ مُورِ ضعیف کو یہ طاقت دی کہ حضرت سلیمان کی دعوت کی۔ آیا جان لڑکپن میں ہمیں مناجات سکھاتے تھے:۔

بے ترے حکم اے الٰہ العالمیں

ایک پتا ہِل نہیں سکتا کہیں

تجھ سے روشن ہے زمین و آسماں

تیری قدرت کی ہیں سب نیرنگیاں

خاک کے پتلے کو تو گویا کرے

قطرۂ ناچیز کو دریا کرے

کُن کے کہنے سے کیا عالم بپا

اور جب چاہے اُسے کر دے فنا

ذات تیری لا عدیل و بے مثال

پاک بے ہمتا قدیر ذوالجلال

مرزا صاحب نے کہا ہاں سچ تو کہتی ہو۔ خدا کی قدرت سے کوئی بات بعید نہیں ہے۔ وہ بڑا مسبّب الاسباب ہے۔ تم اتنے دن سے اس قدر مغموم و ملول تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اور سچ کہوں میری بھی روح روتی تھی، کہ ہائے یہ کیا ستم ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ آج یہ مژدہ سننے میں آیا، ایک بات اگر کہوں تو تم کو شاید یقین نہ آئے۔ مگر بے کہے رہا نہیں جاتا۔ یہاں ایک روسی میم رہتی تھیں۔ روس کے خاندان شاہی سے متعلق ہیں۔ بہت بوڑھی اور مقدس عورت ہیں۔ ان کی نسبت مشہور ہوا تھا کہ معجزے دکھاتی ہیں اور عیونِ باطن سے منزلوں کی چیزیں دیکھ سکتی ہیں۔ مجھے اس کا یقین نہیں آیا۔ ایک روز میں خود اُن کے پاس گیا۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ کچھ عجائبات دکھائیے۔ مسکرائیں۔ کہا میں شعبدہ باز نہیں ہوں، الغرض دس بارہ بار کہا۔ اصرار کیا اور ایک روز ہاتھ جوڑ کر اور قدموں پر ٹوپی رکھ کر عرض کیا کہ آج یہ سر ہے، اور آپ کا در ہے۔ جب تک مجھے آپ عجائبات نہ دکھائیے گا میں یہاں سے نہ ٹلوں گا۔ انہوں نے کہا اگر میں یہ باتیں سب کو دکھاؤں، تو لوگ بدظن ہو جائیں اور سمجھیں کہ یہ شعبدہ باز ہیں۔ مگر چونکہ تم نے اصرار کیا ہے لہٰذا میں مجبور ہو گئی اب تم بتاؤ کہ تمہارے اعزہ میں سے اس مہینے میں کسی نے انتقال کیا ہے۔ میں نے کہا ہاں مرزا ہمایوں فر بہادر نے۔ کہا تم نے بھی ان کو دیکھا تھا۔ میں نے کہا ہاں۔ تصویر دیکھی ہے۔ حکم دیا کہ آنکھ بند کرو۔ میں نے آنکھ بند کی اور پھر کھولی تو دیکھتا ہوں ایک کرسی پر مرزا ہمایوں فر بہادر متمکن ہیں۔ ہوش اڑ گئے اور میں کانپ اٹھا کہ یا خدا یہ کیا دیکھ رہا ہوں جس طرح تصویر میں ان کی شکل دیکھی تھی اسی طرح کرسی پر بیٹھے تھے مجھے خائف دیکھ کر ہنسے۔ کہا اس خوف کا کیا سبب ہے۔ میں خبیث نہیں ہوں۔ پریت نہیں ہوں۔ تمہارے ملک کا شہزادہ ہوں۔ پھر مجھ سے خوف کرنا کیا معنی۔ میں نے دست بستہ عرض کیا۔ خداوند کچھ فرمائیں تو یہ کیا ماجرا ہے مسکرا کر فرمایا شانِ خدا۔

بیگم :۔ ہمیں یقین نہیں آتا۔ یہ کب کی بات ہے۔

مرزا :۔ اب یقین نہ آنے کا علاج ہی نہیں۔ بھلا جھوٹ بولنے سے مجھے کیا فائدہ ہوتا، آخر اور میں تو خود

کہتا ہوں کہ کسی کو دنیا بھر میں اس بات کا یقین نہ آئے گا۔ لیکن جس بات کو بچشم خود دیکھا اس کو کیونکر نہ باور کروں۔ کوئی لاکھ شک کرے میں نہ مانوں گا۔

بیگم :۔ اچھا تار بھیج کے دریافت تو کر لو کہ یہ خبر سچ ہے یا نہیں۔ اللہ کرے سچ ہو۔ بھلا تار کا جواب کب تک آجائے گا۔

مرزا :۔ آج ہی، یہ تار بھی اعجاز سے کم نہیں ہے۔ شعر۔

دمبدم از عالم اجسام می بخشد خبر
پیش دستی می کند بر نبضِ انساں تارِ برق

یہ کہہ کر مرزا صاحب نے تار کا جواب لکھا، اور دریافت فرمایا کہ یہ خبر سچ ہے یا غلط۔ بیگم صاحب نے کہا اگر یہ خبر سچ نکلی تو آج رت جگا کروں گی۔ لکھنؤ سا شہر ہوتا تو ڈومنیاں بُلواتے۔ گانا سُنتے۔ یہاں کی ڈومنیوں کو دُور ہی سے سلام ہے۔ نہ زبان دُرست، نہ قطع درست، وہ بات کہاں۔

مرزا صاحب نے کہا خدا کی قسم تم پر روز بروز جوبن آتا جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ میں تمہارا درم ناخرید غلام ہو گیا ہوں۔ اور خدا کے فضل سے تم سب بہنیں ایک سے ایک بڑھ کر ہو۔ حُسن آرا بیگم کے حسن وجمال کا کیا کہنا، سپہر آرا کی شوخی و دلرُبائی، بہار النسا کی کج ادائی و نزاکت، روح افزا کی رنگین بیانی اور حسنِ خداداد کا کیا کہنا۔ جو ہے نازک اندام، گلفام، مگر ہم کو سب میں تم ہی پسند ہو اور حُسن آرا پر آزاد لٹّو ہیں۔ آزاد کا نام زبان پر آیا تو بیگم صاحب کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ گورے گورے گالوں کی سُرخی اور بھی جھلکنے لگی۔ آہ سرد بھر کر کہا خدا جانے آزاد بیچارہ کہاں ہوگا۔ رہا ایسا محبّتی آدمی بھی کسی نے کم دیکھا ہوگا۔ خلیق، وعدے کا سچا، اور عالم وفاضل۔

مرزا :۔ ایک بات کہوں۔ بُرا نہ ماننا۔ کہوں یا نہ کہوں۔؟

بیگم :۔ ہاں ہاں کہو۔ برا ماننا کیا معنی۔ کیا گالیاں دو گے۔

مرزا :۔ اس کا کیا سبب ہے کہ جب آزاد کا نام آتا ہے تو تم ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہو کوئی وجہ ضرور ہے۔

بیگم :۔ اس بدگمانی کے قربان جیسے مردوے خود ہوتے ہیں، ہر دیگچی کا چمچہ، ویسا ہی اوروں کو بھی سمجھتے ہیں۔

نہ شاید ہوس باختن با گلی
کہ ہر بامداوش شود بلبلی

مرزا :۔ نہیں آخر سبب اس کا کیا ہے آزاد میں کیا خصوصیت ہے۔ ہم بھی سنیں۔

بیگم :۔ خصوصیت یہ ہے کہ ہماری پیاری بہن کے میاں ہیں۔

مرزا:۔ (مسکرا کر) خیر یہاں تک تو خیریت ہے کہ پیاری بہن کے میاں ہیں مگر۔

بیگم:۔ (تیکھی چتون سے) بس بس۔ اگر مگر رہنے دو۔

مرزا:۔ پیاری بہن کے میاں ہیں، یہاں تک تو ہرج نہیں۔

بیگم:۔ (مسکرا کر) بڑے بدگمان، اور لُطف یہ کہ بدگمان بھی نہیں مزاج ہی ہے۔ دل لگی مذاق میں کسی سے بند نہیں۔

مرزا:۔ نہیں ہم نہ مانیں گے۔ تم لاکھ ٹالو۔ اور کچھ نہیں تو یہی سہی کہ آزاد کا نام لے کر ٹھنڈی سانسیں کیوں بھرتی ہو۔

بیگم:۔ چلو بس ہنسی ہو چکی۔ یہ باتیں پاجیوں میں ہوتی ہیں۔ شریفوں میں ان کا ذکر تک نہیں ہوا کرتا۔ واہ وا واہ۔

مرزا:۔ اخباروں میں تو آزاد کی بڑی تعریف چھپی ہے۔

بیگم:۔ اور ہم سے ذکر بھی نہ کیا اب کے آئیں تو ہم تم ان کے ساتھ ہی ساتھ جائیں۔ اے وہ بونا مُوا فیبی ساتھ ہے یا کہیں مار ڈالا گیا ہے۔

مرزا:۔ اس کی تو بڑی تعریف چھپی ہے، وہ بھی وہاں لڑا۔

بیگم:۔ واہ بس یقین آ چکا ہمیں ٹینی مرغے کے برابر تو قد اور لڑیں گے رَن کی زمین میں۔

مرزا:۔ اخبار والا تو ایسا ہی لکھتا تھا، اب تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔ اِس کو ہم کیا کریں۔ آزاد کا حال۔ یہاں ایک ماسٹر ہیں۔ ان کو خوب معلوم ہے۔ ان کے پاس رُوم کے اخبار آیا کرتے ہیں۔

بیگم:۔ خدا کے لیے ان سے منگواؤ۔ اور ہمیں کچھ سُناؤ۔

مرزا:۔ پھر وہی بیتابی۔ پھر وہی بے چینی۔ اللہ اللہ سبب کیا ہے آخر کچھ تو بتاؤ۔

ماسٹر صاحب کے یہاں سے اخبار کا فائل آیا۔ مرزا صاحب نے بیوی کو دو تین مضمون سُنائے۔ کمال محظوظ ہوئیں، کہا تم بھی عجب بے فکرے ہو، اتنے دن ہوئے اور ہمیں ذرا اطلاع نہ دی۔ لے خدارا صاف صاف اور مفصّل حال بتاؤ۔ آزاد آج کل کہاں ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا یہ تو نہیں معلوم مگر سُنا کہ قید ہو گئے تھے پھر قید سے رہائی پائی۔ وہاں کوہ قاف کی ایک نوجوان عورت ان پر عاشق ہوئی۔ آزاد سے خواہش نکاح کی ظاہر کی۔ انہوں نے کہا ہم حُسن آرا بیگم سے وعدہ کر آئے ہیں۔ لہذا شادی قبول نہیں کر سکتے۔ اس پر وہ آگ ہو گئی۔

بیگم:۔ آزاد ایسا ہی خوش رو جوان ہے۔

مرزا:۔ کیا۔ تم بہت چل نکلی ہو صاحب۔؟

بیگم:۔ (مسکرا کر) عورتیں تو ہوتی ہی چالاک ہیں، مگر مردوں سے زیادہ بدگمان کوئی نہیں۔

مرزا:۔ آخر کسی غیر مرد کے حُسن کی تعریف کرنا کیا معنیٰ۔

باسا بہ ترا نمی پسندم
عشق ست و ہزار بدگمانے

مرزا صاحب نے ان کے دستِ رنگیں کا بوسہ لینا چاہا۔ مگر بیگم صاحب نے پکڑ کر ہاتھ جھٹک دیا، اور کہا جو ایسی بدگمانی ہے تو خدا حافظ، یہ بدگمانی تو دیوانہ پن ہے۔ اب کوئی کسی کا نام تک زبان نہ لائے۔ اے واہ۔ اچھی بدگمانی ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں، کہ دربان نے ڈیوڑھی میں آواز دی۔ مہری باہر آئی۔ اور ایک کاغذ محل سرا لے گئی۔

مرزا:۔ لو جواب آ گیا۔ مگر ہمیں سخت تعجب ہے کہ اس قدر جلد جواب کیوں کر آیا۔ یہ ماجرا کیا ہے۔

بیگم:۔ اے ہے اب بات بات میں تعجب ہونے لگا۔

مہری۔ حضور وہ رسید مانگتا ہے۔

مرزا۔ شکرِ خدا۔ ہزار ہزار شکر کی جگہ ہے بعض وقت کی بات اتنی سچی ہو جاتی ہے کہ وہ۔

بیگم۔ سچ ہے نہ۔ بتاؤ بتاؤ خدارا بتاؤ تو۔

مرزا۔ یہ وہاں سے نہیں آئی ہے۔ یہ تار برقی آزاد نے بھیجی ہے روم سے آئی ہے۔ شکرِ خدا شکرِ خدا۔

بیگم۔ بیقرار ہو کے ہنسی مذاق کا یہ موقع نہیں ہے۔ تمہیں کلام اللہ کی قسم سچ سچ بتاؤ۔

مرزا۔ (سر پہ ہاتھ رکھ کر) اس سر کی قسم آزاد کے پاس سے آئی ہے۔ لکھا ہے کہ میں آج یہاں سے روانہ ہوا۔

بیگم۔ تم انگریزی کیا جانو۔ ابھی کل تو شروع کی ہے۔ کسی اور سے پڑھواؤ تو ہمیں تشفی ہو۔ مہری۔ باقر کو دو اور کہو کہیں سے پڑھوا لائے۔

مرزا۔ اب یہ بدگمانی نہیں تو کیا ہے۔

بیگم۔ ان کی بلا سے بدگمانی ہی سہی۔ بس۔

تھوڑی دیر کے بعد باقر نے مہری کو بلا کر کہا۔ کہدو۔ کہ محمد آزاد نے روم سے تار دیا ہے کہ ہم یہاں سے روانہ ہوئے۔ راہ میں کہیں قیام کریں گے۔ یہ فقرہ سنتے ہی بیگم صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ کہا یا خدا اسی طرح وہاں سے بھی تار آ جائے تو خوب بات ہے۔ دو دو خوشیاں ہوں۔

ادھر یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ مولانا عبد القدوس صاحب مرزا صاحب کے دولت خانے پر تشریف لائے۔ مرزا صاحب کو اطلاع ہوئی۔ کمرے میں آئے۔ مصافحہ کیا مولانا صاحب کو تعظیم و تکریم کے ساتھ بٹھایا۔

مولانا صاحب بعد مصافحہ یوں زمزمہ سنج بیان ہوئے الحمد للہ کہ آج حضرت مولانا محمد آزاد صاحب کا

تار اس رُو خلائق بے ننگ نام کے پاس آیا کہ مولانائے ممدوح جو محض بقصد اذخار مثوبات اخرویہ عازمِ رُوم ہوئے تھے۔ مع الخیر والعافیت روانۂ وطن ہوئے۔ ان صاحب نے مرز بوم روم میں وہ نام حاصل کیا کہ ایک عالم مداح ہے۔ اور ان کی شجاعت کے ساتھ ہی ان کے حلم کی بھی لوگ بدرجۂ غایت توصیف کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ کریں ؎

انسان کو حلم فائدہ دیتا ہے　　آئینۂ عقل کو جِلا دیتا ہے
دنیا میں جو عزت ہے تو عقبیٰ میں بہشت　　یہ دونوں جہان میں مرتبہ دیتا ہے

مرزا صاحب نے کہا جی ہاں میرے پاس بھی تار آیا۔ اکثر اخبار آزاد کے مداح ہیں۔ وہ اسی تعریف کے قابل ہیں۔

مولانا۔ بدرجہ اتم عذب البیان اور رُطب اللسان ہیں۔

مرزا۔ انسان میں جو جو باتیں ہونی چاہییں، وہ سب اس میں موجود ہیں۔

مولانا۔ ملکوتی صفات آدمی ہے۔ انسان کیا معنی!

مرزا۔ بیشک فرشتہ صفت آدمی ہے۔ ؎

جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی صفات کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹّی خراب کی

مولانا۔ ہم اس کلمے کو کسی قدر سمجھتے ہیں۔ اس کا جو فعل ہے خالی از حکمت نہیں۔ انسان بنائے چاہے مَلک۔

خیمہ برپا کن سپہر بلند　　آسماں ساز اور زمیں پیوند
نقش پرداز کارگاہِ بدن　　کاتب نسخۂ زمین و زمن

تو نے برپا کئے ہیں یہ افلاک
خاک کو تو نے دی ہے صورتِ پاک

مرزا۔ حضور کے واسطے حُقّہ منگواؤں۔

مولانا۔ کیوں تکلیف فرمائیے گا۔ چنداں عادی نہیں ہوں۔

مرزا۔ حقہ بھر لاؤ (مولانا سے) آپ کی آزاد پاشا سے کہا جائے کہ ایک لکچر دیں۔ اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ اور اس لکچر میں روم کے انتظام کی کیفیت بیان کریں، کہ انتظامِ سلطنت اور نظم و نسقِ مملکت قابلِ پسند ہے یا نہیں۔ سننے کے لائق ہوگا۔

مولانا۔ ع۔　　باطل ست انچہ مدّعی گوید

روس اگر بدنظمیِ دولت رفیعہ کا شاکی ہے تو غلط ہے۔ انتظام روم میں جائے دم زدن نہیں ہے۔ اب یہ معلوم ہو جائے گا۔ مولانا عبدالقدوس صاحب رخصت ہوئے۔ اور آدھ گھنٹے کے بعد جواب تار آیا۔ جس کے الفاظ درج ذیل ہیں' ہمایوں فر زندہ ہیں۔ سپہر آرا۔ نے گویا از سرِ نو زندگی پائی۔ یہاں سب کو حیرت ہے۔ تم کو مبارک ہو۔

مرزا۔ لو جواب باصواب آیا۔ شکرِ خدا ہزار شکرِ خدا۔

بیگم۔ پڑھو تو پڑھو تو۔ خبر صحیح تو ہے' پہلے اتنا تو بتاؤ۔

مرزا۔ سُن لو۔ ہمایوں فر زندہ ہو گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے۔ سپہر آرا نے بھی گویا نئے سرے سے زندگی پائی۔ خدا نے سُن لی' یہاں سب لوگوں کو حیرت ہے' کہ یہ کیونکر زندہ ہوئے۔ تم کو مبارک ہو۔

بیگم۔ (خوش ہو کر) اللہ نے ہماری سُن لی۔

مرزا۔ کسی کی دعا بے اثر نہیں جاتی۔

تو گفتی ہر آنکس کہ در رنج باب
دعائے کند من کنم مُستجاب

بیگم۔ پھر تار بھیجو' لکھو یہاں جس نے یہ خبر سُنی وہ جامے میں پھولے نہیں سمایا۔ خدا تم کو سب کو مبارک کرے۔ اور ہمایوں فر کی تصویر کھنچوا کر ہمارے پاس بہت جلد بھیجدو۔ مگر دولھا بنے ہوں۔ خلعت اور جیغہ' اور سرپیچ سب ہو۔ ہم پھر ان کو اس طرح دیکھنا چاہتے ہیں۔

مرزا صاحب نے ایک لائق انگریزی خواں سے تار کا مضمون لکھوایا اور اسی دم تار گھر بھیجا۔

ادھر کی تو یہ کیفیت تھی اب اُدھر کا حال سُنیئے کہ حُسن آرا کے ہاں بھی آزاد کا تار آیا۔ پیر مرد نے چپکے سے تار کا حال سُنایا تو اُس مژدۂ طرب انگیز نے اس کے دل کے ساتھ وہ کیا جو نسیمِ سحری۔ غنچوں کے ساتھ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دو چار مقاموں پر تار آئے کہ آزاد پاشا رُوم سے بعد فتحیابی روانہ ہوئے۔

حسن آرا بیگم نے روح افزا کے کان میں کہا' بہن روم سے تار آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ آزاد پاشا قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے۔ اور بہت جلد ہندوستان میں داخل ہونے والے ہیں۔ روح افزا ان کو گلے لگا کر بولیں۔ مبارک ہو۔

سپہر آرا کو بھی اطلاع دو کہ ہم جا کے اماں جان سے کہتے ہیں کہ آزاد آئے داخل ہیں۔

تخت کی رات شہزادہ فلک منظر اور عروسِ پری پیکر کی ملاقات

بیا ساقی آئین جم تازہ کن ۔۔۔ طراز بساطِ کرم تازہ کن
بہ پرویز از مے ورودے پرست ۔۔۔ بہ بہرام از نے سرودے فرست
بہ دور پیاپے بہ پیمائے مے ۔۔۔ بشور ذمادم بفرسائے نے

نکبسا دماں را بر آمشش درار
سہی سرو را در خرامش در آر

یوں تو عروسِ ماہ سیما سپہر آرا کا جوبن سادگی میں بھی لطف خداداد دکھاتا تھا۔ مگر آج تو جوبن خود اس قمر رخسار کے جوبن کی بلائیں لیتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو تخت کی رات ہے۔ کون رات جو رشک لیلۃ القدر ہے اور غیرت لیلۃ البدر ہے ؎

شبے دیدہ روشن کنِ دل فروز ۔۔۔ ز اجزائے خود سرمۂ چشم روز
بروشندلی مایہ اندوز بُود ۔۔۔ چنیں شب مگر بہر یک روز بود
رخ جلوہ گر در پرِ ند سیاہ ۔۔۔ چو از مردمک جوشش نورِ نگاہ

نگویم شبے ماہ وش دلبری
خور از زیور پیکرش گوہری

کئی مشاطگانِ چابکدست و نادرہ فن اس غرض سے بصرفِ زرِ کثیر بلوائیں گئیں تھیں، کہ دلھن کو ہر ہفت آرایش سے مزین کریں۔ گیسوئے عنبر بو، اس طرح سنوارے تھے کہ کالی ناگن کو ڈستے تو ہم اُتارے سے نہ اُترتا۔ رخِ زیبا دیکھ کر حوزانِ بہشتی بوسہ لینے کی آرزو رکھتیں، اور ایک بوسہ شکر آمیز و جان پرور، کی قیمت روضۂ رضوان لگاتیں، تاہم حسرت ہی لے کے جاتیں اور یہ شعر زبان پر لاتیں۔ ؎

زاں لب شکر بوسۂ غبغب دگراں شد
در طالعِ ما تلخی دشنام نوشتند

ہاتھوں کی مہندی رنگین ادا معشوقاں کو خون رولاتی، دستِ نازک کی نزاکت دیکھ کر ناز کی شرما جاتی حنائی انگلیوں میں بیش بہا انگوٹھیاں، اور گوری گوری کلائی میں کالی کالی چوڑیاں، اور جڑاؤ کڑے، شیر دہان پیارے پیارے کانوں میں بجلیاں، اور اندیاں، زلفِ شبرنگ میں چھپکے کی جھلک، جیسے اندھیری رات میں کرمکِ شب تاب کی چمک۔ از سر تا پا جوش، نور رشک پری، غیرتِ حور، قیامتِ صغری، دوش بدوش۔ آفتِ جان غارتِ ہوش۔

نسرین بدن، نسرین بناگوش تھی

الماس نثرادٔ غمزهٔ اشس تیز | هم دشنه فسان وهم نمکریز
محبوبهٔ ملک ناشکیباں | اعجوبهٔ شهر دل فریباں
نازک بدنے چنانکه دانی | درگرده بگوشش او گردانی
شیریں نمکی فریب صدکام | درپسته نهفته مغز بادام

در مستی نرگس سیاهش
صد میکده ریزهٔ نگاهش

اس درجہ وفورِ حسنِ گلو سوز، وجمالِ عالم افروز، تھا کہ آئینہ میں صورتِ زیبا اور چہرۂ رعنا، دیکھ کر ایک ہمسن پیش خدمت سے جو میکے سے ساتھ آئی تھی کہا۔ عمدہ خانم! تمہیں ایمان کی قسم، سچ کہنا ایسی شکل وصورت تم نے کسی بیگم کی دیکھی ہے۔ اس نے کہا واری جاؤں، بیوی آنکھوں کی قسم کھاکے کہتی ہوں آنکھوں سے زیادہ کوئی پیارا نہیں ہوتا۔ یوں خوبصورت اور نام خدا کم سن تو حضور ہیں ہی۔ مگر سچ عرض کرتی ہوں اُس وقت عالم ہی اور ہے۔ شہزادۂ بہادر (توبہ توبہ) سجدہ کریں عجب نہیں ہے۔ جس وقت حضور شہ نشین سے باہر کے دالان میں چل کے بیٹھیں گی دیکھئے گا عورتیں کیا کہتی ہیں۔ مکھڑے کے آگے چاند ماند ہے، اور اس گورے گورے مکھڑے پر گیسوؤں نے اور بھی جوبن کی آگ کو بھڑکا دیا ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ مشاطہ اور خواصیں بولیں (آمین)

سپہر آرا نے کہا ہم کچھ غرور کی راہ سے نہیں کہتے۔ اللہ جانتا ہے آج ہمیں اپنی صورت روز سے کہیں اچھی نظر آتی ہے۔ یا شاید آنکھیں دھوکا دیتی ہوں۔ خواص بولی حضور ہرگز نہیں۔ آج ان دونوں نے اپنی کاریگری دکھادی۔ نواب صاحب سے انعام لیں گی چاند میں داغ ہے۔ حضور میں داغ نہیں۔

سپہر۔ آج وہ بھی بہت نکھر کے آئیں گے ہے کہ نہیں۔

خواص۔ ہاں حضور، اور وہ تو روز ہی نکھرے رہتے ہیں۔

سپہر۔ ماشاء اللہ سے خوش رُو، اور کڑیل ڈھلنے کے گبرو ہیں۔

خواص۔ ہاں اس میں کیا شک۔ جو عورت دیکھتی ہے گھنٹوں دیکھا کرتی ہے۔ اول تو شہزادے۔ شہزادگی کا رُعب کہاں جائے دوسرے قبول صورت، تیسرے ابھی سبزہ کا آغاز بھی نہیں۔ مَیں بھی اچھی طرح نہیں جھیکی ہیں، اور ہاتھ پاؤں ماشاء اللہ سے اچھے ہیں۔ پھر آرام کتنا ہے۔ کسی بات کی خدا کے فضل سے کمی نہیں مگر پاس پھٹکنے نہیں پاتی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ حضور بعض بات کہنے کی نہیں ہوتی، وہ جو میرے مکان پاس

پڑوس ڈومنی رہتی ہے۔ (محبوبہ ابھی کم سن ہے۔ کوئی برسیں پندرہ ایک کی ہوگی۔ اک شہزادہ ہیں ادھر امام باڑہ کے پاس رہتے ہیں: بھلا سا نام ہے۔ اس وقت بھولی جاتی ہوں خیر۔ وہ دو سو روپیہ مہینا دیتے تھے کہ رات کو ایک دفعہ تمہارا مجرا ہوگا، مگر اس نے نہ مانا اتنا غرور ہے بڑی ٹن کی عورت ہے۔ مگر جہاں ان کو دیکھا بیقرار ہو ہو جاتی ہے۔ اس وقت محبوبہ کا تن اور بل سب نکل جاتا۔ اور شہزادے کو چاہتی ہے دیکھئے تو تعجب ہوا کہ ایسی مغرور عورت اور اس قدر ریجھی ہوئی۔ مگر حُسن کا اثر ہے۔ اگر مرزا ہمایوں فر یاد فرمائیں تو کوئی پانوں سے آتا ہے وہ سر کے بل آئے۔ مگر اُن میں ایک یہی وصف ہے کہ بد وضع کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ یہ اٹھتی جوانی یہ شباب، یہ حُسن، اور اللہ دیا سب کچھ پاس۔ زر و زیور، اِملاک، جواہرات، اور پھر خود سر، مگر مجال کیا کہ ان کی صحبت میں کبھی ایسی ویسی کو کوئی دیکھ لے۔ انھوں نے شہزادی بیگم سے کہہ دیا تھا (اپنی ماں سے) کہ اماں جان ہم اپنی شادی اپنی رائے سے کریں گے۔ سو وہی ہوا' اور ایسے میاں کے لیے ایسی ہی بیوی چاہیئے تھی! اللہ جوڑا برقرار رکھے۔ بحق رسول و آلِ رسول۔'

جب مشاطگانِ کاملِ فن، سلیقہ شعار دلھن کو سنوار چکیں اور سپہر آرا بیگم چھم چھم کرتی، ناز و ادا سے قدم دھرتی ہوئیں اُس کمرے میں تشریف لائیں۔ جہاں ان کی سسرال کی مخدرات بیٹھی تھیں۔ خورشیدی بیگم، اور نواب بیگم نے بھاوج کو از سرتا پا دیکھا۔ تو خوش ہوئیں کہ بھائی نے اچھی بیوی پائی۔ ایک شوخ طرح نوجوان نے کہا کہ اگر اندھیر کمرے میں ان کو اس وقت بٹھا دو تو روشن ہو جاوے۔ چاہے جیسا ہی گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوئے، ان کا مکھڑا جھلکنے لگے۔ اور زناریکی زائل ہو جائے۔ سپہر آرا نے فرطِ حلم اور حیا سے گردن نیچی کر لی تو اس شوخ طبع نے کہا آج کوئی ہمایوں فر کے دل سے پوچھے۔ خورشیدی بیگم کے آنسو بھر آئے۔ کہا بہن بڑی بڑی مصیبتوں کے بعد آج خدا نے یہ دن دکھایا ہے۔ اس کی کس کو امید تھی، مگر اللہ بڑا رحیم ہے۔ اس کی کارسازی کے صدقے۔ ہماری سُن لی۔ جس طرح ہماری سُنی، اللہ کرے سب کی سُن لے۔ ساتویں دشمن کو وہ وقت نہ دکھائے۔ نواب بیگم نے اشارہ کیا کہ اب یہ باتیں نہ کرو۔ ایک مُغلانی بولی۔ جو ہوا وہ ہوا۔ انجام تو اچھا ہوا۔ ان کو دلھن کی طرف اشارہ کرکے) اس گھر میں آنا تھا۔ چرخ لاکھ بدی پر ہو، جب خدا اپنی مدد پر ہے۔ تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ شہزادی بیگم نے مہری کو حکم دیا کہ نواب دولھا (نواب بیگم کے میاں) سے جا کے کہو کہ شاہ جی صاحب سے اس قدر اور دریافت کر لیں کہ اگر آج ڈومنیاں گائیں تو کچھ ہرج تو نہیں ہے، مہری نے باہر جا کر عرض کیا۔ نواب صاحب نے شاہ صاحب سے دریافت کیا۔ حکم ہوا کہ مُطلق ضرورت نہیں ہے، ڈومنیوں نے یہ خبر سُنکر شاہ صاحب کو دل میں کوسا' کہ اچھے آئے۔ ہمارا ہی گلا کاٹا۔ مگر ہمارا صبر ضرور پڑے گا۔ گانا بند، ناچنا موقوف ہو گیا۔ ڈومنیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ کیا کرتیں مجبور تھیں۔ اب سُنیے کہ اُدھر چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا، اور مہتاب

عالمتاب نے جلوۂ جہاں آرا دکھایا۔ ادھر میاں بیوی کے وصل کا وقت آیا۔ شہزادۂ فلک منظر عطر جان پرور سے بسے ہوئے۔ بحرِ جوشِ طغیانی پر تھا۔ مستی اور صنم پرستی کا حال کچھ نہ پوچھیے، طبیعت کی امنگ اور دل کے ولولہ کی انتہا ہی نہ تھی۔ بے پیئے نشہ جم گیا۔ بیخودی کا عالم تھا۔ شوق کی افزونی کا کیا کہنا۔ تمام محلے میں جسم و لباس کی خوشبو سے روح پرور بلند تھی۔

الغرض۔ دُلھن کو کمرے میں پلنگ پر بٹھادیا۔ دُولھا کی عزیز مُسن عورتیں ہمراہ گئی تھیں۔ دولھا کو کمسن عورتوں نے بہت چھیڑا تھا۔ ان میں دو چار دولھا کی عزیز تھیں، دو چار غیر تھیں۔ دولھا سے اِن کم سِنوں نے کہہ دیا تھا کہ ذری خبردار رہیئے گا۔ تاک جھانک ضرور ہوگی۔ انھوں نے کہا خیر۔ کیا مضائقہ ہے۔ شوق سے خوب دل کھول کے، تاک جھانک لیجئے۔ دُلھن کی ایک ہمجولی، عروس کی والدہ سے اصرار کرکے ہمراہ عروس آئی تھی۔ اس سے دولھا کی عزیزوں نے دن بھر چہل کی، وہ اکیلی پڑ گئی۔ گو وہ بھی طبیعت کی تیز تھی، مگر ان سب سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوگیا۔ ہاں اگر جانی بیگم یا نازک ادا بیگم، ساتھ جائیں تو ہزاروں میں بند نہ ہوتیں۔ جب دُلھن کو مسن عورتوں نے پلنگ پر بٹھایا، تو دولھا کو بُلوایا۔ دُلھن نے پانی پینے کو مانگا دُولھا نے پانی مانگا اور مسکرا کر کہا خدا کرے میں مثل پانی کے تم سے برتاؤ کروں۔ دُلھن کو اس پر ہنسی آئی۔ مگر ہنسنے کا وہ کون سا موقع تھا ضبط کی۔

جب عقد کی ان کے ساعت آئی	اور رشتوں میں ایک گرہ لگائی
یکجا کیے وہ عروس و داماد	وہ شیر دل اور یہ پریزاد
حیرت نے آئینہ دکھایا	شربت دیدار نے پلایا
زلفیں ہوئیں چہرے کی بلا چیں	تو بادہ نگاہیں سحر آگیں
جوڑی جو ملی بنے بنی کی	سنگت ہوئی راگ راگنی کی

زیبا تھا بنے بنی کا جوڑا
یکجا دولھا دُلھن کو چھوڑا

اِدھر تو نوشاہ کج کلاہ، اُدھر عروس غیرتِ ماہ، دولھا قمر رخسار، دُلھن گلعذار، وہ شیر دل شیر مرد، یہ نزاکت و حُسن میں فرد، وہ سرو دانِ گلشنِ برنائی، یہ گلبن نارستہ گلزار زیبائی، وہ سرو صنوبر خرام، یہ گلبدن گل اندام وہ خورشید منظر شگفتہ رخسار، یہ رشکِ قمر باغ و بہار، یہ بے قرار و بیتاب، اِدھر مانع وصل شرم و حجاب، اِدھر لب پر محبت کی تقریر۔ ادھر حیا دامن گیر، ادھر اصرار، ادھر انکار، ادھر شوق بوسہ سیراب، ادھر ہول و اضطراب، اور ہ

اس طرف تو وفور خواہش دل
پردۂ شرم تھا ادھر حائل
شوق کہتا تھا اب حجاب ہے کیا
شرم مانع کہ اضطراب ہے کیا

شہزادہ۔ اب یہ حیا کس کی اور یہ حجاب کیسا۔ اور خوف کس کا۔

سپہر۔ (لجاکر) کچھ خبر ہے۔ سیدھی سیدھی باتیں کرو۔ میری جان کے دشمن ہوئے تھے، وہ تو کہو ان شاہ صاحب کا خدا بھلا کرے، اللہ کرے جو آرزو ان کے دل میں ہو وہ پوری ہو جائے۔ بڑے گاڑھے وقت آڑے آئے۔ ورنہ اب تک خدا جانے ہمارا کیا حال ہوتا۔

شہزادہ۔ جان من۔ خدارا اس قسم کی گفتگو نہ کرنا، ورنہ میرے اور تمہارے دونوں کے لیے بُرا اور دونوں کے حق میں مُضر ہے اتنا یاد رکھنا۔

سپہر۔ اچھا مانا۔ مگر کل سے باغ میں چل کے رہو۔

شہزادہ۔ اس میں کچھ قباحت نہیں، جو کہو حاضر ہوں۔ اور خصوصاً اس وقت۔ سمجھیں اس وقت کی خصوصیت کیوں کی بولو۔

سپہر۔ (شرماکر) اللہ جانے میں ایسی باتیں نہیں سمجھتی۔

شہزادہ۔ اے ہے سچ کہو۔ کیوں نہیں۔ میں خوب جانتا ہوں۔ کہ حضور بالکل ناسمجھ ہیں۔ ہمایوں مالی تک سے تو باتیں کر چکی ہو، اور ہم سے کہتی ہو میں نہیں سمجھتی۔ بجا۔

سپہر۔ (مسکراکر) چہ خوش۔ ایک تو ہم نے احسان کیا اس کا شکریہ ادا کرنا درکنار، اور اُلٹے ہم کو شرماتے ہو، اب احسان فراموش ہوئے یا نہیں، بندگی۔

شہزادہ۔ اور مہتابی پر سے گھورا کرتی تھیں۔ کیوں صاحب۔

سپہر۔ (شہزادہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) اچھا پھر کیوں شادی کی۔ جانتے تو تھے کہ مہتابی پر سے گھورا کرتی ہے کسی نے زبردستی کی تھی۔

شہزادہ۔ ہاں ہمارے دل نے۔ اوّوہ مجھے خوب یاد آیا ہے وہ، جب عاشق النسا بیگم بن کر میں تمہارے ہاں گیا تھا اور گلے ملا تھا

سپہر۔ بھلا یہ کون بھل منسئی تھی جی، کیوں صاحب آخر بتاؤ یہ کون بھل منسئی تھی۔ ایک تو شرماتے نہیں اوپر سے ہنستے ہو۔ واہ وا واہ ماشاءاللہ۔

شہزادہ۔ اور وہ پتنگ یاد ہے۔ جس پر ایک شعر لکھا تھا۔
سپہر۔ بھولتے کوئی اور ہوں گے، مگر اللہ جانتا ہے تم نے بڑی بڑی شرارتیں کی تھیں۔ اتنے بڑے شاہزادے اور ڈھٹائی کی باتیں۔ یہی شعر تھا نہ۔ ؎

از عاشقانِ صادقت اے دلستان منم
اول کسیکہ بر تو خدا شد ز جان منم

شہزادہ۔ ہاں (مسکرا کر) خیر۔ پھر ان باتوں کا تو یہ نتیجہ نکلا کہ ہم تم آج اس وقت یہاں بیٹھے ہیں۔ اپنا مطلب تو حاصل ہو گیا۔ ایک مرتبہ تو عباسی کو رشوت دیکر یہ شعر لکھ بھیجا تھا۔

برامید وعدۂ شب درمیانِ زلفِ او
روزگاری شد کہ دو از گیسو امیر دد!

اُس بیوقوف نے بڑی بیگم صاحب کو دیدیا، وہ کچھ سمجھیں نہیں خیر آئی گئی بات ہو گئی ورنہ بڑی رسوائی ہوتی۔ خدا نے بچایا۔
سپہر:۔ آخاہ۔ آپ کو اس کا خیال ہے۔ خیر بڑی بات اتنے میں زلفِ عنبر یار کے رائحہ مشکیں نے دونوں کو ایسا مست کیا۔

وا اند بدست یکد گر دست — گشتند بجام وصل سرمست
مژگان بہزار غمزہ آمیخت — ابرو بہزار عشق آویخت
شد دور دو آرزو پیاپی — ابرو نگہہ پیالہ و می
نزاک ادب ز دست دل شد — یکران ہوس عنان گسل شد
ناہید بماہ شد ہم آغوش — گلدستہ ستارہ بردوش
یک چند دراں کرشمہ سازی — کردند دو غنچہ بوسہ بازی

گشتند بجلوہائے گستاخ
پیچیدہ دو نخل شاخ در شاخ

بعد مدت یہ نوبت آئی۔ شبِ وصل نے صورت دکھائی۔ بنے نے بنی کو پیار کیا۔ دُولھا دُلھن سے ملا۔ عروس زہرہ جبین، زینتِ آغوش، دین و دنیا کا غم فراموش ہے۔ شادمانی و کامرانی کا وقت ہے۔ ایک نو دولھا جوان گلبدن۔ دوسرے عروس نوخیز شاخ سمن۔

اور سامان وہ قیامت کا — وہ نکھار اس پری کی آفت کا

وہ شبِ عیش دل ملولوں کی　　　وہ مسہری پہ سیج پھولوں کی

گرم اُس مُنھ سے ہالۂ آغوش　　　وہ لبوں سے بہم لبِ مے نوش

الغرض۔ سہ

مستانہ ملا دُلھن سے دولھا
صحبت ہوئی دخترِ رز سے دل خواہ

شہزادۂ رشکِ سنجر، سکندر فر شاہد آرزو سے ہم آغوش ہوئے اور عروس حور پیکر کی دل کی کلی کھلی تو میٹھی میٹھی باتیں ہونے لگیں۔
شہزادہ۔ ع۔

آنچہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

سپہر۔ مجھے بھی یہی حیرت ہے۔ یا خدا ایسا تو کبھی اور نہ ہوا ہوگا۔
شہزادہ۔ اب اس کا ذکر ہی نہ کرو دلِ لبِ شیریں کا بوسہ لیکر اگذشتہ راصلواۃ۔ اب تو صنم عشرت سے ہمکنار ہیں۔ مضیٰ مامضیٰ۔
سپہر۔ (ہنسکر) نواب مجھے ایک لغت بھی یہاں رکھنا پڑے گا۔
شہزادہ۔ (ہنستے ہوئے) مطلب یہ کہ جو ہوا وہ ہوا۔ مضٰی ما مضٰی۔
سپہر۔ جس وقت میں گھوڑے پر سوار ہو کر کسی کے مزار پر گئی ہوں، اُفوہ عجب حال دل تھا۔ میں کچھ بیان کر نہیں سکتی ہوں اور کان میں یہی آواز آتی تھی۔

سوار توسن نازست و بر حالم گذر دارد
ببال اے آرزو چنداں کہ در بانے کابش را

شہزادہ۔ اُف۔ اُف۔ اُف۔ از برائے خدا۔ آج کی شب تو ان باتوں کا ذکر نہ کر رکھو۔ یہ کیسا ستم ڈھاتی ہو، خدا کا واسطہ اب خاموش رہو، پچھلے کے وقت دونوں کی آنکھ لگ گئی

بر بستر لالہ مست خفتند
از نکہت گل فسانہ گفتند

یہ شب بھی یادگار تھی۔ روز عید سے زیادہ مسرت بار تھی۔ بقول حضرت تجلی۔ ساغر لب تشنگان خار حرماں از فروغ کوکبش بادۂ فیض در جام۔ طوطیانِ ارواح را در شگفتہ زار مہتابش چاشنی شیر و شکر

درکام۔ اس کلام کی مصداق تھی۔ ؎

مہتاب شگوفۂ چمن خیز

سیارہ پیالہ مطرب ریز

نور کے تڑکے عروسِ رنگیں ادا و مہ لقا سپہر آرا۔

جاگے مُرغِ سحر بیکل سے

اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

دیکھا کہ سپیدۂ صبح نمودار ہونے کو ہے، گھبرا کر اٹھی۔ تو شہزادے کی آنکھ بھی کھل گئی۔ دلھن کو گلے لگایا لب شیریں و رخسار و رخسار رنگین کے بوسے لیے۔ کچھ دیر تک ہم آغوشی اور گرمجوشی رہی اس کے بعد۔ ؎

چوں از دم باد نو بہاری	گل بر سر شعلہ زد عماری
بر دست صبا نگار بستند	پیرایۂ نو بہار بستند
دوران بہار رنگ و بو داد	گلدستہ بدست آرزو داد

سیراب ہوا چو مغز دانا

دورانِ چو مزاج دلِ توانا

دولھا زنانے مکان سے باہر آئے خدام با ادب، آداب بجالائے۔ ان کے تین دوست مرزا صاحب، نواب رونق الدولہ اور نواب مبارک الدولہ بہادر تشریف لائے، اور ان کو دیکھ کر مسکرائے۔ گاڑی سے اُترے صاحب سلامت ہوئی۔

مُبارک الدولہ۔ آج بندگی کا جواب کاہے کو دیں گے بھلا۔

شہزادہ۔ ہے تو ایسا ہی اس میں کچھ شک نہیں ہے۔

رونق الدولہ۔ مسکراتے ہوئے، خانہ زاد بھی بہت جھک کے مُجرا عرض کرتا ہے۔

شہزادہ۔ دور باش۔ ادب۔ کوئی ہے۔ کسی کو نہ آنے دو۔

رونق الدولہ۔ یا الٰہی۔

ہمارا نام سن کر ہاتھ وہ کانوں پر دھرتے ہیں

شہزادہ۔ ہمارا دماغ مت پریشان کرو صاحب۔ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ کل ہم سب باتوں کو موقوف کر دیں گے ہر کس و ناکس کو آنے دیتے ہیں، ہمارا مرتبہ نہیں پہچانتے سب کی شامت آگئی ہے (مسکرا کر) تم لوگوں کو کس نے آنے دیا۔ خبردار آیندہ ایسی بے ادبی نہ ہونے پائے۔

رونق الدولہ۔ حضور تو اس وقت سب کو برطرف کرنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ حضور کے خانہ زاد غلام کے تلام کے چلام کے ہیں۔

شہزادہ۔ ہم خوشامد کی بات نہیں سُننا چاہتے۔ برطرف۔

مرزا صاحب۔ کہیے حضور سرگذشت کہیے بخیر گذشت۔

شہزادہ۔ معقول! سرگذشت کیسی۔ یار یہ رسم سخت خراب ہے۔ کہ عورتیں دق کرتی ہیں۔ تاک جھانک بس ستم ہے۔ واللہ عین کربال میں غلّہ لگانا جو مشہور ہے وہ یہی ہے۔ اور سُنیے دواجی نے ناک میں دم کر دیا، وہ جو ہمراہ تشریف لائی ہیں۔ بی بی مبارک، اور ان کی ایک ہجولی بھی آئی ہیں۔ مگر چنداں شوخ نہیں ہے۔ ارے یار یہ نازک ادا بیگم کون ہے اس کی ٹوہ لگاؤ۔

رونق الدولہ۔ میں واقف ہوں۔ انتہا کی شوخ طبع بڑی ٹھٹھول ہے۔ مگر پاکباز پاکدامن۔ عفیفہ۔ اس طبیعت کی عورت ہی نہیں دیکھی۔ پہلے مجھے تھے دھوکا ہوا تھا۔ کہ رنگین طبع ہیں، اور کسی قدر اُدماتی مگر۔ ؏

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

ہماری رائے صحیح نہ تھی۔

شہزادہ۔ حضرت ہمیں یقین نہیں آتا۔ واللہ میں نہ مانوں گا۔

مبارک الدولہ۔ لاحول ولاقوۃ۔ اب آپ کو ان امور کی طرف نہیں متوجہ ہونا چاہیے اوّل تو کسی کی بہو بیٹی کا ذکر کرنا انسانیت کے خلاف ہے، آپ شہزادے ہیں۔ آپ میں بادشاہوں کی خو بو چاہیے۔ دوسرے کسی عفیفہ پر خواہ مخواہ شک کرنا چہ معنیٰ دارد۔ اور اب تو حضور نے تائید ایزدی سے پیاری سی دلھن پائی ہے شہر میں کیا معنیٰ دور دور تک اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔ اب ان خیالات سے درگذر ئیے۔

شہزادہ۔ کہتے تو سچ ہو۔ انسان سے اس دنیائے دُوں میں اگر افعال نیک نہ ہو سکیں تو بدی کی طرف بھی تو نہ مائل ہو۔ اور پھر گناہ بے لذت۔ نازک ادا کا ذکر کر کے اگر دل بدی کی طرف مائل ہو اور نفس اَمّارہ طبیعت پر غالب آیا تو بخیر گناہ بے لذت کے اور کیا ہے۔ خصوصاً ہمارے مزاج کے آدمی کو جو آج تک اس قسم کے گناہوں سے بُری ہے پھر زبانی داخلہ کر کے داخل معصیت ہونا یعنی چہ۔ حق یہ ہے جو لوگ صوم وصلوٰۃ اور شرع کے پابند ہیں وہ بہت خوش رہتے ہیں۔ اور جو حضرات افعال قبیحہ کے مرتکب ہوتے ہیں وہ اسی دنیا میں انواع واقسام کی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ کس کا بد پھوٹ نکلتا ہے۔ کوئی مرضِ مبارک میں گرفتار ہوتا ہے۔ کوئی عوام اور ہچشموں کی نظروں گر جاتا ہے۔ ہم نے آج تک نہیں دیکھا کہ کسی وضعدار یا سچے مولوی یا عالم کو کسی نے نظرِ حقارت سے دیکھا ہو، مگر خرابی یہ ہے کہ اب جو لوگ

عیاشی کرتے ہیں۔ اُن کا مردوں میں شمار ہے۔ اور جو اس گناہ سے محترز ہیں وہ بے چارے نظروں سے گرے ہوئے ہیں کوئی کہتا ہے اجی حضرت پارسائی تو بخیر حقیقت یہ ہے کہ جامہ ندارم، دامن از کجا آرام۔ کوئی کہتا ہے یہ روکھے پھیکے ان کو ان باتوں سے کیا واسطہ یہ گھر ہی میں دن رات گھسے رہتے ہیں، ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ جو علماء عام اس سے کہ ہندو ہوں یا مسلمان، بنتے زیادہ ہیں ان کو بھی لوگ پسند نہیں کرتے۔ اور قُل آعوذی کہلاتے ہیں۔ نواب مبارک الدولہ بہادر گو خوش مزاج، خوش مذاق، خوش خو آدمی تھے۔ مگر منہیات و معصیات سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کی نصیحت نے شہزادے کے دل پر بڑا اثر کیا۔ نواب صاحب نے سمجھایا کہ حضور جب خداوند کریم نے آپ کو اس قدر مہ پارہ اور پری چہرہ بیوی کا میاں بنایا اور ون کو گھورنا اور گرہستنوں کو بہو بیٹیوں پر عاشق ہونا اور رکھنا کفرانِ نعمت ہے۔ میاں کو بیوی کا خیال چاہیے بیوی کو میاں کا، زید کبھی نہ چاہے گا کہ اس کی بیوی بکر سے آشنائی کرے۔ خالد اگر سُن پائے کہ اس کی جورو پر عمرو کی نظرِ بد پڑتی ہے، تو عمرو کا دشمن ہو جائے۔ جب مردوں کے دل میں اس قدر خیال ہے کہ بیوی پاک دامن رہے، تو وجہ کیا کہ عورتوں کے دل میں یہ خیال نہ ہو کہ مرد پاک دامن نہ رہے۔ جب مردوں کو اس قدر رشک ہے تو عورتوں کو رشک کیوں نہ ہو۔ ہمارے نزدیک جس قدر حق میاں کو اپنی بیوی کا اسی قدر بیوی کو میاں کا ہے۔ بس وجہ کیا ہے کہ میاں جو چاہے کرے اور بیوی اس سے مواخذہ نہ کر سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں مردوں نے عورتوں کو بدتر از بہائم سمجھ لیا ہے۔ میاں عیاشی بدمعاشی و زنا کاری کریں اور بیوی ذرا چوں نہ کر سکیں۔ اور طرہ اس پر یہ کہ جو بھلا مانس ایسا نہ کرے اور ایک ہی نیک بخت پر قانع رہے وزن ان ہتری کہلاتا ہے۔ اگر میاں بیوی کا عاشق دلدادہ، اور بیوی میاں کی عاشق زار ہو تو سبحان اللہ تو سبحان اللہ۔ کس لُطف کے ساتھ زندگی بسر ہو۔ ہندوستان کے ادبار کا سبب خاص یہی ہے کہ میاں اور بیوی میں جیسی الفت ہونی چاہیے ویسی ہونے نہیں پاتی۔ کیونکہ جس طرح میاں کا قاعدہ ہے کہ زنِ نیک خوش سیرت و پارسا سے خوش ہوتا ہے، اسی طرح بیوی بھی ایسے میاں کی لونڈی ہو جاتی ہے۔ جو عیاشی سے نفرت کرے۔ یہ تو بندھی چوٹیں ہیں، چار بیویوں کا حکم ہے۔ مانا۔ سلّمنا۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی تو شق ہے کہ عدل کرو۔ جی۔ یہ تو سن لیا کہ چار بیویوں تک حکم ہے۔ مگر شقِ ثانی سے چشم پوشی کی۔ میرے ایک آشنا ہیں خدا یار خان تین شادیاں کیں۔ تیسری بیوی جس کو حال میں بیاہ کے لائے اسی کے ہاں رہتے سہتے ہیں۔ پہلی دو بیویوں کی برسوں صورت دیکھتے نہیں۔ ایک روز میں نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ صاف صاف کہتے ہی بن پڑی کہ بھائی جان ابھی یہ کمسن ہے، اور نہایت خوبرو، اور خوش وضع، میں نے کہا اب آپ گنہگار ہوئے۔ عدل کرو، کیا آپ کی پہلی بیویاں آپ کے اس حرکت سے خوش ہوئی ہوں گی، ہرگز نہیں کیا مجال ان کو

رشک ہوا ہوگا اوران کا رشک بجا ہے اور خدا کے فضل سے وہ دونوں صاحب اولاد ہیں۔ آپ نے صرف نفسِ امارہ کے اغوا سے شادی کی اور بُرا کیا، بہت بُرا کیا، دنیا میں چند روز لُطف اٹھا لیجیے، مگر عقبیٰ میں معلوم ہوگا۔ وہاں آپ سے مواخذہ کیا جائے گا اور لینے کے دینے پڑیں گے اور یوں عیاشوں کا تو ذکر ہی نہیں۔ رندان باتوں پر مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ ان کا تو قول یہ ہے ؎

زنِ نوکن اے دوست، در ہر بہار

کہ تقویم پارینہ ناید بکار!

اس کا کچھ جواب ہی نہیں، بجز سکوت کے۔

شہزادہ۔ حق ہے واقعی جس قدر خیال میاں کو اپنی بیوی کی عفت کا ہوتا ہے، اسی قدر خیال بیوی کو بھی ہوتا ہوگا کہ اس کا میاں ہر دیگی کا چمچہ نہ ہو۔

رونق الدولہ۔ اجی حضور یہ سب باتیں ہیں۔ مرد پھر مرد ہے اور عورت پھر عورت ہے؛ بیوی کو اس سے کیا واسطہ۔ کھانا لے کپڑا لے پڑی رہ۔

مبارک الدولہ۔ اے لعنت خدا تم پر۔ لاحول ولاقوۃ۔ ایسے آدمیوں نے تو ہندوستان کو غارت کیا لینے لگے مرد پھر مرد ہے، اور عورت پھر عورت ہے۔۔ بجا۔ عورت کو تو بالکل جانور سمجھتے ہیں۔ بنی نوعِ انسان میں عورت داخل ہے یا نہیں پہلے یہ بتائیے اگر داخل ہے تو آپ کو اسقدر آزادی آپ کی بیوی نے کیوں دی یہ آپ تباہ ہو جائیں۔

رونق الدولہ۔ بس بس سمجھ گئے تم بیشک زنان بہتری ہو ؎

جس طرح بد کی بدی جاتی نہیں	نیک کے دل میں بدی آتی نہیں
دیکھ رنگیں ہے بدی کا بد ثمر	نیک نیکی کا ہے پھل اے بیخبر

رونق الدولہ۔ ایسے روکھے شعر کسی مردود کو ہی پسند ہوں گے۔ واہیات۔ خرافات، مہمل۔ بے معنی۔ از سرتاپا لچر۔ بالکل خبط شعر ہیں۔

یہ سن کے وہ شوخ مسکرا کے	بولی اسے چھاتی سے لگا کے
گلچیں تو نہیں فقط چمن کا	محرم ہے تو سارے تن بدن کا
یہ کہہ کے لبوں سے قند گھولے	مستی نے دلوں کے عقدے کھولے

واں صبح صفا تھی گل بداماں

پُھولی رُخِ مہر پر شفق یاں

مبارک الدولہ۔ نیکی کا شعر حضور کے خلاف ہے، بدی کے اشعار ہوں تو حضور خوش ہو جائیں گلے لگایا، اور بوسہ بازی ہوئی، اور دھول دھپا ہوا۔ ان باتوں سے خوش ہوں گے۔ ہمارے حضور رونق الدولہ بہادر نیکی کا ذکر نہ آنے پائے۔

شہزادہ۔ اب حمام کر کے بندہ درگاہ آرام کریں گے اور کوئی بارہ بجے خاصہ چُنا جائے گا۔ کھانا کھا کے پھر سوئیں گے۔

رونق الدولہ۔ خدا خیر کرے۔ کیا تمام شب جاگتے ہی رہے۔

شہزادہ۔ نہیں میاں دو دن کے تھکے ہوئے ہیں۔ اب آرام کریں یا نہ کریں۔ یا کوئی بیں مقرر کیا ہے۔ سہ پہر کو بس ایک گھنٹے سے زیادہ نہ سوؤں گا۔ زیادہ سونا بیٹنگ بہت بُرا ہے۔

مبارک الدولہ۔ خدا کے لیے اب اس وقت نہ سونا، یہ کیا بات ہے۔ اتنے میں کشمیری بھانڈ دروازے پر آئے، اور مبارک باد گانے لگے۔ سپہر آرا کو وہ وقت یاد آیا جب بھانڈ اِن کے دروازے پر آئے تھے اور غل مچا مچا کر (ہمیشہ دلبر سبحان مبارک باشد) گایا تھا۔ اندر حسن آرا اور سپہر آرا کا رنگ فق۔ باہر خاص بردار چوبدار، خدمت گار، دنگ کہ یا خدا لڑکا کس کے ہوا۔ حسن آرا اور سپہر آرا کنواری لڑکیاں بڑی بیگم بیوہ، اور مالک دیرینہ روز۔ وہ وقت سپہر آرا کو یاد آیا تو آزاد پاشا اور سپہر آرا، اور ہمایوں فر کے مکان کا آگ سے جلنا، اور ان کا دریچے سے بے قابو ہو کر گرنا، سب یاد آگیا۔ اور اس ضمن میں آزاد پاشا بھی یاد آئے۔ ادھر بھانڈ گاتے تھے۔ ادھر عروسِ زیبا خصائل کے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے تھے۔ مغلانیاں اَنا، خواصیں محلسرا کی ڈیوڑھی میں آ کر دروازے کے پاس سے چھپ چھپ کے دیکھتے تھے۔ مہریاں بچوں کو گود میں لے کر باہر کھڑی تھیں۔ بھانڈ مسخرا پن کر رہے تھے۔ ان کو خاطر خواہ انعام دیا گیا۔ ایک موٹے تازے بھانڈ نے کہا۔ قربان جاؤں آج تو کچھ ایسی رقم عنایت ہو کہ جی بھر کھاؤں۔ کوئی تو راد لوائیے کہ میں بھی شادی کروں۔ دوسرے بھانڈ نے پوچھا۔ اے بوڑھوتی وقت شادی کر کے کیا کرے گا۔ کہا۔ اجی جاؤ بھئی تم جانو۔ جورو کی جورو، اور ثواب کا ثواب۔ کہا اچھا تو پھر ہم بھی تمہارے پڑوس میں مکان لیں گے۔ ایک بولا خداوند سرکار کے دربار سے نامحروم جائیں تو تعجب کا مقام ہے۔ ایک ایک دوشالہ ہمارے وطن کا ہم کو دیجئے۔ دعائیں دیتے جائیں گے

الٰہی در جہاں باشد باقبال

جواں بخت و جواں دولت جواں سال

خدمت گار کی شامت اعمال۔ ڈپٹ کر جواب دیا۔ بس اب جاؤ، جو پانا تھا پا گئے۔ تم لوگوں کو تو کوئی دس ہزار بھی دے تو تم بے لڑے نہ جاؤ۔ اتنا کہنا تھا کہ سب کے سب بلچ پڑے پھر کیا تھا اللہ دے بندہ لے۔

ایک۔ (تو نند ٹھکا کر) یہ بے وقت کی پیدائش کا کہاں سے بولا۔
دوسرا۔ (کریزہ مین تھا) اب فٹ فٹانے لگا۔ ہاں زین چہ چہ۔
تیسرا۔ (آخاہ) ارے میاں یہ تو امامی بھٹیارے کا لڑکا ہے۔ بھئی خوب آدمی تھے۔ ان کے باپ مگر ان کی ماں شیریں اے توبہ اے توبہ توبہ کر بندے۔ عورت کیا تھی چڑیل تھی۔
چوتھا۔ اور یہ تو اپنے کو حسینی حلوا سوہن والے کا سالا بتاتے تھے۔
پانچواں۔ بھانجی خور صاحب سلام۔ سلام بڑے بھائی۔ ادھر اُدھر۔
چھٹا۔ یہ سب کو برطرف کر کے آئے ہیں۔ ماں بھی برطرف ست

خدا کے غضب سے ذرا دل ہیں کانپ
چغل خور کے منھ کو ڈستے ہیں سانپ

خدمت گار ان فقروں پر اور بھی جھلایا اور گالیاں دینے لگا۔ جس قدر یہ جھلاتا تھا اُسی قدر بھانڈ اور بھی فقرے چست کرتے تھے۔ ہٹ جانا بھئی۔ چکٹ نہ دے بیٹھے۔ چوٹ کیا ہی چاہتا ہے۔ ارے میاں سنکھیا والی کوٹھی سے کب آئے، (یہاں پاگل خانہ ہے) یارو دیکھنا۔ کہیں بسر ہاتو نہیں ہے۔ بھونکنے تک خیریت ہے۔ کہیں تنگڑی نہ لے (اُچک کر) الٰہی خیر۔ اللہ نے بچایا۔ بھئی منہ میں گولی لیے ہے۔ گرگٹ ہے گرگٹ۔ ہمیں بسکھوپڑے کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔ مرزا ہمایوں فر اور ان کے احباب گو یہاں سے دور تھے مگر پھبتیوں کی آواز بخوبی سن سکتے تھے اور قہقہے پر قہقہے پڑتے تھے۔
مبارک الدولہ۔ کوئی آدمی ان سے بھڑ پڑا ہے۔ اسی پر آوازوں کی بوچھار ہو رہی ہے۔ ان کو تو بھڑ کا چھتا سمجھنا چاہیے۔ کچھ کہا اور شامت آئی۔
رونق الدولہ۔ بڑے حاضر جواب ہوتے ہیں۔ کسی مقام پر بند نہیں رہتے۔
شہزادہ۔ مسخرے۔ کسی سے دبتے ہیں، اور خصوصاً بھانڈ۔ توبہ ہی بھلی ہے، ان کو کچھ دلوا کے رخصت کرو۔ داروغہ صاحب کیوں غل مچایا ہے۔ بم چق لگا رکھی ہے۔

داروغہ صاحب تشریف لے گئے لحیم و شحیم آدمی، تھل تھل داروغہ صاحب نے جاتے ہی کہا۔ یہ کیا ہے بھئی یہ کیا غل مچایا۔ ان کا اس قدر کہنا تھا کہ بھدے بھانڈ نے کہا۔ آئیے۔ اور سب نے بھی ہانک لگائی۔ آئیے آئیے معقول یہ کیا ہوا۔ کیا ہولی آ گئی۔ ایک بولا۔ او بھئی میر فیض علی آئے۔ دوسرے نے کہا قاضی صاحب آ گئے۔ اب ان کی (خدمت گار کی طرف اشارہ کر کے) چھوٹی ہمشیر کے ساتھ ہمارا نکاح ہوگا۔
داروغہ۔ کیا بات کیا ہے۔ کیوں فحش بکتے ہو۔ مطلب بتاؤ۔ فضول گوئی سے کیا فائدہ نکلتا ہے۔

بھانڈ ۔ خداوند نعمت بات ساری یہ ہے کہ یہ بیچارہ ہمارے غلام کا لڑکا تباہ حال ہے۔ اگر شہزادے کے ہاں ممکن ہو تو خبر گتوں ہیں اس کا اسم کر دیجئے۔ آپ یہاں سولہوں آنے کے مالک ہیں۔

دوسرا ۔ نہیں داروغہ جی۔ بھولے سے بھی ایسا نہ کیجئے گا۔ آدھی گھانس راستے میں یہ خود کھا جائے گا۔ یہ ایک ہی حضرت ہیں۔ حرام خور کہیں کا۔

تیسرا ۔ اس کی استری کسی دھوبی کے ساتھ نکل گئی ہے۔

داروغہ ۔ میاں قدرت ایک اشرفی لا دو۔ بس صاحب اب تو چھٹکارہ ملے گا۔ جان عذاب میں کر دی۔

بھانڈ ۔ اللہ کرے آپ کے ہاں آپ ہی کے برابر بیٹا ہو۔ سب بھانڈوں نے مل کر کہا۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔ شہزادے نے یہ لطیفہ سنا تو کمال محظوظ ہوئے اور سب مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ گئے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ داروغہ صاحب بہت جھلائے اور کہا کھڑے کھڑے نکال دو اور سنئے اب ہم پر بھی آوازے کسنے لگے۔ خبردار جو کبھی اس ڈیوڑھی پر قدم رکھا ہو گا۔ بھانڈوں نے اشرفی لی، سلام کیا دعا دی اور چلتے پھرتے نظر آئے۔ خدمت گار نے ہزار سنیں۔ اور چلتے چلتے داروغہ کو بھی لے ڈالا۔ یک نہ شد دو شد۔ جب داروغہ صاحب شہزادہ گردوں مدار کے روبرو آئے تو دیکھا قہقہہ پڑ رہا ہے۔ جھینپتے ہوئے کہا۔ حضور میں تو گیا تھا فیصلہ کرنے وہ مجھے صلواتیں سنانے لگے۔ معاذ اللہ خدا ان سے بچائے۔ کسی کی سنتی ہی نہیں۔ گالیاں دو۔ برا بھلا کہو۔ وہ سنتے کس کی ہیں۔ کان پر جوں بھی تو نہیں رینگتی وہاں یہ نقشہ ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ عجب قسم کے آدمی ہیں۔ آدمی کیا مسخروں کے سردار ہیں۔ یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ ایک خدمت گار نے جھک کر عرض کیا۔ خداوند صفی پور سے غفورن آئی ہیں۔ حضور کے سلام کے لیے۔ مبارک الدولہ نے کہا۔ بلا لیجئے۔ دو گھڑی دل لگی ہو گی۔ ہمایوں فر حمام گئے غفورن کو حکم ہوا ذرا تامل کرو۔ جب حمام سے تشریف لائے تو پھر حکم دیا گیا کہ حاضر کرو۔ آئیں اور سب کو سلام کر کے بیٹھیں۔ یہ بیٹھی ہی تھیں کہ اور ایک نیک بخت حاضر ہوئیں۔ حضور لاڈلے آئی ہیں۔ فرمایا بلا لو۔ الغرض اس مژدۂ طرب انگیز کا حال سن کر کل ارباب نشاط نے آنا شروع کیا۔ تجویز ہوئی کہ شب کو بشرط اجازت شاہ صاحب خوب دھما چوکڑی مچی۔ ہمایوں فر نے کہا حضرت سنیے بندہ دس گیارہ بجے سے زیادہ نہ بیٹھے گا۔ ہاں صبح کو جس وقت کہو آ جاؤں۔

مبارک الدولہ ۔ آپ ٹھیک گیارہ بجے یہاں سے جائیں۔ اور چار بجے محفل میں ہوں۔ بس اس میں کسی طرح کی کسر نہ ہونے پائے۔

رونق الدولہ ۔ جی ہاں درست ہے۔ اگر وہ چلے جائیں گے تو آپ روک لیں گے۔ یہ بینجر ایسے بیچارے کسی اور کو دیجئے گا۔

مبارک الدولہ ۔ نہیں۔ آخر دروغ گوئی سے فائدہ کیا ہو گا۔ اچھا یہ ہمارا ذمہ گیارہ بجے جائیں اور چار بجے

آجائیں اگر گیارہ بجے کے قبل گئے تو تم سزاوار اور اگر چار بجے کے بعد تو ہم گنہگار، دو گھڑی دن رہے تک شہزادہ ہمایوں فر نے دولت کدے پر احباب اور مصاحبین و رفقاء و ارباب نشاط کا اس قدر ہجوم تھا کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ مگر دوپہر سے جبکہ شاہ صاحب نے سُنا کہ اس قدر ہجوم ہے فوراً حکم دیا کہ شہزادہ باہر نہ بیٹھے اور چونکہ پہلے ہی شاہ صاحب کی ممانعت تھی اور بلا اجازت شاہ صاحب شہزادہ باہر آن کر احباب میں بیٹھا۔ لہٰذا وہ کسی قدر بد دماغ ہو گئے۔ شہزادی بیگم نے ہزاروں قسمیں دیں کہ بیٹا واسطے خدا کے باہر نہ جانا ورنہ میں اپنا سر پھوڑ ڈالوں گی۔ دُلھن کو سمجھایا کہ جب کمرے میں جاکر بیٹھیں تم ہرگز نہ جانے دو۔ اور قسمیں دے دے کر بٹھانا۔ چنانچہ جب ہمایوں فر محلسرا میں آئے، اور کمرے میں جاکر بیٹھے سپہر آرا نے تخلیے میں کہا اگر میری اجازت کے بغیر باہر جاؤ، تو مجھی کو رُؤو۔ شاہزادے نے بوسہ لے کر کہا۔ کیا مجال تم اتنی بڑی قسم دو اور میں نہ مانوں یہ امر محال ہے۔ الغرض شہزادہ کو نہیں بیٹھنا پڑا۔ اور بھاوجوں کی دل لگی اور کم سن اعزہ کی چہل سے دل بہل گیا۔ بارہ دری سے دو بار احباب نے بلوایا تو ہمایوں فر نے کہلا بھیجا، ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جاکہ خاطر خواہ اوست

انھوں نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھا، ؎

دیدار می نمائی و پرہیز میکنی
بازار خویش و آتش ما تیز میکنی

تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ شہزادہ نے ایک کرسی بچھوائی۔ اور کہا کہ لالہ خشونت رائے شرر اور مرزا سلیم شاہ کو حکم دو کہ سامنے سے باتیں کریں، لالہ نے کہا، خداوند حضور تو بالاخانے پر ہیں۔ غلام تحت الثریٰ میں۔ انھوں نے کہا۔ مطلب تو باتوں سے ہے۔ اور وہ مطلب حاصل ہے۔ لالہ نے عرض کیا خداوند اس وقت تو غلام کو آزاد کر دیجئے۔ دعوت گاہ جانا ہے۔

شہزادہ صاحب نے کہا کہ لالہ صاحب آپ تو غضب کرتے ہیں۔ بھلا یہ وقت دعوت میں جانے کا ہے۔ مدعو آپ کس کے ہیں۔ اور دعوت میں آپ کیا کھائیں گے۔ یہاں ہی سب چیزیں حاضر ہو سکتی ہیں آپ اتنا فرمائیں کہ دعوت میں آپ کیا کھائیں گے۔ آپ بتاتے کیوں نہیں۔

لالہ۔ حضور تو مالک ہیں جو چاہیں کہیں، مگر یہ لوگ جو خوشامد خورے اور نیبو نچوڑ ہیں ان کا کہنا برا معلوم ہوتا ہے۔ بس اب علم کی قسم بندہ درگاہ بلا اشتباہ کچھ عرض کرے فضول محض ہے۔

شہزادہ۔ میاں ان لوگوں کی باتوں پر نہ جاؤ تم یہ بتاؤ کہ دعوت میں کھانا کیا ہوگا۔

لالہ۔ خداوند۔ غلام حضور کا نمک پروردہ ہے۔

شہزادہ۔ ہو۔ پھر اس سے مطلب کیا۔ لاحول۔

لالہ۔ حضور مالک ہیں، اور میرا دعوت کا وقت جاتا ہے۔ اگر حکم دیں تو غلام نہ جائے بس۔

شہزادہ۔ آپ جائیے۔ مگر اتنا تو معلوم ہو جائے کہ آپ وہاں کیا کھائیں گے۔ ہم یہاں ہی منگوا دیں۔

لالہ۔ تو خداوند سُنیئے۔ بڑا روپیہ صرف کرنا ہوگا۔

شہزادہ۔ آپ کی بلا سے ہم صرف کریں گے۔ آپ فرمائیے۔

لالہ۔ خداوند پہلے تو مہوے کی دارو ہوگی، یا سونفی چھ آنے بوتل کی۔ کوئی پانچ آنے کی بوتل۔ کوئی چھ آنے کی اور حضور ہم لوگ پوری بوتل یا آدھی بوتل پینے کے عادی۔

شہزادہ۔ اول مقدمہ چھ آنے کی بوتل اور کھانا۔

لالہ۔ خداوند۔ بس اس کا حال نہ پوچھئے قلیہ اور پوری اور ترکاری، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دال دو طرح کی ہوگی کیوٹی اور ارہر کی دال۔

شہزادہ۔ ایں! دو طرح کی دال! غلط بالکل غلط۔

لالہ۔ حضور صحیح عرض کرتا ہوں۔ دال دو قسم۔ قسم اوّل کیوٹی۔ قسم دوم ارہر۔ یہ دو دال برائے ما اہلِ دعوت ہر دو قسم حضور کی بدولت۔

شہزادہ۔ ہمیں یقین نہیں آتا۔ ارے میاں تم لوگوں میں بھی دو قسم کی دال ہوتی ہے۔ تعجب ہے کبھی ممکن نہیں بالکل جھوٹ بولتے ہو سراسر جھوٹ۔

لالہ۔ حضور کے قدموں کی قسم دو قسم کی۔

شہزادہ۔ تو دوالہ نکل جاتا ہوگا بھئی۔ لاحول ولا۔

لالہ۔ خداوند دوالے سے بدتر، دو طرح کی دال کیوٹی اور ماش کی یا ارہر کی اور چنے کی اور قلیہ۔ یہ اس پر طرہ ہے۔

شہزادہ۔ بھلا گوشت کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس کی بھی تفصیل بیان کرو۔

لالہ۔ دال تو ضرور دو طرح کی ہوگی گوشت چاہے دو طرح کا ہو، یا ایک طرح کا ہووے۔ مگر قلیہ ضرور بالضرور ہوگا۔ بیشک ہوگا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔

شہزادہ۔ اور دارو! خوب پیتے ہوگے۔ ہے نہ۔

لالہ۔ حضور بس اب بے ادبی ہوتی ہے۔ اب خداوند کچھ نہ کہلوائیں اب لوگ یہ زبردستی کے کہہ سکتے ہیں، کہ خداوند ہمارے مالک۔

شہزادہ: اب آپ بہکنے لگے۔ ذرا سنبھل کے بات کرو۔

لالہ: خداوند دو طرح کی دال۔ دو طرح کی اور بلکن و بلکہ ہاں حضور دو طرح کی اس میں کوئی شک نہیں دال اور دو طرح کی۔ طرح اوّل جس کو بزبان پارس ارہر گفتہ و بزبان ہندی ماش اَنرا۔ آنرا۔ آنرا ماش۔

شہزادہ: (مسکرا کر) خوب فارسی بولتے ہو شاباش۔

لالہ: خضور ہماری زبان ہے۔ انشا، مادھورام۔ رقعات لالہ خرسند رائے۔ دستور الصبیان از مصنفہ لالہ نوندھرے دیوان لالہ خرم۔ یہ سب از بر حفظ زبان ہیں اور یہ سب زبان دان ہیں اُن کی خاص زبان فارسی ہے اور حضور کے سب نمک پر وردہ ہیں خداوند زبان فرس من غلام کما ینغی جانت ہے۔ ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندین بار　　بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

حضور لب و لہجہ کو دیکھیں۔ آداب خداوند آداب۔

شہزادہ: بھئی لالہ تم واللہ ایک ہی شخص ہو۔ کیوں نہ ہو۔ فرد ہو۔ اور فارسی تو ایسی بولتے ہو کہ۔ باید و شاید مگر تم لوگوں میں سب دوائے معلوم ہوتے ہیں ارے غضب دو طرح کی دال۔ دو طرح کی دال۔ اللہ اکبر بڑے فضول خرچ ہو۔ اور سو تفی پیتے ہو لاحول ولاقوۃ استغفر اللہ۔

لالہ: خداوند ہم لوگ روز پیتے ہیں روز۔

شہزادہ: بلاناغہ! ہمیں یقین نہیں آتا۔ اور پیتے بھی بلاناغہ ہو غلط ہے بالکل بہتان۔

لالہ: حضور اور دو طرح کی دال ہوتی ہے ہر روز۔

شہزادہ: اور دعوتوں میں تو بڑی بدعت ہوتی ہوگی۔

لالہ: خداوند ادھیلا کی اس وقت ادھیلا کی اُس وقت۔ دونوں جون۔ یہ جون اور وہ جون ؎

انچہ کردی تو بمن ہیچ بہ انسان نکند　　مرگ با جان نکند کفر با یمان نکند

شہزادہ: فارسی تو آپ کی زبان ہے اور لب و لہجہ تو بالکل مثل ایرانیوں کے ہے۔ کیا کہنا آوٗ لالہ ذرا فارسی تو بولو اگر طبیعت حاضر ہو۔

لالہ: حضورِ والا عالم و عالمیاں طبیعت خاکسار ہر دم حاضر ست مگر والآنہ طبیعت من کہ متلون بدلے چون بدلے کر یک اَدھائے ٹھرا اندرون خلق بذریعہ گلوئے من حاضر و جاری اند و آن در طبیعت کھل بلی سی انداز و ؎

مرا بارہا در حضر دیدہٗ　　زخیل و چراگاہ پرسیدہٗ

شہزادہ : (قہقہہ لگاکر) آپ ہم کو بھی کچھ فارسی پڑھایا کیجیے۔

لالہ : خداوند غلام حاضر ہے مگر محنت حضور کے تعلق ہے اگر آپ محنت کریں تو بسم اللہ۔ الا ورنہ غلام کو کیا عذر ہے۔

شہزادہ : بھلا کبھی پی کے بہکتے بھی ہو سچ سچ بتانا۔

لالہ : حضور عالم ایک روز للا کی مہتاری کنکا بھر زیادہ پلائے دہس بس پھر حضور دو دن تلک ہوش اگرچہ آج بجا ہے مگر۔

مصاحب : حضور اب یہ چلے اب آپے میں نہیں ہیں۔

شہزادہ : جی ہاں میں خود دیکھ رہا ہوں اس وقت باتیں کیسی گھل گھل کے کر رہے ہیں۔ توبہ ہی بھلی۔

مصاحب : لالہ صاحب بھلا آج تو نہیں پی ہے بھئی سچ کہنا۔

لالہ : نہ کہیں گے سچ تو ہرگز ہرگز نہ کہیں۔ چرا گویم کہ چہ کردم۔ آنچہ کردم کردم۔ مگر کسی کا اجارہ اس میں نہیں ہے۔ از ماست کہ بر ماست۔ بس آنچہ کرد آن سگ کرد آن مرغ کہ بکرد رمن نکردم۔

اب سنیے کہ لوگوں نے صاحب کلکٹر سے جا کے کہا کہ خداوند وہ شخص ہمایوں فر نہیں ہے مگر ہمایوں فر بن بیٹھا ہے حضور اس کی کامل طور پر تحقیقات کریں تو قلعی کھل جاوے۔ دو چار آدمیوں نے کوتوال سے مخبری کی تین چار آدمی ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے پاس گئے ان سے جا کر خبر دی کہ ہمایوں فر کجا وہ تو قبر میں سو رہے ہیں۔ حضور اس امر کی ضرور تحقیقات کریں لالہ اور شہزادہ میں جو گفتگو ہوئی اس کا بھی چرچا جڑ دیا کوتوال اور کپتان صاحب یہ خبر سن کر صاحب کلکٹر کے بنگلے پر جانے کے لیے تیار ہوئے اور عزم کیا ادھر شاہ صاحب کو جو خبر ہوئی کہ شہزادہ جو کوٹھے پر سے بے دھڑک باتیں کرتا ہے اور نیچے دو ایک آدمی مصاحبین میں سے کھڑے ہیں تو آگ ہو گئے۔ فوراً ڈیوڑھی پر آئے اور کہا شہزادی بیگم سے کہو کہ میں ڈیوڑھی پر کھڑا ہوں آپ ذرا پردے تک چلی آئیں شہزادی بیگم گھبرا کے اٹھیں۔ لڑکیاں خواصیں استانی جی ساتھ آئیں پردے کے پاس پہنچ کر یوں کہا۔

شہزادی : شاہ صاحب خیریت تو ہے کیوں یاد کیا۔

استانی : آپ نے اس وقت خود کیوں تکلیف فرمائی شاہ صاحب۔

شاہ صاحب : بہت برا ہونے والا ہے۔ بہت ہی برا ہونے والا ہے۔

شہزادی بیگم : (آہستہ سے) خدا نہ کرے آخر کہیے تو کیا سبب کیا ہے۔ دفعیے کا کوئی طریقہ بھی ہے یا نہیں۔

شاہ صاحب : از ماست کہ بر ماست۔ پھر خود کردہ را چہ علاج۔

استانی : کیا حضور کے حکم کے خلاف کوئی بات ہوئی۔

شاہ صاحب : ایک بات سراسر خلاف بالکل خلاف افسوس۔
شہزادی : صاحب لوگوں کے پاس جانے نہیں دیا باہر سے بُلالیا۔ باہر نہیں جانے پائے۔ اب کون بات خلاف ہے۔
شاہ صاحب : بے دھڑک اور بے تکلف کوٹھے کے کمرے سے دروازے کے پاس کرسی بچھاکر باتیں کر رہے ہیں قاتل کے دوستوں میں سے اگر کسی کو خلش باقی ہو تو ممکن ہے کہ کوئی داغ دے۔ بس اب زیادہ نہ مُنہ کھلواؤ اور اس کو سمجھادو۔

من نگویم کہ ایں مکن آں کن مصلحت بین وکار آسان کن

فہمیدہ ہو کے بچے بنے جاتے ہیں۔ توبہ توبہ میں کہاں تک سمجھاؤں۔
شہزادی بیگم نے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اُستانی جی نے بڑی تعریف کی خواصوں نے کہا۔ حضور یہی کی دُعا سے ہم نے آج یہ دن دیکھا ورنہ اُمید کسی کو تھی۔ توبہ توبہ شہزادی بیگم نے فوراً دونوں بیٹیوں کو حکم دیا کہ تم جاکے وہیں بیٹھو اور کمروں کے سب دروازے بند کر دو بیچ کے کمرے میں تم بھی بیٹھو اور ہمایوں فر کو بھی بٹھاؤ خورشید لقا بیگم اور مہ لقا بیگم معاً کوٹھے پر گئیں اور ادھر شاہ صاحب نے کہا میں چند باتیں بتاتا ہوں استانی جی قلمبند کرلیں اور انھیں کے مطابق کارروائی ہو۔
ایک : مرزا ہمایوں فر ایک ہفتے تک ہرگز ہرگز باہر نہ نکلیں۔
دو : پھاٹک بند رہے صرف کھڑکی کھلی رہے اور ایک دربان اور ایک سپاہی تلوار لیکر ہر وقت کھڑکی پر حاضر رہنا چاہیئے۔
تین : بلا اطلاع کوئی شخص نہ آسکے اس میں چاہے جو ہو۔
چار : اپنے قریب کے دو چار اعزہ اور شہزادے کے دو ایک احباب ولی کو اس سے مستثنیٰ کر دیجیے تو مضائقہ نہیں۔
پانچ : شہزادہ کوٹھے پر عمدہ سجے سجائے کمروں میں محفوظ مقام پر رہیں اور جو دروازے یا دریچے باہر رخ ہیں وہ ہمیشہ بند رہیں۔
چھ : احاطے میں ہر وقت دو سپاہیوں کا پہرا رہے۔ ایک بارہ دری میں دوسرا غلسرا کی پشت پر اور دونوں مسلح رہیں۔
سات : احاطے میں کم سے کم دس بارہ آدمی خاص برادر سپاہی خواص خدمت گار۔ چوبدار۔ یہ ہر دم لیس رہیں۔ اور ٹہلا کریں۔
آٹھ : چھوٹے شاہزادے کا باہر ہی رہنا مصلحت ہے اُن کے ساتھ دو ایک اور مصاحب بھی رہیں تو مضائقہ نہیں مگر ایسا ویسا ایک ہفتہ تک نہ آنے پائے۔
نو : بذریعہ تحریر اگر کوئی صاحب مرزا ہمایوں فر سے مزاج پرسی کریں تو مضائقہ نہیں مگر ملاقات قطعی موقوف۔
دس : اگر بزرگوں یا حاکموں میں کوئی آئے تو مجھ سے دریافت کرلیجیے پھر اجازت دیجیے لیکن ملاقات کوٹھے ہی پر سے ہوگی باہر تو کسی طرح آہی نہیں سکتے۔

گیارہ: دلہن کو بطور خود سمجھا دیا جائے کہ شہزادے کو اُٹھنے نہ دیں وہ لاکھ باہر جانے کی کوشش کریں مگر ہرگز نہ جانے پائیں۔
بارہ: شہزادے کی جس قدر تصویریں ہیں سب میرے حوالے ہوں۔
تیرہ: شہزادے کا کھانا بغور دیکھ لیا جائے پہلے وہی کھانا گھر بھر کھائے پھر اُن کی بہنیں بھاوج یا کوئی اور ہوشیار اور معتبر خادمہ کے ذریعہ سے جائے۔
شہزادی بیگم: بہت اچھا اس کے خلاف ہرگز ہرگز نہ ہونے پائے گا۔
شاہ صاحب: داتا تمہارا بھلا کرے گا۔ مائی ہم شاہ جی فقیر آدمی شہزادے سے سروکار نہ شہزادی سے واسطہ اگر کہا مانو تو واہ واہ نہ مانو تم جانو تمہارا کام جانے اور اب ہم جاتے ہیں۔

مراد ما نصیحت بود گفتیم ——— حوالت با خدا کردیم در فتیم

اُستانی: نہیں حضور ایسا نہ فرمائیے۔ ہم نہ جانے دیں گے۔
شاہ صاحب: فقیر کو سیاحی سے کام ہے قیام وضع کے خلاف ہے۔

درویش رواں رہے تو بہتر ——— آب دریا بہے تو بہتر

شہزادی بیگم: کچھ دن تک تو قیام کیجیے۔ آپ کا گھر ہے جب تک رہیے۔ آپ کے رہنے سے ہمارا فائدہ ہی ہے نقصان نہیں ہے۔ مگر کچھ دن تو قیام فرمائیے۔
شاہ صاحب: تو ایک شرط سے وہ یہ کہ جو آپ کا باغ ہے اس میں ایک عمارت ہے اُس کی چھت پر میں رہوں مگر تنہا اور آپ مشہور کر دیں کہ شاہ صاحب حج کو گئے ہیں۔ اس میں مجھے عذر نہیں ہے مگر مخفی رہے تو بہتر ہے۔
شہزادی بیگم سے گفتگو کر کے شاہ صاحب باہر آئے اور باغ میں رہنے لگے۔
اب سنیے کہ خورشید لقا اور مہ لقا بیگم نے شہزادے کے کمرے میں جا کر سب دروازے بند کر دیے اور برطائف الحیل سپہر آرا کو علیحدہ لے گئیں اور یوں گفتگو کی۔
خورشید لقا: تم ان کو باہر نہ جانے دینا شاہ صاحب خفا ہوتے ہیں۔
سپہر: (شرماکر) اچھا مگر جب کوئی میرا کہنا مانے بھی۔
خورشید: (مسکراکر) بجا۔ تم کہو تو۔ ضرور مانیں گے دیکھ لینا۔
مہ لقا: ان سب کہہ دو تو ان کو بھی خیال رہے شاہ صاحب ابھی آئے تھے انھوں نے کہا کہ اب میں ذمہ دار نہیں ہوں۔
سپہر: کیا۔ کس بات کا۔ کیا ابھی کچھ اور باقی ہے۔
مہ لقا: اللہ نہ کرے مگر وہ کہتے تھے کہ ہمایوں فر کرسی بچھاکر باہر کے رخ کیوں بیٹھے اور ایک بات انھوں نے ایسی کہی کہ پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی از برائے خدا ان کو دروازوں کے پاس نہ جانے دیا کرو۔
سپہر: (آہستہ سے) وہ کیا بات ہے سچ سچ بتا دیجیے گا۔

خورشید: اُنھوں نے کہا کہ شہزادے کے ابھی بہت دشمن ہیں۔ ایسا نہ ہو کوئی ان کو دیکھ پائے اور گولی چلائے تو پھر۔

سپہر: غضب ہے۔ اُفوہ۔

مہ لقا: اب تو سمجھ گئیں نا اب خدا کے لیے جس طرح ممکن ہو سمجھا دو۔ ورنہ۔ ہاں۔

سپہر: بس اب ہیں۔ (مسکرا کر) خاموش۔

خورشید: اٹھنے بھی نہ دوں گی، یہی کہنے کو بھتیں نا۔

سپہر: (گردن جھکا کر) اُفوہ۔ یا خدا اب کیا منظور ہے جو شہزادے سے خورشید لقا نے کہا دیکھو اللہ جانتا ہے جو تم نے ہمارا کہنا نہ مانا تو ہم ہیرے کی کنی کھا کے سو رہیں گے تم کو گھر کیوں کاٹے کھاتا ہے خاصی اچھی طرح یہاں بیٹھو اٹھو ایک اٹھوارہ بات کرتے تو جاتا ہے ایسا بھی دوستوں کا کیا خیال ہے جانتے تو ہو کہ سو دشمن ہیں سو دوست ہیں تم ہماری قسم کھاؤ تو ہم کو یقین آئے گا۔

شہزادہ: بہن کے سر کی قسم جو کہو گی اُس کے خلاف نہ کروں گا۔

مہ لقا: ہمارے سر پر ہاتھ رکھو تو ہمیں یقین آ جائے بس۔

شہزادہ: تم خوب جانتی ہو کہ مجھے قسم کا اعتبار نہیں مگر میں سچ کہتا ہوں کہ یہاں سے کہیں جانے کا قصد نہ کروں گا خورشید لقا اور مہ لقا سمجھا بجھا کر چلی گئیں اور سپہر آرا نے شہزادہ بلند اقبال کے گلے میں ہاتھ ڈال کر لب شیریں کا بوسہ لیا اور کہا کو بیحیائی ہو مگر۔ ع

مانمی خواہیم ننگ و نام را

دیکھو شہزادے واسطہ خدا کا اب ہماری جان کے دشمن نہ ہو۔ ہمایوں فر نے بوسہ کا جواب دے کر کہا خدا کے لیے اصرار نہ کرو ایک ہفتہ کیا معنی دو ہفتہ تک شاہ صاحب کے حُکم کا پابند رہوں گا۔

نواب ثریّا بیگم کی چوتھی

شب عروسی کو نگار قمر رخسار ثریا بیگم کا حسن خدا آفریں جمال یوسف پر خندہ زن تھا۔ دلہن کی جوانی اور مستی دولہا کی شاہد پرستی۔ اس کا شباب ان کا اضطراب گو ثریا بیگم نواب صاحب کے ساتھ شکار کے لطف اُٹھا چکی تھیں مگر خلوت میں جائیں بات کرتے ہوئے شرمائیں۔ دولہا نے رخسار رنگین کا بوسہ شکر ریز لیا۔ بوس و کنار کی گرمی بازار تھی۔ دولہا دلہن پر ہزار جان سے عاشق دلہن دولہا پر نثار تھی۔ وہ عطر روح پرور میں بسے ہوئے ادھر محرم کے بند کسے ہوئے۔ ؎

گہہ پائے طرب بخاک بوسی گہہ صیت نشاط نو عروسی

ثریا بیگم جامے میں پھولے نہیں سماتی تھی کہ کس درجے سے کس رتبے کو پہنچی ایسے گل رُخسار المیر والا تبار گردوں مدار کی چاہتی بیوی بنی وہ اس پر ہزار جان سے عاشق بہ عذرا تو وہ وامق۔ دونوں خوب دل کھول کے گلے ملے اور بوسہ بازی نے آتش جنون کو اور بھی بھڑکا دیا۔

بر پردۂ دل نگار بستند در حجلہ بیکدگر نشستند

ابرو بکنایہ رازمیگفت مژگان باشارہ سازمیگفت

ناہید بماہ شد ہم آغوش
گلدستۂ صد ستارہ بردوش

دلہن کا نقش مراد کرسی نشین ہوا۔ دولہا کا تیر دعا بہدف اجابت قرین ہوا۔ یہ شاد وہ بامراد۔ دلہن البیلی چھیل چھبیلی مگر بوجوہ در چند انتہا کی شرمیلی۔ دولہا سر خرو فائز۔ بہرام شیر دل شیر اندام۔ دلہن کا جام دل بادۂ مراد سے لبریز۔ اور کاکل مشکین عنبر بار و گل بیز۔ دولہا نے مسکرا کر کہا اللہ اللہ بعد مدت دل کی ہوس نکلی مراد بر آئی جس چیز کی برسوں دعا مانگی وہ آج پائی۔ ٹھان لی تھی کہ یا تو شادی ہی نہ کریں گے یا اگر بیاہ کریں گے تو کسی برق کردار حور پیکر صنم فریب رو کش قمر کو۔ ع

معشوق کیجیے تو پریزاد کیجیے

اس کے بعد نواب صاحب نے بوسہ لے کر۔ ؎

گفتہ قدمت مبارکم باد خاک قدمت مبارکم باد
بنشین بنشین نشیمن از تست جان و خرد و دل و تن از تست
بر جلوہ گہہ مراد بنشین
جو شمع بنشان و شاد بنشین

تمام شب دولہا دلہن نے لطف بے پایاں اٹھایا ان کا خندہ خندہ شکر ریز و رنگین۔ ان کا تبسم دزدیدہ و شریں دونوں کمسن۔ ع

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن!

نواب: میں تو صورت دیکھتے ہی عاشق ہو گیا تھا سن سے جان نکل گئی۔ بھوک پیاس بند۔ آیہ فتبارک اللہ احسن الخالقین پڑھی کہ خدا نے ایسی صورت زیبا دکھائی ادھر تم نے آنکھ لڑائی پھر کیا تھا سمجھا کہ مار لیا ہے۔

ثریا بیگم: ہم نے آنکھ لڑائی کیوں نہیں۔ ماشاء اللہ سے حضور ایسے ہی خوبصورت ہیں۔ شان کردگار یہ مرد وا اتنا بھولا بھولا بنتا ہے۔

نواب: بجا ہے۔ ہم لوگ ایسے ہی ہیں۔ عورتیں بڑی شایستہ ہوتی ہیں۔ مگر یہ کیا سبب ہے کہ اناث میں مردوں کی طرح آج تک ولی سننے میں نہیں آیا۔

ثریا بیگم: ہاں صحیح ہے۔ مگر نمرود اور شیطان اور شداد کی بہن بھی نہ کوئی سنی ہو گی۔ کوئی عورت ایسی تھی جس نے خدائی کا دعوے کیا ہے۔

نواب: واہ یہ کیا۔ اس سے کیا مطلب۔ پیر پیغمبر نبی سب مرد ہی ہوئے عورت کا کہیں ذکر بھی نہیں سنا اور پھر ناقص العقل ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

ثریا بیگم: جتنے صلحا اور صدیق پیدا ہوئے عورتوں ہی کے بطن سے پیدا ہوتے یا زمین سے یا آسمان سے آتے۔

نواب: ہائے اس ادا کے صدقے قسم خدا کی میاں کیا غلام بنایا ہے۔ یہ ادائے دلربا کھب گئی ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

رات بھر دولہا دلہن کی آنکھ نہ جھپکی میٹھی میٹھی باتوں اور مزیداریوں میں رات معلوم بھی نہ ہوئی اور ادھر موذن نے

ثریا بیگم جامے میں پھولے نہیں سماتی تھی اکہ کس درجے سے کس مرتبے کو پہونچی۔ ایسے گل رخسار امیر والا تبار گردوں مدار کی چاہتی بیوی بنی وہ اس پر ہزار جان سے عاشق۔ یہ عذرا تو وہ وامق۔ دونوں خوب دل کھول کے گلے ملے اور بوسہ بازی نے آتش جنوں کو اور بھڑکا دیا۔

بر پردۂ دل نگار بستند　　در جلہ بیکد گر نشستند

ابرو بکنایہ راز می گفت　　مژگان باشارہ ساز می گفت

ناہید بماہ شد ہم آغوش

گلدستہ صد ستارہ بر دوش

دلھن کا نقش مراد کرسی نشین ہوا۔ دولھا کا تیر دعا بہدف اجابت قرین ہوا۔ یہ شاد، وہ بامراد۔ دلھن البیلی چھبیل چھبیلی، مگر بوجوہ در چند انتہا کی شرمیلی۔ دولھا سرخ رو فائز بمرام، شیر دل، شیر اندام۔ دلھن کا جام دل بادۂ مراد سے لبریز۔ اور کا کل مشکیں عنبر بار و گل بیز۔ دولھا نے مسکرا کر کہا، اللہ اللہ بعد مدت دل کی ہوس نکلی، مراد بر آئی۔ جس چیز کی برسوں دعا مانگی وہ آج پائی۔ ٹھان لی تھی کہ یا تو شادی ہی نہ کریں گے یا اگر بیاہیں گے تو کسی برق کردار حور پیکر، صنم فریب رو کش قمر کو۔ ع

معشوق کیجیے تو پری زاد کیجیے

اس کے بعد نواب صاحب نے بوسہ لے کر، س

گفتند قدمست مبارکم باد　　خاک قدمست تبارکم باد

بنشیں بنشیں نشیمن از تست　　جان و خرد و دل و تن از تست

بر جلوہ گہ مراد بنشین

چو شمع بنشاں و شاد بنشیں

تمام شب دولھا دلھن نے لطف بے پایاں اٹھایا۔ ان کا خندہ، خندہ شکر ریز، و رنگین۔ ان کا تبسم دزدیدہ، و شیریں، دونوں کم سن۔ ع

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

نواب۔ میں تو صورت دیکھتے ہی عاشق ہو گیا تھا۔ سن سے جان نکل گئی۔ بھوک پیاس بند۔ آیہ فتبارک اللہ احسن الخالقین پڑھی کہ خدا نے ایسی صورت زیبا دکھائی۔ ادھر تم نے آنکھ لڑائی پھر کیا تھا۔ سمجھا کہ مار لیا ہے۔

ثریا بیگم۔ ہم نے آنکھ لڑائی۔ کیوں نہیں۔ ماشاء اللہ سے حضور ایسے ہی خوبصورت ہیں۔ شان کردگار یہ مردوے اتنا جھوٹ کیوں بولا کرتے ہیں۔

نواب۔ بجا ہے۔ ہم لوگ ایسے ہی ہیں۔ عورتیں بڑی شائستہ ہوتی ہیں۔ مگر یہ کیا سبب ہے کہ اُناث میں مردوں کی طرح آج تک ولی سُننے میں نہیں آیا۔

ثریا بیگم۔ ہاں صحیح ہے۔ مگر نمرود اور شیطان، اور شداد کی بہن بھی نہ کوئی سُنی ہوگی۔ کوئی عورت ایسی بھی تھی جس نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔

نواب۔ واہ یہ کیا۔ اس سے کیا مطلب۔ پیر پیغمبرؐ نبی سب مرد ہی ہوئے عورت کا کہیں ذکر بھی نہیں سُنا اور پھر ناقص العقل ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

ثریا بیگم۔ جتنے صلحا اور صدیق پیدا ہوئے عورتوں ہی کے بطن سے پیدا ہوئے یا زمین سے یا آسمان سے آئے۔

نواب۔ ہائے اس ادا کے صدقے۔ قسم خدا کی میاں کیا غلام بنایا ہے یہ ادائے دل رُبا کھُب گئی ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

رات بھر دولھا دُولھن کی آنکھ نہ جھپکی۔ میٹھی میٹھی باتوں اور مزیداریوں میں رات معلوم بھی نہ ہوئی اور ادھر مؤذن نے مسجد میں اللہ اکبر کی آواز بلند کی۔ ہمسائے کے ہندو بھجن گانے لگے۔ دروازے پر حافظ جی مناجات پڑھنے میں مصروف ہوئے۔ شوالوں میں ٹھنا ٹھن گھنٹے بجنے لگے۔ پھاٹک پر نوبتی نے ڈہل صبح بجایا۔ مُرغ نے ککڑوں کوں کی آواز لگائی۔ جیسے۔ ؎

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشان صبح

مرغان چمن بہ نکتہ رانی	چوں برہمناں بہ بید خوانی
خوں در رگ لالہ جوش در جوش	ریحان زبنفشہ دوش بر دوش
آب از لب جوی نغمہ پیوند	بر سوسن دہ زبان زباں بند
از سبزہ تر بچشم بینا	مستانہ ہوا شکست مینا
گل را بکف نگار پیوند	مشاطۂ صبح شد حنا بند
خضرائے زمین شگفتہ گل گل	در سایۂ گل دمیدہ سُنبل
نو کرد بہار عشق دیرین	پیچیدہ صبا بشاخِ نسرین

گلبرگ چکاند چشمۂ نوش
فوارۂ غنچہ آتشیں جوش

نسیم سحری کے جھونکوں نے دولھا کو بیدار کیا۔ عروسِ زیبا شمائل بھی خواب ناز سے بیدار ہوئی۔ نواب جم اقتدار دیوانخانہ میں آئے۔ سپاہی خدمتگار مصاحب آداب بجالائے۔ حکم ہوا حمامی سے دریافت کرو، حمام تیار ہے

عرض کیا ہاں خداوند تیار ہے نواب صاحب جلو خانے میں داخل ہوئے خدمت گار نے حقہ پیش کیا۔ حمامی مجرا بجالائے۔ مشک بو دھواں دھار حقہ پی کر لنگی باندھی۔ پھر اُبٹن پہنکر تشریف لے چلے۔ حمامی نے حمام کا پردہ اٹھایا حمام میں آئے۔ حمامیوں نے سر مبارک پر بیسن ڈالا۔ سر ڈھا کر کنگھی کی۔ مُشت بال کرنا شروع کیا۔ لنگی باندھی اور کھیس اوڑھ کر جلو خانے میں رونق افروز ہوئے۔ حکم دیا کپڑے لاؤ۔ خواص نے دست بقچہ لا کے سامنے رکھا۔ لباسِ فاخرہ زیبِ تن کیا اور دیوان خانے میں کرسی پر متمکن ہوئے۔ اعزہ اقربا خالہ زاد بھائی چچازاد بھائی احباب، رفقا، مصاحبین دائیں بائیں ارد گرد بیٹھے سلیقہ شعار، خدمت گاروں اور باتمیز ملازموں نے حقے پیچوان پیش کیے۔ گلوریوں کا خاصدان آیا اور چہل ہونے لگی۔

نواب مبارک الدولہ ان کے چچازاد بھائی، دلی دوست، اور راز دار تھے۔ انھوں نے چھیڑنا شروع کیا۔

مبارک الدولہ۔ کہو بھائی سرگذشت بیان کرو۔ شیر کہ بھیڑ۔

نواب۔ (مسکرا کر) شیر بھیڑ کیسے۔ بھیڑ کوئی اور ہوتے ہوں گے۔

مبارک الدولہ۔ تم تو کہتے ہو سویرے سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ کھٹی ڈکاریں آتی ہیں۔ سو ہیضم کی شکایت تھی۔

نواب۔ اجی فاقہ ہو یا سوء ہضم ہو، اس سے کیا واسطہ سُنا نہیں۔ ع

(فاقہ ہو یا کہ پیاس ہو پھر شیر شیر ہے)

مبارک الدولہ۔ اُونھ اُونھ! آج تو بہت اکڑ رہے ہیں حضور۔

نواب۔ اور اکڑتے کب نہ تھے۔ شیر دل مرد ہیں، کہ باتیں۔

مبارک الدولہ۔ اس کا حال خدا جانے ہمیں کیا معلوم۔

نواب۔ ارے یار بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس پر ہی چھم کو بلواؤں، جس نے وُہ غضب کی غزل گائی تھی۔ ہائے۔

سوال بوسہ شاید داشت از تو
لبش می جنبد و جانے ندارد

مبارک الدولہ۔ کل کچھ رائے تھی، آج کچھ ہے یہ کایا پلٹ۔ کل تو رونق الدولہ سے لڑتے تھے آج خود ہی کہنے لگے ماشاءاللہ!

احباب میں جو آتا تھا نواب صاحب کو دیکھ کر پہلے مسکراتا تھا۔ اور اس کے مسکرانے کے جواب میں یہ بھی مسکرا دیتے تھے۔ آنکھ اور ابرو سے باتیں ہوتی تھیں۔ رونق الدولہ تو رنگین طبع آدمی تھے۔ انھوں نے نواب صاحب کے ہاتھ جوڑے، اور کہا بھائی خدا کے لیے اس کافر کو بلواؤ۔ ارے بھئی آج چوتھی کے دن ناچ نہ دکھاؤ گے۔

کچھ فرض ہے کہ جب کوئی طائفہ بلوایا جائے تو بدی ہی منشا ہو۔ ارے صاحب گانا سُنیئے، ناچ دیکھئے۔ دو گھڑی چہل کیجئے۔ ہنسئے بولیے۔ مانتا ہوں واللہ شادی کو ایک ایک ہفتہ کیا۔ یعنی دو دن بھی نہیں ہوئے، حضور مُلّا بن بیٹھے۔ مگر یہ مولوی پن ہمارے سامنے نہ چلنے پائے گا۔ اور لوگوں نے بھی ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ یہانتک کہ ایک دو بے تکلف دوستوں نے آدمی بھیج کر کئی طائفے بلوائے۔

اب سُنئے بی بی مبارک ددا، اور مغلانیاں وغیرہ جو ساتھ آئی تھیں، دُلھن کے پاس گئیں۔ منھ دھلوایا۔ گگوری کا دی۔ شہ نشین میں شرما کر بیٹھی تو گھر بھر کی عورتوں نے گھیر لیا۔ ہمجولیوں نے باہم اشارہ بازی کی۔ خوب چہل ہوئی۔ ددا کہتی جاتی تھی، بیوی ذرا دم تو لینے دو، دلھن کو سب نے گھیر لیا وہ بیچاری گھبرا رہی ہے۔

خورشیدی بیگم۔ اب کب تک شرمائیں گی۔ ہم بھی دیکھتے ہیں۔

نواب بیگم۔ اور دو چار روز۔ بس لو گردن اور جھکالی۔

ددا جی۔ جو گردن نہ جھکائیں، تو آپ ہی سب ہنسیں، کہ کیسی ڈھیٹ ہے۔ ذرا نہیں شرماتی اور یوں بنی ہوئی بیٹھی ہے۔

ہمجولی۔ واہ کبھی نہ کہیں۔ اچھی طرح سینہ تان کے بیٹھیں۔

ددا۔ (مسکرا کر) واہ بیوی اچھی تمیز سکھاتی ہو جس میں سب کے سب مل کے دلھن کو ہنس ڈالیں، واہ ایسی سادی نہیں ہیں۔ اتنے میں باجے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ دلھن کا بھائی آتا ہے۔ روشن چوکی بجتی ہوئی۔ لوگ ادھر اُدھر ساتھ۔ بارہ دری میں متمکن ہوئے۔ چوبھا آگے لگایا گیا۔ شربت قند پلایا گیا۔ دلھن کے بھائی نے پانچ اشرفیاں چوبھے میں ڈالیں۔ دولھا کی ماں نے مہری کو حکم دیا کہ دولھا کو اندر بلالو۔ مہری چہکتی ہوئی باہر گئی۔ یوں تو نواب صاحب کے ہاں پچاسوں خواصیں، پیش خدمتیں، مغلانیاں، ددا آتون اُستانیاں مہریاں تھیں۔ مگر یہ مہری سب سے کمسن اور انتہا کی نمکین اور آہو چشم تھی اور چال اس غضب کی پائی تھی کہ طرز خرام سے دل پامال کرتی چلتی تھی۔ یہ جو سینہ تان کر باہر گئی، اور چمک چمک کر ملازموں سے باتیں کرنے لگی، تو کئی جوان عاشق تن ریجھے، اور محفل سے اٹھ کر اس طرف آئے۔ مہری ایک طبیعت ایک دار سینکڑوں کو گھائل کر چکی تھی۔ چتونوں سے تاڑ گئی۔ کہ دل آیا اداۓ دلربا نے ایسا لبھایا، کہ محفل سے دوڑے آئے پھر کیا تھا۔ ایک ایک ادا پر سب کی جان جاتی تھی کبھی دوپٹا سنبھالتی تھی کبھی مسکراتی تھی۔ کبھی دوپٹے کو ذرا کس لیا۔ کبھی سینہ ابھار دیا۔ کبھی کسی آدمی کو کھڑکنے لگی۔ کسی کو کوسا۔ خدا کی مار مُوے۔ دُر گور اور سنو ہم سے اور چہل۔

کیسی غیباتی مالزادی چھیتسی ہے ایسی باتیں کر۔ پاؤ بھر قیمہ ہو تو منھ درست ہو میاں کا۔

ایک نواب صاحب نے بڑھ کر کہا کیا ہے۔ بی مہری صاحب کیوں بگڑ رہی ہو خیر تو ہے۔ کیا کسی نے چھیڑا تھا۔

تیکھی چتون کر کے جواب دیا۔ اے حضور یہاں بادشاہزادوں کو منہ نہیں۔ اچھے اچھے شہزادے صورت دیکھ کر صلِ علیٰ کہتے ہیں۔

اور بندی کسی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتی۔ یہ موا چرکٹا آدمی چلا ہے ہم سے ہنسنے منہ بنوا جا کے پہلے (چمک کر) ابھی دل پر آ جائے تو تگنی کا ناچ نچاؤں۔

نواب۔ تمہارا کیا نام ہے۔ مگر واللہ کس قدر شستہ تقریر ہے۔

مہری۔ (مسکرا کر) بندگی حضور ہلے امیروں کی صحبت رہی ہے۔

نواب۔ ایں! تم مردوں کی صحبت میں رہی ہو۔ یہ کہیے۔ پھر چلو آج ہمارے ساتھ۔ برا نہ ماننا۔ واسطے خدا کے۔

مہری۔ (گردن پھیر کر مسکرا کر) حضور ہم اس قابل کہاں کہ حضور کے ساتھ رہیں۔ مگر ذری آہستہ آہستہ کہیئے ایسا نہ ہو محل میں کوئی اطلاع کردے، تو حضور کی بیگم صاحبہ بدظن ہو جائیں۔ میری ٹکے کی اوقات ہے حضور۔

نواب۔ (ہنس کر) یہ تم اپنے منہ سے کہو۔ میں نہیں کہہ سکتا ٹکے کی اوقات والی کو کیا کہتے ہیں۔ بُرا نہ ماننا۔

نواب صاحب کو اس کی شوخی اور زیر لب مسکرانا اور انگلیاں مٹکانا، اور چمکنا ایسا پسند آیا کہ باتیں ختم ہی نہیں کیں، جب کچھ دیر تک دولھا نہ آئے، تو ان کی ماں نے دوسری مہری بھیجی اُس نے خدمت گار سے کہا۔ دولھا کو اندر بھیجدو۔ حضور یاد کرتی ہیں۔ دولھا اندر تشریف لائے۔

پلنگ پر بیٹھے۔ دوا جی نے دُلھن کا گھونگھٹ ہٹا کر کہا۔ میاں اس کی مینڈیاں کھول دو۔ جب مینڈیاں کھول چکے حکم ہوا۔ سکھپال نکالا جائے۔ دلھن ابھی ابھی سوار ہوں گی۔

دُلھن سکھپال پر سوار ہوئی۔ چار مہریاں دو ادھر دو ادھر سُرخ دوپٹے پھڑکاتی جوانوں سے آنکھیں لڑاتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی بادِ بہاری باجا بجتا ہوا میکے پہونچیں۔ سکھپال سے اتریں ماں نے سر سے پانوں تک بلائیں لیں بہنیں آئیں۔

اب ان کے حمام کی تیاریاں ہونے لگیں۔ حمام میں پردہ ہوا پیش خدمت اور خواصیں ساتھ گئیں۔ حمامی باہر چلے گئے۔ خواصوں نے پہلے اٹنا ملا۔ جونپور کی خوشبودار کھلی آئی۔ پیش خدمت نے سر ملا۔ خواص نے کنگھی کی بھسہا بھسہا گرم پانی ڈالا۔ آہستہ آہستہ کھیسا کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد بیسن مُلا۔ نہا کر جلو خانے میں آ کے بیٹھیں۔ مغلانیوں نے چادر اور رومال سے بال خشک کیے۔ پھر سَر میں تیل ڈالا۔ آئینہ سامنے لگایا۔ خواص نے چوٹی گوندھی۔ چھپکا چاند ٹیکی افشاں لگائی، ازسرتاپا دھانی جوڑا پہنا۔ دوپٹہ سبز کریب کا۔ لچکا ٹھا، گوکھرو ٹکا ہوا۔ چٹکی کی چھڑیاں سبز گرنٹ کا پاجامہ مقیشی ازار بند، پٹھے کا موباف، جوتا سبز کاشانی مخمل کا، گھنگرو لگے ہوئے۔ زیور اور پھولوں کا گہنا پنھایا۔ عطر سے بسایا چھم چھم کرتی آئیں۔

اب دولہا کے ہاں کا حال سنیے۔

بیگم ۔ (مادرِ نوشہ) داروغہ سے دریافت کرو، چاندی کی ترکاریاں تیار ہیں۔ اب چوتھی کھیلنے کا وقت آگیا۔

مہری۔ حضور عرض کرتا ہے کہ ہاں تیار ہے سب بس۔

بیگم۔ منڈی بھیجکر ترکاریاں منگوالو اب دیر نہ کرو۔

مہری۔ خداوند ہر قسم کی ترکاریاں موجود ہیں، حکم ہو منگوالوں۔ باہر ٹوکرے کے ٹوکرے پٹے پڑے ہیں۔

بیگم۔ ہاں لے آؤ۔ اور خوان پوش اور کشتیاں سب حاضر کرو۔

نوکروں کے سروں پر ٹوکرے آنے لگے۔ مالن کو حکم ہوا گہنا لائے۔ پھولوں کا گہنالے کے مالن حاضر ہوئی طرہ، بدھی، طوق، پہنچ بند۔ جوشن، ہار، خواصوں وغیرہ نے کشتیوں میں گہنا لگایا، اور چاندی کی ترکاریاں لگائیں۔ خوانوں میں رنگترے سنگترے آڑو۔ کولے۔ ان سب پر کھانچے رکھے گئے۔ خوان پوش کسے گئے۔ کشتیوں کا شانی مخمل کے سبز زرد سپید اودے فالسائی کشتی پوش رکھے جن پر کار چوبی کام بنا ہوا تھا۔

اب دولھا کی بہنیں فنسوں پر سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ طرح طرح کے چھلکے۔ کوئی چینی اطلس کا کوئی تمامی کا کوئی زربفت کا۔ کوئی کمخواب کا۔ مہریوں نے داروغہ کے حوالے کئے۔ انہوں نے مزدوروں کے سربراہ کار کے سپرد کئے۔ کشتیاں مہریوں کے ہاتھ میں تھیں۔ ارگن بجا۔ باد بہاری۔ روشن چوکی۔ تاشے والے ساتھ ہوئے۔

ادھر دولھا گھوڑے پر سوار ہوا۔ دُلھن کے مکان پر پہونچے۔ بارہ دری میں دُولھا مسند پر بیٹھا۔ بھائی بند، یار دوست دائیں بائیں، خواصوں نے پیچوان لگایا۔ طائفہ آیا۔ ناچ ہونے لگا۔

مبارک الدولہ۔ لو پہلے اسی پرکالۂ آتش قاتلِ خونخوار کو بُلایا۔ قسم خدا کی میرا بس چلے تو اس کو ہرگز محفل میں نہ آنے دوں، نوجوانوں کو خراب کرتی ہے۔ دو گھڑی کی حکومت بھی ہو جائے تو۔ سمجھے۔

نواب۔ ہاں ہاں سمجھے۔ دو گھڑی کی حکومت ہو جائے تو شہر بدر کروا دو۔ اور آپ سے ہونا ہی کیا ہے۔ واہ ری قدر دانی۔

مبارک الدولہ۔ اے ہے بھائی سُن تو لو۔ دو گھڑی کی حکومت ہو تو اس کو مارے غصے کے اپنے گھر ڈال لوں۔

رونق الدولہ۔ کچھ نہ پوچھو جان و دل دونوں حاضر ہیں۔ ع

دل و جان دین و ایماں ہے جو لینا ہے صنم لے لو

آنکھ تو دیکھئے سن و سال دیکھو۔ ابھی کوئی پندرھواں برس ہوگا۔

مرزا۔ چھلاوہ ہے حضرت۔ عورت کا ہے کو ہے جادو ہے۔

پریزاد و پری رو و پری خو   غلط گفتم پری شرمندۂ او

اتنے میں اس بت سیم بدن نے مسکرا کے طبلے کے کان میں کچھ کہا تو گردن پھرنے میں دوپٹا کسی قدر کھسکا، اور ادھر رونق الدولہ نے اپنی چھاتی پر آہستہ سے ہاتھ مار کر کہا ہائے، قریب جو لوگ بیٹھے تھے وہ مسکرانے لگے۔ انھوں نے باواز بلند کہا نیک بخت کیوں قتل عام کر رہی ہے۔ واسطے خدا کے اس وقت ذرا اور رہنے دو۔ ورنہ میں ڈھیر ہو جاؤں گا۔

حسینہ۔ ایسے ہوتے میاں نو اتنا سن نہ آنے پاتا۔

رونق۔ تیغ نگاہ نے گھائل کر دیا ہے۔ یہی تو خرابی ہے۔ کہ تیر نیم کش ہے جو ادھر سے ادھر پار ہو جائے تو سبحان اللہ

تیرے تیر نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

حسینہ۔ (مسکرا کر) کوئی فرمائش کیجیے۔ غزل ٹھمری ٹپا۔

رونق الدولہ۔ کوئی فارسی غزل کہیے۔ ہم تو اس قتیل والی غزل پر مرے ہوئے ہیں۔ ویسی ہی غزل ہو۔ لطف دے، اور رنگ جمے۔

حسینہ۔ رنگ جمانے کی ضرورت جس کو ہو، وہ یہ فکر کرے۔ یہاں رنگ جمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آکے محفل میں بیٹھنے بھر کی دیر ہے۔ رنگ خود بخود جم جائے گا۔ گا کے رنگ جمایا تو کیا۔

رونق الدولہ۔ حسن کا بھی بڑا غرور ہوتا ہے کیا کہنا۔

حسینہ۔ ہوتا ہی ہے اور کیوں نہ ہو حُسن سے بڑھ کر کون دولت ہے۔

بگڑے دل۔ اب آپس ہی میں دانہ بدتول ہو گا یا کسی کی سنو گی بھی۔ اب کچھ گاؤ بیوی۔ آج چوتھی ہے۔ دوگال ہنس بول چکیں تھوڑا ہی ہے۔ کوئی غزل شروع کر دو۔ یا ٹھمری گاؤ۔ یا کوئی آستائی کہو مگر بہت مشکل نہ ہو آسان ہو۔

رونق الدولہ۔ ہم عرض کریں بشرطیکہ شنوائی ہو۔

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ

رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

بگڑے دل۔ اجی پرانی چیز دو سو برس پرانی۔ کوئی نئی غزل بتلایئے۔ چھچھاتی ہوئی جس میں لوگ پھڑک جائیں۔ ؎

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑ یو

دیوانے کا پانوں درمیان ہے

اتنے میں محل سرا سے دولھا کی طلبی ہوئی۔ گلوری کھا کے دولھا اُٹھے۔ محل میں داخل ہوئے۔ دُلھن اور دُولھا کو آمنے سامنے بٹھایا۔ تمامی کا دسترخوان بچھایا۔ چاندی کی لگن رکھی گئی۔ ڈومنیاں آئیں۔ انھوں نے دلھن کے دونوں ہاتھوں میں دولھا کے ہاتھ سے ترکاری دی۔ پھر دُلھن کے ہاتھوں سے دولھا کو ترکاری دی ڈومنیوں نے خوش الحانی کے ساتھ گانا شروع کیا۔

(یہ ہریالی مکھ سے نہ بولے۔ تڑپے بنے کا جی، شکر کے بڑ سوے پکے چوون لاگا تھی۔ یہ ہریالی مکھ سے نہ بولے) دلھن کے ہاتھ سے گنگنا کھلوایا۔ کھولا ڈومنیوں نے مگر نام کو دلھن نے بھی ہاتھ لگا دیا۔

اب ترکاریاں اچھلنے لگیں۔ دولھا کی سالیوں نے نارنگی کھینچ ماری۔ حشمت بہو۔ اور مبارک محل نوخیز مگر نازک اُدا اور جانی بیگم نے دولھا کو بہت دق کیا۔ آخر کار جھلا کر ایک چھوٹی سی نارنگی انھوں نے تاک کے لگائی۔ نازک ادا بہت شرمائی۔ اور ہمجولیوں نے خوب قہقہہ لگایا۔

جانی بیگم۔ تو جھینپ کاہے کی ہے اور نہیں۔ شرماتی کیا ہو۔

مبارک محل۔ ہاں ہمیں بھی تعجب ہے۔ شرمانے کی کیا بات ہے، اور بے بھی تو تم کو شرم کاہے کی۔ شرمائے تو وہ جس کو کچھ حیا ہو، تم نے تو بُھون کھائی۔

حشمت بہو۔ تم بھی پھینکو نازک ادا بہن۔ اے ہے ایسا شرمائیں کہ اب رعب نہیں ہونا۔ ہمیں اس وقت بڑا تعجب ہے۔ (ہنسکر)

نازک ادا۔ شرماتا کون ہے۔ کیوں جی پھر میں بھی ہاتھ چلاؤں۔

دُولھا۔ بسم اللہ بسم اللہ چشم ماروشن دل ما شاد۔ حضور ہاتھ چلائیں ابھی تک تو خالی خولی زبان چلتی تھی۔

نازک اُدا۔ اب کیا جواب دوں۔ جاؤ چھوڑ دیا تم کو۔ دولھا کی بہن خورشید بیگم نے رنگترہ کھینچ مارا ان کی مغلانیوں نے دولھا کی طرف ڈالیوں پر آڑو پھینکے دونوں طرف سے میوے اچھلنے لگے دولھا نے بس ایک نازک ادا کو تاک لیا تھا۔ جو میوہ اٹھایا انھیں پر پھینکا۔ نشانہ باندھ کر نارنگی پر نارنگی پڑنے لگی اور اُس شوخ مست ادا کے ساتھ چونک پڑنا عجب لطف دکھاتا تھا۔

جب جانی بیگم نے دولھا پر بوچھار کر دی تو دولھا کی آنا نے کہا۔ اے دیکھو لڑکیو۔ کہیں چوٹ نہ لگے۔ دُلھن کی ماں بھی تڑپنے لگی۔ مگر سُنتا کون تھا۔

چوتھی کھلوا کر دلھن کے ہاتھ میں کھیروی اور دولھا کو دھکا دیا۔ نازک ادا نے اس وقت کا بدلہ لے لیا۔ ادھر دولھا منہ لائے ادھر اس نے دلھن کا ہاتھ اُچھال دیا۔ ناک میں کسی قدر یوں ہی سی چوٹ آئی۔

دولھا۔ خیر اب وہ موقع تو رہا ہی نہیں۔ اچھا کیا ہوا۔

نازک ادا۔ ہاں! اب وہ موقع ڈھونڈ ھتے ہیں بجا۔

جانی بیگم۔ اب کیا ہر گھڑی تمہیں شیر رہو گی۔ کسی اور کا وقت آئے گا۔ یا نہیں۔ اس وقت بہت دق کیا اب بولیے۔ اب فرمائیے۔

نازک ادا۔ ہاتھ جوڑو، ہاتھ جوڑو، اچھا نہیں تو ہم ایک نہ مانیں گے۔ ہاتھ جوڑو صاحب۔ صورت کیا دیکھ رہے ہو

دولھا۔ اچھا صاحب معاف کر دو۔ بس اب تو خوش ہوئیں۔

نازک ادا۔ واہ اچھا خیر خاطر ہے۔ ورنہ یے ہاتھ جوڑوائے نہ رہتی اور دُلھن کے قدموں پر سر رکھ کر روتی۔

دولھا۔ اس میں عذر نہیں مگر ہاں تخلیہ ہو سب کے سامنے نہیں۔

تھوڑی دیر تک چہل پہل رہی۔ نواب نامدار عاشق تن، اور رنگین مزاج تو تھے ہی، ان نوخیز حوران پری وش سے مذاق کرتے رہے نازک ادا کی ادائے نازک نے ان کو اس قدر لبھایا کہ دل ہاتھ سے بے اختیار جاتا رہا۔

نازک ادا۔ (نخرے کے ساتھ) ایسے ڈھیٹ دولھا بھی نہیں دیکھے۔

دولھا۔ اور ایسی بے تکلف، اور چنچل بیگمیں بھی نہیں دیکھیں۔

نازک۔ اے ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اک ذرا ہوش سنبھالو۔ ابھی دنیا دیکھو چنچل! بے تکلف! الفظین تو سُنئے کوئی۔

دولھا۔ اچھا یہاں اتنی ہیں کوئی کہہ دے کہ نازک ادا بیگم کی سی شوخ طبع اور ڈھیٹ کسی نے آج تک دیکھی ہے۔

نازک۔ (مسکرا کر) ارے! (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) یہ تم ہمارا نام کہاں سے جان گئے صاحب۔

دولھا۔ اب مشہور عورت ہیں۔ یا ایسی ویسی۔ آپ کو کوئی نہیں جانتا۔ کوئی ایسا بھی ہے، جو حضور سے واقف نہیں۔

نازک ادا۔ تمہیں اللہ کی قسم بتاؤ۔ ہمارا نام کہاں سے جان گئے۔

مبارک محل۔ بڑی ڈھیٹ ہیں۔ اس طرح باتیں کر لی ہیں جیسے برسوں کی بے تکلفی ہے۔ ہنسی مذاق، چہل اور شے ہے، اور یہ اور بات ہے۔

نازک ادا۔ اے تو تم کو کیا اس سے۔ اس کی فکر ہو گی۔ ہمارے میاں کو تم کاہے کو کانپتی جاتی ہو۔ یہ جانی بیگم کہاں چل دیں۔

مغلانی۔ (بوڑھی، اُونہہ! اونہہ (آہستہ سے)، اِن سے آپ نہ جیت سکیں گے ان کے منہ ہی نہ لگیے۔ نہیں تو سینکڑوں ہی سنائے گی۔

مبارک ادا۔ نوج ایسی زبان دراز منہ پھٹ کوئی ہو۔

دولھا۔ آپ کے میاں سے اور ہم سے بڑا یارانہ ہے۔

نازک۔ اے لو کیسا کچھ۔ یارانہ نہیں وہ ہے۔ وہ بیچارے کسی سے یارانہ نہیں رکھتے۔ اپنے کام سے کام ہے۔ کم کھانا اور خوش رہنا بس۔

دولھا۔ میں خوب واقف ہوں۔ بھلا بتاؤ تو ان کا نام کیا ہے۔ نام تو لو جانیں، کہ بڑی بے تکلف اور رنگین ہو۔

نازک۔ ان کا نام۔ ہمارے میاں کا نام! ادھر اُدھر دیکھ کر) ان کا نام سنجر سطوت ہے۔ (مسکرا کر)

دولھا۔ اُفوہ۔ بس اب ہم ہار گئے۔ قسم خدا کی میں ہار گیا۔

مبارک محل۔ ان سے کوئی جیت ہی نہیں سکتا۔ زبان اس قدر کی چلتی ہے، کہ شاید سلطانی شترخانے کی سانڈنیاں بھی نہ چلتی ہوں گی۔ جب مردوں سے ایسی بے تکلف ہیں تو ہم لوگوں کی اصل حقیقت ہی کیا ہے۔ مجھے ان کی باتوں سے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ایسی بے باکی نہیں چاہیئے۔

نازک ادا۔ اپنی اپنی طبیعت اس میں کسی کا اجارہ نہیں ہے۔

دولھا۔ ہم تو آپ سے بہت خوش ہوئے۔ خدا کرے روز دو دو باتیں ہو جایا کریں۔ بڑی ہنس مکھ اور خلیق ہو۔

جب سب رسوم ہو چکیں تو دولھا اور دُلھن یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ پردہ گرایا گیا۔ دولھا کی بہنیں اور رشتہ دار سوار ہوئیں۔ دولھا کے مکان پر داخل۔ یہاں تھوڑی دیر تک گانا ہوا۔ اُس کے بعد نواب صاحب محلسرا میں تشریف لے گئے۔ ثریا بیگم نے کہا۔ اُفوہ آج بہت تھکے۔

نواب۔ نازک ادا بیگم تو بڑی شوخ، اور رنگین معلوم ہوتی ہیں۔ بعض بعض موقعوں پر میں شرما جاتا تھا۔ مگر وہ نہیں شرماتی تھیں۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ جو میری بیوی ایسی ہو، تو دم بھر مجھ سے نہ بنے۔ غضب خدا کا غیر مرد سے اس بے تکلفی سے باتیں کرنا ستم ہے یا نہیں، شوخی بھی تو کہاں تک۔

ثریا بیگم۔ مجھے خود حیرت ہے کہ کن لوگوں میں رہی ہے۔

نواب۔ تم نے کبھی پہلے تو ان کو کاہے کو دیکھا ہو گا۔

ثریا بیگم۔ توبہ توبہ۔ مفت کی ماں بھی مل گئی، اور مفت کی بہن بھی بن بیٹھیں۔ اور میاں بھی مل گئے۔

نواب۔ افوہ ایجاب و قبول کے وقت کس قدر غمزے اور نخرے کئے ہیں۔ کہ الاماں۔ مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ بی صاحب بولتی ہی نہیں، اور یہ کسی کو خبر ہی نہیں۔ کہ ہاتھی پر سوار ہو کر شکار کھیلنے گئی تھیں، اور مہینوں بے حجاب ادھر ادھر گھومائیں۔

ثریا بیگم۔ مجھے خود ہنسی آتی تھی۔ مجھے اپنی بپتا پر ہنسی آتی ہے۔

نواب۔ اور مجھے کئی باتوں پر ہنسی آتی تھی۔ ایک تو یہ کہ تم بنتی اس قدر تھیں۔ دوسرے یہ کہ تمہاری فرضی ماں میرے ساتھ اس طرح پیش آئی تھیں۔ جیسے کوئی خاص اپنے داماد کے ساتھ پیش آتا ہے۔

ثریا بیگم۔ سنئے بندہ پرور۔ اب نازک ادا بیگم وہاں جھانکنے نہ پائیں گی۔ یہ بھی یاد رہے۔ کہ محبت کی نظر سے گھور رہے تھے کیوں صاحب۔

نواب۔ اس بہتان کے صدقے تم نے کیوں کر دیکھ لیا۔

ثریا بیگم۔ کیوں خدانخواستہ کم سوجھتا ہے کچھ۔؟ ابھی تو اللہ کی عنایت سے روشنی بدستور ہے۔ یہ خوب بات پوچھی۔

نواب۔ گردن جھکائے ہوئے دُلھن تو بنی بیٹھی تھیں۔ یہ کیوں کر دیکھ لیا کہ میں گھور رہا تھا اور ایسی خوبصورت تو کچھ ہیں نہیں اللہ اللہ!

ثریا بیگم۔ مجھ سے جانی بیگم نے قسمیں کھائیں کہ گھور رہے تھے۔

نواب۔ ارے غضب تو ان کی باتوں کا تم کو یقین ہوگا ہم کو یقین نہیں ہے۔ زمانے بھر کی شوخ طبیعت ۔۔۔ وہ لڑواتی ہیں۔

ثریا بیگم۔ سُنیئے۔ اگر میں نے سُن پایا، کہ آپ نے کوئی گھر والی یا نوکر رکھی، یا ادھر ادھر آوارگی کرنے لگے۔ تو مجھے ایک دم بھر نہ بنے گی۔ ہاں یہ یاد رکھیئے گا کہ میں یہ نہیں دیکھ سکتی۔

نواب۔ کیا مجال قسم خدا کی۔ کیا طاقت۔ ایسی بات ہے بھلا۔

ثریا۔ ایک جانی بیگم پر کیا فرض ہے۔ حشمت بہو نے کہا۔ مہریوں نے کہا کیا کچھ چھپی ہوئی بات تھوڑا ہی ہے۔ اور ہاں خوب یاد آیا۔ بھول ہی گئی تھی کیوں صاحب یہ نارنگیاں پھینکنا اور کھینچ مارنا کیا معنی، ان کی شوخی کا ذکر کرتے ہو، اور اپنی شرارت کا حال نہیں سُن کہتے۔

نواب۔ جب اس نے دق کیا، تو میں بھی مجبور ہو گیا۔ پھر

ثریا بیگم۔ کس نے دق کیا۔ وہ بھلا بیچاری کیا دق کرتی۔ تم کو، تم مرد، وہ عورت ذات، بھلا کوئی بھی مقابلہ ہے۔

نواب۔ وہ سوا مرد ہے۔ مرد اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ مردوں کی کیا حقیقت ہے۔ آخر میں بند ہی ہو گیا تھا۔

ثریا بیگم۔ یہ اخبار اتنے رکھے ہیں، اور پڑھتے پڑھاتے ایک نہیں، ذرا دو گھڑی کوئی اخبار ہی سناؤ، وہ بڑا اخبار اٹھاؤ۔ نواب صاحب نے ایک اخبار اٹھایا۔ دو چار خبریں سنائیں۔ اس کے بعد ایک خبر پڑھ کر ہنس دیئے ثریا بیگم نے پوچھا ہنستے کیا ہو۔ کیا اس میں ایک عجیب خبر درج ہے۔

ثریا بیگم نے اصرار کیا تو نواب صاحب نے یوں سُنایا۔ ؎

فغاں کیں لولیانِ شوخ شیریں چشم شہر آشوب

چناں بُروند صبر از دل کہ ترکان خوان یغما را

اَیُّہا النَّاظِرِین۔ ایک بتِ سفاک، ستمگر، جور پیشہ، نے مار ڈالا۔ عشق نے ایسا چرکا دیا کہ کہیں کا نہ رکھا، شبّو پادیا شبّو جان نامی ایک گل پیرہن، پر جان جاتی تھی۔ ہائے سونے کی چڑیا پھنسی تھی۔ مگر ہاتھ سے نکل گئی۔ پھر سے اُڑا دی۔ میرے خدمت گار سلارو سے خدا سمجھے، مجھے اس مرغنے نے کہیں کا نہ رکھا۔ سونے کی چڑیا اڑا دی۔ اور میں سون کھینچ کے رہ گیا۔ یا۔ خدا اگر میری کا سُن لے تو کیا کہنا ہے۔ شبّو جان پیاری اب کیوں کر نظر آئے۔ وہ گورے گورے گال، اور وہ کالی کالی کیل، وہ سفید سفید کلائیاں۔ اور حنائی ہاتھ۔ اس سلارو سے خدا سمجھے کہ بھڑے دے کر ایسی پری کو جس کو میں شیشے میں اتار چکا تھا بھگا دیا۔ واضح ہو کہ شبّو جان بصد آن بان، ایک روز بوقت شب دیجور راہ میں ملیں۔ قریب آئیں تو دیکھا کہ ایک پری چہرہ، سفید پوش، اینڈتی ہوئی سامنے سے چلی آتی ہے۔ اس نے مجھکو گھورا میں نے اس کو۔ وہ میری جوانی اور کرارے ہاتھ پیر اور ورزش کے بدن اور خوب روئی پر عاشق ہوگئی۔ میں اس کی جوانی اور برنائی خوبصورتی اور رعنائی پر ریجھا۔ غڑاپ ہاتھ پکڑا۔ ہاتھ پکڑنا تھا کہ اسنے کہا۔ کیا ایک دن ہاتھ دیتے ہو دوسرے دن چھوڑ دو گے میں نے کہا کیا مجال۔ قولِ مرداں جان دارد۔ بس ساتھ ہوئی۔ میرا آدمی سلار بخش نہیں۔ سلارو۔ اس مردود کو سلارو ہی کہنا چاہیے۔ وہ کم بخت ساتھ تھا۔ اس کو بُرا معلوم ہوا۔ بس گھر پر آن کر مجھ سے اور شبّو جان سے نکاح ہوا۔ میں عرض نہیں کر سکتا۔ کہ حُسن اور جمال کی چھوکری ہے۔ کوئی مسا کر کے انیس برس کی یا تیرہ سولہ کی ہوگی۔ سولہ سے زیادہ نہ تھی۔ سلارو نے بھگا دی۔ یا بیچ ڈالی یا بہکا دیا۔ اگر کوئی صاحب پتا لگا دیں تو احسان ہوگا۔

راقم آثم بندہ۔ وکیل سرکاری نزد پوسٹ ماسٹر صاحب۔ ثریا بیگم یہ مضمون سُنکر مسکرائی۔ مگر دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ کہ وکیل صاحب نے اچھی بے پر کی اڑائی نواب صاحب اس حال سے واقف نہ تھے، کہ شبّو جان ان کی بغل میں بیٹھی ہیں۔ ہنس کر کہا کوئی پاگل یا مسخرہ ہے۔ شبّو جان خاموش رہیں۔ اس کے بعد نواب صاحب نے پھر قہقہہ لگایا اور بیگم صاحب کو مضمون سُنایا۔ سنو صاحب جو یہ شخص ایک مرتبہ یہ مضمون چھپوا چکا تھا، اور بندہ خاموش رہا۔ آج میرے ایک دوست نے مجھسے کہا کہ اے نامعقول تو بھی جواب لکھ۔ میں اپنا سر کھجلانے لگا پھر مجھسے کہا کہ اے جواب نہیں لکھتا۔ میں نے کہا میں ایسے پاجیوں کے مُنہ نہیں لگتا۔ جب دوست نے اصرار کیا تو جانتے ہو کہ یہاں عمر بھر بھاڑ جھونکا کیے۔ کچھ لکھے پڑھے تھوڑا ہی ہیں۔ اس نے کہا ہم لکھ دیتے ہیں ہم نے کہا بیش سو یہ جواب ہے۔

شبّو جان ان کی منکوحہ نہ تھی۔ اس کی ہم قسم کھاتے ہیں، مگر اتنا ہم نے شبّو جان ہی کی زبان سے سُنا تھا کہ انھیں کی خالہ ہیں۔

ثریا بیگم۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑیں) کسی بڑے مسخرے کا لکھا ہے۔

نواب۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ دونوں کے دونوں پاگل معلوم ہوتے ہیں۔

ثریا بیگم۔ ہاں آگے پڑھو، تو آگے کیا لکھا ہے۔ اُفّوہ۔ توبہ۔

نواب۔ ہاں آگے لکھا ہے (آپ فرماتے ہیں کہ کس حسن و جمال کی چھوکری ہے، واہ کبھی چھوکری بناتے ہو کبھی شبّو جان کبھی بیوی، کبھی خالہ۔ اور ایک جگہ مجھے مُرغ بنایا ہے۔ ایسے چونچ بھی کسی نے نہ دیکھے ہوں گے۔

ثریا بیگم۔ (ہنسکر) اللہ یہ کون شخص ہے۔ کوئی مسخرا ہے کیا۔؟

نواب۔ نہیں کوئی بڑا متین آدمی ہے صریح سُنتی جاتی ہو۔ مگر ابھی تک مسخرے ہونے میں شک ہے۔ سبحان اللہ۔ یہ مسخرا اس کا باپ مسخر الدولہ خیر سنو۔ ٹوٹے ہوئے مکان کو محل مقرر کیا۔ اور چھپر کا نام رکھا بنگلہ۔ اور ٹٹوؤں کے وہ مرے ٹٹوے اصطبل کے گھوڑے بنائے۔ واہ رے گدھے۔

اخیر میں نواب صاحب نے نام پڑھا تو (سلارو) سلارو کی جگہ پر ثریا بیگم کو بے اختیار ہنسی آئی۔ اس قدر ہنسیں کہ ضبط کرنا محال تھا۔ نواب صاحب نے کہا مضمون تو واقعی اس قابل ہے کہ جس قدر زیادہ ہنسی آئے کم ہے مگر سلارُو نام تو اس قدر ہنسی کے لائق نہیں۔

نواب صاحب اس حیرت میں تھے کہ سلارُو نام سُنکر یہ اس قدر کیوں ہنسیں، اور وہاں سلارو اور نیو انجنٹ دونوں کی صورت نظروں تلے پھر گئی۔ کل باتیں یاد آگئیں۔ ثریا بیگم کو ایک خیال البتہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہیں نواب صاحب کو یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں۔ ان سے کل اُمور جہاں تک مخفی رکھے جائیں وہیں تک اچھا ہے۔

نواب صاحب اس مضمون کو غور سے پڑھنے لگے ثریا بیگم کی نظر جو اخبار پر پڑی تو انہوں نے (آزاد) پڑھا۔

ثریا بیگم۔ ذرا یہ اخبار ہم کو دینا۔ ابھی دے دوں گی۔ لاؤ ذری۔

نواب۔ ایک ضروری مضمون پڑھ رہا ہوں ابھی دیتا ہوں ٹھہر جاؤ۔

ثریا بیگم۔ اور ہم چھین لیں تو۔ اچھا زور زور سے پڑھو ہم بھی سُنیں۔

نواب۔ تم کو اس کا حال کیا معلوم ہے۔ ایک شخص ہیں۔ آزاد۔ محمد آزاد۔

ثریا بیگم۔ کون آزاد اے وہ تو نہیں جس کو کسی بیگم نے کسی ملک کو بھیجا تھا۔

نواب۔ انھوں نے ایک بڑی فتح پائی۔ بڑی تعریف چھپی ہے۔

ثریا بیگم۔ سنائیے۔ اللہ کرے وہ سُرخ رُو ہو کر آئیں۔ آمین۔

نواب۔ تم ان کو کہاں سے جانتی ہو کیا کبھی دیکھا ہے۔
ثریا بیگم۔ واہ دیکھا کسی اور نے ہوگا اُن کو ہم نے تو ان کا ذکر سنا ہے۔ کہ مسلمانوں کے بڑے دوست ہیں۔ اور کس لیے گئے ہیں کہ ترکوں کا ہاتھ بٹائیں اللہ ایسے باحمیت مسلمان کو صدوسی سال کی عمر دے۔
نواب۔ اس وقت جی خوش ہوگیا کہ تم اپنے مذہب میں پکی ہو۔ آزاد کے لیے دل و جان سے دعا دو کہ وہ کامیاب ہو۔ اس کے بعد نواب صاحب نے مضمون سُنایا۔ ثریا بیگم بہت مسرور ہوئیں گیارہ بجے تخلیہ ہوا۔

ہمایوں فر کی نسبت شک

اب سُنیئے کہ مرزا ہمایوں فر بہادر کے دوبارہ زندہ ہوجانے کی خبر گھر گھر مشہور ہوئی۔ انگریزی اخباروں کے نامہ نگاروں نے تار کے ذریعہ سے اڈیٹروں کو اطلاع دی۔ اردو اخباروں میں مختلف طرز کے بیان چھپے۔ ایک اخبار نے اس کل معاملے کو خدا کی قدرت پر چھوڑا۔ لکھا کہ ہمارے ملک کے شہزادۂ گردوں مدار، وجم اقتدار، حضور پرنس ہمایوں فر بہادر، کا دوبارہ زندہ ہونا اصلاً مقام حیرت نہیں۔ خدا بڑا مسبّبُ الاسباب ہے۔ پس جو لوگ حیرت کرتے ہیں، وہ بر سر غلط ہیں۔ انھوں نے خدا کی قدرت ابھی تک نہیں پہچانی۔ ہم نے مرزا ہمایوں فر بہادر کو اس مرتبہ نہیں دیکھا۔ مگر ہزاروں آدمیوں نے شہادتیں دیں، کہ وہی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی ماں نے ان کو پہچانا۔ ان کی بہنوں نے پہچانا۔ ان کے احباب نے پہچانا۔ اور حسب پابندی قواعد و اصول شرع متین نکاح بھی ہوگیا۔

مرزا ہمایوں فر کا دوبارہ زندہ ہوجانا، نئے فیشن کے نوجوانوں خصوصاً نیچریہ لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہے لیکن وہ لوگ اس قدر متعصب ہیں کہ اس امر اہم کو خلافِ نیچر سمجھ کر کہتے ہیں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ حالاں کہ بچشم خود کل امور دیکھ رہے ہیں مگر تعصب سے خدا سمجھے۔

یہ ایک اڈیٹر صاحب نے رائے ظاہر کی۔ دوسرے اخبار کے اڈیٹر نے جو نیچری تھے۔ اس کے خلاف یوں لکھا آج کل جس اخبار کو کھولو جس پرچے کو دیکھو۔ جس صحیفے پر نظر ڈالو، مرزا ہمایوں فر کے دوبارہ زندہ ہونے کی خبر ضرور درج ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سارا زمانہ دیوانہ ہوگیا ہے۔ اور سب کو فصد کی ضرورت ہے۔ اگر گورنمنٹ ہمارا کہنا مانے تو ہم بھی صلاح مانیں کہ سب کو ایک سرے سے پاگل خانے بھیجئے۔ غضب خدا کا اچھے اچھے پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ آدمیوں کو یقین واثق ہے کہ واقعی ہمایوں فر زندہ ہوگئے۔ استغفر اللہ اس ضعیف الاعتقادی کے صدقے یارو آخر کچھ عقل بھی رکھتے ہو۔ مردے بھی کہیں زندہ ہوئے ہیں، ہم جانتے ہیں، کہ نواب شہزادی بیگم نے اس معاملے میں بہت کچھ روپیہ صرف کرکے لوگوں کو یقین دلایا کہ مرزا ہمایوں فر ہی ہیں۔ جب ماں نے اپنا بیٹا اور

اور بہنوں نے بھائی تسلیم کر لیا، تو پھر کسی اور کو کیا پڑی ہے کہ انکار کرے اور کون نہیں جانتا کہ نواب شہزادی بیگم خوشامد پسند شہزادی ہیں۔ بس ان کے خوف کے مارے کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ ہاں میں ہاں ملانے والوں کو خدا سلامت رکھے، اچھا فقرہ چست کیا۔ بھلا کوئی ذی عقل بھی اس بات کو تسلیم کرے گا کہ ایک درویش کی دعائے خیر اور برکت سے مُردہ جی اٹھا۔ قبر بدستور بنی کی بنی رہی۔ اور مرزا ہمایوں فر بہادر موجود ہو گئے۔ جو لوگ اس کو باور کریں اُن سے زیادہ احمق کوئی نہیں۔ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ کہ یہ لوگ اِن باتوں کو کیوں کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ ہمارے ملک کا ہونہار شہزادہ ہمایوں فر بیچارہ تو چل بسا اور اب اس کا زندہ ہونا معلوم۔ یوں کہنے کو جس کا جو جی چاہے کہہ لے۔ کوئی کسی کی زبان نہیں روک سکتا۔

ہم چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ اس بارے میں کامل تحقیقات کرے۔ جن لوگوں کو مرزا ہمایوں فر بہادر کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ ان سے دریافت کیا جائے۔ وہی ہیں یا کوئی اور۔ بہتر ہے کہ قبر کھودی جائے۔ ابھی تک کفن میلا نہ ہوا ہو گا۔ دیکھا جائے کہ قبر میں لاش ہے یا نہیں۔ بس ساری قلعی کھل جائے گی۔

ایک اور اخبار کے اڈیٹر نے یہ رائے زنی کی۔

ہم نے ایک نامہ نگار کے ذریعے سے ایک عجیب حیرت خیز خبر سُنی ہے۔ جس کا ہم کو مطلق اعتبار نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شہزادۂ ہمایوں فر جن کو ایک شقی القلب سفاک نے نہایت بزدلی کے ساتھ عین برات میں قتل کیا۔ ایک شاہ صاحب کی دعا سے زندہ ہو گئے۔ شاہ صاحب کی نصیحت اور حکم کے موافق نواب سپہر آرا بیگم شب کو بن ٹھن کے شہزادۂ مبرور کی قبر پر گئیں۔ قلعہ معلیٰ میں حضرت شاہ نور اللہ مرقدہٗ کے قبر کی پاس جہاں شہزادہ کا مقبرہ بنا ہے۔ گھوڑے کی باگ روکی۔ اس وقت قلعہ معلیٰ میں ہجوم عام اور بڑا ازدحام تھا۔ ہزار ہا آدمی جمع تھے۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے دور دور سے لوگ آئے تھے۔ بعض کو یقین تھا کہ اس سب کا نتیجہ یہ ہو گا کہ سپہر آرا بیگم خدانخواستہ صدمۂ جان کاہ کی تاب نہ لا سکیں گی۔ اور ان کے دشمنوں کی جان جائے گی مگر خدا کی شان شاہزادۂ ہمایوں فر فرس باد رفتار پر سوار سامنے سے نظر آئے۔ کئی آدمی گر پڑے۔ اکثروں کو غش آ گیا اور بعض سکتے میں تھے کہ یا خدا ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ مگر اس میں کسی کو شک نہیں کہ ہمایوں فر ہی ہیں۔ ہمارے نامۂ نگار صاحب نے شہزادہ کو پاس سے بچشم خود دیکھا اور وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ لیکن ہا ابہمہ ہمیں یقین نہیں آتا۔ ہمارا قصد ہے کہ خود جا کر دیکھیں، اور لوگوں سے پوچھیں اور خود حضور مرزا ہمایوں فر بہادر سے ملیں، اور زبانی گفتگو کریں تاکہ یہ شکوک رفع کریں۔

ایک آزاد اخبار نے جس کی ملک میں بڑی وقعت تھی۔ یوں رائے ظاہر کی کہ آج ہم نے عجب طرح کی خبر سُنی ہمارے نامہ نگار صاحب نے جو بڑے معتبر اور راست باز مولوی ہیں۔ ایسی خبر لکھی کہ باوصف اُن کے تقدس کے

ہمیں اس کا یقین نہیں آتا۔ فرماتے ہیں کہ شاہزادۂ مرزا ہمایوں فر ایک فقیر خدا رسیدہ کی دعا سے زندہ ہوگئے۔ اور لطف یہ کہ قبر بدستور رہی، اور شاہزادہ محتشم الیہ قلعے کے پھاٹک سے کیت گھوڑے پر سوار ہو کر کڑکڑاتے ہوئے تشریف لائے۔ ہم یہ سطریں لکھ رہے تھے کہ دو انگریزی اخباروں میں سے اسی مضمون کے تار نظر آئے۔ ایک نے لکھا ہے کہ دپرنس مرزا ہمایوں فر کی نسبت یہاں مشہور ہے کہ وہ زندہ ہوئے) دوسرا لکھتا ہے دشہزادہ ہمایوں فر جن کے قتل کا حال درج اخبار ہوا تھا۔ زندہ ہو گئے ہیں۔ اس میں کچھ راز ضرور ہے۔ ان کا زندہ ہونا معلوم۔ اس کا تو کسی دشمنِ عقل ہی کو یقین آئے گا اور ایسے سست اعتقاد شاید دنیا میں دو ہی چار ہوں گے۔ ہمارے نزدیک اس معاملے میں گورنمنٹ کو پوری پوری تحقیقات کرنی چاہیئے۔

اچھی دل لگی ہوئی۔ ہم نے اپنے معزز نامہ نگار کو لکھا ہے کہ اس معاملے میں جہاں تک سچی سچی خبریں سُنیں ان سے ہمیں وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہیں۔

ان سب سے زیادہ سخت رائے ایک اخبار نے ظاہر کی جس کا مطلب بطریقِ خلاصہ یہ ہے۔

ہمارے ایک ہم عصر کی از بس صحیح ہے کہ سارا زمانہ پاگل ہوا چاہے ہم کو بھی انھیں لوگوں کے زمرہ میں سمجھ لو۔ آج کل ساری دنیا میں ہلڑ مچا ہوا ہے۔ کہ شہزادۂ ہمایوں فر جی اُٹھے۔ افسوس ہے۔ ہمارے ملک کے ساتھ اس قسم کے ضعیف خیالات وہ کرتے ہیں۔ جو موت جان کے ساتھ کرتی ہے۔ اس ضعیف الاعتقادی نے ہندوستان کو کہیں کا نہ رکھا۔ چھینکتے کوئی کام نہ کریں بلّی راستہ کاٹ جائے۔ تو گھنٹوں کھڑے رہیں۔ دو گدھے سڑک کے اِدھر اُدھر ہوں تو بیچ سے جانا گناہ ہے۔ اب یہ شگوفہ چھوڑا کہ مرزا ہمایوں فر بہادر، جن کے قتل کی خبر ابھی کل ہی مشتہر ہو چکی ہے جیتے جاگتے ہیں۔ یہ شہزادہ ایسا ہوشیار، اور فہمیدہ، اور لایق اور خلیق تھا کہ اس کے قتل اور وفات کا سارے عالم نے رنج کیا دُور دور تک لوگوں کو کمال افسوس ہوا، کہ ایسا خوبصورت اور نیک سیرت، اور وضعدار شہزادہ اس بے رحمی سے قتل کیا جائے۔ اس کی جوانی اور شہزادی بیگم کی پیرانہ سالی پر افسوس آتا تھا۔ اگر مرزا ہمایوں فر زندہ ہیں، تو ہمیں خوشی کا مقام ہے۔ مگر یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ یا تو قتل کی خبر غلط یا زندہ ہونے کی خبر پوچ۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے قاتل نے پھانسی پائی تھی۔ یا نہیں۔ لیکن اگر اس نے پھانسی پائی اور اب ہمایوں فر زندہ ہو گئے تو کبھی یہ خبر ہمارے نزدیک اس قابل نہیں کہ کوئی عقلمند آدمی اس سے لحاظ کرے۔ بلکہ ہمارے نزدیک اس سے بڑھ کر بیوقوف نہیں، جو اس کا ذرا بھی یقین لائے۔ گورنمنٹ پر فرض ہے کہ اس معاملے میں باضابطہ تحقیقات کرے ممکن ہے کہ کوئی شخص شہزادی بیگم کو بہکا کر ہمایوں فر بن بیٹھا ہو۔ ممکن ہے کہ یہ شخص کہ جو اپنے کو ہمایوں فر مشہور کرتا ہے شہزادہ کا ہمشکل ہے۔ اب اس کو اچھا موقع ملا۔

—

شہزادی بیگم کی نصف جائداد کا مالک بن بیٹھا۔ گورنمنٹ کو اس امر میں یہ انتظام کرنا چاہیئے۔

ایک۔ جن لوگوں سے مرزا ہمایوں فر سے زیادہ رسم تھا ان کو بلاکر دریافت کرے کہ یہ وہی ہیں یا کوئی اور۔ وہ لوگ ان کا امتحان لیں۔ تخلیے میں جو باتیں ہوئی ہیں وہ دریافت کریں، اگر ہمایوں فر ہیں تو بے شبہ سب باتیں بتادیں گے، اور امتحان میں پورے اُتریں گے۔ اگر ہمایوں فر نہیں ہیں، تو آئیں بائیں شائیں بکنے لگیں گے۔

دوسرا۔ جن حکام سے ملاقات تھی، وہ بطور خود کل اُمور کو جانچیں۔ شہزادے سے ملیں، اور دیکھیں کہ جس طرح ہمایوں فر ملتے تھے اسی طرح ملتے ہیں یا نہیں۔

تیسرا۔ قبر فوراً کھدوائی جائے اور دیکھا جائے کہ ہمایوں فر ہی کی لاش ہے یا کسی اور کی۔ اس سے بڑا بھید کھلے گا۔ انگریزی اخباروں نے بھی ایسی ہی رائے ظاہر کی۔ حاکم ضلع نے انسپکٹر پولیس، اور صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو بلایا، اور تخلیئے میں ان سے یوں گفتگو کی۔

کلکٹر۔ مرزا ہمایوں فر از سرِنو زندہ ہو گئے۔ یہ کیا بات ہے۔

کپتان۔ خدا جانے یہ کیا ماجرا ہے۔ اور سارا شہر کہتا ہے کہ وہی ہیں۔ ہم نے ان کو کبھی دیکھا نہیں۔ میں ابھی مقرر ہو کے آیا ہوں۔

کلکٹر۔ ہمیں سخت تعجب ہے کہ یہ لوگ یقین کیوں کر کر لیتے ہیں۔

کپتان۔ حضور یقین تو ہم کو بھی ہے اور کیونکر نہ ہو۔

کلکٹر۔ ایک اخبار نے رائے دی ہے کہ قبر کھودی جائے۔ اور ایسا ضرور ہو گا ہم کل تک حکم دیں گے۔ کہ قبر کھودی جائے۔

انسپکٹر۔ ہاں کچھ تو حال ضرور ہی معلوم ہو جائے گا۔ اچھی بات ہے۔

کلکٹر۔ دنیا بھر کہے مگر ہم باور نہ کریں گے۔ اور کیوں کر باور کریں۔

انسپکٹر۔ آپ خود شہزادی بیگم تک چلے چلیں تو سبحان اللہ۔ ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ اور ہمایوں فر سے بھی ملیئے۔

صاحب کلکٹر نے کہا ہم بلا اطلاع دیئے ہوئے چلتے ہیں۔ تاکہ دفعتہً ان کے مکان پر پہونچ جائیں، اور فوراً شہزادے کو بلائیں۔ الغرض حکام اور انسپکٹر گھوڑوں پر سوار ہوئے، اور دن سے شہزادی بیگم کے مکان پر موجود۔ یورپین حکام کی صورت دیکھ کر نوکر چاکر آدمی گھبرائے کہ خیر باشد، سب سے بڑھ کر خیال یہ ہوا کہ کوتوال صاحب کیوں ساتھ ہیں۔

مرزا ہمایوں فر کے بھائی نے سب سے ہاتھ ملایا۔ عزت کے ساتھ بٹھایا، اور باتیں کرنے لگے۔

صاحب۔ شہزادہ صاحب زندہ ہو گیا۔ آپ کو مبارک ہو۔

بھائی۔ تسلیم۔ میں آپ کی ہمدردی کا کمال شاکر ہوا۔

صاحب۔ کہاں ہے شہزادہ صاحب۔ آپ ہمارا اطلاع دیں۔

بھائی۔ وہ تو محلسرا میں ہیں، مگر میں خود اطلاع کر دوں گا۔ آپ تشریف رکھیے میں حاضر ہوتا ہوں۔

زنانے میں خبر ہوئی تو شہزادی بیگم نے کہا ہم بلا حکم کے ان کو اب باہر نہیں بھیج سکتے۔ پہلے شاہ صاحب سے اجازت لاؤ پھر ان کو لے جاؤ۔ اس میں صاحب ہوں، یا کوئی ہوں۔ سپہر آرا کو جو خبر ہوئی تو شہزادے کا دامن پکڑ کے بیٹھ گئی۔ کہا بھلا تم جاؤ تو۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ہم نہ اُٹھنے دیں گے۔ تم باہر جانے کا نام زبان پر لاتے ہو۔ ہمیں وہم ہوتا ہے از برائے خدا کچھ دن تو کہا مانو۔ شہزادہ بوسہ لے کر بولا، بدلو جان اس وقت کیا معنیٰ جس وقت کہو جاؤں کہو نہ جاؤں۔ ایک ادنیٰ سی بات کے لیے اس قدر اصرار کیوں کرتی ہو دل و جان سے فرماں بردار ہوں۔ خدا کرے ہم دونوں عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

اب سنیے کہ شاہ صاحب رنگ لائے۔ ان سے جو دریافت کیا گیا کہ مرزا ہمایوں فر کی ملاقات کو صاحب کلکٹر آئے ہیں جائیں یا نہ جائیں۔ ملیں یا نہ ملیں۔ تو صاف انکار۔ ہرگز نہ ملیں۔ محل سرا سے باہر آئے اور ہیں چل دیا۔ بذریعہ تحریر ملاقات ہو۔ صاحب کلکٹر سے کہا گیا تو انہوں نے گردن ہلائی۔ کہا اچھا ہم کچھ لکھ دے آپ شاہزادے کو دیں، اور اس کا جواب لا دیں۔ شہزادی بیگم نے کہا ہاں اس میں عذر نہیں ہے۔ مرزا ہمایوں فر نے خط پڑھا اور اس کا جواب لکھا۔

My Dean Sin

Yes, I am Prince Homayun fon Bahadun I don't Know Whethen I was deaddine but I have — to Know one Thing That There ane Centain secret fonces in natune bejau the good of the Eunopians foun sincenely Minza Homayun fas.

صاحب کلکٹر نے پڑھا تو مسکرائے اور کپتان صاحب بھی ہنسے۔ کلکٹر صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ہمایوں فر کی تحریر کا اس سے مقابلہ کیا تو یکساں۔ جب صاحب ممدوح بنگلے سے آئے تھے تو مرزا ہمایوں فر کا ایک خط ساتھ لائے تھے۔ دونوں کو ملایا تو بالکل ایک اور لُطف یہ کہ اس خط میں Beyond لفظ تھا اور اس خط میں بھی۔ اور وہ دونوں میں (a) ملا۔

کلکٹر۔ اب ہم کو شک نہیں باقی ہے۔ بیشک وہی ہیں۔

کپتان۔ ہاں خط تو بالکل ایک ہے اور Beyond اس میں بھی (a) سے اس میں (a) سے ہے

مگر ملاقات سے کیوں انکار کیا۔

انسپکٹر۔ شاہ صاحب کا حکم نہیں ہے۔ وہ فقیر جس نے دعا دی تھی۔

کلکٹر۔ اس کا حکم مانتے ہیں، اور ہمارا حکم کوئی نہیں مانتا۔

کپتان۔ (مسکرا کر) اچھا کہیئے دور سے دیکھ سکتے ہیں۔ یا یہ بھی نہیں۔

شاہ صاحب سے دریافت کیا گیا فرمایا سایہ تک نہیں دیکھ سکتے۔ اس پر دونوں حاکموں کو غصہ آیا مگر خاموش ہو رہے۔ کچھ کہنے کا موقع تو تھا ہی نہیں۔ شاہ صاحب کو دل ہی دل میں بُرا بھلا کہا۔ صاحب کلکٹر ہمایوں فر کے بھائی کو علیحدہ لے گئے۔ پوچھا آپ کو خوب معلوم ہے کہ یہ ہمایوں فر ہی ہیں۔

کلکٹر صاحب نے مرزا ہمایوں فر کے بھائی سے ایک گھنٹے کامل تخلیئے سے باتیں کیں، اور خوب سمجھایا کہ آپ پھر جا کر غور و تعمق سے دیکھیئے کہ وہی ہمایوں فر ہیں، یا کوئی اور۔ وہ لڑکا ہنسا اور ہنس کر بولا۔ آپ کو یقین ہی نہیں آتا۔ میں پردہ کرائے دیتا ہوں۔ آپ خود چل کر گفتگو کر لیجئے۔ دونوں حکام اس پر راضی ہوئے۔ لڑکے نے جا کر شہزادی بیگم سے کہا۔ اماں جان پردہ ہو جائے تو وہ آکے دیکھ لیں۔

شہزادی بیگم۔ نا پہلے شاہ صاحب سے دریافت کر لو بیٹا۔

لڑکا۔ اس میں کیا حرج ہے اماں جان۔ یہ تو کوئی قباحت کی بات نہیں ہے۔ پھر گھڑی گھڑی شاہ صاحب کو کیوں دق کریں آیندہ جو آپ کی رائے ہو۔

شہزادی بیگم۔ مہری۔ جاکے دریافت کر لو۔ ہماری طرف سے آداب عرض کرو۔ اور کہو پوچھتی ہیں کہ صاحب لوگ اوپر جا کر دیکھ لیں۔ صرف یہی غرض ہے۔

مہری۔ (تھوڑی دیر کے بعد) حضور فرمایا کہ شہزادے شہ نشین میں رہیں۔ چوطرفہ سے بند ہو۔ باتیں کرنے میں ہرج نہیں۔ مگر چار آنکھیں نہ ہونے پائیں۔

شہزادی بیگم۔ جاؤ کہہ دو۔ ہم اوپر بندوبست کئے دیتے ہیں۔ مرزا ہمایوں فر سے جب شہزادی بیگم نے یہ سب بیان کیا تو کھِل کھِلا کر ہنس پڑے۔ یہ کہہ کر شہزادی بیگم چلی گئیں، اور ادھر سپہر آرا نے ہزاروں قسمیں دیں کہ واسطے خدا کے تم تلے جانا، بس تمہاری صورت ان کو نہ دیکھنے دوں گی۔

اتنے میں دونوں حکام مع انسپکٹر صاحب کے آئے۔ دو نواب زادے ہمایوں فر کے اعزہ ہمراہ تھے۔

کلکٹر۔ ول پرنس۔ ہمایوں فر، یہ سب کیا بات ہے۔

شہزادہ۔ خدا کے کارخانے ہیں۔ ان باتوں میں کسی کو دخل نہیں۔ اور جو دخل دے وہ کافر۔ وہی خوب سمجھتا ہے۔

کلکٹر۔ آپ وہی ہمایوں فر ہیں یا کوئی اور شخص۔

شہزادہ۔ (مسکرا کر) کیا خوب۔ اب تک شک ہے۔ وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔ مجبوری ہے۔

کلکٹر۔ ہم نے آپ کو کچھ دیا تھا آپ نے پایا یا نہیں۔

شاہزادے نے کہا۔ مجھے یاد نہیں۔ کلکٹر صاحب نے کئی سوال کئے اور باہر آن کر کپتان صاحب سے کہا۔ کہ یہ شخص ہرگز ہمایوں فر نہیں ہے۔ ابھی حکم ہو کہ قبر کھودی جائے۔ شہر بھر میں اُلٹر ہو گیا۔ کہ شہزادے کی قبر کھودی جائے گی۔ صاحب کلکٹر نے جو اُن سے باتیں کیں، تو شک ہوا کہ ہمایوں فر نہیں ہیں۔ شہزادی بیگم اور بڑی بیگم اور حسن آرا نے یہ خبر سُنی تو دھک سے رہ گئیں۔ اُستانی جی کو اس خبرِ بد کے سُنتے ہی غش آ گیا۔

عروس ابروقی

اسکندریہ میں آزاد پاشا کئی روز تک فردکش رہے، وجہ یہ کہ ہیضے کے سبب سے جہازوں کی آمدورفت بند ہو گئی تھی قطعی حکم تھا۔ کہ اسکندریہ سے بجز تاجروں کے کسی کا جہاز نہ جانے پائے۔ اور وہ بھی اسی حالت میں جب ڈاکٹر سارٹیفکٹ دے کہ اس جہاز کے جانے سے چنداں نقصان متصور نہیں ہے۔ عدن سے بھی آمدورفت بند تھی۔ اسکندریہ اور عدن دونوں مقاموں پر ہیضے کی بڑی شکایت تھی۔ آزاد پاشا بیچارے نے مجبور ہو کر یہاں پر قیام کیا۔ مگر سوچا کہ بغیر دل بستگی کے اس ملک بیگانہ میں دل نہ بہلے گا۔ اور دل بستگی کے لیے خوجی کافی تھے۔ مس میڈا اور مس کلیرسا نے آزاد سے کہا کہ ان کو کسی طرح بتانا چاہیئے۔

آزاد۔ اجی خواجہ صاحب اب تو یہاں سے رہائی کچھ دن مشکل ہے۔

خوجی۔ شکر بھیجو شکر بھیجو۔ کہ بچ کے چلے آئے۔ ناشکری نہ کرو۔

آزاد۔ مگر یار تم نے وہاں نام نہ کیا۔ افسوس کی بات ہے۔

خوجی۔ بجا درست۔ ہونھ! کہنے لگے تم نے نام نہیں کیا۔ ہم نے نہیں تو کیا تم نے نام کیا۔ حلوا خوردن را روئے باید۔ یہ منھ کھائے چولائی۔

ہزار نکتۂ باریک ترزِ مُو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

آزاد۔ سر منڈاتے ہی کہیں اُولے نہ پڑنے لگیں۔

خوجی۔ مگر غرور کی ہر بار کیوں لیتے ہیں۔ آپ نے کیا کیا آخر۔ کچھ معلوم تو ہو، کون گڈھ فتح کیا۔ کون لڑائی لڑے۔ ہاں یہ کیا کہ مس کلیرسا کو چومتے ہوئے چلے گئے۔ آپ تو مس کلیرسا اور مس میڈا اور پولینڈ کی شہزادی اور یہ اور وہ اور ان اور ان پر عاشق ہوئے۔ اور یہاں بندہ نواز معرکے لڑے ؎

منم آں پیل دماں ومنم آں شیر یلہ

نام بہرام مرا و پدرم بو حیلہ

اصل افغانی ہوں بابا۔ پھر مجھ سے لڑکے کوئی کیا کرے گا۔

آزاد۔ آپ نہیں تو از عفران پر عاشق ہوئے تھے۔

میڈا۔ خواجہ مہرادا اپنے ملک کے کچھ حالات تو ہم سے بیان کرو، وہاں کے رؤسا کیسے ہیں، اُمرا کا کیا حال ہے۔

خوجی۔ رؤسا تباہ۔ اُمرا خراب۔ پریشان حال۔ اَن پڑھ۔ وہاں کے شوق دنیا سے نرالے ہیں۔ پتنگ بازی کا شوق۔ طرح طرح کے پتنگ بنے۔ گول۔ دو پنا، ماہی جال، مانگدار، بھیڑیا، طوقیہ، خربوزیہ، لنگوٹیہ، چپ۔ نکل سکنکیا، سفید، للپتا۔ کلپتا۔ دس دس اشرفی پیچ لڑایا۔ میدان پر میدان ہو گئے۔ یوں ہفتہ وار میدان تو اکثر مقامات پر ہوتے ہیں، مگر بارہوں ماس میدان کسی نے کم سُنا ہو گا۔ اور فی پیچ ایک ایک اشرفی۔ پتنگ باز اپنے فن کے کامل۔ بلکہ اکمل۔ کوئی ڈھیلم لڑانے کا استاد ہے۔ کوئی گھسیٹ ایسی لڑاتا ہے۔ کہ آج تک کسی نے نہ لڑائی ہو۔ میاں ولایتی کے جھنڈے گڑے ہوئے۔ اُدھر پیچ پڑا۔ ادھر غوطہ دیتے ہی کہا، وہ کاٹا۔ لُوٹنے والوں کی چاندی تھی۔ ایک ایک دن میں دس دس سیر ڈور لُوٹی۔

آزاد۔ کیوں صاحب یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

خو۔ ہے ہے۔ تم کیا جانو۔ تم تو کتاب کے کیڑے ہو۔ تم کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔ سچ کہنا کبھی پتنگ لڑایا بھی ہے۔

آزاد۔ ہم نے پتنگ کی اتنی قسمیں ہی نہیں سُنی تھیں۔

خو۔ واہ جانگلو ہو نہ۔ بھلا پٹیا جانتے ہو کسے کہتے ہیں۔

آزاد۔ ہاں مثلاً تم پتنگ اڑا رہے ہو، ہم ڈور توڑ لیں اسی کا نام پٹیا ہے۔ ہے کہ نہیں۔ ہم تو جانتے ہیں۔ اسی کو پٹیا کہتے ہیں کیوں صاحب۔

خو۔ واہ شاباش۔ اور بھیکا کسے کہتے ہیں۔

میڈا۔ ہاں ہاں تم اپنا کام کرو۔ اور وہاں کے دولتمند کیا کرتے ہیں کوئی اچھا کام بھی کرتے ہیں یا نہیں۔

خو۔ ہاں افیم اور چانڈو کثرت سے پیتے ہیں۔ ؎

کھو دیا حُسن مدک نے ستم ایجادوں کا
اُڑ گیا رنگ دھواں بن کے پری زادوں کا

آزاد۔ اور کبوتر بازی کا حال تو بیان کرو۔

کلیرسا۔ میں سوچتی ہوں کہ ہندوستان چل کے وہاں کی مخدرات، اور شریف زادیوں سے رسم بڑھاؤں۔ اور اُن کو پڑھاؤں۔

آزاد۔ تم چل کے اُردو فارسی سیکھ لو۔ اور پھر اُن کو پڑھاؤ۔

کلیرسا۔ ہم نے سُنا ہے کہ ہندوستان کی عورتیں بالکل جاہل ہوتی ہیں۔ شہزادیاں تک تعلیم نہیں پاتی ہیں۔ بڑے شرم کی بات ہے۔

آزاد۔ مگر مس حسن آرا کو دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔

کلیرسا۔ ہم تو بیشک خوش ہوں گے مگر خدا جانے وہ ہم کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے۔

مئیڈا۔ نہیں امید نہیں کہ ہم دونوں کو دیکھ کر حسن آرا خوش ہوں، وہ چاہتی ہوں گی کہ آزاد کی بغل میں بجز اس کے اور کوئی نہ ہو۔ ہم تم کو دیکھیں گی تو ان کو کمال رنج ہو گا۔

کلیرسا۔ (تنک کر) کیا۔ ذری ہوش کی باتیں کرنا۔

مئیڈا۔ یہ کیوں یہ کیوں۔ اس قدر تنکتی کیوں ہو۔

کلیرسا۔ بغل میں آزاد کے تم ہو گی۔ اور کسی پر کیوں تہمت تراشتی ہو، اے ہاں کہنے لگیں جب ہم تم کو بغل میں دیکھیں گی۔ ہم سے واسطہ۔

مئیڈا۔ آخاہ حُسن آرا، تو حسن آرا ہیں دیکھتی ہوں تم کو بھی رقابت کی سُوجھی۔ اچھا تو ہے چوگڈم تو ہو جائے۔

کلیرسا۔ معاف کیجئے میں تمہاری طرح پھسل نہیں پڑتی ہوں۔

مئیڈا۔ چہ خوش۔ جب انہوں نے کروڑوں بار سر ٹیک کی تب میں نے قبول کیا۔ سُو وہ بھی جب سُن چکی کہ میدان جنگ میں انھوں نے نام کیا تھا۔ ورنہ اُن میں ہے کیا نہ۔ حسین نہ جوان نہ طاقت اور نہ تربیت یافتہ۔

خو۔ اور ہم۔ ہم کو کیا سمجھتی ہو آخر۔

مئیڈا۔ تم بڑے حسین جوان ہو۔ اور تو اور گراں ڈیل ماشاءاللہ۔

آزاد۔ ہم بھی کسی زمانے میں خواجہ صاحب ہی کے سے گراں ڈیل اور شہ زور تھے۔ مگر اب وہ بات کہاں۔
اب تو مرے ہوئے بوڑھے آدمی ہیں۔ ؎

مرا ہم چنیں چہرہ گل فام بود
بلورینم از شوخی اندام بود

خو۔ (کندے تول کے) اجی ابھی کیا ہے۔ ابھی شباب کے عالم میں ہماری کیفیت دیکھئے گا۔ جب عین جوانی کا عالم ہوگا۔

آزاد۔ کیوں صاحب قبر میں عین جوانی کا عالم ہوگا نہ۔

خو۔ اجی کیا بکتے ہو۔ ابھی ہمیں شادی کرنی ہے بھائی۔

میڈا۔ تم مس کلیرسا کے ساتھ شادی کرلو۔

کلیرسا۔ آپ ہی کو مبارک رہیں۔

میڈا۔ تمہارا تو آزاد پاشا پر دانت ہے، میں سمجھ گئی۔

خو۔ یہ تو نہیں جانتے ہیں قسم کھا کے کہتے ہیں، کہ اگر ہمارے ساتھ کا دوسرا خوبصورت جوان کوئی ہو تو ٹانگ کی راہ نکل جائیں۔ ع

حسن تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سال لالہ گوں باد

یہ شعر ہمارے ہی لیے کہا گیا تھا۔ ہم ایسے ہی ہیں۔

آزاد۔ اب اسکندریہ میں آپ کی شادی ہو تو خوب بات ہے۔ ورنہ ہم تو دو دو لے جائیں۔ اور آپ اکیلے جائیں۔ اس سے لوگوں کو شک ہوگا۔ کہ بالکل پھٹکار روئے ہیں۔ وہاں کسی نے نہ پوچھا۔

خو۔ اہاہاہا۔ واللہ یہ تو تم نے ایک ہی سُنائی۔ بیشک صحیح ہے۔ دریں چہ شک۔ اب ہمیں شادی کی ضرورت واقع ہوئی ہے۔

آزاد۔ مگر کوئی خوبصورت ہو جس پر سب کی نظر پڑے۔

خو۔ (آنکھیں نیلی نیلی کرکے) اس کے کیا معنی حضرت۔؟

آزاد۔ مطلب یہ کہ انتہا سے زیادہ حسین و مہ جبین ہو۔ پری بھی اس کے مقابلہ میں شرمائے حور بھی دیکھے تو جھینپ جائے۔

خو۔ اور جس میں حضور کو بھی گھورا گھاری کا موقع ملے۔ درست ہے خداوند۔ چہ خوش چرا نباشد۔

کیا مجال — خواجہ صاحب سمجھے کہ آزاد نے یہ کلمہ بدی کی راہ سے کہا۔ بگڑ کر بولے۔ بابائے من بدیعِ من را خوب خوب معلوم شد کہ من از شما التفات دارم، والّا شما از من نہ، چہ شود کہ گفتہ است۔ ؎

ہر کہ بعد از عاشق بر فرازش گل بُرد

فتویٰ از من در بتاں زور آشنا بس بس

من فہمیدہ ام، کہ اگر زوجۂ من بدیع خوبرو بُدے چہ خوش بُدے مگر شما زوجۂ من برائے خود خوبرو خواستی کہ گفتہ است۔ ؎

نادان صنم من روش کار ندارد — بر ہر کہ کند رحم سر از بار ندارد

بے خنجر و دشنہ نبود معتقد رحم — دلہائے عزیزاں صنم افکار ندارد

دانم کہ نہ دانست و نہ دانم کہ غمِ من — خود کم تر از آنست کہ بسیار ندارد

پیمانہ براں رندِ خرامست کہ غالب

در بے خودی اندازۂ گفتار ندارد

آزاد۔ کیوں صاحب ہم سے اس قدر بدظن ہیں۔

خو۔ اجی حضرت جورو کے معاملے میں بندہ کسی سے یارانہ نہیں رکھتا۔ ایسے یار چہ کوئی اور ہوتے ہوں گے۔ جی قبلہ ایسے یاران کہیں اور ڈھونڈھیئے۔ ع

اگر فہیم ہے تو چشمِ دل سے کر تو نظر

زبان کا مرتبہ سعدی سے لے کے تا بہ حزیں

آزاد۔ حزیں کون تھے یار خوجی۔ واہ رے غضب۔

خو۔ خدا کی مار اس بدبخت پر جو ہماری شان میں ایسا لفظ استعمال کرے۔ اس سے خدا ہی سمجھے، اور میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مئیڈا۔ کیا ہے خواجہ بدیع کیا ہوا۔ کیوں بگڑ گئے۔

خو۔ ہاں دیکھو تم بھلی مانس، اور شریف زادی ہو نہ۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ خواجہ بدیع اور یہ کم بخت تو خوجی کہتا ہے۔ ہم کو کیا۔ تم نے خوجی کہا خدا کی عنایت ہے۔ تمہارے سامنے ہی اُس پیری پیکر نے خواجہ بدیع کہا جی حضور دل لگی نہیں ہے۔ ع

گمرہی خود منزلِ مقصود کی ہے رہنما

خضر بن جاتے ہیں جن کو راستہ ملتا نہیں

خواجہ صاحب نے مس کلیرسا سے پوشیدہ طور پر کہا۔ واسطے خدا کے ہمارے لیے کوئی ایسی بیوی ڈھونڈ دو جو جانِ ہندوستان ہو۔ جس پر ساری خدائی کے شہزادے اور وضعدار لوگ جان دیتے ہوں، آزاد کا کھٹکا ہمیں ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ وجہ یہ کہ رخنہ اندازی سے باز نہ آئیں گے۔ ہم خوب سمجھے ہوئے ہیں۔ اس شخص کی عادت میں داخل ہے کہ جو عورت ہم پر عاشق ہوگی اس کو بہکائے گا۔ اس سے تو ہم کو کسی قدر کھٹکا ہے اور یہ جو ہم نے کہا کہ ہم کھٹکا نہیں ہے۔ یہ اس سبب سے کہ جس وقت خواجہ صاحب یعنی ایں جانب کے جمالِ انور کو بی صاحب دیکھیں گی۔ بس پھر آزاد کیا معنی آزاد کے باپ سے بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ مجھے دیکھ کر اس وقت مارے حسد کے جل بھن کے خاک ہو گئے۔ اور یہ شعر پڑھنے لگے۔ ع

مرا ہمچنیں چہرہ گلفام بود

بلورینم از شوخی اندام بود

کلیرسا۔ آزاد تمہاری سی جوانی کہاں سے لائیں ہے کہ نہیں۔؟

خو۔ بس بس۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور خدا کرے تم کو میرا سا شوہر ملے۔ اس سے زیادہ اور کیا دعا دوں۔

کلیرسا۔ کچھ سر تو نہیں پھر گیا ہے، اور سنیئے گا۔

خو۔ ہائے غضب ابھی سے عورتیں ہم کو برا کہنے لگیں۔ مگر یہی ایک انوکھی عورت ہیں جنھوں نے یہ کلمہ کہا، ورنہ جو دیکھتی تھی عشق کرتی تھی۔ ہائے جوانی اور حُسن بھی کیا شے ہے۔ مگر یہ سبب کیا کہ تم ہم کو دیکھ کر نہ ریجھیں۔؟

کلیرسا۔ اپنے اوپر سے تجھ ایسوں کو صدقے کرا دوں۔

خو۔ اچھا ایک درخواست ہے جان بخشی ہو تو کہوں۔؟

راوی۔ اس جان بخشی پر ایک بار جوتے کھا چکے تھے، مگر اب اٹک ٹرائے جاتے ہیں۔ پھر جان بخشی کا لفظ زبان پر لائے۔

کلیرسا۔ کہو، مگر ایڈی بینڈی بات زبان سے نکالی تو تم جانو گے۔ جو منھ پر آیا بک دیا۔ واہ واہ۔

خو۔ نہیں ایک بات۔ کہوں یا نہ کہوں۔

کلیرسا۔ کہو کہو کس قسم کی بات ہے، ہم بھی تو سنیں۔

خو۔ کچھ شادی بیاہ کا ذکر ہے۔

کلیرسا۔ کہیں شامتیں تو نہیں آئی ہیں۔ اور سنیئے یہ اور شادی۔

خو۔ کیوں کیا ہوا۔ آخر ہم میں کون بات نہیں ہے۔ کچھ معلوم ہو۔ اندھا ہوں؟ کانا ہوں؟ لولا ہوں۔؟ لنگڑا ہوں؟ بدقطع ہوں، وہ کون سی بات ہے جو ایں جانب میں نہیں ہے مگر تم سے کون کہے۔؟

کلیرسا۔ حلوا خوردن را رُوئے باید چلے ہیں ہمارے ساتھ شادی کرنے۔

خو۔ آخر عورت مرد کی شادی باہم ہوتی ہے۔ مرد مرد یا عورت عورت کی ہوتی نہیں۔

کلیرسا۔ خدا کی شان۔ ارے کچھ خبط ہے۔

خو۔ خبط! بیجا۔ اب خبط کا حال مسون، میمدن، ہندنیوں، مسلمانیوں، مصرنیوں، ترکنوں، عدن کی عورتوں، بمبئی کی مستورات، ان سب سے جا کے پوچھو تو، حال معلوم ہو۔ کیا دل لگی ہے۔ ہونھ! ان کو دنیا بھر کی عورتوں سے بڑھ کر حسین شوہر کا خیال ہے، تو خواجہ بدیع کہ تم ہی کو بیاہوں۔

کلیرسا۔ کچھ تری ہو لے ہے۔ خبطی سا معلوم ہوتا ہے۔

اتنے میں آزاد نے پوچھا کیا باتیں ہو رہی ہیں۔؟ آج مس کلیرسا اور میاں بدیع صاحب بہت کھل کھل کے باتیں کر رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ مس کلیرسا تم ان کے پھیر میں نہ آنا۔ یہ بڑے چالاک آدمی ہیں، یہ باتوں باتوں ہی میں عشق کر لیتے ہیں، یہ ان کی شیریں بیانی کا اثر ہے۔ ع

اثر لُبھانے کا پیارے ترے بیان میں ہے

کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

عجب جادو بیان آدمی ہے۔ خوجی بولے خراب تو تم نے اُن سے کہہ ہی دیا۔ یہ واقف ہو گئیں۔ ورنہ آج ہی شادی ہوتی۔ اور نہیں کرتے۔ اَب آج نہیں کل سہی۔ کل نہیں پرسوں سہی۔ بے شادی کیے جاؤں گا نہیں دریں چہ شک۔

کلیرسا۔ تو اپنے کو اس قابل سمجھنے لگے شانِ خدا۔

خو۔ اِس اُس قابل کے بھروسے نہ رہنا۔ میں عجب، جادو بیان آدمی ہوں۔ اجی حضرت کسی کی آنکھ میں سحر ہے ہماری زبان میں سحر ہے۔ آزاد نے تو بیان کیا ہی ہے۔ یہ بے سمجھے بوجھے ایسا بیان نہ کرتے۔

خواجہ صاحب سحر بیان جادو زبان نے فرمایا۔ کہ مس کلیرسا کو ہم اپنے عقدِ نکاح میں لائیں اور مس میڈا آپ کی ہو کے رہیں۔

آزاد۔ سُنا۔ مس میڈا کا نام زبان پر نہ لانا۔

کلیرسا۔ اللہ اللہ۔ آپ کی میڈا ایسی پری بن کے آئی ہیں۔

خو۔ اجی تم گھبراؤ نہیں۔ مجھے بھی تمغہ ملے گا۔ یہ بڑی جنگ میں نام برآوردہ ہیں۔ بندہ بحری میں نام کرے گا۔

آزاد۔ تو اپنے وقت کے بم اور آپ اسکندر ہیں۔

خو۔ سکندر۔ سکندر۔ سکندر۔ کو ہم کیا سمجھتے ہیں۔ ع

آنچہ در ظلمت سکندر آرزو کرد دبیافت

در سوادِ خطِ آں توقیع مضمر یافتم

آزاد۔ بُوا زعفران کی سی عورت ہو۔ تو ضرور بیاہ کر لو۔

خو۔ حضرت مس کلیرسا نے اگر منظوری نہ ظاہر کی تو پھر ہم کوئی اور ڈھونڈھ رکھیں گے مگر یہ ان کی غلطی ہے عجب نہیں کہ صبح و شام میں راہِ راست پر آجائیں۔ خیر خدا حافظ و ناصر ہے۔ اگر خواستہ خدا ہے۔ تو کوئی پری وش حور پیکر بغل میں ہوگی۔ ع

اگر دیدی رُخ آں حور پیکر

خلیل بت شکن میگشت آزر

ہم نے ٹھان لی ہے کہ انوکھی بیوی کے ساتھ شادی کریں گے۔ جس عورت میں کوئی نئی بات ہے اس کو بیوی بنائیں تو سبحان اللہ۔ ورنہ بیکار و فضول ہے۔ ایسی ہو جس کی صورت دیکھنے سے بھوک پیاس بند ہو جائے۔

آزاد پاشا اور کلیرسا اور میڈا ہوا کھانے گئے۔ مگر خواجہ صاحب بیوی کی تلاش میں علیحدہ تشریف لے گئے۔ راہ میں اتفاق سے آزاد کو ان کے جان پہچان کے ملے۔ آزاد نے گاڑی روک کر کہا۔ تم یہاں کہاں۔ کہا حضور حج کو گیا تھا۔ وہاں سے ایک قدردان یہاں لے آیا۔ آزاد نے کہا۔ خوجی بھی نہیں ہے تمہارے دوست۔ اس قدر سُننا تھا کہ وہ بہت ہنسا اور آزاد سے اور اس سے بڑی دیر تک سرگوشی ہو کر ایک بات ہوئی۔ آزاد نے مس میڈا اور کلیرسا کو بھی اطلاع دی۔ جب خواجہ صاحب آئے تو اُن سے بیان کیا گیا۔ کہ ایک نہایت خوبصورت عورت تم پر جان دیتی ہے۔ ابھی دوشیزہ اور پانزدہ سالہ ہے۔ اور کل ہی شادی ہوگی۔ انھوں نے فوراً منظور کر لیا۔ اور دوسرے ہی روز یہ دل لگی ہوئی۔ کہ ظریفوں کے اُستاد میاں آزاد نے مس کلیرسا اور مس میڈا کو گاڑی پر بٹھایا اور کوچ بکس پر خواجہ بدیع الزماں صاحب جلوہ افگن ہوئے۔ راہ میں خواجہ صاحب نے کئی آدمیوں کو بگھی پر بٹھا کر آواز لگائی' او جانے والا۔ ہائیٹ۔ ہائیٹ۔ آئی یو فول ہٹ جا۔ اپنے کو بھی الّو کی دم فاختہ بنا لیا غلبۂ ذکاوت اسے کہتے ہیں۔ ایک مقام پر ایک بہرا گاڑی کے سامنے آگیا۔ یہ غل مچایا ہی کئے، اور گاڑی کلّے پر پہونچ گئی۔ حضرت بہت بگڑے۔ بھلا بے گیدی بھلا۔ پچا ہی جا کے چھوڑوں گا۔ جب اور کچھ بس نہ چلا تو آج جان دینے آیا آزاد نے پوچھا کیا ہے۔ خواجہ صاحب خیر تو ہے کہا اجی حضرت آج میاں بہروپیے نیا بھیس بدل کر آئے۔ ہم گلا پھاڑ پھاڑ کر غل مچا رہے ہیں وہ مُردک سُنتا ہی نہیں جب وہ سمجھے کہ ہو نہ ہو بہرہ پیا ہی ہو۔ گاڑی کے سامنے کے اُڑ جانے سے کیا مطلب۔ ہم سے سنئے آپ

سمجھے اور بندہ ایک کائیاں چتونوں سے تاڑ گیا کہ آج پھپے کے نیچے کچلنے آیا ہے، اِدھر اُدھر لیٹ جانا۔ گھوڑے زور میں تو جا ہی رہے تھے۔ پہیا پاؤں کے پرخچے اُڑا دیتا۔ اب پوچھیے فائدہ۔ وہ ہم سے سُنیے۔ فائدہ یہ کہ ٹانگ یا پانوؤں تو مانگے کا نہیں ہے۔ وہ چار دن یا دس پانچ روز، یا تین چار ہفتے میں، یا تون اچھا ہو جاتا اور یہ لوٹ پوٹ کے چنگا۔ مگر ہماری گاڑی پکڑ جاتی۔ جی اب پوچھو کہ تم کو کیا فکر ہے ہم لوگ بھی تو سوار ہیں۔ اس کا جواب ہم سے سُنیئے۔ سین تو چھوکریاں بن کے چھوٹ جاتیں تم اور ہم۔ اچھا جس کی نظر پڑتی ہمیں پر پڑتی۔ تم کو لوگ خدمت گار سمجھتے۔ ہم رئیس کے دھوکے میں دھر لیے جاتے اور بے بھاؤ کی پڑتیں۔ حضور تو اچھے رہتے ہمارے مانھے جاتی۔ اللہ نے بچایا۔ مگر میں بھی اتنی قربلیاں بھونکتا کہ کبھی کبھی کو یہ لوگ یاد بھی کرتے۔ جی۔ دل لگی ہے۔ مگر — ع۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

اتنے میں اتفاق سے دس بارہ ڈُبے سامنے سے آئے۔ اس نے دیکھتے ہی گلا پھاڑ کے چلانا شروع کیا۔ ادگیدی من بدیع اندریں وقت بالائے کوچ بخش است آں نوشتہ روزنہ کہ تو من خواجہ بدیعارا از شتر ہائے خود برتر انداز و بیا واز من مقالبہ (مقابلہ) کن۔

جب ڈُبے قریب آئے تو حضرت بدیعا نے ڈُبے والے کو اس تیکھی چتون سے دیکھا کہ گویا کھا ہی جائیں گے اس سے ان کی چار آنکھیں ہوئیں تو خواجہ صاحب اکڑ گئے۔ ان کا نرالا کینڈا دیکھ کر اس کو ہنسی آئی۔ ان میں تاب کہاں کہ کوئی ہنسے، اور یہ خاموش رہیں آگ ہو گئے۔ پہلے چین کو ڈانٹ بتائی۔ روک لے۔ روک لے بے۔ تو نہیں روکے گا۔ (بگڑ کر) ارے تو نہیں روکے گا۔ کوئی ہے۔

آزاد۔ خداوند اب کیا مصیبت پڑی حضور۔ خیر تو ہے۔

خو۔ بس اس نامعقول سے کہا کہ باگ روک لے۔ میں اس گُستاخ، بے ادب کو سزائے مناسب دے آؤں تو بات کروں۔ مُردک میرا کینڈا دیکھ کر ہنس دیا۔ کوئی مسخرہ مقرر کیا ہے۔ کانا ہوں، آخر ہے کیا بات۔؟

آزاد۔ کون تھا۔ کون خداوند۔ نام تو سنوں میں۔

خو۔ اب راہ چلتے کا نام کیا جانوں کہیئے اٹکل پچو کوئی نام بتا دوں مجھے دیکھا تو ہنسے آپ۔ خون آنکھوں میں اُتر آیا۔

آزاد۔ بھائی جان دیکھ کر جی تو خوش ہوا ہوگا، کہ کیا خوش رو جوان ہے۔

خو۔ ارے یار سچ کہا۔ لاحول ولاقوۃ بھئی سچ کہتے ہو۔

آزاد۔ اب بتاؤ ہو گدھے کہ نہیں، جو میں نہ سمجھاتا تو پھر۔

خو۔ خون بے گناہ پر گردن خواجہ بدیع الزماں ہے۔

روئے سخن صفائی بناگوش گل گزید

بانگ قلم نشاط نوائے ہزار یافت

آزاد۔ بعد مدت یہ شعر زبان پر آیا۔ حضور ہی ہیں شاید۔

خو۔ (مسکرا کر) تبسم۔ اور آپ کے سر مبارک کی قسم ابھی ابھی حسب حال موزوں کیا ہے۔ نہ کہئے گا۔ کیوں قبلہ آداب۔

آزاد۔ حسب حال ہونے میں تو کچھ شک نہیں، مگر قسم اپنے سر ناپاک کی کھانا معقول۔ ہمارا سر کدو مقرر کیا ہے۔ غالب کا یہ شعر ہے۔ ع

در روزگار ما نتواند شمار یافت

خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

یہ مطلع ہے۔ بات تیرے جھوٹے کی ایسی ملیسی۔ شرمائیے یا نہیں۔

خو۔ تو توارد ہو گیا ہوگا۔ صاحب اور غنی کے کلام میں کس قدر توارد تھا۔ پھر غالب کا اور ہمارا کلام ملا تو حیرت کیا۔ اور غنی کشمیری اور ملا غنیمت اور طغرا اور خیبرا اور فیضی اور آرزو اور متاخرین غالب اور بدیع بھی تو ہندی فارسی داں شعرا تھے ایک مشاعرے میں ہم نے یہ مطلع پڑھا تھا۔

بسکہ لبریز ست واندوہ تو سرتا پائے من

نالہ مبروید چو خار ماہی اعضائے من

آزاد۔ جی بجا ہے۔ مطلع تو خیر۔ مگر مقطع آپ نے خوب فرمایا ہے۔

حسن ولفظ و معنیم غالب گواہ ناطق ست

بر عیار کامل نفس من و آمائے مَن

خو۔ (دانت کے تلے انگلی دبا کر)! اُف! اُف!۔ لاحول وَلا۔

آزاد۔ کیوں جناب یہ تو آپ کے باپ غالب دہلوی کا مقطع ہے، اور مطلع شاید آپ ہی کا ہو۔ لہذا اس سے فائدہ کیا اور جو وہیں کہیں ایسی ہی بے پر کی اڑائی تو ذلیل ہوگے۔

خو۔ کیا مجال۔ اس طرح اگر طمعا اینڈتا چلوں۔ کہ صلِّ علیٰ۔

آزاد۔ مگر وہاں کہیں بلم بردار نہ بن جانا۔ اتنا خیال رہے کہ میں سب میں ذلیل و خوار ہوں گا مجھے صاحب۔

خو۔ اجی ہاں سمجھنے کو تو ہم سب سمجھتے ہیں، مگر اُستاد ایک بات نہ سمجھے، پوچھو وہ کیا۔ پوچھو۔ وہ یہ کہ آپ کیا بن کے چلتے ہیں، دوست یا آقا۔ یا نوکر۔ یا مصاحب یا خانہ زاد۔

آزاد۔ بھئی مصاحب بن کے چلیں گے مگر مساوی درجے کے۔

خو۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ نوکر کے نوکر اور مالک کے مالک۔ ؎

تجھ نعرۂ غضب کی یہ صولت ہے گر نہیں

فیصل ہوں بر و بحر کے باشندگانِ عام

آزاد۔ مگر تم وہاں قرولی کو میان میں ہی رکھنا۔ ایسا نہ ہو قرولی بات بات پر نکلے تو ستم ہی ہو جائے۔ کرتے ہو نا وعدہ۔ کیوں خواجہ صاحب۔؟

خو۔ نعرے کے کیا ہجے ہیں۔ عین ہے یا الف اور آخر میں الف ہے یا عین الف ہو گا شاید رے الف نارا۔ اور بعض نون الف رے ہمزہ لکھتے ہیں۔ مگر ملّا جامی نے نون، الف، رے، الف ہی باندھا ہے

آزاد۔ بجا۔ کیوں جناب! جامی کیوں کہا۔ جامی کے کیا معنی۔

خو۔ عجب کوڑھ مغز ہو۔ ناؤں۔ گاؤں۔ ٹھانوں کے معنی بھی کہیں ہوا کرتے ہیں۔ ٹھہر۔ ابّا جان کی پیدائش پکاس۔ ابّا جان کا تولد گاہ امروہہ، جہاں کے برتن مشہور ہیں۔ التی پور جہاں کے ہم چکلہ دار تھے۔ پیتے پور۔ جہاں والد مبرور کی نظامت تھی۔ سلون جہاں ہم وگلے والی پلٹن کے کمیدان تھے۔ اِن سب کے نام بنائے ویسا ہی جامی بھی ہے۔

آزاد۔ یہ ہم کو معلوم ہی نہ تھا۔ تو جامی مہمل لفظ ہے۔

خو۔ ایک مہمل دوسرے بالکل مہمل۔ محض مہمل، حد بھر مہمل۔

آزاد۔ جی۔ اور خواجہ بدیعا۔ یا خواجہ بدیع الزّماں بہادر

خو۔ اونھ! ایک کلیہ بنا دیا۔ یہ بھی مہمل در مہمل۔

اس پر آزاد کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

اتنے میں کوچ مین نے گاڑی روک لی۔ خوجی گھبرا کر کوچ بکس سے اُترے، تو پایہ دان سے دامن اٹکا اور منہ کے بل گرے، مگر چوٹ کم آئی۔ جلدی سے جھاڑ پوچھ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ آزاد اور اُن دونوں پری پیکروں کو بے اختیار ہنسی آئی۔ خوجی نے پہلے تو لبوں پر انگشت شہادت رکھ کر آہستہ سے کہا چپ چپ۔ مگر جب ان سب نے اور زور زور سے ہنسنا شروع کیا تو خوجی سر پیٹنے لگا۔ اور بہت ہی تیکھا ہوا۔

آزاد۔ دیکھو پھر وحشت کی لی۔ اور جو دُھن والے دیکھتے ہوں تو کیسے ہو۔ گرد درد پوچھو۔ ذرا آدمی بنو۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃ۔

خو۔ ارے یار گرد و درد تو جھاڑ چکا مگر یہ تو بتاؤ کہ ہتھکنڈے کس کے ہیں۔ واللہ یہ اُس بہروپئے ہی کا کام تھا۔

میرے دشمنوں کی آنکھوں میں خاک۔ جھونک کے ٹانگ پکڑ کے گھسیٹ لیا۔ اچھا شادی ہولے پھر بیوی کی ملاح سے مردود کو نیچا دکھاؤں گا۔ سہ

پہن کر زرہ رخش پہ ہو سوار
چلوں سوئے میداں پئے کارزار

آزاد اور وہ دونوں پریاں گاڑی سے اتریں۔ خوجی کی سسرال کے دروازہ پر آئے۔ خواجہ صاحب گاڑی کے اندر بیٹھے رہے۔ جب اندر سے ان کے بلانے کو آدمی بھیجا گیا تو انھوں نے کہا ان سے کہہ دو۔

مستیم ز عشق تو مستم مستم دل در طلب وصل تو بستم بستم
گو بندہ مرا عاشق بدنام توئی
منکر نتواں بود کہ ہستم ہستم

اس نے اندر جا کے کہہ دیا کہ وہ تو کوئی نئی زبان بولتے ہیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ آزاد نے ایک پرچہ پر یہ عبارت لکھی اور اسی آدمی سے کہا کہ یہ کاغذ جا کے دکھا دو۔

"خوجی تم واقعی عَلم بردار ہو۔ شریف نہیں۔ اور پاجی پن تو تمہارے بشرے سے ظاہر ہے۔ اے لعنتی خر مُردک وہ غیرتِ حور و دراز قصور، اس محبت سے آدمی بھیجے، اور تو نہ آئے۔ اگر نہ آئے تو حضور کی چندیا پر ایک بال نہ رہے گا۔ اور خود دلہن آن کے تم کو لیجائیں گی۔ آزاد"

خواجہ صاحب دو لفظوں پر آگ ہو گئے۔ ایک خوجی دوسرے پاجی۔ رقعہ چاک کر ڈالا اور آدمی سے کہا۔

بے پردگی شہر رسوائی خویشم
در پردۂ یک خلق تماشائی خویشم

آدمی پھر اپنا سا منھ لیکر واپس آیا۔ آزاد نے اندر سے ایک چھپتی، دبنگ، بھدی، موٹی تازی عورت بھیجی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی سے اُتارا، اور گود میں اُٹھا کر اندر لے چلی۔ خوجی سمجھے تھے کہ دلہن یہی ہے اکڑنے ہی تھے کہ اس نے گود میں اٹھا لیا۔ اور جھپ سے مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ صحن میں خوجی کو پٹکے پٹکر دے مارا۔ اور اوپر سے دبانے لگی۔ آزاد کوٹھے پر سے یہ کیفیت دیکھتے جاتے تھے۔ کلیرسا سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اور مس میڈا کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ خوجی نے با آواز بلند کہا اماں جان معاف کرو۔ ایسی شادی پر خدا کی مار۔ بندہ در گذرا واسطے خدا کے چھوڑ دے نیک بخت۔ شادی ہونا تو درکنار بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔

اتنے میں آزاد نے پوچھا کیلے ہے بھئی۔ آزاد کی آواز سُن کر عورت الگ ہٹ گئی اور خواجہ نے یوں جواب دیا۔

خو۔ کچھ نہیں میاں۔ اختلاط کی باتیں ہوتی ہیں۔ کیوں۔؟۔

آزاد۔ کچھ نہیں۔ آغا جان کا لفظ کسی نے کہا تھا شاید۔

خو۔ واہ وا۔ یہاں اور ہندوستانی کون ہے سوائے آپ کے فرمائیے۔

آزاد۔ اور آپ۔ آپ کیا خراسانی ہیں۔ یا بدخشانی۔

خو۔ بھائی جان (خاموش باش) ہزار بار کہہ دیا کہ ماں، کابلی، باپ ترکی، مسلمان ہوں۔ مگر ولایت زاد۔ نہ کہ ہندی الاصل۔

آزاد۔ اچھا آکے دُلھن کے پاس بیٹھو۔ وہ کب سے گردن جھکائے بیٹھی ہے۔ بیچاری، اور آپ شنوائی نہیں کرتے۔

خو۔ کیا دلھن۔ اور منا وکیست، من دانستم کہ ہمیں زوجہ آیندۂ من بدلیاست۔ اگرچہ دیز اعضا ست والا بشرہ شکرین و چہرۂ خوش و دیدارسنت جمالی خربوزہ است۔

آزاد۔ اجی یہ تو لونڈی ہے۔ اس سے کیا واسطہ صاحب یہاں آئے۔

خوجی اوپر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک کونے میں دوشالہ اوڑھے ہوئے دُلھن بیٹھی ہے۔ مگر گردن زمین زد ہے۔ قریب جا کر بیٹھے۔ کلیا اور مُیڈا ادا فاصلے پر تھیں۔ خواجہ صاحب نے ڈون کی لینا شروع کی مس کلیر سا صاحب ہمارے آبا جان بارہہ کے سادات تھے۔ رضوی اور زیدی اور تقوی میں سب سے بڑے ہوئے، اور آغا جان خاص امرائے کابل کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں اگر آپ دیکھتیں تو ڈر جاتیں۔

راوی۔ تو عورت کیا چڑیل تھی ڈائن تھی۔

خو۔ اچھے اچھے پہلوان نام سننے سے کان پکڑتے تھے۔ یہ کھچے اور یہ چوڑی کلائی۔ اور سینہ مثل سینۂ شیر اور کمر چیتے کی سی پتلی، اور رنگ بالکل جیسے شلجم اور وہ بھی پھیکا۔ اور آنکھیں خونخوار۔ ایک دفعہ رات کو گھر میں چور آیا اور میں ڈرا بھائی۔ مگر واہ ری اماں جان۔ اگر زندہ ہوں تو خدا بخشے اور اگر خدانخواستہ جاں بحق تسلیم ہوئیں تو بھی خیر۔

راوی۔ سبحان اللہ ماں کا حال نہیں معلوم کہ زندہ ہیں یا روانہ باشد۔ خیر اور یہ بھی خوب فرمایا کہ اگر زندہ ہیں تو خدا بخشے۔ بہت ہی خاصے۔ ہاں صاحب چور آیا۔

خو۔ چور کی آہٹ پائی اور اس طرح لپکیں کہ جیسے بلائے بے درماں جاتی ہے۔ اس لعین کو چپر غٹو کیا۔

آزاد کو یہ فقرہ سن کر اس قدر ہنسی آئی تو فرش ہو گئے۔ خوجی نے بغور دیکھا کہ دُلھن گو ہنسی ضبط کرتی تھی مگر بیتاب تھی۔ سوچے کہ ہم سے کوئی بے ضابطگی عمل میں آئی ہے۔ مگر کچھ پروا نہیں۔ دا ماں جان کی تعریف تو ہوئی، فرمایا کہ بس ادھر انہوں نے چپر غٹو کیا اُدھر چور عین بول گیا۔ بات تیری کی میں نے پکار کے

کہا، اماجان جانے نہ پائے۔ میں بھی آن پہونچا۔ اتنے میں اباجان کی آنکھ کھلی۔ پوچھا کیا ہے۔ میں نے کہا بے کیا۔
اباجان سے اور ایک چور سے پکڑ ہورہی ہے۔ چور کو انھوں نے گرفتار کرلیا۔ اب میں جاتا ہوں۔ کہ گرفتار کرلوں۔
تو ابا کس اطمینان سے کہتے ہیں۔ دبکے پڑے رہو سردی میں اس نے اب تک چور کو بیدم کرکے قتل کرڈالا ہوگا۔
ہیں جو جاکے دیکھتا ہوں تو لاش پھڑک رہی ہے تو جناب ہم ایسوں کے لڑکے ہیں۔

آزاد۔ کچھ ایسے ہو۔ تب ایسے ہو۔ سوروں کے سور ہی ہوتے ہیں۔

خو۔ (ہنسکر) تسلیم۔ مس کلیرسا اس وقت ہماری باتوں پر بہت ہنس رہی ہیں۔ کیا پڑا پایا۔ ابھی ہم ان کی نظروں میں نہیں جچتے۔

آزاد۔ دلھن آج بہت ہنستی ہیں۔ ہنس مکھ ہیوی پائی۔

خو۔ اجی بڑی خرابی یہ ہے (سنبھل کر) اُردو تو یہ کیا سمجھی ہوں گی مصر کی رہنے والی۔ اُردو کیا جانیں۔ کیوں صاحب۔

آزاد۔ آپ بس چونگار ہی رہے۔ ارے بیوقوف اُردو سے انھیں کیا تعلق۔ یہ مصری بولتی ہیں اور کچھ کچھ ترکی

خو۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں جس گلی کوچے میں نکل جایئے۔ سب کی نظر پڑا چاہے۔ اچھا۔ اور یہ ہوا چاہیں بدظن۔

با سایا ترا نمی پسندم
عشق ست و ہزار بدگمانی

اس کو میں کیا کروں، اگر ان کو سیر دکھانے ساتھ نہ لے چلوں تو نہیں بنتی۔ لے چلوں تو نہیں بنتی۔ کہ مبادا کسی پری چہم کی نظر پڑے۔ اور وہ گھور گھور کے دیکھے۔ یہ سمجھیں کہ وجہ خاص ہے۔ اور یہاں فشار بگڑ جائے۔ اور اُس سے بڑھکر خرابی یہ ہے کہ مجھے گھورے بغیر کوئی جوان یا ادھیڑ عورت رہے۔ یہ ممکن نہیں۔ اب فرمایئے کیا کیا جائے کچھ چارہ ہے۔

آزاد:۔ ہم سمجھادیں گے۔ ارے میاں خوجی۔ اوہ توبہ توبہ (گالوں پر تھپیٹر لگاکر) توبہ خواجہ صاحب وہ بہروپیا بھی یاد ہے۔

خو:۔ آپ نے نہیں سنا آج دنبے کی شکل بن کر آیا تھا، اور پہلے گاڑی کے سامنے آکے ڈٹ گیا۔ اب میں غل مچارہا ہوں ہائیں ہائیں۔ مگر وہ کسی کی سنتا ہے۔ توبہ استغفار، تو مطلب یہ کہ اس کا کہنا نہ۔ مطلب خاص یہی تھا کہ گاڑی کے تلے پانوں کچل جائیں، اور ہم کو دھر دادے۔ کہ انھوں نے میرے پاؤں زخمی کئے۔

آزاد:۔ جی پرائی بدشگونی کے لیے اپنی ناک کٹواتا تھا بھلا۔

خو:۔ طبیعت۔ ایک مرتبہ ہم نے بھی ایسا ہی منصوبہ کیا تھا۔

آزاد:۔ اچھا بھئی ناک کٹوانے کا منصوبہ کیا تھا۔

خو:- ناصاحب کھی ناک میں گھس گئی۔ میں نے چاہا کہ بھاڑ میں منھ جھونک دوں جس میں وہیں جل بھن کے مرجائے۔ اس پر آزاد نے قہقہہ لگایا اور دلھن بھی ہنسیں۔

آزاد:- دلھن منہ بند کئے کیوں بیٹھی ہیں۔ ناک کی تو خیر ہے۔

خو:- کیا بکتے ہو میاں مگر۔ اب مجھے بھی شک ہو گیا تم لوگ عمدہ زبان میں سمجھا دو بھائی۔ ناک تو دکھادے۔

مس کلیر سانے دُلھن کو سمجھایا۔ سمجھنے کو تو سمجھی لیکن خدا جانے کس سبب سے دلھن نے تمام چہرے کو بڑی ہوشیاری سے چھپا کر ناک ذراسی دکھادی۔

خو:- صدقے صدقے اس خود بینی کے صدقے۔

آزاد:- داد دینا۔ قربان اس ناک کے۔ لوگوں نے تو دردناک بات کہی تھی، مگر خدا نے بچایا۔ ان لوگوں کی آنکھ تو ہے؛ آنکھ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک۔ نکٹا جیا بُرے احوال۔ داد دو یارو، داد دو!

آزاد:- بھئی کیا کیا اچھے کہے ہیں۔ مانتا ہوں واللہ واہ۔

خو:- تسلیم۔ قدردانی شرط ہے۔ یار جی چاہتا ہے اس ناک کا ایک بوسہ لوں۔ تم دلوادو۔ بھائی جان تمہیں

آزاد:- اچھا جاؤ مگر صرف ناک کا بوسہ لینا۔ خبردار ہوشیار۔

خو:- اور نہیں تو کیا بیشک فقط ناک کو چوم لوں گا۔ واللہ!

دلھن نے پھر تمام چہرے کو چھپا کر ناک باہر نکالی۔ خوجی نے کہا مس مُبڈا و کلیر سا گفتن دہ کہ از سامنے سے ذرا اس سمت کو (رسیدہ روند) آزاد نے کہا اُونھ؟ کیا ہے۔ تم بوسہ لو۔ خواجہ صاحب نے چپکے سے دو بوسے لیے تو دُلھن بھی ناک کے بوسے کی طالب ہوئی جیسے ہی انھوں نے بڑھائی، اس نے زور سے چکت دی، اور یہ تلملاتے ہوئے پیچھے ہٹے۔

آزاد:- او بے ادب۔ ایں۔! لاحول ولا قوۃ۔ توبہ توبہ۔

خو:- ارے میاں جاؤ بھی یہاں ناک ہی کا صفایا ہو گیا تھا۔ ان کو بے ادبی سوجھی ہے اور سُنیے۔ آزاد یار بسم اللہ تو غلط ہوئی۔ پہلے تو گاڑی سے گرے۔ وہ تو کہیے منہ ہاتھ اتفاق سے بچ گیا۔ ورنہ کھرنجے پر کھوپڑی پڑتی تو چٹاخا بولتا۔ اور بھوٹ کی طرح کھل جاتی، اور پہلا سابقہ جوان سے پڑا تو ان بی صاحب نے ناک ہی تاکی۔ خدا ہی خیر کرے۔ یار اچھے گھر بیعانہ دیا۔

آزاد:- واہ یہی کہتے تھے کہ ہم بڑے بے نیاز ہیں اور کائیاں ہیں۔

خو:- کیوں صریح۔ دلھن بوسہ لیا چاہتی ہے۔ کیا انکار کرتے خود دلھن بن جاتے۔

دُلھن بن جاتے۔ اول تو یہاں کی رسمیں ہی کچھ جداگانہ ہیں۔ دُلھن کیا بیوہ سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر خیر وہ بیوہ ہی سہی باشد۔ کچھ تو لحاظ ہو۔ بوسے کے عوض چکت دے بیٹھی۔

آزاد۔ ارے گاؤدی یہ غمزے ہیں یہ نخرے کہلاتے ہیں۔ جی۔

خو۔ (ہنسکر) واہ رے غمزے۔ غمزے کیا ہیں تشتر غمزے ہیں واہ۔

آزاد۔ کیوں بھئی لڑائی پر جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ خواجہ صاحب۔

خو۔ کبھی کی ایک ہی کہی۔ مانتا ہوں استاد کیا نخھے بنے جاتے ہیں۔ جانتے تھوڑا ہی ہیں کہ کمیدان تھے۔ شاہی میں گل چلے مشہور تھے۔ اب بھی جو چاند ماری ہوئی۔ ہم ہی بیس رہے۔ اور دور کیوں جاؤ۔ دریاپار والی جنگ میں اس جانب نے وہ نام پیدا کیے کہ کہو مصر میں دو سو شادیاں کرلوں۔ جناب والا۔

آزاد۔ مس منیڈا ہنس رہی ہیں۔ گویا تم جھوٹے ہو بالکل۔

خو۔ جناب والد مبرور کو خدا بخشے۔ واللہ وہ گُر بتا گئے ہیں کہ ہر مقام پر کام آتے ہیں۔ کئی باتیں بتا گئے ہیں ایک تو یہ جب کسی سے لڑائی ہو پہلا وار اپنا کرنا۔ اس میں چاہے دیو ہی کیوں نہ ہو بات کرتے ہی چانٹا دینا۔ ادھر گفتگو شروع ہوئی اُدھر تم نے تپتڑ دیا۔ پھر تو وہ چینیلا ہو گیا۔ اب اس کا انتا رعب نہ ہو گا کہ ہاتھ چلائے۔ جیسے چنبا بٹیر۔

آزاد۔ جی ہاں آپ تو کئی جگہ اس نصیحت پر عمل کر چکے ہیں۔ ایک تو نواز عمران پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ سچ کہنا کتنی بے بھاؤ کی پڑی تھیں۔ دوسرے زہرہ نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ چھینکتے چھینکتے ناک پھکنی کی جھاڑی بن گئی تھی۔ اختر النسا اور زینت النسا کے مکان کے پاس اس کسان نے اچھی خبر لی تھی کہ میاں کو مع ٹٹوی کے کانجی ہاؤس لیے جاتا تھا اور آخر میں بہروپیے نے خوب دق کیا۔ اچھے اچھے جھانسے دیئے۔ ان لوگوں میں برتاؤ کرنے میں اپنے والد مبرور کی نصیحت کو بھول گئے۔ اس میں سے ایک آدھ کو تومات کرتے چانٹا دیتے تو ہم جانتے۔

خو۔ اب میں اپنا سر پیٹ لوں کیا کروں یارو۔ جس جس مقام پر اپنے حلم کے سبب سے ذلیل ہوا تھا اُن سب کا ذکر کیا وہ تو کہیئے خیریت ہے کہ دُلھن اُردو نہیں سمجھتی ورنہ نظروں سے گر جاتا۔

اس فقرے پر آزاد مسکرائے اور دلھن ہنسنے لگی۔ تو خواجہ صاحب اکڑ کر فرماتے کیا ہے۔ واہ رے میں اور واہ ری میری قسمت۔ واللہ وہ ہنس مکھ خندہ پیشانی بیوی پائی ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ ہر دم ہنستی رہتی ہے۔ اور بے وجہ سمجھتی خاک نہیں۔ مگر ہنس دیتی ہے۔ آزاد نے کہا اور لطف یہ ہنستی بھی ہے تو عین موقع پر جس مقام پر ہنسنا چاہیئے۔ وہاں ہنستی ہے یار بڑی طبیعت دار ہے۔ اور نازک اندام، گلفام، خوجی اور بھی اکڑ گئے کیوں میاں آزاد تم نے دُلھن کو اچھی طرح دیکھا بھی ہے۔ بھئی پہلے دیکھ لو، آنکھیں دونوں

ہوں، مگر گاؤ دیدہ نہ ہو گاؤ دیدہ معشوق سے ہمیں نفرت ہے۔

آزاد۔ ایسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جیسی ہاتھی کی ہوتی ہیں۔

خو۔ بس یہی میں چاہتا ہوں وہ معشوق کیا جس کی بڑی بڑی آنکھیں ہوں۔ تعریف یہ ہے کہ ذرا ذرا سی آنکھیں اور ہنسنے کے وقت بالکل بند ہی ہو جائیں مگر یار گلا کیسا ہے۔ اس کی ہم کو بڑی فکر ہے۔

آزاد۔ گلا کیا معنی۔ کیا ہندوستان میں گانے کی تعلیم دو گے۔ لاحول

خو۔ اے ہے سمجھتے تو ہو ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ دراز گردن یا کوتاہ گردن ہے۔ پہلے سمجھ لو۔ پھر اعتراض جڑ دو۔ یہ نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی۔

آزاد۔ گردن اور سر اور دھڑ سب ایک ہے۔ گویا گردن ہے ہی نہیں۔

خو۔ یہ کیا تو کیا کوتاہ گردن کی تعریف ہے یا دراز گردن کی۔

آزاد۔ پاگل ہے کون۔ ارے نامعقول کوتاہ گردن، تنگ پیشانی حسین عورت کی یہی نشانی۔ محاورات اور مثلیں بھول گئے۔

خو۔ محاورے تو کوئی ہم سے سیکھے۔ آپ کیا جانیں۔ مگر از برائے خدا پاگل اور نامعقول اور ایسے ایسے لفظ زبان سے نہ نکالیے گا۔ جی ہاں حضرت میری یہاں کر کری ہوگی، اور کیا وارث علی خاں بن کے، پاس جا کے زانو سے زانو بھڑا کے بیٹھے ہیں۔ الگ ہٹ۔ اور سُنیے۔ بیوی کسی کی پاس کوئی بیٹھے۔

آزاد۔ یہ ڈپٹ۔ اللہ اللہ۔ الگ ہٹ۔ ہٹو بھئی۔ نہیں ہٹ کیوں صاحب اپنی سسرال میں ہماری اتنی بے وقعتی کرتے ہیں آپ۔ اچھا خیر۔ دیکھا جائے گا۔ جائیے گا۔

خو۔ آپ تو دل لگی میں بُرا مان جاتے ہیں اور ہماری عادت ایسی خراب ہے کہ بے چُہل کیے رہتے ہی نہیں۔

آزاد۔ چلو ہو گا کچھ۔ بھئی ایک نئی بات دلھن میں دیکھی۔ پانوں بڑے بڑے ہیں کوئی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو میرے پانوں کے برابر ہوں گے۔

خو۔ پھر تردد کا کوئی مقام ہے۔ اگر پانوں بڑے ہوتے تو معشوق میں حرف آتا۔ سُنا نہیں سر بڑا گنوار کا اور پانوں بڑا سردار کا۔

راوی۔ بجا۔ اُلٹے پیدا ہوئے تھے۔ کیا اچھا اُلٹ پھیر ہے

آزاد۔ اور قد و قامت کا حال ہی نہ پوچھیے۔ ناڑ کے برابر قد ہے۔ آپ کو باڑ باندھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

خو۔ واللہ مجھے اس وقت معلوم ہو گیا کہ آپ بالکل بدتمیز آدمی ہیں۔ اور شعر و شاعری سے تو مطلق لگاؤ ہی نہیں ہے۔ معشوق کی کیا تعریف ہے۔ یہ تعریف معشوق کی نہیں ہے کہ بونا ہو یا عورت بونی ہو۔ جب سُنے گا

تو سرو قامت رشک شمشاد سنا نہیں۔

سب اس کو سرو باندھے ہیں تو اس کو تاڑ باندھ

بوسے کی گر ہوس ہے تو گرد اس کے پاڑ باندھ

میں دیکھتا ہوں کہ دُلھن میں جس قدر حُسن کی باتیں ہیں سب کو آپ عیب سمجھتے ہیں۔

ع۔ بریں عقل و دانش بباید گریست

آزاد۔ اچھا یہ کون سا معشوق پن ہے کہ چہرے کی طرف نظر ڈالی۔ اور خواہ مخواہ بوسے لینے کو جی چاہا۔ فرمایئے سچ کہوں میری طبیعت توڈانواڈول ہو گئی تھی۔ کلیر سا کو تو میں نے بہانے سے اس طرف بھیجا، اور اس عروس شکر لب کو کئی بار چوما، اور اس نے بھی بوسے لیے۔

خو۔ (بگڑ کر) کیا قسم خدا کی قرولی لے کے ابھی ابھی مردود کا کام تمام کروں گا۔ یہ گرہست کو ہرجائی پن کیسا۔

آزاد۔ سُن تو لو۔ سُن تو لو۔

خو۔ (تیکھے ہو کے) اجی بس سُن چکے۔ اس وقت رگِ حمیت جوش زن ہے۔ ایسی ویسی کی ایسی تیسی۔ چھنیسی اور کیسی دبکی دبکائی بیٹھی ہیں گویا کچھ جانتی ہی نہیں ہیں۔ صورت سے نفرت ہو گئی۔

آزاد۔ اب جہاں داد نہیں وہاں فریاد کون کرے گا۔ کوئی سُنے تو سمجھائیں۔ بھائی پہلے اس کو دھو کا تھا کہ آزاد ہی شادی کریں گے۔ معلوم ہوا کہ ایک اور صاحب کو دپڑے، پھر اس کا کیا قصور تھا۔

خو۔ تو بندہ نواز یہ قبل نکاح بوسیدن کا صیغہ گردانناچہ معنی دارد۔ آپ نے کہا من بوسم چومتا ہوں۔ انھوں نے کہا بوس چوم تو۔ کہیں بھی آج تک سُنا ہے کہ نکاح ہوا ہی نہیں اور بوسہ بازی ہونے لگی۔

آزاد۔ ہر ملکے وہر رسمے۔ بس یہ اس کا گُر ہے۔ دگر ہیچ۔

خو۔ اب آپ سے رنج ہو یا نہ ہو۔ یہ دونوں خدا کے فضل سے یہاں موجود ہیں۔ ایک پولینڈ کی شہزادی۔ تین ہوئیں ایک اللہ رکھی چار۔ ایک حُسن آرا بیگم سب کی سرتاج، پانچ پانچ ہیں۔ کچھ ٹھکانا ہے اور پھر بھی اس پر توجہ ہے۔

زمنزلے نگذشتم بہ محفلے نہ رسیدم

کہ در دلم نہ گذشتی بہ خاطرہ نہ رسیدی

خیر تو جناب سُنیئے لوٹا کا روپیہ آپ کے اس خادم کے پاس بھی ہے اور ہرمز جی بھائی کی کوٹھی میں بھی بہت کچھ پیدا کیا۔ یہاں سے ہندوستان تک بندہ مع اپنے قبائل کے جا سکتا ہے۔ جی کچھ حضور کا دست نگر، یا زر خرید غلام، یا خانہ زاد نہیں ہوں۔ اور نہ محتاج ہوں۔ اب آپ تو جائیں بندہ اُن سے دو دو باتیں کر لے پھر شادی کی رائے پیچھے دی جائے گی۔

آزاد بسم اللہ کہہ کر اٹھنے ہی کو تھے کہ دُلھن نے پانوں سے دامن دبا لیا۔

آزاد۔ اَب بتاؤ۔ اُٹھنے نہیں دیتیں۔ اب میں کیا کروں۔

خو۔ (ڈپٹ کر) چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ اجی چھوڑ دو۔

آزاد۔ چھوڑ دو صاحب۔ دیکھو تمہارے میاں خفا ہوتے ہیں۔

خو۔ حاشا بندہ یہاں وہاں نہیں بنتا۔ ہم تو شگفتہ خاطر آدمی ہیں۔ اس بے اعتدالی کو یہاں کب جائز رکھنے والے ہیں۔

آزاد۔ ارے یار ایک دفعہ بھی اگر اس کی رسیلی نشیلی انکھڑیاں دیکھ لو تو غلامی کرنے لگو۔ بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ۔ باقی رہی بے اعتدالی بھئی انسان ہی تو ہے۔ اچھی صورت پر کون نہیں ریجھتا۔

فصلِ گل میں ہاتھ سے جاتا رہا اپنا مزاج

جوشِ سودا باعثِ بے اعتدالی ہو گیا

خو۔ تم سے بے طور اختلاط کرتے ہیں۔ یہ معاملہ کیا ہے۔

آزاد ہنسنے لگے، اور دُلھن نے بھی قہقہہ لگایا۔ تب تو خوجی گھبرائے کہ اب تک تو مسکراتی ہی تھی۔ اب قہقہہ بازی بھی شروع کر دی۔ ایسا نہ ہو رفتہ رفتہ پاپوش کاری بھی کرنے لگیں۔ آزاد نے دست بستہ عرض کیا خداوند غلام کا قصور معاف ہو۔ خانہ زاد آزاد کا قصور نہیں۔ آپ کی ان کی شادی ہو جائے، بس پھر اگر بندہ آنکھ اٹھا کر دیکھے تو گنہگار۔ قابلِ دار سزاوار۔ خواجہ صاحب اکڑ کر بولے۔ اچھا منظور۔ اس میں عذر نہیں۔ مگر اتنا سمجھا دینا کہ یہ بڑے کڑے خان ہیں۔ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔

یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ خواجہ صاحب نے قرولی میان سے نکالی، اور ایک کونے کی طرف جھپٹ کے گھٹنا ٹیک کے بیٹھے۔ نگاہ کونے سے لڑی ہوئی اور زبان سے بکتے جاتے ہیں۔ نکل تو موذی نکل اگر مرد ہے تو نکل موذی۔

خواجہ صاحب نے دُلھن کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا۔ سنو جی صاحب ہم ہیں نامی آدمی۔ موذی تم سے سیانا سو دیوانہ، ہمارے ساتھ چلتی ہو تو دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی غیر مردِ نامحرم کو صورت نہ دکھانا نہ کہ بوسہ بازی۔ مَعَاذَ اللہ۔ مَعَاذَ اللہ۔ دوسری شرط یہ ہے کہ بندہ خدا کے فضل سے خوبصورت اور گراں ڈیل جوان ہے۔ اور خیر حسین تو نہیں کہہ سکتا (مسکرا کر) مگر اللہ نے ایسی صورت دی ہے کہ ہندوستان سے روم تک دوسرا اس شکل وصورت کا نظر نہیں آیا، تو جو کوئی عورت دیکھتی ہے، پہروں گھورا کرتے ہے، ٹکٹکی بندھ جاتی ہے۔ اس میں تم ٹھہریں ناواقف، اور عورت ذات۔ سو تیا ڈاہ بُری ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ تم بدظن ہو جاؤ۔

یا کسی عورت سے لٹر پڑو۔ دو باتیں یاد رکھئے گا۔ بھائی آزاد۔ ذرا اِن کو اِن کی زبان میں سمجھا دو یار۔ آزاد نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد مس کلیر سا اور مس میڈا باغ میں جاکر ٹہلنے لگیں۔ اور آزاد نے میاں بیوی کے تخلیے کی فکر کی اور کہا خواجہ صاحب آپ اگر ذرا باہر چلے جائیں تو میں سمجھا دوں۔ ایک منٹ کے لیے۔ خوجی بولے جی درست بس بس۔ یہ بھرے کونڈوں کو دیجئے گا۔ آپ ایسے چھوکرے میری جیب میں پڑے ہیں۔ اور سنیئے کیا اُلو مقرر کیا ہے۔ یہ فقرے کسی گنوار سے چلئے۔ اَب تم جاؤ ہم اُن سے دو باتیں کرلیں۔ مگر قاضی مفتی کوئی تو آئے۔ یہ شادی کیسی۔ نکاح تو ہولے۔ یا بے نکاح ہی۔ آزاد نے کہا اس قدر بدگمانی پر خدا کی مار! ذرا باہر چلے جاؤ۔ اچھا چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ ان کی لونڈیاں اور خادمہ اور مشاطہ آن کے بناؤ چناؤ کرکے ان کو بٹھائیں۔ پھر آپ آیئے اگر کچھ بدگمانی ہو تو میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت دوں۔ خواجہ صاحب نے یہ بات پسند کی۔ آزاد کو لے کر باہر آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت نے آن کے خواجہ صاحب سے کہا۔ آپ چلئے۔ اور یہ صاحب (آزاد) باغ میں سیر کریں۔ خوجے کمرے میں داخل ہوکر، پلنگ پر دُلھن کے پاس بیٹھے۔ خادمہ پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کو اشارہ کرکے کہا باہر چلی جا۔ سب دروازے بند کرلے دُلھن سے کہا جانِ من خدارا اب تو برقع اٹھادو۔ للہ اس قدر نہ ترساؤ زیادہ ترسانا اچھا نہیں۔

طالبِ نظارہ ام پردہ برافگن زرُخ
پیشِ صفِ راستاں شعبدہ بازی مکن

صدائے برنخاست۔ یہ سمجھے کہ دلھن ہے شرمیلی، پھر کہا۔ جانِ جان اب حیا و شرم کو بالائے طاق رکھو۔ خدا کے لیے صورتِ زیبا دکھاؤ۔

ع۔ نہ چھپاؤ نہ چھپاؤ رُخِ تاباں ہم سے

دُلھن گردن جھکائے ہوئے چپ چاپ بیٹھی رہی خواجہ صاحب اور آگے کھسک کے بیٹھے اور فرمایا، کہ، نورِ چشمی، لختِ جگری، عزیزی، للہ اس وقت شرم کو بھون کھاؤ۔ ذرا چہرۂ زیبا کی جھلک دکھاؤ۔ کیوں ترساتی ہو ارے کب تک ترسائے رکھو گی۔ دو منٹ تک خواجہ صاحب نے علم موسیقی کا خون کیا۔ اپنے نزدیک گویا رجھاتے تھے۔ اے تری قدرت، جب یوں بھی دُلھن نے نہ مانا تو برقع کی طرف ہاتھ لے گئے۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑا۔ تو اب میاں کے چھوڑائے نہیں چھوٹتا۔ دھر دھر کے زور کر رہے ہیں۔ مگر ہاتھ گویا دیو کے ہاتھ میں آگیا۔ اب خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ چھوڑدو پیاری بھلا کسی غریب کے ہاتھ توڑنے سے کیا ملے گا۔ اور یہ تم خوب جانتی ہو کہ میں تو تم سے کبھی زور تو کروں گا نہیں۔ یہ مجھ سے نہ ہوسکے گا۔ پھر خواہ مخواہ کے لیے کیوں دق

کرتی ہو۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا مگر تمہارے ننھے ننھے ملائم ملائم ہاتھ دُکھنے لگیں گے۔

خود گلا کاٹوں اگر خنجر عنایت کیجئے
دیکھئے دکھ جائے گی نازک کلائی آپ کی

دُلھن نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ تو ان کی جان میں جان آئی۔ دل میں سوچا کہ دلھن کیا دیوزاد ہے یہ تو ہُر کس نکال دیگی مگر اس قدر فائدہ ہوگا کہ لوگ شہ زور اور پہلوان کہنے لگیں گے یہ کیا کم ہے۔ آہستہ کہا کیوں پیاری ہمارا قصور تو بتاؤ۔ پھر ہمیں ترساتی کیوں ہو حیا ہو چکی۔ اب حیا کب تک رہے گی۔ آخر حیا کی بھی کچھ انتہا ہے۔ یا نہیں۔ لے بس برقع اٹھاؤ۔ ؎

برقع زعارض برفگن یک صبح دم تا دید آں
گردد فراش صبح را خورشید تاباں در بغل

دیکھو تو کیسے کیسے شعر پڑھ رہا ہوں، اب بھی نہیں پسیجتیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ بھئی اس ملک کے عجیب عجیب رنگ ہیں معاذ اللہ کا مقام ہے۔ توبہ کر بندے۔ توبہ کر بندے! برقع کے پاس ہاتھ لیجانے ہی کو تھے کہ روح فنا ہوگئی۔ جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔ سر پر رکھ کر کہا پیاری آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ منہ سے بولو سر سے کھیلو۔ بت کی طرح چپ چاپ بیٹھی ہو، مگر میں تو اس نازک کمر کا قائل ہوں کتنی ذرا سی کمر ہے۔ ہوا کے جھونکے سے لچکنے لگے۔ تعریف محال ہے۔

دیوان میں خالی ہی جگہ چھوڑ دی ہم نے
مضمون یہ باندھا تری نازک کمری کا

جی کڑا کر کے خوجی نے بُرقع ہی پر سے بوسہ لے لیا۔ بوسہ لینا تھا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ خوجی پلنگ کے نیچے۔ اور دلھن ان کی چھاتی پر چھاپ بیٹھی، اور دو تھپیڑ اِدھر اُدھر لگائے۔ مگر چھلتے ہوئے۔ ان کا اتنے ہی میں کام تمام ہوگیا۔ جب دُلھن نے ان کو چھوڑا تو لیٹے ہی لیٹے شیخ سعدی کا قول زبان پر لائے۔ ؎

اے مُرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز — کان سوختہ را جان شد و آواز نیامد
عاشقان کشتگان معشوق اند
بر نیاید ز کشتگان آواز

دلھن پھر پلنگ پر جا بیٹھی یہ بھی اُٹھے۔ کہا۔ جانی ایک بوسہ کے عوض تم نے کچومر نکال ڈالا۔ اب کی بوسہ کی جرأت کی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ ایسی بیوی سے درگذرے۔ مگر اب تو سنگ آمد سخت آمد۔ پھر جی کڑا کر کے پلنگ پر بیٹھے مگر ذرا ہٹ کر۔ پلنگ کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی۔ اور کہا، اب جان، اور عزت اور آبرو، اور توقیر سب

تمہارے ہاتھ ہے۔ میں نے کمیدانی کی ہے۔ رسالداری کی ہے۔ گڑھیاں فتح کی ہیں۔ میدان لڑا ہوا ہوں۔ معرکہ دیکھے ہیں۔ بہروپیوں کو جھانسے دیئے ہیں۔ اس فقرے پر دُلھن بے اختیار ہنس دی۔ خوجی بشاش کہ مار لیا ہے فرمایا۔ وہ ہنسی آئی۔ ناک پر آئی۔ منھ پر آئی۔ لب پر آئی۔ آخر کھلکھلا کر ہنس ہی دیں کیوں نہ ہو جانِ من لے اس بات پر گلے لگ جاؤ۔ دُلھن نے ہاتھ پھیلائے۔ خوجی گلے ملے، تو دُلھن نے اس زور سے دبا دیا کہ قیں بول گئے۔ چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ دیکھو چوٹ آجائے گی۔ ناحق اپنی نازک کلائیوں کی دشمن ہوئی ہو۔ دیکھو دیکھو چوٹ نہ آجائے کہیں۔

راوی۔ دل ہی جانتا ہوگا بچہ جی۔ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ اور کہتے کس مردے سے ہیں کہ (تم کو چوٹ آجائے گی) اچھے گھر بیعانہ دیا۔ ایسی دلھن بھی کسی نے کم دیکھی ہوگی۔ پہلے ہاتھ پکڑ لیا تو میاں کے کئے دھرتے کچھ نہ بن پڑی۔ پھر اُٹھا کے دے مارا۔ اب کی گلے ملے تو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ اچھی نازک اندام بیوی ہیں۔ خواجہ صاحب اپنی بدقسمتی پر زار زار روتے تھے، کہ بیوی پائی بھی تو اس درجہ بدمزاج کہ ہاتھ نہیں لگانے دیتی بولتے ہیں تو جواب ندارد۔ ہاتھ بڑھاتے ہیں تو وہ گدا وجی ہے۔ ہاتھا پائی میں وہ ان سے ہیں۔ پنجے کلائی میں چوکس۔ ان کی دال نہیں گلنے پائی۔ اور وہ وار پر وار کرتی جاتی ہے۔ دوبارہ پٹخنی بتائی۔ ایک مرتبہ ہاتھ مروڑ ڈالا، وہ تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی تھی۔ پہلے ہی ناک پر چپکن دی۔ وہ تو کہئیے خدا نے ناک بچائی۔ ورنہ جہان میں نکو بنتے۔ کہ بیوی کے پاتے ہی ناک گنوائی۔ خواجہ صاحب سوچ کہ جان پر کھیل کر ایک دفعہ اور کوشش کروں۔ بہت ہوگا مار ڈالے گی۔ اور کیا کرے گی۔ اُٹھ کھڑے ہوئے، کپڑے اُتارے۔ لنگوٹ کسا۔ اور پینترا بدل کر کھڑے ہوئے۔ پہلے بیوی کو سمجھایا۔ سنو جی صاحب ہم ایک شاہزادے ہیں۔ اور معشوق مزاج۔ تلوار کے دھنی۔ بات کے دھنی۔ اور ناک پر مکھی بیٹھے قلم تراش سے ناک ہی اُڑا دوں۔ سمجھیں؟۔ اب تک میں دل لگی کرتا تھا۔ تم عورت میں مرد۔ اور عورت بھی کیسی نازک بدن، نازک اندام، نازنین۔

راوی۔ آپ کا دل ہی جانتا ہوگا۔ کہ کیسی نازک بدن ہیں۔

خو۔ اگر اب کی ذرا گستاخی کی تو آگ ہو جاؤں گا۔

راوی۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کے صدقے۔ آگ ہوئیے گا تو کیا کیجئے گا۔ جل بُھن کے خاک ہو جائے۔ اب ہم کو یقین ہو گیا کہ آپ کی شامت آگئی ہے۔ ایک دفعہ بھُرکس نکل چکا ہے۔ اب کی جان کی خیریت نہیں نظر آتی۔ ہڈیاں چلبلا رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو ہاتھ پاؤں توڑ کے دھر دے۔

خو۔ تم نازک عورت، اور میں مرد بھی کیسا گراں ڈیل۔ بنوٹیا۔ بنکیت، اڑنتیا ابھی کل ہی کی بات ہے۔ کہ ہوٹل کے ایک پہلوان کو دے مارا تو چاروں شانے چت۔

راوی۔ اے سبحان اللہ! کیوں نہ ہو۔ حضور کے گراں ڈیل ہونے میں کیا شک ہے۔ آدمی کیا دیوزاد ہے۔ اللہری کلائی اور اُف رے سینۂ فراخ۔

خو۔ اب میں پینترا بدل کے کھڑا ہوا۔ بس اب اگر ذرا بے ادبی کی بات ہوئی تو سنۃ اُئے گا۔ پھر یا تم ہی نہیں یا بندہ ہی نہیں۔ یوں تو موم ہوں، مگر غصّے کے وقت معاذاللہ فولاد میر۔ موم سے بدتر، تو وجہ کیا جو گرجتا ہے وہ برستا نہیں۔ لے اب برقع اٹھادو۔ بُرقع اٹھاؤ گھونگھٹ ر۔ ورنہ خیر نہیں ہے۔ یہ کہیں اونچا تو نہیں سُنتی۔ (تالیاں بجا کر) سُنتی ہو۔ بُرقع اٹھاؤ (اشارے سے)، بُرقع بُرقع نقاب اُلٹو۔ سہ

پیمبر میں نہیں یوسف ہوں جانی
رہے موسیٰ سے تیری لن ترانی

واللہ مجھے رحم آتا ہے۔ شبِ عروسی اور یہ باتیں۔ بی بی آخر کچھ تو منہ سے بولو۔ منہ سے نہ بولو۔ اشارے ہی سے باتیں کرو۔ یا الٰہی یہ شرم اجیرن ہو گئی۔ حیا بھی تو کتنی۔ گنوارپن کی شرم سے ہم عاجز آ گئے۔ ع۔

بیٹھ جاؤ خود حیا اُٹھ جائے گی

اب مجھے اور بھی غصہ آیا۔ ایک بار اور سمجھائے دیتا ہوں۔

خواجہ صاحب بکا کئے وہاں شُنوائی ہی نہ ہوئی۔ آدمی جھلّے تو تھے ہی بگڑ کر کہا اب سنبھل، اور سمجھ کہ قضا کا سامنا ہے۔ یہ پنجۂ بدیع، پنجۂ اجل ہے۔

ع۔ نیام تیغ قضائے مُبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے پھر پینترا بدلا اور اکڑ کر کھڑے ہوئے مگر کُندے تول تول کے رہ جاتے تھے جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ہاتھ بڑھائیں۔ چوٹ کھائے ہوئے تھے نہ۔ آخر کار جان پر کھیل ہی گئے۔ اور جھپٹ کر دُھن کی گردن میں حُلقوم باندھا، حُلقوم باندھنا تھا کہ دُھن نے ایک ہاتھ سے حُلقوم کا توڑ کیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے ان کی گردن لی۔ اب خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع تڑپ رہے ہیں۔ دانت پیتے ہیں مگر بے سود، گردن نہ چھوٹنی تھی نہ چھوٹی۔ تو جھلا کر کاٹ کھایا۔ کاٹنا تھا کہ اس نے زور سے ایک تھپڑ دیا، اور خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع سابق کیدان و گلے والی پلٹن کا منھ پھر گیا۔ دانت کلکٹا کے ریلنا چاہا۔ تو دُھن نے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اور گردن اب تک پھنسی ہی ہے۔ مجبور ہو کر کوسنے لگے۔ خدا کرے تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ اللہ کرے بُوا زعفران کا اور تیرا مقابلہ ہو جائے، یا خدا اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ کر گر پڑیں۔ ہائے اس وقت اگر خداوند کریم ایک منٹ کے لیے زور عطا کرے، تو سُرمہ بنا ڈالوں۔ اِس مردودنی کا۔ دیکھا خوب! (مردودنی

کی ایک ہی کہی۔ یہ دُرگی کی ایسی ہی ہے۔ غل مچا کر کہا چھوڑ دے بس، کہہ دیا ہے چھوڑ دے۔ ہائے قرولی نہ ہوئی۔ ورنہ دکھا دیتا۔ مگر افسوس قرولی کمرے کے باہر رہ گئی۔ دُلھن نے اُن کو چھوڑ دیا تو کمرے کے باہر تڑپ کر نکل آئے اَب سُنیے کہ مس کلیر سا اور منیڈا ایک دروازے کی درازوں سے کل کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ جب خوجی صاحب باہر نکلے تو انھوں نے یوں گفتگو کی۔

آزاد۔ مبارک باشد۔ کہیئے دُلھن خوبصورت ہے یا نہیں۔ یار ہو خوش قسمت۔ واہ اُستاد کیا کہنا ہے۔

خو۔ خدا کرے آپ بھی ایسے خوش قسمت ہوں۔ آمین آمین۔

آزاد۔ کیا ارے بھائی کیا، بد قطع ہے۔ ہم نے تو بڑی تعریف سُنی ہے۔ مگر تم کچھ افسردہ ہو کے آئے ہو اس کا کیا سبب ہے۔

خو۔ بھائی جان وہاں تو فوجداری ہو گئی۔ عورت کیا دیونی ہے۔ یہ تو بُوا زعفران کی جوڑی دار ہے۔ واللہ کچومر نکل گیا۔ انتہا کی بد مزاج ہے۔ چکٹ دی، دے مارا۔ ہڈیاں پسلیاں چور کر ڈالیں۔ بیدم کر دیا۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ۔ دُلھن کیا ڈائن ہے۔

آزاد۔ تم خاموش ہو رہیے۔ ارے میاں مرد کیسے ہو۔

خو۔ وہ آپ ایسے چار پر بھاری ہے۔ اُسے عورت نہ سمجھئے گا۔

آزاد۔ آپ تو ہیں پاگل۔ بھئی یہ اس ملک کا رواج ہے۔ کہ شبِ عروس میں پہلے دو گھنٹے تک میاں کو مارتی ہیں۔ چپتیں لگاتی ہیں۔ کاٹ کھاتی ہیں۔ پھر میاں باہر آتا ہے۔ اور پھر جاتا ہے۔

خو۔ تو بھائی صاحب اَب تو جرأت نہیں ہوتی۔ وہاں تو لپاڈگی کی نوبت آ گئی۔ اور میں مروّت کے سبب سے بول نہ سکوں۔ مُروّت کا گھر خراب۔

آزاد۔ تو شبِ عروسی کیا دیوگڈھ کی لڑائی تھی جس کا مادھورام نے انشا میں ذکر کیا ہے۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ۔

خو۔ جی میں تو آیا تھا کہ اُٹھا کے دے ماروں، مگر عورت کے منہ کون لگے۔

آزاد۔ لَاحَولَ۔ آپ نے اچھا کیا۔ اور وہ تو نازک عورت ہے۔

خو۔ (اپنے دل میں) نازک تو جیسی ہیں ہم ہی جانتے ہیں، خدا کی مار اس نزاکت پر یہ چُرمُر کر ڈالا۔ اُن کی ادنیٰ سی ادا۔ اور میاں کی جان کو صدمہ۔

آزاد۔ اچھا اَب بسم اللہ کر کے پھر جائیے۔ جاؤ میاں۔

خواجہ صاحب بمصداق قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ جانے کے لیے مستعد ہوئے مگر آزاد پاشا نے کہا کہ اگر شرائطِ مندرجہ ذیل میں کوئی شرط آپ کو منظور نہ ہو تو اطلاع دیجیے۔ اور جب تک آپ یہ شرطیں پوری

نہ کریں گے تب تک ہم نہ جائیں گے۔

اوّل۔ اگر تم سے باتیں نہ کیں، تو ہم مار بیٹھیں، بس سمجھئے صاحب۔

دوم۔ اور اگر ہمارا ہاتھ مروڑ ڈالا تو ہم کو سنانا شروع کر دیں گے۔

سوم۔ اگر کوئی بات ہماری شان کے خلاف ہوئی تو ہم دشمن ہی ہو جائیں گے۔

چہارم۔ جو اس مرتبہ لپاڈگی کی، تو پٹخنی بتائیں گے۔ چاہے چوٹ آئے

پنجم۔ برقع ہمارے جاتے ہی اُلٹ دے۔ گھونگھٹ سے ہمیں نفرت ہے۔

(۱) ضرور آپ بھی اتنے ہوئے۔ اے تری قدرت۔

(۲) خوب سمجھے۔ مگر افسوس ہے کہ آپ خاک نہ سمجھے۔

(۳) بس یہ تو ہم سمجھے ہی تھے۔ اور آپ ہیں کس مصرف کے۔

(۴) آپ کیا اور آپ کی شان کیا۔

(۵) اے ہے۔ آپ دشمن ہو جائیں گے۔ خدا ہی خیر کرے۔ آپ سے دشمنی پیدا کر کے دُلھن رہے گی کہاں۔ رہنا دریا میں اور مگر سے بیر۔ آپ دشمن ہو جائیں گے تو آپ کی کھوپڑی کا خدا حافظ ہے۔

(۶) اتنے ہو تب تو پہلے بیس دفعہ تو پٹ چکے۔ مگر بے حیا کی بلا دور۔ بڑی پٹخنی بتانے والے آئے۔ بوا زعفران نے اتنی بے بھاؤ کی لگائیں کہ یہ چپت گاہ کے بھوٹیرے اڑ گئے۔ مگر اس بے سری کے صدقے۔ اب تک وہی دم خم ہیں۔

(۷) چوٹ کیوں نہ آئے گی۔ آپ کے ہاتھ بھی تو فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔ پھونک مارے تو بہتر لڑھکیاں کھائے چلے ہیں پٹخنی بتانے۔ شانِ خدا۔

(۸) وہ بُرقع اُلٹیں یا نہ اُلٹیں، تم ٹاٹ تو الٹ دو۔ بے ٹاٹ اُلٹے فائدہ معلوم۔ اچھے گھر بیانہ دیا ہے۔ بچہ۔ دیکھ تو سہی۔

(۹) کیسی کچھ۔ پھر نفرت ہے تو خود الٹ دو۔ مرد ہو۔

آزاد نے کہا۔ ان میں کوئی شرط سخت نہیں۔ مگر ہاں شرمیلی دلھن پہلی شب کو اپنے آپ کو کیوں بُرقع اُلٹے گی۔ آپ جاتے ہی برقع الٹ دیجئے گا۔ گر پاک دامن ہے تو آنکھیں نیچی کر لے گی۔ ورنہ کوسے گی۔ گالیاں دے گی۔ بُرا بھلا کہے گی اور یہی شرافت کا ثبوت ہے۔ کہ گالیاں نہ دے چپ چاپ سُن لے۔

آزاد۔ شب عروسی کیا جنگ کر میا ہے۔ معاذ اللہ۔

خو۔ حضرت میں ہی ایسا کرارا آدمی ہوں کہ اتنی سختیاں سہیں۔ ورنہ دوسرا ہوتا چیں بول جاتا۔ دل لگی

نہیں ہے۔ اس کے لیے چاہیئے کہ کوئی بڑا دل کا مضبوط آدمی ہو۔ اس زور سے ہاتھ مروڑے کہ روح پر صدمہ ہو۔ مگر واہ رے میں۔ آنسو ڈبڈبا آئے۔ مگر پی گیا ذرا اُف تک نہ کی وہی خم ودم، تیور تک نہ میلے ہوئے دل میں تو سمجھ گئی ہوگی، کہ آدمی بڑا مضبوط ہے۔ اور میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں رستم کی اولاد سے ہوں۔ دل میں کانپ اٹھی ہوگی۔ لیکن معشوق مزاج وہ بھی ہے۔ ظاہر میں گویا سُنا ہی نہیں، مگر یار کسی قدر اونچا سنتی ہے۔

آزاد۔ تو پھر کیا ہے۔ چین کرو۔ بیوی ہے بھی تو بہشتی۔

خو۔ (مسکرا کر) دیکھیں آپ کی کیسی گذرتی ہے۔ میں اب کی فیصلہ ہی کر دوں گا۔ اُدھر اُدھر۔ بس۔ یا تو وہی نہیں۔ یا ہم ہی نہیں۔

آزاد۔ کیا کیا۔ سچ مچ فوجداری ہی پر آمادہ ہو۔ بھائی خدارا کہیں ہم کو نہ دھروا دینا، پردیس کا معاملہ ہے، اپنا وطن بھی نہیں، کہ کسی سے کچھ کہہ سکیں۔ اور چاہے جو ہو قرولی ہرگز ہرگز آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔

خو۔ اچھا یہاں ہاتھ کیا کم ہیں۔ قرولی مرد کے لیے ہے۔ جب عورت سے مقابلہ ہے۔ تو قرولی کی کب ضرورت ہے۔ ہاتھ کیا کم ہیں قرولی سے۔ قربان جاؤں اپنے اُستاد کے۔ میں کیا کچھ اُس سے کم ہوں۔

آزاد۔ تو فقط میٹھی میٹھی باتوں سے مسخر کر لو۔ بس۔

خو۔ اس میں تو اپنجانب برق ہیں۔ بھائی ہاں —— اس میں کوئی ہمارا کیا مقابلہ کرے گا۔ بھلا شیریں زبان، شیریں بیان۔ شیریں ادا اور شیریں حرکات۔ جی حضرت جب کوئی بولے بھی۔ وہ تو بات ہی نہیں کرتی۔ بات کہتے ہی سنّاٹا لگاتی ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔ یہاں پر ہم بھی قائل ہو گئے۔

آزاد۔ اب کی جا کے میٹھی میٹھی باتیں کرو۔ پانوں دباؤ۔ ہاتھ جوڑو۔ پھر دیکھئے کیسی مطیع ہو جاتی ہیں۔ اب دیر ہوتی ہے، جائیے۔ خواجہ صاحب کمرے میں تشریف لے گئے۔ پھر کپڑے اتارے۔ جب وہاں سے بھاگ کر باہر نکل آئے تھے تو کپڑے پہن لیے تھے۔ اب پھر کپڑے اتارے۔ صرف لُنگی پہنے رہے۔ اور پینترا بدل کر سامنے آن کھڑے ہوئے۔ دُلھن ہنسی تو جان میں جان آئی۔ خود بھی قہقہہ لگایا اور اکڑ گئے۔ پلنگ پر جا کر بیٹھے۔ اور پاؤں دبانے لگے۔ آپ خوش ہیں کہ دلھن راہِ راست پر آئی۔

خو۔ اوہو ہو۔ دیکھو جو لُطف میل میں ہے، وہ بگاڑ میں کہاں ہے۔ لُطف تو یہی ہے کہ میاں بیوی مل جل کے رہیں۔ یک جان دو قالب۔ یہ اس پر عاشق وہ اُس پر فدا۔ وہ گُل تو یہ بُلبل۔ وہ شمشاد تو یہ قمری۔ وہ لیلیٰ تو یہ مجنوں، وہ شیریں تو یہ فرہاد۔

دُلھن۔ (آہستہ سے) ہم کو چھوڑ کے تو نہ چلے جاؤ گے۔

خو۔ (چونک کر) ارے! یہ تو اُردو بول لیتی ہیں۔ جی! یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ جانِ من۔ (شانہ ہلاکر) بولو جانی۔ اُردو بولتی ہو۔ اوہو ہو ہو۔ ہم پر تو خوب گذرے گی۔ جی خوش ہوگیا۔ خدا سلامت رکھے۔ واہ اللہ میاں واہ کیا بیوی ملی ہے۔ اِس زبان کے صدقے۔ ہاں کیا پوچھتی تھیں۔

دُلھن۔ بے مروتی تو نہ کروگے۔ تم پردیسی ہو۔ پردیسیوں کا کون ٹھکانا۔ مسافر پنچھی ہے آج یہاں کل وہاں۔ بیسیوں سمندر پار۔

مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پریت
مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

خو۔ یا خدا تیری کریمی کے صدقے۔ کیسی زبان داں بیوی ہے۔

دُلھن۔ زباندانی ہم کیا جانیں میاں، مگر ہاں ٹوٹی پھوٹی زبان ہے۔

خو۔ سبحے۔ اور ٹوٹی پھوٹی زبان اور میاں اور پردیسی اور یہ شعر خوانی۔ اس سے بڑھ کر اور زباندانی کس کو کہتے ہیں۔ اس قدر کیا کم ہے کافی ہے۔

دُلھن۔ میاں کچھ نہ پوچھو کس مصیبت سے یہاں آئے ہم کو ایک حبشی بہکا کر بیچنے لئے جاتا تھا۔ بارے خدا خدا کرکے یہ دن نصیب ہوا کہ حضور کی زیارت کی۔

خو۔ جانِ من اب تک تم ہم سے صاف صاف نہ بولیں۔ اتنی دیر تک دق کیوں کیا۔ اس میں تمہارا کیا فائدہ تھا۔ خواہ مخواہ کسی بھلے آدمی کو دق کرنے سے فائدہ۔

دُلھن۔ تمہارے ساتھی آزاد نے ہم کو سمجھایا۔ ہم نے تم سے ویسا ہی برتاؤ کیا۔

خو۔ واللہ۔ اچھا آزاد۔ ٹھہر جاؤ بچہ سمجھا جائے گا۔ چڈّا گلنجیر و۔ جانے کہاں ہو۔ دیکھو تو کیسا بدلہ لیتا ہوں۔ عمر بھر یاد ہی کرو۔ خواجہ صاحب نے اپنی ٹوپی ان کے قدموں پر رکھ دی، اور کہا بیوی بس اب تو یہ سمجھو میاں نہیں خدمتگار ہے۔ خواص ہے، درم ناخریدہ غلام ہے۔ خانہ زاد ہے۔ بندہ بے زر ہے، ملازم خاص ہے۔ مگر کب تک۔ جب تک ہماری ہو کے رہو۔ ادھر حضور نے گردن کشی کی اُدھر بندۂ درگاہ بگڑ کھڑے ہوئے۔ بس پھر کسی کے یار نہیں۔ مجھ سے بڑھ کر ذی مروّت کوئی نہیں ہے۔ مگر مجھ سے بڑھکر شریر بھی کوئی نہیں ہے، دونوں باتیں مجھ میں ہیں۔ شرارت تو رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اور مُروّت بھی اس قدر ہے کہ جس کا حساب نہیں۔ خواجہ بدیعانے کہا کہ اس کی مادرِ مہربان کہا کرتی تھی کہ ارے خوجی ایک طرف سے تو نے دودھ پیا اس میں زہر تھا۔ دوسری طرف سے دودھ پیا اُس میں آبِ نبات تھا۔ ایک سمت سے خلق اور حلم۔ دوسری سمت سے غیظ و غضب۔ اگر مل کے چلا دوستی ظاہر کی تو غلام کے تلام کا چولام، اور اگر کسی نے بل کی لی۔ تو مجھ سے زیادہ

پاجی کوئی نہیں۔ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، حضور اپنی تعریف اپنے آپ کرتے جاتے ہیں۔ غلبۂ ذکاوت اس کو کہتے ہیں زندہ باش، زندہ باش۔ شاباش۔ شاباش۔ اب آج سے ہم آپ کو باجی کہہ کے پکاریں گے۔ بُرا نہ مانیئے گا۔ بیشک اور بے شبہ اور بلا ریب۔ تم باجی ہو۔ ؎

کیا لُطف جو غیر پردہ کھولے

جادو وہ جو سَر پہ چڑھ کے بولے

دُلھن نے خواجہ صاحب کی دل جوئی کی۔ کہا میاں ہیں تم کو بجائے اپنے بڑے ابا کے سمجھتی ہوں۔ جو اس میں ذرا فرق ہو تو ناک کٹوا ڈالو۔ مجھے کچھ عذر نہ ہو گا۔

راوی۔ کس کی ناک۔ تمہاری یا خوجی کی۔ ہو چالاک کس قدر۔

خو۔ دیکھو تو بس لُطف اس میں ہے اور نہیں تو کیا۔ تم ہم پر عاشق ہم تمہاری شمع رخسار پر پروانہ۔ ہے لُطف اس میں یا نہیں۔ اور جو تم ہم سے خفا ہوئیں، ہم تم سے تو، تم الگ منہ پُھلائے بیٹھی ہو۔ ہم الگ۔ تم اُدھر بڑبڑا رہی ہو۔ ہم ادھر۔ کسی کی زبان چلی کسی کا ہاتھ چلا۔ تم نے کوسنا شروع کیا ہم نے دو ایک لپوٹے لگا دیئے تم رو رو کے پانی پی پی کے کوسنے لگیں۔ ہم نے ڈرانا شروع کیا۔ تم اور کچھ بکیں۔ ہم نے دو چار اور لگا دیں۔ چلئے اللہ اللہ خیر صلا۔ اب تو خواجہ صاحب شیر ہو گئے۔ فرمایا کہ مجھ میں کئی ہنر ہیں۔ ایک تو آج تک سینکڑوں پہلوانوں سے لڑا، اور ہمیشہ کشتیاں نکالیں۔ دوسرے قرولی چلانا مجھ سے بڑھ کر ساری خدائی میں کوئی نہیں جانتا۔ تیسرے گھوڑے پر ایسا سوار ہوتا ہوں کہ بایدو شاید۔ ایسی ران پڑی۔ اچھا شہسوار نہیں جما سکتا۔ چوتھے فارسی ہم خوب لکھتے ہیں۔ اور خوب بولتے ہیں۔ کیا کہیں وہ کانسل جو یہاں متعین تھے وہ تو چلے ہی گئے۔ ورنہ ہم اُن سے ملتے۔ پانچواں ہُنر یہ ہے کہ افیم کھانے میں بند نہیں۔ چاہے جس قدر وید و چانڈو کے جتنے کہو چھینٹے لگاؤں مدک کے دم لگاؤں۔ چرس کی لَو آسمان تک پہونچاؤں۔

دلھن۔ تمہارے پہلوان ہونے میں شک نہیں اور سپاہی آدمی ہو۔

خو۔ اسی بات پر نقاب ہٹا دو اب تو بے تکلف ہو گئے نا۔

دُلھن۔ تم تو ہاری مانتے ہو نہ جیتی۔ اپنی ہی سی کہے جاتے ہو۔ کسی اور کی بھی سنو گے یا اپنی ہی کہو گے۔ کل سے ہماری مونچھ میں درد ہے۔ اس سے کپڑا منھ پر رکھا ہے۔ جس سے ہوا نہ لگے، بڑا درد ہوتا ہے۔

خو۔ کاہے میں درد ہے۔ کیا کہا۔

دُلھن۔ اے موچھ تو کہا کانوں کی ٹھیٹیاں نکال مردوے اُوئی۔

خو۔ مُوچھ کیا۔ موچھ کیسی۔ (متحیر ہو کر) یہ بکتی کیا ہو۔

دلھن۔ (تھپڑ لگا کر) اے چچے دور موئے۔ خدا کی شان یہ منہ کھائے چولائی ہونہہ! کہنے لگے کیا کہتے ہو۔ بکتا تو خود ہے۔ مونڈی کاٹے۔

خو۔ اے تو بیوی۔ آخر یہ موچھ کیسی کہتی ہو۔ میں کہتا تو کہتا۔ سننا سٹری ہو جاتا ہے۔ عورت ہو یا مرد ہو۔ خدا جانے تم موچھ کسے کہتی ہو۔

دلھن۔ (خوجی کی موچھ پکڑ کے) اسے کہتے ہیں، یہ موچھ نہیں ہے۔

خو۔ بڑی دل لگی باز ہو۔ اللہ جانتا ہے۔ میں بھی سوچتا تھا کہ کیا کہتی ہیں۔ موچھ۔ چلو بس اب دل لگی ہو چکی۔ نقاب اٹھاؤ میں صدقے گھونگھٹ الٹو۔

دلھن۔ اللہ جانتا ہے۔ میری موچھ میں درد ہے۔ اِن کو یقین ہی نہیں آتا۔ یہ تو دیکھ لو میاں۔ ؎

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

خو۔ موچھ۔ کل کو کہو گی میری ڈاڑھی بڑھ گئی ہے۔

دلھن۔ قسم کلام اللہ کی یہ دیکھو اب یقین آیا یا نہیں۔

خواجہ بدیع الزماں غور کر کے دیکھتے ہیں تو ذرا سی موچھیں۔ پھر غور کر کے دیکھا تو گھبرائے۔ پوچھا آخر بتاؤ تو جانِ من یہ موچھ کیا معنی۔ وہ بولی۔ کیا معنی کے کیا معنے۔ اللہ کی شان۔ اس میں تم کو اصرار کیا ہے۔ صورت شکل اچھی ہے۔ نِک سُک سے درست ہوں۔ کم سِن ہوں۔ پھر تیز طبیعت ہوں۔ طاقت ور ہوں۔ تم سے کسی سے کشتی ہو میں اٹھا کے دے ماروں۔ خوجی چونک کر بولے۔ (ایں! کیا) مجھ سے اور کسی مرد سے کُشتی ہو تم اٹھا کے دے مارو۔ ایسی جورو سے بندہ درگذرا۔ خیر دل لگی رہنے دو۔ آخر بتاؤ تو یہ موچھ کیسی ہے۔

دُلھن۔ جو بات کسی عورت میں نہ ہو وہ مجھ میں موجود ہے۔

خو۔ تم پر خدا کی مار پیاری۔ بھلا عورت کو موچھ سے کیا واسطہ ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ۔ ؎

اتنا تو وہ سرنگوں ہے کہ سب اُڑ گئے ہیں دانت

جبڑے پہ بس کہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار

دُلھن۔ اَب میں شعر و یر کو تو۔ کہ میں نہیں جانتی۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ تم بالکل گدھے ہو۔ ہمارے ملک کی جتنی عورتیں ہیں سب کے موچھ ہوتی ہے۔ بے موچھ کی کوئی عورت نہیں ہوتی۔

خو۔ آپ کی ایسی تیسی پیاری۔ کیا اُلّو مقرر کیا ہے۔

راوی۔ اے سبحان اللہ۔ ایسی تیسی کے بعد پیاری کے لفظ نے وہ لُطف دیا ہے کہ باید و شاید۔ (تم پر خدا کی مار پیاری) اور آپ کی ایسی تیسی پیاری۔ آپ کی بھی ایسی تیسی جناب خواجہ صاحب۔ آپ پر خدا کی مار حضور

بدلیقا صاحب۔

دُلھن۔ اے ہے تم تو بالکل اناڑی ہو۔ سب عورتیں تم نے دیکھیں۔ کہاں سے یہ موئی بازاری عورتیں بھی کسی گنتی میں ہیں۔ اے گھر گھر گرہستیوں، بہوؤں بیٹیوں کو دیکھو۔ ذرا ذری سی موچھ سب کے ہے۔

خو۔ واہ ہے یہ عورتیں کیا رچھنیاں ہیں۔ بندۂ درگاہ درگذر ہے۔ بس ہیچ پے ہزار نعمت پائی۔ صاحب جی ہاں۔

دلھن۔ اللہ کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ اس عمر میں بڑا سا خوش رو جوان پری شمائل۔ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ جو دیکھا ہو تو سامنے والے (خوجی کی طرف اشارہ کرکے) دونوں دیدے پٹم ہو جائیں۔

خو۔ (مسکرا کر) میں کس لایق ہوں۔ ہاں کسی زمانے میں تھا۔

دُلھن۔ قسم کھاکے کہتی ہوں۔ کہ اس اتنی عمر میں کوئی ایسی قبول صورت نہیں دیکھی۔ میاں اللہ تم کو دو چار برس اور زندہ رکھے۔

خو۔ آخر تمہاری عمر کیا ہوگی ابھی تو ماشاء اللہ جوان جہان ہو اُٹھتی جولانی ہے۔ ابھی سے اتنی تجربہ کار کیوں کر ہوگئیں۔

دُلھن۔ واہ۔ اے شادی ہوتی تو تم ایسے لڑکے کھیلتے ہوتے۔

خو۔ وہ سب غلط۔ آخر آپ کا سن شریف کیا ہے۔

دُلھن۔ اے یہی کوئی چالیس بیالیس پینتالیس چھیالیس۔

خو۔ (قہقہہ لگا کر) صاحبزادی ہم سے اور سن۔ واہ۔ اے پچاس برس کے تو میرے پوتے موجود ہیں، اور خدا نہ جھوٹ بلائے تو کم از کم اور بیش از بیش میرا سن کوئی باون ترپن سے کم نہ ہوگا۔ میرے آگے کی لڑکی ہو ابھی۔ ؏

اک ذرا ہوش سنبھالو ابھی دنیا دیکھو

میرے چھوٹے بھائی کی پوتی تمہاری دادی جان سے بڑی ہوگی، اور وہ بھی چھوٹا بھائی۔ ؎

برادر کی یہی ہے نیک بختی رہے پیشِ برادر وقتِ سختی

سلف سے عالموں نے اے مزدور

کہا ہے قوت بازو برادر

دُلھن۔ اتنی دیر سے بیٹھے باتیں بنا رہے ہو، اتنا نہیں ہوتا کہ ذری بوسہ تو لیں۔ گویا تھک جائیں گے۔ بس بس دیکھ لی محبت۔

جائیے بس خوب الفت آزمائی آپ کی

آپ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ سے اُلفت کرے یا دل لگائیے۔

میرے زہے قسمت زہے نصیب کہ حضور طالب بوسہ ہوئیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ بوسہ مجھے نصیب نہ ہوگا۔

بارے شکر ہے کہ خود حضور نے طلب کیا۔ ورنہ بس ؎

یک بوسہ ہرگزم لب سیمیں بری نداد

گویا نہال عاشقی ما بری نداد

دلھن۔ اچھا اسی بات پر بوسہ لیلو، مگر ایک بوسہ۔

خو۔ برقع ہٹاؤ تو لطفِ بوسہ حاصل ہو ورنہ کیا فائدہ۔ اس سے۔

دلھن۔ نہ۔ حجاب بھی کوئی شے ہے، یا موئی بیحیائی ہی کے ہاتھ بک گئے ہو۔ اوئی بیحیائی بھی تو کتنی ہو نہ!

خو۔ اچھا تو برقع پر ہی سے سہی (دو تین بوسے لے لئے)۔ ؎

برقع ز عارض برافگن یک صبح دم تا جاوداں

گردد فرامش صبح را خورشید تاباں در بغل

یہ شعر ہر بات کے جواب میں کہوں گا، اور روٹھ جاؤں گا۔

دلھن۔ اوئی سچ کہنا تو گویا معشوق تم ہو تم عورت ہو اور ہم مرد۔ اس معشوق مزاجی کو آگ لگے اللہ کرے۔

خو۔ دو باتیں ہیں دونوں کا جواب دیجئے۔

(۱) تم مجھ سے مل کے رہنا چاہتی ہو یا بگاڑ کر کے۔

(۲) یہ مونچھیں سچ مچ کی ہیں یا مصنوعی۔ اور بنائی ہوئی ہیں۔

دلھن نے کہا اچھا خیر تم بھی کیا یاد کرو گے، لو برقع اٹھائے ڈالتی ہوں۔ مگر اس وقت سے تم اپنے کو میرا غلام سمجھو۔ تمہاری شرطیں تو میں سن چکی ہوں۔ اب تم میری شرطیں سنو۔ لیکن اگر ایک شرط کے بھی خلاف عمل درآمد کیا تو میں بگڑ ہی جاؤں گی۔ اور تمہاری بوٹیاں نوچ نوچ کھاؤں گی۔ خواجہ صاحب نے برقع پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ جانِ من تمہارے لیے جان و مال سب حاضر ہے۔ یہ کیا بات ہے جو حکم ہو فوراً بجا لاؤں۔ اب شرطیں بتایئے بدل و جان منظور ہیں۔ یہی شرط کرو گی کہ کسی عورت کو نظرِ بد سے نہ دیکھنا۔ سو اگر نظرِ بد سے پری تک بھی نظر پڑے تو آنکھیں تلوؤں کے تلے مل ڈالنا۔ ایسی مہ پارہ کے ہوتے ساتھی پھر کسی ایسی ویسی پر نظر ڈالوں کیا مجال ہے۔ ؎

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

دوسری شرط یہ ہوگی کہ کسی سے کشتی نہ لڑوں۔ تم کو خوف ہوگا کہ شاید کبھی ہاتھ پاؤں پر ضرب آئے۔ اس خیال پر مجھے بڑی ہنسی آتی ہے، جانِ من تمہارا میاں لڑکپن سے کشتی لڑتا آیا ہے۔ باپ پہلوان۔ دادا پہلوان۔

پَردادا مشہور آدمی، اور مورثِ اعلیٰ رستم کا نام تو سب نے سُنا ہے۔ ہندوستان میں پہلوانوں نے ہمارا نام سُنا اور کان پکڑ لیئے۔ جو مقابلہ کو آیا اس نے نیچا دیکھا ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ٹھور کے میلے میں ایک پہلوان آیا شیدی بڑا شہدا بنا ہوا گینڈا۔ پنجاب کا نامی گرامی پہلوان اس نے کہا ہم کشتی لڑیں گے مگر اس شرط پر کہ کوئی ہمارا ہی سا گران ڈیل ڈنڈ پیل اور چست ہو اس قدر لحیم شحیم اور ڈنڈ پیل آدمی کہاں ملتا۔ لوگوں نے ہم سے آن کے کہا۔ ہم نے کہا اچھا۔ سمجھا جائے گا۔ اپنے کل پٹھوں کو لے کر ہم اس طرف سے نکلے جہاں وہ ٹکا تھا۔ اس نے مجھے ٹوکا۔ کہو بھئی پہلوان کہاں کی تیاریاں ہیں۔ میں نے کہا بھائی پہلوانی ہم کیا جانیں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ ہیں۔ بولا چاہے جو ہو اگر پہلوان ہو تو پھر آؤ۔ دو دو باتیں ہو جائیں۔ میں نے بولا باتیں تو ہو ہی رہی ہیں۔ کہنے لگا کہ یہ زبانی داخلہ۔ یا ہم اوپر ہوں یا تم۔ یا تم آسمان دیکھو یا ہم کو دکھاؤ۔ جس کو خدا دے وہ لے۔ بس پھر ہم کب چوکنے والے ہیں۔ ہم نے کہا بھئی سنو ؎

کرتے جوں کو وہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے سُنے گا جو کہے گا ہم کو

ہم کسی کو ٹوک کے نہیں لڑتے۔ ہاں تم نے ٹوکا اب ہم موجود ہیں۔ مصرع۔

جب ٹوکتے ہیں غیظ تب آتا ہے شیر کو

مگر یاد رکھو تم ہم سے لڑو گے نہیں۔ اس نے کہا تم سے لڑیں اور تمہارے باپ سے لڑیں۔ بس قبلہ۔

راوی۔ چہ خوش۔ بیوی کو قبلہ بنایا۔ ہو خلف الرشید۔

خو۔ بس قبلہ جناب والد مرحوم کا لفظ جو اس گستاخی سے اس کی زبان پر آیا، تو بندہ آگ ہو گیا۔ میں نے کہا آؤ بسم اللہ۔ تو پھر تو مجھ سے اور اُس سے زبان ملی۔

شیدی۔ ابھی ابھی کشتی ہو۔ اکھاڑا کھدوایا جاوے۔

خو۔ کس کا اکھاڑا یہیں بالو پر ہو یا ادھر یا اُدھر۔

شیدی۔ اچھا یوں ہی سہی آؤ چٹنی کر ڈالوں گا بچہ۔

خو۔ سا بے او گیدی چونچ سنبھال۔ مرد آدمیوں میں اس قسم کی باتیں مطلق جائز نہیں ہیں۔ دل کا حوصلہ نکال لو نہ آ کے۔

شیدی۔ اچھا آؤ۔ اتنے برسوں کا تمہارا ریاض خاک میں ملا دوں گا۔

خو۔ تو بھائی جان جس کو خدا دے وہ لے۔ بنی بنائی بات ہے۔

شیدی۔ ہاں ہاں بنی بنائی بات تو ہے، مگر دیکھ لینا انجر پنجر ڈھیلے کر دوں گا۔ دا کڑ کس پہلوان ہوں بھیڑ نہیں لوں

بس مجھے غصہ آیا باندھ کے چٹ لنگوٹ مستعد، اب دریا کے گھاٹ پر دو تین کروڑ آدمیوں کی بھیڑ ہو گئی تھی۔ اُسی وقت کوتوال نے ٹٹر لگا دیئے، اور روپیہ آٹھ آنے چار آنے ٹکٹ باندھ دیا۔ اور بندہ اور شیدی اکھاڑے میں اُترے۔ جیسے ہی میں نے کپڑے اتارے اور علی کا نام لے کے تین ڈنڈ پیلے۔ حضرت شیدی کانپنے لگے۔ چُپ کیے تو کیا کیے۔ میں نے خم ٹھونک کے کہا بسم اللہ۔

شیدی۔ ہم نہ لڑیں گے صاحب۔ ہم کو انکار ہے اس سے۔

صاحب۔ ول کشتی ضرور ہوگا۔ تم سمجھائے کوتوال صاحب۔

کوتوال۔ خداوند اِس شیدی نے ان کو خود ٹوکا تھا۔

صاحب۔ ول اکھاڑے کے باہر تم نہ جانے پائے گا۔ آج بے لڑے۔

شیدی۔ خداوند اس کا بدن پچور ہے۔ پہلے میں سمجھا کہ میری جوڑ ہے مگر اب میرے حواس جاتے رہے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں میں نہ لڑوں گا۔

خو۔ دیکھو پہلوانی کرتے ہو مگر پہلوان کا گینڈا تک نہیں پہچانتے۔ کہ پہلوان کیسے ہوتے ہیں۔ واہ حضرت واہ۔

جواں مرداں نہ پیچیند از سخن رو

ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گو

پھر ایک گھنٹے تک کوتوال اور صاحب کہا کئے وہ نہ لڑا نہ لڑا۔ ہم وہ ہیں۔

دلھن نے کہا اب تم نے اپنے دل سے گھڑ کے ایک بات بنائی۔ ہم ان دونوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی نہیں کرتے۔ ہماری شرطیں یہ ہیں۔

پہلی شرط۔ افیم کھانا قطعاً چھوڑ دو۔ بالکل۔

خو۔ بس اب دونوں شرط کی ضرورت نہیں افیم چھوڑ دی۔ اور میری پہلی ہی شرط میں حضور نے فیصلہ کر دیا اور شرطیں خدا جانے کس قدر سخت ہوں گی۔ خدا کے لیے اس شرط کو جانے دو۔ واسطے خدا کے کوئی اور شرط اس کے عوض تجویز کرو۔

دُلھن۔ اچھا دوسری شرط سُنو۔ ہندوستان میں جب مکان لو۔ کسی بہروپئے کے پڑوس لو۔ ورنہ ہم ایک دن تمہارے ساتھ نہ رہیں گے۔

اس قدر سُننا تھا کہ خوجی آگ ہو گئے۔ اور مارے بوکھلاہٹ کے اردو کی عوض فارسی بولنے لگے۔

تا باہائے من بدیع۔ مکانِ ما قریب بود و باش شخص (صورت تغیہ) باشد ہرگز نباشد۔ پرسی کہ چرا نباشد گفتم کہ ازیں وجہ نباشد کہ مکانِ ما لائق تہدگان نیست۔ فہم کردی۔ ارے غضب من ونزد بہ بہ بیا مانم پیدا مام۔

ہرگز نہ مانم۔ ع۔

من کہ باشم کہ براں خاطر عاطر گذرم

اس وقت چلو بھر خون خشک ہوگیا۔ بہروپئے کی تو صورت سے مجھے نفرت ہے؛ دو شرطیں بیان کیں دونوں جان کی دشمن۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃ بس، اب شادی اور خانہ آبادی معلوم۔ میں سمجھا تھا کہ خدا کو کچھ بہتری منظور ہے اب سمجھ گیا کہ خانہ بربادی کی فکر ہے۔ اللہ میاں کو کوئی نہ ملا۔ ساری دنیا میں ہمیں ڈھونڈھ نکالا۔ ؎

ہر بلائے کز آسماں آید گرچہ بر دیگرے قضا باشد

بر زمین نارسیدہ می پرسد

خانۂ انوری کجا باشد

دُلھن۔ فارسی خوب بولتے ہو میاں۔ مگر (صورت تغیر) ہم نہ سمجھے۔

خو۔ (اکڑ کر) ہونھ! کیا تعریف کی ہے۔ کہنے لگیں فارسی تو خوب بولتے ہو میاں۔ یہ نہ کہا کہ ایرانیوں کو مات کر دیا۔ فارسی تو خوب بولتے ہو میاں واہ۔ مگر۔ خیر۔ تعریف تو کی۔ آزاد کمبخت تو تعصب کے سبب سے اس قدر بھی تعریف نہیں کرتا (صورت تغیر) کا لفظ ایرانیوں کا محاورہ ہے شیرازی بہروپئے کو صورت تغیر کہتے ہیں۔

دلھن نے کہا جانِ من۔ از برائے خدا سچ سچ بتاؤ کہ شادی کے بعد تو ہمارے باپ سے بدلا نہ لوگے۔ جب تم داماد اور وہ تمہارے خُسر ہوئے تو پھر ناچاقی نہ ہونی چاہیئے۔ مل جل کے کام کرو۔ یہ نہیں کہ وہ تمہارے دشمن ہوں نہ تم ان کے۔ خوجی نے تشفّی دی۔ کہا کیا مجال اور اگر وہ اُن دامادوں میں ہیں کہ جن ملعونوں کی نسبت یہ شعر چسپاں، اور صادق ہے۔ ؎

واں نہ برسیں فلک سے انگارے

بیٹی دے کر دَمَاد کی مارے

راوی۔ معقول۔ یہ حضور کا کلام ہی ہوگا۔ دَمَاد کتنا فصیح لفظ ہے، وہ تو آپ کا کینڈا ہی چھپا ہی نہیں رہتا۔ واللہ فرد ہو۔

خو۔ اگر اس شعر کے مصداق ہیں تو خیر ورنہ بندہ نوان کا دعاگوئے قدیم ہے، اور اب خسروی بزرگی کا واسطہ ٹھہرا اتنا سمجھ لیجئے۔ بس۔

دلھن نے کہا۔ اچھا اب ہم نقاب اٹھاتے ہیں۔ مگر سنبھلے ہوئے ایسا نہ ہو کہ چہرہ کی ضیاء اور نورِ موفور اور حُسنِ گلوسوز دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اور دھم سے گر پڑو۔

خو۔ واہ یہاں کروڑوں پریاں دیکھ ڈالی ہیں۔ جی۔

دلھن۔ کروڑوں تو پھر ہم کو کاہے کو پسند کروگے؛ مگر خوب یاد رکھنا، صورت دیکھتے ہی تڑپنے لگوگے۔

اگر ہوش و حواس قائم رہیں، تو ناک ناک بدتے ہیں، چاہے بدلو۔

خو۔ واہ ہماری ناک کٹی تو تمہارا، اور ہمارا دونوں کا نقصان ہے۔ اور تمہاری کٹی تو دونوں کا زیان۔

دلھن۔ نہیں تو پھر میں صورت نہ دکھاؤں گی نہ دکھاؤں گی۔

خو۔ اچھا صاحب بدلی۔ ناک ناک بدلی۔ ادھر یا اُدھر۔ دلہن نے کہا خیر۔ بدلی تو بدلی۔ یوں ہی سہی۔ اب میں بُرقع اٹھاؤں، یہ کہہ کر دلھن نے نقاب کو اُلٹ دیا۔ اور خوجی چیخ کے گر پڑے۔ اُٹھے اور پھر گرے اور سگِ پاسوختہ کی طرح ادھر اُدھر گھبرائے ہوئے پھرنے لگے۔ مگر پانوں دقت سے پڑتے تھے۔ اس قدر غل مچایا کہ آسمان سر پر اُٹھایا۔ اس وحشت کے صدقے یا خدا بچائے۔ اگر اس منحوس کی صورت آج بعد مدت دیکھی، اوگیدی (دروازہ پر ہاتھ مار کر) ہائے دروازہ بھی بند ہے۔ اوگیدی خدا تجھ سے سمجھے نامعقول۔

راوی۔ جھوٹے کی ایسی تیسی۔ بڑے فارسی داں بنے ہیں۔

دلھن۔ تم بہروپئے کے نام سے اس قدر چونکتے کیوں ہو۔

خو۔ یہ نہ پوچھو۔ ہم کو بمبئی کے ایک بہروپئے نے بہت دِق کیا تھا۔ بہروپئے کے نام سے مجھے کامل نفرت ہے۔ اور خصوصاً اس بمبئی والے نامعقول بہروپئے کے نام سے۔

دلھن۔ کون۔ کون بمبئی کا بہروپیا۔؟ کون سا بہروپیا۔

خو۔ ارے صاحب وہ بڑا نامی گرامی بہروپیا ہے۔

دلھن۔ اے ہے تم وہی خوجی تو نہیں ہو۔ مسخرے جو آزاد کے ساتھ بمبئی میں آئے تھے اور ایک بہروپئے کو جھانسا دے گئے تھے۔ کئی روپئے کا پارسل اپنے نام لکھ کر بھیجدیا۔

خو۔ ارے!۔ اُفوہ۔ ہم اس قدر مشہور ہوئے ہیں۔ مگر اس وقت تم نے ہمیں قتل ہی کر ڈالا۔ کہیں کا نہ رکھا۔ آگ ہو گیا ہوں آگ۔ مصرعہ۔

پانی چھڑ کا تو آگ ہو جاؤں گا

دلھن۔ یہ کاہے سے میں نے تو ایک بات کہی۔

خو۔ خوجی کس بھکوے کا نام ہے۔ خوجی خوجی۔ اور خوجی کے باپ دونوں کی ایسی تیسی۔ ہمارا نام جناب خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع ہے۔ خوجی کہیں اور رہتے ہوں گے اور یہ تم نے کیا کہا کہ مسخرے ہو۔ مسخری تو خود ہو گی۔ ہم ظراف، بذلہ سنج، لطیفہ گو ہیں۔ مسخرے کی دُم میں رسّا مُردک کی۔ مگر تو بتا کہ ہمارے جُل دینے کا حال تمہیں کیوں کر معلوم ہوا۔

دلھن۔ وہ میرے باپ ہیں، اب تمہارے خُسر ہوئے۔

خو۔ (اچھل کر) اہو ہو ہو۔ جی خوش ہوگیا۔ ہات تیرے گیدی کی۔ کوئی چچا بنا کے چھوڑتا ہے۔ میں نے سسرا بنا کے چھوڑا۔ ؎

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست
کہ ایں مژدہ آسایش جاں فاست

شکر ہے کہ اس کے خسر تو ہوئے۔ ہاں جانِ من۔ آزاد پاشا روم کے وزیر جنگ کا مصاحب میں ہی ہوں۔ میں پرائیوٹ سکریٹری ہوں۔

دُلھن۔ خیر تو اب اور شرطیں تو سُن لو۔

خو۔ یہ شرط اب مجھکو منظور ہے کہ میں کسی بہروپئے کے پڑوس رہوں، مگر افیم کا ترک کرنا محال ہے۔ یہ ہم سے نہ ہو سکے گا نہ ہو سکے گا۔

دلھن۔ اچھا ایک شرط اور ہے۔ جس جہاز پر بہت سے کمھار سوار ہوں، اُسی جہاز پر ہم تم بھی جائیں۔

خو۔ ارے غضب خدا جا چکے۔ کمہار کی صورت سے نفرت ہے۔ ہاں اگر کمہاروں کے ہاں ننہال ہو تو کیا مضائقہ، وہ بھی آکے سسرے بنیں، ادھر بہروپیا اُدھر بہروپیا کمہار۔ یہ تو سب ہوا۔ اب آپ ذرا صورت زیبا تو دکھائیں۔ خدا کی مار اُس خرِ نامشخص پر (دوسرے دروازے پر ہاتھ مار کر) اُفوہ۔ یہ بھی بند ہے اب میں بھاگوں کدھر سے (تیسرے دروازے پر ہاتھ مار کر) ارے یہ بھی بند ہے۔ یا خدا کس غضب میں جان پڑی ہے۔ آزاد آزاد۔ (شیشے کی راہ سے) آزاد آزاد پاشا۔ مس کلیرسا۔ مس میڈا۔ پولینڈ کی شہزادی۔ ارے زمین۔ مرزا صاحب۔ ارے کوئی ہے ہرمز جی۔ سب مر گئے۔ ہائے گاڑھے وقت کسی نے مدد نہ دی۔ ؎

اُس کا ہے کون جس کی مددپر خدا نہیں
ڈوبے وہ ناؤ جس کا خدا نا خدا نہیں

جب خدا ہی مِن بدیع بدبخت کا نہیں، تو کون ہوگا۔ (زور سے) یا خدا میری سُن۔ خدا سے کیونکہ اس کمبخت پلید نے تو سب دروازے بند کر دیئے۔

راوی۔ اس بوکھلاہٹ کے صدقے۔

خو۔ اس مصیبت میں کبھی نہیں پڑا تھا۔ افتاد۔ ہائے افسوس (سر پیٹ کر) یاراں ایں چہ شد۔ مرا ایں چہ شد کہ دریں چاہ نابکار وعمیق گرفتار شد۔ افسوس می کنم یاران من نالہ کہ بسیار افسوس دارم ارے کوئی اس بیکس کی خبر لو (دُلھن کی طرف مخاطب ہوکر) اچھا پھر آج تم ہی نہیں یا ہم ہی نہیں۔ دونوں میں ایک نہیں؛ او گیدی تو دُلھن نہیں۔ گیدی ہے؛ اور جو دو زور کی تپ نہ ہوتی تو اٹھا کے دے مارتا۔

گیدی۔ اچھا صاحب ہم گیدی ہی سہی آگے فرمائیے۔
خو۔ ایسی صورت خدا کسی کو نہ دکھائے۔ یہ کون بھل منسی ہے۔
گیدی۔ کی حضرت پہلے تو ناک کٹوائیے۔ سامنے آئیے۔
خو۔ دور دور سے باتیں کرو۔ دُور دُور سے۔
گیدی۔ دور دور سے نہیں۔ میں ناک کاٹوں گا۔ ہم سے آپ سے شرط ہے۔ پہلے ناک کٹوائیے۔ پھر اس پارسل کے روپے لائیے۔ کیا باپ کا مال سمجھ کر اپنے نام لفافہ لکھوالیا اب دائیں ہاتھ سے روپیہ لاؤ، اور ناک سامنے کرو۔ تو چھری تیز کر کے اُڑا لوں۔
خو۔ الگ رکھو۔ بس میں جھلا آدمی ہوں۔ جی الگ الگ۔

ناظرین کو یاد ہوگا۔ کہ جب حضور خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع۔ (بدلیعا) آزاد کے ساتھ بمبئی میں داخل ہوئے تو ایک بہروپیے نے ان کی ناک میں دم کر دیا۔ پہلے عورت کا بھیس بدل کر آیا۔ سرا میں انہوں نے سیٹھی بجائی۔ ان کو ایسا غیا دیا کہ وہ جھکے میں آگئے۔ آخر کار نوبت بایںجا رسید کہ وہ ان کو گود میں اٹھا کے لے بھاگا۔ اس کے قبل ان کی گفتگو سننے کے قابل تھی۔ ناظرین کی تفریح کے لیے اس پیاری پیاری تقریر کا کسی قدر حصہ نذر کیا جاتا ہے۔

عورت۔ اللہ جانتا ہے کتنے وجیہ جوان ہو، اور خدائے پاک کی قسم کیا ہاتھ پاؤں پائے ہیں۔ مگر ڈاڑھی منڈوالو۔
خو۔ (اکڑ کر) ابھی کیا ہے جوانی میں دیکھنا۔
عورت۔ ڈیل ڈول کتنا پیارا ہے، اور نک سک سے کتنے درست ہیں۔ آپ، کہ ماشاء اللہ۔ جی خوش ہو گیا۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔
خو۔ (دونوں بازوؤں کو پھڑکا کر) اور جو میں ورزش کروں تو شیدی لنڈھور کو لڑا دوں۔
عورت۔ ذری کان تو پھٹپھٹا ڈالو۔ شاباش ہے۔
خو۔ ایک بات کہوں بُرا تو نہ مانوگی۔ سچ بتانا۔
عورت۔ جو بُرا مانوں گی تو ذرا کھوپڑی سہلا دوں گی۔
خو۔ (ہاتھ جوڑ کر) جانِ من جان بخشی ہو تو کہوں۔
عورت۔ کیا کسی بھٹیاری یا کسی بھٹیارے کی جان لوگے اے ہاں۔
خو۔ کہوں کہہ ڈالوں۔ اچھا مگر خون معاف ہو جائے۔

عورت۔ (چپت لگاکر) ابے خون کیسا بھکوے۔ خون لایا ہے۔

خو۔ یہ دھول دھپّا شریفوں میں کہاں جائز ہے بھلا۔

عورت۔ شریف بچہ موے کو کون نگوڑی سمجھتی ہے (ٹوپی پھینک کر ایک اور چپت جمائی چٹاخ۔ آنکھیں کیا نیلی پیلی کرتا ہے۔ پھوڑ دوں دونوں دیدے۔

راوی۔ واہ۔ واللہ اچھی۔ آنکھ پھوڑی۔ آنکھ لڑائی خدا چشمِ زخم حوادث سے بچائے۔ جہنم بھر میں اس نے دیدہ و دانستہ عین آنکھ پر ہی نشتر مارنا چاہا۔ عورت کیا آنکھ پھوڑنڈا ہے۔

خو۔ اب ہمارا مطلب تو اس جھنجھٹ میں خبط ہوا جاتا ہے۔ یہ بتاؤ کچھ مانگیں تو دو یا نہ دو۔

عورت۔ ہاں کیوں نہیں (کان پکڑ کر ایک لپّڑ اِدھر اور دوسرا اُدھر) کیا مٹے بولتے ہیں۔ آپ چیستان بجھواتے ہیں۔

خو۔ ہم یہ مانگتے ہیں۔ ہمارے ساتھ شادی کر لو۔ تمہارے ساتھ شادی کرنے کو جی چاہتا ہے۔

جب اُس نے بیاہ کا اقرار کر لیا تو خوجی کو جھپ سے گود میں اٹھا لیا اور بغل میں دبا کر لے چلی۔ خوجی بہت ہی چکرائے۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے، ہزار زور کئے، مگر اس نے جو دبایا تو اس طرح لے چلی جیسے کوئی چڑی مار جانوروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے لے چلے۔ اب سارا زمانہ دیکھ رہا ہے۔ کہ خوجی پھڑکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ کشیدہ قامت عورت چھم چھم کرتی اور پھرتی کے ساتھ قدم دھرتی یہ گئی، وہ گئی۔ ایک بار خوجی بھاگ نکلنے کو تھے مگر اُس نے پھر چپڑ غٹو کیا۔ خوجی بولے چھوڑتی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا ہم شریفوں کی بہو بیٹیاں ایک کے سر ہو رہیں میاں کو چھوڑنا کیا معنی۔ خوجی سر پیٹنے لگے۔ کہ ابھی سے میاں کیونکر ہوئے۔ ارے یار کیا شہر شملہ ہے۔ ایک ڈائن بھلے مانس کو مارے ڈالتی ہے۔ کوئی بیچ بچاؤ تک نہیں کرتا۔ یارو خدا کے لیے بچاؤ۔ للّٰہ بچاؤ۔ لیکن واہ رے بیّن ڈاڑھی بچا ہی لی۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ان کو چھوڑا تھا۔ اس کے بعد دوسرے روز سپاہی بن کر آیا خوجی کو مٹھائی کی چاٹ دے کر بزاز کی دوکان پر بٹھایا، اور ان کی ضمانت دے کر ان کو دکان پر گروی رکھ کر لمبا ہوا۔ یہ جو تھوڑی دیر کے بعد اُٹھنے لگے تو بزاز نے للکارا۔ آخر ان کے نام پر رقعہ آیا۔ بات تیری کی کیوں کھا گیا۔ غپا۔ دیکھ اب کی پھر پھانسا۔ تب کی بیوی بن کے چپتا دیا۔ اب کی میاں بن کے غپیا دیا۔ اس بہروپئے سے خواجہ صاحب اس قدر ڈرتے تھے کہ ہر دم و ہر لحظہ اُسی کا نام زبان پر آتا تھا۔ ذرا کھٹکا ہوا اور انھوں نے غل مچانا شروع کیا کہ بھلا بے گیدی، ابے بھلا ابے بہروپئے بھلا۔ اچھا بچہ سمجھا جائے گا۔ یہاں تک کہ پہلے ایک بار حضور خواجہ صاحب درخت کے سائے میں آرام فرماتے تھے۔ اتفاق سے چیل نے بیٹ کر دی تو جھلا کر درخت کی طرف نظر ڈالی اور باواز بلند کہا۔ بھلا بے گیدی۔ بھلا آج چیل بن کے آیا۔ اب سنئے کہ وہی بہروپیا ایک رئیس نامدار کے ساتھ

حج کے لیے گیا تھا۔ بعد زیارت حرمین الشریفین رئیس موصوف مصر کی سیر کے لیے آئے۔ بہروپیا بھی ساتھ تھا۔ آزاد پاشا سے آشنا، راہ میں جس ہندی سے ملاقات ہوئی (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) وہ بہروپیا ہی تھا۔ آزاد نے اس سے فرمایش کی کہ یہاں خوجی کو چکمہ دو تو جانیں۔ چنانچہ یہ رائے قرار پائی کہ بہروپیا عورت کا بھیس بنا کر ایک کمرے میں بیٹھے، اور خوجی سے کہا کہ تمہاری شادی کے لیے ایک پری پیکر دوشیزہ تجویز کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب عقل کے دشمن تو تھے ہی فوراً شادی کرنے پر آمادہ ہوئے۔ یہاں آئے تو دیکھا کہ مونچھ اور داڑھی والی بیوی ہے۔ جب اصرار بلیغ کے بعد دلھن نے برقع اٹھایا، تو بہروپیے کی صورت دیکھ کر خوجی کانپ اُٹھے۔ اور بوکھلائے ہوئے کمرے میں دوڑنے لگے۔ بہروپیے نے دو اقرار کئے تھے۔ کہ اگر برقع الٹنے کے بعد خوجی گھبرا نہ جائیں۔ تو بہروپیے کی ناک کاٹ ڈالیں۔ اور اگر گھبرا جائیں تو بہروپیا ان کی ناک اُڑا لے۔ اب اس نے ناک اڑانے کی فکر کی، اور یہ بھی کہا کہ ہمیں چکما دے کے آئے تھے۔ اب پارسل کے روپے اُگلئے۔ ورنہ مرمت کی جائے گی۔ خواجہ صاحب بوٹیاں نوچنے لگے کہ کس مصیبت میں جان پڑی۔

بہروپیا۔ دائیں ہاتھ میں روپیہ بسا دیجئے۔ ایک بات اور ناک ادھر لائیے، بندہ چاقو تیز کر رہا ہے۔

خو۔ جا بے جا منھ سے نکالو گے تو بس بگڑ ہی جائے گا۔

بہروپیا۔ اور بنی کب تھی۔ ناک ادھر لاؤ۔ آج نکٹے تو کہلاؤ گے۔ ہم اسی میں خوش ہیں کہ خوجے جیا بُرے احوال۔

خو۔ (تھپڑ کا اشارہ کرکے) خوجے کی ایسی تیسی سُور کی۔

بہروپیا۔ جیتی باد۔ ناک تھی بھی بڑی۔ بات ترے کی۔

خو۔ او گیدی الگ رہنا۔ بس الگ ہی رہنا۔ کہہ دیا ہے۔ ہاں کیا دل لگی ہے۔ ہونھ! بڑے وہ بن کے آئے ہیں۔ ابھی آپ میرے غصے سے واقف نہیں ہیں۔

بہروپیا۔ میں خوب واقف ہوں۔ کم زور مار کھانے کی نشانی۔

خو۔ ہم کمزور ہیں۔ یا خدا اس وقت کمرے پر بجلی گرے، اور ہم دونوں جل بُھن کے خاک ہو جائیں۔ آزاد (دروازے سے جھانک کر) اے آزاد۔ نہ بول کمبخت۔ مس کلیر سا صاحب، اجی مس میڈا کوئی ہے۔ واہ سب کے سب مٹ گئے مارے پڑے ہیں اچھی دلھن دکھائی۔

بہروپیا۔ اب بتاؤ وہ پارسل والے روپے دو گے یا نہیں۔؟

خو۔ کیسے روپے اور کس کی پارسل۔ آیا وہاں سے۔

بہروپیا۔ پھر مجھ سے آپ سے بگڑ ہو گی۔ بس اور اس سے بھڑ کر کیا ہو گا۔ ناحق بن ناحق ہاتھ پاؤں توڑ کے دھر دوں گا۔

خو۔ کیا (مسکرا کر) ماشاءاللہ پہلے جا کے ہوٹل والوں سے تو دریافت کرو کہ کس جواں مردی کے ساتھ مصر کے پہلوانوں کو اٹھا کے دے مارا چاروں شانے چت۔

بہروپیا۔ اچھا پھر اب تمہاری قضا آئی ہے۔ ہڈیاں چلچلاتی ہیں۔ خواہ مخواہ ناحق ہاتھ پانوں کے دشمن ہوئے ہو۔

خو۔ سچ کہتا ہوں۔ ابھی میرا غصہ تم نے نہیں دیکھا ہے۔

راوی۔ کیوں کر دیکھتے اس وقت یہ کہاں تھے۔ جب بوا زعفران پر آپ نے غصہ اُتارا تھا۔ جب کُمہار کی مرمت کی تھی۔ جب کسان کو کانجی ہَوس لے گئے تھے۔ غرض کہ بہروپئے کی خیر ہم کو نہیں نظر آتی ہے۔ خوجی کے ہاتھ سے اِس کی قضا آئی ہے

بہروپیا۔ اب ایک دفعہ پوچھ کر پھر ہاتھ سے خبر لوں گا۔

خو۔ اور میں فرولی سے بات کا جواب دوں گا۔ گیدی۔

بہروپیا۔ ہم سے تم سے کیا اقرار تھا۔ ناک ناک بدی تھی۔ نہ ناک تراش کے چیلوں کو دیں گے۔ چیل چلو چیل چلو۔ انڈے بچے والی چیل چلو۔ حضور کی ناک اور چیل کی چونچ۔

خواجہ صاحب سوچے کہ اب اس سے چھٹکارہ محال ہے۔ اوّل تو کرارا آدمی۔ دوسرے گراں ڈیل۔ تیسرے تنہ زور، چوتھے جوان۔ یہ پستہ قامت، ضعیف الجثّہ، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں۔ ماشہ بھر کے آدمی۔ کوئی پھونک مارے تو پتانے لگیں۔ مگر نکھیے پن کے سبب سے دَب کے رہنا محال تھا۔ آخر کار بہروپئے سے بہ لجاجت پیش آئے۔

خو۔ بھائی جان۔ پردیس میں ہم کو تم کو مل جُل کے رہنا چاہئے۔ مگر خدا جانے تم کیسے ہندوستانی ہو کہ ہندوستانی کا ساتھ نہیں دیتے۔

بہروپیا۔ پارسل کا روپیہ دائیں ہاتھ سے ڈال دو تو خیر۔

خو۔ اجی لاحول تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ اے توبہ۔

حسابِ دوستاں در دلِ اگر وہ بے وفا سمجھے
کوئی پوچھے تو کیا پوچھے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

پارسل کا ذکر کیسا۔ بزاز کی دکان پر ہم بھی تو حضور کی طرف سے کچھ پوچ آئے تھے۔ کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے۔ چلو فراغت ہوئی۔

بہروپیا۔ اچھا تو وعدہ تو پورا کرو۔ ناک تو کاٹنے دو۔

خو۔ واہ بھلا مجھ غریب آدمی کی ناک کاٹنے سے فائدہ۔ ناک چھوڑ چاہے دونوں کان کاٹ ڈالو۔ مگر ہمارا جوبن کم نہ ہوگا۔

راوی۔ ہم جانتے ہیں ناک کاٹنے سے اور دو بالا ہو جائے گا۔

اتنے میں آزاد پاشا نے دروازے پر آواز دی۔ جناب خواجہ صاحب اور خوجی کفن پھاڑ چیخ اُٹھے۔ خوش آمدی۔ خوش آمدی بیا برادرم بیا۔ ع۔

بیا برادر آ درے بھائی

بھروپئے نے دروازہ کھول دیا۔ مس کلیرسا نے آتے ہی قہقہہ لگایا۔

آزاد۔ کہیئے حضرت شادی مبارک ہو۔ یار آج ہماری دعوت کرو۔

خو۔ زہر کھلاؤ، اور دعوت مانگو۔ یہ جو ہم نے آپ کی حمایت کی۔ کروروں مصیبتوں سے بچایا۔ لاکھوں خطروں میں جان پڑی۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ آپ نے ہم کو ذلیل کیا۔ مس روز دل افروز کے روبرو ہم کو کیا جلنے کیا کیا کہا، ہزار ہا باتیں سُنائیں۔ مگر ہم خاموش ہو رہے۔ اب اس وقت یہ گل کھلا۔ بس قسم خدا کی۔ خیر۔

ما زیاراں چشم یاری داشتیم

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

ایک تو اس مردنا معقول سنڈے نے بُھرکس نکال ڈالا۔ اور میں اس دھوکے ہیں کہ عورت ہے، اس کے منھ کون لگے۔ کوئی پہلوان ہو تو خم ٹھونک کے لڑوں، مگر دُھن سے لڑنا چھوٹی بات ہے۔ یہاں تو یہ خیال تھا، اور وہاں وہ اور ہی فکر میں تھا۔ اب ہم یا مصر میں نوکری کرلیں گے یا پھر روم واپس چلے جائیں گے۔ وہاں کے لوگ قدر دان ہیں دن بھر میں اگر دو چار شعر بھی کہہ لیں تو کھانے بھر کو بہت ہیں۔ روپیہ شعر سے تو کم ملے گا نہیں ان اشعار نے ہمیں ایک اشرفی دلوائی تھی۔

بی می نکند در کفِ من خامہ روائی — سر دست ہوا آتش بیدرد کجائی

باید کہ صراحی بود ابستن صہبا — تا ناطقہ را رُدی دہد نادرہ زائی

عیدست دم صبح و جہانی بتماشا

ما و کفِ خاکستر و آئینہ روائی

خیر بس انسان کچھ کھو ہی کے سیکھتا ہے۔ ہم بھی کھو کے سیکھے۔ اب تمام عالم میں کسی کا بھروسا نہ رہا۔ دینا ہے۔ اپنا مطلب، افسوس صد افسوس۔ اب خموشیدن بہ از خروشیدن کے مسلک کا سالک ہونا لازم ہے سے

نفس یا سوز دمسازست امروز

خموشی مخبر رازست امروز

کلیرسا نے کہا یہ مٹھائی اور دعوت نہ دینے کی باتیں ہیں، اڑان گھائیاں کسی اور کو بتانا۔ ہم بے دعوت لئے نہ رہیں گے۔ ایسی بیوی پائی۔ جلسہ اور دعوت ندارد۔ خوجی نے کہا۔ ہاں صاحب آپ کو کیا۔ یہاں ہڈی پسلی

کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ ان کو دل لگی سوجھتی ہے۔ خدا کرے جیسی بیوی ہم نے پائی ویسا ہی شوہر تم پاؤ۔ بس اب اس سے بڑھ کر اور دعا کیا کروں۔ سہ

بد نہ کہیئے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

مس میڈا نے مسکرا کر خوجی کو سلام کیا۔ حضرت نے جھلا کر کہا۔ بس بس سلام رہنے دیں حضور، دور ہی سے سلام ہے لے کے دھروا دیا، اور اوپر سے سلام کرتی ہیں۔ ایسے سلام سے درگذرے۔ اور میں اس وقت پاگل بن گیا کہ کچھ نہ پوچھو اتنا بھی نہ سوچا کہ مصر کی عورت اُردو کیوں کر بول سکتی ہے۔ لیکن بیوی پانے کا شوق آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔ آخر کار اُلّو بنے وہ تو کہیئے بڑی خیر گذری۔ ورنہ ناک ہی گئی تھی۔ اور پارسل کے روپئے الگ دینے پڑتے۔ خدا نے بڑی خیر کی۔

خواجہ صاحب سے لاکھ لاکھ کہا۔ مگر انھوں نے قسم کھائی کہ ہرچہ بادا باد۔ چاہے جو ہم آزاد کی صورت نہ دیکھیں گے ہمیں ایک قسم کی نفرت ہو گئی۔ ہندوستان سے اتنی دور کے فاصلے پر آئے۔ راہ میں ہماری وجہ سے دل لگی رہی راستے بھر بناتے ہوئے آئے۔ وینیشیا کو ان سے ملا دیا۔ مس روز کے ہاں ہمارے قدم کی برکت سے چہل پہل رہی سفر کے خطروں سے ہماری دعائے نیم شب وسحری نے بچایا۔ پولینڈ کی شہزادی کے ہاں ہم کام آئے، ورنہ قید میں پڑے پڑے آنکھیں مانگتے ہوتے میاں۔ ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا کہ ہمیں پر چکمے چلنے لگے۔ اور اس بدبخت نالائق سخت بہروپئے سے مڈبھیڑ کرائی۔ معاذاللہ۔ خیر۔ ع۔

زمانہ با تو نہ سازد تو باز مانہ ساز

سمجھا جائے گا۔ ع۔

چور جاتے رہے کہ اندھیاری

یارب مرے خامہ کو زباں دے　　منقار ہزار داستاں دے
پانچ انگلیوں پہ حرف زن ہے　　یعنی کہ مُطیع پنجتن ہے

ختم اب ہوئی سخن پرستی
کرتا ہے زبان کی پیش دستی

نسیم

الغرض آزاد پاشا اُن دونوں حورانِ جنت کو لے کر ہوٹل گئے۔ مگر خوجی نے اِن کا ساتھ نہ دیا۔ گھنٹوں آزاد سمجھایا کئے۔ مس کلیرسا نے خوشامد کی، میڈا بہ لجاجت پیش آئیں۔ لیکن انھوں نے ایک کا کہا نہ مانا۔ بہروپئے نے

اب ہم تم دونوں اکیلے رہ گئے ہیں۔ چلو جہاں ہمارے نواب صاحب ٹکے ہیں وہیں چل کے رہو۔

خواجہ صاحب بہروپئے کے ساتھ روانہ ہوئے، اور کہا کہ اب تمہارے ساتھ ہیں چاہے بناؤ چاہے چکمادو۔

چالا

چوتھی کے دن نواب جم اقتدار نے وہ لطف اٹھائے کہ جی خوش ہوگیا۔ نازک ادا بیگم کی شوخی اور اچپلاہٹ جانی بیگم کی لفاظی اور چلبلاپن۔ حشمت بہو کی نازک ادائی۔ اور دلربائی، مبارک محل کی نستعلیق باتیں۔ الغرض جدھر نگاہ جاتی تھی کمسن حسین ہی نظر آتی تھیں۔ نازک ادا کی چلبلی باتوں نے اُن کو لبھالیا۔

ثریا بیگم بھی کسی قدر کھٹکیں کہ میاں کی نظر اس شوخ بیباک چست و چالاک پر بے طور پڑ رہی ہے ایسا نہ ہو کہ طبیعت ہاتھ سے جاتی رہے اور دل قابو میں نہ رہے۔ شب کو نواب صاحب نے ان کے چھیڑنے کے لیے کئی بار نازک ادا کی تعریف کی اور ثریا بیگم جھلّانے لگی۔

نواب۔ نازک ادا بیگم کی ادا نے ہمیں مار ڈالا۔ ادا خود اس کی ادا پر لوٹ پوٹ ہے۔ اور آنکھ تو ایسی نشیلی رسیلی پائی ہے کہ ہائے ہائے۔

ثریا بیگم۔ عجب بیہودہ باتیں ہیں تمہاری۔ خدا جانے کن لوگوں میں تم نے تعلیم پائی ہے۔ نازک ادا کی ایسی تیسی.

نواب۔ تم ناحق بیکھی ہوتی ہو۔ میں تو صرف ان کے حُسن کی تعریف کرتا ہوں۔

ثریا بیگم۔ اے تو کوئی ڈھونڈھ کے ایسی ہی کی ہوتی، اور نہیں۔

نواب۔ تمہارے یہاں کبھی کبھی آیا جایا کرتی ہیں۔

ثریا بیگم۔ مجھے اس گھر کا حال کیوں کر معلوم ہو۔ مگر جو تمہارے یہی لچھن رہے، تو خدا حافظ ہے۔ آج سے یہ باتیں شروع ہوگئیں۔

نواب۔ میں تو ہزار جان سے فدا ہو گیا ہوں۔

کافری غارت گر ایمانِ من
دلبر من جانِ من جانانِ من

ثریا بیگم۔ اور جانی بیگم پر بھی تو بار بار نظر پڑتی تھی۔

نواب۔ وہ بھی پرکالہ آتش ہے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔

ثریا بیگم۔ ہاں سچ ہے۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ ابھی دوسرا ہی دن ہے، اور یہ حال ہے۔ سچ ہے مردوے۔ بر دگیہ بجا۔ اسی سے کہلائے۔ خیر اب تو میں آن کے پھنس ہی گئی۔ مگر مجھے وہی محبت ہے۔ جو پہلے تھی۔ تمہاری

محبت۔ البتہ جاتی رہی۔

نواب۔ دل لگی تو ہو چکی۔ قسم کھائے کہتا ہوں جو تمہارے مقابل میں کوئی بھی جنچتی ہو۔ کوئی جنچنی ہی نہیں۔ خدا گواہ ہے نواب صاحب کا منشاء اس چھیڑ چھاڑ سے یہ تھا کہ دو گھڑی کی دل لگی ہو، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ اپنا مطلب ہی فوت ہوا جاتا ہے تو کان پکڑے کہ اب ایسی دل لگی نہ کریں گے۔ اور دُلھن کے رُخسار چوم کر یوں سمجھانا شروع کیا۔ تم اتنی بڑی دانشمند ہو کر ذرا سی بات پر روٹھ گئیں۔ بھلا اگر میرے دل میں بدی ہوتی تو تمہارے سامنے ان کی تعریف کرتا۔ اے توبہ مجھے کوئی پاگل مقرر کیاہے کیا۔ اے واہ سبحان اللہ۔ مطلب فقط یہ تھا کہ دو گھڑی کی دل لگی ہو۔ تم ذرا نکچو۔ میں ذرا چھیڑوں۔ تمہارے روٹھنے منانے میں بھی تو ایک لُطف ہے، مگر تم کچھ اور ہی سمجھیں۔ میرے ہوش اُڑ گئے۔ خوب یاد رکھنا کہ جب تک میری اور تمہاری زندگی ہے۔ کسی اور عورت کو نظر بد سے نہ دیکھوں گا۔ اگر دیکھوں تو شریف نہیں۔

ثریا بیگم۔ وہ عورت کیا جو اپنے شوہر کے سوا کسی نامحرم کو بری نظروں سے دیکھے۔ اور وہ مرد کیا جو اپنی بیوی کے سوا پرائی بہو بیٹی پر نظر ڈالے۔ سچ سچ تو یہ ہے کہ میاں بیوی جب ہی خوش رہیں گے کہ یہ اس پر فدا ہو، وہ اس پر شیدا۔ نہیں تو دل نہ ملے گا۔ بس صاف صاف یہ ہے۔

نواب۔ بس یہی ہماری بھی رائے ہے۔ جو لوگ دس دس شادیاں کرتے ہیں۔ دو جورو۔ چھ بیسوائیں گھر پڑی ہوں ان کو ہم اچھا نہیں سمجھتے۔ ہزاروں میں شاید دو ایک ایسے ہوں تو ہوں۔ ورنہ عدل کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور زبانی داخلہ اور شے ہے۔ کہنے کو سبھی کہتے ہیں اور کرتا کوئی بھی نہیں۔

ثریا بیگم۔ جو نازک اَدا یا جانی بیگم کی سی عورت کے ساتھ اب تم شادی کرو۔ تو پھر ہمیں کاہے کو پوچھو پھر عدل کہاں ہے۔؟۔

نواب۔ اے توبہ۔ کیا کہتی ہو۔ تم لاکھوں کروڑوں میں انتخاب ہو۔

ثریا بیگم۔ مگر تم نے تو اس طرح ان کی تعریف کی کہ میں سمجھی دل ہی قابو میں نہیں ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔

نواب۔ فقط مذاق تھا۔ ورنہ کجا تم۔ کجا وہ۔ کوئی مناسبت بھی ہے۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اوّل تو سِن میں فرق، پھر حُسن میں فرق۔ خالی خولی شوخی ہوئی تو کیا۔

ثریا بیگم۔ اب مجھے بناؤ مت۔ خالی خولی شوخی۔ کیا بد قطع ہیں۔ وہ دونوں حسین اور خوبرو نہیں ہیں۔ بہت چل نہ نکلو۔

اب سنئے کہ صبح کو دلھن کے میکے سے مہری آئی۔ آن کر بیٹھی۔ آداب بجالائی۔ عرض کیا۔

دولھامیاں سے کہہ دیجئے آج بڑی سالی کے ہاں آئیں، اور دلھن کو بلایا ہے۔ پہلا چالا ہے۔ بیگم صاحب مادرِ نوشہ نے پوچھا ان کے میکے میں آئیں یا حشمت بہو کے ہاں۔ کہا حضور میکے میں بلایا ہے۔ حضور دلھن کو اس وقت اجازت دیں۔

بیگم۔ اچھا۔ تمہارے ہاں وہ لڑکی تو بڑے غضب کی ہے۔ نازک۔ کسی سے دبتی ہی نہیں۔ کسی بات میں بند نہیں۔ اکثر طبیعت تیز بھی لڑکیاں دیکھیں۔ وہ سب سے نرالی ہے۔

مہری۔ (مسکرا کر) حضور طرح طرح کی طبیعتیں ہوتی ہیں۔

بیگم۔ ایسی طبیعت بھی کیا کچھ تو شرم یا حیا کا خیال ہو۔

مہری۔ حضور بیگم صاحب نے بھی کئی بار سمجھایا۔ حشمت بہو کو خود بھی بُرا معلوم ہوا، مگر وہ سمجھتی ہی نہیں۔ مگر ہے کیا کہ باتیں ہی باتیں ہیں۔ کوئی جا بیجا بات نہیں سُننے میں آئی۔ آج تک۔ ہاں یوں جو کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ۔

بیگم۔ وہ خالی باتیں ہی ان کو کیا کم ہیں۔ اُفوہ۔

خورشیدی۔ اماں جان ہمارے تو ہوش اُڑ گئے۔ اور اس بیچاری فیضن کو بات بات پر بناتی تھیں۔ اس کو تو رُلا ہی چھوڑا۔

نواب بیگم۔ وہ تو باتیں ہی گنوارنوں کی سی کرتی تھی۔

بیگم۔ اے واہ۔ وہ لاکھ گنواروں کی سی باتیں کرے۔ پھر اس سے کیا۔ ان کو تو نہ بنانا چاہیئے تھا۔ اور پھر جو اپنے ہاں آئے اس کی خاطر کرنی چاہیئے۔ انسان کو یا اس سے اس قدر کی دل لگی کرے کہ وہ پھر کبھی آنے کا نام زبان پر نہ لائے۔

خورشیدی۔ ہاں یہ سچ ہے مگر ہم کو ان کی وضع سے۔ (آہستہ سے) معلوم ہوتا ہے (دبے دانتوں) نیک نہیں ہیں۔ آگے خدا جانے۔

بیگم۔ یہ نہ کہو بیٹا۔ ابھی تم نے دیکھا کیا ہے۔

نواب۔ (اشارہ کر کے) کہا ان کی مہری بیٹھی ہے۔ اس کے سامنے کچھ نہ کہو۔

خورشیدی۔ (آہستہ سے) ہم نے تو بہت ہی آہستہ سے کہا۔

نواب۔ (دلھن کے کان میں) تم برا نہ ماننا۔ ہم لوگ آپس میں ہنستے ہیں اور کیا ہم جانتے ہیں کہ نازک ادا پاکدامن عورت ہیں۔

دلھن۔ (شرما کر آہستہ سے) جیسا کوئی ہوگا اس کو ویسا سب کہیں گے۔ اس میں بُرا ماننے کی کون بات ہے، اور میں کیوں بُرا مانوں گی۔

راوی۔ ناظرین کو خوب معلوم ہے کہ نواب صاحب نے جو نازک ادا پر چاہ سے نظر ڈالی تو ثریا بیگم کو برا معلوم ہوا۔ کہا ہمارے ہوتے ساتھے کسی اور پر نگاہ پڑے۔ ستم ہے یا نہیں۔ بس خورشیدی بیگم اور نواب بیگم اور ساس کے کہنے کا برا نہ مانا۔ اور اصل میں دیکھئے تو بُرا کیوں مانتیں۔ نام کی بہن بن بیٹھی تھیں، ورنہ ثریا بیگم اللہ رکھی، جوگن، شبنو جان، مس پالین، کو نازک ادا اور جانی بیگم سے کیا واسطہ۔ کچھ نہیں پھر بُرا ماننے کا کیا سبب ہے۔

الغرض دُلھن کی ساس نے حکم دیا کہ داروغہ سے کہو باجے والے باد بہاری والے، روشن چوکی والے سب حاضر ہوں۔ مغلانیاں، پیش خدمتیں، خواصیں، تیار ہو رہیں۔ سکھپال لگایا جائے۔ فوراً تعمیل حکم ہوئی۔ سواری ٹھتے سے چلی۔ ثریا بیگم دم کے دم میں میکے میں داخل ہوئیں۔ یہاں پہلے ہی سے آراستہ سجا سجایا تھا گنگا جمنی پلنگ کونے میں بچھا ہوا۔ بغل میں چاندی کی پلنگڑی عمدہ عمدہ، نفیس نفیس پردے پڑے ہوئے۔

شام کو دولھا چلا۔ صوفیانہ مگر بیش بہا لباس زیبِ تن ہوا۔ لطافتِ پوشاک خارج از بیان ہے عطر کی خوشبو سے تمام محلہ بس گیا۔ اور مصاحبوں نے حسن و جمال اور جامہ زیبی، اور ریاست، اور شان و شوکت اور اخلاق کی تعریف کے پل باندھ دیئے۔

ببر علی۔ حضور اس وقت ایران کے شہزادے معلوم ہوتے ہیں۔

نور خاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ زادہ کسی سلطنت کا ولی عہد مسند لگائے بیٹھا ہے۔ اللہ ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

عیدو۔ حق تعالیٰ کرے کسی ملک کی بادشاہی ملے۔

اے قدرت ہمچوں صنوبرے درخت چوں میم بی
دارو دروے کہ داری، درمیان لام بی

اس شعر پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ میاں عیدو جھینپ گئے۔ رُفقاء میں تو ایک دوسرے سے لاگ ڈانٹ ہوتی ہی ہے۔ سب نے ہنسنا شروع کیا اور آوازے کسنے لگے۔

ایک۔ واہ میاں عیدو، واہ، اچھی بے تکی ہانک لگائی۔

دوسرا۔ حضور کو بولنا ہی کیا فرض تھا۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

تیسرا۔ مگر کتنا موزوں شعر میاں عیدو کو یاد آیا۔ درخت چون م ی کی کتنی کہی ٔرخ اور یے سے مشابہت بھی تو ہے۔

بولیں گے ضرور چاہے آئے جائے خاک نہیں۔

چوتھا۔ زبان کی چُل کو کیا کریں، اور پہلے مصرع کے بعد۔ ع

دارِ دو روی کہ داری در میانِ لام بی

کسی قدر چیستان ہے۔ (عیدو کی طرف مخاطب ہو کر) آپ بھی بالکل۔ گاف۔ دال۔ ہے، ہی رہے۔

پانچواں۔ اُفوہ۔ واللہ ہنستے ہنستے انسان لوٹ لوٹ جائے۔ آدمی تو آدمی گدھوں تک کو ہنسی آئے۔ ان کی باتوں پر مردِ خدا شعر پڑھنا ہی کیا فرض تھا۔ خواہ مخواہ اپنے کو ہنسوانا کیا فرض ہے۔ اگر حضور کی تعریف کرنے کا شوق تھا تو یوں کہا ہوتا۔ ؎

مداح چوں توئی نستر و غیر چوں منے — نازم شکوہ خویش بلند ست شانِ تو

باید دماغ بہر شنیدن نہ گوش بس — بوئے گل ست زمزمۂ ناتوانِ تو

حاشا کہ در گمان گذرانے نظیرِ من — یکتا دری بدور تو گرویدہ آنِ تو

اے بخت تو بشیری و عمرِ تو در خوشی — آں نو بہار و ایں چمن بے خزانِ تو

ہموارہ یاد رُوے زمین جلوہ گاہ تو

پیوستہ باد خنگ فلک زیرِ رانِ تو

رفقا۔ آمین آمین ؛ ثم آمین ؛ یا ربَّ العالمِینَ۔ ع

ایں دعا از من واز خلقِ خدا آمین باد

خدا بہچنیں کند۔ اب میاں عیدو کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ ہاں شعر شاعری اسے کہتے ہیں۔ جی حضرت۔ اور نہیں آپ نے شعر پڑھا تھا۔

چہ خوش گفت ست کالی داس درزند

ٹونکل ٹونکل لِٹل اسٹار

مصاحب۔ خداوند نظر بد سے حضور کو خدا بچائے۔ اس وقت سج دھج، اور آن بان ہی نرالی ہے۔ عورت دیکھے، تو ہزار جان سے عاشق ہو جائے۔ ذرا فرق اس میں نہیں۔ شیر مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ریاست چہرے سے نمودار ہے۔ جرأت آنکھوں سے آشکار۔ مُروّت بُشرے سے عیاں۔ سخاوت بات بات سے نمایاں۔ ایک رفیق بولا۔ پیر و مُرشد واسطے خدا کے ذرا آج چوک کی طرف سے چلئے گا۔ قربان جاؤں آج یہی دن ہے۔ کہ ہمارے حضور پُر نور چوک کی جانب سے چلیں۔ ذرا اِدھر اُدھر کمروں سے اُحسنت و مرحبا کی آواز تو بلند ہو۔

نواب۔ بیکار ہے۔ جس کی بیوی ہو، اس کو ان باتوں میں نہ پڑنا چاہیئے۔
رفیق۔ اے حضور یہ تو ریاست کا تمغہ ہے خداوند!
دوسرا۔ کیا شک ہے رئیس اور ریاست اس کے معنیٰ ہیں۔
تیسرا۔ حضور یہ تو غریب مفلس آدمیوں کے لیے ہے، کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ ہو۔ دوسری بیوی کو کھلائے گا خاک۔ مگر امراء کا تو یہ جوہر ہے۔ ایک ہو یا دس ہوں۔ اور بادشاہوں کے آٹھ آٹھ نو نو سے زیادہ محل ہوتے ہیں بھلا۔ ایک دُو کی کون کہے، ایک دو کس شمار قطار میں ہیں بھلا۔ جس کو خدا نے دیا ہوتا ہے، وہی اس قابل سمجھا جاتا ہے۔ ہر کوئی تھوڑا ہی ایسا ہوتا ہے۔ مصرعہ۔

لایق افسر نبا شد ہر سرے

چوتھا۔ ارے بھئی تم لوگ خاک نہیں سمجھتے۔ بالکل عقل سے بے بہرہ ہو۔ رئیس لوگ کہیں چوک کے کمرے تا کا کرتے ہیں۔ جس کو آنا ہو گھر پر حاضر ہو۔ دربدر مارے مارے پھرنے سے کیا مطلب نکلتا ہے۔
پانچواں۔ حق یہ عیب کرنے کو بھی ہُنر چاہیئے۔
راوی۔ سُبحان اللہ۔ مگر عیب کرنا فرض ہے۔ کیا خوب بھڑے دے رہے ہیں۔ ریاست کے یہی معنیٰ ہیں کہ بدمعاش، اُوباش، عیاش، بدوضع، خدائی خوار ہو۔ غریب بیچارہ کیا کھا کے بدمعاشی کرے گا۔ اے لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ۔ اس کی کیا ہستی ہے۔ یہ جوہر امیر زادوں کا ہے، تو خیر حضور کی صحبت میں شاعر کیسے کیسے گراں مایہ بیٹھے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر جو ہے اپنے وقت کا فیضی اور خاقانی اور عرفی اور سعدی ہی ہیں۔

عیب کرنے کو بھی ہُنر چاہیئے

اے سبحان اللہ تقطیع سے یہ مصرع کس قدر درست ہے ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔
الغرض نواب صاحب کو ایسا چنگ پر چڑھایا کہ چوک ہی سے لے گئے۔ مگر نواب صاحب نے گردن جو نیچی کی تو چوک بھر میں کسی کمرے کی طرف نہ دیکھا۔ اس پر مصاحبوں نے حاشئے چڑھائے۔ اے حضور از برائے خدا ایک نظر تو دیکھ لیجئے۔ لِلّٰہ ایک نظر دیکھئے تو سہی کیا کٹاؤ ہو رہا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے حُسن کا فقط شہرہ ہی شُہرہ سُنتے ہیں۔ مگر حضور کا جمالِ مُبین آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ خدا اس سے اور زیادہ دولتِ حُسن عطا کرے۔ آمین۔ عنایتِ خدا سے آج اس حُسن کا جوان اس شہر میں تو نہیں ہے۔ ساری خدائی کا حال کیا جانے، مگر اس شہر میں تو واقعی کوئی جوان حضور کے

حُسن کو نہیں پاتا۔ مردانہ حُسن یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیرِ ببر کچھار سے چلا آتا ہے۔ دوسرا بولا مگر اس وضع کے پاس کو دیکھے گا۔ ذرا سر نہیں اٹھایا۔ یہ نہیں کہ بدمعاشوں کی طرح نکلتے چلیں۔ کبھی ادھر اور کبھی اُدھر کیا مجال۔ ع۔

سبن کے رُتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

نواب صاحب دل میں سوچتے جاتے تھے کہ ان بدوضع بدتمیز، خوشامد خوروں کے ہاتھ سے چھٹکارا محال ہے۔ یہ تباہ ہی کر ڈالیں گے۔ ان کے پھندے میں پھنسے اور داخل جہنم ہوئے۔ ہم نے ٹھان لی ہے کہ تا دمِ زیست کسی عورت کو نظرِ بد سے نہ دیکھیں گے۔ یوں ہنسی دل لگی مذاق کی اور بات ہے۔ مگر بدی کے قریب نہ جائیں گے۔ اور یہ بدبخت ہمیں چنگ پر چڑھائیں گے۔ اگر یہی صحبت ہے تو خدا ہی حافظ ہے۔ ان سے بچنا محال ہے۔ سے

گر ہمیں مکتب ست وایں مُلّا
کار طفلاں تمام خواہد شد

سسرال میں پہونچے۔ باہر دیوان خانے میں بیٹھے۔ ناچ شروع ہوا، اور مصاحبوں نے اِدھر خداوند نعمت اُدھر اربابِ نشاط کی تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ ہمارے خداوند خوب سمجھتے ہیں، کوئی علم ایسا نہیں جس سے آگاہ نہ ہوں۔ ہر فن کے اُستاد ہیں۔ اور اس علم موسیقی کے تو کامل استاد ہیں۔ دوسرے نے کہا مگر یہ بھی اپنے فن کی کامل ہیں۔ ایسی خوش آواز اب شہر میں دوسری نہیں ہے۔ اگر شاہی زمانہ ہوتا تو لاکھوں روپے پیدا کر لیتیں، اب بھی ہمارے حضور کے سے قدردان جوہر شناس بہت ہیں۔ مگر پھر بھی کم ہیں۔ بھلا ہولی کی تو کوئی چیز گائیے۔ کیوں حضور ہولی کی فرمائش کروں۔

نواب۔ جو جی چاہے۔ اختیار ہے۔ گانے دو۔

رفیق۔ حضور فرماتے ہیں یہ جو ادا کریں گی رنگ جما لیں گی مگر ہولی ہو تو اور بھی اچھا۔ ہولی رنگ بھری، بنی بن آئی ہے چاتر نار۔

نواب۔ ہم نے یہ نہیں کہا تھا۔ تم لوگ ذلیل کرا دو گے ہمیں۔

رفیق۔ کیا مجال پیر و مرشد۔ کیا طاقت، اے توبہ توبہ۔ حضور کا نمک کھاتے ہیں نمکخوار نمک پرور قدیم۔

قدیمانِ خود را بیفزاری قدر
کہ ہرگز نیاید زپروردہ غدر

ہم غلاموں سے اور یہ امید خداوند سر جاتا رہے نمک کا ضرور پاس رہے گا۔ اور یہ تو حضور دو گھڑی ہنسنے

بولنے کا وقت ہی ہے۔ ؎

غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

نواب۔ (چپکے سے) دریافت کرو کہ کھانے میں کتنا عرصہ ہے۔ ہم جلد جانا چاہتے ہیں۔ طبیعت پریشان ہے۔
رفیق۔ حضور کھانا تیار ہے، اور خدانخواستہ نصیبِ اعداء، دور دراز حال مزاج بے لُطف کیوں ہے۔ آج سویرے سے کچھ طبع مبارک بے لُطف سی تھی۔ اتنے میں دولھا زنان خانے میں تشریف لے گئے۔ پیش خدمت نے خاصہ چُنا، طعام نوش جان کرنے کے بعد سالی نے ایک بھاری خلعت بہنوئی کو، اور ایک بیش بہا خلعت بہن کو دیا۔ اشرفیاں دیں شب کو دولھا دلھن کمرے میں گئے۔

دوسرے روز ثمر یا بیگم نے اصرار بلیغ کیا کہ اپنے گانوں پر چل کے رہو ہم شہر میں رہنا نہیں چاہتے۔ نواب صاحب تو اُن پر جان و دل سے عاشق تھے ہی فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اب کچھ روز تک اِن کو گوشۂ عزلت میں رہنے دیجئے۔ آئندہ ان کا ذکر کیا جائے گا۔

ریل کی سواری اور جنٹلمین

ایک دودھ پیتا بچہ تک جانتا ہے کہ ریل کی سواری سے زیادہ اور کسی سواری میں آرام نہیں ہے۔ مگر اکثر حضرات، جو وحشت کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ اس آرام سے محروم رہتے ہیں؛ کوئی لاکھ سمجھائے وہ سننے کس کی ہیں، جو بات ذہن میں سمائی وہ سمائی۔ دھن کے پکّے انھیں لوگوں کو کہتے ہیں۔ حال میں دو صاحبوں نے لکھنؤ سے بریلی تک سفر کیا۔ دونوں ہندو۔ ایک نئی روشنی والے۔ دوسرے پرانے فیشن کے آدمی۔ اب سنئے کہ ساڑھے چھ بجے شام کو بریلی کی ریل جانے کا وقت ہے۔ نئی روشنی والے جنٹلمین سوا چھ بجے روانہ ہوئے۔ سات منٹ میں اسٹیشن پر پہونچے۔ گاڑی درجہ اوّل کے پلیٹ فارم کی طرف لے گئے۔ اور رپ رپ کرتے ہوئے اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ فوراً دوسرے درجہ کا ٹکٹ لیا۔ اسباب رکھا، اور پلیٹ فارم پر چرٹ پیتے ہوئے ٹہلنے لگے۔ ادھر اُدھر دیکھتے ہیں، تو ان کے دقیانوسی خیالات والے دوست کا پتہ نہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک مرتبہ دیکھا کہ وہ حضرت درجہ سوم کے کندوں کے ساتھ کٹھرے کے باہر کھڑے ہوئے ہیں ایک ہاتھ میں بیگ دوسرے میں گٹھری۔ بغل میں ایک پوٹلی، دوسری بغل میں لکڑی اور کھڑاؤں۔ اس مقام پر وہ ریل پیل ہے کہ الاماں۔ ہر فردِ بشر چاہتا ہے کہ میں ہی سب کے پہلے پہونچ جاؤں۔ یہ بھی اس ہجوم اور طوفانِ بے تمیزی میں جکڑے کھڑے ہیں۔ نئی روشنی والے دوست نے کہا آئیے۔ فرمایا دروازہ بند ہے۔ انہوں نے برق انداز کو

اشارہ کیا، کہ ان کو نکل آنے دو۔ اُس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ ہانپتے ہوئے آئے۔

جنٹلمین۔ کیا درجہ سوم کا ٹکٹ لیا ہے لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ۔

دقیانوسی۔ بھئی درجہ سوم کے ٹکٹ میں دام زیادہ نہیں صرف ہوتے۔!

جنٹلمین۔ لاحول ولا قوۃ۔ فرق کیا ہے۔ چھ آنے کا فرق بھی کوئی فرق ہے۔ تیسرے درجہ کا ایک روپیہ چودہ آنے محصول ہے۔ دوسرے کا دو روپیہ چار آنے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ مگر آرام کتنا ہے۔

دقیانوسی۔ کیا کہئے ہم چوک گئے۔ جو یہ معلوم ہوتا تو پہلے ہی لے لیتے۔ مگر استاد تم نے اچھا رنگ جمایا ہے۔ سب سے یارانہ ہے۔ اور سُنیئے ہم کانسٹبل کو تین ڈبل رشوت کے دیتے رہے، ایک نہ سُنی۔ آنکھیں نیلی پیلی کر کے ڈپٹ دیا۔ تمہارے ایک اشارہ سے چٹ دروازہ کھول دیا۔ ہم کو بھی تو یہ گر بتاؤ۔ اب باتیں نہ کرو۔

ہم کسی درجے میں جا کے بیٹھ جاتے ہیں ورنہ ریل ہک جائے گی۔

جنٹلمین۔ ابھی تو پہلی گھنٹی بھی نہیں ہوئی ہے، اور آپ چل کے ہمارے ساتھ بیٹھئے کچھ پرواہ نہیں ہے۔

دقیانوسی۔ نا صاحب دھروانے کی فکر ہے کیا ٹکٹ لیا تیسرے درجہ کا۔ بیٹھیں دوسرے درجے میں۔ کھل جائے تو فوراً جیل خانے بھیجے جائیں۔ ایسے دوسرے درجے سے ہم درگذرے قبلہ۔ کم کھائیے غم نہ کھائیے۔

جنٹلمین۔ تم چل کے بیٹھو تو۔ اچھا تم اپنا ٹکٹ ہمیں دے دو۔ اور ہم اپنا ٹکٹ تم کو دیں۔ بس اب تسلی ہوئی۔

الغرض دقیانوسی خیالات والے نے اپنا ٹکٹ ان کو دیا اور ان کا ٹکٹ خود لیا۔ اب ان کے دوست مارے وحشت کے جلدی کر رہے ہیں، کہ ریل میں بیٹھ جاؤ۔ ایسا نہ ہو۔ یہیں ٹاپتے رہ جائیں۔ ٹکٹ کلکٹر آیا۔ تو جنٹلمین نے ایک چونی اور ایک دوانی دے دی۔ اور ٹکٹ کی پُشت پر لکھوا لیا۔ حضرت دقیانوسی جو گھبرا کے ریل میں بیٹھنے لگے تو پوٹلی بغل میں سے کھسک کر پلیٹ فارم پر آ رہی۔ قلی نے خیر خواہی دکھانے کی غرض سے معًا اٹھا دی۔ تو کھلائے ہوئے تو تھے ہی ریل میں آن کے بیٹھے، اور اسباب رکھا۔ لُطف یہ کہ جب تک پلیٹ فارم پر کھڑے رہے گٹھری اور بیگ اور لکڑی اور پوٹلی کوئی شے ریل پر نہیں رکھی۔ اور سوار بھی ہوئے تو سب سامان کے ساتھ اس وحشت کے صدقے۔ پوٹلی تک کھسک پڑی۔ جب درجے میں جا کے اطمینان سے بیٹھے تو دور کی سوجھی۔ جس قلی نے پوٹلی اٹھائی تھی اس کی تلاش ہوئی۔ اتفاق سے اس کا پتہ نہ لگا۔ اب ان کو اور بھی وحشت نے گھیرا کہ خدا جانے چمار تھا۔ کوری تھا۔ کون تھا۔ غرض کہ پوٹلی ملی تو کیا ہوا ان کے مصرف کی نہ تھی۔ جنٹلمین نے کہا۔ چلو خوب شد۔ ہماری چاندی ہے۔ اُس پوٹلی میں حلوا سوہن تھا۔ ریل چلی۔ تو دقیانوسی خیالات والے نے غل مچایا جے کالی جی کی۔ اس پر کئی آدمی ہنس پڑے۔ اور ان کے دوست نے کہا کہ اگر کہنا ہی تھا تو آہستہ سے کہا ہوتا۔ کفن پھاڑ کے چیخ اُٹھے۔ خیر جس جس مقام پر ریل ٹھہرتی اور گارڈ یا ڈرائیور نظر آتا، وہاں حضور جھک کر سلام

ضرور کرتے۔ اب سُنئے کہ جنٹلمین کے پاس سب سامان لیس تھا۔ مٹی کی کوری صراحی میں پانی۔ کمل میں دو سیر برف کھانے کے لیے دال موٹھ۔ مٹھائی، انار عمدہ عمدہ فواکہ۔ مگر دقیانوسی کا منہ سِل گیا تھا۔ ریل پر کھانا گناہ ہے۔ ایک اسٹیشن پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ یہاں آدھ گھنٹہ ریل ٹھہرتی ہے۔ جب چھ منٹ رہے تو حضرت دقیانوسی پلیٹ فارم پر گئے۔ برہمن سے پانی لیا۔ منھ دھویا مگر جوتا اُتار کے پانی پینے کو ہی تھے کہ سیٹی ہوئی۔ بوکھلائے دوڑے تو ایک کھمبے سے ٹکر لگی۔ چوندھیا کے گرے؛ مگر قہر درویش بر جان درویش۔ پھر اُٹھے ریل چلنے ہی کو تھی کہ یہ درجے میں بیٹھ گئے، مگر جوتیاں غائب۔ اب سُنئے کہ پیاسے کے پیاسے رہے، اور جوتا الگ غائب غلّہ ہوا۔ جنٹلمین جس مقام پر جاتے ہیں۔ ان کی تعظیم ہوتی ہے۔ جو شے مانگتے ہیں، فوراً ملتی ہے مگر ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔

دقیانوسی نے ٹکٹ کو ایک بٹوے میں رکھا تھا اور کئی بار گرہیں دے کر چادر میں باندھا جنٹلمین نے نمبر دیکھ لیا اور منی بیگ میں ٹکٹ رکھ لیا۔ جب بریلی پہونچے تو بڑی دل لگی ہوئی۔ جوتا ندارد تھا۔ اب ریل سے اُتریں تو کیوں کر۔ نئی مصیبت پڑی۔ جنٹلمین نے ایک قلی کو بلایا۔ اس کا جوتا ان صاحب نے پہنا۔ اب دونوں دوستوں میں گفتگو ہونے لگی۔

جنٹلمین۔ اس وقت ڈھائی بجے ہیں۔ رات کے وقت کسی کو خواہ مخواہ کیوں جگاؤ گے۔ یہیں سو رہو۔ صبح کو چلے جانا۔

دقیانوسی۔ یہاں کہاں۔ باہر مسافر خانے میں چلئے نا۔

جنٹلمین۔ مسافر خانے میں چرگٹے، گھسیارے، گرہ کٹ رہتے ہیں۔ ہم اس میں رہیں گے۔ جنٹلمین ویٹنگ رُوم۔

یہ کہہ کر جنٹلمین اُس کمرے میں داخل ہوئے۔ چپراسی نے سلام کیا، اور ادب کے ساتھ کھڑا ہوا قلی اسباب لائے۔ چپراسی نے کوچ پر بستر بچھایا۔ اسباب لگایا۔ انہوں نے فوراً لمونیڈ کا ایک گلاس برف ڈال کر پیا۔ خوب آرام سے اس سجے سجائے کمرے میں سوئے۔ سویرے اُٹھے۔ وہیں غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ آدمی نے جوتا صاف کیا۔ گاڑی منگوالی۔ مزے سے سوار ہوئے اور جہاں جانا تھا وہاں گئے۔ وہاں دقیانوسی خیالات کے ذاتِ شریف بھی ملے۔ پوچھا کیسی گزری۔ کہا اِتّے پر سوار ہو کے سرا پہونچے۔ وہاں ایک چھوٹی بڑی کوٹھری ملی۔ چارپائی موجود نہ تھی۔ مسافروں کی کثرت سے سب رک گئی تھیں۔ اور ہمارے پاس فرش ندارد۔ ناچار چادر بچھائی اور بیگ دبا کر بیٹھے۔ اونگھا کئے۔ رات کو کتوں نے ناک میں دم کر دیا۔ ایسی مصیبت کبھی نہ پڑی تھی۔ خدا خدا کر کے کہیں سویرا ہوا۔ اب غور کا مقام ہے کہ جنٹلمین نے

اپنی تجربہ کاری کے سبب سے ریل کی سواری کے بے بہا فوائد حاصل کیے۔ مگر دقیانوسی خیالات والا بیچارہ اس سواری میں بھی مصیبت سے نہ بچا۔ از ماست کہ بر ماست کی مثل صادق آتی ہے۔ حلوا سوہن گیا۔ گذرا جوتا غائب ہوا۔ بھوکے پیاسے رہے۔ رات آنکھوں میں کٹی۔ اب فرمائیے۔ اس فیشن کے آدمی ریل کو کیوں کر اچھا کہیں۔ ع

جشمۂ آفتاب راچہ گناہ

بریلی سے دونوں صاحب روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ جنٹلمین نے کوٹ پتلون، شرٹ کالر کے علاوہ ٹوپی بھی انگریزی ہیٹ زیب سر کی۔ ریل پر پہونچے تو گھڑی جیب سے نکال کر وقت دیکھا۔ معلوم ہوا ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔ جنٹلمین نے اپنے دوست سے کہا اس مرتبہ تم خود ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھو۔ تاکہ تمہاری جھجک جاتی رہے۔ میں بھی دو تین منٹ میں ٹکٹ خرید کر آتا ہوں۔ یہ صاحب آپ جانئے ناواقف محض جنٹلمین کے کمرے کے عوض لیڈیوں کے کمرے میں گھس آئے۔ آیا نے کہا کچھ خیر تو ہے۔ کہاں دندناتے ہوئے چلے آئے میاں۔ باہر چلو۔ اب حضرت چکرائے۔ جا کے کرسی پر ڈٹ ہی تو گئے۔ آیا اور بھی آگ ہو گئی۔ اے میاں کسی کی سنتے بھی ہو۔ اے واہ، اے لو اس کان سے سنا اس کان سے اڑا دیا۔

دقیانوسی۔ ہمارا بستر کوچ پر لگا دو اور چرٹ لاؤ۔

آیا۔ پاگل ہے کون۔ یہ بیبیانہ کمرا ہے۔ تم یہاں کہاں آئے۔

دقیانوسی۔ ہوٹل والا سے بولو کہ لمونیڈ ہمارے واسطے جلد لاؤ۔

آیا۔ کچھ گھانس تو نہیں کھا گیا ہے اے یہ ہے کون ہولا خبط۔ میاں کچھ پی کے آئے ہو کیا۔

دقیانوسی۔ غسل خانہ کدھر ہے۔ پانی لاؤ۔ ہم غسل کریں گے۔

آیا۔ ایں! اچھے بگلے سے پالا پڑا۔ کوئی میم صاحب جو آئیں گی نہ بھرآٹے دال کا حال معلوم ہو گا۔ لالہ۔

دقیانوسی۔ بولاؤ ہوٹل والے سے کہ میٹھا پانی لائے اور برف۔

آیا۔ آگ لگے ایسے سٹری کو، موا دِوانہ۔ لالہ یہ میم صاحبوں کا کمرا ہے۔ تم باہر جاؤ۔ نہیں کیا جانے کیا آفت آنے والی ہے۔ میں ترس کھاتی ہوں اور تم سر پر چڑھے جاتے ہو۔

دقیانوسی۔ ول ہمارا جوتا صاف کر دو۔ برش لے آؤ جلد۔

راوی۔ جو جو باتیں دیکھی اور سنی تھیں۔ سب کا حکم دیا۔ آیا جو بکتی تھی۔ اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ اپنی ہی کہی جاتے تھے۔

آیا۔ اللہ اچھے سے پالا پڑا ہے بے تکی ہانک لگائے ہی جاتا ہے اب میں چپراسی کو بلاتی ہوں۔

دقیانوسی۔ بیشک بلاؤ۔ بولو صاحب آیا ہے۔ تم کہاں بھاگ گیا۔

آیا۔ (ہنسکر) بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ اب آخر جاتے ہو یا صاحب کو بلاؤں پھر میں نوبہ۔ اللہ۔

دقیانوسی۔ صاحب کو بلاؤ۔ بولو ٹکٹ لے کے آؤ۔ اور اس روم میں بیٹھو۔

راوی۔ اپنے مطلب کی خوب سمجھے۔ گویا ان کے دوست جنٹلمین کی طرف صاحب کا اشارہ کیا تھا۔

آیا۔ ٹکٹ ہہیں تمہارے واسطے ریل کی ریل لے آئیں گے۔ گھر کی پٹکی اور باسی ساگ۔ صاحب سے بولو صاحب سے بولو۔ لایا ہے وہاں سے۔

اتنے میں مس وائیز میم آئیں۔ دیکھا کہ یہ ذاتِ شریف کرسی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ آیا نے غل مچا کر کہا۔ اٹھو لالہ اٹھو۔ چلو دیکھو میم صاحب آئی ہوئی ہیں۔ آپ نے میم صاحب کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے۔ سٹی پٹی بھول گئے۔ مگر کمرے کے باہر نہیں نکلتے۔ اب دو اور میمیں آئیں۔ اور حضور ڈٹے ہوئے ہیں۔ جنٹلمین کو خبر ہوئی تو دروازہ پر آن کر کہا۔ اجی حضرت یہ زنانے کمرے میں کیوں گھس گئے۔ اب خدارا باہر آؤ، ورنہ ایسا نہ ہو پٹ جاؤ۔ اگر حضور کی یہی حرکتیں ہیں تو خدا ہی حافظ ہے۔ معقول۔ بھائی ذرا عقل سے کام لو۔ بالکل پاگل ہی نہ بن جاؤ۔

دقیانوسی۔ کتب خانوں میں تھیٹروں میں ناچ گھر میں تماشوں میں، ہم نے ہر مقام پر دیکھا ہے، کہ لیڈیاں اور جنٹلمین برابر ساتھ بیٹھے ہیں، اور علیٰ ہذالقیاس۔ دعوتوں میں ہمیں کوئی عذر نہیں کہ یہ کمرا خالی کر دیں مگر وجہ کیا۔

جنٹلمین۔ آپ تو ہیں پاگل۔ ع۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

خدا کے لیے باہر آؤ۔ یہ دونوں معزز خاتونیں باہر کھڑی ہیں۔

دقیانوسی۔ (کھڑے ہو کر) جان عذاب میں کر دی۔ آخر سبب تو بتاؤ۔

راوی۔ دیکھیے سبب معلوم ہوا جاتا ہے۔ اتنے میں اسٹیشن ماسٹر آیا۔ میم نے یوں کہا۔

میم۔ لیڈیوں کے کمرے میں یہ میلا کچیلا بدتمیز نیٹو بیٹھا ہے اس کا دوست اس کو سمجھاتا ہے۔ مگر یہ نہیں مانتا۔

اسٹیشن ماسٹر۔ تم کون ہے اس کمرے میں لیڈیوں کے کیا مانگتا ہے۔

دقیانوسی۔ ہم جنٹلمین ہے۔ اور اس کمرے میں ٹھہرنا مانگتا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر۔ (خفا ہو کر) باہر آؤ۔ چلو باہر۔ ایک دم سے۔

دقیانوسی۔ (جھلا کر باہر آئے) ہم صاحب سے رپورٹ کرے گا۔

اسٹیشن ماسٹر۔ تم پاگل ہے۔ میم لوگ کے کمرے میں جانا کیا بات۔

دقیانوسی۔ تو ہم کیا قلی ہے یا چمار ہے۔ ہم بھی آج سے جنٹلمین بنا ہے۔
جنٹلمین۔ (اسٹیشن ماسٹر سے انگریزی میں) میں ان کو لیے جاتا ہوں۔ ان کے دماغ میں کسی قدر خلل ہے۔
دقیانوسی دوست کو لے کر جنٹلمین ریل میں آ بیٹھے۔ سمجھانے لگے۔ یار تم تو آندکی لینے لگے۔ اس وقت خدا نے بچالیا ورنہ ایسی بے بھاؤ کی پڑتیں کہ یاد ہی تو کرتے۔ بڑے بڑے اسٹیشن پر دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک کمرا لیڈیوں کے لیے اس میں مرد بیٹھ نہیں سکتا۔ دوسرا کمرا جنٹلمینوں کے لیے۔ اس میں عورتیں نہیں جاتیں۔ ابھی ہمارے نقش قدم پر چلو۔ اپج کی نہ لو۔ ہم بھی ابتدا ابتدا میں بڑی زکیں اٹھا چکے ہیں۔ جب جا کے پکے ہوئے بسیار سفر باید۔ ہم نے چاہا تھا کہ ٹوپی بھی انگریزی دیا کریں۔ اور دیتے بھی تھے۔ مگر اب کے اتار ڈالی، پوچھئے وجہ۔ دوسرے درجہ میں دو کمرے ہندوستانیوں کے لئے ہیں اور دو کمرے یورپین کے لئے۔ اب ہم کس میں بیٹھیں۔ اگر انگریزوں کے کمرے میں بیٹھتے ہیں، تو وہ بیٹھنے نہ دیں گے کہ تم ہندوستانی ہو۔ انگریزی کپڑے پہننے سے انگریز ہونا معلوم۔ اور ہندوستانیوں کے کمرے میں بیٹھے بے عزتی ہو جائے گی۔ اس وجہ سے ٹوپی بدل ڈالی چالیں یاد رکھیں، اور انگریزی کپڑے پہنے، اور انگریزی بولنے کی لیاقت نہ ہوئی تو بھی برا۔ سیکڑوں پھبتیاں ہوتی ہیں۔

زرِ گل سے کاغذِ گل تر ہو نہیں جاتا　　قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے

ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

دقیانوسی۔ تو آپ نے آج اچھا دھروا دیا ہوتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ لیڈیوں کا کمرا الگ ہوتا ہے۔ اور مردوں کا کمرا الگ خیر۔ اب سیکھ گئے۔ آیندہ سے احتیاط رہے گی۔
جنٹلمین۔ اور گارڈ اور ڈرائیور کو جھک جھک کے سلام بھی کیا کرو، کیونکہ کبھی نہ کبھی کام ہی آ جائیں گے۔
دقیانوسی۔ نہیں اب تو اچھوں اچھوں کو سلام نہ کروں گا۔ اب تو کایا پلٹ ہی ہو گئی۔ اب کیوں صاحب جب ٹکٹ لینے جائیں گے تب کیا کریں گے۔ ریل پیل ضرور ہو گی۔ وہاں کون جانے گا کہ جنٹلمین ہیں یا نہیں۔
جنٹلمین۔ لاحول ولاقوۃ۔ ہم تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیویں ہی کیوں۔
دقیانوسی۔ ہاں ٹھیک ہے۔ اچھا پھر جاہے جو ہو۔ جان پر کھیل کے دوسرے ہی درجے کا ٹکٹ لیا کریں گے "نا" سے ادھر یا اُدھر۔
راوی۔ ادھر اُدھر کے بھروسے بھی نہ رہیئے گا۔ اگر اسی طرح جان پر کھیل گئے تو ایک روز چار ابرو کا صفایا ہو جائے گا۔

جنٹلمین۔ اب کہیں ایسی غلطی نہ کرنا کہ لیڈیوں کے کمروں میں دھنس جاؤ۔ جنٹلمین بن کر ہ ماذلیل ہوئے تو کیا۔ مگر یہ لباس تو بدلو۔

دقیانوسی خیالات والے کو راستے میں گرمی جو معلوم ہوئی تو پہلے انگرکھا اتار کے پھینکا۔ پھر پائجامہ نکال ڈالا۔ اور لیٹے۔ اِن کے دوست جنٹلمین کی آنکھ لگ گئی تھی۔ دو گھنٹے کے بعد جاگے تو دیکھتے ہیں کہ حضرت بالکل خوش غلاف۔ ایں! یہ کیا دھوتی اور کرتا باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔

جنٹلمین۔ اے بیوقوف تو نرا دُھنیا پرشاد ہی رہا۔ مردِ خدا ہم تو کہتے ہیں کوٹ پتلون پہن اور تو دھوتی پہن کے سویا ہے۔

دقیانوسی۔ مارے گرمی کے بُرا حال ہے۔ آپ کو کوٹ پتلون کی پڑی ہے۔ ہم ایسی جنٹلمینی سے درگذرے۔ بلی بخشے۔ مُرغا لنڈورا ہو کر ہی جیئے گا۔ چہ خوش۔ چرا نباشد۔

جنٹلمین نے کہا اوّل تو آپ ننگے بیٹھے ہیں۔ آپ کو جنٹلمین کون سمجھے۔ دھوتی اور کرتا پہن کے بیٹھنا ننگا ہی بیٹھنا کہلائے گا۔ دوسرے جنٹلمینیت کا سامان نہیں۔ ہمارا بستر دیکھو کیسا صاف ستھرا ہے، اوڑھنے بچھانے دونوں کا سامان لیس۔ برف نفاست سے ساتھ ہے۔ سوڈا کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوتلیں لگی ہوئی ہیں۔ تیسرے خوشگوار خوش ذائقہ مٹھائی ساتھ۔ نمکین چیزیں پاس۔ مزے دار پیڑے موجود۔ چرٹ بیگ میں۔ چار آنے والی دیا سلائی مستعد۔ تمہارے پاس ایک میلا کچیلا بیگ، ایک گٹھری۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔ پھر تمہیں جنٹلمین کوئی کیونکر سمجھے۔ اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہے۔ میلے کچیلے۔ پھٹے پھٹے کپڑے پہن کر آئے۔ بستر تک ساتھ نہیں، اور اُس پر طرّہ یہ کہ لنگوٹی باندھ کے بیٹھے۔ دقیانوسی خیالات والے بولے اپنا اپنا خیال ہے۔ ہم کالا بانات کا کوٹ اور اس قدر دبیز گرم پتلون اور سب اٹم غلّم پہنیں، مر جائیں ایسے جنٹلمین بننے کو دور ہی سے سلام ہے۔

نگارِ نازک ادا حسن آرا کی بیتابی

فرزانہ کہ دفتر جنوں خواند

از جادو عشق ایں فسوں خواند

نگار شوخ و شنگ، رشک پری رُخان فرنگ نازک ادا حسن آرا بیگم، جو بادِ صبا کی طرح سحر خیز تھیں۔ نور کے تڑکے فرشِ گل سے اٹھیں۔ پیش خدمت نے کیوڑے کے بسے پانی سے منہ دُھلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے نماز صبح پڑھی۔ مگر بہار النساء اور روح افزا اور گیتی آرا ابھی تک آرام ہی کر رہی تھیں۔

حسن آرا ان کے پلنگ کے قریب جاکر بہنوں کو جگانے لگیں، اے بہار النساء بہن اب اٹھو۔ دیکھو تو کتنا دن چڑھا ہے۔ تم ابھی تک آرام ہی میں ہو، آج یہ ماجرا کیا ہے۔ جیسے کوئی گھوڑے بیچ کے سوتا ہے۔ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ اور روح افزا بہن کا ہمیں اور بھی تعجب آتا ہے۔ روز تو منھ اندھیرے کھٹ سے اُٹھ بیٹھتی تھیں۔ آج خبر ہی نہیں ہوتیں۔ پیاری بولی حضور رات بڑی دیر تک باتیں ہوا کیں۔ سرکار تو سو رہیں، مگر بہار النساء بیگم نے جو ایک کہانی شروع کر دی تو دو بجا دئے۔ حُسن آرا نے کہا۔ اخاہ جبھی سب کے سب چادریں تانے پڑی ہیں۔ کا ہے کی کہانی کہی تھی۔

پیاری کہانی کا حال کہنے لگی

"حضور۔ گلِ باصنوبر چہ کرد"۔ بہت بڑی کہانی ہے۔ مگر دو تین جگہ بُرے بُرے ذکر آئے، تو میں ڈرنے لگی۔ اور مجھے ڈرتے ہوئے دیکھ کر گیتی آرا بیگم نے اور بھی ڈرانا شروع کر دیا۔ ان کے نزدیک تو دو گھڑی کی دل لگی تھی۔ مگر میری جان پر بنی پلیوں خون خشک ہو گیا۔ جہاں پر عاشق و معشوق کا حال بیان کیا۔ وہاں البتہ جی لگتا تھا۔

حسن آرا بہت ہنسیں اُخاہ۔ ابھی سے عاشقی معشوقی کا حال بھلا لگنے لگا۔ بڑھ کے خدا جانے کیا کرے گی۔ ایک ہی چھٹی ہو گی۔ تیری چتون ہی کہے دیتی ہے کہ بڑھ کے غضب کی ہو گی۔

پیاری نے گردن نیچی کر کے یہ مصرع پڑھا۔ ع۔

آج فتنہ ہوں کوئی دن میں قیامت ہوں گی

بوڑھی مغلانی نے کہا وہ تو تمہارے لچھن ہی کہے دیتے ہیں۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ میاں نگوڑے کی ناک میں دم کر دو گی۔ آنکھیں کیسی نچتی رہتی ہیں۔ اور بوٹی بوٹی پھڑکتی رہتی ہے۔

اتنے میں حسن آرا بیگم نے بہار النساء کو زبردستی جگایا۔ وہ انگڑائی لے کر جھک جھک پڑتی تھیں۔ مگر یہ پھر اٹھا اٹھا کے بٹھاتی تھیں، بارے اٹھیں، آنکھیں ملتی ہوئی بولیں توبہ۔ جگانے کی آخر اس قدر جلدی کیا تھی۔ کل رات کو تم نے تو اپنے حساب رتجگا کیا۔ اور یہ خواہی نخواہی صبح کو جگانے لگیں اور کل خود دو گھڑی رات گئے ہی سو رہیں۔

حسن آرا:۔ ہم کو چاہے چار بجے کے بعد سونے دو۔ اللہ جانتا ہے نماز کے وقت نہ اُٹھیں تو سو روپیہ ہارتی ہوں۔ نماز قضا ہونا کیا معنے۔ آج تک کبھی قضا نہیں ہوئی ہے۔

بہار النساء۔ اب بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ۔ پرسوں کیا ہوا تھا۔ پرسوں کے بجے اُٹھی تھیں۔ سارے میں

دھوپ پھیل گئی تھی کہ نہیں۔؟

حُسن۔ (ہنسکر) واہ یہ بھی خبر ہے کہ مُنہ ہاتھ دھو کے اچھی طرح فارغ، وضو کر کے نماز پڑھ کے پھر سو رہی تھی۔ چاہے بی مغلانی سے پوچھ لو۔

مغلانی۔ ہاں ہاں بیگم صاحب مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

بہار۔ یہ بولیں ٹھگوں کی بڑھیا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔

مغلانی۔ اللہ گواہ ہے حضور بہت سویرے اٹھی تھیں، اور فارغ ہو کر نماز پڑھی۔ گلوری کھائی۔ پھر افشروہ پیا۔ بلکن (بلکہ) میں نے ٹوکا بھی تھا کہ

حسن۔ صبح کا وقت ہے۔ خنکی کا اس وقت نہ پیجئے۔ ہے کہ نہیں۔؟

بہار۔ (مسکرا کر) تو اُسی کو کہنے دیا ہوتا۔ تم بیچ میں کیوں کود پڑیں۔ خواہی نخواہی۔ اے ان دونوں کو تو جگاؤ۔

گیتی آرا اور روح افزا ابھی بیدار ہوئیں، پلنگ سے اٹھیں۔ روح افزا کی آنکھیں جھکی پڑتی تھیں۔ گیتی آرا جھومتی ہوئی چلتی تھیں۔ ان تینوں بہنوں نے علیحدہ علیحدہ نماز ادا کی۔ اور چاروں بہنیں کمرے کا دروازہ کھول کر نونہالانِ چمن کا جوبن لوٹنے لگیں۔

روح افزا۔ اس وقت باغ جوبن پر ہے، اور ہوا سے بھی بہشت کی لپٹیں آتی ہیں۔ اور یہی باغ ہے کہ اُن دنوں میں سونا نظر آتا تھا۔

بہار۔ اے ہے۔ مکان کاٹے کھاتا تھا۔ مگر اَب اس کا ذکر ہی نہ کرو۔ انجام تو بخیر ہوا اب حُسن آرا کی بھی شادی ہو جائے۔ تو بس پھر کوئی فکر نہ رہے۔

اتنے میں پیاری نے چونک کر کہا۔ ہاں خوب یاد آیا۔ میں یہ تو کہنا بھول ہی گئی تھی رات کو میں نے خواب میں انھیں دیکھا۔ وہ جو آتے نہیں تھے۔ وہ گورے گورے ہیں کہ نہیں۔ وہ جو حُسن آرا کو بہت چاہتے تھے۔ حُسن آرا نے کہا کیا واہیات خرافات بکتی جاتی ہے۔ چاہتے ہوں گے تجھے (مسکرا کر) اور نہیں اچھا ہاں کیا خواب میں دیکھا۔ پیاری نے تھوڑی دیر یاد کر کے آزاد کا نام لیا۔ اور خواب کا حال بیان کرنے ہی کو تھی کہ مہری نے آ کے کہا۔ حضور جلدی چلیے۔ سرکار بلا رہی ہیں۔ یہ سُنتے ہی حسن آرا بڑی بیگم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آداب بجا لائی۔ بڑی بیگم نے کہا بیٹا اُستانی جی کے ہمراہ ذری دور جانا ہے۔ کھڑے کھڑے ہو آؤ۔ چاہے فنس پر جاؤ چاہے بگھی پر۔

حُسن۔ بہت خوب مگر جانا کہاں ہوگا اُماں جان۔

بڑی بیگم ۔ سُنہری مسجد میں ایک درویش رہتے ہیں ۔ بہت رسیدہ ہیں، بڑے باکمال ۔ اُن سے دو باتیں دریافت کرنی ہیں ۔

حُسن ۔ تو اماں جان آپ خود تکلیف کریں، یا فقط استانی جی کو بھیجدیں ۔ میرا جانا بہت معیوب ہے ایسے مقاموں پر بڑی بوڑھی جائے تو خیر ہرج نہیں ۔ بھلا شاہ جی کا سن شریف کیا ہو گا ۔

مہری ۔ اے حضور ابھی گبھرو جوان ہیں ۔ بہت ہو بیس بائیس برس کا سن ہو، اور چہرے پر اس قدر کا نور برستا ہے کہ میں کیا عرض کروں ۔ بڑے رسیدہ ہیں ۔

حُسن ۔ اماں جان ہمارا جی تو نہیں چاہتا آپ ہی جائیں ۔

بڑی بیگم ۔ تم بیٹھ جاؤ تو میں کہوں ۔ بھلا کوئی چاہے گا کہ اولاد بُری راہ چلے ۔ سپاہی چاہتا ہے کہ میرا لڑکا مجھ سے بڑھ کے بہادر ہو ۔ مولوی دعا مانگتے ہیں ۔ کہ یہ اس قدر پڑھ لکھ جائے کہ کوئی اس سے مقابلہ ہی نہ کر سکے ۔ بھلا میں بے سمجھے بوجھے، بے پوچھے گچھے تم کو وہاں بھیج دیتی ۔ کیسی نادانی کی باتیں کرتی ہو ۔ پھر اُستانی جی تمہارے ساتھ ہی ہیں ۔ مغلانیاں مہریاں گھر کی دس پانچ عورتیں سب ہمراہ ہوں گی تمہیں ڈر کاہے کا ہے ۔ سُنا ہے کہ شاہ جی غیب دان ہیں ۔ غیب کی باتیں بتاتے ہیں ۔ اُن سے دو باتیں پوچھنی ہیں ۔ ایک یہ کہ آزاد زندہ تو ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان آئیں گے یا نہیں ۔

اتنا سُننا تھا کہ حُسن آرا کے چہرے کی رنگت بدل گئی ۔ گو ضعیف الاعتقادی سے منزلوں دور بھاگتی تھی ۔ مگر دل میں سوچی کہ اچھا پوچھ لو چل کے ۔ اپنا ہرج ہی کیا ہے ۔ کہا بہت خوب میں جاؤں گی ۔ کپڑے بدل کے ابھی آتی ہوں ۔ پیش خدمتوں نے گیسوئے عنبر بُو سنوارے، لباسِ فاخرہ وگراں بہا زیبِ تن کیا ۔ اور نکھر کے نکلیں تو یہ معلوم ہوا کہ زمین پر دوسرا آفتاب نمایاں ہو گیا ۔ ؎

خونیں نگہہ کرشمہ کوشے

ہم خنجر و ہم نمک فروشے

بہار النسا اور روح افزا اور گیتی آرا اور جہاں آرا نے یہ خبر سُنی تو حُسن آرا کو کوٹھے پر بلوایا پوچھا کہاں کی تیاریاں ہیں بہن، کہا اماں جان ایک کام کو بھیجتی ہیں ۔ میرا دل تو نہیں بھرتا مگر اماں جان اصرار کرتی ہیں کہ ضرور بالضرور جاؤ ۔

گیتی آرا ۔ تم تو بہن پہیلیاں بُجھواتی ہو ۔ بھیجتی کہاں ہیں ۔

حُسن ۔ کوئی درویش مسجد میں رہتے ہیں، ان کے پاس بھیجتی ہیں ۔

روح افزا ۔ کیا مطلب کیا ہے ۔ یہ اماں جان کو ہو کیا گیا ہے آخر ۔ کم سن لڑکیاں کہیں اس طرح سے ماری ماری،

پھرتی ہیں۔ تم ہرگز ہرگز نہ جاؤ۔

حُسن۔ اب جیسی رائے ہو، آپ جا کے اماں جان سے کہیئے۔

روح افزا۔ میں ابھی ابھی جاتی ہوں۔ واہ یہ کیا بات ہے۔

یہ کہہ کر روح افزا گیتی آرا کو لے کر بڑی بیگم کے پاس گئی۔ کہا اماں جان کچھ خیر ہے۔ حُسن آرا بیگم کو کہاں بھیجتی ہیں۔ آپ یہ سن و سال، یہ حسن و جمال، دوشیزہ کنواری، کوراپنڈا، ایسی حالت میں کہیں یوں بھیجتا ہے۔ کوئی، آئندہ اختیار ہے آپ کو میں صلاح نہ دوں گی۔

بڑی بیگم کے مزاج میں سب سے زیادہ دخیل روح افزا ہی تھیں۔ گیتی آرا بیگم بھی دبے دانتوں ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ بڑی بیگم نے روح افزا سے کہا۔ آج کل کی لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ ہم سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ بڑی بوڑھیاں تو کسی گنتی ہی میں نہیں ہیں، اور ہم کو موت نہیں آتی۔ آنکھ بند کریں تو یہ سب کیوں کر دیکھیں۔ مجھ نصیبوں جلی نے کچھ تو سوچا ہے۔ اور ڈر کاہے کا ہے یہ میں نہیں سمجھتی۔

روح افزا۔ آپ جانیں آپ کا کام جانے۔ ہم کو کیا واسطہ۔

بڑی بیگم۔ اچھا تو زبان ذری چھوٹی کرو۔ تم دخل نہ دو۔

گیتی آرا۔ اماں جان کسی سے پوچھ لیجئے۔ اس میں تو ہرج نہیں ہے۔

بڑی بیگم۔ میں دیکھتی ہوں یہ سب کی سب مجھے عقل سکھانے کا دم دعویٰ رکھتی ہیں۔ جو ہے وہ اپنے کو بقراط ہی سمجھتی ہے۔

روح افزا۔ (اٹھ کر) آپ سے کہے کون ہم سے تو بے ادبی نہ ہوگی۔

گیتی آرا۔ اچھا پھر تم اس قدر اصرار کیوں کرتی ہو۔ جانے دو۔ اُستانی جی تو ساتھ ہیں ہی۔ اتنی عورتیں ساتھ ہیں، اور وہ درویش بھی جانے بوجھے اور نیک اور بوڑھے ہوں گے۔ بس پھر کیا ڈر ہے جانے دو۔

بڑی بیگم کو جو سمائی وہ سمائی۔ بہار النسا وغیرہ نے لاکھ لاکھ سمجھایا۔ مگر انھوں نے اپنی رائے قائم رکھی حسن آرا تو جانے پر آمادہ ہی ہو گئی تھی۔ استانی جی اور دو بوڑھی مغلانیاں اور مہریاں ساتھ گئیں سواری کے ہمراہ چار خاص بردار، اور دو سپاہی تھے۔ مسجد کے دروازہ پر پردہ کرایا گیا۔ شاہ جی کے پاس جو لوگ بیٹھے تھے وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر آئے۔ حُسن آرا بیگم ناز و ادا سے چلیں۔ اور شاہ صاحب سے چار آنکھیں ہوئیں تو درویشی سے مُنہ موڑا عشق سے ناطہ جوڑا۔

در باب کہ حال عشق اینست　　　اینست کمالِ عشق اینست

چوں عشقِ علم گشت بعیوق　　آتش زنِ عاشق ست و معشوق
چوں آتش عشق برفروزد　　پروانہ و شمع ہر دو سوزد
در عشق چنیں کرامست مارا　　ایں نشہ بعاشقان گوارا

ہندست و ہزار عالمِ عشق
ہندست و جہاں جہانِ غمِ عشق

حُسن آرا پر اُس وقت واقعی عالم تھا۔ لڑکپن سے اس روز تک کبھی اس قدر جوبن پر نہ تھی۔ اٹھلا کے جو اوپر گئی تو نظر لڑتے ہی شاہ صاحب کا تقدس اڑنچھو ہو گیا:۔

زانِ غمزہ کہ در خرام کردہ　　صد زلزلہ فتنہ وام کردہ

ہر جا نگہے ستارگی کرد
خون در جگرِ نظارگی کرد

درویش کا بے اختیار جی چاہا کہ اُٹھ کے گل رخسار کے بوسے لے لے۔ مگر رعب حسن اور پاسِ وضع نے اجازت نہ دی۔ دزدیدہ نگاہ اُس گلِ گلزار خوبی و عندلیب شاخسار محبوبی پر نظر ڈالتا تھا۔ زہد اور تقویٰ کے خرمن کو برق عشق نے پاک جلا دیا۔ ؎

پنجہ زد عشقش لباس پارسائی پارہ شد
طاعتِ صد سالہ اش تاراجِ یک نظارہ شد

دل کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس مہوش سراپا ناز سے ہم کلام ہوئے۔

شاہ صاحب۔ بیٹی۔ تیرے اوپر خدانخواستہ کیا مصیبت پڑی ہے۔ جو تو اس بن میں میرے پاس دوڑی آئی۔

حسن آرا۔ عشق و حُسن کامیابی و ناکامی کا جھگڑا پڑا ہے۔

درویش۔ (بادلِ پُر درد آہ سرد بھر کر)۔ ؎

در عشق بجز گداختن نیست
ایں سوختن ست و ساختن نیست

حسن آرا۔ (رنگ فق ہو گیا) ہائے غضب شاہ صاحب یہ کیا فرمایا۔

شاہ صاحب۔ (نہایت جوش و خروش کے ساتھ)

چوں بقاصد بسپرم پیغام را　　رشک نگزارد کہ گویم نام را

گشتہ در تاریکی روزم نہاں — کو چراغے تا بجویم شام را

آں ہمیم باید کہ چوں ریزم بجام — روزمی در گردش آرد جام را

از دلِ تست انچہ برمن می رود — می شناسم سختی ایام را

ما کجا و گوچہ سودا درسرست — ذرہ ہائے آفتاب آشام را

رحمت عام ست دائم خاص را

عشرت خاص ست ہردم عام را

حسن آرا۔ میں صدقے میرے شاہ صاحب صاف صاف بتا دیجیے۔

راوی۔ اس فقرے نے شاہ صاحب کو اور بھی بیتاب کر دیا (میں صدقے میرے شاہ صاحب) ہائے ستم شاہ صاحب اس وقت استانی جی کو دل ہی دل میں کوستے تھے کہ مالک دیرینہ روز کہاں سے آئی۔ اگر خلوت ہوتی تو اظہار مطلب کرتا۔ قدموں پر سر دھرتا۔ اس کے سامنے کہتا ہوں تو یہ پری وش شرماتی ہے۔ نہیں کہتا تو دل نہیں مانتا لہذا یہ رباعی ترجمان دل کی اور رُوتے رُوتے آہستہ سے پڑھی۔

خلوت میں نہیں ہے یار کیوں کر ملئے — جلوت میں تمہیں ہے عار کیوں کر ملیے

رونے نے تو کھویا خواب کا بھی آنا

دریا حائل ہے یار کیوں کر ملیے

اُستانی جی نے شاہ صاحب سے کہا مجھے تخلیئے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ شاہ صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تخلیئے میں تم سے باتیں کروں گا تو پھر اس صاجزادی سے بھی خلوت ہی میں باتیں کرنی پڑیں گی اور گو مجھے اس میں اصلاً عذر نہیں ہے، مگر شاید یہ لڑکی جھجکے۔

حسن آرا نے گردن جھکائی استانی جی بھی مطلب سمجھ گئیں اور مغلانیاں باہم اشارہ کرنے لگیں۔

شاہ صاحب۔ صاجزادی عشق کے جھگڑوں میں نہ پڑنا خبردار۔

حسن آرا۔ اب تو جو ہوا وہ ہوا۔ جو میں پوچھوں وہ بتائیے۔

شاہ صاحب۔ (مسکراکر) تم وہ سوال کروگی افسوس صد افسوس۔

حُسن۔ (گھبراکر) ہائے ہائے۔ تمہاری زبان سے جب سنا افسوس ہی کا لفظ سُننے میں آیا۔ خدارا بتاؤ کیا حال ہے۔

شاہ صاحب۔ (باآواز بلند خوش الحانی کے ساتھ)

لب شیریں تو جانِ نمک ست — ونیکہ گفتم بزبان نمک ست

در نہادِ نمک از رشک بست   ہست شورے کہ فغان نمک ست

اے شدہ لطف و عنایت ہمہ ناز   ناز در عہد تو کان نمک است

شور ہا صرف فغانم گردید

نمک از صبر بتان نمک است

حسن آرا۔ اُستانی جی اب چلئے ہماری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔

شاہ صاحب۔ اچھا صاف بتاؤں۔ پوچھنا شروع کرو۔

حسن آرا۔ آزاد کہاں ہیں خط آیا تھا کہ روانہ ہوتا ہوں۔

شاہ صاحب۔ روانہ ہوئے ہیں، مگر علیل ہیں۔ آنکھ بند کرلے۔

راوی۔ حسن آرا نے آنکھ بند کرلی اور تھوڑی دیر کے بعد شاہ صاحب کے حکم کے مطابق کھولدیں۔

شاہ صاحب۔ کچھ دیکھا۔ کوئی شے نظر آئی یا نہیں۔

حسن۔ ہاں آزاد کی صورت جس طرح پہلے ملے تھے اسی لباس میں اس وقت بھی میں نے ان کو دیکھا۔

شاہ صاحب۔ طبیعت ناساز ہے۔ اور ایک عورت سے نکاح ہوگیا ہے۔ اور وہ بد وضع عورت ہے۔ ان سے اور اس کے پہلے شوہر سے لڑائی ہونے والی ہے۔ جس کا نتیجہ بہت خراب ہے۔ ؎

صاحب دل ست ونا مور عشقم بسامان خوش فکرد

آشوب پیدا تنگ اد اندوہ پنہاں خوش فکرد

اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آزاد کو تم نہیں دیکھ سکتیں ہاں ایک بات ہے وہ خلوت میں کہنے کی ہے اگر سب ہٹ جائیں تو بیان کروں۔

حسن آرا نے کہا یا اُستانی جی میرے پاس بیٹھی رہیں یا یہ مغلانی یا سامنے سے سب ہٹ جائیں مگر دور نہ جائیں۔

الغرض کل عورتیں سامنے سے ہٹ گئیں، اور شاہ صاحب نے یوں کہنا شروع کیا۔

شاہ صاحب۔ پیاری ایک آزاد نہیں ہزار آزاد تمہارے دام محبت میں اسیر ہو جائیں گے۔ اور میں تو خطِ غلامی لکھے دیتا ہوں۔

حسن آرا۔ (متحیر ہوکر) شاہ صاحب ہائیں۔

شاہ صاحب۔ (کانپ کر) نہیں نہیں جانِ من واسطے خدا کے خفا نہ ہو۔ یاد رکھو میں شاہزادہ ہوں۔ فقط تمہارے عشق میں یہاں تک آیا۔ اور خدا نے مجھے تمہارا چہرۂ زیبا دکھایا۔ میں نے تمہارے حُسنِ خدا آفریں کا

بہت کچھ شہرہ سنا تھا۔ اور جیسا سنا تھا اُس سے دوچند پایا۔

حسن آرا۔ تو آپ میرے عاشق زار نکلے یہ کہیے۔

شاہ صاحب۔ میری شکل میری صورت، میری گفتگو سے شہزادگی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ آزاد میں کیا ہے۔ آزاد ہیں کہاں۔

حسن آرا۔ بس خبردار اب ایسا ذکر نہ کرنا۔ تم فقیر نہیں ہو۔

شاہ صاحب۔ اچھا جانِ جان یاد رکھنا کہ کسی فقیر نے کچھ کہا تھا۔

رُوئے مقصود کہ شاہان بدعا می طلبند

سببش بندگی حضرت درویشان ست

حُسن آرا کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ اور درویش کو کوستی ہوئی چلیں۔

استانی جی۔ کیا چلوگی۔ دونوں باتیں پوچھ لیں۔

حسن آرا۔ اللہ کرے اس کا جنازہ نکلے۔ موا ٹھگ زمانے بھر کا۔ اٹھائی گیرا۔ درویش بنا ہے۔

درویش نے حُسن آرا کے غیظ و غضب کا حال دیکھ کر بد دعا دی، اور کہا آج کے آٹھویں روز تو خبرِ بد نہ سُنے تو فقیری چھوڑ دوں۔ قدم درویشان ردِّ بلا۔ فقیر کا بڑا گھر ہے۔ فقیروں سے بگاڑ کر آج تک کوئی بھی پھلا ہے۔ رہے دریا میں اور مگر سے بیر۔

حُسن آرا بکمال سراسیمگی گاڑی پر سوار ہوئی، اور وفورِ غم سے ضبط گریہ نہ کرسکی۔ استانی جی نے بہت سمجھایا مگر فہمایش نے اُس وقت اصلاً اثر نہ دکھایا۔ درویش کا اس بیتابی کے ساتھ بد دعا دینا ستم تھا۔ بہزار خرابی گاڑی گھر پر پہونچی۔ حُسن آرا مکان میں گئیں تو بڑی بیگم نے حیرت کے ساتھ کہا۔ کیوں کیوں یہ آنکھیں لہو کی بوٹیاں کیوں ہوگئیں۔ خیر تو ہے۔

حسن آرا۔ ہائے آزاد۔ اور وائے آزاد۔ آنا جان۔

بڑی بیگم۔ کچھ کہو تو بٹیا۔ کیا کہا کیا سُنا خیریت ہے یا نہیں۔

حسن آرا۔ طوفان الم سینہ میں جوش زن ہے اب کیا کروں۔

بڑی بیگم۔ استانی جی۔ بہن تم ہی بتاؤ۔ یہ کیا ماجرا ہے۔

استانی جی۔ ساری خدائی کا بدذات۔ لوگوں کے پھانسنے کے لیے فقیر بن بیٹھا ہے۔ آج اللہ نے بڑی خیر کی۔ عجب زمانہ آگیا ہے۔

بڑی بیگم۔ بی مغلانی ذری ادھر آنا (کان میں) مجھے مفصل حال بتاؤ۔

حسن آرا۔ لوگو یہ دن ہے یارات تاریکی سی تاریکی ہے۔

شد ہر کہ گاہی ہمرہم بے خانماں شد ہمچو من

باہر کہ شستم دمی چوں خویش محزوں کرد نش

ہمیں آج یقین ہو گیا کہ ہماری جان جائے گی وصل جاناں کی نوبت نہ آئے گی۔ کاش کہ صورت ہی دیکھ لیتی وہ بھی نصیب میں نہیں۔ مغلانی نے بڑی بیگم سے سارا حال یوں بیان کیا۔

حضور وہ تو کوئی شہدا لچا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے تو ایسی ایسی باتیں کیں کہ میرا دل چاہا کہ منھ پکڑ کے نوچ لوں۔ صاحبزادی پر بُری نظر ڈالتا تھا۔

بڑی بیگم۔ ایں! آسمان سے انگارے کیوں نہیں برستے۔

حسن آرا۔ اماں جان اُس نے چلتے وقت ہمیں بددعا دی۔

بڑی بیگم۔ چمار کے کوسے سے کہیں ڈانگر مرتا ہے۔ لے منھ دھو ڈالو بیٹیا۔

استانی جی۔ ایسے بچوں کی بات کا بُرا ماننا کیا۔ مگر ہاں بڑا دھوکا ہو گیا۔ اس سے کوئی انکار نہ کرے گا۔ جو ہمیں پہلے ذرا بھی معلوم ہو تو ہرگز ہرگز نہ جائیں۔ خیر اَب تو جو ہوا وہ ہوا۔ اور مجھے تعجب ہے کہ تم ایسی فہمیدہ ہو کر روتی ہو۔ ابھی کل تک تو لڑتی تھیں کہ دعا کیا چیز ہے۔ دعا بے اثر ہے، اور آج بددُعا کا اس درجہ خیال ہے۔ ع۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

بہار النسا۔ اُستانی جی آپ نے خوب بات کہی۔ مجھ سے چھین لے گئیں۔

روح افزا۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کا جانا مصلحت کے خلاف ہے مگر اماں جان خفا ہونے لگیں تو میں بھی چپکی ہو رہی، اور کیا کرسکتی۔ ایسے ایسے رسیدہ بہت دیکھے ہیں۔ ہر کوئی خدا رسیدہ ہی بن جائے تو دنیا میں کوئی ایسا ویسا کاہے کو باقی رہے۔

بڑی بیگم۔ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔

استانی جی۔ مگر کان پکڑے کہ آج سے بے سمجھے بوجھے ایسی جگہ نہ جاؤں گی۔ میری روح پر صدمہ ہوگا، اس وقت لیکن بخیر گزشت۔ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ بہت ٹھیک ہے۔ ؎

چو از قومی یکے بیدانشی کرد

نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

گیتی آرا۔ ہم اوروں پر ہنستے تھے کہ عورتیں جنوں کی مسجد، کالے پہاڑ، درگاہ میں جاتی ہیں، مگر

یہ خبر ہی نہ تھی کہ ہم سے خود ہی ایسی بے وقوفی ہوگی۔ عورتوں کی بڑی عبادت یہی ہے کہ گھر کی چار دیواری میں نیکی سے رہیں۔

روح افزا۔ سر پیٹتی رہی۔ مگر اماں جان کی ضد تو جانتی ہی ہو، ایک نہ سنی۔ بلکہ اور خفا ہونے لگیں۔ پھر میں کیا کرتی۔

حسن آرا۔ نہیں بہن عشق کے جھگڑے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ گتھی کسی کے سلجھائے سلجھنے والی نہیں ہے۔ عاشقی و معشوقی کیا کچھ ہنسی ٹھٹھا ہے۔

از فروغ عشق جاں تابندہ است　　　جسم عالم زین حرارت زندہ است
عشق فردوسی حصارش خار خار　　　ظاہرش وے باطنش باشد بہار
صورتش زہر ست و معنی صاف مُل　　　شعلہ آبستن صد رنگ گل
عشق بارانی سحابش جملہ دل　　　عشق طوفانی حبابش جملہ دل

دربشر ایمان و کفر و ایں و آں
شعلہ دود چراغ عشق داں

استانی جی۔ حسن آرا بیگم۔ میں کہتی ہوں یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ آخر تم اور بد دعا کا اس قدر خیال کرو اور دو پر ہنستی تھیں۔ اب تم اپنی کہو۔

حسن۔ استانی جی خاتونِ جنت کی قسم کھا کر کہتی ہوں بد دعا نے مجھے نہیں رُلایا۔ مطلب میرا کہ میں اس سبب سے نہیں روئی کہ دعائے بد کا خدانا کردہ کچھ اثر ہوگا۔ مگر جو کوئی آزاد کو بُرا کہتا ہے تو مجھ سے سُنا نہیں جاتا۔ بس بات ساری یہ ہے۔ میں سچ کہتی ہوں اُستانی جی مجھے مایوسی سی ہو گئی ہے۔ میں سوچا کرتی تھی کہ اگر آزاد کی صورت اللہ نے نہ دکھائی تو میں کیا کروں گی، یا ان کے ساتھ نکاح ہو، یا موت آئے۔

فصلِ خزاں میں گل کا تو آنا محال ہے
بجلی ہی کاش آئے مرے آشیاں تلک

اُستانی۔ جب تک روم میں آزاد تھے تب تک ہمارا دل بھی بے قابو تھا۔ مگر اب تو روانہ ہو چکے۔ تار بھی آگیا۔ اب کیوں اس قدر تشویش ہے۔ بے کار جان ہلکان کر رکھی ہے۔

وہ بھی آیا نہ آپ میں ہم
اس کو کہتے ہیں انتہائے فراق

یہ شعر تمہارے حسب حال ہے۔

حسن۔ اُستانی جی اَب دل ایسا ضعیف ہوگیا ہے، کہ میں کچھ عرض نہیں کر سکتی۔ ذری سا صدمہ جگر کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ شاید غم ہی سہنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ دیکھیے اب آئندہ کیا ہوتا ہے۔ اب تو غم ہی غم سہنا ہے۔

ہوں میں وہ بُلبل کہ مثلِ طائرِ قبلہ نما

منہ قفس میں بھی نہ پھیرا خانۂ صیاد نے

استانی جی۔ کیوں حُسن آرا۔ ایک بات کہیں۔ بُرا تو نہ مانوگی۔

حسن۔ آپ تو اُستانی جی ہیں مثل اپنی ماں کے سمجھتی ہوں۔

استانی۔ وہ بات یہ ہے کہ تم اس صفائی کے ساتھ آزاد اور نکاح کے لفظ زبان پر کیوں کر لا سکتی ہو۔ بڑی بیگم صاحب کے سامنے ہمارے سامنے اور عورتوں کے سامنے اس طرح صاف صاف باتیں کرتی ہو کہ ہمیں بڑا تعجب ہوتا ہے۔ ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ عشق کے جھگڑے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

حسن۔ استانی جی اب تو آبے کہ سرگزشت کا نقشہ ہی نہیں۔ جب سارے زمانے میں مشہور ہوگیا کہ آزاد کو حُسن آرا نے روم بھیجا ہے پھر اب گھونگھٹ کیسا۔

آزاد کی یاد نے حُسن آرا کو انتہا سے زیادہ بے قرار کر دیا۔ کوٹھے پر جا کر سو رہیں۔ مہری پنکھا جھلنے لگی۔ ادھر سامنے کے کمرے میں روح افزا اور گیتی آرا نے ایک مغلانی سے جو حسن آرا بیگم کے ہمراہی میں گئی تھی۔ مفصل حال پوچھا تو اس نے یوں کہا۔ اے حضور وہ تو چھٹا ہوا شہدا معلوم ہوتا ہے۔ اللہ اس سے بچائے۔ ابھی کوئی بیس بائیس برس کا سن ہوگا۔ ہاتھ پانوں اچھے ہیں۔ اور بڑا گورا چٹا ہے۔ شنجرفی بدن۔ چہرے سے خون برستا ہے۔ تہمت باندھے تھا۔ اور صندلی رنگا ہوا کرتا پہنے تھا۔ آستینوں دار۔ ڈھیلی ڈھیلی آستینیں، اور کرتا گھٹنوں تک تھا۔ سر پر مانگ۔ پٹیاں جمی ہوئی۔ بالوں میں جٹا کا تیل پڑا ہوا۔ اور موتیے کے عطر سے بسے ہوئے۔ صاحبزادی کو دیکھتے ہی عاشق ہو گئے۔ میں سایہ کی طرح ساتھ ساتھ تھی۔ میں چتونوں سے تاڑ گئی کہ میاں کی نیت بُری ہے۔ گھور گھور کے دیکھنے لگا مُوا اور یہ جھینپ جائیں۔ اور حضور بعض بات کہنے کی نہیں ہوتی۔ یہ اُس وقت بنی ٹھنی بھی بہت نہیں۔ ایسا جوبن تھا کہ میں کیا عرض کروں۔

روح افزا۔ اور میں نے منع کیا۔ جیسے یہ سامنے آئیں چھوٹتے ہی میں نے کہا۔ اَخاہ عطر میں کپڑے ڈوبے ہوئے ہیں۔ جاتی درویش، کے پاس ہو اور بتاؤ یہ مگر سُنتا کون ہے۔

گیتی آرا۔ میں نے بھی تو کہا تھا۔ حُسن آرا نے کچھ سُنا ہی نہیں۔

مہری۔ حضور جب وہ گھورنے لگا میں تو کانپ گئی۔

گیتی آرا۔ چلو اَب کسی کے سامنے زبان پر نہ لانا۔

روح افزا۔ یہ اماجان کی ساری غلطی ہے، اس کو کوئی کیا کرے۔

مہری۔ کہیئے تو صاحبزادی یہ ٹبیا۔بیٹی اور نیت۔

گیتی آرا۔ پھر یہ اُٹھ کے چلی کیوں نہ آئیں۔ بیٹھنا ہی کیا فرض تھا۔

مہری۔ ایک دفعہ اُن کی ٹھڈی پر ہاتھ لیجا کر کہا۔ بیٹی گردن اونچی کرکے بیٹھو۔ میری روح لرزتی تھی۔ کہ اللہ خیر کرے۔ یہ ذرا پیچھے کھسک کر بیٹھیں۔ پیچھے کھسکنا تھا کہ وہ مُوا ذری آگے کو بڑھا، اتنے میں بیگم صاحب کے زانو سے زانو بھڑا کے بیٹھ گئے تو ـــــ جھینپکر۔

اَب میں کیا کہوں۔ خدا غارت کرے مونڈی کاٹے کو۔ اے مُجھی کو گھورنے لگا۔

گیتی آرا۔ ضرور اس میں کیا شک ہے۔ تم پر ضرور نظر پڑی ہوگی۔

روح افزا۔ اے لو کیسی کچھ۔ یہ کیا کچھ کسی سے کم ہیں توبہ توبہ!

مہری۔ بس حضور کہنے لگا کہ جو کچھ پوچھنا ہے تخلیے میں چل کے پوچھ۔ حُسن آرا بیگم اب اس کا کیا جواب دیں۔ اس پر استانی جی بولیں چلو میں خلوت میں چلتی ہوں۔ جو کچھ کہنا ہو مجھ سے کہو۔ وہ اس پر کیوں راضی ہوتا۔ اور اللہ جانے جادو کردیا، سحر کردیا، کیا کردیا کہ حُسن آرا بیگم نے ہم سب سے کہا تم ذرا تھوڑی دور ہو جاؤ، تو میں یہاں ہی ان سے پوچھ لوں۔ استانی جی ذرا پیچھے بیٹھیں، مگر پیٹھ پھیر کے میں حضور آنکھ لڑائے رہی۔ انھوں نے آزاد کا حال پوچھا تو واہی تباہی بکنے لگا۔ اخیر میں بولا تم کو آزاد کی فکر اور پروا کیا ہے۔ ایک آزاد پر فرض کیا ہے ہزار آزاد دامِ کاکلِ مشکیں کے اسیر ہو جائیں گے اگر آزاد نہ آئیں تو ہم موجود ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ میری روح لرزنے لگی، اور ان کا رنگ فق ہوگیا۔ پھر کہنے میں شہزادہ ہوں۔ فقیر نہیں ہوں۔ یہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تو بددعا دی، اور کہا اللہ نے چاہا تو آزاد کی صورت کبھی نہ دیکھے گی، یہ گاڑی پر آتے ہی رونے لگیں۔ پھر اُس گھڑی سے اور اب تک ہچکی بند نہیں ہوئی۔

روح افزا۔ توبہ۔ خدا بچے ایسے ایسے موذیوں سے۔ یہ فقیر ہیں یا بہروپیے۔

اب سنیئے کہ حسن آرا بیگم جو عین اضطراب و بے قراری میں سوئیں تو خواب پریشاں دیکھنے لگیں۔ آزاد کی یاد میں تو آرام کیا ہی تھا۔ وہی باتیں خواب بن کر نظر آئیں۔ دیکھا کہ آزاد ایک توسنِ عقاب ہیبت پر سوار لبِ جو کھڑے ہیں۔ حُسن آرا نے قریب جاکر کہا اجی حضرت مزاج شریف۔ اور یوں مکالمہ ہونے لگا۔

آزاد۔ (چونک کر) حُسن آرا۔ حُسن آرا۔

حسن آرا۔ آپ گھوڑے سے اُتریئے گا بھی یا نہیں۔؟

آزاد۔ حسن آرا۔ یا الٰہی میں خواب دیکھ رہا ہوں کیا۔ ے

گرچہ شاطر بود خروس بجنگ
چہ زند پیش بازِ رُوئیں چنگ

یہ بوستاں کا شعر نہیں گلستاں کا شعر ہے۔ بوستاں کا وزن ہے اور ہے۔ فعولُ فعولُ فعولُ فعولُ۔

منم کہ نالہ بمرغان گلشن آموزم | بر ڈی خاک بر بسمل طپیدن آموزم
زبسکہ دشمنِ جان و دل خودم ہردم | جفائی تازہ باں چشمِ پُرفن آموزم
عجب مدار ز بیتابیٔ من شیدا | کہ طرز کشتن خود را بدشمن آموزم

قتیں از غم آں نشتر نگاہ مدام
کشودنِ رگِ جان را برگ زن آموزم

حسن۔ جی تو چاہتا ہے کہ لبِ لعلِ شیریں کا بُوسہ لوں۔ مگر سوچتی ہوں کہ تمہارے ہونٹھ اس شرف کے قابل ہیں یا نہیں۔

آزاد۔ (مسکرا کر) اللہ اللہ آپ کوثر سے ہونٹھ دھولو۔ ہمارے لب وہ لب ہیں۔ جن کے بوسے کی حورانِ جنّت کو آرزو ہے جی۔

حسن آرا۔ ہاں یہ گویا آپ کو بڑے فخر کا مقام ہے، اور یہاں اگر حور سامنے سے نکل جائے، تو ناگوار گذرے۔ حور بھی کوئی شے ہے۔

آزاد۔ ہمارے مرنے کے بعد کیا کرنے آئی ہو، مگر خیر شکر ہے۔ اس قدر توفیق ہوئی کہ بعد مرگ تو مرقد پر آئیں۔

سر مزار پئے سیر لالہ زار آمد | طپیدن دلِ پُرخون نا بکار آمد

نشد چو کس دم مرگم کفیل گور و کفن
دل ستم زدہ نالاں ز کوئے یار آمد

حسن آرا۔ دیکھو آزاد ایسی باتیں کروگے تو میرا دم نکل جائے گا۔

آزاد۔ یہ فقرہ بازی رہنے دو۔ تم جاکے جوان فقیروں سے تخلیے میں باتیں کرو۔ آزاد کی فکر کیوں ہوگی۔

حسن آرا۔ ہائے (زور سے) ہائے آزاد یہ بدگمانی !!!

آزاد۔ بس دیکھی تیری کالپی اور باون پُرے اُجاڑ۔ میں اب تک تمہارے خیالات کا ادب کرتا تھا۔ مگر بس دیکھ لیا۔ ؎

من فدائے ایں تمکین کز ادب بگوئی اُو
نیست صید بسمل را رخصت طپیدن ہا

حسن۔ اتنا تو پوچھا ہوتا کہ تمہارا حال کیسا ہے۔

آزاد۔ مجھ سے تو دریافت کیا ہوتا کہ تجھ پر کیسی گذری۔

چہ پیش آمد ترا وحال چونست　　　　مگر صحرانوردی از جنوں ست

جدا چوں گشتی از یاران غمخوار

چرائی ہم چو مجنوں سر بہ کہسار

حسن آرا۔ تو گھوڑے سے اترو۔ تم آسمان پر ہم زمین پہ۔ آزاد بسم اللہ کہہ کر گھوڑے سے اترے، مگر گھوڑے سے اترتے ہی کیا دیکھتی ہیں، کہ وہ اونٹ بن گیا۔

راوی۔ واہ رے شتر غمزے۔ اب کہیں میاں آزاد نہ بلبلانے لگیں۔

خیر۔ آزاد نے کہا پیاری حسن آرا، میں نے تمہارے حکم سے سر کٹایا ہے۔ گو اس دنیا میں اس قدر خوش قسمت نہ تھا، کہ بغل گرم ہوتی۔ مگر یہ خوشی کیا کم ہے کہ بہشت میں تم ہم آغوش ہوگی۔ (حسن) آزاد میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اچھا تم سے مجھ سے پہلے پہلے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے کیا کہا تھا تم نے کیا کہا تھا۔

آزاد۔ اللہ رے امتحان۔ پہلے بھی امتحان لیا تھا۔ اور اب بھی لیتی ہو۔ اس مصرع کا دوسرا مصرع موزوں کرنے کا حکم تھا۔

شبِ چو آمد ماہِ ما بر بام ما

میں نے جواب دیا تھا وہ فرمائیے۔ شہسوار کا مصرع بھی مجھے یاد ہے۔

حسن آرا۔ تم ہی بتاؤ یہ سوال مجھ سے یا تم سے۔

آزاد۔ شہسوار نے کہا تھا۔

شب چو آمد ماہِ ما بر بام ما

پُرشد از جوہر دل جامِ ما

میں نے اُس پر اعتراض جمایا۔ میں نے کہا شراب کو شعرائے گرانمایہ، اور فصحائے بلند پایہ، نے جوہر روح باندھا ہے۔ جوہر دل نیا محاورہ ہے۔ چنانچہ لسان الغیب حافظ شیراز کا شعر بھی بطریق حال پڑھا۔

بدہ ساقی آں جوہرِ روح را

دوائے دلِ ریش مجروح را

اور پھر میں نے اس مصرع پر دوسرا مصرع یوں لگایا۔

شب چو آمد ماہِ ما بر بام ما

خندہ زد بر صبح روشن شام ما

حسن آرا۔ ہاں صحیح ہے۔ بھلا مُردے کو کہیں حافظہ بھی ہوتا ہے۔ تم جھوٹ کہتے ہو کہ میاں نے سر کٹایا اور یہ اور وہ یہ سب میرے چھیڑنے کی باتیں ہیں۔

آزاد۔ مُردے کہیں بولا بھی کئے ہیں۔ اچھا بتاؤ ہم سے کون تاریخ پوچھی ہے۔ کس کی شادی کی تاریخ پوچھی تھی میں نے۔

حسن آرا۔ پیرِ نابالغ۔ بارہ سو چھیانوے عدد اس کے ہوئے۔

آزاد۔ وہ وقت مجھے خوب یاد ہے۔ جب پردہ گر پڑا تھا۔ اور سپہر آرا دم کے دم میں چمک دمک کر ایک ہی ذَقن میں نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ مگر حضور ذرا نستعلیق پن سے بھاگی نہیں۔ سپہر آرا نے جھلا کر کہا۔ اے اللہ کرے اس ہوا کو آگ لگے۔ اس پر ٹپکی پڑے۔ اور میں نے یہ شعر بھی پڑھا تھا۔ ؎

کس کا حجاب کس کی حیا، اور کہاں کی شرم

پردے سے ہاتھ ہاتھ سے پردہ اٹھائیے

تم دونوں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہائے دیکھتے ہی دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ تڑپنے لگا۔ حواس بر جانہ تھے۔ بھوک پیاس بند ہو گئی۔ مگر مجھے تعجب ہوا کہ بہو بیٹیوں میں اس آزادی کے ساتھ میری رسائی کیوں کر ہوئی۔ ملاح نے مجھے بڑی مدد دی۔ ورنہ میں کچھ نہ کر سکتا۔ ظاہر میں تو جھڑکتے تھے کہ یہ کیا کچھ گڑیا گڈوں کا بیاہ ہے۔ ذرا جلد بازی نہ کرنا۔ میاں گبرو، دل میں خوش تھے۔ کہ مطلب برآری ہوگی۔ اشارے سے کہتے جاتے تھے کہ ہاں خبردار جو چُوکے۔ یہی موقع ہے۔ ہم بھی شیر ہو گئے۔

حسن آرا۔ ہمایوں کا حال بتاؤ۔ زندہ ہیں یا مر گئے۔

راوی۔ اَب بہکنے لگیں آپ۔ خدا ہی خیر کرے۔

آزاد۔ بس ایک پہاڑ نظر آیا، مگر حُسن آرا میری جان تمہاری ہی بدولت نکلی۔ ازماست کہ برماست۔ اب کیا کیا جائے کمال افسوس کا مقام ہے۔ عین اٹھتی جوانی میں، عین عنفوانِ شباب میں میں نے قضا کی۔ اور تم نے اُف تک نہ کی افسوس۔ ؎

نجویم دست و تیغ آلود جاناں	بد آموزاں وکیل بی زباناں
چگویم در سپاس بے کسی ہا	زہے نا مہربانِ مہرباناں

دم مُردن چو پیر شکم تنگ گیرد

فراخی ہائے عیش سخت جاناں

حُسن آرا۔ اب مجھ سے صاف صاف کہہ دو کہ تم ہو کیسے۔ دنیا میں ہو یا نہیں ہو۔ اگر ہو تو خدارا اب کہیں

نہ جاؤ اور نہیں ہو تو صاف صاف بتاؤ۔ میں بھی وہیں آؤں جہاں تم ہو۔

آزاد۔ حسن آرا گو یہ خواب ہے، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ میں مر گیا، پلونا کی لڑائی میں میں نے ایک گولی کھائی اور اس گولی نے جان لی۔ افسوس۔

بر لبِ زہرۂ نوا پرواز
نغمۂ عنبر از فغاں خواہم

حسن آرا نے بہ لجاجت و منت و سماجت کہا کہ بس اب میں صرف ایک بوسے کی طالب ہوں۔ اگر مرضی اور رائے ہو تو میری تمنا کا خون اپنی گردن پر نہ لو۔ مجھے ہنسی خوشی بوسے لینے دو۔ ورنہ اختیار ہے۔ بوسہ لینے دو گے تو جان شیریں تلخی کے ساتھ نہ نکلے گی۔ مرتے وقت آرام ملے گا۔ نہ دو گے تو تلخ کامی سے مروں گی۔ میری زندگی محال ہے۔ جینی بچوں یہ معلوم۔ مگر وقت نزع اور دم واپسیں میرا خوش کرنا تمہارے ہاتھ ہے۔

آزاد کا دل بھر آیا۔ آہ سرد کھینچ کر کہنے کو تھے مگر فرطِ غم سے زبان بند ہو گئی۔ حسن آرا نے بیتاب ہو کر گلِ رخسار اور چاہِ ذقن اور چشم و ابرو کے کئی بوسے متواتر لیے۔ اور چونکہ آنکھوں سے اشکِ اضطراب فروش اُمڈے آتے تھے۔ آزاد کے دامن اور لباس اور رُخ و ابرو پر قطرہ ہائے سرشک ٹپ ٹپ گرتے جاتے تھے آزاد نے جب اُس نگارِ رنگیں ادا کی یہ سراسیمگی اور بے قراری دیکھی تو بولنے سے منع نہ کیا۔

حُسن۔ تم اسی کو بڑا احسان سمجھتے ہو گے کہ میں جو بوسے لے رہی ہوں تو تم خاموش کھڑے ہو جھٹک نہیں دیتے۔ مگر میں یہ سوچتی ہوں کہ ملے تو دمِ واپسیں۔ دیدار بھی نصیب ہوا تو آخری وقت۔

تپ ہجر سے حال تھا میرا بُرا کہ وصال ہوا نہ وصال ہوا
نہ تو میں ہی رہا نہ مرض وہ رہا اُسی عیسیٰ کے دستِ شفا کی قسم

آزاد۔ غنیمت جانو اور شکر بھیجو، کہ بوسے تو نصیب ہو گئے۔

حُسن۔ (متواتر بوسے لے کر) الٰہی یہ اس وقت میں ہوں کہاں۔

آزاد۔ اس وقت بڑی خوش قسمت، خوش نصیب، خوش طالع ہو۔

حُسن۔ خوش نصیب تو اپنے کو تب سمجھوں جب مراد بر آئے۔

قانع بہ تجلی نشود شائقِ دیدار
پروانۂ مہتاب تسلی نتواند کرد

آزاد۔ اللہ اللہ کس قدر سختیاں تمہارے سبب سے میں نے اٹھائیں۔

حُسن۔ اور ہم نے جو رنج سہے وہ کسی شمار قطار ہی میں نہیں۔

آزاد۔ کیا تم بھی کسی جنگ پر گئی تھیں تمہاری جان بھی معرضِ خطر میں تھی۔ تم کو بھی کسی نے قید کیا تھا۔ تم بھی پہاڑوں پہ گولیاں کھا کھا کے مجروح ہوئی تھیں۔ تم اپنی چار دیواری میں مزے سے بیٹھی ہو، تم درویش کے پاس جاؤ۔ تم کو اس سے کیا واسطہ کہ آزاد کون ہے، اور کہاں ہے۔ مرے چاہے جئے۔

حسن۔ ہماری تباہی کا حال ناگفتہ بہ، مگر تم سے جب کوئی بیان کرے تب تو سنو اور جب سنو تب تو کوئی بیان کرے۔ یہاں تو آہ بھی اچھی طرح نہیں نکل سکتی۔ ضعف کی بھی کوئی حد ہے۔ الاماں الاماں۔

کب پہونچی آہ ضعف سے گوشِ بتاں تلک
سو جا ٹھہر کے سینے سے آئی زباں تلک

آزاد۔ اب بندہ وہ آزاد ہی نہیں، تم نے بیوفائی کی۔

حسن۔ ہائے ہائے۔ ایسی توتے کی طرح آنکھیں بدلی ہیں۔

ہم بھی کشتہ تری نیرنگی کے، ہیں یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

آزاد۔ حسن آرا، اگر تم کو ذرا بھی میری محبت ہوتی تو۔

حسن۔ (گریۂ وزاری کرکے) بس آزاد بس۔ خدارا اب کچھ نہ کہو۔ تم کو میری محبت کا اس قدر شک ہے۔ کہ تم سمجھتے ہو مجھے ذرا بھی تمہارا پیار نہیں۔ ہائے کس سے کہوں۔ آفریں نہیں کہتے کہ اب تک تمہارے نام پر یوں ہی بیٹھی ہوں۔

ہم ازل سے انتظارِ یار میں سوئے نہیں
آفریں کہیے ہمارے دیدۂ بیدار پر

آزاد۔ میدانِ جنگ۔ توپ و تفنگ۔ دن کو معرکۂ رستخیز، شب کو ہنگامِ ستیزہ کی زمین خون سے لالہ زار۔ گولوں کی بارش، گولیوں کی بوچھار، فرس کی بے قراری۔ آتوابِ اژدر وہاں کی شرر باری۔ گھوڑے گولیاں کھا کھا کے ہنہناتے تھے۔ طاؤس طناز کی چھب ہا، دکھاتے تھے۔ آبدار تلواروں کی چمک۔ لیس دار وردیوں کی جھلک۔ اور تیرا آزاد شمشیرِ برہنہ ہاتھ میں لیے حسن آرا کا حکم بجا لاتا تھا۔ زخم پر زخم کھاتا تھا۔ مگر غنیم کو پشت نہیں دکھاتا تھا۔ بڑھ بڑھ کے ہاتھ لگاتا تھا۔

معرکہ پڑتے ہی اٹھ جائیں گے غیروں کے قدم
جب سمجھنا ہو سمجھ لیں سرِ میداں ہم سے

یہ شعر میرے حسبِ حال تھا۔ مگر افسوس صد افسوس، کہ جس کے واسطے یہ سب پاپڑ بیلے، وہی اپنا

نہ ہوا۔ شومی طالع وادریغا۔

زجوشِ آتشِ غم شعلہ افشاں شد چراغِ من
خدایا بردلم رحمے کہ خوں گردید داغِ من

حُسن۔ آزاد۔ جو میرے امکان میں تھا اس سے میں نے بھی دریغ نہیں کیا۔ آزاد میں بھی دو بار تیرے سبب سے جان کھو چکی تھی۔ اعزہ اقربا سب مایوس ہو چلے تھے۔ یہاں تک کہ تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مگر مجھے تو یہ دن دیکھنا تھا۔ کہ آزاد سا مہربان، آزاد سا عاشق، مجھے بیوفا کہے۔ خیر۔ اس میں کسی کا کیا چارہ ہے۔ جو کچھ خدا نے دکھایا، وہ دیکھا۔ اب اور جو کچھ دکھائے گا وہ دیکھوں گی۔ جس طرح میں نے اب تک بسر کی خدا دشمن کو بھی نہ نصیب کرے۔

کس طرح کٹتی ہیں راتیں کس طرح کٹتے ہیں دن
میری حالت گر وُہ بدخو دیکھتا روتا ضرور

آزاد۔ چلو اب تو جھگڑا ہی نہ رہا۔ اب تو فراغت ہی ہوگئی۔

حُسن۔ ہے ہے میں یہ باتیں سُن کر رہوں ہائے کس سے حالِ دل کہوں۔ دلدار دلبر تو میری صورت ہی سے بیزار ہے۔ اب کہاں تک ماجرائے دل بیان کروں۔ طاقت گویائی نے صاف جواب دے دیا۔

چلتی نہیں زبان بھی اب اس کی کیا کرے
آتا ہے ہر سخن پہ ترے ناتواں کو غش

آزاد۔ لیلے و مجنوں، شیریں و فرہاد، کی طرح ہمارے تمہارے عشق کا حال بھی زبان زد خلائق ہوگا۔ مگر تمہاری بے وفائی اور کج ادائی سے ہمارا خود نام بد ہوگا۔ خیر جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔

ہوا جو کچھ کہ ہوا بس گذشتہ راہ صلواۃ
کہاں تلک کوئی رویا کرے گلہ دل کا

حُسن۔ دل سوختوں کو جلانے سے کیا فائدہ ہے آزاد۔

آزاد۔ خود ہی دل جلاؤ اور خود ہی دل سوختہ بنو۔ واہ

حُسن۔ اگر ہم نے جلایا ہو، تو خدا ہم کو جلائے۔ بس اور کیا قبر میں بھی یہ خیال درد انگیز میٹھی نیند نہ سونے دے گا۔ کہ آزاد نے ہمیں بیوفا کہا۔

درد نے رنج والم نے غم تنہائی نے
قبر میں بھی انھیں دو چار نے سونے نہ دیا

آزاد۔ ہائے اگر زندہ ہوتا۔ یا خدا ایک دن کے لیے بھی زندگی دیتا تو وصیت کر جاتا کہ خبردار عشق سے منزلوں دور رہنا۔ اس کا آغاز خراب، انجام انتہا سے زیادہ خراب۔ اوائل میں انسان دل کو ڈھارس دیتا ہے کہ صنم مراد سے ہم آغوش ہوں گے۔ مگر یہ خیر صلاح ہے۔ صرف خیال ہی خیال ہے۔

اَلایَا اَیُّہَا السَّاقِیُ اَدِر کاساً وَنَاوِلہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مُشکلہا

یہ سُن کر حُسن آرا نے فرطِ اشتیاق و وفورِ بیتابی و جوشِ بحرِ جنوں سے آزاد کو بے دھڑک چھاتی سے لگایا اور بوسہ لینے ہی کو تھی کہ آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ بستر اور تکیہ اشکوں سے تر ہے۔ روتے روتے یہ غزل آہستہ آہستہ لیٹے لیٹے پڑھنے لگی۔

آنکھیں دکھلا کے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات اس فتنۂ بیدار نے سونے نہ دیا

اپنی آنکھوں میں کھٹکتا رہا کانٹے کی طرح
مجھ کو اس میرے تنِ زار نے سونے نہ دیا

طور پر برق کی مانند میں تڑپا شبِ ہجر
ایک دم حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

یاد دلوا کے مجھے یار تری آنکھوں کی
باغ میں نرگسِ بیمار نے سونے نہ دیا

نگہ و ابرو و مژگاں نے ترے کاہش کی
تیر نے برچھی نے تلوار نے سونے نہ دیا

خواب میں بھی نہ ہوا اُس ماہ کا تا وصل نصیب
اس لیے چرخِ ستمگار نے سونے نہ دیا

موت بھی ہجر کی شب روتی رہی عیسیٰ بھی
ایک مجھ کو دلِ بیمار نے سونے نہ دیا

اس کی آنکھوں کے تصور نے اُڑا دی مری نیند
اپنے بیمار کو بیمار نے سونے نہ دیا

مُغلانی۔ حضور کیا طبیعت خدانخواستہ ابھی بے لُطف ہے۔

حُسن۔ نہیں۔ کیوں۔ طبیعت وُہ طبیعت نہیں ہے جو بے لُطف ہو، یہ بے حیا طبیعتیں ہیں، ورنہ اب تک مرض تو مرض، مرض کی جڑ ہی باقی نہ رہتی۔

میں نزع میں تھا۔ بلوا نہ سکا کوئی مجھے واں پہونچا نہ سکا
وہ آ نہ سکا، میں جا نہ سکا، یہ بھی نہ ہوا۔ وہ بھی نہ ہوا

مُغلانی۔ لونڈی کی طبیعت گھبراتی ہے، اور الجھن ہوتی ہے۔

حُسن۔ بس میری بھی یہی کیفیت ہے۔ بعینہٖ یہی حال ہے۔

مہری۔ سرکار منہ دھو ڈالیں، تو ذری طبیعت ہلکی ہو جائے۔

حسن ۔ کیسا منہ اور کس کی طبیعت اُلٹی ہو گئی۔

قبر میں جن کو نہ سونا تھا۔ سُلایا اُن کو
پر مجھے چرخ ستمگار نے سونے نہ دیا

اتنے میں روح افزا، اور گیتی آرا کو خبر ہوئی کہ حسن آرا بیگم بیدار ہوئی ہیں۔ دونوں کمرے میں آئیں، دیکھا تو آنکھیں پُرنم اور خون کبوتر کی سی سُرخ۔ گھبرائیں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ روح افزا نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ گیتی آرا نے مہری کو حکم دیا پنکھا جھلو۔

روح ۔ بہن سونے سے ذرا طبیعت تو ہلکی ہوئی ہو گی۔ خود جاگیں یا کسی نے جگا دیا۔ کتنی دیر ہوئی۔

حسن ۔ گلے لگاتے ہی آنکھ کھٹ سے کھل گئی۔ ہائے ہائے۔

روح ۔ کیسا گلے لگاتے ہی۔ کس کو گلے لگاتے۔؟

حسن ۔ بڑے شکوے بڑے شکایتیں۔ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ ؎

یار اگر آتا نہیں تو ہی شب فرقت میں آ
اے اجل تو نے بھی کیا ہم کو بھلایا یاد سے

روح ۔ مجھے وحشت ہوتی ہے۔ یہ تم کہہ کیا رہی ہو۔

حسن ۔ تمہیں وحشت مجھے جنون۔ جنون اور وحشی کا ساتھ کیا۔ دونوں قریب قریب ایک سے، مگر یا اللہ میں نے کیا کیا جو اس قدر بد دماغ پایا۔

گیتی آرا۔ حسن آرا یہ بہکتی کیوں ہو۔ نصیب دشمناں ہذیان کی سی کیفیت ہے۔ ہوش کی سی باتیں کرو بہن۔ اٹھ بیٹھو منہ اچھی طرح سے دھو ڈالو۔

حسن ۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ تو جی میں جی آئے۔

روح ۔ مہری۔ جا کے تھوڑا سا جواہر مہرہ، شربتِ انار میں ملا کر لے آؤ۔ برف ڈال کے مگر کیوڑہ الگ لانا۔ مہری نے حکم کی تعمیل کی داروغہ سے جواہر مہرہ شربت کیوڑہ لیا۔ برف ڈالی۔ چاندی کے کٹورہ میں شربت لائی۔ کیوڑہ اور آب شیریں ملایا۔ جب کٹورہ خوب ٹھنڈا ہوا، تو رومال اٹھا کر حُسن آرا کو پلایا۔

حسن ۔ دل کو ذرا تسکین ہوئی۔ ورنہ قلب کا عجب حال تھا۔

روح ۔ اب منہ بھی دھو ڈالو۔ لگے ہاتھوں۔ لاؤ پانی۔

حسن ۔ (منہ دھو کر) آنکھیں اس طرح جل رہی تھیں۔ جیسے تنور۔ پنکھا زور زور سے جھلو جس میں خوب ٹھنڈک ہو۔

روح۔ اب تم لیٹ رہو، اور لیٹے لیٹے ہی باتیں کرو۔
حسن۔ کسی پہلو چین بھی آئے جب لیٹے گون، اور باتیں کیا کروں، جب دل ہی قابو میں نہیں۔ تو لیٹنے سے کیا آرام ہوگا۔

یار نامِ خدا ہے کشتی میں
ناخدا آج پار بیڑا ہے

کہیں جہاز کے داخل ہونے کی خبر سنوں تو جی اٹھوں۔
روح۔ سنوگی سنوگی۔ تار آہی گیا ہے۔ پھر گھبراہٹ کا ہے کی ہے۔ بیڑا پار ہی ہو جائے گا۔ اللہ بڑا مُسبّبُ الاسباب ہے۔
گیتی۔ ہم سمجھے تھے سونے سے ذری چین ملے گا۔ آرام ہوگا۔ مگر ویسی کی ویسی۔ حُسن آرا دل کو ڈھارس دو۔ خدا کے لیے ذرا دل کو مضبوط رکھو۔ ایسی فہمیدہ ہو کے یہ باتیں۔ بہار النسار اور بڑی بیگم نے جو سنا کہ جواہر مُہرہ، اور شربت انار اور برف اور کیوڑہ کی اوپر ضرورت ہے تو گھبرائیں۔ بہار النسار جھپٹ کر کوٹھے پر گئیں۔ پیچھے پیچھے بڑی بیگم بھی جریب ٹیکتی ہوئی پہونچیں۔ گو حُسن آرا کو شربت پینے سے کسی قدر سکون ہوا تھا، مگر پھر بے چین تھی۔ بہار النسار نے پیشانی اور سر پہ ہاتھ رکھا۔ اور پلنگڑی پر بیٹھ کر یوں ہم کلام ہوئیں۔
بہار۔ کیوں طبیعت کیسی ہے۔ کچھ حال تو کہو۔
حُسن۔ قلب پر گرمی سی معلوم ہوتی تھی۔ مگر جب سے انار کا شربت کیوڑہ، اور پانی اور برف ملا کے پیا۔ تب سے کسی قدر سکون ہے۔ اور جواہر مہرہ بھی تھا۔
بڑی بیگم۔ (بیٹھ کر) آخر یہ قلب پر گرمی کیوں ہے۔ اس کی بات کا بُرا نہ مانو۔ سمجھ تو گئی ہو کہ بد وضع آدمی ہے۔ بس پھر کیا۔
حُسن۔ نہیں اماں جان ہم نے ایک خواب دیکھا ہے جس نے ہمیں بہت ہی پریشان کر دیا۔ میں لیٹی لیٹی خدا جانے کیا سوچ رہی ہوں۔ اماں جان کے قدموں کی قسم بڑی کوشش کرتی ہوں۔ کہ طبیعت بہلاؤں، مگر نہیں بہلتی۔ اب اس کا علاج کیا کروں۔
بڑی بیگم۔ کوئی کتاب پڑھو۔ دو گھڑی سیرِ باغ کو جاؤ۔ جوڑی تیار کرا کے ہوا کھا آؤ۔ شطرنج کھیلو۔ گنجفہ کھیلو۔ یہی ترکیبیں دل بہلانے کی ہیں۔
روح افزا۔ ہم بتائیں۔ نازک ادا کو بُلوا لیجئے تو خوب بات ہے۔

بڑی بیگم تشفی دے کے چلی گئیں۔ ادھر فنس اور دو سپاہی لے کر دو مہریاں نازک ادا بیگم کے ہاں پہونچیں۔ اس نے پیغام کہا فنس پر سوار کرایا۔ اور روانہ ہوئیں۔ کھٹ سے فنس داخل۔

یہ وہی نازک ادا بیگم ہیں۔ جنہوں نے ثریا بیگم کے میاں، نواب سنجر صولت کو انگلیوں پر نچایا۔ اور فیضن، کو بنایا تھا۔ نازک ادا بیگم فنس سے اتریں، اترتے ہی پوچھا۔ روح افزا بہن کہاں ہیں۔ روح افزا سے اور اُن سے بہن بنتی تھی۔ کوٹھے پہ آئیں۔

نازک۔ آج بے وقت کی طلبی کیسی ہے۔ صاحب کیا حکم ہے۔

روح۔ برسوں شکل ہی نہ دکھائی ہو۔ واہ ری مروّت۔

نازک۔ ہم کچھ دن سے مرزا صاحب کے ہاں تھے۔ ان کی لڑکی کا نکاح تھا۔ کئی دن تک جشن رہا وہاں۔ اور اب چھٹی ہوئی جاکے۔

روح۔ مرزا صاحب کون، اے وہ توڑی والے کے بھائی۔

نازک۔ ہاں ہاں وہی زینے کے پاس مکان ہے جن کا۔

گیتی۔ اُن کی لڑکی کہاں ہے۔ حشمت بہو کی تو شادی ہو ہی گئی ہے۔ ان کی لڑکی کون سی ہے۔ شاید ہو۔

نازک۔ انہوں نے اپنی لڑکی ثریا بیگم اپنی چچی کے گود بٹھائی تھی۔ تو لڑکی کو یہ وہاں سے لے آئیں۔

روح۔ سن کیا ہے۔ ہوگی کوئی تیرہ چودہ برس کی۔

نازک۔ نہیں بہن۔ خاصی سیانی ہے۔ حُسن آرا سے دو ایک برس بڑی ہی ہوگی۔ بلکہ تین چار برس بڑی ہو تو عجب نہیں۔ حُسن آرا کیوں کیسی ہو تم۔

حسن۔ (آہستہ سے) اچھی ہوں۔ آپ کا مزاج شریف۔

نازک۔ شکر ہے بہن۔ دعا کرتے ہیں۔ مبارک ہو بہن۔

حسن۔ ہاں بزرگوں کی دعا سے سپہر آرا بچ گئی۔ خدا اُس کا سہاگ قائم اور برقرار رکھے۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔

نازک۔ مگر اللہ برتر جانتا ہے، کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا۔ ایسا آج تک کبھی ہوا ہی نہیں۔ کسی نے سُنا ہی نہ تھا۔ چلو جو ہوا اچھا ہوا۔ مگر درویش کی تو بندی معتقد نہیں۔

اس بوریا نشین کا دلا میں مُرید ہوں
جس کے ریاضِ زہد میں بوئے ریا نہ ہو

حسن۔ کیا معلوم کون فقیر اچھا ہے۔ کون بُرا ہے۔ ہم کو تو فقیروں اور درویشوں کا ذرا عقیدہ نہیں، دل کی صفائی سے بڑھ کر کوئی زہد نہیں۔ اور اس کا حاصل ہونا دل لگی نہیں ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر ست

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر ست

نازک۔ آخر تم اس وقت ہو کیسی، اے روح افزا بتاؤ تو بہن کیسی ہیں کیسی۔ اس وقت کچھ سُست سی معلوم ہوتی ہیں۔

رُوح۔ ہاں کچھ طبیعت سُست ہے۔ تم ذرا دل بہلاؤ۔

نازک۔ دیکھو دو ایک شعر سنو۔

بتے دارم از اہل دل رم گرفتہ — بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

رگِ غمزہ از نیشِ مژگاں کشودہ — سرفتنہ و زلفِ پُر خم گرفتہ

برخسار و عرض گلستان ربودہ — بہ ہنگامۂ عرض جہنّم گرفتہ

فسوں خواندۂ کار عیسےٰ نمودہ

پری بودہ و جام از جسم گرفتہ

حُسن۔ ہم کو تو اپنے بخت واژگوں سے شکایت ہے۔ شعر بھی ویسے ہی یاد ہیں۔ جو بات ہوئی پوری ہے۔ اپنی ناکامی کے صدقے افسوس صد افسوس۔

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے — ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

میری ایذا کے لیے مُردے میں جان آتی ہے

کاٹنے دوڑتی ہے ماہی بے آب مجھے

نازک۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ (اور روح افزا کے کان میں) کیا کہیں گھائل ہوئی ہیں۔ کسی کے تیر نگہ نے زخمی کر دیا، مگر کھلم کھلا اس کا اظہار کیا۔ اگر وہ بھی راضی ہے، تو نکاح کر دو، اگر نہیں راضی ہے تو مجبوری ہے بس بات ساری یہ ہے، اور اس طرح علانیہ اظہار کرنا تو اچھی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حُسن آرا نے یہ شعر پڑھا۔

ابر اشک بار و ما خجل از ناگریستن

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

نازک ادا نے حُسن آرا کے قریب جا کر کہا۔ بہن یہ بڑی بُری بات ہے، جو کچھ ہو دل میں رکھو، ہجولیوں سے کہو

مجھے مطلع کرو۔ ع

درماں ہے کہ دردِ لادوا ہے

اگر لادوا ہے، تو دل کو مضبوط کرو۔ شریفوں میں یہ باتیں کب جائز ہیں۔ ہم نے آج تک کسی شریف زادی کا یہ حال نہیں سُنا۔ کیا انوکھی تمہیں کنواری ہو۔ میں نہ کہتی مگر مجھے ڈر کا ہے کا۔ میں تو کہوں اپنے باپ سے مانو تو واہ واہ نہ مانو، تو واہ واہ۔ ہمارا کام صلاح دینا ہے۔ چاہے عمل کرو چاہے نہ کرو۔ اور تم تو اللہ کی عنایت سے پڑھی لکھی ہو، فہمیدہ ہو۔ تم سے ان باتوں کا سرزد ہونا تعجب کی بات ہے۔ اٹھ بیٹھو، باتیں کرو۔ واہ واہ۔

نازک ادا نے حُسن آرا کو خوب آڑے ہاتھوں لیا پہلے تو کچھ دیر تک حُسن آرا ٹالتی گئی مگر آخر کار مجبور ہو کر جواب دے دیا۔

حسن۔ (بے پروائی کے ساتھ)۔

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

نازک۔ یہ باتیں کچھ دیوانِ حافظ ہی کی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کالے پانی کی بھی لسان الغیب نے تعریف کی تھی۔ پھر پینا شروع کرو۔ ے

بیار بادہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

پھر اس سے کیا ہوتا ہے۔

ما مریداں رو بسوئے کعبہ چوں آریم چوں
رُو بسوئے خانۂ خمار دارد پیر ما

اب کیا کوئی کعبے کو نہ مانے گا کہ حافظ یوں ہی لکھ گئے۔

حُسن۔ میں بحث نہیں کرنا چاہتی۔

جنونے کو کہ از قیدِ خرد بیروں کشم پارا
کنم زنجیر پائے خویشتن دامان صحرا را

نازک۔ تم بحث کر نہیں سکتیں۔ بحث کیا کرو گی بھلا۔

حسن۔ اچھا یوں ہی سہی۔ ے

من وانکارزمی ایں چہ حکایت باشد
غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد

نازک۔ یہ نکمی بات ہے اس سے پرہیز کرو بہن۔
حسن۔ (افسردگی کے ساتھ)

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہوش وہواس ٹھکانے نہیں ہیں۔
نازک۔ ہوش کی دوا کرو، بھلے مانس کے ہاں پیدا ہو کے ایسی باتیں کب زیبا ہیں۔ ایک انوکھی یہی تو ہیں بس۔
حسن۔ اور دل دکھتا ہے۔ ا[illegible] توں بے فائدہ۔
رُوح۔ (نازک ادا کے کان میں) [illegible] نہ کہو بہن۔
نازک۔ یہ کیوں۔ یہ کیوں۔ ہم تو کہیں بھلے باپ سے۔

با صاف دل مجادلہ با خویش دشمنی ست
ہر کو کشد بر آئینہ خنجر بخود کشد

رُوح۔ مجادلہ کیسا۔ تسلی دینی چاہیئے؟ صفا ہونا چاہیئے۔
نازک۔ اے تو بہن تسلی کس بات کی دوں۔
گیتی۔ چلو باغ کی سیر کریں۔ اُٹھو حسن آرا۔
حسن۔ دور ہی سے سلام ہے۔ ہم اب کہیں نہ جائیں گے۔
گیتی آرا نے اشارے سے کہا کہ تم جو کہتی ہو وہی کہے جانا۔ نازک ادا نے کچھ سوال کرنا شروع کیے۔
نازک۔ نکاح تم سے ہو گیا ہے۔ یا ابھی نہیں ہوا۔
حسن۔ ابھی نہیں۔ کس کا نکاح۔ ہائے افسوس۔

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغ آشنائی را

مگر کوئی کیا جانتا ہے، کہ انجام کیا ہوگا۔
نازک۔ یہی معلوم ہو تو پھر کیا ہے۔

حسن۔ بات ٹالنے کے لیے۔

بایدزمی ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند | آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند
لفظے ہم از حکایت شیریں شمردہ ایم | آں قصۂ شکر کہ بہ پرویز گفتہ اند
خون ریختن بکوئے تو کردار چشم بلاست | مردم ترا برائے چہ خوں ریز گفتہ اند
بشگفتہ دل زیاد توگوئی دروغ بود | از نو بہار انچہ بہ پائیز گفتہ اند

غالب ترا بہ دیر مسلماں شمردہ اند
آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

نازک۔ ہاں خیر۔ شعر پڑھو۔ باتیں کرو۔ ہنسو بولو۔
حسن۔ ہنسو بولو۔ بولنے میں کیا ہرج ہے، مگر ہنسے کون۔
گیتی۔ ہنسو تم اور روئیں تمہارے دشمن۔
حسن۔ (آہستہ سے)۔

دو چیز طرۂ عقل ست دم فرو بستن
بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

ہمارے لیے مصلحت یہی ہے، کہ اب اس وقت سے سکوت اختیار کریں۔

نازک۔ واہ وا۔ کیا اچھی مصلحت ہے۔

ہے بس کہ کلام میرا مشکل اے دل | سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

یہ رُباعی حضرت غالب دہلوی کی ہے۔
حسن۔ ہمیں معلوم ہے مگر۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ یہ مصرع اچھا ہے اور خوب آیا۔ رباعی کا چوتھا مصرع جانِ رُباعی ہے۔
نازک ادا۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ تمہارے حسبِ حال ہے۔
حسن۔ ہم کو ہر طرح کی مشکل ہی مشکل ہے۔
اتنے میں استانی جی ادپر آئیں۔ کیا تم نے کچھ سنا آج غضب ہوگیا۔ صاحب نے جو حکم دیا تھا کہ مرزا ہمایوں فر کی لاش کھودی جائے، اس کی نسبت آج سخت تاکید کی گئی۔ اُدھر مزدور قبر کی طرف چلے۔

اِدھر ہمایوں فر بھاگ گئے۔ اب ان کا پتہ ہی نہیں ہے۔ مگر سپہر آرا سے کہلا بھیجا تھا کہ کچھ فکر نہ کرنا۔

اتنے میں مَلّاح یعنی پیر مرد نے آن کے کہا۔ حُسن آرا بیگم ذرا فال تو دیکھو۔ سپہر آرا بہت گھبرا رہی ہیں گو ہونا کچھ نہیں ہے، مگر تشویش تو ہوگی۔ روح افزا بولی، یہ فال کی قائل کب ہیں۔ فال اس سے دکھلاؤ جو فال کی معتقد ہو۔

حُسن۔ (اُستانی جی سے آہستہ آہستہ) یہ بات کیا ہے۔

اُستانی۔ گھبراؤ نہیں۔ سپہر آرا نے مجھ سے کہہ دیا ہے۔

حُسن۔ اللہ اللہ۔ اب ہم ایسے غیر ہو گئے کہ ہم سے کچھ بیان ہی نہ کیا جائے گا۔ خیر۔

اُستانی۔ اے نہیں صاحبزادی مگر۔

همه کارم ز خود کامی به بدنامی کشید آخر!
نهاں کے ماند آں رازی کز و سازند محفل ہا

حُسن۔ ہمایوں فر کہاں چل دیے اور کیوں گئے۔

استانی۔ یہی تو بھید نہیں کھلتا۔ یہی تو راز سر بستہ ہے۔

حُسن۔ مگر قبر کا کھُدنا تو غضب ہے۔ ہماری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی، کہ یہ موت کیسی تھی، اور یہ زندگی کیسی، اور دوبارہ زندہ ہونا کیا معنیٰ۔

استانی۔ اُنّاہ اس پھیر میں نہ پڑو۔ ع

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

حُسن۔ نہیں اُستانی جی صاف صاف بتاؤ۔ یہ کیا بات ہے۔

استانی۔ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے۔

حُسن۔ ہم نے آج ایسا پریشان خواب دیکھا، کہ خدا نہ کسی کو دکھائے، ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ اور آپ نے یہ خبر اور آن کے سنائی۔ میں مہری کو سپہر آرا کے یہاں بھیجے دیتی ہوں۔

استانی۔ وہاں چوکی پہرا ہے۔ کوئی جانے ہی نہیں پاتا۔

حُسن۔ یا اللہ۔ گھر سے کسی کو بھیجو۔ عسکری بھائی کو بلاؤ۔ کہو خدارا ذرا چلے جاؤ۔

محمد عسکری نے جو خبر پائی کہ حُسن آرا بیگم بلاتی ہیں، تو کھِل گئے۔ ریشہ خطمی ہو گئے۔ کپڑے پہن کر برآمد ہوئے، وہی گل بدن کا ڈھیلے پائینچوں کا پائجامہ۔ شربتی کا چُنا ہوا انگرکھا۔ گول چوگوشیہ ٹوپی۔ سرخ نری کا بوٹ بجھوئے دار، عطر میں بسے ہوئے۔ تسبیح ہاتھ میں پیچھے خدمت گار۔ تشریف لائے۔ پہلے

بڑی بیگم سے محمد عسکری کو بہار النسا نے اوپر ہی بلایا۔ جو پردہ کرتی تھیں وہ سب ہٹ گئیں۔ بہار النسا یوں ہم کلام ہوئیں۔

بہار النسا۔ مرزا ہمایوں فر کے ہاں کا کچھ حال سُنا۔

محمد عسکری۔ (مسکرا کر) ہاں ہاں شہر بھر میں مشہور ہے۔

مہری۔ لیجئے یہیں نہ سُنیے۔ کس نے نہیں سنا سب جانتے ہیں۔

عسکری۔ مگر تشویش کی بات نہیں ہے۔

مرد باید کہ ہراساں نہ شود
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود

بہار النسا۔ جب مرد نہ ہو۔ حُسن آرا کو کون سمجھا سکتا ہے۔ صبح سے رونے کا تار باندھ دیا ہے۔ اور خدا جانے کیا بکتی ہے۔

محمد عسکری۔ نہیں۔ ماشاء اللہ فہمیدہ ہیں۔ سمجھائے سے سمجھنا کیا معنی۔ وہ خود ہی سمجھتی ہوں گی۔ ہمارے سمجھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔

بہار۔ حُسن آرا، دیکھو عسکری کیا کہتے ہیں۔

حُسن۔ آپ نے انھیں میرے دُکھڑے کے لیے بلایا ہے۔ یا ہمایوں فر کا حال پوچھنے کے واسطے۔

عسکری۔ وہاں کا حال کیا پوچھتی ہو بہن۔ خیر صلاح ہے۔

حسن۔ خیر صلاح۔ یہ نگوڑے دس دس پہرے کیوں بیٹھے ہیں۔

عسکری۔ کون کہتا ہے۔ پہرا ہے نہ دہرا ہے۔ فقط بات یہ ہے کہ آج کل گھر سے باہر نہیں نکلتے دن رات محل ہی میں رہتے ہیں اور نہ وہاں کوئی جانے پاتا ہے، اسی سبب سے لوگوں نے مشہور کر دیا کہ بھاگ گئے ورنہ کوئی بھاگا واگا نہیں سب گپ ہے۔

حسن۔ یہ ملاقات کا دروازہ کیوں بند کر دیا۔

عسکری۔ سہمے ہوئے ہیں۔ صدمہ سا صدمہ اٹھایا ہے۔

حسن۔ خدا جانے یہ کیا اسرار ہے۔ بھلا ہم جانیں تو۔ جانے پائیں یا جانے بھی نہ پائیں ہم سے تو شک نہیں ہے۔

عسکری۔ پہلے دو سپاہی فنس کا چھنکا اٹھائیں گے۔ پھر مہریاں آن کے دیکھیں گی۔ پھر مغلانی پہچانیں گی پھر ڈیوڑھی میں گذر ہوگا۔ ہمایوں فر سے بات نہ کر سکو گی۔ ہاں بہن سے ملو تو ملو۔ مرزا صاحب تو اندھیرے میں بیٹھے ہیں۔

حسن۔ اندھیرے میں بیٹھنے کا کیا سبب ہے۔ بھلا۔ ہونھ!

عسکری۔ شاہ صاحب کی رائے جو اُن کا حکم ہو۔ کسی کا اجارہ ہے۔

حسن - اچھا آپ جا کے خبر لائیے۔ اور سپہر آرا کے پاس ہمارا پیغام پہونچائیے۔ میں رقعہ لکھے دیتی ہوں۔
یہ کہہ کر حسن آرا بیگم نے رقعہ لکھا۔

پیاری بہن شہزادۂ بہادر کی صحت مزاج سے اطلاع تو دیا کرو۔ تم تو وہاں جا کے ہم سب کو بھول بیٹھیں۔ اور اس قدر بھولیں کہ کبھی یاد نہ کرتیں۔ میں آؤں تو ممکن ہے یا نہیں۔ شہزادی بیگم اپنی ساس کی خدمت میں ہماری طرف سے بندگی عرض کر دو۔ اور شہزادے سے کہو کہ کسی وقت شب کو بند گاڑی میں یہاں تک آؤ۔ کیا پانوں کی مہندی گھس جائے گی۔

یہ عبث کہتے ہو موقع نہ تھا اور گھات نہ تھی　　　مہندی پانوں میں نہ تھی آپ کے برسات نہ تھی
کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی　　　دن کو آسکتے نہ تھے آپ تو کیا رات نہ تھی
بس یہی کہیے کہ منظور ملاقات نہ تھی

یہ خط لکھ کر محمد عسکری کو دیا، ادھر وہ روانہ ہوئے، اُدھر پیاری دوڑتی ہوئی آئی۔ کہا حضور یہ خط ایک لڑکا بازار میں لیے جاتا تھا۔ میں چھین لائی۔ انھوں نے خط پڑھا۔ وھوہذا :

مانامہ بہ برگ گل نوشتم
باشد کہ صبا بادرساند

جانِ آزاد۔ آہنگ گرم شوق نے خطاب و القاب سب بھلا دیا۔ طول عقال شوق وانتہا، مبالغہ سے گذر کر نفسِ مطلب کہے دیتا ہوں، کہ میرے آہنگِ شوق کی آبرو۔ اب خدا کے ہاتھ ہے، میری شمشیر خارا شگاف اور تیغِ خوش غلاف سے جو ہو سکے گا، وہ میری لیاقت، شجاعت کے گواہ ہوں گے۔ غنیم کا فتح کر لینا تو ہمت مردانہ کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں۔

ہاں فتح الباب دل ذرا ٹیڑھی کھیر ہے، جب میں نے تمہارے دل پر فتح پائی تو روسیہ کیا بیچارے ہیں تین چار دن میں بمبئی سے مثل نظر رواں ہوں گا۔ اور میرا جہاز بہت جلد قسطنطنیہ کے قریب لنگر انداز ہوگا۔ شکست و فتح کا حال خدا جانے۔ اس وقت بحرِ اظہار بسالت ہر رگ و پے میں موج زن ہے۔ جوش و خروش کی انتہا ہی نہیں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم راتوں کو مجھے یاد کر کے چونک چونک پڑتی ہوگی۔ میری تصویر ہر دم تمہارے روبرو رہتی ہوگی۔ لطفِ صحبت آنکھوں میں پھر جاتا ہوگا۔ بعض اوقات تم دیوانوں کی طرح سر پٹکتی ہوگی، مگر میرے استقلال کو دیکھو کہ محبوبِ مطلوب کے حکم کی تعمیل کے لیے میں نے کیا کیا گوارا کیا۔ ایک اشارے کی دیر تھی کہ ٹرکی کا جانا فوراً منظور کر لیا۔ سربازوں اور سچے عاشقوں کا یہی کام ہے۔ ورنہ عشق خام ہے۔ اور عاشق برائے نام۔ پیاری سپہر آرا بھلا تم کو کیا سمجھاتی ہوں گی۔ وہ تم کو بات بات پر

طعنے دیں گی کہ ایسا ہی عشق تھا تو شہر بدر کیوں کیا۔ مگر تم مستقل رہو۔ اور وضع اہلِ آبرو اسی کی مقتضی ہے کہ دل کو تشفی دو۔ تم دونوں پیاری بہنوں کو میری وجہ سے بڑا صدمہ پہونچا۔ اگر مجھ سے ملاقات نہ ہوتی تو تم کیوں مضطر و پریشان ششدر و حیران ہوتیں۔ لیکن اب تو جو ہوا وہ ہوا۔ کچھ کلیجے پر پتھر رکھو، میں روم میں داخل ہونے ہی خط پر خط بھیجوں گا۔ ہماری ایک صلاح مانو، اِن دنوں اودھ اخبار ضرور پڑھا کرو۔ اس میں جنگ کا پورا پورا ذکر اشاعت پاتا ہے۔ راہ میں بنجارنے ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب خدا کے فضل سے صحیح و سالم ہوں۔ میاں خوجی راہ میں خوب خوب تماشے دکھاتے ہیں۔ ایسا مسخرہ بھی کم دیکھا ہوگا۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ جیتے ہیں تو پھر ملیں گے۔ ورنہ جس دن لیلیٰ اور مجنوں، فرہاد اور شیریں کا نکاح ہوگا۔ اسی دن ہم تم بھی دُولھا دُلھن بنیں گے۔ خدا حافظ۔ بمبئی سے اپنی روانگی کا تار بھیجوں گا۔

آزاد خستہ جان۔

اس خط کے پڑھتے ہی حسن آرا کی آتش جنون مشتعل ہو گئی۔ اور بے قراری سے اس قدر روئیں کہ الاماں۔

گریاں شد و تلخ تلخ بہ گریست

بے گریۂ تلخ در جہان کیست

رُوح۔ پیاری یہ کس کا خط لے آئی۔ اس وقت کس نے دیا تھا۔

پیاری۔ حضور ایک لونڈا، وہی بہشتی کا لڑکا بازار سے لاتا تھا۔ خان صاحب نے اس سے یہ کاغذ چھین لیا۔ مجھے دیا کہ اس کو سونگھو۔ دیکھو عطر کی خوشبو آتی ہے۔ بس میں لے کے دوڑ کے یہاں چلی آئی وہ غل ہی مچاتے

رُوح۔ مہری۔ خاں صاحب سے جاکے پوچھو یہ خط کس کا ہے۔

مہری۔ (باہر جاکر) خاں صاحب۔ خاں صاحب۔ اے خاں صاحب۔

خانصاحب۔ بی عباسی خانم ہیں۔ آج تو عجب جوبن ہے۔

مہری۔ اے آگ لگے تیرے جوبن پر۔ جب دیکھو موئے کو جوبنوں ہی کی پڑی رہتی ہے۔ ہمارے جوبن کی فکر ہمارے میاں کو ہوگی۔ تم کون ہو۔ ادھر آؤ ابھی ابھی حاضر ہو۔

خان۔ حاضر ہوا سرکار۔ حکم۔ حضور خانم صاحب۔

عباسی۔ (مسکراکر) تو مرتے وقت دل لگی بازی نہیں چھوڑے گا۔ مرتے دم تک جوبنوں ہی کی فکر رہے گی۔

خان۔ اب حکم تو فرمائیے کہ دل و جان سے بجا لاؤں۔

عباسی۔ یہ تم نے کیا شگوفہ چھوڑ دیا۔ گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ کوئی روتا ہے کوئی اداس بیٹھا ہے۔

یہ ہے کیا ماجرا۔

خان۔ کیا کیا۔ رونا دھونا کیا معنی۔ کیا ہوا کیا۔؟

مہری۔ اوپرسے کہتے ہو کیا ہوا کیا۔ بُرے کا سر ہوا۔ ایک ایک کے دو دو ہوئے۔ یہ خط کہاں سے لائے ہو۔ کیا جانے کیا لکھا ہوا ہے۔ اُس میں حسن آرا بیگم پڑھتے ہی رو دیں، اور سب کے سب اُداس ہیں۔

خان۔ کیا کہتی ہو عباسی۔ خط کیسا میں نے کون خط دیا۔

عباسی۔ اے پیاری یہاں سے لے کے گئی ہے۔ اور حسن آرا بیگم کو دیا کہ دیکھیے عطر سے کیسا بسا ہے یہ خط۔ وہ لے کے پڑھنے لگیں۔

خان۔ پیاری کو ہم نے کون خط دیا تھا بلاؤ تو۔

عبّاسی۔ اب ہم کیا جانیں وہی کہتی ہے۔ ہمیں کیا معلوم۔

خان۔ اخّاہ۔ میں سمجھا۔ بہشتی والا لونڈا لیے جاتا تھا۔ میں نے اُس سے چھین کے پیاری کو دیا۔ وہ لے کے بھاگ گئی۔

عبّاسی۔ معاذاللہ خط کیا ماتم نامہ ہے۔ دشمنوں کے لیے۔

خان۔ ارے لونڈے۔ او بہشتا وہ خط تو کہاں سے لایا تھا۔ سچ سچ بتا دینا۔ کہاں پڑا پایا۔

لونڈا۔ ایک آدمی نے پنساری کی دوکان پر کیوڑا لیا تھا دو پیسے کا۔ پانی میں ملایا اور پی گیا۔ کیوڑے کے آبخورے پر یہ کاغذ تھا۔ میں نے اٹھا لیا۔ کیوں کیا کچھ چوری کا ہے۔

عباسی نے جا کے کہا حضور پنساری کی دکان کے نیچے کاغذ پڑا تھا۔ وہیں سے اٹھا لایا۔ وہ خانصاحب نے چھین کے ان کے حوالے کر دیا۔

حسُن۔ اس تحقیقات کی کیا ضرورت ہے۔ ع۔

دنیا ہیچ ست و کارِ دنیا ہمہ ہیچ

نیک نامی کے ساتھ جیے بس یہی بڑی نعمت ہے۔ ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو　　ہمہ خنداں بدند تو گریاں

آں چناں زی کہ بعد مردن تو

ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

نازک ادا۔ پھر پڑھنا بہن کیا رُباعی کہی ہے۔

حسُن۔ کیا کہوں بہن۔ دل ہی سرد ہے۔ مجھے یہ شعر خوب یاد ہیں۔ ہائے کس طرح بگڑ بگڑ کر طعنے

دیئے تھے۔ اور یہ اشعار زبان پر لائے۔

چہ پیش آمد ترا وحال چوں ست — مگر صحرا نوردی از جنوں ست

جدا چوں گشتی از یاران غمخوار

چرائے ہم چو مجنوں سر بہ کہسار

ہے ہے (رو کر) بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

نازک۔ کیا خواب دیکھا کیا۔ اچھا ہم سے حال تو بیان کرو۔ سرے سے کہو۔ کیا دیکھا۔ آزاد کس حالت میں تھے

حسن۔ کہنے لگے میدانِ جنگ، اور توپ و تفنگ، اور معرکۂ رستخیز اور ہنگامۂ ستیزہ کا ذکر کیا۔ اور کہا۔ ؎

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من

آں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

یہ شعر روز پڑھا کرتے تھے۔

نازک۔ تو خواب کو تم مانتی ہو۔ خواب ہے کیا۔

روح۔ واہیات خدا جانے یہاں کتنے خواب دیکھ ڈالے۔ اس سے ہوتا کیا ہے خرافات ہے۔

حسن آرا کی طبیعت اُلجھنے لگی۔ بار بار یہ شعر پڑھتی تھی۔ ؎

ما نامہ بہ برگ گل نوشتم

باشد کہ صبا باو رساند

اتنے میں روح افزا نے بات ٹالنے کے لیے نازک ادا بیگم سے دریافت کیا کہ تم کو فقیروں کا عقیدہ ہے یا نہیں۔ اشارے سے کہا کہ بات ٹال دو۔

روح۔ پہلے حسن آرا اپنی رائے دیں، پھر ہم بیان کریں گے۔

حسن آرا نے کہا میں اس وقت اپنی رائے نہیں ظاہر کر سکتی۔ مگر مختصر طور پر البتہ کہوں گی۔ بہن بات ساری یہ ہے کہ مردوے ظاہر آباد و باطن خراب ہوتے ہیں، جو فروش گندم نما۔ یہ جتنے فقیر، اور مجذوب اور باکمال، اور رسیدہ، بنتے ہیں۔ سب ایسے ہی ہیں! جو لوگ رسیدہ ہیں، وہ اپنے کو ظاہر نہیں کرتے رسیدہ سے کیا مطلب۔ مطلب یہ کہ نیک کام کرتے ہیں۔ بدی سے محترز رہتے ہیں۔ مگر ان کو اس سے کیا واسطہ کہ لوگوں کو اپنے مکان پر جمع کریں۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ اس قدر ضعیف الاعتقادی کے بندے کیوں کر ہو جاتے ہیں۔ کم سن نوخیز لڑکیاں اور درویشوں سے لڑکا مانگیں۔ لڑکے کہیں فقیروں کی دعاؤں سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اے توبہ۔ جو طریقہ جناب باری نے مقرر کیا ہے۔ اس کے خلاف لڑکا ہو سکتا ہے

نہ لڑکی۔ جو فقیر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی دعا سے لڑکا پیدا ہو جائے گا۔ ان سے بڑھ کر مکار کوئی نہیں۔

شدائد سے مکائد سے دغا سے

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

ان رنگے سیاروں سے خدا کی پناہ۔ ابھی کوئی چار ہی پانچ برس ہوئے کہ ایک فقیر املی والی گلی میں آن کے ٹکا۔

روح۔ ہندو تھا، یا مسلمان، دونوں مذہبوں کے فقیر ہوتے ہیں۔

حُسن۔ وہاں ایک سنارن رہتی تھی۔ کوئی چھبیس ستائیس برس کا سن تھا۔ میاں سے اس سے روز جھگڑا رہتا تھا۔ ایک دن وہ فقیر کے پاس گئی۔ جا کے حال بیان کیا۔ فقیر نے دیکھا تو جوان عورت، میاں سے ناراض۔ زیور سے لدی ہوئی۔ اور خوش قطع۔ چپ کے سے کہا کہ مائی کوئی پھول من میں لو۔ انھوں نے کہا۔ اچھا لیا۔ فقیر کچھ دیر تک غور کر کے بولا۔ سبز رنگ کا پھول ہے۔ واہ ایں گل دیگر شگفت۔ یہ نیا گل کھلا۔ سبز پھول آج تک نہیں سنا تھا۔

روح۔ بس جسے لوگ گنڈے بازی کہتے ہیں وہی ہے۔ رمّال کیا ہیں نجومی کیا ہیں۔ وہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔

حُسن۔ ہم جب کبھی سنتے ہیں، کہ کم سن شریف زادیاں فقیروں سے ملتی ہیں۔ تو آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ حُسن وہ بدبلا ہے کہ چاہے کیسا ہی پارسا ہو۔ حسین عورت پر نظر ضرور پڑے گی۔ دل اور حُسن میں عجب قسم کی قوّتِ مقناطیسی ہے۔

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم

کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زُلیخا را

کوئی مرد دنیا میں ایسا نہیں، جو حلف اٹھائے کہ حسین عورت کو دیکھ کر اس کے دل میں بدی کا خیال نہ آئے گا۔

رُوح۔ اے توبہ کرو بہن۔ خدا خدا کرو۔

بہار۔ عورتوں کی طرف سے تو ہم حلف اٹھاتے ہیں۔

نازکؔ۔ اور خصوصاً وہ عورتیں جو ہر دم بنی ٹھنی رہتی ہیں۔ چاہے تیس پینتیس سے تجاوز کر جائیں، مگر معلوم بارہ ہی برس کی ہوتی ہیں۔ اُن کی طرف سے تو ہم بھی قسم کھاتے ہیں۔ تم بھی تو خیر سے ابھی بارہ ہی برس کی ہو۔

بہار۔ نہ بارہ سہی تیرہ سہی۔ ابھی میرا سن ہی کیا ہے۔

نازکؔ۔ اے ہے کیا ننھی بنی جاتی ہیں۔

خدا ترا بُتِ ناداں درازسن تو کرے
ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

بہار۔ درگاہ جاتی ہو یا نہیں۔ ضرور جاتی ہوگی۔

نازک۔ جو جس کا مذہب ہے اس کی وہ پابندی کرتا ہے۔ ہندنیاں گومتی، گنگا، جمنا، جاتی ہیں کہ گناہ دھل جائیں۔ جاتی ہیں یا نہیں۔ شوالوں میں جاتی ہیں یا نہیں جاتیں۔ میموں کو دیکھو گرجا گھر ہر اتوار کو پہنچتی ہیں، پھر ہم بھی گئے تو کیا ہرج ہوا، پردہ دل کا ہے۔

بہار۔ یہ سب کہنے ہی کی باتیں ہیں۔ دل کا پردہ تو ہے ہی۔ مگر بُری صحبت سے بچنا چاہیئے۔

با بد بنشیں و باش بیگانۂ اُو
در دام افتی اگر خوری دانۂ اُو

اسی سبب سے بُری عورتوں کو گھر میں نہیں آنے دیتے۔ بھلے مانس کے ہاں ایسی ویسی نہیں آنے پاتی۔

اتنے میں مغلانی نے آن کر کہا۔ بڑی سرکار مزاج کا حال دریافت کرتی ہیں۔ فرماتی ہیں کہ جو جی چاہے، اور طبیعت بحال ہو، تو دو گھڑی کے لیے یہاں آجائیں۔ رُوح افزا نے کہا اب اس وقت طبیعت خدا کے فضل سے رو براہ ہے۔ باتیں کر رہی ہیں، اماں جان سے کہدو کہ اللہ کے فضل سے اب اچھی ہیں۔ مغلانی نے جا کے بڑی بیگم سے کہا تو ان کے دل کو ڈھارس ہوئی۔ نازک ادا بیگم بڑی دیر سے بیٹھی تھیں، مگر تعجب کا مقام ہے کہ اب تک مذاق اور چہل کا کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ آخر کار نہ رہا گیا اور یوں ہم کلام ہوئیں۔

نازک۔ ہمارے دو چار سوالوں کا جواب دینے والا کوئی ہے۔ اِتنوں میں تو یہاں کوئی نہیں ہے۔

حسن۔ اب خدا جانے کیسے سوال ہیں۔ کچھ معلوم تو ہو۔

نازک۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اگر ہم تمہاری آنکھ پھوڑیں، تو تم راضی ہو، یا ناک کاٹیں تو خوش ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ترجیح کس کو دو۔ اِس کو یا اُس کو۔

حسن۔ واہ واہ کیا سوال کیا ہے۔ ہونہہ!۔

پیاری۔ نہ ناک کٹانا اچھا نہ آنکھ پھوڑوانا، ہم تو کان کٹوانے پر راضی ہو جائیں۔

نازک۔ جب وہ مانے بھی۔ وہ کہتا ہے یا ناک کاٹوں گا یا آنکھ پھوڑوں گا۔ اور وہ زبردستی کرتا ہے۔ تو ان دونوں میں کس کو ترجیح دو۔

پیاری۔ جو آنکھ ہی نہ رہی تو سرکار کام کون کرے گا۔

بہار۔ اور جو ناک کٹ گئی تو پھر کیا رہے گا۔

پیاری۔ تو پھر نکٹا جیا بُرے احوال۔ ناک کٹی مبارک، کان کٹے سلامت۔

حسن۔ میں کہتی تھی کہ کس قسم کا سوال ہوگا۔

نازک۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ شتابو کی بڑی بہن گلابو کے لڑکا پیدا ہوا۔ عیدو۔ عیدو نے بقریدی کے ساتھ شادی کی اور بقریدی شتابو کی ماں۔ تو بقریدی کا نواسا گلابو کا کون ہوا۔

حسن۔ جو اِس سوال کا جواب دے پہلے اپنی فصد کُھلوا لے۔ دیوانگی کی علامت ہے، یہ سوال بھی اور جواب بھی پاگل بنا ہے۔

بہار۔ یہ کیا گلابو، شِتابو کی باتیں کرتی ہو، کوئی اور ذکر چھیڑو۔ تم نے کبھی کسی فقیر سے کوئی بات پوچھی تھی۔ کبھی سابقہ پڑا ہے یا نہیں۔

نازک۔ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یہ بار بار فقیروں کی کیوں تفتیش ہوتی ہے۔ ہمارے شہر میں شریف زادیاں فقیروں سے کہاں ملتی ہیں۔ بدکی تو اور باتیں ہیں۔ فقیروں سے کیا مطلب۔ ہاں یہ کہو کہ محلدار چرباک ہوئی یا مغلانیاں بدوضع نوکر رکھیں اور شہدی ہڑونگی مہریوں سے سابقہ پڑا یا پاس پڑوس گرگیاں عورتوں کے مزاج میں دخیل ہوئیں، انھیں باتوں سے طبیعت رنگین ہو جاتی ہے۔ جہاں بدوضع عورتوں نے شہ دی بس جیسے سونے میں سہاگا لے اُڑا۔

حسن۔ جو وضعدار لوگ ہیں، وہ ان سب باتوں کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ جو لوگ خود بدوضع مردوے ہیں اُن کو شکایت کا موقع نہیں۔ ہم کہتے ہیں مردوے خود تو منہیات و معصیات سے اجتناب نہیں کرتے ہیں عورتوں کو ناقص العقل کہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے:

ع به کیدِ زن بود دانا گرفتار

ع زنان را کید ہائے بس عظیم ست

مگر عورتوں کا حصہ ہے۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ دنیا میں جتنے گناہ ہوئے تمہاری ذات سے ہوئے۔ یا عورتوں کی ذات سے۔ مرد فی صدی بانوے گنہگار تو عورتیں فی ہزار دو۔ ع۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

مگر کسی کا مُنھ کوئی روکتا ہے۔

بہار۔ تو مردوں سے بہت خلاف ہو گئی ہو۔

حسن۔ وہ اسی قابل ہیں۔ جب ہم کو بُرا کہیں گے تو بُرا سنیں گے بھی۔

دہنِ خویش بدشنام میالا صائب

کین زرِ قلب بہر کس کہ دہی باز آید

وہ ہم کو جھوٹ مُتہم کرتے ہیں۔ مگر ہم صحیح کہتے ہیں۔

تو نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سُنے

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

اب سُنیے کہ محمد عسکری جن کو حُسن آرا بیگم نے مرزا ہمایوں فر بہادر کے ہاں بھیجا تھا، اور سپہر آرا کے نام خط لکھدیا تھا، واپس آئے۔ حسن آرا نے بیتاب ہو کر پوچھا خیریت ہے۔ محمد عسکری نے سپہر آرا کا خط دیا ڈھونڈا میری پیاری باجی جان کو میرا سلام پہونچے۔ باجی تم ہرگز نہ گھبراؤ۔ چوکی پہرا کیسا۔ گھر کے سپاہی مسلح پہرے پر بیٹھے ہیں۔ جس میں کوئی ایسا ویسا نہ آنے پائے۔ بس اس میں ڈر کا کون مقام ہے۔ آپ سے کسی نے جھوٹ بولا ہوگا۔ پہلے صاحب کی رائے ہوئی تھی کہ قبر کھود دی جائے مگر پھر لوگوں کے کہنے سننے سے راضی ہو گئے کہ اب قبر کھدوانے سے کیا ملے گا۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ مرزا ہمایوں فر ہی ہیں۔ مگر اب پھر لوگوں نے پھیر دیا میں نے آپ کا خط اُن کو دکھایا تھا۔ پڑھ کر بہت ہنسے۔ کہا میری طرف سے اس قدر کہدو کہ میں ہی عاشق النساء ہوں، جو گلے مل چکا ہوں، میں نے کہا بڑی بہن کو میں ایسا نہیں لکھ سکتی مگر انھوں نے قسمیں دے دے کر لکھوایا۔ معاف کیجیے کہتے ہیں کہ وہ شعر بھی لکھ دو جو پتنگ پر لکھا تھا:

عاشقان صادقہ اے دلستان منم

اول کسے کہ بر تو فدا شد ز جان منم

اماجان کا مزاج کیسا ہے۔ ان سے کہدیجئے گا کہ ہر روز دو دفعہ آدمی آیا کرے یہ کس نے کہدیا کہ کسی کے آنے جانے کا حکم نہیں ہے۔

باجی جان آج ہم نے ایک اخبار میں ایسی بات دیکھی کہ اگر کہوں تو پھڑک جاؤ۔ مٹھائی قبولو تو بتائیں ہم نے پڑھا کہ آزاد نے روم میں بڑی نیک نامی حاصل کی۔ پلونا کوئی مقام ہے، وہاں بڑی بھاری جنگ ہوئی تھی۔ اُس جنگ میں آزاد نے وہ کارِ نمایاں کیا کہ آج ساری خدائی میں کسی سے سرزد نہیں ہوا۔ لاکھوں آدمیوں کے مقابل میں صفیں توڑ کر مردانہ وار قلعے سے نکل آئے۔ کئی ہزار آدمیوں کی جانیں بچائیں۔ پہلی کارگذاری تو یہ تھی کہ جب جہاز ڈوبنے لگا انھوں نے ستر آدمیوں کو چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر اتار لیا، اور ایک بار دو عورتوں کی جان بچانے کے لیے دور تک پیر کے گئے۔ اخبار والا لکھتا ہے کہ ان کا نام سونے کے پانی سے لکھنا چاہیے، یہ ایسے کارگذار سورما اور بہادر ہیں۔ دوسری کارروائی سنو گی تو پھڑک جاؤ گی کوہ قاف کی ایک پری جس کے حسن و جمال کی روس و روم میں دھوم ہے اُن پر عاشق ہوئی اور اس نے چاہا کہ یہ اس کو عقد نکاح میں لائیں مگر انھوں نے صاف انکار کیا تمہارا نام لیا کہ

ہم اُن سے شادی کا اقرار کر آئے ہیں اور سُنا وہ عورت کروڑ پتی ہے۔ ؏

این کار از تو آید و مردان چنیں کنند

پھر ایک جنگ میں معدودے چند سپاہیوں سے روسیوں کے لشکر جرار کو ایسی شکست دی کہ بھاگتے راستہ نہ ملا
وہ بھی تم کو مبارک باد دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا وہ دن جلد دکھائے کہ آزاد یہاں داخل ہو جائیں۔ اب
قصد ہے کہ جس مکان میں پہلے رہتے تھے وہی جو ہمارے مکان کے سامنے ہے اُسی میں اُٹھ آئیں۔ مگر صاحب
لوگ نہیں مانتے کہتے ہیں کہ وہ مکان مخدوش ہے۔ میں بفضلہ اچھی ہوں۔ آپ ذرا اندیشہ نہ کیجیے۔ روح افزا
بہن، بہار النسا بہن، گیتی آرا بہن کی خدمت میں بندگی۔ پیاری کو دو ایک دن کے لیے یہاں ہی بھیج دیجیے۔

سپہر آرا۔

یہ خط پڑھ کر حسن آرا کو کسی قدر تشفی ہوئی، پانی منگوا کے مُنہ دھویا۔ نماز پڑھی۔ خدا کا شکریہ ادا کیا۔
بہنوں کو ساتھ لے کر باغ میں آئیں۔ مصروف گلگشت چمن ہوئیں۔

رُوح۔ کیا ٹھنڈی ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے اسی چبوترے پر سو رہیں۔

حُسن۔ آج رات کو یہیں سوئیں گے ہم سب۔

نازک۔ اب ہم جائیں گے بہن۔ دیر ہوئی ہے۔

حُسن۔ یہ کیوں رات کو یہیں رہو، تمہارے میاں اجازت دے دیں گے۔

حسن آرا بیگم کی بے قراری

نازک ادا بیگم نے باغ میں دو ایک ایسی مذاق اور دل لگی کی باتیں کیں کہ روح افزا گلے لگا کے بولی۔ بہن
خاتونِ جنّت کی قسم ہم تمہیں آج نہ جانے دیں گے اور جو چلی جاؤ گی تو ہمیں بڑا رنج ہوگا۔ ناحق جھگڑے فساد سے کیا
فائدہ۔ نازک ادا نے مسکرا کر جواب دیا۔ اے واہ اچھا جھگڑا ہے۔ ہمارے میاں کو ہماری دم بھر کی جدائی
ناگوار گذرتی ہے۔ رات بھر یہیں رہوں، تو ان کو نیند نہ آئے۔ ان کے دشمن تڑپا کریں، اور پھر مجھ سے خود یہ نہ
ہو سکے گا کہ ایسے میاں کا دل دکھاؤں جو مجھ پر پروانہ ہے۔ آپ اپنی محبت تہ کر رکھیں۔ تمہارے سے یہاں
نہیں ہیں کہ مہینوں میاں کی صورت ہی نہ دیکھیں۔

الغرض اس چہل کے بعد نازک ادا بیگم شب باش ہوئیں۔ اور ناچ ہونے لگا۔ نازک ادا بیگم ہنسوڑ تو
تھیں ہی سوچیں کہ کسی نہ کسی طور پر حُسن آرا کو ہنسانا چاہیئے۔ کہا بہن ایک لالہ کا لکھا ہوا فارسی خط تم کو سنائیں
تو لوٹ لوٹ جاؤ۔ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جائیں۔ ایک شخص کا باپ مر گیا۔ اس کو لالہ صاحب تعزیت نامہ

لکھنے بیٹھے۔ سوچ کہ عنوان شعر کے بغیر سونا رہے گا۔ آؤ بھئی کوئی شعر بھی درج کر دیں۔ سوچتے سوچتے یہ شعر یاد آیا۔ شتر بے مہار کی طرح قلم اٹھایا، اور ریگستان قرطاس میں شتر غمزے کرتے ہوئے بلبلانے لگے۔ لکھتے تو ہیں دوست کے باپ کا تعزیت نامہ اور سُرخی یہ:

زاں نمی ترسید گرد د قعرِ دوزخ جائے اُو
وائے گر باشد ہمی امروز او فردائے اُو

ماشاء اللہ کیا دعائے خیر دی ہے۔ سیدھا دوزخ بھیج دیا۔ اور خالی دوزخ ہی نہیں قعرِ دوزخ۔ اِس دعا کے صدقے کوئی لکھتا ہے اِنّا لِلّٰہ برہانہٗ، کوئی کہتا ہے نور اللہ مرقدہٗ۔ تربتش عنبریں باد۔ خدا ایش بیامرزاد۔ طَابَ ثراہ برد اللہ مَضْجَعَہٗ۔ انہوں نے پرانے ڈھڑے کو چھوڑا۔ یہاں کا جھگڑا۔ طبیعت جدت پسند ہے۔ ایجاد ضرور ہو۔

طرز گران وِداع کردم
طرز گر اختراع کردم

اسے کیوں نہ ہو شاباش ان کے دوست نے خط پڑھ کر بڑی دعائیں دی ہوں گی کہ ابا جان کو لالہ صاحب نے جہنم وَاصِل کیا۔

حُسن۔ اور بہادری کتنی ظاہر کی ہے۔ زبان نمی ترسید۔

نازک۔ یہ تو شعر لکھا۔ اس کے بعد القاب سنو۔ یہ بھی ساری خدائی سے انوکھا القاب کیا لکھتے ہیں۔

دوست صاحب، سراپا پوست صاحب۔ بندہ ہمہ اوست صاحب مثل پدر بزرگوار خود بعمر ہفتاد ویک سال روانۂ عالم جاودانی شدہ پس ماندگان را داغ حسرت دہند، وبہ بیکنٹھ سدھارند۔

اس القاب کے سنتے ہی، حُسن آرا اور روح افزا کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اس قدر ہنسیں کہ بیتاب ہو گئیں، پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

حُسن۔ دوست صاحب نے بھڑکا دیا، اور سراپا پوست صاحب اس سے بڑھ گیا۔ اس سوجھ بوجھ کے صدقے کہ بندہ ہمہ اوست صاحب یہ صاحب دوست کی طرف ضمیر ہے۔ وہ کس کے بندے ہمہ اوست کے۔ اور دعا نے تو ستم ہی ڈھایا۔ گو ان کے دوست کا باپ مر گیا۔ تاہم یہ تعزیت نامہ پڑھ کر بے اختیار ہنس دیے ہوں گے۔ مگر جیتی مر جانے کی دعا نہیں دی۔ بعمر ہفتاد و یک سال روانہ عالم جاودانی شوند۔ سٹری ہے موا۔

رُوح۔ اور یہ تو کہا ہی نہیں کہ پس ماندگان را داغ حسرت دہندہ بہ بیکنٹھ ـــــــــ اس کے آگے کیا لکھا تھا۔

نازک ۔ سدھارند۔ یعنی سدھاریں ہندو ے اکثر بولتے ہیں۔ مگر یہ مصدر را چھا بنایا۔ سدھاریدن۔ سدھارنا۔

حسن ۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ ایک دن مریں گے سب۔ کوئی عاقبت کے بوریے توبٹورے گا نہیں، پھر صاف صاف کیوں نہ لکھ دو۔ اور عمر بھی کچھ ایسی کم نہیں ہے۔ اکھتّر برس کا سن، کچھ کم نہیں ہوتا ہے۔ زیادہ جی کے کوئی کیا کرے گا۔ سکندر آبِ حیوان سے محروم کیوں واپس آیا۔ یہی سمجھ کے کہ بہت جینے میں لطف نہیں۔

نازک ۔ یہ تو القاب تھا۔ اب آداب سُنیے۔ اس کا طرز بھی ساری خدائی سے نرالا ہے۔ لکھتے ہیں۔ بعد ادائے مدارج تعزیت کہ خدا بایں عمر، ہر کسے را نصیب کند، و بعمر ہفتاد و یک سالا پدر ہر کس بشرطیکہ توانگر بود نہ تہی دست بہ جنّت رود، و بعد ادائے مراسم ماتم پُرسی، کہ لازمہ بشری نہ از دل بلکہ حسبِ رواج ست۔ آنکھ کھولو تو اس فقرے کو پھیر پڑھ کر سناؤں۔

حسن ۔ بس۔ خدارا اب ایسے فقرے نہ سناؤ، ورنہ مارے ہنسی کے بہت برا حال ہوگا۔ خدا کی مار ایسی فارسی لکھنے پر اور فارسی کہا کیا معنی، اردو لکھتے تو اس سے بھی بدتر ہوتی۔ وہ تو دعا مانگتا تھا کہ کسی کا باپ مرے، اور تعزیت نامہ لکھے۔

رُوح ۔ ہماری سمجھ میں کچھ کچھ مطلب آیا۔ پھر کہو بہن۔

نازک ۔ اس کے معنی یہ کہ تعزیت کا خط خدا سب کے پاس بھجوائے، اور اکہتّر برس کی عمر، جتنے امیر بوڑھے ہیں سب جنت کی راہ لیں۔ اور ماتم پرسی فقط حسبِ رواج ملک کرتے ہیں۔ کچھ ضروری اور لابدّی امر نہیں ہے۔ عقل کا دشمن تھا، اور اس میں ذری بال برابر بھی جھوٹ یا مبالغہ نہیں ہے۔ میں نے خود پڑھا تھا۔ ابا کے پاس وہ بیچارہ خط لایا تھا۔ کہا۔ دیکھو قبلہ ایسے ایسے بے تکے بھی دنیا میں موجود ہیں۔

تعزیت نامہ میں مسخرہ پن نہ سنا ہوگا۔

اس کے بعد نازک ادا بیگم نے خط کا مضمون سنایا۔ وہ القاب اور آداب دونوں سے بڑھا تھا۔ فارسی لکھتے لکھتے اب اُردو کا خون کرنے لگے۔ دھونڈا۔ خبرِ وحشت اثر وفاتِ والدم آپ کے۔ اس قدر نازک ادا بیگم نے کہا تھا کہ حسن آرا اور روح افزا نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور ہنستے ہنستے گل رخسار بیر بہوٹی سے سُرخ ہوگئے۔ والدم آپ کے' اس جملے نے پھڑکا دیا۔ بیتاب کر دیا۔

حسن ۔ خدا جانے لالہ کا باپ جیتا تھا یا 'بعمر ہفتاد و یک سال روانۂ جنت شد) کا نقشہ تھا۔ اگر زندہ ہو تو یہ لفظ ضرور دکھا دینا چاہیئے۔

رُوح ۔ خوش تو بہت ہوں کہ اچھے ہونہار صاجزادے ہیں۔

نازک ۔ خبرِ وحشت اثر، وفاتِ والدم آپ کے بذریعہ اخبارات و خطوطات سُن کر کمالِ ملالِ بالاجمال

لاحق حال ایں ذرۂ بے مثال وہ خاندان کے آل و عیال از نیپال تا بھوپال تال ہوا۔

راوی۔ اِس تک بندی کے صدقے۔ خط کیا چورن والوں کی بانی ہے۔ مگر ہم تو اس کے قائل ہیں کہ قافیے کیا ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے نکالے ہیں۔ اس طبیعت داری کے قربان۔ واہ اُستاد کیا کہنا ہے۔ ساری خدائی سے کینڈا نرالا ہے۔ مگر خطوطات کی ایک ہی کہی۔ یہ بھی داخل حماقت ہے۔ قلمات توڑ دیئے۔ اور مردمات اس کا مقابلات نہیں کر سکتے۔ قافیے کے لیے بھوپال تال اور نیپال کا لانا مقدم تھا۔ بہ نینی تال کو کیوں چھوڑ دیا۔ واہ لالہ دہی بڑے لال کیوں نہ ہو۔

حسن۔ خطوطاتُ خطوط کی جمع الجمع بنائی ہے۔ دور کی سوجھی۔

نازک۔ اس فقرے کے بعد آپ نے یہ برجستہ شعر لکھا۔

برو قت از جان لالہ جیو نامدار

شتابی بہ بیکنٹھ گشتہ فرار

راوی۔ کیا؟ کیا مفرور ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بڑا کڑا وارنٹ جاری ہوا تھا۔ وہ بھی سوچ کہ برٹش عملداری میں جہاں جاؤں گا پکڑا آؤں گا۔ ایسی دور کا پاٹا ماروں کہ آرنٹ وارنٹ سب رکھا ہی رہے، اور قعر دوزخ میں وارنٹ لے کے جانے کی کسی کو جرأت ہو گی۔ ہاں اگر راقم خط لالہ صاحب کمرِ ہمت چُست باندھے تو مقام عجب نہ تھا۔

نازک۔ لالہ کے بعد جیو کے لفظ نے کیا لطف دکھایا ہے۔ اس کے بعد اور فارسی شعر لکھے۔ مگر سب بَرمحل برجستہ، اور بامعنی اور مضمون خیز۔ ؎

ایں چہ شد ایں چہ شد کہ رفت شتاب	لالہ عمر شصت و یازدہم
چوں ازیں تہنیت شدم آگاہ	بود تاریخ خوب او نہم
سینہ کوبیدم و برقصیدم	چوں شنیدم کہ بود دمی سوم
مردماں نان بگو بہ بخشایش	خالق جن و انس و بود آدم
بہرِ تاریخ فکر کردم من	گفت ہاتف بگو کہ قم قم قم

چوں نمودم دو بارہ من قم قم

شدہ تاریخ فوت لالہ گم

رُوح۔ پاگل تھا کون۔

حُسن۔ پہلے شعر میں ایں چہ شد، ایں چہ شد کی تکرار۔ کیا مزہ دیتی ہے۔ قند مکرّر سے بھی شیریں بیانی کی

حلاوت بڑھ گئی، اور لالہ کی اضافت نورٌ علیٰ نور۔

روح۔ کوبیدم کیا معنی۔ مصدر کوفتن ہے کو بیدن۔

حسن۔ ہم تو سمجھے تھے کہ فارسی بھول گئیں، مگر نہیں یاد ہے۔ آمدنامہ بھر حفظ ہے۔ اور نوا اور یہ لالہ ناچنے کیوں لگے۔ کیا رنج میں انسان تھرکنے لگتا ہے، اور مردماناں اچھی جمع بنائی۔

نازک۔ ایرانیوں کے باپ کو بھی کبھی نہ سوجھی ہوگی بہن۔ اور۔

ع۔ خالق جن و انس و بود آدم

(ہنسکر) اللہ جانتا ہے مجھ سے ہنسی ضبط نہیں ہوسکتی۔ قافیے کے لیے آدم کو آدُم کردیا ہے۔ بے دُم کا گدھا ہے۔ اُف اس آدُم نے مار ڈالا۔

حسن۔ اور۔

ع۔ ایک مصرع کی بڑھ گئی ہے دُم

رُوح۔ ہاں۔ وہ تو منشا یہ تھا کہ جن و انس بھی اور دیو بھی ہو اور آدم بھی ہو، کوئی بات رہ نہ جائے۔ قافیے سے کیا سروکار۔

حسن۔ اور یہ قم قم قم چہ معنی دارد۔ کہیں خود بدنام بدکریں۔ ہاتف بیچارے کا۔ اور دوبارہ قم قم سے کیا واسطہ یہ فقرہ (والدم) والے جملے سے بھی بڑھ گیا۔

نازک۔ قم کی اچھی کہی۔ اور تاریخ کیا صاف ہے۔

روح۔ جھٹ پٹ کہہ لی۔ مورخ بھی اچھے اور شاعر بھی۔

اس کے بعد یہ عبارت لکھی۔ برادر بجان برابر سُنو نصیحت سنو۔ (اس کو سنو نہ پڑھیے گا سنو پڑھیے) دنیا میں ملک الموت کا کسی نے مقابلہ نہیں کیا۔

راوی۔ نئی بات بنائی۔ آج تک کسی کو معلوم ہی نہ تھی۔

لالہ۔ مَلِک الموت جم راج ہیں۔ موت کے مالک یعنی بادشاہ۔

راوی۔ اے سُبحان اللہ۔ یہ معنی نئے ایجاد کیے۔ مَلِک کے معنی بادشاہ یعنی موت کے بادشاہ۔ اَب تک جو لوگ سمجھے تھے کہ موت کے فرشتے کو ملک الموت کہتے ہیں وہ غلط خیال تھا۔

لالہ۔ یہ بادشاہ ہم رعایا۔ اگر احیاناً کسی نے مثل چکلہ داروں سے مقابلہ کیا تو راانڈ والا یا گیا۔ جس طرح بندر جانور آدم تھے اَب راندے گئے تو بندران ہو گئے۔

ایک شخص نے جس کا نام حاطون تھا، ملک عرب میں دعویٰ فرمایا کہ ہم مرنے کو ٹال بخوبی کریں گے۔

راوی۔ اس ترکیب کے صدقے اور دعویٰ فرمایا۔ ماشاء اللہ۔

لالہ۔ سو خدا کو بُرا معلوم ہوا۔ ملک الموت کو مار ڈالنے کا اس شخص کے ہوا فوراً ہوا۔

راوی۔ مار ڈالنے کا اس شخص کے ہوا فوراً ہوا۔ ہم تو سمجھے تھے یہ صاحب فارسی ہی اچھی لکھتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ اُردو کے بھی استاد بے بدل ہیں۔ اور تحقیق کا درجہ تو بہت بڑھا ہوا ہے۔ نازک ادا بیگم کی لفّاظی اور طرّاری کے صدقے۔ روتوں اور افسردہ دلوں کا دل بہلانا، ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا یا توتا بانوں میں وہ رنگ باندھا کہ حسن آرا بیگم قہقہے پر قہقہہ لگانے لگیں۔

نازک۔ ابھی کیا۔ اور سنو۔ لکھتے ہیں، ازآنجا کہ میں نے خبر خلافِ مسرت اثر زبانی ان لوگوں کے سُنی جو صُمٌّ بکمٌ ہیں۔ جو منھ سے بولنا اور فرق وان سے کھیلنا نہیں جانتے۔ لہٰذا شک ہوا، اور شک بیشک ہوا کہ مبادا بفحوائے مَالَا یُدرَکُ کُلّہٗ یہ خبر غلط کی اشتہار ہوئی ہو، لہٰذا دریافت کرتا ہوں اور لکھے دیتا ہوں کہ اگر احیاناً غلط ہو تو خدا کرے والدم آپ کے نہ مرے ہوں۔

حسن۔ (قہقہہ لگا کر) پھر والد کے بعد ضمیر متکلم لائے۔

روح۔ اور مسرت اثر کے پہلے خلاف کا لفظ کتنا موزوں ہے وحشت اثر نہ لکھا۔ خلاف مسرت اثر۔ یعنی ایسی خبر جس کا اثر مسرت کے خلاف ہے۔ جو سوجھتی ہے نئی ہی سوجھتی ہے۔

نازک۔ اور اس کا مطلب بھی کچھ سمجھیں۔ زبانی ان لوگوں کے جو صُمٌّ بکمٌ ہیں۔ الخ۔ وہ کون لوگ ہیں جو حسن آرا بتائیں گی۔

روح۔ ہماری سمجھ میں تو یہ نگوڑا فقرے کا فقرہ نہ آیا۔

حسن۔ (جو منھ سے بولتا نہ فرقدان سے کھیلتا) تو ہم سمجھ گئے یعنی منھ سے بولتے ہیں، نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں اللہ عقل کام نہیں کرتی۔ اور صُمٌّ بکمٌ بھی ہیں۔ (غور کرکے) ہماری سمجھ میں نہیں آتا پھر پورا فقرہ پڑھیے، شاید ذہن لڑ جائے۔

نازک۔ (فقرہ مکرر پڑھ کر) جب جانیں کہ سمجھ جاؤ بہن۔

حسن۔ یہ بفحوائے مَالَا یُدرَکُ کُلّہٗ۔ سمجھ میں نہیں آیا۔

نازک۔ اے ہے۔ تم اس پھیر میں پڑی ہو یہ تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آئے گا۔ اور ہم بھی یہ نہ سمجھے، یہ بتاؤ کہ صُمٌّ و بکمٌ کون لوگ ہیں۔ جو نہ منھ سے بولتے ہیں نہ فرقدان سے کھیلتے ہیں۔

حسن۔ اب سمجھ گئی۔ کسی دوست کا خط گیا ہوگا۔ حروف سے مراد ہے (ہنس کر) یہ تو بدر چاچ[1] کے مضمون سے بھی بڑھ گیا۔

---

[1] ط

نازک۔ ہاں اخبار سے مطلب ہے۔ وہ ایک ہی بات ہے۔ اس کے بعد لکھے دیتا ہوں) اس نے خط کو اور بھی درست کر دیا۔ اپنے حساب لکھنے بیٹھے تھے۔ اور دعا مانگتے ہیں کہ خدا کرے اگر غلط ہو تو وہ نہ مرے ہوں۔ اُف (دو منٹ تک ہنس کر) اُف تڑپا دیا۔ اگر خبر غلط ہو تو اللہ کرے وہ نہ مرے ہوں، پھر یہ شعر لکھے۔ سب شعر برمحل اور برجستہ۔

ے دل خراب مرا مطلب ست آیت یاس — چو رود رفتن من پیش نیم کشتہ شکار

دلم چو رنگ زلیخا شکستہ در خلوت — غمم چو تہمت یوسفؑ و دیدہ از ناراز

گل حیات من از بسکہ ہست پژمردہ — اجل تمیز ندار ز ننگ بر سر دیوار

ز دوستان منافق نہاں رمیدہ دلم — کہ پیش روز سے الماس می کنم دیوار

اگر کرشمۂ وصلم کشد دگر غم ہجر

نہ آفریں ز لبم بشنوند و نہ زنہار

حسن۔ جو شعر یاد آیا فوراً لکھ دیا۔ شعر سے مطلب ہے۔

روح۔ اور نہیں تو کیا۔ مطلب

نازک۔ ان اشعار کے بعد خوب بات لکھی فرماتے ہیں، بندہ درگاہ خیر خواہ بلا اشتباہ نے وفات والدم آپ کی تاریخ موزوں کی ہے۔ اگر زندہ ہوں، اور زندہ درگور تو فہو المُراد کیونکہ اُن کے مرنے کا اس قدر رنج نہ ہوگا جس قدر اس تاریخ کے بے کار جانے کا۔ اور اگر صبح شام مرنے والے ہوں تو بھی خیر، کیونکہ ابھی اس سن کے روز باقی ہیں، ورنہ پار سال تک ایک کا داخلہ ہو سکتا ہے۔ اس سے اطلاع ضرور دینا۔ اگر وہ زندہ ہوں، اور خاندانِ سامی کے بیچ میں کوئی اور مرا ہو، یا عنقریب مرنے والا ہو تو بھی میری محنت رائیگاں نہ جائے گی۔ نام والدم آپ کے بدل کر نام اس کا درج ہو جائے گا۔

حسن آرا، اور روح افزا، اور نازک ادا، اور بہار النسا اور گیتی آرا نے اس زور سے کھل کھلا کر قہقہہ لگایا کہ نیچے تک آواز گئی۔ اور بڑی بیگم کمال مسرور ہوئیں۔

حسن۔ اپنی تاریخ کی بڑی فکر ہے۔ ان کی جان کی فکر نہیں۔

روح۔ جان کی فکر کیسی وہ تو مناتے ہیں کہ مریں۔

نازک۔ اور کیا جس میں تاریخ بیکار نہ جانے پائے۔

حسن۔ مردہ بہشت میں جائے یا دوزخ میں ان کو اپنے حلوے مانڈے سے مطلب ہے۔ تاریخ کسی نہ کسی کے کام آجائے۔

نازک۔ ہاں گھر بھر میں کوئی اور مرتا ہو یا مر گیا ہو۔ اُسی کے کام آجائے۔ اس ہمدردی کو تو دیکھیے۔

شیطان کی پھٹکار اس عقل پر اور نگوڑی کون بڑی تاریخ ہے جس پر اس قدر اتراتے ہیں۔ کہ ایک نہ ایکا مرہی جائے۔

نہ فارسی نہ عربی نہ ترکی۔ نہ تال کی نہ سم کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لُر کی
حویلی علی نقی خان بہادر کی

تم نے یہ روایت نہیں سُنی ہے کیا۔ کسی شاعر سے نواب علی نقی خاں بہادر نے فرمائش کی کہ ہمارے مکان کے بنا کی تاریخ کہہ دو۔ اس نے یہ تاریخ کہی (حویلی علی نقی خاں بہادر کی) انشاء اللہ خاں اِنشا نے جو تاریخ دیکھی تو تین مصرع اور موزوں کیے اور پیچ بھی ہے۔ سہ

کہ تال کی نہ سم کی نہ سُر کی
فارسی نہ عربی نہ ترکی

گیتی۔ بہت دن سے گیند نہ کھیلا۔ کیوں بہن۔ لاؤں۔؟

حسن۔ اب وہ شوق ہی نہیں رہا۔ وہ ولولہ ہی نہیں:

زیور ہیں نہ دستار کے نہ زیبا ہیں سر کے
مثلِ گل بازی نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے

نازک۔ ہاں اَب وہ شوق کہاں، بوڑھی ہوئیں۔ گالوں پر جُھریاں پڑ گئیں۔ کیا کریں بیچاری۔ مجبور ہیں۔ کوئی ایک سو دس برس کا سن تو ہوگا اماں جان۔

حسن۔ (مسکرا کر) ہاں اس میں کیا شک ہوگا بیشک۔

نازک۔ مگر دانت بدستور قائم ہیں۔ بیسیوں دانت گن لو۔ یہ عجیب بات ہے، اور بال بھی ابھی تک سفید نہیں ہوئے۔ پکا بال ایک نہیں نظر آتا۔ یہ کمال ہے۔

گیتی۔ تم تو ان کی بیٹی کے برابر ہو گی نازک ادا۔

نازک۔ بیٹی۔ اے پروتی کے برابر۔ ایک سو دس برس کا ان کا سن اور چودھویں بس ہم۔ ہمارا چودھواں [14] سال۔

روح۔ اونھ! اونھ! یہ کم سنی۔ دو برس اور گھٹا کے بارہ ہی برس کی نہ بن جاؤ۔ یہ تو اپنے میاں کے سامنے کہو جاکے۔ جس میں قدر کریں۔ بارہ برس کی بنو بلکہ گیارہ ہی برس کی۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

تم نے اس میں بھی دو تین سال کم دیئے۔

نازک۔ ہمارے میاں ہماری ہر حال میں قدر کریں گے۔

شب ماہ میں روح افزا کو گیند کھیلنے کا بے اختیار جی چاہا۔ حسن آرا سے کہو بہن اٹھو آؤ گیند کھیلیں اس وقت چاندنی خوب نکھری ہوئی ہے۔

حسن۔ رات کے وقت ان باتوں کا خیال نہ کیجئے۔

روح۔ یہ کیوں۔ پٹریاں صاف ہیں۔ کہیں تنکا تک تو پڑا نہیں ہے۔ کیڑے مکوڑے کا تو وہاں خوف ہوتا ہے، جہاں گھانس پھوس ہو۔

حسن۔ ہم تو اب لیٹیں گے۔ لیٹے لیٹے باتیں کریں گے بس۔

روح۔ تم آؤ نازک ادا۔ ہم تم باجی جان۔ گیتی آرا بہن سب مل کے دو گھڑی دل بہلائیں۔

حسن۔ واہ۔ دل بہلانے کا کیا عمدہ طریقہ ہے، اور دل وہ بہلا ہے جس کا دل بہلنے کی حالت میں ہو۔ یہاں تو عیش عشرت خوشی، نام ننگ، سب سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

از نکوئی نشاں نمی خواہم	خویش را بدگماں نمی خواہم
زیست بے ذوقِ مرگ خوش نبود	دل اگر رفت جاں نمی خواہم
تنگ دستان ز غصہ دل تنگ اند	بزم خنیا گراں نمی خواہم
بادۂ من مدام خون دل ست	ارمغان ارمغاں نمی خواہم
کس نمی نالد از فسانہ من	درد دل درمیاں نمی خواہم
دوستاں زینہار غم نخورند	شادی دشمناں نمی خواہم

آتش اندر نہاد من زدہ اند
لالۂ ارغواں نمی خواہم

ہائے۔ میں باغ میں کیا کرنے آئی۔ مفت میں بیٹھے بٹھائے مصیبت تازہ اٹھائی۔ افسوس۔

بے گل عذار آ کے گلستاں میں کیا کیا
ہاں یہ کیا کہ داغِ کہن کو نیا کیا

نازک۔ پھر شیطان نظر آیا۔ خدا ہی خیر کرے۔

حسن۔ بہن میرا دل تو تنور کی طرح پھنک رہا ہے۔

نازک۔ یہ کاہے سے۔ جب آزاد کے آنے کی خبر پائی تو پھر اب دل تنور کی طرح کیوں پھنک رہا ہے۔ اب

خوشیاں مناؤ کہ خدا نے یہ دن دکھایا۔ کہ ایسا طرب انگیز مژدہ سُنا۔ رنج وغم سے اب کیا سروکار ہے۔

حسن۔ ہائے مجھے خواب کی باتیں سب یاد ہیں۔ اُف کس غصے کے ساتھ کہا ہے کہ تم جا کے فقیروں اور اور درویشوں کے پاس بیٹھو۔ تم کو ان امور سے کیا تعلق ہے۔ تم کو کیا پڑی ہے توپ و تفنگ کے مورچے پر تو ہم سینہ سپر ہیں۔ مگر جو تم نے ہمارے ساتھ کیا وہ دشمن کے ساتھ بھی نہ کرنا ہو گا۔

آنچہ کردی تو بمن ہیچ بہ انساں نہ کند

مرگ با جان نہ کند کفر بہ ایماں نہ کند

ہائے غضب میری نسبت یہ بدگمانی۔ بس یہی ستم ہے۔

روح۔ حسن آرا تمہاری عقل کو یہ ہو کیا گیا ہے۔

نازک۔ تم تو کبھی خواب واب کو مانتی ہی نہ تھیں، یہ سب عقل کو کیا ہو گیا۔ تم تو کہتی تھیں کہ خواب کوئی شے نہیں ہے۔ اور سچ بھی یوں ہی ہے۔ انسان خدا جانے کیسے کیسے خواب پریشاں دیکھتا ہے۔ مگر فہمیدہ آدمی اس کا خیال تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ اے توبہ۔ مثل نہیں سُنی ہے کہ خواب و خیال۔

روح۔ ایک دفعہ خود انھوں نے ہی ایسا بے سروپا خواب دیکھا کہ جس کی انتہا نہیں۔ کبھی دریا کبھی پہاڑ اور کبھی جھیل، اور مردہ اور کبھی زندہ۔

حسن۔ دنیا کے بھی کیا کارخانے ہیں۔ عقل کام نہیں کرتی۔

ہوتا ہے شعبدوں سے ترے آسماں سفید

اُڑتا ہے رنگ چہرۂ نیرنگ ساز کا

مغلانی۔ حضور حکم ہو تو سرکار کو کہانی سناؤں۔

حسن۔ کہانی اس کو سُناؤ جس کے ہوش ٹھکانے ہوں۔

نازک۔ دیکھو حُسن آرا انھیں باتوں سے انسان کا نام بد ہو جاتا ہے۔ اور تم ہاری مانتی ہو نہ جیتی۔ کسی کی سنتی ہی نہیں ہو۔ کوئی شعر پڑھو۔

حسن۔ (آہ سرد بھر کر)

کے شعر ترانگیز و خاطر کہ حزیں باشد

یک نکتہ دریں معنی گفتیم ہمیں باشد

عشق کا گھر خراب ہو کہیں کا نہ رکھا۔ ہائے۔

نمی گویم کہ تو نامردی اے عشق ولیکن بوالعجب بیدردی اے عشق

بجان من بلا آوردی اے عشق   جہانم زا تباہی کردی اے عشق

ترا من ناخدا دانستہ بودم

زجورت جان من برلب رسیدہ   جگر خوں گشتہ از مژگاں چکیدہ

بردن کارم از دستت رسیدہ   دلت دادم مسلماں زادہ دیدہ

نہ کافر ماجرا دانستہ بودم

نازک۔ حسن آرا ان باتوں سے کیا ملے گا۔ مفت میں آنکھیں کھونے سے کیا فائدہ۔ سمجھو تو خیر۔ ورنہ تم کو اختیار ہے۔ ہم کیا کریں۔

حسن۔ ترکستان، ومازندران، اور شاہانِ عالی دودمان، سنجر و قزل ارسلان، اور بقراط و سقراط اور سعدی و خاقانی و عسجدی و نظامی گنجوی اور طاہر وحید، اور امراء القیس اور متبنی یہ سب عشق کے بندے تھے۔ کوئی بھی ایسا ہے جو عشق سے بری ہو۔ کوئی نہیں۔

نازک۔ پھر اس سے مطلب معقول۔ اچھی بے تکی ہے۔

حسن۔ بے تکی نہیں بہن، انصاف کرو کہ اگلا خواب میں بھی بلا نورکھے پن کے ساتھ بالکل خشکی مزاج میں۔ چتون تیکھی آنکھیں خون کبوتر۔

بخواب دیدہ شبے خویش را بہ بستر من

ستیزہ خوب درآمد پگاہ از درِ من

نازک۔ تارکا آنا صاف خبر دیتا ہے کہ آئے داخل ہیں۔

حسن۔ ہائے یہ سچ۔ مگر ~

نویدِ وصل دہیم می دہد ستارہ شناس

نہ کردہ ژرف نگاہے مگر در اختر من

اتنے میں مرزا ہمایوں فر بہادر کا خط آیا۔

پیاری۔ (حسن آرا سے) حضور یہ خط آیا ہے۔

حسن۔ (چونک کر) کیا ڈاک پر آیا ہے۔ یا خدا آزاد کا خط ہو۔ دیکھوں ایں! مُہر تو ہے ہی نہیں۔ کس نے دیا ہے۔

پیاری۔ سرکار۔ ایک چوب دار لایا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی ہے۔ کہا کہ خاص حسن آرا بیگم کے ہاتھ میں خط دینا۔

حسن۔ (خط لے کر) ایں! یہ خط تو ہمایوں فر کا ہے۔

پیاری۔ ہاں حضور وہیں سے آیا ہے ایک چوبدار ہے۔ ایک خواص۔

حسن آرا نے خط کھولا اور پڑھا۔

حسن آرائے بیگم کو ہمایوں فر کا خادمانہ سلام پہونچے۔ زیارت تو محال ہے۔ شومی طالع۔ مگر المکتوب نصف الملاقات ہی سہی مجھ پر جو جو سختیاں گذریں میرا خدا ہی خوب جانتا ہے۔ مگر خود را چہ علاج ــــ از ماست کہ بر ماست۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے سے بھی گریاں نکلا

خیر مضیٰ ما مضیٰ۔ ع

کہاں تلک کوئی رویا کرے گلہ دل کا

آپ کی چھوٹی ہمشیرہ (جان میری) چاہتی بیوی بخیر و عافیت ہیں۔ خوش و خرم دلشاد۔ مسرور و محفوظ۔ مگر ابھی کچھ دن تک میں کسی سے مل نہیں سکتا۔ صرف سپہر آرا میرے پاس رہتی ہیں۔ اور کبھی کبھی ہنسی بھی آجاتی ہیں۔ بس۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔ کیا کہوں بیٹھے بیٹھے جی اکتایا کرتا ہے۔ سپہر آرا بیگم اور مہ لقا بیگم سے شطرنج ہوا کرتی ہے۔ ایک نقشہ حل طلب آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ جب جانوں کہ غور کر کے حل کر دیجئے۔

سرخ

	شاہ سبز						
پیادہ سبز	پیادہ سرخ			اسپ سرخ			
	پیادہ سرخ						
	پیادہ سبز						

سبز

سرخ پہلے چلے اور سات چال میں مات کرے۔

حسن۔ سات چال میں! یہ نیا نقشہ۔

نازک۔ شطرنج منگوالو۔ غور کرو۔ شاید نکل آئے۔

حسن۔ جو نقشہ صحیح ہے تو نہ نکلنا کیا معنی، اور جو نقشہ ہی غلط ہے تو مجبوری ہے۔ مگر سات چال کا نقشہ آج تک نہیں سُنا۔

نازک۔ (روح افزا کے کان میں) یہ خط آنا اس وقت اکسیر ہوگیا۔

حسن۔ شطرنج لے آؤ پیاری۔ چاندی کی مُہروں کی۔

روح۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ دیکھو اس وقت ان کی کیا کیفیت تھی۔ اب یہ بے غور کیے نہ رہیں گی۔ اور دیکھ لینا نکال ہی چھوڑیں گی۔

حسن۔ پہلی مرتبہ بھی انہوں نے ایک نقشہ بھیجا تھا۔ ہم نے حل کر دیا۔ اب دیکھیے اب کی عزت رہتی یا نہیں۔

حسن آرا بیگم تو ادھر شطرنج کے نقشے پر غور کر رہی تھیں اُدھر ہمجولیوں میں باہم چُہل ہوتی تھی۔

روح۔ باجی جان آپ کے بال ہوا سے بکھر جاتے ہیں۔

بہار۔ تمہاری بلا سے بکھرنے دو۔ تم کو ہمارے بالوں سے کیا واسطہ۔ اپنے بالوں کی فکر کرو۔ کیا کچھ چڑھ نکال لی ہے۔ ہم ایسی باتوں سے نہیں چڑھنے۔

گیتی۔ آج گیسو اچھی طرح سنوارے نہیں گئے۔

روح۔ ذرا تردد میں تھیں نہ۔ یہی سبب ہے۔ بس۔

بہار۔ کیا اس وقت سب کی سب ایک ہوگئیں۔

نازک۔ تمہارے میاں بڑے خوش قسمت ہیں بہن۔ ہر دم بناؤ چناؤ کے ساتھ رہتی ہو۔ ؎

خدا جانے یہ آرایش کرے گی قتل کس کس کو

طلب ہوتا ہے شانہ آئینے کو یاد کرتے ہیں

بہار۔ ہماری آرایش کیا۔ آرایش تم لوگوں کی ہے جو ماشاء اللہ سے جوان جہان ہو۔ ہم کس شمار میں ہیں بھلا مگر۔ ؎

مرا ہم چنیں چہرہ گلفام بود

بلور نیم از خوبی اندام بود

حسن۔ اب تم لوگ باتیں نہ کرو۔ ہم نقشہ حل کر رہے ہیں۔

روح۔ اچھا چلو اس طرف چلیں۔

نازک ادا نے کہا کیوں حُسن آرا ہمایوں فر نے تم کو اور سپہر آرا دونوں کو دیکھا تھا۔ اس کا کیا سبب ہے کہ تم کو پسند نہ کیا، سپہر آرا کو پسند کیا۔ حُسن میں، سن میں، جوبن میں، ادائیں، آن میں، کسی بات میں

تم اپنی بہن سے کم نہیں ہو۔ پھر اس کا کیا سبب ہے کہ سپہر آرا ہی پر ریجھے۔

روح۔ طبیعت دل۔ اور ان سے تو یہ بھی نہیں سکتے تھے۔

نازک۔ چاہے بُرا مانو چاہے بھلا۔ ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ہم نے آج تک کسی بھلے مانس کی لڑکی کو کسی مردوے کے پیچھے ایسا گرویدہ نہیں دیکھا جیسا۔ حسن آرا کو دیکھا' یہ تو اپنے آپ ہی سے گذر گئیں بالکل مجھے ہنسی آتی ہے اور کچھ رنج ہوتا ہے۔ دُلھن وہ جو گھنٹوں ایجاب و قبول میں شرمائے۔ قبلہ و کعبہ ہوں یا مُفتی۔ سوال کرتے تھک جاتے ہیں۔ اور وہ جواب نہ دے نہ یہ کہ ماں باپ کو رکھے طاق پر' اور اپنا میاں اپنے آپ ڈھونڈھ نکالے۔ طرّہ یہ کہ روم کی لڑائی پر بھیجدے اے واہ۔ اب ہم اپنے میاں کو سپاٹو کی ہوا کھلائیں گے۔ کہاں کا جھگڑا کھدوں گی میاں چند روز کے لیے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ سپاٹو کے پہاڑ پر دو ہزار جانوروں کا شکار کرو' اور پھر جنگل جا کے شیر مارو اور شیر افگن خاں کا خطاب پاؤ۔ تب تو ہم بیوی بنیں ورنہ ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔ پھر ہم اپنا نام نور جہاں بدل دیں گے۔

اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا۔ یہ سب ہمجولیاں ہنس ہی رہی تھیں کہ بڑی بیگم صاحب جریب ٹیکتی ہوئی باغ میں آئیں۔ دیکھا کہ یہاں قہقہے پڑ رہے ہیں۔ سخت متحیر ہوئیں کہ یا خدا یہ کیا اسرار ہے ابھی تو خبر آئی تھی کہ حسن آرا کے دشمن ننکے چُننے لگے' اور یہاں آئی تو قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔

بڑی بیگم۔ حسن آرا کہاں ہیں۔ اب کیسی ہیں۔

عباسی۔ فضل الٰہی ہے۔ بیٹھی شطرنج کھیل رہی ہیں۔

بڑی۔ کس سے اور دوسری کون ہیں۔ روح افزا۔؟

عباسی۔ نہیں حضور آپ ہی آپ۔ اور کوئی نہیں ہے۔

بڑی۔ اے واہ۔ کہیں اکیلے اکیلے بھی شطرنج کھیلی جاتی ہے۔

روح۔ (آگے بڑھ کر) کیوں نہیں کھیلی جاتی۔ اماں جان نقشہ ہے۔ وہی بیٹھی نکال رہی ہیں۔ اُس وقت جنون کا زور تھا۔ مگر جب سے مرزا ہمایوں فر کا خط آیا تب سے ذرا اطمینان سے بیٹھی ہیں۔

بڑی۔ اللہ اطمینان ہی رکھے کیا جانے اس لڑکی کو کیا ہوتا ہے۔ کبھی ایک ہفتہ تک صحیح نہیں رہتی ہے مجھے اس کی طرف سے بڑا اندیشہ ہے۔

حسن۔ اماں جان میں سُنتی جاتی ہوں' مجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔ ؏

دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی ترست

بڑی۔ تم گھبراؤ نہ بیٹا۔ اللہ فضل کرے گا۔ اور تمہاری آرزو بر آئے گی۔ کیا اس کی کریمی سے کچھ بعید ہے

کون جانتا تھا کہ آزاد میدانِ جنگ سے بخیر و خوبی واپس آئیں گے۔ کس کو معلوم تھا کہ وہ تمغے لٹکائیں گے۔ مگر خدا کی شان۔ تو بیٹا اس کی کریمی سے کچھ بعید نہیں ہے۔

حسن۔ اماں جان ذری غور کرنے دیجئے۔

روح۔ ہاں اماں جان اب ان کو نہ چھیڑیئے۔

گیتی۔ اب آپ جائیں یہ اچھی ہیں۔

نازک۔ ہاں ہاں۔ ہم آپس میں ہنس بول رہی ہیں۔ اور حسن آرا کا مزاج اب بہت اچھا ہے۔

تنت نباز طبیبان نیازمند مباد　　　وجود نازکت آزردہ گزند مباد

ہمیں دعا طلبم روز و شب ز ایزد پاک

بہیچ عارضہ شخص تو دردمند مباد

روح افزا اور بڑی بیگم محلسرا میں گئیں، تو اس بوڑھی عورت نے روح افزا سے کہا بیٹا ہم نے کل رات کو خواب میں دیکھا تھا کہ ایک سانپ حسن آرا بیگم کی چارپائی کے نیچے پھنکار رہا ہے۔ قریب تھا کہ حسن آرا چارپائی کے نیچے ہاتھ لٹکا کر ٹٹول کے دیکھیں کہ کون جانور ہے۔ اتنے میں ایک موریلا نظر آیا۔ حسن آرا کا ہاتھ لٹکانا تھا کہ سانپ بڑھا، اور ہاتھ میں کاٹنے ہی کو تھا کہ طاؤس رنگیں پر و بال نے جھپٹ کر سانپ کو شکار کیا۔

روح۔ اماں جان یہ تو خوب ہی خواب ہے۔ سچا اور صاف۔

بڑی۔ کل خواب دیکھا آج اس کی صداقت ہوئی۔

روح۔ مور تو سانپ کا دشمن ہے سانپ کی مور کے آگے نہیں چلتی۔ خدا کے بھی کیا کارخانے ہیں۔

بڑی۔ بس سمجھ گئی کہ حسن آرا کے دشمن کسی مصیبت میں مبتلا ہونے والے ہیں، مگر خدا کا شکر ہے کہ سانپ کے لیے مور بھی موجود ہے۔ جو مرضیِ خدا۔

گاہے خود را براوج چوں مہ دیدی　　　کہ چو یوسفؑ فتادہ در چہ دیدی

میدانندت چناں کہ می خواہندت

کار تو بہ جہد ہست صدرہ دیدی

تم فارسی پڑھی ہو اور میں اَن پڑھ ہوں۔

روح۔ تو اماں جان اب تو آئی ہوئی ٹل گئی۔

بڑی۔ ہاں شکر ہے خدا کا۔ جیسی یہ ٹلی اللہ کرے سب کی مصیبت اسی طرح دور ہو جائے۔

دشمن بھی کبھی ایسا روز سیہ نہ دیکھے۔

روح۔ اماجان سُنتے ہیں کہ آزاد کے ساتھ کوئی عورت اور بھی آتی ہے۔ یہ بُری ہوئی اماجان۔

بڑی۔ منکوحہ ہے کہ غیر منکوحہ یہ بتاؤ ہمیں۔

روح۔ اس سے کیا واسطہ۔ دونوں یکساں۔ سوتیاڈاہ برابر ہے۔

بڑی۔ ایک شخص کے چار محل تھے۔ ایک منکوحہ تین غیر منکوحہ۔ ایک روز اس نے ایک غیر منکوحہ سے پوچھا کیوں بیوی تم کو کون فصل پسند ہے۔ اس نے کہا فصل سردی کی سب سے اچھی ہے۔

میاں۔ سردی کی فصل میں کیا بات ہے۔

بیوی۔ کھانے کا لُطف پینے کا لُطف، پہننے کا لُطف۔ گرما گرم بستر میں آرام سے سو رہے ہیں۔ معشوق سے بغل گرم ہے۔ شراب خواری غرض کہ ہر قسم کا لُطف حاصل ہوتا ہے۔

میاں دوسری بیوی کے ہاں گئے پوچھا بیوی تم کو کون فصل پسند ہے۔ میاں سب سے گرمی کی فصل اچھی ہے۔ خس خانہ ہے۔ برف آب ہے۔ پنکھا چل رہا ہے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے حقے پی رہے ہیں۔ پھولوں ہاروں کی خوشبو آرہی ہے۔ چین ہی چین لکھتا ہے۔

تیسری کے ہاں گیا۔ وہاں بھی یہی پوچھا۔

میاں۔ کیوں بیوی سب سے بہتر کون سی فصل ہے۔

بیوی۔ میاں فصل ہے برسات کی اور باغ میں بیٹھے ہیں۔ مینھ برس رہا ہے جھما جھم۔ کوئل کوک رہی ہے بار بار۔ سامنے ہرے بھرے درخت لہلہا رہے ہیں۔ زمردیں پتے مزہ دکھا رہے ہیں گلابیاں چُنی ہوئی ہیں۔ شراب برابر لنڈھائی جاتی ہے۔ معشوق پری زاد پہلو میں جھڑی لگی ہوئی ہے گوئی ساون گاتا ہے کوئی ملہار اڑا رہا ہے۔

اس کے بعد میاں منکوحہ بیوی کے پاس آئے۔

بیوی۔ اخاہ! آج بعد مدت کہاں بھول پڑے۔

میاں۔ ایک بات پوچھنے آئے ہیں۔ فصل کون اچھی۔

بیوی۔ کیا فصل کیسی۔ کیا کوئی پہیلی ہے۔؟

میاں۔ تینوں فصلوں میں تم کو کون فصل سب سے زیادہ پسند ہے۔ سردی کہ گرمی کہ برسات یا کوئی نہیں یا سب،

بیوی۔ میاں فصل روپے کی سب سے اچھی۔ بے زر عشق ٹیں ٹیں۔ اگر زر نہیں تو سردی گرمی برسات

تینوں فصلیں بے کار ہیں۔ سردی میں مارے جاڑے کے اینٹھ جائیں گے۔ گرمی میں لُو کے تھپیڑے جُھلسا دیں گے۔ برسات میں چھپر ہزار جگہ سے ٹپک رہا ہے۔ مقدم چار پیسے ہیں۔ سو فصل روپے کی سب سے اچھی۔ ورنہ خیر صلاح ہے۔

خواجہ بدیع مبرور

ساقی بیا کہ شد قدح لالہ پُر زمی
طامات تا بچند و خرافات تا بکی

کچھ دن تک تو آزاد پاشا مصر میں اس طرح رہے جس طرح اور مسافر رہتے ہیں، مگر جب کانسل کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا اپنے اٹاچی کو جو ہندی تھے ہوٹل بھیجا، اور کہا اُن سے کہو یہاں آئیں۔ اور ہمارے مہمان رہیں۔ اٹاچی نے ہوٹل میں آن کر آزاد سے ملاقات کی اور بہت تپاک ظاہر کیا۔

اٹاچی۔ مجھے کانسل نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ان کو سخت شکایت ہے کہ آپ آئیں اور ہم سے نہ ملیں، جس بسالت اور شجاعت سے آپ نے میدانِ جنگ میں کارنمایاں کیے اس کا شہرہ دور دور تک ہوا۔ ایسا شاذ ہی کوئی ہوگا، جو آزاد پاشا کے نام نامی سے واقف نہ ہو۔ جو اخبار آتا ہے اس میں آپ کا ذکرِ خیر ضرور ہوتا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ مسخرہ کون ہے وہ بونا خوجی۔

آزاد۔ (مسکرا کر خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔) یہ صاحب۔

خو۔ جی وہ مسخرے اور بونے کوئی اور ہوں گے اور خوجی خدا جانے کس بھکوے کا نام ہے ہم جناب غفران مآب خواجہ بدیع الزماں بدیع ہیں۔ خوش مذاق لطیفہ گو۔ مسخرے کے پڑوس نہیں رہتے۔ اور بونے کی ایک ہی کہی۔ ہائے میں کس سے کہوں کہ میرا بدن چور ہے۔ بونا لائے وہاں سے ہونھ!

آزاد۔ خواجہ صاحب کا ذکر مذکور بھی اخبار میں پڑھا ہوگا۔

کانسل۔ جی ہاں۔ ان کی بڑی دھوم ہے۔ مگر ایک مقام پر تو واقعی انھوں نے کارنمایاں کیا۔ خواجہ صاحب کا ذکرِ مذکور کانسل صاحب سے بھی رہا ہے۔

راوی۔ آزاد اور اٹاچی دونوں نے خواجہ صاحب کے بعد لفظ ذکر مذکور جو کہا تو حضرت بہت بگڑے۔ سمجھے کہ خواجہ مذکور کہا بگڑ کر فرماتے کیا ہیں۔

خو۔ خواجہ مذکور؟ خواجہ مذکور کوئی اور ہوں گے۔ ہم خواجہ موصوف ہیں۔ اور خواجہ ممدوح کہو۔ خواجہ صاحب

محتشم البلہ کہو خواجہ مذکور نفرون کو کہتے ہیں۔

آزاد۔ گستاخی ہوئی مذکور نہیں خواجہ مبرور سہی بس ؟

خو۔ ہاں یہ مانا۔ خواجہ صاحب مبرور تک خیریت ہے۔

راوی۔ جی اس میں کیا شک ہے۔ مبرور نہیں صاف صاف مرحوم و مغفور سہی۔ کہاں کا جھگڑا اگر مذکور البتہ خلاف شان ہے۔

اٹاچی۔ آپ کا دولت خانہ کس شہر میں۔ جناب خواجہ صاحب مبرور کرسی میں تو ریاست نہیں ہے حضور مبرور کی

خو۔ جناب بندے کا دولت خانہ اودھ کے بیچ میں ہے۔

راوی۔ بہت ہی خاصے۔ کرسی نہیں گو پا مو سہی۔

کانسل۔ مجھے اس وقت سخت حیرت ہے کہ اتنے ننھے ننھے تو آپ کے ہاتھ پاؤں یہ جنگ میں آپ کس برتے پر شریک ہوئے تھے۔

خو۔ (مسکرا کر) یہی تو کہتا ہوں حضرت کہ بندۂ درگاہ کا بدن چور ہے۔ دیکھئے ذرا ہاتھ ملائیے۔ ہیں فولاد کی انگلیاں یا نہیں۔ ہر رگ و پے میں فولاد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اور اگر ابھی زور کروں تو آپ کی ایک آدھ انگلی موڑ کے رکھ دوں۔

اٹاچی کو غصہ آیا کہ مرا ہوا آدمی اور ہماری انگلیاں توڑنے کا زعم جھلا کر انگلیاں ذرا کڑی کیں تو خواجہ بدیع مبرور کی جان پر بن آئی۔ اور چیخ کر کہا۔ اُدگیدی۔ اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ یاد کرے گا۔ آزاد ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔ اٹاچی سے کچھ دیر تک گفتگو ہوئی۔

آزاد نے وعدہ کیا کہ شام کو ضرور حاضر ہوں گا۔ اٹاچی رخصت ہوئے۔

خو۔ یہ آپ کی عجیب عادت ہے کہ اغیار ناہنجار کے سامنے اتنے بڑے لائق اور سورما اور مبرور دوست کی ہجو کرتے ہیں اور جو ہاتھ ٹوٹ جاتا تو کیسی ٹھہرتی۔ میں مارے مروت کے بولا نہ چاہوں ورنہ میاں کی سٹی پٹی بھول جاتی۔

آزاد۔ یہ حضور ہر مقام پر مروت کو کیوں دخل دیتے ہیں۔ ایسی مروت کیا۔ جس سے خوامخواہ جوتیاں کھائیے۔ کئی مقام پر آپ پٹے۔ کئی مقام پر آپ نے جوتیاں کھائیں۔ کئی مقام پر آپ ذلیل ہوئے، مگر مروت نہ چھوڑی۔ اس مروت کی بدولت ایک دن کہیں کانجی ہاؤس نہ بھیجے جائیے۔

خو۔ (مسکرا کر) ارے میاں دل ہی تو ہے (چونک کر) کیا کہا کیا کہا۔ جوتیاں کھائیں، نکالے گئے۔

کس مردک نے جوتیاں کھائیں اور کس مردک نے لگائیں۔

راوی۔ ایں! خواجہ مبرور و مردود کی نسبت یہ گستاخانہ کہا، خبردار خواجہ مبرور اور جوتیاں اور کفش کاری۔!

آزاد۔ کیوں خواجہ صاحب۔ جب ان سب نے ہمارا حال سُنا تو کیا حسن آرا نے نہ سُنا ہوگا۔

خو۔ ضرور بالضرور۔ اب آج کے آٹھویں دن شادی کرلو۔ مگر استاد ذرا دو ایک دن بمبئی میں ضرور رہنا۔ وہ شوخ اس وقت نظر کے سامنے ہے۔

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضوان رفتم

ہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنباں رفتم

آزاد۔ گھبرا کے شعر پڑھ ہی دیا خواجہ مبرور نے۔ بھائی اگر حسن آرا بیگم ہمارے حالات اخبار میں پڑھتی گئی ہیں تو۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

خو۔ اجی گھبراتے کیوں ہو بھائی جان:

در نظرم رو بہ از نامہ خوش ست ... بادہ بدیں وجہ موجہ خوش ست

نغمہ چہ می ہوش ز سر می برد ... رہ زدن مطرب ایں رہ خوش ست

ہر کہ ز چہ آب کشد سود اوست

سبزہ کہ روید بلب جو خوش ست

خواجہ صاحب نے بڑی خوشی ظاہر کی۔ کہ کانسل اور اٹاچی صرف آزاد ہی سے نہیں واقف ہیں، بلکہ ایں جانب کا نام بھی بخوبی جانتے ہیں۔ فرمایا کہ کیوں بھائی آزاد تم نے جان جوکھم کی تو نتیجہ معقول نکلا۔ حسین آرا سی حسین و مہ جبین بیوی پالی۔ ہم نے جو جان لڑا دی تو کیا پایا۔

آزاد۔ یار تم بھی ایک پریا کے ساتھ شادی کرلو۔ اب راستے میں تو ہم کہیں ٹھہریں گے نہیں۔ یہیں سے تجویز کرلو۔ ادھر ہندوستان پہونچے اُدھر کھٹ سے شادی ہوگئی۔ مگر کوئی اچھی سی تجویز رو۔

خو۔ سوچو۔ پھر سن سال زیادہ نہ ہو۔ اور شکل صورت اچھی ہو۔ بس ہم تو صرف اس قدر چاہتے ہیں۔ دو باتیں ہوں۔

آزاد۔ حسن آرا کے مکان کے پاس ایک درزی رہتا ہے۔ اس کی بیوی بس کچھ نہ پوچھو۔ رنگت تو سانولی ہے مگر ایسی نمکین کہ کیا کہوں۔ اور ابھی کم سن، بہت ہو، بہت ہو کوئی چالیس بیالیس۔

راوی۔ بس اس قدر کمسن کے ساتھ تو خواجہ صاحب مبرور شادی نہ کریں گے۔ ہمیں یقین نہیں ہے۔

آزاد۔ اور درزی دن رات زمین کا گز بنا رہتا ہے۔

خو۔ کیا خوب مگر یکسوئی نہیں حاصل ہوئی۔ ؎

اُس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجّام

چھن جائیں گے اوزار کسی روز تمہارے

آزاد۔ خیر اجی ضلع جگت کو بالائے طاق رکھو۔ اس درزن کی فکر کرو۔ اور لُطف یہ کہ گھر میں دو میاں بیوی بس۔ اللہ اللہ خیر صلاح سو بیوی کو تو آپ ہتیایئے، اور میاں کو جہنم واصل کیجئے۔

خو۔ بھلا مُیڈا میں اور اس میں کیا فرق ہے۔

آزاد۔ یہ اُن سے دو چار برس کم سن ہیں۔ یہ سرخ و سفید ہیں۔ وہ نمکین ہے۔ بس اتنا فرق ہے اور کچھ نہیں۔

خو۔ اسمِ شریف اُن کا کیا ہے۔ مسلمان ہے نا۔

آزاد۔ اور نہیں تو کیا ہندنی کے ساتھ شادی کروگے۔ عجب بیوقوف آدمی ہے۔ نام شتاب جان ہے۔

خو۔ مگر پکّی بوڑھی بات تو ہو لے پہلے۔

آزاد۔ آپ کو اِس سے کیا واسطہ۔ کچھ تو سمجھ کے ہم نے کہا ہے۔ ہمارے پاس اُس کا خط آیا تھا کہ خواجہ صاحب اگر منظور کریں تو میں حاضر ہوں۔

خو۔ ہاں۔ بس اب ہم قائل ہو گئے۔ بس انشاء اللہ آج کے آٹھویں روز شتاب جان ہماری بغل میں ہوں گی۔ نام کتنا پیارا ہے۔

آزاد۔ شام کو کانسل سے مل کے چلے چلو آج ہی۔

خو۔ اجی کہاں کا کانسل۔ ہم کو شتاب جان کی پڑی ہے۔ یا ہمارے سامنے خط لکھ کے بھیجدو۔ مضمون ہم بتائیں گے۔

آزاد۔ (قلم دوات لیکر) بتاتے جاؤ۔

خواجہ صاحب نے شتاب جان کے نام آزاد سے خط لکھوایا۔

مشفق و مہربان بی بی شتاب جان سلمہ الرحمان!

بعد ملاقاتِ جسمانی و زیارتِ روحانی کہ مافوق آں نہ باشد۔ از نگاہِ ملاحظہ کنند کہ از برادر صاحب مکرمی ام جناب غفران آب خواجہ بدیع الزماں بدیع کہ از بس لائق ملاقات و افزونی محبت شدند ملاقی شدہ، گفتگوئے شدم۔ گفتم کہ زنے جمیلے و حسینے و بہتر از یوسف لقائے قوم۔

درزی کی فارسی کیا ہے بتانا نہیں۔ درزی کی فارسی۔ لاحول ولا قوۃ بتایئے گا نہیں۔ حجام نائی تیتر بینی فروش۔ حلوائی۔ ترہ فروش، ترکاری والا۔ تمباکو فروش، تمباکو والا۔ شیر فروش، گھوسی۔ پارچہ والی گلی بزاز

عطار، عطر بیچنے والا۔ گوش صاف، کان میلیا۔ گل فروش، مالی۔ گل فروشن، مالن۔ زمانے بھر کی فارسی یاد ہے درزی کی فارسی بھول گیا۔ اچھا گڑھ لوں گا۔ یوسفؑ لقائے قوم آں کہ جامہ قطع کردہ بر بالائے زنان و مردمان و بچگان چہ یکسالہ و چہ دہ سالہ راست بر قدے کند، برائے برادر تیارست۔ آں خواجہ بدیعا کہ درمیدان برائے جنگ دو اسپہ راند۔

کوکبہ بین وعلم وکوس و نامی　　پرچم رقصندہ بفرقِ لوائی

حاجب و سرہنگ روان پیش پیش　　فوج رواں ازپس کشور کشائی

چشم تسم خوردہ بہ رفتار پیل　　گوش زخود رفتہ ببانگ درائی

آنکہ دریں دائرہ لاجورد

تاج زر از خسرو خاور گرفت

آں خواجہ صاحب بدیع، مبرور، رابرائے عقدِ شما تیار کرانده امیدوارم کہ از تاریخ نکاح خواجہ مبرور و آں جانِ جہاں معشوق من اطلاع شود (چونک کر) خیاط خیاط۔

درزی کو خیاط کہتے ہیں خوب یاد آیا۔ گازر دھوبی خیاط درزی اور یہیں شعر بھی اس کا یاد ہے بے تامل شعر پڑھ دیا۔ ؎

خیاط زمانہ بے تکلف

بر قد تو دوخت جامۂ فتح

ہاں صاحب لکھیے۔ آں خواجہ بدیعا کہ از حسن و جمال وے بوے یوسفی مات دہاں تنگش رشک جیحون وفرات:

سیم تن خوش لقا و گل رخسار　　یوسف عصر ہست و باغ و بہار

خواجہ خواجگان بدیع الدین　　گلِ باغِ لیاقت و ایثار

وقت رزم آں کہ شیر دل بودہ

وقت بزم آں کہ بود بس سرشار

خواجہ صاحب رسالدار بُدہ۔

دوسرا مصرعہ موزوں نہ ہوا کہا بجنسہٖ چھوڑ دو۔

ہر چند در اوائل اوائل، خواجہ صاحب بدیع الزماں انکار نمودہ شد۔ کہ من مردے ہستم حسین و مبرور چرا بایں طور نکاح بمنظوری وہم والانہ از گفت و شنود من گفت کہ بسیار بہتر ؎

شادیٔ جلوۂ گل فام مبارک ہووے

عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہووے

اس کے بعد خواجہ صاحب نے خط پھر سُنا۔ اور یوں ہدایت کی۔

خو۔ درا وائل اوائل۔ اس کے کیا معنی سمجھے۔

آزاد۔ یعنی پہلے پہل۔ یا ابتدا ابتدا میں کیوں نہ کہو گے۔

خو۔ (پیٹھ ٹھونک کر) شاباش۔ شاباش۔ اچھا خط کو ختم کرو۔ آخر میں لکھدو۔ راقم آثم آزاد پاشا۔ آثم شین سے لکھنا۔

آزاد۔ میں تو ثے سے لکھ گیا۔ اب بنا دوں۔

خو۔ نہایت بد املا ہو۔ اب کہیں املا الف سے نہ لکھ جانا۔ عین میم الف لام۔ اِملا کی املا ہے۔

آزاد۔ بجا ارشاد ہوا۔ عین میم الف لام تو عمّال ہو گیا

خو۔ وہ ـــــ لاحول ولاقوۃ۔ نہیں میم لام الف عمّال۔

اب سنیئے کہ خط لکھ کے تیار ہوا۔ اور بھیج دیا گیا۔ اور خواجہ صاحب کمال مسرت کے ساتھ ادھر ادھر گپیں اُڑانے لگے۔ بس مُیڈا سے جاکے کہا اب ہماری خوشامد کیجئے۔ آج کے آٹھویں روز ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہو گی عمدہ سے عمدہ قسم کی برانڈی تجویز کر رکھیے۔ بی شتاب جان کے ہاتھ پلواؤں گا۔

مُیڈا۔ شتاب جان کون۔ تمہاری بہن کا نام ہے۔

خو۔ ایں! توبہ۔ شتاب جان سے مجھ سے شادی ہونے والی ہے۔ اس نے مجھے بھیجا تھا کہ وہاں جاکے نام کرو، لڑو، کٹو، مرو، تو پھر نکاح ہو گا۔ کہو اب میں سُرخ رو ہوا ہوں۔ اس وقت جامے میں پھولے نہیں سماتا۔ ابھی آزاد نے کہا کہ ان کے کئی خطوط ان کے نام آچکے ہیں۔

شنیدم چو آزاد من ایں سخن
زشادی نہ گنجید در پیرہن

مُیڈا۔ کیا سن ہو گا بیوہ تو نہیں ہیں۔

خو۔ خدا نہ کرے درزی زندہ ہے ابھی۔ بیوہ کیسی چہ۔

مُیڈا۔ کیا میاں والی ہے۔ ماشاء اللہ اور آپ اس کے ساتھ نکاح کریں گے اور میاں کہاں جائے گا۔ سن کیا ہے۔

خو۔ ابھی کیا سن ہے۔ کل کی لڑکی ہے کوئی بیالیس برس کی انتہا چوالیس سال۔ بس پینتالیس ہو شاید۔

راوی۔ بس پچاس کے پیٹے میں ہیں۔ عین عنفوانِ شباب۔

مُیڈا۔ پینتالیس ہی برس کی ہے۔ کیا پالو گے اُسے۔

خو۔ (ہنس کر) ہم کو تو اپنی قسمت پہ ناز ہے۔

مُیڈا۔ بھلا شکل صورت کیسی ہے۔ بد قطع تو نہیں ہے۔

خوب۔ آزاد سے پوچھ لو چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ میں تو آزاد کو دعائیں دیتا ہوں جن کی بدولت خواجہ صاحب مبرور کو شتاب جان ملی بس۔ واہ خواجہ مبرور کیوں نہ ہو ؎

تا گل و سبزہ و ریحان ز خیاباں جویند
تا کف و موجہ و گرداب بہ دریا بینند

آزاد فرخ نہاد مع خوجی ومہ وشال پریزاد رونق بخش بمبئی ہوئے

آمد آشفتہ بخوابم شبے آں مایہ ناز
ہر دوش مہر فزاد بہ نگہ صبر گداز

وہ چہ شب سرمۂ آہوئے غزالانِ ختن
وہ چہ شب وسمۂ ابروئے عروسان طراز

چہ پری چہرہ نگارے کہ ندارد د شکش
در پس پردۂ فطرت فلک بست یا ز

خواب نے زاویۂ دارد او والی حسن
خواب نے آئینہ صورت او معنی ناز

خواب را شب ہمہ شب دیدہ بپا میسودم
کہ بروئیم در ایں واقعہ را ساختہ باز

ایک شب کو آزاد فرخ نہاد بادل شاد دس بجے کے بعد بستر استراحت پر گئے۔ معشوقہ پریزاد یاد آئی۔ شوقِ وصل نے گدگدایا۔ سوچے کہ بعد خرابی بصرہ یہاں تک خدا لایا۔ میدانِ کارزار میں کوس نصرت بجایا۔ غنیم کو نیچا دکھایا۔ عروس آرزو سے دوچار ہوئے۔ شاہد مراد سے ہمکنار ہوتے۔ اب انشاء اللہ مع الخیر داخل منزلِ مقصود ہوں گے۔ رنج کے بعد راحت پائیں گے۔ خوشیاں منائیں گے۔ اسی خیال میں آنکھ لگ گئی تو خواب میں حسن آرا نے صورت زیبا دکھائی۔ بوس و کنار کی نوبت آئی۔ معشوق سراپا ناز شیخ وطناز کا جوبن خوبان طراز پر رنج زن تھا۔ الٰہی یہ جادو تھا یا جوبن تھا ؎

بت دلربا بعتے دلفریب
بلای قرار و عدوی شکیب

ز سر تا بپا باغ آراستہ
شگفتہ در و انچہ دل خواستہ

گلشن مشک سا سنبلش گل فروش   یہ شام پرور شب صبح پوش
بقامت صنوبر بہ چہرہ آفتاب   دو ہندو بہ یغماد و جادو بخواب

سیہ نرگس از رستی خراب
دو آہو بہ چنگال شیران بخواب

صبح کو آنکھ کھلی تو خوش خوش بستر سے اٹھے۔ دیکھا خواجہ بدیع الزمان صاحب بدیع پلنگ میں پڑے ہیں۔ آہستہ سے جگایا۔ دونوں نے مل کر نماز صبح پڑھی۔ بعد فراغ نماز خوجی اور آزاد میں۔ باتیں ہونے لگیں۔ آزاد نے کہا خواجہ صاحب شب کو ہم نے خواب دیکھا تھا کہ حسن آرا ایک سجے سجائے کمرے میں نازک پلنگڑی پر بصد ناز و ادا متمکن ہیں۔ ادسا تن جانب کے ہاتھ میں ان کا دست سیمیں ہے۔ بوسہ بازی ہوتی جاتی ہے۔ معشوقہ پری وش کبھی لجاتی کبھی مسکراتی ہے، اس وقت حسن آرا پر عجیب عالم تھا۔ جب سے ایزد پاک نے لفظ کُن سے دنیا نمودار اور ما فیہا کو آشکار کیا۔ حسن آرا کی سی دخت گلفام حور دیکھ کر رشک قمر خلق نہیں ہوئی جمال دلربا کے مقابل میں لیلیٰ و شیریں کا جمال دلفریب گرد اور حسن گلو سوز و عالم افروز کی خجلت سے رنگ مہر منیر زرد۔ ہنگام تقریر منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

میدہد گفتار تو جان کشتہ زار ترا
ظاہر اخاصیت عیسیٰ ست گفتار ترا

خواجہ صاحب نے یہ تقریر سن کر منہ بنایا اور فرمایا، ع

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

آخر ابھی بچے ہی ہو نہ۔ اول تو دن کے وقت خواب کا بیان کرنا غلطی ہے۔ مسافر گمراہ ہو جاتا ہے۔ دوسری غلطی یہ سرزد ہوئی کہ آپ نے شعر غلط پڑھا۔ ع

میدہد گفتار تو جان کشتۂ زار ترا

غلط ہے یوں کہیئے۔ ؎

میدمد گفتار تو جان کشتۂ زار ترا

میدمد کیا معنی۔ میدمد کہیئے۔ تیسری غلطی آپ نے یہ کی کہ حسن آرا کی بیجا تعریف میں انتہا سے زیادہ مبالغہ کیا۔ خلق میں خلق نہیں ہوئی۔ واہ کون کہتا ہے نہیں ہوئی، واہ کون کہتا ہے نہیں ہوئی۔ کیا شتاب جان سے بڑھ کے ہیں۔

شتاب جان کے تلوؤں کو بھی نہ پہنچیں اور میرے سامنے کہنا گویا لڑائی مول لینا ہے۔

آزاد مسکراتے۔ خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ واقعی غلطی ہو گئی۔ اب آئندہ خیال رہے گا۔ بیشک شتاب جان حسن و جمال میں اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔

ہوٹل والوں سے خواجہ صاحب نے کہا۔ اگر ہماری چاہنی بیوی کو دیکھو تو غش آجاتے اور کوئی چھ مہینے سے اینجانب پر اس پری پیکر کی نظر پڑتی تھی۔ اب انشاء اللہ لطف اڑیں گی۔ کہاں کا جھگڑا۔ اس کی دعا مستجاب الدعوات نے سن لی۔ زہے نصیب زہے بخت۔ ایسی قسمت کہاں تھی مگر سراپا سانچے کا ڈھلا ہوا ہے۔ اب آزاد کے سامنے تھوڑا ہی آنے دوں گا۔ نا بابا۔ ہرگز نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیا مجال۔ استغفر اللہ۔ امر لیست محال مگر وہ درزی بڑا بد نصیب آدمی ہے فاقے ہوتے ہیں ؎

ہر سحر ش تیرہ تر از تیرہ شام

فاقہ پی فاقہ کشیدے مدام

یہ کیفیت ہے دس روپے ماہواری مقرر کر آیا ہوں۔ چال غضب کی ہے۔ بی شتاب جان پر جان جاتی ہے ؎

چتون میں رکاوٹ ہائے غضب مژگاں کی جھلک پھر ویسی ہے

دل چھین لے اس کی چین جبیں۔ ابرو کی لچک پھر ویسی ہے

وہ نازک رنگ اور بھرے بھرے وہ رخسارے

صورت پہ امنگ جوانی کی چہرے پہ دمک پھر ویسی ہے

وہ سُرخ ملائم ہونٹھ غضب اور ادا دی وہ مستی کی دھڑی

دانت موتی کی اُن میں لڑی ہنسنے میں چمک پھر ویسی ہے

ہر آن ہے اس کے آن نئی اور ساتھ ادا کے سب ویسی ہے

ہے ناز و کرشمہ اور عشوہ غمزے کی کمک پھر ویسی ہے

نیسٹا:۔ تم سے بات چیت بھی ہوئی تھی یا دوری دور سے دیکھا۔

راوی :۔ دیکھا کس نالائق نے۔ بات چیت کیسی، صورت آشنا بھی نہیں ہیں اور خدا جانے ترشتاب جان کوئی ہی بھی یا نہیں۔

خو:۔ جی ہاں۔ میں کئی بار گفتگو کر چکا ہوں۔ باتیں کیا کرتی ہی لبوں سے قند گھولتی ہی۔ شیریں زبان شیریں بیاں ہے

نہ عاشق ہی فقط اسکا دم نظارہ حیران ہی

کہ آئینے کی صورت آپ وہ مہ پارہ حیران ہے

اور رنگین بھی ہیں چشم بدور۔ جی۔ کبھی کبھی بادۂ گل رنگ کا بھی شغل رہتا ہی۔ یہ بات نہیں کہ روکھی پھیکی ہوں۔ جب مس کلیر سا آتیں تو ان سے بھی کہدینا۔ آپ کو اپنے ہاتھ سے جام پلاتے۔ خدا وہ دن تو دکھائے

دہن اُس گل کا چٹکارا ہی برنگ غنچہ

پی کے جب وہ مئے گلرنگ مزہ لیتا ہی

ہائے اس وقت یاد آگئیں۔ ایک چھری سے کلیجے پر پھر گئی۔ ولئے ستم ہائے ستم کیا غضب ہوگیا۔ یا خدا تو اس گلبدن کی صورت دکھا۔ ورنہ فراق یار میں مر جاؤں گا۔

ہوٹل کے آدمیوں نے جو میاں خوجی کو اس قدر خوش وخرم دیکھا تو متحیر ہو کر سوال کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ آج کیا پایا جو اُچک رہے ہو۔ دوسرا بولا۔ خیر باشد خواجہ صاحب۔ یہ اس وقت اس قدر خوش کیوں ہو۔ تیسرے نے کہا، معلوم ہوا ہی کسی کا ترکہ ملا ہی۔ کوئی دولتمند رشتہ دار لاوارث مر گیا۔ تار آیا ہی ہم کو نہ بھول جانا صاحب۔

خواجہ صاحب اکڑے جاتے تھے کہ ہم بھی اس قابل ہوئے۔

خو:۔ آج وہ خوشخبری سنی ہی کہ جامے میں پھولے نہیں سماتا۔

خانساماں:۔ کہیے تو سہی۔ کچھ ہم بھی تو سنیں حضرت۔

خوجی۔ ہمارے گھر میں فرزندِ ارجمند تولد ہوا۔

خانساماں:۔ ہاں شکر ہے۔ کیا تار پر خبر آئی ہے۔ مبارک باشد۔

خوجی۔ ہاں۔ ہماری قبیلہ نے ہم کو لکھا ہے کہ خدا کی عنایت سے فرزند نرینہ تولد شد مبارک باد بالتون والقاء۔

آزاد:۔ خدا کی عنایت تو ہے ہی، یہ کہو کہ پڑوسیوں کی عنایت سے لڑکا ہوا۔ پوچھئے آپ نے ہندوستان کب چھوڑا تھا۔

خوجی۔ کب کیا معنی۔ کوئی دو برس ہوتے ہوں گے۔

خاناماں:۔ ایں۔ چہ خوش۔ اور لڑکا اب ہوا۔

خوجی۔ ارے (دانت تلے انگلی دبا کر) افوہ۔

آزاد۔ زبان سے کہتا نہیں ہے۔ دو برس کے بعد بیٹا ہوا آپ کے ہاں اے لعنت خدا۔ پھٹے سے منہ چلے وہاں سے وہ بن کے۔

خوجی۔ اچھا اب تو ایک بیوقوفی ہوئی سو ہوئی۔ پھر اب اس کے اعادے کی کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ الو بناتے ہو۔ بھائی صاحب اصل بات یہ ہے خانساماں جی کہ ایک شتاب جان نامی شریف زادی پر ہماری جان جاتی تھی۔ اب آج اس نے ہم کو خط لکھا کہ شادی منظور ہے۔ آؤ بس کچھ پوچھو نہ کہ دل کا کیا حال ہے۔ مارے خوشی کے بند چٹ چٹ ٹوٹ گئے۔ ؎

عنقائے قاف قدر تو اوج ہوا گرفت

زو ماند بیضۂ کہ دریں آشیاں نہاد

جب مس کلیبر ساہو اکھا کے آئیں تو ٹمنڈل نے ان سے کل حال بیان کیا۔ ان کو بھی شگوفہ ہاتھ آیا خواجہ صاحب کو بلایا۔ کہا مبارک باشد یہ خوش خبری تو ہم سے کہی ہی نہ تھی آپ نے۔ میں نے سنا ہے کہ نہایت حسین ہے۔ خواجہ صاحب اکڑ کر بولے۔ دریں چہ شک چندے آفتاب چندے مہتاب ؏

ادا خود لوٹ ہے اس کی ادا پر

اُس روز آزاد پاشا نے جہاز کا بندوبست کیا اور چوتھے دن مع دونوں پریوں اور خواجہ صاحب کے جہاز پر سوار ہوئے۔ سوار ہونے کے وقت خوجی نے باوازِ بلند گانا شروع کیا۔

ارے ملاح لگا کشتی مرا محبوب جاتا ہے
شتابو کی تمنا میں مجھے دل لے کے آتا ہے
مگر چھوڑا بدیسی ہو کے خواجہ نے گئے لڑنے
شتابو کے لئے جی میرا کل سے تلملاتا ہے

بدیع سیاں نہ گھبراؤ وہ سہرا لے کے آتا ہے

جو لوگ اردو سمجھتے تھے وہ ان کی بے تکی ہانک سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ صبح کا سہانا سماں۔ ساحل بحر۔ میدان فراخ۔ آواز اس قدر گونجی اور خوجی ایسے محظوظ ہوئے کہ دیر تک گردن ہلا ہلا کر گاتے ہی گئے۔ یقین واثق تھا کہ بیجو باورے کی روح شرما گئی ہوگی۔ تان سین گور میں لرزتا ہوگا۔ آزاد نے شہ دے دے کر اور چنگ پر چڑھایا۔ جوں جوں ان کی تعریف ہوتی تھی اور اکڑتے جاتے تھے۔

آزاد نے بار بار پُرچک دہی تو گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخنے لگے (شفتالو کی تمنا میں مجھے دل لے کے آتا ہی)

اب سنیئے کہ ایک ٹھاکر صاحب جو بغرض تجارت اکثر اوقات

سفر بحری کر چکے تھے خوجی کو دیکھ کر

سمجھے کہ یہ کوئی بڑے باکمال ،

عارف باللہ ہیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، قدموں پر ٹوپی رکھدی اور کہا۔ سائیں جی دعا تے خیر دو۔ خواجہ صاحب اور بھی گڑگڑا گئے۔ بہت زور ہانک لگائی۔ مگر چھوڑا بد لیسی ہو کے خواجہ نے گیتے لڑنے۔ شفتالو کے لیے جی میرا کل سے تلملاتا ہی) ٹھاکر صاحب کانپ اٹھے۔ پھر قدم لیے آزاد نے ہنسی کو بہت ضبط کیا اور ٹھاکر سے کہا یہ مجذوب ہیں ذرا سمجھ بوجھ کر ان سے باتیں کرنا۔ ٹھاکر کو اور بھی یقین ہوگیا کہ یہ ولی حق آگاہ ہیں۔

ٹھاکر :۔ سائیں صاحب ہمارے حق میں دعا خیر دیجئے۔ غلام ہوں۔

(ٹھاکر کے سر پہ ہاتھ پھیر کر) خوش رہو بابا ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے

میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ٹھاکر :۔ آپ کس شہر میں بود و باش کرتے ہیں۔ سائیں جی صاحب۔

خو۔ مصرع

ع "درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

حق حق۔

ٹھاکر :۔ (کانپ کر) اب مجھے امید ہی کہ بیڑا پار ہو جائے گا۔

خو :۔ بیڑیا کر دکار۔ مدد۔ مدد۔ مدد حق۔ حق۔ ؎

دو یتیم جگر کرد روز سے کباب

کہ می گفت گوینده بار یاب

دریں آگہ بعدم بسے روزگار — بروید گل و بشگفد لالہ زار
بسے تیر ودی ماہ و اردی بہشت — بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت
اللہ باقی من کل فانی — اللہ بس باقی ہوس

چو دی رفت فردا نیابد بدست
حساب از ہمیں یک نفس کن کہ ہست

جہاز کا لنگر کھولا گیا تو خوجی نے بہت زور سے کہا بیڑا پار ناخدا پار یا خدا بادۂ عرفان میں سرشار۔ گنہگار شرمسار یا پاک پروردگار۔ شتاب جان گل رخسار۔ خواجہ رنگین بیان بدیع الزماں سے ہمکنار) جہاز اس طرح رواں ہوا جس طرح سے برق ابر شرربار پہ چلئے۔ جس طرح سے نغمے کی صدا پار یہ جاتے چند گھنٹوں میں یہ کیفیت ہوئی کہ نیچے سطح آب نظر آتا تھا اوپر چرخ ناجور دی۔ ادھر ادھر بحر ناپیدا کنار سر پر فلک زرنگار باد نوروزی مشک افشاں و غالیہ ریز روح افزا ہوا سے عطر بیز تصور نے یہ رنگ جمایا کہ آزاد کے کان میں کوس ظفر کی صدا آتی تھی اور خوجی کو چوطرفہ فرضی معشوقہ صورت دکھاتی تھی۔ مرکز خاک سے مثلثات افلاک تک عالم نور تھا۔ رنج و غم جہازیوں کے دلوں سے اس طرح دور تھا، جیسے شرق سے غرب یا نیکی سے بدی۔ آزاد مسرور شاد بغل میں مس میڈا صنم پری زاد۔ سامنے کلیر سا نگار حور نژاد خوش گپی کے لئے خواجہ بدیع الزماں شاعر نغز گفتار۔ چینا بیگم کے عاشق زار۔ میڈا کی کج ادائی، کلیر سا کی دلربائی۔ یہ باغ و بہار۔ وہ خورشید نثار۔ ایک ناوک نگاہ دوسری کج کلاہ۔ یہ شگفتہ رو۔ وہ قوس ابرو، اس کی زلف چلیپا عطر گستر اس کا طرۂ تابدار روح پرور

بہم متاب و گرہ سنبل پریشان را
یکے مساز بقتلم وفا مسلمان را

میڈا۔ (چہل کے لئے) کلیر سا بہن دیکھو۔ ہم سے ان باتوں میں نہ بنے گی۔ اللہ جانتا ہے بگڑ جاتے گی۔ بس میں کل سے دیکھ رہی ہوں کہ تم ان کو (آزاد کی طرف اشارہ کر کے) بے طور گھور رہی ہو۔ کچھ ہم سے بڑھ کر ہو ذری آیئنے میں اپنی صورت تو دیکھو۔

کلیر سا۔ (مسکرا کر) چہ خوش۔ اس بدگمانی کے صدقے۔ اے بہن ہم وہ ہیں جن پر ایک عالم کی نظر پڑتی ہے۔ تمہارے آزاد بیچارے کیا ہیں۔

میڈا۔ یہ باتیں سنی ہوتی ہیں۔ نہ ایسے ہیں کہ تمہاری نیت ڈانواں ڈول ہو گئی۔

کلیر سا۔ اب تو تم صاف صاف کہنے لگیں۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ مگر ہم مارے شرم کے گڑے جلتے ہیں۔ واہ اچھا مذاق ہے۔

ییمنڈا۔ برا نہ مانتا بہن۔ آزاد کی طرف کوئی بدنیتی سے دیکھے تو ہمارا دل بیقرار ہو یا نہیں، تمہیں انصاف سے کہدو۔ اب انصاف تمہارے ہی ہاتھ ہے۔

کلیرسا:۔ اب صاف صاف کہواتی ہو۔ کہوا چاہیے یہ برا مانیں چاہے بھلا مانیں۔ پہلے حضرت ہی نے نظر ڈالی۔ بیٹھے تو ہیں پوچھ نہ لو۔

آزاد:۔ خوب اب مجھ سے لڑوانے کا ارادہ ہے کیا؟

خوجی:۔ کر تو کر نہیں، تو خدا کے غضب سے ڈر۔

کلیرسا:۔ اچھا ان سے پوچھ لو نہ۔ کیوں بندہ پرور آپ نے کئی بار اظہار محبت کیا تھا یا نہیں۔ میں نے کہا تھا یا نہیں کہ ییمنڈا ہم سے بدظن ہو جاتے گی۔

ییمنڈا۔ چلو بس اب بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ۔

کلیرسا:۔ عشق بھی کیا چیز ہے مرد سے تو اپنی گون سے عاشق ہوتے ہیں۔ مگر عورتیں چوندھیا ہی جاتی ہیں۔ عجیب کارخانہ ہے۔

آزاد:۔ تو کیا ہم مس میڈا پر گون سے عاشق ہوتے ہیں۔

خوجی:۔ استاد تم بڑے گون گیر ہو۔ تمہیں ہمیں خوب جانتے ہیں، اپنے مطلب سے تو کہیں پر چوکتے ہی نہیں وہ بے بدل استاد ہو۔

آزاد:۔ اب یہاں غراؤ گے، تو جہاز سے دھکیل ہی دوں گا۔

خوجی:۔ دیکھا نہیں ہے کسی کو (کنگڈے تول کر) ہمارے دو ہاتھ دو پاؤں تو ہیں ہی نہیں۔ ہونہ اڑے سے سرہنگ بنے ہیں۔ اخاہ اتنے میں ایک ملاح نے کہا لوگو! ہوشیار۔ صاحبو۔ خبردار۔ آندھی آتی ہے۔ طوفان کی آمد آمد ہے۔ دوسرے ملاح نے کہا۔ گھبراؤ نہیں، زور کا طوفان نہیں ہے، جلد دور ہو جاتے گا۔ اس خبر کے سنتے ہی اکثروں کے ہوش اڑ گئے۔ اور بیشتر تھرانے لگے۔ مگر خواجہ صاحب کی بیقراری سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ غل مچانے لگے۔ ارے دہائی ہے لوگو دہائی ہے۔ یاران دہائی ہے۔ دہائی ہے یاران۔ دہائی ہے غمگساران جہاز کی دہائی۔ بیڑے کی دہائی، سمندر کی دہائی۔ ہائے شتاب جان، وائے شتاب جان۔ اری میری پیاری شتاب، دعا مانگ۔

آخری فقرہ کہہ کر ایک مرتبہ اکڑ کر آزاد کی طرف دیکھا۔ آزاد ان کی قبر تک سے واقف تھے۔ تاڑ گئے کہ فقرے کی داد چاہتا ہے، کہا۔ ای سبحان اللہ شتاب جان کے لئے شتاب کیا خوب ضلع جگت سے تو کہیں، چوکتے ہی نہیں کبھی۔

خو۔ تسلیم :۔ یہ تو کوئی تعریف نہ ہوئی۔ بندہ نواز اینجانب اس فن کے نقاد اس علم کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ جی۔ کوئی برابر کرے تو بھلا۔

آزاد :۔ اور لطف یہ کہ ایسے نازک وقت میں بھی نہیں چوکتی۔

خو۔ یا خدا میری سن لے۔ میں رکوع و سجود و قیام و قعود و صوم و صلوٰۃ روزہ و دعا کا پابند۔ فقیر کامل و عالم و فاضل علامہ با عمل فیلسوف اور دقاق ہوں۔ مستجاب الدعوات ہوں۔ برگزیدہ کائنات، اشرف المخلوقات ہوں۔ انسان کا ان اور حلم میں ـــــ وقت نبرد شیر مرد۔ دم صلح بالکل سرد۔ اے یارو خدا کو یاد کرو، رو رو کر اس کی درگاہ سے دعائے خیر مانگو کہ خواجہ صاحب الزماں بچ جائے اور شتاب جان سے بیاہ ہو اور عمر بھر نباہ ہو، خوب رو۔

کنونت کہ چشمت ست اشکے ببار
زبان دہانست عذری بیار،
نہ پیوستہ باشد رواں در بدن نہ ہموارہ گردو زبان درد ہن
مکن عمر ضائع بہ افسوس وحیف
کہ فرصت عزیز ست والوقت سیف

یا باری تعالیٰ میری مدد کر اور مجھے بچا لے خداوندا۔

راوی :۔ اچھی دعا مانگی اور سب چاہیں غرقاب ہو جائیں۔ مگر حضور بچ نکلیں۔ بشتاب جان کے ساتھ شادی کرنی ہے نہ۔

آزاد :۔ خواجہ صاحب یہ کیا سبب ہے کہ آپ صرف اپنے حق میں دعائے خیر مانگتے ہیں اور بیچاروں کا بھی تو خیال رکھئے۔ جناب۔

خو :۔ میاں اس میں لم ہے ایک۔ بندہ مستجاب الدعوات جو دعا مانگوں گا وہ قبول ہو جائے گی، گر سب کیلئے دعا مانگوں تو سب بچ جائیں مگر ایک خرابی ہے کہ اللہ میاں کا ہم پر احسان ہو گا اور ہم پرائے پھٹے میں کیوں پاؤں ڈالیں فرمایئے ہم سے تو نہ ہو سکے گا بندہ پرور۔

اتنے میں آندھی کی آمد آمد ہوئی۔ مس کلیر سا تو میدان رستخیز دیکھے ہوئے تھیں۔ ذرا ہراس با تشویش نہ کی۔ بلکہ جس رخ سے آندھی اٹھی تھی، اس کو دیکھا کیں۔ تیندلا گو بانکی و وغیرہ تھی۔ سپاہی زادی، مگر اس نازک انداز کے دل میں کسی قدر خوف جاگزیں تھا۔ آزاد استقلال کے ساتھ جہاز کے کپتان سے باتیں کر رہے تھے، مگر خواجہ صاحب کے ہوش اڑے ہوئے تھے کہ یا خدا اگر جہاز ڈوبا اور ساتھ ہی خود بدولت بھی غرلق

لبتہ فنا ہوتے تو شتاب جان کیا کرے گی۔ سب سے زیادہ انھیں کو زندگی عزیز تھی۔ سوچے کہ چاہے مرجاتے مگر اپنا سامان لیس رہے۔ فوراً افیم کی ڈبیا لی اور خوب کس کے کمر میں باندھ کر کہا۔ چلو یارو۔ ہم تو تیار ہیں۔ اب چاہے آندھی آئے چاہے بگولا۔ چاہے طوفان بلکہ طوفان کا باپ آئے تو کیا مضائقہ ہے۔ چنیا بیگم کو اب کلیجے سے لگا لیا۔ بس ع

ہر چہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم

ڈوبیں بھی تو انھیں کے ساتھ۔

ہم تو ڈوبیں گے مگر یار کو لے ڈوبیں گے

تنہائی سے یہاں طبیعت کو نفور ہے۔ اکیلے ڈوبے تو کیا۔ فرمایئے۔ ڈوبیں تو دو ایک کے ساتھ۔ جہاز والے ان کی عقل پر ہنستے تھے کہ اگر ڈوبنے کا خیال ہے تو افیم کیا بچائے گی۔ ایک ڈبیا نہیں کھیت کا کھیت لے بیٹھے تو کیا ہوتا ہے۔ بعض آدمی کسی قدر بدحواس تھے اور جو بدحواس نہ تھے۔ وہ بھی کچھ کچھ منتشر تھے کہ واللہ اعلم طوفان کیا گل کھلائے گا۔ مگر خواجہ صاحب تان لگا رہے تھے۔ ے ارے ملاح لگا کشتی مرا محبوب جاتا ہے + تماشا کو کی تمنا میں مرا دل تلملاتا ہے + بدیع سیاں نہ گھبراؤ وہ سہرا لے کے آتا ہے + جی نکی بانگ سن کر آزاد نے کہا۔ خواجہ صاحب آپ تو بے وقت کی شہنائی بجاتے ہیں۔ پہلے تو خوب روتے چلاتے اور اب تان لگاتے اور اپج کی لینے لگے۔ ماشاء اللہ کیا عقل ہے۔ یہ گانے کا وقت ہے بھلا۔

الغرض اس مرتبہ کے سفر میں باد شرطہ نے ہراس کا موقع نہ دیا۔ ایک مرتبہ طوفان کی آمد آمد تھی مگر فرو ہو گیا۔

خواجہ صاحب ٹھاکر کو راہ میں الو بناتے ہوتے مزے سے آتے تھے اور قہقہے پر قہقہے پڑتے جاتے تھے آزاد نے خوجی کے کان میں کہا۔ استاد آتے ہوئے مس ونشیا یعنی مسٹر اپلیٹن کے سبب سے راستہ کٹا۔ اب جاتے ہوتے ٹھاکر کے سبب سے دل بہلے گا۔ ٹھاکر صاحب بار بار خواجہ صاحب عارف باللہ سے مختلف امور دریافت کرتے تھے اور درمیان میں فقیر کامل بنے ہوتے کل امور کا اناپ شناپ جواب دیتے تھے۔

ٹھاکر:۔ سائیں جی جمعہ کے دن سفر کرنا کیسا ہے۔ آپ کے نزدیک؟

خو:۔ سعد جمعہ کو روزِ آدینہ کہتے ہیں۔ نیک دن ہے۔

ٹھاکر:۔ اور جمعرات۔ جمعرات کے دن سفر کیسا؟

خو:۔ اچھا جمعرات سعدِ اکبر ہے۔

ہر گناہے کہ کنی در شبِ آدینہ بکن

تاکہ از صدر نشینانِ جہنم باشی

آزاد:۔ ٹھاکر صاحب آپ کب سے سفر کر رہے ہیں۔ ہوتے کوئی دس برس؟

ٹھاکر:۔ ایسا کہ جب سعادت علی خاں تخت نشین ہوئے۔ ہمارا سن کوئی چودہ برس کا تھا۔ تب سے ہم سفر کرتے ہیں۔ اور ہر سال سفر میں رہتے ہیں۔

آزاد:۔ تو آپ اودھ کے رہنے والے ہیں مگر اتنا سن آپ کا نہیں معلوم ہوتا کہ سعادت علی خاں کے وقتِ جلوس آپ چودہ برس کے ہوں۔ چودہ برس کی سن سے آپ سفر کرتے ہیں اور اب تک ضعیف الاعتقاد بنے رہتے ہیں۔

ٹھاکر:۔ سنیچر کے دن آپ سفر کر کے دیکھ لیں صاحب۔

خو:۔ ان سے اس بارے میں گفتگو ہی نہ کرو، یہ ملحد ہیں خدا کو نہیں مانتے۔ ان کا بابا آدم ہی نرالا ہے؛

از مذہبم مپرس نہ مومن نہ کافرم

من رہ رسیم این دیار نداندم مسافرم

آزاد:۔ بھلا اودھ آپ نے کب چھوڑا تھا۔ وہاں کی کوئی تازہ خبر بھی معلوم ہے۔ آپ کے اعزہ اقربا کہاں رہتے ہیں۔

خو:۔ ان باتوں کا پیچھے جواب دینا۔ پہلے ہماری سنو، ہر صبح کو بعد مناجات نظامی گنجوی کے یہ اشعار پڑھ لیا کرو۔ ؎

دریغا کہ بگذشت عمرِ عزیز بخواہد گذشت این دم چند نیز

گذشت آنچہ در ناصوابی گذشت وزین نیز در نیابی گذشت

کنون وقت تخم ست اگر پروری گر امید واری کہ خرمن بری

بشہر قیامت مرو تنگدست کہ وجہے ندارد بہ حسرت کشست

گرت چشم عقل ست تدبیر گور

کنون کن کہ جسمت نہ خورد ستِ مُور

ٹھاکر:۔ میں یہ شعر ابھی لکھ لوں گا (آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) اودھ چھوڑے ہوتے کوئی تین مہینے کئی روز ہوتے۔

تازہ خبر یہ ہے کہ ایک بیگم صاحب نے اپنے عاشق کو حکم دیا کہ اگر شادی کرنا چاہتے ہو تو روم

جاؤ اور وہاں اپنے مذاہب والوں کی طرف سے خوب لڑو۔ لڑ بھڑ کر جب واپس آؤ گے، تمہارے ساتھ نکاح ہو جائے گا۔ لوگ اس کے عاشق کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معشوق کا حکم پاتے ہی چلا گیا۔ مگر بیگم کی نسبت اکثروں کی رائے ہے کہ عورت اچھی نہیں ہے۔ وہ بیگم شاعرہ بھی ہیں۔ چنانچہ ان کے نام سے ایک غزل مشہور ہے جس کو ارباب نشاط محفلوں اور جلسوں میں اکثر گایا کرتے ہیں ؎

جو عندلیب ہو قید قفس میں راز ہو | غضب کی بات ہے پہلوئے گل میں خار رہے
ہزاروں بھاگ گئے تیغ غم کی بارش سے | ہم ایک جان بکف تھے کہ جو دوچار رہے
ہماری آہ جگر سوز سے قیامت تک | فلک کا سینہ بے مہر دلفگار رہے
عجب ہے چرخ کا چکر کہ سرزمیں پہ بھی | قرار سے نہ پیادہ نہ شہسوار رہے
ہماری آبلہ پائی کے فیض حسرت سے | حباب بھی جو اٹھے تو بھی سرمشار رہے
اٹھے کبھی نہ خوشی سے نہ چین سے بیٹھے | قدم قدم پہ گرے ضعف سے نزار رہے
مزا اسی میں ہے رگ رگ کٹے ہو تراش گلو | ہمارے قتل کو خنجر نہ آبدار رہے

ملا ہے ہم کو پتا آنے والے ہیں آزاد
خدا کرے کہ ہمیشہ وہ ہمکنار رہے۔

آزاد نے آہ سرد بھر کر کہا۔ ٹھاکر صاحب شاعرہ ہونے میں کچھ فرق نہیں ہے کہ فاحشہ ضرور ہو۔ اکثر ورتیں ہندو مسلمانوں میں اکثر عورتیں ہندو ہیں جو پڑھی لکھی تھیں اور اب بھی اکثر ایسی عورتیں موجود ہیں۔ کوئی بزطبع ہوئی وہ شعر کہنے لگی۔ اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ زیب النساء کیسی عفیفہ و پاکدامن عورت تھی وہ شعر بھی کہتی تھی۔ ؎

وائے بر شاعران نادیدہ | غلطی را نجود پسندیدہ
سر دار قد یار می گویند | سرو چوبے ست ناتراشیدہ

لکھنو کی ایک شاعرہ آتش زبان کا مطلع سنئے ؎

سینے کو چمن بنائیں گے ہم
گل کھائیں گے گل کھلائینگے ہم

ایک شاعر کا مطلع کس دھوم کا ہے ؎

سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا
پھل لگا ہے آج نخل دار میں

مگر بات یہ ہو کہ آج کل شریف زادیاں تو لکھنے پڑھنے سے بھاگتی ہیں۔ ان کو شوق آرائش و تراش خراش ہے۔ دن بھر بنی ٹھنی رہیں۔ ہر دم مانگ چوٹی میں گرفتار، پڑھے ان کی بیزار اور بیسوائوں نے اپنی قدر کے لئے لکھنا پڑھنا شروع کیا تاکہ اُمرا میں ان کی اور بھی قدر ہو، وہ شاعروں میں بیٹھیں۔ بعض بعض خود شعر کہتی ہیں بعض بعض اوروں سے کہوا کر اپنے نام سے مشہور کرتی ہیں۔ اسی سبب سے شریف زادیاں احتراز کرنے لگیں اور اس بیگم بیچاری نے جو اپنے عاشق کو روم بھیجا اور شرط کرلی تو کیا گناہ کیا۔ حمیتِ اسلام اسی کی مقتضی تھی۔

ٹھاکر نے کہا ہاں ہماری بھی یہی رائے ہو مگر بعض آدمی خصوصاً بوڑھے اس کے خلاف ہیں۔ سنا ہے کہ وہ بہنیں ہیں۔ دونوں پریاں، اور وہ جو روم گئے ہیں، ان کا نام آزاد ہو۔ ان کو حسن بیگم منسوب ہونے والی ہیں ایک شخص محمد عسکری نامی اس بیگم کے عزیزوں میں ہیں۔ ان کا بھی بڑی بہن پر دانت تھا، چنانچہ انھوں نے مشہور کردیا ہو کہ آزاد نے روم میں ایک پنج قوم عورت کے ساتھ شادی کرلی۔ جسوقت حسن آرا نے یہ خبر اخبار میں پڑھی، دھک سے رہ گئی اور اس قدر رنج ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ لوگ سمجھے کہ مر گئیں۔

ٹھاکر اس قدر بیان کرچکا تھا کہ مرنے کے لفظ پر آزاد کی زبان سے (خدا نہ کرے خدا نہ کرے) یہ کلمات نکل گئے۔ ٹھاکر صاحب چکرائے کہ ان کو حسن آرا سے کیا واسطہ، پوچھا کیا آپ بھی کچھ دوا نے ہیں۔ مُسکرا کر جواب دیا ہاں کچھ کچھ۔

ٹھاکر نے بیان کیا کہ حسن آرا ہزار جان سے آزاد پر عاشق ہیں یہاں تک کہ ان کی شادی کی خبر سن کر ملے قلق کے زندہ در گور تھیں۔ آزاد نے پھر (خدا نہ کرے) کہکر آہ سرد کھینچی اور دل میں سوچے کہ خدا ہی خیر کرے، جو آتا ہو ایک تازہ مصیبت کی خبر سناتا ہے۔ پہلے سنا کہ سپہر آرا کے میاں نے قضا کی۔ اب سنتے ہیں کہ حسن آرا علیل ہوگئی ہیں۔ محمد عسکری نئے بگڑے دل پیدا ہو گئے، مگر خیر۔ بہت گذر گئی، تھوڑی مصیبت اور باقی ہو۔ خوجی نے ان کے کان میں کہا۔ میاں اب وہاں کا ذکر ہی نہ کرو کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ، خدا پر چھوڑ دو بس۔ اسمیں سب قدرتیں ہیں۔ جہاز پر دل بہلاؤ ٹھاکر الو پھنسا ہو اس کو بناؤ بس۔

خو: ۔ ٹھاکر، سنو۔ بچا ہماری نصیحتیں، گوش گوش سے سنو۔ ایک تو یہ کہ سفر روز کرو۔ مگر تین بجے سے اٹھکے ۴ بجے اٹھے اور چار پانچ کوس نکل گئے، ورنہ سفر اور خواب میں بڑا فرق ہو۔ بعد المشرقین۔

شبے خوابم اندر بیابان قید	فرو بست پای دویدن رسید
شتر بانے آمد ہول وستیز	زمام شتر بر سرم زد کہ خیز
مگر دل نہادی بمردن ز پس	کہ برمی نہ خیزی ببانگ جرس
مرا ہم چو تو خواب خوش در سرست	ولیکن بیاباں بہ پیش اندرست

خنک ہوشیاران فرخندہ بخت
کہ پیش از دہل زن بسازند رخت

دوسری نصیحت یہ کہ ہی کہ ایک بیوی سے زیادہ کے ساتھ شادی نہ کرنا اور اگر وہ مشیت ایزدی سے مرجائے تو مجبوری ہی۔ زوجہ ثانیہ کا خیال دل میں نہ لا۔ تیسری نصیحت یہ ہے کہ رات کو دو گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں کھڑے رہ کر یاد خدا کرنا۔ اس میں چاہے مرجاؤ مگر منھ نہ موڑنا۔ گرمی سردی برسات تینوں فصلوں میں اس کا خیال رہے، ورنہ پھر پچھتاؤ گے اور یہ اشعار زبان پر لاؤ گے ؎

دریغا کہ فصل جوانی برفت — بلہو و لعب زندگانی برفت

دریغا چنان روح پرور زماں — کہ بگذشت برما چو برق یماں

چوتھی نصیحت یہ ہی کہ عمدہ غذا اور عمدہ پوشاک سے پرہیز رکھنا۔ کھانے کی جو کی روٹی پینے کو اوٹنایا ہوا پانی دسترخوان پر نہ پلاؤ، ہو نہ باقرخانی دیکھ کر اکڑ گئے اور آزاد کی طرف غرور کی نظر سے دیکھا۔ آزاد نے کہا واہ شاہ صاحب پانی اور باقرخانی کا خوب قافیہ ملایا۔ فرمایا، یہ چٹکلے ہیں۔ غذائے لذیذ اور پوشاک نفیس دنیا پرستوں کے لیے ہی نہ کہ فقر کے لیے۔

زسوداے آن پوشم واین خورم
نہ پرداختم تا غم دین خورم

خواجہ صاحب نے آزاد سے دریافت کیا کہ جہاز کس وقت بر میمون مقام داخل شدہ آزاد بولے حضرت اب ترکی نہ بولیے، اردو ہی میں ہم کج مج زبانوں سے باتیں کیجیے۔ یہ میمون مقام چہ معنی دارد۔

خوجی بہت ہنسے اور یوں سمجھانے لگے۔ برادر میمون مقام کا لفظ نہیں سمجھے، تو بازچہ خواہی فہمید آزاد نے کہا برادر کے بعد میمون نہ کہا ہوتا۔ دیکھتے ایک ہوئی۔ یاد رکھئے گا۔ اب ہماری زبان سے بھی کوئی جہابیجا کلمہ نکلا تو برا نہ مانئے گا۔ خیر۔ خواجہ میمون مقام کے معنی تو بتاؤ۔ فرمایا۔ میمون مقام مرکب ہے ساتھ دو لفظوں میمون اور مقام کے۔ میمون کے معنی بندر بروزن چقندر اور مقام کے معنی جگہ۔ جگہ کو عربی میں گاہ کہتے ہیں۔ میمون پہلے اور مقام اس کے بعد دونوں پھر مرکب ہوتے تو مل کر میمون مقام لفظ قرار پایا ر یعنی بندرگاہ یعنی وہ جگہ جہاں بندر رہی

آزاد:۔ میمون کے معنی بندر۔ سلمنا ہم کو معلوم ہی، مگر بندر کے بعد یہ کہنا کیا فرض تھا کہ بندر بروزن چقندر۔ خیر اس کو بھی جانے دو۔ مقام کے معنی کی کیا ضرورت تھی۔ اس لفظ سے کون واقف نہیں ہی اور پھر جگہ کی عربی بتانا کیا فرض تھا اور میمون مقام کیوں کہا۔ بندرگاہ ہی کیوں نہ فرمایا۔

خوجی۔ عام فہم الفاظ ہماری زبان سے نہ نکلیں گے۔

آزاد۔ سبب۔ کیا بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ آپ سبحان اللہ۔

خوجی۔ سبحان اللہ سمیت۔ کیا کچھ جھوٹ ہی ہے۔ عام فہم الفاظ زبان سے نکلیں تو زبان کاٹ ڈالوں، پڑھا جن ہوں اور ہماری طبیعت تو وقت پسند واقع ہوئی ہے۔ جب شعر پڑھا ادق مغلق۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہی معدوم

لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

اب اس میں ہم کیا کریں۔ فرمایئے اور شعر سنئے۔ اس سے بھی ڈبل معنی سمجھ میں آئیں تو میرا ذمہ۔ جن صاحب کو دعویٰ ہو وہ کہکر دیکھ لیں۔

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے

کہ نہ سمجھے وہ لذت دشنام

اتنے میں ملاحوں نے کہا، اب بمبئی سامنے نظر آتی ہے۔ سنتے ہی خوجی کی باچھیں کھل گئیں، چلا کر کہا۔ یار و ذرا دیکھنا بی شتاب جان صاحب کی فینس تو نہیں آتی۔ کریم بخش نامی مہری ساتھ ہوگی اطلس کا چھتکا ہے اور کہاروں کی پگڑیاں، وردی رنگی ہوئی ہیں۔ مچھلیاں ضرور لٹک رہی ہوں گی۔ بی شتاب جان ہوتے اے شتاب جان صاحب۔

آزاد پاشا۔ آواز آئی۔ ارے یار آواز آتی ہے خدا کا واسطہ بتا دو بی شتاب جان۔ اے کرم بخش مہری مہری کیا بہری ہے۔

لوگوں نے سمجھایا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجئے۔ بی شتاب جان اور کرم بخش یہاں سے کیوں کر سن لیں گے۔ کہا اجی ہٹو بھی۔ تم کیا جانو کبھی کسی پر دل آیا ہو تو سمجھو ارے نادان عشق کے کان دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں اور کون کوس کڑی منزل کے، کیا شتاب جان نے آواز نہ سنی ہوگی۔ واہ بھلا کوئی بات ہے، مگر جواب کیوں نہ دیا، یہ پوچھو۔ اس میں ایک طرح ہے پوچھو وہ کیا۔ وہ یہ کہ۔ ع

معشوق پن نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو

اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دیں تو بندے کی نظروں سے گر جائیں۔ مزا جب ہے کہ ہم بوکھلاتے ہوئے ادھر ادھر ڈھونڈھتے اور آواز دیں دیتے ہوں کہ بی شتاب جان صاحب۔ اجی بی صاحب اور وہ بےخبری میں پیچھے سے ایک دھول جمائیں اور تنک کر کہیں ـــــ مونڈی کاٹا آنکھوں کا اندھا، نام نین سکھ، غل مچاتا پھرتا ہے۔ شتاب جان۔ شتاب جان۔ اے بی صاحب تیری بی کو کیا کہوں۔ موئی کہیں چرخا کات رہی

ہوگی اور ہم دھول کھا کر عمداً کہیں کے دیکھئے سرکار اب کی دھول لگائی تو خبر جواب دھول لگائی نہ تو بگڑ جائے گی۔ بس کہدیا ہی اور وہ جھلا کر ایک اور جمائیں کہ اینجانیب کی ٹوپی گھورے پر جا کے گرے اور اور ساتھ ہی اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تڑ تڑا دو چار اور جمادیں۔ تب ہنس کر کہوں۔ جان من خدا گواہ ہی اس وقت پیٹ بھرا ہے ورنہ مارے بھوک کے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ سفر اور پردیس میں ایسی چاند تارہ مہ پارہ کہاں ملتی جو بے دھڑک دھول پر دھول جماتی اور ابھی کیا ہی، پیاری ذرا تہ دل ہو کے بیٹھیں تو پھر دو ایک جوتے ضرور لگانا۔ ہاں بے پاپوش کاری کے طبیعت بے چین رہتی ہی۔

آزاد:۔ بالفعل کیسے تو خاکسار ہی لگا دے جی۔

خوجی:۔ (مسکرا کر) اے نہیں حضرت آپ کو تکلیف ہوگی۔

آزاد:۔ واللہ کس مردود کو اپنے حساب تکلیف ہو۔ دو جوتوں میں آپ اس درجے کو پہنچ جائیں کہ پھر عمر بھر آرام سے سوتیے سے ع

نے غم دزد و نے غم کالا

یا کہیے فقط سونگھا ہی، دو ن کو تکلیف ہو کچھ پرواہ نہیں۔ اس کا کہاں تک خیال کروں گا۔

خوجی:۔ میاں پہلے منہ دھو آؤ۔ دل لگی نہیں ہی۔ ان کھوپڑیوں کے سہلانے کے لئے پریوں کے ہاتھ چاہئیں نہ کہ تم ایسے دیو زادوں کے۔

آزاد:۔۔۔ خدا کرے جس وقت شتاب جان آپ پر پاپوش کریں اس وقت ہم بھی ہوں۔ کہتا جاؤں کہ ہماری خاطر ایک اور۔ پھر پڑے اب کی رنجک چاٹ گئی۔ اب کی خوب چٹاخ سی آواز آئی۔ ہاں ذرا ایک اور۔ اور ذرا دور تک آواز جاتے سے

ناصح کے سر پہ ایک جمائی چٹاخ سی

پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

اتنے میں ساحل بحر نظر آیا تو خواجہ صاحب نے غل مچایا۔ شتاب جان صاحب اجی حضور کا غلام فرزندانہ آداب عرض اس قدر کہہ چکے تھے کہ لوگوں نے قہقہہ لگایا اور خوجی متحیر ہوئے کہ یہ کیا اسرار ہی۔ آزاد سے پوچھا گیا کہ اس خندہ بے محل کا کیا سبب ہی۔ آزاد بولے آپ کی حماقت اس کا سبب ہی۔ گدھا پن خود کرتے ہو اور اوپر سے ہم سے پوچھتے ہو کہ اس کا کیا سبب ہی۔ کیا فقرہ کہا تھا آپ نے ذرا پھر فرمائیے گا۔ خواجہ صاحب نے طیش کھا کر پھر وہی فقرہ سنایا۔ اجی حضور غلام فرزندانہ آداب عرض کرتا ہی۔

آزاد:۔۔ تو آپ شتاب جان کے صاحبزادے فرزند دلبند ہیں۔

خوجی:۔ یہ کاہے۔ صاحبزادے ہیں یا میاں ہیں۔ شوہر خاص۔

آزاد:۔ پھر یہ فرزندانہ آداب کیسا ہوتا ہے۔ جو رو کو کوئی فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے تو آپ کی بیوی کیا آپ کی والدۂ شریفہ ٹھہریں۔

خوجی:۔ (گالوں تھپڑ لگا کر) اُررررر۔ غضب ہو گیا۔ بڑا بُرا ہوا واللہ ستم ہو گیا۔ سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئے ایسے خفیف ہوئے کہ تو بہ ہی بھلی اے ہے حفت سی خفت ہے مگر چھڑے کی زبان پھسل گئی۔ لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے عالم میں ایسا کلمہ زبان سے نکلا اور وہ بھی اپنی پیاری شتاب جان کی نسبت۔ جی۔ پھر درین چہ مضائقہ باشد ۔ اب تو صاف صاف قفس نظر آتی ہے۔ وہ دیکھئے ہوا سے زلف درہم و برہم ہوئی جاتی ہے۔ ؎

سمجھ کر چھیڑ او مشاطہ اس کی زلفِ پُرخم کو

خدا کے واسطے برہم نہ کر اسباب عالم کو

وہ مہری سامنے ڈٹی کھڑی ہے۔ اخاہ اب تو بی کرم بخش بھی باڑھ پر ہیں۔ سروقامت، رشک شمشاد ہے۔ اس حورکردار کی مہربانی بھی پری زاد ہے۔ وہ ہنسی۔ اہو ہو۔ دُر دندان نے مار ڈالا کیا پیارے دانت ہیں۔

چمک لعل بدخشاں کی مٹا دے

ترے ہونٹوں پہ ایسا رنگ پان ہے

یاران مژدہ باد کہ عروسِ مانوسِ من و نگارِ گل عذارِ من و صبیۂ من بی شتاب جان وامت حسنہ از جھروکہ زرنگار مرامی بیند و میگوید ؎

یار نام خدا ہے کشتی میں

ناخدا آج پار بیڑا ہے

آزاد:۔ یار عمر بھر میں برجستہ شعر آج ہی سنا جب حال۔

خوجی:۔ درست۔ اور وہ شعر جو کانسل کے نام ہم نے لکھا تھا۔ ؎

ای قبائے بادشاہی راست بربالائے تو

مصرع ثانی حذف شد والائے تو

آزاد:۔ مگر ایک غپا پھر کھایا۔ پہلے شتاب جان کو اپنی مادر مہربان بتایا۔ ابھی ایک ایسا کلمہ کہا کہ پھر جھینپ جاؤ گے۔ زبان سے کہنا ہی نہیں۔

خوجی:۔ کیا طاقت۔ ہم نے کہا کیا تھا۔ یہی کہا تھا نہ کہ عروسِ من و نگارمن و صبیۂ من بی شتاب جان۔ پھر کیا عروس نہیں یا صبیہ نہیں ہے۔

آزاد:- اے لعنتِ خدا۔ ارے کم بخت جبیبہ عربی میں لڑکی کو کہتے ہیں۔ لے اب سر پٹیو۔ کبھی ماں بناتا ہے کبھی لڑکی اور پھر اوپر سے غراتا ہے۔

خوجی:- (سر پیٹ کر) زبان تراش ڈالنے کے قابل ہے لیکن خیر گذشتہ را صلواۃ آیندہ را احتیاط۔

آزاد:- یار وہ دیکھو سامنے کیا نور کا بکا نظر آیا۔ یہی ہماری شتاب جان ہیں۔ کیا صورت ہے۔

چہرہ گلگوں ہے گلشن قامت موزوں ہے سرو　　　گوش نازک ہیں گل تر غنچہ گل ناک ہے

جلوہ گر خال سیہ ہے روئے آتشناک پر　　　چشمۂ خورشید میں زنگی مگر تیراک ہے

اتنے میں جہاز لنگر انداز ہوا۔ اور لوگ اترنے لگے۔ خواجہ صاحب دور ہی سے فرضی شتاب جان کو ڈھونڈنے لگے۔ کرم بخش او کرم بخش! اب خدا کے واسطے یہ چونچلے رہنے دے کم بخت۔ معلوم ہے آپ نخرے باز ہیں، مگر اب کب تک ترساؤ گی۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں نے ایک دن اس مہری سے دل لگی کی تھی، بس تب سے منہ چڑھ گئی۔

خواجہ پا بندۂ پری رخسار　　　چون در آید بسازی و خندہ

چہ عجب گو چو خواجہ حکم کند　　　دین گشد بار ناز چون بندہ

آزاد مس کلیریسا اور مس میڈا کو لیکر خشکی پر آئے۔ اسباب اتارا گیا۔ اتنے میں مرزا صاحب نے دوڑ کر آزاد کو گلے لگایا۔ آزاد کمال مسرور ہوئے، خوجی سے مصافحہ ہوا مگر ان دونوں پری پیکروں کو دیکھ کر کس قدر حیرت ہوئی۔ آہستہ سے پوچھا یہ دو ماہر و معشوق کہاں سے لائے ہو۔ کیا پرستان کی پریاں ہیں۔ مسکرا کر جواب دیا ہاں۔ کہونگا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خواجہ بدیع الزماں گفن پھاڑ کے بول اٹھے۔ ادھر ادھر شتاب جان ادھر مہربان۔ کرم بخش اور کرم بخش کرم چھوڑ کر کم بختی کے نشان۔ میاں خواجہ بدیع الزماں تیری تلاش میں سرگرم ہیں اور توبتے بتاتی ہے۔ جانِ جان۔

مرزا:- کس کو پکارتے ہو جناب خواجہ صاحب میں بلالوں۔ مزے مزے میں آئے۔ آپ ہیں کیا بیچارے وہ مال ہی اور ہے ایسا مال ہے کہ کبھی آپ کے فرشتوں نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ شتاب جان در یشہ خطمی ہو کر) کیوں کیا پیارا نام ہے۔

مرزا:- کیا بیاہ لائے کوئی پری چہم مگر استاد نام تو ہندوستان کا ہے۔ ذرا دکھا تو دو۔ نظرے خوش گذرے

آزاد:- گھر میں تو خیریت ہے۔ بیگم صاحب کا مزاج تو اچھا ہے؟ اور سب خیر و عافیت ہے زمین ہے یا چھوڑا دی گئی۔

مرزا:- ہے تو کرہے۔ گھر میں بہمہ وجوہ خیریت ہے۔

راوی:- کوئی آزاد ہی کے دل سے پوچھے۔ مطلب تو اس معشوق شوق کی خیریت دریافت کرنے سے تھا مگر

پھیر پھار کے پوچھا گھر میں خیریت ہے بیگم صاحبہ کا مزاج اچھا ہے۔ زبین نوکر ہی یا نہیں۔

بجا ارشاد ہوا۔ زبین سے آپ کو سروکار۔ آپ اپنی طرار ساقی کا ذکر خیر کیجئے۔

آزاد۔ بیگم صاحب سے ہم بہت جھوٹے بنے مگر اتفاق شکایت تو ضرور رہوں گی۔ خدارا الڑوانہ دیجئے گا۔ آپ دل لگی باز آدمی ہیں۔ آپ سے خوف معلوم ہوتا ہے ہمیں۔

مرزا۔ ہمایوں فر کا حال کچھ سنا آپ نے۔ ہائے ہائے۔

آزاد۔ افسوس۔ سخت افسوس ہوا۔ سپہر آرا کے غم والم کا حال ناگفتہ بہ مگر اس کے ساتھ ہی گھر بھر کی حالت بُری ہوئی ہوگی۔

مرزا۔ دریں چہ شک یہ تو قاعدے کی بات ہے۔

جو عضوے بدرد آورد روزگار

دگر عضو ہا را نماند قرار

مگر مژدہ باد کہ وہ زندہ ہیں۔ بندہ پرسوں وہاں سے آیا۔ آزاد کو سخت حیرت ہوئی کہ یہ مرنا اور زندہ ہونا، یعنی چہ باصرار تمام دریافت کیا کہ بعد مرگ زندہ ہونا کیا معنی، آپ سچ سچ فرمایئے کہ مرزا ہمایوں فر کا کیا حال ہے مرزا صاحب نے کہا یہ ایک طول طویل قصہ ہے۔ خلاصہ عرض کر دیا کہ سپہر آرا کا شہزادے کا ساتھ نکاح ہو گیا اب وہ خوش و خرم لطف شادی حاصل کر رہی ہیں۔ اب اس ذکر کو جانے دیجئے۔ اور اپنا حال کہیے۔ بہت سے اخباروں میں آپ کا حال نظر سے گذرا، شاباش بھائی۔

ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

خصوصًا پلونا کی آخری جنگ میں تو تم نے بڑا نام کیا۔ میں نے وہ مضمون پڑھ کے بیگم صاحبہ کو سنائے تھے۔ بہت خوش ہوئیں۔ یہ نوید مسرت خیز سن کر آزاد کی باچھیں کھل گئیں۔

اتنے میں خواجہ صاحب نے جو اب تک افیم گھولنے کے سبب سے خاموش تھے، چسکی لگا کر غل مچایا (شتاب جان پیاری، میں تیرے واری، جلدی سے آری، کی صورت دکھاری، آنسو ہیں جاری، عقل ہے عاری، میں تیرے واری، صورت دکھاری، یہ کج ادائی۔ واہ

کج رہی مژگان یار بھی ہم سے

بس اسی خار نے ہمیں مارا

جان من جس بستر پر تم سوئی تھیں، اس کو ہر روز صبح شام سونگھ لیا کرتا ہوں۔ اسی کی خوشبو پر زندگی کا دارومدار ہے۔

رخسار وہ رکھ کے سو گیا تھا — گل تکیوں کو روز سونگھتا ہوں
نیری سی سنہ بو کسی میں — پائی سارے پھولوں کو سونگھتا ہوں

مرزا صاحب نے کہا آخر یہ ماجرا کیا ہے جناب خواجہ صاحب۔

چوں بیاید ہنوز خر باشد

کا نقشہ ساری خدائی کی سیر کر کے آئے مگر عقل سے بے بہرہ ہی رہے۔ شتاب جان کون ہے کہاں ہے یہ آپ کو ہو کیا گیا۔ سفر سے رہی سہی عقل اور بھی فرد ہو گئی۔ ماشاء اللہ — اگر آپ عاشق صادق ہیں، تو فریاد کیسی ہے؟

کب اپنے منھ سے عاشق شکوۂ بیداد کرتے ہیں
دہان غیر سے وہ مثل نے فریاد کرتے ہیں،

خواجہ صاحب نے تیکھے ہو کر جواب دیا۔ جی ہاں کرنے اور کہنے میں زمین آسمان کا فرق ہے جناب والا۔ کہنا سب جانتے ہیں مگر کرنا مشکل ہے اور شعر خوانی۔ مجھ سے کہتے ایسے ہی ایسے دو کروڑ شعر پڑھ دوں۔

مرزا:۔ دو کروڑ تو خیر دس کروڑ برس تک بھی آپ سے نہ پڑھے جائیں۔ آپ دو ہی چار شعر فرمائیں۔ بسم اللہ

خو:۔ بسم اللہ، تو بسم اللہ ہی سہی۔ سنتے جائیے اور گنتے جائیے ؎

یہی کہ کہ کے ہجر یار میں فریاد کرتے ہیں — وہ بھولے ہم کو بیٹھے ہیں جنھیں ہم یاد کرتے ہیں
اسیران کہن پر تازہ وہ بیداد کرتے ہیں — رہی طاقت نہ جب اڑنے کی تب آزاد کرتے ہیں
رقم کرتا ہوں جس دم کاٹ تیری تیغ ابرو کی — گریبان چاک اپنا جامۂ فولاد کرتے ہیں
صفت ہوتی ہے جاناں جس غزل میں تیرے ابرو کی — تو ہم ہر بیت پر آنکھوں سے اپنی صاد کرتے ہیں
جنون خیز چمن میں کی یہ اسکے قد موزوں نے — سوال اب قمریوں سے طوق کا شمشاد کرتے ہیں
یقیں ہے درد مند عشق کو کچھ کام نالوں سے — دہان زخم کو دیکھو تو کب فریاد کرتے ہیں

جو وہ سوتے ہیں سو جاتا ہے گویا فتنۂ محشر
جہاں جاگے قیامت خلق پر بیداد کرتے ہیں

اس قدر شعر جو اس بحر میں پڑھ دیئے تو خواجہ صاحب اکڑ کر بولے۔ اب بھی کوئی نہ شرمائے تو اندھیر ہے اور قسم شتاب جان کی فرقدان مبارک کی، کہ دو کروڑ پورے دو کروڑ۔ شعر اسی بحر میں نہ پڑھ کر سناؤں تو خواجہ بدیع الزماں نام بدل دو، یہ کیا بات ہے قول مردان جان دارد ہاں اور سنئے۔

نہیں ہم شغلِ سحر رہتے ہیں غافل ایکدم ہمدم
جو بُت کو بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں،

آزاد :۔ اس وقت تو مرزا صاحب کو آپ نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ مانتا ہوں استاد اللہ اللہ ہزاروں ہی شعر یاد ہیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا حافظہ ہے۔ مگر ایک مثل اس وقت غلط ہوئی جاتی ہے۔

مرزا :۔ (مرزا) جی ہاں۔ دروغ گورا حافظہ نباشد۔

خوجی :۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے، اب جب قائل ہوئے تو تمثیلیں یاد آئیں جب سب طرف سے ہارے چلے نان پارے میاں کوئی ایک شعر پڑھے تو ہم دس کروڑ شعر پڑھیں۔ جانتے ہو کہاں کے رہنے والے ہیں۔ بمبئی والوں کو ہم کیا سمجھتے ہیں۔

اب سنئے کہ ایک عورت نے خواجہ صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر اشارے سے ان کو اپنے قریب بلایا خواجہ صاحب کو خوب جانتے تھے کہ شاید جان کو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا مگر دشمنِ عقل، مجسم حماقت۔ ساحل بحر سے پکار رہے ہیں اور فرضی مہری کا نام بی کرم بخش رکھدیا۔ اس عورت نے جو بلایا تو باچھیں کھل گئیں۔

خوجی :۔ (قریب جاکر ہمارے دماغ عرش بریں پر ہیں۔

عورت :۔ اے در ہوئے۔ ان کا دماغ! رہیں جھونپڑوں میں، خواب دیکھیں۔ محلوں کا کہاں، ہے تیرا دماغ۔ مونڈی کاٹا آیا وہاں سے دماغ لے کر۔ بڑا دماغ دار بنا ہے اب بول کچھ لایا بھی ہے یا خالی خولی محبت جتاتا ہے بے زر عشق ٹیں ٹیں لا! جو کچھ لایا ہو دے دے۔

خوجی :۔ اوں۔ لایا ہو۔ لایا کیا ہو۔ تم اپنا نام تو بتاؤ۔

عورت :۔ (دھپ جماکر) موڈی کاٹا۔ نام بتادو۔ نام بتادو؟

خوجی :۔ این! قسم ہے بارہ کنڈے کی، اب کی دھپ لگائی تو لگائی جو کہیں اب کی ہاتھ اٹھایا تو بہت ہی بیڈھب ہوگی۔ اے واہ، اور سینتے گا گہری رنگ لائی۔

عورت :۔ (دوسری دھپ جماکر) بیڈھب کیا تیرا سر ہوگی۔

آزاد :۔ ارے یار یہ کیا ماجرا ہے بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ استاد اب کوئی دم کے دم میں کھوپڑی گنجی ہوجائے گی۔ ہاں ایک اور۔

خوجی :۔ اجی عاشقی معشوقی کے یہی مزے ہیں بھائی جان ؎

عاشقان کشتگان معشوق اند
بر نیاید ز کشتگان آوازہ،

عورت :۔ اب ترکی نہ بولو۔ سیدھی طرح سے جو کچھ لاتے ہو ہمارے ہاتھ رکھ دو۔ نہیں بہت بری ٹھہرے گی۔ عاشق بنتے ہیں اندھے۔ تھکے دیتے لینے کا نام نہیں۔ ایسے عشق کو کیا کہوں اور ایسے عاشق کی دہان گردن ماروں جہاں پانی پینے کو نہ ملے۔ اب لاتا ہے، یا باتیں بناتا ہے۔

خوجہ :۔ یا الہیٰ۔ آپ اپنا نام تو آہستہ سے بتا دیجئے۔

عورت :۔ اے ہے کیا ننھے بنے جاتے ہیں یا تو دو کوس سے غُل مچا رہا تھا۔ شتاب جان شتاب جان یا ایسے تھکے ہو گئے، خدا کی سنوار شیطان کی پھٹکار۔ تجھ ایسے موئے سودائی پر مضنوعی شتاب جان نے خواجہ صاحب کی گت بنائی۔ خوجی ریشہ خطمی ہوئے جاتے تھے، جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ آزاد سے کہا۔ کیوں حضرت سچ کہیے ایجانب کی شناخت کیسی ہے۔ بمبئی سے تا بہ لندن (تک) ایسی خوبصورت عورت ہمیں، دکھا دیجئے، تو جانیں۔ کیا طاقت۔ کیا حسن ہے صدقے ذرا مسکراؤ جانِ من ۔

حق نمک چگونہ فراموش میشود
داغ مرا بخندہ نمک سود کردہ،

میں تو اس شوخ کی چال ہی سے سمجھ گیا۔ آزاد نے کہا۔ بارک اللہ۔ قریب کے لئے دور بھی کیا خوب خواجہ صاحب نے مسکرا کر کہا، یار اب تو تمہیں ہماری بات کا یقین آیا ہے مستانہ چال یا نہیں خرام ناز اسے کہتے ہیں۔

سرو من برخاست وز قدش قیامت شد پدید
خیر آن قامت کہ من ویدم قیامت را کہ دید،

اِدھر خواجہ صاحب نے یہ شعر پڑھا، ادھر اُس عورت نے ایک اور دھپ جمائی۔ مونڈی کاٹے شاعر کا بچہ بنا ہی دکان پکڑ کے، چل گھر۔ برسوں ہوتے منہ ہی نہیں دکھاتا۔ اسی منہ سے غُل مچاتا تھا۔ شتاب جان، شتاب جان خواجہ صاحب کی کھوپڑی پر اب کی اس رتاتے سے چپت پڑی کہ ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔ ان کی چاند۔ جھلا کر کہا۔ بس اب زیادہ ہاتھا پائی نہ کرنا، ورنہ جا کے ابا جان کے سامنے فریاد کروں گا کہ دیکھو ابا جان یہ شتاب جان ہم کو چپٹ پٹ مار بیٹھتی ہیں، واہ کیا مفت کا پایا ہے۔ جیسے کوئی بے وارثا ہے۔

مرزا :۔ یہ آپ کی منکوحہ ہیں، یا صرف رسمی ملاقات ہے۔

شتاب جان :۔ میرے اگلے بزرگوں سے مراسم چلے آتے ہیں۔

مرزا :۔ تو تم اور یہ بھائی بہن ہوئے، نہ رشتہ قائم ہوا۔

خوجہ :۔ خدا سنبھل کے فرمائیے گا۔ میں آپ کا بڑا لحاظ کرتا ہوں۔

شتاب :۔ اے تو کچھ جھوٹ بھی ہے۔ آخر آپ میرے ہیں کون ؟ (دھول لگا کر) بول مونڈی کاٹے بول۔ (چٹکی لے کر) آخر آپ کون ہیں ہمارے بتاتے۔ تو چلا وہاں سے بڑا وہ بن کے۔ روٹی نہ کپڑا سینٹ میٹ کا بھترا۔

خو :۔ لو بی صاحب نکاح تو ہو لے۔ ذرا چھڑی کے نیچے دھر لو۔

شتاب :۔ (جوتا نکال کر) اللہ کرے تجھ پر آسمان پھٹ پڑے۔ معشوق سے کوئی اس قسم کی باتیں بھی کرتا ہے۔ چھڑی کے تلے دم لو۔ یہ معشوقوں سے کلام ہوتا ہے (جوتا دکھا کر) دو ن لگاؤں پے بھاؤ کی۔

خو :۔ (ذرا پیچھے ہٹ کر) کیا مضائقہ۔ حاضر ہوں۔

عاشقانِ گشتگان معشوق اند

برنیاید ز گشتگان آواز ،

بس یہ شعر وردِ زبانِ خواجہ بدیع الزماں ہے۔

شتاب :۔ خیر دل لگی تو ہو چکی۔ اب یہ بتاؤ کہ خیریت سے ہے، خدا نے آج ہمیں یہ دن دکھایا کہ تم سے ملایا۔ ہزار شکر صد ہزار شکر۔

خو :۔ تھے میدانِ جنگ میں مگر دل تمہاری ہی طرف تھا۔

آزاد :۔ ہر روز یاد کرتے تھے بیچارے۔ بڑی محبت ہے۔

اتنے میں مرزا صاحب نے کہا کہ آزاد پاشا اور مس میڈا اور وہ دوسری پری پیکر گاڑی پر سوار ہو گئیں، اب تشریف لے چلئے۔ خوجی بولے اب بعد مدت جانِ جان پا کے کہاں جاؤں گا۔ آپ چلئے، میں بھی حاضر ہوتا ہوں، مجھے راستہ خوب یاد ہے۔ ہم کہیں بھولنے والی اسامی ہیں۔

راوی :۔ اے توبہ! آپ اور راستہ بھولیں۔ کیا طاقت۔ خدا جانے وہ کون ذات شریف تھے جو حوض میں گر پڑے تھے۔ جن کو کانسٹبل نے رگیدا تھا۔ جانا کہیں تھا پہونچے کہیں اور حوض ہی میں اشعار موزوں کئے تھے ؎

پلا ساقیا مالوے کی افیم | کہ ہے شوقِ گلشت باغ نعیم
پیاسا کئی دن کا ہوں ساقیا | جھلک آب اسود کی جھٹ پٹ دکھا
کرم کر فقیروں پہ مائی ڈیر | میں قربان جاؤں ذرا کم ہیر

اور خدا جانے مرزا صاحب کے مکان کے دھوکے میں افیمی کے ہاں کون گھسا جاتا تھا۔

الغرض وہ سب تو ادھر روانہ ہوئے، ادھر فرخی شتاب جان حضرت خواجہ بدیع کو ہمراہ لے کر

چلیں، گاڑی پر سوار کرایا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

خواجہ صاحب خوش و خرم کہ دل لگی میں معشوقہ ہاتھ آئی۔ یہ عورت ادھیڑ تھی۔ کوئی اڑتیس برس کا سن۔ کسی قدر نمکین ــ دراز قد، مگر گران ڈیل۔ بچہ فیل۔ خوجی ایسے دس کو بغل میں دبا لیتی۔ گھر پہنچی تو شتاب جان نے کہا۔ کچھ کھانے کو پکوائیے۔

خوجہ:۔ چہ خوش اب رنگ لائی گلہری۔ بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ ہم سپاہی آدمی ــ میرے پاس بجز ڈھال تلوار، چھری، کٹار کے اور کیا ہے یا تمغے سو وہ میں کسی کو دے نہیں سکتا۔ آزاد کے صندوق میں ہیں۔

شتاب:۔ کمائی کرنے گئے تھے وہاں سے کیا لاتے، تمغے لے کے چاٹوں، تلوار سے اپنی گردن ماروں چھری بھونک کے مر جاؤں، نکھٹو چھری تلوار سے پیٹ بھرتا ہے۔

خوجہ:۔ یہ دل لگی بازی اچھی نہیں۔ برسوں کے بعد آئے ہیں۔ کچھ کھلواؤ کچھ پلواؤ۔ پھر جب ہم رسالداری کریں گے تو تم کو بھی دیں گے۔ گھبراہٹ کاہے کی ہے۔

شتاب:۔ اچھا تو ایک کام کرو۔ ہمیں ایک کاغذ پر اس قدر لکھ دو کہ شتاب جان خوجی کی بیوی ہے۔ یا ہمارے نام خط لکھو اور اس میں جورو ہم کو، لیس پھر ہم تم سے کچھ نہ مانگیں گے۔

خوجہ:۔ تو مطلب یہ ہے کہ سفیدی پر سیاہی پھیر دوں۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ ایں چہ بہتر۔ خانہ احسان آباد بالنون والصاد۔ لاؤ کاغذ قلم دوات (لکھنے لگے)

خطِ دوستی نمط بنام شتاب جان مشفق مہربان زوجہ زوجگان سرور شوہران و آشنائے خویشان نور اللہ مرقدہٗ بعد بوسہ بوسہ شوقِ ملاقات و کنار کنار اشتیاق، تحصیل نفاستے بالقا من میگویم کہ برمی گوید۔ کما قال السعدی۔

تب تو اہلِ دل کی خوشبو سے معطر ہو دماغ

جستجو مثل صباحیب در بدر پیدا کروں

راوی:ــ نئی بات معلوم ہوئی۔ شیخ مبارک نہاد اردو شعر بھی خوب کہتے تھے خوجی نہ ہوتے تو یہ بات کس کو معلوم ہوتی۔

خیر اب خواجہ صاحب کے خط کا بقیہ سنئے۔

جان شوہران ورد حِ دورانِ خویشاں، خویش و سر درد دل خواجہ دلریش مالک و ملکِ آن بان، سارے معشوقوں کے بدن کی جان، نورچشمی لختِ جگری، شتاب جان، صاحب ہوت (اس ہوت کے جواب میں اگر از راہِ مذاق دھوت یا دوت دوت نہ کہے تو ہمارا ہی خون پیئے جگر گوشہ من بدیں چگونم کہ بر من چہا

گذرتی ہے۔ آزاد کہتے ہیں کہ خواجہ تم کو شتاب جان عزیز نہیں رکھتیں۔ حالِ جنگ چہ شروع خواہد داد۔ دادِ از دست غفلت داد۔ دادمیں نے دو بڑے کام کیئے وہ تم سن ہی چکی ہوگی۔ ایک یہ کہ دس ہزار کی ناک کاٹ ڈالی۔ دس ہزار کون۔ زندے نہیں۔ مردے۔ زندے سے تو کوئی بھی نہیں ڈرتا۔ مردے سے البتہ خوف معلوم ہوتا ہے۔ زندوں سے تو میں بولا بھی نہیں مگر ادھر غنیم کی فوج نے شکست پائی ادھر بندہ درگا قرولی چھری قرابنیچہ پھتر کلا شیر بچہ لے اور میدان میں کھٹ سے داخل۔ جسکو دیکھو کہ سسک رہا ہے۔ اس سے پھنک کے چلا اور جس کو دیکھا کہ بالکل سرد ہوگیا ہے۔ اس کی ناک اڑادی، نکالا پھتر کلا اور ناک کھٹ سے الگ۔ لی قرولی اور کان کتر لئے۔ بات تیرے کی۔ جبتک میدان گرم تھا تب تک تمہارا سعادتمند آدمی خواجہ بدیعا ادھر اُدھر چھپ کے بیٹھتا تھا، کبھی بیٹر پر چڑھ گیا، کبھی پھنگی پر ہورہا۔ کبھی اس شاخ پر کبھی اس شاخ پر۔ چوطرفہ پھدکتا پھرتا تھا۔ واہ رے میں لڑائی کا نام آیا اور بندہ بھاگ کھڑا ہوا۔ تو وجہ کیا مردمیں نہ کبھی کوئی مرد زندہ آدمی سے مقابلہ ہی نہ کرے گا۔ مرد وہ جو مردے سے بھڑے۔ زندے کی ناک کاٹ لینا کون، بڑی بات ہے جب جانیں کہ کوئی مردے کی ناک کاٹ لے۔ یہ کام تمہارے ہی سعادتمند آدمی خواجہ بدیع سے ہوا۔ ایک مرتبہ بڑی مصیبت پڑی۔ ترک اور روسی دونوں کا قاعدہ ہے کہ لڑبھڑ کے کٹ مرنا جانتے ہیں مگر بعد فتح مردوں کے قتل کی فکر ہی نہیں۔ سپاہی وہ مردے کو بے حیثیت کردے۔ ہاں صاحب بس جنگ ختم ہوتے ہی سب اپنے اپنے دھندے سے لگے مگر سپاہی کو زیر فلک چین کہاں۔ ہم بھیگی بلی بنے ہوئے ایک اونچے درخت پر بیٹھے تھے کہ بھئی کسی کے پھٹے میں ناحق بن ناحق کون پالوں ڈالے۔ درخت سے اترے حسبِ معمول بندوق لی۔ پندرہ ہزار کے کان کاٹ لئے۔ یہ ایک ادنیٰ سی بات تھی۔ بائیں ہاتھ کا کرتب، بس دوم دے بولنے لگے تب تو میں ڈرا ـــــــ وہ ـــــــ لاحول۔ ڈرنا کیا معنی ہم سپاہی زادے کہیں ڈرا کرتے ہیں۔ ایک ذرا جھجک سی ہوئی بدل کے بیٹر امیں نے پوچھا۔ چہ میگوئی۔ ایک بولا آب ـــــ دوسرے نے کہا شراب۔ آب جس نے کہا تھا اس کو پانی پلایا۔ شراب جس نے مانگی تھی اس کو شراب پلوائی۔ دونوں گر پڑے۔ ان دونوں کو تو بندے نے چھوڑ دیا۔ باقی اور سب کے کان کاٹ ڈالے۔ ناکیں، جبڑے اڑالیں اور سنئے بڑی کوشش اس بات کی تھی کہ قلعے سے باہر نہ نکلوں۔ یہ عین سپاہی پن ہے۔ میں سوچتا تھا کہ اگر قلعے کے باہر آیا تو مبادا فی النار ہوں۔ ذرا سی گولی اچھے ڈوہ کے ڈوہ کو گرادیتی ہے۔ میں ڈوہ سے ذرا زیادہ ہوں۔ میرے لئے گو کہ کافی تھا ـــــ میں سوچتا تھا کہ یا خدا اگر فی النار ہوا تو اپنی جگہ گوشۂ عزیزی شتاب جان معشوق شوہران سے کیونکر ملوں گا اور سنو۔ گلی کوچوں گاوں میدان کے لونڈی لاڑھتے صورت دیکھتے ہی دور سلام سے کرتے اور میری سواری کے ساتھ رہتے تھے۔

وہی اثر ہے جنوں کا ابتک وہی ہے لڑکوں کو اب بھی کاوش
کہ میری سلی کے روز مجنون بگاڑتے ہیں بنا بنا کر

دہاں جس شہر میں جانا تھا ـــــــ شہر بھر کی کم سن عورتیں آرزو رکھتی تھیں کہ کسی طرح ایک نظر ہم کو دیکھ لے مگر ہم کب دیکھنے والے ہم بھلا اے توبہ۔ ہاں ایک زنِ حسین وخوش جمال بشکل جان جانانِ نسخۂ تپ دق۔ خاتون شتاب جان کی شکل ہم صورت سے البتہ نظر لڑائی مگر صورت کا اثر وہ مخاطب نہ ہوتی۔ کئی بار دروازے پر سر ٹکراتے۔

دردِ سر کی یہ دوا ہم کو ملی
سر تری چوکھٹ سے ٹکراتے ہیں ہم

پھر تو یہ کیفیت تھی کہ وہ گھر سے نکلی اور ہم سایئے کی طرح پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیتے پھر جناب گالیاں بھی دیں اور پتھر بھی کھائے اور ڈنڈے بھی مارے مگر خواجہ بدیعا نے پیچھا چھوڑا نہ چھوڑا۔ ایسے ڈٹے رہے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ جہاں کسی نے کہا کیدان صاحب آگئے۔ بس گالیاں دینے لگی:۔

لیا جس نے ہمارا نام مارا ہے گنہ اسکو،
لیا جس نے بتایا بس وہ تیروں کا نشانہ ہے

غرض کہ جنگ میں ہم نے بڑا نام کیا۔ آزاد پاشا، ازاد پاشا، آئے وہاں سے بڑے سپاہی بنکے۔ قسم ہے شتاب جان کے سرِ مبارک۔ یہ صرف اس خواجہ بدیع ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے پاشا اور نامی گرامی بن بیٹھے، یہ تو جانتے بھی نہ تھے کہ جنگِ کرا بیگوید، مار مار کے مین نے اصول سکھاتے۔ اب ذرا مسکرا دو۔ خط پڑھ کر ذری تبسم ناز بھی چاہیئے۔

تبسم منہ میں فرمایا تو ہوتا
ذرا بجلی کو تڑپایا تو ہوتا،

اب آداب بجالاتا ہوں۔ جیو نگا تو پھر ملوں گا، ساڈے نال بے او میاں، یادش بخیر۔ سونے کی صراحی شیشے کا پیالا پیتا کیوں نہیں، ساڈے نال بے میرا ماہر وڈھولا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔ ماخیر و شما بسلامت۔ راقم الدعا خواجہ بدیعا۔ (مرسل فی الہوطل الاسکندریہ الملک المصر۔)

راوی :۔ اے سبحان اللہ۔ عربی خوان بھی حضور ہیں۔ ماشاء اللہ صرف ونحو میں کیا خوب دخل ہے۔ ہوطل ہوٹل کی عربی ہے۔

جب خواجہ صاحب یہ خط لکھ چکے تو باآوازِ بلند اپنی جگر گوشہ شتاب جان کو سنایا اور اکڑ اکڑ کر کہنے

لگے۔ کیوں جانِ من! سچ کہنا کیا کیا فقرے لکھے ہیں۔ ہاں سپاہی ہی سپاہی نہیں ہوں۔ منشی بے بدل ہوں تمہاری شان میں وہ غزل کہونگا کہ پھڑک جاؤ اور طرز بعینہٖ ایسا ہوگا مگر رنگ اس سے اچھا۔

ابر میں لب نہ چھپا شرم سی تیرے آگے ۔۔۔ ماہ کس رات چراغ تہِ دامان نہ ہوا

مینھ برستا ہی تو بجلی بھی چمکتی ہی ضرور ۔۔۔ تو تو اک روز مرے رونے پہ خنداں نہ ہوا

نظر آیا نہ کبھی یار کی تلوار کا گھاٹ ۔۔۔ غسل میت کا ہمارے کبھی سامان نہ ہوا۔

ہجر میں کون سے عاشق کے نہ تو کام آئی

اُمّی اَجَلْ ایک ہمیں پر ترا احسان نہ ہوا

اب سنئے کہ شتاب جان کے مکان پر ایک فارسی خوان بھی بیٹھا تھا مگر وہ آدمی پھٹے کپڑے پہنے ہوتے۔ بوچا کان ندارد۔ خط سنکر خوجی کی طرف مخاطب ہوا۔

بوچا۔ آپ کا دولت خانہ کہاں ہو۔ سلام علیک۔

خو:۔ آپ کو کیا واسطہ۔ سپاہیوں کو ٹوکتا ہو۔ ابے ہم کہیں رہتے ہیں، تو اپنی جگہ اور اگر لڑنے کا دعویٰ ہو تو لے قرابین۔ اور میدان کر۔

بوچا۔ ہم تو علمی بحث کرتے ہیں اور تم سے لڑکے کون اُلّو بنے ذرا ذرا سے ہاتھ پاؤں۔ بٹیر کے برابر قد۔

خو:۔ ہونھ! بٹیر کے برابر قد! اے نادان یہ چور بدن ہیں۔

بوچا:۔ اے جا چھٹے آیا وہاں سے چور بدن ہے۔

راوی:۔ خوجی بھلا کب کسی کی سننے والے تھے۔ بہت ہی بگڑے اور اگر شتاب جان نہ روکتیں تو بوچے کو مار ہی ڈالتے۔ خیر۔ اب صلاح ہوئی کہ علمی بحث ہو۔

خواجہ صاحب نے کہا کہ ہم کو آج تک کسی نے ٹوکا نہیں تھا۔ اوّل اوّل انھوں نے ٹوکا ہم بحث کیے نہ رہیں گے۔

بوچے نے کہا خط از سر نو پڑھیے تو عرض کروں۔ خوجی پڑھتے جاتے تھے اور وہ ٹوکتا جاتا تھا۔

خو:۔ جانِ شوہران۔

بوچا:۔ ہو ہو۔ واہ رے بے حمیت شوہر۔ اچھا شوہر ہے جان شوہران یعنی کئی شوہر میں ایسے شوہر پر خدا کی سنوار۔

خو:۔ ارے شوہر شوہران کا الف نون کاٹ ڈالا م روح و روان خویشانِ خویش۔

بوچا۔ خویشان یعنی داما دوں سے مطلب ہے اور خویشاں کے بعد خویش کا لفظ کتنا موزوں ہو۔

خو۔ نہایت ہی غصے سے (اکڑ کے) یہ مہمل اعتراض ہے فوراً اٹھ جائے گا۔ نور چشمی لخت جگری۔
لوچا۔ اے لعنت خدا معشوق کو نور چشمی اور لخت جگری اور صاجزادی ہیں آپ کی۔
خو۔ یہ بھی بالکل بے تکا اعتراض ہے۔ معشوق کو اگر لخت جگر کہا تو کیا نقصان ہے اور نور چشم تو وہ ہے ہی۔ دھوت
لوچا۔ شتاب جان چاہیے دھوت نہ کہیں۔ ہم تو دوت دوت کہے دیتے ہیں۔ واہ اچھا معشوق ہے جس کو آپ ہوت کر کے پکارتے ہیں اور خواہش یہ ہے کہ وہ اس کے جواب میں دھوت کہے۔ واہ رے بے تکے۔
خو۔ جگر گوشہ
لوچا۔ جگر گوشہ لڑکے کو۔ لکھتے ہیں۔ یا چھوٹی بہن کو۔ معشوق کو نہیں لکھا کرتے۔ خوجی خیر آپ کی بلا سے۔

من اگر نیکم وگر بد تو برو خود را باش

ہر کسے آن درود عاقبت کار کشت

لوچا۔ اور چہا گذرتی ہے۔ اس فقرے نے تو خط میں جان ڈالی۔ ایک ترکی لفظ بھی ملا لیا ہوتا۔ بہت چوکے۔
خو۔ شرح خواہد داد۔ داد، داد، از دست غفلت داد داد۔
لوچا۔ وحشت، بالکل بے تکا ہے اس کے کیا معنی ہوتے اور ہم کو تو اس فقرے نے پھڑکا دیا کہ جب کاٹی مردوں کی ناک کاٹی، زندے سے بحث کرنا، اور لڑنا فضول ہے۔ وہ تو سب کر سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مردوں کا مقابلہ کرے، ورنہ سپاہی پن نہیں۔ واللہ کتنے بہادر سپاہی ہو اور طرہ یہ کہ اگر کوئی سسک رہا ہے تو بھی، حضرت اس کے قریب نہ پھٹکے۔ دور ہی دور رہے۔ شاباش میاں شاباش شتاب جان کو اچھے ملے۔
خواجہ صاحب نے بڑی نادانی یہ کی کہ جو سسک رہا تھا، اس کے قریب نہیں گئے۔ اس خوف کو ملاحظہ فرمائیے۔ ڈرے کہ مبادا کاٹ کھاتے یا چکت لگاتے اور یقین کسے ہے حضور مردوں سے نہ ڈرے ہوں۔

شتاب جان نے کہا اور تو خیر۔۔۔ مگر کیوں میاں پتھر کلا اور بندوق سے ناک کیونکر کاٹ ڈالی جاتی ہے۔ اس پر خواجہ بدیع بہت بگڑے ہوئے تھے۔ دینے میں بند تو تھے نہیں کہا تم تو ان باتوں کو کیا جانو۔۔۔ تم آرائش اور سنگار جانو یہ باتیں وہ سمجھ سکتا ہے جو عقل سے بہرہ رکھتا ہو۔

اس تمنا میں ہم افسوس ہوئے سودائی

تیرے ہاتھوں سے مگر چاک گریباں نہ ہوا

پھر وہ عورت بولی تم کبھی میاں بنتے ہو، کبھی سعادتمند آدمی۔ مجھے خوف ہے کہ ایسا نہ ہو تم عدالت میں بھی جیسے لڑکے بن جاؤ تو پھر مجھ کو شرمانا پڑے۔ اس امیر خوجی نے طیش کھا کر اپنے حساب لطیفہ کہا۔ فرمایا۔ واہ لڑکے کی ایک

ہی کہی۔ عدالت تک نوبت آئی تو ہم تمہارے باپ بن جائیں گے۔ گھر بھر لوٹنے لگا۔ شتاب جان اور بوچا اور گھر کی یہ کیفیت تھی کہ سب کے سب لوٹ لوٹ گئے۔ وہ خواجہ صاحب واہ۔ زبان سے کہنا ہنیں بیوی کے باپ بننے پر تیار ہو گئے۔ اس عقل کے قربان، اور کس مزے سے کہتے ہیں۔ لڑکے ہنیں ہم باپ بن جائیں گے۔ ماشاء اللہ مگر سپہ گری کا ثبوت اچھا دیا کہ لڑائی کا نام آیا اور بندہ بھاگ کھڑا ہوا) اور اس پر طرہ یہ کہ (مرد ہیں نہ) واہ اچھے مرد ہیں کیا کہنا۔

الغرض انہوں نے اُن سے خط لے لیا۔

اب ادھر کا ذکر سنئے کہ آزاد خوش خوش، مرزا صاحب کے مکان پر داخل ہوتے اور زیبن نے بیوی کو اطلاع دی کہ آزاد آ گئے۔

آزاد فرخ نہاد بمبئی سے روانہ اور عازم ملک جانانہ ہوئے

کہاں ہو تو اے ساقی تیز ہوش ۔۔۔ کہ مانند مے مجھ کو آیا ہے جوش

پلا جلد اک جام کوثر مجھے ۔۔۔ خراب شراب ہدیٰ کر مجھے

وہ ذوق آشنا لذت افزا شراب ۔۔۔ کہ تسنیم ہو شرم سے جس کے آب

وہ مے مشتری جس سے ہیں سر فروش ۔۔۔ وہ ہے جس کا صدیق ساخم بدوش

وہ مے جس کی قلقل ندائے صلوٰۃ ۔۔۔ سجود صراحی اداتے صلوات

وہ مے جس کی نکہت نسیم بہشت ۔۔۔ وہ مے جس کی تلخی نعیم بہشت

وہ مے جس کی کلفت صفائے سحر ۔۔۔ وہ جس کی قلقل دعائے سحر

وہ مے جس کی لو جانِ صاحب ذلاں ۔۔۔ وہ مے جس کا رنگ آتش مقبلان

وہ مے جس سے مومن زبان تر کریں

وہ مے جس سے پرہیز کافر کریں

مگار طناز و سراپا ناز شیریں حرکات، و رنگین انداز یعنی بمبئی کے مرزا صاحب کی چاہتی بیوی نے جو آزاد فرخ نہاد کی آمد آمد کی خبر پائی تو جامے میں پھولی نہ سمائی۔ لونڈی سے کہا زیبن مدت کے بعد آرزو بر آئے پیاری بہن کے پیاری کے آنے کی خبر پائی۔ اس مژدہ طرب انگیز نے میری روح کے ساتھ وہ کیا جو باد بہاری غنچۂ گل کے ساتھ کرتی ہے۔

برین مژدہ گر جان فشانم رواست
کہ این مژدہ آسایش جان ماست

زبین بولی، قربان جاؤں حضور۔ یہ تو قاعدہ ہے کہ جب کبھی عزیز کی آمد آمد ہوتی ہے تو دل بشاش ہو جاتا ہے۔ نہ کہ آزاد سا عزیز۔ یاد ہے جب چلتے چلتے گاڑی پر سے اتر کر حضور کے کان میں کچھ آہستہ سے کہا تھا یاد ہے نہ۔

یہ فقرے سن کر بیگم صاحبہ لجائیں اور تنک کر بولیں، زبین اللہ جانتا ہے جو مجھے محبت نہ ہوتی نہ تو میں اس وقت تیری آنکھیں تلوے کے تلے مل ڈالتی اور جہاں کی ہے وہیں پہونچا دیتی۔ موئی شفتل خام پارہ نیکے کی اوقات۔ اس کائنات پر بھولی ہوئی ہے۔ اور ہمارے سامنے مسکرا مسکرا کر اور آنکھیں مٹکا کر باتیں کرتی ہے۔ زبین مگر دبی نیچی کمر کے بولی۔ سرکار جو ہیں نے بڑے مرزا صاحب سے ذری بھی ذکر کیا ہو تو اللہ مجھ سے سمجھے۔ جنت نصیب نہ ہو اور صاف کہواؤگی تو میں ضرور کہوں گی کہ گاڑی سے اتر کر آزاد نے کان میں بات کہنے کے بہانے سے حضور کے گال چوم لئے تھے۔ حضور برا جب مانیں جب لونڈی کہیں۔ ادھر ادھر کسی ایرے غیرے سے چپکیاں سی کہتی، پھرے کیا مجال آج تک زبان پر لائی ہوں تو زبان تراش ڈالے۔ ایسا ہو سکتا ہے بھلا۔

بیگم صاحب نے طیش میں آکر کہا۔ موئی اندھی۔ تجکو دور سے یہی سوجھا ہوگا کہ گال چوم رہے ہیں۔ وہ کان میں کچھ کہنے کو تھے مگر مارے گھبراہٹ کے رخسار پر ہونٹھ جم گئے۔ زبین نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ سرکار تو غضب ڈھاتی ہیں۔ چلئے خیر ایسا ہی مگر لونڈی نے ان کو حضور سے باتیں کرتے تو ضرور دیکھا۔ آہستہ آہستہ مسکرا کر باتیں ہوتی تھیں۔ بیگم صاحب سمجھ گئیں کہ زبین راز داں ہے۔ کہا سنو زبین۔ صاف صاف یہ ہے مجھے حسن آرا سے عشق ہے۔ وہ مجھ پر عاشق اور میں اس پر عاشق ہوں اور اس کو آزاد سے دلی عشق ہے۔ پھر مجھے بتاؤ آزاد سے الفت ہو یا نہ ہو۔

پیارا نہیں پیاری کا پیارا ہے
رنج اس کو ہو تو کس طرح گوارا

اُس روز آزاد نے چلتے چلتے بوسہ لیا تھا مگر صدق دل سے اور صفائے دل سے۔ اب تم چاہے جو معنی لگاؤ۔ اللہ گواہ ہے کہ میری نیت بد نہیں اور زبین سچ کہتی ہوں نیت بد ہو بھی تو نہیں ہو سکتی۔ چھوٹی بہن کا دولہا غضب ہے کہ اس پر نیت ڈگمگائے۔ بہو بیٹیوں کی یہ خو نہیں ہے اور لاکھ لاکھ میں دو چار ایسی ہوتیں تو کیا۔ نیک اندر بد، و بد اندر نیک۔ مشہور ہے مگر یہ عشق خدا اس سے سمجھے، یہ موجد نیرنگ ہے۔ پارساؤں کی پارسائی خاک میں ملائی۔ اُمرا کے خرمن امارت پر اس نے بجلی گرائی ——— یوں ہی دل بھی آتا ہے،

اور انسان کو حیوان سے بدتر بناتا ہے۔

یہ کہہ کر بیگم بصد ناز و ادا اٹھیں۔ خواص کو حکم دیا کہ آبنوس کی صندوقچی لائے۔ اس میں سے آزاد کا تصویر... تصویر بولا چاہتی تھی۔

نازسے خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
اور تصویر یہ بول اٹھی کہ اللہ رے میں

تصویر دیکھتے ہی عشق نے اثر دکھایا اور جنون نے زور کیا۔ اب ساری چوکڑیاں بھول گئیں۔ نہ یہ یاد رہا کہ چھوٹی بہن سے نکاح کا وعدہ ہوا ہے نہ یہ خیال رہا کہ پیاری کا پیارا ہے۔ تصویر کو زبین اور خواص کے سامنے چوم لیا۔ زبین نے خواص کی طرف اور خواص نے زبین کی طرف حیرت کے ساتھ دیکھا مگر دونوں سلیقہ شعار تھیں۔ مثل پیکرِ تصویر خاموش ہو رہیں۔ ؎

دھوم ہے خسرو اقلیم جنوں آتا ہے | فوج غم ساتھ ہے آمادۂ خوں آتا ہے
خلل انداز صفِ صبر و سکوں آتا ہے | صاحبِ لشکرِ نیرنگ و فسوں آتا ہے

قابل دید تماشا حشم و جاہ کا ہے
داخلۂ تخت گہ دل میں شہنشاہ کا ہے

وہ ملک فقر شہنشاہ زمن کون کہ عشق | تیغ زن تیر فگن قلعہ شکن کون کہ عشق
رستم معرکہ رنج و محن کون کہ عشق | مالک ملک دل و جان و بدن کون کہ عشق

گرد میں گردشِ ایام کی بہاری دیکھو
حضرتِ عشق کی آتی ہے سواری دیکھو

کیا جلوس اس کی سواری کا دکھاتا ہے بہار | فیل آفت کے جلو میں ہیں ستم کے راہوار
آگے آگے علم نالہ خورشید نثار | زر فشاں اس کا پھریرا کہ دھواں آتشبار

دل جو ٹوٹے ہیں نقیب آہ کے ہرکارے ہیں
آبلے سینۂ عشاق کے نقارے ہیں

بیگم صاحب اس تصویر جوان ماہرو پر ایسی ریجھیں کہ حیا سے منہ موڑا۔ بے شرمی سے ناتا جوڑا۔ بار بار تصویر چومنے لگیں۔ زبین اور خواص کسی تدبیر سے ان کو کوٹھے پر لے گئیں اور ایک ذرا پلنگ پر لٹا دیا۔ ایک نے پنکھا جھلا، دوسری نے عطر سنگھایا۔

بیگم :- ہم کو غش آیا ہو تو عطر دو لخلخہ سنگھاؤ۔ گرمی دماغ پر چڑھ گئی ہو تو پنکھا جھلو۔ دونوں علاج اس وقت

بے کار ہیں۔

زیبن :۔ حضور خدارا دل کو قابو میں رکھئے واسطے کبریا کے۔

بیگم :۔ زیبن یہاں تم رہو اور یہ خواص۔ بس اور کوئی نہ آنے پائے۔ ریل کے آنے کا وقت تو ابھی دور ہے۔

خواص :۔ سرکار اس وقت ذری آرام کریں تو خوب بات ہے

زیبن :۔ ہاں حضور ایک ذرا سو رہیئے تو یہ سب خلش دور ہو جائے گی۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ حضور مجھے کہنا زیبا نہیں ہے۔ چھوٹا منھ بڑی بات۔ مگر بے کہے رہا بھی تو نہیں جاتا۔ یہ جو خرابی ہے۔

بیگم :۔ دروازے بند کر دو۔ جو وہ آئیں تو کہدینا کہ طبیعت نصیب اعدا یوں ہی سی بے لطف ہو گئی تھی، اب ذرا آنکھ لگی ہے جگایئے نہیں، اور جو آزاد ساتھ ہوں تو ان سے بھی یہی کہدینا۔ یہ حال کسی پر کھل جائے تو حقارت کی نظر سے دیکھئے۔

خواص :۔ خبر تو آزاد کے آنے کی کل سے ہے۔ آج ضرور آئیں گے اور آج سویرے سے میری بائیں آنکھ، پھڑک رہی ہے۔

زیبن :۔ اللہ اللہ کیا دلیل ہے۔ ان کی بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ تم کیا اور تمہاری بائیں آنکھ کیا۔

بیگم :۔ آنکھ پھڑکتی تو ہماری بائیں آنکھ پھڑکتی۔ تم سے کیا سروکار۔ بالکل پھوٹ رہی رہی اور میرے دل کو خدا جانے اس وقت بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔ کس سے کہوں اور کہاں جاؤں۔ کہوں تو اپنے کو ہنسواؤں اور بھاگ کے جاؤں تو کہاں جاؤں۔

خواص :۔ اے حضور عشق تو میری گھٹی میں پڑا تھا۔ آزاد کو میں نے دیکھا ہے ابھی اٹھتی کوپل ہے مسیں بھیگتی ہیں اور حسن تو اللہ نے تین حصے ان کو دیا ہے۔ ایک حصے میں ساری خدائی ہے۔ مگر میری مجال کیا کہ دل کا حال زبان تک لائے لونڈی کہیں سرکار کے منھ چڑھ سکتی ہے۔

زیبن :۔ اخاہ اُن کے جوہر تو اب کھلے اور اس بے حیائی پر خدا کی سنوار کہ سرکار کے سامنے بے ادبی کرتی ہے

خواص :۔ جوانی میں بندی نے بھی سیکڑوں ہی گھر کھائے ہیں۔ اس شہر میں جتنے گھونگر والے ہیں، وہ سب، مجھے جانتے ہیں مگر رنگاوٹ کی اور الگ۔ فقط باتوں کا مزہ ہے۔

بیگم :۔ اللہ گواہ ہے تمہاری باتوں سے میرا جی جلتا تھا مگر خیر آخر میں تم نے بگڑی ہوئی بات بنائی۔ ورنہ تم ہو بیٹوں میں رکھنے کے قابل نہ تھیں۔

زیبن :۔ اے بوا تمہارے میاں کہاں ہیں۔ ہیں بھی یا نہیں؟

خواص :۔ موا کل موا۔ تنباکو کا پینڈا حد جانے کہاں چلا گیا۔ زمین کھا گئی کہ آسماں کھا گیا۔

اتنے میں بیگم صاحب کی آنکھ لگ گئی تو زبین نے خواص سے کہا آج تو تم نے ایسی باتیں کہیں جو تمنے پہلے نہیں کی تھیں اور مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ اتنی جلد تم بے تکلف کیونکر ہو گئیں اور بے تکلف بھی کس سے جس کا نمک کھاتی ہو۔ ہم نے آج تک ایسی منہ پھٹ عورت دیکھی نہ سنی۔ خواص نے کہا۔ تم یہ باتیں کیا جانو؟ کیا ہم سے زیادہ نمک حلال ہو۔ میں نے دیکھا کہ سرکار کا دل اس وقت بے طور آیا ہے اگر ان کی سی کہتی ہوں تو بُرا اور جو ان کو سنبھالتی نہیں ہوں تو بُرا۔ ہر طرح خرابی ہے۔ میں نے وہ بات کہی جو اُن کے دل پر اثر کرے۔ مگر پھر ویسی ہی بدل گئی۔ بات کرنے کے لئے سلیقہ چاہئے۔ تم سوچو تو کہ بڑے مرزا صاحب کے سامنے بھی ان کی خدانخواستہ یہی کیفیت رہی، تو کیا ہوگا؟ ایک تو میاں بیوی میں دشمنی ہو جائے گی۔ دوسرے آزاد صاحب یہاں نہ آنے پائیں گے۔ تیسرے خرابی یہ ہو کہ پھر سرکار اپنے میکے نہ جانے پائیں۔ خدا ہی خیر کرے۔ میں کہتی ہوں ابھی سے تو یہ حال ہے اور جو آزاد کی ان کی چار آنکھیں ہوں کیا ستم ہو جائے۔ کسی نہ کسی طرح سرکار کو سمجھانا چاہئے۔

زبین :۔ (بہت آہستہ سے) اس بار بھی ان کی یہی کیفیت رہی، مگر ایسی خود رفتہ نہیں ہو گئی تھیں جیسی اب ہیں، اب کی تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔

خواص :۔ میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ میں کیا کہوں۔ یہ ہونا کیا ہے یارب یہ تو بڑی بری ہوئی۔

زبین :۔ میاں سمجھیں گے بیوی بدراہ ہو گئیں، پاس پڑوس کی عورتیں طعنے دیں گی۔ گھر میں دن رات تکرار رہے گی۔ کچھ گل کھلنے والا ہے بہن۔ ہمارا ماتھا ٹھنکتا ہے اللہ رحم و فضل کرے اپنا۔

خواص :۔ آمین۔ ہم تو جانتے ہیں! ذری آرام کرنے سے طبیعت کا رنگ بدل جائے گا اور جو نہ بدلا تو قیامت کا سامنا ہوگا۔

اتنے میں مرزا صاحب، اور آزاد پاشا دروازے پر گاڑی سے اترے۔ خدمت گار نے جھک کر آزاد کو آداب عرض کیا، اسباب لیا۔ دونوں جیب بسبب کمرے میں آن کر بیٹھے۔ مرزا صاحب محل سرائے میں تشریف لائے۔ مہری سے پوچھا۔ ہماری بیگم صاحب کہاں ہیں۔ اُس نے کہا حضور کمرے میں ہیں، یہ اوپر تشریف لے گئے۔ دیکھا دروازے خوجی کی آنکھ کی طرح بند ہیں۔ ایک دروازے پر ہاتھ مارا۔

زبین نے قریب آن کر کہا۔ حضور غل نہ مچائیں، سرکار کی طبیعت نصیب دشمنانِ کچھ یوں ہی سہی بے لطف ہو گئی ہے اب ذری آنکھ لگی ہے سوتے دیجئے۔

مرزا :۔ دروازہ تو کھولو۔ خیر ہے۔

زبین :۔ جی ہاں حضور۔ فضل الٰہی ہے مگر ابھی سوتی ہیں۔

مرزا :۔ تو طبیعت ہے کیسی۔ خدانخواستہ بخار کی آمد تو نہیں ہے دروازہ کھول دو۔ میں نبض تو دیکھوں۔

زیبن:۔ بہت خوب مگر کھٹر بر ہوگا اور آنکھ کھل جائے گی۔

مرزا:۔ اچھا جانے دو۔ جب بیدار ہوں تو مجھ کو بلوا لینا۔ اور کہدینا کہ محمد آزاد بخیریت آ گئے۔ باہر بیٹھے ہیں

زیبن:۔ خیریت سے تو آئے۔ میری طرف سے بندگی کہدیجئے گا۔

مرزا:۔ (مسکرا کر) بہت اچھا۔ جگانا نہیں، سونے دو۔

زیبن:۔ بہت خوب۔ جب خود بیدار ہوں گی تو عرض کر دوں گی۔

مرزا صاحب باہر تشریف لائے۔ کہا گھر میں سوتی ہیں اور طبیعت بھی کسی قدر ناساز ہے۔ میں نے زیبن سے کہدیا۔

آزاد سمجھے کہ بیگم صاحبہ نے بے اعتنائی کی۔ شاید کوئی امر طبع نازک کو ناگوار گذرا۔ بڑی دیر تک اسی فکر میں غلطاں پیچاں رہے کہ یا الٰہی یہ کیا سبب ہے کہ ہم سے ملنے سے انکار کیا ان کو شک کے عوض یقین تھا کہ مرزا صاحب نے بات بنائی۔ بیوی کو ہمارے آنے کی خبر سنائی تو ملنے سے انھوں نے انکار کیا۔ طبیعت بے چین ہو گئی اور یہ اشعار زبان پر لاتے۔ ؎

بلبلان گرسنہ مرا بار سخن یا ید داد　　فرصت یک دو سہ آہے بچمن باید داد

مسکنی در قدم سرو سمن باید داد　　فرش خار بے پئے آسائش تن باید داد

بر غریبیم نفسے یاد وطن باید داد　　بعد ازیں گوش بر افسانہ بمن باید داد

کہ من از تازہ گلے تازہ حکایت دارم

از وفائے کہ در وینست شکایت دارم

اب سنئے کہ ایک چپراسی نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر مرزا صاحب کو سلام کیا اور ایک لفافہ دیا۔ لفافہ کھولا۔ چٹھی کا مضمون یہ تھا۔ آج بتاریخ ______ ساڑھے چھ بجے آپ صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کے دفتر میں آئیے مشورہ کرنا ہے۔

مرزا:۔ بھئی اس وقت تو جانے کو جی نہیں چاہتا۔ بعد مدت ایک دوست آتے ہیں، ان کی تواضع کرنا لازم ہے ورنہ وہ کہیں گے کہ اچھے میزبان کے مہمان ہوتے۔

آزاد:۔ استغفر اللہ۔ آپ جائیے، میں ابھی کئی روز تک مہمان رہوں گا۔ آپ جائیے کوئی ضروری کام ہوگا شاید۔

الغرض مرزا صاحب نے گاڑی تیار ہونے کا حکم دیا اور سوار ہو کے رجسٹرار کے دفتر گئے۔ ادھر آزاد پاشا کے پاس زیبن آئی جھک کے سلام کیا۔

آزاد :- کہو زیبن۔ اچھی رہیں، اور سب خیر و عافیت ہے

زیبن :- حضور کی جان و مال کو دعا دیتی ہوں۔ حضور تو اچھے ہے اس وقت جیسے کروروں روپے مل گئے بس دن حضور یہاں سے گئے تھے ہماری سرکار کا عجیب حال تھا۔

آزاد :- بیگم صاحبہ کا مزاج شریف، کیا ابھی آرام ہی میں ہیں۔

زیبن :- جی نہیں حضور کو بلاتی ہیں، اور بڑے مرزا صاحب کو۔

آزاد :- مرزا صاحب تو ابھی گاڑی پر سوار ہو کر کسی صاحب کی ملاقات کو گئے ہیں۔ بیگم صاحب سے کہو کہ اگر تنہا آنے کی ہمیں اجازت دیں تو ہم حاضر ہوں۔ ورنہ خیر۔

زیبن نے جا کے بیگم صاحب سے کہا۔ وہ بولیں ہیں ڈیوڑھی سے سن رہی تھی جا کے کہہ کہ اگر ایک ہزار بار آپ کو غرض ہو تو حاضر ہو کے سلام کر جائیے۔ ورنہ کچھ ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر بیگم صاحب اوپر کمرے میں متمکن ہوئیں۔ ادھر زیبن نے آزاد سے پیغام کہا تو حضرت مسکراتے کہا، چلو صاحب ہمیں غرض ہے تب تو چلتے ہیں کوٹھے پر تشریف لائے، کمرے میں قدم رکھتے ہی خواص نے کہا۔ حضور وہیں تشریف رکھیں کرسی آتی ہے۔

آزاد :- یا الہٰی ! خدا خیر کرے۔ اب تو خواصین، اور پیش خدمتین تک للکارنے لگیں۔ خیر صاحب جو چاہو کرو۔ اس ظلم کی انتہا ہی نہیں (کرسی پر بیٹھ کر) سرکار کہاں ہیں

ذری بیٹھئے، نہ دل ہو جتنے۔ ذری زیور تو پہن لیں۔ آرام میں تھیں۔ ابھی حمام کیا۔ کپڑے بدلے جاتے ہیں۔

کرسی پر بیٹھ کر آزاد پاشا یوں ہم کلام ہوتے۔

آزاد :- بیگم صاحب کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

بیگم :- بندگی۔ آپ کو جو کچھ فرمانا ہو فرمائیے۔ مجھے اور کئی ضروری کام ہیں۔ آج سخت عدیم الفرصت ہوں، زیادہ دیر تک بک بک کی مہلت نہیں۔

آزاد :- اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔

ہم ایسے ہو گئے اللہ اکبر اے تری قدرت
ہمارا نام سنکر ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

غلام صرف سلام کو حاضر ہوا ہے
تو سلام ہو چکا۔ اب ٹھنڈے ہوا کھائیے۔

آزاد :- مزاج شریف۔ آج تو حضور کا مزاج آپ ہی کی زلفِ چلیپا کی طرح پریشان ہے۔ خدا خیر کرے آخر کس جرم میں بندہ مورد عتاب ہوا۔ ناکردہ گناہ غریبوں پر یہ ظلم روا نہیں ہے۔

بیگم :- ناگردہ گناہ! بجا! ایسے ناکردہ گناہ دو ایک اور ہوں تو بات بن جاتے۔ آپ ناگردہ گناہ ہیں۔ بس زبان نہ کھلواؤ۔

آزاد :- اچھا صاحب گنہگار ہیں۔ معاف کیجئے۔

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو	ہر کس کہ گنہ نکرد و چون زلیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات وہی	پس فرق میاں من و تو چیست بگو

بیگم :- غضب خدا کا ایک خط تک بھیجنا قسم تھا۔ اس طرح کوئی اپنے اعزہ اقربا کو تڑپاتا ہے اور اب آن کے گرم جوشی دکھاتے ہو۔ چھوٹے رہو۔ عزیز ہو کیا کہوں، کوئی اور ہوتا تو بتادیتی۔

آزاد :- آپ خطا پوش و عطا پاش ہیں۔ قصور معاف فرمایئے۔ بیشک گناہ تو ہوا ہے ——— مگر نہیں سوچا کہ خط بھیجکر مفت میں محبت بڑھاتی سے کیا فائدہ۔ واللہ اعلم زندہ باد واپس آؤں، اس سے بہتر ہے کہ ایسی فکر کروں کہ ان کے دل سے بھول ہی جاؤں۔ اگر حیات مستعار باقی ہے اور زیارت نصیب ہوتی تو چٹکیوں میں گناہ معاف کرالوں گا۔ ورنہ یا قسمت یا نصیب یا بخت۔

اس فقرے نے بیگم صاحب کے دل میں بڑا اثر کیا۔ غصہ مبدل بہ محبت ہوا۔ زیبن کو نیچے بھیجا کہ حقہ بھر لاؤ خواص کو حکم دیا، پان بناؤ۔ میدان خالی پاکر آہستہ سے چق اٹھائی۔ آزاد کو صورت زیبا دکھائی۔ آنکھیں ہوتیں چار دل میں آیا پیار، مگر معًا چق ڈالدی اور یوں باتیں کیں۔

بیگم :- وہ کہاں گئے ہیں تمھارے ساتھ ہی آتے تھے۔

آزاد :- جی ہاں کسی صاحب نے ان کو اس وقت بلایا ہے۔

بیگم :- مجھے معلوم ہوتا کہ وہ یہاں ہیں تو ابھی تم کو نہ بلواتی۔ ذرا توقف کرتی۔ ان کے ساتھ ہی آتے۔

آزاد :- (آہستہ سے) خدا نے مجھے خوب موقع دیا شکر ہے۔

بیگم :- (چین بہ چین ہو کر) کیا کہا۔ کیا کہا ہاں ذری پھر تو فرمایئے۔ موقع کیسا۔ یہ آپ نے کہا کیا۔ میں ذرا سنو تو کس چیز کا موقع ملا۔

آزاد :- یہ چق الٹنا ستم تھا۔ نور کا بکا نظر آیا ہے

چلون سے ہے حسن کیا نمودار
یوں چھانتے ہیں صفاتے رخسار

بیگم :۔ واہ چق کا الٹنا کیسا۔ ہوا سے ذرا ہی سی ہٹ گئی۔ ہمیں ان کی اجازت نہیں ہے کہ کسی کو منھ دکھائیں۔

آزاد :۔ اللہ اکبر۔ اب ہم ایسے غیر ہو گئے۔

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشین
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

اتنے میں بیگم صاحب نے چق اٹھا کر کہا لے آؤ۔ یہاں میٹھو آزاد نے جو بے حجاب صورت دیکھی تو دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس روز بلا کا نکھار تھا ؎

دیکھ کر نور جبیں داغ مہ تاباں ہے — چشم حیران سے آئینہ سوا حیران ہے
دل عاشق کی طرح پیر فلک قرباں ہے — حسن کہتے ہیں جسے جسم وہ، یہ جان ہے

سحر ہے قہر ہے آفت ہے نظارہ ان کا
غضب آشوب قیامت ہے نظارہ انکا

پیاری پیاری وہ پری چاند سے وہ رخسار نے — حور جنت کے بھی ہو وینگے نہ عارض ایسے
چین پیشانی پہ کیا لطف دکھاتی ہے کہ واہ — جوہر اس آئینے میں وہ ہے کہ سبحان اللہ

آزاد :۔ (ادب کے ساتھ قریب بیٹھ کر) یہ آج ہمارے قتل کے لئے اس قدر نکھری ہو۔ کیوں تمہارا مارا پانی نہ نہ مانگ سکے۔

بیگم :۔ کچھ خیر ہے ہوش کی دوا کرو صاحب۔ واہ کیا یہ گفتگو ہے شریف زادوں کی صحبت بھی کبھی رہی ہے؟

آزاد :۔ مجھ سے گناہ پر گناہ سرزد ہوتا جاتا ہے۔

بیگم :۔ حسن آرا کے نام تم نے کوئی تار بھیجا تھا۔ مجھے لکھا کہ جس دن آئیں فوراً تار پر اطلاع دینا، اور ہماری طرف سے بہت پوچھنا۔

آزاد :۔ خالی خولی پوچھنے کے لئے لکھا ہے یا یہ بھی لکھا ہے کہ ہماری طرف سے گلے لگانا بوسے لینا خیر ؎

پوچھے ہے خبر مریض غم کی — کیا بات ہے اس مسیح دم کی
بجلی تری شوخیوں کے آگے — اے آہ شرر فشاں نہ چمکی

ان شوخ چنان ربود از من
گوئی کہ دلم نبود آنِ من

میرا خدا اور میں کہ اس سفر نے بالکل توڑ دیا۔ مگر دل کو اس خیال سے البتہ تقویت ہے حسن آرا کی صورت زیبا سے آنکھوں کو نور حاصل ہوگا۔ ہم تو بندۂ عشق بتاں ہیں۔

یہ شیخ حرم سے کام نہ پیر مغاں سے ربط
کیا کفر و دین جو پاس وہ زیبا جوان نہ ہو

بیگم :۔ یہ باتیں سب سنی ہوئی ہیں۔ پہلے ہم خوب تحقیقات کرلیں گے۔ تم عاشق مزاج جوان۔ پھر اس پردیس میں کوئی کیا جانے کہ آزاد پاشا کی شادی ہوئی یا نہیں؟ کسی سے کچھ وعدہ ہوا ہے یا نہیں ہوا۔ مردوں کا اعتبار کیا

آزاد :۔ یہ بدگمانی مگر افسوس ہے کہ حضور نے باکمال شوق وصلی بغرض وصال بھیجی تھی اور امتحان بھی لیا تھا کہ اس کی نیت میری چاہ میں ڈانواڈول تو نہیں ہے لیکن خاکسار کی طرف سے کشش ہوئی اور کشش ہوئی آپ کی کوشش بیکار ہو گئی تب حضور نے بات بنائی۔

بیگم :۔ (لجاکر) اے لو اور سنو۔ واہ واہ ـــــ یہ تو فقط امتحان تھا کہ حسن آرا سے عشق صادق ہے یا نہیں۔

آزاد :۔ تریا چرتر اسے کہتے ہیں۔

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

بیگم :۔ اب تو تم بڑھ بہت بڑھ بڑھ کے باتیں کرنے لگے چلتر باز کوئی اور ہوتی ہوں گی۔ چلتر باز سمجھتے ہو تو ہمارے خاندان میں کیوں شادی کی فکر کی کہتے ہوتے شرم نہیں آتی۔

آزاد :۔ خیر اس جھگڑے کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ اب ہمارے ساتھ چلنے کا قصد ہے یا نہیں۔

بیگم :۔ نہیں۔ یہ دستور ہمارے ہاں کا نہیں ہے صاحب بہنوئی کے ساتھ جوان جوان سالیاں سفر نہیں کرتیں۔ وقت پر ان کے ساتھ میں آجاؤں گی۔ اے ہاں خوب یاد آیا۔ وہ موا ٹھاخوجی کہاں گیا جیتا ہے۔ چل بسا۔

آزاد :۔ واہ چل بسنے کی ایک ہی کہی۔ وہ تو قسم کھا کے آیا ہے مرنے کا نام زبان پر نہ لائے گا۔

بیگم :۔ لڑائی پر بھی مسخرہ پن کرتا تھا یا وہاں مارے ڈر کے ادھر ادھر چھپ رہتا تھا۔ بڑا ٹری ہے

آزاد :۔ بات بات پر بہروپیا یاد آتا تھا۔ بات ہوئی اور غل مچانے لگا۔ بہروپیا آیا، بہروپیا آیا۔ مصر میں سامنے سے دبنے آتے تھے اور خود بدولت افیم کی پینگ میں جھومتے جاتے تھے۔ اتفاق سے دنبوں کے ریلے میں منہ کے بل گرے تو کفن پھاڑ کر چیخ اٹھے۔ بھلا بے بھلا او گیدی۔ ہات تیرے بہروپئے کی ایسی تیسی۔ نہ ہوتی قرولی ورنہ بھوک دیتا تو دھواں اس پار جاتا۔

بیگم صاحب اس فقرے پر بہت ہنسیں۔

آزاد نے کہا۔ از برائے خدا تم جاکے پردے میں بیٹھو۔ صاحب تمہاری تو ایک ادا مارے ڈالتی ہے پیشتر تو اس قدر شوخ نہ تھیں۔ اس مرتبہ کس کامل فن مشاطہ نے لگاوٹ بازی سکھا دی۔ خدارا حق کے اندر بیٹھو۔ جوبن الگ پھٹا پڑتا ہے اور آن اس پر اور بھی مارے ڈالتی

آج فتنہ رہو کوئی دن میں قیامت ہوگی

بیگم صاحب للہ اب تو ایک۔ بے دس ہ دو۔ بیگم صاحب نے کہا اسے ہوش کی دوا کر مردوے، بچے کرو بچے (ہنسکر) ابھی تو تمہارے الف بے پڑھنے کے دن ہیں۔ کیوں صاحب پیٹ سے پانوں نکالے معلوم ہوتا ہے روم کی آب و ہوا بہت راس آتی۔

آزاد:— اللہ اللہ اُس دفعہ تو خود سر جھکا دیتی تھیں۔ ہمیں ضرورت کی اجازت ہی نہیں رہتی تھی۔ اب کی یہ انکار جب نگاہ اشارت آشنا نہ تھی۔

بیگم:— تسلیم کیوں صاحب یہی آپ کی پارسائی ہے بندگی۔

آزاد:— اچھا تم ہی انصاف کرو کہ پارسائی کے خلاف کون سی بات میری زبان سے نکلی۔ صرف ایک امر۔ وہ کچھ ایسا نہ تھا کہ خلاف طبع گذرتا، مگر دفعتہً ایسی بات کر دی کہ میرا دل خود مجھ پر نفرین کرنے لگا۔ ادا اُس کا نام ہے۔

کیا سخن ساز ہو وہ سحر بیان — فقرے فقرے سے ظرافت ہو عیاں

چپ ہو جو مصلحتاً غنچہ دہاں — لاکھوں انداز رہوں اس میں پنہاں

متن گفتار تبسم اس کا

شرح اس کی ہے تکلم اس کا،

اس قدر کہہ چکے تھے کہ وہ شوخ سراپا ناز، مست طناز اٹھ کر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی میرے کمرے کی طرف چلی۔ انھوں نے جو یہ کیفیت دیکھی تو چاہا کہ جھٹ سے ہاتھ پکڑ لیں، اٹھے ہی تھے کہ وہ شوخ بے مہر ہرن کی چھل بن دکھائے دم کے دم میں نظر سے اوجھل ہوگئی، اور یہ منھ دیکھتے ہی رہے۔

اتنے میں خواص نے اس کمرے سے آن کر کہا سرکار کہتی ہیں کہ حضور اب چل کے باہر ہی تشریف رکھیں —— مرزا صاحب بھی آتے ہوں گے۔ اب زیادہ دیر تک یہاں بیٹھنے کا موقع نہیں ہے۔ بات وہ کرے جس میں حرف نہ آنے پائے۔ آزاد چپ چاپ اٹھے مگر دل کہتا تھا کہ اب یہاں سے کہاں جاؤ گے یہیں نقش پا کی طرح جم جاؤ۔

پہلوئے یار سے اٹھنے کو تو اٹھے لیکن

درد کی طرح اٹھو گر پڑے آنسو کی طرح

بہزار خرابی باہر تشریف لاتے۔ خدمت گار نے حقہ بھر دیا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ پیتے اور سوچتے جاتے تھے کہ آزاد تم سے آج بڑی لغو حرکت سرزد ہوئی۔ اگر مرزا صاحب دیکھ لیتے تو اپنے دل میں کیا کہتے۔ ہائے افسوس۔ یا خدا میں وہی آزاد ہوں یا کوئی اور۔ حسن آرا کی بہن کو نظر بد سے دیکھنا غضب ہے یا نہیں مگر عشق کو کیا کروں۔ ؎

عشق بے طرح ستاتا ہے خدا خیر کرے
بحر الفت میں ڈباتا خدا خیر کرے

غیر عالم نظر آتا ہے خدا خیر کرے
دل بہت رنج اٹھاتا ہے خدا خیر کرے

گھیرے ہے حسرت و غم دیکھئے کیا ہوتا ہے
نزع میں اب تو ہیں ہم دیکھئے کیا ہوتا ہے

اب یہاں زیادہ توقف کرنا غلطی ہے۔ خدا کرے حسن آرا کے مکان پر آج کے چوتھے روز داخل ہو جاؤں آمین۔

اے چارہ گر آ چک کہ دم چاہ گری ہے
میں جان سے مرتا ہوں تجھے بے خبری ہے

ایک دفعہ خیال ہی آیا کہ اگر یہ شوخ بے وفا حسن آرا کو کچا چٹھا لکھ بھیجے تو ستم ہی ہو جاتے۔ کل کی کرائی محنت رائگاں ہو۔ لینے کے دینے پڑیں۔ روم کا جانا اور تمغے پانا سب بیکار ہو جاتے اور ہنسی جو ہو وہ بالائے طاق اللہ اللہ۔ ایک وہ وقت تھا کہ مس بیٹڈا کی سی حسین مہ جبیں نے خود شادی کی درخواست کی اور ہم نے انکار کر دیا ۔۔ مصیبتیں جھیلیں۔ سختیاں برداشت کیں اور ایک آج کا دن ہے کہ گرہست عورت حسن آرا کی بڑی بہن، اتنے بڑے شفیق مرزا صاحب کی بیوی اور ہماری یہ نیت۔ یا خدا اس وقت، بہر النفس ہزاروں باتیں سن رہا ہے مگر حسن شہر آشوب و زاہد فریب کا کیا علاج کروں:۔

اللہ رے دل کی ہرزہ تازی
میں اور محبت مجازی

ہندی صنم آفت جہاں ہیں
سوگند پیمبر حجازی

ہے رشتہ جان پہ زخم نشتر
اے نغمہ یاس دل نوازی

اس چشم کا محو ہوں شب و روز
دیکھو تو مری زمانہ سازی

سینے میں آگ لگ رہی ہے
بھائے کسے میری جانگدازی

مجبور وہ ہائے دل کا جانا
اللہ رے اس کی ترکتازی،

اللہ رکھی سو دل کا مگر دامنِ لوث عصیان سے پاک رہا۔ حالانکہ وہ مطلق العنان آزادہ روش، بیباک عورت تھی مگر ہم صاف رہے پھر حسن آرا کے ساتھ اس قدر عرصے تک رہنے کا اتفاق ہوا اور ان کے علاوہ اور بھی حوران سیم بدن تھیں مگر آزاد گناہ سے مبرا ہی رہا۔ پھر دیشیا سے بے تکلفانہ ملاقات ہوئی مگر پاکی کے ساتھ قس علی ہذا زینت النسا اور اختر النساء سے اس طرح ملا جس طرح شاید دنیا میں کوئی عورت نامحرم سے نہ ملی ہوگی لیکن عنایت ایزدی سے کسی مقام پر ذرا لغزش نہ ہوئی۔ اس مرتبہ بھی میں اس قدر گستاخ نہیں ہوا تھا مگر اب کے خدا جانے کیا ہو گیا۔

اس بار آنکھوں سے اظہار دل کرتا تھا۔ صرف چشم ابرو کے اشارے سے تاکہ کسی پر یہ کھلنے نہ پائیں کہ ان کا بیگم صاحب پر دل آیا ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا،

مگر اس دفعہ تو بالکل ہی نڈر ہو گیا۔ کچھ کسی کا خوف ہی نہیں رہا۔ خدا خدا کر کے میدانِ جنگ سے یہاں تک تو آیا۔ اب کوئی بات ایسی سرزد ہو جس سے موردِ عتاب ہوں تو ستم ہے یا نہیں۔ جذب دل کی تاثیر تو دیکھ لی۔ خدا نے ہماری سن لی۔

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی ۔۔۔ رہ گئی بات بیقراری کی
مبتلائے شبِ فراق ہوتے ۔۔۔ ضد ہے ہم تیرہ روزگاری کی
تیری ابرو کی یاد میں ہم نے
ناخنِ غم سے دلفگاری کی،

آزاد نے ٹھان لی کہ اب بیگم صاحب سے چار آنکھیں نہ کریں گے۔ اس زبانِ پارسا کا جھیپ کے بھاگ جانا اس امر پر دال ہے کہ وہ نظر حقارت سے دیکھنے لگی۔ ورنہ وہ اور اس قدر بے مہری۔
حسن آرا پھر یاد آئیں اور انتہا سے زیادہ شوق چرایا کہ جس طرح ممکن ہو پر لگا کے پہونچیں:

پھر محبت میں مزہ آتا ہے ۔۔۔ کیوں نہ کھائیں ہمیں غم بھاتا ہی
پھر کھجاتی ہے ہتیلی دیکھوں ۔۔۔ سیم تن کون سا ہاتھ آتا ہے
مدوائے کشمکش شوق کہ پھر ۔۔۔ دل کہیں کھنچتے کھنچتے جاتا ہی
عشق کی زمزمہ سنجی ہے ہے ۔۔۔ ولولہ ناک میں دم لاتا ہے
ہے غم پردہ نشین جو ناصح ۔۔۔ پھر زبان کھولتے شرماتا ہے

پھر ہوں دیوانہ: بخود کس کا
خار تلوے مرے سہلاتا ہے

لیٹے ہوئے آہستہ شعر پڑھ رہے تھے کہ زیبن دروازے پر آئی۔ کہا حضور سرکار نے یہ پرچہ دیا ہے کہا ہے اس کو پڑھ لیجئے۔ پڑھا تو ذیل کی عبارت نظر سے گذری:۔

آزاد دولھا کو ان کی بڑی سالی کا سلام۔ ابھی ابھی میں نے زیبن کی زبانی سنا ہے کہ حضور کے ہمراہ دو فرنگنیں آئی ہیں۔ دونوں کم سن ہیں۔ دونوں ناوک نگاہ، دونوں رشکِ مہر و ماہ، دونوں خوش انداز، دونوں مست و طناز:۔

پری زاد و پری رو و پری خو
غلط گفتم پری شرمندہ او

آپ کی جوانی اور طبیعت کی رنگینی مجھ سے چھپی ہوتی نہیں ہے اللہ کی عنایت سے حضور عاشق تن آدمی ہیں۔ اور آگ پھوس کا ساتھ کیا۔ جب اتنے بڑے سفر میں گھر بار چھوڑ کر آپ کے ہمراہ آئیں تو ظاہر ہے کہ نڈر و بیباک ہیں۔

یہ تو میرے دل کو شک کی جگہ یقین ہے کہ وہ مہ جبیں ہوں مگر حسن آرا کے تلووں تک کو نہ پائیں گی۔

وہ چشمِ سیاہ تو نہ ہوگی	وہ شوخ نگاہ تو نہ ہوگی
پامال روشن جہاں نہ ہوگی	وہ گرمی گفتگو نہ ہوگی
وہ فتنہ فزا چلن نہ ہوگا	ہر بات میں بانکپن نہ ہوگا
ویسی تو نہ ہوگی عشق بازی	ویسی تو نہ ہوگی طرحداری
ویسی تو نہ ہوگی جامہ زیبی	ویسی تو نہ ہوگی دلفریبی

کیا ان کے بھی ویسے ہی ہیں گیسو
خم دار و سیاہ و عنبریں مُو

اگر واقعی تم نے ان دونوں کے ساتھ شادی کر لی ہے تو بڑا ستم ڈھایا۔ پھر امید نہ رکھنا کہ حسن آرا تم کو منھ لگائیں، ساری کی کرائی محنت تم نے خاک میں ملا دی اور اگر شادی نہیں کی تو یہاں کیا کرنے لائے اگر کسی اور بات کا شوق تھا تو بمبئی تو اس پیشے کے لئے بدنام ہے۔ وہیں سے دو چار لے گئے ہوتے۔ شرم نہیں آتی۔ شرم چہ کتی ست، کہ پیش مردان آید۔ اب حسن آرا کو برا معلوم ہو تو جائے دار دوہ نہ کہینگی کہ ہم آتش فراق میں جلیں اور تم دوستوں کو ساتھ لے کے آؤ:۔

کیا قہر ہے کیونکر نہ اٹھے دردِ جگر میں | میری تو بغل خالی اور آپ اور کی بر میں
اِک آن بھی مجھ سے نہ ملو آٹھ پہر میں | گھر چھوڑ کے اپنا رہو ہوں اور کے گھر میں
سنتے ہیں شب و روز تمہیں بزم دگر میں | کیونکر نہ ہو تاریک جہاں میری نظر میں

ہر روز تو اے مہر درخشاں ہے کہیں اور
ہر رات تو اے شمع شبستاں ہے کہیں اور

اگر وہ دونوں بدصورت مسین یا ادھیڑ یا اوسط درجے کی خوبرو ہوتیں تو کسی کو یقین نہ آتا کہ آزاد ان کے ملتفت ہوں گے مگر ستم تو یہ ہے کہ دونوں نوعمر ہیں۔ دونوں سیم بدن ہیں۔ گل رخسار، ظریف، طبع، باغ و بہار ہیں۔

حسن کا ہے یہ اشارہ طرف شمس و قمر
میں بھی حاضر ہوں تمہیں نور کا دعویٰ ہو اگر

تم اور غیروں کو ساتھ لاؤ، دو دو کو ایک دم سے بیاہو، اگر تمہاری طرح حسن آرا بھی اب تک شادی کر لیتیں تو پھر آپ کیا بنا لیتے۔ غضب خدا، تم کو اس قدر بھی خیال نہ رہا کہ حسن آرا کے دل پر کیا اثر ہو گا ـــ تمہارے ہزار دن چاہنے والے ہیں تو اس کے گاہک بھی اچھے اچھے شہزادے ہیں۔ وہ بھی زبان حال و قال سے کہے گی۔

کچھ تم ہی تو دلبر نہیں اے یار جہاں میں | تم سے بھی زیادہ ہیں طرحدار جہاں میں
باقی ہیں ابھی دل کے طلب گار جہاں میں | اس جنس کی ہے گرمی بازار جہاں میں
نکلیں گے بہت آپ کے اغیار جہاں میں | میرے بھی ہزاروں ہیں خریدار جہاں میں

معشوق مجھے، اگر تمہیں عشاق بہت ہیں
یہ یاد رہے میرے بھی مشتاق بہت ہیں

اب صاف یہ ہے کہ وہ دونوں لولیانِ فرنگ مہ ونشان شوخ و شنگ ہمیں دکھا دو ـــ ان کی بات چیت رنگ ڈھنگ سے ہم تاڑ جائیں گے کہ تم سے التفات خاص ہے یا نہیں مگر یہ سنتی ہوں کہ یا اللہ آخر پھر ان کو اتنی دور سے لاتے کیوں ہو؟ کیا سچ مچ سوداگری کی فکر ہے۔ کیوں نہ ہو؟ سوجھی اچھی ـ محنت کا نتیجہ یہ تھا۔ دل لگانے کی یہی سزا ہے کہ عاشق کے دل کو زخمی کر دے۔

یوں دل شکنِ عاشق جانباز نہ ہووے
ان بوالہوسوں سے کبھی دمساز نہ ہووے

تم مردوں کی بات کا ٹھکانہ کیا ہے ـــ آج کچھ، کل کچھ ـــ کبھی نیک کبھی بد، کبھی دوست کبھی دشمن۔

حسینوں کی کیا بات کا اعتبار
کدھر تھی طبیعت کدھر ہو گئی

غرض کہ جو میں نے لکھا ہے اس کو بغور پڑھئے اور میری تشفی فرمایئے کہ وہ دونوں کس غرض سے ساتھ آئی ہیں۔ آخر وجہ کیا دو کم سن خوبصورت عورتیں مرد، اور پرائے مرد کے ساتھ کیوں آنے لگیں، اس کا جواب ابھی دیجئے ورنہ سمجھ لیا جائے گا۔

کانٹوں میں نہ ہو اگر الجھنا
تھوڑا لکھا بہت سمجھنا،

میں نے ٹھان لی ہے کہ حسن آرا کو آپ کے اس آزاد حال سے اطلاع دوں کہ اب وہ آزاد نہیں ہیں۔ اب دو دو بغل میں رہتی ہیں اور تیسری کی فکر ہے اب بہو بیٹیوں پر نظر بد ڈالتے ہیں، مگر جب تک میری تشفی نہ ہوے گی کہ تمہارا دامن بے لوث ہے پاک ہے تب تک یہ خیال دل سے دور نہ ہوگا اور اگر تشفی نہ دے سکے تو پچھتاؤ گے۔

پھر ورنہ بری ہووے گی پچھتاؤ گے آزاد
اپنے کئے کی تم بھی سزا پاؤ گے آزاد

یہ خط پڑھ کر آزاد نے زمین پر نظر ڈالی۔ کہا کیوں زیبن تم ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر لگاتی ہو۔ اور باہم لڑواتی ہو۔ یہ باتیں اچھی نہیں۔ ان میں انسان ذلیل ہوجاتا ہے تم نے بیگم صاحب سے کیا جا کے کہہ دیا۔ شرم نہیں آئی تھی۔ ۔ ہم سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ مرزا صاحب سے دریافت کیا ہوتا۔ قلم دوات کاغذ لاؤ۔

زیبن :۔ اے حضور تو میرا اس میں کیا قصور۔ مجھ سے جو سرکار نے پوچھا، میں نے بیان کر دیا۔ اسمیں بندی نے کیا گناہ کیا؟

آزاد :۔ خیر جو ہوا وہ ہوا، مگر تم سے یہ کس نے خبر دی۔

زیبن :۔ کوئی اور بھی ساتھ گیا تھا، یا بس آپ ہی اکیلے تھے؟

آزاد :۔ خدمت گار تھے، ہاں یہ انھیں کی شرارت ہے۔

زیبن :۔ بیگم صاحب بڑی خفا ہیں حضور، اس وقت بہت بگڑی ہوئی ہیں۔ اور کسی سے بولتی ہیں نہ چالتی ہیں۔ بڑے غصے میں خط لکھا تھا۔ اب اس کا جواب ذری بڑی نرمی سے لکھئے گا۔

ع کہ آہن بہ آہن تواں کرد نرم

نرمی کیسی۔ ملائمت کے کیا معنی۔ ہمیں سکھاتی ہو۔ آزاد نے قلم دوات کاغذ لے کر جواب خط یوں لکھا۔

اے گل گلستانِ رعنائی تو بہار ریاضِ زیبائی
اے مہ آسمانِ حسن و جمال بے نظیر جہان وہم خیال
اے بت روبہ ہر سو نہادہ در کف کافری نیفتادہ
اے تغافل شعار بے پروا
حال معلوم تجھ کو کیا میرا

بیگم صاحب کی خدمت میں تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ حضور کا نامہ گلہ ریز و شکایت آمیز غلام کی نظر سے گذرا۔ اس بدگمانی کے قربان۔ آپ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ ان دونوں معشوقوں میں کوئی ایسی بھی ہے جو حسن آرا کا مقابلہ کرے۔ آپ فرماتی ہیں:۔

وہ فتنہ فزا چلن نہ ہوگا
ہر بات میں بانکپن نہ ہوگا

سنئے حضور حسن آرا بیگم حسن آرا ہی ہے ...... وہ غمزہ فتنہ گر نہیں ہیں۔

وہ غمزہ فتنہ گر نہیں ہیں وہ ناز نہیں اشارتیں نہیں ہیں
ویسی تو شرارتیں نہیں ہیں وہ گرم اشارتیں نہیں ہیں،

حسن آرا کا طرہ عنبریں اور دست نگارین اور کمر نازک اور ناز دلربایانہ، اور انداز معشوقانہ جس وقت یاد آجاتا ہے دل قابو میں نہیں رہتا اور تم بدگمانی کی باتیں کرتی ہو۔ بیگم صاحب شاید آپ کو یقین نہ آئے گا مگر میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ اکثر مقامات پر ایسی ایسی حور وش، نو عمر شوخ و شنگ دشمنِ زہد، کافر کیش پری دیکھیں ہیں کہ اگر حسن آرا سے سچا عشق نہ ہوتا تو میں ہندوستان میں آنے کا نام لیتا مگر افسوس ہے کہ میری کل محنت رائگاں گئی۔ میں حسن آرا کی محبت کے سبب سے ایسے ایسے مقامات میں گیا جہاں جان کے لالے پڑے تھے، جہاں فیصدی ننانوے دم کے دم میں چنے کی طرح بھن گئے۔ مگر میں نے اف تک نہ کی۔ یہ حسن آرا کی محبت اور اس بتِ رعنا جمال کے عشق کا جذبہ تھا جو مجھے ان ہائل مقاموں میں شیر دل کر دیتا تھا۔ ہزاروں سختیاں اس خیال سے آرام معلوم ہوتی تھیں کہ یہ مشقت جھیل کر ہماری دلی آرزو پوری ہوگی۔ خدا اور خدا کا رسول گواہ ہے جن جن جنگلوں اور لق و دق میدانوں اور سنسان ہولناک پہاڑوں پر میں گیا۔ کوئی کم گیا ہوگا ہفتوں دامن کوہ کی ایک تیرہ و تار کوٹھری میں قید رہا۔ جان انسان کیا، کسی جاندار کی صورت نظر نہیں آتی تھی اور دن رات میں دو روٹیاں اور ایک جام آب ملتا تھا۔ ہفتوں ایک عمیق اور مہیب اندازے کی کوٹھیوں میں قید رہا اور یہ سب اس جرم کی پاداش میں کہ ایک ناز آفریں یاسمن بدن پری مجھ سے شادی کرنا چاہتی

تھی اور میں انکار کرتا تھا کہ حسن آرا کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ اپنے دل زار کا حال کس سے کہوں، کہوں سب کچھ جب کوئی سننے والا بھی ہو۔

سر کنم شکوہ اگر تاب شنیدن داری
بسینہ بشا کا قم اگر طاقت دیدن داری

یہ دونوں مخدرات، نوخیز، جو میرے ساتھ ہیں، ان کا میں رہین۔ منت بیکراں، اور مرہون عنایت بے پایاں ہوں۔ انھوں نے جان بچائی ہر گاڑھے وقت بھی آڑے آئیں۔ ورنہ ہندوستان واپس آنا کس بدبخت کو نصیب ہوتا ہے

امید روزِ وصل تھی کس بد نصیب کو
قسمت الٹ گئی مرے بختِ سیاہ کی

با ایں ہمہ حضور کا عتاب۔ یہ خفگی۔ وائے ناکامی۔ جو کام ہوا لو راہی ہوا۔ تم سے کیا شکایت کروں۔

تقدیر سے گلہ ہے بتوں سے گلہ نہیں

از برائے خدا کہیں حسن آرا کو نہ لکھ بھیجنا اور اگر یہی چاہتی ہو کہ میں جان دوں تو صاف صاف کہدو۔ اس نازک دماغ کو کیوں بددماغ کرتی ہو۔ میں تو سمجھتا تھا کہ بعد فتح و ظفر عروسِ زریں کمر پری پیکر سے ہم آغوش ہوں گا۔ بادۂ مسرت ساغر دل میں چھلک رہا ہوگا۔ شاہد شنگول کے لب لعل کے بوسے نصیب ہوں گے اسی کی چاہ میں کروڑوں کنوئیں جھنکواتے۔ اسی کے وصل کے لئے بن بن گھومے۔

جز مہر تو نیست سرنوشتم	نقشِ غم تست سرنوشتم
عشقت شگفاند باغ باغم	سرتا سر سینہ داغ داغم
صبر و دل و دین بکار بردم	عمر بیست کہ انتظار بردم

گر رہ بودم بروئے شمشیر
از مہری نو کے شوم سیر

اس بت جادو جمال، لیلیٰ تمثال سے کوئی جا کے اتنا تو کہدو کہ تیرا شیدا جان بکف میدان رستخیز میں گیا اور مردانہ وار لڑ بھڑ کر کے وہ نام پیدا کیا جو تجھ سے پری مربع نشین، چار بالش دلبری کے شوہر کے شایان ہے از برائے خدا کوئی پیغام پہونچا۔

پیش صنم کر می برد سوختہ نیم جان من	وہ کہ زبردست میرا این دل ناتوانِ من
چوں کہ رسی بادر سان بندگی از زبانِ من	باد کہ پیش میروی خیز کہ پیشِ میر مت

اب زیادہ کیا لکھوں۔ طبیعت بے چین ہے مگر قہر درویش بر جان درویش۔

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

یہ خط لکھ کر زبین کو دیا اور کہا جواب لاؤ۔ زبین خط لے کر گئی۔ تو بیگم صاحب نے آنکھوں سے لگایا اور پڑھ کر زبین سے کہا جا کے کہدو۔ کل جواب ملے گا۔ آزاد نے کہا۔ اس قدر جا کے کہدو :۔

شرمگیں آنکھ سے تم نامہ لگاتی کیوں ہو

خاک میں نام کو دشمن کے ملاتی کیوں ہو

اتنے میں آزاد کی آنکھ جھپک گئی تو خواب دیکھا کہ ایک زن نازنین، رشک لیلیٰ، غیرت شیریں، سرہانے کھڑی کہہ رہی کہ اے آزاد، پاک نہاد و عالی نژاد، کچھ ہماری بھی خبر ہے مانا کہ حسن آرا بت سیمیں غنچہ دہن ہے یہ دونوں پریاں رگ جاں پر نشتر زن ہیں۔ بہتی کی بیگم کی اچپلاہٹ ستم ڈھاتی ہے۔ اللہ رکھی پر جان جاتی ہے مگر آخر ہم بھی تو کم سن گلبدن نوخیز خوبرو ہیں چہرہ مہرہ صاف، نک سک سے درست، عضو عضو سانچے میں ڈھلا ہوا چندے آفتاب، چندے مہتاب یا تو حسن آرا کے سوا اور کسی کو عقد نکاح میں نہ لاؤ، یا ہم سب کے ساتھ شادی کرو ـــــ یہ نہ ہو کہ ان دونوں فرنگنوں کو پیار ہو، اور ہم کو ترساؤ۔ سمجھے میں کون ہوں۔ اس قدر اس پر کالۂ آتش نے کہا تھا، کہ آزاد خواب ہی میں۔

ہم کلام ہوئے اور بڑی دیر تک باتیں رہیں۔

آزاد :۔۔ کوئی نظر کے سامنے ہو تو پہچانوں، تم سرہانے کھڑی ہو۔

عورت :۔ اللہ اللہ اب ہماری آواز سے کان بالکل نا آشنا ہیں۔ شان خدا اور اس غرور کے صدقے کہ ذرا سر اٹھا کر دیکھنے کی قسم کھائی ہے واے قسمت۔ سچ ہے مردوے بڑے بے مروت ہوتے ہیں۔ اور ہم با ایں ہمہ بے مروتی تمہارے اوپر فدا ہیں مگر یا اللہ ہم سے ایسی کون سی خطا سرزد ہوئی۔

کیا ایسی ہی مجھ پہ کہ پامال جفا ہوں | تم اتنے بگڑ جاؤ میں اس پر بھی بنا ہوں
تم چھوڑ دو لیوں اور میں پابند وفا ہوں | تم سی نہ ہو آزردہ میں کوچی سی خفا ہوں
یہ چاہیئے مجھ کو بھی کہ اب اور کو چاہوں | ایسے کسی معشوقۂ دلجو پہ فدا ہوں

ہر دم جو سوئے عاشق مضطر نگراں ہو

فکر ستم اس کے دل نازک پہ گراں ہو

آزاد :۔ خدا کے لئے اپنا نام تو بتاؤ۔ باتوں سے محبت کی بو آتی ہے دل میں سوز و گداز پایا جاتا ہے

عورت :۔ آزاد۔ ذری تو سوچ لو۔ خدا کے لئے ہم سے ہمارا نام نہ پوچھو۔ خود ہی بتادو کہ یہ نام ہے اور ذری گلے

ے لگ جاؤ۔ واسطے خدا کے۔

آزاد :۔ جانِ من۔ بے سمجھے بوجھے کسی کو دل دینا ہمارا شیوہ نہیں۔

عورت :۔ پھر جانِ من کیوں بنایا۔ اس خطاب کا کیا سبب ہے ؟

آزاد :۔ یا الٰہی آواز تو سنی ہے مگر اس وقت ذہن نہیں لڑتا۔

عورت :۔ آزاد ہماری بہن تمہارے دیکھنے کو تڑپ رہی ہیں۔

آزاد :۔ بی صاحب آپ تو پہیلیاں بجھوا رہی ہیں۔

اتنا سنا تھا کہ وہ زنِ خوبرو رونے لگی اور ان کے تکیے پر جوئے اشک جاری تھا۔ ؎

از ہر مژہ اشک آتشینی میریز بخت بہر گل زمینی

میکرد خروش بیخود انہ میر بخت سرشک دانہ دانہ

گریان شد و تلخ تلخ بگریست

بے گریہ تلخ در جہاں کیست

آزاد نے اصرار کیا کہ اپنے نام سے مجھے شاد کام کرو۔

عورت :۔ میرا نام ــــــ زینت النسّاء۔

آزاد :۔ بستر سے اٹھ کر۔ زینت النساء، زینت النسّاء مجھے معاف کرنا اُفوہ۔ اس وقت میرا دل بھر آیا۔ اختری بہن تو اچھی ہیں۔

زینت :۔ اللہ کا شکر ہے ہر روز تمھاری یاد میں رویا کرتی ہیں۔ جب سے تم گئے، تمہارا حال معلوم ہی نہیں ہوا پھر پھر نہیں سنا کہ تم کہاں ہو اور تمہاری بے مروتی پر افسوس آتا ہے کہ دو خط بھیج کر رہ گئے۔ خیر جہاں رہو خوش رہو ــــ زینت النسّاء تم کو بہت یاد کرتی ہے اور حسن آرا نے آج ہی بلایا ہے چلو تو سواری موجود ہے ڈولی لیتی آتی ہوں مگر ایسا نہ ہو زینت النساء کو شک ہو۔ یہ سمجھ لو۔

معشوق شیریں ادا ماہ لقا زینت النساء بیگم جھپٹ کے گلے لپٹ گئی اور کہا آزاد اب میرے حال پر رحم کرو۔ میں تم کو اپنا منہ دکھا چکی ہوں، اب کسی نامحرم کو کیا دکھاؤں۔ مگر تم ایسے بے مروت ہو کہ خدا کی پناہ ارے غضب خدا کا، تمہیں خوف بھی نہیں، ریل پر کیسی کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتے آتے۔ کیسی کیسی لگاوٹ کی باتیں کیں۔ کہ درم نا خریدہ غلام کر لیا۔ کبھی ہاتھ جوڑے، کبھی شراب اور سوڈا پلانے کا شوق۔ کبھی ہمارے ہاتھ کی گلوری کھانے کا ذوق، ہم لاکھ انکار کرتے تھے کہ عیسائی ہو گئے ہو کیا شراب سے کلی نفرت ہے مگر آپ ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے اور ایک آج کا دن ہے کہ شنوائی ہی نہیں ہوتی۔ اے خدا کے لئے منہ سے بولو۔

گھنٹہ بھر سے گلے لپٹا کے پڑے ہیں۔ آپ خبر ہی نہیں لیتے۔ آزاد نے کہا سنو جی سپہر آرا صاحب ہم سے اور تمہاری بہن سے وعدہ ہو گیا ہے کہ نکاح کریں گے۔ اب تم خود ہی انصاف کرو کہ تم کو ہم سے کیا رشتہ ہے چھوٹی سالی ہوتیں یا نہیں سپہر آرا نے کہا!

شادم کہ بار قیبان دامن کشاں گذشتی

گو مشتِ خاک ماہم بر باد کشتہ باشد

علیفو پاشا سے اور آزاد سے جنگ ہوئی تو زینت النساء نے کہا ہماری بہنی کھائے جو آپس میں لڑے۔

اتنے میں آزاد نے دیکھا کہ اختر النسا زینت النساء کے سرہانے کھڑی رو رہی ہے۔ پوچھا خیر باشد۔ کہا تمہارے فراق میں میری بہن نے جان دی اور تم کو خبر ہی نہیں۔ ہائے بہن کہاں گئیں۔ یہ جگر خراش خبر سنتے ہی آزاد کا دل ایسا الجھا کہ آنکھ کھل گئی۔ تو دیکھا کہ زینت النساء نہ ان کی ہمشیرہ و غنچہ دہان فقط پلنگ اور مرزا صاحب کا مکان عالیشان۔ خواب کی حالت یاد کر کے بہت روتے، یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی۔

بیٹھے بیٹھے انھیں کیا جانئے کیا یاد آیا۔

طرح طرح کے خیالات سے آزاد کا دل بھر آیا اور گو لاکھ ضبط کیا مگر آنکھیں بے اختیار پرنم ہو گئیں۔ زبین جو کسی کام کے لئے باہر آئی تھی، یہ حال دیکھ کر اندر دوڑی گئی۔

بیگم صاحب سے کہا، حضور وہ تو نصیب دشمناں برا حال کر رہے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو اس طرح ٹپ ٹپ گر رہے ہیں، جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگی۔ کیا جانے اسوقت ان کے دل پر کیا گذر رہی ہے ذری آپ چل کے پردے کے پاس سے دیکھیں تو:۔

بیگم صاحبہ بیقرار ہو کر چھم چھم کرتی ہوئی چلیں تو زبین نے کہا حضور پازیب اتار ڈالیں۔ اس کی آواز خبردار ہو جائیں گے۔ بیگم صاحب نے پازیب اتاری اور آہستہ آہستہ ڈیوڑھی میں آئیں۔ دربان کو زبین نے اشارہ کیا ـــــ پردے کے پاس کھڑی ہوئیں تو دیکھا آزاد کی باتیں کہنی میز پر ہے اور ہاتھ سر پر رکھ کر رو رہے ہیں۔ آنسو ہیں کہ امڈے ہی چلے آتے ہیں۔ تھمتے ہی نہیں۔ بیگم صاحبہ کا دل یہ حال زار دیکھ کر بھر آیا۔ سمجھیں کہ میری تحریر آزاد کو ناگوار گذری۔ آہستہ سے پکارا۔ آزاد، آزاد، آزاد مگر صدائے برنخاست۔

زبین :ـــ (آزاد کے قریب جا کر) حضور دیکھئے کون سامنے کھڑا ہے ادھر ملاحظہ فرمائیے۔ یا الٰہی سرکار دروازے کے پاس آگئیں۔ ذری ادھر تو نگاہ کیجئے۔

راوی :ـــ آزاد نے گردن نہ اٹھائی۔ بدستور رویا کیے۔

بیگم : آزاد جو روتے تو ہمیں کوہے ہے کرے۔

زیبن : اے ہے ہے۔ بیوی ایسی قسم نہ کھائیے۔ حضور اب تو رونا موقوف کیجئے۔ مہری ذری پانی تو لاؤ ٹھنڈا ٹھنڈا۔

بیگم : ہاں صراحی اٹھالا۔ منہ پر چھینٹے دو منہ پر۔

زیبن : حضور کیا غضب کر رہے ہیں۔ کچھ کسی کی خبر بھی ہے وہ سامنے کون کھڑا ہے، ذری ملاحظہ تو کیجئے۔

بیگم : ہمیں روتے ہمیں گور میں گاڑے جو ادھر نہ دیکھے۔

آزاد : (بیگم صاحب کی طرف رخ کر کے) ارشاد ــــ

بیگم : روتے تم ہو اور احساس یہاں مجھے ہوتا ہے۔

آزاد : نہیں آپ کو احساس نہ ہو۔ خدا جانے اس وقت مجھے کیا یاد آیا۔ آپ تشویش نہ کریں۔ فضل الٰہی ہے

بیگم : خیر دل ہی تو ہے مگر اب منہ دھو ڈالو۔

آزاد : جی ہاں پانی منگوائیے مگر اب آپ کو تکلیف ہوتی ہے آپ تشریف لے جائیے۔ میں اچھا ہوں۔ آپ ناحق کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ بہت دل نہ دکھائیے۔

بیگم : اب چو چلے رہنے دو۔ منہ دھو ڈالو۔

زیبن نے آن کے کہا۔ رو رہے ہیں۔ پانوں تلے سے مٹی نکل گئی۔ اپنے خود میں نہیں رہی کہ اللہ یہ کیا اسرار ہے اے آگے دیکھتی ہوں تو سچ مچ رو رہے ہیں۔ واہ میاں واہ۔ مردوے ہو کے آنسو بہاتے ہو۔ تم سے چھوکریاں اچھی۔ یہ تم لڑائی میں کیا کرتے تھے۔ رن کے میدان میں اماں جان یاد آتی تھیں ــــ مردوے اور رونا۔ اے واہ۔

آزاد : جلاؤ اور کہو کہ خبردار دھواں نہ نکلنے پائے۔

بیگم : اے لو۔ کیا خوب۔ جلاتے کی ایک ہی کہی۔ جلاتے تم ہو۔ یا ہم ایک چھوڑ دو دو وہاں سے لاتے اور اوپر سے باتیں بناتے ہو۔ منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا اپنے کو۔ کیوں جی یہی شرطِ محبت تھی، میں نے جب سُنا دل مسوس کر رہ گئی۔ حسن آرا بیچاری نے فقط اڑتی ہی خبر پائی تھی کہ آزاد نے کسی عورت کو بیاہ لیا تو سنتے ہی چہرہ زرد اور رنگ فق ہو گیا۔ پچھاڑیں کھائیں، اللہ کی امان، پیروں کا سایہ، دعائیں مانگتے مانگتے زبان تھک گئی۔ ایک وہ اللہ کی بندی ہے ایک تم ہو کہ جوڑی کی جوڑی ساتھ لاتے اور اوپر سے کہتے ہیں۔ جلاؤ جلاؤ تمہیں شرم بھی نہیں آتی۔

آزاد : کیا ٹیڑھی کھیر ہے نہ کھاتے بنے، نہ چھوڑتے بنے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حضور کی عنایت سے شاید

حسن آرا تک رسائی بھی نہ ہوگی، پروانہ جل بھن کے معشوق ہی میں پیوست ہو جاتا ہے مگر یہاں جل بھن کے خاک بھی ہو جائیں تاہم وصلِ معشوق نصیب ہوگا۔

آگ میں کود کے پروانہ جو بیہوش ہوا
جسکی الفت میں جلا اس سے ہم آغوش ہوا

مگر یہاں چھروں اور گولوں میں در آتے ہوتے گئے توپ از دہاں کی شرر افشانی سے مطلق نہ ڈرے اور نتیجہ کیا ہوا، بدگمانی، پریشانی جگت ہنسائی۔ بدنامی ہے۔

مثلِ گل چاک ہے ہر وقت گریباں اپنا	حال سنبل سے زیادہ ہے پریشاں اپنا
جسم داغوں سے سراپا ہے گلستاں اپنا	اب ہے نرگس سے سوا دیدۂ حیراں اپنا

اور آپ پوچھتی ہیں کہ بیقراری کا سبب کیا ہے؟

یہ کہہ کر آزاد کی آنکھیں بھر آئیں ـــــ اور گو بیگم صاحب نے دور سے لاکھ لاکھ سمجھایا مگر آنسو نہ تھمے۔ زبین نے قریب جاکر منھ پر آب سرد کے چھینٹے دیتے تو منھ چھپا لیا۔ یہ سوچتے تھے یا خدا حسن آرا جب سنیں گی کہ دو خوبصورت قمر طلعت نوجوان دوشیزہ ساتھ ہیں تو اپنے دل میں کیا سمجھیں گی اور بیگم صاحبہ کا ایک فقرہ ان کو اور بھی شاق گذرا جب انہوں نے کہا کہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے تو بیگم صاحب بولیں، جس کے لیے ہے اس کے لئے ہے تم کو کیا۔ تمھارے والدلوں بیٹھے یہ کیفیت دیکھ کر بیگم صاحب سے نہ رہا گیا۔ زبین کو حکم دیا کہ بارہ دری سے ڈیوڑھی میں لاؤ۔ زبین نے قدموں پر سر رکھ کر کہا۔ خداوند بیگم صاحب ڈیوڑھی میں بلاتی ہیں۔ اس ڈیوڑھی پر کوئی نہیں ہے۔ بارہ دری میں آمد و رفت عام کا دوسرا راستہ ہے حضور ضرور تشریف لائیں، ورنہ وہ بے پرواہی چلی۔ بیگم صاحب سے زبین نے کہا حضور آئیں، اس طرف کوئی نہیں ہے۔ پردہ ڈال دیا ہے۔ قنات گروا دی بیگم صاحب نے آن کر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ زبین کو حکم دیا کہ جاکے خوب سرد پانی لے آ۔ زبین کو اس بہانے سے بھیجا اور قریب تھا کہ پیشانی نورانی کا بوسہ لیں۔ کہ اتنے میں محلدار سامنے آن کھڑی ہوئی بیگم صاحب نے جھلا کر کہا کھڑی منھ کیا تکتی ہو ـــــ پنکھا لاؤ۔ محلدار کا جانا تھا کہ جبین الانور کو بسنتی رومال سے پونچھ کر بوسہ لیا تو آزاد نے ہاتھ جوڑ کر یوں گفتگو کی ـــــ خدا کے لئے مجھے آزاد کر دو۔ یہ کیا غضب کرتی ہو سب کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کبھی تو وہ عتاب، کبھی یہ عنایت۔ عجب مزاج پایا ہے۔

چشم امید کبھی ہے نگہ یاس کبھی
مرہم ریش، کبھی سودۂ الماس کبھی

بیگم: بجا ہے۔ اس وقت ہالہ آغوش کی زینت ہو گئی۔ ان پیارے پیارے ہونٹوں سے بوسہ لیا اور آپ ابھی تک خفا،

ہی ہیں۔

آزاد :۔ نوازش، عنایت مہربانی۔ خانۂ احسان آباد۔

بیگم :۔ یہ ہر گھڑی تو رونا اچھا نہیں۔ آخر بتاؤ تو۔ یہ دونوں کون ہیں؟ یہ معتاب تک نہ کھلا کہ یہ کون ہیں اور حضور کے ہمراہ کیوں آئی ہیں، کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔

آزاد :۔ ضرور بالضرور۔ دال میں کالا کالا ضرور ہے

بیگم :۔ اچھا تو پھر صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے! بولو

آزاد : (مسکرا کر) بیاہتا بیوی ہیں دونوں ۔۔ اور کیا کہوں ؟

بیگم :۔ اچھا صاحب بیاہتا۔ بیوی نہیں، دونوں آپ کی بہنیں سہی ۔ اب خوش ہوئے حضور۔ یا اب بھی کوئی جھگڑا ہے۔ برسوں بعد آئے تو ایک کانٹا ساتھ لے کے۔ تو بہ ایسا نصیب کہاں تھا کہ دو گھڑی ہنستے بولتے۔ مورچہ تو بمبئی ہی ہے۔ میں اس پر خاک ڈالوں اور چپکی ہو رہوں تو حسن آرا کیا کہے گی کہ واہ بہن تم نے ہم کو لکھا بھی نہیں اور لوگوں سے دو دو کھیپ کی کھیپ لاتے تھے۔ دو میں کیا فائدہ ہوگا۔

آزاد :۔ دیکھتے جاتے، آپ دل لگی کرتی ہیں اور بندہ خاموش ہے پھر اب میری بھی زبان کھلے گی۔

بیگم :۔ تو ہماری تمھاری برابری ہے تم تم ہی ہو، ہم ہم ہی ہیں۔ زبان کھول کے کیا کرو گے بے حیا کے بیسیوں لبسوے۔

آزاد :۔ دو ہوئیں حضور۔ اب ہم بھی چھیڑیں گے۔ کیا خوب۔

ع ۔ تم کہو اور سنا کرے کوئی

کیا ہمارے منہ میں زبان ہی نہیں۔

بیگم :۔ آپ کی آنکھ ایسی جادو بھری ہو تو بسم اللہ کیسی۔ پھر کیا۔

آزاد :۔ کیا کہوں بجز اس کے کہ :

زندگانی کا مزہ عشق میں کھو بیٹھے ہیں
اپنی کشتی اسی دریا میں ڈبو بیٹھے ہیں

تقدیر سے اور آزاد سے جنگ ہو رہی ہے دیکھیں کون فتحیاب ہوتا ہے جنگ دو سر دارد۔ شاید میری تقدیر تمہاری ہی صورت بن کر آئی ہے خیر۔ تم ہی سے نپٹ لیں گے۔

بیگم :۔ مطلب کی بات کیسی چبا جاتے ہیں۔ ایک ہی استاد ہو۔

آزاد :۔ کیا خوب۔ یہ تو مجھ کو کہنا چاہتے تھا صاحب ؎

منھ بناتے ہیں جو بوسہ مانگو　　　بات مطلب کی چبا جاتے ہیں

بیگم :- آپ ہیں کیا مال کہ ہمیں آپ کی پرواہ ہو۔ یہ کہو کہ تمہارے رونے پر رحم آگیا۔ ہم نے کرم کیا۔ ورنہ ایسے ایسوں سے بات کرنا وضع کے خلاف ہے جی حضرت۔

راوی :- اس مرتبہ تو حضور اور بھی شگفتہ ہو گئیں۔ چشم بد دور۔ بھلا یہ کون سی شرافت ہے غور تو کیجئے۔

آزاد :- ہزار بات کی ایک بات یہ ہے کہ اگر میری بے کسی پر رحم کرو تو اس قدر صاف بتادو کہ حسن آرا کیا لکھو گی

بیگم :- اللہ جانتا ہے اگر ہم کو اس قدر معلوم ہو جاتے کہ یہ دونوں کس غرض سے آئی ہیں، تو ہم خاموش رہیں۔

آزاد :- بہتر۔ ان دونوں کو یہاں بلالاؤں۔

بیگم :- ان کو آنے دو۔ ان سے صلاح لے کے جواب دوں گی۔

آزاد :- (مسکرا کر) خیر۔ تو ہم میں اور ان میں کچھ فرق سمجھتی ہو۔ میں تم کو اور حسن آرا کو ایک نظر سے دیکھتا ہوں۔

بیگم :- (شرماتی ہوئی) چلو۔ اپنی ــــ بس اب میں کچھ کہہ بیٹھوں گی۔ بڑے بے شرم ہو چھٹے ہوتے بے حیا۔

اتنے میں خادمہ نے آن کر کہا کہ بڑے مرزا صاحب آگئے۔ بیگم صاحب چھپٹ کر کوٹھے پر ہو رہیں۔ آزاد بارہ دری میں آن کر لیٹ رہے۔

مرزا صاحب گاڑی سے اترے۔

آزاد :- ع　　طاقتِ مہمان نداشت خانہ بہ مہمان گذاشت

مرزا :- آپ نے حمام کیا یا نہیں۔ بڑی دیر ہو گئی ہے حضرت جس طرف جاتا ہوں۔ صدہا آدمی گاڑی روک روک کے حضور کے حالات استفسار کرتے ہیں۔ کئی انگریز پوچھ چکے اور پونا کے مجسٹریٹ کے نام تار دیا گیا ہے وہ آپ کی ملاقات کے بہت شائق ہیں۔ یہاں کے ایک چیف جسٹس نے صاحب رجسٹرار سے کہدیا تھا کہ اگر آزاد پاشا کے آنے کی خبر سنو تو ہمیں ضرور اطلاع دینا۔ کل شام کو سب صاحب آپ سے ٹاؤن ہال میں ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دو روزانہ انگریزی اخباروں کے اڈیٹروں نے بھی مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے کہا آپ نوٹس دیدیں۔ کہ کل ٹھنڈے وقت ٹاؤن ہال میں ملاقات ہوگی۔

ہاں صاحب، یہ تو فرمایئے کہ دونوں پریاں کون ہیں، یہ تو ہم جانتے ہیں، حسن آرا سے بھی خوبصورت ہیں۔

آزاد :- واہ۔ اچھی قدر دانی کی۔ حسن آرا کی سی آن کہاں سے لائیں گی۔ واہ ادا ہی اور ہے آپ نے شاید حسن آرا کو دیکھا نہیں نہ۔

واعظ ہمارے سامنے کرتا ہے وصفِ حور
شاید کہ اس نے جلوہ دکھایا نہیں ہنوز

وہ جادو بھری نگاہ کجا | آنکھ کیا سحر بابل ہے وہ

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بیجاں ہونگے

مرزا :۔ حضرت ایک تو اس میں سے کسی اور ملک کی معلوم ہوتی ہے۔ وہ جو سیہ چشم ہیں اور جن کے رخ انور کا زلف شب رنگ نے اور بھی جوبن دو بالا کر دیا ہے وہ فرنگ کی بہنیں ہیں۔

آزاد :۔ ایک تو روس کی ہیں۔ دوسری کوہ قاف کی پری۔

مرزا :۔ یہ کہاں مل گئیں۔ شادی ہو چکی ہے نہ۔ یار برا کیا۔ حسن آرا سنے گی تو کیا کہے گی۔ آخر ملیں کس طرح۔

آزاد :۔ ہوٹل میں ہم ٹھہرے تھے۔ وہاں یہ بھی آیا کرتی تھی۔ کوہ قاف کی پری سے ایک دن آنکھیں لڑیں۔ دوسرے روز کمرے میں دروازے کے پاس کھڑی ہوئیں۔ اتفاق سے میں بھی وہیں پر کھڑا تھا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ پری اس قدر قریب ہی کہ دفعتاً۔

پردے سے ایک آواز خوش آئی | جس نے چپ سی مجھ کو لگائی
وصف کی اس کی تاب کہاں ہے | رنگ بیان کی لال زبان سے
کیا کہوں اس کی سحر بیانی | لفظ کئی اور لاکھ معانی
چھیڑ کی باتیں جادو مائل ، | جس سے مسخرہ ہو گیا دل
پردہ اٹھایا شوق نہاں نے | پردہ اٹھایا تاب و تواں نے

چلمن اٹھا کے دو ہیں کرا دی
ایک جھلک سی اپنی دکھا دی

آواز خوش کان میں آتے ہی میں تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو وہی پری پیکر، حور دش، پرکالہ آتش ہے، اور ویسے ہی دماغ میں اس طرح کی خوشبو آئی کہ مست ہو گیا۔ روح تک فرخناک ہو گئی۔ اس شوخ نے دروازہ کھولا۔ اور معاً بند کر لیا۔ ہائے اس شوخی کے صدقے جھلک دکھاتی اور صورت چھپاتی: ؎

کیا کہوں عالم اس کی جھلک کا | رنگ اڑے ہی مہر فلک کا
جو ہیں نظر آئی وہیں نہاں تھی | کیسی بجلی برق تپاں تھی
زلف مسلسل سلسلہ جنباں | حلقہ کاکل یا دُر دنداں
بسکہ شکاری جنبش ابرو | چشم کی گردش شوخی آہو
تیغ وہ شکل پردہ نشین ہے | دل سے زبان تک آئی نہیں ہے

گرچہ برابر موئے زباں ہو
تو بھی سراپا وہ نہ بیاں ہو

الغرض رفتہ رفتہ نوبت بر ایں جا رسید کہ شبِ ماہ میں ہم اور وہ نازنین ہاتھ میں ہاتھ دیئے سیر کرتے تھے۔ اس روش میں کرسیوں پر بیٹھے۔ اس روش میں ٹہلے۔

ادھر مرزا صاحب اور آزاد میں یہ گفتگو ہوئی ہی تھی۔ ادھر خواجہ صاحب کو پٹھان پٹی پڑھا رہا تھا کہ شتاب جان بیوہ ہیں، ان کے ساتھ شادی کرکے کیوں مفت میں الو بنو گے۔

برسبیل تذکرہ یہ کہانی جان نے شروع کی۔ جان نامی ایک شخص جانوروں کی بولی خوب سمجھتا تھا۔ آپ جانئے دنیا تو بیوقوفوں سے خالی نہیں ہے۔ دو چار الو کی دم فاختہ ہاتھ جوڑنے لگے کہ یار ہم کو جانوروں کی بولی سکھا دو۔ مگر جان نے کہا خبردار پھر نہ ایسا کہنا۔ اس میں ہماری جان کا خطرہ ہے معاف ہی کیجئے تو بہتر ہے تمہارا فائدہ کروں اور اپنی جان دوں۔ بھلا یہ کون دانائی ہے آخر کار جب ساری کی سیر کر آئے اور دیکھا کہ اس علم سے کچھ وصول نہیں تو گھر واپس آئے۔ جب سب جگہ سے ہارے تو آئے نان پارے۔

اپنی بہن سے انھوں نے کہا کہ برسوں ادھر اُدھر مارا مارا پھرا، اب تھک گیا۔ جی چاہتا ہے کہ شادی کرکے گھر ہی رہوں کہیں آؤں نہ جاؤں۔

بہن :۔ خدا تمہاری آرزو بر لائے مگر بھائی واسطے خدا کے بیوہ کے ساتھ شادی نہ کرنا۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔

زِہ راست برو اگرچہ دور است
زنِ بیوہ مکن اگرچہ حور است

جان :۔ یہ کیوں۔ میں نے بعض بعض بیوہ ایسی دیکھی ہیں جو کنواریوں سے اچھی ہیں۔ حسینہ و جمیلہ خوب رو قوس ابرو اور زردار بھی ہیں۔

بہن :۔ بھائی تم یہ باتیں کیا جانو۔ بیوہ کا دل موسم زمستاں کے آفتاب کا سا ہوتا ہے۔ نہ گرمی نہ روشنی۔ جیسی حور ہوتی۔ ویسا ہی اس کا اثر ہوا مگر دوشیزہ کا دل موسم تابستان کے آفتاب کا سا ہوتا ہے گرمی کی گرمی روشنی کی روشنی۔ اور اہتزازِ نسیم سحری کے وقت بھینی بھینی خوشبو آتی۔

جان :۔ اچھی بہن اب تو میں رخصت ہوتا ہوں۔

بہن :۔ خدا حافظ ہے جایئے۔ مگر جو کچھ میں نے کہا ہے وہ نہ بھول جانا، ورنہ یاد رکھو بہت پچھتاؤ گے۔

خیر۔ بہن سے رخصت ہو کر حضرت روانہ ہوئے اور ایک شہر میں جہاں ان کے اور اعزہ و اقربا رہتے تھے۔ شادی کی فکر میں بود و باش اختیار کی۔ رفتہ رفتہ اکثر کنواری لڑکیوں اور بیوہ عورتوں سے ملے اور منتخب کرنے لگے

اب سنئے کہ جب دو شیرہ لیڈیوں کی صحبت میں ہوتے تھے تو ان کی بھولی باتیں اور خلقی ادا، اور مسیلی بانکپن پر عش عش کرتے تھے اور جب بیوہ عورتوں کی صحبت میں نشست و برخاست کا اتفاق ہوتا تھا تو ان کی اشارت آشنا نگاہ اور بے حجابی سے ملنا اور چہل اور مذاق دل کو گدگداتا تھا۔ سوچے کہ یا خدا کنواری سے شادی کروں یا کسی بیوہ کو بیاہوں۔ کنواریاں بھی رنگین اور بانکی ترچھی اور حسین ہیں اور بیوہ بھی۔ شیریں بیان نازک میان اور مہ جبیں ہیں۔

آخر کار صنم دل فریب ــــ طاؤس زیب، بیوہ پر ایسے مفتوں ہوئے کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا اور اسی بت بے پیر کا کلمہ پڑھنے لگے اور نوبت براین جارسید کہ اس کو اپنے گھر لے آئے اور شادی کرلی۔

میاں :۔ بیوی دیکھو اب مل جل کے رہنا۔ ہاں۔

بیوی :۔ میاں تم پر سے قربان جاؤں۔ دل سے تمھارا پیار ہے۔

میاں :۔ خدا کرے ہم تم مزے اور لطف سے زندگی بسر کریں۔

بیوی :۔ تمہاری سی ہو کے رہوں گی۔

میاں :۔ ایسی ہی بیوی میں چاہتا تھا (دل میں) سبھن نے ہم کو ڈرایا تھا کہ خبردار بیوہ کے ساتھ شادی نہ کرنا مگر بیوہ دل وجان سے ہم پر قربان اور عاشق زار ہے۔

بیوی :۔ تم کبھی اپنے دل میں یہ خیال کرنا کہ میں تم سے زیادہ دنیا میں کسی اور کا کہنا مانوں گی۔ ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔

اب سنئے کہ ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر گھر کی مرغیوں نے آپس میں کہا (آج ہمیں فاقہ ہے۔

بط :۔ ہمارے مالک ہمیں بالکل بھول گئے۔ افسوس ہے۔

مرغی :۔ میں ککڑوں کوں کی بانگ دوں گی تاکہ انھیں یاد آئے۔

بط :۔ تم بانگ دو۔ تمہارے بانگ دینے سے ان کو شک ہوگا۔ میں خود بانگ دوں گا۔ پھر فاقہ نہ رہے گا۔

یہ گفتگو سن کر جان بہت ہنسے۔ خادمہ کو حکم دیا کہ مرغیوں اور جنوروں کو کھلا دے۔

بیوی :۔ کیا ہنسے میاں۔ آخر ہنسی کس بات پر آئی؟

میاں :۔ تم کو اس سے کیا مطلب ہے تم اپنا کام کرو۔

بیوی :۔ بس جاؤ معلوم ہوگیا کہ تمہیں ہمارا ذرا بھی پیار نہیں ہے یہ بھی کوئی بڑی بات ہے ذرا بتا دو تو کیا ہو جائیگا۔

میاں :۔ اگر بتادوں گا کہ کیوں ہنسا، تو میری جان جائے گی۔

بیوی :۔ چاہے جو ہو مجھے بتادو ضرور۔ اگر میرا پیار ہے تو ضرور بتادو۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم میرے دشمن ہو۔

پیارے میاں ہتھیں ہو۔

راوی:۔ اللہ ری محبت۔ میاں کا قول ہے کہ اگرچہ بتادوں گا تو جان جائے گی۔ بیوی کہتی ہے کچھ پرواہ نہیں ——— چاہے جان جائے مگر مجھے معلوم تو ہو کہ ہنسے کیوں تھے۔

اس پر ہمیں ایک مثل یاد آئی۔ ایک شخص نے بیوہ سے اقرار کیا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔ شادی کے لئے ایک روز مقرر ہوا مگر دونوں میں بحث ہونے لگی۔

مرد:۔ میں سامنے والے گرجا میں شادی کروں گا۔

بیوہ:۔ واہ۔ میں ہرگز نہ مانوں گی۔ سات بار اس گرجا میں میری شادی ہوئی ہے اور میں قسم کھا کے کہتی ہوں کہ سات ہی بار اور اسی گرجا میں بیاہی جاؤں گی۔ جب تو وہ چراغ پا ہوتے کہ اچھے گھر بیعانہ دیا۔ کہا۔ بی صاحب جو سات بار شادی کرنے کا شوق چرایا ہے تو غلام کو معاف ہی رکھئے۔ بلی بخشے چوہا لنڈورا ہی جئے گا خیر۔

الغرض میاں نے مجبور ہو کر کہا۔

میاں:۔ اگر میری زندگی کی خواہاں ہو تو کفن منگوا رکھو۔ کیونکہ ادھر راز بستر کھلا ادھر جان گئی۔

بیوی:۔ اچھا (آدمی کو حکم دے کر) کفن جا کے لے آؤ۔

راوی:۔ اس بے تکلفی اور بے ساختہ پن کے صدقے۔ جھٹ سے کفن بھی منگوا لیا اور اصرار کے ساتھ کہا۔ میاں کفن پہن کے ہم کو بتادو کہ ہنسے کس بات پر تھے۔

میاں:۔ اچھا میں ذرا آخری پرستش کر لوں۔ اب مرتا تو ہوں ہی۔ یادِ خدا تو کر لوں (یہ کہہ کر یادِ خدا میں مصروف ہوتے)۔

اب سنئے کہ ایک مرغ نے اتفاق سے ایک دانہ پایا۔ اور کھٹکنے لگا۔ مرغی نے قریب آن کر پوچھا (یہ کیا ہے) (تم نے زمین پر کیا پڑا پایا)۔ مرغ نے جھلا کر کہا۔ تجھے اس سے کیا واسطہ۔ یہ مجھ سے امید نہ رکھنا کہ میں ہر ایک بات خواہ مخواہ تجھ سے بیان کرتا پھروں گا۔ میں اپنے مالک کا سا پاگل نہیں ہوں کہ اپنی ظالم جورو کے سبب سے اپنی جان دے رہا ہوں۔ جان نے یہ سنا۔ تو کفن پھاڑ کے چیخ اٹھا اور بید لے کر اپنی بدبخت بیوی پر رسید کر کے کہا اے ظالم عورت۔ کیا تو مجھے ایسا بیوقوف سمجھتی ہے کہ تو ذرا سی بات کے لئے ——— میری جان لے اور میں چپ چاپ زندگی سے ہاتھ دھوؤں۔ مجھے بہن کی نصیحت یاد ہے کہ بیوہ کے ساتھ کبھی شادی نہ کرے۔

خوجی:۔ یار یہ تو تم نے بری سنائی۔ مگر شتاب جان کے بیوہ ہونے کا ثبوت کیا ہے اس سن میں تو بیوہ ہوتے کسی کو سنا نہیں۔

ان کا کیا سن ہے آپ کے نزدیک۔ آپ ان کو کوئی بچہ سمجھتے ہیں۔ کیا آخر آپ کے نزدیک ان کی کیا

عمر ہوگی۔

خو:۔ ابھی کیا عمر ہوگی۔ بہت ہوں پینتیس چھتیس۔

پٹھان:۔ پینتیس چھتیس نہ سہی سینتیس اڑتیس سہی۔

خو:۔ پھر اس سن میں بیوہ ہونا کیا معنی۔ ارے یار تم عورتوں کی باتیں نہیں جانتے۔ یہ اپنی قدر بڑھانے کے لیئے کہدیتی ہیں کہ ہم تو بیوہ ہیں۔ یعنی اپنی خوبصورتی ظاہر کرتی ہیں کہ تمھارے پہلے اور بھی ہم پر ریجھ چکے ہیں۔ تم ہی اکیلے نہیں ہو۔

پٹھان:۔ (مسکراکر) اور اکثر عورتیں سن بھی زیادہ بتاتی ہیں۔ اس کا کیا سبب، جناب خواجہ صاحب بہادر ــــ

خو:۔ ہونہہ! اب سب گڑ ایک ہی دن میں گھول کر پلادوں۔

پٹھان:۔ (قدم لے کر) خدا کے لئے استاد بتادو۔ آخر پھر شاگرد ادھورا رہ جائے گا تو کون بدنام ہوگا۔

خو:۔ سن اس لیے زیادہ بتاتی ہیں کہ لوگ تجربہ کار سمجھیں اور حرمت کریں۔

پٹھان:۔ سبحان اللہ واہ استاد کیا کہنا ہے اور صحیح بھی یوں ہی ہے۔ اگر عورت اپنے کو کم سن بتاتے تو کوئی شادی کاہے کو کرے۔ کوئی پاگل ہے کہ پندرہ سولہ برس والی کے ساتھ شادی کرے گا۔ ہاں چالیس کی یا پچاس کی ہو تو کیا مضائقہ۔ اب یہ فرمایئے کہ بی شتاب جان صاحب کے ساتھ شادی کرنے کا مقصد ہے یا نہیں، ایسا نہ ہو کہ پچھتانا پڑے اور شادی نہ کیجئے۔ مگر یاد رکھو استاد اگر نہ بیاہا تو بہت پچھتاؤ گے اور عمر بھر یاد کروگے کہ کون کسی شاگرد نے صلاح دی تھی۔

خو:۔ بھئی شاگرد تو لڑکے کے برابر ہوتا ہے تو اگر شتاب جان کے ساتھ میں نے نکاح پڑھوایا تو وہ تمہاری والدہ کے بجائے ہوئیں۔

پٹھان:۔ یہ پیچھے سمجھا جائے گا۔ پہلے منظوری تو ظاہر کیجئے۔

خو:۔ اچھا صاحب منظور۔ خدا جانے میری صورت میں کون سی بات ہے جو کم سن، گلبدن، گلعذار، ایک نظر مجھے دیکھ لیتی ہے ریجھ جاتی ہے اور جان و دل سے کوشش کرتی ہیکہ یہ گبھرو گراں ڈیل جوان ہمارا میاں بنے۔ اور یہاں، سنوائی ہی نہیں کرتے کہ کہتی کیا ہے؟ مصر میں ہزاروں عورتیں عاشق ہوئیں اور کون عورتیں شہزادیاں، اور نواب زادیاں اور بڑی بڑی عالی خاندان، جی ایسی ویسی نہیں اور حور کی بچیاں، بچہ حور، دور از قصور مگر یہاں نظر اٹھا کر دیکھا ہو تو قسم لو۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری

اتنے میں بی شتاب جان صاحب تشریف لائیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ خدا کمر کو بچائے اف ری۔ نزاکت، نازک سا بدن، نازک آواز، نازک اندام معشوق ہے اللہ ری نازکی۔ چوٹی کے بوجھ سے کمر لچک گئی ہے۔

میاں می گویم ولیکن نہ داری در میاں چیزے

خجالت می کشتم از بسکہ تہمت بر کمر بستم

شتاب جان نے کہا آپ سے تخلئے میں کچھ عرض کرنا ہے اگر جی چاہے اور گراں نہ گذرے تو فوراً اس طرف چلئے۔ خواجہ صاحب مسکرا کر اٹھے۔ اللہ کی شان خدا کی قدرت ہے کہ معشوق تک ہم سے اصرار کریں اور ہاتھ جوڑیں کہ حضور ذرا تخلئے میں چلیں کچھ کہنا ہے۔

خواجہ صاحب تخلئے میں تشریف لائے۔ شتاب جان کے قریب بیٹھے اور ہنس کر کہا ارشاد — جو حکم ہو بجا لاؤں من بدلیا کو اگر توپ کے مہرے پر بھیجدو تو ابھی جاؤں — ابھی وہ تو کہو تمہارے سبب سے خاموش ہوں ورنہ اب تک دس پانچ کو قتل کر چکا ہوتا — بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ یہ کہہ کر خواجہ صاحب جھپٹ کر دروازے کے باہر گئے۔ اتفاق سے ایک گاڑی والا گاتا ہوا گاڑی آہستہ آہستہ ہانکتا چلا جاتا تھا۔ حضرت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کی طرف مخاطب ہو کر گالیاں دینے لگے — او گیدی ما — قالوچی — بھلا — خبردار جو آج سے یہ بے ادبی کی۔ نامعقول جانتا نہیں ہم کون ہیں؟ یہ بے ادبی! ہمارے مکان کی طرف سے گاتے ہوئے نکلنا کیا معنی۔ ہم بھی کوئی رعایا ہیں اور پھر نازک ادا، رنگین قبا، حسن کی کلاہ، شتاب جان کا مکان۔ برگ گل کی بو چھن چھن کے دماغ میں آئے گی تو سر گرانی ہو جائے۔ کلیوں کا چٹکنا گوش نازک کو از بس گراں گذرتا ہے۔

اگر بر چہرہ گل پا گذار در رنجہ می سازد

شکست رنگ گل چوں ریزہائے شیشہ پالش را

یہ تو نازکی کا حال ہے اور تو گیدی گاڑی گھڑ گھڑاتا ہوا ادھر سے نکلا۔ گاڑی والا پہلے تو گھبرایا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ گاڑی روک کے خوجی کی طرف گھورنے لگا۔ مگر جب خان صاحب نے اشارے سے کہا کہ یہ پاگل سوداتی ہیں تو مسکرانے لگا — مسکرانا تھا کہ خواجہ صاحب آگ ہو گئے۔ جھپٹ کے گاڑی کے پاس پہنچے اور قریب تھا کہ لکڑی، جمائیں کہ، اتنے میں ایک رہرو نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اب خوجی سٹپٹا رہے ہیں اور وہ چھوڑتا نہیں اور بھی جھلائے۔

خو: — بس کہدیا۔ خیر اسی میں ہے کہ ہمارا ہاتھ چھوڑ دو، ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔ میں جو بگڑا ہوں گا تو ایک پلٹن کے منائے بھی نہ مانوں گا۔ پھر انجر پنجر ڈھیلے کر دوں گا۔

رہرو:- ہاتھ تو رستم کے چھوڑائے بھی نہیں چھوٹتا۔

خوجہ۔ لاناتو میری قرولی ۔ لاؤ تو پتھر کلا میرا۔

رہرو:۔ لاناتو میرا جوتا ، لاؤ تو میرا ڈھائی تلے والا چمروودھا۔ لاؤ تو زیر پائی اور گرگابی۔

خوجہ:۔ (آہستہ سے) شریفوں میں ایسی ہی گفتگو ہوتی ہے جناب۔

رہرو:۔ شریفوں سے نہیں تم ایسے پاجیوں سے یہ گفتگو ہوتی ہے شریف آپ کے قبلہ گاہ بھی تھے کہ آپ شریف بنتے ہیں۔

خوجہ:۔ اچھا ہاتھ چھوڑ دو، ورنہ اتنی قرولیاں بھو کوں گا کہ یاد کریگا۔ تمام عمر۔ قسم کھا کے کہتا ہوں میرا بدن چور ہے اگر اس وقت کپڑے اتار دوں تو تو کیا پلٹن کی پلٹن بھاگ کھڑی ہو۔ کیا مجال جو کوئی سامنا کر سکے۔

رہرو نے جو دیکھا کہ شیخی بگھارنے لگے تو ہاتھ کو اور بھی مڑوڑنا شروع کیا۔ خوجی کی جان پر بن آئی مگر کریں کیا۔ سب سے زیادہ خیال اس بات کا تھا کہ شتاب جان کہیں ایسی حالت میں نہ دیکھ لیں تو پھر بالکل نظروں سے گر جائیں۔

الغرض اور تماشائی جمع ہوئے۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہے۔

خوجہ:۔ ہم شاہی کے کیدان ہیں جی اور ہے کیا؟

تماشائی:۔ پھر اس سے مطلب، اس وقت جکڑے کیوں کھڑے ہیں آپ۔

رہرو:۔ صاحب یہ گاڑی والا بے چارہ گاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ حضرت نے گالیاں دینی شروع کیں کہ تو گاتا کیوں ہے؟

خوجہ:۔ ہمارے دولت خانے کی طرف سے گاتا جاتا تھا۔ ہم نے روک دیا۔

تماشائی:۔ اے صاحب آپ منع کرنے والے کون ___ آپ کچھ خدائی فوجدار ہیں۔ خلق خدا کے منع کرنے والے آپ کون ہیں۔

خوجہ:۔ چھوڑ دو جی۔

رہرو نے خواجہ صاحب کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ جھاڑ پوچھ کے اندر گئے۔ شتاب جان سے کہا، میں بات پیچھے کرتا ہوں، قرولی پہلے بھونکتا ہوں۔ مردک رہرو گاتا ہوا جاتا تھا، جانے کے ساتھ ہی میں نے کپڑے کے پٹے اتنی چپتیں لگائیں کہ بھرتا ہی بنا دیا۔ دو چار حمایتی آئے، ان کا بھی بھرکس نکالا۔ بات تیرے کی۔ آگ برستی ہے میرے منہ سے اگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میرے قتل کی پوری پوری فکر کر رہی ہو، اب کی اور بھی نکھر کے آئیں۔ اس وقت اور بھی جوبن ہے غضب کا بھبن ہے ستم کا جوبن ہے اور اس چال نے مجھے مار ڈالا اتر پادیا اب زندگی محال ہے ہائے کیا چال ہے ؎

پیشتر زانکہ دہد خامہ بد شش استاد   الفِ قامت او شق قیامت می کرد۔

اب یہ بتاؤ بی شتاب جان صاحب کہ جس نیک بخت بدنصیب سے پہلے تمہاری شادی ہوئی تھی، وہ اب کہاں ہیں اور کس قماش کے آدمی تھے اور تم سے اس سے جدائی کا کیا سبب ہوا؟ شتاب جان نے کہا یہ تو میں سب عرض کروں گی۔ پہلے یہ فرمایئے کہ اس موئے کو نیک بخت کہا۔ تو یہ بدنصیب کیوں کہا، جو نیک بخت ہے تو بدنصیب کیونکر ہوسکتا ہے خوجی نے آہ سرد بھر کر کہا۔ جانِ جان۔ قسم خدا کی میری باتیں جواہرات میں تولنے کے قابل ہیں نیک بخت اس سبب سے کہا کہ آپ کی پوردو شاہد رعنا، جمال پائی اور بغل گرمائی اور بد بخت اس سبب سے کہا کیا وہ مرگیا یا تم نے اس کو نکال باہر کیا یا وہ کسی اور پر ریجھا۔ ہر طرح بد بخت ہوا۔ اگر مرگیا تو جواں مرگ ہوا۔ کیونکہ ابھی تمہارا ہی کیا سن ہے جو ان کا یہ سن کچھ ہوگا اور اگر تم نے نکال دیا تو وہ مردود ہوا اور اگر کسی اور پر ریجھا تو یاد رکھنا منفعت نہ ہوگی۔ کجا تم کجا وہ :۔

از بس جنونِ جدائی گل پیرہن سے
دل چاک چاک نغمہ مرغ چمن سے ہے

شتاب نے کہا، پہلے میری شادی ایک بڑے خوش رو جوان کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس کی نظر اس پر پڑی وہ ریجھ گیا۔ ہاتھ پاؤں خوب صورت اور سانچے کے ڈھلے ہوئے گول بدن، چہرہ نورانی۔ شنجرفی رنگ۔ خون برستا تھا۔ آنکھیں مست خمار ؎

در عہد جمال تو نگیرند زر گل آب
عکس تو بہر آب کہ افتاد گلاب ست

اور زیب و آرائش نے اور بھی جوبن کو دوبالا کر دیا :۔

صد شکل خوب چرخ کشید و خراب ساخت
تا صورتے بسان تو اے آفتاب ساخت

خوجی :۔ بی شتاب جان صاحب کا خدا گواہ ہے۔ بندہ آپ کے ساتھ ضرور شادی کرے گا۔ آپ تو فارسی خواں ہیں۔ ازیں چہ بہتر واہ دا۔

شتاب جان :۔ اور حاضر جواب ایسا تھا کہ ادھر بات کی ادھر غزل کی غزل موزوں کر ڈالی -------
بڑا تیز طبیعت

خوجی :۔ یہ بات تو اینجانب میں بھی ہے دس ہزار شعر ایک منٹ میں کہ دو دن پورے 'دس ہزار' ایک کم نہ دو زیادہ اور خدا میرا گواہ ہے۔ آنکھیں مری نرگسی ہیں۔ رنگ میرا بھی شوخ ہے ہاتھ پاؤں میرے بھی سانچے کے ڈھلے ہیں اور بمبئی بھر میں مشہور ہوگیا کہ شتاب جان سے خواجہ بدیع الزماں کی شادی ہونیوالی ہے۔

اس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے
لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

خواجہ صاحب نے دل میں ٹھان لی کہ شتاب جان کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ ورنہ جگت ہنسائی ہوگی، کہ آزاد تو مزے مزے بیاہ لائے اور ایک حسینہ سے یہاں پتہ لگایا اور بدیع پاشا جیسے گئے ویسے ہی آئے۔ ہنسنے والے دنیا میں بہت ہیں۔ پھبتیاں ہوں گی کہ :۔

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود
چون بہ آید ہنوز خر باشد

شتاب جان لگاوٹ کی باتیں کرتی ہی تھی۔ سوچے کہ موقع اچھا ہے۔ جب خوجی نے معشوقہ کو یقین دلایا کہ آپ نکاح کرنے پر حضرت تلے ہوئے ہیں تو شتاب جان نے چند شرطیں پیش کیں۔

شتاب جان :۔ خواجہ صاحب اس میں شک نہیں کہ آپ سا دولہا ملنا مشکل ہے اول تو جوان جہان گھر وا بھی مسیں بھیگتی ہیں۔ دوسرے آدمی کیا شیر معلوم ہوتے ہو۔ سینہ فراخ — کلائی چوڑی، کمر نازک۔ پھر سپاہی آدمی ہو۔ اور میرے وطن کی عورتیں سپاہیوں کی عاشق زار ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر ہو مگر ذرا مزاج کے چھچھلے ہو، بس اتنی خرابی ہے۔

خو :۔ اگر اطاعت کرو گی، مطیع ہو کے رہو گی تو ہم موم دل ہو جائیں گے اور جو کٹہ بہ کلہ ہم سے لڑو گی تو ہمارا مزاج بے شک چھچھلا ہے۔

شتاب جان :۔ میاں میں لونڈی ہو کے رہوں گی۔ مجھے کیا واسطہ۔

خو :۔ ازیں چہ بہتر۔ خدمت سے عظمت ہے۔ حضرت سلامت۔

شتاب جان :۔ مگر یہ بتاؤ کہ رہو گے کہاں۔ میں بمبئی میں رہوں گی یا گرد و نواح بمبئی میں۔ یہ نہ ہوگا کہ تمہارے ساتھ ملکوں ملکوں ماری پھروں۔

خو :۔ اجی میں تمہارا ساتھ دینے کو آمادہ ہوں۔ جہنم تک تو جان من تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔ بس انتہا ہو گئی۔

شتاب جان :۔ اللہ کرے تیری زبان جل جائے اور سنو موئے کی باتیں۔ جہنم میں جا تو — بالکل پھوہڑ ہی رہا۔ یہ تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔

خو :۔ تم جہاں ہو گی وہاں میں بھی رہوں گا۔ اگر۔

شتاب جان :۔ اگر مگر میں نہیں جانتی — ایک تو تم کو افیم نہ کھانے دوں گی۔ تم نے افیم کھائی اور میں نے کسی بہانے زہر کھلا دیا۔

خو:۔ اچھا نہ کھائیں گے نہ پئیں گے۔ کچھ فرض ہے کہ افیم کھائیں ہی، افیم نہ کھائی، پی بھی۔ چھٹی ہوئی۔

شتاب جان:۔ کھانے دوں گی نہ پینے دوں گی۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ نوکری ضرور کرو۔ بغیر نوکری کے گذارا نہیں ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ میرے عزیز دوست رشتہ دار جو آتے ہیں، یہ سب بدستور آیا کریں گے۔

خو:۔ چہ خوش۔ ان بدمعاشوں کو ہرگز نہ آنے دوں گا۔

الغرض بعد خرابی بصرہ رائے قرار پائی کہ شتاب جان کے ساتھ نکاح ہو جاتے مگر خواجہ صاحب نے جو ان کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو کھٹکے۔ اور طرہ یہ کہ دوسرے روز وہ ان کو ایک قصبے میں لے گئی جو بمبئی سے کئی اسٹیشن کے فاصلے پر تھا۔ وہاں آزاد نہ مرزا صاحب۔ نہ اپنا نہ بیگانہ۔ خویش نہ یگانہ۔ شتاب جان دشمن خانصاحب سیدھی بات نہیں کرتے۔ جان عذاب میں، شتاب جان کے ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے ہیں تو وہ ٹھوکر لگاتی ہے

خو:۔ میں تو دل لگی کرتا تھا، شادی کیسی اور بیاہ کیسا؟ کچھ اوپر ساٹھ برس کا میرا سن ہے اب میں شادی کیا کروں۔ ایک پانوں قبر میں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ تم اللہ کی عنایت سے ابھی جوان ہو۔ تم کو سیکڑوں خورد جوان مل جائیں گے۔ عجیب طبیعت تم نے پائی ہے میرے منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، خواہ مخواہ کے لئے نکاح کر کے عمر بھر غم کی آگ میں جلنا۔ اس سے کیا فائدہ ہے؟

شتاب جان نے یہ قصہ سن کر کہا۔ تم کو اس سے مطلب کیا، بوڑھے ہو یا جوان، اس کی مجھے فکر ہونی چاہئے جب میرا تم پر دل آیا اور تم نے مجھے پر چک دی اور مجھ سے کہا کہ شادی منظور ہے، پھر اب انکار کرنا کیا معنی۔ اچھے ہو تو میرے اور برے ہو تو میرے۔ اب تو میں سارے زمانے سے کہہ چکی کہ شادی ہوگی خواجہ بدیع صاحب ہمارے دولہا بنیں گے۔ اب مجھے کیوں ذلیل کرو گے۔ سب میں ہیٹی ہوگی۔

خواجہ صاحب سوچے کہ بہت برے پھنسے۔ پردیس، شہر بیگانہ، ایک آدمی سے بھی ملاقات نہیں۔ مفلس، ٹکا پاس نہیں اور یہ شادی پر تلی ہوئی ہے اپنی عقل پر خواجہ صاحب نے کمال افسوس کیا، اور ایک کونے میں جا کر آزاد پاشا کے نام یہ خط لکھا۔

محمد آزاد پاشا قوت بازوئے برادران میرے بڑے بھائی اور بزرگ یہ خط غور سے ملاحظہ فرمائیں، سلامت بعد گریہ گریہ سلام۔ اشک بندگی کے حال زار من بدیعا چہ طرازی کہ عشق میں شتاب جان کے جان کھونا کام ہے

؎ کارے کہ نکو نشد نکو شد

کہ نہ شد۔ میری آنکھ سے اب غفلت کا پردہ اٹھ گیا، میں کچھ اوپر ساٹھ برس ہوں گا۔ اس سن شریف میں زوجۂ ثانیہ کا خیال غلط اور غلط اور سراسر غیر واجبی ہے شتاب جان جس پر برسوں سے جان دیتا ہوں، اب مجھ پر خود عاشق

ہے اور جس طرح یہ جسم زار اس بدیع کا چور ہے اسی طرح شکل وصورت بھی چور ہے۔ مجھے کوئی دیکھے تو سمجھے ہڈیاں تک گل گئی ہیں۔ مگر آپ خوب جانتے ہیں کہ انھیں دبلے پتلے ہاتھ پاؤں پر میں نے مصر کے ایک نامی گرامی پہلوان کو لڑا دیا اور انھیں ظاہری ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پر ایک دیوئی خشش یعنی بوا زعفران کے پتھر اور لاتیں سہیں اور اف تک نہ کی۔ دوسرا ہوتا تو کچومر نکل جاتا۔ اسی طرح میری شکل میں یہ بات حاصل ہے کہ ڈھول کے اندر پول ہے مگر جو دیکھتا ہے، عاشق ہو جاتا ہے مرد عورت دونوں۔ یہ عجیب بات ہے۔ میں بعض اوقات خود متحیر ہوتا ہوں کہ یہ کیا اسرار ہے مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی، خیر اب دلی خواہش یہ ہے کہ یہاں سے نجات پاؤں اور بھاگ جاؤں۔ تم بغور مطالعہ نوازش نامہ ہذا خرچ کثیر اور فوج بھیجو کہ خواجہ بدیع صاحب کیدان کو ہم لوگ لینے آتے ہیں۔ بس سب باتیں طے ہو جائیں، ورنہ موت کا سامنا ہے :۔

میں مرگ وصال سے بھی خوش ہوں

دل جان سے اس قدر ہے بیزار

سوچا تھا کہ اگر شادی نہ ہوگی تو لوگ جلیں گے کہ آزاد دو ساتھ لاتے اور ایک کو ہندوستان میں بیاہا۔ اور خواجہ بدیع باوصف امارت وقباحت ولڑتے بھڑتے روم کے موچی کا موچی ہی رہا۔ اگر فوج آجائے گی تو شتاب جان خائف ہو کر مجھے چھوڑ دے گی اور اگر زبردستی نکاح پڑھا لیا گیا، میں پھر زندہ نہ رہوں گا، تو وہ سب سے کڑی شرط یہ کرتی ہے کہ افیم بالکل ترک دو اور نوکری کرلو۔ افیم کا ترک کرنا معلوم، اس شرط کے صاف یہ معنی ہوتے کہ جان دے دو۔ زندگی سے ہاتھ دو۔ شادی کے پھیر میں مرجاؤ اور جان ہے تو قبلہ جہاں ہے اب رہی نوکری اس سے طبیعت نفور۔ یہاں تو لڑکپن سے فقرہ بازوں کی صحبت رہے گپ اڑانا، باتیں بنانا، چانڈو پینا اور پلانا، افیم کی چسکی لگانا، یہ سب ہمارا کام ہے۔ ہم سے نوکری تو نہ ہوگی اور لیاقت ٹھہری واجبی ہی واجبی۔ اللا۔ تللک درست نہیں ہے حساب کتاب سے کبھی واسطہ ہی نہیں رکھا، پھر اب نوکری کس کی کریں۔ سرکاری نوکری کی تلاش ہی فضول ہے۔ انسان پچپن 55 سالہ ہوا اور انھوں نے کہا تشریف لے جائیے۔ اور یہاں پچپن اور دس پینٹھ برس کے ہیں، بلکہ دو ایک اس سے بھی بڑے ہی ہوں گے، کم نہ ہوں گے۔ کم نہ ہوں گے۔ خیر جناب والا نوکری کا تو یہ حال ہے ہم تو بس اسی مصرف کے ہیں کہ کسی نواب زادے کی صحبت میں رہیں، اگر اس کے مزاج میں ہوتے ریاست ہو تو ہم رئیس گر ہیں جائیں اور ایسا پکا رئیس ان کو بنا دیں کہ وہ بھی یاد کرے۔ چانڈو کا قوام ہم سے تیار کرالو۔ افیم ایسی عمدہ پلائیں کہ عمر بھر یاد کرے۔ جس محفل میں جائیں ہم مصاحب بنے ہوئے ساتھ ساتھ ہوں، باقی رہا یہ کہ ہم محرری کریں۔ یا جمع خرچ لکھیں یا مختار بن بیٹھیں۔ یہ خیر صلاح ہے جس کو اپنا کام غارت کرنا ہو، وہ ہمارے سے تعلق کرے۔ پس اندریں صورت اگر ذرا اس قدر عنایت کرو کہ ہم کو یہاں سے چھٹکارا دلوا دو تو بڑی عنایت

ہو گی ؎

چشمۂ فیض سے کچھ اب تو اشارہ ہو جائے

نام ہو آپ کا اور کام ہمارا ہو جائے

جواب کا منتظر ہوں۔ مس ٹیڈا کو سلام، مس کلیرسا کو بندگی، مرزا صاحب ہم کو یہاں پھنسا کے چلے گئے۔ اچھا پھنسا دیا۔ بیگم صاحب کی خدمت میں بندگی عرض کر دینا۔ اب خط کا اختتام ہے اور دوپہر کا وقت ہے اس کے بعد شام ہے۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم

زانکہ من بندہ گنہ گارم

امیدوار مغفرت ایزد منّان بندہ خواجہ بدیع الزماں المتخلص بہ بدیع تو گرفتارِ عشق شتاب جان ؎

کیا جاتی تھی جان بے شکایت — کیوں موت دم سخن نہ آئی

یوں داغ عدو کا شکرا ے دل — بے شرم تجھے جلن نہ آئی

اس کو من جو خاک میں ہوا پھر

بلبل طرف چمن نہ آئی

ہر چند میخواہم کہ از من آزردہ شدہ معتوب شوم والا آن چناں ربود از من دل کہ خود دلبر و دلدار ست واز نگاہ برادرانہ آن شوخ مارا امید ہدے

ہر کچھ پہ نگاہ لطف منظور

کیا خوب نظر ہے چشم بد دور

خدا جانے تم لوگ مجھے خاک میں ملاتے ہو۔ میں سانے کیا قصور کیا، روم گیا، تمہاری طرف سے لڑا بھڑا۔ تمہارا ساتھ دیا۔ وقت بے وقت کام آیا۔ صلاح دی، مشورہ دیا اور اب وہی آزاد مجھے غیبا کئے دیتا ہے اور خاک میں ملائے دیتا ہے۔

میں شمع نہیں مرے رلانے سے مول — لوبان نہیں مرے جلانے سے حصول

میں خردہ گل نہ آب بارانِ بہار — ظالم مرے خاک میں ملانے سے حصول

فقط۔ حسرۃً ایضاً یعنی خواجہ بدیع الزماں بدیع۔

یہ خط لکھ کر شتاب جان کو دیا اور کہا خدارا کسی طرح سے آزاد پاشا کے پاس جلد پہنچاؤ — ان سے آخری صلاح لیتا ہوں۔

شتاب جان۔ آخری صلاح کیسی ہوتی ہے کیا مرتے ہو؟

خوجی:۔ پہلے تم کو بیاہ تو لیں۔ ابھی مرنے کا زبان پر نہ لاؤ۔ تم بیکار ہمیں کوستی ہو۔ ابھی تو تمہارے ساتھ

شادی کرنی ہے۔

شتاب جان:۔ پھر کسی سے کہنے سننے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟

خوجی:۔ شادی بیاہ کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے ذرا اس بارے میں انسان کو خوب سمجھ لینا چاہئے۔ نشیب و فراز اور پنچ نیچ، دنیا میں شادی سے بڑھ کر اور کیا ہے یہ بڑا نازک معاملہ ہے بے سمجھے بوجھے شادی کر لینا، عقل کے خلاف ہے یہ تو تم خود ہی جانتی ہو کہ سالہا سال سے تمہارا عاشق زار ہوں۔ فقط اس قدر البتہ دریافت کرنا ہے کہ تمہاری شرطوں کو کہاں تک منظور کر لوں۔ بس اور کچھ نہیں۔

شتاب جان:۔ جاؤ ہم نے بلا شرائط شادی منظور کر لی۔

خوجی:۔ از یں چہ بہتر۔۔۔ اچھا منظور۔۔۔ دل سے منظور ہے مگر خدا کے لئے یہ خط تو بھیجدو۔

شتاب جان نے خط لے کر ڈاک کے ذریعے سے روانہ کر دیا اور خوجی سے کہا کہ یہاں تم اپنے کو خواجہ پاشا یا بدیع پاشا مشہور کرو، تاکہ میری وقعت ہو۔ خواجہ صاحب نے جھلا کر کہا معقول۔ مشہور کرو کیا معنی۔ کیا کچھ غلط بات ہے۔ ہم پاشا ہمارا باپ پاشا۔ پدر پدر پاشا۔ مشہور کرنا کیا معنی بدیع پاشا تو ہم کو حضرت سلطان سے خطاب ملا تھا۔ یہ سلطانی خطاب کوئی ہم سے چھین سکتا ہے بھلا۔ اور ابھی تو ہم کو یہاں آئے عرصہ نہیں ہوا۔ دو چار روز میں دیکھنا کیا نتیجہ ہوتا ہے اور کتنے آدمی ہماری زیارت کو آتے ہیں۔

اب سنئے کہ خان صاحب خاص مالوے کے باشندے تھے انھوں نے جو خوجی کو افیم کا شائق پایا تو مالوے کی نہایت عمدہ افیم پلائی۔ دو دن میں خواجہ صاحب جرعہ جرعہ کر کے اس قدر پی گئے، جس قدر چار دن میں بھی نہ پیتے۔ سفر میں ان کی صحت میں بہت بڑا فتور پڑا تھا اور اس مقام کی آب و ہوا بھی نہ راس آتی۔ طرہ اس پر یہ ہوا کہ افیم جو گتی استعمال کرنے لگے۔ اور غذا میں قلت ہوتی۔ دو ہی دن میں جرم ہو گئے۔ خان صاحب سے افیم پیتے ہوئے یوں گفتگو کی۔

خوجی:۔ خان صاحب واللہ ہے دوسرا اتنی افیم پیتا تو بول جاتا کیا مجال ہے کہ اس شہر میں کوئی مقابلہ کر سکے اور اس شہر پر کیا موقوف ہے۔ جہاں کہئے مقابلے کے لئے آمادہ ہو جاؤں، کوئی تولہ بھر پیتے تو میں سیر بھر پی جاؤں، اور افیون کا گھولنا تو ہمارے سوا اور کوئی جانتا ہی نہیں۔

خانصاحب:۔ مگر استاد آج کچھ انجر پنجر بہت ڈھیلے نظر آتے ہیں۔

خوجی:۔ ہاں بھائی۔ آج تو ہمیں کچھ برے آثار نظر آتے ہیں۔

خان:۔ ہم جانتے ہیں کہ تم نے بہت افیم پی لی ہے۔

خوجی:۔ واہ۔ ایسا کہیں کہئے گا بھی نہیں، حضرت، آپ بھی آجائیں اور بندہ درگاہ بھی بیٹھے ہیں، مقابلہ کیجئے۔

خواجہ صاحب شام تک اور بھی ضعیف سے ضعیف ہو گئے، مگر مالوے کی پرانی افیم کا جو ذائقہ چکھا تو چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ خان صاحب سے سن چکے تھے کہ بارہ برس کی پرانی افیم ہے، دو دن میں سوا پاؤ افیم پی گئے اور اس کے علاوہ دس تولے چانڈو اڑایا۔ شام کو پنک میں موجیں لینے لگے تو شتاب جان نے دق کرنا شروع کیا۔

شتاب: اے خواجہ صاحب۔ خواجہ صاحب۔ ایں، اے واہ ہے۔

خو: (چشم نیم باز سے) ہوں، ہوں۔ سونے دو۔

شتاب: اے آگ لگے تیرے سونے پر، ہم دے کب تک سوتا رہے گا۔ سونے کی بھی کوئی انتہا ہے۔ اوئی۔

خو: (ذرا کروٹ لے کر)

قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم
فتراک میں جو سر ہے تو جان ہے رکاب میں

شتاب: بھلا خیر۔ ہم تو سمجھے تھے خبر آگئی (ہنس کر)۔

خان: کہتی کس سے ہو۔ وہ ہیں کہاں۔ وہ پہنچے خدا گنج۔

شتاب: اے! ایلو پھر پنک میں آیا، ابھی تو زندہ ہو گیا تھا۔ ارے یہ تو دم چور سا معلوم ہوتا ہے۔

خان: (کان کے قریب جا کر) خواجہ صاحب:

کھو دیا حسن مدک نے ستم ایجادوں کا
اڑ گیا رنگ دھواں بن کے پری زادوں کا

خو: (آہستہ سے سر کھجلا کر) ذرا سونے دو بھائی۔

شتاب: (چپت جما کر) میرے ہاں پنک والوں کا کام نہیں۔

خو: ہم تو اس در سے نہ ہٹیں گے نہ ہٹیں گے۔

کوئی ماہ لقا جلوہ دکھائے مجھ کو ۔۔۔ پھر کوئی صنم پسند آئے مجھ کو
وہ دن اللہ پھر دکھائے مجھ کو ۔۔۔ جس دن نے دکھائی ہیں اندھیری راتیں

شتاب: ہم دم چور نہیں۔ اس پنک کو خدا غارت کرے، جس نے ہزاروں کی جان لی۔ اللہ کرے افیم کے کھیتوں میں آگ لگے۔

خان: شتاب جان! خواجہ صاحب بہت پی گئے۔ ایسا نہ ہو آج چل بسیں تو غضب ہی ہو جاتے۔

شتاب: ارے کس تدبیر سے موئے کو شہر بدر کرو۔

خان: خواجہ صاحب۔ اجی خواجہ صاحب۔ آئیں! بولتے ہی نہیں۔ بولو صاحب۔

شتاب: ہے ہے پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ اب کیا کروں۔

خان: مرزا صاحب کو بلوائیے جنھوں نے یہ بلا پیچھے لگائی۔

خواجہ بدیع الزماں کی کیفیت دگرگوں ہو گئی۔ فوراً ایک حکیم صاحب بلوائے گئے۔ نبض دیکھ کر کہا۔ کسی قسم کا سم استعمال میں آیا ہے اور ضعف اس قدر بڑھ گیا ہے کہ مرض غالب اور طبیعت مغلوب ہو گئی ہے۔ خانصاحب نے عرض کیا کہ حکیم صاحب مہربانی کر کے کوئی ایسی دوا دیجئے جس سے ان کی طبیعت ذرا ٹھہرے تو ہم ان کے اعزہ کو تار کے ذریعے سے مطلع کریں۔ حکیم صاحب نے پھر نبض دیکھی، کل حالات دریافت کیے اور بسم اللہ کہہ کر نسخہ لکھا اور کہا ابھی پلا دو۔

یہ کہہ کر حکیم صاحب تشریف لے گئے اور شتاب جان از بس سراسیمہ ہوئیں:

ساقیا اب ناز بے جا کس لئے — چین ابروے بے محابا کس لئے

بے مزہ ہے شکر افشانی تری — بے نمک ہو سر کہ پیشانی تری

اے تنک ظرف اس قدر بدخو نہ ہو — دل ہوا کھٹا کہ ترش ابرو نہ ہو

بے نیازی کا سبب اے بدمزاج — کیا رہی ہے ہم کو تیری احتیاج

کام کیا اب ساغر سرشار سے — بادہ کش ہوں جام چشم یار سے

دیکھ دور ساغر مل کی بہار
پھر گئی آنکھوں کے آگے چشم یار

آزاد فرخ نہاد نے مرزا صاحب سے ان دونوں جادو نگاہ پریوں کے ملنے کا حال بیان کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ مس کلیرسا کے ساتھ شادی کا ذکر بھی نہیں آیا۔ ہاں کوہ قاف کی پری سے البتہ عہد و پیمان ہوا ہے اس شوخ کا احسان میری گردن پر ہے۔ تادم واپسی اس کا احسان نہ بھولوں گا، بار منت سے سر نہیں اٹھا سکتا۔ اول تو میں خود بھی اس پر فریفتہ تھا اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ محبوب گل رخسار مجھ سے لگاوٹ کی باتیں کرنے لگی۔

کیا رکھوں پرسش نگاہ کرم
چشم سے غمزہ داد خواہ ستم

لب جان بخش چارہ، جو کیا کیا — الفت آلودہ گفتگو کیا کیا

شادیاں دل کو ہم کناری کی — ہائے باتیں وہ دوستداری کی

دیکھ اس لب کی گوہر افشانی — ہو گیا آب ابر نیسانی

مگر مرزا صاحب از برائے خدا آپ بیگم صاحب کو سمجھا دیجئے، کہ حسن آرا کو بھی اس امر کی اطلاع نہ دیں۔

مرزا صاحب نے ان کی تشفی کی اور کہا آپ چلئے تو دو بدو گفتگو ہو جاتے۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب آزاد کو لے کر محل سرائے میں تشریف لائے۔ بیگم صاحبہ جھپٹ کے کوٹھری میں چلی گئیں اور یوں باتیں ہونے لگیں۔

مرزا :۔ آزاد پاشا کو مبارک باد دو کہ صحیح سلامت واپس آ گئے۔ خدا نے یہ دن دکھایا۔

بیگم :۔ خدا ان کو صد و سی سال کی عمر عطا کرے۔ آمین۔

مرزا :۔ بڑے بڑے ریاض کے بعد ہندوستان واپس آئے ہیں۔

بیگم :۔ اگر سچے دل سے ریاض کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے گا۔

مرزا :۔ اگر سچے دل سے کیا تو کیا، اس میں کچھ شک بھی ہے۔

آزاد :۔ حضرت اس مرتبہ ہم سے خفا ہیں، حالانکہ میرا خدا خوب جانتا ہے کہ صرف حسن آرا کی خاطر سے یہ زحمتیں اٹھائیں اور پھر یہ بھی سوچا کہ ؏

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

ایک تو اس محبوب مطلوب کی خاطر ہو گی، دوسرے برادران دینی کی مدد۔

مرزا :۔ محمد آزاد صاحب یہ دو تحفے حضور کے لئے لائے ہیں۔

آزاد :۔ (مسکرا کر) ایک اپنے لئے ایک اپنے دوست مرزا صاحب کے لئے۔

بیگم :۔ (بہت تیکھی ہو کر) اور تم سے امید کیا ہے کاتنے بودو۔ میرے حق میں۔ میں نے ایسا ہی گناہ کیا ہے۔ اور نہ ان کے واسطے لینے آئے۔ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی پھٹے سے منھ۔

مرزا :۔ یہ چاہیں بگڑیں ہم تو خوش ہوئے کہ ایسا نادر تحفہ ہمارے واسطے لاتے۔ پھر اب میں مکان تجویز کروں۔

بیگم :۔ پھونک دوں مکان و کان کو۔ ان سے اور امید کیا تھی۔ کس صفائی کے ساتھ کہتے ہیں۔ ایک اپنے لئے ایک اپنے دوست کے لئے۔

مرزا :۔ اچھا صاحب ہم کو دکھا تو دو، اس میں کیا عیب ہے۔

بیگم :۔ خیر ہنسی تو ہو چکی۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ حسن آرا کو نہ لکھوں تو نہیں بنتی، لکھوں تو نہیں بنتی۔ تم جا کے ان دونوں کو دیکھ لو کہ کس وضع کس قطع کی عورتیں ہیں۔

آزاد :۔ آپ اس وقت ہمارے ساتھ چلئے۔ اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھے بلکہ دونوں کو اپنے ساتھ ہی لیتے آئیے۔

بیگم :۔ نہیں نہیں۔ یہاں ان کا کچھ کام نہیں ہے اور سنو! ہم اپنی بہن کی سوت کو اپنے ہاں بلائیں۔

مرزا :۔ آخر آزاد کا بھی تو کچھ خیال ہے یا نہیں ہے۔

بیگم :- میں دیکھتی ہوں تم باتوں ہی باتوں میں ریجھ گئے۔

آزاد :- بھابھی صاحب کچھ پوچھئے نہ۔ راستہ بھر کلیجا پکا دیا کہ خدا کے لئے ان کے ہمراہ ہوٹل چلو۔ از برائے خدا ہوٹل چلو اور تسپر ابھی اچھی طرح سے صورت نہیں دیکھی ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد

بسا کین دولت از گفتار خیزد

مرزا :- اب یہ لڑوا دیں گے۔ آپ کی دو گھڑی کی دل لگی ہے اور میاں دو تین روز تک کھٹ پٹ کی گرمی بازار رہے گی۔

مرزا صاحب نے دربان سے کہا حضور کوئی مولوی صاحب آپ کو باہر بلاتے ہیں۔ مرزا صاحب باہر تشریف لائے۔ آزاد کھڑے تو ہوئے مگر بہانے سے حقہ اٹھا لیا اور پھر ذرا بیٹھ گئے اور آہستہ سے یہ اشعار پڑھے۔

تم کو یہ طور یہ انداز کہاں آتے تھے　　ستم حادثہ پرواز کہاں آتے تھے

ایسے عصائے فسوں ساز کہاں آتے تھے　　اس قدر مہر فزا ناز کہاں آتے تھے

چشم قاتل کو خیال نگہ ناز نہ تھا

غمزہ مانند مرے اشک کے غماز نہ تھا

بیگم صاحب نے چھب دکھا کر کہا۔ بس یہی تم میں عیب ہے دو چلے گئے اور تم ڈٹے بیٹھے ہو۔ آزاد نے حقہ لیا اور پیتے ہوئے چلے۔ باہر آئے تو مرزا صاحب نے کہا جناب مولانا محمد آزاد صاحب آپ ہی ہیں۔ جناب حافظ امان الحق صاحب سے مصافحہ کیا اور گفتگو ہونے لگی۔

حافظ صاحب :- عرصہ دراز سے مشتاق زیارت تھا۔ آج کے روز سعید یہ سعادت نصیب ہوئی، اب حضور کا یہاں کب تک قیام ہے۔

آزاد :- جناب دو چار روز کے بعد عزم روانگی وطن ہے۔

حافظ :- جو کارہائے نمایاں آپ سے سرزد ہوئے ان کا تمام اہل اسلام کو شاکر ہونا لازم ہے۔ ہم لوگ اخبارات کے ذریعے سے آپ کے حالات فتح و ظفر دیکھتے تھے۔ عرض نہیں کر سکتا کہ طبیعت کس قدر محظوظ و شاد ہوتی تھی۔

آزاد :- میں نے کوشش کی کہ اپنا فرض ادا کروں۔ اگر ادا کیا تو کسی پر احسان نہیں کیا اور اگر احیاناً اتفاقیہ یا اپنی پست ہمتی سے اس کے ادا کرنے میں قاصر رہا۔ تو افسوس ہے السعی منی والاتمام من اللہ۔

حافظ :- فرض ادا کرنے میں صرف کوشش ہی کرنا مشکل ہے جس شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنا فرض ادا کرے۔ داخل حسنات ہو چکا اور خصوصاً اس ذمہ داری کا فرض۔ اس کا ادا کرنا ہر ایک شخص کے امکان میں نہیں،

ہے آپ نے اپنے اعلیٰ ہمت اور حمیت سے ثابت کر دیا کہ اسلام کے سچے خیر خواہ اور پکے دوست ہیں۔

حماک اللہ من شر النوائب جزاک اللہ فی الدارین خیراً

آزاد:۔ قصد ہے کہ مولانا محمد عبدالقدوس صاحب اور مولانا اطہر صاحب وغیرہ بزرگوں سے ملوں۔ اس مرتبہ شرفِ ملازمت حاصل ہوا تھا۔

حافظ:۔ اس خاکسار کو انھیں بزرگانِ مقدس نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ کل شام کو اگر تکلیف نہ ہو تو بلدہ بمبئی کے ٹاؤن حال میں ضرور تشریف لائیے۔

مرزا:۔ پہلے تو یہ رائے قرار پائی تھی مگر ابھی ابھی صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کا خط آیا کہ پرسوں جلسہ منعقد ہوگا۔

حافظ:۔ بہتر ہے کل علمائے بمبئی بسر وچشم آئیں گے اور اہلِ اسلام جوق جوق جمع ہوں گے۔ ان کے علاوہ پارسی اور یورپین اور ہنود اور ہر مذہب وملت کے لوگ آزاد سے مشہور جنرل کو دیکھنے آئیں گے۔ آج کل تمام عالم میں آزاد کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اللھم زد فزد۔ اکثر اصحاب نے فکر کی ہے کہ عربی میں آپ کے لئے قصیدے تصنیف کریں۔ اس روز قاضی صاحب قبلہ اسپاچ کریں گے۔

آزاد:۔ (ہنسی کو ضبط کر کے) یہ ان کی نوازش ہے ورنہ من آنم کہ من دانم بندہ اس قابل کہاں کہ علماء وفضلاء اسپاچ کریں مگر خدا کی دین۔ میرا دین وایمان یہ ہے کہ برادرانِ قومی سے خصوصاً اور بنی نوع انسان سے عموماً ہمدردی کے ساتھ پیش آؤں۔ جب تک اپنی قوم کی اعانت نہ کروں۔ تب تک صبر وشکیب محال ہے

بے شاہد وبادہ ہے صبر توبہ توبہ اس عمر میں دل پہ جبر توبہ توبہ

ایام شباب اور دیجو ساقی فصل گل وجوشش ابر توبہ توبہ

حافظ:۔ بندہ اب رخصت ہوتا ہے، پرسوں انشاء اللہ ضرور ملوں گا۔ آج درس وتدریس کے سبب سے نہ قاضی صاحب قبلہ کو دم زدن کی مہلت ہے اور نہ جناب مفتی صاحب کو۔ مولانا عبدالقدوس صاحب نے مسہل لئے ہیں ورنہ سب صاحب بالضرور آتے۔

آزاد:۔ یہ توجہ اور عنایت کیا کم ہے خانہ احسان آباد۔

حافظ:۔ رخصت ہوتا ہوں (استادہ ہو کر) تسلیمات عرض ہے۔

آزاد:۔ (ادب کے ساتھ) تسلیم فی امان اللہ۔

مرزا صاحب نے آزاد سے کہا کہ نصف بمبئی آپ کی ملاقات کا مشتاق ہے اور سب کے سب یہاں اب تک آگئے ہوتے مگر آج کا دن خود ٹال دیا کہ دو دن تو آرام کر لیجئے۔ پرسوں انشاء اللہ شام کو سب صاحبوں سے ملئے گا بہت خوش ہوں گے۔

حافظ جی رخصت ہوئے تو آزاد اور مرزا صاحب نے کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر آرام کیا۔ دو گھڑی دن رہے۔ دونوں صاحب فٹن پر سوار ہو کر ہوٹل میں آئے۔ آزاد پاشا کمرے میں گئے، تو مس میڈا نے فرط محبت سے بوسہ لیا۔ مس کلیرسا نے خوش خوش ہاتھ ملایا۔ آزاد نے شکایت کی کہ واہ اجنبی شہر میں اتنی دیر تک خبر ہی نہیں لی۔ یہاں ہی سے یہ حال ہے تو اپنے وطن پہنچ کر تو شاید بالکل بھول ہی جاؤ گے۔ جب آزاد نے مرزا صاحب کی تشریف آوری کا حال بیان کیا اور کہا کہ حسن آرا کے بہنوئی ہیں۔ کلیرسا اور میڈا دونوں مسکرائیں۔ کیا اچھا ہم حمام کر کے کپڑے بدل لیں تو ان سے بخوشی ملیں۔ آزاد نے باہر آن کر برآمدے میں کرسیاں بچھوائیں اور کہا کہ بعد حمام ملاقات ہوگی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد دروازہ کھلا اور یہ دونوں بلوائے گئے۔ آزاد نے مس میڈا کی طرف اشارہ کر کے کہا (مس میڈا اور مرزا صاحب) مس میڈا ہاتھ بڑھانے ہی کو تھیں کہ مصافحہ کریں مگر مرزا صاحب ان رسوم سے ناواقف، چونگا بنے کھڑے رہے تو آزاد نے اشارے سے کہا کہ مصافحہ کرو۔ حضرت نے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد اسی طرح مس کلیرسا سے مصافحہ ہوا۔ دونوں پریاں نکھر کے بیٹھی تھیں۔ ایک بت گل عذرا دوسری لغز گفتار، ایک پری تمثال، دوسری جادو جمال۔ اس کا حسن دلاویز۔ اس کا جمال مہر انگیز۔ رخسارے گل تو زلف سنبل، سراپا چمن ماہ فریب یاسمین بدن، ان کی نوخاستگی، اور آراستگی دیکھ کر مرزا صاحب دنگ رہ گئے۔ کلیرسا پر نظر ڈالتے ہیں تو پریزاد میڈا کو دیکھتے ہیں نور شک خوبان نوشاد ایک روکش پری دوسری غیرت بتان آزری۔ زلف چلیپا سے روح افزا خوشبو چلی آتی ہے۔ جس سے روح کا مشام معطر ہوا جاتا ہے۔ الٰہی یہ زلف عنبر بار ہے یا مشک تاتار ہے یا طرۂ تابدار ہے یا زلیخا نسیم بہار ہے۔ کلیرسا کے تبسم ناز نے مرزا صاحب کے زخم جگر پر جراحت کا کام کیا۔ اس تبسم کے صدقے ۔

چون لب لعل تو تشریف تبسم بخشد ‏ ‏ ‏ ‏ داغ را برہنہ سازم کہ نمک پوش کند

اور میڈا کے گلوئی مصفا پر جو نظر پڑی تو مثل آئینہ حیران ہو گئے ۔

روان اندر گلو یشن از صفا آب ‏ ‏ ‏ ‏ چو تار بر نیان از گوہر ناب ،

مرزا :- یہ صاحب کوئی ایسی زبان سمجھ سکتی ہیں جس میں ہم گفتگو کریں ؟

آزاد :- فرانسیسی شاید سمجھتی ہوں۔ کچھ پوچھئے !!

آزاد تاڑ گئے کہ مرزا صاحب کا دل آ گیا۔ سوچے کہ اب البتہ بیگم صاحب کے سامنے ان کے چھیڑنے کا موقع ملا۔ اُن کی نظر اُن سے چھپی نہ رہے گی۔ وہ چالاک و تیز مزاج ہیں۔ یہ سیدھے سادے مسلمان۔ ہم کو خوب موقع ہاتھ آیا کہ ان کو آڑے ہاتھوں لیں اور بیگم صاحب کو پُرچک دیں۔ اب سنیئے کہ میڈا نے سادگی سے مرزا صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرانسیسی میں تقریر کرنا شروع کی۔

میڈا :- ہم آپ کی ملاقات سے بہت خوش ہوئے۔ اسم شریف ؟

مرزا :- (بغلیں جھانک کے جھیپ گئے) کیا فرمایا۔

آزاد :- (فرانسیسی زبان میں) جواب دیجئے مرزا صاحب !

مرزا :- (دونوں کی طرف دیکھ کر اردو میں) جی ارشاد ؟

آزاد :۔ (پھر فرانسیسی میں) جواب دو صاحب۔ باتیں کرو واہ۔

مرزا صاحب نے اردو میں آزاد سے کہا، یار کیوں ذلیل کرتے ہو۔ ہیں یہ گٹ پٹ کیا سمجھوں۔ عجب طرح کے دل لگی باز آدمی ہو۔ اردو بولو، فارسی میں گفتگو کرو۔

آزاد نے مسکرا کر مس میڈا سے کہا یہ فرانسیسی نہیں سمجھ سکتے۔ اس وقت مس میڈا نے اس طرح ادائے دلربا کے ساتھ منھ بنایا کہ آزاد کا بے اختیار جی چاہا کہ لب لعل اور عارض گلگوں کے بوسے لے لیں۔ مگر کلیرسا اور مرزا صاحب کی وجہ سے مجبور تھے۔ ایک دفعہ ہی کمر لچکاتی ہوئی کرسی سے اٹھیں تو مرزا صاحب نے آزاد کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا :۔ ؎

بسکہ باریک تراز موی بیانست اورا	بر کمر بار کمر بند گران ست اورا

آزاد :۔ کوہ قاف کی مس میڈا ایسی ہیں۔ کچھ سمجھے حضور؟

مرزا : (گھبرا کر) معافی چاہتا ہوں، مجھے بالکل خیال ہی نہ رہا۔

الغرض تھوڑی دیر کے بعد آزاد اور مرزا صاحب ان دونوں پریوں کو سوار کر کے گھر لے چلے۔

مرزا : میرا خدا اور میں کہ بدی کی راہ سے نظر نہیں ڈالی۔ اگر بدی کی نیت دل میں ہو، خدا جنت نصیب نہ کرے کفار کے ساتھ حشر ہو۔ گناہ گاری تا بہ کئے۔ کچھ زاد راہ کی بھی فکر چاہئے :

مومن شوق گناہ گاری کب تک	اے تیرہ دردن سیاہ کاری کب تک
مان اپنے خدا کو باز آ بہر خدا	اے دشمن دین بتوں سے یاری کب تک

آزاد :۔ بیگم صاحب ان دونوں حور نژاد رشک خوبان نوشاد کو دیکھ کر بہت افسردہ دل اور کبیدہ خاطر معلوم ہوتی ہیں۔

مرزا :۔ ہاں کچھ بندۂ درگاہ سے بھی کھٹکی ہوئی ہیں۔

آزاد :۔ میں انکی چتونوں ہی سے تاڑ گیا تھا بھائی جان۔

مرزا :۔ مگر قسم ہے خدا کی کلیرسا کی سی بانکی عورت آج تک نہیں دیکھی۔ سبحان اللہ قتل عام کر دے گی۔

آزاد :۔ اس میں تو شک نہیں۔ بلا کی صورت پائی ہے ؎

کشیدہ قامتے چون تازہ شمشاد	بہ آزادی غلامش سرو آزاد
دو لعلش از تبسم در شکر ریز	دہانش در تکلم شکر آمیز
بخندہ از ثریا نور می ریخت	نمک از پستۂ پر شور می ریخت

لعب لعل برگ گل چشم مست ساغر مل۔ تازہ و نازک اندام نسترن عذار گلفام۔ خدا جانے کس خوش نصیب کی زیب آغوش و زینت کنار ہو گی۔ چاند سا مکھڑا ہے واللہ ؎

چشم چون نرگسے کہ خفتہ بود	فتنہ در خواب او نہفتہ بود
تنگ چشمے ز تنگ چشمی دور	ہمہ سردان ز خاک داو از نور

آب گل خاک رہ پرستانش گل کمر بند زیر دستانش

مرزا:۔ آپ تو تعریفیں کرکر کے اور بھی طبیعت کو پریشان کئے دیتے ہیں۔ میں کیا اندھا ہوں۔ میں تو دیکھ رہا ہوں۔ نزع کی حالت میں ہو، اور انسان دیکھ لے تو ملک الموت سے لڑ پڑے۔ بجلی سے بھی زیادہ شوخ و شنگ اور گرما گرم ہے دل کی آنکھوں میں اس بت جادو جمال کے دیکھنے سے نور آتے اور زلف عنبر بار دماغ روح کو معطر کر دیے جاتے۔ ؎

خجل از لطف نگاہت بدو بادام نیم

وز لب لعل تو شرمندۂ دشنام نیم

اب سنئے کہ بیگم صاحب نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو ان دونوں محبوبان گل رخسار، سمن عذار کے حسن دلآویز کے مقابل میں رنگ جمنا نظر نہ آیا۔ فوراً مشاطہ آزمودہ کار کو بلوایا اور کہا آج تمھاری مشاطگی کا کمال ہمیں دیکھنا منظور ہے دریچے کے سوراخوں سے ان دونوں پریوں کو دیکھو اور پھر ہماری صورت پر نظر ڈالو۔ اگر اس طرح سنوارو کہ ان کے سامنے چہرہ ماند نہ نظر آئے تو موتیوں اور اشرفیوں سے دامن بھر دوں۔ زیبن اے حضور کوئی مشاطہ ہوتی ہے۔ یہ مشاطہ گر ہیں ابھی ڈیڑھ مہینے تو لکھنو چھوڑے ہوئے کربلا کی زیارت کو جاتی تھیں۔ لون جو لگی تو ماندی ہو گئیں۔ یہ نواب آبادی الزمانی بیگم اور نواب محبوب محل کے ہاں نوکر تھیں۔ ایک تو حضور کی صورت یوں ہی ماشاء اللہ سے ایسی ہے کہ لاکھ دو لاکھ میں ایک ہیں آپ اور پھر مشاطہ ایسی جو لکھنو کی ناک ہے سونے پر سہاگہ۔

مشاطہ:۔ قربان جاؤں سرکار۔ نواب وجاہت علی خاں بہادر کی چھوٹی صاحبزادی کی صورت ایک تو کالی کلوٹی، دوسرا اس پر چیچک کے داغ اور باپ ماں کوئی نہیں۔ روپیہ ایرے غیرے پچکلیاں مل کے چکھ گئے۔ ایک مہینے لونڈی خدمت میں رہی۔ پھر اس طرح کا نور چہرے سے بدلنے لگا کہ مرزا حیدر علی بیگ کے لڑکے نے دو لاکھ کا مہر نکاح کے وقت لکھ دیا اور جس پر لونڈی نے کوئی بڑی تند ہی نہیں کی تھی، اور حضور تو یوں ان دونوں سے بری نہیں ہیں۔ مگر ہاں جھوٹ بولنا اور سور کھانا برابر ہے۔ جس کا نمک کھائیں گے، اس سے جھوٹ کبھی نہ بولیں گے۔ کس زندگی کے لئے۔ بات یہ ہے کہ یہ دونوں ابھی سن بن میں بہت کم ہیں اور (مسکرا کر) اچھوتی۔

زیبن:۔ (ہنس کر) یہ ایک ہی کہی۔ اچھوتی! ہونھ!

مشاطہ:۔ پس حضور جو تازگی چہرے پر بارہ برس کے سن میں ہوتی ہے، وہ اٹھارہ برس کے سن میں نہیں رہتی مگر ہاں بعض عورتوں کی بلا کی کاٹھی ہوتی ہے لڑکی اور ساں نہیں معلوم ہوتی ہیں سرکار ان میں اگر حضور سے بڑھ کے کوئی بات ہے تو یہی ہے کہ ابھی کنوارپنے کے دن ہیں۔

زیبن:۔ اور کوئی چاہے لاکھ بناؤ چناؤ کرے وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی، وہ تو بات ہی اور ہے نہ جو بات اللہ نے پیدا کی، وہ بات بندہ بھلا کیا کر سکے گا۔ کس برتے پر تتا پانی۔

مشاطہ:۔ بہن۔ اللہ کا دوسرا، توبہ توبہ تو یہ دنیا کے پردے پر کون ہے مگر اسی خدائے پاک کی قسم کھا کے کہتی ہوں حضور (ناک پر مٹی لگا کر اور کان پکڑ کر) بڑے بول کا سر نیچا۔ توبہ کر کے کہتی ہوں کہ وہی بات نہ پیدا ہو تو

ناک کٹواڈالوں اور پھر اس پیشہ کا نام نہ لوں۔ چاہے لکھ رکھئے۔

بیگم :۔ اچھا باتیں تو بہت بناتی ہو چکنی چپڑی ۔۔۔ دیکھیں جو کچھ کہا وہ کہاں تک کر دکھاتی ہو۔

مشاطہ حضور۔ ع

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

بسم اللہ شعبدہ باز تو جھوٹ موٹ کا باغ لگا دیتے ہیں مگر دم بھر کے لئے، اور لونڈی وہ گل بوٹے دکھائے جن کو خزاں کا خوف نہیں، ہر دم شاداب مگر نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے جم جم جیئیں ان سے انعام لوں گی۔ ہاں۔

زیبن :۔۔۔ اے حضور ہی انعام دینے کے لئے کیا کم ہیں اور مرزا صاحب تو دیکھتے ہی خوش ہو جاتیں۔ ایک باری نواب قدسیہ محل نے خوش ہو کے ہمیں اپنے خاص پٹے کا نیا جوڑا دیا جو پہن کے احمد کے ابا کے سامنے گئی تو سلامی کرنے لگے اور اس قدر خوش ہوئے کہ میں کیا کہوں۔

بیگم :۔ اب باتوں میں تو دیر ہوتی ہے، اور۔

زیبن :۔ تو حضور کمرے میں تشریف لے چلیں۔ چلو بہن۔

مشاطہ :۔ بسم اللہ! ہمیں کیا عذر ہے۔ یہ دونوں کہاں سے آئی ہیں، کیا کوئی ان کو باہر سے لایا ہو۔ نئی پوشاک ہے

زیبن :۔ یہ مرزا صاحب کے ایک دوست کے ساتھ آئی ہیں۔

مشاطہ :۔ ایسی السیدن کو مرزا صاحب کو نہ دکھایا کیجئے۔ حضور (مسکرا کر) اتنی لونڈی کی عرض مانئے۔ حضور تو خود دانا بینا ہیں۔

بیگم :۔ (ہنس کر) یہ کاہے سے تم نے کہا۔ وہ ایک نہیں دس کو گھر ڈالیں۔ ہم سے بڑھ کر کسی کی خاطر ہو سکتی ہے۔

مشاطہ جادو خیال کی کارستانی و چابکدستی سے بیگم صاحب کا حسن خدا آفریں، اس وقت جمال یوسف پر چشمک زن تھا۔ آئینے میں صورت زیبا دیکھی تو سر زمین نخوت کی ہوا بھر گئی۔ سوچی کہ اللہ ری میں۔ اپنے بھولے پن کے صدقے آج تک اپنے جوبن سے خبردار ہی نہ تھی۔ ایڑی چوٹی پر ایسی ایسی ہزاروں کو قربان کر دوں۔ کمرے سے چھت پر اس طرح جھومتی ہوئی آئیں جیسے طاؤس چمن ابر کے دن صحن گلشن میں رقص کرتا ہے عطر میں اس قدر بسی ہوئیں تھیں کہ دور تک محلہ طبلہ عطار بن گیا تھا۔ پیش خدمت کو حکم دیا کہ جس کمرے میں ان سے ملاقات ہوگی۔ اس کو خوب معطر کر دو۔ پھولوں کی سیج بچھی عطر کے کنٹر کھول دیئے گئے۔ طرح طرح کے ولایتی پردے دروازوں پر لٹک رہے تھے۔ جب سب انتظام لیس ہو گیا، تو اس نے عرض کیا حضور۔ اب بلوائیے سب سامان درست ہے ہر شے قرینے کے ساتھ رکھی ہے دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔

بیگم :۔۔۔ آج البتہ تم نے ہمیں خوش کر دیا۔ بھرپور انعام دوں گی۔

مشاطہ :۔ حضور اس سے زیادہ انعام اور کیا ملے گا کہ سرکار خوش ہوگئیں۔ اور انعام تو روز ہی پایا کرتے ہیں مگر آج لونڈی نے وہ ریاض کیا ہے کہ اگر کسی صاحب ملک کی بادشاہ بیگم کی خدمت کرتیں تو پشتہا پشت کے لئے جاگیریں مل جاتیں

بیگم :۔ اب آج کے دن تو خاموش رہو۔ کل سمجھا جائے گا۔

مشاطہ :۔ (بندگی کرکے) اللہ وہ دن دکھائے کہ صاحبزادہ گود میں کھیلتا ہو اور گھر میں ہم سب خوشیاں منائیں کہ اللہ کے فضل سے بیٹا ہوا۔

راوی :۔ مشاطہ نے تو اپنے حساب بیگم صاحب کے خوش کرنے کے لئے عادی تھی مگر وہ کسی قدر بدمانع ہوگئیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ابھی دو چار برس اولاد نہ ہو تو اچھا مگر کسی سے یہ رائے ظاہر نہیں کی تھی کہ ہم جولیاں ہنسیں گی اور طعنے دیں گی کہ واہ۔ ایک تم ہی انوکھی عورت ہو۔ جوبن کا اتنا خیال دیوانہ پن ہے لوگ تو اور دعا مانگتے ہیں کہ اللہ بیٹا دکھائے اور تم الٹی دعا مانگتی ہو کہ ابھی دو چار برس بیٹا نہ ہو، جوبن برقرار رہے۔

خیر۔ زیبن نے آکر کہا۔ سرکار وہ دونوں تو اردو کا ایک حرف بھی نہیں سمجھ سکتیں۔ بڑے حضور نے کسی صاحب لوگ کے ہاں سے ایک میم بلوائی ہے آیا۔ کسی میم صاحب کی انگریزی آیا۔ وہ لولی سمجھاتے گی گور چیتی اور طرہ یہ کہ ذرا نہیں جھجکی ہیں۔ مرے حضور بھی بیٹھے ہیں اور وہ جو آئے ہیں وہ بھی بیٹھے ہیں۔ وہ بلا تمیز ساتھ ہی لائے ہیں۔ اس طرح تنی ہوئی بیٹھی ہیں، سینے کو ابھارے کہ میں کیا کہوں۔ ملکوں ملکوں کا پانی پیا ہے نہ۔ ہزاروں کنوؤں کا جو پانی پئے وہ بے حجاب کیوں کر نہ ہو جائے۔ اب دیکھیں یہاں آن کے باتیں کرتی ہیں۔ کیا کہتی سنتی ہیں۔

حضور وہ بات نہیں ہے جو سرکار سمجھی تھیں۔ بڑے حضور کی دونوں میں سے ایک پر بھی نظر نہیں پڑتی اور پھر چاہے نظر پڑتی بھی ہو، اب تو دشمنوں کی آنکھوں میں خاک۔ اس وقت جو سچ مچ کی پری بھی آئے تو نظروں سے گر جائے۔ اب یہ دونوں آئیں گی۔ نہ کھل جائے گی۔

بیگم :۔ دونوں بڑے آئینے آمنے سامنے لگا دو۔ اور اس تصویر پر غلاف چڑھا دو اور خاصدان میں گلوریاں بہت سی تیار رہیں۔ چاندی سونے کے ورق ان پر لپیٹے ہوں۔ مگر گلوری کھانا یہ کیا جانیں۔ یہ تو بسکٹ وغیرہ ہی کھاتی ہوں گی بس جو انگریزوں کی غذا ہے ــــــ آیا ان کے واسطے کالے پانی کی فکر کی ہے یا نہیں۔

مشاطہ :۔ (ہنس کر) کیا کالے پانی بھیجنا ہے گا۔

بیگم :۔ (مسکرا کر) ہاں جوان کی نیت بری ہوئی تو یہی کرنا ہی پڑے گا۔ ذری تم بھی غور سے دیکھنا۔ ان کی نظر تو کسی اور نیت سے نہیں پڑتی ہے۔

مشاطہ :۔ حضور لونڈی تو پہلے ہی عرض کر چکی کہ ایسی خوبصورت اور بیباک بن بیاہی لڑکیوں کا آنا جانا اچھا نہیں۔ آئندہ حضور کو اختیار ہے۔

بیگم :۔ میں اس قسم کا طوطا نہیں پالتی۔ ان کو اختیار رہی، جا کے کہو کہ آئیں، مگر پہلے ان کو بلا لاؤ۔ جو کچھ کہنا سننا ہو کہہ دیں۔ جس میں پیچھے نہ ٹوکیں کہ یہ نہیں تھا، وہ نہیں تھا۔ کہو حضور یہاں تک آ جاتے۔

زبین نے جا کے دونوں پریوں کو بہت جھک کے سلام کیا اور مرزا صاحب سے کہا حضور گھر میں خدا بلاتی ہیں۔ مرزا صاحب زنان خانے میں آئے۔ بیگم صاحب کو دیکھا تو آنکھیں کھو گئیں۔ از سرتا پا نظر ڈالی۔ علیحدہ کمرے میں لے جا کر گل رخسار کا بوسہ لیا۔ مگر بیگم صاحب جھپٹ کر باہر چلی آئیں۔ کہا بس بس۔ اب یہ اختلاط اور ٹھنڈی گرمیاں رہنے دیجئے۔ میں سب دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے اڑ کے کہاں جائے گا۔ وہ جو دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کو بانکی سی بیٹھی ہے اس پر بے طور حضور کی نظر پڑتی ہے گھر ڈال لو۔ کہو مشرف باسلام ہو جائے نکاح کر لو۔ ولایت محل کا نام رکھنا۔ ظاہرداری کے لئے ہم سے پیار اور دل میں اوروں سے لگاؤ۔ خیر اچھا یہی سہی۔

مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا۔ کچھ خیر ہے ہوش میں ہو۔ خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں جوان صالح ہوں اور ریوں دیکھنے کے لئے اچھی چیز پر کس کی نظر نہیں پڑتی۔ مگر آج تم اپنی تو کہو۔ جادو کر دیا۔ خدا کے لئے ذرا بات تو سن لو۔ بیگم صاحب تنک کر بولیں۔ جی بس۔ باتیں رہنے دیجئے۔ سنی ہوتی ہیں سب باتیں۔ کیا ہم کو دیوانہ مقرر کیا ہے ؏

رخ میری طرف نظر کہیں اور

اچھا اب انصاف کے تو یہ معنی ہیں کہ ہمارا اور ان کا اپنے دل میں مقابلہ کرو اور پھر دیکھو کس قدر فرق ہے کسوٹی پر اچھا برا معلوم ہو جاتا ہے

مرزا :۔ تم اڑتی چڑیاں پکڑنے لگیں میں دیکھتا ہوں۔ بے سبب بدگمانی۔

بیگم :۔ چلو تم کو کیا، تم کو تو سونے کی چڑیا چھو ہاتھ لگی۔

مرزا :۔ اس بدگمانی کا کیا ٹھکانہ کیا بھلا۔ تم تو اپنے سائے سے بھڑکنے لگیں۔ آخر اس دم تک کبھی تم نے کسی سے ہماری شکایت سنی، کبھی سنا کہ فلاں عورت پر نظر بد ڈالی، پھر اس قدر خفگی اور اس بدگمانی کا کیا سبب ہے۔

بیگم :۔ سنی تو نہیں مگر آنکھوں دیکھی۔ ؏

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

سنی تو بے شک یقین نہ آتا مگر اب تو آنکھوں دیکھ چکی۔ آزاد نے بیٹھے بٹھائے نیا روگ لگایا۔

مرزا :۔ اب، تو تم تمر ساقی ہو، اور بیکار تر ساقی ہو، مجھے دیر ہوتی۔

بیگم :۔ میں تو اس طرح ترساؤں جس طرح بے رحم اناٹاڑکی کو دودھ کے لئے ترساتی ہے ابھی دیکھو تو سہی۔

مرزا :۔ (قہقہہ لگا کر) کتنی سیدھی سادی ہو۔ توبہ کسی اور کے سامنے کہیں تو مجھے سخت شرمانا اور جھینپنا پڑتا یہ تم کو سوجھی کیا (پھر قہقہہ لگا کر) لاحول ولاقوۃ۔

بیگم :- ابھی نہیں۔ کسی کو آنے دو۔ پھر دل لگی ہوگی۔ دیکھو تو ہی ہمارے سامنے کسی پر نظر بد ڈالنا۔

مرزا :- اب دیر ہوتی ہے صاحب۔ تم بیٹھو میں جا کے بلائے لاتا ہوں۔

بیگم :- ہاں دیر کیوں نہ ہوگی۔ گھورنے کے لئے دیر ہوتی ہوگی۔

مرزا صاحب نے کہا میں جاتا ہوں تم خواہ مخواہ جھگڑا کرتی ہو۔ بیگم صاحب نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ فرش کی نشست تو ہوگی نہیں، کرسیوں کی نشست ہوگی اور جو کچھ کہنا ہو کہہ دو۔ کوئی بات ان کے خلاف نہ ہونے پائے۔ مرزا صاحب نے کہا، سب ٹھیک ہے۔ یہ کہہ کر باہر آئے اور آزاد سے کہا تشریف لے چلئے۔

اتنے میں ولایتی آیا جو فرانسیسی اور اردو سمجھتی تھی، آ گئی، سب مل کر اور زنانے مکان میں آئے۔

بیگم صاحب نے پڑوس کی ایک رئیس زادی افتخار النسا بیگم کو بلایا اور ایک پارسی لیڈر کو جب آزاد اور مرزا صاحب کو آتے ہوئے دیکھا تو افتخار النسا بیگم ہٹ گئیں۔ کمرے میں بیگم صاحب بناؤ چناؤ کر کے شہزادی بنی ہوئی بیٹھی تھیں۔ ان دونوں دوشیزگان مہر طلعت نے مسکرا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ اور قریب بیٹھیں، بیگم صاحبہ نے گھبرا کے آیا سے بھی مصافحہ کیا۔ انھوں نے ان حوران بہشتی کے حسن اور سراپا وضع پر نظر ڈالی۔ انھوں نے بیگم صاحب کے جمال اور ہندوستانی لباس کو غور سے دیکھا۔ بیگم صاحب اپنے دل میں سوچیں کہ میں لاکھ بنی ٹھنی مگر ان دونوں پریوں کے مقابل میں ٹھہر نہیں سکتی۔ ان کی ایک ایک ادا ناز آفریں ہے۔ سراپا سانچے کا ڈھلا ہوا چاہ زنخداں دیکھا تو صلے علیٰ کہنے لگیں اور سوچیں صرف ایک دفعہ ہم پر تمام عالم کی حسین نثار ہو جائیں تو میز بہ بدر۔ زاہد دیکھیں تو زہد سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

من آن روز از سلامت دست شستم کہ آن چاہ زنخدان آفریدند۔

لطافت ہائے عالم جمع کردند

ازان چاہ زنخداں آفریدند

اور یہ دونوں نازنیناں عالم فریب، طاؤس زیب، بیگم صاحب کی وضع اور پوشاک غور سے دیکھتیں تھیں۔ ان کا گلنار اطلس کا پاجامہ جھلک رہا تھا۔ عطر کی فتنہ انگریزی ستم تھی۔ کپڑوں کی جگمگاہٹ دیکھ کر نظر جھپکی جاتی تھی۔ سیس پھول اور چھپکے کو دیکھ کر مس کلیرسا نے آہستہ سے میڈا سے کہا یہ کتنا پیارا زیور ہے۔

میڈا :- ان دونوں زیوروں سے حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

کلیرسا :- جو یہ زیور مس میڈا کے سر کے زیب ہوں تو پھر آزاد حسن آرا کو بھی بھول جاویں۔ ذرا مس میڈا اپنے سر پر لگاؤ تو۔

کلیرسا :- کیوں آزاد۔ ایک روز میڈا کو از سرتاپا ہندوستانی کپڑے پہناؤ۔ زیور اور لباس سب ہندوستانی ہو اس پوشاک میں بھی بڑی خوبصورت نظر آئیں گی۔

میلڈا:- اچھا ہم تم دونوں بہنیں دیکھیں، کون اچھی معلوم ہوتی ہے۔

کلیرسا:- (آیا سے) بیگم صاحب سے کہو کل آپ ہماری پوشاک پہنیں اور ہم آپ کی وضع اختیار کریں۔ آپ ہم کو اپنا جوڑا دیں۔

آیا:- (اردو میں) اس پایک بولتا کہ کل ہم ٹم دونوں ادل بدل کپڑا کریس گا۔ ٹم ہمارا ہم ٹمارے کا۔

بیگم:- کیا بولیں یہ بولی تو ہمارے جد کی سمجھ میں بھی نہ آنے کی۔

زینبن:- کیا جانے کیا کیا کہتی ہیں۔ ادل بدل کیسا۔ اچھی بولی ہے۔

افتخار النسا بیگم پردے میں سے خوب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ادھر آزاد مسکرائے اُدھر بیگم صاحب کو ہنسی آئی۔ آزاد نے مس کلیرسا کا مطلب سمجھا دیا۔

بیگم:- (آیا سے) کہدیجئے کہ ہم بہت خوشی سے آپ کا لباس پہنیں گے اور ہمارا جوڑا جو آپ نے پسند کیا (مسکرا کر) خیر۔ آپ کو مبارک ہو۔

آیا:- (فرانسیسی میں) بیگم صاحب کہتی ہیں کہ ہم نے منظور کیا۔

کلیرسا:- کہدو کہ ہم آپ کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے مگر افسوس ہے کہ نہ ہم آپ کی زبان جانتے نہ آپ ہماری زبان سے واقف۔

آیا:- مس صاحب بولنے مانگتا کہ جبان کسی کا بھی ٹیک نہیں ہے اور دیکھ کے بہت دل کو اچھا ہونے لگا دوست کے پایک۔

بیگم:- اے کیا اول جلول باتیں کر رہی ہیں۔ تم خود کیوں نہیں سمجھاتے۔

آزاد:- واہ۔ چپ چاپ بیٹھے ہوتے ہیں۔

میلڈا:- بیگم صاحب فارسی عربی پڑھی یا نہیں ... انگریزی ان کو پڑھائی۔ ہم اگر بمبئی میں رہتے تو ضرور سکھاتے مگر مرزا صاحب تو خود ہی نہیں جانتے۔

آیا:- دوسرا مس صاحب کتا بیگم صاحب کو انگریجی جبان سکھائی۔ ٹھیک بات ہے ہم بمبئی میں رہے گا سکھانے سکتا۔

آزاد:- کہتی ہیں کہ اگر میں بمبئی میں رہتی تو انگریزی ضرور سکھا دیتی اور پوچھتی ہیں کہ فارسی عربی پڑھی ہیں۔

بیگم:- کہدو کہ اردو اچھی طرح جانتی ہیں۔ خط پڑھ لیتی ہیں، لکھ لیتی ہیں۔ کہیں میری ہیٹی نہ کرنا، یہ نہ کہدینا کہ کچھ جانتی ہی نہیں ہیں۔ کہدو فارسی بھی پڑھی ہیں مگر عربی کی لیاقت کم ہے۔

آزاد:- ہاں پڑھی لکھی تربیت یافتہ ہیں، کئی زبانیں جانتی ہیں۔

کلیرسا:- بیگم صاحب سے کہئے کہ مہربانی کر کے کچھ گائیں۔

آیا:- مس کلیرسا آپ سے گجل گانے کہتا ہے۔

بیگم :۔ کیا! غزل گانا۔ میں سمجھی نہیں کیا کہا۔ آزاد تو ایسے چپ ہو رہتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کیا یہ مجھ سے گانے کی فرمائش کی، میں گانا کیا جانوں۔

آزاد :۔ ان کے ملک میں کوئی عورت ایسی نہیں جو گا نہ سکتی ہو۔ اگر کوئی عورت علم موسیقی سے بے بہرہ ہو تو اس کی شادی وقت سے ہوتی ہے ہر ملکے دیر رہے۔

کلیر سا :۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ کیا بیگم صاحب کو گانے میں عذر ہے۔

آزاد :۔ ہم لوگوں میں بہت شاذ و نادر کوئی عورت گاتی ہو اور جو گاتی ہے اس کو رواج کے مطابق لوگ سنتے ہیں۔

میڈرا :۔ ہم ہندوستانی کا گانا سننا چاہتے ہیں۔

آزاد :۔ ڈومنیاں بلوائی گئی ہیں۔ آج شب کو جلسہ ہو گا۔ گانا سنئے مگر بہت عورتیں اس طرح پر نہیں گا سکتی، ہیں۔ بیگم صاحب نے مرزا صاحب کے کان میں کہا۔ آزاد والی کون سی ہیں اور آپ کے لئے کس کو لاتے ہیں۔ کہا دونوں میں سے جو ہم کو پسند ہے تم کو اس سے کیا مطلب۔ اب بتاؤ تم خوبصورت معلوم ہوتی ہو۔ یا وہ، ایمان سے کہنا۔ بیگم صاحب نے کہا بات یہ ہے کہ یہ دونوں ابھی کنواری ہیں۔ بن بیاہی لڑکی اس عمر میں ضرور اچھی معلوم ہو گی اور خصوصاً جب اس قدر سنگار کیا ہوئیں ایک بات پر بڑی دیر سے غور کر رہی ہوں کہ نہ لچکا ہے نہ پٹھا۔ نہ کرن پھول نہ بادلا نہ چنکی اور پھر بھی ایسی نفیس پوشاک ہے کہ اس کی صفائی اور نفاست کی قسم کھانی چاہیئے۔

آزاد نے کہا ان کے طرز معاشرت کا حال ہم سے پوچھو۔ تراش خراش بناؤ چناؤ، کنگھی چوٹی کی فکر میں یہاں کی خاتونوں سے زیادہ غلطاں پیچاں رہتی ہیں۔ یہاں سوائے پاجامے، دوپٹے، کرتی رضائی دولائی......کے اور کیا ہے مگر ولایت کے ملکوں میں ہر روز پچاس پچاس طرح فیشن ایجاد ہوتے ہیں اور اخباروں کے ذریعہ سے اشاعت پاتے ہیں۔ وضع قطع اور تراش خراش کے بہت سے اخبار ہیں جن میں خاص یہی باتیں درج ہوتی ہیں۔ درزیوں اور درزنوں کی آمدنی کا حال نہ پوچھو۔ ان کی دکانوں پر اژدہام عام ہوتا ہے۔ دو تین گھڑی دن رہے پری پیکر، رشک قمر لیڈیاں نکھر نکھر کر دکانوں اور کوٹھیوں میں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔ جو شے پسند آتی ہے خرید کی قیمت دریافت کرنا اور پوچھنا کہ اس کے دام کیا ہیں سیکھا ہی نہیں، بعض بعض فیشن تو واقعی دل کو اس طرح لبھا لیتے ہیں کہ بیان سے باہر۔ بعض بعض کھیل ایسے ہیں کہ ان کی پوشاک دنیا سے نرالی ہے جس وقت کسی جلسے یا دعوت میں لیڈیاں ناچنے کھڑی ہوتی ہیں۔ اس وقت ان کی اور چھب دیکھتے تو ہندوستان کے انداز و کرشمہ سب کو بھول جاتے۔ اس وقت یہ پریاں گلے سے سینہ چھاتی تک بالکل برہنہ رہتی ہیں۔ اس میں چاہے امیرزادی ہو چاہے شہزادی چاہے غریب۔ سینے کے پاس سے اکثر بیش بہا ریشمی پوشاک ہوتی ہے اور مردوں کے ساتھ ناچتی ہیں، اگر کسی مرد نے اٹھ کر کسی لیڈی سے کہا کہ آپ میرے ساتھ ناچئے تو اس پر فرض ہے کہ مرد کو ساتھ لے کر

رقص کرے۔ ہاں اگر پہلے ہی سے اقرار ہو گیا ہو کہ ہم تمہارے ساتھ ناچیں گے تو انکار کیا جا سکتا ہے اگر میاں بیوی کسی جلسے میں ہوں تو پہلے وہ دونوں باہم رقص کریں گے، پھر اگر بیوی کا جی چاہا تو کسی اور جنٹلمین کے ساتھ ناچے اور اگر میاں کو خواہش ہوئی تو کسی لیڈی کے ساتھ رقص کیا۔

بیگم :۔ اوئی۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ بھلا تم ان دونوں میں سے کسی اور کے ساتھ ناچو تو دیکھیں اور ساتھ مل کے کیونکر ناچتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا۔ ایک ناچ چکا پھر دوسرا ناچے گا۔ پہلے مرد ناچتا ہے کہ عورت۔

آزاد :۔ دونوں ساتھ ناچتے ہیں۔ ایک کی کمر دوسرے کا ہاتھ۔

بیگم :۔ (نہیں) ایسی دوانی نہیں ہوں۔ واہ پرائے مرد کے ساتھ کمر میں ہاتھ ڈال کے ناچنا کیا معنی، کیا اڑاتے ہیں۔

مرزا :۔ نہیں نہیں۔ صحیح کہتے ہیں۔ اپنے اپنے ہاں کا رسم ہے۔

آزاد :۔ اچھا میں خاموش رہوں گا۔ تم آیا کے ذریعہ سے خود دریافت کرو۔ آپ یوں پوچھئے کہ تم دونوں میں سے کسی نے آزاد کے ساتھ ناچا ہے۔

بیگم صاحب نے آیا سے کہا ان سے پوچھو کہ آپ دونوں میں سے کسی کے ساتھ آزاد ناچے بھی ہیں۔ میڈا نے کہا۔ ان کو تو ناچنا آتا ہی نہیں۔ ایک فرانسیسی افسر قسطنطنیہ میں آ کر کچھ دن رہا تھا وہ البتہ رقص کا استاد تھا۔ بیگم صاحب کو اب یقین آیا کہ واقعی یہ خاتونیں مردوں کے ساتھ ناچتی ہیں۔ پوچھا کیا، ہاتھ میں ہاتھ دیکر ناچتی ہو۔ اس پر مس کلیرسا نے ادائے شیریں کے ساتھ اٹھ کر آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا اور بانکپن سے بصد شوخی رقص کرنے لگیں۔ اول تو خیر مرادوں کے دن۔ دوسرے جوش و مستی جوانی کی امنگ، تیسرے طبیعت رنگین پائی تھی چوتھے ناز آفرینی کی استاد سینہ اضافی ابھار کر ناچنا اور آزاد کا شرمانا۔ اس وقت عجب بہار دیتا تھا۔

بیگم :۔ (قہقہہ لگا کر) اللہ جانتا ہے میں تو ان کی قائل ہو گئی۔ نامحرم کے ساتھ کس لطف سے ناچ رہی ہیں، اور مردوے کو دیکھو چہرہ کا رنگ فق ہو جاتا ہے

مرزا :۔ ہر ملکے دہر رسمے۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں ہے

بیگم :۔ مگر آزاد کو ناچنا واچنا خاک نہیں آتا۔

آزاد :۔ اور سنیئے۔ میں ناچنا کیا جانوں۔ میرے ملک کی رسم نہیں۔ بیگم صاحب نے مس میڈا کی بدولت آزاد نے قید سے رہائی پائی اور انہیں کی مدد سے اس قدر روپیہ ملا کہ فوج میں بھرتی ہو سکے تو نہایت مسرور ہوئیں مگر ایک۔ مگر ایک بات دریافت کرنی باقی رہ گئی۔

بیگم :۔ آپ نے ہمارے آزاد کو جو مدد دی، خدا آپ کو اس کا اجر دے۔

میڈا :۔ میں نے ان پر کوئی احسان نہیں کیا۔ مجھے ان سے دلی عشق رہے یہاں تک کہ اگر یہ میرے ساتھ شادی کرنا نہ

پسند کریں تو بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑوں۔
بیگم :۔ آفریں ہے صد آفریں۔ مگر یہ تو بتاتیے کہ یہ دوسری جو آپ کے ہمراہ ہیں، ان کو آزاد سے کس قسم کا تعلق ہے۔
ان سے تو شادی بیاہ کا تعلق نہیں ہے یا یہ بھی شادی ہی کے لئے آئی ہیں۔
میڈا :۔ جی نہیں۔ ان کے سامنے نہ کہئے گا۔ جب میں موجود ہوں تو میں کیونکر پسند کروں گی کہ میرے علاوہ کوئی اور
ان کی محبوبہ کہلائے ہمارے ملک میں دو چار شادیوں کا رواج نہیں۔ ایک مرد ایک عورت۔ ہم عرصے تک فرانس میں
رہے اور وہاں ہی کی رسوم کی زیادہ پابندی کرتے ہیں۔ اس امر سے آپ اطمینان رکھیں مگر ہاں حسن آرا کے ساتھ کرنا تو ان پر
فرض ہے، اس میں اصلاً شک نہیں۔

بیگم صاحب کو ڈھارس ہوئی کہ مس کلیرسا سے آزاد کی شادی نہ ہوگی۔ باقی رہیں مس میڈا۔ ان کے حالات ہمدردی
سن کر بیگم صاحب خود دعائیں دیتی تھیں کہ ان کی سبب سے آزاد نے یہ درجہ حاصل کیا ورنہ فوج کی افسری کیونکر مل سکتی۔
بیگم صاحب کے چہرے کی تازگی و شگفتگی دیکھ کر آزاد نے مرزا صاحب سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے بیگم صاحب کا شک
رفع ہو گیا۔

اتنے میں مس میڈا نے افتخار النسا بیگم کی جھلک دیکھی۔ یہ پردے سے کل باتیں سن رہی تھیں مگر آزاد اور
مرزا صاحب کے باعث سے شریک صحبت نہیں ہوئی تھیں۔ میڈا نے کہا ابھی میں نے اس پردے میں کسی لیڈی کی
صورت دیکھی۔ کیا اس ملک میں عورتیں بھی عورتوں سے پردہ کرتی ہیں۔ آیا نے جب اس کا ترجمہ سنایا تو بیگم صاحب
بہت ہنسیں۔ مرزا صاحب سے کہا، اب تم ان کو لے کے جاؤ۔ باہر بیٹھو تو افتخار النسا بیگم یہاں آئیں۔ آزاد اور مرزا صاحب
باہر تشریف لاتے اور بیگم صاحب چھم چھم کرتی ہوئی برآمد ہوئیں پیاری لیڈی نے مس میڈا اور کلیرسا سے ہاتھ ملایا اور
باہم چہل اور مذاق ہونے لگا۔

اب سنئے کہ بارہ دری میں مرزا صاحب نے اپنے عشق کا حال ظاہر کیا، اور آہ سرد بادل پر درد بھر کر کہا ـــــ بھائی
صاحب، آپ نے ہم کو کہیں کا نہ رکھا، دین کا نہ دنیا کا۔ مس کلیرسا کے ناوک نگاہ نے دل پر نشتر کا کام کیا۔ لاکھ چاہتا ہوں
کہ بات کو ٹال دوں مگر دل ہے کہ امنڈ آتا ہے ؎

دوستوں عشقِ نہفتہ نے ستایا ہے مجھے ‌‌ ‌ آتشِ شوقِ نہانی نے جلایا ہے مجھے
کیا کہوں کیا غمِ پنہاں نے دکھایا ہے مجھے ‌ ‌ ضبطِ وحشت نے یہ دیوانہ بنایا ہے مجھے

چہرۂ زار سے پردہ نہ اٹھاؤں کب تک
گو غم پردہ نشین ہے پہ چھپاؤں کب تک

خرابی یہ ہے کہ اگر ذرا راز کھل جاتے تو پہلے گھر میں جھگڑا پیدا ہو۔ صنم عابد فریب کا ملنا نہ ملنا دوسرا مقدمہ ہے مگر یہ

جھگڑا پہلے ہی شروع ہو جائے اور صبر کروں تو بتایئے صبر کی کچھ حد بھی ہے

ہو تحمل جو تحمل کی نہایت ہووے

کیجئے صبر اگر صبر کی غایت ہووے

میں اکثر احباب سے کہتا تھا کہ عشق ہے کیا بلا تو وجہ کیا کسی پر عاشق ہوا ہوتا تو جانتا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ عشق کسے کہتے ہیں ایک حبیب سے ہنس کر میں نے کہا تھا دیار برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ یہ عشق سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے۔ اس نے آہ سرد کھینچ کر کہا۔ ؎

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح

اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی میری طرح

اگر مس کلیر سا پر اظہار عشق کروں تو خوف ہے کہ مبادا دل طبع نازک پر گراں گذرے کبیدہ ہو جائیں۔ بیگم صاحب سے شکایت کردیں۔ ہم عاشقی کا دم بھر میں جان نذر کریں وہ الٹا رسوا کردیں۔

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا

میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

آزاد:۔ سنئے مرزا صاحب۔ اصلیت یہ ہے کہ بت تند خوئے بلائے جان انسان، عدوئے شکیب، ملاک فریب، بڑی بانکی عورت ہے اور ابھی آپ کو ان کا حال اچھی طرح نہیں معلوم ہوا ہے۔ یہ تو سوا مرد ہیں ــــ زن شیر افگن یہ وہ جری عورت ہے جو پشت فرس ضیغم سے شکار پر سوار ہو کر میدان جنگ میں آتی تھی۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا تھا اور یہ میدان رستخیز میں ہرن کی سی چھل بل دکھا رہی تھی۔ حیرت تھی کہ یا الٰہی میدان کارزار اور یہ عروس نسترن عذار !!!۔ توسن فلک شکوہ تیز خرام اور یہ معشوقہ گلفام گل اندام جس وقت ۔ آہو شکم کو کڑا کڑاتی ہوئی میدان میں آئی ناظرین انگشت حیرت بدنداں تھے۔ خاص شاہ کی سواری کا توسن ہوا نہاد تھا زمین پر قدم رکھتا ہی نہ تھا۔ ؎

از فعل او پر مہ زمین ذرگام او کونہ تہ میں — ز آہنگ ادا گہہ زمیں در طبع او حانی غضب

بادِ بہارے خویش افتاد در جولان کیش او — صحرا دور پا پیش او چون مہرہ پیش بو العجب

آسو سپہر عن ضر عام بر کیواں منقش خورشید فر — خارا دل دستداں جگر روئیں سہم واہن حفیب

آیا دہر آن بادہ میمون ہمایوں

خوش گام چو خنر دم درہ انجام خود لدل

اس وقت آپ اس ناز آفریں کو دیکھتے تو ہوش اڑ جاتے۔ مرزا صاحب نے اس زن شیر افگن کی جرأت اور آزاد کے مقابلہ کا حال اخباروں میں دیکھا تھا۔ متحیر ہو کر کہا ارے یہ وہی ہیں چہ خوش، یہ تو مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ یہ

یہ رازاب کھلا - اب اور بھی مرمٹے۔ رہی سہی آرزو کا بھی خون ہوگیا۔ پھر بھلا ہم ایسوں کو یہ کیا مال سمجھیں گی۔ توبہ توبہ۔ فکر کرنا ہی فضول ہے لاحول ولاقوۃ اب اور ذکر سنیئے۔ ؎

معشوقی ہے آپ کی نرالی — یہ تم نے نئی طرح نکالی،
ہر نازو ادا ستم گری ہے — عاشق کشتی آہ دلبری ہے
درپیش یہی رہو گر سبھی کو
چاہے کوئی کاہے کو کسی کو،

اب اس خیالِ خام سے بندہ درگذرا۔ اب عشق کا نام لوں تو گنہ گار۔

اتنے میں اندر سے ایک مہری نے آن کر کہا حضور ذری آپ کو گھر میں بلاتی ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا کہ خیر تو ہے کہا ہاں حضور کھڑے کھڑے ذری چلے آیئے۔ مرزا صاحب تشریف لائے۔ بیگم صاحب ایک شہ نشین میں تیار بیٹھی تھیں۔ وہاں ان کو بلایا اور مسکرا کر یوں مقابلہ کیا۔

بیگم :۔ کون پسند کی تم نے دونوں ابھی ناکتخدا ہیں۔

مرزا :۔ ہم نے! ہم نے وہ پسند کی جوان دونوں سے بڑھ کے ہے۔

بیگم :۔ اوئی۔ غضب۔ کیا کوئی اور بھی ان کے ساتھ ہے

مرزا :۔ ہاں اسی پر ہمارا دل آیا ہے۔ بلا کی عورت ہے۔

بیگم :۔ ہے کہاں۔ یہاں ہی ہے یا یہاں سے کہیں دور ہے۔

مرزا :۔ یہ کیا سامنے بیٹھی ہے (بوسہ لے کر) یہی ہے۔

بیگم :۔ (مسکرا کر) اب حسن آرا کے نام تار بھیجدو کہ آزاد خیریت سے آگئے۔ خوشیاں مناؤ۔ ایک ہفتے میں آئے، داخل ہیں۔

مرزا :۔ اچھا ابھی بھیجتا ہوں مگر تمہاری تشفی ہوئی یا نہیں۔

بیگم :۔ بے تشفی ہوئے کبھی منظور ہی نہ کرتے۔ حسن آرا ہماری دشمن نہیں ہے۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں سب حال پوچھ لیا

مرزا :۔ تو میں تار بھیجے دیتا ہوں اور آزاد سے کہتا ہوں کہ ایک خط بھی لکھ بھیجیں تاکہ حسن آرا کو یقین کامل ہو جائے ذرا شک نہ رہے۔

بیگم :۔ میڈا اُن کے ساتھ جائیں گی اور وہ ہماری سوت یہاں رہے گی (مسکرا کر) چلو اچھا ہے۔ ہرج ہی کیا ہے۔

آزاد نے جو یہ مژدہ بہجت خیز سنا تو باچھیں کھل گئیں۔ فوراً تار لکھ کر مرزا صاحب کے نام سے بھیجا، اور حسن آرا کے

لیے یہ خط لکھنے لگے۔ ؎

اے جلوۂ برق خانماں سوز	اے شعلۂ آتش جہاں سوز
اے طعنہ زن فسون نگاہاں	اے موجد قتل بیگناہاں
اے مہر عروج کج ادائی۔	اے ماہ بروج بے وفائی
اے نقش و نگار مسکن حسن،	اے تازہ بہار گلشن حسن
اے نورس بوستانِ خوبی	تجھ پر نثار جانِ خوبی
اے جادو پر فن فسوں ساز	بازی وہ عاشقانِ جانباز
اے باعث قطع دست موسا	اے غیرتِ دلبر زلیخا
اے دار و درد بیقراران	اے مرہم زخم دلفگاران
اے موجب آہ و زاری دل	اے باعث بیقراری دل
اے حوصلہ سوز چارہ سازاں	آتش زن آزر و گدازاں

اے محرم و محرم تمنّا

اے ہمدم و ہمدم مسیحا،

جان آزاد۔ تمھارا عاشق ہماں باز میدان ستیز سے واپس آگیا۔ مگر، کس طرح جیسے شیر ...... کچھار سے نکل کر ڈکارتا ہوا شکار کرتا ہے اور جھومتا ہوا پھر کچھار کی راہ لیتا ہے۔ جو کوئی پوچھتا تھا کہ میاں جوان ہندوستان چھوڑ کے اس سفر دور دراز کی زحمت کیوں لی تو یہ شعر زبان پر لاتا تھا۔

آنکھ آفتِ جان سے لڑائی

ایک ترچھی نگہ کی برچھی کھائی

میدانِ جنگ میں اکثر تم یاد آئیں۔ یاد آنے کے یہ معنی نہیں کہ تمھارا خیال دل میں جاگزیں ہوا ہو۔ وہ تو رگ و پے میں پیوست ہے مطلب یہ ہے کہ اکثر اوقات تمھاری یاد بیقرار و بے تاب کر دیتی تھی اور یہ اشعار ترجمانِ دل تھے۔

جلوۂ بزم عشرت و رونق خانہ ہائے ہائے	زمزمہ و ترنم و رقص ترانہ ہائے ہائے
ساقی و مطرب و مے و وصل شبانہ ہائے ہائے	گردش چرخ حیف حیف دورِ زمانہ ہائے ہائے

صبح دمید و شب گذشت ماہ شبینہ خانہ رفت

روئے سحر سیہ کنید یار باین بہانہ رفت،

میں سوچتا تھا کہ یا خدا ہنسے بولے تو دو ہی دن اور مفارقت برسوں اور طرّہ یہ کہ اس مفارقت کی انتہا ہی

نہیں۔ ہر سمت آگ ہی آگ برس رہی ہے دو دن چین کے نہ گذرے تو جدائی نے کہیں کا نہ رکھا۔ عداوت۔

گرچہ کئی برس کے بعد ہوا وصالِ یار ہمدم رہے ہم نشین رہے ہم نفس اور ہمکنار
ایک نہ دل کو چین تھا اور نہ جان کو قرار جس سے کہ ڈر رہے تھے ہم وہی ہوا مآل کار

صبح دمید شب گذشت ماہ شبینہ خانہ رفت
روے سحر سیہ کنید یار باین بہانہ رفت،

کئی مقام پر خدا نے جان بچائی۔ مرتے مرتے بچا توپوں اور بندوقوں کے دھوئیں معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کے نیچے ایک اور آسمان بن گیا ہے۔ زن کی صورت خدا نہ کسی کو دکھائے، مگر ان سب مقاموں پر جب مجھے یاد آتا تھا کہ حسن آرا بیگم کا وصل اس مصیبت و پریشانی کا نتیجہ ہوگا تو باچھیں کھل جاتی تھیں کہ اگر جان کے لالے پڑے۔ ایک گولی نے کام تمام کر دیا، تو خیر —— اور کچھ نہیں۔ یہ تو لوگ کہیں گے کہ برادران دینی کے لئے اپنی جان دی اور اگر جان بچ گئی تو۔ سبحان اللہ حسن آرا ہیں اور ہم ہیں:۔

نکلی ہر بار نئی طرز ملاقات میں بات بذلہ آمیز بیان حرف حکایات میں بات
ہر روش سحر کرے ایما و اشارات میں بات ہر سخن میں سخن نغز ہو، ہر بات میں بات

اشب گلگوں نصیب تھا اور تیغ الماس بار۔ دنیا سے واسطہ نہ ما فیہا سے سروکار۔ راہ میں پریچ ایک مجھ پر فریفتہ ہو گئی اور اس نے واقعی اس قدر مدد دی کہ اگر وہ نہ ہوتی تو میں کسی مصرف کا نہ رہتا۔ عجب پیاری اور دلربا باتیں اور پری چہرہ ہے

پری زاد و پری رو و پری خو
غلط گفتم پری شرمندہ او

تمہاری بہن ان کی ملاقات سے بہت خوش ہوئیں اور تم تو اس کے قدم لوگی کہ تمہارے آزاد کی جان بچائی۔ مگر جانِ من ہم تو تمہاری بدگمانی اور خوش اعتقادی کے قائل ہو گئے۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ ایک ذرا سی بات کے سنتے ہی یقین کر لیا کہ آزاد ہم کو بھول گئے۔ اور یہاں پہاڑ اور دریا اور موت کے منہ میں کودنے کو مستعد واہ شکایت ہی شکایت ہے ؎

سرکنم شکوہ اگر تاب شنیداں داری
سینہ بشگافم اگر طاقت دیدان داری

مگر خیر۔ شکایتوں کا دفتر تو وقتِ ملاقات کھلے گا۔

سپہر آرا کی شادی مبارک ہو۔ میں نے ایک اندوہناک حال جس وقت سنا تھا کچھ بیان نہیں کر سکتا، کیا حال تھا

بہت رویا مگر خود ہی دل کو سمجھایا، کہ ناداں روتا کس کو ہے، کیا تو حشر تک بیٹھ کے لے کے آیا ہے۔

یارانِ رفتگان کو کیا روتے ہو مسرت

کیا تم روانہ سوئے ملک عدم نہ ہوگے

اگر رونے سے کچھ فائدہ ہو تو خیر یہ آرزو بھی نکال لے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال

صد سال می توان تمنا گریستن

جہاں آرا بہن اور گیتی آرا بہن کی خدمت میں بندگی۔ حضور اگر بڑی بیگم کو اگر یاد رہوں تو جھک کے آداب کہدینا۔

یہ خط لکھ کر آزاد نے روانہ کیا۔ ادھر بیگم صاحب نے مرزا صاحب کو بلوایا اور یوں باتیں کرنے لگیں۔

بیگم صاحب نے اپنے پیارے شوہر سے بصد ادائے ناز آفریں نہایت شیرینی کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ مرزا صاحب ایک تو یوں ہی اپنی بیوی کو دل سے چاہتے تھے دوسرے اس پر طرہ یہ ہوا کہ مشاطہ سحر کار نے جوبن کو رشک حسن پری کر دکھایا۔

بیگم :۔ اف فوہ۔ آج اللہ نے منہ مانگی مراد دی۔ اس کی کریمی کے صدقے۔ اس وقت جی بہت خوش ہے ایک تو آزاد کے آنے کی خوشی۔ دوسرے وہ جو کھٹکا تھا کہ ان دونوں سے جو کچھ ہے وہ بھی اب جاتا رہا۔ دونوں نیک ہیں بیچاریاں۔

مرزا :۔ آج ڈومنیوں کا گانا تو سنا دو۔

بیگم :۔ اے ہم رت جگا کرنے والے ہیں۔ میں نے تو سویرے ہی تم سے کہدیا تھا کہ رتجگاہ ضرور کروں گی اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہوگی۔

مرزا :۔ ہمیں اختیار ہے ناز تو ہم نے بھیجدیا بڑی بیگم کے نام اور آزاد نے حسن آرا کو خط بھیجا ہے کہ ہم بمبئی داخل ہو گئے۔

بیگم صاحب نے اسی روز سے رت جگے کی تیاریاں کیں۔ صبح کو اعزہ کو بلوایا۔ کسی کے ہاں سے ماش تیل صدقے کے لئے آیا۔ کسی نے پیسے بھیجے۔ کسی کے ہاں صدقے کے روپے خاصدان میں لگا کر آئے۔ عمدہ خانم خواص کو حکم دیا کہ جا کے سب عزیزوں کو بلا لاؤ، وہ سب رشتہ داروں کے ہاں گئی۔ کہا آج رت جگاہ ہے آپ کو بلایا ہے چار گھڑی دن چڑھے مٹھائیاں لے لے کے سب آئیں۔ چہل پہل ہونے لگی۔ داروغہ کو حکم دیا کہ میراثی شکر اندر بھیجدو۔ کل سامان باورچی خانے میں بھیجا گیا۔ مالن بلوائی گئی۔ سہرہ لانے کا حکم ہوا۔ نہایت نادر سہرہ بنا کر لائی۔ ایک لڑکوں کی۔ مقیش کے پھندنے لگے ہوتے سہرے کا سرا کارچوبی بنا ہوا۔

ادھر گلگلے پکنا شروع ہوتے اور گھر کی عورتوں نے اللہ میاں کی سلامتی گائی۔ مع پردار سلامت۔ سلامت بلند آزاد سلامت، سلامت باشد۔

بیگم :۔ آج کا دن اللہ نے بڑی بڑی منتوں کے بعد دکھایا۔

ہجولی :۔ ہیں کہاں۔ کسی پردے اردے یا کھڑکی یا روشن دان سے دیکھ سکتے ہیں۔ سنا لڑائی پر گئے تھے۔ وہاں بزن بول کے آتے ہیں۔

بیگم :۔ تصویر دیکھوگی یا سچ مچ کی صورت۔

ہجولی :۔ سچ مچ کی صورت ہو تو اور بھی اچھا۔

بیگم :۔ تو بلوالوں۔ سامنے نکلوگی ان کے۔

ہجولی :۔ اوئی اور سنو۔ جان نہ پہچان۔

خالہ جی سلام۔

بیگم :۔ اچھا آؤ۔ ہم دکھادیں۔ زیبن ذری ان کے کانوں میں جاکے کہدو کہ باغ میں آزاد کو لے کے ٹہلیں تو دکھادوں

زیبن نے باہر جاکر مرزا صاحب کے کان میں آہستہ سے کہا۔ حضور ان کو لے کر ذری باغ میں چہل قدمی کریں۔ دو چار صاحب دیکھنے والی ہیں۔

مرزا :۔ حضرت آئیے باغ میں ذرا گلگشت کریں۔

آزاد :۔ کیوں زیبن نے کچھ آپ کے کان میں کہا ہے۔ بیشک۔

مرزا :۔ (مسکراکر) ہو بڑے خوش قسمت استاد۔

راوی :۔ آپ ایسے سادہ لوحوں کی سلامتی مقدم ہے۔

آزاد :۔ بتائیے تو آخر ماجرا کیا ہے باغ میں لے جاکر کیا ہوگا

مرزا :۔ دو ایک رنگین طبع آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔

آزاد :۔ بسم اللہ مگر خالی خولی دیکھنے سے بندۂ درگاہ کی تشفی نہ ہوگی۔ اس قدر آپ مہربانی کر کے کہلا بھیجیں۔

مرزا :۔ اس کے کیا معنی۔ بدنیتی اب تک نہ گئی خداوند۔

آزاد :۔ نہیں حضرت بدنیتی نہیں رونمائی چاہئے۔

قانع بہ تجلی نشود شائق دیدار
پروانہ بمہتاب تسلی نتواں کرد،

آزاد مخرج نہاد مرزا صاحب کے ساتھ باغ میں آئے تو وہ شوخ طبع بیگم صاحب دیکھ کر بولیں۔ بہن تمہارے بہنوئی صاحب تو بدو در ہزار میں ایک ہیں۔ جبھی دو دو دان کے ساتھ چلی آئیں۔ میں بھی کہتی تھی۔ اللہ یہ کیا باعث ہے اب بھید کھل گیا نہ کہ خوش رو اور بڑے ہنس مکھ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ تم سے تو گھر کا رشتہ بھی ہوگا۔ بیگم صاحب نے

دیسے دانتوں کہا، ہاں، گھر کا رشتہ ہی ہے۔ آزاد بھی دزدیدہ نگاہ دیکھتے تھے، مگر دروازے کی بلندی کے سبب سے اچھی طرح صورت نہیں دکھائی دیتی تھی۔

اب منے کو مس کلیرسا اور مس میڈا اور آیا اور پارسی لیڈی میں ہندوستانی رسوم کی نسبت باتیں ہوتی تھیں۔ اور اکثر امور کا ذکر سن کر ان دونوں کو حیرت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی بیگمات کی پوشاک کی نسبت بھی سوالات کرتی تھیں۔

اتنے میں آزاد نے ان دونوں کو باغ میں بلوایا اور کلیرسا کو دیکھتے ہی مرزا صاحب یہ اشعار زبان پر لائے ؎

کچھ دار و مدار پر کب تلک یوں
بس جام میں بھر شراب گلگوں

پھر لب سے مرے اسے لگا دے
شاغر کئی متصل پلا دے

ساقی ہیں یہ روز ہائے گلگشت
ہے غیرت باغ ہر بر و دشت

اب دور فلک سے دل ہوا شاد
ہے نام حمل کا مہر آباد

ہیں جلوہ نو بہار کے دن
بد مستی بادہ خوار کے دن

تزئین سمن کے ہیں یہ اندام
گلگشت چمن کے ہیں یہ ایام

کیا رنگ چمن بہار پر ہے
عالم گل و لالہ زار پر ہے

آیا ہے نظر جو سرد بستاں
شمشاد کھڑا ہے سخت حیراں

اور دیکھ کے جلوہ ہائے شمشاد
یابت طرب سرد آزاد

ہے وجد فزا نوائے بلبل
قربان ترانہ ہائے بلبل

دلکش ہے غضب صدائے قمری
کیا چیز ہے، ہائے ہائے قمری

شام کو خوب دھما چوکڑی مچی۔ تمام شب ڈومنیاں گاتی رہیں۔ چار بجے رات کو منھ ہاتھ دھو کر داروغہ کو حکم دیا کہ سینی میں گل گلے لگاؤ اور پلیٹ میں چاول اور بالائی کے رحم رکھو اور چوک بنا کر قاب میں رکھو اور اس کو گھی سے بھر دو۔ خلدار نے چوک بنائی، ناڑے کی چار بتیاں بنا کر چوک میں رکھیں اور گھی سے لبالب بھر دیا۔ ایک پلیٹ میں سہرہ اور پھول رکھے گئے۔ ایک پلیٹ میں نذر کے پانچ روپے کشتی میں کل اشیاء قرینے کے ساتھ رکھی گئیں۔ اس پر کشتی پوش خوان میں سینی رکھ کر مہری کو دیگی فینس لگائی گئیں۔

سواریاں صبح ہوتے ہوتے مسجد میں داخل ہوئیں۔

مس کلیرسا اور مس میڈا فٹن پر سوار تھیں۔ آزاد اور مرزا صاحب سامنے بیٹھے تھے۔

کلیرسا۔ اس ملک کی عورتوں کی نسبت ہماری رائے غلط تھی۔

آزاد :- کس امر میں. حسن وجمال میں یا عقل وفہم میں ؟

کلیرسا :- ہم سنتے تھے کہ ہندوستان کی عورتیں بالکل نااہل اوران پڑھ ہوتی ہیں، اور شکل وصورت میں بھی اچھی نہیں ہوتی مگر ہم نے مرزا صاحب کی بیوی اوران کی بہن بیگم صاحب اور دو تین اور عورتوں کو دیکھا دیکھا تو سرخ و بلند پایا۔

آزاد :- شرفا کی عورتیں بہت فہمیدہ ہوتی ہیں. مگر ہاں یورپ کی لیڈیاں کی طرح تربیت یافتہ نہیں ہوتیں۔ پڑھی لکھی بہت کم ہیں اور جو پڑھی لکھی کہلاتی ہیں وہ بھی واجبی ہے واجبی لیاقت رکھتی ہیں۔

کلیرسا :- مرزا صاحب کی بیگم صاحب سے ہم بہت خوش ہوئے۔

مرزا :- وہ بھی آپ سے بہت خوش ہیں۔ تعریف کرتی تھیں۔

کلیرسا :- خندہ پیشانی، فہمیدہ، ذی لیاقت۔

مرزا :- ہاں. خدا کا شکر ہے خوبصورت بیوی بڑے خوش قسمتوں کو ملتی ہے اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہوگی؟ ؎

زن نیک وخوش سیر وپارسا کند مرد درویش را پادشا

میڈا :- (کسی قدر بچا کر) اگر یہ بات صحیح ہے تو ہمارے نزدیک آزاد سے زیادہ خوش نصیب دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

آزاد :- (قہقہہ لگاکر) اس میں شک نہیں۔

مرزا :- اور لطف یہ کہ فضل خدا سے دونوں جمیلہ۔

کلیرسا :- بیگم صاحب نے مجھ سے کہا کہ جس بے تکلفی سے آپ دونوں اس قدر دور دراز کے سفر میں آئی ہیں۔ اس قدر بے تکلفی ہمارے ملک کی عورتوں سے محال ہے مگر مجھے حیرت ہے کہ مرزا صاحب ہماری تقریر کیونکر سمجھے۔

آزاد :- اشارے سے اور آدمی تیز فہم ہیں ہی۔

اتنے میں فٹن مسجد میں داخل ہوئی اور فنینین سامنے سے نمودار ہوئیں۔ دستیاں روشن۔ روشن چوکی بجتی، ہوئی ملّا اذان کہہ رہا تھا۔ جب اذان سے فراغت کی تو مہریلوں نے کہا۔ مولوی صاحب آپ باہر تشریف لیجائیے۔ زنانی سواریاں اتریں گی۔ مولوی صاحب خوش ہوگئے۔ باچھیں کھل گئیں۔ حجرے میں آکے بیٹھے۔ عورتیں اتریں۔ طاق میں سہرا باندھا گیا۔ چومک روشن کی، اور اللہ میاں کا طاق گلگلوں سے بھرا۔ چربی کی چار بتیاں لال اور سبز روشن کیں۔

بیگم :- اے کیوں بہن۔ یہ دونوں میمیں بھلا کیا سمجھتی ہوں گی۔

خانم :- سمجھتی بوجھتی تو کیا ہوں گی بھلا۔ یہ کہو کہ اپنے دل میں ہنستی تو نہ ہوگی۔ انھوں نے یہ باتیں کہاں دیکھی ہوں گی

آیا :۔ اور ہنسی کا ہنسنے کا بات ہیں۔ اپنا نات، اپنا رسم۔ اپنا ملک ہنسنے کا بات ہنیں کچھ۔

کلیرسا :۔ کیا کہتی ہیں۔ ہماری نسبت کچھ گفتگو ہو رہی ہے؟

آیا :۔ ہاں کہتی ہیں کہ آپ اپنے دل میں ہنستی ہوں گی۔

کلیرسا :۔ ہنیں سمجھا دو کہ ہم لوگوں میں بھی ایسی رسمیں اکثر ہوتی ہیں۔ اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

بیگم :۔ (آیا سے) کہو کہ آپ کو بھی ہماری خوشی میں شریک ہونا لازم ہے آپ دونوں مل کے جئیں۔ مگر گھر پر چل کر۔

خانم :۔ یہ کیوں۔ گھر پر کیا فرض ہے یہاں کیا حرج ہے؟

بیگم :۔ مولوی صاحب سے پوچھ لو ان کو ناگوار تو نہ گذرے گا۔

مولوی صاحب نے کہا یہاں تو میں پسند ہنیں کرتا مگر ہاں زینون سے اتر کر وہ جو صحن ہے وہاں اگر یہ رقص کریں تو کچھ مضائقہ ہنیں۔ وہ مقام بالکل علیحدہ ہے۔

مس میڈا اور مس کلیرسا کو بیگم صاحب سب کے ساتھ اس مکان میں لے گئیں اور وہاں ایک عمدہ مقام پر ان دونوں، محور بنا بد فریب نے یہ لحن دادری گانا شروع کیا۔

مرزا :۔ دونوں علم موسیقی کی استاد ہیں۔ ایک رشک نکیسا ہے ۔ تو دوسری باربونر زاد۔ کیا نور کا گلا پایا ہے جس طرح گل باد نسیم سے کھل جاتا ہے اسی طرح میرا غنچۂ دل ہے صورت دل کش سے کھل گیا۔ تال سم سُر سے کتنی درست ہیں۔ اس وقت کا سماں بھی خوب بھی روح افزا پھول، ہر سمت بار آور درخت، ہری بھری شاخیں جھوم رہی ہیں۔ ارے باوجود کہیں ان دونوں کو ہندوستانی سکھائی جاتے تو اور بھی زیادہ لطف ہو۔

آزاد :۔ ان دونوں میں کلیرسا خوب گاتی ہیں۔ تمام روس میں اس بت جادو نگاہ کی خوش آوازی کی دھوم ہے اور رقص میں میڈا اچھی ہیں۔ ان دونوں نے تعلیم پائی ہے۔

مرزا :۔ مگر یہ سب کچھ ۔ اس بے چاری کو سمجھاؤ تو کہ اپنی زندگی مفت میں کیوں تباہ کرتی ہے۔

ساقی مے سرخ رائیگاں ہے ۔ خم بھر دے کہ چشم خوں فشاں ہے

ایکبارگی آگئی خموشی ۔ بد مستی شوق سرگران ہے

کس پردہ نشین نے تیز دیکھا ۔ اس جوشش پہ راز دل نہاں ہے

آن شوخ چمنان ربود از من

گوئی کہ دلم نبود از من،

آزاد :۔ واللہ مجھے حیرت ہے کہ وہ کون لوگ ہیں، جو انگریزی علم موسیقی کو پسند ہنیں کرتے۔ بندہ تو دل جان سے عاشق ہے

مرزا :۔ اجی ان کے گانے کو بُرا کہے وہ کافر۔

آزاد :۔ یہ کیا کفر کی باتیں زبان سے نکالتے ہو (مسکرا کر)

مرزا :۔ واہ ــــ کفر کیسا اور ایمان کیسا؟

سن اے مومن یہ ایمان ہے ہمارا

نہ کہنا کفر پھر عشقِ بتاں کو

بڑی دیر تک رقص و سرور کی محفل آراستہ رہی۔ بیگمات نے بھی کاہے کو اس قسم کا ناچ دیکھا تھا۔ ان دونوں حسینانِ فرنگ کے رقص نے کمال مسرور و محظوظ کیا۔

بیگم :۔ عجیب طرح کا ناچ ہے۔ بھاؤ بتانے سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

خانم :۔ ہم نے تو آج ہی دیکھا، بہن پہلے پہل۔

زمین :۔ جب مرد کے ساتھ ناچتی ہیں، تو یوں خالی خولی ناچنا، ان کی نزدیک کون بات ہے ہم کو تو یہ ناچ نہیں بھاتا

مہری :۔ اپنی اپنی پسند ہے کسی کو کوئی ناچ پسند آتا ہے، کسی کو کوئی ناچ مگر ناچ واچ تو ایک طرف، ان کی جوانی کی امنگ اور چست لباس اور شوخی البتہ اس قابل ہے کہ بادشاہ وزیر تک ان کا دم بھرنے لگے اور کیسا ہی پرہیزگار کیوں نہ ہو، ان کا لوہا مان جائے۔

رقص کے بعد مس کلیسا نے بیگم صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور مسجد کے صحن میں آئیں، یہاں سب عورتوں نے سجدے کئے۔ طاق کی بلائیں لیں، سہرے کی بلائیں لیں۔ خواص نے طاق سے سات گلگلے اٹھا کے پلیٹ میں رکھ لئے اور بیگم صاحب نے نذر کے پانچ روپے رکھ دیئے اور حکم دیا کہ چلنے کی تیاریاں ہوں۔

خواص :۔ مولوی صاحب چراغی کے روپے رکھے ہیں۔

مہری :۔ اب آیئے ہم جاتے ہیں۔ سب دیکھ بھال لیجئے۔ عورتیں سوار ہوئیں۔ آزاد اور مرزا صاحب مس میڈ اور کلیسا پھر حسب سابق فٹن پر سوار ہو کر چلیں۔

مرزا :۔ آزاد صد شکر کہ اردو یہ نہیں سمجھتی ہیں، مگر

آزاد :۔ چپ رہو صاحب۔ شاید تاڑ جائیں۔ دل کو سمجھاؤ۔

مرزا :۔ بجا۔ دل ہی قابو میں ہوتا تو پھر کیا تھا :ـــ

ناصح ناداں یہ دانائی نہیں	دل کو سمجھاؤں میں سودائی نہیں
کس توقع پر امیدِ وصل اب	طاقتِ صبر و شکیبائی نہیں
دعویٰ حسنِ جہاں سوز اس قدر	پھر کہو گے تم میں ہرجائی نہیں

گر نہیں ملتے ملوں گا غیر سے
کیوں مجھے کیا پاس رسوائی نہیں،

اب سنیئے ٹھیک جس وقت میاں آزاد حسن آرا کے نام خط لکھ رہے تھے حسن آرا انکو خواب میں دیکھ رہی تھیں بیدار ہوئیں تو شوق نے گدگدیا اور خط لکھنے بیٹھیں :-

صد حیف سینہ سوز فشاں کا اگر نہ ہو
یاں جان پر بنی ترے دل میں اثر نہ ہو

جب سے گوری سدھ ہی نہ لی تھی، کیوں کٹھن کٹھور کسی نے آج تک معشوق سے یہ بے اعتنائی بے وفائی کی ہوگی :-

کوئی بھی اس طرح جلاتا ہے | کوئی بھی اس قدر ستاتا ہے
کوئی بھی اتنا بھول جاتا ہے | یہی رہ رہ کے جی میں آتا ہے

میں بھی پروا تری ذرا نہ کروں
رہوں تو عاشق و لے وفا نہ کروں

وہ جو ہمدم ہے تیری مہ پارہ | شوخ جیسے نجوم سیارہ
وہ بھی ہوتی چپلی ہے آوارہ | تازہ تازہ ہے شوق نظارہ

منہ سے شوخیاں ٹپکتی ہیں
آنکھیں زہرہ نما جھپکتی ہیں

میں اخباروں میں پڑھ چکی ہوں کہ حضور ایک نیم تن مس کو ہمراہ لاتے ہیں۔ مبارک ہو۔ آپ کو وہ مبارک، اس کو آپ مبارک، اس وقت میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک سیم بدن سمن عذار، ولایتی مس، باغ و بہار حضور کی زینت کنار ہے اور گلزار پر فضا میں حضور اُس پر کالہ آتش کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے ہیں اور بدلی توب چھائی ہوتی ہے جو اشعار میں نے تمہاری زبانی لب دریا والی بارہ دری میں سنے تھے وہ یاد آتے اور خواب میں میں نے دیکھا کہ اس کے لب شیریں کے بوسے لے کر وہی شعر پڑھ رہے ہو :-

کیا کیا ہی مچا رہا ہے دھوم ابر | آتا ہے مدام جھوم جھوم ابر
چل سوئے چمن بہار دیکھیں | سبزہ گل و لالہ زار دیکھیں
بیٹھیں لب آب جو پہ اک دم | پی جائیں سبو سبو پہ ایک دم
شاید اسی طرح چین آتے | جی ٹھہرے کچھ اضطراب جائے

ہائے دل بے قرار تسکین مسرور ذرا ہو جان غمگین

تزئین سمن کے ہیں یہ ایام

گلگشتِ چمن کے ہیں یہ ایام

میں نے دور سے کہا۔ جلاؤ۔ جلاؤ۔ اچھا آزاد۔ ؎

تو بھی ٹھنڈا نہ رہے جی کے جلانیوالے

کتنے ادھر ادھر دیکھ کر لوگوں سے پوچھا، یہ مصرع کس نے پڑھا۔ میں نے ایک جھاڑی میں چھپ کر یہ شعر پڑھ لیا۔

شب چو آمد ماہ ما بر بام ما

خندہ زد ہر صبح روشن شام ما

جس وقت میں سوئی تھی، مجھے تمہارا اور اس گلعذار کا تہہ دل سے خیال تھا اور اسی خیال میں غلطاں پیچاں ہو کر آنکھ لگ گئی۔ قاعدہ ہے کہ جس چیز کا زیادہ خیال ہوتا ہے اسی کو انسان خواب میں دیکھتا ہے مگر خواب میں بھی مجھ سے یہ نہ دیکھا گیا کہ غیر تمہارے ہم آغوش ہو اور میں کھڑی ترسوں۔ ؎

گو سوا شربت دیدار مرا چارہ نہیں نیز نظر تار رفو ہے دل صد پارہ نہیں

ساتھ تیرے میں پھروں ایسی بھی آوارہ نہیں کیا کہوں تاب نہیں طاقت نظارہ نہیں

کیوں بگڑے ہوئے تیور یہ تمہارے دیکھوں

کیوں ان آنکھوں سے غیروں کے اشارے دیکھوں

چھوڑ دینا تھا تمہیں جھوٹ قسم کو نہ مجھے دل سے کھونا تھا، اس اندازِ ستم کو نہ مجھے

چھوڑ دینا تھا جفائے پیہم کو نہ مجھے نیست کر دینا تھا اندوہ و الم کو نہ مجھے

قابل ترک تھی خوئے ستم آرا نہ کہ من

لائق سوختی بہ رنجش نہ کہ من

مگر خدا کی شان۔ خیر۔ ظالم کبھی خیر و عافیت سے تو اطلاع دیا کر اور سچ تو یوں ہے کہ بالکل قطع محبت کر دو کر دو تو اور اچھا۔

سب سے گذرے تو کسی کا بھی گذارا کیوں ہو

گر پڑے چشم سے جو اس سے اشارہ کیوں ہو

خدا حافظ و ناصر ہے جہاں رہو خوش رہو: ؎

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں

بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

اور اس خواب نے اور بھی مسرت کی آگ کو بھڑکا دیا:۔

شب وصل اس کے تغافل کی زلبس تاب نہیں
تلخی مرگ ہے آنکھوں میں مگر خواب نہیں،

خدا جانے یہ خط حضور کی نظر انور سے گذرے گا بھی یا نہیں؟ مگر جب دل بھر آیا تو مجبور ہو کے خط لکھا کہ ذرا دل ہی بہلے گا۔ ہائے افسوس تم اور مجھے مہینوں خط نہ لکھو اور شعلہ رووں کو لا کے مجھے آتشِ غم میں جلاؤ۔ ؎

امتحان کے لئے جفا کب تک — التفاتِ ستم نما کب تک
غیر ہے بیوفا پہ تم تو کہو — ہے ارادہ نباہ کا کب تک

تم کو خو ہو گئی برائی کی
درگذر کیجئے بھلا کب تک

اسی خط پر اکتفا کرتی ہوں۔ کبھی امید تھی کہ اب سرخرو ہو کر ولایت سے واپس آتے ہیں۔ لطفِ صحبت اٹھے گا مگر۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دودسے سیاہ شعلہ شمع زاوری،

خدا جانے اس عشق کی بدولت، ہماری قسمتوں میں کیا لکھا ہے اور کیا ہوتا ہے ہرچہ بادا باد:۔ ؎

الغرض ہے چمن عشق عجب آفت خیز — مدتوں ہم کو رہا اس کی ہوا سے پرہیز
آخر کار ہوئی بوئے گل شوق جو تیز — رنگ الفت نے جتایا کہ رہی راہ گریز

گل یہ پھولا نہ رہے اور کسی کام کے ہم
بندۂ عشق ہوئے ایک گل اندام کے ہم

آخر سوچو تو کہ پہلے چوڑے وعدے کر کے ایسی طوطا چشمی تم کو کب زیبا تھی۔ اب اگر اُس پر کالہ آتش کے ساتھ شادی ہو گئی ہے تو میری زندگی تم نے تلخ کر دی۔ میں لونڈی بن کے رہوں۔ یہ انہونی بات ہے اول تو مجھے رہ رہ کے یہ خیال آتا ہے کہ آزاد تم سے نکاح کر کے روم جائیں اور وہاں خوبصورت سی عورت پسند کر کے شادی کر لیں اور گلچھرے اڑائیں:۔ ؎

از یارانِ چشم یاری داشتیم
خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم،

اسی خیال میں دن رات غلط و پیچاں ہوں کہ یا الٰہی آزاد کی طبیعت اس قدر کیونکر بدل گئی۔ اس کایا پلٹ کا خدا ہی حافظ ہے سچ ہے۔ ؎

حسینوں کی کیا بات کا اعتبار	کدھر کی طبیعت کدھر ہو گئی

اگر تم مجھ کو اور اس کو برابر بھی سمجھو، اور عدل بھی کرو تو بھی یہ خیال میرے دل سے نہ جائے گا کہ تم نے مجھ سے اس قدر اظہارِ محبت کر کے مجھے پھندے میں پھنسالیا اور پھر اوروں سے دل ملایا:۔

اوّل تو مرا مدام خویشش آوردی	صد گونہ وفا و مہر پیش آوردی
چون دانستی کہ دل گرفتار تو شد	بیگانگی تمام پیش آوردی

آزاد جو محبت تم کو ہم سے پیشتر تھی، اس کی قسم ہے آخر تم ہم سے اس قدر خلاف کیوں ہو گئے ہو۔ خیر۔ وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ ایک بات یاد رکھو، جب تک ہم کو تسلی نہ ہو گی اور ہم کو بخوبی ثابت نہ ہو جائے گا کہ تم نے دوسری شادی نہیں کر لی، تب تک اس طرف آنے کا قصد نہ کرنا۔ میں نے تمہیں روم اس غرض سے بھیجا تھا کہ تم نام نیک حاصل کر کے آؤ گے۔ مگر تم نے وہ نام حاصل کیا کہ دل ہی جانتا ہے واہ۔ واہ۔ بس۔ دیکھ لیا ہائے میں نے بے سمجھے بوجھے دل دیا۔ اب عمر بھر رنج اور غم نہ ہونگے راس عشق کو خدا غارت کرے۔

یہ وہ ہوتی ہے لڑی جس کی طبیعت اس پر	آبرو کھو کے ہوا خاک یہ غلطان وہ بشر
یہ وہ یاقوت ہے رلواتے جو خون آٹھ پہر	یہ وہ الماس ہے ٹوٹکرے ہو خود جس سے جگر

آتش اس لعل کی گر آب میں پیدا ہو جائے
دفعتہ جل کے گہر سیپ میں چونا ہو جائے

یہ وہ بدنام ہے لے اسکا اگر صبح کو نام	شام تک کھائے غم و غصہ غذا ہووے حرام
اس کے اوصاف کا لیوے جو دہن میں کوئی کام	شمع کیطرح زبان منہ میں جلے وقت کلام

اس پتنگے سے زمانے کے جگر جلتے ہیں،
گو پریزاد بہت دور ہیں پر جلتے ہیں،

سپہر آرا بے چاری بھولے پن کے سبب سے کہتی ہے باجی جان یہ سچ نہیں ہے۔ سب جھوٹ ہے، لوگ ناحق لڑوانے کے لئے گپیں اڑاتے ہیں مگر میں اسے کیا کہوں کہ میں اخباروں میں صاف صاف پڑھ چکی ہوں۔ خیر۔ ع۔

تھوڑا لکھنا بہت سمجھنا۔
راقم

سب چو آمد ماہ کا بر بام ما
خندہ زد بر صبح روشن شام ما

یہ خط لکھ کر پیر مرد کو دیا اور کہا اپنے ہاتھ سے ریل کے ڈاکخانہ میں ڈال آؤ جا کے۔ خبردار گم ہو گا تو عمر بھر نہ بولوں گی۔ رجسٹری

کرا کے بھیجنا۔ یہ خط حسن آرا بیگم نے اپنی بہن کے پاس بمبئی بھیجا کہ ان کی روانگی کا تار آیا ہے۔ بمبئی میں آکر تم سے ملیں تو یہ خط دیکھ جواب اپنے سامنے لکھوا لینا۔ اس کے علاوہ بہن کو اور بھی اکثر باتیں لکھیں ـــــ اب سنئے کہ ادھر خط گیا، ادھر دربان نے ڈیوڑھی میں آواز دی۔ عباسی ذرا یہاں آؤ عباسی باہر گئی۔

دربان :ـــ یہ تار آیا ہے اندر اطلاع کر دو۔

عباسی :ـ تار! تو پڑھے گا کون۔ کسی انگریزی نویس کو بلاؤ۔

دربان :ـ تم جا کے گھر میں کہہ تو دو پہلے؟

عباسی :ـ (اندر جا کر) حضور ایک چپراسی تار لایا ہے۔

روح :ـ کہاں سے تار آیا ہے۔ اللہ کرے سب خیر و عافیت سے ہوں۔ اس نگوڑے تار کا نام سنتے ہی میرا کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔ پوچھ کہاں سے آیا ہے؟

تار کا نام سن کر حسن آرا، اور سپہر آرا اور روح افزا سب بیقرار اور متوحش ہو گئیں نیچے چلی آئیں۔

حسن :ـ تار کے نام سے کانپ جاتی ہوں۔ اللہ رحم کرے۔

روح :ـ عباسی کیا مر گئی موئی چڑیل۔ اے عباسی!

عباسی :ـ (ڈیوڑھی سے) آئی حضور آئی اور دربان سے) پوچھتی ہیں تار کہاں سے آیا ہے کچھ معلوم ہے؟

دربان :ـ ارے میاں تار کہاں سے آیا ہے میاں جوان۔

چپراسی :ـ اب لے ہمیں کیا معلوم دستخط کر دو چلے جائیں اب دیر ہوتی ہے صاحب خفا ہونے لگتے ہیں کہ کہاں تھے؟

دربان :ـ (ایک لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر) خوب آئے جناب آپ ذری یہ تار تو پڑھ دیجئے گا۔

راوی :ـ اتنے میں عباسی مع تار کے اندر گئی۔ کہا حضور یہ تو اس کو معلوم نہیں مگر تار لے آئی ہوں۔

مغلانی :ـ اے یہ تو کاغذ ہے حضور تار کہاں ہے؟

عباسی :ـ اور سنو۔ اسی کو تار بولتے ہیں صاحب۔

حسن :ـ (مارے عجلت اور وحشت کے لفافے کو چیر کر) لفافہ تو لال ہے اور خط کا کاغذ سفید چکنا۔

عباسی :ـ حضور کسی کے ہاں شادی بیاہ ضرور ہے یا چاہے ختنہ ہو، یا لڑکا پیدا ہوا ہو۔ دربان سے کہدیا ہے کہ انگریزی نویس کو بلا لائے۔ اب سنیئے کہ میاں صاحبزادے جو خط پڑھنے آئے تو تار ندارد۔ عباسی غائب۔ پکارا وہ تار لے آئی۔

دربان :ـ حافظ جی کے لڑکے اسوقت خوب مل گئے ہیں پڑھو تو بھائی کہاں سے تار آیا ہے۔

بلبن :ـ بھیجا فرام بمبئی۔ یعنی بمبئی سے یہ تار آیا ہے۔

عباسی :۔ کس کے نام بھیجا ہے اور کس نے بھیجا ہے۔
بہن :۔ بمبئی سے آیا ہے۔ اب مضمون یہ ہے کہ آزاد پاشا داخل بمبئی ہوئے اور یہاں فروکش ہوئے اور علماء بمبئی کی طرف سے ان کی خدمت میں ایک ایڈریس دیا جائے گا اور ایک ہفتہ میں روانہ ہوں گے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ آزاد پاشا خوش و خرم اور صحیح و سالم ہیں۔ عباسی دوڑتی ہوئی اندر آئی کہا حضور مبارک ہو آپ کی بہن کا تار بمبئی سے آیا ہے۔ لکھا ہے کہ آزاد پاشا سفر کر کے یہاں آئے ہیں اور اللہ کے فضل سے خوش ہیں۔ اب وہ ایک ہفتے میں روانہ ہوں گے۔

حسن آرا بیگم اس مژدۂ روح افزا کے سنتے ہی اس قدر مسرور ہوئیں کہ باوصف کوشش اخفا کی نہ کر سکیں بے اختیار ہنس پڑیں مگر فوراً ضبط کیا۔

روح :۔ تو مبارک ہو بہن مبارک ہو۔ آج ہم نے کہا ہی تھا کہ کوئی نہ کوئی خوش خبری ضرور سنیں گے۔ سویرے اٹھنے کے ساتھ ہی بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ اماں جان سے کہا وہ بولیں۔ اللہ نے چاہا تو کوئی اچھی خبر آئے گی۔

عباسی :۔ افوہ۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کے روز ہاتھ اٹھا اٹھا کے دعائیں مانگیں۔ بارے اللہ نے سن تو لی غریبوں کی۔

مغلانی :۔ غریبوں کا خدا فریاد رس ہے۔

عباسی :۔ سنا بڑے خوبصورت گبھرو ہیں۔ خدا مبارک کرے۔

جس طرح غنچہ گل ہوائے نسیم سے کھل جاتا ہے اس طرح حسن آرا بیگم کا دل اس نوید مسرت خیز سے شگفتہ ہو گیا۔ روح افزا سے کہا بہن ہم نے ناحق یہ خط بھیجا۔ خدا کرے بہن نہ دکھائیں مگر ہم کو اس بات کا بڑا کھٹکا ہے کہ آزاد اپنے ساتھ ایک پری جمال مشتری خصال، دوشیزہ حسینہ کو کیوں لائے۔ آگ اور پھوس کا ساتھ کیا۔ ایسا پارسا، تو ہم مردوں میں کسی کو نہیں دیکھتے، اگر شادی کرنی ہے تو چاہیے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے بندی عمر بھر بن بیاہی ہی رہے گی اور جو شادی نہیں ہوئی ہے تو ہم کو یہ بتا دیں کہ ساتھ کیوں لاتے؟ بارے خیر۔ صحیح سلامت آگئے وہ بھی سرخرو ہوئے اور اللہ نے ہمیں بھی سرخرو کیا۔ اب تک آزاد کا راسخ قول تھا۔ میرے ذرا سے اشارے میں ہندوستان وطن، اعزہ۔ اقربا۔ احباب چھوڑ کر غربت اختیار کی اور غربت کیسی۔ ہر دم جنگ۔ ادھر توپ اُدھر تفنگ، ؎

صبر خیال و خواب زمانہ ۔۔۔ مشغلہ خواب و خواب فسانہ
عیش وطن اندوہ غریبان ۔۔۔ دست جنون سے چاک گریبان
پاؤں سے اپنے نہ اٹھاتے ۔۔۔ شوق مغیلان تلوے کھجائے
وحشت سیر گلستاں سے خفقان
دیکھ کے جدول اشک رواں ہو،

مصیبت تو بیچارے نے بڑی اٹھائی مگر آخر میں قدم ڈگمگا گئے۔ ثابت قدم رہنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ واہ آزاد واہ۔

روح :۔ بہن یہ کاہے سے ثابت ہوا کہ کسی فرنگن کو روس سے ضرور لائے ہیں۔ کیا اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہو۔ سنی سنائی ہی کہتی ہو نہ پھر۔ مصرع :

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

سننے اور دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

حسن :۔ بہن ایک نہیں دس اخباروں میں پڑھ چکی، اب کیونکر یقین نہ آئے۔ ایک اخبار پڑھتی تو کہتی کہ غلط۔ دو میں یہ خبر درج ہوتی تو سمجھتی کہ جھوٹ ہے۔ جب کوڑی بھر اخباروں میں ہو تو کوئی کیونکر شک نہ کرے آئندہ۔ واللہ اعلم بالصواب

روح :۔ سچ کہتی ہوں حسن آرا بالکل غلط سراسر جھوٹ ہے

حسن :۔ اللہ کرے جھوٹ اور بے بنیاد خبر ہو۔ آمین۔

بہار :۔ وہ خبر بھی تو اخبار ہی میں درج ہوئی تھی کہ آزاد نے سایئں گھر ڈال لی۔ شاید اسی طرح یہ بھی کسی نے چھوڑ دی ہو اس کا ثبوت کیا ہے بھلا۔

حسن :۔ ہم تو آزاد کو مرہم زخم دل، اور چارہ گر مریض غم سمجھتے تھے، مگر وہ نمک پاش جراحت نکلے۔ مصرع

تو بھی ٹھنڈا نہ رہے جی کے جلانے

ہی جستجو نے کبھی یار سعی رو عدم　　　اے شوق دیکھئے کہ پہنچوں کہاں تلک

تاثیر کو بھی آ گئی موت اسکے ہاتھ سے　　　کھایا کروں امید اثر میں کہاں تلک

اس زندگی سے میرا دم آیا ہے ناک میں　　　آخر تحمل قلق و غم کہاں تلک

جب روم میں تھے تو جان کے لالے پڑے تھے۔ یا الٰہی کیا جانے کس میدان میں بلا خیز میں مورچے پر لڑ رہا ہوگا یا خدا کس دشت جنوں انگیز میں برسر پیکار ہوگا۔ واللہ اعلم کن کن مصیبتوں میں گرفتار ہوگا، کس کس خطرے سے دوچار ہوگا۔ سوچتی تھی کہ مجھے کیا سوجھی، بیٹھے بٹھائے اس گلبدن جوان رعنا کو اجل کے منہ میں کیوں بھیجا۔ بڑی رسوائی اور جگت ہنسائی ہوگی۔ اب جو خدا خدا کر کے واپس آئے تو سمجھی تھی کہ آب رفتہ جو میں آیا۔ بچھڑے ہوئے کو خدا نے ملایا مگر گل کے پہلو میں خار، کیا خزانے پر مارے کنچے دار، یہ کیا خدا جانے وصل ہو یا نہ ہو۔

وصل جانان کہاں سوائے خیال　　　ہم ہیں مایوس امیدوار رہے دل۔

روح :۔ تو بمبئی سے حال دریافت کرو۔ فلک آرا کو سب حال کب کا معلوم ہو گیا ہوگا۔ جب فروکش ہی وہاں ہیں تو کیا ان پر یہ حال مخفی رہ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

حسن :۔ ہمارا دل تو قابو میں نہیں۔ وہ آخر خط پڑھیں ہی گی۔ آپ ہی سب کچا چٹھا لکھ بھیجیں گی ہے کہ نہیں؟

روح :۔ نہیں۔ تم خود دریافت کرو۔ بہن کے نام لکھو۔

حسن :۔ اچھا اگر شادی کر ہی لی ہے تو یہاں پھر کس منہ سے آئیں گے بھلا اور اگر شادی نہیں کی ہے تو بینگ آئیں گے مگر دال میں کالا کالا ضرور ہے۔ میں لاکھ دل کو ڈھارس دوں، وہ خود ہی آئیں گے اور نہ بلائیں گے۔

نہ بلائیں گے وہ نہ آئیں گے　　　جوش لبیک و مرحبا کب تک

بہار:- اچھا تو اس جھنجھٹ سے تو یہی اچھا کہ خط لکھ بھیجو۔

حسن:- بہت خوب۔ پیاری ذری قلمدان لے آؤ۔

حسن آرا بیگم نے آزاد کے نام ذیل میں مختصر و موزوں خط اسی دم لکھا۔ وہو ہذا:-

کھولیو ساقی منہ کو سبو کے، پیتے ہیں کب سے گھونٹ لہو کے
جام شراب احمر بھر دے چشم بھر آئی ساغر بھر دے
چپ ہو سن آواز کسی کی، آہ فلک انداز کسی کی
شور فگن ہے بانگ تنظلّم صور شکن ہے بانگ تنظلم
غور سے سُن فریاد ستمکش جلد کہیں دے داد ستمکش
مست شراب غم کی خبر لے سینہ کباب غم کی خبر لے
بادہ سر شک و چشم پیالہ ہائے ہو مستانہ ہے نالہ
نشۂ غم میں خال دگر ہے بادۂ الفت زہر اثر ہے،

جس طرح زہاد صد سالہ اس طمع سے دنیا کی لذتوں کو ترک کر کے یادِ خدا میں مصروف ہوتے ہیں۔ کہ اس زہد و تقویٰ کے صلے میں خدا اُن کو جنت اور حور دوراز قصور، اور شراب طہور اور نظارہ سلسبیل و کوثر عطا کرے گا۔ اسی طرح تم معرکۂ جنگ میں اس طمع سے سر کے بل گئے کہ بعد فتح حسن آرا کے ساتھ نکاح ہوگا۔ جس طرح زاہد عبادت کی سختیوں کو عین راحت سمجھ کر برداشت کرتا ہے۔ اسی طرح تم نے جنگ کی، مصیبتوں کو آسائش سمجھ کر برداشت کیا۔ یہ شعر گویا تمہارے حسب حال تھا:-

گر دون ز سخت جانی سن داغ و من ہنوز
شادم کہ سنرو صبر پس از امتحان ہنوز

مگر تم وہ زاہد ہو جو سو برس تک عبادت میں راسخ رہ کر مرتے دم افعال قبیحہ کا مرتکب ہوتا ہے اور طاعت صد سالہ کو بالکل تاراج کر دیتا ہے۔ میری حالت اب اُس مسافر کی سی ہے کہ منزل پر پہونچ کر سنے کہ جانا مشرق تھا اور وہ گمراہ مغرب چلا آیا۔ دن بھر کی محنت رائگاں گئی اور دل پارہ پارہ ہو گیا۔ خدا نہ کرے کہ میری سی مصیبت کسی پر پڑے ہے

یارب زبان مباد کہ جنبد بنام من
آنرا کہ روزگار علے شادباں دہد

مگر اب بھی اسی ظالم ستم ایجاد، آزاد دلا شاد کا دم بھرتی ہوں اور دل سے دعا کرتی ہوں کہ یارب وہ جہاں رہے خوش رہے۔ میں تو اس غم میں جان دونگی مگر میری تربت صرف اس سبب سے ہمیشہ عنبریں رہے گی کہ ایک غنچہ دہن کی یاد، اور فراق میں مری، تم کو عروس نو مبارک ہو۔ اگر شادی نہ کی ہو تو میری خاطر سے یہ ارمان بھی

دل سے نکال لو۔ جب ایک سمن عذرا شعلہ رو موجود ہے جس کو اس قدر مسافت بعید اور راہ دور دراز سے ہاتھ لاتے تو پھر دل کا ولولہ کیوں رہ جائے؛۔ ؎

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ

ترا کہ مست ہو نیا شامی از بہار چہ حظ

میرے دل کی دوا ہو گئی اور مرض کی جڑ تک کھودی گئی۔ دردِ دل کی دوا دو ہیں۔ شربت دیدار یا شربت اجل۔ جب ہر سمت سے یاسی ہی یاسی نمودار ہو تو درد دل کا دفیعہ معلوم، مگر یہ یاسی گو دردِ دل کا دفیعہ نہ کر سکے۔ دل کے ساتھ تو اکسیر کا کام کرتی ہے۔ یعنی دل ہی نہیں رہتا تو دوا کی کیا ضرورت ہو؛ ؎

یا سم زجان گزانی تخواہش نجات داد

دردم را بدانع دوا کرد روزگار،

عشق سے خدا سمجھے۔ اس خانہ خراب کا یہی نتیجہ آخری ہے ؎

عشق کے زہر سے ہی طوطیوں کا سبز بدن
عوض قہقہہ ہر کبک ہے گر شیون

تاج کے بوجھ سے ہے جھکی ہدہد کی گردن
ابلقا ابلق ایام سے پابند محن

فاختہ ہی نہیں کھو دیتی ہے کو کو کی صدا

ہی کبوتر کی بھی آواز میں یا ہو کی صدا

موج سبزہ ہے کہ تلوار ہے اس گلشن میں
رخت گل خون سے گل نار ہے اس گلشن میں

تیز کیا موت کا بازار ہے اس گلشن میں
جعفری جعفر تیار ہے اس گلشن میں

پتے پتے کو کمی خنجر بران سے نہیں

جو انا اس میں ہے گنج شہیداں سے نہیں

مگر پہلے تو عشق نے عقل کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور جب کام تمام ہو گیا تو اب یہ سمجھ آئی مگر اب کیا ہوتا ہے۔ اب ہر دم لب پر آہ سرد ہے۔ میں ہوں اور دل پر درد ہے ؎

نالہ جب کرتی ہوں ایک آگ لگا دیتی ہوں

پر نسرین فلک دم میں جلا دیتی ہوں،

روح :۔ اب بہت سخت نہ لکھنا، ورنہ اس بے چارے کا بھی یہی حال ہو گا جو تمہارا حال ہے نرم الفاظ لکھو بہن۔

بہار :۔ ان سے زیادہ بے چین وہ ہوں گے کہ وہ اس قدر مصیبتیں سہہ کے پھر بھی عروس آرزو سے ہم کنار اور مہ پارہ ستم کوش سے ہم آغوش نہ ہوئے۔

حسن :- اب اس وقت تو جو زبان قلم پر آیا وہ لکھ ڈالا۔

روح :- ہم کو سُنا دینا پھر خط روانہ کرنا۔

حسن :- بہت اچھا۔ صاف لکھا ہے ہر چہ باد اباد۔ یہ کہہ کر حسن آرا بیگم نے پھر سلسلۂ تحریر شروع کیا۔

اگر تم کو یہ خیال ہے کہ ہم جوان رعنا جمال ہیں تو ہم کو بھی غرور ہے کہ ہم بھی پری تمثال ہیں ؎

تم کو جو ہے یہ دھیان کہ ہم انتخاب ہیں

ہم کو بھی ہے خیال کہ ہم لاجواب ہیں

مگر فرق اس قدر ہے کہ تم پر حور بھی اس کے بس میں آ گئے اور ہم اب تمہارے نام پر بیٹھے ہیں۔ اگر فرشتہ بھی نظر بد ڈالے تو آنکھیں مل ڈالوں۔ تم ہر دیگچی کے چمچے ہو۔ تم سے اب اختلاط کرنا وضع کے خلاف ہے۔

نہ شاید ہوس باختن با گلے

کہ ہر بامدادش بود بلبلے

خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اگر نظر بد کا خوف نہ ہو تو اس بولی ٹھولی کار دستدرو رفتار دگھر کی پٹلکی باسی ساگ) کی تصویر کا خاکہ تو بھیجدو۔ میں دیکھوں تو کون ایسی جادو ادا ہے۔ جس پر آپ کا دل پھسل پڑا۔ ذرا میں اپنی صورت سے مقابلہ تو کروں :- ؎

ہم سے بہتر کوئی محبوب خدا کی قدرت	ہم بُرے اور وہ خوش اسلوب خدا کی قدرت
وصل اس کا نہیں مرغوب خدا کی قدرت	ہم سے یہ چال بہت خوب خدا کی قدرت

پاؤں کل پڑتے تھے کچھ آج سروکار نہیں

چھوٹے سے منہ کو بڑی بات سزاوار نہیں

ہمارا بھی خدا حافظ ہے۔ خدا کے ہاتھ بڑے بڑے ہیں۔ تمہارے سبب سے ہمارے گلستان عیش پر ابر غم چھایا۔ مہر مسرت گہن میں آیا۔ ؎

اب تو آفت میں پھنسے خیر جو ہونا تھا ہوا	کوچۂ عشق کجا منزل آرام کجا
ہے جنون جوش پہ وحشت کی ترقی ہے سوا	خیر ہو خیر ہو دیکھوں کہ ہے تقدیر میں کیا
عکس رم کرتا ہے گھبرا کے اب آئینے سے	کوئی کھینچے لئے جاتا ہے یہ دل سینے سے

میرے لڑکپن کی تصویر جس سے بھولاپن برستا ہے بہن کے پاس موجود ہے۔ ذرا اُس تصویر سے اپنے معشوق نو کی صورت ملا کر شرمایئے۔ میری تصویر خورشید ہے تو وہ ہما۔ نور اور تاریکی کا مقابلہ کیا۔ جب تم سے آنکھ لڑی تمہارا بخت سازگار تھا مگر میں بد نصیب تھی۔ میں نے کڑی اٹھائی، تم نے ولایتی بیوی پائی۔ اچھے بھلے دل

کو میں نے بٹھلائے بیٹھے کہیں کا نہ رکھا۔ کلیجہ پک گیا۔ اب باغ بھی جاؤں تو سنبل کی طرح پریشان ....

.... اور مثل گل خون در جگر۔ زیست سے تنگ ہوں اور کیونکر نہ ہوں۔ موت سے کوئی بھی خوش ہوئی

رقیباز آتش عشقش من مجور میوزم

نمی سوزی تو از نزدیک و من از دور میوزم

ایک دو نہیں۔ دس بارہ اخباروں میں پڑھ چکی کہ آزاد پاشا سلمہ روم سے کوہ قاف کی ایک پری کو ہمراہ لائے ہیں۔ ایک ہی اخبار میں پڑھتی تو کہتی کہ شاید جھوٹ کا پتلا بنایا ہے مگر سب کے سب تو کاذب اور دروغ گو نہیں ہو سکتے یا سب کو آپ سے ایسی عداوت ہو گئی کہ طوفان باندھا۔ وہاں بھی تم کو معشوقوں ہی سے پالا پڑا۔ سچ ہے:

جس سے رغبت ہو وہی شے وہ عطا کرتا ہے

منہ شکر خورے کا شکر سے خدا بھرتا ہے

اب ہمارے اور اپنے دل کا مقابلہ کرو۔ یہاں حیرانی و سرگرانی، وہاں وصال یار جانی۔ یہاں دل میں خلش خار غم۔ وہاں بغل میں معشوق برق دم۔ یہاں ہجوم یاس و نامرادی۔ وہاں خوش وقتی و شادی۔ یہاں قلق و دلفگاری، وہاں بوس و کنار اور عشوہ بازی۔ یہاں آہ شعلہ بار۔ وہاں زیب آغوش صنم شیریں کار:

یاں دل میں بھری امید دیدار — وہاں دل میں رقیب کے رو رخسار

یاں چشم کو خواہش نظارہ — وہاں غیر سے دم بدم اشارہ

وہاں بزم میں راگ ہو رہا ہو — یاں نالوں کا تار بندھ گیا ہو

وہاں غیر کے ساتھ شب گذارے — یہاں نیند نہ آئے غم کے مارے

واں وسعت خواب گاہ گلزار — یاں اپنا نصیب بستر خار

واں زانوئے غیر تکیہ سر — یاں نیچے دھرا ہو سر کے پتھر

بوسوں کے مزے عدو اٹھائیں — ہم جان سے تلخ کام جائیں

وہ مے کا سبو پیا کریں واں — ہم دل کا لہو پیا کریں یاں

ان کو ہو سرور ہم کو ہو غم — ہو عید انھیں ہمیں محرم

وہ چین سے کاٹیں اپنے اوقات

یاں دل کو رہو اضطراب دن رات

وہ دن مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ آزاد نے ایک پاجی کی جورو کے ساتھ شادی کر لی، اتنا روئی، اتنا روئی کہ آنکھیں لہو کی بوٹیاں بن گئیں۔ کہیں پاجی کی جورو اسی خام پارہ سے تو مراد نہیں ہے

جو آج کل آپ کی زینت کنار ہے۔ اس نے میرا جی جلایا ہے اور مجھے کہیں کا نہ رکھا، اس خیال نے مجھے خون رلایا تھا کہ آزاد نے ایک کمینی عورت کو گھر ڈال لیا۔ ایسی بے چین ہوئی کہ دل بھر آیا۔ اور اتنی ضعیف ہوگئی کہ سانس تک رک رک کے چلنے لگی اور اماں جان اور باجی اور سپہر آرا گھر کا گھر مردہ اور بیدم مچھ کر رونے لگا۔ وہی رنج کا سامنا اس خبر کے پڑھنے سے ہوا:۔

پھر داغ کہن ہے تازہ و تر۔ پھر زخم جگر ہنسے ہے گل پر

پھر چشم ہے خونفشاں و خونبار پھر چہرہ بنا ہے زعفران زار

پھر دیدہ تر ہے وقف داماں پھر ہاتھ ہے مائل گریبان

پھر ناوک درد دل شکن ہے پھر سینے کا زخم خندہ زن ہے

پھر داغ جنون سے سر پہ ہے گل پھر نالہ ہے ہم نوائے بلبل

پھر ہے وہی سنگ اور وہی سر پھر سر ہے وہی، وہی ہے پتھر

پھر ہمدم وہم نفس ہوئی آہ دمساز ہے نالہ سحر گاہ

گستاخ ہے آہ خونچکان پھر

منہ لگنے لگا ہے کچھ خفقان پھر

اب ہزار بات کی ایک بات ہے کہ یا تو صفائی کرو یا ادھر آنے کا رخ نہ کرو۔ ورنہ بہت پچھتاؤ گے:۔

کانٹوں میں نہ ہوا گر الجھنا

تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

فقط:۔ حسن آرا جگر فگار و غم زدہ۔

یہ خط لکھ کر روح افزا اور بہار النساء وغیرہ کو سنایا۔ گھر کی ٹیکی باسی ساگ، اس پر قہقہہ پڑا اور تصویر کے لئے خاکے کی لفظ کو سب نے پسند کیا۔

روح:۔ اور تو سب اچھا ہے مگر ذرا سخت باتیں لکھی ہیں اور اگر یہ خبر جھوٹ ہوئی تو ان کو کس قدر رنج ہوگا۔

حسن:۔ اب جو لکھنا تھا وہ لکھا۔ پیاری کسی معتبر آدمی کو دے کہ یہ خط بھی ریل کے ڈاکخانے میں ڈال آئے۔

روح:۔ اچھا پھر اب بہ عجلت بھیجا جائے گا۔

حسن آرا بیگم نے بڑی بیگم سے پوچھا۔ اماں جان اگر آپ کی صلاح ہو، ہم سپہر آرا کو آج بلوائیں اور ان کو لکھ بھیجیں کہ خوشی کا تار آیا ہے۔

بڑی بیگم نے کہا اچھا۔ اس پر بہار النساء مسکرا کر بولی (پھیری منہ میں لونی تو کیا کرے گا کوئی) حسن آرا سپہر آرا کے نام خط لکھنے بیٹھیں:۔

اب ادھر کا حال سنئے۔

آزاد پاشا نے بمبئی میں سب سے پہلے ذیل کا لکچر دیا۔ وھو ہذا:۔

اے تماشائیان بزم سخن	دے مسیحا زمان نادر فن
اے گرانمایگان عالم حرف	خوش نشینان ایں بساط شگرف
ہریکے صدر بزم بار گہے	شمع خلوت سرائے کار گہے
ہریکے پیش تاز قافلۂ	ہریکے کتمندائے مرحلہ
اے بشغل وکالت آمادہ	داد غمخواری جہاں دادہ
اے شگرفان عالم انصاف	بفارت رسیدہ از اطراف
اے سخن را طراز جان دادہ	صفحہ را ساز گلستان دادہ
عطر ہر مغز گی افشانان۔	پہلوان پہلوی دانان
اے رئیسان ایں سواد عظیم	دے فرار ہفت تعلیم ہم شدہ

اے گرامی فساں ریختہ گو

نغز دریا کشان عربدہ جو،

یاایہا السامعین۔ آج کا مبارک دن میری سوانح عمری کی تاریخ میں یاد رہے گا کہ مجھ ایسے ذرۂ بمقدار اور ناچیز آدمی کی خاطر سے اس وقت ایسے ایسے علماء اجل اور فضلاء اکمل، دانش پژدہان بالغ فن۔ امرائے غریب نواز۔ مربع نشینان چار بالش امارت، اور ہر طبقے کے احباب، اولی الالباب یہاں رونق افروز ہوئے۔ آپ سب طبیب النفس اور کامل خرد اور ہمدرد بزرگوں کی جس قدر زیادہ توصیف کروں کم ہے۔ سفلہ منش اور پست ہمت آدمی دوسروں کی ترقی جاہ دیکھ کر آتش حسد میں جلتے ہیں مگر جو بزرگوار دل پرورد اور عقیدۂ خوش اور نیک نیت رکھتے ہیں۔ وہ غریب الوطنوں سے بلطف پیش آتے ہیں اور جن لوگوں کو باحیثیت سمجھتے ہیں، اُن کی ترقی مناسب کے لئے دعا مانگتے ہیں۔

اے صاحبان ہمایوں فطرت و بزرگان والا ہمت۔ آپ کا خادم خانہ برباد جس کا نام آزاد ہے، اس وقت صدق دل سے عرض کرتا ہے کہ:۔

گر در طلب دوست بود پائے تو شست غمگین مشو	در خو باشی بہ جست وجو چابک وجست منزورشو
اخلاص بہ نسبت ست و نسبت ازلی ست چون شبنم مہر	گر جذبہ قوی فتاد و پیوند درست یخو دمے چار سو

مصرعوں پر مجید زد ہیچداں کا عمل ہے۔

میری نسبت کوتہ اندیشوں نے بہت بہت تہمتیں تراشیں اور کم ظرفوں نے بڑے بڑے جوڑ مارے مگر میں نے جادۂ نیکی

سے باہر قدم نہ رکھا اور دائرۂ اعتدال سے تجاوز نہ کیا (آفریں، آفریں صد آفریں) معرکہ روم وروس کی نسبت سے مجھے بالفعل بطریقِ خلاصہ اس قدر عرض کرنا ہے کہ گو ظاہراً سلطنتِ عثمانیہ نے ایک قسم کی شکست پائی مگر یہ شکست باعث تشیید بنائے مملکت ہوئی۔ ع۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

زیں رنگ کہ در گلشن احباب دمید — پژمردگل ولالہ شاداب دمید

در کلبۂ اقبال ترقی خواہاں

گر مہر فرو نشست مہتاب دمید

مگر افسوس صد افسوس کہ دولت قیصر روم کے اراکین واسمیان اعلیٰ کا دامن لوث تعصب وبغض وحسد سے پاک نہیں ہے (افسوس صد ہزار افسوس) روم کی رعایا روم کے جرار، اور جانباز سپاہی معرکہ رستخیز میں جان بکف جاتے تھے، قسم کھاتے تھے اور قرآن اٹھاتے تھے کہ غنیم کو پشت نہ دکھائیں گے۔ (بارک اللہ) ماریں گے اور مر جائیں گے (خدا اجر دے گا) چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جس وقت غازیانِ دین اللہ اکبر کہہ کر شمشیر الماس بار، تبر خارا شگاف ہاتھ میں لے کر بزن بزن اور فاقتلوا فاقتلوا کہتے ہوئے میدان میں جاتے تھے۔ جرأت ان کی بلائیں لیتی تھی۔ (شاباش)۔۔۔ بسالت دل سے دعائیں دیتی تھی۔ ادھر للکار اور کوچ کا حکم ہوا ادھر ع۔ ؎

لولی یہ تیغ دم صفر اعدا پہ لونگی میں ،

برش پکاری تو یہ ٹھہرنے نہ دوں گی میں

روم کے سپاہیوں کی جرأت یادگار تاریخ رہے گی، ایک ایک سپاہی کو زعم تھا کہ غنیم کے ہزار ہزار کو کاٹ کے مروں گا۔

اگر روم کے سپاہ جرار کی طرح افسران عساکر سلطان بھی ثابت قدم اور خیر طلب، اور حبیب وطن ہوتے تو یہ گلشن مینو مواد دست تطاولِ خزاں سے معنون اور محفوظ رہتا۔ جس وقت کرنا، دھرنا، وقرنا، وعزنا کی آوازوں کی زمین پر بلند ہوتی تھی، روم کے دل سوز اور جیوٹ کے سپاہی اس طرح بڑھتے تھے جیسے شیر کچھار سے شکار کے لئے جاتا ہے اور اجل سے ایسی ہنسی خوشی سے دوچار ہوتے تھے جیسے عاشق زار سمن عذرا معشوق سے مصروف ہم کنار ہو۔ برابران۔ سازراں جان نثار کی زبان سے یہی صدا ہوتی تھی کہ ہاں برادران شیر دل بڑھے ہوئے۔ ہاں غازیان بلند حوصلہ تلے ہوتے اس میدان میں جان کام آئے تو سمجھو کہ زندہ ہوگئے۔ یہ موت نہیں خلد علیین کا زینہ ہے ادھر قفس عنصری سے مرغ روح نے پرواز کیا۔ ادھر رضوان نے استقبال کر کے باغ نعیم کی ہوا کھلائی۔ ادھر گردن تن سے جدا ہوئی، ادھر حوروں نے صورت زیباد کھائی۔ ادھر سلسبیل وکوثر کی لہروں نے روح تازہ از سر نو بخشی۔ برسوں کی عبادت کا فاصلہ نہیں ہے حواس میدان بلاخیز وحشت انگیز میں ایک دن کام کرنے کا صلہ ہے۔ جن لوگوں نے ہزار بار طواف کعبہ کیا ہے اور جو سفر دور دراز سے

صمصام تبرِ تیغ عنایات عالیات سے مشرف ہوئے ہیں، ان کے لئے بھی وہ درجہ نہیں، جو ان برادرانِ دینی کے لئے درجہ ہے جنھوں نے اس سرزمین کی حفاظت ملک و حمیتِ اسلام کی نظر سے جان دی۔ تمہارے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون جو اس جنگ میں بہے گا۔ حشر کے دن ہزار ہزار دریائے رحمت ہوگا۔ یہ سپہر سرمہ رنگ، ان سواد الوجہ فی الدین اور سواد القلب فی العقبیٰ دشمنوں کا منھ کالا کرے گا جو دست تعدی ہم پر دراز کرتے ہیں مگر ہمارا خدا ہماری بانگ تظلم خوب سنتا ہے۔ تمہاری تجہیز و تکفین کے لئے گو کافور و عنبر اور عود و مشک وافر نہیں، مگر یاد رکھو کہ جس مقام پر تمہارا پسینا بھی گرا ہے، وہ زمین کا چپہ تاتار پر رشک زن ہوگا اور تمہاری نعش بے کفن سے منزلوں تک زمین اس طرح بس جائے گی۔ جیسے شاہی باغوں کے تختۂ گل سے دماغ بس جاتا ہے۔ گو تم کئی دن پلک پر پلک نہیں مار سکتے ہو مگر حشر کے دن تک ایسی میٹھی نیند سوؤ گے کہ تیرہ باطنوں کی طرح فشارِ قبر معلوم ہی نہ ہوگا کہ کہتے کسے ہیں۔ تمہاری خاک سے گلہائے روح افزا اگیں گے اور تمہاری تربتوں پر ہمیشہ ہما کا سایہ چتر بنا رہے گا۔ دنیا گذشتنی اور گذاشتنی ہے ؎

ہیچ ست ہمین تو دکھن را	بر ہیچ مپیچ خویشتن را
بر چرخ مناز بر نعیمش	بر صبح مپیچ در نسیمش
سیلاب غم ست در سر دش	طوفان بلاست در تموش
ایں جائے نشد برو مند	کش باد فنا ز پا نیفگند
نیرنگ فناست پردہ بشگاف	سیمرغ بقا مجوازیں قاف
ہر چند مقام دلپذیر ست	زیں مرحلہ کوچ ناگزیر ست

تو آبلہ پائے و کاروان تیز

برخیز ازیں کردہ بہ خیز

پھر کس دن کے لئے اٹھا رکھو گے۔ کیا حشر تک زندہ ہی رہو گے (ہرگز نہیں ہرگز نہیں) سلطان گیتی داور فخر قاقانِ رفان ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی حضرت قدر قدرت سلطان عبدالحمید خاں غازی خلد اللہ ملکہ و دولتہ نے جو سلوک بمقتضائے آئین جہانداری، و قوانین شہریاری تم پر مرعی کئے ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس ملک اور اس سلطنت کو غنیم کی یورش سے محفوظ رکھو۔ جب شاہ گیتی ستان حکمران ہو اور سپاہی شیر ژیان ہو اور خدا نگہبان ہو، تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہاں جوانانِ رومن ہیں، ثابت قدم رہنا۔ قلعہ شکن، عسکر شکن۔ نصرت۔ اثر۔ فیروز و منصور، عدو بند، یہ تمہارے خطاب ہیں بے شک۔ بلا شبہ ایک دربگیر و محکم گیر یا تو اس معرکۂ نبرد میں آئے ہی نہ ہوتے اور اب جو آئے ہو تو مستقل مزاج اور ثابت قدم رہو ورنہ ادھر کے رہو گے نہ ادھر کے ؎

گر دین میں تھا لقب یگانہ اپنا نہ بخت سے خفا

گاہے مضمون کو ہم نے جانا اپنا۔ اللہ ری خطا

سب دیر و حرم کی خاک چھانی مومن۔ کیا خاک کہیں دیکھا تو نہیں کہیں ٹھکانہ اپنا۔ جی بیٹھ گیا اس کے مصداق ہو گئے (ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں) جس وقت یہ کیفیت ترکوں کے گوش گذار ہوتی تھی، خون جوشش میں آتا تھا اور قدم آگے بڑھ جاتا تھا۔ مگر افسران فوج نے بڑا دھوکا دیا۔ رشوتیں انھوں نے لیں۔ سہل انگیاں، اور بے پروائیاں انھوں نے کیں۔ حسد نے ان کے دل میں جگہ پائی۔ کینے نے ان کے سینے کو مسکن بنایا۔ افسوس کا مقام ہے (ہزاراں ہزار افسوس) جس وقت ایک معصوم بچہ سیزدہ سالہ جو اپنے باپ کی چوری سے بھاگ کر چلا آیا تھا اور زخمیوں کی خدمت کے لئے ہمہ تن مصروف تھا، مارا گیا۔ اس وقت تمام اہلِ فوج اور جزناکل از خرد تا بزرگ از اعلیٰ تا ادنیٰ سب اشکبار ہو گئے۔ ؎

آشوب قیامت از جہانِ خاست شیون ز زمین و آسمان خاست

از ماتم شان جہان بجوشید صد فتنہ زمان زمان بجوشید

غم سوخت دروں درون سگان را ماتم کدہ شد جہان جہاں را

بگرفت فلک ستارہ باری بنشست جہان بسوگواری

اس بچے معصوم سے سب کو محبت تھی۔ اب حضرات سامعین مقابلہ کریں کہ ایک ایک بچہ رومی تو یوں یوں جان لڑائے اور افسر لوں کاندھی دیں۔ ؎

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغ شرر افشاں شعلے نے الحذر کیا بجلی نے الامان۔

آواز دی زمیں نے کہ یا حافظ جہاں دہشت سے تھر تھرا گیا مریخ آسمان

ثابت ہوا کہ چہرہ خورشید کٹ گیا

غل تھا کہ فوج روس کا دفتر الٹ گیا

(نعرہ جوش و خروش بلند ہوا۔)

ہماری الماس باز تلوار اور سیف لنگروار جس طرف چمک جاتی تھی۔ صفوں کی صفیں کاٹ آتی تھی، جدھر گئی، بجلی گرائی۔ دم کے دم میں اِدھر آئی ؟ اُدھر آئی۔ یہ چمکی وہ سر کے دو ٹکرے کر دیئے۔ یہ اگلی وہ عدو کو لقمہ کیا۔ خون کے شرلے اس طرح بہ رہے تھے کہ الامان الامان۔ ؎

جس صف پہ چمک کر گئی گھمسان کر آئی جمعیت اعدا کو پریشان کر آئی

لشکر کے زرہ پوشوں کو بے جان کر آئی چار آئینہ والوں کو بھی حیران کر آئی

نکلی وہ اجل بن کے جو شمشیر کی صورت

اک ایک کا منھ تکتا تھا تصویر کی صورت

میں نے جو کچھ کیا میرا خدا جانتا ہے یا میں جانتا ہوں۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا اپنی وضع کے خلاف ہے۔ ؎

کس منہ سے کیوں لائق تحسین ہوں میں
کیا لطف جو گل کہے رنگین ہوں میں

ہوتی ہے حلاوت سخن خود ظاہر
کہتی ہے شکر کہیں کہ شیریں ہوں میں

روسیوں کے جوش و خروش کی بھی میں تعریف کرتا ہوں، مگر جو لوگ کل معاملات سے واقف ہیں، وہ ضرور مجھ سے اتفاق کر لیں گے کہ روسیوں کا اور ہمارا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ وجہ یہ کہ ان کے پاس فوج کثیر تھی۔ ہماری اور ان کی فوج کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ ان کا مقابلہ زیادہ، رقبہ زیادہ، آمدنی زیادہ، لوگ زیادہ، پھر وہ آمادۂ جنگ ہو گئے تھے۔ ہم غافل وہ آٹھوں گانٹھ میت۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں ہمارے دشمن ہو گئے۔ مانٹی نگرو جو بڑا احدی ملک ہے ہمارے بالکل خلاف ہے۔ سرویا جانی دشمن بلغارستان عدوے مہیب، ہر زمی گودنا خون کا پیاسا (توبہ الامان الامان) جرمن بغلی گھونسا (خدا سمجھے) آسٹریا ہمارے کمال خلاف ہے۔

اس طرف ساری خدائی تھی ادھر کچھ بھی نہیں

بااینہمہ ترکوں نے وہ کیا جو روسیوں سے نہ ہوسکا۔ ترک تلوار کے بڑے دھنی ہیں جب دست بدست جنگ ہوتی، چھکے چھڑا دیتے:۔ ؎

ناگن سی گئی فوج کو مسمار کر آئی
جو جو تھے لب نہر الخمیس فی النار کر آئی

ساحر کو فنا مست کو ہشیار کر آئی
جس موذی نے لی بل کی اسے مار کر آئی

سرسبز تھی لاکھوں میں یہ اقبال تھا اسکا
تھا جسم لہو دار دہن لال تھا اس کا

شہبازی نظروں میں جیسے تول کے آئی
اکدم میں وہیں ظالموں کو رول کے آئی

غل ہونے لگا بیچ میں جس غول کے آئی
لو مرگ مفاجات دہن کھول کے آئی،

خونریزی اعدا کا بس عہدہ تھا اسی کو
بے ذبح کئے اب یہ نہ چھوڑے گی کسی کو،

پلونا کی جنگ میں جس استقلال اور ثابت قدمی اور جواں مردی سے ترکوں نے مقابلہ کیا۔ شاید ساری خدائی میں، اس جرأت کے ساتھ کوئی نہ لڑے گا۔ اگر کوئی صاحب اس وقت وہاں ہوتے تو ترکوں کی بسالت دیکھ کر عش عش کرنے لگتے۔ مگر فناسب کے لئے ہے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس نے ہمیشہ فتح و ظفر ہی پائی ہو۔ اچھے اچھے سپہ سالار اور بڑے نامی گرامی شہید پیوند خاک ہوئے:۔ ؎

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے

تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے۔

کل افسران روم میں جنرل عثمان پاشا البتہ سب سے زیادہ قابل قدر ہیں جنھوں نے جان نذر کردینے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور سب سے زیادہ نزدونما سلیمان پاشا نے کھیلی۔ محمد علی پاشا کا دامن بھی لوٹ سازش سے پاک نہیں ہے مگر واہ ری سپاہ روم۔ پیادوں نے البتہ کارنمایاں کیا۔ (آفریں شاباش، شاباش)۔ ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

میں اس عفیفہ خاتون بلقیس مرتبت عالی منزلت کا تہ دل سے شاکر ہوں جس کے ایما سے میں روم جاکر شریک جنگ ہوا اور اس شرکت سے داخل حسنات ہوا۔ گو اس ملک کی رسوم و قواعد کے مطابق کوئی دوشیزہ عفت مآب کسی نامحرم سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تمہارے ساتھ بشرائط چند در چند شادی کروں گی اور کوئی ایسی ہو بھی تو اس کی جگت ہنسائی، اور رسوائی ہو مگر صاف ظاہر ہے کہ اس عفیفہ نے ایسی شرائط نیک پر مجھے بھیجا تھا جن کو سن کر سچے مسلمانوں اور برادران دین کو خوش ہونا چاہئے۔ مجھ سے یہ اقرار کیا تھا کہ تم روم جاکر اس ملک میں برادران دینی کی طرف سے شریک جنگ ہو تو، میں تمہارے ساتھ نکاح پر راضی ہو جاؤں گی۔ (حمیت۔ حمیت۔ شاباش) ؎

نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

(اُس عفیفہ کے قدم دھو دھو کے پینے چاہئیں) اس کی بعد ایک آواز آئی (یہ وہ عفیفہ ہے جس کے دامن پر حوران بہشتی نماز پڑھیں) دوسری آواز آئی حمیت دینی اس کا نام ہے اور حب قوم اسے کہتے ہیں) تیسری آواز آئی۔ (آفریں باد بریں ہمت) میں بصحیح عرض کرتا ہوں کہ حسن بلا خیز مقامات میں میں کبھی مضطر و مضطرب ہوتا تھا۔ صرف اس امید سے کہ ایسی بیوی ملے گی۔ مجھے کمال تقویت ہوتی تھی اور جب کبھی میں زخم کھاتا تو یہ شعر یاد آتا ؎

وہ کہ ز دست میرود ایں دل ناتوانِ من	پیش صنم کہ می برد سوختہ نیم جانِ من
باد کہ پیش میبردی خبر کہ پیش میر بست	چونکہ رسی بادرساں بندگی از زبان من

اس دوشیزہ جادو ادا پری تمثال یوسف جمال کی تعریف میرے امکان سے خارج ہے انتہا یہ کہ اس کے ایک اشارے نے مجھے مجبور کیا کہ روم جاؤں۔ سوچا کہ جب یہ کم سن نوعمر خاتون حمیت اسلام کی دلدادہ ہے تو واسئے برحال اس مرد کے جو۔ برادرانِ دینی کی مدد سے عاجز اور قاصر رہے اور اگر اُس کی یاد ہے اس کے حکم کی تعمیل اور اُس کے وصال کا شوق نہ گدگداتا تو شاید اس قدر کارہائے نمایاں مجھ سے وقوع میں نہ آتے جس قدر اب وقوع میں آئے۔ یہ سب اسی رنگین ادا کی سحر بیانی کا اثر ہے جس کی تعریف خیز امکان اور احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ اگر کوئی اس

تعریف کا شکریہ ادا بھی کر سکتا ہے تو وہ میں ہوں جس کے دل پر اثر پہنچا ہے اور جس کا دل انتہا سے زیادہ شکر گذار ہے۔

مداح چون توئی بشر و غیر چون منی — لازم شکوہ خویش بلندست شان تو

باید دماغ بہر شنیدن نہ گوش و بس — بوئے گل ست زمزمۂ ناتوان تو

ہم بندۂ از تو خوش دل و ہم خواجہ سرفراز — تو میزبان و اہل جہاں میہمان تو

ہم سبزہ از تو خرم و ہم گل شگفتہ رو

تو باغبان و روے زمین بوستان تو

لطف یہ کہ ادھر ترک حسن آرا بیگم کو دعائیں دیتے تھے۔ ادھر روسی اخبار برابر اس کی بدحت سرائی میں رطب اللسان تھے۔ چنانچہ مختلف اخباروں کا ترجمہ بطور خلاصہ کرتا ہوں:۔

۱۔ ہم نے سنا ہے کہ ہندوستان کی ایک امیر زادی نے جو ابھی بالکل نو عمر ہیں دو شیزہ ہیں، ایک رئیس زادے سے جوان پر رتبچھے ہوئے تھے یہ شرط کر کے روم بھیجا کہ رومیوں کی فوج میں بھرتی ہو کر نام کریں، تو ان کے ساتھ شادی کریں گے۔ خدا کرے ہماری روس کی بندیاں بھی اسی طرح حبِ وطن کا لحاظ کریں مگر افسوس ہے کہ وہ فرقۂ نہلسٹ کی حامی ہیں اور گورنمنٹ کی مدد کے عوض دشمنی پر آمادہ ہیں۔

۲۔ روم کی لیڈیاں تک دست بدعا ہیں کہ ترک ظفریاب ہوں اور محبت اسلام کا بحرِ ناپیدا کنار اس قدر موج زن ہے کہ اس کی لہر ہندوستان تک پہونچی۔ چنانچہ آزاد نامی ایک جنرل کو کسی بن بیاہی بیگم نے اس غرض سے روم کے ملک میں شریک ہونے کی صلاح دی کہ بعد واپسی نکاح کریں گی۔

۳۔ جو لیڈیاں گورنمنٹ کی دشمن ہیں ان کو اس خبر کے سننے سے شرم آنی چاہیئے کہ ہندوستان تک کی جگہیں، دعا مانگتی اور سعی بلیغ کرتی ہیں کہ جس طرح ممکن ہو ترک فتح پائیں، برعکس اس کے ہمارے ملک کی امیر زادیاں باغیوں اور مفسدوں کو مدد دیتی ہیں۔

۱۔ خدا کرے آپس ہی میں جو چلے اور روس تباہ ہو جائے۔

۲۔ فرقۂ نہلسٹ ہی بدلہ لے گا۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

۳۔ حسن آرا بیگم کا نام جترک اس قابل ہے کہ آبِ زمزم سے منھ دھو کر اس نام کو زبان پر لائے۔

۴۔ اور روس روسیہ کی نسبت ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھر ہی میں پھوٹ ہے اور ازل سے اس کی نسبت یہی لکھا ہے کہ تو چاہے جس قدر عظمت حاصل ہو جائے۔ انجام خراب ہی ہے:۔

بہ آب زمزم و کوثر سفید نتوان کرد

گلیم بخت کسے را کہ بافتند سیاہ،

اس مقام پر میری یہ خواہش نہیں ہے کہ میں اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا حال بیان کر کے آپ لوگوں کو رنجیدہ اور ملول کروں۔ مجھ پر جو کچھ گذری میں نے کمالِ استقلال اور غایت ثابت قدمی سے مصائب سخت کو برداشت کیا۔ اف تک کی ہو۔ تو خدا سمجھے، اوائلِ سفر میں ہمارا جہاز جزیرہ بیرم کے قریب غرق ہو گیا۔ اس جہاز کے غرقاب ہونے کے وقت جو کچھ میں نے کیا، وہ تمام عالم پر روشن ہے۔ میں اپنے آپ اس کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا مگر ایک اخبار میں جو اسی شہر میں طبع ہوتا ہے۔ کسی نامہ نگار نے اس کا حال من و عن لکھا ہے۔ وہ اخبار یہ ہے:۔

اخبار نکال کر آزاد نے کہا ـــــ اگر کوئی صاحب یہ اخبار پڑھ کر حاضرین جلسہ کو سنائیں، تو خاکسار رہین منتِ بیکراں ہوگا۔۔۔

ایک قاضی صاحب نے اخبار لے کر پڑھنا شروع کیا۔ وہو ہذا:۔

سفرِ بحری محمد آزاد سلمہ اللہ تعالیٰ

زاہد جو ہیں انھیں ہے طاعت پہ گھمنڈ   اہلِ دنیا رکھتے ہیں دولت پہ گھمنڈ

واقف ہیں اطاعت سے نہ دولت سے جو   ہے ان کو اگر تو تیری رحمت پہ گھمنڈ

جو لوگ خدا کی رحمت پر ناز کرتے ہیں، وہ دولت کو فانی اور طاعت کو خوشامد سمجھتے ہیں اور امورِ خیر کے انجام دینے پر ہر دم تلے رہتے ہیں، چنانچہ ہندوستان کے ایک باحمیت اہلِ اسلام، عالی نژاد آزاد نام جو سلطنت مقدس روم کے عازم تھے اور جنھوں نے ٹھان لی تھی کہ اسلام کے نام پر خون بہائیں گے۔ بمبئی میں جہاز ڈیننس پر سوار ہو کر خدا کا نام لے کر روانہ ہو گئے اور حامیانِ دینِ متین نے اس وقت زبانِ حال و قال سے یہ شعر پڑھا:۔

به سفر رفتنت مبارک باد

به سلامت روی و باز آئی

یہ مردِ خدا، ولی حق آگاہ عارف باللہ محض بقصدِ اذکار، تواب ـــــ عازم استنبول ہوا ہے:۔

ع   آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو

اصل حال یہ ہے کہ آزاد نامی ایک جوانِ خوش رو زیبا شمائل رعنا جمالِ یوسف خصال کی حسنِ اتفاق سے ایک عفیفہ نازنین کے حسنِ دلفریب اور عارضِ بہار آفریں پر نظر پڑی تو ہزار جان سے عاشق ہو گیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ جانِ من تم پر جان جاتی ہے۔ اس بت شیریں حرکات نے لگاوٹ کی کہ ان کا دل قابو سے جاتا ہی رہا، اور کلمہ پڑھنے لگے، ادا نے دیوانہ کر دیا۔

لازم یہ ادا و ناز سہتا ہی نہ تھا   اور اس کی طرف دیکھ کے رہتا ہی تھا

اظہار کیا کہ چاہتے ہیں تجھ کو

کہہ بیٹھے ہم اس سے جو کہنا ہی نہ تھا

اس آنکھ لڑنے کا نتیجہ ان کے حق میں ایک معنی کر کے برا ہوا۔ یہ بے چارہ اس پھیر میں روم گیا ہے کہ بعد حصولِ فتح ہندوستان آئے تو اس معشوق ملائک فریب کو عقد نکاح میں لائے۔ حسن بھی کیا بد بلا ہے؛ ؎

اے جمال تو بتاراج نظرہا گستاخ ۔۔۔ وے حرام تو بہ پامالی سرہا گستاخ

داغ شوقِ تو بہ آرائش دلہا سرگرم ۔۔۔ زخم تیغ تو بہ گلگشت جگرہا گستاخ

ناز دلہائے نزارش چہ محابا باشد

سر زلفی کہ بہ پیچیدہ بہ کے ہا گستاخ

دیدہ باید کہ شب حاملہ فردا چہ زائد مگر اس نیک بخت خاتون کی نیکی اور پاس حمیّت اسلام کی قسم کھانی چاہیے اور اس شیر دل، دوستِ اسلام کی جواں مردی اور جانبازی کی جس قدر تعریف کیجیے، می زیبد جو مسلمان حضرت قدر قدرت سلطان ابنِ سلطان ابن سلطان خلیفہ الرحمانی حضرت عبدالحمید خان غازی خلد اللہ ملکہٗ وضاعف قدرہٗ کی افواج ظفر امواج کی اعانت کرنے اٹھ کھڑا ہو۔ اس کی تعظیم بھی کافہ اسلام جمہور مسلمین پر فرض عین ہے۔ عادل باذل حامی دین ظہیر المذمت؛ ؎

اے ذات تو جامع صفتِ عدل کرم را ۔۔۔ دے بر شرفِ ذات تو اجماعِ امم را

حقا کہ زر اسم تو عیانست کہ در شرع ۔۔۔ فرزانہ وزیرے شہ بطحا و حرم را

در عہد تو از گوش بدل راہ نباید ۔۔۔ آوازۂ اسکندر و افسانۂ جم را

گر حرف وقار تو فراب نویسند ۔۔۔ از موج بہ طوفان نتوان کرد رقم را

اے در روشِ کوکب عزم تو بہ شبگیر ۔۔۔ پروین وا پرن سبحہ سرانگشت علم را

معذورم اگر نام تو در مجمع نگنجد

در کوزہ حباب چائے دم دجلہ و یم را

جس وقت جہاز غرق ہونے لگا، سب کو یہ فکر تھی کہ اپنی اپنی جان بچائیں، مگر آزاد کو یہ فکر تھی کہ چاہے اس کی جان جاتی رہی. مگر اور کسی پر آنچ نہ آنے پائے۔ تو آفریں، آفریں صد آفریں۔ گلستانِ سعدی کی حکایت منظومہ میں جس مردِ خدا کا ذکر ہے اس کے بھی آزاد نے کان کاٹے اور اس سے بھی گویا سبقت لے گئے:۔ ؎

جوانے پاکباز و پاک رو بود ۔۔۔ بجز دایے درافتاد ند باہم

چنیں خواندم کہ در دریائے اعظم ۔۔۔ کہ با پاکیزہ روئے در گرہ بود

چو ملاح آمدش تا دست گیرد ۔۔۔ مبادا کاندراں حالت بمیرد

راہگذار دوست یار من گیرد   دریں گفتن جہائے بروئے اشفت
ہمیں گفت از میان موج شہ بر   شنید مدش کہ جان میداد و می گفت

حدیث عشق زان بطال می نوش
کہ در سختی کند بارے فراموش

اس شخص نے اپنے دوست کی نسبت اس قدر محبت ظاہر کی تھی مگر آزاد نے ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی جن کو کبھی پیشتر نہیں دیکھا تھا۔ ہمدردی اس کو کہتے ہیں۔ اس شخص نے ساٹھ ستر آدمیوں کو لائف بوٹ پر سوار کرایا اور ان کی جان بچائی ورنہ وہ گھبرا کر ڈوب گئے تھے۔

اب سنئے کہ ایک بوٹ میں سے ایک ولایتی صاحب نے جو فوج کے لفٹینٹ تھے لڑھکنی کھائی، آزاد نے ساتھ ہی کود کر ان کو کود کر سمندر سے نکالا اور اس کوشش و کشمکش میں خود بہہ گئے (افسوس صد افسوس) اور اسی حالت میں جزیرہ بیرم میں داخل ہوئے۔ شکر خدا حضور سلطان نے جو رعایا کے پکے خیر خواہ ہیں، اس خبر کو سن کر آزاد کی بڑی تعریف کی، اس سے ثابت ہے کہ حضور محتشم الیہ جزو امور تک پر نظر ڈالتے ہیں۔

اس پر ایک مفتی صاحب نے بہ آواز بلند خدمت حضرت سلطان ہیں۔ افتخار عظمت نامہ پڑھ کر حاضرین کو سنائے۔

محیط بخشش و دریا کف و سحاب نوال   قمر لوائے و فلک خرگہ و ستارہ سپاہ
ز خاک رہگزرش سرد آرزوئے جنوں   بر آستانِ درس سجدہ آبروئے سپاہ
چو او نگفتہ از خسروان بروئے خریر   حدیث فقر و فنا لا الٰہ الا اللہ

طرب بطبع تو شامل چو رنگ یار رخ گل
بقا ز خصیم تو زائل چو قند از اباہ

اس کے بعد آزاد پاشا نے یوں بیان کیا۔

ایہا الناس۔ روم کا انتظام ایک اور طرز تمدن میں نے ویسا نہیں پایا جیسے یورپ کے شائستہ ملکوں میں ہونا چاہئے طرز معاشرت، یہاں کے طرز معاشرت سے بدرجہا بہتر ہے، وہاں کے مسلمان کوٹ، پتلون، جاکٹ، شرٹ زیب بدن کرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ان کی ٹوپی سرخ یا سیاہ ہوتی ہے جسکو ترکی ٹوپی بولتے ہیں اور جو اس ملک کے پیروان نیچر کے سروں پر نظر وں آتی ہے (قہقہہ) ترک نہایت خوش رو جوان ہوتے ہیں۔ مثل انگریزوں کے سرخ و سفید۔ عورتیں بھی انتہا کی حسینہ و جمیلہ ہیں۔ طرہ یہ کہ سیہ چشم و عنبریں ہو۔ ایک دخت گلفام پری کردار و پری کچھ دن بھیس بدل کر فوج کے ساتھ رہی۔ اس کے دل سے لگی تھی کہ روسیوں کو ہر طرح مدد دے مگر اس کے باپ نے حلیہ چھپوا دیا۔ اور فوج سے اس کو بلا لیا۔ شوخ برق وش انا البرق کہتی ہوئی میدان کارزار میں جاتی تھی۔ جب ترکوں کو معلوم ہوا کہ یہ ایک شریف خوش باش کی دختر نیک اختر ہے تو اور بھی زیادہ بحر حمیت جوش زن ہوا کہ یہ لڑکی اس جرات کو کام میں لائے کہ ہم مر دنہ کیکے

رہ جائیں، پس پھر اس وقت ترکوں کی صفیں کروڑوں شیروں کے بھگا دینے کا دم رکھتی ہیں : ؎

ہتھیار چمکتے ہوئے اور برق سے تیزی | دیندار و خوش اطوار وفادار و غازی
ترکی و قریشی و حسینی و حجازی | زور آور و لشکر و صفدر و غازی

جب آنکھ ملائیں تو دلیروں کو بھگا دیں
قبضے میں رکھیں ہاتھ تو شیروں کو بھگا دیں

حضراتِ سامعین! میری کل کامیابی اور سرخروئی ایک دوشیزۂ بلقیس مرتبت کے سبب سے ہوئی۔ اگر وہ مدد نہ دیتی تو صنم آرزو سے ہم آغوش نہ ہوتا۔ اگر وہ اعانت نہ کرتی تو شاید تمنا سے ہمکنار ہونا مشکل ہو جاتا۔ کیا آپ بزرگوں نے اس پری کردار تدرو، رفتار کا نام سنا ہے، ہاں سنا ہے سنا ہے حسن آرا بیگم۔ حضراتِ سامعین! یہ پیارا نام حسن آرا بیگم وہ نام ہے جس کو میں دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں : ؎

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

مگر جس دوشیزہ کا میں نے اس وقت حوالہ دیا وہ اور ہی ہے۔ اس کے ذریعے سے میں نے فوج میں عہدہ جرنیلی پایا۔ اس کے ذریعہ سے میں اس قابل ہوا کہ رسالے کی افسری کے عہدے کا سامان بہم پہونچایا۔ اسی کے ذریعے سے اس لائق ہوا کہ ترکوں کو مدد دوں۔ پلونا کی جنگ میں جو کچھ بسالت و شجاعت میں نے ظاہر کی وہ اسی کے بحر عنایت کی ایک لہر ہے۔ اس دوشیزہ سمن عذرا کبک رفتار۔ رشکِ حور و پری افشاں جبیں دلبری کا نام مس میڈا ہے۔

سامعین نے یہ نام سن کر با آوازِ بلند دعا مانگی کہ خدا اس زنِ نیک سیرت کو فائز بمرام کرے اور اس کا ساغرِ دل بادۂ نشاط سے بھرے۔

۱۔ جو نیک مرد ہیں، ان کی مصیبت کے وقت نیک مرد اور نیک بیبیاں، ان کے کام آتی ہیں۔
۲۔ خدا کرے یہ دوشیزہ پری جمال مشرف باسلام ہو۔ سب نے مل کر آمین آمین کی صدا بلند کی۔
۳۔ آزاد پاشا کو لازم تھا کہ اس زنِ خوش سیر کو یہاں لائے تاکہ ہم اس کے دیدار سے دلی مسرت حاصل کرتے۔
۴۔ جو نیک بیبیاں ہیں وہ نیک مردوں کو وقتِ ضرورت جان سے اٹھ کر مدد دیتی ہیں اور جو نیک مرد ہیں وہ امور احسن پر تلے رہتے ہیں : ؎

مردانِ خدا خدا نباشند
لیکن ز خدا جدا نباشند!

آزاد نے پھر سلسلۂ سخن شروع کیا اور کہا حضراتِ سامعین نے اس وجہ سے اس نیک عورت کا ذکر چھیڑا کہ اگر آپ

صاحبوں کے دلوں میں میری طرف سے کوئی شک ہو تو اس کو رفع کر دیں (ہرگز شک نہیں) ہر کہ شک آرد کافر گردد) اس نیک بی بی نے مجھے اس طرح سے مدد دی تھی کہ میں اس کو عقد نکاح میں لاؤں (کچھ مضائقہ نہیں) اگر عدل کرے تو چار نکاح تک جائز ہیں) میں نے کئی بار انکار کیا اور کہا کہ میں حسن آرا بیگم سے جس کی ایک ادائے دلربا کا عاشق زار ہوں اور جس کی ترچھی نظر نے مجھے گھائل کر دیا اور اقرار کر آیا ہوں، اب اگر یہاں سے شادی کر کے جاؤں تو وہ اپنے دل میں کیا سوچے گی۔ اس پر دوشیزہ جادو ادا نے مجھے قید کروا دیا۔ آخر کار خود بر سر رحم آئی۔ ؎

جنگ جو ئے کلہان صلح و صفا نیز کنند

غنچہ سازند دل و کار صبا نیز کنند،

قید سے رہائی اسی کی بدولت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد اس وزیر ملک سے میری سفارش کی۔ روم میں اس وقت طوائف الملوکی کا ڈنکا بج رہا تھا، اور یہ ہر ملک کا قاعدہ ہے مگر ہاں کہیں کم کہیں زیادہ، ذرا سے شک پر لوگ قید کر لیے جاتے تھے۔ سلطان مراد آفندی اور سلطان عبد المجید خاں فردوس آرام گاہ کا جو لوگ جنبہ کرتے تھے ان کی بڑی جستجو تھی۔ اگر مس میڈا مدد نہ دیتی تو افسری کا عہدہ فوج سلطانی میں مجھے نصیب نہ ہوتا۔

حضرت سلطان المعظم خلد اللہ ملکہ بڑے پابند صوم و صلوٰۃ نمازی روزہ دار متقی۔ متشرع شب زندہ دار عادل بادشاہ ہیں ان کی عظمت و جبروت کے جھنڈے گڑے ہیں اور بڑا دبدبہ و طنطنہ ہے ؎

شبدیز جنہ زرخش بر فتار تیز تر	سرہنگ شہ برستم و دستان برابر ست
بدخواہ راز اشتلم خار خار خوف	دل در خراش سینہ بہ پیکان برابر ست
کیوان نہ دیدہ کہ بود دیدبان بام	گفتی کہ بام کاخ بکیوان برابر ست
جنتم زا آفتاب پرستان نشانہ	گفتند شہ بمہر درخشاں برابر ست
ہم کعبہ برزمین بود و ہم سر بہ شاہ	در ہر دو پلہ یار بمیزان برابر ست
تا اہتمام نیر رخشاں بہ بذل نور	در شہر و باغ و کوہ و بیاباں برابر ست

بلادالبقائے شہ کہ بتقر فسقر و رع سخت

ولیعہم شہ بہ نیتر رخشاں برابر ست

حضور سلطان نے حتی الوسع کوشش بلیغ کی کہ روم فتح و نصرت حاصل کرے اور میدان جنگ میں اسی سلطنت کا ڈنکا بجے مگر دو چار افسران فوجی کے بغض اور حسد اور باہمی عناد نے سب کوششیں بیکار کر دیں (افسوس صد افسوس) بیشک وہ افسر اس قابل ہیں کہ بعد تحقیقات سخت سزا پائیں۔ رومی اور ایسے طامع افسوس، رومی پیادے، اس بساعت سے لڑے کہ سواروں کے رخ چھوٹ گئے اور افسروں نے صرف اس وجہ سے کہ فلاں افسر کی بدنامی ہو،

روسیوں سے ساز کر لیا۔ (ستم ستم۔ ہائے ستم وائے ستم)

کیا شرم کی بات نہیں کہ ایسے معرکے میں روم کے افسران فوجی اس قدر پست ہمتی کا اظہار کریں کہ روسیوں سے رشوتیں لے لیں۔ (شرم۔ شرم) بے شک شرم کی بات ہے مگر نیک اندر بد و بد اندر نیک۔ ؎

نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

اگر ہمارے رجمنٹوں کے میجروں اور کرنیلوں اور جنرلوں نے وہی نمک حلالی اور ثابت قدمی اور مستقل مزاجی ظاہر کی ہوتی اور اسی نیک دلی اور یکدلی اور جان نثاری سے لڑے ہوتے جس طرح اور ادنی درجے کے سپاہیوں نے جان لڑائی تو ہلالی جھنڈے کا پھریرا آج آسترو سے ڈینوب اڑتا ہوتا۔ مگر ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان و لیکن پھر بھی کم نکلے

خیر۔ مقتضی رنج والم، شادی وغم شکست و ظفر توام ہیں۔ ایک روز وہ تھا کہ روم ہی روم تمام مشرقی حصۂ یورپ اور مغربی حصۂ ایشیا اور ہسپانیہ وغیرہ مقامات میں نظر آتا تھا اور ایک آج کا دن ہے مگر پھر بھی اس سلطنت کی نسبت جو کچھ گپ بازی مشہور رہی اور جس قدر گھٹا کر لوگ اس کا نام لیتے ہیں۔ وہ بہتان اور تعصب ہے۔ روم کو صرف لائق منتظموں کی ضرورت ہے۔ اگر روم کے اراکین سلطنت طرز تمدن سے واقفیت حاصل کریں، تو اب بھی روم اپنی اصلی حالت پر آسکتا ہے۔

ٹرکی کو چند امور کی ضرورت اشد ہے۔

۱۔ فرمانروائے ملک مدبر اکمل ہو۔ مستقل مزاج۔ مردم شناس، منتظم جری، دور اندیش، غیر متعصب، اور انگلستان کی صلاح کا پیرو۔

۲۔ وزرا اعلی درجے کے ناظم۔ طرز تمدن سے واقف۔ رعایا کے خیر خواہ، ملک کے خیر طلب، ہر دل عزیز سلطان کے مطیع اور نہی خواہ۔

۳۔ محکموں کے افسر کمی کا جنبہ نہ کریں۔

۴۔ افسران فوجی میں باہم خصومت نہ ہو اور ٹرکی کے علاوہ اور ممالک یورپ کے مدارس حرب میں تعلیم پائیں۔

۵۔ مال کا کام ان افسروں کے تعلق رہے جو کفایت شعاری کے اصول سے واقف ہوں اور بڑی کوشش کی جاتے کہ خزانہ عامرہ کی آمدنی عمدہ طرز پر صرف ہو۔ یہ نہیں کہ ہزاروں کی جگہ لاکھوں اڑا دے اور لاکھوں کے عوض کروڑوں۔

۶۔ رشوت ستانی کی سزا نہایت عمدہ۔ قرار پائے۔ روم میں رشوت کا دروازہ باز ہے اور اسی سبب سے اکثر امور کا

انتظام حسب دلخواہ شائستہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک رشوت لینے والوں کیساتھ رعایا کی جائے گی۔ اول مقدمہ یہی ہے، کہ باب رشوت ستانی مسدود ہو (بیشک، بے شک) اگر رشوت کا دروازہ کھلا نہ ہوتا تو روسی اس طرح آسانی کے ساتھ درائے ہوئے شبکا گھاٹی پر نہ جم جاتے۔ بیشک اس طرف کے جنرل افواج سلطانی نے جان بوجھ کر اغماض کیا۔ روسیوں کا نام ہوا کہ ایسے جری ہیں کہ شبکا گھاٹی پر دراتے ہوئے داخل ہو گئے اور ترکوں کی بدنامی ہوئی کہ ذرا روک نہ سکے۔ ہم کس کے سامنے سر پھوڑیں کہ ہماری سپاہ اعدا کی اس فوج کو جو شبکا پر دندناتی تھی ٹکرے ٹکرے کر ڈالتی۔ مگر دنیا بھر میں یہ مشہور ہوا کہ روسیوں نے بڑی جرأت کی۔ افسوس صد افسوس۔

۷۔ ماتحت ملکوں سے معاہدۂ تحتگی کے ساتھ کیا جائے۔ مثلاً مانٹی نیگرو سرویہ۔ بلگیریا۔ رومانیا وغیرہ وغیرہ۔

۸۔ انگلستان کو روم اپنا دلی دوست سمجھتے ہیں۔

اگر ان امور کے مطابق ٹرکی کارروائی کرے تو سبحان اللہ۔ حضرات سامعین! فرانس وہ ملک ہے جس کے ادنیٰ ادنیٰ آدمی جنگی عزت و توقیر پر جان دیتے ہیں۔ نپولین بوناپارٹ جو اپنی آپ ہی نظیر تھا جس نے یورپ سے عرب سے شرق تک کوس ظفر بجایا۔ اس فرانس نے ذرا سی غلطی کے سبب سے شکست پائی اور جرمن نے نیچا دکھایا۔ کیا گھوڑے پر سے شہسوار نہیں گرتا، کیا پیراک آج تک کوئی نہیں ڈوبا، کیا اچھے اچھے پہلوانوں نے کبھی کشتی نہیں کھائی۔ کیا کوئی دعویٰ کر کے کہہ سکتا ہے کہ اگر منش زندہ رہتا تو کبھی شکست ہی نہ کھاتا۔ اگر دریائے ستلج پر پورس کے ھاتھی اگر آگ کے شعلوں سے نہ بھڑکتے تو کیا سکندر اعظم فتح بھی پاتا۔ نپولین اور ولنگٹن کا مقابلہ سمجھئے، مگر اتفاق وقت ایک ذرا سی سپاہی نے اتنے بڑے آزمودہ کار جنرل کے چھکے چھڑا دیئے، بارہا تجربہ ہوا ہے کہ: ع

پیارے غالب آتے ہیں سوار پشت توسن پر

شیواجی ایک ادنیٰ مرہٹا تھا۔ جس کی بمقابلہ سلاطین دہلی کوئی وقعت نہ تھی مگر عالمگیر لے بادشاہ ثریا جاہ کی ناک میں دم کر دیا۔ کیا اس سے عالمگیر کی سبکی ہوئی یا شیواجی کا مرتبہ بادشاہ سے بڑھ گیا۔ ہرگز نہیں عالمگیر پھر عالمگیر تھا، اور شیواجی بااین ہمہ اقتدار پھر لونڈا ہی تھا، مانا کہ بعض ممالک کے تقابل میں روم کی اب وہ سطوت و حشمت نہیں، جو کچھ سال بیشتر تھی مگر ہاتھی لٹے گا تو کہاں تک لٹے گا۔ روم گو زمانہ حال میں کسی قدر دب گیا مگر اب بھی اس کی پرانی طاقت عود کر سکتی ہے۔ اگر منتظم اور اعیان دولت کارگزار اور لائق ہوئے، تو عود کریگی اور ضرور عود کرے گی۔

کم مبین من ظاہر ذلیل را

از غلاف کہنہ چہ تیغ اصیل را

اے برادران باحمیت اس شکست سے ہمارے تمہارے دل چھوٹے اور حوصلے پست نہ ہونے چاہئیں۔

ہمت مرداں مدد خدا۔

اس عروسِ عربدہ جو کے لطف وکرم کا مجھے تہِ دل سے ممنون وشاکر ہونا چاہیئے' جس نے مجھے موقع دیا کہ میں روم کی حالت پر نگاہِ ژرف ڈالوں اور جو کچھ ہو سکے مددوں اور رومیوں کے کام آؤں' بے اختیار دل چاہتا ہے کہ اس شکرلب کی توصیف میں مدح سرا ہوں۔

عنادل گل روئے تو گلعذاد انند   اسیر دام بلائے تو دل شکارانند

غبار راہ وفائے تو شہسوار انند   غلام نرگس مست تو تاجدار اتند

خراب بادۂ لعل تو ہوشیار انند

میرا سا عاشق جانباز اور اس کی سی معشوقہ طناز وغماز کوئی ہو تو بتاؤ۔ ہم اس میں فرد وادہ اس میں فرد۔ دونوں آپ ہی نظیر ہیں عدیم السہیم۔ لاثانی۔ بے عدیل' کجا قیس کجا آزاد۔ وہ شاگرد' ہیں استاد ؎

ایک جوان ہوں بالم خو کردہ   نشور وحشت کا نمک پروردہ

حکم بے ربط وہ ملک جنون   افسر واغ لبسر چوں مجنون

کیا کیا گریہ کیا کچھ نہ کیا   نہ رہا مرتبہ اس کا نہ رہا

قیس کو اس سے بھلا کیا نسبت   ایک شاہ ایک گد کیا نسبت

ذرے کو مہر سے کیا رتبہ ہے   کچھ بھی ذرے کا بھلا رتبہ ہے

قیس اک طفل دبستان جنون

اور میں استاد زباندان جنون

حضرات سامعین! روس کی ایک پری چہم خاتون میرے مقابلے کے لئے میدان میں آئی اور پیغام بھیجا کہ یکہ وتنہا مجھ سے آن کے مقابلہ کیجئے۔ سوچا کہ اگر میں نے اس لولی دلفریب وگل رخسار کو زیر کیا تو ناموری کیا خاک ہوگی۔ (قہقہہ، قہقہہ) سب ہی کہیں گے کہ عورت پر شیر تھے اور اگر اتفاق سے وہ غالب آگئی اور مجھ کو مغلوب کر دیا (بڑے زور کا قہقہہ) تو بڑی ہی کرکری ہوگی مگر مجبور ہو کر جانا ہی پڑا۔ اس یکہ ناز میدانِ خوبی وفارس مضمار محبوبی کو دیکھا تو تیر نگاہ دل کے پار ہوا۔ زن کافر کیش نے مومن سے کلمہ پڑھوایا۔ فرسِ فلک سیر پر اس طرح ران پٹری جمائے بیٹھی تھی کہ شہسوار کی کیا حقیقت ہے: ؎

شکر نے چابکے چستی دلیری   بہر آہو بکینہ تند شیری

گل بے آفت باد خزانی   بہار تازہ بر شاخِ جوانی

بیک بزم از رام صد ور کشادہ   بدور رخ ماہ را دو رخ نہادہ

براد ہم زین منہد ستم نہادست   بمی خوردن نشیند کیقباد ست

بشسے گر گنج بخشی راد بد داد   کلاہِ کبر قارون رابر دباد

سخن گوید در از مرجان براید

زند شمشیر شیر از جان بر آید

سراپا دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہوگیا۔ وہ تلوار کا وار کرتی تھی اور میں بوسے سے جواب دیتا تھا۔ وہ جھلاکر شمشیر دوپیکر لے کے جھپٹتی تھی اور میں گورے گورے گال چوم لیتا تھا۔ (فرمائشی قہقہہ)۔

۱۔ اپنے مطلب سے سپاہی کہیں چوکنے والے ہیں۔ توبہ۔

۲۔ عورت کی تلوار کا جواب بوسۂ رخسار ہی تھا۔

۳۔ اس معشوقہ پری تمثال کی تصویر دیکھنے کے لائق ہوگی۔

۴۔ شاید مس کلیرسا کا ذکر ہے۔ میں نے لندن کے اخباروں اور یہاں کے دو ایک اردو اخباروں میں ذکرِ خیر پڑھا تھا۔

۵۔ ایسا واقعہ بھی کم ہوا ہوگا، بلکہ شاید نہ ہوا ہو۔

آزاد نے کہا نتیجہ بد یہ ہوا کہ وہ بت مہر سیما مجھے گرفتار کر لے گئی اور وزیر جنگ سے حکم دلایا کہ سیبریا کے برفستان میں ان کو بھیجدو، چنانچہ سو سواروں کی حفاظت سے بھیجا گیا۔

میں نے سوچا کہ دس پانچ بوسوں کے عوض مفت آزادی ہم نے ہاتھ سے دی۔ اب بھلا ٹرکی کو ہم سے کیا فائدہ پہنچے گا۔ اے کاش کسی بڑی لڑائی میں کام آئے۔ جان جاتی تو خیر۔ اب تو ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

جس وقت سو سوارانِ روس کی حراست میں چلا ہوں۔ عرض نہیں کر سکتا کہ کیا کیفیت تھی۔ جینے سے عار، موت کا طلبگار جان بار تھی۔ اس بت سنگدل کو میرے حال پر ذرا رحم نہ آیا:۔ ؎

صد حیف سینۂ سوز فغاں کارگر نہ ہو   یاں جان پر بنی، ترے دل میں اثر نہ ہو

دیکھیں غم درو نہ پہ کب تک نظر نہ ہو   سیر اشگاف سینہ ترا چاک در نہ ہو

اے آہ آسمان میں عبث رخنہ گر نہ ہو   ڈرتا ہوں میں نزول بلا پیشتر نہ ہو

فریاد بے گناہ کشی جا بجا کروں۔   گر وہم جان نثاری پیغامبر نہ ہو

معشوق دم سے زاہد مفلس کو پاس ہے   قطع تعلقات کس امید پر نہ ہو

عابد فریب شوخی و رغبت خرامگاہ   میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو

سودا تھا مجھ کو گرمی بازار عشق کا ـــــ اس کا کہاں خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو

اب لیجئے آہ تاب گسل ہر جفا کے ساتھ

جب جان سے گذر گئے پھر در گذر نہ ہو

ایک بار میں نے اس گلبدن ناوک نگاہ سے مکالمہ بھی کیا تھا۔ وہ سننے کے قابل ہے۔ وہو ہذا:۔

آزاد :۔

گل بدن :۔ دو چار بوسوں کے عوض دو چار ہزار کی جان لی جاتی ہے۔ عاشق بنے تھے تو اب خمیازہ کھینچو۔ عشق دل لگی نہیں ہے۔

آزاد :۔ حضور دو بوسوں کے عوض دو سو لے لیں۔

گلبدن :۔ اب بھی شرارت سے باز نہیں آتا۔ اچھا۔

آزاد :۔ اب تو جرم ہوا مگر رحم دلی بھی لازمۂ انسانی ہے۔ انسان سے جرم ہوا ہی کرتا ہے۔ خدا تو معاف کر ہی دیتا ہے ورنہ ع۔ عاشق کی سزا جو تو چہتی ہو:۔

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ ــ کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ۔

شمشیر سے قتل ہو جو منظور ، ــ ابرو کے اشارے سے کرو چور

زنداں میں، جو زنداں بھیجنا ہو

اپنے دلِ تنگ میں جگہ دو،

گل بدن :۔ (شوخی کے ساتھ) جب برفستان میں ٹھٹھروگے تب ان ٹھنڈی گرمیوں کا حال معلوم ہوگا۔ ہمارے رخسار تاباں کے بوسے اور تم لو۔ شانِ خدا اے تیری قدرت :۔

بت کرے آرزو خدائی کی

شان ہے تیری کبریائی کی ،

آزاد :۔ خدا سے اس کی شکایت ہو تو می زیبد۔ تمہارے رخسار تاباں کیوں اس قدر عابد فریب بناتے مگر ہم بھی تو چشم بدور۔ ۔ رو ہونے میں آپ کے کیا شک ہے ؟

گل بدن :۔ میں ایک پری تمثال لیلیٰ جمال کا عاشق زار ہوں اور وہ بھی دل و جان سے مجھ پر ریجھی ہوئی ہے۔ واسطے خدا کے میرا قصور معاف کر دو۔ مجھے اپنی جان جانے کا خوف نہیں ہے مگر صرف اس قدر خیال ہے کہ اس معشوق سیم بدن کا کیا حال ہوگا۔ ہے ہے۔

ان کو سامنے سے لے جاؤ بس۔

الغرض دو تین دن میں دریائے ڈینوب کے پار ہوا، مگر خدا کی شان صبح کو آنکھ کھولتا ہوں تو نہ لشکر نہ وہ دریا۔ ایک کوہ فلک شکوہ کی چوٹی پر محمد آزاد ایک نازک اور بیش بہا پلنگڑی پر آرام کر رہے ہیں۔ ع

سبحان اللہ شان تیری

وہ رات عمر بھر نہ بھولوں گا۔ عجب شب تھی — لیلۃ القدر لیلۃ البدر: ؎

شبے خوش ہمچو صبح زندگانی — نشاط افزا چو ایام جوانی

سواد طرہ اش خجلت وہ حور — بیاض عارضش نورٌ علیٰ نور

نسیمش جعد سنبل شانہ کردہ

ہوا یش اشک شبنم دانہ کردہ

وہاں بھی وہی پیش آیا۔ ایک روز دو روز تو ہم ذرا ذرا خوش رہے ایک پری ایک قلعہ کوہ کی ملکہ تھی۔ ایسی حسینہ و جمیلہ کہ چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی اور شنید کے کانوں نے کبھی نہ سنی ہوگی، چندے آفتاب، چندے مہتاب، مگر اس حسینہ نے بھی شادی کا پیام دیا، مجھے منظور کہاں۔ دوسرے دن مجھے ایک ہیبت ناک مقام میں قید کر دیا۔ ؎

لاش پر آنے کی شہرت شب غم دیتے ہے — اے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں،

دھیان آتا ہے ترے منہ میں زبان لینے کا — جی ہم اے شوخ پئے سیر عدم دیتے ہیں

کر دیا خانہ اغیار ہوسناک خراب — داد رونے کی مرے دیدۂ نم دیتے ہیں،

مر گئے رشک سے ہم تو کہ وہ دشمن کو خطاب — خط ترسائی پر اعجاز رقم دیتے ہیں،

دم نہ لے اے اثر آہ کہ معلوم ہوا — جن پہ دم دیتے ہیں ہم وہ ہمیں دم دیتے ہیں

کیا دوا سے ہو تری رنجش ہر دم کا علاج

چارہ گر کیوں مجھے رنج پیہم دیتے ہیں،

مجھے اس شہزادی نے پہاڑ کے ایسے مقام میں قید کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا، کہتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، توپ کے مہرے پر جانا آسان ہے مگر اس وحشت کدہ میں ایک دم بھر بھی ٹھہرنا عذاب جان ہے۔ خدا دشمن کو بھی اس قید تنہائی سے بری ہی رکھے۔

میں دو ہفتے کامل اس مقام تیرہ و تار، وحشت زار میں یکہ و تنہا رہا۔ ایک عجب طرح کی گلی صراحی میں پانی آتا تھا اور چینی کے پیالے میں دو روٹیاں اس وقت، دو روٹیاں اُس وقت۔ بس اللہ اللہ خیر صلاح۔ اس قید خانے میں جو مجھ پر گذری، خدا کسی کو نصیب نہ کرے۔ خیال کیجئے کہ دو ہفتے تک انسان کی صورت نہیں دیکھی (الامان الامان تم

ایک آدمی جو کھانا لانے پر مقرر تھا، ایک روشن دان کے ذریعے سے پیالا لٹکا دیتا تھا اور صراحی پانی کی بھری مجھے ملتی تھی۔ ایک روز صبح شام دونوں وقت وہ بندہ خدا روٹی لانا بھول گیا۔ قہر درویش برجانِ درویش۔ تن بتقدیر خاموش ہو رہا دوسرے روز روشن دان کی راہ سے اس نے کہا۔ اے مردہ مصیبت زدہ کل میرا باپ سخت علیل بلکہ جاں بلب تھا۔ اس سبب سے میں تیرا کھانا نہ لا سکا، معاف کرنا۔ میں نے دونوں روٹیاں پیالے سے نکالیں تو دیکھا کہ بھنے ہوئے گوشت کے بھی دو ٹکڑے رکھے ہیں۔

اس نے کہا اے شخص آج شہزادی کی چوری سے میں تیرے واسطے گوشت بھی لایا ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ گوشت کے ساتھ روٹیاں کھائیں، پانی پیا تو نیند اس قدر غالب ہوئی کہ سو گیا۔ خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک جنگ میں ترکوں کو شکست ہوئی ہے اور جنرل کوئی بھی اس موقع پر فوج کو ذرا امداد یا اعانت یا ہدایت نہیں، کرتا۔ میں خواب ہی میں چلایا اور غل مچایا کہ او افسر واسطے خدا کے دل مضبوط رکھو، اور جہاں تک ممکن ہو سکے کوشش کرو کہ ترکوں کو فتح حاصل ہو۔ اس حالت میں میری آنکھ کھل گئی۔ گو بندہ خواب کی تعبیر کا قائل نہیں، مگر دل پر اس وقت بڑا خراب اثر اس خواب کا ہوا۔ پھر آنکھ لگ گئی تو حسن آرا بیگم نظر آئیں، مگر شاکی بلکہ کمال شاکی کہ آزاد نے خط تک نہ بھیجا۔ آخر کار میرے ایک رفیق و ندیم نے جس کا نام خواجہ بدیع الزماں ہے، اپنی جان پر کھیل کر میرا پتہ لگایا اور پتہ لگاتے لگاتے میرے پاس آیا۔ پہاڑ کی ایک گھاٹی میں غار تھا۔ اسی میں مجھے محبوس کیا تھا۔ دروازہ باہر سے بند۔ اس مقام پر پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ انسان جاتے ہوئے کانپتا تھا خاکسار آزاد آپ سب صاحبوں کا خادم اسی وحشت زار میں دو ہفتے تک رہا۔ خیر خواجہ صاحب نے آن کر دروازے پر ہاتھ مارا اور خدا جانے کس ترکیب سے اس منحنی مصیبت الجثہ نے دروازہ کھولا اور قعر کوہ میں دوزخ پر طعنہ زن تھا آئے۔ میں ضعف کے مارے ایک گوشے میں پڑا ہوا الخفیں مانگ رہا تھا۔ خواجہ صاحب نے قریب آکر مجھے دیکھا مگر تاریکی کے سبب سے ان کو کچھ نظر نہ آیا۔ جب تھوڑی دیر میں تاریکی کے عادی ہو گئے تو آہستہ سے مجھے جگایا۔ میں سمجھا کہ شہزادی نے رحم کھا کر مجھے بلوایا ہے۔ اب سنئے کہ خواجہ صاحب کی آواز نہیں پہچانتا۔ وہ لاکھ کہتے ہیں کہ میں خواجہ بدیع، مگر میری سمجھ ہی میں نہیں آتا، کہ خواجہ بدیع کس شخص کا نام ہے، اس بدحواسی کو ملاحظہ فرمائیے (سواہی چاہیے) اب خواجہ صاحب جو میرے قریب آئے تو معطر و معنبر۔ ان کو میں نے کبھی عطر لگائے دیکھا ہی تھا۔ ذرا گمان نہ تھا کہ خواجہ صاحب آئے ہیں۔ اب وہ باتیں کرنے لگے۔

خو :۔ بھائی آزاد۔ ارے میاں تم مجھے بالکل بھول گئے؟

آزاد :۔ شہزادی نے بھیجا ہے۔ پیغام کیا کہا ہے۔

خو :۔ ارے میاں میں ہوں، خواجہ بدیع، تمہارا دوست۔

آزاد :- روسی زبان ہم نہیں سمجھتے۔ ہم سے فرانسیسی زبان میں گفتگو کرو، صاحب۔ فرنچ ہم بول لیتے ہیں۔

خو :- افسوس صد افسوس، آزاد ارے بھائی میں تمہارا خادم ہوں۔ خواجہ بدیع الزماں۔ تمہارا خادمِ خاص۔

آزاد :- شہزادی کے خادم خاص ہو یا عام ہو۔ مطلب کہو۔

خو :- مطلب یہ کہ مس میڈا نے تمہارے پاس بھیجا ہے

آزاد :- (چونک کر) خوجی۔ افوہ۔ مجھے یہ اس وقت کیا ہو گیا۔

خواجہ صاحب :- آپ یہاں۔ افوہ۔ شکر خدا صد ہزار شکر خدا۔

خو :- میں تے ٹھان لی تھی کہ جس طرح ممکن ہوگا، جاؤں گا اور بالضرور جاؤں گا (چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے) جان کی پرواہ نہیں۔ جب آزاد ہی نہیں تو جان کیا مال ہے۔ شہزادی سے ملا تو تمہاری بڑی تعریف کی ہے اور بہت کچھ سمجھایا:

بہر کجا کہ روم وصفِ دوستان گویم

برائے یار فروشی دکان نمی باید،

میں نے خواجہ صاحب سے بیان کیا کہ یہ شہزادی مجھ پر عاشق ہے اور اس نے مجھ سے شادی کا پیغام کیا تھا۔ میں نے منظور نہیں کیا تو سخت بد دماغ ہو گئی اور نوبت باینجا رسید، کہ مجھے یہاں قید کر دیا۔

خوجی نے اس وقت بڑے غور کے بعد اس کا جواب دیا۔ یہ سچ ہے :۔

سخن دان پرور دہ پیر کہن

بیندیشد آنگہ بگوید سخن

خو :- آپ نے بہت برا کیا اور محض لڑکپن کیا۔

آزاد :- مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں حسن آرا سے شادی کا اقرار کر کے ایسا احسان فراموش اور دروغ گو بنوں کہ دوسری کر لوں اور اس کو جلاؤں، ہم سے نہیں ہو سکتا :۔

نشاید ہوس باختن با گلے

کہ ہر بامدادش شود بلبلے

مرد عورت دونوں کے لئے صادق آتا ہے۔

خو :- صاحبزادے مصلحت وقت بھی تو کوئی شے ہے :۔

نہ ہر جائے مرکب توان تاختن

جام سپر باید انداختن

آزاد :- خیر۔ وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا ممکن ہے۔

خو :۔ شادی کرلو۔ رہو سہو۔ گھر گھاٹ سے واقف ہو۔

آزاد :۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی محبت میں آجاؤں اور پھر اس قول و قرار کا مطلق خیال نہ رہے، بوستان آرا سے ہوا ہے!

خو :۔ آپ ہیں دیوانے۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں۔

آزاد :۔ خیر پھر جو رائے ہو۔ میں اپنی رائے کے مطابق کام کرنا نہیں چاہتا۔ خدا کی عنایت پر بھروسہ ہے، اور تمہاری صلاح پر۔

خو :۔ اب چار پانچ شعر پڑھیے۔ ہم ایک فال دیکھتے ہیں۔ دیوانِ حافظ نہیں ہے تو نہیں سہی۔

آزاد :۔ بہت خوب ایک شعر تو غالب کا سنئے :

آنچہ در مبدء فیاض بود آں نیست،
گل جدا نہ شدہ از شاخ بداماں نست

اور دوسرا شعر مومن خاں مومن دہلوی کا سناتا ہوں :

آسماں فتنہ کچھ ایسا نہیں اے اہلِ جہاں
کوئی باقی نہیں رہنے کا اماں ہونے تک

تیسرا شعر خدائے سخن میر انیس کا سنئے :

جس کا در اکھاڑے وہ جلی شانہ
ٹکڑا نمک سے کھائے جو نانِ شعیر کا

اور چوتھا شعر شایان کا ملاحظہ فرمائیے :

آنکھیں کھلی عجب پریزاد سے درپردہ ساز
دل کو تھا غیرتِ شمشاد سے درپردہ ساز

پانچواں شعر سننے یادگار کی یادگار ہے :

اپنوں سے ترے چہرے کو ضیا مرد لوائی
مستی اور پان سے دانتوں نے تجلی پائی

خو :۔ آنچہ در مبدء فیاض بود آں منست، فال نیک ہے۔ نہایت عمدہ شگون۔ دو خنجر ذرا بے ڈھب پڑھے تھے مگر تیسرے شعر نے ڈال دی۔ چوتھا شعر حسب فال اور دالِ بر نیک فال مست کہ از پریزاداں ساز بودہ۔ دورِ عیش و عشرت باز بودہ۔ پانچواں شعر نیز ہمہ شعر بامزہ و خوب و نرم و فصیح ست رفتی :

اپٹنوں سے ترے چہرے کو ضیاء دلوائی
مسی اور پان سے دانتوں نے تجلی پائی

فال نیک ہی ہے ہم جا کے سفارش کریں اور شادی ہو جائے۔

الغرض بااین ہمہ دوسری بار کنوئیں میں قید کیا (الامان۔ الحفیظ) یہ قید اور بھی سخت تھی مگر قہر درویش برجان درویش چہ کردہ شود خیر۔ کچھ دن اس کنوئیں میں بھی بسر کی صرف ایک بار دن بھر میں کنوئیں سے باہر آتے تھے۔ یا کسی بار دوبار۔ پھر دن رات میں اسی انداز سے میں۔ یہ انداز نئے طرز سے بنایا گیا تھا۔ خاص اسی غرض سے کہ مصیبت زدہ آدمی اس میں قید کئے جائیں۔ اس تذکرے کے بیان میں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بالفعل میدان جنگ کے حالات سُنئے۔ ایک بار ایک لق ودق میدان تختی خرام وتیز گام اشہب سبزہ شکار پر سوار کمال سراسیگی کے ساتھ یکہ وتنہا جاتا تھا۔ قدم قدم پر روح فنا تھی کہ مبادا روسیوں کی فوج مل جائے یا کسی درندے سے دوچار ہوں، سوچتا تھا کہ یا رخدا جاؤں تو کدھر جاؤں اور راستہ پوچھوں تو کس سے (توبہ۔ توبہ) خیر بقول شخصے جدھر سینگ سمائے ادھر چلا۔ تھوڑی دیر میں اجل نے صورت دکھائی۔ حضرت ملک الموت مزاج پرسی کے لئے آئے۔ دفعتہً پچیس تیس روسی سوار نظر آئے (الامان، الامان، ارے غضب) اور لطف یہ کہ ہم اور وہ آمنے سامنے (اف۔ اف۔ توبہ توبہ۔ اب جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ بھاگوں تو وہ تیس، میں یکہ تنہا یک بینی و دو گوش میں بھاگتا تو فیصلہ تھا۔ ایک سوار نے معاً گولی چلائی۔ دائیں۔ خدا نے بچایا، گھوڑے کو اشارے سے پھیر کر ایک سوار کو تلا ہوا ہاتھ مسروہی کا دیتا ہوں تو پشت توسن سے زمین پر۔ لاش پھڑکنے لگی۔ ان لوگوں نے پھر گولی چلائی مگر خدا نے پھر مجھے محفوظ رکھا، میں نے پھر تلوار کا بھرپور ہاتھ مارا، تو دو کو زخمی کیا۔ پھرتی سے گھوڑا بڑھا کر چاہتا تھا کہ اور شقی کے دو ٹکڑے کر دوں مگر خود ہی زخمی ہو گیا۔ ع

جب ٹوکتے ہیں غیظ تب آتا ہے شیر کو

زخم کھاتے ہی آگ ہو گیا۔ بے خوف وخطر کمیت خوش خرام کو آگے بڑھا کر تین سواروں کا چشم زدن میں کام تمام کر دیا۔ روسیوں کے بیڑے میں رنادن کی آواز گئی تو معاً اسی سوار پہنچے۔ ادھر ایک آزاد نیم جان ادھر اتنے جوان (واہ رے شیر) حضرات سامعین اس وقت مجھے حسن آرا بیگم یاد آئیں۔ سوچا کہ یا خدام تا تو ہوں ہی۔ اب زیست کی امید انتہا کی بیوقوفی ہے مگر اس وقت وہ گلبدن میری حالت اور بسالت اور مایوسی دیکھ لے تو گویا جی اٹھوں۔ ہنوز اسی سواروں کی جماعت مجھ تک آنے نہیں پائی تھی کہ روس کے چند سواروں نے اپنے ساتھیوں کو زخمی اور بسمل اور مردہ دیکھ کر گھوڑے بڑھائے اور جھلا کے وار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ میں بھی اشعار رجز پڑھ پڑھ کر تلا ہوا تھا:

سر تیغ من خون حیران خورد، ہمہ گرز ومغز دلیران خورد
چوں تیغ من از کیسہ آمد بروں، کند ہفت کشور چو دریائے خون

مراخندہ آید بدین داوری ۔۔۔ کہ پیشم تو آئی وجنگ آوری

خدا بڑا مسبب الاسباب ہے اس کی کریمی کے صدقے۔ ادھر اتنی سواروں کا پرا دور سے نمودار ہوا اور روسی جو مجھ سے لڑ رہے تھے، سمجھے کہ ترک آ گئے۔ ایسے چندھیاتے کہ بھاگتے راہ نہ لی۔ میں نے بھی باگ اٹھائی مگر بھاگنے نہ پایا تھا کہ کئی روسیوں نے باڑھ ماری اور میں لڑ بھڑ کر آخر کار اس قدر زخمی ہوا کہ گھوڑے پر نہ بیٹھ سکا اور چوندھیا کر گرا۔ مجھے پھر اس وقت کا حال مطلق نہیں معلوم ہے مگر روس کے ایک اخبار نے لکھا ہے جس وقت میں گرا گرتے ہی بے ہوش ہو گیا اور روسی ہمارے سرہانے پر کھڑے ہو کر یوں مکالمہ کرنے لگے:۔

ایک افسر: ــــ کیا مر گیا یا جان ابھی باقی ہے؟

دوسرا: - سینے پر اور قلب پر ہاتھ رکھ کر دیکھو۔

تیسرا: - مگر بڑا اچھا جوان تھا شاباش۔

چوتھا: - ناک کاٹ لو۔ یہ مردود اسی قابل ہے۔

حاضرین نے یہ فقرے سن کر کمال افسوس کیا اور ایک عالم بمبئی رونے لگا۔ کہرام مچا ہوا تھا۔

پانچواں: - ہمارے نزدیک اس کا قتل ضروری ہے۔ زندہ چھوڑنا بڑا افعی راکشتن و بچہ اش را نگاہداشتن کار خردمنداں نیست موذی کا فنا ہی کرنا مصلحت ہے۔

چھٹا: - آؤ اس کے زخموں پر چرکے دیں۔

ساتواں: - بھلا اگر بیڑے میں لے چلیں تو کیسا؟

آٹھواں: - اجی ہمیں فیصلہ کر دو اور سر کاٹ کے لے چلو۔

ایک شقی نے کہا کہ نہیں، چاہے جو ہو، اس کو اسی دم قتل کر دو اور اس کا سر کاٹ لے چلو۔ یہ کہہ کر اس نے تلوار سونتی اور قریب تھا کہ گردن پر پھیر دے (حاضرین فرط بیقراری و غم و غصہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور الامان کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اس پر رحم دل نے کہا مرے ہوئے کو مارنا، مٹے ہوئے کو مٹانا، گرے ہوئے کو ٹھوکر لگانا، آئین شجاعت سے بعید ہے۔

الغرض مجھے بیڑے میں لے گئے اور دسویں روز میں اس قابل ہوا کہ چہل قدمی کر دوں۔ میں روسیوں کا اس امر میں شکر خاص ادا کرتا ہوں کہ میرے علاج میں دلی ہمدردی ظاہر کی جو خاص ترک ظاہر کرتے۔ (آفریں، آفریں) میں اگر زخمی ہو کر گر نہ پڑتا تو جان ہی جاتی۔ میدان نبرد میں میرے قدم آج تک ڈگمگانے نہیں پائے۔ ؎

ہم رہیں گے امتحان عشق میں ثابت قدم
ہار جانا دل کا ننگ ہمت مردانہ ہے

اب سنیئے! اکہ ایک ٹاپو میں قید کر لیا گیا۔ مگر ہمت ٹوٹ گئی کہ ستم ہی ہوگیا، اب بھلا بھاگنے کا راستہ کون رلتہ اب بھاگ کے جائیں گے کیونکر۔ مگر ایک سوار نے مدد دی۔ شب کو دس بجے کے وقت وہ میرے پاس آیا۔ مجھے کہا اب موقع ہے، اس وقت سب سپاہی اور سوار میٹھی نیند ہو رہے تھے، صرف ایک پہرے والا جاگتا تھا۔ میں نے مقابلے پنجہ سر کیا اور پہرے والے کو اُسی مقام پر ٹھنڈا کیا۔ تپنچے کی آواز سن کر دو چار آدمی بیدار ہوتے۔ دو تین نے غل مچایا، ترک آ گئے ترک آ گئے۔ میں نے روسی زبان میں کہا، یار یہ تو دل لگی کی تھی، بس اتنے ہی میں ڈر گئے اور جو سچ مچ ترک آ ہی جائیں گے تو بھاگتے راہ نہ ملے گی۔ ان سب کو یقین ہوگیا کہ مذاق ہی مذاق ہے۔ ادھر وہ سوئے، ادھر وہ آزاد پاشا ایک توسن خوش خرام پر سوار ہو کر چلے۔ گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ادھم باد پا دریا میں اٹکھیلیاں کرتا ہوا جانے لگا۔ اتفاق سے دس پندرہ قدم جا کے گھوڑا تھما یا اور اپنے سائے سے آپ بھڑکا۔ غضب کا سامنا تھا۔ شب تیرہ و تار۔ رہوار باد رفتار۔ عدو بر سر پر خاش، یہ سب تو تھا ہی رعد کے گرجنے کی آواز آتی۔ الٰہی خیر ہو ؎

ہر بلائے کز آسمان آید	گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمین نارسیدہ می پرسد	خانہ انوری کجا باشد

حضرات سامعین! میرے مصیبت پر غور کیجئے۔

سمندر کی طرف مخاطب ہو کر میں نے جوشِ جنوں میں خدا جانے کیا کیا کہا، او ظالم او بیرحم سمندر۔ یاد رکھ کہ حسن آرا کا عاشق تیرا مہمان ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ پیوندِ خاک ہونے کے عوض اس دریائے قہار میں مقبرہ بنے گا۔ عاشق زار کو آرزو ہی رہ جائے گی کہ نہ خاک جائے۔ مگر اس عشق کی تھاہ کسی نے بھی نہیں پائی ہے اے کاش مزار بنتا تو حسن آرا کبھی دو پھول تو چڑھا جائیں۔ فاتحہ پڑھنے آئیں۔ کبھی تو یہ شعر ہمارے حسب حال بھی ہوتا۔ ؎

جو آئے تربت عاشق پہ ناز کرتا ہے

حضور خاک سے دامن ذرا اٹھائے ہوئے

میں کس دلی مسرت سے چلا تھا اور سوچا تھا کہ قضا کی پنجے سے چھوٹا، اجل کے منہ سے نکلا اور یہ معلوم ہی نہ تھا کہ لاکھوں حسرتوں کا خون ہوگا۔ ہزاروں آرزوئیں خاک میں مل جائیں گی۔ زندان بلا سے نجات پائی تو اس گرداب بلا میں آن پھنسے :- ؎

کام نہیں جز ناکامی۔۔۔	آب کے بدلے خون آشامی
موجۂ دریا اشک دمادم	آہ و فغاں دنبالہ پیہم
کاوش تازہ پیہم جی کو	نزع کی حالت ہر دم جی کو
سخت مشوش ہوں اب کیا کیجئے	دل کو تسلی کیونکر دیجئے

ضعفِ دل اپنا روز جتادے — نیند کے بدلے غش پہ غش آوے
ولولہ طاقت شور، قیامت — رات کٹی جوں، روز قیامت
دل کے قلق سے دشت نوردی — نقشِ قدم سے صحرا گردی

دردِ نہاں نے پیر نکالا
غمِ ابد نے مار ہی ڈالا...

ایک مرتبہ اس روز سے رعد کی آواز آئی کہ میں سمجھا آسمان پھٹ پڑے گا۔ ع
بجلی چمک رہی تھی فرس بیقرار تھا

اس پر بھی فلکِ بے مہر کو چین نہ آیا۔ (شاعرانہ خیالات ہیں، معاف فرماتے گا آزاد) بادِ مخالف نے چلنا شروع کیا اور گھوڑا اس قدر بیقرار کہ الاماں۔

حاضرین :- اف رے مصیبت۔ اللہ اللہ۔ وہ تنہائی اور وہ دریائے قہار، وہ تاریکی شب اور پردیس اور پر بجلی اور رعد اور ادھر بادِ مخالف۔ توبہ آزاد، خدا آپ کو اجر دے۔

ایک :- آمین، آمین۔ باحمیّت ایسے ہی ہوتے ہیں۔

دوسرا :- آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو۔ صد آفریں۔

تیسرا :- اس شخص کے قدم دھو دھو کے پئے تو جادو رو۔

چوتھا :- دریں چہ شک۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

آج تیرا طوطی بولتا ہے۔ مرحبا آزاد مرحبا۔

اس سے بڑھ کر یہ ستم ہوا کہ موسلا دھار مینھ برسنے لگا۔ آسمان سے بارش اور دریا میں موجوں کی جولانی۔ گھوڑا دس دس ہاتھ اچھلتا تھا، اور میں نہ کبھی بیشتر اس گھوڑے پر سوار ہوا تھا نہ کبھی اس دریا کی صورت سے آشنا تھا۔ اف رے مصیبت خلاصہ یہ کہ میری بدبختی کو اس پر بھی چین نہ آیا: بجلی اس روز سے چمکی کہ گھوڑا قابو سے جاتا رہا۔ اگلے پاؤں سے کھڑا ہو کر بائیں طرف جو پھرا تو آسن جمانا محال ہو گیا اور اچھل کر دریا میں ہو رہا۔

اس فقرے اور جگر دوز سانحے نے کل حاضرین کو آٹھ آٹھ آنسو رلایا جسے یہ دیکھو گریہ کناں اشک ریز۔ اس سے بڑھ کر مصیبت اور کیا ہو گی۔ انتہائے مصائب اسی کا نام ہے۔

ایک :- (رو، کر) قیامتِ کبریٰ کا سامنا تھا۔ افسوس)

دوسرا :- بڑا جگر دوز خرد سوز سانحہ نادیدنی ہے۔

تیسرا: اس بیکسی اور بے بسی کو دیکھئے۔ الامان۔ الامان۔

چوتھا: سننے سے تو ہم لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے وائے۔ بر ان کس کے جس پر خود سب مصیبتیں بیتیں۔ اف فوہ۔ بس ستم ہے۔

پانچواں: بے کسی سی بیکسی تھی۔ خدا دشمن کو بھی اس مصیبت سے محفوظ رکھے۔ عدوے جانی کو ایسا روز بد نہ دکھائے بس کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ دل پر کیا بنی تھی: ؎

ہر دم لب پر جان حزیں تھی ہر آن ہر آن باز پسین تھی
شور فغاں تمہید قیامت داغ جنوں خورشید قیامت
گریہ شور آمیز تلاطم آب وہ آب سینۂ قلزم
دیکھے جدھر کو چشم بھر آوے
آنکھ میں آنسو خون نظر آوے

اوّل تو زخمی بیمار خستہ جان۔ نہ تاب توان۔ اتنے دن کا علیل جسم میں نام کو طاقت نہیں، اس پر ستم یہ کہ بھیگا۔ اور چر کے پر چر کا یہ دیا کہ گھوڑے سے گرا: ؎

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاّد نے جاتے جاتے

مرتا کیا نہ کرتا۔ ناچار پیرنے لگا۔ مگر چڑھاد کا نٹا دل لگی نہیں ہے اور وہ بھی کس حالت میں دو ہاتھ لگاتا ہوں، تو بیس قدم پیچھے جاتا ہوں۔ جس قدر زور کرتا ہوں۔ اسی قدر موج کے تھپیڑے دور لئے جاتے ہیں۔ جس طرح خس و خاشاک ادھر ادھر نالوں میں بہا بہا پھرتا ہے وہ میری کیفیت تھی (سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں) کئی بار کوشش کی کہ ساحل تک آؤں مگر تر پا کے پانی کے تھپیڑے پھر بیس قدم پیچھے ہٹا دیتے ہیں: ؎

حسرت پہ اُس مسافر بیکس کے رویئے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

خدا خدا کر کے ساحل کے قریب آیا تو غش آگیا، عین بے ہوشی میں گر پڑا۔ دیر کے آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ دریا پا بوسی کر رہا ہوں، پاؤں کی انگلیاں پانی میں ہیں، اور کبھی کبھی دریا لہر سی مارتا ہوا پاؤں اور نصف ٹانگ تک آن کر بہ رجعت قہقری واپس جاتا ہے۔ آنکھ کھلی تو سرہانے پر ایک وہی سوار نظر آیا ارے! لاحول ولا قوۃ ہوش اڑ گئے مگر غور کر کے دیکھا تو وہی گھوڑا۔ اصیل گھوڑے کا کیا کہنا۔ ہزار خرابی اٹھا۔ گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی تو ہنہنانے لگا۔ میں نے کہا، شاباش غازی مرد۔ کیوں نہ ہو، قہر درویش بر جان درویش۔ جس طرح ممکن

ہوا گھوڑے پر سوار ہو کر چلا۔ ایک مصیبت ہو تو بیان کروں۔ خیر: ؎

ہوا جو کچھ ہوا بس گذشتہ را صلوٰۃ

کہاں تلک کوئی رویا کرے گلہ دل کا

خواجہ بدیع الزماں نے میرا بڑا ساتھ دیا یہ محض ایک افیونی ہے مگر پرلے سرے کا مسخرہ۔ عدالت میں ایک بار پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے بس اس نے وہ مسخرہ پن کی باتیں کیں کہ الاماں۔

عدالت:۔ تمہارا کیا نام ہے؟

خو:۔ ہم کو سب لوگ ماشاء اللہ خان کہتے ہیں، صاحب۔

عدالت:۔ ماشاء اللہ خان۔ نیا نام ہے۔ اور باپ کا نام؟

خو:۔ ہمارے باپ کا نام استغفر اللہ خان بہادر ہے۔

عدالت:۔ دادا کا نام بھی کوئی ایسا ہی ہو گا۔

خو:۔ نعوذ باللہ خان بہادر بندے کے جدّ امجد کا نام تھا۔

عدالت:۔ (ہنس کر) اور پردادا کا نام کیا تھا؟

خو:۔ پردادا کا نام ثم باللہ خان بہادر، ولد انشاء اللہ خان بہادر، بنتِ عیاذ اللہ خاں بہادر تھا۔

بنت کی لفظ پر اور بھی قہقہہ پڑا۔ صاحب جج اور وکلا اور فریقین اور حاضرین، سب بہ آواز بلند ہنس پڑے تو خواجہ صاحب نے کہا، ہمارے مورثِ اعلیٰ کا نام سبحان اللہ خاں تھا۔

پھر کہا، نہیں نہیں، میں نے غلطی کی۔ مورثِ اعلیٰ لاحول ولا قوۃ الا باللہ خان تھے اور ان کے بھائی کا نام۔ العظمۃ اللہ خان تھا۔

وکیل:۔ پاگل خانے میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔

خو:۔ قرولی ہوتی تو جواب باصواب دیتا۔

وکیل:۔ (عدالت سے) حضور اس پاگل کی سند نہیں۔

خو:۔ خاصے ہو بھئی، واہ جانگلو۔ چرا نباشد ؎

بلبل یاں آ کے خوش بیانی سیکھے	انداز فغاں مجھ سے فغانی سیکھے
رونا مری آنکھوں سے کرے حاصل ابر	دریا مرے اشکوں سے روانی سیکھے

حاضرین اس مسخرے کی گفتگو پر بہت ہنسے۔ بڑے بڑے متین علما تک مسکرانے لگے۔

آزاد نے کہا، حضراتِ سامعین مجھے وہ وقت خوب یاد ہے۔ جب استنبول سے رومیوں کی فوج نصرت موج

جنگی سامان اور اتواپ، اژدر دہان، بانکپن اور آن بان کے ساتھ میدانِ نبرد کی طرف چلی روم کے فوجی آدمی قابل دید ہیں۔ وجیہ کرارے، ڈنڈ پیل۔ پہلوان۔ روئیں تن بانکے۔ سیم بدن، نہایت حسین و خوش رو، جرأت کے نہنگ بحر آشام، رنگین مزاج مگر تند خو۔ بہادر طبع مگر وقتِ دغا شیر زبان اور بس جہان کی حقیقت نہ سمجھیں۔ جسے دیکھو زرق برق۔ بحرِ بسالت میں غرق وردی زیب تن۔ گل اندام، گلبدن، گھوڑے اٹھکھیلیاں کرتے جاتے تھے۔ تمام شہر فوج کے دیکھنے کے لئے جمع تھا۔ چھتوں پر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ شہر بھر کے زن و مرد امیر و غریب اوسط درجے کے لوگ، رئیس زادے، عمائد روسا، عوام دکانوں اور چھتوں پر ٹھٹھ لگائے ڈٹے کھڑے تھے۔ ایک خاتون زیبا اندام، گلفام نے اپنے کسی عاشق زار کو دیکھ کر رومال ہلایا، کسی نے ہاتھ سے اشارہ کیا، عورتیں پردے سے دعا مانگتی تھیں کہ یا خدا ان نوجوانوں اور ان تجربہ کار سپہ سالاروں کو سرفراز کر کے واپس لا۔

۱۔ یا خدا سلطنتِ عثمانیہ کی عظمت حشر تک برقرار رہے۔

۲۔ یا خدا یہ جتنے جاتے ہیں سب نمک حلالی کے ساتھ کاروائی کریں۔ اقبال قدم قدم پر ان کے ساتھ ہو۔

۳۔ اور نصرت و فیروزی ان کی غلامی کا دم بھرے۔

۴۔ بوڑھوں اور نوجوانوں کا خدا حافظ ہے۔

۵۔ انشاء اللہ معرکہ بڑا توان کی جرأت دیکھنا۔

۶۔ فتح فتح (نعرۂ خوشی) فتح۔ (جوش و خروش): ؎

آن زمیں باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آن منم کاندر میانِ خاک و خون بینی سرے

ترکوں کے حسن پر روس کی لیڈیاں اس قدر ریجھی تھیں کہ بس آنکھوں ہی آنکھوں میں پیے لیتی تھیں جیسا کہ عورتیں کہتی تھیں۔ جن ترکی افسروں اور سواروں کو روسی قید کر کے لے گئے تھے جب ان کو بعد جنگ رہا کر دیا اور وہ عازمِ وطن ہوئے تو ریل کے اسٹیشن پر صدہا جوان جوان عورتیں ہی عورتیں جمع تھیں۔ اکثروں نے ان کی رفاقت کے رنج میں بے اختیار آنسو بہائے اور اکثر مچل گئیں کہ ہم ان کے ساتھ روم جائیں گے۔ روسی اس وقت اس قدر خفیف ہوتے، ایسا جھینپے اور دل میں کٹ کٹ گئے کہ بیان سے باہر۔ سو سوا سو نوجوان خواتین نکھر نکھر کے آئیں اور ترکوں سے لڑ لڑا کر مچلی جاتی ہیں کہ ہم انھیں کے ہمراہ جائیں گے۔ اللہ اللہ رے حسن۔ گرہست بہو بیٹیاں اپنے آپے میں نہیں رہیں۔ سچ ہے۔

؎:۔ سعدیا روزِ ازل حسن آنر کان دادند ؎

من ازانِ حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بردن آرو زلیخا را

جب ہماری فوج صدر بازار یعنی چوک میں پہنچی تو ترکی خاتونوں نے جھروکوں سے گل افشانی کی۔ ایک صنم صندلی رنگ شوخ و شنگ نے تاک کر میری طرف پھول پھینکا۔ میں نے ہاتھ سے روک کر پھول کو چوم کر بٹن میں لگا لیا۔ اس مقام پر ذرا فوج رک گئی اور جھروکے سے آواز آئی ؎

سر دا زناز جلوہ گر کن ،	بر مبا بغلط یکے نظر کن
اے خرمن گل کہ مے خرامی	بر سوختہ خرمے نظر کن
غافل بگذرد کہ سوخت جانم	از آتش آہِ من حذر کن
پروانہ نیم کہ سوزم اے شمع	باسوختہ شبے بسر کن
اشب ز درم در آے چون صبح	شام سہ مرا سحر کن

چون دست بمیند ہد وصالت
دست من و دامنِ قیامت

مجھے آج تک نہیں معلوم ہوا کہ وہ خاتون کون تھی ؟ الغرض ترکوں کا جوش و خروش عام تھا مگر بعض افسروں نے جن پر یاب عامل کو کامل بھروسہ تھا ایسا کورنمکی کی کہ جس قدر زیادہ افسوس کریں کم ہے۔ ایک ایک فرزند دوازدہ و سیزدہ سالہ جو فوج کے ساتھ گیا اس نے جانِ شیریں روم کے نام پر قربان کرنے کا عزم بالجزم کر لیا مگر دو چار افسرانِ اعلیٰ اور ان کے ماتحت افسران نے ستم ڈھایا۔ اگر ہم بھی انھیں کی طرح رہتے تو رنج و مصائب کاہے کو سہتے۔ مگر روم سے سچا عشق رہا۔ ؎

گر دل میں اثر نہ تیرے غم کا ہوتا۔	کاہے کو یہ لوٹتا تڑپتا ہوتا۔
کیسی آرام سے گذرتی اوقات	اے کاش کہ میرا دل بھی تجھ سا ہوتا

میدانِ نبرد میں ترکوں کے جرسِ فلک شگاف ، اور کوسِ گردون خروش کی آواز دور تک جاتی تھی اور فوجی باجا تو اس قدر جوش دلاتا ہے کہ بیان سے باہر۔ آدمی تو آدمی گھوڑے تک مست ہو جاتے تھے۔ ادھر روم کا لشکر جرار۔ ادھر روسیوں کی فوج آزمودہ کار۔ ادھر کا ننگ برنگ شیر۔ اُدھر باشی بزوق جانباز و دلیر۔ سپہ سالار نے ایکبار ہم سب کو مخاطب کر کے حوصلہ بڑھانے کے لئے چند کلمات کہے ، جن کو میں نے پنسل سے کاغذ پر لکھ لیا تھا۔ اور وہ فقرے یہ ہیں۔

اے غازیانِ باوفا مردانِ خدا ، ہمارا لشکر فیروزی پیکر نصرت اثر دریائے ناپیدا کنار کی طرح اس جوش و خروش

سے جاتا ہے کہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ دل گواہی دیتا ہے کہ ہمارا ایک ایک نیزہ روسیوں کے کلیجے کے پار ہوگا' تو وجہ کیا۔ دل میں کچھ ایسا ہی ولولہ ہے۔ جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ حضرت سلطان المعظم کے کلمات مہر انگیز نے ہم سب کو درم ناخریدہ غلام کر لیا ہے'، اور جو باتیں حضور ظلِ سبحانی نے فرمائیں ان سے ہم ہی خوب واقف ہیں۔ ہمارا دل ان باتوں کے مزے لے رہا ہے۔ خدا حضرت سلطان المعظم کو ہم چشموں میں با آبرو کردے۔

بادشاہ ہے کہ پائگاہش را — برتر از چرخ سایباں بستند
بر فلک بخت نوجوانش را — بہ ظفر عقد جاوداں بستند
رہروان قوافلِ جبروت — ہوو ج قدر ہا وگراں بستند

سایبان قضائے دولت را
از مکان تا بہ لامکان بستند

اے مردانِ جنگجو و غازیانِ باصدق صفا اگر استقلال و صبر کو کام میں لاؤ تو غنیم روسیہ کو دم کر کے دم میں تباہ و خوار کرو، جو دور اندیش و آخر بین ہیں۔ وہ ہمیشہ ایسے امورِ خیر میں جان دینا ذریعۂ مغفرت سمجھتے ہیں۔ جب خدا نے ہمیں ایسا گردوں مدار و جم اقتدار، بادشاہ دیا ہے جو اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ ایک مقام پر دونوں لشکر آمنے سامنے مورچہ باندھ کر منتظر ہیں کہ غنیم کی طرف سے گولی چلے تو ہم جواب دیں آخر کار روسی گولہ اندازان کی توپوں پر بتیاں پڑیں اور گولہ چلا ہی تھا کہ طرفین سے آگ برسنے لگی:۔

دو لشکر چو دریائے آتش دماں — کشادند باز از کمین ہا کماں
دگر بار در گار زار آمدند — بشیر افگنی در کس کار آمدند

در اے جگر تاب و فریاد زنگ
ز سر مغزمی بُرد و از روی رنگ

ایک شبانہ روز یہی کیفیت رہی اور ہزاروں نوجوان زخمی اور مقتول ہوئے۔ ادھر دس کی لاشیں پھڑک رہی تھیں ادھر بیس زخمی کراہتے ہیں۔ کوئی تڑپتا ہے کہیں مردہ پڑا ہے۔ آدھی رات کو دست بدست جنگ ہوتی ——— طرفین کے سپاہیوں نے شجاعت کی داد دی۔ اس وقت آپ کے خادم نے للکارا کہ اور وسیان ناہنجار، خبردار' اور:۔

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغ شرر فشاں — شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
آواز دی زمیں نے کہ یا حافظ جہاں — دہشت سے تھرتھرا گیا مریخ آسماں
ثابت ہوا کہ چہرۂ مہتاب کٹ گیا — غل تھا کہ فوج روس کا دفتر الٹ گیا

حاضرین: شاباش آزاد۔ شاباش۔ آفریں باد۔

قاضی:۔ ایسے مومنوں کے لئے خلدِ علیین میں جگہ ہے۔

مرزا:۔ حق ہے۔ دنیا میں عزت، عقبیٰ میں مرتبۂ اعلیٰ۔

مفتی:۔ تہ دل سے ان صاحب کے لئے دعا نکلتی ہے۔

حاضرین: خدا اس شخص کی دلی آرزو بر لائے۔ آمین۔

آزاد:۔ جس کی طرف گھٹنا ٹیک کر شمشیر تو پیکر چمکائی، چوندھیا دیا۔ معلوم ہی نہ ہوا کہ کب چمکی اور کب گلے پر آئی:۔

اترے گلے سے جس کے اسی کو خبر نہ ہو

کاٹے گلے ہزار کے اور خوں میں تر نہ ہو

یہ کہہ کر آزاد پاشا نے نیام زریں سے وہ تیغ دودم لنگر دار محرابی خارشگاف نکالی اور چمکائی۔ لوگوں نے اٹھ اٹھ کر، تلوار کو چوم چوم لیا اور کہا کہ یہ تلوار اسی قابل ہے کہ غنیم اسے گلے لگائیں۔

اس جنگ میں کوہ قاف کی اُس وختِ شکرلب کا خط میں نے پایا جس کا مطلب یہ تھا۔

پیارے آزاد آج کل اخبارات میری روح کی غذا ہیں۔ میری آنکھیں تمہارے نام کو فوراً تلاش کر لیتی ہیں۔ او ظالم، او دستگیر خط تو بھیجا کر۔ یہاں جان پر بن آئی ہے اور تم نے وہ سکوت اختیار کیا ہے کہ الاماں۔ بھلا حضور ہی انصاف کریں کہ جب عاشق میدان جنگ میں ہو اور خیر و عافیت کی خبر معشوق کو نہ ملے تو زندگی تلخ ہو یا نہ ہو۔ تم اور بیوفائی افسوس۔ صد افسوس تم سے یہ امید نہ تھی:۔

یوں تو منہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو

تب میں جانوں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے

حضراتِ سامعین:۔ مس میڈا پر میں کچھ اس وجہ سے نہیں ریجھا تھا کہ وہ سمن سینہ و صبح عارض ہے، بلکہ اس کے لاتعداد اور غیر محدود احسان کے بارے میری گردن نہیں اٹھ سکتی۔ یوں تو خدا کے فضل سے جس مقام پر گیا، اچھی اچھی سیم ساق شعلہ رو پریاں ہزار جان سے عاشق ہو گئیں۔ ایک مقام پر وہ صورت دیکھنے میں آئی کہ میں کیا عرض کروں۔ دہن تنگ مرکز دائرہ عیش۔ زنخدانِ سیب سیمین زلفِ دراز کمندِ عنبرین، ابرو، سیہ تاب۔ مژگان گران خواب چال وہ مستانہ کہ کبک دری کے ہوش اُڑائے:۔

بہر چمن قد موزونِ او خرام کند

ز طوق فاختگان سرو چشم دام کند

مجھے دیکھا تو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ مگر کج ادائی کے ساتھ سوچا کہ جاتا ہوں تو خوف ہے۔ واللہ اعلم۔

کس کی بہو، کس کی بیٹی ہے۔ کوئی مرد اس کا کوئی عزیز دیکھ لے۔ نامحرم کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر دل میں شک ہو مگر نہ رہا گیا حکم کی تعمیل ہوئی۔ آنکھیں صباحت حسن سے گلرنگ جیسے ہی میں گیا۔ اپنی زبان میں کچھ پوچھا، میں نے اشارے سے کہا میں نہیں سمجھا تو وہ رنگین و معشوقہ فرانسیسی زبان بولنے لگی۔

معشوقہ :۔ تم کس ملک کے رہنے والے ہو، اور کہاں جاتے ہو؟

میں :۔ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں اور روم جاتا ہوں۔ اس وقت تمہارے جمال مبین نے مجھے بالکل فریفتہ کر لیا۔۔۔

معشوقہ :۔ روم !ــــ اس جنگ و نبرد کے وقت میں

میں :۔ ہاں اگر زندگی ہے تو خیر ورنہ یا قسمت یا نصیب۔

معشوقہ :۔ ہم نہ جانے دیں گے۔ تم نے ہمارے ہاں چوری کی ہے۔

میں :۔ (متحیر ہو کر) کیا! چوری!! سپاہی اور چور؟

معشوقہ :۔ بے شک تم نے ایک چیز ہم سے چرالی ہے۔

میں :۔ جانِ من تم کو دھوکا ہوا ہے۔ میں اور چوری۔

معشوقہ :۔ اگر دھوکہ تھا بھی تو اب یقین ہو گیا۔

میں :۔ خوبرو ظالم تو ہوتے ہی ہیں۔ مگر تم اظلم ہو۔ جس خدا نے ایسی پیاری پیاری صورت دی ہے وہی خدا ہم کو دل بھی ایسا دے کہ میرے اوپر رحم کرنے لگو۔

معشوقہ :۔ تمہاری دعا خدا نے قبول کر لی۔ سمجھے۔

میں :۔ شکرِ خُدا۔ مگر ایک درخواست ہے۔

معشوقہ :۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم نے چوری کی اور اب صاف صاف کہتی ہوں کہ تو میرے جسم سے میرا دل چرا لے گیا۔

میں :۔ اللہ اللہ خوبرو، اور سرو قامت، اور گل عذرا تو ہو ہی ماشاء اللہ ظریف اور بانع و بہار بھی ہو ــــ اب التماس قبول کرو اور ایک بوسہ لینے دو۔

معشوقہ :۔ (مسکرا کر)۔ بڑے جلد باز ہو۔ کیا مفت کے رخسار پاتے ہیں، ان رخساروں کے بوسہ لینے کے لئے بڑا نصیب چاہیئے۔

میں : خدا جانتا ہے اس وقت بڑی مایوسی ہو گی۔ بس یہ سمجھ لو کہ درد دل کا علاج اس وقت بوسہ ہی ہے

معشوقہ :۔ میں بے غور کیے ہوئے کسی مریض کا علاج نہیں کرتی۔

میں :۔ اے ہے توہم سمجھ گئے کہ یہ درد لا علاج ہے۔

درماں میں مرے طبیب کو غور ہے آج
معلوم ہوا مزاج بے طور ہے آج

اس حال میں کل تلک تو جینا معلوم
آج آؤ کہ زندگی مری اور ہے آج

معشوقہ :۔ دیکھو خوب یاد رکھو کہ جس قدر لگاوٹ تم اس وقت کر رہے ہو، اسی قدر میرا دل قابو سے جاتا ہے۔ سنو میں ایک امیر زادی ہوں۔ والدین نے قضا کی اور دولتِ کثیر چھوڑ کر مرے۔ میں سوچتی تھی کہ کسی غیر ملک کے باشندے کے ساتھ شادی کر لوں اور اسی کے ہمراہ اسی کے وطن میں جا کر رہوں۔ اب آج خدا نے تمہاری صورت دکھائی۔

میں سمجھ گیا کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں اب اُسنے بے طور لگاوٹ بازی کرنا شروع کی ہے۔ تیر حسن دلآویز ستم تھا۔ وہ جو بن کر میں کیا عرض کروں۔

معشوقہ :۔ اب یہ بتاؤ کہ ہماری خواہش پوری ہوگی یا نہیں؟

میں :۔ ابھی ذرا کسی قدر غور کے بعد کہوں گا۔

معشوقہ :۔ (چھری نکال کر) او بدبخت تو نے پھر لگاوٹ کی باتیں کیں ـــ اب تو ہے اور میری چھری ہے۔

میں :۔ (گردن جھکا کر) سر حاضر ہے۔ مگر دل پرایا ہے۔ اس پر آپ کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔

معشوقہ :۔ (جھلا کر) کوئی ہے۔ اس کو جانے نہ دینا۔

بس دو حبشی آئے بڑے ننگے موٹے تازے۔ اغل بغل بیٹھے اور وہ معشوقہ قہر جمال۔ بد دماغ ہو کر چلی گئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ گناہ بے لذت اسی کو کہتے ہیں۔ اگر زلف چلیپا چھوٹا اور سانپ ڈستے تو اپنے جرم پر منفعل ہوتا، اگر لعلِ لب کا بوسہ لیتا اور ایسے کی کنی کھلاتی تو بھی کچھ لطف حاصل ہوتا۔ بوس و کنار کی نوبت آتی اور اس گناہ کے عوض شاید اجل سے ہم آغوش ہوتا۔ تو بھی سوچتا کہ جرم کی سزا ہے۔ مگر کر تو ڈر اور نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ خاموش۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ یہ رباعی یاد آئی :۔

اے خواجۂ خواجگان رحم خشم و عتاب
کیا تاب کہ دے سکے کوئی تجھ کو جواب

گر جرم کا ہے وزن کرنا ٹھہرا
انصاف سے کر اپنے کرم کا بھی حساب

اپنی حالت زار دیکھ کر بے اختیار رونا آنے لگا :۔

ہیں خون فشانیاں عبث اے چشم اشکبار
گر کام دل بگریہ میسر شدے زیار

صد سال میتوان تمنا گریستن

بے صرفہ ہائے روتی ہیں کس مدتوں سے خوں
عمرم بگریہ ہائے ہوس صرف شد کنوں

عمر دوبارہ بایدو درما گریستن

نالۂ دل شگاف و نعرۂ تاب گسل نے اثر دکھایا۔ وہ زن شوخ پھر آئی اور یوں ہم کلام ہوئی۔

معشوقہ:۔ مجھے تم بڑے بیوقوف نظر آتے ہو۔ غضب خدا کا، جس شخص کو ایسی جمیلہ جوان عورت ملے اور جو ثروت و دولت لے کر آسکے، ساتھ چلدے وہ شادی سے انکار کرے۔

میں نے لجاجت اور منت سماجت سے کہا کہ میں غریب الوطن آدمی ہوں۔ مجھے دولت و ثروت، جاہ و حشم سے مطلق سروکار نہیں۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دولت عطا کی ہے اور تیسری شادی بھی ہوگی۔ میں حسن آرا بیگم سے اقرار کر کے آیا ہوں کہ بعد واپسی شادی کروں گا، اب میں کسی اور پر نظر نہ ڈالوں گا۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ حبشیوں نے بھی سمجھایا کہ جس شخص کو آپ سے اس قدر انکار ہے اس سے اصرار کرنا کیا معنی۔ خدا خدا کر کے وہاں سے چھٹکارا پایا۔

حاضرین:۔ حسن آرا کے ساتھ تم نے سچی محبت کا اظہار کیا۔ آفرین ہے۔ بیگم صاحب کو تمہارا شکر گذار ہونا لازم ہے۔

مرزا:۔ بیشک، بے شک۔ شکر گذار ہونا چاہئے۔

ایسی ایسی عابد فریب خاتونیں خود درخواست کریں اور حسن آرا کے خیال سے یہ ان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔

سبحان اللہ:۔ ؎

گوہر پاک تو از مدحت ما مستغنی ست

دستِ مشاطہ چہ با حسنِ خداداد کند

مرزا:۔ بڑا نیک نام حاصل کیا تھا۔ چشم بدور۔

حاضرین:۔ ہر مسلمان ان کو اپنا سچا دوست سمجھتا ہے۔

مرزا:۔ دریں چہ شک۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں۔

حاضرین:۔ حسن آرا بیگم بڑی خوش نصیب ہیں۔

آزاد:۔ حضرات میرے دل اور دماغ سے کوئی جانفشانی کا حال پوچھے، میرے پاؤں سے کوئی آبلے کا لطف سنے۔ جب جا کے خدا نے یہ دن نصیب کیا۔ ورنہ میں تھا اور آہ شرربار اور یاس کے اشعار:۔ ؎

جذبِ دل زور آزمانا چھوڑ دے　　پائے نازک کا ستانا چھوڑ دے

جان سے جاتی ہیں کیا کیا حسرتیں　　کاش وہ دل میں بھی آنا چھوڑ دے

گوشِ نازک پر کسی کے رحم کر　　جوش افغاں غل مچانا چھوڑ دے

داغ سے میرے جہنم کو مثال

تو بھی واعظ دل جلانا چھوڑ دے

ہوں وہ مجنوں گر میں زنداں میں رہوں　　فصلِ گل گلشن میں آنا چھوڑ دے

لب پہ حرفِ آرزو کا خون ہوا　　　رنگ پان کو منہ لگانا چھوڑ دے

آہ میری کب دعائے نوح تھی

چشم تر طوفان اٹھانا چھوڑ دے

الغرض اس بت سیم بدن کے ذہن میں یہ بات آگئی اور مجھے رہا کر دیا۔ ایک مصیبت ہو تو بیان کروں۔ ہزاروں مصیبتوں میں گرفتار ہوا تھا۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ نصیب پھر آئے اور خوشی کے دن دکھائے۔ میں اکثر اپنے دل کو ڈھارس دیتا تھا کہ :۔ ؎

دلا چند باشی زغم ور خمار　　　سراز جیب مستی جو عشرت بر آر

حیاتِ آبد چو بمیخانہ رو　　　کہ بخشد شراب کہن جان نو

بگیر آب از زمزم و کن وضو

چو دست امانت دہی با سبو

ہاں مجھ سے راہ میں ایک قصور البتہ ہوا تھا کہ جب ہمارا جہاز غرق ہو گیا اور میں پیرتا ہوا جزیرۂ روم میں پہنچا تو اس وقت اس قدر سردی کھائے ہوئے تھا کہ خارج از بیان ہے۔ ٹھٹھر رہا تھا۔ ایک شخص نے شراب دی اور میں نے پی لی۔ اس شراب کا نام جمیکا رم ہے۔

ایک :۔ کچھ ہرج نہیں بطریق دوا بدرجۂ مجبوری جائز ہے۔

دوسرا :۔ عدم واقفیت میں پی لی۔ معاف ہے۔

تیسرا :۔ بابا در توبہ باز ست۔

آزاد :۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے شراب بجھ کر پی۔ بھولے چوکے سے نہیں پی، بلکہ جان بوجھ کر پی مگر وقتِ واپسی مصر میں توبہ کی۔ مفتی اسمٰعیل آفندی گواہ ہیں، عین کانسل فرانس کی کوٹھی کے سامنے مسجد ہے، وہاں توبہ کی تھی۔

قاضی :۔ بس۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ؛

مرزا :۔ جی ہاں۔ اور اس وقت یہی علاج تھا۔

آزاد :۔ بے شبہہ۔ واقعی اگر دخترِ رز کو اس وقت منہ نہ لگاتا تو جان پر آتی۔ میں بے بدرجۂ مجبوری و بحالت مایوسی پی لی :۔ ؎

بیا ساقی آن ہمدم جان بیار　　　کہ دردِ سر است اختلاطِ خمار

بمن دہ کہ ہستم ہوا خواہ مئے　　　چو جام بود چشم در راہ مئے

ازان می رساند آنکہ کیف بلند — درافگند افلاک را در کمند

سخن دگر زند لاف افسوں گری

کہ پیوستہ در شیشہ دارد پری

خیر اگر گناہ ہے تو حضرت لسان الغیب حافظ شیراز بچالیں گے۔ اس پر فرمائشی قہقہہ پڑا۔

۱۔ اچھے کو مرشد بنایا پیچ ہی :- ؎

بامر بدان رد بسوئے کعبہ چون آریم چون

رو بسوئے خانۂ خمار دارد پیر ما

حضرات سامعین۔ ایک خط جو محبوب شیریں ادا حسن آرا بیگم نے اپنے ہمشیرہ مکرمہ کے نام بھیجا تھا، وہ آپ کے سامنے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس سے اس گل اندام نازک اندام کے دل کی کیفیت صاف معلوم ہو جائے گی۔

میری پیاری بہن، خدا کرے ہمیشہ خوش رہو۔ اللہ وہ دن دکھائے کہ ہم تم ایک دسترخوان پر کھانا کھائیں۔ باہم چہل، ہنسی مذاق ہو آمین۔ اب ذرا میرا درد دل سنو۔ یہاں ایک جوان ماہ رو قوس ابرو پری زادا، آزاد فرخ نہاد آیا تھا۔ جوان نیک طینت اور پاکباز اور نامی گرامی شعراء کے ساتھ دمساز ہیں۔ اصرار کیا کہ نکاح ہو۔ ساعت سعید کو بیاہ ہوں۔ میری زبان سے نکلا کہ روم جایئے۔ مسلمانوں کو روسیوں کے حملے سے بچاتے۔ نام کر کے آؤ، اور تمغے لٹکاؤ تو کیا مضائقہ۔ وہ ایک ٹن کا آدمی۔ فوراً منظور کر لیا اور مجھے اطلاع بھی نہ دی اور چل کھڑا ہوا۔ اب فراق مارے ڈالتا ہے دل قابو میں نہیں۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں ابھی ناکردہ کار ہوں۔

عشق کے صدمے اٹھانے کو جگر بھی چاہئے ؏

یہاں جگر پاش پاش ہو گیا اور ابھی بسم اللہ ہی ہے۔ ؎

الایا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

کہ عشق آسان نمود اول دلے افتادہ مشکلہا

وہ بمبئی ہی کی راہ سے روم جائیں گے۔ تم سرویہ ہوٹل میں پتہ لگا کر ان کو دولہا بھائی کے ذریعے سے بلواؤ اور میرا خط پڑھواؤ۔ اتنا ضرور لکھنا کہ کیا مروت اسی کی مقتضی تھی کہ مجھ شہید خنجر کشتۂ تیغ وفا کو تڑپاؤ۔ ؎

ندانم ترا اور دل چہ افتاد

کہ دادی صحبت دیرینہ برباد

اس کی تصویر شناخت کے لئے بھیجتی ہوں۔ میرا حال اللہ ہی جانتا ہے ؎

بیماری عشق لا دوا ہے — اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

کچھ روگ جو درپے خلش ہو | درماں کے لئے دوا دوش ہو
آخر یہ تو جی سے اپنے ہے تنگ | ایسا نہ ہو لاتے اور کچھ رنگ
مجنوں ہو اگر تو فصد کیجئے | سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے
کریاد کہیں چہ دفن کو
کودے نہ کنوئیں میں باولی ہو

سپہر آرا روز طعنے دیتی ہے کہ ایسی ہی محبت پھٹ پڑی تھی تو بھیجا کیوں، مگر دل گواہی دیتا ہے کہ آزاد سرخرو آئے گا۔

اب میں سب صاحبوں سے رخصت ہوتا ہوں اور جناب باری سے دعا مانگتا ہوں کہ سلطنتِ رفیعہ روم کو ترقی روز افزوں نصیب، اور اہلِ روم تشئید بنائے مواخات میں زیادہ ساعی بالخیر ہوں۔ آمین۔

سامعین و حاضرین نے اس زور سے تالیاں بجائیں کہ کمرہ گونج اٹھا۔ جب جلسہ برخاست ہوا تو اکثر علماء و فضلاء آزاد کے پاس آئے اور کمالِ تپاک اور محبت کے ساتھ ہمکلام ہوئے۔

قاضی :۔ سبحان اللہ سبحان اللہ ــــ کیا خوب تقریر کی ہے۔

آزاد :۔ تسلیم۔ تقریر تو بجز یہ سب آپ کی مہمان پروری اور ذرہ نوازی ہے۔ کل اناء تیر شح بما فیہ

مفتی :۔ صاحبِ سیف اور صاحبِ قلم۔ دونوں باتیں حاصل ہونا آسان امر نہیں ہے۔ یہ خدا کی دین ہے۔

محدث :۔ حضور سلطان المعظم نے بھی آپ کی قدر کی۔ بہت مغتنم بادشاہ ہیں۔ ہوا لسلطان اکبر السلطان، مالک الارض والسماء و نحن جیاد احقرون قابلون للعدم والفناء باد ینا شکر۔ عشر الوف احسانہ بساعۃ من الساعات۔

آزاد :۔ (مرزا صاحب سے) حضرت ان صاحب کا نام لکھ لیجئے۔

مرزا :۔ (مسکرا کر) بہت خوب درجِ رجسٹر ہیں۔

آزاد :۔ اس عشق نے ہمیں خدا جانے کیا کیا دکھایا ہے۔

این عشق ندانم از کجا خاست | کز ہر رگ و ریشہ ام بلا خاست
ایک جان و ہزار برق اندوہ | کاہے چہ کند باتشین کوہ
اے فتنۂ چہ خاستی بکینم | دے خرچ چہ داری از یکینم
بر قتل منت چہ لشکر ست این | آئین کدام کشور ست این،
اے کوکب بخت سوختم وائے
بر آبلۂ جگر بہ بخشائے

قاضی :- جناب باری نے آپ کی ذاتِ مجمع صفات میں قابلیت اور علمیت اور شجاعت اور مروت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ چشم بددور آپ کا دل صفا، منزل آئینہ ہے آپ نے ہم لوگوں کو رہینِ منت اور مرہونِ عنایت فرمایا اور آج کی تقریر سے ہم لوگ اور بھی محظوظ و مسیح ہوئے۔ خدا آپ کو اجر نیک دے۔ آمین۔

آزاد :- بزرگوں کی دعا سے تیسرے دل کی ایک آرزو تو بر آئی۔ اسی طرح شاید خدا کے فضل و کرم سے اور امیدیں بھی پوری ہوں گی۔

قاضی :- بیشک آپ کی آرزوئے دلی بر آئے گی۔

آزاد فرخ نہاد کی آمد آمد کی تمام بمبئی میں دھوم مچ گئی۔ اس شب کو بمبئی کے رئیس اعظم پارسی نے جس کے فرزند دلبند کو آزاد نے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ ان کو باصرار و انکسار تمام مدعو کیا۔ مکان دلہن کی طرح سجا سجایا تھا۔ جب آزاد اس رئیس کے دولت خانۂ طرب کاشانہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وفورِ نورِ چراغان اور جھاڑ کنول ہانڈی کی روشنی سے چکاچوند کا عالم ہے۔ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ جدھر نگاہ جاتی ہے حورانِ بہشتی ہی نظر آتی ہیں۔ وہ جھمگڑا کہ پریانِ شترمابستان چین رشک کھائیں۔ یہودیوں اور پارسیوں کی مہ وشاں زریں کمر کا جھمگٹا ستم ڈھاتا۔ کوئی سامری فریب کوئی دشمن صبر و شکیب۔ سیم ساق شہرۂ آفاق۔ سمن سینہ غمزہ زن نسرین بدن، پستہ دہن :

ہر نگارے بسان تازہ بہار	ہمہ در دستہا گرفتہ نگار
لب لعل چو لالہ در بستان	خندہ شان چون بہار خوزستان
دست و ساعد پر از علاقۂ زر	گردن و گوش پر ز لولو تر
بر کشیدند مرغ وار نوا	در کشیدند مرغ مرا زہوا
بردہ آواز شان زردے فریب	ہم زما ہی و ہم زماہ شکیب

یک جہان پر نگار نورانی

تیز رو چون خیال روحانی

ناظرین کو یاد ہو گا کہ جب اوّل مرتبہ آزاد بمبئی سے عازم روم ہوئے تھے۔ اس عالی مرتبت پارسی نے دعوت کی تھی۔ وہی سماں ان کی نظروں تلے آج بھی پھر گیا۔ وہی پریوں کا دنگل، وہی چہل پہل۔ وہی پریوں کے جمگھٹے۔ وہی معشوقوں کے جھمگڑے۔ کوئی اٹھکیلیاں کرتی تھی، کوئی ناز دلربا سے قدم دھرتی تھی، کوئی فرط مستی سے ہمجولی کو چوستی تھی۔ کوئی صحن میں ابر کی طرح جھومتی تھی :

رخ آراستہ دستہا زر نگار	بشادی دویدند از ہر کنار
مغانہ مئے لعل بر داشتہ	بیاد مغان گردن افراشتہ

همہ کارِ شانِ شوخی و دلیری ۔۔۔ گہہ افسانہ گوئی گہہ افسونگری
جز افسون چراغی نیفروختند ۔۔۔ جز افسانہ چیزے نیاموختند
فروہشتہ گیسو شکن در شکن
یکے پائے کوب و دگر دست زن

اب سنئے کہ ان حوران زاہد فریب میں ایک مہنم عربدہ

جو تند خو نعیما گر کاروانِ ہوش ۔۔۔ عدوئے صبر آفت کوشش

موجد رسم کج ادائی افشان جبین خود نمائی۔ سبحان اللہ۔ اعلیٰ کے ہوش اڑانے والی، نسیم باغ وجاہت، شمیم طرہ صباحت پیشانی نورانی سے بارقہ حسن درخشاں۔ مطلع جبیں سے نورجمال مثل شعاع مہر منیر تاباں، رشک عرب و، ہندوستان، روکش، عرائس جہاں، خرد سوز طاوس زیب چمن افروز عابد فریب۔

فرماندہ خیل کامیابان ۔۔۔ پیشانی اور بخت تابان
اور سرور خیل و خیل رایان ۔۔۔ بردرگہ او گلاہ سایان

جن ناظرین نے فسانہ آزاد جلد اول کو غور سے پڑھا ہے، وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ غیرت بعتبان نوشاد صنم پریزاد کون ہے؟ یہ نظیر بیگم ہیں۔ جن کی تاریخ ہم حوالۂ قلم کر چکے ہیں۔ یہ پری وحشت شیریں حرکات ناز و ادا اور انداز روح افزا کے ساتھ آزاد کی طرف آئی۔ مسکرائی ہوئی، ہاتھ ملایا اور بعد محبت دادیوں ہمکلام ہوئی۔

نظیر:۔ کہئے حضرت پہچانا دل سے بھلا دیا۔

آزاد:۔ واہ! دل میں جس کی جگہ ہو اس کو کوئی بھول سکتا ہے ؎

شب چو در بزم حدیث از رخ خوب تو گذشت
شمع پیش از ہمہ انگشت شہادت برداشت

نظیر:۔ (زیرِ لب مسکرا کر) آپ نے تو سکندر اور دارا اور اچھے اچھے نامی سپہ سالاروں کو مات کر دیا۔ روم میں وہ نام کیا کہ ساری خدائی آپ سے واقف ہے۔ مگر یہ شعر آپ نے اس وقت موزوں نہ پڑھا۔ تاہم معاف کئے دیتی ہوں۔

آزاد:۔ موزوں نہیں تو کیا ناموزوں ہے شانِ خدا۔

نظیر:۔ جی ہاں بیشک ناموزوں ہے اس وقت مجھے دیکھ کر آپ کا یہ شعر پڑھنا ایک قسم کی لگاوٹ ظاہر کرنا ہے، اور یہ ستم ہے۔

آزاد:۔ (شرما کر) خیر قصور ہوا۔ انسان۔

نظیر:۔ حسن آرا بیگم سے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری

آزاد :۔ جی ہاں. کہئے آپ کا نکاح کسی کے ساتھ ہوا ؟

نظیر :۔ ابھی کسی نوجوان خوبرو کی قسمت نہیں کھلی.

آزاد :۔ واللہ سچ ہے ایسی مہ جبیں نازنین دیکھی نہ سنی۔

نظیر :۔ کسی قلعے کی جنگ میں آپ اشہب عُقاب طلعت کی پشت پر سوار ہو کر دریا کی طرف جاتے تھے اور سواران جرار ہمراہ رکاب ظفر انتساب تھے۔ یہ تصویر میرے پاس ہے جس وقت یہ تصویر لندن کے تصویر دار اخبار میں میری نظر سے گذری اور میں نے اپنی ہمجولیوں کو دکھائی۔ سب کی سب عش عش کرنے لگے۔

نقرہ خنگ آہنی سم اشہب عنبر غبار کوہ پیکر مرگئے صرصر تگی ہاموں گذار

کوتہ و پہن و دراز و نرم و سخت و استوار پشت و پیشانی و دنبال و سر و ساق و کمش

ایک ہمجولی نے سب کے سب سامنے آپ کی تصویر طلانگ فریب کو چوم لیا۔

عجب ہے کھینچی مصوّر نے کس طرح تصویر
کہ شوخیوں سے تو اک رنگ پر رہی کیونکر

آزاد :۔ وہ بی صاحب اگر اس وقت یہاں ہوں تو ذرا ملاقات کرا دیجئے۔ واقعی مجھ کو ان سے ایک قسم کی محبت ہو گئی ہے۔

نظیر :۔ وہ اور اس وقت یہاں نہ ہوں۔ سبحان اللہ۔

آزاد :۔ سن کیا ہے ہوں گی صاف طبع رنگین مزاج۔

نظیر :۔ ہماری ہم سن ہے، مگر بڑی چلبلی اور شوخ طبع۔

آزاد :۔ پھر اگر مضائقہ نہ ہو تو ملاقات ہو جائے۔

نظیر بیگم نے خادمہ کو حکم دیا اور وہ جا کے ایک پر کالۂ آتش دوشیزہ لالہ رخ بے نظیر آفاق، نازک کمر، نازک بدن، نازک اندام کو ساتھ لائی۔ نظیر بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا آزاد بلاتے ہیں۔

آزاد :۔ مزاج شریف حضور کا ؟

نظیر :۔ اے ہے بتری شرم۔ تصویر چومتے میں شرم نہ تھی، اب حیا پھٹ پڑی ہے

پیھودن :۔ (لجا کر) واہ واہ۔ کیسی تصویر۔

آزاد :۔ حضور کے چہرے سے ثابت ہوتا ہے کہ رنگ فق ہے اور رخ گل رنگ پر عرق مثل شبنم نمودار ہو گیا ہے

نظیر :۔ چور کہیں چھپا تھوڑا ہی رہتا ہے ؟

پیھودن :۔ (شرما کر) واہ کس کو لئے مرتی ہو۔۔۔

آزاد :- سرکار قصور معاف کرنا، اور نہیں تو ایک نظر تو ادھر دیکھ لیجئے۔ ہم تو فقط ایک نظر کے سائل ہیں۔
انصاف تو اسی کا مقتضی ہے کہ جیب کا غذی تصویر کو چوم لیا تو اصل کے بھی بوسے لیں۔

نظیر :- تم خود کیوں نہیں بوسے لیتیں۔

بہودن :- واہ ان کو کیا اس میں عذر بھی ہے کچھ۔

آزاد :- (مسکرا کر) جی بجا ارشاد ہوا۔

نظیر :- اللہ اللہ اب ہم ایسے گئے گذرے۔

آزاد :- اب کیا معنی۔ اس لگاوٹ بازی کے صدقے۔

نظیر :- اچھا انہیں کو سمجھاؤ۔

آزاد :- یہ کہنے سے نہ مانیں گی۔ اللہ جانتا ہے تصویر دیکھتے دیکھتے ایسی مست ہو گئیں، جیسے بھونرا کلیوں کا رس چوس چوس کر مست ہو جاتا ہے، اور تڑ سے بوسہ لے لیا۔

خدا سے ڈرو نظیر بیگم۔ توبہ توبہ۔

بہودن :- خیر صاحب نہ سہی اب ہم بھی نہ کہیں گے :-

آزاد :-
کاٹے ڈسیں جو زلف تمہاری کبھی چھوئیں
لو اب تمہارے سر کی قسم کھا کے جاتیں ہیں

وہاں کون عورتیں آپ پر عاشق ہوتی تھیں۔ سنا کوئی بادشاہ زادی عاشق تھی ــــــ عشق بھی کیا بد بلا ہے ؟

شاہنشہ بے نبرد عشق ست
سلطان خرابہ گرد عشق ست

آزاد :- جس جوان رعنا شمائل کو خدا نے صورت زیبا دی ہے اس پر سب صورتیں ریجھیں گی۔ بہودن اور نظیر بیگم تنک تنک کر ادائے معشوقانہ کے ساتھ چہل کرنے لگیں۔ آزاد کا مطلب دونوں طرح حاصل تھا۔

بہودن :- اس چلبلے پن کا ایک روز خمیازہ اٹھاؤ گے۔

نظیر :- تمہاری طرح سے یہاں کوئی مردوں کی تصویریں نہیں، چوم لیا کرتا ہے شرم نہیں آتی۔ باتیں بناتی ہو۔

بہودن :- تم نے خود تصویر چوم لی ہو گی۔

آزاد :- جس نے تصویر کا بوسہ لیا وہ اصل کا بوسہ لیتے ہوئے کیوں شرماتے۔ مجھے برا نہ معلوم ہو گا۔

بہودن :- اے چہ خوش کیوں نہیں بجا۔

آزاد:- اس شوخی کے صدقے:-

خوبرو جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی
ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی

نظیر:- پلونا کی لڑائی کا حال بیان کیجئے۔

بیھودن:- ہاں ہم مشتاق ہیں کہ آپ کی زبان خاص سے پلونا کی جنگ کا حال سنیں۔

آزاد:- مجھے کوئی عذر نہیں۔ مگر کس زبان میں کہ سب کی سمجھ میں آئے۔ چھوٹے بڑے سب سمجھ سکیں۔

نظیر:- اردو میں کہو مگر عربی میں چھانٹیے گا۔

آزاد نے جنگ پلونا کا حال یوں بیان کیا۔

روسیوں نے پلونا کے قلعہ کو ہر چہار طرف سے محصور کر لیا تھا اور یورپین ٹرکی کے قریب قریب کل سپاہ روس جو اس جانب تھی، اسی جانب پر مور و ملخ سے زیادہ مجتمع ہو گئی۔ اب ٹرکی بھاگیں تو کدھر سے بھاگیں۔ سفر کی راہ بند ہے کوچۂ گریز مسدود۔ قلعہ دشمن بے شمار۔ ترکی بہت کم۔ سامان رسد قلعہ میں۔ واجبی ہی واجبی گولہ یوں ہی سا۔ بارود ناقص۔ فوج شل تھکی ماندی۔ روسی برق دم تازہ دم فوج۔ بارود گولہ سامان رسد سب لیس۔ رجمنٹ پر رجمنٹ جوق جوق اُنڈی آتی ہے کالم پر کالم ٹوٹ پڑتا ہے۔ جس وقت:

وہ شام الم اور وہ صحرا کی سیاہی
ترکوں کی پریشانی و اندوہ تباہی

یاد آتی ہے خون رلاتی ہے۔ یا الٰہی یہ ہو گا کیا۔ جس طرح بھڑ بھوکا بھاڑ میں چنے بھون ڈالتا ہے۔ اس طرح غنیم کے گولے پلونا کی فوج کو بھون کر رکھ دیں گے۔ افسوس کا مقام تھا:

نہ جنگ کا سامان نہ کچھ فوج ادھر ہے
لٹ جانے کا بھی شب خوں کا بھی ڈر ہے

صرف توکل بخدا۔ زار روس تار تار پر بھیجتا جاتا تھا کہ جس قدر لشکر ہو سب پلونا کی سمت روانہ کیا جائے۔ پلونا کلید خزانہ فتح ہے۔ جو راستے ترکوں کی فوج کے آنے کے تھے وہ سب روسیوں نے مسدود کر دیئے۔ بس جب میں نے خبر پائی فوراً ولایتی کمر سے لٹکائی اور گھوڑے کی پیٹھ پر تھا۔ بس بزن بزن کی آواز بن مو سے آتی تھی۔ ایک مقام پر لُٹ کے گئے وہاں خدا نے بچایا۔ بندہ صرصر تک رہوار پر سوار ہو کر معرکۂ نبرد میں ڈٹا۔ اس وقت کی کیفیت قابل دید تھی۔ گھوڑے ہم لوگوں کی رانوں کے تلے سے نکلے جاتے تھے یہ چھل بل یہ تیزی:-

دیکھی نہیں کسی نے یہ خرمی شباب میں ہے جس کے زین صاف یہ مخمل ہے خواب میں

ہماری اتواب برق بار۔ ان کی بندوقیں دوزخ شرار۔ جس وقت تلوار چلی ہے پرے کے پرے صاف تھے۔ روسی۔

بس تیغ کے چمکتے ہی معدوم ہو گئے

کوئی وار خالی نہ گیا۔ دو کے چار کئے اور ایک کے دو: ؎

ڈھالوں پہ سواروں کی وہ صمصام نہ ٹھہری　　بجلی سی میان سپہ روس نہ ٹھہری

زیر زرہ جسم بد انجام نہ ٹھہری　　اللہ ری روانی کہ تہ دام نہ ٹھہری

دریا کو بھی اس طرح کا چالاک نہ دیکھا

ایسا کبھی مچھلی کو پیسراک نہ دیکھا،

گرتی تھی پیاپے صف اعدا پہ جو شمشیر　　نیزے نہ اٹھاتے تھے سر اپنا کسی تدبیر

دہشت سے کمانیں تھیں خمیدہ صفت پیر　　پردار تھے ہر چند یہ اڑ سکتے نہ تھے تیر

روپوش جو ڈھالیں عقب دوش ہوئی تھیں۔

تلواریں بھی جوہر سے زرہ پوش ہوئی تھیں

اس مہم کا سر کرنا بڑا مشکل تھا مگر پلونا ابھی کہاں۔ ہنوز دلی دور است کا نقشہ تھا۔ وہاں سے ڈبل کوچ کیا۔ تھکے ماندے بے آب ودانہ۔ ایک پر پڑاؤ ڈالا، اِدھر اُدھر سوار بھیجے کہ کوئی گاؤں ہو تو رسد کا سامان بہم پہنچے۔ یہاں اس فکر میں تھے کہ دفعتہً ایسی خبر پائی، جس نے ہوش اڑا دیئے۔ سنا پلونا کی جانب سے گرد اٹھی ہے اور روسیوں کا رسالہ چلا آتا ہے۔ فوراً بگل ہوا۔ گو سب کے سب بالکل شل تھے مگر اٹھ کھڑے ہوتے اور مقابلہ کیا۔ ہماری فوج کی دو کمپنیاں اور تھیں، اس کے بعد خاص فوج کی بارہ کمپنیاں، ہم نے فقط ایک فوج کو بڑھایا اور باقی کاموں کو آراستہ کر کے نشیب میں چھپا دیا کہ روسی صرف اس قدر آدمی دیکھیں، اور وہ کمین گاہ سے قلع قمع کریں۔ جب جنگ کی نوبت آئی تب روسی سمجھے کہ دھوکہ ہوا مگر مشتے بعد از جنگ یاد آمد کا نقشہ تھا۔ آخر کار روسیوں نے ٹھان لی کہ جان پر کھیل جائیں

وقت ضرورت چو نماند گریز

دست بگیرد سر شمشیر تیز

ایک نامہ نگار جو قلعہ فلک شکوہ سے جنگ کی کیفیت دیکھ رہے تھے یوں رقم طراز ہیں۔ (میں واٹرلو کی جنگ میں لڑا، فرانس اور پرورش کی لڑائی میں شریک حرب تھا۔ جنگ قرمیہ میں میں نے تمغے پائے۔ روس اور اس کی مختلف جنگوں میں شریک حال تھا اور بڑا معمر اور سن رسیدہ آدمی ہوں۔ لڑکپن سے جنگ ہی کے میدانوں میں پرورش پائی تھی اور آپ سب صاحبوں کو تعجب ہوگا کہ میں معرکہ نبرد ہی میں پیدا ہوا تھا۔ کوئی شائستہ ملک دنیا کے پردے پر

ایسا نہیں، مگر ترکوں کے سے تلوار کے دھنی اور روسیوں کے سے مستقل مزاج دیکھے نہ سنے۔ آزاد نامی ایک سپہ سالار روم نے جو اپنے وقت کا سکندرِ اعظم جو فینس سیزر۔ ٹالی اور نپولین ہے وہ شجاعت ظاہر کی کہ سبحان اللہ اس کی توصیف میں زبان قاصر ہے؛ ؎

بلبل سے کبھی وصفِ گل تر نہیں ممکن　　آئینے سے اوصاف سکندر نہیں ممکن
ذرے سے ثنائے شہ خاور نہیں ممکن　　جبریل سے تعریف پیمبر نہیں ممکن

ترک شل ہو گئے تھے مگر بایں ہمہ اُنکا ہاتھ نہیں رکتا تھا اور روسی گو شل نہیں ہوئے تھے لیکن دیر تک لڑنے بھڑنے کے سبب سے پریشان تھے طرفین سے گولی چل رہی تھی اور میدانِ جنگ گرم تھا۔ آخر کار روسی بھاگ کھڑے ہوئے اور آزاد پاشا نے حکم دیا کہ (تعاقب کرو)

الغرض بعد خرابی بصرہ ہم لوگ داخلِ پلونا ہوئے۔

نظیر :۔ ابھی یہ باہر ہی لڑائی ہو رہی تھی۔

آزاد :۔ اور نہیں تو کیا؟

نظیر :۔ جب تم لوگ فوج لے کر پہنچے تو بڑی خوشی ہوئی ہوگی۔

آزاد :۔ جان میں جان آئی۔ کوس فتح بجنے لگا۔

نظیر :۔ کتنے ایک آدمیوں سے تم داخل ہوئے تھے؟

آزاد :۔ اس وقت اس درجہ مسرت تھی کہ کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ چھ ہزار کئی سو روسی گرفتار کر لئے تھے مگر اسلحہ چھین چھین کر سب کو آزاد کر دیا۔

یہودن :۔ سنا یہودیوں پر روسی بڑا ظلم کرتے ہیں۔

آزاد :۔ ہاں۔ بعض بعض اوقات پر۔

یہودن :۔ خدا ظالموں سے سمجھے گا اور سزا دے گا۔

نظیر :۔ سچ کہنا بہن۔ اب صاف صاف کہدو۔ تم کو آزاد سے محبت ہے یا نہیں۔ لگی لپٹی کی سند نہیں۔ راست راست کہہ دو۔

یہودن :۔ اگر تم صاف صاف بیان کر دو تو ہم بھی کہدیں۔

نظیر :۔ ہم سے کیا واسطہ۔

یہودن :۔ واسطہ نہیں تو جب ہی اس باری شادی کرنے کا خود ہی پیغام کیا تھا۔ ہم سے اڑتی ہو۔

آزاد :۔ اللہ اللہ یہ تو واقف کار معلوم ہوتی ہیں۔

نظیر:۔ دیوانی ہیں۔ اور سنو۔ اس وقت کہاں ہو۔

آزاد:۔ یہی تلوار جنگ میں ہمارے پاس تھی ؎

سر پر سوار کے تو کبھی یہ بغل میں تھی
گہ گردن سمند پہ گاہے کفل میں تھی

جس وقت آزاد نے پلونا کی جنگ کا حال بیان کیا، کل لیڈیاں جو اردو دیکھ سکتی تھیں آزاد کی حالت نازک، اور جوانمردی اور بانکپن پر عش عش کرتی تھیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ روسیوں نے ہر سمت سے کوچہ گریز بند کرکے اونچے مورچوں سے قلعہ معلیٰ کی دیواروں پر گولے مارنا شروع کئے۔ جس قدر توپیں لانا ان کے امکان تھا۔ سب اسی قلعہ کے گرداگرد لگادیں۔ اس طرح کی آواز گونجتی تھی کہ الامان والحذر ترکوں نے ٹھان لی کہ جان پر کھیل جائیں گے مگر یہ نہ ہوگا کہ قلعہ ہماری موجودگی میں ہاتھ سے جاتا رہے۔ سپہ سالار عساکر سلطانی کا بحر بسالت موج زن تھا اور سپاہ تو ہر مقام پر جاں بکف جاتی ہی تھی۔ اگر اس قلعہ میں بھی ویسے ہی افسر رہتے جیسے شپکاہ وغیرہ مقام میں تھے تو پلونا کا بھی قلع قمع ہو جاتا مگر اس قلعہ کا سپہ سالار غازی باحمیت، خداترس، جنگ آزما، انتہا کا جری، شیر دل، مستقل مزاج آدمی تھا۔ مجھ سے عین اس وقت جبکہ غنیم کی دھرتی دھمک اور بجلی کڑک توپوں کے گولوں نے دیواروں کو چاروں طرف سے چھلنی کردیا۔ یہ تقریر کی۔

جنرل:۔ آزاد تمہاری جرأت پر مجھے کامل بھروسا ہے؟

میں:۔ بیشک ہونا چاہیے اور ضرور ہونا چاہئے۔

جنرل:۔ اب تمہاری کیا صلاح ہے۔ بھاگنا محال اور دور از حال۔ مقابلہ ضرور ہے مگر بیکار۔ محض بے سود ہمّت ہارنا اور فوج اور سامان عدو ے روسیہ کے حوالے کردینا بزدلی کی دلیل ہے ننگ ترک ہے۔

آزاد:۔ چاہے جو ہو۔ جب دیکھئے کہ اب آخری وقت ہے۔ تلواریں سونت سونت کے قلعہ سے نکل پڑیے۔ ہرچہ بادا باد۔

جنرل:۔ بس ہماری بھی یہی رائے ہے (یہ کہہ کر جنرل نے ایک کاغذ پر آزاد کو نہایت عمدہ سرٹیفکٹ لکھدیا اور حضرت سلطان سے سفارش کی کہ اس شخص کے ساتھ سلطنت عثمانیہ جو سلوک کرے تھوڑا ہے۔

بس جب یہ کیفیت ہوئی کہ گولیاں نہیں رہیں، گولوں کا قحط ہوگیا۔ رسد ندارد۔ دیواریں برائے نام رہ گئیں۔ فوج بیدل ہوگئی ادرادھر سے گولے اور بھی سرگرمی اور تیزی کے ساتھ آنے لگے تو جنرل نے حکم دیا کہ سب کے سب مرنے اور جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ اس وقت اس طرح جوش وخروش تھا کہ خارج از بیان ہے، وہ نعرے بلند ہوتے تھے۔ کہ الامان الامان، الحذر۔ جو تھا جان بکف۔ مستعد۔ آمادہ۔ ؎

تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے
آمادہ جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے

نیام سے شمشیر عدو کش نکال نکال کر، پیادے پیدل اور سیاہ پشت توسن پر پھاٹک کی راہ سے اس طرح چلے جس طرح طوفان سخت وعظیم میں سمندر کا پانی امڈا چلا آتا ہے ایک سپاہی نے بڑھ کر آواز دی، مرنے والوں کو کون روتا ہے دوسرے نے کہا شیروں کو کون ٹوکتا ہے۔ ادھر ہماری فوج کا بیڑا کے قلعہ کے باہر آنا تھا کہ روسیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ ان کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ترکی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اس جوش کے ساتھ بے خوف نکل پڑیں گے۔ جس جانب سے ہماری سپاہ جرار نکلی اس طرف کے روسیوں کا تو واقعی قلع قمع بھی ہو گیا۔ مگر تازہ دم فوج نے ان کا بدلہ لیا جنرل گرفتار ہو گئے سخت مجروح ہوئے تھے۔ خاکسار نے ہزارہا رومیوں کو تہ تیغ کیا اور تنے چند مردانِ کاری کے ساتھ نلوہ زیچ آیا ورنہ خدا جانے اس وقت ہڈیاں کہاں ہوتیں۔

اس کے بعد محفلِ رقص وسرور آراستہ ہوئی۔ آزاد نے ناچ دیکھا۔ طعامِ لذیذ نوشِ جان کیا اور تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہوئے۔

دوسرے روز ایک جلسے میں اکثر حکامِ یورپین نے ان سے ملاقات کی اور ان کی تندرستی کا جام پیا۔ کئی جلیل القدر حاکم ان کی شجاعت وواقفیتِ فنونِ جنگ کی توصیف میں عذب البیان ہوئے۔

اب سنئے کہ ادھر میاں آزاد نے روانگی کی تیاری کی۔ ادھر حسن آرا بیگم کا خط دن سے موجود۔ بیگم صاحب نے پڑھا تو مرزا صاحب کو بلوایا اور کہا آزاد کو پڑھ کر سنا دو۔ آزاد نے اس کے جواب میں بیگم صاحب کی یوں تشفی کی۔ سنئے حضور یہ تو آپ کو کامل یقین ہو گیا کہ یہ دونوں امیرزادیاں اور ٹن کی عورتیں ہیں، اب اس امر کا ثبوت کہ یورپین جن کی قوم کی یہ ہیں ان کی توقیر وعزت کریں گے یا نہیں۔ مرزا صاحب سے دریافت کر لیجئے کہ آج کے جلسے میں سب شرکا معزز افسر تھے۔ کوئی جج، کوئی چیف جسٹس، کوئی بیرسٹر، کوئی سکریٹری، کوئی کمشنر، اور ان کی لیڈیاں بھی ساتھ تھیں۔ پوچھئے ان دونوں خاتونوں سے، کس طرح بے تکلفی اور تپاک سے گفتگو کرتی تھیں۔ ذرا غور کر لیجئے۔ حسن آرا اس بارے میں جس قدر مجھ سے ملول ہوں، اسی قدر ان کی محبت کا اظہار ہے وہ نہیں چاہتیں کہ مجھے کسی اور لولی شوخ کی کنار میں دیکھیں۔ مگر آپ ان کی تسلی کیجئے۔

بیگم:۔ صفت چہ خوش۔ کچھ مٹھائی کھلوایئے تو کیا مضائقہ ہے۔

آزاد:۔ جان تک حاضر ہے مگر سفارش کیجئے۔

بیگم:۔ میں اسی وقت جواب لکھے بھیجتی ہوں۔

آزاد:۔ تسلیم۔ خانہ احسان آباد۔

آزاد نے کہا لائیے میں مسودہ لکھدوں آپ نقل کر لیجئے گا۔ یہ کہہ کر جواب خط منجانب بیگم صاحب یوں لکھا۔

میری پیاری بہن خوش رہو۔ تمہارے دو تابڑ توڑ خط آئے:۔

مسرت نامہ راچون برکشادم گئے بردیدہ گہہ برسر نہادم

آزاد کے ساتھ دو دوشیزہ ولایت ترا آئی ہیں، دونوں حسین اور شوخ اور نظرف اور سیم ساق۔ مگر تمہاری رائے غلط ہے۔ تم آزاد کی طرف سے شک نکال ڈالو۔ وہ جوانِ صالح ہے ایک دوشیزہ کا نام مس میڈا ہے۔

نسرین بچمن برسد دگر بدن البینست باغیچہ صبا دم نزند گرد ہن الینست

اور دوسری کا نام مس کیلرسا۔ یہ دونوں ہماری مہمان ہیں، ہم کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے :۔

چوں شرف شوی بہمانی ہرچہ داری فدائے مہمان کن

در تره مردی و دلداری! ہرچہ دلخواہ اوبود ہمان کن،

اگر ان دونوں میں ہم کوئی بات خلاف پاتے تو ان کی مہمانی ہرگز قبول نہ کرتے۔ میں نے پہلے ہی آزاد سے کہہ دیا تھا کہ جب تک مجھے تشفی نہ دوگے کہ یہ دونوں کون ہیں؟ اور کیوں آئی ہیں تب تلک میرا دل تمہاری طرف سے صاف نہ ہوگا۔ مس میڈا کو وہ اس اقرار سے لائے ہیں کہ میاں اس کے ساتھ شادی کریں۔ مگر بہن اگر یہ نہ ہوتی تو آزاد بمبئی کے عالموں، اور صاحب لوگوں اور میموں کی گفتگو کا حال درج ہے اس کو پڑھ کر تمہیں خود حسرت ہوگی کہ آزاد کس قماش کا آدمی ہے۔ جنگ میں رقص و سرور کی محفل تو تھی ہی نہیں وہاں تو :۔

بجائے نغمہ نے صوتِ دلکش حفاظ

بجائے جرعۂ مے مادۂ محبت دوست

اب خدا کے لئے ایسے جگر خراش کلمے نہ لکھنا۔ میں پرسوں یہاں سے روانہ ہوں گی اور سب باتیں سمجھا دوں گی۔ خاطر جمع رکھو۔ اماجان کی خدمت میں بندگی۔ سپہر آرا کا حال تو لکھا ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنی بہن کو خط لکھا، ہمارے نام کچھ نہیں۔ سچ ہے ہرچہ ازدل دور از دیدہ دور۔

آزاد :۔ بس اس کی نقل کر دیجئے تو احسان ہے۔

بیگم :۔ اچھا دو چار باتیں اور بڑھا دو چاہو۔

مرزا :۔ نہیں بس کافی ہے اب زیادہ سر مغز فی فضول ہے۔

آزاد :۔ آپ کی توجہ سے سب امور رو براہ لائیں گے۔

ع شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمتہائے تو

بیگم :۔ اب بہت باتیں نہ بنائیے۔

مرزا :۔ باتیں نہیں بناتے۔ تم کو در پردہ تناتے ہیں۔

آزاد :۔ تو اب آج کوچ کی تیاری ہے۔

مرزا :- خوجی کو یہیں چھوڑ دیجئے گا کیا؟

اب سنئے کہ خوجی کی لاکھ تلاش کی گئی مگر پتہ نہ ملا۔

فرضی شتاب جان نے ان کو کہیں کا نہ رکھا۔ آزاد کو کمالِ افسوس ہوا اور کئی اخباروں میں انھوں نے خوجی کا حلیہ اور اشتہار چھپوا دیا۔

دوسرے روز میاں آزاد بیگم صاحب سے رخصت ہوئے، بیگم صاحب نے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ اسٹیشن پر ہزاروں آدمی جوق جوق جمع تھے، ریل پر سوار ہوئے تو درجۂ اول میں ایک یورپین کے ہاتھ میں اردو اخبار دیکھ کر ان سے مانگا اور سب سے پہلے یہ اشتہار نظر سے گذرے :-

سوائے خداوندِ ارض و سما — نہیں، ہے سزاوار حمد و ثنا
زبان تر زبان اس کی تعریف سے — قلم خوش رقم اس کی توصیف سے
ہوا بلبل اس سے ہے رنگین بیان — ہوئی طوطی اس سے ہے شیریں زبان
بھرا ہے عجب شوق میں اسکے ذوق — کہ ہر شوق پر اس نے پایا ہے فوق
وہ دل ہو گیا رو کش کوہِ طور — بھرا جس میں اس کی محبت کا نور
جہاں میں اس کا ہے جلوہ عیاں — دلِ آشنا پر نہیں کچھ نہاں
اسی کی تو بو سے ہی مہکتا ہے گل — کہ جس پر یہ بلبل مچا ہے غل
عیاں شمع میں بھی اسی کا ہے نور — یہ ہے حق میں پروانہ کے کوہِ طور
تماشائے قدرت تو ہر شے میں ہے — دف چنگ و سارنگی رونے میں ہے
عذار گل شور بلبل میں ہے — قد سرو کو کوئے صلصل میں ہے
لب و ابرو عشوہ کاراں میں ہے — تب و نالہ عشقبازاں میں ہے
کہاں ہو سکے حمد اس کی ادا — نہ کلک رواں ہے نہ فکر رسا
زبانِ قلم تو یہاں ہے قلم — پھر کیسے رہے اس میں تابِ رقم
رہ فکر میں بھی رسائی نہیں — مگر حمد کی حد نہ پائی کہیں
اب اس بحرِ حیرت میں جرات نہ کر — یہاں لغزشِ عقل کا ہے خطر
کہ ہے یہ ثنائے خدائے قدیر — نہیں مدح شاہ دلیر و وزیر
جو ہو عقل کو کچھ رسائی بیاں — کرے حمد محمود کی کچھ یہاں،
اب اس مہلکہ سے بچا چاہئے۔ — مگر نعمت حضرت کہا چاہئے

کہ نعتِ نبی بعد حمدِ خدا
وسیلہ ہے یہی بر قبولِ دعا

اسی سے ہے آغاز ہر کام کا
یہی ہے سببِ حسنِ انجام کا

پلا ساقی وہ بادۂ فیض کوش
کرے نشۂ معرفت جس سے جوش

کہ نعت حبیب خدا ہو بیان
ملے اُس سے مقصود ہر دو جہاں

زبان پاک کرکے بہ مشک و گلاب
کر اے خامہ نعت رسالت مآب

رسول خدا، سرورِ انبیا،
حبیب الٰہ و شہ اتقیا

محمد شہنشاہِ ہر دو جہاں
بشمشیر اعجاز گیتی ستاں

پناہ امم شافع مذنبیں
امام رسُل خاتم مرسلیں،

کیا جس نے ظاہر ہدایت کا نور
جہاں سے ہوئی ظلمتِ کفر دور

جہاں ان کے سایہ میں معمور ہے
اسی سے نظر سے وہ مستور ہے

ہوا اُن کے باعث سے پیدا جہاں
اگر وہ نہ ہوتے، نہ ہوتا عیاں

یہ رتبہ جو معراج میں پا گئے
ابھی تو گئے اور ابھی آ گئے

نہیں ان کے اعجاز سے کچھ عجیب
کئے ہیں بہت ایسے امر غریب

نہیں اب زباں میں مری کچھ تواں
جو اوصاف اُن کے کروں کچھ بیاں

ہمیشہ ہو ان پر درود و سلام
تمام آل و اصحاب پر بھی مدام

اب اے ساقیا جام معنی پلا۔
کہ ایسا کہوں ایک قصۂ نیا

ہر ایک داستاں اس کی میخانہ ہو
ہر اک شعر راوق کا پیمانہ ہو

گلستانِ گیتی کی رنگین بہار
نئے گل کھلاتے ہیں لیل و نہار

کھلا کر کبھی حسن شیریں کا باغ
کیا ہے دل کوہ کن داغ داغ

کبھی گلبن حسن لیلیٰ کا رنگ
دکھا کر کیا ہے دل قیس تنگ

اب ایک اور غنچہ کھلایا نیا
اور اک بلبل اس کا بنایا نیا

کہ ایک قصۂ دلکش و دلکشا
زبانی خلایق کے یوں ہے سُنا

کہ تھا بمبئی میں کوئی نوجواں
امارت پناہ و شرافت نشاں

جسیم و وسیم و حسین و شکیل
لئیق و خلیق و فہیم و عقیل

فنِ شاعری میں بھی استاد تھا
تخلص میں مشہور آزاد تھا۔

جہاں کے تنعم سے محفوظ تھا
تموّل میں ہر غم سے محفوظ تھا

ستو وہ میسر اور عالی ہمم — تمامی مراعات حاصل بہم
تعشق بھی جو اس کی خدمت میں تھا — سبب اس کا اس طرح پیدا ہوا
کہ تھی ایک بیگم اسی شہر میں — نظیر اپنا رکھتی نہ تھی دہر میں
نہایت حسین اور نہایت جمیل — جمال جہانگیر میں بے عدیل
سراپا تو اس کا کہاں ہو بیاں — مگر آزماؤں تو طبع رواں ،
کہ حاصل ہو مانند حسن اتم — رسائی سخن کو ہو سر تا قدم
عجب حسن اس کا دلآویز ہے — حیا ساتھ ہے اس کے بلاخیز ہے
وہ گیسوئے مشکین وہ مشکین کمند — وہ سر حسن کا آسمانِ بلند
وہ مفرق میانِ سر دلستاں — کہوں راہِ فاعات یا کہکشاں
جبیں بدر ہے اور ابرو ھلال — ببر چشم ہے اور مردم غزال
نگہ دام دلہائے برنا و پیر — مژہ تیر و بینی چو پیکان تیر
وہ چہرہ بہاریں ہے یا آتشین — وہ خال اسپہ مشکیں ہے یا عنبریں
زبان درج یاقوت و دندانُ گہر — زبان پارۂ لعل دکان دُر !
لب لعل حلوائے قوت رداں — دمِ خندہ گلہائے رنگین فشاں

خواجہ بدیع الزّمانُ علیہ الرحمتہ والغفران

فرعونِ مرتبت، شداد منزلت، نمرود وقار، میاں خواجہ بدیع الزمانُ صاحب بدیع وگلے والی پلٹن کے رسالدار المشہیر بہ خوجی، مارے ہوکے کے اس قدر افیم گھول کر پی گئے کہ جان کے لالے پڑے۔ افیم ہی کی پینک میں پڑے پڑے اشعار آبدار موزوں کرتے جاتے تھے۔ ذہن کا فوارہ کھلا تھا اور طبیعت حاضر۔ ایک کڑوا کریلا دوسرے نیم چڑھا لے ! ڑا۔ حضرت بدیع کا نتیجہ طبع نامبارک ملاحظہ ہو۔ ؎

اے ساقی مشک رنگ و شب فام — دے بھر کے افیم ناب کا جام
جب تک ہے بدن میں جان باقی — ٹپکا منہ میں افیم ساقی
یہ چینیا بیگم کا عاشق زار — یعنی خواجہ بدیع بیمار
برسوں سے ترس رہا ہے ساقی — رہ جاتے نہ آرزو یہ باقی

ساقی قدح افیم دیدے | اور اس میں ملا کے نیم دیدے
نشے کے پینگ میں خوب بڑھ جائیں | اور کڑوے کریلے نیم چڑھ جائیں
نشے میں جو لکھنے بیٹھوں اشعار | پینگ کا ہو دیو مجھ پہ اسوار،
کاغذ کا ورق سیاہ ہو جائے | دشمن میرا تباہ ہو جائے،
سطریں ہوں رشکِ زلفِ خوباں | اور روکشِ کاکلِ حسینان،
ہر لفظ بنے حبش کی دولھن | اور خواجہ بدیع شوہر آن ما
ہر لفظ ہو خالِ روئے معشوق | بل روکش رنگ و بوئے معشوق
ساقی چینی کی پیالیاں لا | آبِ اسود کا جلوہ دکھلا
ہونٹوں پر جان آگئی ہے | بے ہوشی آج چھا گئی ہے،
بندہ کوئی دم کا مہمان ہے، | خوبی کا ترے جہان بیان ہے
کر رحم پلا افیم چینی، | نازت بکشم کہ نازنینی
ہونٹوں پہ آگئی مری جان | رنجسم مفزائے بائدادان
تو بے خبر اور میں ہوں رنجور | اس ملک کا کیا یہی ہے دستور
ہے میری دعا کہ خالقِ کُن | برسائے تری دکان پہ ہن
جم جم جئے ساقی عدو مال | زندہ رہے حشر تک اقبال
جب تک ہیں فلک پہ ماہ و خورشید | ساقی کی دکان ہو قابلِ دید
مجمع ہے واں افیمیوں کا | دل بادل چیونٹی مکھیوں کا
بیماری موت بد بلا ہے، | بس اس کی افیم ہی دوا ہے
مر جاؤں گا گر نہ دے گا افیون | سوگند بذاتِ پاک بےچوں،
پیاری ہے افیم جان و دل سے | پیاری ہے افیم تیرے تل سے
بیداد نہ دے گا کیا مری داد | ہے قول نسیم لائق صاد،
پیاری کا جو ہو اپنے ہو پیارا | رنج اس پہ ہو کس طرح گوارا
ہیہات نہیں کوئی مددگار | ہونٹوں پہ ہے جان خستہ دار
خیر اب تو جان پر بنی ہے — | بیماری مرگ دل لگی ہے!
دو ایک منٹ میں اے مرے یار | ہو جاؤں گا میں اجل سے دوچار

ہی نزع کا وقت وادریغا	اب یادِ خدا کر دبدیعا
ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری	ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے وہ دوزبان سے یکسر	حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے	یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

شتاب جان :۔ اس وقت تو کروڑوں شعر سنادیتے۔

خو :۔ طبیعت میں بدیع کا ندو کے نالے سے کم نہیں۔

شتاب جان :۔ کیا سچ مچ مرنے کا وقت آگیا۔ اللہ خیر کرے۔

خو :۔ ہائے میری جوانی پر اجل کو رحم نہیں آتا۔ ہائے میرے عنفوان شباب پر ملک الموت ترس نہیں کھاتا۔

شتاب :۔ ابھی برسیں۔ ساٹھ اک کا سن ہوگا۔

خو :۔ ساٹھ برس کی عمر بھی کوئی بڑی عمر ہوتی ہے :۔

ہزار و صد و سیزدہ سالہ مرد

زمانہ ندید و زمانش بخورد،

یہ سنو۔ دادا جان کے مرنے کے بعد ہماری پردادی نے بصد حسرت پڑھا تھا۔ ہمارے خاندان میں ہزاروں برس سے کوئی کم مرا ہی نہیں۔

خواجہ صاحب کا دماغ دائرہ صحت سے متجاوز ہوا تو بہکی بہکی باتیں کرتے لگے اور جو گفتگو کسی قدر سمجھ کے بھی کرتے تھے وہ بھی کسی کے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ارد گرد سب اجنبی ہی تھے۔

خو :۔ ہر مزجی بھائی۔ ذرا مصر کے پہلوان کو بلاؤ۔

شتاب :۔ مصر کے پہلوان کون' آپ کہاں ہیں؟

خان :۔ دماغ پر انجرے چڑھ گئے۔ سرسام ہوگیا ہے۔

شتاب :۔ خان صاحب! اب ان کی فکر کچھ کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس کے آدمی ہم کو گرفتار کرلے جائیں۔ کہاں کا مواپریت کی طرح آن کے چمٹا۔ ہنسی ہنسی میں ہستوا ہوگیا۔

خان :۔ خواجہ صاحب کی ذرا نبض تو دیکھ بی بی۔

شتاب :۔ میں عورت ذات نبض کیا دیکھ سکوں۔

خو :۔ (آہستہ سے)

پلا ساقیا مالوے کی افیم	کہ ہے شوق گلگشتِ باغ نعیم

کرم کر حقیروں پہ مائی ڈیر　　　میں قربان جاؤں ذرا کم ہیسر

پیاسا کئی دن کا ہوں ساقیا　　　جھلک آبِ اسود کی مجھ کو دکھا

نہ مطرب، نہ ساغر، نہ مینا نہ چنگ　　　نہ چانڈو نہ افیوں نہ گانجا نہ بھنگ

چلا لے دم واپسی اے کریم　　　سرہانے پہ کہ قم باذن الافیم

نہ تاخیر کر ساقی مشک رنگ　　　پلا جام افیون ابھی بیدرنگ

دم پینک و عیش بے رنج و غم　　　پڑھوں یہ کلام فصیح عجم

کریما ترحم بحالِ سقیم　　　کہ ہستم امیر کمند افیم

جو ٹپکے مرے منہ میں افیونِ ناب　　　تو کم ہو ذرا جوششِ اضطراب

پھر دوں خوب بازار میں بے دھڑک　　　وہ ٹھنڈی ہوا اور وہ ٹھنڈی سڑک

سنیحیان ز افیوں بدمی خورند　　　سنیحیان نبات و شکر بخورند

نگہدار ما را از راہ خطا　　　خطا در گداز و افیم نما

ندارم غیر از تو فریاد رس
بدہ جام افیون زبانی ہوس

یہ جوانی کے زمانہ کا کلام ہے۔ ہائے افیم وائے افیم۔

شتاب :۔ ارے بدبخت افیم ہی نے تو یہ درگت کی، اور افیم ہی پکار رہا ہے، خدا اس افیم موئی سے سمجھے۔

خو :۔ شتاب جان از برائے خدا افیم کو برا نہ کہو۔

خان :۔ خواجہ صاحب خدا خدا کرو۔ اللہ کو یاد کرو بھائی۔

خو :۔ بھائی جان وہ بہروپیا اب کی موت لے کر آیا۔

خان :۔ پھر وہی بہکی ہوئی بات کی۔ بہروپیا کیسا ہوتا ہے۔

خو :۔ بدبلا۔ کبھی مولانا بن کے آیا، کبھی چیل، مگر اب کے اس بہروپئے نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ اچھا اگر چنگا ہوا تو قرولی سے خبر لوں گا۔

شتاب :۔ (آہستہ سے) ابھی چنگے ہونے کی امید باقی ہے۔

خان :۔ اب جنازے پر قرولی سے خبر لیں گے۔

خو :۔ ارے یارو توپیں بھر دو۔

ماروگولے دَن دَن دَن　　　بولے رن بھئی بولے رن

جان :- بی بی اب سرسام کی زیادتی ہے ان کو کہیں چل کے پھینک دینا چاہئے۔ یا کہو تو تھانے پر رپورٹ لکھوا دیں۔
شتاب :- میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
خو :- (آہستہ سے) بھائی آزاد۔ ذرا سی افیم دیدو۔
شتاب :- ارے کمبخت، اللہ کو یاد کرو۔ مر رہا ہے موئے۔
خو :- اور موتے پر سو درے (رو کر) ارے یاران گرد اگرد میں بدیع از من بشنو کہ من مردے رسالدارد، کسیدادن بودم، وجنگ روم وروس اندر کارے کردم ؎

زنعل سمندان دران پہن دشت
زمین آسمان گشتہ شش وہشت

راوی :- اچھی اصلاح دی اور مصرع کو موزوں کردیا۔
شتاب :- ذرا جا کے حبشن کو بلالاؤ۔ میرے خاں صاحب۔
خان :- مگر تم کو اس مردے کے پاس تنہا کیونکر چھوڑوں۔
شتاب :- ہماری فکر نہ کرو۔ رحیمن ہمارے پاس بیٹھی ہے تم لپک کے بلالاؤ۔

خاں صاحب جا کے حبشن کو بلا لائے تو دیکھا کہ خواجہ صاحب بالکل بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ جن کا سر پیر ہی نہیں۔

خو :- بگھی کیوں لڑائی تھی۔ اور جو ہم چابک رسید کریں۔
خان :- بگھی لڑ چکی، اب ملک الموت سے لڑائی ہے۔
خو :- اچھا افیم سے لڑائی ہے۔ کوئی ہے۔ الاافیسم : ؎

خراب وسیہ مست وتردامنم
بدہ او پیسم او پیسم اوپیم

حبشن :- ان کی حالت تغیر ہے۔ اب ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر آئے ہیں۔ تم لوگ پردہ کردو تو دکھادوں۔ (پردہ کرایا گیا ڈاکٹر صاحب تشریف لائے)

ڈاکٹر :- زبان دکھاؤ زبان (زور سے) زبان
خو :- ہم کسی کو زبان نہیں دکھاتے، ہم کیدان ہیں۔
ڈاکٹر :- (منھ کے پاس ہاتھ لے جاکر) زبان زبان
خو :- (منھ بند کر کے) دفان، دفان۔

چخے ددر شو، مر دِ گیدی خرے

الگ ہٹ مرے پاس سے تو پرے

ڈاکٹر:۔ کیا سودائی ہے خلل دماغ ہے نہ۔

جبستن: میاں ان سے کوئی واقف ہی نہیں ہے۔ آج پہلی پہل یہاں نازل ہوئے۔ ایام معیاد سے چوگنی بادمے رہ کے کھا گئے۔

خان: اب بڑی دیر سے بدحواسی کی باتیں بک رہے ہیں۔

ڈاکٹر: کچھ علاج دلاج بھی ہوا یا راہِ خدا ہی پر ہیں۔

خان: جی پہلے حکیم صاحب کا علاج ہوا اس سے فائدے کی صورت نظر نہ آئی تو ڈاکٹر صاحب کا علاج ہوا اب دوا پیتے ہی نہیں۔

ڈاکٹر:۔ ایک طرف سے آپ منہ کھولیں ایک طرف سے میں۔

خان:۔ تکلیف ہوگی، ان کو اس سے کچھ فائدہ ہے؟

ڈاکٹر:۔ ہاں ہاں صاحب ہے کیوں نہیں ـــ زبان دیکھوں گا۔

خو:۔ صبح کا سہانا سماں ہے اور بدیع سخنداں ہے:۔

بدیعا بس اب روک اپنی زبان

دمِ صبح ہوتا ہے پینک کا دھیان

ڈاکٹر نے زبردستی منہ کھول کر زبان دیکھی اور خانصاحب نے دل لگی بازی کی خاطر تھوڑی سی ریت منہ میں ڈالدی تو خواجہ صاحب بہت ہی جھلائے۔ او گیدی خر۔ ابے او بہروپئے۔ بھلا بچہ۔ بھلا۔ بیماری میں ڈاکٹر بن کے آیا اور یہاں سب ٹھہرے اجنبی:۔

خدا کی قسم شکر کر شکر کر	قرولی سے خالی ہے میری کمر
قرابچہ اب پاس ہوتا اگر	تو کچ کر کے میں بھونک دیتا مگر

جو پینک میں ہوتا نہ میں بے خبر

تو بھٹے کی صورت اڑا دیتا سر

تھو تھو۔ لاحول ولا۔ ارے اب پانی تو دے۔

خان:۔ کیا ہوا خواجہ صاحب بہادر۔ جھلاتے کیوں ہو۔

خو:۔ اجی یہ گیدی بہروپیا عجب بدذات آدمی ہے۔

خان:۔ اس وقت آپ کیسے ہیں جناب؟

خو:۔ ہونہہ۔ زندہ در گور :۔

از حالتم مپرس نہ زندہ نہ مردہ ام
خود من گلوئے خویش بدشنہ فسردہ ام

ڈاکٹر:۔ خیر سے حضور شاعر بھی ہیں۔

شتاب:۔ (پردے سے) ڈاکٹر صاحب، ان کو کوئی دوا جھٹ پٹ دیجئے۔ کہیں یہ یہاں سے دفان بھی ہو مُوا۔

ڈاکٹر:۔ میں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ سامنے کے دواخانے سے منگوا دیجئے۔ جلد فائدہ بخشے گا۔ بشرطیکہ پرہیز کریں۔

شتاب:۔ پرہیز نہ کرے گا تو انا غفیل بھی ہو جائے گا۔

خو:۔ یا خدا ذرا طاقت دے تو ان سب کے قرولی بھونک دوں۔

شتاب:۔ مرمونڈی کاٹے۔ اور سنو۔

خواجہ صاحب نے جو (مرمونڈی کاٹے) کا لفظ سنا تو آگ بھبوکا ہو گئے اور صد ہا بے نقط سنائیں اور بڑی دیر تک اپنی تعریف کیا کئے، اجلا کر کہ اے ہماری شان یہ کلمہ از زبان۔

بس ہم سمجھ گئے کہ یہ زنِ کج عقل ناقص رائے بیکارہ داشت :۔

زنان راکید ہائے بس عظیم ست
زکیدِ زن شود دانا گرفتار

میں اگر اپنے کارناموں کا شمار کروں طومار ہو جائے، لہٰذا بمضمونِ مشتے نمونہ از خروار سنئے۔ دانۂ از انبار وقطرۂ از بحار زگار۔

۱۔ شاہی میں رسالداری وکمیدانی ایں جانب نے کی۔

۲۔ لڑکپن میں فیل نشین تھے۔ امیر کبیر۔

۳۔ چار معلم، عربی، فارسی، اردو اور علوم سکھانے کے لئے تھے، ایک شاعر، ایک بنوٹیا، ایک نبکست، ایک کشتی گیر، ایک قوال، ایک شہسوار، ایک گل چلا، اتنے ادب آموز اں۔

۴۔ اور والد ماجد ایسے متمول تھے کہ :۔

ہمہ اسباب شاہی حاصل او	نماند آرزوی اور دل او
فلک در جیلش از جوز اکمر بند	ظفر یا بند تیغش سخت پیوند

۵۔ ہمنے جو لڑائی لڑی ترکیب کے ساتھ، جہاں ذرا بھی خوف دیکھا پھٹک رہے اور ذرا غنیم نے بھاگنے کا ارادہ کیا چڑھ دوڑے۔ بھاگتوں کے آگے اور مارتوں کے پیچھے۔

۶۔ افیم کے استاد۔ اس فن میں ہماری قسم کھاتے ہیں لوگ۔

۷۔ کبھی آج تک سچ نہ بولے مگر کسی کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ یہ کاذب ہے۔ جب دروغ گوئی اس طرح پر کی گویا سچ سچ اور واقعی بیان ہے۔ ؎

راستی موجب رضائے خداست

کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

اس کلام نے بطلان کیا۔ اس کلام کو بالکل ہی باطل کر دیا۔

۸۔ بات بات پر قسم کھائی اور ہمیشہ غلط۔ تمام عمر اس شعر پر دار و مدار رہا: ؎

سیدھے مکان پر سے کچہری کو جاتے

قرآن بات بات پر جھوٹا اٹھاتے

9۔ روم میں وہ لڑائیاں دیکھیں اور ایسے ایسے محاربات عظیم میں شریک ہوئے کہ الامان الامان۔ مگر اس دانائی کے صدقے کہ میدان میں کبھی گئے ہی نہیں۔ کبھی درخت پر بیٹھے تماشا دیکھا کئے، کبھی دوڑے، کسی ٹیلے پر بیٹھے سیر دیکھ رہے ہیں اور یہ اشعار ورد زبان ہیں ؎

میں وہ ہوں سوختہ قسمت کہ کرے چرخ کہن — مشعل برق مرے دود جگر سے روشن

داغ گر آتش سوزاں ہے تو سینہ گلخن — کاش جل کر کہیں برباد ہو خاکستر تن

چند سوزم ز غمم و چند گدازم یارب — بخت ناساز و بدل سوز چہ سازم یارب

سوزش غم نے کیا بسکہ عناصر میں فتور — جائے خوں شعلہ سرکش ہے رگوں میں مستور

مجھ سے پروا نہ کرے ہم نفسی کیا مقدور — گرم ہنگامہ سمندر کا نہ ہو مرے حضور

برق کو جلوہ فروشد من محزوں چہ کنم

خرمنے بود مرا سوختم اکنوں چہ کنم

اور روم میں بیمار، در بخور تو تھا ہی نہیں۔ عین فصل بہار اور جوانی تھی۔ صدہا اوصاف سے مملو ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے دوا پلائی اور کہا ایک ایک گھنٹے کے بعد پتے جاییے گا۔ دو دن میں خواجہ صاحب کو آرام حاصل ہوا۔ فرحی شتاب جان گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ حبشن نے ان کی خدمت کی اور ڈاکٹر نے جم کے علاج کیا۔ سات آٹھ دن میں اس قدر طاقت آگئی کہ چلنے پھرنے لگے۔ آزاد کا مطلق پتہ نہ معلوم ہوا۔ شتاب جان بھی غائب غلا،

بمبئی دور۔ یاالٰہی اب جائیں تو کہاں جائیں، اور کریں تو کیا کریں۔ جبشن نے کہا اب آپ اپنا کام کیجیے، اور بلیے ہوچکے بمبئی واپس جانا بیکار ہے، اور شتاب جان ہے کون۔ تم کو۔ مرزا صاحب اور آزاد نے دھوکا ہی دھوکا دیا تھا۔

خواجہ صاحب کو سخت افسوس ہوا کہ آزاد پاشا کے ساتھ اس قدر عرصۂ دراز تک ریاض اور جان جوکھم کر کے آخر کار یہ نتیجہ نکلا کہ ہندوستان میں لا کے ہمیں چھوڑ گئے۔ ایک گوشے میں جاکر خوب روتے اور پانی سے آنسو پونچھ کر جبشن سے باتیں کرنے لگے تاکہ غم غلط ہو۔ جبشن نے ان سے کئی سوال کئے۔

خوجی :۔ قسمت کہاں سے کہاں لائی۔

جبشن :۔ آپ کا گھونسلہ کس جھاڑی میں ہے حضرت؟

خوجی :۔ ہمارا دولت خانہ صوبہ خوزستان میں ہے

جبشن :۔ کون صوبہ۔ خوزستان۔ یہ کس لنگوڑے چوپٹ آباد کا نام لیا۔ خوزستان کس ویرانے میں ہے۔

خوجی :۔ ہونھ۔ تم جانو۔ سب ملک ان کے دیکھے بھالے ہیں۔ ارے ہم ملکوں ملکوں کی ہوا کھا آتے ہیں، خوزستان ایک صوبہ ہے، درمیان شکر قند اور حلیستان کے متصل دریائے بتاشہ۔

جبشن :۔ شکر قند تو آج تلک کسی ملک کا نام نہیں سنا تھا، انوکھے انوکھے ملکوں کے نام لے رہے ہو۔

خوجی :۔ شکر قند! ہونھ، سمرقند کا چھوٹا بھائی ہے۔

جبشن :۔ وہاں آپ کس محلے کی خاک چھانا کرتے تھے۔

خوجی :۔ حلواپور میں شیریں باغ کے پاس دولت خانہ ہے۔

جبشن :۔ آپ کا مکان بھی خیر سے میٹھے محلے میں ہے۔

خوجی :۔ مکان کسی اور کا ہوگا، ہم دولت خانے میں رہتے ہیں۔ نام کسی اور کا ہوتا ہوگا، ہم اپنے نام کو اپنا اسم شریف کہتے ہیں۔ مگر اس وقت تمہاری شترنگ صورت آبنوسی پر ایک پھبتی سوجی ہے۔ سچ کہنا حبشی حلوہ سوہن کی کتنی ہوئی ہے بی بی اب تو ہم کو شتاب جان کے فراق نے مار ڈالا۔ ورنہ ہم کسی زمانے میں بذلہ سنجی کے استاد تھے :۔

عشق نے بدیعا نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

راوی :۔ اور یہ خبر ہی نہیں کہ بدیع تقطیع میں گر جاتا ہے۔ خالی بدیا رہ جاتا ہے۔ میاں بدیعا بھی پچھتا کے تادبی ہے

جبشن :۔ آپ شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں حضور مگر قد کیا خوب پایا ہے۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ

خوجی :۔ ہاں ہیں تو ہم بڑی خوبیوں کے آدمی اور شعر کی نہ کہو، بڑے بڑے شیریں کلام استادی کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ میاں حلاوت لکھنوی کا نام سنا ہوگا۔ جی۔ اور تو نہیں جانتا۔ استاد نہ ہوتے تو کہہ دیتا کہ بلا تشبیہ،

شیطان سے زیادہ مشہور ہیں۔ انھیں کی بیعت لایا۔

حبشن :۔ جو جیسا ہوتا ہے اس کو ویسا ہی مل جاتا ہے۔ شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر۔ تم شکر پر جان دیتے ہو تو وہ میاں حلاوت قند پر مرتے ہوں گے۔

خوجی :۔ قند اور شکر تو ہماری زبان میں ہے مگر جانی :۔

خواہش نہ قند کی ہے نہ خواہاں شکر کے ہیں
چسکے پڑے ہوئے تری میٹھی نظر کے ہیں!

حبشن :۔ اللہ اللہ۔ میرے عاشقوں میں ہیں آپ چہ خوش۔

خوجی :۔ یہ کیوں، یہ کیوں۔ نہیں پہچانا۔ ہم کون ہیں۔

حبشن :۔ خدا جانے۔ مگر آدمی تو نہیں معلوم ہوتے۔ ذرا الگ ہٹ کر بیٹھئے، ایسا نہ ہو کہ پینک میں آن کر لڑھک جایئے (مسکرا کر) کہیں مجھ پر گر دو تو میری ہڈی پسلی ہی ٹوٹ جائے۔

راوی :۔ دریں چہ شک۔ تم خود ہی ہٹ بیٹھو۔ خوجی صاحب اسنڈا اگر پڑے تو تمہاری خیر کہاں۔ ہاتھ پاؤں سب چکنا چور ہو جائیں۔

خوجی :۔ اب تو آپ غمزے کی لینے لگیں۔ زہے نصیب۔

میں یہ سمجھا حبشی دیکھ کے حلوا سوہن
حلوہ دکھلاتی ہے شاید شب وصلت میری

حبشن :۔ چکنی چپڑی باتیں بناتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ دو پیسے کی کھٹیاں لے کر کھلائیں ہمیں۔

خوجی :۔ اچھا فقرہ دیا۔ بے شربت وصل کھٹیاں کھلاؤں۔ تم جھانسا دیکر چل دو اور میں استاد کا انتظار کرتا ہوا جلیبیوں کی طرح پیچ و تاب کھاتا رہ جاؤں :۔

کھٹیاں وہ کھلا کے رات کو فقرے سو ٹل گئے
افسوس مفلسی میں مرے دو ڈبل گئے!

حبشن عمر بھر محلات میں رہی تھی۔ اردو کے محاوروں سے واقف شین قاف سے درست دو ایک شعر جو سنے تو ان کی شیریں زبانی کی قائل ہو گئی۔ با اصرار کہا کہ اپنا کلام سنایئے۔ یہ میٹھے میٹھے شعر بڑا مزا دے رہے ہیں۔

خواجہ صاحب نے فرمایا، ہم جب پڑھتے ہیں قدر دانوں کے سامنے پڑھتے ہیں، تم نے قدر دانی کی، تمہارے سامنے ضرور پڑھیں گے، مگر پہلے جناب استادی منبع فصاحت و مجمع بلاغت پستہ دہن، گل رو، شکر لب، قند کلام، ——— بتاشا بیاں، رشک حافظ حلوائی، غیرت نور امان بائی۔ حضرت حلاوت صاحب کا کلام شیریں فرجام تبرکاً پڑھ لوں، پھر

اس عاصی پر معاصی، حقیر فقیر کے اشعار، عذوبت بار، کا مزا چکھے جناب استاد فرماتے ہیں : ـــــ

رحم اے یار کرو گو ہیں گنہ گاروں میں، ہم بھی اے غیرتِ شیریں ہیں وفاداروں میں
کیا تری کاکل پیچاں کا کیا نظارہ بھو کس واسطے بل کرتے ہیں بازاروں میں
جیرے جلاب کو گل قند عجب ہو تیار ڈالوں شکر جو تری اُترے ہوئے باروں میں
بُوسے پائیں حور ہو گل کے لب شیریں کے قند گھل جائیں شکر خوروں کی منقاروں میں
کیوں زمانے میں مٹھائی ہوئی مہنگی اب کے جا بجا ہوتے ہیں مولود جو زرداروں میں،
کیوں نہ عشاق رہیں چینٹوں کی صورت گرد بدلے لونی کے ہے شکر تری دیواروں میں
عرق آلودہ وہ عارو ہیں مزہ ہے اے دل ہے عوض آب کے شربت ہیں تلواروں میں
لب شیریں کی ترے یوسف مصری کی طرح دھوم ہے چار طرف مصر کے بازاروں میں

کیوں نہ باتوں میں حلاوت کے حلاوت ہو یار
صاف مصری کا مزا ہے تری گفتاروں میں

خواجہ بدیع صاحب بدیع عقل کے پتلے تو تھے ہی۔ سمجھے کہ یہ حبشن ریجھ گئی۔ اپنے استاد میاں حلاوت کے اشعار عذوبت بار اور کلام شیریں کی چاشنی سے معشوقہ کے دل و دماغ کو سرور موفور بخشا۔ حبشن ایک ایک شعر پر کھلکھلا کر داد دیتی تھی۔

حبشن :۔ تم تو بڑا دور دراز سفر کر آئے ہو؟

خو :۔ ایک سفر۔ پنجاب، اور اودھ، اور یورپ، اور پچھاؤں، اور بمبئی، اور مصر اور عدن، اور روم اور روس کی سرحد اور فرانس، ہم نے کیا نہیں دیکھا اور جس جس مقام پر گئے وہاں ہمارے حسن کی تاثیر نے عورتوں کے دلوں پر ایسا اثر کیا کہ یہ حسن ہمیں دوبھر ہو گیا۔ جانِ عذاب ہیں ہے کیا یا الٰہی کیا کروں۔

بواز عفران نامی ایک عورت ہم پر اس قدر فریفتہ ہوئی کہ پکڑ کے پٹے دے جوتا دے جوتا مار کر، اڑا دیا، اور ہماری جرأت کو دیکھو کہ اف تک نہ کی۔ کان پر جوں تک نہ رینگی۔

حبشن :۔ ہم کو یقین کیونکر آئے۔ باتیں تو سب بناتے ہیں بھلا جب جانیں کہ سر جھکاؤ اور ہم دو چار لگائیں۔ پھر دیکھیں کیونکر اف نہیں کرتے۔

خو :۔ ہاں ہم حاضر ہیں مگر عشق کا وہ درجہ تو ہو اور آج افیم بھی یوں ہی سی پی ہے۔ صرف برائے نام جب نشے جمیں اور پینک کے مزے لوٹیں تب البتہ آزما لو۔ ہم مرد میدان ہیں۔

امتحاں کو بہ کاری میں رہیں ثابت قدم جوتیاں جس دم لگا کر چاہے جاناں دیکھ لے

جبشن :- اے ہے پھر نگوڑی افیم کا نام لیا۔ توبہ توبہ۔

خوجی :- افیم ہماری گھٹی میں پڑی ہے بی صاحب۔

جبشن :- مرتے مرتے بچے اور اب تک افیم ہی افیم کئے جاتے ہو، دوسرا ہوتا افیم کا نام زبان پر نہ لاتا۔ یہ نوبت پہنچی کہ اٹھنے بیٹھنے میں دقت ہوتی ہے۔

خوجی :- تم کو اس کے مزے کیا معلوم ہوں۔ بڑے بڑے نقرا جب کمال ریاض کرتے ہیں تب جاکر کہیں وہ درجہ حاصل ہوتا ہے جس کو بیخودی کہتے ہیں ؎

بندۂ عشق بتام بخدا

بخدا کارہ ندارم بخدا

وہی درجہ ہم کو ملا۔ یہ ریاضت افیم کی پینک میں حاصل ہوتا ہے۔ پھر ایسی شے کو ہم بھلا کیونکر چھوڑیں، اور لطف یہ کہ نفس پر افیمی ہمیشہ جبر کرتا ہے چنانچہ میں اکثر جگہ پٹا۔ اکثر مقاموں پر جوتیاں کھائیں۔ کبھی کوئی کابُجی ہوس لے گیا۔ کبھی کسی نے دل لگی دل لگی میں کھوپڑی پلپلی کر دی مگر انکسارِ مزاج نے اجازت نہ دی کہ جواب ترکی بترکی دوں، اس کو بھی جانے دیجئے۔ افیم میں کتنا بڑا فائدہ ہے کہ شب زندہ دار ہو جاتا ہے۔ صبح کے وقت ذرا آنکھ جھپکی تو جھپکی رات بھر نیند نہیں آتی۔

جبشن نے کمال افسوس کیا اور کہا اگر یہی حال ہے تو دیکھ لینا۔ ایک دن اسی پھیر میں جان دو گے۔ مجھے تمہاری خیر نظر نہیں آتی۔

خواجہ صاحب گو بیماری کے سبب سے سخت پریشان ہو گئے تھے مگر چانڈو خانے میں بیٹھنے کا چسکا اور پھر یہ بھی خیال تھا کہ اب جہاں دیدہ ہو گئے ہیں، چل کر ذرا چانڈو خانے میں سیر و سیاحت کا حال تو کہیں۔ ڈولی منگوا کر سوار ہوتے ادھر چٹ چانڈو خانے میں داخل۔ لوگوں نے ان پر نظر ڈالی تو متحیر کہ یہ نئے کون پھنسے؟

خوجی :- سلام علیکم یاران۔ سلام علیکم برادران۔

امامی :- مالیکم بھائی۔ مالیکم۔ آؤ کہاں سے آنا ہوا۔

خوجی :- ذرا ٹکنے دو پھر کہوں۔ مگر میں بیٹھ نہیں سکتا۔ دو برس لڑائی پر خستہ ہو گیا۔ جب دیکھو مورچہ بندی۔ ہر دم ساز و سامان سے لیس۔ مرنے۔ مگر وہ نام کیا کہ ساری دنیا میں مشہور ہوئے اور قسم جناب والد کی روح کی شیطان بھی ایسا نہ مشہور ہوا ہوگا جیسا بندہ نے نام کیا۔ یہ سب اس کی کریمی ہے۔

امامی :- لڑائی کیسی؟ اب اس زمانہ میں خانہ جنگیوں تک کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔ لڑائی کیسی؟

خوجی :- تم بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے بیٹھے کیا جانو۔

قادر :- (چانڈو کی نگالی چھوڑ کر) کیا روم روس کی لڑائی سے آئے ہو کیا اور تو کوئی لڑائی نہیں سنی۔ ہاں

ایران والے اور توران والے سے بھی مورچہ بندی ہو گئی تھی۔

خو:۔ تم کیا جانو روم روس کی لڑائی کا حال۔

امامی:۔ (مسکرا کر) اجی حضرت یہ نہ کہیے۔ ان کو ساری خدائی کا حال معلوم رہتا ہے ان سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔

قادر:۔ روم والے نے روس کے بادشاہ سے کہا کہ جس طرح تمہارا چچا ہم کو خراج دیتا تھا، اسی طرح تم بھی دیا کرو مگر اس نے نہ مانا۔ اسی بات پر تکرار ہوئی تو روم کے شہنشاہ نے کہا اچھا اپنے چچا کے مقبرے میں چلو اور پوچھو، دیکھو کیا آواز آتی ہے۔ بس صاحب سننے کی بات ہیکہ وہاں چانڈو چھینٹا اڑانے لگے۔ بس جناب روس والے نے کہا ہم نہ دیں گے تو اس بات پر تکرار ہوئی۔ روم کے شہنشاہ کے پاس حضرت سلیمان کی انگشتری تھی اور وہ انہوں نے کسی فرشتے یا موکل کی مدد سے ہوا پر بھیجی تو صدہا جن حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ روس میں ہر چہار طرف آگ لگا دو تو روس کی چہار دیواری جلنے لگی۔ روس والے نے سب وزیروں کو جمع کر کے کہا کہ آگ بجھاؤ تو سوا کروڑ سقے مشکیں بھر بھر کے پانی لئے کھڑے تھے اور مشکیں اتنی اتنی بڑی کہ دو لاکھ من پانی جن میں آئے۔

خو:۔ کیوں صاحب! یہ آپ سے کس نے کہا؟

امامی:۔ اجی یہ نہ پوچھو۔ ان سے فرشتے سب کہہ جاتے ہیں؟

قادر:۔ بس صاحب سننے کی بات ہے کہ سوا دو کروڑ مشکیں جن میں فی مشک دو لاکھ من پانی تھا۔ ملک کے چاروں کونوں پر پڑی تھیں۔ مگر آگ بھڑکتی جاتی تھی، تو بادشاہ نے حکم دیا کہ دو کرور لاکھ سقے کام کریں اور مشکوں میں چھتیس چھتیس کرور من پانی ہو۔

خو:۔ او گیدی۔ کیوں اس قدر جھوٹ بولتا ہے؟

شبراتی:۔ بیان سننے دو بھائی۔ عجب آدمی ہو۔

خو:۔ مرد خدا میں تو سنتے سنتے پاگل ہو گیا۔

قادر:۔ اجی آپ لکھنو کے ہیں آدمی، ان ملکوں کا حال کیا جانیں۔ روم کے تو ران توران النوپ شہر کا حال ہم سے سنیئے۔

امامی:۔ وہاں کے لوگ دیو ہوتے ہیں دیو۔

قادر:۔ روس کے بادشاہ کی غذا کا حال سنو تو چکرا جاؤ۔ سویرے منہ اندھیرے چھ بکروں کی یخنی۔ چار بکروں کے کباب، دس مرغوں کا پلاؤ اور دو مور بلے ترکیب کے ساتھ کھاتے ہیں اور نو بجے کے وقت مرغ کا شوربہ، اور دس سیر ٹھنڈا پانی۔ بارہ بجے جواہرات کا شربت، کبھی پچاس من، کبھی ساٹھ من۔ چار بجے دو کچے بکرے،

دو کچھے ہرن۔ دو کچھے کبوتر جنگی۔ شام کو شراب کا ایک پیپا اور پہر رات گئے گوشت کا ایک چھکڑا۔

امامی :۔ جب تو طاقتیں ہوتی ہیں کہ سو سو آدمیوں کو ایک آدمی مار ڈالتا ہے۔ ہندوستان کا آدمی کیا کھا کے لڑے گا؟

شبراتی :۔ ہندوستان میں اگر ہاتھی کی طاقت کچھ ہے بھی تو چانڈو کے سبب سے، دالانہ سب کے سب مر جاتے

قادر :۔ اس میں کیا کلام ہے بھائی صاحب۔ دریں چہ شک۔

امامی :۔ سنا ہاتھی سے تنہا مقابلہ کرتے ہیں، روس والے۔

قادر :۔ ہم سے سنو:۔ دس ہاتھی ہوں اور ایک روسی، دسوں کو مار ڈالے گا۔ ہاتھی کی مستک پر گھونسا مارا اور وہ چنگھاڑ کر بیٹھ گیا، بیٹھا اور مر گیا۔

خو :۔ روس جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہے آپ کو؟

قادر :۔ اجی ہم گھر بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر رہے ہیں۔

امامی :۔ حضرت ان کو سب باتیں یوں ہی معلوم ہیں۔

خو :۔ یارو، ہم کہیں سے کہیں ابھی جنگ کے میدان سے آتے ہیں، ہم نے تو وہاں ہاتھی دیکھے ہی نہیں۔

قادر :۔ روم والوں نے جب آگ لگا دی تو گیارہ برس، گیارہ مہینے، گیارہ دن، گیارہ گھنٹے، جلا کی۔ اب جا کے پرسوں ذری ذری آگ بجھی ہے۔ نہیں تو عجب نقشہ تھا کہ تمام ملک جل رہا ہے اور روم والے جب رات کو سوتے ہیں تو ہر مکان میں دو دو دیووں کا پہرہ رہتا ہے۔ جو ایک دن بھی روم میں رہے گا اس کے پاس دیو ضرور آئے گا اور سایہ اس پر رکھے گا۔

خو :۔ اف فوہ۔ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ارے یارو، اس جھوٹ پر خدا کی مار۔ ہم برسوں رہے، ایک دیو بھی نہیں آیا۔

قادر :۔ آپ کی تو صورت ہی کہے دیتی ہے کہ آپ روم ضرور گئے ہیں، خدا جھوٹ نہ بلائے تو گھر کے باہر قدم نہ رکھا ہوگا۔

خو :۔ بھلا روم کی دار السلطنت کا نام کیا ہے۔

قادر :۔ مرزبان، دس کوس ادھر دس کوس ادھر یہاں ہے۔

مرزبان شہر ہے اس آن کا اے یار میرے
دیکھئے انسان تو فرحت بھی معاش عش کہے

راوی :۔ یہ خوجی کے بھی چچا پیدا ہوئے۔ خواجہ صاحب تو محقق بن کر گئے تھے مگر قادر نے چکرا دیا۔

خواجہ صاحب سمجھے تھے کہ سب کو بند کردیں گے اور چانڈو خانے میں ان کا طوطی بولنے لگا مگر یہاں جو آئے تو دیکھا کہ یار لوگ زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔

خو:۔ مرزبان نام کا تو کوئی شہر ہی نہیں۔

قادر:۔ اجی تم کیا جانو۔ مرزبان وہ شہر ہے جہاں اپسرا اور پریاں پہاڑوں پر رہتی ہیں، اور دس کوس کے فاصلے پر آدم زاد اور پہاڑوں پر، وہاں بادل روئی کے گالوں کی طرح چشموں میں پانی پی پی کے آسمان پر جاتے ہیں، اور آسمان کے رہنے والوں کو پانی پلاتے ہیں۔

خو:۔ تو وہ روم جس کا حال آپ کہتے ہیں اور ہوگا اور جس روم سے میں آتا ہوں وہ اور ہے۔

قادر:۔ روم کے ملک میں عورتیں ہاتھی پر خوب سوار ہوتی ہیں اور ہاتھیوں کے جنگلے میں جاکر ان کا شکار کرتی ہیں اور مرد دو زن رات کو گھر میں رہتے ہیں مگر ایسے جری ہیں کہ ایک ترک دس شیروں کو بھگا دیتے ہیں۔ تین برس کے ایک بچے نے ایک شیرنی کو کھیل کھیل میں ایک پتھر مارا تو شیرنی کا منھ الٹ گیا اور مر گئی۔

خو:۔ یا خدا ان لوگوں کو سیدھی دُھر سے لگا۔

قادر:۔ اچھا بتاؤ روم کے بادشاہ کا نام کیا ہے۔

خو:۔ ہم سے پوچھتے ہو۔ شانِ خدا۔

قادر:۔ ہاں ہاں آپ سے پوچھتے ہیں۔ بتایئے۔

خو:۔ سلطان عبدالحمید خان بہادر غازی۔

قادر:۔ (ہنس کر) واہ وا۔ بس بس۔ آپ خاک نہیں جانتے۔

اما جی:۔ پھر یہ کیا کہتے ہیں کہ ہم روم سے آتے ہیں۔

قادر:۔ بھلا لڑائی کا انجام کیا ہوا بتایئے نہی۔

خو:۔ پلونا کی جنگ میں سپہ سالار ترک قید ہوگیا۔ قلعہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور روسیوں نے فتح پائی۔

قادر:۔ کیا کہتا ہے بدبخت۔ خبردار جو اب ایسا کہا ہوگا تو اتنے پونڈیں ماروں گا کہ بھرکس ہی نکل جائے گا۔

نواب:۔ جی میں آتا ہے کہ اس وقت ان کی مرمت کردوں۔

اما جی:۔ ہمارے بادشاہ کے حق میں بری بات نکالنا کیا معنی، بدخواہ بے ادب آدمی۔ پھر یہاں ایسی باتیں کروگے تو پٹ جاؤگے اور سنتے اچھے ملے۔

خو:۔ سنو صاحب ہم شاہی کے کمیدان ہیں اور۔

قادر:۔ اب زیادہ بولوگے تو اٹھ کر گھوم ہی نکال دوں گا۔ ہم سے بڑھ کر روم کا حال تو جانتا ہے۔

نواب :۔ روم کا بادشاہ بڑا بادشاہ ہے۔

قفس ز خوئے تو گلدستہ بند رنگینی — گہ ز روئے تو آئینہ دار حیرانی

لب تو زندہ کن معجز مسیحائی — رخ تو جلوہ دہ شوکت سلیمانی

بفحہ از خم تیغ تو گر گشد نقشے — چو نامہ شق شود از خوف پیکر یانی

فلک بدر گہ جاہ تو متکف پیر ست — زر و زمشب بہ کفش سبحۂ سلیمانی

بگرد سُم سمندر تو بستے دارد — منر و کہ ناز کند سر مہ صفایانی

سپہر بار گہا روزگار مرتبتا — کہ از تو یافتہ جنس کرم فراوانی

براوج قیصر جلالت — خیال و نوری و سمی فکر خاقانی

بذوق نعمت خوانت چناں بحرص افتاد

کہ درد ہان صدف کرد آب دندانی

خوجی :۔ جناب آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں۔

قادر :۔ قسم خدا کی اگر ذرا بولے نہ تو بنیں گی نہیں، نہ

امامی :۔ اب تم بے پڑھے نہ جاؤ گے کیا۔

خوجی :۔ (دل میں) اگر روم میں ہوتے تو ہر مزجی کے آدمیوں سے پٹوا تا اور درخت میں بندھوا کر مار کھلوا تا مگر

با ہمیں مرد بان بیاید ساخت

چہ توان کرد مرد ماں ایں اند

چہ کردہ شود۔ کیا کیا جائے۔ بجز سکوت کامل۔

شبراتی :۔ یہ ہیں کہاں کے۔ قبر سے نکل بھاگا ہے کیا۔ صورت تو دیکھو مردے کی سی۔

خواجہ صاحب کو سب نے مل کر ایسا ڈپٹا کہ گیدی، اور قرولی اور قرابینچہ اور رکیدانی اور دگلے والی پلٹن سب بھول گئے۔ گئے تو بڑے زعم میں تھے کہ جاکے چانڈوخانے میں یوں ڈینگ ہانکیں گے اور جہاندیدہ بن کر روم اور روس کے معرکے کا مرقع کھینچ دیں گے مگر وہاں لینے کے دینے پڑے۔ لہٰذا دم بخود ہو رہے اور سکوت ہی کو مصلحت وقت سمجھے، چانڈو کے چھینٹے پی کر پلٹے ہوئے۔ اثنائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے آدمی ایک مقام پر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ حضرت بھی جھک پڑے۔ کوشش کی کہ بھیڑ کاٹ کر درانے ہوئے جائیں مگر ذرا سے آدمی۔ ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ بیماری نے اور بھی مردہ کر دیا تھا۔ جس طرف چلے لوگوں نے دھکا دے دیا۔ لڑھکنی کھا کے دس قدم پر ہو رہے۔ ادھر ادھر دیکھا تو کوئی جان پہچان نہیں۔ جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیحیائی کی،

بلا دور۔ آخر کار بڑی دیر کے بعد دیکھا کہ ایک گران ڈیل پہلوان بیٹھا ہے اور لوگ اس کی تعریف کر رہے ہیں کہ واہ استاد کیا کشتی نکالی ہے اپنے سے دونے کو پنچھاڑ کھایا۔ خواجہ صاحب نے اپنے دو رِحل پر بھی نظر ڈالی اور پہلوانی کے زعم میں چلے مصافحہ کرنے۔

خو:۔ (ہاتھ بڑھا کر) یاد اللہ ہے بھئی پہلوان۔

پہلوان:۔ (متعجب ہو کر) سلام بھائی جان۔

خو:۔ ہم اس وقت اس قدر خوش ہیں کہ بس رشتہ خطی ہو گئے۔ اللہ اب اس سے زیادہ اور خوشی کیا ہوگی کہ ہم نے اپنے ایک جوڑیدار کو پا یا اور تم تو ہمارے بدن ہی سے سمجھ گئے ہو گے کہ ہمارا ساتھی پہلوان ہے۔

راوی:۔ جی ہاں کیوں نہیں وہ تو آپ کا کینڈا ہی نہیں چھپا رہتا ہے جو دیکھتا ہے دور سے پہچان جاتا ہے کہ پہلوان آ رہا ہے۔

پہلوان:۔ تم کہاں کے پہلوان، بھائی صاحب۔

خو:۔ یار کیا بتائیں۔ اپنے ساتھیوں میں اب ایک نہیں نظر آتا۔ شیدی سالمین شیدی لندھور کے ساتھ کے لڑکے ہوتے ہیں۔ اب کوئی پہلوان جچتا ہی نہیں۔

پہلوان:۔ مگر کیا کاٹھی ہے اور ہاتھ پاؤں کیسے سڈول ہیں کہ واہ واہ۔

خو:۔ میاں بڑے ریاض کئے ہیں اور تس پر میرا بدن چور ہے اور میرا قد بھی چور ہے۔

پہلوان:۔ (ہنس کر) استاد کچھ ہم کو بھی بتاؤ۔

خو:۔ (اکڑ کر) واللہ تم خود استاد ہو، ہماری صورت دیکھتے ہی تاڑ گئے کہ یہ استاد بے بدل ہے۔

اتنے میں پہلوان کے ایک شاگرد نے جس کا سن پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھا۔ خوجی کے قد و قامت پر نظر ڈال کر استاد سے کہا بھلا اس کے کینڈے سے کوئی بات لڑ بہنتے پن کی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر کہئے تو ابھی ابھی گدا دوں۔ خواجہ صاحب آگ ہو گئے اور لڑکے کو دو ایک باتیں سنائیں تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گردن پکڑ کر اَنٹی دی تو خواجہ صاحب دھڑ سے زمین پر گرے، اور اُدھر فرمائشی قہقہہ پڑا۔ پہلوان نے لڑکے کو ڈانٹا اور خواجہ صاحب کو تھپتھپا کر سمجھایا کہ آپ بڑے ہیں۔ اس لونڈے کے منہ نہ لگئے۔

خو:۔ اللہ گواہ لونڈا سمجھ کر چھوڑ دیا گیدی کو

پہلوان:۔ اس میں کیا شک ہے یہ ہے کیا مال۔

خو:۔ کوئی استاد اور برابر والا ہوتا تو دکھا دیتا۔

پہلوان:۔ برابر والا ہوتا ہی کاہے کو۔

خوجی :۔ اور بولتا تو اس وقت لاش بھی پھڑکتی ہوتی، اور اس لونڈے کو چرمرا ہی کر ڈالتا۔

پہلوان :۔ آپ نے کس استاد سے کشتی سیکھی ہے۔

خوجی :۔ (گھبرا کر) ہم نے اپنی والدہ سے کشتی سیکھی ہے۔

راوی :۔ لے سبحان اللہ۔ اس پر اور بھی قہقہہ پڑا اور اس مرتبہ پہلوان بھی ہنس دیا۔

۱۔ کیا وہ بھی پہلوان تھیں۔ کیوں استاد؟

۲۔ ان کو کس نے کشتی سکھائی تھی۔ والدہ نے آپ کے۔

۳۔ ان کو زبان سے لینا نہیں ہے۔

خوجی :۔ اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے۔ ہم کو اپنی ذات (منھ پر تھپیڑ لگا کر) ارے لاحول ولا قوۃ۔ کیا گدھے بنے ہیں جناب والا کشتی سیکھی ہے۔ توبہ توبہ۔ اسی طرح کبھی کبھی کشتی کے وقت بھی اپنے زعم میں آپ گر پڑتا ہوں۔ تم کہاں رہتے ہو پہلوان؟

پہلوان :۔ ہم آج کل نواب ذوالفقار علی خاں کے ہاں ہیں۔ تین روپے روز دیتے ہیں، اور ایک بکرا آٹھ سیر، دودھ، دو سیر گھی، اس وقت دو سیر اس وقت اور ایک روپیہ روز کا تیل بندھا ہے۔

خوجی :۔ (چونک کر) ذوالفقار علی خاں؟

پہلوان :۔ جی ہاں۔ جن کو بیٹروں کا بڑا شوق ہے

خوجی :۔ اخاہ۔ بھلا وہاں بھانڈوں کا بھی شغل رہتا ہے۔

پہلوان :۔ کچھ نہ پوچھئے۔ خداوند دن رات۔

خوجی :۔ بھلا وہاں مستا بیگ بھی ہیں۔

پہلوان :۔ ہاں ہیں آپ کیونکر جان گئے۔

خوجی :۔ اور میر صاحب بھی ہیں، پیرو بھی ہے۔

پہلوان :۔ جی ہاں میر صاحب اور مستا بیگ اور پیرو، تو مصاحب ہیں اور کسی کا نام لیجئے۔ یاد علی بھی کوئی ہیں، کیا آپ وہاں ہو آئے ہیں۔

خوجی :۔ یاد علی ہمارے وقت میں نہ تھے۔ ہمارے وقت میں شجاعت، منّے میاں، اچھے مرزا، چھٹن، میر آغا مبارک قدم، لونڈی یہ لوگ تھے۔

پہلوان :۔ آپ کا کیا نام ہے، آپ کیا دربار میں تھے۔

خوجی :۔ بھلا صف شکن علی خاں نیر کا ذکر بھی سنا ہے۔

پہلوان :۔ (قہقہہ لگا کر)۔ اخاہ تو یہ کہیئے آپ کل باتوں سے واقف ہیں۔ صف شکن علی خاں کو نواب تک رہتے ہیں لوگ۔ اور قبر بھی بنی ہوئی ہے، اور وہاں کوئی خوجی فوجی بھی تھا بڑے ہنسوڑ آدمی ہیں۔ وہ وہاں مسخروں میں نوکر تھے۔

خوجی :۔ آزاد نامی بھی کوئی صاحب وہاں تھے؟۔

پہلوان :۔ جی ہاں، وہ جو سانڈنی لے گئے ہیں۔ مگر سنا وہ تو کسی ملک میں لڑائی سر کرنے گئے ہوئے ہیں۔ نواب صاحب سے ایک روز کسی نے کہا تھا، کہ آزاد اور خوجی دونوں لڑائی پر گئے ہیں تو لوگوں نے یقین کیا کہ خوجی افیمی آدمی بھلا سمندر میں کیونکر گئے ہوں گے۔ عمر بھر مسخرہ پن اور چانڈو بازی کیا کیئے۔ ان کو جنگ اور مورچے سے کیا واسطہ۔ مگر آزاد تو دور دور تک مشہور ہیں۔

خوجی :۔ یہ مرزا کمبخت کہتا ہوگا، کہ خوجی افیمی آدمی ہے، اس کو جنگ سے کیا واسطہ۔ اچھا گیدی تجھ کو دربار سے پھر نکلواؤں تو سہی، ایک دفعہ نکلوا چکا ہوں گیدی کو۔ شاعر کے بچے ہی بنے ہیں:۔

نواب کی جاہ دیکھیئے گا
مرزا کا نباہ دیکھیئے گا
بچّہ سے کھڑے سمجھ لو
انشاء اللہ دیکھیئے گا
جوتی خورے ہمیں بنائیں
ماشاء اللہ دیکھیئے گا
افیون کی لم میں یاں نکلے
تقصیر و گناہ دیکھیئے گا
مرزا کی اپج افیم کا رنگ
سبحان اللہ دیکھیئے گا

میں بھی شعر کہہ کر نواب صاحب کو سناؤں گا۔

پہلوان :۔ میں جو شہر کے قریب پہنچا تو ایک قبر نظر آئی۔ پڑھتا ہوں تو یہ لکھا تھا:۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ غنودیم

مزارِ پُرانوارِ مقبولِ بارگاہِ لَم یَزلی ولیِ حق آگاہ عارف باللہ حضرت صف شکن علی شاہ برّد اللہ مضجعہ وانار اللہ برہانہٗ :-

پختہ مکان کی طرح سے ہے فکرِ گور بھی — انسان جان دیتا ہے آرام کے لئے

رہتا ہے آدمی کا نشان اِس جہان میں — بنتی ہے قبر بعدِ فنا نام کے لئے

اے خاک تیرہ خاطر مہمان نگاہدار — کیں نورِ چشم است کہ در بر گرفتہٗ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

خوجہ :- (ہنس کر) یہ سب ہمارے وقت کی باتیں ہیں۔ ایسا بنایا نواب صاحب کو کہ یاد کریں گے۔ آپ کے ساتھ ہم بھی چلتے یا اگر تم دیر میں جاؤ تو ہم چل دیں۔

پہلوان :- میں تو آج ہی ریل پر جاؤں گا۔

خوجہ :- بھائی ہم کو ضرور ساتھ لیتے چلو۔

پہلوان :- چلئے بسر وچشم۔ میرا اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

خوجہ :- ہم اپنا کرایہ دے دیں گے اور چلے چلیں گے :-

من وتو ہر دو خواجہ تاشا نیم — بندۂ بارگاہِ سلطا نیم

من زخدمت وی نیا سودم — گاہ بیگاہ درسنہ بودم

پہلوان :- ہم کو نواب صاحب نے صرف دو دن کی اجازت دی تھی۔ کل اور آج۔ کل یہاں داخل ہوئے۔ آج دنگل میں کشتی نکالی، اور شام کی ریل پر چل دیں گے۔ مزے سے ہمارے ساتھ مرزا ستیا بیگ بھی ہیں۔

خوجہ :- واللہ۔ ہوہوہو۔ بڑی خوشی ہوئی۔

الغرض شام کو پہلوان کے ساتھ خواجہ بدیع صاحب ریل کے اسٹیشن پر آئے۔ پہلوان نے کہا، وہ دیکھئے مرزا صاحب کھڑے ہیں جا کر مل لیجئے۔ خواجہ آہستہ آہستہ گئے اور پیچھے سے مرزا ستیا بیگ کی آنکھیں بند کر لیں۔

مرزا :- کون ہے بھئی (ہاتھ ٹٹول کر) کوئی متماۃ ہیں کیا۔ نیک بخت کیوں گلے کا ہار ہوئی ہے۔

پہلوان :- بھلا بوجھ جائیے تو جانیں۔

مرزا :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر ہیں کوئی متماۃ۔

خوجہ :- بھلا گیدی بھلا۔ ابھی سے بھول گیا۔ کیوں ؟

مرزا :- (ہاتھ چھوڑ کر) اخاہ۔ خواجہ صاحب ہیں۔ کہو بھئی خوجی اچھے تو رہے یار جی۔

خوجہ :- خوجی کہیں اور رہتے ہوں گے۔ اب وہ خوجی نہیں ہیں۔ ہمیں جناب مولانا خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیعؔ

کہا کرو۔

مرزا :۔ ارے کم بخت۔ بغل گیر تو ہو۔ اللہ اللہ۔

خو :۔ سرکار کیسے ہیں۔ گھر میں خیر و عافیت ہے۔ دداجی تو ابھی جیتی جاگتی ہوں گی۔

مرزا :۔ وہ عاقبت کے بورے بٹورے گی۔ سرکار فضلِ الٰہی سے اچھے ہیں، بیگم صاحب پر کچھ آسیب تھا مگر اب ذرا ذرا تخفیف ہے۔ کہو تم نے خوب نام پیدا کیا۔

خو :۔ نام! ارے ہم میجر تھے میجر خواجہ سُنا ہو گا۔

مرزا :۔ سرکار کو اس لڑائی کے زمانے میں اخبار سے بہت شوق تھا۔ آزاد کا ذکر ہر روز نظر سے گزرتا تھا اور آپ کا حال پڑھتے تھے۔ آزاد کو تو سب جانتے ہیں۔ بڑے گل چلے قدر انداز، لائق فائق، عالم فاضل، شاعر سپاہی خوب صورت جوان ہیں۔ مگر تمہارا حال جب سے پڑھا تب سے سرکار کو اخباروں کا اعتبار جاتا رہا ہے۔ دداجی روز کہا کرتی تھیں، کہ مواخوجی وہاں کیونکر پہنچا۔ ایسی آدمی سمندر کی صورت دیکھ کر اس کا پتہ کیوں نہ پھٹ گیا۔ تم فقرہ باز آدمی، نشہ پانی سے کام جنگ سے تم کو کیا واسطہ۔

خو :۔ اب اس کا حال تو تم ان لوگوں سے پوچھو جو مورچوں پر ہمارے شریک تھے۔ تم مزے سے بیٹھے بیٹھے مال چرغیاں اڑایا کیئے۔ تم کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ وہاں اگر ہمارا ساتھ دیتے تو جانتے کہ بڑے مرد دے ہو۔ مگر بھائی نشوں میں نشہ شراب، اِدھر کوسِ جنگ بجا اور سپاہی مستعد کارزار ہوئے اِدھر یاروں نے گلابی سامنے رکھی، اور چُسکی لگائی۔

شرابِ تُند دے ایسی ہی ساقی کہ جس سے غم رہے مطلق نہ باقی

گلابی رکھ دے لا کر وہ مرے پاس کہ ہو دُلہن پنے کی جس میں بُو باس

سُناؤں ابتدا سے پھر وہ قصہ

کہ فی الواقع یہی میرا ہے قصہ

مرزا :۔ اب سرکار کے سامنے نہ کہنا کہ شراب پی تھی۔ ورنہ دربار سے کھڑے کھڑے نکال دیئے جاؤ گے بچہ۔

خو :۔ اب تو سرکار کے باپ کے نکالے بھی نہیں نکل سکتے۔

مرزا :۔ ایک مرتبہ تو خبر کے کاغذ میں لکھا آیا تھا کہ خوجی نے شادی کر لی ہے۔

خو :۔ ارے یار اس کا حال نہ پوچھو۔ اپنے حسن و جمال کا تو ہم کو باہر جا کے معلوم ہوا۔ جس مُلک، جس شہر، جس ٹاپو پر نکل گیا۔ کروڑوں عورتیں ہم پر عاشق ہو گئیں۔ اور ایک سے ایک پری پیکر۔ خصوصاً ایک کم سِن گلعذار برق کردار نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا:۔

اب تو اک شوخ پہ جی اپنا فدا رہتا ہے — اپنے پہلو میں وہ گل صبح و مسا رہتا ہے

اُس کی باتوں میں یہ دل اپنا لگا رہتا ہے — غیر کے نام سے جی اپنا ہٹا رہتا ہے

صبح کو وہ کسی جانب نہ ذرا دیکھتی تھی — جائے آئینہ مرے منھ کو سدا دیکھتی تھی

مصر کے ملک میں تھا عشق کا شہرہ یہ صنم — انگلیاں اُٹھتی تھیں ہم تم جو نکلتے تھے بہم

عشق بازی کے مزے کھاتے تھے عشاق قسم — جان دیتا تھا وفا پر مرے سارا عالم

بند سب راستے ہو جاتے تھے بازاروں کے

ہوش اُڑ جاتے تھے یوسف کے خریداروں کے

مرزا :۔ اخاہ۔ آپ تو واللہ بڑے شاعر ہو گئے ہیں۔

خو :۔ ہو گئے ہیں کیا معنی! اور شاعری بھی کیا کھیل:

خواجہ بہ فصاحت و بلاغت

گویا سلمان ساوجی ہے

مرزا :۔ تو آپ کے حُسن پر کل عورتیں مرتی تھیں۔ ماشاء اللہ ایسا ہی حسن و جمال ہے۔ بجا۔

اب دیکھیے سرکار کے سامنے چل کر خواجہ صاحب کیا سامان باندھتے ہیں۔ واللہ بلبلِ ہزار داستان ہوں، طوطیِ ہندوستان ہوں، بات سے صدائے قلقل، آواز سے خندۂ گل، ثابت ہو۔ اہو ہو۔ قسم خدا کی ایک قصرِ دلکش و معلّٰی میں سوارانِ ترک کے ساتھ دو ہفتے رہنے کا اتفاق رہا۔ اس میں ایک بارہ دری خدا جانے کس وقت کی بنی ہوئی تھی۔ چو طرفہ انہارِ آبدار، اور سبزہ زارِ پربہار (یہ سب فقرے یاد کیے ہوئے تھے) ایک روز بعد حصولِ فتح جوانجانب کا اس طرف گذر ہوا، تو بارہ دری کو دیکھ کر عش عش کرنے لگا۔ ادھ گوئی گھڑی دن رہے کا وقت تھا اور بارہ دری نور سے معمور:

صاف شفاف سجل نور کی وہ بارہ دری — قصرِ قیصر کہوں رفعت میں ویا کوہ مری

ہو وے ششدر کہیں بھولے سے جو آجائے پری — دیدۂ ماہ میں تھی تاب سے خیرہ نظری

ٹھاٹھ سے شیش محل نور کا کاشانہ تھا

ماہ رو پریوں کے جھرمٹ سے پری خانہ تھا

بس حضرت حیرت ہوئی کہ میدان جنگ اور نوبلی شوخ و شنگ۔

مرزا :۔ بھئی خوجی واللہ تم تو اس عرصے میں بلا کے رنگین طبع، طلیق اللسان ہو آئے ہو۔ اللہ اللہ اب وہ خوجی ہی نہیں ہے۔

خو :- بھائی جان مورچے پر میرا جیالا پن دیکھتے تو دنگ ہو جاتے۔ خیر پہلے اس معرکے کا حال تو سنو۔ پس حضرت غور کر کے دیکھا تو نور کا عالم۔

دل کش اک حسن خداداد ہے اس گل رو کا	ہے اسی پیکر بلقیس پہ عالم شیدا
ملشت از بام ہوا حسن کے اس کے شہرا	جا بجا دیر و حرم میں ہے اسی کا چرچا
پیر گردوں نے کہاں دیکھا ہے اسکا ثانی	خاک بر سر ہو اگر دیکھ لے خاکہ مانی
اژدہا چوٹی ہے کافر ہے بلا ہے جادو	کاکلیں سانپ ہیں اور زلف چلیپا بچھو
دام دلکش ہیں، بلا کے وہ پریشان گیسو	ہو گئے صید دشکاران حرم کے آہو

خم کاکل نے تو پھندے میں پھنسائی یہ غزال
آہو چشم کو ہے زلف کا خال اک جنجال

بس حضرت اس پر میرے علاوہ پچاس ترکی افسر بھی عاشق ہوئے اور سات فرنگی۔ رائے یہ قرار پائی کہ جس سے وہ پری راضی ہو وے، اس کو عقد نکاح میں لائے۔ ایک روز سب کے سب بن ٹھن کر آئے۔ مگر اُس شوخ کی نظر آپ کے خادم پر پڑتی تھی۔

مرزا :- لے کیوں نہیں۔ ہزار جان سے عاشق ہو گئی ہو گی۔

خو :- اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مٹھا اٹھلاتی ہوئی آئی، اور میرا ہاتھ لے کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

مرزا :- اوہ واہ رے خوش نصیب، تمہیں۔ واللہ۔

خو :- اب سنیئے کہ بغض کی آگ اُن سب کے دلوں میں بھڑکی۔ کہا ہم نہ مانیں گے۔ جو شخص اس پری کے مطبوع طبع ہو وہ کُل رقیبوں سے لڑے۔ ہم نے کہا خیر:-

جتنا کوئی ہمارا دشمن ہو گا	اُتنا طبع رسا کا جوبن ہو گا
گل گیر صفت جو سر بھی کاٹیں عُدو	نام اپنا مثل شمع روشن ہو گا

ہم نے کہا منظور۔ ہم جواں مرد ہیں۔

ہیں میدان ہمیں چوگان ہمیں گو

دس ترکی اور چار یورپین افسران کو نیچا دکھایا۔ جی جب کئی افسروں کو ایسی چوٹیں لگائیں کہ بلبلانے لگے۔ خون نہ نکلا۔ اور تڑپ تڑپ گئے خون نکلنا کیا معنی۔ اے توبہ۔ بس پھر تو اوروں کے بھی کان ہوئے اور پری ہم کو ملی۔ بولتے تو سب کے سب وہ بن جاتے۔

مرزا :- واجبی بات ہے مجبور تھے۔

خو :۔ اب دربار کے رنگ ڈھنگ کا حال کہو۔

مرزا :۔ تمہیں چل کر سب کو ٹھیک بناؤ گے۔ اور تو سب خیر مگر جھمن نے وہ چغل خوری پر کمر باندھی ہے کہ یا الٰہی توبہ۔

خو :۔ کہو مرزا تو اچھے ہیں نادر بیگ۔

مرزا :۔ ہاں مگر آتے جاتے کم ہیں۔ ایک رانی کے مختار ہو گئے ہیں چین لکھتا ہے اب مزے میں ہیں۔

خو :۔ چھپڑی اور دو دو۔ مبارک قدم کا کیا حال ہے۔

مرزا :۔ چھوٹی بیگم کے مزاج میں بہت دخیل ہے۔ مگر جھمن کی دشمن۔

خو :۔ یاد ہے جب مرزا نادر بیگ اور جھمن میں چخ چلی تھی۔

مرزا :۔ اجی صد ہا خدمت گزار پچاسوں خاص بردار۔ کئی خواص اس شخص نے موقوف کرائے۔ نان بائی کا لونڈا ہے۔ مرزا بن گئے۔ مرزا ہم ہیں اصل مغل۔ جھمن تو کہا کرتا ہے۔ کہ

ع :۔ اصل بد از خطا خطا نکنہ

خو :۔ ایک دن مبارک قدم نے کہا تھا کہ اس موے افیمی مرزا کو شہر بدر کر دو۔ تو آپ تڑا کر بولے کہ واہ بیگم صاحب ہوں گی تو اپنے گھر کی، سارے شہر سے ان کو کیا علاقہ ہے۔ وہ ابھی کل آئیں، یہاں اس گھر میں برسوں سے رہتے ہیں۔ عمر بسر کر دی۔ جیسے نواب، ویسی بیگم۔

مرزا :۔ اے ہے اُس دن تو سب مصاحبوں نے چوطرفہ سے للکارا تھا، اور مرزا کی جان عذاب میں تھی۔ کسی نے کہا۔ ابے او نمک حرام تو اور بیگم صاحب کو بُرا کہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ حضور کے کہے کو ڈُلکتا ہے، بے نامعقول اسی پر تو وہ زٹل قافیہ اڑایا تھا :۔

افیون کے غم میں یاں سے نکلے — تو قیر و گناہ دیکھئے گا
مرزا کی اپنچ افیم کا رنگ — سبحان اللہ دیکھئے گا

خو :۔ یاد ہیں شعر۔ ہم کو تو پوری غزل ازبر ہے۔ مگر بھائی مٹر گشت بھی بلا کا ڈینگیا ہے۔ اس قدر گپ اُڑاتا ہے، کہ اَلاَمَانْ اَلاَمَانْ ہم اسکندریہ گئے۔ روم گئے۔ فرانس میں رہے رومانیا کے رئیس دیکھے۔ مصر کے امراء سے سابقہ رہا، مگر استاد ایسے بھولے بھالے سیدھے سادے رئیس نہیں دیکھے۔ غضب خدا کا ایک بدمعاش نے جو کہہ دیا کہ مرزا کے رہنے سے فرشتے کل املاک کو پھونک کر خاک سیاہ کر دیں گے۔ تو کامل یقین ہو گیا۔ اب کوئی لاکھ سمجھائے وہ سُنتے کس کی ہیں۔

مرزا :۔ اور فرشتوں کے خوش کرنے کے لیے برہمن جاپ کر رہے ہیں۔ دوسری طرف قرآن خوانی ہو رہی ہے۔ ہزار ہا لمپ اور کنول روشن ہیں اور محفل رقص آراستہ ہے اور کہتے جاتے ہیں کہ ہاں بھی سارنگی چھڑتی جائے :

جب تک کہ نہ دل کی بے کلی جائے
اور دائرے والے گت چلی جائے

اور نواب صاحب برابر کہتے جاتے ہیں کہ خبردار افیمی دہلیز کے ادھر نہ آنے پائے۔ اور بیٹو۔ اس کالی بلا سے اللہ بچائے، اور لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ خداوند اگر خدانخواستہ، خدانخواستہ مرزا صاحب ہوتے تو فرشتے وہ داند مچاتے کہ الامان الحذر۔ اس وقت خدا جانے کیا ہوگیا ہوتا۔

خو :۔ مگر یار مرزا نے خط خوب لکھا تھا۔

حقوق خدمت صد سالہ لعبِ طفال ست
بکشورے کہ درد کو دکان خداوند اند

اور القاب افیمیوں کے پُشت پناہ لکھا تھا۔

اس بیماری کے عالم میں ہم نے وہ وہ شعر کہے کہ واہ ہی واہ۔

مرزا :۔ بھلا نادر بیگ کے مقابلے کے ہیں۔

خو :۔ اجی وہ کیا جانے شاعری کس چڑیا کا نام ہے :۔

در بہشت آئی نظر جب تو عاشق نے کہا
نشہ افیون کا بڑھا ہے یہ عمارت میری

مرزا :۔ واہ ہے افیم کا رنگ نہ چھوڑا۔

خو :۔ اور سنیئے لاکھوں اس قدر :۔

کیوں نہ سترگ میں رہے گردھر اک افیونی
ڈھیر گٹوں کا زمین پر ہے کہ تربت میری

اور جو شعر ہے خُذ دبُتُ میں تر بتر :۔

کہتا ہے خوانچہ فرنی کا تو زَرُدے کا طُباق
ورقِ نُقرا سے کر دے کوئی زینت میری

اور نزاکت کا شعر سنیے گا۔ بس نزاکت کا خاتمہ ہے :۔

ٹوٹ سکتا نہیں افسوس بتاشا مجھ سے
بڑھ گئی کھاکے مٹھائی یہ نزاکت میری

اور مصری کی ڈلیا کی تعریف میں ایک نادر شعر موزوں ہوگیا ہے سنو گے تو مزہ پاؤ گے :۔

مصری کی بغیا چل کے صنم بیچے افیم
ہے جائے لطف کھیت وہاں خشکر کے ہیں

مرزا :۔ (ہنس کر) آپ کے ذہن کا بغارا کھلا ہوا ہے۔

خو :۔ بھائی جان یہ اللہ کی دین ہے۔ کسی کا اجارہ نہیں۔

مرزا :۔ مگر پہلے تو آپ ایسے شعر نہیں کہتے تھے۔

خو :۔ ہائے افسوس۔ ارے میاں تخم تاثیر صحبت کا اثر :۔

کمالِ ہمنشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

بس اس قدر یاد رکھو، اور ہم بڑے بڑے تجربے کی باتیں کرتے ہیں حضرت۔ جی مسیتا بیگ نے کہا میں نے مرزا کا خط برزبان یاد کر لیا ہے۔ مگر خوب لکھا ہے اُس نے کیا لکھا کسی سے لکھوایا ہوگا۔

افیمیوں کی پشت پناہ، دام لعنتہٗ۔ لاکھ سکھایا بتایا مگر تم لونڈے ہی رہے۔ تمہارے جدِ امجدٗ تک کی تو میں نے آنکھیں دیکھی ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں تم نے ہمیں دربار سے نکلوایا۔ اچھا خیر۔ مگر دیکھو تو کیسا ناچ نچاتا ہوں کہ عمر بھر یاد کرو۔ ایک بدمعاش نے زٹل قافیہ اڑایا، اور تم کو اُلّو بنایا، کہ پہلی کو فرشتے آن کر تمہارا گھر خاک سیاہ کر دیں گے اور تم کو عقل کہاں کہ جھوٹے سچے میں تمیز کر سکو۔ بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ فرشتوں کو گھر جلانے سے کیا واسطہ مگر ایک شیطان نے جو پٹی پڑھائی تو آنکھیں بند ہو گئیں۔ ذرا تو دل میں غور کرو کہ ساری خدائی میں کہیں بھی ایسا اندھیرا ہے۔ مفت خوروں نے میری بیخ کنی کے لئے یہ ہوا باندھی، اور آپ تو دشمنِ عقل ہیں ہی۔ ہائے افسوس۔

ع :۔ گوسالۂ ما پیر شد و گاو نہ شد

ہم کو کیا ایک در بند سو در کھلے۔ یہاں نہیں اور کہیں سہی :۔

گر تم نہیں تو اور بتِ مہ جبیں سہی
ہم کو تو دل لگی سے غرض ہے کہیں سہی

اب تو بندہ آپ کے ہاں آنے سے رہا۔ مگر کسی کا دل دکھانا اچھا نہیں ہوتا :۔

ع :۔ اے رشکِ قمر دل کا جلانا نہیں اچھا

گر صد ہزار لعل و گہر می دہی چہ سود — دل را شکستہ بہ کہ گوہر شکستہ
دریا میں رہ کر مگر سے بیر — او میاں یادش بخیر

خو :۔ اجی اس جھگڑے کو چولھے میں ڈالو۔ مفت کا بکھیڑا نکالا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ ہم سے نواب صاحب خوش ہوں گے یا نہیں۔ تم مُہر چک دینا اور ہم تم یک جان دو قالب بن کر رہیں گے۔

مرزا :۔ دریں چہ شک۔ میں کہوں گا خداوند، یہ اب سب مصاحبوں کے سرتاج ہوئے، اور حضور کا ملک انھوں نے نام کیا کہ فلاں نواب صاحب بہادر کے رفیق ہیں۔ سرکار بڑی قدر کریں گے۔ تم دیکھو تو سہی۔ ایسی بات ہے بھلا۔ مگر ذرا تم بھی اپنے کو لئے رہنا۔

خو :۔ کون۔ میں؟ میں تو ایسا بنوں کہ لوگ دنگ ہو جائیں۔ اور جانے کے ساتھ ہی فوراً ایک لکچر دوں۔

جب گھنٹی بجی، اور ٹکٹ بٹ چکے اور مسافر چلے تو پہلوان اور مرزا مسیتا بیگ کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ صاحب بھی پلیٹ فارم پر آئے، اور پہلوان کی طرح حضرت خود بھی اکڑتے جاتے تھے۔ ریل کے دو چار اہلکاروں نے ان کی برزخ مبارک دیکھ کر آوازے کسے۔ اور پھبتیاں کہنا شروع کیں۔

۱۔ کیا گینڈا ہے استاد، واہ کیوں نہ ہو۔

۲۔ آدمی کیا گینڈا بنا ہوا ہے۔ ماشاء اللہ کیا ہاتھ پاؤں ہیں۔ سُبْحَانَ اللہ سُبْحَانَ اللہ۔ کیوں صاحب کتنے ڈنڈ آپ پیل سکتے ہیں۔ استاد ہیں صاحب۔

خو :۔ اجی حضرت بیماری نے توڑ دیا، ورنہ میں تو ایک پوری ریل پر لد کر جاتا تھا۔

اہلکار :۔ اس میں کیا شک ہے۔ ایک ایک ران دو دو من کی ہے۔

خو :۔ قسم کھا کے عرض کرتا ہوں اب آدھا نہیں رہا۔

اہلکار :۔ یہ سب آپ کے شاگرد ہوں گے۔

خو :۔ یہ پہلوان ہمارے اکھاڑے کے خلیفہ ہیں۔ اور باقی سب شاگرد ہیں۔ اور یہ لونڈا اکھاڑے کا چھٹا ہے۔ سب ملا کے ہمارے کوئی چالیس بیالیس ہزار آدمی شاگرد ہوں گے۔ کم نہ ہوں گے۔

اہلکار :۔ دور دور سے لوگ شاگردی کرنے آتے ہوں گے۔

خو :۔ (مسکرا کر) دور دور سے۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ از ہندوستان سے لے کے تا بہ بمبئی اور کلکتہ اور جزیرہ پیرم، اور عدن، اور مصر، اور اسکندریہ، اور مالٹا، اور پارس، اور روم، اور رومانیا، اور تا بہ روس تک میرے شاگرد ہیں لاکھوں کے قریب۔

راوی :۔ (از ہندوستان سے لے کے) سبحان اللہ کیا محاورہ ہے اور (تا بہ روس تک) اس سے بھی بڑھ گیا۔

خو :۔ مصر میں ایسا ہوا کہ ہزاروں آدمیوں کی ہم پر نظر پڑنے لگی۔ ایک دو نہیں ہزاروں ہی تھے۔ بس

ایک پہلوان کی شامت آئی۔ ایک میلے میں ہم کو ٹوک بیٹھا۔ ٹوکنا تھا کہ بندہ بھی چٹ لنگوٹ کس کے سامنے آن موجود۔ کہہ دیا کہ لو بھئی حاضر ہیں۔ تو تھوڑی دیر تک باتیں ہوا کیں۔ لکھو کہا آدمی جمع۔

پہلوان :۔ ہم مصر کے پہلوان اور تم ہندوستان کے۔

ہم :۔ بھائی ہم تو پہلوان نہیں، ایک ادنیٰ سے شاگرد ہیں۔

پہلوان :۔ واہ ہم تمہارے کینڈے سے سمجھ گئے۔

ہم :۔ اچھا پھر تم سمجھو۔ ہم تو اپنی زبان سے نہ کہیں گے۔

پہلوان :۔ استاد ہم سے تم سے ہوگی ضرور کر کے ہاں۔

ہم :۔ مُستَعِد ہیں۔ آیئے۔ بسم اللہ۔

پہلوان : اس طرح پٹخنی بتاؤں کہ یاد کرو۔

بس میں نے کچھ کہا نہ سُنا۔ اسی دم جُٹ گیا، اور چپقلش ہونے لگی۔ پھر خوب خوب پیچ ہوئے۔ اس کے مصری پیچ۔ ہمارے ہندوستانی داؤں :۔

سلسلہ کشتی پچیتی کا نہ میں چھوڑوں گا
مرتے دم تک نہ میں اس فن کو کبھی چھوڑوں گا

تھوڑی دیر میں اُٹھا کے میں نے دے مارا۔

اتنے میں دوسری گھنٹی ہوئی۔ خواجہ صاحب ایسے بوکھلائے کہ زنانے درجہ میں دھنس پڑے۔ لینا لینا دو دوبک۔ الگ الگ دروازہ سر سے لگا اب درجۂ اول میں گھس پڑے۔ صاحب نے ڈانٹ بتائی، وہاں سے بھاگے تو اب مرزا صاحب کا پتہ نہ پہلوان کا۔ مرزا صاحب مرزا صاحب۔ ارے یار پہلوان ہوت او پہلوان۔ لاحول ولاقوۃ۔ ارے یار دم گئے۔ اہاہا اس بہروپیئے نے جھانسا دیا ہوگا۔ واللہ خوب سمجھا۔ اتنے میں مرزا صاحب نے پکار کر بلایا اور ریل پر اپنے پاس بٹھایا۔

خواجہ صاحب نے ریل پہ سوار ہو کر جناب باری کا شکر ادا کیا، صحیح سلامت بعد طے منازِل و قطعِ مَراحِل جان بچا کر مع الخیر و عافیت داخل منزل مقصود ہوئے۔ پہلوان نے کہا بھائی صاحب ابھی یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آپ بخیریت داخل ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ جی ہاں یہ تو کہیے گا آپ لوگوں سے خدا کی پناہ۔ اب داخل منزل مقصود ہونا، اور کسے کہتے ہیں۔ کیا آپ کی یہ نیت ہے کہ راہ میں ٹانگ توڑ کے دھر دیجیے، یا اندھیرے اجالے میں کہیں سنگسار کیجیے گا۔ نہیں آپ کی تقریر سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ آپ دشمنی پر آمادہ ہیں۔ پہلوان نے کہا بھلا ایسی بات ہے۔ آپ اور ہم خواجہ تاش ہیں۔ آپ کے سر پھوڑنے یا ٹانگ توڑنے سے ہمیں کیا مل جائیگا۔

مرزا مسیتا بیگ نے چھیڑنے کے لئے اور بھی ٹپر چک دی۔

خواجہ صاحب تھکے ماندے بہت تھے۔ سوئے تو عین منزلِ مقصود میں آنکھ کھلی۔ شام کے وقت مع مرزا مسیتا بیگ و پہلوان نواب صاحب کے ہاں داخل ہوتے۔ دیکھا کہ دربار میں حوالی سوالی سب جمع ہیں۔

خو :۔ آداب عرض ہے پیرومرشد (پینترا بدل کر)

نواب :۔ (متحیر ہوکر) اخاہ خوجی ہیں آؤ آؤ بھئی آؤ۔

خو :۔ (پھر آداب عرض کر کے) حاضر ہوں خداوند۔ (قدم لے کر) الحمد للہ کہ یہ سعادت ابدی مجھے نصیب ہوئی۔

غفور : خوجی میاں سلام۔

خو :۔ سلام بھائی۔ مگر ہم کو خوجی میاں نہ کہنا۔ اب ہم فوج کے افسر ہیں بدیع پاشا۔

جھمن :۔ آپ پادشاہ ہوں یا وزیر، ہمارے تو خوجی ہی ہو۔

خو :۔ ہاں بھائی یہ تو ہے ہی۔ خداوند حضور کے نمک کی قسم ملکوں ملکوں اس دربار کا نام کیا۔

نواب :۔ شاباش۔ خوجی۔ شاباش۔ ہم نے اکثر اخباروں میں تمہاری تعریف پڑھی اور بہت محظوظ ہوئے۔

خو :۔ (سلام کر کے) خداوند غلام کس لائق ہے۔ مگر :۔

یہ کیا شرف ہے کم کہ تمہارا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

دواجی :۔ اخاہ خوجی میاں آئے ہیں اچھے رہے بیٹا۔

خو :۔ بندگی دواجی۔ ذری چھوٹی سرکار سے کہہ دیجئے کہ خواجہ بدیع پاشا حاضر ہے اور آداب عرض کرتا ہے

دوا :۔ اچھا ہیں تو تم کو روز پوچھا کرتی تھی۔

نواب :۔ اور ان کا نام بھی سنا۔ اب خوجی میاں نہ کہا کرو۔ اب ان کو روم سے خطاب ملا ہے۔ بدیع پاشاہ۔

دوا :۔ یہ تو مجھے یاد نہ رہے گا۔ کون پدی پاشاہ۔

خو :۔ دواجی تم کہہ دینا کہ حضور کا غلام خواجہ بدیع حاضر ہے، اور آداب عرض کرتا ہوں۔

جھمن :۔ ارے یار تو سمندر میں جہاز پر کیونکر سوار ہوا۔

خو :۔ ہوتھ! یہ سمندر میں جہاز پر کیونکر سوار ہوا۔ مورچوں پر جرنلوں اور سپہ سالاروں اور کرنلوں، اور میجروں سے بھڑ بھڑ پڑے ہیں! اور مارتے مارتے مارتے بڑے بڑے کرارے اور تجربہ کار افسروں کے ناک میں دم کر دیا ہے! پلونا کی جنگ میں خداوند دس لاکھ آدمی ایک طرف اور سنتر سواروں کے ساتھ غلام دوسری طرف۔

پھر یہ ملاحظہ فرمائیے کہ چودہ دن برابر مقابلہ کیا اور چھکے چھڑا دیئے۔

جھمن :۔ ارے یار اس قدر جھوٹ! ادھر دس لاکھ ادھر بستر بھلا کوئی بات ہے۔

خو :۔ تم کیا جانو۔ لونڈے بچے گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہاں ہوتے تو اوسان خطا ہو جاتے بچہ۔

نواب :۔ بھئی اس میں تو شک نہیں تم نے بڑا جیالا پن کیا۔ خبردار آج سے ان کو کوئی خوجی نہ کہے۔ بدیع پاشا کے لقب سے پکارے جائیں۔

خو : (سلام کر کے) آداب حضور۔ جھمن گیدی چغل خور نے منہ کی کھائی آخر۔ خداوند رئیسوں کی صحبت میں ایسے مردود کا گزر افسوس کا مقام ہے۔ اب تو حاضر ہوا ہوں۔ دیکھئے گا۔ کیا کیا باتیں عرض کرتا ہوں۔ خداوند جس طرح زار بزور س رہتے ہیں، اس طرح حضور کا طرزِ معاشرت ہو تو سہی۔

نواب :۔ چشمِ ما روشن دل ما شاد۔ خانۂ احسان آباد۔

راوی :۔ اب چین ہی چین لکھتا ہے۔ واہ خواجہ صاحب واہ۔ بلی کی قسمت سے چھینکا ٹوٹا۔ اب کیا پوچھتے ہو۔ چپڑی اور دو دو۔ نواب تو درم ناخریدہ غلام ہو گئے۔

نواب :۔ کیوں صاحب بھلا ہندوستان کے باہر بھی کوئی ہم کو جانتا ہے۔ سچ سچ بتانا بھائی۔

خو :۔ خداوند جہاں جہاں غلام گیا حضور کا نام بادشاہوں سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

خوجی کے احباب اور محلے کے لوگ اور دربار کے آدمی جوق درجوق جمع ہوئے، اور خوجی پینترے بدل بدل کر ڈینگ اُڑانے لگے۔

بنظرِ احتیاط خواجہ صاحب نے ایک نامی گرامی اخبار میں ایک اشتہار درج کرایا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ اگر آزاد پاشا کی نظر انور سے یہ اشتہار گزرے تو اپنے رفیقِ قدیم خواجہ بدیع کو بُلوا لیں، اور پتہ بھی درج کر دیا۔ یہ اشتہار کسی لائق شاعر کا تصنیف کیا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنے نام سے اخباروں میں درج کرا دیا۔

فرسٹ کلاس جنٹلمین اور ہندوستان کی ضعیفُ الاعتقادی

ان بزرگوار کا ذکر خیر وقتاً فوقتاً جلدِ ثانی میں کیا ہے، اور غالباً ہمارے ناظرین باتمکین فرسٹ کلاس جنٹلمین کے نام سے خوب واقف ہوں گے۔ یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے ہندوستانی وضع ترک کر کے جاکٹ پتلون ڈاٹا تھا۔ کچھ دنوں تو اُن کے مزاج میں وحشت نے بہت دخل پایا۔ آخر کار ہمارے فرسٹ کلاس جنٹلمین نے خُذ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدَر پر عمل کر کے وہ وضع اختیار کی جس میں انگریز ہنسیں اور نہ ہندوستانی یہ پھبتی کہیں:۔

جو کی تقلید خسرو کی تو کارِ کوہکن بگڑا ! چلا جب چال کوا ہنس کی اس کا چلن بگڑا

انھوں نے دل میں ٹھان لی، کہ ہندوستان کی ضعیف الاعتقادی کی بیخ کنی کریں یہ صاحب جھاڑ پھونک، جادو ٹونے، سحر، بھوت پریت، چڑیل ٹوٹکے وغیرہ امور کے قائل نہ تھے۔ کوشش بلیغ کی کہ جو مکار رنگے سیار بن کر سست اعتقاد آدمیوں کو بہکاتے، اور اُن سے کچھ ے مرتے ہیں اور جن کے مکر سے ہندوستانی کی ایک حصہ خلقت تباہ ہے۔ اُن کو نیچا دکھائیں۔ اور اُن کے مکر کی ترقی کے مانع ہوں۔ ایک روز انھوں نے اپنے فیشن کے دو چار آدمیوں سے مشورہ کیا، اور اُن سے اس کام میں مدد چاہی، تین چار دوستوں نے بیڑا اٹھالیا کہ جہاں تک ممکن ہوگا مدد دیں گے۔

میر :۔ ہم آج تک ان باتوں کے قائل ہی نہ ہوئے۔

لالہ :۔ پڑھا لکھا آدمی ان باتوں کو کبھی نہ مانے گا۔

ٹھاکر :۔ پرانے فیشن کے لوگوں کے سامنے کہو تو لڑ پڑیں

شیخ :۔ وہ تو معاذ اللہ اسی کو دین و ایمان سمجھتے ہیں۔

لالہ :۔ وہ لوگ تو قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے بھوت پریت دیکھے ہیں۔

شیخ :۔ حضرت یہاں تک یقین ہے کہ مردے زندہ ہو جاتے ہیں۔

جنٹلمین :۔ ہزاروں گپیں لوگ اڑاتے ہیں۔ مگر سب بے اصل۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک صاحب منے میاں نامی جو عاملوں کی صحبت میں عرصۂ دراز تک بیٹھے تھے تشریف لائے۔ انھوں نے جو یہ تقریر سُنی تو بحث کرنے لگے۔ کہا واہ صاحب واہ دنیا میں آپ کسی چیز کو مانتے ہیں، یا کسی چیز کو مانتے ہی نہیں۔ جادو کے آپ قائل نہیں۔ ٹونے کو آپ ہیچ سمجھتے ہیں۔ ٹوٹکوں کو آپ بے اثر بتاتے ہیں۔ ابھی آپ نے عامل نہیں دیکھے ہیں۔ قسم خدا کی اگر دوستی کا خیال نہ ہوتا، تو آج شب کو کوئی خبیث بھیج دیتا۔ پھر آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا۔

جنٹلمین :۔ آپ دوستی کا خیال نہ کیجئے، اور کچھ ضرور دکھائیے۔

منے :۔ اب آپ سے حجت کون کرے، اسی طرح ہمارے محلے میں ایک حجتی رہتے تھے۔ وہ بھی بنکارا کرتے تھے۔ کہ دیو کی کیا حقیقت ہے اور جن کیا مال ہے۔ اور پریت کو ہم کیا سمجھتے ہیں۔ ایک دن بندے نے اُن کو چیز غتو کیا۔ جب میں نے دیکھا ہاری مانتے ہیں، نہ جیتی تو کئی بار سمجھایا کہ بھائی ہم سے حجت نہ کیا کرو۔ ورنہ ایک دن زک پاؤ گے، اور منہ کی کھاؤ گے یہ کوچہ بڑا نازک ہے۔ مگر سُنتے کس کی تھے۔ ہوا کے گھوڑوں پر سوار۔ میں نے ایک عامل سے کہا کہ اس شخص کو نیچا دکھانا لازم آیا انھوں نے کہا بھائی صاحب ہم تو اچھے اچھے کڑے خان کو بلوانے والے لوگ ہیں۔ وہ بے چارے کس کھیت کی مُولی ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ کوئی ہلکا سا کرتب دکھائیے۔

سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ انھوں نے کہا آج شب کو اُن کی چارپائی اُلٹ دی جائے گی جتنی مرتبہ چارپائی پر سوئیں گے اُتنی ہی مرتبہ چارپائی اُلٹ دی جائے گی، اور پٹخنی پر پٹخنی کھائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بڑے گجردم میرے میرے پاس وہ دوڑے آئے۔ ہاتھ جوڑ کر کہا بھائی صاحب خدا کے لئے میرا پیچھا چھڑا دیجئے میں نے جو کچھ کہا جھک مارا۔

مرزا :۔ کس مردود کو ذرا بھی اس بات کا یقین آیا ہو۔

لالہ :۔ پڑھا لکھا آدمی کہیں ایسی بات بیان کرتا ہے۔

شیخ :۔ ایسی ایسی بے سروپا کہانیاں بہت سی سُنی ہیں۔

جنٹلمین :۔ اجی توبہ توبہ۔ یہ ڈھکوسلے ہم کب مانتے ہیں۔

منے :۔ اور تو نہیں لالہ جی کو کہیئے آج ناچ نچاؤں۔

جنٹلمین :۔ ضرور۔ سو کام ہزار کام لاکھ کام چھوڑ کے۔

لالہ :۔ اور جو اثر نہ ہوا تو میں جرمانہ بھی لوں گا آپ سے۔

منے :۔ منظور، مگر پھر شکایت نہ کیجئے گا۔ چارپائی مکان پر ہوگی۔ مگر آپ گھوڑے پر اوندھے پڑے ہوں گے۔

اس کے بعد منے نے کہا۔ ایک مرتبہ کانگرآباد میں ہم ایک مجذوبہ کے پاس گئے۔ مجھے دیکھتے ہی ہنسی اور کہا۔ آئیے۔ آئیے۔ لائیے وائیے کچھ نہیں خالی خولی فتح چاہتے ہیں۔ میں نے ہاتھ جوڑے اور قدموں پر ٹوپی رکھ کر عرض کیا کہ اگر فتح ہو جائے تو آدھا مال تمہارا۔ کہا اپنی بہن سے نہ بگاڑنا۔ جا کل خوش خوش آئے گا ترکے کا مقدمہ تھا، ادھر گھر پر آیا۔ اُدھر سُنا کہ چونتیس ہزار روپے ہمارے چچا نے گھر پر بھیج دیئے ہیں۔ بس جناب میں نے ٹھان لی کہ سترہ ہزار مجذوبہ کو دوں گا مگر یاروں نے سمجھایا، کہ کچھ سٹری ہوئے ہو۔ بھلا کوئی اس قدر روپیہ ایسی ویسی دیوانی کو دیتا ہے لالہ صاحب اور شیخ جی کے سے حضرات نے خوب بھرے دیئے، اور روپے تو آپ جانتے ہیں، ہر دل عزیز چیز ہے۔ ہم بھی سوچ کہ کیسی مجذوبہ اور کہاں کا اقرار اور ہر گھوڑے پر ایک آدمی سوار ہے، مگر سواروں اور گھوڑوں کے سرندارد۔ بس گھوڑے اور سوار سب طاق کے اندر داخل ہوتے گئے۔

جنٹلمین :۔ از برائے خدا خاموش رہو۔ اللہ ری گپ۔

شیخ :۔ بس انھیں حضرات نے تو یہ گپیں اڑا رکھی ہیں۔

لالہ :۔ اور ہم تو ان لوگوں کے قائل ہیں، جو اِن خبروں کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔

جنٹلمین :۔ کیوں میاں منے۔ تم نے کوئی چڑیل بھی دیکھی ہے۔

منے :۔ حضرت اب آپ سے کون کہے۔ آپ لوگ نہ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔

بڑی دیر تک یہ بحث ہوا کی۔ آخر کار جب جلسۂ برخاست ہوا تو جنٹلمین نے منے کو بلایا، اور کہا۔ اگر تم کوئی عامل بلالاؤ اور وہ ہم کو کامل ثبوت دے تو ہم بھی ان چیزوں کے قائل ہو جائیں۔

منے میاں نے کہا، بس آپ اب اس بارے میں ہم سے کچھ نہ کہیں۔ میں سمجھ لوں گا۔ اس خوبصورتی سے کل بانہیں دکھادے کہ آپ کو حیرت ہو جائے۔ ہمارے وہاں ایک عامل رہتا ہے۔ اس فن کا نقاد ہے۔ اس سے میں کہوں گا۔ اور کل شام کو ساتھ لاؤں گا۔

دوسرے روز شام کو منے میاں ایک عامل کو ساتھ لائے۔ میانہ قامت، خوبصورت، مرغولہ مو، دراز گیسو، خوش پوش، از سرتاپا معنبر و معطر۔

جنٹلمین :۔ آئیے۔ (منے میاں سے) آپ ہی ہیں۔

منے :۔ جی ہاں۔ جناب مولوی محمد برکت علی صاحب۔

جنٹلمین :۔ آپ کو میں نے ایک سبب خاص سے تکلیف دی۔

عامل :۔ میں سن چکا ہوں۔ عرض کردوں حضرت یہ کوئی شعبدہ تو ہے نہیں، مگر آپ رئیس ہیں، اور دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ تو لازم آیا کہ آپ کو نچ کے طور پر اس قدر سمجھادوں کہ ان باتوں میں کسی قدر خطر اور ضرر بھی ہے، بالفعل ایک ادنیٰ سی بات عرض کرتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں پرمٹ کے داروغہ ہندو ہیں۔ انھوں نے ایک چپراسی کی جورو اپنے گھر ڈال لی اور وہ چپراسی رنج میں مرگیا، ادر مرنے کے بعد وہ خبیث ہوگیا، اور اور داروغہ کو ستانے لگا۔ عورت نہایت حسین اور خوبصورت ہے۔ داروغہ کی یہ کیفیت کہ دن رات شدید۔ طبیبوں اور ڈاکٹروں، اور بیدوں، کا علاج ہوا مگر بیکار، محض نوبت بایںجا رسید کہ شب کو چارپائی اوندھادی۔ کبھی ان کے سرہانے پر بلیاں بولتی تھیں۔ کبھی بستر پر چوہوں کی قطار نظر آتی ہے۔ اور ہر روز خواب میں اُن سے کہتا تھا کہ تجھ کو مارڈالوں گا۔ سب روپیہ ہضم کرلیا۔ اس کو خبر ہوئی تو کہا اچھا کہہ دینا اس میں سے دس روپے تیرے ہیں، باقی سب ہمارے ہیں، بس جناب چوتھے روز آگ لگی۔ محلے والوں نے سب روپیہ لوٹ لیا۔ دس روپیہ لے کر ہم شاہجہاں پور گئے تھے، وہ تو ہمارے ہاتھ آئے۔ باقی سب صفایا ہوگیا۔ اب ہم کیوں کر نہ مانیں۔

اتنے میں ایک صاحب اور تشریف لائے، اور یہ گفتگو سُن کر انھوں نے مُنّے کا ساتھ دیا اور وہ دلندیزی گپ اڑائی کہ الاماں۔ کہا آپ لوگ تو بے سمجھے بوجھے رائے دے دیتے ہیں۔ ابھی صاحبزادے ہیں نہ آپ، ہم نے یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک شہید مرد کے طاق کے پاس سینکڑوں گھوڑے کھڑے ہیں۔

جنٹلمین: کیوں صاحب یہ آپ کو یقین ہے کہ خلل دماغ نہیں ہے۔

عامل: کیسا خلل دماغ حضرت سُنتے جلیئے۔ بس قبلہ مجھ سے رجوع لائے۔ میں نے عمل کے زور سے اس کو زیر کیا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو داروغہ صاحب اور اس عورت کو بلاؤں اور آپ کے سامنے عمل کروں۔

جنٹلمین: ضرور بلوایئے۔ میں کمال مشتاق ہوں۔

عامل: مُنّے میاں بُلالو۔ گاڑی پر ہیں دونوں۔

جنٹلمین: کیا آپ ہمراہ لیتے آئے ہیں۔ پھر بلوایئے۔ پردہ کرلیا گیا۔ داروغہ صاحب آئے۔ لحیم شحیم اور گرانڈیل، کشیدہ قامت، جوان، چالیس برس کا سن۔ پیچھے پیچھے ایک عورت، بوٹا سا قد۔ سرخ و سفید، نازک اندام، پاکیزہ رُو۔

جنٹلمین نے دیکھا تو جی خوش ہوگیا۔

عامل: یوں آن کر بیٹھو۔ شرماتی کیا ہو صاحب۔

عورت: (آہستہ سے) یہ کس کا مکان ہے۔

عامل: ہمارے ایک دوست ہیں اُن کی کوٹھی ہے۔

جنٹلمین: داروغہ صاحب آپ ہی ہیں۔ کون ٹھاکر ہیں آپ۔

داروغہ: ہم تو سُنار ہیں صاحب، بنارس کے رہنے والے۔

جنٹلمین: آپ اب بھی بُرے بُرے خواب دیکھتے ہیں۔

داروغہ: جی ہاں۔ مگر اب جب سے مولوی صاحب کی مہربانی ہوئی تب سے بُرے خواب کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

جنٹلمین: پہلے کس قسم کے خواب آپ دیکھتے تھے؟

داروغہ: آدھی رات کو دس بارہ بلیاں لڑتی ہوئی سرہانے پر آتی تھیں، اور جب میں اُٹھ بیٹھتا تھا تو کبھی گینڈا بن کر ڈراتی تھیں۔ کبھی کتا بن کر۔ اور رات کو میرے کان میں کوئی شخص یہ اشعار ہمیشہ پڑھا کرتا تھا۔

مزار یار پہ مجکو جلایا آخر کار　　بنایا آتشِ غم نے مجھے چراغِ مزار

زمیں بلرزہ در آید بے قراری من　　فلک بگریہ در آید ز اشکباری من

اور دوسرے تیسرے سرہانے پر یہ شعر لکھا نظر آتا:

میں نزع میں تھا بُلوا نہ سکا کوئی مجھے واں پہنچا نہ سکا

وہ آنہ سکا میں جا نہ سکا یہ بھی نہ ہوا وہ بھی نہ ہوا

اور جب نہانے بیٹھوں تو پانی کھولنے لگے۔ کیسا ہی تازہ اور ٹھنڈا پانی ہو۔ میں نے ہاتھ لگایا اور آگ ہوگیا۔

جنٹلمین: یہ کہیے تو آپ بڑی مصیبت میں پھنسے۔

عورت : میں بھی جب سے ان کے گھر میں آئی بہت ہی مصیبت میں ہوں۔ کھانا کھاتی ہوں تو بچتا نہیں۔ پانی پیتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے، کلانٹے چبھتے ہیں۔ تالو چلنے لگتا ہے۔

داروغہ : اچھا اب رات جاتی ہے۔

عامل : آپ پاک صاف ہیں اس وقت ؟

جنٹلمین : جی ہاں ابھی حمام سے آیا ہوں۔

عامل نے عورت کو اپنے قریب بٹھایا، اور داروغہ صاحب سامنے بیٹھے۔ جنٹلمین نے بھی ایک کونے میں جگہ لی، اور عامل نے دھونی جلا کے ٹکی ہانک لگائی۔ ع

اَیُّهَا الْمَشْغُوْلُ فِی فِکْرِ الْبَیَانِ ؎

اَیُّهَا الْمَطْرُوْدُ عَنْ بَابِ الْهُدیٰ	تا کجا شرمت نیابت از خدا
چند آمیزی بایں ناسوتیاں	ہائے وہوئے گوئے چوں لاہوتیاں
زخمہ بر سازِ جگر زن از خروش	تا بیاید نورِ عرفانت بجوش
عاشقاں را خود مذاقِ دیگر ست	وجہ ذوقِ و اشتیاق دیگر ست
چند باشی در پے فکرِ معاش	مشت خاکے ریز بر فرقِ تلاش
اَیُّهَا الْمَصْرُوْفُ فِی قُوْتِ الثَّرٰیا	پند انشا گوش کن بگذر ریا
اے فقیہ بادیہ پیما بو الفضول	چند گوئی از فروغ و از اصول
نیست در مند اخذ و جز مدام	خویشتن را کردی اما جلام
از پے جلب منافع چہل سال	گشتہ از اہل دخل چشمے ہمال
مرشدت شیطان فگند ایں وسوسہ	درس تا گوئی میانِ مدرسہ
از شرائع و زہدایہ اے فقیہ	چند باشی ضرب شیطان را شبیہ
صاف زیں عمامہ تختِ فلک	میچکد یکسر ریائے بی نمک
زیں عبائے صوف گشتی مسخرہ	می نمائی در نظر چوں شیبرہ

لَسْتَ یَا خُفَّاشُ مِنْ اَهْلِ الْوَفَا

لَا تَرٰی شَمْسًا وَلَا ضَوْءَ النَّهَار

یہ کہہ کر عامل صاحب نے اور بھی بے تکی ہانک لگائی۔ اور جھوم جھوم کر کہنا شروع کیا۔ دھونی میری جلتی ہے۔ جلتی ہے۔ جلتی ہے۔ اور جلتی ہے۔ دھونی میری جلتی ہے۔ گھنی مونچھیں، اور چڑھی داڑھی۔ لمبے بالوں والا ہے صبح میرا

اعلیٰ ہے۔

داروغہ کی یہ کیفیت تھی کہ کانپ رہے تھے۔ عامل نے کچھ بڑبڑا کر داروغہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، تو وہ دشمن عقل جھومنے لگا۔

عامل: آپ کون صاحب ہیں۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی اس وقت؟

داروغہ: ہم دتامل اوجھے ہیں۔ تربنی پور کے رہنے والے۔

عامل: اس بیچارے نے آپ کا کیا قصور کیا تھا۔

داروغہ: (قہقہہ لگا کر) جس پر ہمارا دل آیا تھا اس سے اس نے میل جول بڑھایا۔ اب ہم اس کو مار ڈالیں گے۔ اس نے ہمیں بڑا دکھ پہونچایا ہے یہ ہمارا دشمن ہم اس کے دشمن۔

عامل: جو کہیے بھینٹ آپ کو دلوا دیں مگر اس کو چھوڑ دیجیے۔

اوجھا: اس نے انگور کی ٹیٹی میں بیٹھ کر ایک اوجھا سے وعدہ کیا کہ اگر ہم کو وہ عامل نہ ستاتے تو ہم اس کے نام پر پچاس باہمنوں کو کھلائیں گے۔ سو ہم نے تین دن تک اس کو دق نہیں کیا مگر اس نے وعدہ پورا نہ کیا۔

عامل: یہ اس عورت کو بھی چھوڑ دے گا، اور باہمنوں کو بھی کھلائے گا۔ اب تم اس کو چھوڑ دو۔

اوجھا: اچھا تمہارے کہنے سے چھوڑے دیتے ہیں مگر وعدہ دس دن میں پورا نہ ہوا، تو بڑا ستم ہو جائے گا اور پھر میں اس کو مار ہی ڈالوں گا۔

یہ کہہ کر داروغہ گر پڑا، اور عامل نے کچھ پڑھ کر کہا۔ اُٹھ حکم معبود سے۔ حضرت فوراً اُٹھ بیٹھے، اور یہ اشعار زبان پر لائے ؎

اے کہ گستردی لسانِ عنکبوت	دامِ تلبیس از پے تحصیلِ قوت
تار و پود ہستیت بگسستنی است	ایں زمان صید گیری اندکی است
بس مگسہا طعمہ ات گردیدہ است	دل ضعیفاں راز تو رنجیدہ است
تا کجا ایں سعیٔ بیجا بہر صید	ایں تکبر تا کجا ایں مکر و شید
تا کجا باشی میان ہر ملہ	بہرِ شیطان در دخود کن ہو تلہ

قُل ہو اللہ احد آغاز کن

ذکرِ الا اللہ را دمساز کن

عامل: یہ ایک حافظ ہیں، بڑے عالم اِن سے بڑی مدد ملے گی۔

جنٹلمین: یہ ان دونوں کو داروغہ جی کے سر شریف پر آپ نے بُلوایا ہے یا از خود آگئے۔

عامل : (ہنس کر) خود کہیں آیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ بادشاہ وزیر کی نہیں پروا کرتے۔ التجا کی ہے تب آئے ہیں اب ان کی زبانی سنیے ۔

عامل : حافظ صاحب آداب عرض ہے۔ اس وقت کی تکلیف معاف فرمائیے گا۔

حافظ : اب آپ بہت پریشان کرنے لگے، اور میں مارے مروّت کے کچھ بولتا نہیں ہوں۔

عامل : اس بیچارے کا حال تو ہم کو کچھ بتلائیے۔ اس سے کیا قصور سرزد ہوا۔

حافظ : انھوں نے ایک شخص کی منکوحہ بی بی کو بدنیتی سے اپنے گھر میں رکھا۔ دتا مل ناتھ اوجھا اس پر عاشق تھا۔ اُس کو بُرا معلوم ہوا تب سے یہ بخار میں پڑے ہیں، اور اُس عورت کا میاں الگ اُن پر جادو کر رہا ہے۔

ع۔ پھر اب اُس کا کچھ رفع دخل کیجئے تو احسان ہے

حافظ : ایک بکرا تو اپنے ہندوؤں کے قاعدے کے موافق دیبی پر قسم بان کر کے، مالن کو دے دے اور جنوں کی مسجد میں منت مانے، اور اس عورت کو ترک کر دے۔

عامل : آپ اپنا دستِ شفقت اِس بیچارے کے سر پر رکھیں تو اس کی مخلصی ہو۔

داروغہ نے اپنا ہاتھ سر پر رکھ لیا، تو ضعیف الاعتقادوں نے نعرہ مارا اور باہم کہنے لگے کہ چونکہ حافظ جی صاحب نے اِس بیچارۂ ستم رسیدہ کے سر پر دستِ شفقت پھیرا، لہٰذا امید ہے کہ آپ دتا مل کے جرم سے محفوظ رہے۔

اتنے میں حافظ جی نے عورت کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ تم نے بہتوں کو گھائل کیا ہے۔ مُردے تک تمہارے جادو سے نہ بچے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ یہ شخص تم کو پسند ہے یا نہیں۔ عورت نے شرما کر کہا کہ اوجھا ہمیں ہر روز رات کو خواب میں ستاتا ہے۔ اور ہم کو اپنا میاں بالکل پسند نہیں ہے۔ ہم انھیں کے پاس رہنا چاہتے ہیں، یہ کہہ کر عورت کی آنکھوں سے اشک جاری ہوئے حافظ جی نے ٹھنڈی سانس بھر کر یہ دو شعر پڑھے ؎

پے تعظیم اشک اس طرح آہِ سرد اُٹھتی ہے — کہ جیسے قطرۂ افشانی جو موئے گرد رکھتی ہے
گرہ حسرت کے ہتارِ نفس میں پڑ گئی جس سے — یہ کیسی ہوک ہر دم اے دلِ پُر درد اٹھتی ہے

حافظ : اب بندہ رخصت ہوتا ہے۔ خدا حافظ و ناصر۔

عامل : یہ دیر آمدن و شتاب رفتن کیا معنی: ؎

گاہے گاہے جو ادھر آپ کرم کرتے ہیں
وہیں اُٹھ جاتے ہیں یہ اور ستم کرتے ہیں

حافظ : ایک سر و ہزار سودا۔ ایک انار سو بیمار۔

حافظ : اگر کچھ کھایئے تو بے تکلف فرما دیجئے۔ گو آپ کے قابل یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ع
برگ سبزست تحفۂ درویش

حافظ : ہماری غذا رنج و بلا۔

درویش بلا نوش بلاچٹ ہے میاں دوست　　　پینک میں جو آویں
افعی کو مسل کر کریں افیون کا گولا　　　ہیں ایسے بلاچٹ

اتنے میں داروغہ پھر گر پڑا۔ اور جب عامل نے اُٹھ حکم معبود کہہ کر ران پر ہاتھ مارا۔ تو گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ سُست اعتقاد آدمیوں کو شگوفہ ہاتھ آیا، عامل کی بڑی قدر دانی اور عظمت کی۔ مگر جنٹلمین دل ہی دل میں ہنس رہے تھے، کہ عجب بھیڑیا دھسان خلقت ہے۔ نہ کہیں حافظ جی نہ کہیں دتا مل او جھے کا پتہ ہے۔ داروغہ صاحب ہی کبھی حافظ بن جاتے ہیں۔ کبھی دتا مل بن جاتے ہیں۔ مگر جُہلا کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ عامل نے عمل کے زور سے داروغہ افیون کے سر پر دتا مل اوجھے کو جو برسوں ہوئے مر گیا تھا بُلا لیا اور پھر حافظ جی کو جو عالم باعمل ہیں، داروغہ کے سر پر بُلوا کر خوبصورتی کے ساتھ کل امور پوشیدہ کی تحقیقات کر لی اب طرح طرح کی باتیں ہونے لگی۔

ایک : دتا مل او جھے ہمارے گاؤں سے کوس بھر کے فاصلے پر تربینی پور میں رہتا تھا۔ لال بخار کے عارضے گرا کہ پھر طبیعت سنبھل نہ سکی۔ آٹھ دس برس کا عرصہ ہوا مر گیا۔ اب وہ اِس عورت کے سر پر بولا اور حافظ جی کے کلام سے بھی اُس کی تصدیق ہوئی۔

دوسرا : ان اوجھوں سے نارائن اپنی پناہ میں رکھے۔

تیسرا : ہم تو ان عاملوں کے قائل ہو گئے برسوں کے گڑے مُردے اُکھاڑتے ہیں۔

چوتھا : جس وقت بلایا اُسی وقت آئے، اور جس وقت رخصت کیا کان دبائے چلے گئے۔

پانچواں : عامل اچھا ہو تو سب باتیں صاف صاف معلوم ہو جائیں۔ بعضے کٹھ مُلّا جانتے وانتے خاک نہیں، مگر اپنے تئیں مشہور بہت کر دیتے ہیں۔

جنٹلمین نے داروغہ اور ان کی معشوقہ رعنا جمال کو علیحدہ لے جا کر باتیں کیں، پوچھا کہ سچ کہیے گا، اس وقت آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ داروغہ صاحب کچھ کہنے کو تھے، مگر عورت نے پیش قدمی کی اور تیزی کے ساتھ کہا۔

ع　　ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

خود آزما لیجئے، عامل تو بہت بڑے شخص ہیں میں ادنیٰ سی عورت ہوں کہیے تو وہ باتیں دکھاؤں کہ آپ کے آئے ہوئے حواس غائب ہو جائیں۔ جنٹلمین نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ جی صاحب اس کی کوشش کرنے

——— کی کیا ضرورت ہے۔ میرے حواس تو آپ کی صورت دیکھتے ہی اُڑ گئے۔ تعجب ہے آپ کو اب تک یقین نہیں آتا کہ میرا میاں مجھ پر جادو کر رہا ہے اور اسی کے جادو سے ان کی یہ کیفیت ہو رہی ہے کہ دن رات بخار میں پڑے رہتے ہیں۔ رات کو بُرے بُرے خواب دیکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان سب کو رخصت کیا، اور صحبتِ اجنّات میں عامل، اور داروغہ افیون کا خوب خاکا اڑایا۔ منے میاں سر پیٹنے لگے۔ کہ اب بھی آپ سب صاحبوں کو یقین نہ آئے تو ستم ہے۔

اب سُنیئے کہ جنٹلمین کو اس بات کی ٹوہ ہوئی کہ اس قسم کے شعبدہ بازوں، افترا پردازوں، مکاروں، عیاروں رنگے سیاروں کی کارستانیوں، اور عیاروں کی تحقیقات کامل کریں، ہر روز ان کے مکان پر دس پانچ آدمی اس قسم کی خبریں لاتے تھے۔ کہ آج فلاں شخص کی لڑکی پر جن آئے، کل فلاں شخص کے بیٹے پر کوئی پیر آنے والے ہیں، پرسوں ایک تہہ خانے میں سے رُن کی آوازیں آتی تھیں۔ فلاں مکان پر ایک گوشے سے دس سر کا ایک دیو نکلا، جو دو سو مسافروں کو کھا گیا، یہ ہر مقام پر جا کر خود تحقیقات کرتے، مگر خیر سے کسی امر کی ذرا بھی صداقت نہ پاتے۔

اب سُنیئے کہ جنٹلمین کو ایک مرتبہ کسی عزیز کی برات میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا، تو کیا دیکھتے ہیں کہ دولہا کی ماں نے کم سے کم پندرہ بار تاکید کی کہ خبردار کوئی چھینکے نہیں۔ ناکوں کو قابو میں رکھو۔ جس وقت دولھا کو کپڑے اور خلعت پہنانے کا وقت آیا۔ اتفاق سے ایک شخص نے چھینک دیا۔ اس پر اس قدر جھگڑا ہوا، کہ اَلْاَمَان وَالْحَذَر نوبت بانیجا رسید کہ وہ بیچارہ اٹھ کر چلا گیا۔

اب سُنیئے کہ ایک تخت پر دولٹرکے باہم بیت بازی کر رہے تھے ایک نے یہ شعر پڑھا:

اٹھتے ہیں خفتگانِ خاکِ عدم سے چونک چونک
موجِ نسیم کوئے یار آج تو تیری باس سے

دوسرے نے تھوڑی دیر میں یہ شعر پڑھا:

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اس پر دولھا کے ایک بزرگ نے جو پُرانے فیشن کے تھے کہا۔ لڑکو بیت بازی موقوف کرو، بس اب خاموش رہو۔ مگر لڑکے کب ماننے والے تھے۔ وہ سنتے کس کی ہیں، ایک لڑکے نے اس خیال سے کہ مات نہ ہو جاؤں یہ بیت پڑھی۔

دیکھتے ہی اسے کچھ جی جو بھر آیا اللہ
ہم بھی کیا روئے ہیں کل بلبلِ بستاں سے لپٹ

بزرگ : تو نہ مانے گا بے۔ ہزار بار کہہ دیا کہ بیت بازی موقوف کرو یہ کس کا لڑکا ہے جی۔

لڑکا : واہ ہم بات لیں اپنے اوپر۔ خاموش کیوں رہیں۔

بزرگ : بھلا اب کی کوئی بیت پڑھو تو۔

لڑکا : ٹے کی چاہیئے نہ :-

ٹٹ پونجیئے بساطی کی کیا ہے بساط یار

سوداگروں کی ناک میں دم ہے بساط سے

اُدھر اس نادان لڑکے نے یہ شعر پڑھا۔ اُدھر بزرگ جھلائے۔ لوگوں نے سمجھایا اور فہمایس کی کہ آپ معمّر ہو کر بچے سے لڑتے ہیں۔ یہ زیبا نہیں۔

بزرگ : بچے بے ادبی کرے اس کو کوئی کچھ نہ کہے گا۔

لوگ : جناب و قبلہ وہ بیت بازی کر رہے ہیں۔

بزرگ : اِس سعید وقت میں رنج اور رونے اور ٹٹ پونجیئے بساطی کا کیا ذکر ہے۔ یہ بدشگونی ہے، یا نہیں؟

لوگ : لاحول ولاقوۃ۔ یہ نئی بات سُنی۔

بزرگ : ہمارے یہاں یہ باتیں جائز نہیں رکھی جاتیں۔

لوگ : اچھا تو پھر جن جن باتوں کو لوگ منحوس سمجھتے ہیں اُن سب سے کنارہ کیجئے۔

بزرگ : بیشک۔ ہم اپنے فرزند کی برات میں کبھی ایسی بات جائز نہ رکھیں گے۔ خوشی کے شعر پڑھیں تو ہرج نہیں :-

چمن میں جام صہبا ہے گھٹا ہے جائے خلوت ہے

اگر ایسے میں آ جاؤ تو صاحب وقت فرصت ہے

اس طرح کی شعر پڑھیں تو بسم اللہ۔

لوگ : قبلہ۔ بھلا آپ کے نزدیک کانے کا سامنے آنا کیسا۔

بزرگ : (گھبرا کر) اس سے کیا مطلب۔ اس سے کیا مطلب؟

لوگ : اس سے بڑے بڑے مطلب ہیں۔

بزرگ : آپ سب صاحب بالکل بدتمیز ہیں۔

لوگ : بدتمیز نہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی صاحب کا ایک کونا آباد دوسرا چوپٹ آباد ہے۔

بزرگ : (بہت جھلا کر) آپ لوگ کسی کا دل کیوں دکھاتے ہیں۔

لوگ : دل نہیں دکھاتے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر آپ کے بھائی صاحب سامنے آئیں، تو ایسا نہ ہو کہ بدشگونی جلوہ دکھائے۔ جس وقت نوشہ گھوڑے پر سوار ہو، اُن سے کہیئے گا کہ سامنے نہ آئیں۔ ورنہ ذلیل ہوں گے۔

۱۔ اس میں کیا شک ہے صاحب۔

۲۔ کانے سے بڑھ کر اور کیا چیز نجس ہے۔

۳۔ کانے کی بدذاتیاں دل میں کرو یقیں
آیا ہے قرآن میں کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْن

۴۔ مگر واللہ کانا بڑا شریر ہوتا ہے۔

الغرض جس وقت نوشہ کے سوار ہونے کا وقت آیا۔ لوگوں نے جو تاک میں بیٹھے تھے حضرت واحد العین کی خبر لی۔

۱۔ قبلہ آپ ذرا باہر جا کے برات کا انتظام کریں۔

۲۔ اور بہتر ہو کہ آپ برات کے پہلے ہی جائیں۔

۳۔ مگر خدا کے لیے برات کے پہلے جا کے سمدھیوں کے ہاں نہ گھس بیٹھیئے گا۔ ورنہ ذلیل ہو جائیے گا۔

۴۔ چلیے جناب باہر چلیے۔ اب سوچتے آپ کیا ہیں۔

۵۔ کیا نوشہ کو گود میں اٹھانے کا شوق ہے۔

۶۔ ارے توبہ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔

بارے ہزار خرابی کانے کو باہر لائے، اور کہا کہ آپ برات کا انتظام کیجئے، جب ان کو ٹال چکے تو نوشہ سے کہا کہ چلیئے۔ نوشہ خود بڑے شکی آدمی تھے۔ دس قدم گئے ہوں گے کہ ایک عورت نظر آئی۔ فوراً واپس۔ آپ کو کوئی کہتا ہے کہ پان کھالو۔ کوئی کہتا ہے پانی پی لو۔ نوشہ بیٹھے پان کھایا جوتا اتارا۔ پھر چلے۔ اب کی مادری حکم تھا کہ یہاں سے گھوڑے تک خبردار کسی عورت کی صورت نظر نہ آئے۔

آدمی : خبردار۔ کوئی ادھر ادھر اغل بغل میں نہ ہو۔

دوسرا : بھولا دیکھتے رہنا۔ خبردار کوئی عورت نہ آنے پائے۔

بزرگ : یہ نام کیوں لیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔

الغرض اس مرتبہ خیریت سے گزری۔ نوشہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ برات چلی۔ چلتے چلتے کہیں اتفاق سے نشان کے ہاتھی کے سامنے تھوڑی دور پر ایک بلی راستہ کاٹ گئی۔ جو صاحب سب کے آگے انتظام کرتے جاتے تھے۔ انھوں نے فیلبان کو حکم دیا کہ روک لے، اور دو چار معمر آدمیوں کو بُلا کر مشورہ کیا۔

نندلال: بلی سامنے سے راستہ کاٹ گئی۔

دیبی دین: براتوں میں یہ باتیں نہیں دیکھی جاتی ہیں۔

نندلال: واہ صاحب۔ براتوں میں نہیں تو کیا جنازوں میں دیکھی جاتی ہیں۔

رام پرشاد: اے تو جب تک کوئی برات اِدھر سے نہ جائے تب تک برات یہیں کھڑی رہے، اور یہ ہو نہیں سکتا

نندلال: بس یہ ہو سکتا ہے کہ راستہ بدل دیا جائے۔

رام پرشاد: ہاں۔ دوسری سڑک سے چلیے بس یہی ٹھیک ہے۔

برات دوسری جانب سے چلی تو جنٹلمین نے کہا کیوں صاحب اگر خدانخواستہ ادھر سے بھی بلی آئے تو پھر کیا کارروائی کی جائے۔

ایک صاحب نے فرمایا اجی اب اس کا ذکر ہی نہ کیجیے۔

مزن فال بد کآورد حالِ بُد

الغرض بعد وقت برات دُلہن کے مکان پر پہونچی اور جنٹلمین کو شگوفہ ہاتھ آیا۔

اس کے بعد کسی شخص نے ان سے کہا کہ ایک رئیس زادی پر فلاں محلے میں آسیب آتا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ چاندنی رات میں نکھر کر مہتابی پر گئی تھیں، اور کئی ہمجولیاں ساتھ تھیں۔ اتفاق سے وہاں بے ادبی کی، بس اسی وقت سے تپ میں مبتلا ہوگئیں۔ اور اب یہ کیفیت ہے کہ ہر جمعرات کو شب کے وقت ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگتے ہیں، اور وہ وہ شعر پڑھتی ہیں، کہ میں کیا بیان کروں، ایک دن پوری میزان عربی سُنا گئیں۔ تو وہ کیا پڑھتی ہیں پڑھنے والا تو کوئی اور ہے۔ پرسوں میں بھی گیا تھا۔ میرے دوست ایک عامل مجھ کو لے گئے تھے۔ کہ تم بھی کچھ مدد دو۔ پوچھا مزاج اقدس۔ اگر کسی شے کی خواہش ہو تو حاضر کریں۔ اِس کے جواب میں کِھل کِھلا کر اشعار پڑھے۔

جرعۂ مے بادا از اشفاق ۔۔۔ ساقیا تا شود دماغم چاق

واشد خاطرم اگر طلبی ۔۔۔ یم فیضی رسانیم بمذاق

تا بیابم بسان خم در جوش ۔۔۔ روح را این قیود باشد شاق

از حقیقت دری بمن بکشائے ۔۔۔ یا بہر سوئے منزل مشاق

بادل و جان کنون ہمیخواہم ۔۔۔ ہمدم عطربان شوم بوثاق

رحم فرما بیا برائے خدا ۔۔۔ می پسندم دگر بدرد فراق

لوحہ سینہ ام مصفا کن

ہم بشویش زلوثِ بی اِغراق

حضرت میرے تو ہوش اُڑ گئے۔ بالکل اہلِ ایران کے لہجہ میں شعر پڑھے۔ سب کے سب دنگ ہو گئے۔

اتنے میں ایک عامل نے کہا کیا آپ جام و صراحی، اور نغمہ و دُف کے بھی شائق ہیں۔ بس اتنا کہنا تھا کہ سرہانے پر جو پیالی رکھی تھی اُٹھالی اور خادمہ کو حکم دیا کہ اس کو دھولا۔ جب مہری نے پیالی دھو کر دی، تو کچھ پڑھا اور کہا لے شرابِ طہور۔ تھوڑی سی خود پی اور باقی ماندہ میں کچھ مجھے پلائی کچھ اور عاملوں کو۔ پیتے ہی نشہ چڑھ گیا۔ پھر میں کیا عرض کروں کہ کیا لطف اٹھائے ہیں۔

شرابِ کہنہ کہ روشن گر روان من ست
مصاحبِ من و پیرِ من و جوان من ست

میں نے کہا۔ کہیے حضرت۔ شراب طہور کے لطف اُڑا رہے ہیں۔ آپ بہت ہنسے، اور سر سے دوپٹا ہٹا کے کہا:

آرزوئے بہشت زد بجیابان دگر کمند
آمد زمان مستی در دمی کش نثر ند

عامل : آپ کی خدمت میں اس سے کیا خطا ہوئی ہے۔

شہید : میں شہید مرد ہوں۔ میرے طاق پر اس نے بے ادبی کی تھی۔ مجھے سخت غیظ آیا۔ اس دخت نازنیں چہرہ پر اب میں عاشق ہوں، مگر آہ سرد بھرتا ہوں کہ اس کو میرے سبب سے تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن مجبوری ہے:

دارم آہے کہ بود جملہ صفاتش آتش — لا درش برق پسر شعلہ و ذاتش آتش
تخم بتخانہ فرد ریخت بدل دانۂ اشک — بار در گشت بجائے ثمر آتش آتش

شعلہ طور تجلی بودم سینہ گرم
کہ کنوں سر کشد از جملہ حیاتش آتش

جنٹلمین: آپ کی ایسی تیسی۔ سوائے گپ کے دوسری بات نہیں۔

شیخ : میں سچ عرض کرتا ہوں جناب۔

جنٹلمین: اجی بس اب گپ نہ اڑاؤ بہت۔

اِتنے میں ایک مہاجن آیا۔ جنٹلمین نے پوچھا، کہیے حضرت کوئی تازہ خبر، کہا آجکل تو یہی خبر مشہور ہے کہ نواب خورشید علی کی صاحبزادی بہت ماندی ہیں۔

جنٹلمین: کیا بخار آتا ہے عارضہ کیا ہے۔؟

مہاجن: اصل میں ان کو بیماری ویماری تو ہے نہیں، اُن پر کوئی شہید مرد آتے ہیں۔

جنٹلمین: آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ بیماری نہیں ہے۔

مہاجن: سارا شہر کہتا ہے۔ کیا کوئی چھپی ہوئی بات ہے۔
جنٹلمین: کس وقت شہید مرد آتے ہیں۔ کوئی دن مقرر ہے؟
مہاجن: ہاں جمعرات اور سوموار کو آتے ہیں۔ اور سنا ہے کہ دو دو گز اچھل اچھل پڑتی ہیں۔ باپ چچا، سسر سب کے سب روکتے ہیں۔ تو روکے نہیں رُکتیں۔ کوئی پھیر ہے۔ آپ لوگ تو کل ہے کو باتیں سنتے ہیں کہ رات کو عطر لگا کے کہیں گئی تھیں۔ راستے میں شہید مرد کا طاق ملا، وہاں اتفاق سے کہاروں نے کاندھا بدلا۔ اور لاعلمی میں انھوں نے تھوک دیا، اور اسی دم آٹھوں کہاروں اور دو مشعلچیوں اور سپاہیوں اور دو مہریوں نے جو ہمراہ تھیں ٹھوکر کھائی، اور منہ کے بل زمین پر آرہے۔
جنٹلمین: دیکھیے شیخ صاحب کس قدر اختلاف بیانی ہوتی ہے۔
شیخ: مگر جناب اصل بات میں اختلاف نہیں ہے۔
جنٹلمین: ہاں لیکن جب تک کوئی معتبر آدمی نہ کہے تب ہمیں یقین نہ آئے گا۔
شیخ: درست ہے ہم سب تو غیر معتبر چور ہیں۔

اتنے میں احاطے کے اندر ایک پالکی آئی۔ اور ایک پستہ قامت خوبرو سفید پوش اس پر سے اترے خدمت گار نے کہا حکیم صاحب تشریف لائے ہیں۔ حکیم صاحب آئے۔ صاحب سلامت مزاج پرسی ہوئی۔
جنٹلمین: کہاں سے تشریف لاتے ہیں آپ۔
حکیم: مرزا خورشید علی صاحب کے ہاں گیا تھا۔ اُن کی چھوٹی صاحبزادی کی کسی قدر طبیعت ناساز ہے۔
جنٹلمین: ہم نے تو سُنا کہ آسیب کا پھیر ہے۔ مگر ایسے ہی ویسے لوگوں کی زبانی سننے میں آیا ہے۔
حکیم: لاحول ولاقوۃ۔ محض لچر چیز ہے۔ خفقان کا عارضہ ہے۔ دماغ صحیح نہیں ہے قلب پر گرمی آگئی۔

الغرض جنٹلمین وہاں سے روانہ ہوئے۔ ایک روز ایک شخص نے ان سے آن کر کہا کہ ایک فقیر ایک عورت کو یہ فقرہ دے کر بہکائے لئے جاتا ہے کہ تیرا زیور چوگنا کر دوں گا۔ آج ریل پر سوار ہو کر دونوں بھاگنے والے ہیں۔

جنٹلمین نے اس کو ساتھ لیا، اور فقیر کے پھانسنے کی نیت سے ریل پر آن کر دونوں کے قریب بیٹھے جب منزلِ مقصود پر بابا جی اور زنِ رعنا جمال اسٹیشن پر اترے تو چھما چھم کی آواز اور اس مجسمِ یوسف لقا کے حسن گلو سوز و ناز نے کل حاضرین کو محوِ دیدار کر دیا۔ اتفاق سے آزاد پاشا بھی اسٹیشن پر روانگی کی غرض سے آئے تھے۔ اُس فقیر اور اُس عروس ناز آفریں کو دیکھ کر جنٹلمین کے قریب آئے اور یوں مکالمہ شروع ہوا۔
آزاد: مجھے آپ کی خدمت میں نیاز نہیں حاصل ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ سے مجھ سے ملاقات ہے

مجھے آپ سے کچھ دریافت کرنا ہے۔

جنٹلمین: (ہاتھ ملا کر) میں آپ کی ملاقات سے بہت خوش ہوا۔

آزاد: آپ نے انگریزی کی تعلیم کہاں تک پائی ہے۔

جنٹلمین: میں حال میں انگلستان سے آیا ہوں۔ تین برس تک وہاں میں نے انگریزی کے علاوہ بہت سے علوم کی تعلیم پائی ہے۔

آزاد: اب آپ یہاں کس عہدے پر ممتاز ہیں۔

جنٹلمین: میں بیرسٹری کرتا ہوں، اور کچھ ریاست بھی ہے۔

آزاد: جناب یہ تو تمہید تھی مگر مطلب سعدی دیگر ست۔ کچھ دریافت کیا چاہتا ہوں لیکن خوف ہے کہ مبادا آپ بد دماغ ہو جائیں۔

جنٹلمین: جی نہیں آپ فرمائیں میں سمجھ گیا ہوں۔

آزاد: اس نوجوان لیڈی سے آپ کو کیا تعلق ہے۔

جنٹلمین: مطلق نہیں اب آپ پوچھئے گا کہ ساتھ کیونکر ہوا۔ اگر فرصت ہو تو سنئے طول وطویل قصہ ہے۔

آزاد: آپ فرمائیں مجھے سخت حیرت ہے کہ ایسی حسینہ پری پیکر برق وش، اور اس بے تکلفی سے ایسے نفیر کے ساتھ جو خود نوجوان ہے اس کا رہنا کچھ ٹھیک بات نہیں ہے۔

جنٹلمین: آپ ان کے حالات سے مطلق واقف نہیں ہیں

آزاد: جی کیونکر واقف ہوں، مگر ہے کچھ دال میں کالا کالا!!

جنٹلمین: یہ عورت گرہستن ہے۔ آپ نے اچھی طرح سے اسے دیکھا نہیں۔ اس طرح کی خوب صورت اور پری چہرہ ہے کہ میں تعریف نہیں کر سکتا۔ اللہ رے حسن:

روئے تو گل ولب تو قند ست
گل قند علاج دردمند ست

اگر تمام دنیا کے معشوق ایک مقام پر جمع ہوں تو مجھے کامل یقین ہے کہ یہ حسینہ سب سے بڑھ چڑھ کر رہے لیلی وشیریں کا تو نام ہی سُنا ہے لیکن اس کے خداداد حسن کے مقابلے میں میں نے یورپ تک کوئی عورت نہیں دیکھی:

گلِ رخسار پہ گلہائے چمن صدقے ہوں — لب پان خوردہ پہ یاقوتِ یمن صدقے ہوں
وہ چمک دانتوں میں ہو دُرِ عدن صدقے ہوں — دیکھ کر حور وپری بھی ہمہ تن صدقے ہوں

قدِ موزوں اگر اُس گُل کا نظر آجائے — سرو گلزار میں پیارے ابھی تھرا جائے
وہ جبیں صاف کہ آئینہ ہو جس سے حیراں — جلوۂ حسن پہ ہو نیر تاباں کا گُماں
ہیں وہ ابرو کہ خجل جس سے ہو تیغِ صفہاں — بیت ابرو کو ہلالی کا نہ پہونچے دیوا ا

اُس پری زاد سے پھر کوئی کنارہ نہ کرے
ہجر اُس کا کوئی دنیا میں گوارا نہ کرے

میں نے ایک روز دیکھا کہ یہ چھم چھم کرتی ہوئی ایک مندر سے نکلی۔ اور ایک خادمہ اس کے ساتھ تھی۔ متحیر ہوا کہ یا خدا اِس قدر کم سن اور ایسی خوبرو ایسی پری جمال، ایسی کان حسن، ایسی صبیح و وجیہہ اور اس مطلق العنانی سے ایک مہری کے ساتھ باہر آتی جاتی ہے۔ زیور سے آراستہ و پیراستہ۔ خوش نما اور بیش بہا ساری زیب تن کیے ہوئے۔ سمجھا کہ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ چھما چھم کرتی ہوئی ایک بغیا میں داخل ہوئی۔ میں بھی پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ ساتھ گیا۔ چھٹپٹا وقت تھا۔ دیکھا کہ دنیا کی ایک روش میں صاف ستھری چٹائی بچھی ہے اور اُس کے ایک کونے میں مرگ چھالا یعنی ہرن کی کھال پر ایک فقیر صندلی کپڑے پہنے ہوئے بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ کم سن۔ سرخ و سفید، کشیدہ قامت۔ ہاتھ پاؤں اچھے۔ چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا۔

آزاد: اب وہاں کوئی اور بھی ہے یا وہی دونوں۔

جنٹلمین: وہی دونوں۔ جاپ کر کے اس عورت نے مسکرا کر کچھ کہا۔ فقیر نے قہقہہ لگایا۔ میں اس قدر دیکھ رہا تھا کہ مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

آزاد: لاحول ولا قوۃ۔ ہاں جناب۔ پھر۔

جنٹلمین: شاہ جی اٹھے کچھ آڑو توڑے، عورت کو دیئے اُس نے آنکھوں سے لگائے اور کھائے۔ اتنے میں ایک باغبان آیا۔ مجھ کو دیکھ کر سلام کیا۔ میں نے اشارے سے بلایا اور یوں گفتگو کی۔

میں: یہ شاہ جی کسی کے آنے جانے سے بُرا تو نہیں مانتے ہیں۔؟

مالی: اس وقت اگر کوئی جائے تو سراپ دے بیٹھیں۔

میں: سراپ کیا میں اس لفظ کے معنی نہیں جانتا۔

مالی: مطلب یہ کہ بابا جی جب برا مانتے ہیں، تو بری دعا دیتے ہیں۔ اس وقت ایک مائی بیٹھی ہیں، اور اُن سے بابا جی بہت خوش ہیں۔

میں: یہ کوئی بوڑھی عورت ہیں نہ۔

مالی : (ہنس کر) صاحب بات یہ ہے کہ یہاں جوان بوڑھی ادھیڑ سب عمر کی عورتیں آتی ہیں؛ باباجی کو ان سب باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔

میں : باباجی کا سن کیا ہوگا۔ کوئی تیس برس۔

مالی : ہوں گے کوئی بائیس چوبیس برس کے۔

میں : اور عورت کی عمر کیا ہوگی۔ یہ آئی کیوں ہیں۔

مالی : کوئی انیس برس کی ہوگی۔ آئی اس لیے ہیں کہ ان کے میاں نے کسی کو گھر میں ڈال لیا ہے؛ اور یہ ان کو ناگوار۔ تو باباجی کے پاس آتی ہیں کہ اس کا دل اس عورت کی طرف سے پھر جائے۔

میں : بھلا باباجی میں اتنی قدرت ہے ؟

مالی : صاحب یہ کون کہے۔ ہے نہیں تو لوگ آتے کیونکر ہیں۔

میں : ہاں یہ بتاؤ کہ یہاں آتا کون ہے۔

مالی : صاحب مرد کم آتے ہیں۔ عورتیں بہت آتی ہیں۔

میں : ہم تو سمجھتے ہی تھے۔ بھلا ہم بھی ملیں۔

میں نے مالی سے کہا بھئی تم ہم کو ان باباجی کا مفصل حال بتاؤ تمہاری تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کچھ کہنے کو ہو، مگر کہتے ہوئے جھجکتے ہو۔

مالی نے کہا حضور یہ باغ ایک زمین دار کا ہے۔ ان کے ہاں باباجی بہت آتے جاتے ہیں۔ اور وہ ان کو بہت مانتے ہیں۔ سیر بھر گوشت، اور آدھ سیر گھی، اور تین پاؤ آٹا، اور ڈیڑھ پاؤ چاول اور آدھ سیر دودھ، اور ایک آنے روز کی بالائی، ان کے واسطے مقرر ہے۔ اور جو میوہ چاہیں کھائیں زمین دار ن کے لڑکا نہیں ہوتا تھا۔ ہزاروں گنڈے تعویذ کئے مگر لڑکا نہ ہوا۔ باباجی نے چار مہینے پڑھ پڑھ کر پانی دیا تو حمل رہا، لڑکا ہوا تب سے باباجی پجنے لگے۔ خلاصہ یہ کہ آج اس عورت کو باباجی ایک پہاڑ پر لیے جاتے ہیں۔ یہاں سے دو تین کوس پر ہے۔ پہاڑ کیا ایک ٹیلا ہے مگر کالے پہاڑ کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں جاکر اس کا گہنا دونا کر دیں گے۔

آزاد : واللہ تو یہ کہیے کہ باباجی بہت بڑھے ہوئے ہیں۔

جنٹلمین : میں اسی لیے ان کے ساتھ ساتھ چپکے سے آیا ہوں کہ ان کو دھروا دوں، آپ کو اگر فرصت ہو تو مدد دیجیے۔

آزاد : حضرت فرصت تو عنقا ہے مگر ضرور مدد دوں گا۔

الغرض آزاد اور جنٹلمین دونوں نے ٹھان لی کہ فقیر کو گرفتار کریں، ادھر وہ کامنی ناز و ادا سے کمر لچکاتی، دل حاضرین خرام ناز سے پامال کرتی باہر آئی۔ باباجی نے گاڑی کرایہ کی۔ اُدھر آزاد اور جنٹلمین بھی بگھی پر سوار ہو کر ساتھ ساتھ چلے۔ باباجی اس ماہرو کو لے کر ایک سرا میں فروکش ہوئے یہ دونوں بھی وہیں اترے۔ صبح کو منہ اندھیرے باباجی نے کالے پہاڑ جانے کی تیاری کی۔ معشوق جمیلہ و حسینہ کے لیے فنس منگوائی۔ خود پیادہ پا پیچھے پیچھے آزاد اور اس کے دوست بھیس بدل کر ساتھ ہوئے۔ کالے پہاڑ پر باباجی نے اشنان کیا، اور پوجا پر بیٹھے۔ آزاد اور ان کے حبیب صادق ایک گوشے سے کل کیفیت دیکھ رہے تھے۔ وہ پری بھی بصد شانِ دلبری برافگندہ نقاب اس فرحناک ٹیلے پر مصروف خرام ناز تھی۔ آزاد نے کہا حضرت بجا فرماتے تھے واقعی کیا صورت زیبا پائی ہے۔ صلِ علیٰ صلِ علیٰ۔ بڑی دیر تک یہ دونوں اس رشک نگار ارمنی کو گھورا کیے۔

اتنے میں اس کی نظر آزاد پر پڑی، تو خلقی شوخی اور جبلی شرارت سے منہ چڑایا اور فنس کے قریب منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ آزاد مسکرا کر رہ گئے۔ اللہ ری شوخی اور اُف رے چلبلاپن، دم کے دم میں تن تن کر جوبن دکھانے لگی، وہ نکھار کہ حور جنت بھی دیکھے تو قدم لے۔

اتنے میں آنا اٹرتی کہتی ہوئی آزاد کے قریب آن کر از سرتاپا ان پر نظر ڈالی اس وقت آزاد کے دل کا عجب حال تھا۔

چشم بد دور وہ آنکھیں ہوئی ناگاہ دوچار	برق سی ٹوٹ پڑی خرمن دل پر اک بار
صبر باقی نہ رہا دل میں نہ تاب و نہ قرار	آہ سوزاں ہوئی سینے میں یہاں آبشار

سرنگوں بیٹھے تھے فوارۂ مژگاں اُٹھے
دونوں آنکھوں سے غضب اشک کے طوفاں اُٹھے

قد جو بوٹا سا تھا کم اُس نے قیامت برپا	سر یہ رفتار نے کی حشر کی آفت برپا
شوخیوں سے بھی عجب کرم شرارت پیدا	ہر ادا سے بخدا طرز نزاکت پیدا

نکہت زلف سے کم مرتبہ مشک ہوا
شرم سے نافہ میں آہو کے لہو خشک ہوا

درویش کچھ بڑبڑا کر اُٹھے تو آزاد اور جنٹلمین ادھر اُدھر عمداً و قصداً کھسک گئے۔

باباجی نے لکڑیاں جمع کر کے ایک مقام پر رکھیں، اور روشن کر کے ایک برنجی پتیلی میں اس گل بدن کا گل زیور رکھا اور حکم دیا کہ فنس میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے جاپ کرے۔

وہ سادی غریب کیا جانے

اس مزدور کو کیونکر پہچانے

وہ تو اُدھر جاپ میں مصروف ہوئی۔ اِدھر اس مکار نابکار نے کونڈی میں بھنگ رگڑی، اور اس میں تھوڑا دھتورہ ملا دیا۔ اور ایک کورے سکورے میں بھر کر فنس کے پاس جاکر کہا۔ مائی یہ پیالہ پی لے۔ اس عروس زیبا شمائل نے پوچھا اس میں کیا ہے۔ بابا جی نے کہا یہ شیبو کی بوٹی ہے مائی۔ جو پیئے وہ تینوں لوک کی سیر کرنے لگے۔ عورت تو باباجی کے کمال کی قائل تھی ہی، فوراً سکورا لیا اور پی گئی پیتے ہی نشے نے وہ زور باندھا کہ الاماں اور نشے کے ساتھ ہی دھتورے نے رہے سہے حواس اور بھی غائب کر دیئے۔ بے ہوش ہو کر فنس میں گر پڑی، ادھر باباجی نے زیور کو کپڑے میں باندھ کر اوپر سے صندلی رنگا ہوا دوپٹا اوڑھا۔ فنس کے کہاروں کو پہلے ہی رخصت کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ جھانک کر دیکھا تو عورت کو فنس میں بے ہوش دیکھ کر کہا۔ مائی جی اب شام تک یہاں پرمیشور کی یاد میں رہو۔ یہ کہہ کر باباجی نے گردن فنس کے اندر ڈالی۔ اور آزاد اور جنٹلمین قیاس سے تاڑ گئے کہ بوسہ بازی کا شوق چرایا ہے جیسے اس مزور روسیاہ نے فنس بند کر کے جنگل کی طرف جانا چاہا۔ آزاد ایک طرف سے جھپٹے اور جنٹلمین نے دوسری جانب سے گھیر لیا اور باباجی گرفتار ہو گئے۔

باباجی: بچہ سنت سادھوؤں کے دکھ دینے سے کیا ملے گا۔

آزاد: اب تو ہم نے آپ سے باکمال فقیر کے قدم لئے۔

جنٹلمین: اب تینوں لوکوں کی سیر دیکھیے گا۔

بابا: بچہ میرے سے تمہارے کو کیا واسطہ ہے۔

آزاد: ہم کو کچھ سکھایئے۔ آپ تو ایک ایک کے دو کرتے ہیں۔ اِس زیور میں کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے۔

جنٹلمین: اب بیٹھئے یہاں پر ورنہ ہم دو تم اکیلے۔

آزاد: بے ایمان اس کامنی نازک بدن کو نیم جان چھوڑ کر حضور بھاگے کہاں جاتے تھے۔ جی۔

جنٹلمین: رکھ زیور، اُتار چادر اور بیٹھ سامنے۔

بابا: بچہ دیکھو اب سنت کے منہ سے کچھ بُری دعا نکلے گی بابا رمتے جوگی ہر کا بھجن کیا۔ موج آئی جہاں گئے۔ موج آئی جہاں رہے، اور تم دونوں ڈاکو ہمارے کو روکتے ہو۔

آزاد: اب خیریت اسی میں ہے کہ زیور رکھ دو۔

جنٹلمین: حضرت آپ تو ان کی خبر لیجیے اور میں اُس بیچاری کو دیکھتا ہوں، جو بے بسی کی حالت میں بیہوش پڑی ہے۔

آزاد نے اُس مکار بدوضع کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو منہ کے بل گرا اور برا بھلا کہنے لگا۔ زیور اُن سے چھینا گیا اور زانو بزانو بٹھایا۔

اِدھر جنٹلمین نے فنس کھولی، اور کوٹ کے دامن سے پنکھا جھلا۔ سامنے کے چشمہ سار سے اُس درویش کے لوٹے میں پانی لائے اور زنِ نسرین دہن کے منہ پر خوب چھینٹے دیے اور پھر دامن سے پنکھا جھلا۔ اتنے میں ایک آدمی بڑا سا لٹھ لیے ہوئے نمودار ہوا۔

آزاد : تم کون ہو۔ او جوان۔ کون ہو تم۔

جوان : گاؤں کا چوکیدار ہوں صاحب یہ کیا ہے۔

آزاد : یہی چوکیداری کرتے ہو۔ یہاں واردات ہو گئی تم کو خبر ہی نہیں دیکھو۔ وہ عورت پالکی میں بیہوش پڑی ہے۔

چوکیدار : آہا۔ ارے وہی بابا جی ہیں ایک بار اور یہاں واردات ہوئی۔ کوئی سادھو کسی عورت کو یہاں لے آئے، اور کہا کہ چاندی کا گہنا سب سونے کا گہنا بنا دوں گا۔ بس یہاں لا کے کیا جانے کیا پلا دیا اور لے دے کے چل دیا۔

بابا : وہ کوئی سادھو نہ ہوگا بابا۔ کوئی چانڈال ہوگا۔

آزاد : اِس برتن میں کل زیور رکھ کر عورت کو فنس میں لٹا دیا اور کہا مالا جپتی جا۔ اور بھنگ میں دھتورہ ملا کے پلا دیا وہ بیہوش ہو گئی۔

چوکیدار : بس گئے چودہ برس کے لئے۔ ہم جا کے تھانے پر رپٹ بولتے ہیں، کہ بابا جی پکڑے گئے ہیں۔

چوکیدار نے اپنے ایک بھائی کو آزاد کے قریب بٹھایا اور کہا کہ بابا جی کی خبرداری رکھنا۔ اور خود تھانے کی راہ لی۔ ادھر متواتر چھینٹے دینے اور پنکھا جھلنے سے عورت کو کسی قدر ہوش آیا۔ مگر ایک دم کے لئے ہوش آیا اور پھر غوطہ کھایا۔

جنٹلمین : اب طبیعت کیسی ہے (آہستہ سے شانہ ہلا کر) اب کیسی ہیں آپ کچھ کچھ فرق ہے نہ۔

عورت : (آنکھیں بند مگر گردن کے اشارے سے) ہاں۔

آزاد : ایک کام کرو فنس اسی درخت کے سائے میں لا کے رکھو۔ یہ سایہ دار ہے ذرا ٹھنڈک رہے گی۔

بابا جی کی گردن پکڑی اور کہا فنس اُٹھاؤ۔ ایک طرف آگے بابا جی پیچھے، آزاد دوسری طرف جنٹلمین اور چوکیدار سائے میں فنس آئی۔ تو آزاد نے اُس محبوبِ صبیح کے رُخِ رعنا سے زُلفِ چلیپا ہٹائی۔ اور کہا منہ پر خوب زور سے پنکھا جھلو۔ اس سے اس قدر ہوش آیا کہ ایک دفعہ آنکھیں کھول دیں اور اشارے سے بتایا کہ بڑی گرمی معلوم

معلوم ہوتی ہے۔

جنٹلمین: (آہستہ سے) ابھی بالکل کم سن ہے واللہ۔

آزاد: کوئی شانزدہ سالہ ہوگی یا کچھ کم و بیش:

خدا ترا بت نادان دراز سن تو کرے
ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

جنٹلمین: حضرت یہ عروس دلربا اس قابل ہے کہ تربیت پائے۔ اور کسی ذی لیاقت اور فہمیدہ کی پیاری بیوی ہو۔

آزاد: شادی تو اُس کی ہوگی کیوں شاہ جی۔

بابا: ہم تو نہیں جانتے بچہ۔ سادھو کو کیا کام۔

جنٹلمین: اگر شادی نہ ہوئی ہوگی تو ہم شادی کریں گے اگر ہاتھ نہ آئی تو برسوں نہیں تو مہینوں تک ضرور دل بے چین رہے گا۔ خدا میری دعا کو اثر دے، مگر اپنی دعا ہمیشہ بے اثر ہی پائی:

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

تپ دل نے سینے کو گلخن بنا دیا:

شعلہ ہائے تپ دل آگ لگاتے کیوں ہو
گر ہو دل سوز مرے مجکو جلاتے کیوں ہو

اتنے میں اُس سرمایۂ نازنینی غیرتِ لُعبتان چینی نے آنکھ کھول دی اس جادو بھری نگاہ سے آزاد اور جنٹلمین کو دیکھا کہ دونوں کا دل ہاتھ سے جاتا رہا:

کیا کہوں پرسش نگاہ کرم
چشم سے غمزہ داد خواہ ستم

عروس: (متحیر ہو کر) مجھے یہاں کون لایا۔

آزاد: یاد کیجئے۔ کچھ یاد ہے۔ یہ کون مقام ہے۔

عروس: (اِدھر اُدھر نظر کر کے) یہ تو کوئی بن ہے۔

آزاد: یہاں آپ کس کے ساتھ آئی تھیں۔ یاد ہے؟

عروس: ہم تو کسی کے ساتھ نہیں آئے تھے ہم کیوں آنے لگے ایسے بنوں میں ہم بہو بیٹیوں کو ان جنگلوں سے کیا واسطہ ہے۔

آزاد: کسی باباجی کے ساتھ آئی تھیں سوچ لیجئے۔

عروس: (چونک کر) ہاں ہاں ہمیں کچھ پلا کے بیہوش کر دیا۔

آزاد: مجھ کو سب معلوم ہے۔ اب مزاج کیسا ہے۔

عروس: طاقت نہیں ہے اور گرمی بہت لگتی ہے۔

آزاد: آپ کی یہ کیفیت دیکھ کر یہاں سب کو تردد تھا۔

اس نازنین مہ جبین کی گوہر افشانی اور سحر بیانی نے ان دونوں کو اور بھی نخچیر تیر الفت بنایا۔:

حرف منہ سے جو اس کے نکلے پڑیں — ایک غنچے سے لاکھ پھول جھڑیں
دیکھ اس لب کی گوہر افشانی — ہو گیا آب ابر نیسانی
حال پوچھا جو ناتوانی کا — بڑھ گیا زور سخت جانی کا
لب جاں بخش چارہ جو کیا کیا — الفت آلودہ گفتگو کیا کیا
پوچھنا اب مزاج کیسا ہے — غش یہ پھر تم کو آج کیسا ہے
دیکھو کس کس کا ہے برا احوال — یہ بنایا ہے تم نے کیا احوال

شادی دل وہ ہم کناری کی
ہائے باتیں وہ دوست داری کی

یہ اشعار آزاد اور جنٹلمین اور اس ماہرو کے حسب حال تھے۔ آزاد کا مزاج دریافت کرنا۔ جنٹلمین کا دم عشق بھرنا' اور اس کافر عابد فریب کی جادو بیانی و جادو طرازی ستم ڈھاتی تھی۔

آزاد: پانی پیجئے گا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی منگواؤں؟

عروس: پیتی تو۔ مگر دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ جب اس سادھو نے بے ایمانی کی' تو اب کس کا بھروسا کروں۔ تم کسی ہندو کے ہاتھ پانی منگواؤ' اور اپنے سامنے پلاؤ تو پی لوں۔ اس وقت بڑی پیاس لگی ہے۔

آزاد: اجی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اور تمہاری خدمت کے لیے تو خوبان فرخار و خلیج حاضر ہو جائیں۔

شمع پہ کچھ نہیں موقوف کہ سارے ظالم
پانی آگے ترے اے عربدہ جو بھرتے ہیں

عروس: اس کمبخت کو کیا کہوں جو مجھے مردہ کر کے چھوڑ کر چل دیا۔

آزاد: چل کہاں دیا۔ یہ سامنے بیٹھا ہے۔ ہم نے گرفتار کر لیا اب کہیں جانے بھی پائے گا۔

عروس : تھو ہے اس کی فقیری پر میں اس کی صورت نہیں دیکھنی چاہتی۔ اخوہ۔ اتنا بڑا بے ایمان۔
بابا : مائی جی۔ سنتوں سادھوؤں کو بُرا کہنا اچھا نہیں کیا جانے کس روپ میں کون ہے۔ اور چاہ تو مائی پہلے تیرے ہی طرف سے ہوئی تھی۔ اب تم پریت نہیں کرو گی سو ہی اچھا۔ کسی نے کہا ہے بابا آزاد کی طرف مخاطب ہو کر):

چلو اب چین سے آرام کرو جان بچی — اب کسی اور سے پیغام کرو جان بچی
اور پیدا کوئی گلفام کرو جان بچی — اُسی کے عشق میں اب نام کرو جان بچی

تم کرو مجھ سے گریز اور میں کروں تم سے نباہ
اجی لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا باللہ

آزاد : اخاہ۔ باباجی تو بڑے عاشق تن بگڑے دل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہیے پورے مکار پکے مزور۔ شعر شاعری میں برق ہیں۔ اور خیر سے اشعار بھی واسوخت کے یاد ہیں۔
عروس : اب مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں کون ہو؟
آزاد : ہم سب بتادیں گے۔ اب آپ فکر کم کیجئے۔
عروس : ہمارے میاں سنیں گے تو کیا کہیں گے۔

پولیس والوں کو خبر ہوئی تو مُعادوڑ پڑے باباجی کو آن کر دیکھا گرفتار کیا۔ آزاد اور خطلین۔ دونوں چوکیدار باباجی اور پولیس والے روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں تھانہ دار نے کہا۔ یہ باباجی اشتہاری مجرم ہیں۔ پارسال بھی اسی مقام پر ایک جوان عورت کو بیہوش کر کے اُس کا زیور لے گیا تھا۔ اور ہاندے میں ایک شخص کے ہاں ٹکے اس کو اپنا چیلا بنایا۔ سات روز تک اس کے ہاں رہے۔ آٹھویں روز شب کو مال و اسباب لے کر چل دیئے، تو اب تک آتے ہی ہیں۔ مگر وہ بھیڑیا دھسان خلقت ہے کہ الامان الامان۔ ایک دفعہ ان کا حلیہ لکھ آیا تھا۔ دوسری مرتبہ پھر اشتہار چھپا۔ تیسری دفعہ پھر خبر آئی، کہ ایک فقیر نے جس کی یہ شکل یہ صورت یہ قدوقامت ہے۔ فلاں مقام پر ایک بوڑھے کے ہاں آگ لگادی اور اس کی جورو کو کہ از بس جمیلہ اور خوبرو ہے مع زیور کے بھگالے گیا۔ اور کئی ہزار کے تمسک بھی اڑا دیئے، یہ بوڑھا مہاجنی کرتا تھا۔ اب آج پکڑے گئے۔

آزاد : لیکن ضعیفُ الاِعتِقاد آدمیوں کو ان حضرت کی طرف سے عقیدہ کم نہ ہو گا وہ ان کو خدا رسیدہ اور عارف باللہ ہی سمجھیں گے سچ ہے۔

شعابدسے مکائدسے بلاے

تھانہ دار: کانپور سے دو کوس پر پوروہ ہے۔ عین لبِ دریا۔ ایک فقیر کھپریل ڈالے ہے۔ اِردگرد پیپل اور برگد کے درخت ہیں۔ اُس دلچسپ مقام پر ایک مرتبہ مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک چوری کی تحقیقات کے لئے گیا تھا میں نے زمیندار سے کہا کہ اگر بندوبست کر دو تو میں آج یہیں قیام کروں، اُس نے ایک چھولداری نصب کرادی تو میں نے بڑے بڑے تماشے دیکھے۔ وہ فقیر بڑا ڈیڈیل جوان ہے۔ سُرخ و سفید۔ بابا کا پریشر داس نام ہے۔ پڑھا لکھا خاک نہیں گورکھی البتہ کچھ کچھ جانتا ہے، وہ بھی برائے نام، مگر دور دور تک لوگ اس کے کمال کے قائل ہیں۔ پہلے ایک لالہ صاحب آئے۔ ٹٹو سے اُتر کر فقیر کے قدموں پر گر پڑے، دو روپے نذر کے دکھائے اور کچھ کھوپرا پان قند مصری کے کوزے نذر کیے۔

فقیر: میں نے اپنے آدمی سے آج صبح کو کہہ دیا تھا کہ لالہ آتے ہیں سو آپ سچ مچ آ ہی گئے۔

لالہ: بلہاری۔ مہراج چکرورتی راج کر رہے ہو۔

فقیر: فقیر کا بڑا گھر ہے۔ ایک چکلہ دار نے ہم سے زبان ملائی تھی تو ہم نے فارسی اور عربی اور انگریزی اور پنجابی اور ہندوستانی اور بنگلے میں اُس کو جواب دیا۔ اس نے کہا تم کیا پاکھنڈ کر کے یہاں بیٹھے ہے۔ ہم نے کہا بابا آج کے تیسرے روز یا کھنڈ نہ رہے گا۔ سو بابا اس کی کرمی تیسرے روز اس پر زمیندار نے چڑھائی کی اور قید کر لیا۔

لالہ: ہاں مہراج۔ فقیر ہیں نہیں تو پرتھوی کیونکر تھمی ہے۔ فارسی والا لکھتا ہے کہ:-

روئے مقصود کہ شاہان بدعا طلبیدند
سببش بندگی حضرت درویشان ست

ہم تو ان کی باتوں ہی سے سمجھ گئے تھے، کہ لالہ فارسی واجبی ہی واجبی جانتے ہیں۔ خیر۔ شام کو سُنا کہ لالہ صاحب اپنے کسی دشمن کے قتل کی فکر میں ہیں۔ باباجی سے تین سو روپے کا اقرار ہوا ہے۔ کہ اگر دو مہینے میں منتر کے زور سے اس کو نہ مار ڈالوں تو فقیری چھوڑ دوں۔ لالہ صاحب شام کو روانہ ہوئے تو دو عورتیں آئیں ایک جوان کوئی پندرہ سولہ برس کا سن دوسری بوڑھی۔ ان دونوں نے باباجی کا بڑا شکریہ ادا کیا۔ وجہ یہ کہ اُس بوڑھی عورت کا لڑکا بعارضہ تپ و سرسام سخت علیل ہو گیا تھا۔ بوڑھیا اَن پڑھ جاہل، ان کے پاس دوڑی آئی اور رو دی ہاتھ جوڑے۔ فقیر نے حسب معمول جاپ کی راکھ دے دی۔ اور کہا کچھ کھلا دینا کچھ اِدھر اُدھر لگا دینا۔ عورت نے آتے ہی راکھ چٹائی۔ بیدراج معالج تھے۔ صبح کو لڑکے نے آنکھ کھولی تپ کم ہوئی۔ عورت نے بید کی محنت اور علاج کا تو مطلق خیال نہ کیا مگر یہ بات دل میں جم گئی کہ باباجی کی چٹکی اور دعا سے لڑکا اچھا ہوا۔ فقیر نے بوڑھی کی خوب صورت لڑکی کے گورے گورے رخساروں پر محبت پدری سے ہاتھ پھیرا۔ اور کہا لڑکی تو مجھے مثل اپنے باپ چچا

کے سمجھانا یہ دونوں گئیں تو، اور عورتوں کا ایک غول آیا۔ اُن میں کئی عورتیں تھیں۔ مگر باباجی کی نظر ایک عروس عنبریں زلف زریں قبا آفتاب جلوہ ہی پر پڑتی تھی۔ اور یہ موسرشت باباجی کی نظارہ بازی، اور آنکھوں کے اشاروں اور توجہ خاص سے جھینپی۔ باکرہ تھی کہ ہجوبیاں بنائیں گی اور طعنے دیں گی کہ اتنے بڑے پاکدامن باباجی زاہد و عابد تجھ پر ریجھ ہی گئے۔ یہ پری زاد معشوقہ واقعی کان حسن و جمال تھی۔

دو لعلش از تبسم در شکر ریز — دہانش در تکلم شکر آمیز

بخندہ از ثریا نور می ریخت — نمک زپستہ پر شور می ریخت

کشیدہ قامتے چوں تازہ شمشاد

بہ آزادی تلامش سرو آزاد

ناصیۂ انور سے فروغ کوکبِ جمال نمایاں تھا۔ اور جبین مبین سے نورِ شمس کمال عیاں۔ باباجی نے لاکھ ضبط کیا مگر نہ رہا گیا کہا مائی تو کس کی کنیا ہے۔ اور تیرا بیاہ ہوا ہے کہ نہیں، تو مہارانی ہوگی۔ ہاتھ دیکھوں۔ اس مہر سیر رعنائی نے لجاتے ہوئے دست نازک بڑھایا۔ باباجی نے ہاتھ میں ہاتھ لیا۔ اور کہا بیٹی تو بہت اچھے گھر جائے گی، اور بڑی عمر ہے۔ تو راج کرے گی۔ میں یہ سب سیر دیکھ رہا تھا۔ ایک شوخ و بے تکلف اُس غول میں سے بول اُٹھی، باباجی تمہاری نظر پڑی تو اسی پر پڑی۔ ہم اتنی بیٹھی ہیں ایک سے بھی مخاطب نہ ہوئے اتنا کہنا تھا کہ باباجی بہت خفا ہوئے، اور جلال میں آکر ہزاروں بے تکی باتیں کہیں۔

الغرض وہ ناظورۂ مشتری خصال اُس سیاہ قلب مزور کے دام تزویر سے محفوظ رہی۔

جنٹلمین نے اس ضلع میں ایک روز وہاں کے علما و کلا اور لائق و فائق آدمیوں کے روبرو لکچر دیا جس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔

اے اہلِ ہند اب تو اٹھو خوب سو چکے — پیدا کیا تھا تم نے جو کچھ سب تو کھو چکے

اب کیا رہا ہے جس پہ تغافل یہاں تلک — دنیا میں نیم وحشی و جاہل تو ہو چکے

حضرات سامعین! بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ملک کا ادبار ہمارے قول و فعل، حرکات و سکنات چال ڈھال اور ہر قسم کی ترقی ملکی و قومی و علمی میں سد باب ہے اگر مشعل آفتاب لے کر بھی ڈھونڈھیے تو ساری خدائی میں ایسی ضعیف الاعتقاد قوم نہ پایئے گا جیسی ہندوستان میں بستی ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس سے بری نہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔

۱۔ عورتوں کا جہل۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے وطن مالوف کی نسواں پڑھی لکھی نہیں ہوتیں۔ اُن کی جہالت ہماری ترقی کے ساتھ وہ کرتی ہے جو سانپ کا زہر انسان کی جان کے ساتھ کرتا ہے۔ گنواروں کی

عورتیں تو خیر یہ کہہ کر بری ہو جائیں گی، کہ ہمارے میاں، باپ، بھائی گاؤں کے مرد خود ہی ان پڑھ ہوتے ہیں۔ تابہ نسوان چہ رسید۔ مگر جو اصحاب تربیت یافتگی اور لیاقت کا دم بھرتے ہیں، وہ اس جرم سے ہرگز ہرگز بری نہیں ہو سکتے۔ اپنی مخدرات کو علم کی نعمت سے محروم رکھتے ہیں۔ لڑکا ابتدا ابتدا میں عورتوں ہی سے پرورش اور تربیت پاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر ماں تربیت یافتہ ہو تو لڑکا بھی بچپن ہی کی حالت سے اپنی لائق اور پڑھی لکھی ماں کی تربیت یافتگی سے فیض پائے گا۔ اگر اوائل میں لڑکا کسی گنوارن کے سپرد ہو تو بجز اس کے کہ گنواری بولنے میں طاق ہو جائے اور کچھ نہ سیکھے گا۔ ادب تمیز سلیقہ وہی عورتیں سکھا سکتی ہیں جو خود سلیقہ شعار، اور باادب ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ذی لیاقت اور تربیت یافتہ میاں اور غیر تربیت یافتہ جاہل بیوی میں محبت کیونکر ہوتی ہے۔

جنٹلمین کے اس فقرے پر حاضرین میں سے ایک جاہلِ مطلق نے کہا (آپ اپنی جورو کو پڑھائیے، مگر اوروں کو نہ ہدایت دیجئے، اسپر ایک شخص اُس جاہل کی طرف مخاطب ہو کر بولا (بیٹھئے بیٹھئے لکچر سننے دیجئے) اور جنٹلمین نے یوں کہنا شروع کیا۔

حضرات سامعین۔ اثنائے لکچر میں ایک بزرگ نے جھلا کر ارشاد فرمایا کہ آپ اپنی جورو کو پڑھائیے، مگر اوروں کو گمراہ نہ کیجئے۔ اس کے جواب میں میں دست بستہ عرض کرتا ہوں، کہ میں نے ایسا کیا ہے۔ اور تربیت یافتہ بیوی میرے نزدیک میاں کے آرام و آسائشِ مزید کا باعث ہوتی ہے۔ علم شے بہ از جہل شے۔ اگر میاں بیوی دونوں پڑھے لکھے ہوں تو محبت باہمی کو ترقی حاصل ہو، مگر اس ملک میں شیطان نے یہ پٹی پڑھا دی ہے، کہ ادھر عورت پڑھ لکھ سکی، اور اُدھر اُس نے نامحرموں کے نام عشقیہ خطوط لکھنے شروع کئے۔ حیف صد حیف کہ اس خیالِ خام و پوچ کا ڈر ہوا ہے جس کی ذرا بھی اصلیت نہیں ہے۔ ہم لوگوں کے دلوں میں ایسی جگہ کر لی ہے کہ اَلاماں۔ اَلاماں۔ یہ کہنا کہ عورتیں بعد تحصیلِ علم یا زبان اس قدر دیدہ دلیر و بے حیا، ہو جائیں کہ غیر مردوں کے نام عشقیہ مراسلت جاری کر دیں گی۔ علم و فضل پر حرف رکھنا، اور روز روشن کو شب دیجور کہنا ہے۔ نیک اندر بد و بد اندر نیک، ایک مشہور مسئلہ ہے۔ ممکن ہے کہ تربیت یافتہ عورتوں میں بھی کسی کی طبیعت بوجوہ چند در چند مائل بہ بدی ہو۔ کیونکہ کوئی فرد بشر جس کو عقلِ سلیم سے بہرہ دانی ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ حرف شناس ہونے یا پڑھنے لکھنے سے انسان ہر حالت میں بالکل نیک دل ہی ہو جاتا ہے، مگر یہ کلیہ قائم کرنا کہ تربیت و تعلیم عورتوں کی طبیعتوں کو بد کر دے گی۔ محض غلط اور بے سر و پا کہانی ہے۔ یہ ہمارا ہی قصور ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو تربیت و تعلیم کی نعمت عظمیٰ سے بے نصیب رکھتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ قبیح یہ مستخرج ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی پرورش اُن کو عوارض سے محفوظ رکھنے، عمدہ عمدہ باتیں سکھانے کے قابل نہیں ہوتیں۔ ان پڑھ

عورتوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ ہمیں وقتِ ضرورت اہم اُمور میں مشورہ دینے کے لائق ہوں گی انتہائی حماقت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ میاں جن کی بیویاں دنیوی امور میں مشورہ، معقول دینے کی لیاقت رکھتی ہیں، بڑے خوش نصیب لوگ ہیں۔

راوی : اس پر ایک صاحب نے کہا (ایسے ہی ایسے خیر خواہ ہندوستان میں دو چار اور ہوں تو ملک کا ستیاناس ہو جائے)

جنٹلمین : افسوس صد افسوس۔ آپ ہی سے بزرگواروں کے خوابِ غفلت سے چونکانے کے لیے ان لکچروں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

سامع : بیشک۔ آپ کی رائے قابلِ صاد و داد ہے۔

دوسرا : واقعی ہمارے اُدْبَار کا بہت بڑا باعث یہی ہے کہ اس ملک کی عورتیں غیر تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔

تیسرا : مسلمانوں کی پُرانی کتابوں سے ثابت ہے کہ پڑھی لکھی خاتون کی سَلَفْ میں بڑی قدر و منزلت تھی۔

چوتھا : ہنود کے ہاں بھی اکثر رسیدہ اور نیوں کی مخدرات تربیت یافتہ ہوتی تھیں، چنانچہ لیلاؔ وتی اور رُکمنی بائی مشہور رہیں۔

جنٹلمین : مگر زمانے اور ادبار نے ہمیں یہ گمراہ کیا کہ عورتوں کی تربیت یافتگی کو ہم معیوب سمجھنے لگے! گو سرکار کوششِ موفور کر رہی ہے تاہم ہم لوگ ذرا توجہ نہیں کرتے۔ اس سے زیادہ ادبار اور کیا ہوگا مگر:

غم مخور حافظ بہ سختی روز و شب
عاقبت روزی بیابی کام را

انشاء اللہ ایک روز فائز المرام ہوں گے۔

حاضرین : انشاء اللہ جوئندہ یابندہ۔

ہر چیز کہ دل بداں گر آید
گر حسد کنی بدست آید

جنٹلمین : ہم اُس روز جامے میں پھولے نہ سمائیں جب ہم سنیں کہ مسلمان شریف زادیاں اخلاق کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں، اور وقت کا ایک حصہ اسی میں صرف کرتی ہیں یا ہندوؤں کی نوجوان عورتیں اخلاق کے عمدہ عمدہ رسالوں سے اپنے دلوں کو نور بخشتی ہیں۔ مگر ہنوز دلی دور است۔ عورتوں کو چاہے ناقص العقل کہو چاہے موردِ طعن بتاؤ۔ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ سب مردوں ہی کا قصور ہے۔ اگر مخدرات ہندوستان تربیت یافتہ ہوں، تو ضعیف الاعتقادی نصف

۲۔ دوسرا سبب خاص ترقی ضعیفُ الاعتقادی ہندوستان کا یہ ہے کہ بچوں کو لڑکپن ہی سے وہ باتیں سکھائی جاتی ہیں. جن سے بڑھ کر بھی فضول خوف ان کے دلوں میں جاگزیں رہتا ہے۔ لڑکا ذرا رویا اور اس کی ماں نے کہا وہ آیا ارے چپ چپ پکڑ لے جائے گا۔ کبھی اندھیرے سے ڈراتی ہیں کبھی طرح طرح کی بولیاں بولتی ہیں۔ اور دل میں خوش ہوتی ہیں کہ بچہ سہم کے خاموش ہو رہا۔ مگر یہ نہیں سمجھتیں کہ یہ اس کے حق میں سُم کی خاصیت رکھتا ہے۔

۳۔ سبب ضعیف الاعتقادی کی ترقی کا یہ ہے کہ جو جس نے گپ اڑائی اُس کو آمنا و صدقنا تسلیم کر لیا۔ فقرہ باز لوگ غضب کے ہوتے ہیں۔ ایک روز اپنے ایک دوست کے مکان پر میں نے دو چار صاحبوں کی زبانی اس طرح کی باتیں سُنیں کہ دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ ایک پنڈت بھڈری۔ دوسرا گاؤں کا ٹھاکر زمین دار۔ تیسرا اہیر۔ چوتھا ڈفالی۔

زمیندار: مہراج بھلا ہاتھ دیکھنے سے عمر کا حال بتا سکتے ہو۔

بھڈری: کاہے ناہیں ہاتھ کی لکیروں میں سب لکھا ہے۔

ڈفالی: (اپنا ہاتھ بڑھا کر) بھلا بتاؤ تو۔

بھڈری: (ہاتھ دیکھ کر) ستر برس بعد موت ہے۔

ڈفالی: میرا چھیالیسواں سال ہے تو کے برس اور ہیں۔

زمیندار: یہ نہ بتائیں گے اتنا بتا دیا کہ ستر برس کے سن تک تمہاری موت نہیں ہے۔ ابھی چوبیس برس تک بے جوکھم ہے۔ پھر چاہے سترھویں میں مرو چاہے بستر کے ہو کے۔ چاہے اسی برس کے ہو کے۔

اہیر: ہمراہ بیاہ کب تک ہوئیے مہراج؟

بھڈری: (ہاتھ دیکھ کر) دوئی مہینے کے لگ بھگ۔

رادی: اتفاق سے اس کی شادی کو سوا مہینہ باقی تھا، بس یقین کامل ہو گیا کہ یہ بھڈری بڑا کمال ہے۔ اب تو زمیندار صاحب اور بھی خاطر کرنے لگے۔

زمیندار: ڈپٹی صاحب کے ہاں ہمارا ایک مقدمہ ہے، پرشن تو دیکھو مہراج کہ جان ہے یا نہیں، جو جیت جائیں تو کچھ کھلائیں۔

بھڈری: کوئی پھول مَن میں لیو، اور رنگ بتائے دو۔

زمیندار: ہاں۔ اچھا ایک پھول لیا ہم نے۔

بھڈری: (بُدھا نہ کرنا۔ بس ایک ہی بار لو۔

زمیندار: ہاں۔ ہاں لیا۔ سفید رنگ کا پھول لیا۔
بھڈری: (پوتھی کھول کے اور بڑبڑ کرکے) اچھا ہے۔
زمیندار: (خوش ہوکر) جیت جائیں گے بھلا؟
بھڈری: بیج کھیت۔ اُس جیتو کہ سینگ کھڑی رہے۔
زمیندار: بس اب ہم کو یقین ہوگیا۔ مگر پرسوں ڈپٹی صاحب بہت خفا ہوئے تھے۔ کہ تم اسکول میں دو کتابیں پڑھ کر ہم کو دھمکاتا ہے۔ اور قانون سکھاتا ہے۔
بھڈری: کل ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ کہ دودھ پاس نہ آئے۔
اہیر: مہاراج برکھا ناہیں ہوت ہے۔ ہے کچھ اُپاؤ؟
بھڈری: دس دن آسن مار کے بیٹھ جاؤں تو جل تھل ہو جائے۔
اہیر: واہ مہراج سب کا جلاہے لیو۔
بھڈری: ٹھاکر کہیں تو یہی سامنے والے مندر میں بیٹھوں۔
زمین دار: بیٹھئے۔ بنیے سے کہہ دیں گے سیدھا دے جایا کرے گا اور ایک آدمی خدمت کو رہے گا جو بارش ہو تو جی اٹھوں۔
بھڈری: ایک سماں میں جل کا نام کہیں نہیں اور پرانی سب بیاکل ہیں۔ اجمیر میں تھا۔ بس جب دیکھا کہ مینھ کا کہیں پتا نہیں اور اکال کے لچھن ہیں، تو ایک مہاجن نے ہم سے کہا کہ مہراج کچھ بجوگ کرو۔ سو ہم بس بستر بچھائے کے مرگ چھالا، اور مالا کی جاپ کرنے لگے،' اور دھوپ کہے کہ میں پرتھوی بھر کو پھونک دوں گی۔ اور ہم جو پیڑ کے چھائے میں بیٹھے تو اُٹھنا نہیں جانتے۔ لوگوں نے کہا مہراج جل کے تر واہے میں جاپ کرو۔ ہم نے کہا اب چھیڑو مت دو دن اور ایک رات جاپ کیا۔ پھر ایسی برکھا ہوئی کہ سو کوس تک جل تھل تالاب ندی سب بھر گیا اور دریاؤ ایسا چڑھا کہ چوگنا پاٹ ہوگیا۔
اہیر: تو تو آج ہی سے لگا لگا دیوؤ۔
زمیندار: آپ آج ہی سے فکر کیجئے۔ اگر کہیں پانی برس جائے تو پھر کیا کہنا ہے۔
بھڈری: دیکھ لینا مہراج آج بیٹھا دو دن پتوں اور مینھ برسنے لگے یہ کون بات ہے۔

قصہ مختصر بھڈری نے سب ہیں مشہور کر دیا کہ مینھ برسانے کی غرض سے بیٹھے ہیں۔ اب پنج کوسی لوگ چلے آتے ہیں، اور مہراج پج رہے ہیں۔ رات کو یہ شخص دس بجے سے صبح تک مزے سے دندناتا تھا۔ اور صبح کو کہتا تھا کہ رات دن پلک نہیں جھپکاتا۔ اور جُہلا اس کو باور کرتے تھے۔ اتفاق سے چوتھے روز ذرا بارش ہوئی،

برسات کے دن تو تھے ہی۔ مینھ کا برسنا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اور بھی عقیدہ جم گیا۔ اور تب سے بھڈری جس طرف نکل جاتا تھا لوگ بڑی تعظیم سے پیش آتے تھے۔

جنٹلمین اس قدر کہہ چکے تھے کہ پُرانے فشن کے ایک بزرگوار جو یہ خیالات سُن کر جھلا رہے تھے بگڑ اُٹھے، اور استادہ ہو کر باوازِ بلند کہا۔ اگر ان سب باتوں کا ثبوت نہ دوں تو آج سے پنڈت نہ کہیئے نام بدل ڈالو۔

جنٹلمین : کیا آپ اس کا ثبوت دے سکتے ہیں کہ فلاں شخص نے مینھ برسا دیا۔

پنڈت : فلاں شخص نہیں۔ ہم خود برسا سکتے ہیں۔

جنٹلمین : آپ فارسی خوان بھی ہیں۔

پنڈت : جی ہاں۔ میں پٹواری ہوں۔ شاہی میں توپ خانے میں نوکر تھا۔

جنٹلمین : اگر ان کل اُمور کا ثبوت آپ دیں تو ہم پر بڑا احسان ہوگا۔

پنڈت : سنو صاحب تم لوگ اچھے بُرے، نیکی بدی شیطان دیوتا ایک کے بھی قائل نہیں، اور ہم حوالہ دیا چاہیں کتبِ قدیم کا، ہمارے ہاں لکھا ہے کہ کسی زمانے میں دو دو ہزار برس کی عمر ہوتی تھی، اور اب پاپ کے سبب اس قدر تنزلی ہوئی کہ اوسط زندگی تیس چالیس بھی نہیں۔ پھر پاپی اب زیادہ ہیں یا پہلے تھے۔

ہزار و صد و سیزدہ سالہ گرد

زمانہ ندیدش زمانہ بخورد

یہ رُستم کی ماں نے کہا تھا ایک ہزار ایک سو تیرہ برس کا ہو کر مرا اور اس کے نزدیک ابھی تک بچہ ہی تھا۔ تو جس زمانے میں پاپ زیادہ ہو اُس زمانے میں اگر ہم پُرانی باتیں کہیں تو کون مانتا ہے۔

جنٹلمین : آپ کی تقریر کا نتیجہ و ماحصل ہی نہیں معلوم ہوتا۔

پنڈت : ہم اگر سچے ہیں تو جلتا بلتا توا ہاتھ پر رکھ دو، ہمارے ہاتھ کو ذرا جوکھم نہ پہنچے گی۔ یہ فقط منتر کا زور ہے۔

جنٹلمین : حضرات سامعین میں نہیں چاہتا کہ کسی صاحب سے خاص اس مقام پر بحث ہونے لگے۔ ہاں اگر ان صاحب کو دعویٰ ہے تو کسی روز لکچر دیں، اور لوگوں کو جمع کر کے سب کے سامنے مینھ برسائیں۔

ایک : آپ اپنا لکچر ختم کیجئے ان سے کیا مطلب۔

دوسرا : اور یہ امر داب مناظرہ کے بھی خلاف ہے۔

جنٹلمین نے سلسلۂ سخن یوں جاری کیا۔

سخن درست بگویم نمی توانم دید

کہ میخورند حریفان و من نظارہ کنم

جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ اور قومیں ہم سے گویا سُبقت لیے جاتی ہیں، اور ہم روز بروز پست خیالات کے سبب سے تحت الثریٰ کو پہنچے جاتے ہیں، ایک خاص باعث اس ادبار کا یہ بھی ہے۔ کہ شگون اور بدشگونی، فالِ بد اور فالِ نیک کے ہم لوگ تہِ دل سے قائل ہیں۔ ہنود میں ساعت دیکھے بغیر کوئی باہر قدم نہیں رکھتا۔ ایک مرتبہ ہمارے دوست کے پاس صاحب مہتمم بندوبست کا ڈاکٹ آیا کہ عرضی تمہاری مورخہ فلاں تاریخ نظر سے گذری تم کو قلمی ہوتا ہے کہ یکم تک حاضر ہو تو پچھتر روپیہ ماہواری کی سکنڈ کلرکی تم کو عطا کی جائے۔ اب سُنیے کہ یکم کو دو دن باقی تھے اور چھ گھنٹے کا راستہ، اور ساعت تیسری تاریخ کی۔ پھر اس نے لاکھ لاکھ سر ٹپکا مگر جا نہ سکا۔ اسی طرح ایک سوداگر نامی کے ایجنٹ نے کلکتہ سے تار بھیجا کہ یہاں کئی علاقے نصف قیمت پر بہت جلد بکنے والے ہیں، آپ اس تار کے دیکھتے ہی روانہ ہوں، لاکھوں کا وارا نیارا ہوگا۔ مگر ساعت نہ نکلی، اس سبب سے وہ بیچارہ نہ جا سکا اور پھر اُس نے افسوس کے ساتھ سُنا کہ اس کے علاقے کے متصل ہی کئی علاقے کوڑیوں کے مول بک گئے۔ گھڑی بھر میں گھر جلے اور ڈھائی گھڑی کی بھدرا۔

اِس کے علاوہ اور بھی اکثر باتوں میں نحوست، اور سعادت کا خیالِ کامل رکھا جاتا ہے۔ گھوڑا خریدا جائے گا تو سینکڑوں شقوں کے بعد فلاں عیب کا گھوڑا سوار کو مار ڈالتا ہے، اور فلاں عیب کے گھوڑے سے مالک کی بیوی مر جاتی ہے۔ اور فلاں عیب کے گھوڑے سے دیوالیہ نکل جاتا ہے۔ مگر اس کی ذرا بھی اصلیت نہیں، بھلا گھوڑے کے عیب کو انسان کی زندگی اور معاملات تجارت سے کیا واسطہ۔ ہاں اگر کاٹ کھاتا ہو، یا سوار کو جمنے نہ دیتا ہو تو البتہ اِس قسم کے گھوڑے کا خریدنا یا اس پر سوار ہونا غلطی ہے۔ ستاروں کے اثر کو انسان کے معاملات میں ہم لوگوں نے اس قدر دخل دے دیا ہے۔ کہ اُلاَمان۔ اُلاَمان۔ ایک دقیانوسی کے سوال۔

دقیانوسی: بھلا صاحب لوگ تو ان باتوں کو نہیں مانتے۔

جنٹلمین: مطلق نہیں۔ بالکل ذرا بھی نہیں۔

دقیانوسی: اور ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جہاں گھوڑے کو منحوس پایا، فوراً گولی ماردی۔ کہاؤں ایسا گھوڑا منحوس۔

جنٹلمین: یہ آپ کی غلطی ہے۔

دقیانوسی: واہ آپ کے کہنے سے نہ ذرا سی انگریزی پڑھ لی اور بس پدرم سلطان بود:

آدمی را بچشم حالِ نگر

از خیال پری و دری بگذر

جنٹلمین: میں عرض کردوں سبب اس کا یہ۔

دقیانوسی: اچھا تو اُس نے گولی کیا سمجھ کر ماری۔
جنٹلمین: تو عرض کرتا ہوں بندہ نواز۔ آپ جب کہنے بھی دیں۔
دقیانوسی: آپ اگر اس کا جواب دیں، تو شاگرد ہو جاؤں۔
جنٹلمین: گھوڑ دوڑ میں گھوڑا گرا، ٹانگ ٹوٹ گئی۔ صاحب نے گھوڑوں کے ڈاکٹر کو بلا کر دریافت کیا ہوگا کہ اس کا علاج ہے یا نہیں۔
دقیانوسی: نہ کسی کو بلوایا نہ کچھ جی۔
جنٹلمین: اچھا صاحب وہ خود واقف ہوگا کہ اب ٹانگ اچھی نہیں ہو سکتی۔ سوچا کہ تین ٹانگ کا گھوڑا کس مصرف کا گولی مار دی۔
دقیانوسی: واہ یہ سبب نہ تھا۔
حاضرین: بیشک یہی سبب ہوگا۔
جنٹلمین: خیر اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب سُنیئے کہ چوراہے پر صدقہ رکھنا بھی ایک بہت بڑی بھاری غلطی ہے۔ اور اکثر لوگوں کو شک کی جگہ یقین ہے کہ بعض عورتوں پر شہزادے جن، سید، پیر، آتے ہیں جمعرات کے دن ڈومنیاں بُلائی جاتی ہیں۔ اور وہ سر پیر پھینکتے ہیں اور گھنٹوں تک چھو چھار ہا کرتی ہے۔ مگر اصل میں دیکھئے تو سب لچر۔ ہزارہا آدمی اس کے قائل ہیں۔ اس ادہار کا کیا علاج ہے۔ بجز اس کے کہ زمانے پر چھوڑ دے کچھ ختم۔

دو چار دن بعد ایک روز جنٹلمین کسی گاؤں کی طرف جو شہر سے دو کوس کے فاصلے پر واقع تھا نکل گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پچاس ساٹھ عورتیں مل کر گاتی ہوئی کھیتوں کی طرف جا رہی ہیں۔
جنٹلمین: (ایک مسافر سے) کیا ان کے ہاں آج کوئی تقریب ہے۔
مسافر: جی نہیں حضرت۔ چری کو نکلی ہیں۔
جنٹلمین: کیا چری اور چرائی کیسی۔
مسافر: حضور جن دنوں میں ہوا خراب ہوتی ہے، یا پانی وانی نہیں برستا تو عورتیں چری کو نکلتی ہیں، اور گاتی جاتی ہیں کہ:-

کالی بولت ہے بجار
مینھ ناہیں برست گھار

چالیس چالیس پچاس پچاس کا غول نکلتا ہے۔ کھیتوں میں دریا کے کنارے جل کے پوجا کرتی ہیں۔ مالن پوجا کراتی ہے۔ اس کے بعد بھونری سینگ کے گڑ کے ساتھ کماتی ہیں۔ ان کو یقین واثق ہے کہ اس تدبیر سے

ضرور بارش ہوگی۔ مگر یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ جو عورتیں چری کو جاتی ہیں۔ وہ ادھر اُدھر سے پیسے مانگتی ہیں۔ اور جو کچھ ملتا ہے، اس میں کچھ تو مالن کو دیا جاتا ہے اور کچھ بھونریوں اور گڑ میں صرف ہوتا ہے۔

جنٹلمین نے دیکھا کہ ان عورتوں نے پوریاں اور پوڑے تلے اور بتاشے منگائے، اور ایک بکرا منگوایا، وہ دیبی کے نام پر قربان کیا۔ قربانی کے بعد بکرا پکایا گیا۔ جو گوشت نہیں کھاتی تھیں انھوں نے پوریاں کھائیں باقی نے گوشت اور پوری۔

جنٹلمین نے کہا ان میں اکثر کم سنیں بھی ہیں۔ بھلا کم سنوں اور بوڑھوں کے خیالات میں کچھ فرق ہو گیا نہیں۔

مسافر نے کہا حضور ایک بات پیدا کرلی ہے اور ان میں جیسے خیال بوڑھی عورتوں کے ویسے ہی جوانوں کے ہیں۔

جنٹلمین: ان سے جو شکایت کرے وہ گدھا۔ ان کی عقل کتنی یہ سمجھتی ہیں کہ اگر دیبی کی خوشامد کریں تو شاید خوش ہو کر مینھ برسا دے یا مصیبت دور کر دے۔ گاؤں کی رہنے والیاں اَن پڑھ اعزا اقربا پاس پڑوس کے باشندے سب جاہل۔ عقل کا نام کوسوں نہیں۔ فہم کا منزلوں پتہ ندارد۔ کس لطف کے ساتھ مل مل کے گاتی ہیں سب کی سب سفید کپڑے پہن کر، پاک صاف ہو کے، بن ٹھن کے آئی ہیں اب اس وقت ان کے قریب کوئی فکر نہیں آسکتی۔ یہ سب سے بری اور محفوظ ہیں۔

مسافر نے کہا جن دنوں میں مینھ نہیں برستا، لونڈے لوارے خوب غل مچاتے ہیں۔

برسو رام جھڑا کے سے
بڑھیا مر گئی فاقے سے

جنٹلمین: یہ تو ہم نے بھی سُنا ہے۔

ایک شخص نے جنٹلمین سے کہا۔ وہ آپ کے ساتھ انگریزی لباس پہنے ہوئے اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ اُن کو آپ نے پہچانا۔ جنٹلمین نے کہا جی نہیں۔ میں نے اُن سے نام دریافت کیا تو عبداللہ نام بتایا۔ مجھ سے اس قدر کہا کہ میں مصر سے آتا ہوں، اور اپنے وطن جاتا ہوں۔ وہ اُس وقت سوار ہونے کو تھے کہ یہ خبر سُن کر رُک رہے۔ اُس نے کہا حضرت وہ بڑے شخص تھے۔ مجھ سے آج صبح کو ایک پنساری نے کہا کہ چودھری صاحب میں ان کو جانتا ہوں، وہ جو اسٹیشن پر ساتھ تھے۔

جنٹلمین: کیا بتایا کیا۔ تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو۔

چودھری: آزاد پاشا یہی ہیں۔

جنٹلمین: اہاہاہا۔ دیکھا میں کہتا ہی تھا کہ ہوں نہ ہوں آزاد ہوں۔ ان کی تصویر کئی اخباروں میں دیکھی ہے۔

چودھری: اور مجھے معلوم ہو تو بے دعوت کئے ہرگز نہ جانے دوں۔ مگر خیر، اتفاق بہت بڑے نامی آدمی ہیں۔

جنٹلمین: مجھ سے ایک بڑی بھاری غلطی ہوئی۔ مگر خیر میں نے ان سے ثریا بیگم کا کل حال بیان کر دیا۔ مجھے کیا معلوم کہ یہ آزاد ہیں۔ وہ بھی کھود کھود پوچھنے لگے۔

چودھری: ثریا بیگم کون وہی، جو نواب سنجر صولت کو منسوب ہیں۔

جنٹلمین: جی ہاں وہ آزاد کے نام پر جان دیتی ہیں۔

چودھری: تو ایسا نہ ہو کہ سنجر صولت سے جھگڑا ہو جائے۔

جنٹلمین: جی نہیں۔ اب وہ منکوحہ ہے۔ مجھے خوب یاد ہے۔ جس وقت میں نے اس کے حسن کا حال بیان کیا اور سراپا کھینچا تو آزاد نے آہِ سرد کھینچ کر شعر پڑھے تھے، اور وہ شعر میں نے لکھ بھی لیے ہیں۔

خدمت گار سے کوٹ منگوایا اور اشعار سنائے:۔

دورۂ سدرہ در گرفت آہِ جگر خراشِ من	گشت مقام جبرئیل مسکن بود و باشِ من
حضرتِ عشق رہبرم می نشوی برائے چہ	آہ کجا شدی تو اے مرشد خیل تاشِ من
نکہت جام بادہ چیست غوررس دماغ روح	تازہ کن مشامِ جاں موجب انتعاشِ من
بگذر دار بخاطرم میلِ صنم پرستی آہ	کیست بجز خیال دوست آذرِ بت تراشِ من

دوش بحضرتِ مسیح گفت شعاعِ آفتاب

ہست جلالِ سطوتش باعثِ ارتعاشِ من

اور یہ کہہ کر کسی قدر آبدیدہ بھی ہوئے میں نے یہ بھی کہا کہ آزاد پر جان و دل سے عاشق ہے۔ آزاد کے نام پر جوگن ہو گئی تھی۔ سب چپ چاپ سُنا کیے۔ ہمیں اطلاع بھی نہیں دی۔ ہمارے اُن کے خیالات بالکل ایک ہیں۔ ذرا فرق نہیں۔

چودھری۔ جی ہاں۔ آپ ہندوؤں میں کافر، وہ مسلمانوں ہیں، دونوں بے دین۔ آپ سے کیوں نہ اتفاق رائے ہو۔

کند ہمجنس باہمجنس پرواز

کبوتر با کبوتر، باز باباز

جنٹلمین: دو دن ساتھ رہا۔ تین بار ہمارے سامنے نماز پڑھی۔

چودھری: لوگوں کے دکھانے کے لیے۔

جنٹلمین: ضعیفُ الاعتقادی کے تو وہ جانی دشمن ہیں۔

چودھری: دماغ خشک ہو گا بس یہی سبب ہے۔

جنٹلمین: تم مسلمان ہوکے اگر چیچک کے دفعیہ کے لیے مالن بلاؤ، یا ہم ہندو ہوکے عشرے کے دن شربت پلائیں تو زمانہ کیا کہے گا، یا ہنود کے مذہب پر قائم رہو یا مسلمانوں کے مذہب پر، یہ آدھا تیتر آدھا بٹیر کے کیا معنی۔ تھالی کے بیگن ڈھلمل یقین۔ غرض کہ اچھا جھانسا دے گئے۔ اب شکایت کروں گا۔

جنٹلمین کو معلوم تھا کہ آزاد پاشا بمبئی میں مرزا صاحب کے مکان پر مقیم ہیں۔ انھوں نے فوراً خط لکھا کہ آپ کے دوست اور عزیز آزاد پاشا سے مجھ سے ملاقات ہوئی مگر افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا نام مجھ سے مخفی کیا۔ آپ براہِ عنایت ان کے پتے سے مجھے اطلاع دیں۔

چودھری صاحب نے کہا جب آزاد ایک نواب صاحب کی سرکار میں تھے تو مجھ سے بڑی ملاقات تھی مگر تب یہ بات حاصل نہیں تھی اب اس قدر نام برآوردہ اور مشہور ہوئے ہیں کہ تمام ہندوستان اُن سے واقف ہے۔ ہم ایسوں کو کب پوچھتے ہیں۔ ایک روز نواب صاحب کے ہاں دور چلا تو معاذاللہ مجھے اس قدر نشہ تیز ہوا کہ الاماں۔ دوسرے روز آزاد سے ملاقات ہوئی تو کان میں یہ شعر پڑھا:

رخت از بہر تفرج بدر صومعہ کش
ایں قدر معتکف خانۂ خمار مشو

بس میں چپ کا ہو رہا۔

ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

الغرض جنٹلمین نے اپنی عمر کا ایک حصہ اسی میں صرف کیا کہ ضعیف الاعتقادوں کو تلقین کریں۔ مکاروں اور عیاروں کی مکاری اور دام تزویر سے بچائیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں سیر کے لیے گئے اور کچھ تجربہ حاصل ہوا، وقتاً فوقتاً اخباروں کے ذریعے سے اس کو اشاعت دی۔ اُردو میں مختلف رسالے چھپوا کر شائع کیے۔ اور ہزاروں آدمیوں کو چاہِ حماقت سے نکالا۔ ابتدا ابتدا میں لوگوں کو ان سے بہت کم ہمدردی تھی۔ کیونکہ یہ جاکٹ پتلون ڈانٹ کر غرور کے ساتھ پھرا کرتے تھے۔ مگر جب سے انگریزی لباس کے ساتھ انھوں نے انگریزی خیالاتِ نفیس بھی ظاہر کیے۔ تب سے ان کی بڑی قدر ہونے لگی، اور عوام اُن سے بدرجۂ غایت خوش ہوئے۔ ثریا بیگم کے یہاں سے آزاد کے دلوں پر انھوں نے سانپ لٹائے۔

معشوقۂ نسرین بدن نازک اندام، پولینڈ کی شہزادی گلفام کی حسرت و پشیمانی

اور صد ہا بے گناہوں کی مصیبت و پریشانی:

دل لگانا بہت آساں ہے پر دشوار نباہ — عیش آغاز میں انجام کو ہے نالہ و واہ
دل پہ زنہار نہیں رہتا ہے قابو واللہ — صبر و ہوش و خرد اس عشق میں دیکھے ہیں تباہ

عدوِ عشق سے جب تنگ کا ہے لفظ عیاں
معنی تنگ ہیں مشہور عیاں راچہ بیاں

خوبرو گر نظر آئیں تو انھیں سمجھیں خواب — اور اگر بات کریں دے نہ حسینوں کو جواب
جائے سہواً تو پھرے کوچۂ جاناں سے شتاب — عشق انگیز کبھی پاس نہ رکھے اسباب

ہو مرقع جو حسینوں کا تو کر دے فی النار
عاشقانہ نہ پڑھے بھول کے شعر و اشعار

اعید محبوب زہرہ تمثال، شیریں جمال، نورسِ نہالِ گلزارِ خوبی، و گل۔ سرسبزِ بوستانِ محبوبی، فرخندہ خو، عنبریں مو، یعنی پولینڈ کی نوخیز شہزادی تازہ رو، کہسار فلک شکوہ، و عظمت بار، سے دامن کوہ کے لالہ زار پُر بہار کا مشاہدہ کرتی تھی۔ نور کا تڑکا۔ صبح کا سہاناں سماں۔ پنجروں میں مرغانِ خوشنوا نغز نخوان، حمد کردگارِ جہاں آفرین میں رطب اللسان و عذب البیان، ہر سمت طیورِ خوش آہنگ، کی ترانہ سنجی بلند تھی۔ ہر طرف مسرت و انبساط۔ افتراح و نشاط پھولوں کی مست کرنے والی بوے خوش۔ فصلِ گل اور موسم دلکش:۔

چشمِ رضواں میں کھٹکتی ہے وہ دلچسپ بہار — چہچہے کرتے تھے ہر شاخ پہ مرغانِ ہزار
سبزۂ خطِ رخِ غلمان تھا تو طوبیٰ اشجار — خضر کے دل کو بہا لے گئی موجِ انہار

شورِ گلبانگ ہوا صاف صدائے قلقل
دلِ بلبل۔ پہ اُدھر شورِ نمک خندۂ گل

پچاس ساٹھ ماہرو نوعمر گل بدن خادمہ خوش سلیقہ، اِدھر اُدھر ادائے دلربا سے کھڑی تھیں کہ ذرا اشارہ ہو تو خدمت بجا لائیں۔ مانیں سولہ سنگار کر کے روشوں میں ادب۔ کے ساتھ استادہ۔ شہزادی پاکیزہ مشرب مہر سیما کبھی مرغان جادو نوا کے خوشنما پنجروں کے قریب جا کر چمکار کے خوش ہوتی تھی۔ کبھی سبزۂ نو دمیدہ کی لہک سے آنکھوں نورِ موفور بخشتی تھی۔ پھولوں کی بھینی بھینی بوباس پر یہ طرہ ہوا کہ پندرہ بیس کم سن عورتیں زرق برق لباس زیب بدن کیے ہوئے ہاتھوں میں دستنبو اور عطر لیے ہوئے ہوا کے رُخ کھڑی تھیں۔ اور جھونکے کے ساتھ بہشت کی لپٹیں آتی تھیں:۔

بھینی بھینی وہ ہوا اور چمن کی وہ بہار — اور گلوں کی روشوں کی وہ ایک سمت قطار
ہو نسیم سحری جس پہ دل و جاں سے نثار — نور کی بزم تھی روشن تھا وہ سارا کہسار

تھے چنگیروں میں کہیں ہار کہیں گلدستے
تھے کہیں جام بلوریں کہیں کنٹر مے کے

مہوش ناوک نگاہ شہزادی کج کلاہ چھبیلے پن کے ساتھ قصر معلی میں آئیں۔ آرام کرسی پر جواز بس بیش بہا وخوشنما تھی متمکن ہوئیں، اور ایک خادمہ جمیلہ سے باتیں کرنے لگیں۔

شہزادی: آج بدلی اور گھٹا نے کہسار کو ایسا پُر فضا کر دیا ہے کہ سبحان اللہ۔ سامنے دیکھو مور یلے کس مستی کے ساتھ مصروفِ رقص۔

خادمہ: حضور ابر پر طاؤس دل و جان سے عاشق ہے۔

شہزادی: چکور شعلے پر، بلبل گل پر، پروانہ شمع پر، اور طاؤس ابر بہاری پر، جان دیتا ہے۔ اکثر کتابوں میں اس کا ذکر دیکھا ہے۔

خادمہ: اپنے اپنے معشوق کو سب چاہتے ہیں۔ انسان ہو یا حیوان۔

شہزادی: تم بھی کسی پر عاشق ہو کسی پر دل ہے یا نہیں۔

خادمہ: (گردن نیوڑھا کر) حضور سے میں بے ادبی نہیں کر سکتی ہوں۔

شہزادی: کئی دن سے دیکھتی ہوں کہ ذرا اٹھلا کے چلتی ہو۔

اتنے میں دوسری خادمہ آ گئی جس کا لزی نام تھا۔ شہزادی اس کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔ لزی سچ کہنا۔ چند روز سے ان کے مزاج میں ذرا البیلا پن آتا جاتا ہے یا نہیں۔ لزی کے مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ مگر جب دیکھا کہ سرکار اس وقت چہل ہی پر آمادہ ہیں تو دبے دانتوں کہا حضور اب اٹھتی جوانی ہے۔ اب تو البیلے پن کے ان کے دن ہی ہیں، یہ البیلی نہ ہوں گی تو کون ہو گا:

جان عشاق پہ شوخی تری آفت ہوگی
اب تو فتنہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوگی

ایک وہ دن تھا کہ اٹھلانا، اور چمکنا، اور سنورنا جانتی ہی نہیں تھیں اور اب تو ہر دم ناک چوٹی گرفتار رہتی ہیں۔ جب دیکھو بنی ٹھنی کسی سے آنکھ لڑی ہے۔ بے اس کے یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی:

واقفِ رمز و کنایہ نہ مری جان تو تھی
سیدھی الٹی نہ سمجھتی تھی یہ نادان تو تھی

اور اب خیر سے ہم ایسے بیس کو راستہ بتائیں۔

شہزادی: (خادمہ سے) کیوں اب تو قلعی کھل گئی۔

خادمہ: حضور یہ اپنی بیتی سُنا رہی ہیں، اور کیا کہوں۔

شہزادی: دل دے تو ایسے کو جو دلدار ہو۔ جو احسان مانے مگر لاکھ دلدار ہو مسافر سے محبت کرنا اور مسافر پر مرنا بڑی غلطی ہے کبھی بھولے سے مسافروں سے بات بھی نہ کرے۔ آبدیدہ ہو کر) ان کا کون ٹھکانا۔

لزی: حضور از برائے خدا اس طرف خیال ہی نہ کیجئے۔

شہزادی: لزی۔ بھلا تم کو یقین ہے کہ کسی دم بھی میں اس مسافر کو بھولتی ہوں، جس کے سبب سے میرا دل نخچر تیر الم ہے:

صد شعلہ جنوں ریخت بآشفتہ سرِ ما

زد پنجۂ مرجان کہ بخونِ جگرِ ما

ایک وہ دن تھا کہ اُس جوانِ رعنا کے دکھانے کی غرض سے دن بھر میں سو جوڑے بدلتی تھی۔ کہ شاید کوئی چھب کوئی ادا اس کو بھائے۔ شاید کسی ڈھب سے سونے کی چڑیا ہاتھ آئے، ہر دم بناؤ سنگار کے پیچھے دیوانی بنی رہتی تھی۔ کہ اگر یہ جوان زیبا شمائل وجیہہ و کم عمر عاشق ہو جائے تو مزے مزے زندگی بسر ہو۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کٹتی

اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

خادمہ: سرکار ایک آپ ہی نہیں حضور سارا زمانہ روتا ہے:

یہاں جنت کی فضا سبزۂ بیگانہ ہے

باغِ عالم میں اسی گل کا اب افسانہ ہے

لزی: بھلا کسی اخبار میں بھی حضور نے ان کا حال کچھ پڑھا۔

شہزادی: ہاں اس قدر معلوم ہوا کہ بندرگاہ بمبئی میں خیر و عافیت سے داخل ہو گئے۔ مگر ایک خط تک نہ بھیجا۔ ہائے ستم میں نے کس ناآشنا کو دل دیا، چار دن کی چاندنی تھی۔ کبھی ان کا روٹھنا۔ ہمارا منانا۔ کبھی ہمارا روٹھنا ان کا منانا:

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے

کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

مگر۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

لزی: حضور اگر پتا معلوم ہو تو آپ ہی کوئی خط بھیجیے۔

شہزادی: واہ جواب کے انتظار میں اور بھی جان کھوؤں۔

لزی : ایسی بات نہیں ہے۔ جواب آئے اور پھر آئے۔

خادمہ : خدا تمہاری زبان میں برکت دے۔

شہزادی: خط بھیجنے کو بھیجوں مگر انتظارِ جواب موت سے بدتر ہوگا۔ اور جب تک جواب نہ آئے گا مثل ماہیِ بے آب تڑپتی رہوں گی اور کل جو کوشش کرتی ہوں وہ اُلٹی ہی پڑتی ہے:

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

لزی : اچھا حضور اپنے نام سے خط نہ بھیجیں۔ میں اپنی طرف سے لکھوں اور بھیجوں۔ اس میں آپ کا حال شرح و بسط کے ساتھ درج کروں۔

شہزادی: ہاں۔ اس میں سُبکی اور توہین بھی نہیں ہے۔

لزی : تو مجھے اب اجازت ہے نہ۔ میں طول طویل خط لکھوں گی۔

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر کوہسار پر قصرِ ارفع کے قریب ایک نیا گل کھلا۔ دو سوار مسافر کی صورت بنائے ہوئے آئے۔ ایک ایرانی کپڑے پہنے تھا۔ دوسرا روسی۔ گھوڑوں پر سے اُترے۔ گھوڑے درخت کی شاخوں سے باندھے۔ ایرانی نے زمین پوش سبزے پر بچھایا۔ اور روسی ایک درخت کے تنے پر بیٹھا۔ ایرانی نے ایک مالن سے فارسی زبان میں کہا کہ ہمیں تھوڑا پانی پلاؤ۔ اس وقت ہم بہت پیاسے ہیں۔ وہ اُن کی بولی نہیں سمجھی۔ جوشِ جوانی کے غرور سے چتون تیکھی کر کے، شوخی کے ساتھ دوسری روش میں چلی گئی تو روسی نے اپنی زبان میں سمجھا دیا کہ نیک بخت پیاسے ہیں۔ ان کو پانی لا کے پلا دے۔ مالن اٹھلاتی ہوئی چلی ایک قیمتی گلاس میں آبِ سرد لائی۔ ایرانی نے پانی پیا اور بھی لہجہ میں یہ غزل گانے لگے:

اے عشق قطع کردہ رہ سلسبیل را — از ما سلام شوق آسان جبرئیل را

پیوستہ آہوانِ حرم یاد می کنند — آن اولیں زمان بنائے خلیل را

نازم بقدرت تو کہ حیران نمودہ است — عقل و قیاس و وہم و خیال و دلیل را

الغت بجائے چشمۂ آب حیات ماست — زاد دعائے خیر رسد سلسبیل را

از زیر دست بیخ زبردست کندہ شد

نشنیدہ اید قصۂ اصحابِ فیل را

اس نغمۂ باربدی کی آواز جو محل میں گئی، تو شہزادی بلقیس وقار نے متحیر ہو کر ایک کنیز باتمیز سے پوچھا: یہ

کون ہے۔ کچھ عجب طرح کا گانا ہے۔ لونڈی نے خدام سے دریافت کیا۔ انھوں نے دست بستہ عرض کیا، سرکار دو سوار مسافر آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم لوگ بہت تھکے ماندے اور شل ہیں۔ اگر اجازت ہو تو یہاں دم بھر آرام کریں اور مسہریاں مانگتے ہیں۔ شہزادی عالی ہمت نے جھروکے سے اُن کو دیکھا۔ کہا شکل وصورت اور وضع قطع سے شاندار اور رئیس معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے آرام کے لئے کُل سامان مہیا کر دو۔ اسی دم متحیر وا ستماع حکم۔ خدام باادب نے سامانِ راحت مہیا کر دیا۔

ایک چلبلی اور شوخ طبع، غنچہ دہن، مالن روسی جوان خوش اندام وگلفام فراخ سینہ، بالا بلند، پر ایسی رَجھی کہ بار بار اس کے قریب سے چمک چمک کے جانے لگی۔ روسی سمجھ گیا کہ زن نازنیں مہ جبیں میرے گل رخسار تاباں پر مثل بلبل عاشق ہے۔ ایک دفعہ اشارے سے بلایا، اور ایک گھنی جھاڑی میں جو خس وخاشاک سے پاک اور نہایت صاف ستھری تھی ہری ہری دوب پر بیٹھ کر بے غل وغش ہمکلام ہوا۔

روسی : تم کس کی نوکر ہو اور یہ پہاڑ پر کس کی عالیشان عمارت ہے۔ عجب دلچسپ مقام ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمام عمر یہیں رہوں۔

نازنیں : اب کسی اور وقت باتیں کروں گی ہماری سرکار دیکھ لیں گی تو بدظن ہو جائیں گی، اور تمہارے لئے بھی اچھا نہیں ہے۔

روسی : آپ کی سرکار کا سن شریف کیا ہے۔ ہیں رنگین مزاج چمن طبع، یا بالکل روکھی پھیکی سی ہیں۔

نازنین : دیکھو سرکار کی نسبت کچھ نہ کہنا۔ ہیں جو چاہو سو کہہ لو۔

روسی : تم اس وقت وحشت کی کیوں لیتی ہو۔ دو سو عورتیں کام کرنے کے لئے حاضر ہیں۔ تمہاری پکار ہوگی نہیں، اور یہ مقام گنجان اور سایہ دار ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر تو ہوگی نہیں، کہ یہ کیا باتیں کر رہی ہیں۔

نازنیں : مسافر سے محبت کرنا، اپنے دل کو دکھانا ہے۔ ہماری سرکار اب پچھتاتی ہیں۔ کہ یہ کیا کیا۔ مگر تیر از کمان جستہ کا معاملہ ہے۔

روسی : کیا ان کا بھی کسی پر دل آیا ہے؛ ہم سے ان کا حال تو بیان کرو؛ یہ ہیں کون؟ کسی کے ساتھ شادی ہوئی ہے، یا بن بیاہی ہیں۔

نازنیں : شادی برائے نام ہوئی ہے، جس کے ساتھ شادی ہوئی ہے وہ مُفقُودُ الخبر ہیں۔ اگر یہاں کوئی شخص اس کا نام زبان پر لائے تو روسی جاسوس گرفتار کر لے جائیں۔ آزاد پاشا کا نام سُنا ہوگا۔ ایسا خوب صورت جوان بھی نہیں دیکھنے میں آیا۔ مس کلیرسا اس کو میدانِ جنگ سے گرفتار کرلائیں، اور وزیر جنگ نے حکم دے دیا کہ سیبریا بھیج دو۔ دریا کے اِس پار آئے ہی تھے کہ شہزادی نے اُن کو گرفتار کر لیا؛ اور کچھ دن کے بعد اُن سے شادی ہوئی۔

روسی : ہاں، ہم کو اس معاملے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔
نازنیں : سارے زمانے بھر میں مشہور ہے۔ بس جب۔
روسی : (بات کاٹ کر) ہوگا کچھ ہم کو اس جھگڑے سے کیا سروکار۔ اب یہ بتاؤ کہ اگر ہم ساتھ لے جائیں تو چلو یا نہ چلو۔
نازنیں : ہم تو شہزادی کے خانہ زاد ہیں۔ ہاں اگر تم یہ اقرار کر لو کہ یہاں سے باہر نہ جاؤ گے تو ہمیں کچھ عذر نہیں ہے۔
روسی : اور کھائیں گے کیا۔ اگر نوکری ہو جائے تو ہرج ہی کیا ہے۔
نازنیں : اس کی میں ذمہ دار ہوں جس دن شادی ہوئی۔ اسی دن سے تمہارا اسم ہو گیا۔ کھانا سرکاری۔ لباس سرکاری۔ مکان سرکاری، خرچ ضروری ملا کرے گا۔
روسی : واہ پھر کیا پوچھنا ہے۔ تمہاری سی دلبر ہم خوابہ اور یہ آرام۔ پھر اگر چھوڑ کے چلے جائیں، تو ہم سے زیادہ بے وقوف اور کون ہے۔
نازنیں : ایسا نہ ہو کہ قول بھول جاؤ جس طرح آزاد پاشا بھاگ نکلے۔ اسی طرح تم بھی بھاگ جاؤ تو مفت میں ہماری بدنامی اور جگت ہنسائی ہو، اور تمام عمر ہم کو اس رنج میں جلاؤ۔
روسی : قول جان کے ساتھ ہے۔ اقرار کر کے بھولتے کوئی اور ہوں گے اور تم خود ہی غور کرو کہ ہمارا اس میں کیا نقصان ہے۔
نازنیں : سچ کہوں جس وقت میں نے تم کو دیکھا ہے ہزار جان سے عاشق زار ہوں۔ جان جاتی ہے۔ میں اس وقت جان پر کھیل کے آئی ہوں۔
روسی : دل کو دل سے راہ ہے۔ یوں تو یہاں پری خانہ ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر آفت جان بلائے بیدرماں مگر تمہاری ادا اور حسن و صفا اور شوخی نے دل کو بے قابو کر دیا۔

یہ مژدۂ بہجت خیز سن کر نازنیں زہرہ جبیں، باغ باغ ہو گئی۔:

غنچوں کو یہ شگفت نہیں ہوتی صبح دم	بلبل کو یہ طرب نہ ہو ہرگز بفصلِ گل
آہو کو یہ سرور نہ ہووے بوقتِ رم	قمری کو وصلِ سرو کی اتنی نہ ہو خوشی

حضرات ناظرین۔ ساری خدائی پر روشن ہے کہ روسی جاسوس بلا کے آدمی۔ غضب کے پتلے، انتہا کے شریر اور عالی دماغ ہوتے ہیں۔ اور وضع اور لب و لہجہ بدلنے میں تو اُن سے گویا سبقت لے جانا امرِ محال ہے۔ اس فن کے بادشاہ ہیں، یہ روسی ذات شریف۔ واللہ اعلم کون ہیں۔ مگر ہم ان کی اس چالاکی کے قائل ہیں، کہ کس

خوب صورتی سے آزاد کے معاملات میں بے غرضی ظاہر کر رہے ہیں۔ نازنین نے ذکر چھیڑا بھی، تو کسی قدر حال سن کر بات ٹال دی۔ گویا بالکل واسطہ ہی نہیں۔ اور اس لگاوٹ بازی کے صدقے کہ زن زہرہ جبیں کو باتوں باتوں میں اپنے بس میں کر ہی لیا۔

اب سنیئے کہ ان سے بحث ودیر کر کے اس زنِ عابد فریب نے ٹھان لی کہ شہزادی سے اس کا ذکر مذکور کرے مگر سوچی کہ پہلے ان کے حال سے آگاہی ہوئے پھر تذکرہ کروں، پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو اور پیشہ کیا کرتے ہو، روسی نے کہا میں وارسا کے کالج کا پروفیسر ہوں۔ یہاں اس غرض سے سرکاری طور پر بھیجا گیا ہوں کہ پہاڑیوں پر علمی تحقیقات کروں۔ میں علم جیالوجی کا عالم ہوں۔ پوچھا یہ مسلمان تمہارے ساتھ کیوں آیا، کہا۔ یہ بھی بڑا عالم اجل ہے۔ نازنیں نے اصرار کیا کہ اُن سے کہو اسی طرح پھر گائیں۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا مگر آواز بڑی پیاری ہے۔ یہ کہہ کر نازنیں دفعتہً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کہا اب دیر ہوتی ہے۔ ہمیں جانے دو۔ روسی نے اصرار کیا کہ گانا سُن لو تو جاؤ کہا دور ہی سے سُنیں گے یہ کہہ کر سمن پوش چلنے ہی کو تھی کہ روسی نے لبِ لعل شکر خا کا ایک بوسہ جھاڑی کے باہر الخ . . .

جھاڑی کے باہر دونوں آئے تو دیکھا کہ تین عورتیں چھپی ہوئی کھڑی ہیں روسی تو چلا گیا مگر یہ نازنیں مارے شرم کے کٹ گئی۔ اس طرح عرق آلودہ ہو گئی جیسے وَرقِ گل پر قطرہ ہائے شبنم جھلکتے ہیں اُن تینوں ہمجولیوں نے چہل کرنا اور پھبتیاں کسنا شروع کیا۔

ایک : (روز) اب چھپ چھپ کے جھاڑیوں کی سیر ہونے لگی۔

نازنیں : (فرطِ غیرت سے گردن نیچی کر لی۔ اور خاموش ہو رہی۔)

دوسری : (اینٹرم) بہن یہ تمہارے بھائی ہوں گے جن کے ساتھ جھاڑی سے نکلی ہو۔ یا رشتے کے اور عزیز ہیں۔

نازنیں : (پیشانی نورانی عرق آگیں ہو گئی۔

تیسری : (لوسی) جوانی بھی کیا مست موسم ہے۔

نازنیں : آنکھیں نیچی کر کے آہ سرد کھینچی۔

لوسی : اب کہیں اس کے ساتھ بھاگ نہ جانا بہن۔

روز : مگر ہم تو ان کی نظر کے قائل ہو گئے۔ کیا پری زاد اور خوش رو، کشیدہ قامت، جوان ڈھونڈھ کے نکالا ہے۔

لوسی : اس میں کیا شک ہے، کوئی سو، پچاس میں ایک ہی ہوتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں فرد ہے۔ سرو قد رعنا جمال، وجیہہ خوش رو۔

نازنیں : یاالٰہی جو کوئی بھلامانس راستہ پوچھے تو بتلانے میں عیب ہے کچھ تم جیسی آپ ہو ویسا ہی سب کو سمجھتی ہو، اور ہمیں یہ کاٹ پھانس اور یہ باتیں نہیں آتیں۔ تم بھی مجبور ہم بھی ناچار۔

لوسی : یہ باتیں سب سُنی ہوئی ہیں۔ تمہارا دل اس پر ضرور آیا ہے۔ تم لاکھ کہو ہم ایک نہ مانیں گے تم کو اس سے دلی محبت ہے۔

نازنیں : (تنک کر شوخی کے ساتھ)

ہاں جی ہاں غیر سے کی ہم نے محبت تمہیں کیا — اپنا دل اپنی خوشی اپنی طبیعت تمہیں کیا

تم کون ہو۔ ہم نے خوب کیا۔ اپنے فعل کے ہم مختار ہیں۔

لوسی : اب تمہیں شرم کہاں۔ اب تو بے حیا ہو گئیں۔

ان چاروں میں تھوڑی دیر تک چہل ہوا کی۔ شام کو جب نوعروسِ سرمایۂ نازنینی۔ روکشِ مہوشاں چینی بناؤ چناؤ کر کے ایوانِ فلکِ توامان سے برآمد ہوئی تو کل پیش خدمتیں لباسِ فاخرہ زیب بدن کر کے دور دیہ کھڑی ہوئیں اور وہ بصد آن بانِ دلبری اٹھلا اٹھلا کے سبزہ وروش چمن میں مصروف خرام ناز ہے۔

کشد قمری خیال سرور خاکِ آشیاں بندہ

بہر جا سایہ افتد بر زمین از قدرِ عنائش

لچکتی ہوئی نازک کمر اور کج کلاہ زیب سر:۔

ہر قوم راست رلہے دینے و قبلہ گاہے

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے

اس ناز و انداز دلربایانہ سے چمن روح افزا میں اٹھکھیلیاں کرتی تھی کہ دفعتًا وہ جوانِ رعنا سامنے نظر آئے۔ بالابلند آفتاب جبیں شوخ چشم رویئں تن۔ شیر دل۔ صف شکن۔ دوسرا ایرانیوں کے لباس سے آراستہ جوان، خوبرو نو خاستہ حسن۔ گلوسوز پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی:

ہیچ کس را نبود بر رخ تو تابِ نظر

مگر آئینہ کو او راول پولاد بود

پولینڈ کی شہزادی یاسمن پوش سیمیں تن کی ان دونوں مہ لقاؤں پر نظر پڑی۔ مگر اللہ رے غرورِ حسن، چار آنکھیں نہ ہونے دیں، دیکھا بھی تو کنکھیوں سے اس طرح کہ ان کے فرشتے خان کو بھی خبر نہ ہو پہلے تو سمجھی تھیں، کہ کوئی ایسے ویسے مسافر ہوں گے مگر جب ان کی شکل صورت قدِ دلجو گلِ رخسار، چال ڈھال، وضع ولباس پر نظر ڈالی تو سمجھی کہ رئیس زادے ہیں۔ ایک خادمہ سے کہا ہم سمجھے تھے کہ ایسے ویسے ٹٹ پونجیے ہوں گے مگر یہ

بیشک جنٹلمین ہیں۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر سیر کرتے ہوئے، دور نکل گئے۔ تو باہم یوں مکالمہ دلچسپ کرنے لگے۔

ایرانی : اہاہا۔ خدا کی قسم۔ یہ تو سچ مچ کی پری ہے۔ گوش صفا کوش کے موتیوں سے جوبن کی عجب کیفیت ہے

اختر بہ شجریا بہ بناگوش تو گوہر
باشبنم افتادہ دبرگ سمن ست ایں

روسی : اس کا خیال ہی نہ کرو، مگر جب کام کے لئے بھیجے گئے ہو وہ غت ربود ہو جائے گا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ وہ صورتِ زیبا پائی ہے، اور وہ دلربائی و کج ادائی ہے۔ کہ بیان سے باہر۔ پری زاد۔ جب ہی تو اس نے آزاد کو گھائل کیا:

کہ ماند کز تو بہ تیغِ غمزہ گشتہ نہ شد
ہیں شیزۂ حسن تو باخداست نیست

ایرانی : پھر اب ہو گا کیا۔ ہم سے تو اپنا فرض نہ ادا کیا جائے گا۔ مجھے اِس شوخ پرفن کے غمزے نے قتل کر ڈالا:۔

چشم اجل از دور بحسرت نگرانست
تا غمزۂ خونریز تو غارتگر جانست

روسی : حسن دجمال کی تعریف تو برسوں سے سنتے تھے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ اس قدر طلائک فریب حُسن پایا ہے۔ خدا نے آپ اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ آزاد جب ہی پھسل پڑے بھلا ایسی حسینہ پا کے کوئی بے وقوف ہے کہ چھوڑ دے، ہم تو نوکری چھوڑ دیں وطن چھوڑ دیں۔ اعزہ واقربا چھوڑ دیں۔ دین چھوڑ دیں، دنیا چھوڑ دیں، مگر ایسی گل رنگ معشوقۂ سیم بدن کو ہاتھ سے دینا انسان کا کام تو نہیں ہے۔ اللہ رے جمالِ باکمال ایک نظر بھر کر دیکھا، اور جان جاتی رہی۔

روسی اور ایرانی اس ناظورۂ ماہ سیما، عروسِ رنگین اُدا کے نکھار، اور جوبن پر تہِ دل سے عاشقِ زار تھے۔ دونوں اپنے اپنے دل میں سوچتے تھے کہ خدا کرے ہم پر ریجھے۔ اثنائے تقریر میں روسی نے کہا اب ہم اور آپ اس بات کا تصفیہ کرلیں کہ اگر نیت ڈانواڈول ہوئی اور نوکری ترک کر کے اِس بُتِ سفاک کی غلامی اختیار کی تو کس کی قسمت کھلے گی۔

ایرانی : جوز بردست ہو۔ یہ زبردستی کا معاملہ ہے۔

روسی : خیر تو معلوم ہو گیا نہ کہ آپ کی طبیعت میں فساد ہے۔ صلح آپ نہیں چاہتے۔ اچھا کیا مضائقہ ہے۔

برچہ باداباد ۔ اگر جنگ کے عزم ہیں، توبسم اللہ ہم یوں بھی حاضر ہیں۔ اور۔

ع : اگر مزاج میں شرو اں نہیں تویاں بھی نہیں

ابھی سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔

ایرانی : ہم فیصلہ کر دیں ۔ وہ جو کمسن اور خوبصورت خادمہ جھاڑی میں تم سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ تم شادی کر لو۔ اور اس شہزادی کے ساتھ ہماری شادی ہو۔

روسی : بجا اس میں کیا شک ہے۔ حضور ایسے ہی ہیں۔

ایرانی : ورنہ پھر پھوٹ میں تم کو کچھ ملے گا نہ ہم کو۔ وہی مثل ہوگی کہ۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

جب دونوں سیر کر کے واپس آئے تو باہم صلاح ہوئی کہ چل کر ملاقات کرنی چاہیئے۔ ایک خادمہ سے کہا شہزادی کو اطلاع دو کہ وہ دونوں آپ کی ملاقات کو حاضر ہوئے ہیں۔ شہزادی نے اجازت دی۔ یہ دونوں صاحب تشریف لے گئے۔ ٹوپیاں اُتار کر سلام کیا۔ شہزادی نے نازک آوازی کے ساتھ کہا۔ آپ کہاں کے عازم ہیں؛ تو ایرانی روسی زبان میں جواب دینے کو تھا ہی، مگر یہ سوچ کر کہ قلعی کھل جائے گی فوراً زبان روک لی اور روسی سے باتیں ہونے لگیں۔

روسی نے کہا حضور میں وارسا کا پروفیسر علم جیالوجی ہوں۔ مجھے گورنمنٹ نے بھیجا ہے کہ اس پہاڑ پر تحقیقات علمی کروں۔ حضور کے نام بھی سرکاری طور پر خط آتا ہوگا کہ اگر مدد کی ضرورت ہو تو خدام ذوی الاحترام سے مدد دلوایئے گا۔ حضور کی ذرہ نوازی کا ممنون ہوں۔

شہزادی : یہ دوسرے صاحب کہاں کے ہیں۔ ایشیا کے ؟

روسی : حضور یہ میرے ساتھ کھودنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ کوئی افسر نہیں ہیں۔ یہ ایک ذلیل اوقات آدمی ہیں۔ ایران سے بھاگ کر لندن آئے۔ وہاں سے جرمن۔ وہاں اب وارسا میں میرے ساتھ ہو لیے۔

ایرانی اصل میں ایرانی تو تھا ہی نہیں روسی نے اس کے خلاف جو دو ایک جلی کٹی کہیں تو دل ہی دل میں جل گیا۔ مگر بولنے کا موقع تو تھا ہی نہیں۔ بولتے تو شہزادی مٹا کھٹک جاتی کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ شہزادی نے روسی کو اجازت دی کہ کرسی پر بیٹھیں۔ مگر ایرانی بیچارے کو کھڑا ہی رہنا پڑا۔

شہزادی : اب روم و روس میں کیا ہو رہا ہے۔ ؟

روسی : سلاطین یورپ مل کر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

شہزادی: ایک شخص آزاد تھا روم کی طرف سے آیا تھا۔ اس کی تصویر بھی ہمارے پاس ہے۔ پہلے سُنا روسیوں نے گرفتار کر لیا تھا، پھر معلوم ہوا کہ ہندوستان میں داخل ہوا۔

روسی: (تجاہل عارفانہ) آزاد ہم نے تو نام بھی نہیں سُنا آزاد کس ملک کا رہنے والا تھا۔ فارسی زبان میں ایرانی سے تم جانتے ہو؟

ایرانی: میں فقط اس قدر جانتا ہوں کہ حضرت بڑے ذاتِ شریف ہیں۔ کس مزے سے آپ کرسی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

روسی: یہ بھی نہیں جانتے، آزاد کا کچھ پتہ دیجیے۔

شہزادی: مجھے اس وقت سخت حیرت ہے۔ آزاد سے زیادہ مشہور تو اس کل جنگ روم و روس میں کوئی نہ تھا۔

ایرانی: ایک شخص کا ذکر ہم نے سُنا ہے کہ ہندوستان سے آیا تھا اور تلوار کی لڑائی لڑتا تھا۔ اس کی تلوار پر یہ شعر لکھا تھا:

آن نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آن منم کاندر میاں خاک وخون بینی سری

روسی: اخاہ وہ تو نہیں جنھوں نے پلونا کی جنگ میں نام کیا تھا۔ آزاد پاشا کہیے تو ہم سمجھیں۔

ایرانی: آزاد پاشا کو میں خوب جانتا ہوں۔ ایک دن دریا کے کنارے وہ اور ہم بیٹھے پہاڑ کے جوبن لوٹ رہے تھے، اور بادۂ احمر کا دور چل رہا تھا۔ یہ جو مست ہوئے تو جھوم جھوم کر شعر پڑھنے لگے:

میرود خندہ بساماں بہاراں زدۂ — خونِ گل ریختہ و می بگلستاں زدۂ
شورِ سودائے تو نازم کہ بگل می بخشد — چاکے از پردۂ دل سر بگریباں زدۂ
آہ از بزم وصال تو ہر کہ سودا رد — نشتر از ریزہ مینا برگ جاں زدۂ
اندریں تیرہ شب از پردہ بروں تا خدلت — مئے روشن بطرب گاہ حریفاں زدۂ
آہ ازاں نالہ کہ تا شب اثرے بازندۂ — ہم آہنگی مرغان سحر خواں زدۂ

چمن از حسرتیاں اثر جلوۂ تست
گلِ شبنم زدہ باشد لب دنداں زدۂ

روسی اور ایرانی میں کہی بدی تو تھی ہی۔ فوراً روسی زبان میں ترجمہ کر کے شہزادی گل عذار کو سُنایا۔ وہ شہید خنجرِ ناز آزاد کا حال سنتے ہی اس طرح کھل گئی جیسے غنچۂ بادِ نوروزی کے اہتزاز سے ہو جاتا ہے۔ فوراً

کرسی منگا کر ایرانی کو اشارے سے حکم دیا کہ بیٹھو اور یوں ہمکلام ہوئی۔

شہزادی: تم سے کب ملاقات ہوئی تھی۔

ایرانی: مجھ سے ان سے دوستی اِس سبب سے پیدا ہوئی کہ وہ فارسی خوب بولتے ہیں۔ اسی باعث سے باہم اتفاق ہوگیا۔

شہزادی: تم تو روسی زبان بھی اچھی طرح بول سکتے ہو۔

ایرانی: ہاں حضور کچھ کچھ (زبان بگاڑ کے۔)

شہزادی: اب آزاد پاشا کہاں ہیں ؟

ایرانی: ہندوستان میں داخل ہو گئے۔ ٹاپو میں جب وہ گرفتار ہو کر لائے گئے تو میری ہی مدد سے رہائی پائی۔ دو بجے رات کے میں نے ان سے کہا کہ اب موقع ہے وہ مستعد تو تھے ہی، اور رات ایسی اندھیری کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے، اور ایک تمنچہ لا دیا۔ بیڑے بھر میں صرف ایک پہرے والا جاگتا تھا۔ جب وہ ذرا اونگھنے لگا تو آزاد نے اسی کا تمنچہ لے کر سر کیا۔ وہ تو گولی کھا کے دھڑ سے گرا اور گرتے ہی انٹا چت۔ اور اِدھر آزاد گھوڑے پر سوار ہوئے۔ مگر تمنچے کی آواز سے دو چار آدمی جاگ اٹھے! کیا ہے کیا ہے۔ یہ آواز کہاں سے آئی۔ میں نے کہا ابھی سے یہ حال ہے اگر ترک سچ مچ آجائیں گے تو شاید تم لوگوں کے ہاتھ پاؤں ہی پھول جائیں گے۔ وہ لوگ سمجھے یہ دل لگی کرتے ہیں۔ پھر بدستور سو رہے۔ میری آواز پر اُن کو پہرے والے کا دھوکا ہوا۔ سمجھے کہ دل لگی میں اُس نے باد ہوائی فیر داغ دی ہے۔

شہزادی: اور آزاد اب کہاں ہیں۔ روانہ ہو گئے۔؟

ایرانی: عرض کرتا ہوں۔ آزاد نے گھوڑا آہستہ آہستہ بڑھایا اور دریا میں توسنِ بادپیما ڈال دیا۔

شہزادی: (گھبرا کر) حفاظت سے کنارے پہنچ گئے۔

ایرانی: حضور یہ بڑا طویل قصہ ہے۔ اب سنیے کہ اِدھر تو آزاد کا گھوڑا دریا میں آیا، اُدھر آسمان پر اس زور کی گھٹا چھائی کہ اَلاَمان اَلاَمان:

تند و پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد

می کشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

شہزادی: یہ کون زبان ہے جو ہم سمجھتے ہی نہیں۔ اس کا بیان کیا۔

روسی: بس اُن میں یہی تو جنون اور خبط ہے۔

ایرانی: بس حضور میرا تو کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

روسی : بات ہی ایسی تھی۔ دریا کا راستہ اور اندھیری رات۔
ایرانی : اور دریا کا پاٹ میں کیا بیان کروں۔
شہزادی : (آبدیدہ ہو کر) مختصر طور پر کہا۔

شہزادی قمر طلعت اپنے عاشق خورشید جمال کی مصیبت کا حال سُن کر کمال مضطرب و بے قرار ہوئی۔ آنکھیں پُر نم دل صید رنج و غم چاہتی تھی۔ کہ کسی طرح انجام کا حال سنوں کہ آخر کار کیا ہوا۔ مگر بہت ضبط کیا تاہم آنسو نکل ہی پڑے۔ ایرانی نے روسی اور روسی نے ایرانی کی طرف دیکھا۔ اور دل میں دونوں خوش ہوئے کہ جس کام کے لئے آئے تھے وہ انشاء اللہ بہت جلد پورا ہو جائے گا۔ ہمیں کامل یقین ہے۔

ایرانی نے سلسلۂ سخن پھر شروع کیا اور کہا۔ گھوڑا قدم قدم پر بھڑکتا اور جھجکتا تھا مگر یہ ران پڑی جمائے شہسوار کی طرح بیٹھے ہی رہے۔ ان کے دل پر بھی سخت صدمہ تھا۔ مگر قہرِ درویش برجانِ درویش چلتے چلتے ایک دفعہ بجلی چمکی، اور فرسِ تُند خو اور بھی بے قرار ہوا۔ تھوڑی دیر میں برقِ جہندہ نے یہ ستم ڈھایا کہ گھوڑا تڑپ کر ران کے تلے سے نکل گیا، اور آزاد نے غوطہ کھایا۔

یہ فقرہ سُن کر شہزادی کا جسم نازک کانپنے لگا۔ اور دم کے دم میں بیہوش ہو گئی۔ پچاس ساٹھ پیش خدمتیں دوڑ پڑیں۔ لخلخہ سنگھایا۔ صد ہا ترکیبیں کیں، جب ہوش آیا تو شہزادی نے ایرانی کو بلایا اور آہستہ آہستہ یوں پوچھا۔
شہزادی : انجام بخیر ہوا۔
ایرانی : جی ہاں حضور آپ منتشر نہ ہوں۔
شہزادی : ہائے تم کیا جانو، میں اس جوان سہی قد پر جان دیتی ہوں جس دن مجھ سے جدا ہوا ہے۔ مجھ سے زیادہ بے قرار تھا:

چھوڑ کر مجکو تڑپتا وہ سدھارا گھر کو
حال میرا مرے بے رحم سے دیکھا نہ گیا

خیر ہر چہ باد آباد۔ ہاں انجام کیا ہوا۔ اسوقت دل رنج و الم کا نشانہ ہو گیا، جو شے نظر آتی ہے تیرہ و تار:

یہ داغ ہے خورشید لبِ بام نہیں ہے	خونباری عاشق شفق شام نہیں ہے
جب تک نہ جلوں جان کو آرام نہیں ہے	پروانہ ہوں جلنے کے سوا کام نہیں ہے
ہر فصل میں بس داغ محبت کا مزا ہے	اس نخل کا میوہ تو کبھی خام نہیں ہے
وہ بلبلِ نالاں ہیں کہ نالوں سے ہمارے	کس دن چمن دہر میں کہرام نہیں ہے
اللہ رے اس ترکِ پری رو کی محبت	کچھ جان کا ہوش اے دلِ ناکام نہیں ہے

ایرانی: پھر وہ دریا باہر آئے بیہوش ہو گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ دریا پاؤں چوم رہا ہے، اور وہ فرس گلگوں نژاد ہوا نہاد سر بالیں کھڑا ہے۔

شہزادی: بڑا اصیل گھوڑا ہے

ایرانی: اس میں کیا فرق ہے۔ کچھ دیر بعد گھوڑے کو چکارا، سوار ہوئے۔ مگر مثل۔ الغرض۔ خدا خدا کر کے اس مصیبت سے نجات ملی۔

شہزادی: میں چاہتی ہوں کہ تم عمر بھر یہیں رہو۔

ایرانی: میں تو خانہ بدوش آدمی ہوں۔

شہزادی: تم نے ہمارے آزاد کے ساتھ بڑا اسلوک کیا، اِس احسان کا شکریہ بھلا کون ادا کر سکتا ہے۔ اُن کے ساتھ دو دو شیزہ بھی ہیں، اور اُن دونوں کے سبب سے آزاد بآسانی و خیریت جان بچا کر جا سکے۔ مجھ سے تو پہلے شادی ہی سے انکار کیا تھا۔ حسن آرا کوئی ہیں، اُن سے وعدہ کر کے آئے تھے اور اتنی تعریفیں کیا کرتے تھے کہ کوئی سمجھے دنیا میں بس اِس سے زیادہ کوئی حسینہ ہی نہیں۔ مجھے اپنے حسنِ صبیح پر ناز۔ ایک دن میں نے بھی جھلا کے کہا کہ یہ تعریفیں کسی ایسی ویسی کو سناؤ۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ دنیا کے پردے پر مجھ سے زیادہ حسین کوئی ہے ہی نہیں اور تم حسن آرا کے حسن کو سب پر فوق دے دیتے ہو؛

دلِ حزیں کرۂ خاک کا جواب ہوا
تری گلی سے یہ گرد ملال لے کے چلے

مگر سوچتی ہوں کہ کجا ہندوستان کجا روس کا یہ حصہ کجا زمین۔ کجا آسمان۔ اب آزاد یہاں کیا کرنے آئیں گے اور میں جاؤں کیوں کر جاؤں۔ شاید کبھی ایسا زمانہ آئے کہ آزاد سے ہمکنار ہوں۔

نکل جائے گی سب کجی آسمان کی
کبھی تو پھرے گا زمانہ ہمارا

دل کے دینے میں سینکڑوں بکھیڑے ہیں، جہاں کسی بُتِ سفاک پر دل آیا، بس عشق نے ستم ڈھایا۔ غضب کا سامنا ہوتا ہے؛

دیدِ گیسوئے بتاں میں خطر سودا ہے
اور کچھ سوانگ نہ اے دل یہ تماشا لائے

اِس وقت جو کچھ میرے دل پر گذرتی ہے میں جانتی ہوں یا میرا دل جانتا ہے؛ ہائے اِس صورت اور اِس شکل کا جوان کہاں پاؤں گی۔

اس پر ایک بوڑھی خادمہ بولی۔ حضور آپ کی بات کی تردید کرنا تو داخل بے ادبی ہے۔ مگر اس شخص کا ذکر ہی کیا جو چھوڑ کر چل دیا۔ وہ تو مس کلیرسا اور مس میڈا کے پھیر میں تھے، اور حضور اُن کی جدائی میں آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں، شہزادی مہرِ طلعت نے کہا:

یا تنگ نہ کر ناصح نادان مجھے اتنا

یا لاکے دکھا دے، دہن ایسا کمر ایسی

ایرانی : کلیرسا نے کیا مدد آزاد کو دی۔

شہزادی : کلیرسا ہی تو یہاں سے نکال لے گئی۔ ورنہ روسی زبان بولنا آزاد کیا جانیں۔ مجھ سے تو فرانسیسی میں بات چیت ہوتی تھی۔ استنبول سے اس کلیرسا نے ایک خط میرے نام بھیجا تھا اگر پڑھو تو منگواؤ۔

ایرانی : (بے غرضی کے ساتھ) اچھا منگوا لیجئے۔

خادمہ : (خط دے کر) حضور بہت پوشیدہ خط ہے۔

ایرانی نے خط پڑھا تو نفسِ مطلب یہ تھا۔

میری سب سے زیادہ معزز اور پیاری شہزادی۔

تمہارا عاشقِ زار دگل عذار شجاعت کا نہنگ بحرِ آشام، آزاد نکو نام، بڑی بڑی سختیوں اور مصیبتوں کے بعد خدا خدا کر کے استنبول داخل ہوا! راہ میں میرے سبب سے جان بچی، ورنہ روسی زبان میں جواب دیتے نہیں، اور مار ڈالے جاتے۔ آزاد دن رات تمہاری جدائی میں گریہ وزاری کیا کرتے ہیں۔ پرسوں روانہ ہندوستان ہوں گے۔

یہاں کے اخباروں میں آپ کی نسبت مختلف روایتیں مشہور ہوئی ہیں، جن کے سننے اور پڑھنے سے آزاد کا دل بھر آیا، اور دو تین بار دھاڑیں مار مار کر روئے۔ آپ ان دونوں میں کسی پر ہرگز بھروسا نہ کیجئے گا اور بہت سمجھ بوجھ کر چلیے گا۔ نہایت نازک معاملہ ہو گیا ہے۔ میری بھی بڑی تلاش ہے۔

مس کلیرسا۔

ایرانی نے غور و تعمق سے خط پڑھا اور رخصت ہوا۔ جب روسی اور ایرانی ملے تو دونوں نے بڑی خوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس درجہ محظوظ ہوئے کہ خوب زور سے قہقہہ لگایا۔

روسی : کہو کیا کارگذاری کی۔ ہے معاملہ چوکس۔

ایرانی : یار لوگ کہیں چوکنے والے ہیں۔

روسی : میں تو اس وقت بڑی دور نکل گیا تھا۔ ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کامل ثبوت موجود ہے۔

ایرانی : کلیرسا کا خط پڑھ کر آتا ہوں اس وقت۔

روسی : مس کلیرسا، مس کلیرسا کا خط ؟

ایرانی : ہاں ہاں۔ مس کلیرسا کا خط یہ لیجئے۔

روسی : (خط پڑھ کر) افوہ اس چھوکری نے فرقۂ نہلسٹ کے بھی کان کاٹے۔ سخت حیرت ہے کہ روسی لیڈیاں اس قدر بے باک ہوتی جاتی ہیں اور کوئی ذرا ٹوک نہیں کرتا اِس کام کا انجام بہت خراب ہوگا۔

ایرانی : بس اب اِس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ دوشیزہ میں شریف زادیاں، اور اسٹیشن تک دوڑی آئیں، کہ ٹرکی قیدی جو رہا ہو کے اپنے وطن جاتے ہیں۔ اُن کے ساتھ جائیں بڑے شرم کی بات ہے۔

روسی : ابھی کل کی بات ہے کہ مس کلیرسا کی سارے روس میں دھوم مچی تھی۔ کہ واہ ری خاتون، عالی ہمت اس ذراسی لڑکی نے اچھے اچھے مردوں اور جنرلوں کے کان کاٹے عین معرکۂ رستخیز میں فرسِ عُقابِ طلعت پر سوار ہوکر موروچوں پر جاتی، اور اس آن بان کے ساتھ غنیم سے مقابلہ کرتی ہے ایسی پری رشکِ قمر نازک اندام اور یہ ہمت مردانہ۔ آج سنتے ہیں کہ مس کلیرسا کو آزاد پاشا بھگالے گئے۔ اے لعنتِ خدا۔ توبہ توبہ۔ کیا روس میں آزاد سا جوانِ رعنا و گلفام نہیں ملتا تھا۔

ایرانی : اب زیادہ انتظار اچھا نہیں سب کو بلوالو۔

ایرانی : ہاں بس ایک ذرا سا اشارہ کافی ہے۔

روسی : ہم جانتے ہیں، بہتر ہے کہ سویرے منھ اندھیرے پہاڑ گھیر لیا جائے۔ شہزادی کے پاس بھی کسی قدر فوج ہے۔ اور یہ ٹُرا۔

ایرانی : لاحول ولا قوۃ وہ فوج کاہے میں ہے۔

اسی دم ان دونوں آزمودہ کار روسی افسروں نے اس فوج کے جنرل کے نام خط بھیجا جو اس کہسار کے دامن پُر بہار سے آدھ کوس پر ایک کمین گاہ میں خیمہ زن تھی اور خود آرام کیا۔

اب اِدھر کا حال سنیے کہ شہزادی عالی جاہ کج کلاہ تمام شب بیقرار و مضطر رہی۔ دم بھر چین نہیں۔ پیش خدمتیں خواصیں سب مضطرب کہ سرکار کی طبیعت آج نصیبِ اعدا دائرۂ اعتدال سے متجاوز اور جدائی میں انتہا سے زیادہ رنجور و بدحواس ہیں۔ وہ بانوے قوس ابرو کبھی کروٹیں بدلتی تھیں۔ کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرتی تھی اور بصد حسرت دیاس ایک ایک سے پوچھتی تھی کہ میں آزاد کو کہاں پاؤں کدھر ڈھونڈھنے جاؤں۔

ڈھونڈھنے اس گلِ رعنا کو کہاں جاؤں میں   آؤ اب اپنا گلا کاٹ کے مرجاؤں میں

وہ تو گزرا نہ ادھر جی سے گزر جاؤں میں — عشق بازی میں بھلا نام تو کر جاؤں میں

شمع دگل گور پہ شاید وہ چڑھانے آئے

پیٹنے رونے جنازے کو اٹھانے آئے

جوش جنوں میں کبھی سر دے دے پٹکتی تھی کبھی دل کو تھام کر اٹھتی تھی اور پھر حسرت کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی لب خشک، چشم پرنم، تپ ہجر کا بھڑکنا اور کلیجے کا ہاتھوں اچھلنا، ستم ڈھاتا تھا۔ تھوڑی دیر ضبط کیا، تو دس منٹ کے بعد پچھاڑیں کھائیں۔ صبر و شکر اب منزلوں دور تھا۔ ے

جان کا دھیان نہ اصلا قلق رسوائی — وحشتِ دل نے بنایا تھا انھیں سودائی

حد سے یاں تک متجاوز ہوئی بے پروائی — کوئی سمجھائے نہیں خاک وہاں شنوائی

سرکار جو شدنی تھا وہ ہوا۔ اب حضور دشمنوں کا برا حال کیوں کرتی ہیں، اگر آزاد سچے ہیں تو آئیں، اور بیچ کھیت۔ اور اگر سچے نہیں ہیں تو ایسے آدمی سے دل لگانا ہی فضول ہے۔ اپنا تو یہ قول ہے سرکار۔

شہزادی: ہمیں کسی کی نصیحت اس وقت پسند نہیں آتی۔

خادمہ: حضور ذرا نیند کا دھیان کیجئے۔

شہزادی: توبہ۔ توبہ۔ کس کی نیند، یہاں کلیجے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ آنسو ہیں کہ امڈے آتے ہیں۔ دل قابو میں نہیں۔ نیند کیسی۔

خادمہ: ہاں ہاں اس میں کیا فرق ہے، مگر ڈھارس دیجئے۔

شہزادی: اب بے آزاد کے دیکھے ڈھارس ہونا معلوم۔

خادمہ: کیسی خوش رہتی تھیں۔ اس افتاد کا حال کیا معلوم تھا۔

شہزادی: کون جانتا تھا کہ تقدیر پلٹے کھائے گی۔

خادمہ: رنج سا رنج ہے۔ الٰہی توبہ۔ مگر اس کا علاج کیا۔

شہزادی: اس کا علاج بہت سہل ہے۔ چٹکیوں میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔ پھر تم سب سر پیٹتی ہوئی روؤ گی۔ اور ہمیں یاد کرو گی۔ دیواروں سے سر ٹکراؤ گی، اور سارے زمانے میں شہرہ ہوگا کہ ے

جان پر کھیل گئی چاہ نے مارا ہے آہ

طیش میں کھا موئی کچھ رات کو انا للہ

خادمہ: اے حضور آپ یہ کیا زبان سے نکالتی ہیں۔

دوسری: اُف ہمارے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

تیسری : ڈاکٹر صاحب کو بلواؤ ایسا نہ ہو دماغ کی طرف ابخرے صعود کریں۔ اب حضور کے کہنے سننے میں نہ جاؤ ڈاکٹر کو آدمی بھیج دو۔

ایک طبیب حاذق جو خاص شہزادی کی سرکار عظمت آثار میں نوکر تھے بلوائے گئے مگر کوئی عارضہ ہو تو سمجھ میں آئے۔

ڈاکٹر: ہمارے نزدیک دل پر کوئی صدمہ پہنچا ہے۔

خادمہ: حضور میں سب عرض کروں گی۔

دوسری: بات ساری یہ ہے کہ آج کسی مسافر کا خیال آگیا ہے۔ بس تب سے بیساختہ رو رہی ہیں، اور ذرا دم بھر بھی چین نہیں آتا۔

ڈاکٹر: اخاہ یہ سبب ہے۔ اب تو جہاں تک ممکن ہو اس امر کا خیال ہی نہ کیجئے گویا ایک بات ہوئی ہی نہیں۔

شہزادی: آپ بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ اول تو آزاد کی ایک ایک ادا پر ہزار جان سے عاشق ہوں۔ اس کی جدائی میں دل کہاں تک نہ کڑھے، بھلا ممکن ہے یہ اس کو بھی جانے دو۔ میرے سن وسال اور حسن و جمال پر نظر ڈالو۔ یہ عنفوانِ شباب۔ بھلا سردی کی راتیں، تنہائی میں کیوں کر کاٹوں۔ اب اگر آزاد کے ساتھ شادی نہ ہوئی ہوتی تو خیر کسی اور کی تلاش کرتی۔ اب تو بجز اس کے کہ دن رات اسی غم میں گھلوں اور کیا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر یہ گرما گرم فقرے سن کر خاموش ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ کہا میں نیند کی دوا ابھی تیار کر کے بھیجے دیتا ہوں۔ اس دوا کے استعمال سے آنکھ لگ گئی۔ اب کوئی گھڑی بھر رات باقی تھی۔ یہ بانوے مہ لقا خوب ناز میں تھی اور اُدھر مخالف اپنی گھات میں تھے۔ ہنوز سپیدۂ طلعت نشانِ صبح، پیدا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ روسی اور ایرانی۔ یعنی وہی دونوں روسی جاسوس فوج کے استقبال اور صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے کے لئے کہسار سے چلے۔

اثنائے راہ میں فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ کرنل نے ہاتھ ملایا، اور ایک درخت کے پاس لے جا کر ان دونوں سے نج کے طور پر گفتگو کی۔

کرنل : تمام عالم کے اخبار روسیوں کی بے حمیتی کے شاکی ہیں۔ اور بڑے زور شور اور شد و مد سے لکھتے ہیں کہ روس کی لیڈیوں کی بیباکی، اور مطلق العنانی اگر ایسی ہی رہی تو روسیوں کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔

روسی : مس کلیر سا ہی کے تو یہ سب کانٹے بوئے ہیں۔

کرنل : یہ تو سارے عالم میں مشہور ہے مگر ثبوت بھی بہم پہونچا ہے۔ شہزادی کا کیا حال ہے۔ سنا نہایت زہرہ جبیں، مہ طلعت عورت ہے۔

ایرانی : دیکھنے سے بھوک پیاس بند ہو جائے، اور آپ دیکھ لیجئے گا۔ ممکن نہیں کہ اس کا بال بیکا ہو۔ عجب حسن دلآویز ہے:

جمالِ جہانگیر میں بے عدیل	نہایت حسین اور بغایت جمیل
قدِ ناز کا سرو طوبیٰ غلام	نسیمِ چمن پائمالِ خرام
وہ گیسوئے مشکیں و مشکیں کمند	جمالِ مبیں میں بری سے دوچند
لبِ لعل حلوائے قوتِ رواں	دمِ خندہ گلہائے رنگیں فشاں
وہ دستِ حنائی چو برگِ چنار	کفِ دست گُلِ لالۂ تر نثار
وہ چہرہ بہاریں ہے یا آتشیں	وہ خالِ اسپ مشکین ہے عنبریں
وہ لوحِ شکم صبحِ امید ہے	نہیں ناف وہ قرصِ خورشید ہے
وہ انداز و غمزہ وہ ناز و ادا	وہ رمز و کرشمہ بلا در بلا

وہ پنجہ کہ ہو جس سے خونِ بہار
کیا اُس نے مرجان کا پنجہ فگار

کرنل : میں دیکھتا ہوں کہ اُس نے تم کو بھی گھائل کر دیا۔

ایرانی : وہ ایسی ہی نازک نگاہ ہے۔

کرنل : (روسی سے)، کیا حضور بھی کشتۂ ناز ہیں۔

روسی : اور کیا آپ بچ جائیں گے۔ خیر۔

کپتان : میں نے اُس خوبروئے نوخاستہ کی تصویر دیکھی ہے۔ دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ واللہ اس قابل ہے کہ ہر دم اُس بت کا سجدہ کرے۔ کوئی چار مہینے ہوئے جب میں نے تصویر دیکھی تھی ——— دیکھتے ہی:

اسیر دوز بخیر گیسو ہوا	قتیل دو شیر ابرو ہوا
اُٹھا عشق کا مار مست شکار	کیا صید آرام و صبر و قرار
مٹا عیش و راحت اُٹھا رنج و درد	ہوا دیدہ خونبار و رخسار زرد
کیا چشمِ فتان نے ایسا فسوں	ہوا دیکھتے ہی میں مست جنون
جگر خون و دل زخمی و سینہ چاک	نفس شعلہ افشان و جاں سوزناک
دل و دیدہ و فکر و وہم و گماں	بنے سب خیالِ صنم کے مکاں

ہوا خسرو عشق جب جنگ کوش   ہزیمت گزیں ہو گیا شاہ ہوش

ہوا ورطۂ بحرِ غم میں غریق

ہوا آتش سوز دل میں حریق

کرنل : ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے سب پر جادو کر دیا ہے۔

ایرانی : مگر آزاد کا نام لیا اور اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

کپتان : پھر آزاد ہے بھی تو ایسا ہی خوب صورت جوان۔

کرنل : ہزار دو ہزار میں فرد۔ شیر دل، شیر مرد۔

ایرانی : میں کچھ بیان نہیں کر سکتا کہ کس قدر نازک اندام اور رنگین ادا ہے۔ خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ رخِ انور کی جھلک سے نظر خیرہ ہوتی تھی۔ اللہ رے، اور اُف رے حسن خدا آفریں:

ع   بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اب سنیے کہ اس گفتگو کے بعد فوج کے آدمی روانہ ہوئے۔ اور ایک سو پچاس سواروں نے اس صنم عشوہ گر نازک کمر، کا دیوان سپہر توامان چاروں طرف سے محصور کر لیا۔ خدام شہزادی نے جو یہ حال دیکھا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر اللہ رے رُعب اتنی کسی میں جرأت نہ تھی کہ اپنی خاتون بلقیسِ منزلت کو خوابِ ناز سے بیدار کریں۔ کرنل نے اپنا اشہبِ آہو شکار بڑھایا، اور ایک سپاہی سے جو پہرا دے رہا تھا کہا شہزادی کو اطلاع دو کہ روس کے سواروں نے گھیر لیا ہے۔ سپاہی نے کہا میں ابھی ابھی خبر کیے دیتا ہوں تمیں چار پیش خدمتیں جو سراسیمگی کے ساتھ باہر دوڑی آئی تھیں۔ یہ خبر سُن کر اور بھی زیادہ سراسیمہ، و مضطرب حال ہو گئیں۔ کرنل نے اُن کی طرف مخاطب ہو کر فوجی افسران کی طرح غرور کے ساتھ ڈپٹ کے حکم دیا رکیا کھڑی دیکھتی ہو۔ جا کے ابھی اطلاع کرو، اُن میں کٹو نامے ایک نوخیز پیش خدمت نے بانکی ادا سے تنک کر کہا۔ کیا یہ دھکیاں کسی ایسی ویسیوں کو دو، جا کے۔ ہم اُن کے نوکر ہیں۔ جن کے باپ کے دربار میں تم ایسوں کی اطلاع نہیں ہوتی تھی۔

کرنل : کیا! ہم سرکاری افسر فوجی ہیں۔

کٹو : ہوا کرو حضور آرام میں ہیں۔

کرنل : کیا جگا نہیں سکتی ہو۔

کٹو : آپ اس وقت ہیں کہاں۔ اتنا نہیں جانتے کہ کس کے دربار میں آئے ہو۔ یہ بادشاہ کی لڑکی ہیں۔ تم ایسے ہزاروں یہاں ٹھوکریں کھایا کرتے ہیں۔

کرنل : دیکھو ٹکے کی تمہاری اوقات اور۔

سپاہی : (پہرے والا) یہاں غل نہ مچاؤ۔ سرکار آرام میں ہیں۔

اس فقرے پر کرنل کے ساتھیوں کو بے اختیار ہنسی آئی۔ کہ اتنے بڑے عہدہ دار فوجی اور اس طرح ڈپٹے جاتے ہیں۔ پیش خدمت نے للکارا۔ کہ تم ایسے یہاں پھٹکنے نہیں پاتے۔ حضور آرام میں ہیں۔ سپاہی نے ڈانٹ بتائی کہ غل نہ مچاؤ سرکار کی نیند میں خلل آئے گا۔

کرنل نے چاہا کہ پہرے والے کو سزا دے مگر کپتان اور ایرانی نے سمجھایا۔ کہ گو اب مثل قیدی کے ہوں مگر پھر بھی شہزادی ہے۔ بادشاہ کی اولاد، اب کرنا کیا چاہیے۔ اور یوں تو تمہارے پاس اتنے آدمی ہیں چاہے مکان کھود کر پھینک دو۔ کس نمی پرسد۔

کرنل : اللہ رے رُعبِ حسن۔ واللہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس بے ادب پہرے والے کو کھود کر دفن کر دو۔ جو صلاح دیتا ہے یہی صلاح دیتا ہے کہ جانے ہی دو۔ شہزادی ہے۔ حُسن اِسے کہتے ہیں۔

ایرانی : ابھی تو آپ نے شہرہ ہی سُنا ہے دیکھا کہاں ہے۔

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

جب اُس مُرخِ تاباں پر نظر پڑے تب دیکھیے گا ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہیں گے۔

وہ عروسِ طاؤس زیب گھڑی بھر رات رہے، دوا کے زور سے سوئی تھی۔ تمام شب کی بے قراری۔ گریہ وزاری، اختر شماری، آہ سردِ دلِ پُر درد، چشم گریاں، و سینہ بریاں، انتہا کی مصیبت و پریشانی میں رات کٹی تھی، اب نیند جو آئی تو گویا گھوڑے بیچ کر سوئیں۔ اور گو کل محل معلّٰی کو سپاہ نے محصور کر لیا تھا۔ تاہم کسی پیش خدمت یا لازم یا اہل کار کو اس قدر جرأت نہ تھی کہ جگانے کی کوشش کرتا۔ کوئی سات بجے کے بعد آنکھ کھلی مگر کروٹ بدل کر پھر سو رہی۔ آپس میں پیش خدمتیں باتیں کرنے لگیں کہ یا الٰہی یہ ہونا کیا ہے، جو شہزادی اس ناز و نعم سے پالی گئی ہو اور جو اس دل و دماغ کی ہو وہ قید کی سختی کیونکر برداشت کرے گی۔ خدا جانے کیا حکم ہو۔ یہاں یہ مثل بادشاہوں کے حکومت کرتی تھیں۔ آج تک تو شہزادی پن کی بُو دماغ سے نہیں گئی۔ اب یہ کیا ہو گا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

۱۔ یہ آخرش ماجرا کیا ہے۔ قصور بھی تو معلوم ہو؟

۲۔ قصور صاف ہے۔ وہی آزاد کا جھگڑا ہے۔

۳۔ اے ہے تو اب کیا امید ہے۔ ہائے ہائے۔

۴۔ ہمارا تو دل گواہی دیتا ہے کہ کچھ بھی نہ ہو گا۔

۵۔ اُن کا رُعب دیکھ لینا سب پر چھا جائے گا۔

۶۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ مس کلیرسا کا نام انتہا سے زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اگر آزاد اور مس کلیرسا اور حضور سب گرفتار ہوتے تو اور بات تھی، مگر اس میں تو یہ خرابی ہے کہ، وہ دونوں تو بچ نکلے باقی رہیں یہ۔ سب کی خفگی انھیں پر اُتاری جائے گی۔

۷۔ اب خدا مالک ہے۔ حضور کو اب اطلاع کردو۔

اتنے میں شہزادی قمر طلعت از خود خوابِ ناز سے بیدار ہوئی۔ طشت زمردیں میں پیش خدمتیں عرق گلاب بصرہ لائیں۔ جس کی بو باس سے تمام محل معطر ہو گیا اس گل بدن نے منہ دھویا۔ لباس گراں بہا زیب بدن کیا۔

اتنے میں ایک خواص نے بڑھ کر دست بستہ عرض کیا۔ سرکار بڑا غضب ہو گیا۔ اب اللہ کے ہاتھ عزت ہے۔ بس وہی عزت کا بچانے والا ہے۔

شہزادی: (متحیر ہو کر) ہم سمجھے نہیں کیا ہوا۔

خواص: حضور چوطرفہ سے محل گھرا ہوا ہے۔

شہزادی: کیا! گھرا ہوا ہے؟

خادمہ: اور دو چار افسر فوجی سامنے گھوڑوں پر سوار کھڑے ہیں۔ پہلے تو ڈانٹ ڈپٹ بتائی کہ اطلاع دو، اور چنیں و چناں مگر اب خاموش ہیں۔

شہزادی (کمال استقلال کے ساتھ۔

ع

اینہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

یہ مصیبت بھی جھیلوں گی۔

خادمہ: حضور اب کیا کیا جائے گا؟

شہزادی: کچھ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔

اس مہوش ذریں کمر نے دروازوں کے شیشوں کی راہ سے دیکھا تو سواروں کی وردیاں چمکتی نظر آئیں۔ اِدھر اُن کے کرنیل اور کپتان، اور روسی اور ایرانی پر نگاہ پڑی تو کفِ افسوس ملنے لگی، کہ ہائے بڑا دھوکا ہوا۔ یہ دونوں جاسوس بن کر آئے تھے۔ میں نے ان سے کچا چٹھا کہہ دیا۔

اتنے میں کرنیل نے پیغام بھیجا کہ اب خوابِ ناز سے بیدار ہوئیں یا نہیں۔ شہزادی نے کہا کہہ دو خاموش رہیں۔

خواص نے باہر جا کر کہا۔ بیدار تو ہوئیں مگر حکم دیا ہے کہ کہہ دو خاموش رہیں۔ دوسری خواص کو حکم ہوا کہ کہو ایک آدمی آئے اور جو کچھ عرض کرنا ہو عرض کرے۔

کرنل گھوڑے سے اُترے، اور محل معلی میں آئے تو آنکھیں کھل گئیں۔

کرنل : (خواص سے) یہ تو بادشاہوں کے بھی ٹھاٹھ نہیں ہوتے۔

خواص : اور بادشاہ ہوتے کیسے ہیں۔

کرنل : جس طرف نظر جاتی ہے نور کا عالم ہے:

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

آگے بڑھے تو دیکھا کہ شہزادی جادو جمال مہ لقا زہرہ مثال شیریں ادا، بصد ناز برنائی واندازِ رعنائی متمکن ہے:

وہ چہرہ کہ دل جس پہ پروانہ ہو — وہ جلوہ کہ دانا بھی دیوانہ ہو
ملک دیکھ کر اس کو حیران ہو — بشر اس کی صورت پہ قربان ہو
غضب کا کرشمہ بلا کی ادا — وہ عشوہ ستم اور وہ غمزہ بلا
بجا صبر و دانش کہاں یہ محال — رہے دیکھ کر اس کا حسن و جمال

یہ جادو ہی یا شوخی و دلبری
یہ فتنہ ہے یا اس کی جلوہ گری

شہزادی نے آنکھ اٹھا کر نظر ڈالی تو کرنل کی آنکھ جھپک گئی۔

شہزادی: مطلب بیان کرو۔

خواص : مطلب کہو مگر اختصار کے ساتھ۔ حضور کی طبیعت نصیب اعدا ناساز ہے۔

کرنل : (کانپتے ہوئے) بندگی۔ بیچارگی۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ اور اگر ہیں۔ نصیب میرے۔

شہزادی: کیا یہ ہے کون۔ کوئی دیوانہ ہے کون۔

کرنل : حضور حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔

خواص : ایں! اے ہوش کی دوا کر مردِ دے۔

کرنل : مجھے یہاں آن کر افسوس ہوا کہ میں کیوں آیا۔

خادمہ: تم سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ خبردار زیادہ گوئی سے یہاں کام نہ لینا۔ مطلب سے مطلب رکھنا اور تم نے بک بک لگائی ہے۔

شہزادی: اس کے دماغ میں خلل ضرور ہے۔

کرنل: مجھے صیغۂ جنگ سے حکم ہوا ہے۔ لہٰذا حاضر ہوا۔
شہزادی: کس امر کا حکم ہوا ہے۔ اس سے دریافت کرو۔
خادمہ: اے حضور کس سے دریافت کریں۔ کوئی آدمی ہو تو اس سے دریافت کریں۔ یہ تو وحشی ہے۔ سوا دیوانہ۔
کرنل: دیوانہ تو نہیں تھا مگر ہاں اب تو ضرور دیوانہ ہوں۔

دیوانہ اک پری کی نہ رکھتی ہوا مجھے
زنداں سے تنگ تر ہے وحشت سرا مجھے

شہزادی: ہاں کیا حکم دیا ہے۔
کرنل: حکم ہے کہ اس قلعے کو محصور کر کے رپورٹ کروں کہ مس کلیرسا اور حضور کی سازش سے آزاد کیوں کر بھاگ گئے۔
شہزادی: اچھا بس۔ رخصت، جو حکم تمہارے نام ہے اس کی تعمیل کرو۔
کرنل: حضور قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس وقت دل کی کچھ عجیب حالت ہے۔ آزاد کے ساتھ اب مجھے آپ سے زیادہ ہمدردی ہے۔ بڑا جری اور شجاع آدمی ہے۔

بلا سپر سینۂ و شیر چنگ ہوئے آ کے میداں میں جب گوم جنگ
اٹھایا جو گرز گراں منگ کو کیا ریزہ ریزہ صفِ جنگ کو
اٹھا اژدہائے کمندِ رسا
ہوئے صید شیرانِ دشتِ دغا

لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ دل بادل ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے، مگر آزاد کو سب میں فرد پایا یہ کسی سے دب کر نہ رہا:

کہیں مثل اسفندیار جوان! نہ خاک و خوں اژدہائے دہان
دکھائے عجب پہلوانی کے جوش اُڑے دیکھ کر پہلوانوں کے ہوش
بیان کیا کروں جرأت آزاد کی کہ ہمت دلیروں کی برباد کی
چلائی جو شمشیر گردن فشاں
کیا پارہ پارہ تنِ پُردلاں

کرنل نے اس ناظورہ حسین کے خوش کرنے کے لیے آزاد پاشا کی تعریف کے پل باندھ دیے۔ شہزادی آفتاب جبیں بکمال شوق کرنل کی باتیں سنا کی۔ آخر میں کہا بیشک آزاد ایسا ہی شیر مرد ہے۔ وہ نام کیا کہ ساری

دنیا میں مشہور ہو گیا۔

کرنل: حضور اب آرام سے رہیں اور مجھے خادم سمجھیں۔

شہزادی: تم سب کتنے آدمی ہو۔

کرنل: ہم سب ملا کے دو سو آدمی ہیں۔

شہزادی: دو سو آدمی ہیں۔ افسر کتنے ہیں۔

کرنل: بیس۔ بہت عجلت کے ساتھ ہم لوگ بھیجے گئے ہیں۔

شہزادی: (خواص سے) اوٹن کو بلا کے حکم دو کہ سب کے لیے کھانے کا بندوبست کر دیں۔ ہر روز کے واسطے ٹھیک وقت پر شاہی باورچی خانہ سے کھانا جایا کرے۔

کرنل: حضور تو وہ فکر کرتی ہیں کہ ہم لوگوں کی جان ہی پر بن آئے۔ اور ہم کسی امر میں حضور کے حکم کی تعمیل کے خلاف نہیں ہیں۔

شہزادی: آزاد کا کیا حال سُنا۔ ہندوستان پہونچے؟

کرنل: حضور مس کلیرسا اور مس میڈا کو ہمراہ لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کی بڑی قدر و منزلت کی گئی، اور کیوں نہ قدر ہوتی، ہر دل عزیز آدمی ہے۔ دنیا کا کوئی فن ایسا نہیں جس میں وہ طاق نہ ہو۔

تمامی کمالات میں طاق ہے　　　　بہت پر دل و چابک و چاق ہے

فن شاعری میں طبق اللسان

امارت پناہ و شرافت نشان

شہزادی: اچھا اب آپ اپنا بندوبست کیجئے۔

کرنل صاحب رخصت ہو کر باہر آئے۔ کل محل اور اس کے ارد گرد مکانوں کو دیکھا جا بجا پہرے تعینات کیے، اور خیمے میں تشریف لے گئے۔ کپتان اور ایرانی اور روسی سب نے مل کر کرنل سے کھود کھود کر پوچھا کہ کیا باتیں ہوئیں۔ کہا حضرت ہم اپنے فرائض منصبی کو نہیں ادا کر سکتے۔ اللہ رے جمال حسن اس کا نام ہے۔ آزاد بڑا خوش نصیب آدمی ہے۔ کہ ایسے خاتون پری وش اس پر دل و جان سے عاشق ہو گئی۔

خواصیں، پیش خدمتیں، کنیزانِ خانہ زاد، خدام باادب جو بیشتر فوج کی آمد سے اور کہسار کے محصور ہونے سے غنچے کی طرح گرد اقتباس میں تھے۔ کرنل کی اطاعت و فرماں برداری اور خادمانہ تقریر سے باغ باغ ہو گئے۔ دو گھنٹے میں محل معلی اور ارد گرد کی عمارات عالی شان، اور پہاڑ کے وہ حصے جنہیں شہزادی ثریا جاہ

فلک بارگاہ کے موصل رہتے تھے، روسی فوج کے پہرے سے محفوظ کیے گیے۔ اور سوار مختلف مقاموں پر خیمہ زن ہوئے۔ دوسرے روز باہم افسروں نے مشورہ کیا۔ گو کل افسرانِ فوج اس مہ طلعت ملائک فریب کی نادکِ نگاہ کے گھائل تھے مگر مجلسِ شوریٰ میں آخری رائے یہی قرار پائی کہ شہزادی کی نسبت صاف صاف امور سے صیغۂ جنگ کو اطلاع دینی چاہیئے۔ لیکن ان لوگوں نے اس قدر البتہ کوشش کی کہ شہزادی کے ساتھ اور بے گناہ خاتونوں اور عورتوں کو بھی مجرم قرار دیا۔ سہ پہر کو حسب ضابطہ تحقیقات کی تو شہزادی نے کمال بانکپن اور غرور کے ساتھ یہ اظہار لکھوائی - کچھ دن کا عرصہ ہوا کہ ایک جوان خوبرو، کمسن، تربیت یافتہ، خورشید لقا، شیر دل، اس طرف گزرا۔ مجھ سے چار آنکھیں ہوئیں تو سخت متحیر ہوئی کہ یا خدا یہ کس ملک کا رہنے والا ہے۔ رخسارِ تاباں کی رعنائی نے یورپین کے حسن و جمال کو تازہ کر دیا۔ وہ رُخسار گلاب کے پھول سے زیادہ شاداب تھے۔ آنکھیں اس طرح کی جادو بھری کہ دیکھتے ہی انسان قتل ہو جائے

نہ جوہرست کہ شمشیر را در آغوش ست
زہیبتِ نگہش تیغ ہم زرہ پوش ست

سر اور مونچھ کے بال شب رنگ۔ سبزہ آغاز، جوانِ طناز۔ وضع کچھ انگریزی کچھ ترکی۔ میں نے خادموں کو اشارہ کیا کہ اس کو میرے روبرو حاضر کرو، چنانچہ بمجرد استماع حکم کی تعمیل کی گئی۔ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ چہرے سے ریاست اور ایک قسم کا غرور برستا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ آزاد پاشا ملکِ روس کا جانی دشمن یہی شخص ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا تو باوصف عشق میں گرفتار کر کے گورنمنٹ میں پیش کر دیتی۔ اس سے جو میں نے اس کا حال پوچھا تو اس نے کچھ اور ہی بیان کیا۔ میں سمجھی فرانسیسی ہے۔ فرانسیسی زبان ایسی اچھی بولتا ہے کہ خاص زباندان معلوم ہوتا ہے۔ اور مجھ سے بیان بھی کیا کہ میں رسالہ کا لیفٹننٹ ہوں اور فرانسیسی فوج کا افسر کمیشن۔ دس بارہ دن تک وہ اس ایوانِ شاہی میں رہا۔ بعد ازاں در پردہ شادی کا پیغام کیا گیا۔

ایک دن میں اُس جوان پیرہنِ گل کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی تو میں نے عمداً چھیڑا اور پوچھا کیوں لفٹنٹ تم تو کہتے ہو ہم بڑے سیاح ہیں۔ ہندوستان اور چین اور انگلستان اور فرانس اور روم روس سب ملکوں کی سیر کی ہے ایمان سے کہنا تمہارے نزدیک کس ملک کی عورتیں سب سے زیادہ حسین ہیں مسکرا کر جواب دیا کہ بناؤ چناؤ تراش خراش میں فرانس کی لیڈیوں کے مقابلہ میں ساری خدائی کی عورتیں گرد ہیں مگر حُسن جس کا نام ہے وہ کوہ قاف والیوں پر ختم ہے۔ جارجیا اور سرکیشیا کی عورتیں واقعی سچ مچ کی پریاں ہیں اور اُن کی بانکی ٹوپیاں اُن کے جوبن کی آگ کو اور بھی بھڑکاتی ہیں مگر جس خوبصورتی سے

فرانس کی وضعدار عورتیں اظہارِ حسن کرتی ہیں وہ دنیا کے پردہ پر کہیں نہیں ہے۔ لگاوٹ میں کوئی اُن سے سبقت نہیں لیجا سکتا۔ ان کی اُدائیں ستم ہیں، اُن کی اُدا کی نشتر فروشں چٹکیاں دل کو بے قابو بلکہ رگِ جاں کو مضطر کرنے والی ہیں۔ جو بے شیریں حرکات رنگین ادا۔ ایک غمزے میں صفوں کی صفیں تلپٹ کردیں۔ غمزہ کیا پیغام اجل ہے۔

چشمِ اجل از دور بحسرت نگہ است
تا غمزہ خوں ریز تو غارت گرِ جان ست

اگر کوہِ قاف کی حورنژاد معشوقائیں اس لگاوٹ بازی میں طاق ہو جائیں تو ساری خدائی کی بادشاہی کو لیں یہ حُسن خیز ملک اصنام زاہد فریب کی کان ہے۔ جس پر نظر پڑتی ہے از سرتا پا مجسم حُسن ہے۔ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھنے کی آرزو کریں تو می بیند۔

ملائک دوشش بر رخسار الویت آیۃ الکرسی
ہمی خوانند و می گفتند بر خسار ہمیں باید

اور ہندوستان کی عورتیں ناز آفریں ہیں۔ اُن کا حُسن گندم گوں آدم فریب ہے بلکہ فرشتوں تک کو لُبھائے۔ اس کے علاوہ وسط ایشیا کے بعض ملک بھی حسن کے لیے مشہورِ آفاق ہیں۔ مثلاً نوشاد۔ خلخ۔ فرخاریہ چشمان۔ کشمیر۔ گل۔ آذر۔ ان ملکوں کے خوبان پری پیکر اس قابل ہیں کہ برسوں ان کا سجدہ کرے۔ بعض بعض ان میں سے واقعی قیامت کبریٰ سے دوش بدوش ہیں۔ ؎

جلوۂ آں سرو قامت دیدہ ام
یا بچشمِ خود قیامت دیدہ ام

میں نے مسکرا کر کہا بھلا جتنی حسین عورتیں تم نے دیکھیں ان سب میں ترجیح کس کو دیتے ہو ہنس کر جواب دیا۔ ؎

آفاق با گر دیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

میں تو اس کی ناوک نظر سے کشتہ تھی ہی، یہ سُن کر اس قدر مسرور ہوئی کہ جامہ میں پھولی نہ سمائی۔ اب مجھ سے اور اس سے چہل اور پیار کی باتیں ہونے لگیں، میں نے کہا لفٹننٹ سچ کہتی ہوں میں نے بھی بڑے بڑے سفر کیے ہیں۔ اچھے اچھے خوبرو جوانِ رعنا میری نظر سے گذرے ہیں۔ مگر جو بات تم میں پائی وہ کسی میں نہ پائی۔ سرو قد بالا بلند فراخ سینہ گل رخسار بلکہ گل بھی تمہارا رخسار تاباں دیکھ کر عرق عرق ہو جائے۔

یہ جمال شاہد گل نیمار رخ نکورا

کہ آبِ شرم شوید ز عذار رنگ و بورا

اس پر وہ صنم گلفام بولا پھر اگر یہی سمجھتی ہو تو بسم اللہ۔ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ ہمارا تمہارا دل مل گیا۔ اب اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے میں نے کہا یوں نہیں یہ دل کا سودا کوئی اٹھاؤ چولھا نہیں ہے۔ پہلے اس بات کا ثبوت دو کہ تم بھی مجھ پر اسی قدر ریجھے ہو اور خالی خولی زبانی داخلے سے کچھ نہ ہوگا۔ میرے دل پر اس بات کا نقش مرتسم کر دو تو میں مانوں۔ لفٹنٹ نے کہا جانِ من چاہے قتل کر ڈالو مگر اس بات کا ثبوت نہ مانگو۔ اتنا نہیں سوچتی ہو کہ وطن، اعزہ و اقربا نوکری سب چھوڑ کے حضور کے درِ دولت پر آستانہ بوسی کے لیے حاضر ہوا۔

جز آستانہ توام در جہان پناہے نیست

سر مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

اب اگر قتل کرنا منظور ہے، تو ایک اشارہ کافی ہے۔ خنجر اور شمشیر اور چھری کی ضرورت نہیں۔ نقط ایک اشارے بس ہے۔

عاشق کا قتل ہو جو منظور

ابرو کے اشارے سے کرو چور

میں نے پوچھا کہ یہاں آنے سے پہلے تمہیں میرے حُسن کا حال کیوں کر معلوم ہوا۔ کہا تمہارے نام کی تمام عالم میں دھوم ہے۔ کون نہیں جانتا کہ پولینڈ کی شہزادی جمال و حسن میں بے نظیر ہے۔ ہزاروں بار آپ کی تصویریں دیکھیں، اور کلیجا تھام کر رہ گیا۔ مگر ایک دن نہ رہا گیا۔ لاکھ ضبط کیا۔ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اب تمہارے بس میں ہوں۔ اس دل آویز تقریر نے مجھے اور بھی فریفتہ کیا، اور اب مجھے یقینِ واثق ہو گیا کہ یہ نوجوان لفٹنٹ میرا عاشق زار ہے۔ اب صاف صاف باتیں ہوئیں، تو اس نے کہا میں چند شرطوں کے بغیر شادی نہ کروں گا۔ اور چونکہ میں خود بھی بلا شرائط شادی کرنے پر راضی نہ تھی، میں نے منظور کیا کہ پہلے تم اپنی شرطوں سے مجھے اطلاع دو، پھر میں اپنی شرطیں پیش کروں اُس کی شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ میں بڑا بدگمان آدمی ہوں۔ کسی نوجوان یا وجیہہ آدمی سے ہنسنے بولنے یا ملنے جلنے کی اجازت نہ دوں گا۔ ہاں بوڑھا یا بدصورت آدمی ہو مضائقہ نہیں۔ یا بالکل قریب کے رشتہ دار، جیسے حقیقی بھائی، خالہ زاد بھائی، پچازاد بھائی، بس اور کوئی نہیں۔ اور اگر کسی رعنا شمائل کے ساتھ چہل کرتے دیکھا تو سِتم ہو جائے گا:

باسایہ ترا نمی پسندم
عشق ست و ہزار بدگمانی

۲۔ اگر کسی روز بھی میری طبیعت اپنے سے خلاف پاؤ تو مجھے شریف نہ سمجھنا۔ میں چاہے مر جاؤں مگر قول مرداں جاں دارد۔ گو۔ ؎

صورتِ پاک بنارس کا زمانہ مشتاق	بال بنگالے کے طولِ شبِ ہجر عشاق
حُسنِ کشمیر ہے مشہور میانِ آفاق	لکھنؤ کا وہ غضب ٹھسکہ پری رو آفاق

چشم پنجاب کمر دہلی کی شملے کی گات
جسم لاہور کا اور قامت و قد گجرات

زبان زد خاص و عام ہے مگر آج سے اگر کسی ماہرو کی طرف نظر اٹھا کے دیکھوں تو قابلِ دار۔

۳۔ نوکر چاکروں میں بد وضع نہ بھرتی ہوں۔

۴۔ اگر سیر و سیاحت کو جی چاہے تو ہم تم دونوں ساتھ ساتھ سفر کریں۔

۵۔ اپنے عزیز و اقربا کو سمجھا دینا کہ اب یہ ہمارا میاں اور ہم ان کی بیوی ہیں۔ وہ ہم سے اسی طرح پیش آئیں جس طرح اس رشتے کے عزیز سے پیش آنا چاہیئے۔

۶۔ پانچ کوس تک بد معاش کو نہ بسنے دینا۔

۷۔ اگر ہم کسی مہ جبین، نوخیز سے چہل کریں تو تم بدگمان نہ ہونا کیونکہ ہمارا مزاج ہی اس قسم کا واقع ہوا ہے۔

میں نے یہ شرطیں سن کر کہا کہ سب سے پہلے تو میری شرط یہ ہے کہ شادی کے بعد تم کسی خوبصورت عورت سے چاہے خادمہ ہی کیوں نہ ہو چار آنکھیں کر کے باتیں ہی نہ کرو اور تمہاری سب شرطیں منظور ہیں۔ مگر ساتویں شرط ہزار برس تک نہ منظور کروں گی۔ الغرض شادی ہوئی شب عروسی کو مجھے معلوم ہوا کہ لفٹنٹ میرا عاشق زار، اُس دن میرے جوبن پر بھی عالم تھا۔ جو دیکھتا تھا وہ یہی کہتا تھا۔

افق مطلع انوار ہے یا جلوہ نما	عید کا چاند ہے یا ہے وہ جبیں مہ پارا
ہے مہ و مہر کا نور اس کے مقابل پھیکا	صبح صادق ہے شب قدر کی یا نام خدا
آپ کے رشک سے ہے آئینہ پانی پانی	حرف تقدیر نظر آئے یہ پیشانی
ہے خط نسخ میں تفسیر لکھی بیضاوی	چشم بیضا میں نہیں ہے یہ رگوں کی سرخی
ماہ دو ہفتہ گہن میں ہے کہ وہ ہے پتلی	آنکھ محمل ہے بعینہ تو ہے پتلی لیلی

یا پرستان میں پتلی کا تماشا ہے آج
یا کہ پریوں کو ہوئی عرش بریں پر معراج

مگر چند روز کے بعد ہمارے باغ اُلفت میں نفاق کی خزاں کے آثار نمودار ہوئے، اور لفٹننٹ نے ہمیں اس قدر دکھ پہنچایا کہ بدرجۂ مجبوری ہم نے اس کو قید کر دیا۔ کئی روز تک میری یہ کیفیت تھی کہ دن رات سوائے تڑپنے کے اور کوئی کام نہیں۔ مثل ماہی بے آب بے قرار رہتی تھی۔ روز عورتوں مردوں کو بھیجتی اور وہ جا جاکے اپنی طرف سے سمجھاتیں کہ بہت بُرا کرتے ہو، پچھتاؤ گے۔ ایسی معشوق طنّاز پاکے اس قدر بدنصیب ہو۔ سب کے سب سمجھاتے تھے مگر بے سود ذرا اثر نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار ایک عورت سے کہا کہ اب ان کی طرف سے ہمارا بھی دل بھر گیا۔ وہ اگر پری اور حور جنت بن کر بھی آئیں تو ہم نہ مخاطب ہوں۔ یہ فقرا سُن کر یہ معلوم ہوا کہ تیر کلیجے کے پار ہوگیا۔ سوچی کہ تیرا غرور اسی مغرور نے توڑا۔ اللہ اللہ رے استقلال یہ چین یہ آرام یہ عیش اور یہ بے پروائی اور بھی زیادہ صدمہ ہوا اور روز و شب اسی کی یاد میں کڑھا کرتی

بچھڑا محبوب یک لخت مرے پاس سے آہ | لوٹ لی کشور دل لشکر غم نے ناگاہ
دولت صبر و تحمل ہوئی فرقت میں تباہ | درد و غم نے دل ناشاد سے پیدا کی راہ

بہ گیا خون جگر آنکھ سے دریا ہو کر
جان بھی تن سے ہوا ہوگئی شعلہ ہو کر

میں نے جھلا کے سختی کے ساتھ سزا دی مگر جس قدر سختی اُس نے نہیں اٹھائی اس سے زیادہ مجھے برداشت کرنی پڑی۔ ایک تو اپنا رنج و غم۔ اس پر طرّہ یہ کہ معشوق کے صدمے کا صدمہ خونِ جگر کھا کھا کر رہ جاتی تھی۔ ایک دن کسی نے مجھ سے کہا کہ حضور تو خود بخود اپنے آپ کو کُڑھاتی ہیں۔ اگر ایسا ہی عشق ہے تو ایک دن قید خانے میں ان کو دیکھنے کو خود چلی جایئے۔ مجھے بھی یہ رائے پسند آئی۔ دوسرے دن بن ٹھن کے گئی تو دیکھتے ہی رونے لگا۔ بس میں نے بے اختیار گلے لگا لیا۔ ؎

پھر وہی جشن وہی لطف وہی عیش مدام | راحت جان کے آتے ہی بس آیا ایام
خلوت آٹھوں پہر اور بند در خاص و عام | نہ ملاقات نہ دربار نہ مجرا نہ سلام

شکر صد شکر کہ پھر آئی گلستاں میں بہار
دیدۂ دہر میں پھر اشک چھپا صورت یار

اب کی اس طرح کی الفت ہوئی کہ بالکل یک جان دو قالب۔ دم بھر اگر جدائی ہو تو طبیعت بے چین ہو جائے اب مجھے یقین واثق ہوگیا کہ تمام عمر عیش و طرب میں کٹے گی۔ اب صلاح ہوئی کہ اُس زخمیوں کی تیمارداری کے لیے پچاس ڈاکٹر اپنی طرف سے بھیجیں اور گورنمنٹ میں درخواست دیں ضرور منظور ہو جائے گی درخواست لکھی مگر بھیجنے کی نوبت نہ آئی۔ اب سب میں یہاں مشہور ہوگیا کہ اس جوان ماہ رو اور شہزادی میں انتہا کی

اُلفت و محبت ہے۔

فرط سے چاہ کے اک جان و دو قالب گویا
دونوں مطلوب تھے اور دونوں تھے طالب گویا

ایک روز للّی نامی خادمہ نے مجھ سے آن کر یوں کہا۔

للّی : حضور ایک بات سنی ہے۔ جو جان بخشی ہو عرض کروں۔

شہزادی: ایسی کون سی بات ہے کیا کوئی گالی دوگی۔ ؟

للّی: اے حضور لونڈی کی کیا مجال۔ توبہ۔ توبہ۔

شہزادی: اچھا بیان کرو۔ اب ہم کمال مشتاق ہیں۔

للّی: حضور ایک آدمی کہتا ہے کہ یہ فرانسیسی نہیں ترکی افسر ہیں اور آزاد پاشا اُن کا نام ہے۔ یہ تو قید روس سے بھاگ آئے ہیں۔

شہزادی: کیا بکتی ہے یہ کس حاسد نے بیان کیا۔

للّی : حضور ہی کا ایک سپاہی ہے وہ کہتا تھا۔

شہزادی: اس سپاہی کو ابھی ابھی اسی دم حاضر کرو یہاں۔

للّی : حضور اس کو کسی حیلے سے بلوا لیں اور سُن لیں۔

شہزادی: تم خود جا کر حکم دو کہ سرکار نے ابھی یاد کیا ہے۔

للّی جا کے ایک سپاہی کو بلا لائی۔ شہزادی نے خشمگیں ہو کر کہا۔ تو کیا طوفان باندھا کرتا ہے۔ للّی سے تو نے لفٹنٹ کی نسبت کیا کہا تھا کل۔

سپاہی: حضور کل نہیں آج کہا تھا کہ یہ آزاد پاشا ہیں۔

شہزادی: آزاد پاشا ہیں اور فرانسیسی نہیں ہیں۔

سپاہی: سرکار اگر آزاد نہ ہوں تو قتل کا حکم صادر ہو۔ میں تو اُن کو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ بڑے نامی ترکی جنرل ہیں۔

اس سپاہی نے مجھے ایک تصویر لا کے دکھائی جس پر فرانسیسی اور روسی زبان میں لکھا تھا (جنرل آزاد پاشا سپہ سالار فوجِ ترک۔ واقع آں روے دریائے ڈینوب) تصویر جو دیکھتی ہوں تو لفٹنٹ سے بالکل مشابہ ہوش اڑ گئے۔ حواس باختہ۔ روح پر صدمہ۔ یا الٰہی اب کیا ہوگا۔ اس شخص کے ساتھ تو شادی بھی ہوگئی۔ اب ہو کیا سکتا اگر گرفتار کرا دیا تو میں تمام عمر رنج و غم سہوں گی۔ دوسری شادی کی قسم کھائی ہے۔ اور اگر کسی سے

ذکر نہ کروں تو دل نہیں مانتا۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ مجبوری کا عالم تھا۔ سوچا کہ یا خدا اب کس سے صلاح لوں۔ سپاہی کو دھمکایا کہ خبردار زبان سے نہ نکالنا۔

اتنے میں لفٹننٹ نے آن کر طعنے دینے شروع کئے کہ واہ بس یہی الفت کا دم بھرتی تھیں اتنی دیر تک ہماری خبر ہی نہ لی۔ میں نے کہا ذرا آنکھ جھپک گئی تھی۔ پاس بٹھا کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ مجھے نوٹوہ تھی۔ میں نے باتوں باتوں میں کچّا چٹھا دریافت کر لیا۔ جب کبھی ترکوں کی شکست کا ذکر کروں رنگ فق ہو جائے اور جب روسیوں کی ظفر کا ذکر کروں تو چہرے پر اُداسی چھائے۔ جب میں تاڑ گئی کہ یہ بیشک رومی ہے۔ ہاتھ مَل کر رہ گئی مگر اَب کیا ہو سکتا تھا۔ مٹنے کہ بعد از جنگ یاد آید کا نقشہ تھا۔ ایک دن شب کو باغ میں ٹہلتے ٹہلتے میں نے پوچھا تم نے آزاد پاشا کو بھی دیکھا تھا۔ پہلے تو جواب دینے میں ذرا جھجکا مگر دبے دانتوں کہا۔ ہاں اسٹنبول میں دیکھا تھا۔ میں نے کہا جو کہیں وہ گرفتار ہو تو میں ہزاروں روپیہ خیرات کروں۔ ہمارے ملک کا بہت بڑا دشمن ہے۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے کی طرف نظر ڈالی تو معاً تاڑ گئی کہ آزاد بیشک یہی ہے۔ پھر اسی امر کی نسبت میں نے اس سے سوالات کیے۔

شہزادی: سنتے ہیں آزاد بہت خوبصورت آدمی ہے۔؟

لفٹننٹ: ہاں خوبصورت نوجوان آدمی ہے آزاد پاشا۔

شہزادی: عورتیں تو اس کو دیکھ کر ضرور ریجھ جائیں۔

لفٹننٹ: تم کو اس وقت آزاد کیوں یاد آیا۔ اس کافر کا نام زبان پر لاتی ہو وہ صبح شام میں گرفتار ہی ہوا چاہتا ہے۔

شہزادی: خدا کرے قید ہو جائے۔ میں جو سُن لوں کہ دس کوس کے فاصلے پر بھی یہاں سے آزاد کسی جگہ پر مقیم ہیں تو خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں فوراً صدہا آدمی دوڑا دوں اور مشتہر کر دوں کہ جو شخص اس کو زندہ لائے گا وہ انعام کثیر مع جاگیر پائے گا۔ اور جو اس کا سر لائے گا وہ صرف انعام کثیر کا مستحق ہو گا۔

لفٹننٹ: اگر زندہ آپ کے روبرو آیا تو آپ ضرور ریجھ جائیں گی۔ اور اگر مُردے کا سر آیا تو خیر۔ وہ تو مجبوری کا عالم ہے۔

شہزادی: ریجھتے کوئی اور ہوں گے۔ ہم ایسے ایسے لوگوں پر نہیں ریجھتے جو ہمارے ملک کے عَدُو ہیں۔ ان کے لیے تیغِ دودم ہے۔ میں نے جو آزاد کی تصویر دیکھی تو معلوم ہوا کہ ابھی بہت کم سن آدمی ہیں۔

لفٹننٹ: (چونک کر) تصویر کہاں دیکھی۔

شہزادی: لندن کے اسٹرمیڈ لندن نیوز اور گریفک میں۔

لفٹننٹ: کسی دل لگی باز نے چھاپ دی ہوں گی۔

میں نے تصویر منگوا کر آزاد کو دکھائی تو دیکھتے ہی رنگ فق ہوگیا۔

شہزادی: ہے یہ آزاد ہی کی شبیہ یا اور کسی کی کیوں صاحب۔

لفٹنٹ: ہاں (گھبرا کر) دیکھوں۔

شہزادی: صورت ملتی ہے یا نہیں ملتی ہے۔ یہ بتاؤ۔

لفٹنٹ: (پریشان ہوکر) کس سے۔ کس سے۔؟

شہزادی: آزاد سے اور اس تصویر سے مشابہت ہے یا نہیں۔

لفٹنٹ: (شرما کر) دیکھوں۔ مگر۔ مگر۔

شہزادی: اب اس میں اگر مگر کا ہے کی ہے۔ صاف صاف بات ہے۔

لفٹنٹ: (قدموں پر گر کر)۔ سے

زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو

اپنے دلِ تنگ میں جگہ دو

میں نے کہا آزاد تم نے نرودت کھیلی۔ اَب ہم کو تم نے کہیں کا نہ رکھا۔ اگر تم کو بچاتی ہوں تو دل نہیں مانتا اور گورنمنٹ کو اطلاع دیتی ہوں تو بھی دل گوارا نہیں کرتا۔ حیرت میں ہوں کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اور تم نے اب تک ذرا اطلاع نہ دی۔ اس کے چوتھے پانچویں روز آزاد کو دو لیڈیاں ساتھ لے کر چمپت ہوئیں۔ مجھے چکمہ دیا اور ادھر روسی فوج کے سواروں نے بھی اُن کو گھیر لیا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ آزاد کہاں ہیں۔

اس اظہار کی نقل کرنیل نے مع اپنی رائے اور کل متعلقہ امور اور مس کلیرسا کے خط کے وزیر جنگ کے پاس بھیجدی۔

وزیر جنگ نے حکم دیا کہ شہزادی ابھی زیر نگرانی فوج رہیں۔ ایک افسر اعلیٰ کو تحقیقات کامل کے لیے بھیجدیا۔ ان حضرت نے آتے ہی آسمان سر پر اٹھایا۔ دریائے بنوا کے کنارے پر ایک قصبہ واقع تھا۔ اس کے متمول مہاجن کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔

بیچارے کو خبر ہوئی تو سخت متحیر کہ یا خدایا یہ کیا آفت آئی ہے میں بجز لین دین کے اور کسی سے واسطہ ہی نہیں رکھتا۔ جنرل نے میرے نام گرفتاری کا حکم کیوں جاری کر دیا۔ اُس کی بیوی نے علیحدہ لیجا کر یوں بیان کیا۔

بیوی: تم کو اس کا حال نہیں معلوم ہے میں سمجھ گئی۔

میاں: مجھ کو تو پولٹیکل معاملات سے سروکار ہی نہیں تھا۔

بیوی: اصلیت یہ ہے کہ والد نے اس جنرل کے پڑوس ایک مکان لیا تھا اور اس میں بود و باش اختیار کی

اس بدبخت کی مجھ پر نظر پڑی تھی۔ مگر مجھے اس کی خو بو چال ڈھال سے نفرت تھی۔ میں نے شادی سے انکار کیا۔ پس آگ ہوگیا۔ دو بار گھر جلا دیا۔ ایک مرتبہ ڈاکوؤں کے ذریعے سے چوری کرا دی، اور اب برسوں کے بعد یہ بدلہ لیا۔

میاں: کیا اندھیر ہے۔ میں گورنمنٹ میں کل امور پیش کروں گا۔

بیوی: میرے پاس اُس کا خط موجود ہے۔

یہ کہہ کر بیوی نے میاں کو خط دیا جو سترہ برس کا لکھا ہوا تھا۔ پڑھا تو عبارت ذیل درج تھی۔

او ظلم کی ڈھانے والی۔ مجھ پر تو نے وہ کیا جو موت جان کے ساتھ کرتی ہے میرا دل نچ پر آیا ہے، اور میری جان جاتی ہے۔ تیرا اٹھلا اٹھلا کے باغ میں چلنا دل تو پائمال کرتا ہے۔ مہینوں سے تیرے دیدار کی زیارت کے لیے گرجا جاتا ہوں، اور گھنٹوں تیرا رُخِ انور گھورا کرتا ہوں۔ مگر افسوس تو وہ ظالم شقی القلب ہے کہ ذرا رحم نہیں کرتی ہے سچ کہتا ہوں غلام بن کر رہوں گا اور مثل خادموں کے خدمت بجا لاؤں گا۔ اس مہاجن میں کون سی خوبی ہے۔ صرف سود اس کا دارومدار ہے۔ یورپ کی لیڈیاں فوجی افسروں کی عاشقِ زار ہوتی ہیں اور ہمیشہ فوج والوں ہی سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ مگر تو وہ انوکھی عورت ہے کہ مہاجن کو مجھ ایسے مشہور سپہ سالار پر فوق اور ترجیح دیتی ہے۔

میں جس وقت سنتا ہوں کہ وہ مہاجن دو، دو، دن آن کر تیرے ہاں رہتا ہے اور تو بناؤ چناؤ کر کے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چاندنی راتوں کو دو دو کوس میٹھی میٹھی باتیں کرتی نکل جاتی ہے۔ تو کلیجے پر سانپ لوٹتا ہے اور درد جگر تڑپا دیتا ہے۔

کیا قہر ہے کیونکر نہ اُٹھے درد جگر میں
میری تو بغل خالی اور آپ اور کی بَر میں

اک آن بھی مجھ سے نہ ملو آٹھ پہر میں
گھر چھوڑ کے اپنا رہو یوں اور کے گھر میں

سنتا ہوں شب و روز تمہیں بزم دگر میں
کیوں کر نہ ہو تاریک جہاں میری نظر میں

ہر روز تو اے مہر درخشاں ہے کہیں اور
ہر رات تو اے شمع شبستاں ہے کہیں اور

جو دل تم پر فدا ہے اس کو جلاتی ہو۔ غضب ڈھاتی ہو۔ ہائے قیامت کا سامنا ہے۔ پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا ہے۔ درد دل کی چمک کا حال کسی کو کیا معلوم ہے۔ ہم سے بولنا کیسا آنکھ اٹھا کر ہماری طرف دیکھنے تک کی قسم کھائی ہے۔ یہ کج ادائی ہے یا انتہا کی بے وفائی ہے۔ اس مہاجن کی قسمت میں کہاں سے لاؤں۔ اچھی اچھی امیرزادیاں تمنا رکھتی ہیں کہ میں ذرا اُن سے ہنس کر بات کروں۔ جس سوسائٹی میں سنو میرا ہی چرچا ہے۔ جس محفل میں جاؤ میرا ہی تذکرہ ہے۔ سینٹ پیٹرسبرگ سے شہر میں ہزاروں خاتونیں میرے

حسن پر عاشق ہیں مگر خدا جانے اللہ نے تجھے کیسا انوکھا دل دیا ہے کہ جو بات ہے نرالی۔ جو بات ہے انوکھی اب بجز اس کے اور کیا چارا ہے کہ زہر کھا کے مر جاؤں، یا دریا میں ڈوب مروں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اس قصبے کی جھیل میں میری جان ایک روز جانی ہے جس معشوق کو ہم چاہیں جس کی ادا پر عاشق اور دیوانے ہوں وہ اور کو چاہے غیروں سے ربط بڑھائے اور ہم کو آتش غم میں جلائے تو صدمہ ہو یا نہ ہو۔ سہ

رشک کیوں کر نہ ہوا ہے یار ذرا منصف ہو — اپنے کو غیر صنم غیر کو اپنا سمجھو
بات مجھ سے نہ کرو غیر سے ہنس کر بولو — آتش غم میں جلاؤ ہمیں خود چین کرو

رشک سے کیوں نہ جلے عیش کا خرمن اپنے
محفل غیر ہے جب شمع سے روشن اپنے

اور اگر یہی سرد مہری ہے تو خیر۔ اس مہاجن سے کسی روز سر راہ سمجھ لیں گے۔ فوجی آدمیوں سے مقابلہ کرنا دریا میں رہ کر مگر سے بیر کرنا ہے۔

مہاجن نے جو خط پڑھا تو آگ ہو گیا۔ اپنے لڑکے کو بلا کر خط دیا اور کہا مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دینا اور خوب لڑنا دولت خدا کے فضل سے کافی ہے۔ یہ کہہ کر کے مہاجن بیوی سے ملا، دونوں گلے لپٹ لپٹ کر خوب روئے۔ اس عرصے میں کانسٹبلوں نے کئی بار غل مچایا کہ ہمیں فوراً گرفتار کرنے کا حکم ہے۔ مہاجن گریہ وزاری کرتا ہوا باہر آیا اور کمال ذلت و خواری کے ساتھ سپاہی ڈھکیلتے ہوئے اس مغرور اور بے گناہ ساہوکار کو لے چلے۔

اب سنیئے کہ ادھر ساہوکار بے چارہ حوالات میں بھیجا گیا ادھر مکان پر پہرہ بیٹھ گیا۔ اور پولیس کے آدمیوں نے نصف سے زیادہ دولت لوٹ لی۔ اس اندھیر کو دیکھئے مہاجن کے لڑکے نے مجسٹریٹ کے سامنے وہ خط مع عرضی کے پیش کیا۔ تو اہلکاروں نے حسب ایمائے حاکم خط بدل دیا، اور لڑکے کو جعل کے جرم میں ماخوذ کر کے چھ برس قید سخت کی سزا دی۔

مہاجن کے ساتھ بڑی سختی کی گئی۔ اس سے کہا گیا کہ اپنی جورو کو چھوڑ دے جس سپہ سالار نے تجھے ماخوذ کیا ہے وہ اس کی شادی کرے گا اور اپنی دولت کا نصف حصہ داخل کر یا سائبیریا کے میدانوں میں دائم الحبس ہو، وہ روتا ہے سر پیٹتا ہے۔ کہ ارے یہ کیا اندھیر ہے۔ میں پولینڈ کی شہزادی سے واقف ہی نہیں۔ آزاد کا میں نے نام ہی نہیں سنا۔ مجھے اس امر سے مطلق واقفیت نہیں کہ وہ کون ہے۔ کب گرفتار ہوا کب بھاگا۔ شہزادی سے اس کا کیا تعلق تھا، اور وہ مجھے بے گناہ جہنم کو بھیجے دیتے ہو، مگر سنتا کون ہے۔ اب وہی باتیں تھیں۔ یا تو بیوی سے کنارہ کش ہو۔ نصف دولت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اور یا تمام عمر سیبیریا کے برفستان میں زندگی بسر کرے۔ اُس نے کہا دولت نصف نہیں چاہیے۔ سب کی سب چھین لو، عذر نہیں مگر جیتے جی بیوی کی بے عزتی تو ہم سے نہ دیکھی جائے گی۔ لوگوں نے سمجھایا کہ کچھ سودائی ہوا ب وہ تمہاری بیوی کہاں ہے تم سیبیریا میں ہو گے اور وہ تمہارے رقیب کی بغل میں۔ اس پر ساہوکار زار زار رو دیا اور رگ حمیت جوش زن ہوئی۔ مگر پا بجولاں جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اسی وقت اس کو یہ خوش خبری بھی سنائی گئی۔ کہ اس کے لڑکے نے جعل کی عدالت میں قید سخت کی سزا پائی۔ اس خبر سے اور بھی دل بھر آیا اور اس قدر رویا کہ بالکل دیوانہ ہو گیا۔

اُسی روز حکم دیا گیا کہ اس شخص کی نسبت یہ جُرم سخت سنگین من کل الوجود ثابت ہو گیا۔ اور صدہا معزز معزز لیڈیوں اور معتبر معتبر جنٹلمینوں کی شہادتِ کامل اور گواہی کافی پہونچی۔ کہ اس کی سازش سے آزاد پاشا جس کو گورنمنٹ روس نے قید کر کے سیبیریا بھیجا تھا۔ اثنائے راہ میں آزاد کر دیا گیا۔ گورنمنٹ موصوف کو مناسب معلوم ہوا کہ ایسے بدخواہ ملک کو سخت ترین سزا دے تاکہ اوروں کو عبرت ہو، پھر کسی بدنفس کو جرأت نہ پڑے کہ اس شرارت اور نمک حرامی کا مرتکب ہو۔ لہذا حکم ہوا کہ سیبیریا سرد ترین اور سب سے بدتر مقام میں یہ شخص قید کیا جائے۔ کھانے پینے کو ترسایا جائے اور اس سے وہ کام لیے جائیں جو اس سے ادا نہ ہو سکیں۔ گورنمنٹ نے اس معاملے میں کامل غور کر لیا ہے اور بعد تحقیقات نہایت ملائمت اور رحم دلی کے ساتھ یہ سزا دی ہے اس کا جرم اس لائق تھا کہ ایسی سخت سزا دی جائے جس سے بڑھ کر اور کوئی سزا نہ ہو مگر یہ گورنمنٹ کی نہایت رحم دلی اور مہربانی ہے کہ اس کو یہ سزا دی گئی۔

یہ حکم اُس مہاجن کو سنایا گیا۔ مہاجن کو سنتے ہی غش آ گیا اور بڑی دیر تک بیہوش پڑا رہا۔ روس کے حکام شقی القلب نے اس ستم رسیدہ و مصیبت زدہ ساہوکار کو غش کی حالت میں دیکھ کر انتہا سے زیادہ خوشی ظاہر کی اور اس کے بے بس لڑکے اور بے کس جورو کو اُس واقعہ ہولناک سے بغرض مسرت اطلاع دی۔ لڑکے نے جس وقت قید خانے میں اس کے باپ کو ناکردہ گناہ صرف حسد اور بغض کے سبب سے اس قدر سخت ترین سزا دی گئی تو آٹھ آٹھ آنسو رویا اور دو دن تک ہر دم اس کی آنکھوں سے اشک جاری رہے۔ مہاجن کی جورو کو خبر ہوئی تو نیم جان ہو گئی۔

ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

لڑکا قید خانے میں شوہر پر آسمان پھٹ پڑا۔ خود تنہا۔ بیک بینی و دو گوش۔ پولیس والے نصف دولت اڑا لے گئے۔ جو لوگ حفاظت کے لیے مقرر ہوئے تھے وہی ڈاکو نکلے۔

چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی

حکام دشمن جانی سب کی یہی نیت تھی کہ اس ساہوکار کے گھر میں کوئی باقی نہ رہے۔ اور ہم کل روپیہ اور جائداد لوٹ کھائیں علاوہ بریں اُس عرصے میں دو ایک صاحب ڈورے ڈالنے بھی آئے مگر اس پاک دامن عورت نے شیشۂ عصمت کو سنگِ وساوسِ شیطانی سے بچایا۔

اب سنیے کہ جس شخص نے سب سے پہلے آن کر اس بیچاری مصیبت کی ماری سے اس کے شوہر کی قیدِ سخت کے حکم سے اطلاع دی اُس نے مسکرا کے اور ہنس کر کہا۔ لے اَب سزا کو پہونچی۔ کیا ہوا آگے آیا۔ اب بھی اگر اس جنرل کے ساتھ راضی ہو جاؤ تو بہتر۔ تمہارے میاں تو اَب حشر تک تم کو صورت نہ دکھائیں گے ان کے نام حکم ہوا کہ چونکہ تم نے آزاد پاشا سے نامی جنرل غنیم کو قید سے رہائی دینے میں مدد دی، لہذا گورنمنٹ روس تم کو تمام عمر کے لیے سیبیریا کے بدترین مقاموں میں قید کرتی ہے اس کے علاوہ اب بچہ جی کو غذا بھی واجبی ہی واجبی ملے گی۔ اور محنت اس قدر لی جائے گی کہ کلیجہ منہ کو آئے۔ تمہارا لڑکا تو اَب جیتا نہ بچے گا۔ اس کو تو مُردوں میں خیال کر۔ ان فقروں نے اس ناکردہ گناہ عورت کے جگر پر برچھی کی نوک کا کام کیا۔ اور گویا برچھی جگر کے پار ہو گئی۔ کسی نے اس زخم پر نمک چھڑکا تمام عالم تیرہ و تار نظر آتا تھا۔ گلے میں کانٹے پڑ گئے۔ آنکھوں سے طوفانِ اشک جاری ہوا۔ ہاتھ پاؤں سرد۔ سکتے کا عالم، کہ یا الٰہی بیٹھے بٹھائے ہم پر یہ کیا مصیبت آئی۔ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ میاں کے نام دائم الحبس کا حکم بیٹا تین سال کے لیے قید۔ میں اس تباہی میں۔ ساری خدائی میں، اس وقت ہمارا کوئی نہیں ہے۔ کئی بار اپنے اعزہ کا نام لے کر کہ فلاں شخص کو بلا دو، مگر پہرے والوں نے صاف جواب دیا اور کہا ہمیں حکم ہے۔ کہ اگر اس راستے سے کوئی چلے تو گولی مار دو۔ عزیز کیسے۔ دس پانچ اعزہ و اقربا جو مدد کو آئے بھی اُن کو پہرے والوں نے دور ہی سے للکارا اور بندوق چھتیل کے ڈرایا کہ آگے بڑھے تو دھواں اس پار ہو گا۔ صرف یہ عورت اور ایک ذرا سی لڑکی اور دو خادمہ عورتیں گھر میں باقی اللہ اللہ خیر صلاح، اور دروازے پر ڈبل پہرا اور پہرے والے چھٹے ہوئے گُرگے۔ جن کی ہر وقت یہی نیت رہتی تھی کہ اگر ساہوکار کی جورو راضی ہو تو اس کو چپکے سے بھگالے جائیں۔ اُن میں سے بعض بعض نے الفاظ نا ملائم سے بھی مخاطب کیا۔ مگر وہ بیچاری کیا کرتی۔ مجبور تھی اپنی بچی کو دن رات چھاتی سے لگا کر زار زار رویا کرتی تھی۔

شدت گریہ ہے اشکوں کی فراوانی ہے — کشتی چرخ تلک کشتی طوفانی ہے
شوقِ دل مستعدِ سلسلہ جنبانی ہے — آہ پُر درد کہ زنجیر پریشانی ہے

حلقے آنکھوں میں نہیں ضعف کی تصویریں ہیں
جسم لاغر میں رگیں جتنی ہیں زنجیریں ہیں

زبان اور گلو اور تالو خشک۔ چہرے پر مردنی چھائی۔ دل موردِ اَلَم۔ مگر قیدِ غم۔ سوچتی تھی کہ یا الٰہی اِس بیچارے لڑکے پر قید خانے میں کیا گذرتی ہوگی۔ ماں کی تنہائی۔ باپ کی جدائی، اپنی پریشانی، ہائے افسوس وائے افسوس، اور اس کا باپ مصیبت میں ہوگا کہ لڑکا مفت قید خانے میں بھیجا گیا۔ وہ خود تمام عمر کے لیے محبوس ہوئے۔ جورو چھُٹی لڑکے بالے چھُٹے۔ دولت جہنم میں گئی یا خدا اگر اب کی مصیبت دور ہو جائے تو میں سب سے بڑھ کر نہلسٹ ہو جاؤں، یا خدا۔ وے، جس دن سے پیدا ہوئے ان جابروں کی سختیاں سہتے سہتے کلیجہ پک گیا۔ لڑکپن میں بعض قومی لٹیروں نے باپ کی جمع لوٹ لی۔ اب میاں اور بیٹے اور گھر پر تباہی آئی۔ ان کے جَور و تعدّی کے سبب سے ایک دن بھی چین سے نہ گذرا۔

کیا پوچھتے ہو عمر کٹی کس طرح اپنی
جُز درد نہ دیکھا کبھی اس تیس برس میں

پہرے والوں نے یہ بے قراری دیکھ کر کہا اب بھی جنرل کا کہنا مان لو نہیں تو زبردستی لے جائیں گے۔ اس جبر و ظلم پر بھی اُن شقی القلب سفاکوں کو تسلی نہ ہوئی۔ حکم دیا گیا کہ عورت کو بھی حاضر کرو۔ جس درجے میں مہاجن قید تھا اُس کے پاس کے درجے میں عورت بھی قید کی گئی۔ لوہے کی سلاخوں کی راہ سے ساہوکار نے اپنی مصیبت زدہ بیوی، اور اس عفیفہ غمزدہ نے اپنے میاں کو دیکھا، اور کہا بس اب تسکین اس قدر ہے کہ ہم تم ایک ہی جگہ رہیں گے۔ یہ کہہ کر دونوں پھوٹ پھوٹ کر خوب روئے۔ مگر دلوں کو ڈھارس اس قدر ضرور تھی کہ کروروں صدمے سہیں لیکن جدائی تو نہ ہوگی۔ لڑکے کی مفارقتِ ابدی کا سخت قلق تھا۔ مگر اس سے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک افسر آیا۔ اور میاں بیوی کو قریب دیکھ کر آگ ہو گیا۔ کہا یہ کیا اندھیر ہے۔ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ قید کرو اور اگر ایک مغرب بھیجا جائے تو دوسرے کو مشرق بھیجو۔ منزلوں کا فرق رہے۔ سپاہیوں نے اس پاک دامن شریف زادی کو زبردستی اٹھایا۔ اور جب وہ مچلنے لگی تو ایک بے رحم ظالم نے اس زور سے لات ماری کہ وہ ناز و نعیم پروردہ امیر زادی گر پڑی اس پر ساہوکار کو اس درجہ طیش آیا کہ مارے غصے کے زنجیر توڑ کر دوڑا مگر جاتا کہاں۔ لوہے کی سلاخوں سے ٹکرایا اور اس قدر خون بہا کہ گر پڑا۔ عورت ہاتھ جوڑ کر کہتی جاتی تھی کہ چاہے جس قدر سخت سزا دو مگر از برائے خدا ہم کو جدا نہ کرو۔ سپاہی کشاں کشاں لے گئے۔ ادھر ساہوکار نے سب کی لاعلمی میں دم کے دم میں دم توڑا اور دنیائے دوں سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑا۔ ادھر سواد الوجہ سپاہی اس نازنین کو اس بدعت کے ساتھ لیے جاتے تھے اور ادھر زبانِ حال سے لاش کہتی تھی۔ کہ۔ ؎

کہو اس برق وش سے آج لازم ساتھ جانا ہے
جنازے پر ہمارے ابرِ رحمت شامیانہ ہے

جب اس ناز پروردہ کو اس سرد مہری کے ساتھ بظلم خونخوار ایک علیحدہ قید خانے میں لے گئے تو وہاں پھر کہا کہ اب بھی سویرا ہے۔ اگر مان لے تو تیرے شوہر کے ساتھ بھی رعایت کریں۔ اور تو نے خود تو وہ تکلیف اٹھائی کہ شاید پھر کبھی اس کا نام بھی زبان پر نہ لائے۔

اتنے میں ایک آدمی دوڑا آیا، اور بہت ہنسکر کہا، اور بھی کچھ سنا۔ ان کے میاں تو سر ٹکرا کر مر گئے۔ سر پھٹ گیا۔ بھیجا نکل گیا۔ اور چوندھیا کے گرا۔ مگر کسی نے بھی فکر نہ کی۔ بس ایک مرتبہ پہرے والے نے دیکھا تو کہا ارے یہ مردہ پڑا ہے۔ جا کے دیکھتے ہیں بالکل سرد۔ ہاتھ پاؤں سب ٹھنڈے۔ ڈاکٹر نے آن کر دیکھا کہا مر گیا۔ یہ فقرہ سنتے ہی اس عورت کی آنکھوں سے معاً سرخ سرخ آنسو جاری ہو گئے؛

اشکِ خوں سے اے جنوں نسبت ہے کیا اکسیر کو

کر دیا دم میں طلائی آہنی زنجیر کو

کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔ کبھی آواز آئی کہ جیسے اس کا لڑکا سامنے کھڑا کہہ رہا ہے کہ اماں جان، ابا کو کہاں بھیجدیا ہائے ابا۔ کیا غضب کیا۔ اتنا بڑا امیر روسی مہاجن اور اس تیرہ و تار کوٹھری میں دم توڑے اور نعش بے کفن کے ارد گرد کوئی نہ بھٹکے واہ واہ جس کے پاس کروڑوں کی جائداد ہو، وہ کفن تک کو ترسے۔ کبھی کان میں آواز آئی کہ وہی مہاجن مبرور بیوی کی طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے:

او مسیحا نہ خبر لی تو نے

وہ جو بیمار تھا لے مر ہی گیا

آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا، اور کلیجہ بانسوں اچھل رہا تھا۔ دیوانی کی طرح ادھر سے ادھر جاتی تھی مگر پہرے والے قہقہہ لگاتے تھے۔

۱۔ بن داموں کا ناچ آج دیکھا۔

۲۔ اب رنڈاپے میں زندگی بسر کرنا فضول ہے۔

۳۔ وہ جنرل اب بھی موجود ہے۔ کہو تو پیغام بھیجیں۔

۴۔ اجی ابھی کیا ہے۔ صبح شام میں لڑکے کی خبر آتی ہی ہو گی۔ ابھی تو میاں کا ہی سانحہ دیکھا ہے۔

۵۔ تم ہمارے ساتھ شادی کر لو تو بیوی سمجھیں۔

۶۔ بڑی ضدی عورت ہے۔ اس کو ایسی جگہ قتل کرے جہاں پانی نہ ملے۔

۷۔ جس طرح ان کے میاں کی جان گئی کسی کو کانوں کان خبر ہی نہیں کہ کیا ہوا کیا نہیں ہوا۔ مر گیا۔ مر جائے۔

۸۔ اجی بلکہ اور جہنم میں جائے کچھ مطلب ہے۔

۹۔ کھوبی صاحب اب کیا سوچ ہے۔ میاں کو توچت کیا۔ اَب کس کی فکر ہے۔ اب ہم کو مار ڈالو۔ ایک ہم ہی باقی ہیں۔

اس غمزدہ دل شکستہ کا حال تو یہاں چھوڑا اب سُنیئے کہ ایک اور افسر فوجی جو پولینڈ کی شہزادی نسرین بدن کے معاملات کی تحقیقات کے لیے بھیجے گئے تھے انھوں نے دیکھا کہ جنرل نے تو برسوں کا بعض دلی آج نکالا ہمیں کھسنڈی رہے جا رہے ہیں۔ ان کو یاد آیا کہ ان کے قصبے میں انھوں نے ایک بساطی کے باپ کی قبر کھدوا ڈالی تھی۔ بساطی نے استغاثہ کیا تو اُن کو جرمانہ سنگین دینا پڑا۔ اس روز سے یہ اور جانی دشمن ہو گئے۔ ایک مرتبہ لاک ڈابے میں اس نے قید بھی کرا دیا تھا۔ یہ موقع پا کر انھوں نے اس کے پھانسنے کی فکر کی اور اس قصبے کے مجسٹریٹ کو لکھا کہ چونکہ فلاں بساطی پر جرم ثابت ہو گیا ہے کہ آزاد پاشا قیدی کو اس شخص نے پولینڈ کی شہزادی سے سازش کر کے بھگا دیا تھا لہٰذا حسب الحکم کمیشن اطلاع دی جاتی ہے کہ پولیس کی حراست میں اس کو فوراً روانہ کیجیے۔ مجسٹریٹ نے بساطی کے ہاں دوڑ بھیجی جب اس کے دروازے پر سپاہی پہونچے تو اس کو باہر بلایا اور کہا۔

سپاہی: چلو تمہاری گرفتاری کا حکم آیا ہے چلو ساتھ۔

بساطی: کیا! گرفتاری! گرفتاری کیسی صاحب؟

سپاہی: گرفتاری کیسی! ہونھ! قیدیوں کو بھگا دیا۔ اور کہتا ہے گرفتاری کیسی کیا نھے ہیں۔

بساطی: کیسے قیدی۔ عجب دل لگی کے آدمی ہیں۔

سپاہی: کچھ گھاس تو نہیں کھا گیا ہے چل ساتھ۔

بساطی: صاحب مجھے قیدیوں سے کیا سروکار ہے۔ میں تو بساطی ہوں۔ صبح سے شام تک شہر بھر کے صدقے ہوا۔ شام کو چار پیسے ملے تو روٹیاں چلیں۔ قیدیوں کو میں کیا جانوں۔

سپاہی: آزاد پاشا اپنے باپ کو سازش کر کے اپنے ملک کے غنیم کو رشوت کی طمع سے بھگا دیا۔

بساطی: (متحیر ہو کر) کون پاشا کون۔ آپ کو دھوکہ ہوا ہے کسی اور کی طلبی ہو گی مجھے لڑائی کا حال بھی اچھی طرح نہیں معلوم ہے۔ رہائی اور قید کیسی۔

سپاہی: ہمارے نام یہ حکم ہے کہ تم کو گرفتار کر کے فوراً لے جائیں۔

بساطی: سرکاری آدمی سے کون بولے۔ تم دس ہم اکیلے۔

سپاہی: (تھپیڑ مار کر) چل آگے بڑھ۔ کہنے لگا۔ تم دس ہم اکیلے تم ہزار ہو تو کیا پروا ہے۔ جانتے ہو سرکاری پولیس کے آدمی ہیں۔ گورنمنٹ روس کی پولیس کے آدمی ہیں۔

بساطی : اچھا ہم تو غریب آدمی ایک بساطی ہیں مگر دیکھ لینا کہ نہلسٹ اس کا بدلہ لیں گے۔ بس ہماری آہ کا اثر دیکھنا۔
سپاہی : (ایک اور تھپڑ لگا کر) بس چلا چل۔ اب کی بولا تو اسی جگہ ڈھیر ہو جائے گا۔ سوائے وہی فضول تقریر کے دوسری بات نہیں ہے۔

دو آدمیوں نے ادھر ادھر ہاتھ پکڑے، اور ایک آدمی نے بارہ لیا اور دھکے دیتے ہوئے لے چلے۔ بساطی متحیر ہو کر یہ کیا آفت آگئی۔ خدا جانے کس کے دھوکے میں مجھے لیے چلتے ہیں۔ بساطی دس قدم بھی نہ گیا ہو گا کہ ایک عورت نے آواز دی اور پکار کر روتے ہوئے کہا اے کہاں چلے۔ ذری یہاں تو آؤ۔ گھر میں کیا قیامت بپا ہو گئی۔ سپاہی عمداً ٹھہر گئے تو زنِ مذکور نے قریب آن کر کہا اسقاطِ حمل ہو گیا اور بہت بیچین ہیں بساطی کے ہوش اڑ گئے۔ سپاہیوں سے بصد عجز کہا از برائے خدا مجھ بے گناہ کو چھوڑ دو۔

سپاہی : کاہے کو چھوڑ دیں۔ جو ملک کے دشمن کا ساتھ دے اس کو چھوڑنا چاہیے۔ قتل کرنا چاہیے چلے چلو۔
بساطی : بھائی بابا (ہاتھ جوڑ کر) میرے ہاں آج صبح سے طبیعت بیچین تھی۔ اب اس وقت یہ خبر بد سُنی مجھے کیوں تباہ کرتے ہو۔
سپاہی : چلو خوب ہوا۔ ایسے موذیوں کی یہی حالت ہوتی ہے ہم ایک نہ سنیں گے۔ اور زیادہ بولو گے تو سزا دیں گے۔

الغرض یہ بے رحم سپاہی اس بساطی کو کشاں کشاں زبردستی لے گئے، اور اسی دن پولینڈ کی شہزادی کے کہسار کی طرف روانہ کیا۔ بیچارہ ادھ موا ہو گیا تھا۔ ہر دم اسی خیال میں تھا کہ بیوی کا خدا جانے کیا حال ہو گا۔ واللہ اَعْلَم کسی نے ایسے نازک وقت میں مدد بھی دی ہو۔ یا نہ دی ہو ہر دم سوچتا تھا کہ یا خدا مجھ سے کون سی خطا سرزد ہوئی۔ جب وہ صیدِ بلا کہسار میں پہونچا اور اُس شقی افسر سے آنکھیں دوچار ہوئیں تو سر پیٹ لیا۔ کہا ہائے ستم۔ میں بھی سوچتا تھا کہ کس دشمن جانی کے سبب سے اس مصیبت بے حد میں گرفتار ہوا۔ یہاں آیا اور اس کافر ستم گر کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ انھیں حضرت کی کارفرمائی تھی۔ اچھا اب تو پھنسے ہی ہیں۔ لیکن اگر اب بھی کبھی موقع ملا تو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اور بے جان لیے نہ رہوں گا۔

افسر : اب موقع قبر میں ملے گا۔
بساطی : ہاں پھر اب تو تمہارے بس میں ہیں ہی۔
افسر : (سپاہیوں سے) یہ شخص بڑا بدمعاش ہے۔ اس کی بڑی حفاظت رکھنا۔ ڈہری زنجیریں ہاتھوں پانوں میں ہوں۔
سپاہی : خداوند ہم تو بنجار راست اس کے ساتھ آئے ہیں، چلتے وقت اس کے گھر میں اسقاطِ حمل ہو گیا تھا۔

مگر ہم نے اس کو اجازت نہ دی، کہ گھر تک ہو آئے اور راہ میں اس طرح لائے ہیں جیسے کوئی جانی دشمن کو لاتا ہے اور راستے بھر میں حضور کو گالیاں دیتا آیا۔

راوی: اس جھوٹ میں کیا سچ۔ راستے بھر گالیاں دیتا آیا کوئی پوچھے اس کو معلوم کہاں تھا کہ کس کے حکم سے گرفتار ہوا اور کہاں جانا ہے۔

افسر: ہم بہت خوش ہوے کہ یہ مردود ہمارے ہتھے چڑھا۔

بساطی: کیا کسی بیکس پر ظلم ڈھانا اچھا تھوڑا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ ضرور نکلے گا۔ ایک نہ ایک دن۔

افسر: میں تو تم کو اس طرح قتل کروں گا کہ بوٹیاں نوچ نوچ کر چیل کوؤں کو دوں۔ کھڑا چنوا دوں اور قبر پر جوتے لگاؤں۔

بساطی: بیش باد۔

خدا ہی چپ کی داد دے گا کہ تربتیں روندے ڈالتے ہیں
اجل کے مارے ہوے کسی سے نہ بولتے ہیں نہ چالتے ہیں

افسر: سب سپاہیوں کے نام حکم جاری ہوا کہ اس کو آج دانہ پانی کچھ نہ ملے گا۔ اگر بھوکا ہے، تو بھوکوں مرے اور اگر پیاسا ہے تو پیاسوں مرے۔

بساطی: اسی سے تیرا پاجی پن صاف ظاہر ہوتا ہے۔

نہ تو دانہ ہے قفس میں نہ ذرا پانی ہے
کیوں جی صیاد اسیروں کی یہ نادانی ہے

افسر: اس قدر روؤ گے کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔ جگر کے ٹکڑے آنکھوں کی راہ سے نہ گریں تو نام نہ رکھنا۔ جگر کے ٹکڑے!

بساطی: پھر بھی کچھ پرواہ نہیں ہے۔

دامنِ گل کر دیا ہے دامنِ کہسار کو
ابر سیکھے آ کے ہم سے اشک برسانے کا رنگ

ہائے یہ دردِ دل یہ غمِ جدائی۔ یہ بے عزتی مجھ سے نہ سہی جائے گی۔ اس سے تو اگر موت ہی آجائے تو بہتر ہے اس کاوش سے تو چھوٹوں۔

چلا بہت و لے نہ ہوا ہجر یار میں
محبوب کیا اجل بھی نہیں اختیار میں

افسر: میں تو تیرے خون کا پیاسا تھا۔ یہ موقع میرے ہاتھ آیا۔ ہزار غنیمت سمجھا۔ فوراً حکم دیا کہ۔ اِس

بساطی والے کو پھانسو۔ کئی بار مردود زک دے چکا ہے۔ واللہ سپاہیو، اس کے خون کا پیاسا۔

بساطی: یہاں خون بھی خشک ہو گیا ہے۔ خون کجا۔

دل سوختوں کے تن میں نہیں خون بجز آتش

سر کٹ کے نہ خوں شمع کا گل گیر سے ٹپکے

افسر: میں اس خبر سے بہت خوش ہوا کہ جس وقت سرکاری سپاہیوں نے اس ناہنجار کو گرفتار کیا۔ اس وقت اس پر ایک اور بھی کوہِ مصیبت گرا تھا۔ خوب ہوا۔

راوی: ایسے بدنفس خونیوں پر خدا کی مار۔ ان کا نفسِ امّارہ نفسِ مطمئنہ پر غالب ہے۔ اور یہ بالکل شیطانِ مجسّم ہیں۔ انسان کے زمرے سے اُن کو خارج سمجھنا چاہیئے۔

اے نفسِ پلید آدمی بن

کتے میں ولی کی خصلتیں ہیں

بساطی نے کہا۔ یہ وقت غریبوں پر ظلم ڈھانے کا نہیں ہے اس وقت اپنے ملک کی طرف سے جان لڑاؤ۔

بساطی کی نسبت حکم ہوا کہ چھ برس قید سخت بھگتے اور ہر مہینے کے آخری ہفتے میں قید تنہائی دی جائے۔ پورے سات روز قید تنہائی اور باقی قید بامشقت اور اگر کوئی شخص ملازم یا غیر سرکاری بساطی کے گھر کے حال سے اس کو اطلاع دے یا کسی نہ کسی کی رعایت اُس کے ساتھ ظاہر کرے، یا اس امر کی کوشش کرے کہ بساطی کو قید خانے کی سختی کم معلوم ہو، تو وہ دس برس قید کی سزا پائے گا۔ بساطی کو کسی ایسے قید خانے میں بھیجیں جو اس کے مکان سے کم سے کم دو سو کوس کے فاصلے پر ہو۔

بساطی بیچارہ اسی روز قید خانے بھیجا گیا۔ کیا بدنظمی ہے۔ اَلاَمان۔ اَلاَمان۔ جس کو چاہا تباہ کر دیا۔ اَب اس عروس و ماہرو کی مصیبت و پریشانی کا حال سُنیئے۔

پولینڈ کی ماہرو شہزادی کے عارضِ درخشاں پر فرطِ غم سے زردی چھا گئی۔ دل کا کنول کمھلانے لگا۔ روس کے اَظلم افسروں نے کئی بار چاہا کہ اس گلبدن کے نقدِ عصمت کو محلِ امتحان پر کسیں، مگر رعبِ حُسن سے کسی کی جرأت نہ پڑی اکثر افسر فوجی وردیاں ڈانٹے آلاتِ حرب لٹکائے بن ٹھن کے آتے اور سج دھج دکھاتے تھے مگر آزاد کے مقابلے میں ایک بھی نہیں جچتا تھا۔

ایک خوش آتی نہیں تیرے بغیر

لاکھ شکلیں دل کو دکھلاتے ہیں ہم

شہزادی ان افسرانِ روس کے چتونوں سے تاڑ گئی تھی کہ میرے حسنِ بلاخیز نے ان کو مبتلائے عشق کر لیا۔ گو

وقت بناؤ چناؤ کا نہ تھا۔ مگران کے رجھانے اور قتلِ عام کرنے کے لیے طوعاً و کرہاً بن ٹھن کے رہتی تھی۔ کہ اس سے اور کچھ اگر فائدہ نہیں تو اس قدر تو مطلب نکلے گا کہ حسنِ دل فریب کے رعب سے کسی قدر کم تعدی کا خیال دل میں جاگزیں ہو۔ ایک روز یہ رشکِ حور دور از قصور ستم کا نکھار کرکے مسیح نشین جار باش امارت تھی کہ رسالہ کے ایک کپتان نے جو حسن و جمال میں اپنی آپ ہی نظیر تھا خواص سے کہا ذرا ہماری اطلاع کردو ہمیں سرکاری پیغام سنانا ہے۔ خواص نے شہزادی کی خدمت ہمایوں میں عرض کیا حکم ہوا بلاؤ۔ کپتان جنگی وردی پہنے رپ رپ کرتا ہوا آیا۔ تو دیکھا کہ شہزادی کا چہرۂ انور بن گیے چاند پر طعنہ زن ہے۔ اور از سرتاپا نور کا عالم ہے۔ ادائے معشوقانہ نے ستم ڈھایا۔ ناوک جنوں جگر پار ہوگیا۔ چشمِ خونریز نے کہیں کا نہ رکھا۔

کپتان: حضور دریافت کیا گیا ہے کہ حضور کو کسی طرح کی تکلیف تو نہیں ہے۔ ابھی حضور کی نسبت کوئی خاص حکم نہیں آیا ہے۔

ارے ظالمو۔ از برائے خدا بے گناہوں کا خون کیوں گردن پر لیتے ہو۔ اس مہاجن کی جان لی۔ اس کی بے شر بیوی کو مثل ماہی بے آب تڑپایا۔

کپتان: غلام کو اس معاملے میں دخل نہیں ہے حضور۔

شہزادی: ان کی آہ خالی نہ جائے گی۔ یہ ظلم! اُف:

چال ایسی چل زمیں ٹھوکر نہ کھائے
اس میں کیا ظالم تجھے جانا نہیں

کپتان: حضور ہمارے جنرل سے اور اس ساہوکار سے دلی عداوت تھی۔ اس سبب سے اس کو گرفتار کرلیا ہے اور اس کا گھر بھر تباہ کردیا گیا۔ سپاہی اور فوج کے آدمیوں سے دشمنی پیدا کرنا عقل کے خلاف ہے۔ رہنا دریا میں اور مگر سے بیر۔ اور ایک اس مہاجن پر کیا فرض ہے ایسے ایسے ہزار ہا آدمی ناکردہ گناہ سزا پائیں گے۔ اب تو ہمارے بس میں ہیں۔

شہزادی: ہائے آزاد دل لگانے کی اچھی سزا دی۔ افسوس۔

کپتان: حضور اب ان کا نام ہی زبان پر نہ لائیے۔

شہزادی: واہ اس کا بھولنا میرے دل کی فنا پر موقوف ہے۔

کپتان: تو اس کے بار بار یاد کرنے سے بجز غم کے اور کیا نتیجہ ہے۔ حضور اور کسی بات میں دل بہلائیں۔ دنیا میں ایک سے ایک خوبرو جوان موجود ہے۔ اچھے شہزادے، اچھے امیرزادے جن کی جوانی پھٹی پڑتی ہے۔ چہرہ دیکھتے ہی انسان دنگ رہ جائے کہ اللہ اللہ، خدا نے ایسی ایسی صورتیں بھی پیدا کی ہیں۔ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ۔ آزاد کا بار بار تذکرہ کرنے سے حضور کے دل پر رنج اور بھی مستولی ہوجائے گا۔

شہزادی: اس رنج میں جو لطف ہے وہ کسی خوشی میں نہیں ہے:

اے غمِ دلدار سینہ سے نہ جا

ہجر میں دل تجھ سے بہلاتے ہیں ہم

اتنے میں ایک خواص نے آن کر بیان کیا حضور کچھ اور بھی سنا۔ یہ تو بڑا اندھیر کررہے ہیں۔ یہاں سے تین کوس پر دو بہنیں رہتی تھیں۔ دونوں کے میاں کھیتی کرتے ہیں۔ ایک سپاہی ہے اور ایک بہن کے میاں سے آپس میں عداوت تھی۔ بس سپاہی نے کھیت میں جاکر اسے گرفتار کرلیا۔ اور کہتا ہے کہ آزاد پاشا کے بھگانے میں تو بھی شریک تھا۔ وہ لاکھ لاکھ طرح پر بری ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ مگر اس کی کوئی سنتا ہی نہیں۔ شہزادی نے کہا۔ اس ظلم کا نتیجہ برا ہوگا۔ جب ہی تو نہلسٹ کے فرقے کو اس قدر زور ہوتا جاتا ہے۔ دوسری خواص بولی۔ اس اٹھوارے میں دو سو ستر آدمی مختلف حصّوں سے پکڑ کر آئے ہیں۔ اور سب پر یہی شک ہے کہ ان کی سازش سے آزاد پاشا رہا ہوئے تھے۔ ان میں ہزار میل فاصلے کے رہنے والے بھی ہیں اور تین حصے سے زیادہ آدمی اس پہاڑ کا نام بھی نہیں جانتے۔ آدھوں نے آزاد کا نام تک نہیں سنا۔ مگر مجرم قرار دیے گئے۔ دو عورتیں اس طرح زار زار روتی ہیں کہ سننے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ایک ان میں سے دریائے اوبی کے کنارے کی رہنے والی ہے اور کہتی ہے۔ کہ یورپین روس میں آنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ پولیس کی لاگ ڈانٹ کے سبب سے یہ تہمت تراشی گئی کہ آزاد پاشا کی سازش میں یہ بھی شریک ہے۔

کپتان نے ڈرتے ڈرتے قدم بڑھا کر شہزادی کے دستِ نازک میں ایک کاغذ دیا۔ اور بصد عجز کہا کہ حضور اس عرضی کو ملاحظہ کرلیں۔ شہزادی نے عرضی لی اور پڑھی۔ مضمون یہ تھا۔

حضور شہزادی بلقیس منزلت۔ جو شخص جان بکف حاضر ہو کر عرض حال کرے اس کی جان بخشی لازمۂ شان شہریاری اور شایانِ دبدبۂ جہانداری ہے۔ اور جب کہ حضور کا سا فرماں روا اور خادم کا سا غلام ہو تو اور بھی زیادہ ترحم چاہیے۔ حضور کی سطوت و عظمت و دبدبہ و طنطنہ کی ربع مسکون میں دھوم مچی ہے اور کیوں نہ ہو:

در امیری زجم و کے بود افزوں بشکوہ	گلشن خندہ بر آرائش افسر دارد
پنجمین چرخ دگر نیست مقامِ مریخ	کان چو سر ہنگ کنون جائے بریں در دارد
مہر دیدی کہ چساں دانۂ شبنم چنید	ہم چنیں روز جہاں تخمِ ستم بردارد
بسکہ در عالم دارائی و کشور گیری	ورزشِ قتلِ عدو شادی دیگر دارد

بے قرار است چناں آہن تیغش کہ مگر — خار در پیرہن خویش زجوہر دارد
توسنش راست جمالے کہ بہنگام خرام — عرق افشانی او ریزش اختر دارد
از تو جز داد نخواہم کہ در آئینی وداد
ایں چنیں کار نہ پاداش بہ کیفر دارد

میں نہراڈسا کا باشندہ ہوں۔ والد بزرگوار کو سَر کا خطاب حاصل تھا۔ اُن کی وفات کے بعد وہ خطاب مجھے ملا۔ والد مُبرور فوجِ بحری کے افسر تھے۔ جنگ قریمیہ میں کئی تمغے حاصل کیے۔ میرا بڑا بھائی ترکستان میں عہدۂ جلیلہ پر ممتاز تھا۔ عمِ بزرگوار نے تمام عمر سفارت کی اور میں فوج رسالۂ روس کا کپتان ہوں۔ عمر چوبیس سال کی، روپیہ میرے پاس کثرت سے ہے۔ شکل و صورت کا حال ظاہر ہے۔ اک ذرا نظر اُٹھا کے ملاحظہ کر لیجیے۔ باقی رہی تعلیم اس کا حال یہ ہے کہ میں روسی فرانسیسی ترکی اور جرمنی چار زبانیں جانتا ہوں۔ اور اور علوم میں خدا کے فضل سے طاق ہوں۔ مصوری میں آج تمام روس میں میری شہرت ہے۔

ع تھوڑا لکھنا بہت سمجھنا

اس لگاوٹ باز پری نے خط پڑھ کر پھاڑ ڈالا اور زیر لب مسکرا کر کہا۔ کچھ خیر ہے۔ تم یہاں جس کام کے لیے آئے ہو اس کی فکر کرو، ان باتوں سے تم کو کیا واسطہ۔ اور اگر پھر یہ بے ادبی کی تو پچھتاؤ گے۔ یہ کہکر نہایت تیکھی نظر سے کپتان کو از سر تا پا دیکھا، تو بیچارہ کانپنے لگا۔

چشم جادو اور بھی قتل کیے ڈالتی ہے کیا آنکھ ہے۔
جلائے اُس نے اس نے دم میں سو سو مار ڈالے ہیں
تری آنکھوں سے ہے شکوہ مسیح ابن مریم کو

شہزادی : کوئی تدبیر ایسی بھی ہے کہ میں اس بلا سے بچ جاؤں۔

کپتان : (ہاتھ جوڑ کر) ہاں ہے میں اس بات کا ذمّہ دار ہوں۔ اگر میری رائے پر کل معاملات چھوڑ دیے جائیں تو خطرے سے محفوظ رہیے۔

شہزادی: تم کس شہر کے باشندے ہو آدٹ کے۔؟

کپتان : ہاں حضور۔ ڈیوک جیروف کی بھانجی سے میری شادی ہونے کو تھی۔ مگر وہ بیچاری مرگئی۔ اخباروں میں چھپ گیا ہے۔

شہزادی: تم نے کس کس ملک کی حسین عورتیں دیکھی ہیں۔

راوی : اُف ری لگاوٹ۔ کپتان سمجھتے ہوں گے کہ اب سونے کی چڑیا ہاتھ آ گئی۔ شہزادی ریجھی۔ مگر اللہ اللہ خیر صلاح

کیننان: صدہا عورتیں ایسی ایسی حسین دیکھی ہیں کہ دنیا میں نظیر نہیں رکھتیں، مگر وہ سب ایک طرف اور حضور ایک طرف۔

سائے کی طرح وہ ترے پانوں پہ گر پڑے
اے حور جس پری کے تجھے روبرو کریں

مگر اب تو اس قدر حکم ہو جائے کہ عرضی پر لحاظ کیا جائے گا۔ اب تو میرا دل بے قابو ہے۔ مگر وعدہ چاہتا ہوں، اگر زبان مبارک سے اس قدر کہہ دیجیے کہ دیکھا جائے گا تو بھی روح خوش ہو جائے۔ اب تو اگر سچ مچ کی پری بھی سامنے آئے تو اس کی طرف رخ نہ کروں۔ اور وجہ کیا جس پری کی صورت دیکھ کر پریوں کے ہوش اڑیں اس کو چھوڑ کر کسی اور کو کیوں دل دیں۔ حوریں جس کے دیدار کی تمنا کرتی ہوں گی۔

تو قدم جس جا رکھے آنکھیں بچھائیں خوبرو
حلقۂ چشمِ پری حلقہ بنے خلخال کا

غرض ڈیوک کی دختر گلفام و شکر لب پر جان دیتا تھا۔ اس سانحہ و جگر دوز و روح فرسا نے مجھے نیم جان کر دیا۔ دو برس کامل دیوانوں کی سی کیفیت رہی اب خدا خدا کر کے ذرا دل قابو میں آیا تھا۔ کہ پھر چرکا کھایا۔ اب اس مصیبت میں گرفتار ہوں کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ گو علم عشق کا عالم ہوں۔ برسوں کڑی جھیلی ہے اس میں کوئی ہم سے کیا مقابلہ کرے گا۔

عالم ہوں علم عشق کا میں کر نہ ہمسری
اے عندلیب تو ہے پڑھی بوستاں تلک

مگر پھر بھی دل کا حال خدا ہی جانے کہ عشق بازی میں کیا گذرتی ہے۔ شہزادی تم نے میری جان پر ستم کیا۔

با من اے شوخ چہ بیداد نمایاں کردی
خانۂ عاشق جانباز چہ ویران کردی

ساری خدائی کے معشوقوں کو اگر تصویر تنویر دکھائی جائے تو خدا کی قسم کبھی حسن کا دعویٰ کیا معنی، نام تک زبان پر نہ لائیں۔ ایسا حُسنِ صبیح خدا اسی کو دیتا ہے جو محبوبِ خدا ہے۔ اللہ جمیلٌ و یُحِبُّ الجمال ترکوں کا قول صحیح ہے۔ یہ جوانی اور شباب اور اس پر آب و تاب سبحان اللہ۔

باعثِ غیرت خوبانِ جہانی امروز
نازکن ناز کہ اے شوخ جوانی امروز

شہزادی کی لگاوٹ بازی کام کر گئی۔ کپتان تو پہلے ہی سے کشتہ ناوک نگاہ تھا۔ اس معشوقۂ رشکِ لیلیٰ کی لگاوٹ دیکھ کر جامے میں پھولا نہ سمایا۔ اور اس درجہ مفتون ہوا کہ واقعی اگر وہ حکم دیتی کہ سمندر میں کود پڑو تو دریغ نہ کرتا۔ کپتان نے کہا کہ اگر اب حکم ہو تو قریب کی کرسی پر بیٹھوں۔ شہزادی نے خواص کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک کرسی ذرا فاصلے پر بچھا دی۔ اور کپتان کو بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔

کپتان: ع۔ شکر نعمت ہائے تو چندآنکہ نعمت ہائے تو

خواص: چھ آدمی اور پکڑ آئے ہیں وہ سب بلگیریا کے باشندے ہیں اور سب بے گناہ۔

شہزادی: طوائف الملوکی کی کیفیت ہے۔ اللہ رے ظلم۔

اب سنیے کہ دوسرے ہی دن حکم نادری آیا کہ پولینڈ کی شہزادی کی کُل املاک ایک دن کے اندر ہی اندر مسمار کردو۔ اور ایک مینار بنوا کر اُس پر شہزادی کی تصویر ہو، اور یہ فقرے لکھے ہوں۔ (اس شہزادی نے جس کی تصویر ہے اپنے ملک کے ساتھ دشمنی کی اور ترکی افسر کو جو ہمارے خون کا پیاسا ہے اپنے ہاں پناہ دی۔ اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ لہٰذا اس مینار پر یہ کندہ کیا جاتا ہے کہ جس کی نظر پڑے وہ ایسی بدخواہ ملک عورت کو نظرِ حقارت سے دیکھے) اس کے علاوہ اور بھی کئی حکم تھے۔

۱۔ شہزادی کی کل خواصیں گرفتار کر لی جائیں۔

۲۔ دس کوس تک کی عورتیں اور مردوں کی تحقیقات ہو اور جس پر ذرا بھی شک ہو اس کو سزا دی جائے۔

۳۔ شہزادی کی کل جائیداد ضبط کر لی جائے۔

۴۔ مس کلیرسا کی نسبت تمام روس میں تحقیقات ہو کہ کہاں ہے۔ واقعی آزاد کے ساتھ چلی گئی۔ جیسا سب میں مشہور ہے۔ یا کسی نے گپ اڑا دی ہے۔

۵۔ جو لوگ مس کلیرسا کے جان پہچان عزیز رشتہ دار دوست ہوں سب کو ذرا شک میں بھی سخت سزا دی جائے۔

۶۔ پولینڈ کی شہزادی کے لیے ایک مقام تجویز کیا ہے۔ جو بالکل مضر صحت ہے بالفعل اس کو میدانِ جنگ میں تھوڑا ایش کرو۔

کپتان نے یہ خبر پائی تو زار زار رونے لگا اور اسی حالت میں شہزادی کے پاس گیا۔ اس کو گریہ وزاری کرتے دیکھ کر شہزادی سمجھ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔

شہزادی: کیوں کیوں خیر تو ہے۔ حواس ٹھکانے کرو۔

کپتان: حواس اور ہوش دونوں خیرباد کر گئے۔

داد را امید گاہا من کہ اندر عمرِ خویش | سختی و بے مہری از گردوں فراوان دیدہ ام
آں اسیر تیرہ روز ستم کہ عمری در جہاں | آفتاب از روزن دیوار زنداں دیدہ ام
ہر نفس پیچد ز وحشت دود سوا در سرم | بسکہ در شبہائے غم خواب پریشاں دیدہ ام
در پریشانی بداں ماتم کہ گوئی پیش ازیں | خویش را سرگشتہ در کوہ و بیاباں دیدہ ام
وہم ستولی ست برمن دیں چرا نبود کہ من | خود چہ نومیدی زگرد شبہائے دوراں دیدہ ام

لاغر ز انساں کہ ہر گہ موج بیتابی زدہ است
دل زپہلو چوں می از پہلو نمایاں دیدہ ام

شہزادی: (آہ سرد بھر کر) میں سمجھ گئی۔

کپتان: مجھ سے (رو کر) اس وقت (بہت رو کر)

شہزادی: دل دھڑک رہا ہے۔ یا خدا کیا یہ عیش و عشرت اسی دم تک کا تھا۔ یہ آزاد سے اسی لیے دل ملایا تھا۔ کہ دُبھے دُبھے رنج سہوں۔ ہے ہے غضب ہو گیا۔ اب صاف صاف بتاؤ۔

کپتان: جانی (ہنس کر) معاف کرنا۔ یہ لفظ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ تمہاری نسبت سخت حکم آیا ہے۔

شہزادی: ہاں! پھر کوئی چارہ بھی ہے (آبدیدہ ہو کر) ہائے کس ناز سے ماں باپ نے پالا تھا اور کس کس طرح میں نے دعا مانگی تھی کہ یا خدا بڑھ کے میں لاکھ دو لاکھ میں ایک ہوں:

دہ بمن اے رازق برنا و پیر | حُسن و جمالے کہ بود دل پذیر
یوسف اقبال بخواہم رساں | ہم چو زلیخا بہ شبابم رساں

پس ز تو خواہم کہ جوانم کنی
رونق خوباں جہانم کنی

مگر یہ معلوم ہی نہ تھا کہ جوانی اور حُسن ہی آفت ڈھائے گا۔ (آنسو پونچھ کر) دل لگانے کی خوب سزا پائی۔ آزاد ارے کہیں سے تو صورت دکھا ظالم۔

خلوت میں تیرے یار نہ جلوت میں مجھ کو پائے
باتیں جو دل میں بھر رہی ہیں سو کہاں کہوں

کپتان: ایک تدبیر ہے اگر مانو اور منظور کرو۔؟

شہزادی: (آہ سرد بھر کر) اب بھی نہ منظور کروں گی

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خواص نے آن کر عرض کیا۔ حضور دو افسر آئے ہیں کہتے ہیں کہ آپ کی نسبت جو حکم آیا ہے، وہ سُن لیجیے۔ اور یہ محلسرا خالی کیجیے۔ شہزادی کو سنتے ہی سکتے کی سی کیفیت ہوئی۔ کہا کہ دو اس وقت میری طبیعت ناساز ہے اور میرے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔ اگر ذرا تامل کریں تو احسان ورنہ اختیار بدست مختار ہے ہے ابھی کل کی بات ہے کہ اس والا گوہر، اور عظمت مآب شہزادی کی ادنیٰ خواصوں نے روسی کرنل کو ڈانٹ بتائی تھی، اور آج وہ خود کہتی ہے کہ اگر ذرا تامل کرلو تو احسان ہے۔ آیندہ اختیار بدست مختار۔ زمانے کا بھی کیا اختلاف ہے۔ اس وقت شہزادی کے دل کا عجب حال تھا۔ دیوانی کی طرح کبھی اٹھتی۔ اور کپڑے چاک کرتی تھی۔ کبھی دیواروں سے سر ٹکراتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ خوب زور سے روئے مگر پھر سوچتی تھی کہ یہ افسرانِ فوج اپنے دلوں میں کیا سوچیں گے۔ کپتان وفورِ الم سے بولتا تھا۔ چالتا تھا۔ شہزادی نے اپنی خواصوں کو حکم دیا کہ نفیس سے نفیس بے بہا جوڑا نکالو۔ اور کل جواہرات حاضر کرو۔ دو گھنٹے میں لباس بیش قیمت اور زیور و جواہرات سے آراستہ ہو کر دُلھن بن کے ایک قیمتی کرسی پر بصد شانِ امارت متمکن ہوئی اور حکم دیا کہ دونوں کو بلاؤ، دونوں روسی جس میں ایک افسر اور دوسرا اس کا اٹاچی تھا آئے اور اس گوہر شاہوار دریائے حسن وجمال و مہر نیر کستان جمال حیرت انگیز کو دیکھا تو ؎

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

افسر: (آہستہ سے) میں جو کچھ کہنے آیا تھا سب بھول گیا۔
اٹاچی: (کانپتے ہوئے) افسوس، صد افسوس، اس کانِ حُسن، جانِ حُسن، روحِ روانِ حُسن کے نام اور یہ حکم نادری، مجبوری ہے۔
شہزادی: جو کچھ میرے اعمال میں لکھا گیا ہے اُس سے مجھے بھی اطلاع دو کیا حکم کیا ہے۔ پھانسی کا حکم ہے قتل کا حکم ہے۔ ہے ہے آزاد۔ ارے کافر تیرے ہی سبب سے میری جان پر بن آئی۔ اور تیرا کہیں پتا ہی نہیں ؎

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست
تونیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

اب مجھے صاف صاف بتاؤ کہ میں اپنے قتل کی اپنے آپ تیاری کروں، یہ حکم زارِ روس نے دیا ہے۔ یا وزیر صیغۂ جنگ نے یا کمیشن نے ذرا میں خود بھی وہ حکم دیکھنا چاہتی ہوں ؎

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محفل لگی ہوئی

افسر: قتل یا پھانسی کا خدانخواستہ ذکر ہی کیا ہے۔

شہزادی: وہ جو کچھ ہوگا قتل اور پھانسی، دونوں سے بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ کم نہ ہوگا۔ پھر اب جو کچھ ہو۔ ہرچہ بادا باد۔

افسر: اب آزاد کا نام بھی زبان پر نہ لائیے۔

اٹاچی: ورنہ شاید اس سے زیادہ مصیبت پڑے۔

شہزادی: جب عزت گئی۔ نام مٹا۔ دولت پاس نہ رہی۔ سزا پائی قید ہوئی۔ جان کے لالے پڑے تو اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔

اٹاچی: شاید بر سر رحم آئیں۔ ہمارے نام حکم ہے کہ آپ کو محصور نہ لیجائیں اب آپ کو یہاں سے وہاں چلنا ہوگا۔

شہزادی: جو کچھ حکم ہو اب تو برائے بس میں ہوں۔

اٹاچی: آپ کی پیش خدمتیں سب گرفتار ہوں گی۔

شہزادی: افسوس، کرے کوئی دھرا جائے کوئی۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ ان بیچاریوں کی کیا خطا ہے، مگر حکم حاکم۔

اٹاچی: آپ کا کُل مال واسباب ضبط کر لیا گیا۔

شہزادی: جب میں خود ہی ضبطی میں ہوں تو مال واسباب کیا شے ہے۔ مال جائے اس کا غم نہیں۔ میں قتل کی جاؤں سزا۔ مگر ان بے چاریوں نے میری خدمت کر کے یہ پھل پایا اور خدا جانے کیا کیا حکم جاری ہوں۔

افسر: مس کلیرسا کی نسبت بھی سخت حکم آیا ہے۔ ان کے اعزہ اقربا سب گرفتار کیے جاتے ہیں اور سب سزا پائیں گے۔

شہزادی: آزاد کی چاہ نے ایک مجھی کو کنوئیں نہ جھنکوائے بلکہ بہت سے گھر گھائل کیے خدا جانے کون کون اس میں تباہ ہوگا۔

اک میں ہی دل جلا ہوں تو کافی ہے آب تیغ
کیوں کر بجھے گی آگ یہ گھر گھر لگی ہوئی

عشق بلا خیز نے اس گل رخسار کو یہ روز بد دکھایا۔ عشق بھی بلائے بے درماں ہے۔ اس کے پھندے میں جو پھنسا وہ کہیں کا نہ رہا۔

مقتل عشق کی جانب جو خبر ہو وہ چلے　　پوچھنے پھول شہادت کے وہ پھولے وہ پھلے
سر کو جانباز جھکا دیتے ہیں خنجر کے تلے　　کبھی خنجر کبھی تلوار سے کٹتے ہیں گلے

شوق کامل کی جو تائید ہوا کرتی ہے
روز نت بانیوں میں عید ہوا کرتی ہے

یہ وہ ہے تیر کہ سینے سے گذر جاتا ہے یہ وہ خنجر ہے کہ تا ناف اُتر جاتا ہے
پانوں رکھتا ہے جو اس راہ میں گر جاتا ہے آنکھ کھلتے ہی یہاں نور نظر جاتا ہے

سرفرازوں کو بھی سرسام ہے دُھنتے ہیں
غافل اس بھاڑ میں دانوں کی طرح بھنتے ہیں

شہزادی نے کہا خیر پھر تن بہ تقدیر۔ جو کچھ مصیبت پڑے گی بھگتوں گی۔ اب کوئی چارہ تو ہے نہیں۔ مگر مجھے کس طرح لے چلو گے۔ بے عزتی کے ساتھ یا عزت سے۔ گو اب یہ پوچھنا ہی فضول ہے مگر تاہم اس قدر خیال ہے کہ چاہے اور جو کچھ حکم ہو، اس بے عزتی سے محفوظ رہوں۔ کہ گلی کوچوں بازاروں میں ادنیٰ ادنیٰ آدمیوں کے سامنے ذلت و خواری ہو، افسروں نے تسلی دی، اور کہا اس کا تو آپ کبھی خیال ہی نہ کریں۔

الغرض اسی روز شام کو شہزادی کہسار کو خیر باد کہہ کر فوج کی حراست میں بادیدۂ تر مستعد روانگی ہوئی۔ کل اسباب شاہی اور عمارات عالی شان اور باغ دلکش اور جواہرات و زر و زیور سرکار میں ضبط کیا گیا۔ پیش خدمتیں خواصیں سب گرفتار اور زیر حراست ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ شہزادی کی یہ کیفیت کہ ہر شے پر حسرت کی نظر ڈالتی تھی، مگر فرط الم سے اشک تک خشک ہو گئے۔ بس کبھی اتنا تو کہتی تھی کہ واہ ری تقدیر۔ جس کو باعث آرام سمجھے تھے وہی دلی دشمن نکلے۔

سمجھے تھے جس کو یار وہ نکلا ستم شعار کیا جانتے تھے جامۂ گل میں نہاں ہے خار
بزم طرب میں رکھ کے قدم دل ہوا فگار آئینہ ہو گیا ہمیں شمشیر آبدار

بیمار کی قضا ہو تو اکسیر کیا کرے
تقدیر جب ہو یہ کوئی تدبیر کیا کرے

مجھے کیا معلوم تھا کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔ سوا خدا کے کوئی عیب دانی کا دعویٰ کر نہیں سکتا۔ افوہ۔ اس روز میں کس قدر محفوظ تھی جب آزاد سے ہم کنار ہوئی مارے خوشی کے جامہ میں پھولے نہیں سماتی تھی مگر جس کو گل سمجھی تھی وہ کانٹے کی طرح پہلو میں چبھا۔ جس کی زلف چلیپا کا عشق تھا اُسی نے زنجیر پہنائی۔ اللہ اللہ کتنا نیچا دیکھا۔ کچھ ٹھکانا ہے کہاں میرا وہ غرور اور کہاں یہ حال۔ بس آزاد سے نظر کا لڑنا غضب ہو گیا۔ دیکھتے ہی سحر کر دیا۔

جادو کیا کہ تم نے اُڑائے ہمارے ہوش
افسوں کیا کہ عشق کا پیدا ہوا یہ جوش

خواصوں کی گریہ وزاری کا حال کچھ نہ پوچھیے۔ غل مچا مچا کر کبھی فوج والوں کو کوستی تھیں کبھی اپنے

طالع واژگون پر افسوس کرتی تھیں۔

ا۔ یا خدا ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ یہ دن دیکھا۔

۲۔ ہے ہے ہماری بادشاہزادی اور یوں گرفتارِ مصائب ہو۔ جو اب تک اس ٹھاٹھ اس ناز و نعمت اس آن بان سے رہی وہ اب قیدیوں میں شمار کی جائے۔ حیف صد حیف۔

۳۔ یا الٰہی یہ کیا ہوتا ہے۔ دنیا سے الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھے تھے مگر بخت بد نے اتنی بھی اجازت نہ دی۔

۴۔ اب آخرش چلنا کہاں ہوگا۔

۵۔ جہاں ہماری نحوست ہمیں لے جائے اگر ہم سب کو پھانسی دو اور ہماری بادشاہزادی بچ جائے تو ہمیں انکار نہیں۔

شہزادی: میرے غرور کی یہی سزا تھی۔ ؎

سرکشی بندۂ عاجز کو بہت بے جا ہے   اِک کفِ خاک ہے انسان کو رُتبہ کیا ہے

ایک کا ایک ہے سرکوب کہ یہ دُنیا ہے   ہے جو فرعون یہاں اس کے لیے موسیٰ ہے

کبر کس کس کے لیے باعثِ تذلیل ہوا

مُوردِ طعن تکبّر سے عزازیل ہوا

خواص: حضور غرور تو چھو نہیں گیا تھا۔

دوسری: اب اس کا ذکر ہی کیا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہوا۔ اور جو ہونا ہوگا وہ اب ہوگا۔ اللہ کرے سب بلا ہم پہ آجائے مگر ہماری سرکار پھر بدستور اسی طرح چین کریں۔

شہزادی کل خواصوں سے رخصت ہوئی، اور سب سے بخندہ پیشانی ملی۔ گو دل پر جو گذرتی تھی۔ اس کا حال ظاہر ہے مگر دل کو بہت مضبوط کیا۔ اور مستعد ہو گئی کہ جو کچھ سزا دی جائے گی برداشت کروں گی۔ اُف کا کلمہ زبان سے نہ نکالوں گی۔ خواصیں اپنی شہزادی کی ابدی مفارقت کے وقت غش میں آگئیں اور شہزادی کا دل باوصف ضبط بھر آیا۔ جس وقت خواصیں اپنی مہربان شہزادی اور شہزادی اپنے پیارے مسکن سے جدا ہوئی ہر سمت بیکسی برستی تھی۔ روسی افسر خود زار زار روتے تھے۔ شہزادی نے تو دل کو مضبوط کر ہی لیا تھا۔ ذرا اُف تک نہ کی مگر چلتے وقت جبکہ کہرام کی آواز کانوں میں آواز آئی تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ بڑی دور تک خواصوں کی شیون و بکا کی آواز آیا کی یہ آواز شہزادی کے دل پر تیر سے زیادہ اثر کرتی تھی۔ فوج پیچھے پھر کر دیکھتی جاتی تھی اور کل حاضرین اس گوہر کان امارت و شہر یاری کی حالت پر افسوس کرتے تھے۔

آٹھ میل تک ہر مقام پر ہزار ہا آدمیوں کا غول ٹھٹ کے ٹھٹ جمع دس میل کے سفر کے بعد فوج کا پڑاؤ پڑا۔ شہزادی کے لیے ایک نہایت خوشنما اور بیش قیمت چھولداری نصب ہوئی جب تین چار گھنٹے گذر گئے تو کپتان ان کی چھولداری میں آیا۔ اور یوں ہمکلام ہوا۔

کپتان : اگر اجازت ہو تو حاضر ہوں کچھ کہنا ہے۔

شہزادی : ہونھ ! اب اجازت کس کی اب تو قیدی ہوں۔ اور تمہارے بس میں ہوں۔ وہ دن اب کہاں نصیب ہوں گے۔

کپتان : شہزادی اب بھی سویرا ہے۔

شہزادی : اب کیا ہو سکتا ہے۔ فقط اس قدر خیال ہے۔ کہ دیکھیں قید کی سزا دی جاتی ہے یا موت کی۔ اگر قید ہوئی تو مر جاؤں گی اور اگر پھانسی دی گئی تو جان جائے گی مگر مجھے قید سے پھانسی پسند ہے۔

کپتان : قید اور پھانسی دونوں سے بہتر ہے کہ بھاگ چلیں۔

شہزادی : واہ کہیں ایسے ایسے قیدی بھاگ سکتے ہیں بھلا۔

کپتان : اچھا اس سے تم کو کیا واسطہ۔ ہم سمجھ لیں گے۔

شہزادی : اگر کسی طرح ان موذیوں سے چھٹکارا ملے تو کیا پوچھنا ہے۔ جیبن ہی جیبن لکھتا ہے۔ لیکن یہ ایسے غافل کیوں ہونے لگے۔

کپتان : آپ فقط اس قدر فرمائیں کہ بھاگ چلنا منظور ہے یا نہیں۔ اگر منظور ہو تو بسم اللہ۔ مگر میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔ اور اس کا انعام بھی لوں گا۔

شہزادی : انعام دینے کے قابل تو اب نہیں ہوں۔ مگر۔

کپتان : اگر مگر کی ضرورت نہیں۔ جو انعام مانگوں وہ پاؤں۔

شہزادی : منظور۔ مگر ایک امر مستثنیٰ ہے باقی سب منظور۔

کپتان : واہ میری جان معرض خطر میں ہو تو مستثنیٰ امر میں کیوں ماننے لگا صاف صاف یہ ہے۔ اچھا آپ کیا سمجھیں۔

شہزادی : کپتان۔ اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھو (رونے لگی۔)

کپتان : (آنسو پوچھ کر) کیوں گھبراتی ہو۔

شہزادی نے بدحواس ہو کر کپتان کے زانو پر سر رکھ دیا اور لپٹ کر اس قدر زار زار روئی کہ اَلامان کپتان دل میں خوش ہو گیا کہ اس نازنین عنبر مو کو اب پھندے میں لے آیا آنسو برابر پوچھتے جاتے۔

شہزادی: ہائے اب کیا ہوگا۔ (ہچکی)، یا خدا جانے کس کس کی جوتیاں کھائی ہیں کس کس کی گالیاں سننی ہیں (ہچکی)، یا خدا اسی دم موت آجائے۔

کپتان: خدا نہ کرے میں نے تم کو سیدھا ڈھرا بتا دیا۔ اب کیوں اس قدر پریشان ہوتی ہو۔

شہزادی: (کپتان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر) ہے ہے یہ کیا ہوا۔

کپتان: (بوسہ عارض لے کر) پیاری خدا را اس طرح نہ رو۔ ورنہ سچ کہتا ہوں کہ میرا دم ہی ٹوٹ جائے گا۔

شہزادی: میں تو نہ روؤں مگر جب دل بھی مانے، ہائے آزاد کے پاس کس کو بھیجوں۔ وہ ہو تو شاید بیڑا پار ہو جائے مگر۔ ؎

کون ہمدرد ہے ایسا کہ وہاں تک جائے ۔۔۔ جس طرح ہو اُسے سمجھا کے یہاں تک لائے

نامہ لکھوں تو نظر اور ہی عالم آئے ۔۔۔ جس کو جانے کو کہوں راہ مجھے بتلائے

مرغ ہو بے حرکت ٹوٹے ہوئے پر کی طرح

چھپ رہے چاہ میں قاصد بھی کبوتر کی طرح

کپتان: یہ تو خیال خام ہے کہ آزاد کمک کو آئیں۔

شہزادی: اگر میرے دل کے حال پر اُس کو آگہی ہو تو ضرور آئے۔

کپتان: جان جان۔ اُن کو تم سے محبت تھی کب۔

شہزادی: واہ محبت تو ایسی ہے جس کا حق ہے وہ مجھ پر فریفتہ ہیں اس پر مفتون اور واقعی اُس کا حسن ہی ایسا ہے

رُخ کی تشبیہ سے کس کس کو یہ پیارے نہ ہوئے

مہر مہ چرخ کے کب آنکھ کے تارے نہ ہوئے

کپتان: خیر۔ اب آزاد کی یاد کو دل سے بھلا دو۔ مطلب سے مطلب ہے اگر یہ شرط کر لو کہ بعد رہائی میری پیاری بیوی، اور میرے آغوش کی زینت ہوگی۔ تو مجھے جان جوکھم کرنے میں کچھ عذر نہیں۔

شہزادی نے کپتان سے کہا کہ مجھے اس شرط کے منظور کرنے میں بھی کوئی عذر نہیں ہے، کیونکہ میں اگر ڈرتی ہوں تو اس امر سے کہ میری بے عزتی نہ ہو۔ اگر میرے نام یہ حکم ہو کہ فلاں مقام کے قید خانے میں محبوس کی گئی تو میں خوشی سے قید خانے میں رہوں، اور رعیت کسی کو اپنی صورت نہ دکھاؤں۔ لیکن میں سوچتی یہ ہوں کہ اگر تمہارے ذریعے سے رہا بھی ہوئی تو انجام کیا ہوگا۔ گرفتار ہوں گی اور شاید اس سے زیادہ ذلت ہو۔ کپتان نے تشفی دی اور کہا میں فرقہ نہلسٹ کا ایک سرغنہ ہوں۔ مجھے کون ستا سکتا ہے۔

کپتان: تو اب قول سے نہ پھرنا۔ ہاں۔

شہزادی : کیا مجال۔ اگر تیرے ذریعے سے رہائی ہو تو بیشک بیوی بن کر رہوں۔ اب تم اس کی فکر نہ کرو۔

کپتان : تو یوں تھوڑا ہی رہائی ہو جائے گی۔

شہزادی : اس کا مطلب میں سمجھی بڑے شرم کی بات ہے۔

کپتان : نہیں نہیں۔ میرا اور منشا نہیں ہے مطلب یہ کہ پہلے زار کے پاس جا کر دیکھو کہ کیا حکم ہوتا ہے۔ اگر قید یا سزا کا حکم ہو تو میں اس وقت سمجھ لوں گا۔

یہ کہہ کر کپتان نے اُس گل نو دمیدۂ گلزار حُسن کے رُخسار دل نواز کا بوسہ لیا اور رخصت ہوا۔

اب سُنیئے کہ سپاہی اور افسر باہم طرح طرح کی باتیں کرتے تھے اور شہزادی بیچاری چپ چاپ سنتی جاتی تھی۔

سپاہی : حضور چھ سو آدمی پر ظلم کیا گیا ہے۔

افسر : ابھی ابھی ایسے ایسے خدا جانے کتنے سو ہوں گے۔

سپاہی : کئی عورتیں پکڑی آئیں۔ کئی مہاجنوں کا سرکاری حاکموں نے روپیہ لوٹ لیا اور جس نے ذرا چوں کی وہ عمر بھر کو تباہ ہوا۔ دس کوٹھیوں میں تو میں اپنے ہاتھوں آگ لگا آیا ہوں

افسر : ہمارا ایک پیسٹ تھا۔ وہ بھی مہاجن ہے۔

سپاہی : حکم ہو تو پکڑوا بلاؤں۔ یہ کون بات ہے۔

افسر : مگر وہ یہاں سے تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ اگر اس وقت کوئی بھیجا جائے تو فوراً پکڑ آئے۔

سپاہی نے وردی ڈانٹی۔ بیس جوان ساتھ لیے اور اُس مہاجن کے بھائی کو پکڑ لایا۔ کہا حضور چور حاضر ہے۔ مگر وہ نہ ملا۔ افسر نے کہا کیوں بچہ رشوت کا روپیہ لے کر ہضم کر گئے۔ اور جب مانگا تو بے بنائے تمہارے بھائی نے اور تم نے اور وہ جو تمہارے بڑے باپ بنے ہیں۔ سب نے مل کر سرکاری کام میں ہم سے مدد لی۔ اور روپیہ غائب غلہ۔ اب بتاؤ کیا سزا دوں۔ اس نے کہا صاحب مجھ سے واسطہ۔ باپ اور بھائی نے جو کیا وہ ان کے ساتھ گیا، مجھے آپ کیوں دق کرتے ہیں۔ وہ دونوں مر گئے۔ برسوں کی بات ہے اور اگر حکم ہو تو لا دوں۔ جو وعدہ کیا ہو اس کا دو چند بلکہ سہ چند۔ کپتان نے اس کی بیوی کے نام ایک خط لکھوایا اور جس قدر جی چاہا لکھوا لیا۔ وہ خط دیکھتے ہی روپیہ سپاہیوں کے حوالے کیا گیا۔ جب روپیہ آ گیا تو کپتان نے کہا اچھا چکما ہوا دیکھا اس طرح غیّا دیتے ہیں۔ روپیہ کا روپیہ لیا اور اب سزا کی سزا دیں گے حکم ہوا کہ ان کو گرفتار کرو۔ وہ مصیبت کا مارا شب کو وہیں گرفتار کیا گیا۔

اس کے بعد ایک عورت نے آن کر کرنیل سے کہا کہ کمبخت مجھے وطن سے یہاں پکڑ وا بلوایا، اور اب پھر پیٹ بھر کھانا بھی نہیں دیتا ہے۔ اور میری گود میں یہ معصوم بچہ کھیلتا ہے۔ کپتان نے نہایت بے رحمی سے حکم

دیا کہ اس کے بچے کو ہمارے سامنے اس کنوئیں میں پھینک دو۔ جس آدمی کی طرف اشارہ کیا تھا اُس شقی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً لڑکے کو ایک کنوئیں میں دھکیل دیا۔

راوی: اللہ ری نا خدا ترسی۔

عورت: (کنوئیں کی طرف جاکر) ارے میرے معصوم بچے۔

سپاہی: (جھڑک کر) اُدھر جائے گی تو تو بھی کنوئیں میں ہوگی۔

افسر: اس کو مارو۔ اور یہاں سے لے جاؤ۔

عورت: (روکر) یا خدا اس کے بال بچوں کو بھی اسی طرح کوئی زبردستی آدمی قتل کر کے بوٹیاں چیلوں کو دے۔

افسر: اس کی زبان داغ دو۔ ابھی ابھی داغو۔

شہزادی سے نہ رہا گیا۔ کانپتے ہوئے پہرے والے سے کہا از برائے خدا، میری طرف سے کہہ دو کہ بس اب اس کو زیادہ نہ ستاؤ۔

سویرے کوچ ہوا۔ اسی طرح کئی روز کے سفر کے بعد زارِ روس کے قیام گاہ تک پہونچے۔ افسرانِ فوج نے شہزادی کے کل حالاتِ مفصل سے زار، کو مطلع کیا۔ حکم ہوا کہ روبرو بلواؤ۔ شہزادی اسی آن بان سے آئی۔ جس آن بان سے شہزادیوں کو جانا چاہیئے۔ وہی ٹھاٹھ وہی عظمت وشُوکتُ۔

شہزادی: (ادب کے ساتھ سر جھکا کے پھرتن کے کھڑی ہوئی۔

زار: یہ کس کی پوشاک ہے۔

شہزادی: یہ خاص شہزادیانِ پولینڈ کی پوشاک ہے۔

زار: تمہارے پاس اس قدر بے بہا پوشاک کیوں کر رہی۔ افسرانِ فوج کے نام حکم تھا کہ کل اسباب چھین لو۔

شہزادی: میرا رعبِ حسن اور پھر یہ جانتے ہیں کہ بادشاہ کی بیٹی ہے۔ شہزادی ہے۔

زار: شہزادی تو ہو مگر شہزادیوں کی سی خو بو نہیں ہے۔

شہزادی: خیر نہیں سہی۔ اب تو قیدی ہیں۔

زار: تم سے بڑی بُری بات سرزد ہوئی۔

شہزادی: مگر اب صرف اس قدر عرض ہے کہ۔

زار: اب بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کس طرح سلوک کیا جائے۔

شہزادی: جس طرح بادشاہوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔

زار: افسوس ہے کہ تم نے اپنے ملک کا نام بدکیا۔

چو از قومے یکے بیدانشی کرد　　نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را
نمی بینی کہ گاوے در علف زار
بیالاید ہمہ گاوان دہ را

اگر تم کو بری کر دیں تو پھر سب کو جرأت ہو کہ گورنمنٹ کے مخالفوں کو مدد دیں۔ بڑے شرم کی بات ہے کہ صرف اغوائے شیطانی کے سبب سے تم اس قدر چوندھیا گئیں کہ روس کی عزت اور نام اور عظمت کا ذرا خیال نہ رہا تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ بادشاہ کی لڑکی ہوں۔

شہزادی نے گردن نیچی کر کے یوں جواب دیا۔ حضور عشق نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں خود سوچتی ہوں کہ مجھ سے یہ کیا حرکت سرزد ہوئی۔ مگر مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد۔ میں چوندھیا گئی تھی۔ عشق نے مجھے بالکل اندھا کر دیا تھا۔ ؎

یہ وہ موتی ہے لڑی جس کی طبیعت اس پر　　آبرو کھو کے ہوا خاک پہ غلطاں وہ بشر
یہ وہ یاقوت ہے رُلوائے جو خوں آٹھ پہر　　یہ وہ الماس ہے سو ٹکڑے ہو جس سے کہ جگر
آتش اس لعل کے گر آب میں پیدا ہو جائے　　دفعتًہ جل کے گہر سیپ میں چونا ہو جائے
یہ وہ بدنام ہے لے اس کا اگر صبح کو نام　　شام تک کھائے غم و غصہ غذا ہوئے حرام
اس کے اوصاف کا لیوے جو دہن سے کوئی نام　　شمع کی طرح زباں مُنہ میں جلے وقت کلام

اس پتنگے سے زمانے میں جگر جلتے ہیں
گو پریزاد بہت دور ہیں پَر جلتے ہیں

عشق نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب میرا التماس فقط اس قدر ہے کہ چاہے پھانسی قید قتل، جو سزا تجویز جائے مگر یہ نہ ہو کہ کوئی میرے باپ دادا کو جو پولینڈ کے حکمراں تھے میرے سبب سے بُرا کہے کہ فلاں بادشاہ کی بیٹی یا پوتی اس درجہ ذلیل کی گئی کہ سڑک کوٹ رہی ہے۔ یا ایسی نوبت آئے کہ قلی اور کاریگر اور دُکاندار اور بازاری آدمی مجھے گالیاں دیں، یا میری توہین کریں۔ حضور کو خدا نے شہنشاہ بنایا ہے اور میں واکے سلسلے سے ہوں لہٰذا حضور کو اس قدر خیال تو ضرور رکھنا چاہیے۔

زار نے تأمل کے بعد کہا مجھے تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے لیکن ملک کے لیے سیاست بھی ضروری امر ہے۔ میں بلا غور و فکر کوئی رائے نہ دوں گا۔ آزاد پاشا ٹرکی کا بڑا نامی سپاہی ہے۔ کئی جنگوں میں اس نے روسیوں کو شکست دی اور اس کی گرفتاری ہمارے حق میں اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے۔ تم نے اس سے شادی کر کے اپنے ملک کو ذلیل و خوار کیا اور رہا کر کے گورنمنٹ کو دشمن جانی بنا لیا۔ اور اُدھر

مس کلیرسا نے جس پر مجھے ناز تھا وہ لغو حرکت کی کہ روسیوں کو شرمانا چاہیے یہ کہہ کر افسران فوجی کو حکم دیا کہ اس شہزادی کو کسی عمدہ مکان میں قید رکھنا۔

شہزادی کی حفاظت اور حراست کے لیے پچاس کاسک اور سو پولیس کے کانسٹبل اور دو فوجی افسر مقرر ہوئے جن میں اس شبلین مو کا عاشق زار کپتان دل فگار افسر و سرغنہ تھا۔

جب اس لالہ عذار نے یہ خبر فرحت اثر سنی کہ میرا عاشق میری حراست کے لیے مقرر ہوا ہے تو جناب باری کی درگاہ میں شکریہ ادا کیا اور یقین کامل ہوا کہ وہ کسی نہ کسی تدبیر سے مجھ کو رہائی دے گا اور جو ذلت و خواری افسرانِ فوج کے سبب سے ہونے والی ہے اس سے مجھے محفوظ رکھے گا۔ اُس کپتان نے اُس روز اپنی معشوقۂ سیم تن کو صورت نہیں دکھائی۔ یہ انتہا سے زیادہ بے قرار و نعل در آتش تھی کہ بار خدایا یہ کیا ماجرا ہے بایں شوراشوری و بایں بے نمکی۔ کجا وہ زور شور اور عشق کی گرمی بازار۔ کجا یہ سرد مہری کہ پورے بائیس گھنٹے تک خبر ہی نہ لی ادھر جھانکا تک نہیں۔ دل میں شک پیدا ہوا کہ شاید اس وقت جوش مستی سے چوندھیا کر زبان سے کہہ دیا کہ مدد دوں گا اور ہم تم دونوں مزے سے زندگی بسر کریں گے اور اب شہزاغ کی گرمی چھنٹ گئی ہو اور سوچا ہو کہ اگر سازش کر کے مجھے رہا نہ کیا تو پیچھے صید بلا ہوگا۔ الغرض اس سرد مہری سے شہزادی کی رہی سہی امید بھی منقطع ہو گئی اس حالت یاس و نومیدی میں اس گل رخسار نے آزاد کو یاد کیا اور دیوانہ وار مضطرب حال ہو کر آپ ہی آپ کہنے لگی۔ واہ آزاد۔ واہ۔ تم وہاں۔ مس حسن آرا بیگم سے مصروف بوس و کنار اور ہم یہاں شاہد اجل سے ہم آغوش ہونے کی تیاریاں کریں۔ ؎

تم وہاں غیر کے ہاتھوں سے پیو جام شراب — آتش غم سے یہاں اپنا کلیجہ ہو کباب
تم کرو خواب گہہ ناز میں آرام سے خواب — خاک اُڑاتے پھریں ہم دشتِ مصیبت میں خراب
خندہ و عیش تمہیں گریہ و ماتم ہم کو
ہر مہینے ہو تمہیں عید محرم ہم کو

اتنے میں ایک شخص نے آن کر کہا۔ آپ کے واسطے یہ حکم ہوا ہے کہ ملاحظہ فرمائیے۔ شہزادی کے ہوش و حواس فختہ ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے کہ یا خدا کیا جانے کیا حکم ہوا ہے۔ بڑی دیر تک جرأت نہیں ہوئی کہ حکم پڑھے۔ جو شخص لایا تھا اس سے عاجزی کے ساتھ کہا۔ ذرا تامل کرو میرے حواس ٹھکانے ہو لیں تو میں پڑھوں۔

اب سنیے کہ جس مکان میں شہزادی مقید تھی اس میں دو درجے تھے، چھت پر دو کمرے۔ وہ دونوں اُنکے قیام کے لیے آراستہ کر دیے گئے تھے۔ کھڑکیوں کی راہ سے شہزادی دریا کی روانی دیکھ دیکھ کر اپنے کہسار کے

آبشاروں کو یاد کرتی تھی۔ کہ دفعتاً کپتان گھوڑے پر سوار سامنے سے آتا نظر پڑا۔ تو جان میں جان آئی۔ ان کے مکان قیام کے چاروں طرف ہر وقت دو دو کاسک اور چار چار کانسٹبلوں کا پہرا رہتا تھا۔ پھاٹک پر چار کاسک اور دس کانسٹبل۔ مکان کے حصۂ زیریں میں دو جوان شمشیر برہنہ اور بھری ہوئی بندوق لیے ٹہلتے رہتے تھے۔ چھت پر چار کاسک مسلح اور احاطہ مکان کے باہر بیس کانسٹبل مختلف مقاموں پر تعینات تھے۔ شہزادی سوچی کہ یا الٰہی اگر کپتان نے کوشش رہائی بھی کی تو میں جاؤں گی کدھر سے۔ مگر کپتان کو دیکھ کر کسی قدر تسلی و تشفی ضرور ہوئی۔ اور اس ڈھارس سے اتنی جرأت ہوئی کہ وہ کاغذ کھولا اور حکم آخری پڑھا جس میں یہ باتیں لکھی تھیں۔

۱۔ پولینڈ کی شہزادی کی نسبت یہ جرم بخوبی ثابت ہو گیا کہ اس کے ذریعہ سے روس کے دشمن ٹرکی کا ایک افسر فوجی جس کا نام آزاد ہے کچھ عرصہ تک امن میں رہا۔

۲۔ پولینڈ کی شہزادی نے اس افسر کو دیدہ و دانستہ اپنے ہاں جگہ دی۔ اور گو اُس کے علم و یقین میں تھا کہ یہ شخص مجرم ہے تاہم اس کے ساتھ خفیہ طور پر شادی کر لی۔

۳۔ پولینڈ کی شہزادی نے ایسے شخص یعنی آزاد کو جو قید ہو کر بحراست سپاہِ روس سیبیریا بھیجا جاتا تھا۔ اپنے سپاہیوں کے ذریعے سے دھوکہ دے کر پکڑوا بلایا۔ اور اس کو اپنے ہاں آرام دے کر اُس کی ساتھ شادی کر لی۔ اور پھر جب دیکھا کہ اس کی جان معرض خطر میں ہے تو اُس کو کافی مدد دے کر دریا کے پار بآسایش روانہ کر دیا۔

۴۔ پولینڈ کی شہزادی کی شادی جائز طور پر نہیں ہوئی اور نہ آزاد پاشا شادی کرنے پر راضی تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس زنِ بدوضع کی خواہش پوری کرنے سے جان بچے گی تو مجبور ہو گیا۔ لہٰذا اس عورت نے باوصف دعوائے شہزادگی خلافِ شرع کام کیا اور منہیات و معصیات سے باز نہ رہی۔

۵۔ پولینڈ کی شہزادی نے مس کلیریسا کو بھگایا اور اس کو آزاد کے ساتھ روانہ ہندوستان کیا اور ان دونوں کی جان کی حفاظت کے لیے اپنے آدمی ساتھ کر دیئے تاکہ وہ روسی فوج سے روسی زبان میں باتیں کریں اور کسی کو شک بھی ہو تو ان لوگوں کے سبب سے وہ شک رفع ہو جائے۔

لہٰذا حکم ہوا کہ پولینڈ کی شہزادی کا کل مال و اسباب و جائداد و ملکیت ضبط اور خاص پولینڈ میں تمام عمر کے لیے مقام لوسن کے مشہور جیل خانے میں قید کی جائیں اور ان سے کسی قدر سخت اور ذلیل کام لیا جائے۔

جو کمرہ ان کے لیے مقرر ہو اس میں بجز سقے اور باورچی کے اور کوئی نہ جانے پائے۔ دو وقت کھانا دیا جائے اور وہ کمرہ اس طرح کا ہو گا۔ کہ قدِ آدم تک پتھر کی دیواریں ہوں اس کے بعد لوہے کی ڈبل سلاخیں

تاکہ دنیا میں کسی کو نہ دیکھ سکیں۔

یہ حکم قضا شیم پڑھ کر رنگ فق ہو گیا۔ وہ آدمی حکم دکھا کر رخصت ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر میں شہزادی جو مارے بد حواسی کے زمین پر پڑی ہوئی چپکے چپکے رو رہی تھی کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو کپتان۔ کپتان نے آتے ہی اس دل شگفتہ غمزدہ کو زمین سے اٹھایا اور گود میں لے کر مسہری پر لٹایا۔

شہزادی: وہاں اس طرح کون مسہری پر لٹائے گا۔ (رو کر)

کپتان: (آہستہ سے) وہاں کہاں۔ کیا مجال۔ اے توبہ۔

شہزادی: (زار زار رو کر) وہاں تو انسان کی صورت بھی نظر نہ آئے گی۔ پولیس کا کالا جیل خانہ۔ ہے ہے آزاد کے عشق نے یہ گت کی۔ اور سچ پوچھو تو وہ ابتدا ہی سے گریز کرتا تھا۔

کپتان: (بہت آہستہ سے) تھوڑی سی برانڈی لایا ہوں۔

شہزادی: (ہاتھ جوڑ کر) کل تو جیل خانے میں چکی پیس رہی ہوں گی۔ یہ ناز و نعم کی باتیں اب کیسی۔ اب مجھے آج ہی سے زمین پر لیٹنے کی عادت ڈالنے دو۔

راوی: یہ کہہ کر شہزادی مسہری سے اتر کر زمین پر لیٹ رہی۔

کپتان: پیاری۔ ہائیں ہائیں۔ اٹھو۔ اٹھا کر پھر مسہری پر لٹایا۔ تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا کروں گا اطمینان رکھو۔

شہزادی: کپتان اس وقت ساری خدائی میں سوائے تمہارے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اور اگر میں سچ مچ بچ گئی جس کی امید نہیں تو تمہاری لونڈی ہو کے رہوں گی۔

کپتان: لونڈی ہو کے۔ واہ یہ کہو کہ میں البتہ تمہارا غلام ہو کے رہوں گا۔

شہزادی: کجا وہ عیش۔ کجا یہ روز بد۔ وہ کون عیش ہے جس سے میں محروم رہی۔ بادشاہی کا سامان اسباب جہاں داری حاصل تھا۔ اور آزاد کے ساتھ تو دو تین دن اس لطف سے بسر ہوئے کہ دل ہی جانتا ہے۔ ہائے۔

مجھ سے تنہائی میں کہتے تھے گلے مل مل کے
میں ہوں اور تم ہو اب ارمان نکالو دل کے

مگر۔

ع۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کپتان: میں نے پوری پوری فکر کر لی ہے۔ کانوں کان کسی کو خبر ہی نہ ہو اور ہم تم چل دیں۔ پھر کسی کی

کیا حقیقت ہے کہ ڈھونڈ نکالے۔ فرانس میں چل کر رہیں انگلستان چلے چلیں جرمن میں بود و باش اختیار کریں۔ روم میں قیام کریں خدائی بھری پڑی ہے۔ ہر مقام پر کوئی مواخذہ کر سکتا ہے بھلا۔ میں اس ترکیب سے نکال لے چلوں گا۔ کہ پہرے والوں کے فرشتے خان کو بھی خبر نہ ہونے پائے گی۔ میرا ایک دوست ہے۔ چوری اور ڈکیتی میں طاق، اسے سینکڑوں فن یاد ہیں اور اُن فنون کی کنہ سے ایسا واقف ہے کہ کوئی اس کا کیا مقابلہ کرے گا اس نے آج آنے کا وعدہ کیا تھا مگر سویرے سے منتظر ہوں اب تک نہ آیا۔

شہزادی: تم خود چلے گئے ہوتے اب چلے جاؤ۔

چاہ پیاسے تک نہیں آتا کبھی
دوڑ کر جاتا ہے پیاسا چاہ پر

کپتان: میں اس وجہ سے مضطر و دل گیر ہوں کہ حواس برجا نہیں۔

شہزادی: بات ہی ایسی ہے۔ میرا نامۂ اعمال دیکھا ہی ہوگا۔

کپتان: اونھ اوہ سب لکھا کریں۔ ہوتا کیا؟ اگر کوئی ہمارے مقابلہ کو آئے تو منہ کی کھائے۔ اچھے اچھے شجاعوں کے ہاتھوں سے ہتھیار گر پڑیں گے۔ تم ذرا نہ گھبراؤ۔

شہزادی: خدا نے اس وقت تم کو بھیجا۔ نہیں تو ساری خدائی میں میرا کون تھا۔ کوئی بھی نہیں۔ اس کی کریمی کے صدقے۔ خیر آزاد نے جو دل کو نشانۂ تیرِ غم بنایا ہے۔

کپتان: یا الٰہی بار بار وہی ذکر۔

ذکر رقیب عاشق شیدا کے سامنے
اچھی نہیں یہ آپ کی تقریر دیکھئے

شہزادی: اب ایسا نہ ہو کہ یہ باتیں ہی ہوتی رہیں اور وقت ہاتھ سے جاتا رہے۔ پھر خدا جانے کس کس کی سختیاں سہنی پڑیں۔ اگر میری رہائی چاہتی ہو اور خواہش ہو کہ ہم تم ہم کنار ہوں تو فکر سے ہرگز نہ چوکو۔ ورنہ ؎

ٹھہرے نہ ٹھہرے وصل کی تدبیر دیکھئے
کیا شعبدہ کرے فلک پیر دیکھئے!

روز اسی فکر میں رہی کہ شاید آج بچوں شاید خبر آئے کہ میں بری ہو گئی مگر انتظار ہی انتظار رہا۔ ہر روز نئی ہی خبر سننے میں آئی اور وہ جو جیتے جی انسان کو مار ڈالے۔

ہزار بار قیامت گذر گئی ہم پر
مگر ہنوز شبِ انتظار باقی ہے

کپتان: یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ کل ہی سے اس حکم کی تعمیل ہوگی۔
شہزادی: قیاس مقتضی ہے۔ اب آخر کب تک تساہل کو کام میں لائیں گے اتنے بڑے قیدی کے نام حکم ہوا اور فوراً اس کی تعمیل ہوئی کہیں برسوں لگائے جاتے ہیں۔
کپتان: ابھی وزیر جنگ کی رائے زار نے لی ہے۔ یہ حکم مجاریہ شہنشاہ ہے۔ مگر آخری حکم نہیں ہے۔ اب مجھے اجازت ہو تو جاؤں ورنہ پہرے والے دل میں سوچیں گے کہ شاید سازش کر رہے ہیں اور کل راز سربستہ کھل جائے گا۔ اچھا۔ اب اس قدر حکم ہو جائے کہ لب شیریں کا بوسہ لوں۔
شہزادی: ابھی موقع نہیں ہے۔ تمہیں بوسہ کی سوجھتی ہے اور یہاں جان پر بنی ہے۔ جب اس خرخشے سے بچیں تو تمہیں پھر اختیار ہے۔
کپتان: واہ اچھا خشک جواب دیا:

طالب وصل سے تم آج بھی جھگڑا لائے
پھر وہی کل کی طرح وعدۂ فردا لائے

یہ کہہ کر کپتان نے ایک بوسہ لیا اور رخصت ہو کر باہر آیا تو ایک کاسک نے کہا۔ حضور روس میں ایک بے گناہ بھی نہ بچے گا۔ ہم لوگ تو خبر کے لیے بدنام تھے ہی، مگر افسوس ہے کہ افسروں نے ہمارے بھی کان کاٹے اس وقت اس شہر میں ایک سو اڑتیس مہاجن گرفتار ہیں۔ اور ان سے زبردستی کی جاتی ہے کہ جس قدر روپیہ زر و زیور جواہر ہے سب لا کے جمع کر دو۔ ورنہ تم قید کیے جاؤ گے اور مال و اسباب سرکار میں ضبط ہو جائے گا۔ اٹھتر ساہو کار ہمارے پاس قید کر کے بھیجے گئے ہیں۔ کسی پر کوئی جرم قائم کر دیا۔ کسی پر کوئی۔ اس کس مپرسی کا کیا ٹھکانا ہے۔ صدہا عورتیں تباہی کے گرداب میں ہیں۔ گورنمنٹ کچھ شنوائی نہیں کرتی۔ افسوس تو یہ ہے۔ کپتان نے کہا۔ اس حالتِ جنگ میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔
کاسک: واہ سارا ملک خاک میں مل جائے اسی سبب سے تو نہلسٹ کے فرقے کو فروغ حاصل ہے اور سبب کیا ہے آخر۔
کپتان: اسی باعث سے روس بدنام ہو گیا ہے۔
کاسک: اور حضور ستم ہے کہ نہیں۔ شہزادی اور آدمیوں کو مدد دے۔ کلیرسا اور آزاد کے ساتھ نکل جائے اور میں یہ بھی سن چکا ہوں کہ کئی افسر کوشش کر رہے ہیں کہ اس شہزادی کو قید خانے سے نکال لے جائیں۔ اور مزے سے شادی کریں۔
کپتان: (آگے بڑھ کر) پہرے پر ضرور رہنا۔

کاسک : حضور خوب چوکس رہتا ہوں۔

کپتان صاحب کے پیٹ میں چوہے چھوٹے کہ یہ بے ڈھب ہوئی یہ کاسک باتوں باتوں میں سب کچھ کہہ گیا۔ ایسا نہ ہو جاکر کہیں جڑ دے، تو لینے کے دینے پڑیں۔ دھر لیے جائیں۔

دید گیسوئے بتاں میں خطر سودا ہے
اور کچھ سوانگ نہ اے دل یہ تماشا لائے

اتفاق سے یہ تقریر کاسک کی شہزادی نے بھی سُنی۔ گویا پاؤں کے تلے سے زمین نکل گئی۔ سوچنے لگی شاید یہ کاسک میری اس کی تقریر کان دھر کے سُن رہا ہوگا۔ جب ہی اس کو معلوم ہوا ورنہ یہ اس نے کیا سمجھ کے کہا کہ بعض افسر شہزادی کی رہائی کی فکر میں ہیں۔ پھر مایوسی نے صورت دکھائی۔ اور طائر دل حسرت و حرمان کا شکار ہوا۔ ؎

بھرا ہے حسرتوں سے جس قدر دل اس زمانے میں
کبھی درہم نہ اتنے ہوں گے قارون کے خزانے میں

پھر دل کو سمجھایا کہ اس قید سے رہائی اور چھٹکارا پانا امر محال ہے کپتان آدمی جوان، اور رنگین طبع ہے۔ خوبصورت اور سنبل مو شہزادی نوخیز دیکھ کر ایسی باتیں شروع کردیں۔ جس سے میں بھی لگاوٹ کرنے لگی۔ جب عشق کیا تو اب خیالِ سزا کیا جو ہونا ہو وہ ہو سمجھا جائے گا۔

محیط عشق میں انسان مشتِ خاک تو کیا
پہاڑ ہو تو وہ گھل گھل کے کنکری ہو جائے

کپتان کو اپنی غلطی کا حال دوسرے روز معلوم ہوا جب شام کو افسرِ اعلیٰ نے شکایت کی، سرکاری چٹھی بھیجی کہ شہزادی کو اب تک جیل خانے کیوں نہ لے گئے۔ اگر سکریٹری صبغۂ جنگ کے پاس اطلاع بھیجی جائے تو کیسی ہو۔ تم کو لازم ہے کہ بمجرد رسید خط ہذا شہزادی کو قید خانے لے جاؤ۔ مگر اس قدر رعایت کی جائے کہ قید خانے تک سواری پر بھیجی جائیں۔ اور وہاں عام قیدیوں کے سے کپڑے نہ پنہائے جائیں۔ بلکہ سلسلۂ خاندانِ شاہی کا کسی قدر لحاظ رہے۔ یہ حکم پڑھتے ہی کپتان کے ہوش اُڑ گئے۔ اور کانپنے لگا۔ سوچا کہ اب کیا منھ لے کر شہزادی کے سامنے جاؤں۔ ایک لفٹنٹ کو بلاکر حکم دیا کہ یہ کام تم اپنے تعلق کر لو۔ لفٹنٹ نے معاً شہزادی کو اس سانحہ ہوش ربا سے اطلاع دی۔

لفٹنٹ : اب آپ قید خانے چلیں۔ آج ہی کا حکم تھا۔

شہزادی : کیا! قید خانے۔ تم کون اتنہ ہو۔

لفٹنٹ: میں لفٹنٹ ہوں مجھے میرے کپتان نے جو اس حراست کے افسر ہیں بھیجا ہے۔ سواری تیار ہے۔ تشریف لے چلیے۔ مگر آپ کے ساتھ رعایت کی جائے گی کہ جو کپڑے عام قیدی پہنتے ہیں وہ آپ کو نہ پہنائے جائیں گے سارے ملک کو آپ کی قید کا افسوس ہے اور ایک آپ پر کیا فرض ہے بہت سے بندگانِ خدا ناکردہ گناہ صیدِ اَلَم ہوئے۔ شہزادی کو یقین کامل ہو گیا کہ کپتان نے صرف دھوکا ہی دھوکا دیا تھا۔ دل ہی دل میں سخت افسوس کیا اور سوچنے لگی کہ بے وفا سے وعدے کا ثمرہ یہی ہوتا ہے۔ ؎

بیوفاؤں سے محبت کا نتیجہ ہے یہی — شوخ چشموں سے مودت کا نتیجہ ہے یہی
بے حیا لوگوں سے اُلفت کا نتیجہ ہے یہی — کج اداؤں سے مروت کا نتیجہ ہے یہی

ظلم عاشق پہ یہی طرزِ وفا ہوتی ہے
کیوں یہی چاہنے والوں کی سزا ہوتی ہے

شہزادی: اچھا چلیے۔ قیدی کو بھلا کیا عذر ہے۔ مگر۔

راوی: مگر کہہ کر غش آگیا اور گر پڑی۔

لفٹنٹ: ہاں ہاں! کوئی ہے۔ کانسٹبل۔

کانسٹبل نے آن کر مدد دی، اور جب تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو لفٹنٹ نے سمجھایا کہ ابھی اپیل کا موقع ہے۔ آج نہیں، برس بھر میں دو برس میں۔ کیا ہمیشہ روس میں یہی اندھیر رہے گا۔

شہزادی بادلِ محزون اٹھی اور زندان کے چلنے کو تیار ہوئی۔ کہا اے فلک بے رحم مجھ بے گناہ کو یہ دن دکھایا۔ میں اس قابل تھی کہ کسی فرماں روائے ثریا جاہ کج کلاہ کی زینت آغوش ہوتی۔ کسی خاقانِ جم مرتبت فریدوں فر کے محل کی رونق ہوتی۔ مجھے زندانِ بلا میں بھیجنا ستم ڈھانا ہے۔ اشعار عاشقانہ گاتی ہوئی وہ پری پیکر جانانہ سیم بدن بیتابانہ کوٹھے سے اُتری۔ ؎

اثرِ آتشِ سودا سے دوا جلتی ہے — تیرے بیمار کی صورت سے شفا جلتی ہے
میں جہنم میں جلوں یا نہ جلوں اُن کو کیا — واعظوں سے بھی طبیعت مری کیا جلتی ہے
شب فرقت میں بھلا ساتھ مرا کیا دے گی — شمع کو دیکھتا ہوں تا بکجا جلتی ہے
سوزِ دل سے ہوئی ہے آگ بھی پانی پانی — ٹھنڈی ٹھنڈی مری آہوں سے ہوا جلتی ہے
خونِ عُشّاق کا جاتا نہیں بالا بالا — برف سے پالے ہیں ہر سال حنا جلتی ہے
عشق نے اب تو کیا اور ہی عالم پیدا — زندگی تنگ ہے صورت سے قضا جلتی ہے
آتشِ عشق نے اک آگ لگا رکھی ہے — دل جدا جلتا ہے اور روح جدا جلتی ہے

سوزِ دل کا تو کبھی حال نہیں سنتا ہے

جان کیسی مری اے ناشنوا جلتی ہے

ایک دن وہ تھا کہ دس دس مشاطگانِ مہرانسا زلفیں بنانے کے لیے نوکر تھیں اور لوگ کہتے تھے کہ ؎

یہ خود بین ہو کہ دن دن بھر خود آرائی میں رہتے ہو

بسر ہو جاتے ہیں دو دو پہر زلفیں بنانے میں

خدا جانے یہ کس کی چاہ نے مجھے کنوئیں جھنکوائے۔ دل لگاتے ہی موت سامنے سے نظر آئی۔ اس سفاکی کے صدقے کہ دل تو چھین لیا اور قضا کو پیچھے لگا یا۔ ؎

قیامت ہے کسی کو پیار کرنا اس زمانے میں

قضا کا سامنا رکھا ہوا ہے دل لگانے میں

گاڑی پر سوار ہو کر شہزادی روانہ ہوئی۔ سو کاسک اور دو سو کانسٹبل اور ایک لفٹنٹ اور دو اور افسر ہمراہ تھے۔ جب بازار میں پہونچے تو ہزارہا تماشائی ادھر ادھر جوق در جوق جمع ہو گئے۔ کاسکوں کو دل لگی سوجھی، تو لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کیا۔ ایک بیوہ ضعیفہ نے شہزادی کو اس حالت میں دیکھ کر کہا۔ ہائے ہائے ارے لوگو یہ بادشاہ کی اولاد ہے۔ ارے ظالمو ذرا خدا سے ڈرو کچھ خوف خدا بھی ہے یا نہیں۔

کاسک: تو کون ہے بڑھیا۔

ضعیفہ: بیٹا میں سو برس سے اس ملک میں رہتی ہوں۔

کاسک: اس شہزادی کی کون ہے۔

ضعیفہ: کوئی بھی نہیں۔ پولینڈ میں میرا بھی مکان ہے، وارسا میں رہتی تھی۔ اب تو روسیوں کے ظلم سے وہاں سے نکالی گئی۔

کاسک: اس کو بھی گرفتار کرو۔ چل سانڈ۔ تو بھی اس میں شریک ہے کیا بڑھ بڑھ کر باتیں بناتی ہے۔

ضعیفہ: چل ہٹ مجھے ہاتھ لگائے گا تو تو جانے گا۔

راوی: ضعیفہ بیوہ عقل سے خارج ہے۔ کاسکوں نے گرفتار کر کے کمیشن کے حکام اولیٰ کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے چار پانچ روز کے بعد منجملہ اور بے گناہوں کے اس بڑھیا کو بھی قید کی سزا دی۔ اس اندھیر کو دیکھیے اور آگے چلے تو ایک شخص نوجوان نے جھک کر بڑے غور سے شہزادی پر نظر ڈالی۔ دس کانسٹبلوں نے سنگینوں سے اس کو اس قدر زخمی کیا کہ معاً دم توڑا۔ اور دس قدم چلے تھے کہ ایک مرد خوبرو نے شہزادی کو اس حالت زار میں دیکھ کر آہ سرد بھری اور اس کی مصیبت پر رحم کھا کے روسی زبان میں ایک شعر پڑھا۔

جس کا مطلب بالکل اس بیت کے مطابق تھا۔

نکل جائے گی سب کجی روسیوں کی
کبھی تو پھرے گا زمانہ ہمارا

لفٹنٹ نے فوراً اس کو روک لیا۔ اور کہا تم اپنے آپ کو قیدی سمجھو۔ ہم کو تم باغی معلوم ہوتے ہو اس حیرت زدہ نے کہا کہ حضور اس وقت میرا دل بھر آیا، اور میں سچ کہتا ہوں کہ آپ افسر لوگ اس قدر بدعت کرتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ مگر۔

غریبوں کا خدا فریاد رس ہے

لفٹنٹ نے دس کانسٹبلوں کو تھانے سے بلوایا اور اس آدمی کو زیر حراست حکام تحقیقات کے پاس بھجوایا۔ اور لکھا کہ یہ باغی شہزادی کو دیکھ کر ایک مرتبہ کوچ ئین کی طرف جھپٹا۔ مگر اس کا وار خالی گیا۔ دوسری مرتبہ میرے گھوڑے کی طرف حملہ کیا۔ اور قریب تھا کہ تلوار چلائے مگر فوراً پکڑ لیا گیا۔ حکام نے حسب معمول بلا تحقیقات سزائے موت کا فتویٰ دیا۔ اور دو روز کے اندر وہ ناکردہ گناہ عالم فانی سے پرواز کر گیا۔
اتنے میں قید خانے پر گاڑی داخل ہوئی۔ شہزادی نے قید خانے کی صورت دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر سوچی کہ اب تو اسی میں تا بکے خوف کھاؤں گی۔ شاید صبح شام جان ہی نکل جائے۔ فلکِ ناہنجار نے ستایا ہے تو کیا ہوا۔ شاید خدا قید خانے ہی کی ہوا اس لائے۔ اگر آج ہی جان جائے تو عزت کی عزت بچے اور گویا جی میں جی آئے۔

ڈالے گی ہم کو پیار سے آغوش میں زمین
کیا غم عدو جو چرخ، بدافعال ہو گیا

شہزادی گاڑی سے اُتری اور محبس کی طرف آہستہ آہستہ چلی۔ خدایا یہ وقت بد کسی کو نہ دکھائے۔ اب آنسوؤں کا تار بندھا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سانس آتی تھی۔
لفٹنٹ: آپ کے لیے اس کمرے میں خیر کچھ بستر سا بچھا دیا گیا ہے گو حکم تو نہیں ہے۔ مگر شہزادی ہیں آپ۔ اس کا ہم کو بھی پاس چاہیے۔
شہزادی: شہزادی کون ہے بھئی۔ مگر اب تو جیسے اور قیدی ہیں ویسی ہی میں بھی ہوں۔
لفٹنٹ: آپ کے لیے یہ لباس تجویز کیا گیا ہے۔
شہزادی: (آہ بھر کر)

تن عریاں سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

ایک کمرے میں جو کُل قید خانے میں ممتاز تھا۔ شہزادی لائی گئیں۔ لفٹنٹ نے کہا۔ کئی دن کے سفر نے آپ کو رہا سہا اور بھی مضمحل کر دیا۔ لفٹنٹ اور سپاہی اور کاسک اور کانسٹبل تھوڑے عرصے کے بعد روانہ ہوئے جیلر نے آن کر کہا۔ آپ کے لیے میں خاص جیلر مقرر ہوا ہوں اور میرے ماتحت پچاس سپاہی ہیں، اور دس کاسک مگر خوب یاد رکھیے کہ میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ کا جو جی چاہے وہ کھائیے اور فرمائش کیجیے اور جب جی چاہے آرام کیجیے۔ کچھ دن کے بعد میں آپ کو اس قدر اجازت دوں گا کہ آپ میرے ساتھ باغ میں ٹہلیں حضور مجھے نہیں جانتی ہیں، مگر میرا بوڑھا باپ نکن نامی آپ کے ہاں دربان تھا۔

شہزادی: ارے تو نکن کا لڑکا ہے۔ وہ تو ابھی پار ہی سال مرا ہے۔

جیلر: ہاں حضور میں نکن کا لڑکا ہوں اور حضور کا غلام بلکہ خانہ زاد۔

شہزادی: یہ بھی میری خوش نصیبی کی بات ہے۔

راوی: خدا نہ کرے کہ کسی پر مصیبت پڑے۔ جس شخص کا باپ شہزادی کے ادنیٰ دربانوں اور غلاموں میں تھا وہ اب شہزادی سے کہتا ہے کہ (کچھ دن بعد میں آپ کو اس قدر اجازت دوں گا کہ آپ باغ میں ٹہلیں۔) اور مزا یہ کہ (میرے ساتھ) اللہ رے انقلاب، نکن دربان نے بجز سلام کے شہزادی سے بات بھی نہ کی ہوگی۔ اور اسی نکن کا لڑکا اب شہزادی کی نگرانی کے لیے مقرر ہوا ہے۔ چاہے جس قسم کی تکلیف پہونچائے۔ اور چاہے جو اذیت دے۔ جس کا سلام شہزادی نہیں لیتی تھی اس کا لڑکا کہتا ہے کہ میں تم کو فلاں امر کی اجازت دوں گا۔ اب سُنیے کہ دوسرے روز نکن کی لڑکی جو اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ شہزادی کے پاس چُپکے سے گئی۔ اور ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میں نکن کی بیٹی ہوں۔ ایک مرتبہ حضور کے ملک میں اپنے باپ کے پاس گئی تھی، اور دو مہینے تک وہاں رہی تھی۔ مگر حضور کے سلام تک نوبت نہ آئی۔ اس فقرے نے شہزادی کو رُلایا۔ ہائے ستم۔ اُف رے انقلاب۔ نکن کی لڑکی نے روس کے افسروں کی بدعت کا حال بیان کیا۔ اور کہا حضور میری ایک ہمسائی پر ایک بار تہمت لگائی گئی کہ پولیٹیکل مفسدہ پردازی میں شریک ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس کا چچازاد بھائی مفسد تھا۔ اور وہ بیچاری بالکل بے قصور۔ مگر اس کو دو برس کی قید کا حکم ہوا اور اس نے قید خانے میں اتنی مصیبتیں جھیلیں کہ ناگفتہ وہ جس وقت اپنے جیل خانے کا حال بیان کرتی تھی بے اختیار آنسو نکل آتے تھے۔ اور کہتے کہتے اس بیچاری کو غش آجاتا تھا۔ تین برس کے بعد وہ بیچاری رہا کی گئی۔ سزا دو برس کی دی گئی تھی۔ مگر سال بھر اور قید خانہ بُھگتا۔ اور کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ کیا اندھیر ہے۔ جب اپنے ماں باپ کے پاس آئی اور رہائی پائی نو دس دن بھی اچھی طرح نہ رہنے پائی تھی کہ پولیس کے سپاہی اس کی تلاش میں پروانہ اجل لیے ہوئے

آن پہونچے اور گرفتار کرلے گئے۔ آرزو ہی رہ گئی۔ کہ اے کاش اس مصیبت زدی کا جرم تو معلوم ہو مگر اس آرزو کا خون ہوا اور وہ جلاوطن کردی گئی۔ اور اس قید خانے میں حاکموں کا قاعدہ ہے کہ قیدیوں کو پٹواتے ہیں۔ اور بعض کو برچھی کی نوک سے زخمی کرکے اُس پر نمک چھڑکتے ہیں۔ ان کل باتوں کے مقابلے میں تو حضور بہت محفوظ ہیں۔ آرچنجبل میں بہت سی شریف زادیاں قید ہیں۔ ہزاروں کی راہ سے شریفوں کی عورتوں کو ذراسی خطا اور ذراسے شک میں گرفتار کر لائے اور چھوڑ دیا۔ اور کہہ دیا کہ اگر اس ضلع سے باہر گئی تو تُو جانے گی۔ میرے چچا نے بیان کیا تھا کہ ایک دفعہ جو وہاں گئے تو ایک عورت نے اُن سے اپنا حالِ زار یوں کہا۔ میں ایک شریف کی لڑکی ہوں۔ اُڈسا کے دارالعلم میں کچھ طلبہ نے فساد کیا تھا۔ جس کے جُرم میں ان کی ماں بہنیں بھی پکڑی گئیں۔

چند روز کا عرصہ ہوا کہ اس سلطنت میں ایک حکم نسبت قطع برید داڑھیوں کے صادر ہوا تھا جس کی وجہ سے ہزاروں بیچاروں کی ڈاڑھیاں اُڑگئیں، جو لوگ عزت دار ہیں اُن کو ٹکس اپنی داڑھیوں کے واسطے دینا پڑا۔ علیٰ ہٰذا القیاس ایک قسم کے کوٹ پہننے کی ممانعت ہوئی تو یہ کیفیت تھی کہ درزی گلی کوچوں میں مقراض لیے کھڑے رہتے تھے۔ اور جس کے کوٹ کا دامن تعدادِ منظور شدہ سے زیادہ دیکھا فوراً اس کی قطع برید کردی۔ یہاں تک جو ہم نے کیفیت ظلم و بدعت سلطنت حکام روس کی تحریر کی ہے وہ خاص باشندگانِ روس کی نسبت ہے۔ ممالکِ مفتوحہ کا جس کی رعایا سے کوئی تعلق قومی و مذہبی حکام و بادشاہ کو نہیں ہے۔ اس سے بدتر حال ہے اور اُن پر تو جو ظلم از جانب روس ہوتا ہے وہ قابل بیان نہیں۔

جس دن سے قبضہ روس پولینڈ پر ہوا اُس روز سے حکم شاہی کے بموجب کل اسکول و دارالعلم بند کردیے گئے۔ تاکہ رعایا تعلیم نہ حاصل کرسکے۔ سولھویں صدی میں پولینڈ میں سات دارالعلم تھے۔ اب صرف دو رہ گئے۔ وہ بھی اس جزمیں جو بقبضہ اسٹریا ہے۔ پولینڈ کے باشندوں کو اپنی زبان اصلی میں گفتگو کرنے کی سخت ممانعت ہے ان کو حکم شاہی ہے کہ اپنے گھر میں روزمرّہ کی گفتگو زبان روسی میں کیا کریں اگر کوئی باشندۂ پولینڈ اپنی زبان میں گفتگو کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہے تو اُس پر سزائے سنگین ہوتی ہے۔ جس وقت تک کہ ان کے پاس کوئی جائداد اور مال باقی رہتا ہے اس وقت تک اس پر جرمانہ اس قدر سنگین کیا جاتا کہ وہ آخرکار بالکل فقیر ہو جاتے ہیں۔ اور تب قید کرکے برفستان سیبیریا کو روانہ کردیے جاتے ہیں۔ جو لوگ سوائے اپنی دیسی زبان کے دوسری زبان سے بالکل واقف نہیں ہوتے۔ ان پر اس حکم کی کیا سختیاں گذرتی ہوں گی وہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ جو کسی دوسری زبان سے خود واقف نہیں ہیں۔ اکثر مورخوں کا قول ہے کہ حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صدمے میں کم سے کم

قریب دس لاکھ باشندگانِ پولینڈ روس کے جبر وظلم کی وجہ سے ضائع و ہلاک ہوئے ہیں۔

یہ باتیں ہوتی ہی تھیں کہ جیلر نے دوڑ کر اپنی بہن سے کہا بھاگو۔ وہ آ گئے۔ یہ سنتے ہی وہ بدحواس ہو کے بھاگی اور شہزادی دروازے کی طرف دیکھنے لگی کہ کون آتا ہے۔

اتنے میں کپتان رپ رپ کرتا ہوا آیا۔ پہلے جیلر کو دھمکایا کہ تو اس وقت دوڑ کے کیوں یہاں آیا تھا اور دھمکا کر نظر بند کر دیا۔ شہزادی سے کہا۔ آج شب کو مطلق نہ سونا۔ میں بارہ بجے آ کے تم کو نکال لیجاؤں گا۔ شہزادی نے کہا تم ایسے جھوٹ بولنے والے آدمیوں کی باتوں کا ہمیں یقین نہیں آتا۔ اب ہم جس طرح ہیں اسی طرح زندگی کے دن پورے کر لیں گے۔

کپتان قدموں پر گر پڑا۔ کہا۔ جانِ من ایسی بات ہے بھلا۔ مجھے دھوکا ہو گیا، اور اسی سبب سے میں تم سے مل نہ سکا مگر آج اس خوبصورتی سے لے چلوں گا کہ کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہو ایسی بات ہے بھلا۔
یہ کہہ کر کپتان رخصت ہوا اور صبح کو جیلر نے وہ کمرہ خالی پایا تو گورنمنٹ میں رپورٹ کی برسوں تحقیقات رہی۔ اور ہزاروں آدمی بے گناہ موردِ عتاب ہوئے مگر شہزادی اور کپتان کا حال کسی کو نہ معلوم ہوا کہ وہ کہاں گئے۔

ع ۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

اب جیل خانے کے محافظوں پر آفت آئی۔ دربانیوں کی شامت آئی۔ ایک ایک سے سخت بازپرس ہونے لگی۔ سب حیران کہ یا الٰہی شہزادی کیوں کر نکل گئی اور کدھر سے جیل خانے کے باہر گئی۔ عرصۂ دراز کے بعد معلوم ہوا کہ شہزادی کپتان کے ساتھ امریکا میں مزے سے زندگی بسر کر رہی ہے۔

دلبران بالابلند و گیسوکمند کی جادوطرازی

اور نواب صاحب کے دربار میں میاں آزاد کی تعظیم و تکریم

اور خوجی کی فقرہ بازی

گائیو مطرب جہاں گلستاں ہے ۔۔۔ پیالہ دیجیو ساقی کہ جوشِ البران ہے
عروسِ گل جسے اب دیکھئے وہ خنداں ہے ۔۔۔ بہار عیش سے ہندوستان گلستان ہے
بہار باغ میں کیا کیا کھلا رہی ہے گل ۔۔۔ شگفتہ غنچۂ منقار عندلیباں ہے

ریاضِ دہر میں پھرے نو سلۂ کی صورت
مراد دل عقب آرزو شتاباں ہے

چمن میں بات جو کیجے تو منھ سے پھول جھڑیں
اب ان دنوں میں یہ فیض بہار بستاں ہے

کہیں ہے آئینہ سے صاف تر زمینِ چمن
کہ اُس سے سبزۂ نارستہ تک نمایاں ہے

نسیم جانبِ گلشن چلی یہ کہتی ہوئی
اگر ہو آتش نمرود دم میں بستاں ہے

زبانِ حال سے کہتی ہے سوچ نکہتِ گل
اب اِن دنوں یہ ہجوم گلِ گلستاں ہے

جگہ نہیں ہے کہ گردش ہو چشمِ نرگس کو
جو کیجے بے حرکت ہے یہ عین بہتاں ہے

کہاں تلک بھرے دامن میں پھول اب گلچیں
چمن میں نہیں گل اس کے تا گریباں ہے

ہزبرِ بستانِ بسالتْ ضیغمِ بیشۂ شجاعت دلبروں کی جان و روح معزز و ممدوح حضرت آزاد شوق کو شوق چرایا کہ یارانِ قدیم اور محبان صمیم مہ وشانِ زریں کر اور معشوقانِ پری پیکر جن سے کبھی یاد اللہ تھی اُن سب سے ملتے ہوئے چلیں۔ ذرا حسن آرا بیگم کو اور بھی اشتیاق ہو۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

سب سے پہلے زینت النسا اور اختر النسا کے میکے کی راہ لی جب اس قصبے میں پہونچے تو ایک مقام دیکھ کر خواجہ بدیع الزماں بدیع یاد آئے اور آپ ہی آپ بے اختیار ہنسنے لگے۔ ایک گاڑی پر کچھ سواریاں تھیں ان میں سے ایک کمسن شوخ نازنین نے قہقہہ مار کر کہا اے واہ۔ انسان ہیں حواس ہی حواس تو ہیں اور ہے کیا۔ واہ رے مردوے۔ شکل و صورت تو اچھی ہے۔ دیدہ ور آدمی ہے مگر دماغ کی طرف گرمی ضرور چڑھ گئی ہے۔ آزاد آوازے تاڑ گئے کہ کوئی نوخیز معشوقہ طراز ہے۔ اور زندہ دل رنگین طبع آدمی تو تھے ہی آہستہ سے کہا کہ جب ایسی ایسی صورتیں پیاری نظر آئیں تو انسان کے ہوش و حواس کیوں کر ٹھکانے رہیں۔ خدا اس حسن دل آویز کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ آمین۔ وہ نگار گل رُخسار ٹھنک کر بولی۔ ارے یہ تو دیکھنے ہی کو دیوانہ معلوم ہوتا تھا۔ اپنے مطلب کا بڑا پکا نکلا۔ سچ ہے۔ ؎۔

دیوانہ بکار خویش ہُشیار

اور اس نے ہمارا حُسن کہاں سے دیکھ لیا۔

آزاد: اس پردے سے چھن چھن کے نور آتا ہے ؎۔

نہیں روزن جو قصر یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں

معشوق : کیوں میاں، یہ نیم ٹرو ضع تمہیں کیوں بھائی ہے آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اللہ نے تم کو وہ صورت دی ہے کہ کروڑ دو کروڑ میں ایک ہو مگر اس شکل و صورت پر لمبے لمبے مشک بو بال ہوں۔ پٹیاں جمی ہوں۔ بالوں میں سولہ روپیہ سیر والا حنا کا تیل پڑا ہو، باریک شربتی کا انگرکھا ہو۔ تین کمر توئی کا۔ صراحی بنی ہو کرتا، پھوٹ پھوٹ نکلے۔ شربتی کے انگرکھے اور جالی لوٹ کے کرتے سے گورے گورے ڈنڈ شنجرف کے سے نظر آئیں۔ چست گھٹا ہوا ایک اشرفی کا ٹاٹ باتی بوٹ زیب پا ہو اور جو کامدانی کی پیاری پیاری صدری پہن لو تو تم ہو بہو۔ اس بدلی میں جوبن ستم ڈھائے۔ عطر سے از سرتا پا بسے ہو۔ پیچھے مصاحب رفقا، حضور خداوند پیر و مرشد قبلہ عالم سرکار کہتے ہوئے آہستہ آہستہ ہمراہ رکاب ہوں۔ خدمت گاروں رفیقوں کے ہاتھ میں کابکیں اور بٹیریں ہوں۔ جس وقت اس ٹھاٹھ کے ساتھ چوک سے نکلو دو، رویہ گردن پر کٹاؤ ہونے لگے۔ انگلیاں اٹھیں کہ وہ رئیس جارہے ہیں۔ ارباب نشاط آپس میں باتیں کریں کہ بہن یوں تو خدا کی خدائی میں ایک سے ایک بڑھ کر جری اور قبول صورت جوان دیکھنے میں آیا۔ مگر سچ کہنا اس سج دھج تک سک کلّے ٹھلّے کا گبھرو بھی نظر پڑا۔ ہے۔ میں تو دیکھتے ہی دیوانی ہوگئی۔ وہ مستانہ چال ہے کہ چکور سامنے چلے تو پھوہڑ معلوم ہونے لگے۔ تم وہ پریا جوان جوان ہو مگر خیر سے آنکھ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک۔

یہ سب چھوڑ کر بٹے پر تیغ کرا کے لنڈورے ہوگئے، اے واہ ری آپ کی عقل۔

اِک ذرا میں بھی تو رُخِ انور کی زیارت کروں، آخر انسان ہم بھی ہیں۔ پھر انسان کو انسان سے پردہ کیا۔

معشوق : (مسکرا کر) اے ہے۔ آپ بھی خیر سے انسان ہونے کا دم بھرتے ہیں۔ ماشاء اللہ۔ مینڈکی کو بھی چلی مداروں کو۔

آزاد : وہ بے وفائی تو تمہارے فرقے کا حصہ ہے۔

معشوق : (پردہ ہٹا کر شوخی کے ساتھ) اے صاحب لیجئے بس اب تو چار آنکھیں ہوئیں۔ اب کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔

آزاد نے دیکھا تو سوچنے لگے کہ یا خدا یہ صورت تو کہیں دیکھی ہے۔ اور اب خیال آتا ہے کہ آواز بھی سُنی ہے۔ مگر۔ اس وقت ذہن سے بات اتر گئی یا الٰہی کہاں دیکھا تھا۔

معشوق : پہچانا۔؟ بھلا اتنا نہیں سمجھتے کہ بے جانے بوجھے میں جوان جہاں تم غیر مرد نامحرم سے اس طرح بے جھجک، کیوں باتیں کرتی اور پھر کوئی ایسی ویسی کالی کلوٹی چیچک سے بدنما بدقطع چھوکری ہوتی تو مجھے پوچھتا ہی کون، ماشاء اللہ سے وزیر زادوں، بادشاہزادوں کی نظر پڑی۔ اول تو ہمارا سن ہی کیا ہے۔ دوسرے خداداد حسن، تیسرے اللہ نے شوخی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ایک رئیس زادے ہیں نواب

بنے صاحب۔ چک منڈی کے پاس ایک احاطہ ہے اُس میں رہتے ہیں۔ مجھ سے کوئی دو دو باتیں ہوئی تھیں کہ بس بے اختیار کہہ اٹھے کہ ڈومنیاں تو بہت دیکھیں مگر اس آن بان کی کم۔ ؎

تا غمزۂ تو خنجر پیدا و برکشید
ہر کس کہ سر نکرد و خدا درد سر کشید

آزاد: یا الٰہی اس تمہید کو ختم کیجیے۔ یہ تو بات معلوم ہو کہ آپ کون ہیں۔ مجھے تو اتنا یاد آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے مگر یہ خیال نہیں کہ کہاں دیکھا ہے۔

معشوق: اچھا ایک پتہ دیتے ہیں اب بھی نہ سمجھو تو خدا تم سے سمجھے۔ بتاؤں کسی نے یہ غزل گائی تھی یاد ہے۔ ؎

کوئی مجھ سا دیوانہ پیدا نہ ہوگا	ہوا بھی تو پھر ایسا رسوا نہ ہوگا
نہ دیکھا ہو جس نے کہے اس کے آگے	ہمیں لن ترانی سُنانا نہ ہوگا
گیا ہوگا گلگشت کو جب کہ وہ گل	تو گلزار پھولا سمایا نہ ہوگا
قیامت کے منکر ہیں جو اے ستمگر	ترے قد و قامت کو دیکھا نہ ہوگا
کبھی اس کی ہم سے نہ جائے گی ہرگز	فلک جب تلک خوب سیدھا نہ ہوگا

وہ ایسا نہیں چپ رہے بات سُن کر
کوئی اور ہووے گا گویا نہ ہوگا

آزاد: اب سمجھ گیا۔ پہلے وہاں کی خیر و عافیت بیان کرو۔

ظہورن: اللہ کا فضل ہے۔ دونوں بہنیں مزے سے رہتی ہیں۔ اختر النسا کے میاں تو اُن کا زیور کھا پی کے بھاگ گئے تھے۔ اب انھوں نے دوسری شادی کی ہے اور زینت النسا بھی خوش و خرم ہیں۔

آزاد: تو ہم اَب ان کے میکے میں جائیں یا سسرال۔

ظہورن: سسرال نہ جائیے، میکے میں چلیے اور وہاں سے کسی مُہری کی زبانی پیغام بھجوائیے۔ یہ سب سے بہتر بات ہے۔

آزاد: کیا تم بھی وہاں ہی چلتی ہو۔ خدا جانے ان کے چچا زندہ ہیں یا نہیں، آدمی معقول ہے اور مُرنجاں مُرنج کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔

ظہورن: ہم نے تو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ حضور ہیں۔ جب میں اس بے تکلفی کے ساتھ آپ سے باتیں کرنے لگی تو یہ دونوں نے مجھے چٹکیاں لیں، اور سمجھائیں کہ کبریا کے لیے اس سے اختلاط کی باتیں نہ کرو۔ اللہ جانے صاحب ہے۔ گورا ہے۔ کوئی یہودی ہے۔ تم انگلیاں مٹکا مٹکا کے شوخی کے ساتھ باتیں کرتی ہو۔ وہ مرد

تم عورت، ناحق بن ناحق کو بیٹھے بٹھائے نصیحتی تو تو ٹیں ٹیں ہو اس سے کیا فائدہ اور میں اپنے دل میں ہنسوں کہ ہم تو اپنی سرکار سے چہل کر رہے ہیں، اور یہ کانپتی جاتی ہیں۔ تھرّائی جاتی ہیں۔ بدن کانپ رہا ہے۔ جب ممدہ خانم نے میرا منھ بند کر دیا، اور کہا او بدبخت اس ڈھٹائی پر خدا کی مار، ایک ایسے نامحرم پر آوازے کستی ہے جس کے منھ سے آگ جھڑتی اور چہرے سے آگ برستی ہے۔ میں نے کہا میں اس پر عاشق ہوئی ہوں۔ اس کی ادا، اس کی جوانی اس کا شباب مجھے دل سے بھاتا ہے۔

مردے جی اُٹھتے ہیں سُن کر یہ طرز گفتگو

ایک عالم جس پہ مرتا ہے وہ عالم چال کا

آزاد: ہم کو ان دونوں کا کچھ حال معلوم ہی نہ ہوا۔

ظہورن: بس حضور اب ذری زبان نہ کھلوائیے۔

آزاد: خیر باشد یہ کیوں۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔

ظہورن: بے ادبی معاف۔ جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ بیشک حضور ہی کا قصور ہے، پاؤ انگل کا ایک پُرزا تک نہ بھیجا اور اوپر سے قصور پوچھتے ہیں۔

آزاد: ہماری وفاداری اور سچی محبّت کو دیکھو کہ پہلے اسی آستانے کی زیارت کو آئے ورنہ ہمیں کیا غرض تھی:

پاسِ ادب رہا ہے جنوں میں بھی اس قدر

آتا ہوں سجدے کرتا ترے آستاں تلک

ظہورن: حضور جس دن زینت النسا بیگم کے میاں نے ان سے کہا کہ لو آزاد واپس آتے ہیں۔ مصر تک آگئے۔ بس بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلا۔؎

کون یہ صیاد گل رخسار ہے صیاد

شور بلبل کم نہیں شور مبارکباد ہے

مکرر روز کہا کرتی تھیں کہ آزاد کی جدائی کا غم میرا کلیجہ کھا گیا مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ لیکن حضور اس قدر کے پاکباز بھی کم دیکھے ہوں گے اللہ ری پاک دامنی اب چلیے تو تخلیے میں عرض کروں۔ اب اُن کے میکے میں بس ایک ان کی چچی ہیں اور ایک اور کوئی دور دراز رشتے کی ہیں بس۔

آزاد نے کہا اب دن تھوڑا ہے، اور فرصت کم، اور باتیں بہت کرنی ہیں۔ چلنا چاہیے۔ ظہورن۔ بولی چلیے۔ بلکہ اگر تکلیف نہ ہو تو آپ بھی اس بہلی پر آن کر بیٹھ جائیے۔ آزاد نے کہا۔ یہاں تو میدان ہے

اور چوطرفہ دیرانہ آبادی کا نام نہیں۔ یہاں کون دیکھتا ہے۔ مگر ہمارے لیے واقعی یہ بات معیوب ہے۔ سو خدا خوب جانتا ہے کہ یہاں صرف اس شعر پر عمل ہے۔

بتوں کو جو دیکھا گنہ کیا ہمارا
خدا کی خدائی تماشا ہمارا

کبھی آج تک بدی کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہوئی نفس امارہ ہمیشہ مغلوب کرتے رہے۔ ہاں ہنسی دل لگی چہل مذاق ہو تو اُس میں بند نہیں۔ سو وہ بھی دور ہی دور سے۔ حسن آرا بیگم سے جو وعدہ کیا تھا اُس پر اب تک قائم ہیں۔ ایک سے ایک مہ جبین اور ایک سے ایک نازنین نظر سے گذری مگر دل نے یہی گواہی دی کہ حسن آرا سے بڑھ کر کوئی خوبصورت قد و رفتار گل ورخسار غنچہ دہن، سیم بدن نہیں ہے۔ تیز طبیعت مہ طلعت، اور انتہا کی طرار و حاضر جواب ہے :-

نقشہ بنا کے مانی نے چاہی جو اس کی داد
تصویر بول اٹھی مرے حاضر جواب کی

ظہورن : تو اب آنا ہو تو آیئے۔ اب شام ہوتی ہے۔

آزاد : نہیں الگ ہی الگ چلنا اچھا ہے۔ کیا ضرور ہے کوئی اعتراض کرے۔ کوئی بُرا بھلا کہے۔ خواہ مخواہ کی بدنامی سے کیا فائدہ۔

ظہورن : حضور پر تو زینت النسا خدانخواستہ جان دیتی تھیں اور دن رات کہا کرتی تھیں کہ یا خدا کسی طرح آزاد کا دل حسن آرا کی طرف سے پھر جائے۔

آزاد : وہ تو ان کی باتوں سے مترشح ہوتا تھا۔ الغرض زینت النسا کا مکان جو وہاں سے چند ہی قدم کے فاصلے پر تھا، ادھر بہلی اُدھر آزاد کی پنس پہونچی۔ ظہورن نے اندر جاکر زینت النسا کی چچی کو اطلاع دی کہ آزاد آئے ہیں۔ متحیر ہو کر کہا۔ اللہ اللہ آزاد آئے ہیں فوراً بلاؤ۔

آزاد : بندگی عرض کرتا ہوں۔ اُفوہ۔ اتنے ہی دن میں اس قدر بوڑھی ہو گئیں۔

چچی : بیٹا اب ہماری جوانی کے دن تھوڑا ہی ہیں۔ تم کہو خیر و عافیت کے ساتھ آئے۔ آنکھیں تمہارے دیکھنے کو ترس گئیں۔

آزاد : جی ہاں۔ میں بخیریت آیا۔ دونوں صاجزادیوں کو بُلوایئے۔ سنا ہے زینت النسا کی بھی شادی ہو گئی ہے۔

چچی : ہاں! اب تو دونوں بہنیں کچھ کچھ انگریزی بول لیتی ہیں۔ اختری کا پہلا میاں تو بالکل نالائق نکلا۔ زیور گہنا پاتا سب بیچ کر کھا گیا۔ اور خدا جانے کدھر نکل گیا۔ اب دوسری شادی ہوئی ہے۔ ایک ڈاکٹر ہیں۔ ساٹھ تنخواہ ہے۔ اور اوپر سے کوئی چار روپیہ کی اوسط پڑ جاتی ہے۔ خوش و خرم ہیں۔ اور اختری کو پیار کرتا ہے۔

زینت النسا کے میاں اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ دو سو کی تنخواہ ہے۔ اور اخباروں سے بھی ان کو کچھ نہ کچھ مل رہتا ہے۔ غرض کہ دونوں اب خوش ہیں۔ اور اچھے گھر گئی ہیں۔ زینت تو روز تم کو یاد کرتی تھی کہ یا اللہ آزاد کب تک آئیں گے۔ اور اخباروں میں اکثر تمہارا ذکر پڑھنے میں آتا تھا۔ دونوں بہنیں خوش ہوتی تھیں۔ کہ آج فلاں لڑائی میں آزاد نے فتح پائی۔ آج قلعہ مسمار کر دیا۔ آج ادھر یورشں کر دی۔ کل اس قدر روسیوں کو زک دی۔

آزاد: جناب وقبلہ کی وفات کا سخت رنج ہوا۔ مگر ؎

عرفی اگر گریہ میسر شدی وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

راوی: بہت جلد یاد آیا کہ اس بوڑھے کی تعزیت کے لیے کوئی کلمہ زبان سے نکالیں۔ ان کو زینت النسا اور اختر النسا کے حالات سے یہ کہاں فکر تھی کہ ادھر مخاطب ہوتے، بارے خیر ماتم۔

چچی: ہاں وہ تو اچھے گئے۔ مگر مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

آزاد: اتفاق بھلا ان کی شادیاں ان کے سامنے ہوئی تھیں۔

چچی: دونوں کی شادیاں کر کے مرے۔ کوئی چھ مہینے کے بعد۔ اتنے میں ظہورن نے کہا اے اب اُن کے بلانے کو آدمی بھیجو۔ اوئی کب سے بیٹھے ہیں۔ اب تک تو ہم نے دس پھیرے کیے ہوتے مگر تم سب کے سب چپ چاپ بیٹھے ہو۔ آدمی بھیجو۔ مہری بھیجی گئی۔ پہلے اس نے زینت النسا کی سسرال میں جا کر چپکے سے کہا۔ بی بی صاحب وہ آئے ہیں۔ جن کے ساتھ ہونا سا نہیں تھا۔ کہیں بڑی دور کا سفر تھا، وہ ہیں نہیں گورے گورے جوان بہت خوبصورت ہیں۔ وہ آئے ہیں۔ کہا ہے کہ اپنے ساتھ ہی لاؤ۔ اور دونوں بہنوں کو بلوایا ہے۔ زینت النسا نے کہا۔ کون آزاد تو نہیں کہا جی ہاں خوب پتا دیا آزاد۔ زینت النسا نے جو آزاد کی خبر سنی تو مہری سے کہا۔ سچ مچ آزاد آئے ہیں اُس نے کہا بی بی میں اپنی آنکھوں دیکھ آئی ہوں۔ ڈاکٹر کے ہاں بھی جاتی ہوں۔

میرے بابا کے لانے کو زینت النسا نے فوراً کپڑے پہنے اور ایک آیا ساتھ لے کر میکے کی طرف چلی۔ مکان کے اندر قدم رکھتے ہی غل مچا کر کہا ہیلو آزاد گڈ ایوننگ۔ ادھر سے آزاد۔ اُدھر سے وہ پری زاد شوخی کے ساتھ چلی۔ اور ہاتھ ملا کر یوں ہم کلام ہوئیں۔

زینت النسا: واہ۔ واہ وا۔ بے مروتوں کے بادشاہ بے وفاؤں کے سردار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب جب سے گئے ایک پرزہ تک بھیجنے کی قسم کھائی۔

آزاد: یہ تو فرمائیے کہ یہ پوشاک کب سے زیب بدن ہوئی۔

زینت: جب سے شادی کی۔ ان کا خوش کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم ان کی خوشی کے خواہاں۔ وہ ہماری خوشی کی خواہاں۔ دو سو روپیہ ماہواری اسکول سے پاتے ہیں، اور اخباروں میں مدد دیتے ہیں۔ اس وقت مجھے لاکھوں روپیہ مل گیا۔

آزاد: (آہستہ سے) زینت النسا خدا گواہ ہے میری روح اس وقت مسرور ہے کہ ایک تم کو دیکھا اور خوش و خرم دیکھا، دوسرے میں نے یہ مژدہ روح پرور سنا کہ تمہارے میاں پڑھے لکھے، اور ذی استعداد آدمی ہیں۔ اور سب سے زیادہ خوشی یہ ہے کہ تم سے بنتی ہے۔ خوب یاد رکھنا میاں اور بیوی میں جس قدر محبت والفت ہو اسی قدر لطف زندگانی ہے۔ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ جن میاں بیوی میں اتفاق ہی نہیں وہ باہم خوش کیوں کر رہ سکتے ہیں۔ میاں بگڑے ہوئے ہیں، بیوی منھ پھلائے ہوئے ہیں۔ وہ شریف اور رذیل تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ میاں بیوی پر عاشق ہو۔ اور بیوی میاں پر نثار تو سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

زینت: اب کہو حسن آرا تو جامے میں پھولے نہ سماتی ہوں گی۔

آزاد: اب مجھے کیا معلوم۔ مگر یقین تو ہے۔

زینت: آزاد۔ حسن آرا سے بڑھ کر کوئی خوش قسمت ہو تو۔ آج تم نے وہ نام پیدا کیا ہے کہ باید و شاید۔

واضح ہو کہ زینت النسا اور اختر النسا ان عیسائی خاندانوں میں تھیں جنہوں نے عہد شاہی میں لکھنو کی بود و باش اختیار کی تھی، اور سرکار عظمت مدار سے ان کی بسر اوقات کے لیے سرمایہ کافی دیا جاتا تھا، ان کے ہاں کی عورتوں کے دو نام ہوتے تھے ایک مسلمانی دوسرا عیسائی۔ عورتیں اکثر سایہ اور میموں کی پوشاک پہنے رہتیں۔ گھر سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بعض بعض باہر جاتی تھیں وہ خاندان میں مشہور تھیں کہ ان کا دین ذلیل ہے۔ مگر خاندان کے مردوں کو اختیار تھا کہ جس کے ہاں چاہیں زنانے میں چلے جائیں۔ اختر النسا اور زینت النسا کو باہر جانے کی روک ٹوک نہیں تھی۔ مگر اپنے اپنوں کے سامنے بے جھجک بازاروں میں پھرنا ان کو بھی ناپسند تھا۔ ہاں دور دراز کے سفر یا ریل کی سواری میں بے نقاب جاتی تھیں۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ زینت النسا کے حسن مبین اور جمال عابد فریب پر آزاد ہزار جان سے عاشق تھے۔ اور اس عروس سراپا ناز کو آزاد سے اس قدر عشق تھا کہ دم بھر کی جدائی بھی شاق گذرتی تھی۔ آزاد نے دل لگی دل لگی میں کبھی کبھی اس پری چہم کے رخسار چوم بھی لیے تھے۔ مگر اس زمانے میں ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور زینت النسا سمجھتی تھی کہ اب نہیں تو اور چند روز میں شاہد مراد ضرور ہم آغوش ہوں گی۔ آزاد کی بوسہ بازی گو خلاف حمیت تھی مگر بدی کی راہ سے نہ تھی۔ باہم روشوں میں

ٹہلتے ہوئے کبھی کبھی رخسارِ گل رنگ کا بوسہ لے لیتے تھے اور جب زینت النسا تنگ ہو کر بُرا بھلا کہتی تو شرما کے ہاتھ جوڑتے۔ اور اپنے دل میں سخت خفیف ہوتے۔ مہینوں ایسا ہوا تھا کہ آدھی آدھی رات تک باغ میں بیٹھے کہانیاں کہہ رہے ہیں۔ مگر ممکن کیا کہ دونوں میں کسی کی نیت بھی ڈانواڈول ہو۔ کیا مجال۔ اب کی آزاد نے زینت النسا کی بات چیت اور برتاؤ میں کسی قدر فرق پایا۔ اور ظاہر ہے کہ جب شادی ہو گئی تو اب آزاد کے ساتھ اُس لطف سے کیونکر پیش آ سکتی تھیں۔ تاہم محبت میں ذرا کمی نہ تھی۔ خیر۔

اتنے میں اختر النسا بھی آئیں، مگر ان کی وضع میں میم پن بہت کم تھا آتے ہی کہا مبارک۔

آزاد نے بکمال فصاحت و بلاغت میاں اور بیوی کے باہمی اتحاد و موافقت کی نسبت یوں تقریر کی۔

دنیا میں اس سے زیادہ اور کوئی نعمت نہیں ہے کہ نیک سیرت، اور پاکدامن، اور تربیت یافتہ، حسینہ جمیلہ خوبرو، بیوی ملے۔ ہندوؤں کا قول ہے کہ جن خوش نصیب، خوش قسمت، آدمیوں نے اس جنم میں سونا دان کیا ہوتا ہے ان کو اُس جنم میں چاند سی بیوی ملتی ہے۔ اور حق یوں ہے کہ پَری پیکر گل رخسار بیوی باعث آسائش تن ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے حسن باطنی کی دولت سے بھی مالا مال ہو۔ انسان چاہے کیسے ہی فکر و غم میں ہو ممکن نہیں کہ تربیت یافتہ فہیدہ اور حسین بیوی، اس کے غم کو دفع نہ کر دے۔ مصر میں مجھے واپس آتے ہی کئی روز تک اس محلے میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں یورپین رہتے ہیں۔ پڑوس میں ایک جرمنی کا مکان تھا۔ میاں کا سن تیس برس کا۔ بیوی چونتیسویں میں۔ ایک دن اس جرمنی کے افسر نے خفا ہو کر کہا کہ ہم تمہیں موقوف کر یں گے۔ جرمنی کو یہ کلمہ سخت شاق گذرا اور گھر میں آیا۔ ملول و غمگین آتے ہی بستر پر بکمال افسوس لیٹ رہا۔ اس کی بیوی ذوقِ سلیم سے بہرۂ وافی، اور معدنِ عقل خداداد تھی فراست سے جان گئی کہ میاں اس وقت خلافِ معمول جو دفتر سے آن کر اس سرد دلی کے ساتھ لیٹ رہے اس کا کوئی سبب خاص ضرور ہے۔ پہلے سمجھی کہ شاید طبیعت بے لطف ہو گئی ہے۔ میاں کے قریب جا کر بیٹھی تو عقل سے دریافت کیا کہ اس امر کا باعث علالت طبع نہیں، کچھ اور ہی ہو گا۔ فوراً باغبان کو حکم دیا کہ تازہ تازہ گلہائے معنبر توڑ کر گلدستہ بنائے۔ کئی گلدستہ سرہانے پر رکھے۔ اور خود بن ٹھن کے لباسِ بیش بہا زیب بدن کر کے قریب آن بیٹھی۔ پھولوں کی بھینی بھینی مہک نے ان کے دماغ کے ساتھ وہ کیا جو کحل الجواہر آنکھ کے ساتھ کرتا ہے۔ آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سرہانے عروس نازنین نگار زہرہ جبین بصد شان دلربائی ٹھسکے کے ساتھ متمکن ہے۔ کل فکر و غم بھول گئے اور اپنی پیاری بیوی سے بہ کمال طرب یوں ہم کلام ہوئے۔

میاں: ان گلدستوں کی بو سے عنبر بار نے میرے دل کے ساتھ اس وقت وہ کیا جو مارِ گزیدہ کے ساتھ

تریاق کرتا ہے۔ مگر اس سے زیادہ لطف مجھے تمہارے رخسار کے نظارے سے حاصل ہوا۔ ادھر گلدستوں کی نکہت روح افزا سے نسیم عنبر آلود ہے۔ اُدھر رخسار انور کی چمک دمک سے دل کو وہ تازگی حاصل ہوئی کہ۔ ع۔

دل من داند و من دانم و داند دلِ من

بیوی: اگر جی چاہے تو اُٹھ کر چمن کی سیر کرو۔

میاں: تمہارا سراپا کیا کم چمن سے ہے۔

قد سرو ہے رخسار ہے گل آنکھیں ہیں گہر
رفتار ہی عالم ہے ترے سروِ رواں کا

الغرض ان دونوں میاں بیوی کا مکالمۂ دل آویز سُن کر میں انتہا سے زیادہ خوش ہوا کہ میاں بیوی میں محبت ہو تو ایسی ہو۔ وہ میاں کیا جو بیوی کا عاشق زار ہو، وہ بیوی کیا جو میاں پر روزِ ازل سے نثار ہو۔

ایک مرتبہ بسنت کے دنوں میں حسب اتفاق ایک گاؤں میں گذر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عورتیں سولہ سنگار کر کے اٹھکھیلیوں پر ہیں۔ اور سب کی سب زرد پوش و بسنت کا لُطف جیسا اس گانوں میں دیکھا تمنا ہی رہی۔ کہ اچھے اچھے شہروں میں اس کی نصف کیفیت حاصل ہو۔ اور واقعی ہندوستان کا بسنت ہوتا ہی ایسا ہے کہ جس قدر زیادہ تعریف کیجیے می زیبد۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ جندا بسنتی پوشی ہولی بازانِ ہند کہ زعفران زارِ کشمیر یک گلستانِ رنگ باختہ اوست و گلستانِ کابل در حسرت آب و رنگ اوست۔ ہر چہرۂ زنان صد چمن رنگین ساختہ او۔ سیمیں بتان دست کیمیا سازی کشودہ۔ جو سرہم آب طلا ریختہ و صراحی گردنانِ مشک بو برنرگس خواب آلود یکدیگر گلاب می داری باشیدہ در چنیں ہنگام رنگ آمیزی فانوس اگر ہم رنگ شود شمع بشود بمقراضِ گلگیر بریدنے ست۔ ویا در مہتاب اگر رنگ زعفران رنگیں شاید بنجۂ مہر دریدنے ست، زبان برگ گل در وصف گلال لال ست۔ اگرچہ گوید دماغ غنچہ بشمیم عنبر لبریز ست دگرچہ بوید۔ باغ ازدانستۂ فوار ہا چندیں ہزار پچکاری سامان کردہ۔ صحرا از غبار راہ ہولی بازاں عنبر بداماں بستہ صفحۂ خاک از سودۂ طلق کاغذ زرافشاں دور ساغر با گردش چشم محبوباں در چشمک زدن در موج با بروے خوباں باشارا ابرو در سخن۔ شاہین ترازوے مئے فروشاں با بروے بتاں ہم پلۂ حباب بادۂ باصفائے چہرۂ گل عذاراں کلہ بکلہ ہر سو از ہجوم ساغر شگوفہ زار یست نمایاں و ہر طرف از انگشتِ ساغر کشان ہارا سے با طلوع نشان دتواماں۔

اب سنیے کہ ادھر تو آزاد پاشا جوش میں یہ پڑھ رہے تھے اُدھر وہ دونوں مہ وشاں بھی قدر نازک بدن باہم چپکے چپکے باتیں کرتی ہوئی مسکراتی جاتی تھیں۔ جب آزاد نے یہ کیفیت دیکھی تو ذرا خاموش ہو رہے۔ زینت النسا نے کہا۔ ہاں ہاں۔ آپ فرمایئے۔ آپ کیوں خاموش ہیں۔ آزاد بولے تم دونوں کے مسکرانے سے مجھے معلوم ہوتا

ہے کہ کوئی مذاق کی بات ہے، اختر النسا نے مسکراتے ہوئے شوخی کے ساتھ جواب دیا۔ آپ اس وقت ہیں کہاں۔ ذکر بسنت کا اور تعریف ہولی کی بسنت کے شعر پڑھتے ہوتے تو خیر مضائقہ ندارد۔

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی

آزاد: دل میں بہت شرمائے۔

زینت: ہاں خیر۔ یہ تو جوش کی بات تھی اب مطلب کہیے۔

اختر: اللہ جانتا ہے کہ آپ کی اس تقریر کا بہت بڑا اثر نہ ہوگا۔

زینت: اول خود لائق دوسرے تجربہ کار آدمی۔

آزاد: میرا منشا صرف یہ ہے کہ میاں بیوی میں جس قدر زیادہ الفت اور محبت ہوگی اسی قدر زیادہ آسایش و آرام سے رہیں گے۔ ورنہ تکرار اور جوتی پیزار اور لڑائی جھگڑے میں بڑی بڑی خرابیاں ہوتی ہیں جن سے خدا بچائے۔

دلبر لالہ رخسار سیم اندام زیبا خرام مہر سپہر حسن و صفا زینت النسا بیگم نے کہا آزاد بہت صحیح کہتے ہو۔ واقعی میاں بیوی کو باہم اس طرح سے زندگی بسر کی جانی چاہیئے۔ کہ ایک جان دو قالب ہوں، ہمارے نزدیک۔ اس سے زیادہ لطف و آسایش اور کسی امر میں نہیں ہے۔ دنیا ہو اور پیاری بیوی ہو۔ عفیفہ پاکدامن، حسینہ گلبدن۔ مگر ایسی بیویاں بڑے خوش نصیب آدمیوں کو ملتی ہیں۔ لیکن مردوں میں بھی بعض بعض ایسے بے حمیت ظالم ہوتے ہیں۔ کہ خدا کی پناہ۔ ان بدوضع آدمیوں کو گھر میں چین ہی نہیں پڑتا۔ بازاری عورتیں چاہے کیسی ہی بدقطع بدشکل، بدصورت، چیچک رو ہوں، اور بیوی چاہے چاند کا ٹکڑا ہو، مگر اپنی بدنصیبی کو کیا کریں بیوی دشمن اور چڑیل نظر آتی ہے اور وہ بیسوا بازاری عورت حور معلوم ہوتی ہے اس ادبار کو کوئی کیا کرے اور سچ یوں ہے کہ اگر مرد نیک دل اور تعلیم یافتہ ہو تو بیوی مطیع ہو جائے اور لونڈی بن کر رہے۔ ورنہ عورت بیچاری کیا کرسکتی ہے۔ بڑی بڑائی یہ ہے کہ محض شیطان کے ورغلانے سے لوگ ایک بیوی پر قادر نہیں رہتے۔ دو دو چار چار شادیاں کر لیتے ہیں یہ رسم اہل اسلام میں بھی جاری ہے اور بعض اہل ہنود میں بھی۔ مگر سو میں شاید ایک ہی آدمی ایسا ہوتا ہوگا، جو سب بیویوں سے برابر عدل کر سکے۔ مرد اچاہے فرشتہ بن کر کیوں نہ آئے ہم نہ مانیں گے۔ کہ سب بیویوں سے اس کو مساوی محبت ہوگی۔ جب چار بیویاں ہوئیں تو سن اور شکل صورت اور لگاوٹ میں چاروں مختلف ہوں گی۔ اب فرض کرو کہ ایک بیوی پانزدہ سالہ اور شیریں کلام، نازک اندام، کرشمہ ساز جادو طراز بلوریں ذقن پستہ دہن ہے اور باقی بیویوں میں کوئی مسن ہے کوئی بدقطع، کوئی بدصورت

ساری خدائی ایک طرف ہو جائے میں نہ مانوں گی جس قدر اس دلبر عشوہ فروش آفت ہوش سے میاں کو لطف ہوگا اس قدر کسی اور سے ہو۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

آزاد یہ تقریر سُن کر از بس محظوظ ہوئے۔ کہا زینت النسا اس وقت جو خوشی مجھے حاصل ہوئی ہے اُس کا اظہار محال ہے۔ شکر ہے کہ تم نے پڑھا لکھا خوش لیاقت اور عالم میاں پایا اس سے ہم کو بڑی خوشی ہوئی یہ اُنہیں کی صحبت کا اثر ہے کہ اب تم چشم بد دور اس قدر فہیم اور خوش بیان ہو۔ اختر النسا کے پہلے میاں کا حال سُن کر البتہ ہمیں کمال افسوس ہوا تھا مگر اب تم کہتی ہو کہ اُن کے میاں کی بھی اچھی پوزیشن ہے اور ان دونوں میں بنی ہوئی بھی ہے۔ غرض کہ تم بہنیں جیسی نیک اور خوش اخلاق، اور پاکباز، اور حسین تھیں ویسے ہی زیرک اور تربیت یافتہ میاں بھی پائے۔

اختری بولی اُس موئے سے خدا بچے مجھے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ جب تین مہینے تک میری خبر ہی نہ لی تو مجبور ہو کر میں نے ایک خط بھیجا۔

اے چارہ گر مریض بے تاب — اے نورِ فزا چشم بے خواب

مرہم نہ زخم ہائے عاشق — دردِ عاشق دوائے عاشق

اے نبض شناس جانِ مضطر — ناسور زدائے دیدۂ تر

اے مایۂ لطفِ زندگانی — جاں بخش وفائے جاودانی

دھیان آپ کا ان دنوں کدھر ہے — کچھ حال کی بھی مرے خبر ہے

اک آگ سی لگ رہی ہے تن میں — شعلے سے بھڑک رہے ہیں بدن میں

کیا عضو گدازیاں کہوں میں — انگشت نمائے شمع ہوں میں

بیمار ہوں اور قریب مُردن

ہر دم ہے عذاب جان سپردن

اس کے بعد نثر میں بہت کچھ لکھا تھا مگر جواب ندارد۔ زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ جان کے لالے پڑے۔ ایسی ہی حالت میں عورتیں اور خصوصاً نو عمر عورتیں آوارہ ہو جاتی ہیں آخر کوئی صدمے کہاں تک سہے۔ ؎

اس زندگی سے میرا دم آیا ہے ناک میں

آخر تحمل قلق و غم کہاں تلک

میں تو ضبط کرتی اور میاں کے جیتے جی رنڈاپے میں زندگی بسر کرتی مگر جب ضبط نہ ہو سکا اور دل ہاتھ سے جاتا رہا تو مجبور ہو کر لکھنا پڑا کہ او بے رحم ظالم بے جھپتی تو کہاں تک اب دل کو اپنے قابو میں نہیں پاتی ہوں ورنہ شکایت نہ کرتی:

قابو میں نہیں ہے دل کم حوصلہ اپنا
اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا

آزاد پاشا کچھ کہنے ہی کو تھے کہ زینت النسا نے ان کی تعریف کے پل باندھ دیے۔ آزاد اللہ جانتا ہے وہ نام پیدا کیا ہے کہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اخباروں میں تمہاری تعریف پڑھ کر بہت ہی خوش ہوتے تھے کہ اس ہندی مسلمان نے بسالت و دلیری سے وہ نام پیدا کیا کہ آج رُبع مسکون میں اس کا سہیم ونظیر نہیں ہے۔ پہلے جو پیغام شادی آیا بیمار رفتہ رفتہ سب باتیں ٹھیک ہو گئیں۔ تو اُن سے جا کر کسی نے کہدیا کہ وہ آزاد پر دل و جان سے عاشق ہے۔ اور مشہور ہے کہ آزاد کی (جھینپ کر) دو چار روز تک ان کو شک رہا اور شادی ملتوی۔ ؎

تہمت ترے عشق کی لگادی مجھ پر	کردی مری جان حرام شادی غیر
نے دن کو ہے قرار نہ ہے رات کو خواب	دل نے مرے ہائے کیا بنادی مجھ پر

بس سوچی کہ اگر اسی طرح بدنام ہوئی تو خدا ہی حافظ ہے۔ بارے جب ان کو یقین ہو گیا کہ متعصبوں نے تہمت تراشی ہے تو گرجا میں جا کے شادی ہوئی۔

اختر: خدا لگتی کہنا آزاد۔ ان کو تم سے عشق تھا یا نہیں۔؟

زینت: اب اس سے کیا مطلب۔ اس کا ذکر ہی بے کار ہے۔ کبھی بھولے سے بھی زبان پر نہ لانا۔

آزاد پاشا نے ایک خوش نصیب آدمی کا ذکر کیا جو اپنی بیوی پر دل و جان سے فدا تھا اور جس کی پیاری بیوی اپنے میاں کی جدائی بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ میاں اور بیوی بچے عاشق و معشوق کی طرح ہر دم ایک ہی مقام پر لطف و مسرت کے ساتھ رہتے اگر میاں کو اچانک کسی وقت ایسے ضروری کام کے لیے جانا ہوتا جس میں بیوی کی چند روزہ یا تھوڑی دیر کی مفارقت سے اجتناب محال تھا تو یہ ادھر اُدھر وہ تڑپتے اور جب تک مل نہ لیتے مثل ماہی بے آب مضطرو بے قرار و چناں رہتے۔ ان کے گھر میں ہر دم خوشی دل لگی کے شادیانے بجتے تھے۔ کسی وقت کسی گھڑی ان کو ملول و افسردہ خاطر نہ پایا۔ میاں نے بیوی کو دیکھا تو غم و فکر منزلوں دور ہو گئی۔ بیوی نے میاں کو دیکھا اور دل کا کنول کھل گیا۔ اگر کوئی ہمجولی دل لگی میں اگر کہتی کہ بہن آج تمہارے میاں فلاں عورت سے ہنس رہے تھے تو کبھی باور نہ کرتی۔

زینت النساء نے کہا۔ ایسے میاں بیوی کا کیا کہنا۔ اور ایک نگوڑے ظالم مردوے ہوتے ہیں جو بیوی کے ہوتے ہوئے ساتھی کیا جانے کیا کیا ظلم ڈھاتے ہیں۔

آزاد: اگر بیوی بھی خوش سلیقہ ہو تو میاں ہاتھ سے نہ جاتے ہیں۔

اختر: واہ ہم تو مان چکے، شہدے لُچے لفنگے میاں سے اللہ نہ کرے کہ کسی بھلے مانس کو پالا پڑے بڑی خرابی ہوتی ہے۔

زینت: ہاں اچھا یہ تو خوش سلیقہ ہیں پھر ان کے میاں ان کے بس میں کیوں نہ آئے۔ جس کے مزاج میں پاجی پن ہو اُس سے بھلے مانس سے کبھی نہ بنے گی۔ میاں تو آدھی رات تک چنڈو پینا چاہیں بیوی گھر میں پڑے پڑے تارے گنیں۔ میاں صبح سے جائیں تو ایک بجے گھر میں آئیں اور وہ بھی کسی روز آئے کسی روز نہ آئے بیوی بچاری چھپر کھٹ پر پڑی ہوئی تنہا یک بینی دو گوش کیا جانے کیا سوچ رہی ہے اور بعض آدمی جن کے مزاج میں کمینہ پن ہے ان کا قاعدہ ہے کہ بات ہوئی اور بیوی کو مار بیٹھے ایسے شوہر سے تو بیوہ ہونا اچھا بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں بھلا مار دھاڑ کی عادی کیوں کر ہوں۔

اختر: یہ تو دُھنے، جلاہے، کوری، چماروں کی باتیں ہیں۔

زینت: نہیں بہن جو لوگ شریف کہلاتے ہیں ان میں ایسے موئے موجود ہیں کہ بات ہوئی اور تھپڑ دیا۔ موتی سی آبرو اُتار لی۔

آزاد: ایسے مردوں سے کبھی خوش نہ رہے گی۔

اختر: اے چولھے کی جڑ میں جائیں ایسے مرد۔ جب ہی تو کنوئیں میں کود پڑتی ہیں۔ زہر کھا کھا کے سو رہتی ہیں۔ افیم کھا کے جان دے دیتی ہیں اور آخر کریں کیا بیچاریاں۔

آزاد: جس گھر میں میاں بیوی میں نہ بنے گی اس کو ہمیشہ تباہ ہی پاؤ گے۔ میاں اور بیوی میں کیوں نہ بنے۔ وجہ کیا۔

زینت: اوفوہ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک شرونگی عورت جس کا کوئی برس میں اٹھارہ ایک کا سن ہو گا اپنے میاں کو ذرا سی بات پر ہاتھ پھیلا پھیلا کر اور انگلیاں مٹکا مٹکا کر کوس رہی تھی میں نے جو کھڑکی کھولی تو دیکھا میاں صحن میں چپ چاپ کھڑا ہے اور بیوی چھت پر سے ہزاروں صلواتیں سنا رہی ہے۔ اور اس طرح سے کوستی ہے کہ کوئی دشمن کو بھی نہ کوسے گا۔ اللہ کرے تیرا جنازہ نکلے موئے تیری قبر بنے۔ کتے کی موت بھونک بھونک کے جان دے۔ مرتے وقت کوئی تیرے قریب نہ پھٹکے۔

آزاد: لاحول ولا قوۃ۔ دونوں بدنصیب اور کم بخت۔

اختر : ایسی بیوی کا منہ لے کے جھلس دے۔ اور کم بخت۔

زینت : میرے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

آزاد : اور رونگٹے کھڑے ہونے کی تو بات ہی تھی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر ایسے میاں اور بیوی میں باہم میل جول کیوں کر ہو جاتا ہے۔

اختر : اللہ جانے۔ خدا بُرے سے پالا نہ ڈالے۔ بڑی مصیبت پڑ جاتی ہے کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑتی۔

زینت : اے بس ادھر تو کوس رہی تھی اُدھر میاں باہر چل دیا تو لہرا لہرا کے گانے لگی۔ گویا کوئی بات ہی نہ تھی تانیں لینے لگی۔ ؎

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے

مومن مآلِ کار کا آغاز دیکھنا

اختر النسا اور زینت النسا اور آزاد اور ڈومنی سب تہ خانہ باغ کی سیر کو چلے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آزاد فرخ نہاں دونوں معشوقانِ چست و چالاک مشکیں فراک کے ساتھ شب گھنٹوں چہلیں کیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی جوشِ طرب سے بوسے کی بھی ٹھہر جاتی تھی۔ مگر با ایں ہمہ ان دونوں کے شیشۂ پاکدامنی پر سنگ بدنامی صادر نہیں ہوا تھا چلتے چلتے ایک روش میں آزاد نے زینت النسا کا پیارا پیارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اختر النسا اور ظہورن سے دور مقام پرلے جا کر کہا۔ زینت النسا سچ کہنا یہ درخت یاد ہے۔

زینت : اب ان باتوں کو جانے دو۔ لڑکپن کی باتیں ہیں۔

آزاد : مگر بخدا ہم تمہاری پاک دامنی کی قسم کھاتے ہیں۔

راوی : سب سے پہلے اسی مقام پر آزاد نے اُس بدیع الجمال کے رُخسارِ رعنا کا بوسہ تر لیا تھا۔

زینت : آزاد اب تم کو ان باتوں کا ذکر کرنا نازیبا ہے۔

آزاد : ہاں تو ایسا ہے۔ مگر۔ ؎

دل آزردہ کہتا ہے نہ بولوں یار سے لیکن

جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آہی جاتی ہے

زینت : (قہقہہ لگا کر) اے ہے۔ میں کہتی ہوں تم کو یہ ہو کیا گیا ہے کیسے بے تکے شعر پڑھتے ہو۔ بھلا اس وقت اس شعر کے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ماشاء اللہ چشم بد دور میں بھی کوئی شعر پڑھ دوں۔ ؎

نسیم گل میں ہے تاثیر معجز عیسیٰ
نہ کوئی دیدۂ نرگس کو اب ہے بیمار

اب فرمایئے ہم نے اچھا شعر پڑھا یا آپ نے۔

آزاد: اجی ہوگا بھی۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے میاں خوبصورت بھی ہیں۔ بد قطع تو نہیں ہیں۔ چاہے جیسے ہوں۔ لطف کے ساتھ نباہ ہو۔

آزاد نے نہایت ہمدردی کے ساتھ زینت النسا کو انواع و اقسام کی نصیحتیں کی اور خوب ذہن نشین کیا کہ جہاں تک ممکن ہو میاں کی اطاعت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھنا۔

آزاد: اب کہیں اطاعت سے یہ نہ سمجھ لینا کہ صبح اٹھ کر میاں کے قدم لے یا میاں کو معاذاللہ خدا کے برابر سمجھے۔

زینت: اس میں بھی کوئی عیب نہیں ہے۔ مگر ہاں۔

آزاد: شائستگی کے خلاف ہے۔ یورپ کی قوموں میں جتنے میاں ہیں اُن سب کا قاعدہ ہے کہ بیوی کی آسائش کو اپنی آسائش پر مقدم تصور کرتے ہیں۔ اور یہاں قضیہ بالعکس ہے۔

زینت: نہیں میں اس میں اتفاق نہ کروں گی۔

آزاد: وجہ۔ جو آسایش یورپ کی عورتوں کو حاصل ہے وہ ہندوستان کی عورتوں کو کہاں نصیب ہے۔ دھوپ میں اگر میاں بیوی ساتھ چلتے ہوں تو میاں بیوی کو چھتری لگائے گا۔

زینت: یہ تو بیوی پر کوئی احسان نہیں ہے۔

آزاد: احسان فراموشی کی بات ہے۔

زینت: احسان کیا ہے اس میں۔ میاں نے چھتری لگائی تو بیوی پر احسان کیا کیا چھتری اس غرض سے لگائی کہ گل رخسار آفتاب کی تمازت سے سیاہ نہ ہو جائے۔ گالوں کی رعنائی اور گوراپن نہ جانے پائے۔

آزاد: (مسکرا کر) کیا خوب۔

زینت: یہاں مہاجنوں، جوہریوں میں دیکھو عورتیں دس دس ہزار بارہ ہزار کے زیور پہن کر نکلتی ہیں اور میاں لنگوٹ لگائے دُکان پر مکھیاں مارا کرتے ہیں۔

آزاد: مگر چاہے دس ہزار چاہے دس لاکھ کا بھی زیور ہو پانوں میں جوتا نہ ہوگا۔ یہ کون انسانیت ہے۔

زینت: ؎ ۔

زیور ہیں نہ دستار کے نے زیب ہیں سر کے
مثل گل بازی نہ ادھر کے نہ اُدھر کے

اختر: آزاد تمہارا اس قدر نام ہوا کہ تمام ہندوستان میں مشہور ہوا اور با ایں ہمہ تم ابھی بعض باتوں میں بدستور سابق ہی ہنسی مذاق چہل کرتے ہو۔

آزاد: یہ کیا کوئی چیستان ہے۔

اختر: جب ظہورن کی گاڑی ملی تو ہیں سرِ راہ تم نے چہل کرنا شروع کیا۔ بھلا جو کوئی دیکھ لیتا تو کس قدر شرم کی بات تھی۔

آزاد: وہاں تھا کون، اگر کوئی ہو بھی تو اپنا قول و شعروں پر ہے:

بُتوں کو جو دیکھا گنہ کیا ہمارا

خدا کی خدائی تماشا ہمارا

اگر بُتوں کو دیکھا تو ہرج ہی کیا ہوا۔ آنکھوں کو نور ہی حاصل ہوا اور بات ساری یہ ہے کہ دل صاف ہونا چاہیے:

تو پاک باش. برادر مدار از کس باک

زنند جامۂ ناپاک گازراں برسنگ

اختر: واہ۔ یہ باتیں کتابوں ہی میں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ ہم نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ آزاد پاشا عین جنگ کی حالت میں صرف اغوائے شیطان سے ایک گل رخسار دوشیزہ زیبا اندام کے ساتھ چل دیے اور اس کو عقد نکاح میں لائے۔ جس نے سنا تم سے خلاف ہو گیا۔ حسن آرا بیگم نے جس وقت خبر پائی مسکرا کر ایک ہمجولی سے کہا۔ بہن یہ سب جھوٹی باتیں ہیں۔ آزاد اور کسی کے تیرِ نگہ کا گھائل ہو! کیا مجال جو میرا عاشق ہے وہ دنیا میں کسی کا عاشق نہیں ہو سکتا۔:

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا !

سب سے بے گانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

ہاں اگر ساری خدائی کی حوریں اس کی عاشق ہوں تو عجیب نہیں۔ جب تک ہمیں نہیں دیکھا تھا تب تک چاہیے جس پر آزاد عاشق ہوتے مگر جن جن پر پہلے عاشق ہوئے تھے وہ سب ہماری طرف مخاطب ہو کر کہیں گی:

کیستی اے کہ دل تنگ کسے جائے تو شد

سرو من فاختہ سرو دل آرائے تو شد

مگر سب محور عسکری کی شرارت سے حسن آرا نے ایک اخبار میں پڑھا کہ آزاد نے ایک سائیس کی بیوی کے ساتھ شادی کر لی۔ تو بیہوش ہو گئیں اور اس قدر صدمہ ہوا کہ لوگ سمجھے کہ خدانخواستہ جان پر بن گئی۔ بارے بخیر گذشت۔

زینت النسا اور اختر النسا نے ہندی عورتوں کا جنبہ کیا اور آزاد نے یورپین لیڈیوں کی طرف داری کی
انھوں نے بیان کیا کہ ہمارے ملک کی شریف زادیوں کی جو حالت ہے اس کا الزام ہم مردوں ہی کی گردن پر ہے۔
ہم نے اپنے ملک کی مخدرات کو بالکل ذلیل کرر کھا ہے۔ اُن کو قریب بہائم کے سمجھتے ہیں پڑھنے لکھنے تحصیل علم
حساب کتاب مطالعہ کتب سے ان کو کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر کسی نے کہا بھی کہ تعلیم نسواں کے بے شمار فائدوں
سے ہم لوگ ناواقف ہیں اور ملک کے ادبار کا ایک سبب خاص یہ بھی ہے تو بگڑ کے جواب دیا کہ واہ عورتوں
کو پڑھا کے کیا سرکار دربار میں اُن سے نوکری کرانی ہے۔ آپ اپنے ہاں کی عورتوں کو پڑھایئے۔ آپ کو تعلیم نسواں
مبارک رہے۔ سب سے بڑھ کر فائدہ تو ماشاء اللہ اس میں یہی ہے کہ اِدھر بی صاحب نے شُدبُد دو حرف سیکھے
ادھر کاغذ کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ یہ خیال توان لوگوں کے دلوں میں جم گیا ہے کہ عورتوں کو تعلیم دینا ان کے
واسطے کانٹے بونا ہے۔ وہ، تو علانیہ پکارتے پھرتے ہیں کہ جس کسی کو اپنے ناموس میں بٹا لگانا ہو، وہ عورتوں
کو پڑھائے۔ مطلب یہ کہ پڑھنا لکھنا ناموس کا دشمن ہے۔ یوں بی صاحب ڈھولک کے ٹھمریاں گائیں گی وار
خوش آواز رنگین مزاج بیباک ہوں مگر تربیت کا نام آیا اور چراغ پا ہوئے۔ ع۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

اب ان کو کوئی لاکھ سمجھائے اُن کے ذہن میں جو بات بیٹھی ہے وہ رفع نہ ہوگی۔ ان کو معلوم ہی نہیں کہ
اس کے فوائد کیا ہیں۔ ہنود کی اکثر قوموں میں یہ قاعدہ ہے کہ دن بھر میاں بیوی ایک جگہ نہیں رہتے۔ صبح سے
دس گیارہ بجے رات تک نہ بیوی میاں کی صورت دیکھتی ہے نہ میاں بیوی کے جمال کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ چکوا چکوے
کی سی کیفیت ہے کہ۔ ؎

دن بھر توالگ تھلگ رہے وہ

بارہ بجے رات سے ملے وہ

اب بتائیے بیوی کو میاں اور میاں کو بیوی کی کیا محبت ہو خاک۔ اور سنیے بہو اور سسرے میں پردہ
ہر وقت گھونگھٹ سمجھاتے ہیں کہ یارو یہ کیا اندھیر ہے۔ اس پردے پر خدا کی مار یہ جنون ہے یا پردہ مگر سنتا کون
ہے اور لطف یہ کہ چاہے ہزاروں روپیہ پاس ہوں ممکن نہیں کہ عورتوں کے لیے تکلف کا فرش بچھا ہو، یا کمرہ سجا سجایا ہو
وہی مٹی اور گوبر۔ گو بعض بعض اقوام بند وہیں۔ یہ رسم جاری نہیں ہیں۔ مگر کثرت سے ایسی اور کس کی ہیں۔ ہاں
اہل اسلام میں تکلف اور بناؤ چناؤ کا زیادہ ہے۔ لیکن تربیت اور تہذیب اور شائستگی میں دونوں قریب
قریب یکساں ہیں۔ یورپ کی لیڈیوں کا کیا کہنا۔ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ؎۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ہاں اس قدر ہم ضرور کہیں گے کہ ہندوؤں کی عورتوں کو خیالات مذہبی اور ضعیف الاعتقادی کے سبب سے اپنے میاں کی اطاعت کا بہت خیال رہتا ہے۔

اختر: مگر یہ ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ دن کے وقت میاں بیوی چار رہتے ہیں۔ یہ گنواروں میں ہو تو شاید۔

نہیں حضور۔ ہمارے مکان کے دیاں ایک وہ رہتے ہیں۔ مہاجنی کرتے ہیں۔ سو ہم کو ایک باری بلایا تھا۔ مجرا تھا۔ بس جیسے ہی ان کے بھو کے میاں باہر سے آئے وہ چارپائی سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئی اور حضور یقین مانیے گا۔

کم سے کم کوئی پندرہ سولہ ہزار کے زیور سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی تھی۔

زینت: واہ اچھا پردہ ہے کیا پردہ گنوار پنا ہے۔

آزاد: اس میں کیا شک ہے یہ گویا بڑے سلیقے کی بات کی۔

اختر: اُن کے ہاں کی تمیز یہی ہے۔

آزاد: اگر تم کو کوئی کہے اختر النسا کہ میاں کے سامنے گھونگھٹ کر کے جاؤ اور کبھی چارپائی پر نہ بیٹھو۔ تو منظور کرو یا نہیں۔

اختر: اوئی۔ واہ واہ۔ یہاں تو اب چار دیواری میں بھی قید نہ رہا جائے۔ گھونگھٹ کیسا۔

آزاد: حسن آرا اس وقت یاد آ گئیں۔

اسیر اے یار تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ وہ طلائی ــــ کا!

اختر: ہندوؤں میں عورت کی دوسری شادی ہوتی ہے۔ ؟

آزاد: شاستر جو اُن کا ہے اُس کی رُو سے تو جائز ہے مگر شریفوں میں اب بیوہ کی دوسری شادی ناجائز قرار پا گئی ہے۔ ہاں سودروں میں میاں کے عینِ حیات بیوی دوسرے مرد کے ساتھ شادی کر سکتی ہے۔ یا ہم کچھ ذرا ہی یوں جھگڑا ہوا اور میاں بیوی کو چھوڑ بیٹھا۔ بیوی نے میاں کو چھوڑ دیا۔ انھوں نے کسی اور مرد کو بیاہ لیا۔ انھوں نے جس کے ساتھ چاہا بیاہ کر لیا۔

آزاد: سچی محبت اُسی حالت میں ہو گی جب میاں بیوی دونوں کے دل ہیچ اس میں ہندو ہو، یا مسلمان یا عیسائی یا سودر یا عالی خاندان۔ کسے باشند۔ ع۔

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اختر: نہیں ہے کیوں نہیں نہ ہونا۔ کیا معنی۔ شریف زادوں میں اس قدر فحش نہ ہو گا جس قدر نیچ قوموں

میں ہوتا ہے۔

آزاد: ہاں۔ مگر شریف زادے کے کیا معنی۔ یہ کہو کہ اوسط درجے کے لوگوں میں البتہ ہر اُمر کا خیال رہتا ہے خلاصہ یہ کہ اگر میاں بیوی ربط ضبط اور میل جول کے ساتھ رہیں تو سبحان اللہ ورنہ کہیں بینے نہیں جاتا ہے بزرگوں نے جو جو قاعدے مقرر کیے ہیں شادی بیاہ کے وہ ہر طرح انسب ہیں۔ مگر ہم ان کا برتاؤ ہی نہ کریں تو اس میں ہمارا قصور ہے یا ان کا بیشک ہمارا قصور ہے۔

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

شب کو آزاد پاشا نے ایک سجے سجائے کمرے میں آرام کیا۔ سویرے ان دونوں گلبدنوں نے پھر ان کے ساتھ نسیم سحری کے لُطف اٹھائے، مزے مزے کی باتیں کیں۔ تھوڑی دیر میں ظہورن نے زینت النسا کا حال ان سے بیان کیا۔ آپ کو ان کا پچھلا حال بھی کچھ معلوم ہے جس دن سے آپ گئے اُس دن سے اللہ جانتا ہے آنکھیں لہو کی بوٹیاں بن گئیں۔ دن رات آپ ہی کی صورت نظروں میں رہتی تھی سمندر کی کیا اصل وحقیقت ہے ان کے اشکوں کے سامنے بحرنا پیداکنار کی بھی خاک وقعت نہ تھی۔:

بجا ہے طعنہ گر ابر بہار پہ مارے
یہ چشم وہ ہے سمندر کو دھار پر مارے

اس عرصے میں کئی نواب زادے اور کئی عیسائی ان کے حسن وجمال کا شہرہ سُن کر آئے کہ پیغام شادی کریں، اور دو ایک بدمعاشوں نے یہ بھی چاہا کہ باتوں باتوں میں ان کو نکال لے جائیں۔ مگر اللہ ری حیا۔ اُن سے بات تک تو کی نہیں۔ ایک نواب نے دو تین عورتیں سکھا پڑھا کے بھیجیں اور انھوں نے وہ وہ سبز باغ دکھائے کہ میں خود چکرا گئی۔ مگر انھوں نے ہر مقام پر اپنے دامن کو پاک رکھا۔ یہ بہت مشکل ہے۔ دو ایک امیرزادوں کو دکھا بھی دیا اور کہا حضور پر ان کی جان جاتی ہے۔ مگر انھوں نے کہا میں اس کے ساتھ شادی نہ کروں گی جس کی دو دو تین تین بیویاں ہیں۔ میں تو ایسا چاہتی ہوں جو علاوہ حسن ظاہری کے حسن باطنی کی دولت سے بھی مالا مال ہو۔

زینت النسا نے گردن ہلا کر کہا۔ آزاد خیر وہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا مگر اقوہ شہر کے مردوں اور شہر کی عورتوں سے خدا حافظ ہے۔

میرے پاس ایک عورت آئی تھی اس طرح کی میٹھی میٹھی باتیں کرے کہ میں کیا بیان کروں۔ میں اُس سے بہت خوش ہوئی۔ میری بڑی اطاعت کرتی تھی اور کبھی آج تک ایک حبہ کا سوال نہ کیا۔ ایک مرتبہ میں نے

پائجامہ کرتی دوپٹا بنوا دیا۔ تو سلام کر کے لیا۔ آنکھوں سے لگایا دعائیں دیں اور کہا حضور اس عنایت کے عیوض میں لونڈی بھی جان تک قربان کر دے گی۔ بس دوسرے روز آن کر خوش خوش میرے قریب بیٹھی۔ کہا حضور نے مجھے کل جوڑا عطا کیا تھا۔ میں نے بھی جوڑے کے جواب میں حضور کے لیے جوڑی تجویز کیا ہے۔ پہلے تو سادگی کے سبب سے کچھ سمجھی نہیں کہ یہ کہتی کیا ہے۔ تو اس نے صاف صاف کہا۔ حضور ہمارے محلے میں ایک نواب صاحب رہتے ہیں فیل نشین، ان کے صاحبزادے کا سن کوئی اُنیس برس کا ہوگا۔ میں عرض نہیں کر سکتی کہ کیا جوبن ہے۔ اور ماشاء اللہ سے ابھی سبزۂ آغاز ہے۔ مسیں بھیگتی ہیں اور رنگت کی یہ کیفیت جیسے کندن دمک رہا ہے۔ چہرے سے خون برستا ہے۔ اور خوش پوش دن میں پانچ پوشاکیں بدلتا ہے۔ ہر دم عطر سے بسا ہوا اور حضور ابھی پارسال تک کالج میں پڑھتے تھے۔ ہر مہینے کتابیں انعام میں پائیں اور شاعر بھی ہے۔ اگر حضور ایک بار دیکھ لیں تو پھر جی نہ چاہے کہ کسی اور کے ساتھ شادی ہو۔ میں سوچی کہ آزاد تو اب حسن آرا کے میاں ہو ہی گئے ہیں، اُن سے ہاتھ دھوؤ، شاید یہ سچ کہتی ہو، اگر ایسا ہی خوبصورت سبزہ آغاز جوان طناز ہے تو برائی کیا ہے۔ عیسائی ہو یا مسلمان۔ ہم کو شادی سے مطلب ہے۔ ہمیں یہ فکر نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو عیسائی کر کے اس کے ساتھ شادی کریں۔ میں کچھ نیم راضی ہوئی۔ وہ تاڑ گئی کہ چکما چل گیا۔ چوتھے دن مجھ سے کہا ذری چل کر کوٹھے پر باغ اور سبزے کا لُطف اٹھائیے۔ دو گھڑی جی بہلے۔ میں جو کوٹھے پر گئی تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔ حضور وہ دیکھیے اُسی شہزادے کی سواری مثل باد بہاری آ رہی ہے اب اس وقت غور سے دیکھیے کہ کس قدر جوبن ہے اور ذرا دبدبہ وطنطنہ بھی ملاحظہ فرمائیے گا۔

قریب ہی تھا کہ زینت النسا اُس قمر رخسار کی زینتِ آغوش ہو اور شادی ہو کر تمام عمر کے لیے مصیبت میں پڑے کہ مجھ سے بھی انھوں نے اتفاقیہ ذکر کیا۔ میں نے جو اُس نواب زادے کو دیکھا تو غش غش کرنے لگی وہ صورتِ زیبا کہ ملائک سجدے کریں۔ مگر دوسرے روز دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شہر بھر میں اس سے بڑھ کر شہدا اور کوئی نہیں ہے۔ تین تو بیسوائیں نوکر ہیں، اور چار محل میں اور دو منکوحہ بیویوں کو طلاق دے دیا۔ خرچ کی یہ کیفیت کہ ہزار کی آمدنی تو دس ہزار کا خرچ۔ صحبت میں شہدے لُچے لفنگے ہر دم جمع۔ ؎

لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل

دن رات چانڈو بازی، اور مدک بازی کا شغل رہتا ہے اور افیم گھلتی اور چرس کے دم لگتے ہیں۔ ؎

کھو دیا حسن مدک نے ستم ایجادوں کا

اُڑ گیا رنگ دھواں بن کے پری زادوں کا

اگر میں نے ادھر اُدھر تحقیقات نہ کی ہوتی تو غضب ہی ہو جاتا جس طرح وہ سب محلّوں میں پڑی ہوئی زندگی کے دن بسر کرتی ہیں اسی طرح ان کا بھی حال ہوتا۔

دو روز یہاں رہ کر آزاد رخصت ہوئے چلتے وقت زینت النسا نے پوچھا ہاں خوب یاد آیا وہ موا بونا افیمی کہاں ہے، آزاد نے کہا اُس نے روم اور میدان جنگ میں بڑی مدد دی مگر اتنا بڑا خبطی بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اب خدا جانے کہاں ہے۔ بمبئی تک ساتھ تھا۔ اختری اور زینت النسا سے رخصت ہونے کے وقت انھوں نے اقرار کیا کہ خط کتابت کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ اور شادی کے بعد ان دونوں کو مع ان کے شوہروں کے بلوائیں گے۔

زینت : ایسا نہ ہو کہ بھول جاؤ۔ بڑی شکایت ہوگی۔

آزاد : کیا مجال۔ بھولتے کوئی اور ہوں گے۔ یہاں تم دونوں کی یاد سے ہر دم دل کو خوش رکھتے ہیں۔ لے اب خدا حافظ و ناصر ہے۔

ان دونوں بہنوں سے رخصت ہو کر ریل کے اسٹیشن پر آئے۔ اور تین گھنٹے میں اُس مقام پر پہونچے جہاں ہوٹل میں مس میڈا اور کلیرسا کو چھوڑ آئے تھے۔ ان دونوں مہوشان بدیع الجمال کو ہمراہ لے کر پھر سفر کیا تو ایک مقام پر آزاد کچھ پڑھ کر ایسے بے اختیار ہو گئے کہ ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ ذیل کی سطریں نظر سے گذریں۔

شورے شد و از خواب عدم چشم گشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

مزار پُر انوار مقبول بارگاہ لم یزلی حق آگاہ عارف باللہ حضرت صف شکن علی شاہ برد اللہ مضجعہ و انار اللہ برہانہ۔

پختہ مکان کی طرح سے ہے فکرِ گور بھی — انسان جان دیتا ہے آرام کے لیے
رہتا ہے آدمی کا نشاں اس جہان میں — بنتی ہے قبر بعد فنا نام کے لیے
اے خاک تیرہ خاطر مہماں نگاہ دار — کیں نور چشم ماست کہ در بر گرفتۂ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرات ناظرین میاں صف شکن علی شاہ سے خوب واقف ہیں۔ فسانۂ آزاد جلد اوّل میں اس انوکھے بٹیر کا ذکر خیر درج ہے کہ مصاحبوں نے بھرے دے دے کر نواب صاحب کو خوب تیار کیا اور صف شکن علی شاہ کی اس درجہ تعریف کی کہ انسان تک سے بڑھا دیا۔

۱- اے حضور وہ تو عربی سمجھ سکتا ہے۔

۲- حضور غلام نے اس کو وظیفہ پڑھتے دیکھا ہے۔

۳- اجی ہر روز صبح شام ڈنڈ پیلتا تھا۔

۴- پابند صوم وصلوٰۃ بھی تھا جناب والا۔

۵- حضور سے اب ذکر کرتا ہوں کہ دس پانچ مرتبہ میں نے افیم پلادی مگر ذرا نشہ نہ ہوا۔ ہاں انکھڑیاں البتہ لال ہوگئیں تھیں۔

۶- پیر و مرشد پہلے سے حق حق کی آواز کا بک سے آیا کرتی تھی حضور کو ہم نے کئی بار جگا کے سنوا دیا تھا۔

نواب: "مجھے تو اُس سے عشق ہوگیا تھا جی۔ میں اس کی ایک ایک ادا پر جان دیتا تھا۔ وہ نکیلی چونچ وہ بیتابی سے کاکُن مُچگنا۔ چکّھی کھائی اور ڈٹ گیا۔ سینکڑوں معرکوں میں لڑا مگر کورا آیا۔" دو چونچیں ہوئیں اور حریف دم دبا کر بھاگا۔

۸- تس پر خداوند منجھولا ہی جنور تھا کیا شان ہے اُس کی قربان اُہو ہو ہو۔ بلا کا کس بل تھا۔

نواب: (آہ سرد) ۔

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغ آشنائی را

نواب کے دربار دربار کی تصویر آزاد کی نظروں کے سامنے تھی۔ ان دو نوں بعتان سہی قد سے تذکرہ کیا تو اور بھی قہقہے پڑے۔

جب شہر میں پہونچے تو آزاد کو شوق چرایا کہ جس طرح ممکن ہو نواب صاحب اور ان کے رفقا سے ضرور ملیں مس مُیڈا اور مس کلیر سا کو ہوٹل میں چھوڑا اور گاڑی کرایہ کر کے نواب صاحب کے دولت خانہ پر آئے۔ ادھر گاڑی سے اترے اُدھر خدمت گاروں دربانوں سپاہیوں خواصوں نے غل مچایا کہ خداوند محمد آزاد پاشا تشریف لائے ہیں۔ حضور آزاد صاحب گئے۔ پیر و مرشد آزاد آئے ہیں۔ میاں خوجی ہوت لو تمہارے آقا آگئے۔ نواب صاحب رفقا مصاحبین احباب سب کے سب گھبرا کے اُٹھ کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ آزاد پاشا رپ رپ کرتے ہوئے ترکی فوجی وردی ڈانٹے چلے آتے ہیں نواب صاحب نے جھپٹ کر مصافحہ کیا اور گلے سے لپٹ گئے۔ اور یوں ہم کلام ہوئے۔

نواب: بھائی جان آنکھیں تمہیں ڈھونڈھتی تھیں۔

آزاد: بحمد اللہ کہ یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی۔

نواب : اب یہ باتیں نہ کرنا۔ واللہ صاحب ضلع اور صاحب کمشنر تک تمہاری ملاقات کے شائق ہیں۔

مصاحب : بڑا نام کیا۔ واللہ کروڑوں آدمی ایک طرف اور حضور ایک طرف سینہ سپر جاں بکف لڑے۔

خوجی : غلام بھی آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد : (ہاتھ ملاکر) دل خواجہ بدیع الزماں۔

نواب : کیا ! خواجہ کون ! بدیع الزماں ۔!۔ بدالزماں کب سے ہوا۔ خوجی کہیے صاحب۔ بدیع الزماں ۔!۔

خو : حضور یہاں خدا جانے کون کون ملک دیکھ آئے ہیں۔

نواب : سنا آپ نے تین تین کروڑ آدمیوں سے تن تنہا مقابلہ کیا۔ بھئی مسیتا بیگ بلا کا آدمی ہے یہ شخص۔

مسیتا بیگ : خداوند اللہ کی دین ہے۔

غفور : میاں اچھے رہے۔ ہم سے ابھی دواجی نے کہا۔

نواب : ارے بھئی گنگا جمنی حقہ بھر لاؤ آپ کے واسطے۔ آزاد پاشا کو ایسا ویسا نہ سمجھنا میاں مسیتا بیگ ان کی تعریف کمشنر تک کی زبان سے سنی، اور سنا آپ سے اور شہنشاہ روس سے بھی ملاقات ہوئی۔ مگر جب وہ ملنے آئے تو آپ اپنی کرسی ہی پر بیٹھے رہے۔ بھائی جان اب تم نے وہ درجہ حاصل کیا ہے کہ اگر ہم حضور کہیں تو ہمارا فخر ہے کجا شہنشاہ روس کجا ہم۔

خو : خداوند مورچے پر اُن کو حضور دیکھتے تو غش کر جاتے جیسے شیر کچھار میں ڈکارتا ہے۔ ؎

بلبل بے دل برنگ گل درد بند قبا

دردل شوریدہ پنہاں درد پنہانی کس ست

آزاد : سبحان اللہ۔ بعد مدت آپ کی زبان سے برجستہ شعر سنا۔

نواب : (ہنس کر) مردود ہمیشہ گدھا ہی بنا رہے گا۔

خو : خداوند اب بندہ وہ خوجی نہیں ہے۔

نواب : ابے تو نامعقول اس بے محل شعر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی بلبل بیدل سے یہاں کیا سروکار ہے۔

خو : خیر حضور مالک ہیں۔ جو چاہے سو کہہ لیں۔

نواب : کیوں جناب انھوں نے کوئی کشتی نکالی تھی۔

آزاد : میرے سامنے تو دو چار نہیں دو چار ہزار بار دھپیائے البتہ گئے تھے۔ اور ایک بونے تک نے ان کو اٹھا کے دے مارا تھا، عورتوں نے گدّے دیے تو گز گز بھر زمین سے نیچے گرے۔

مصاحب : (قہقہہ لگا کر) واہ بھئی خوجی واہ۔

رفقا: (ہنس کر) اس وقت بھباڑا پھوٹ گیا۔

آزاد: کیا یہ گپ اڑاتے تھے کہ میں نے کشتیاں نکالیں۔

مسیتا: اے حضور جب سے آئے ہیں ناک میں دم کر دیا۔ گیدی سے بات ہوئی اور نکالوں قرولی۔ دوں ایک۔ دے ماروں اٹھا کے۔ منجھولے بٹیر کے برابر تو قد اور اس پر یہ خم دم۔

حضور: پرسوں تو کہتے تھے کہ مصر میں ہم نے آزاد کے برابر کے ایک پہلوان کو دم بھر میں آسمان دکھایا۔

آزاد: گھر کی پٹکی اور باسی ساگ آسمان دکھایا ایک بونے تنک نے گردن ناپی اور اٹھا کے دے مارا۔ چلے وہاں سے دون کی لینے۔

نواب: اجی یہ ہمیشہ کا جوتی خورہ ہے۔

مصاحبین: (قہقہہ لگا کر) بجا ہے جناب اس میں ذرا شک نہیں۔

اتنے میں نواب صاحب کے ہاں ایک منشی صاحب تشریف لائے۔

نواب: منشی صاحب! آپ کو پہچانا۔

منشی: اخاہ۔ حضور جنرل محمد آزاد پاشا صاحب ہیں۔ ؎

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

حضور بڑا نام پیدا کیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

آزاد: جناب میں کس لائق ہوں۔ من آنم کہ من دانم۔

نواب: اجی کمشنر صاحب ان کے مداح ہیں بس اب اور اس سے زیادہ اعزاز کیا ہوگا۔ بھئی میرے تو فخر ہیں۔

منشی: دریں چہ شک۔ بیشک فخر قوم ہیں۔

خو: اجی جناب میدان کارزار میں آپ دیکھتے تو غش غش کر جاتے گھوڑا دبایا اور لاکھ آدمیوں کے پرے میں کڑکڑاتے ہوئے دن سے موجود۔

منشی: آپ نے بھی بڑا ساتھ دیا خواجہ صاحب۔ مگر آپ کی بہادری کا کہیں ذکر سننے میں نہیں آیا۔

خو: آپ ایسے گیدیوں کو میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں نے وہ کارنمایاں کیے ہیں کہ بایدو شاید قرولی ہاتھ میں لی اور صفوں کی صفیں صاف کر دیں۔

منشی: اب کہیے اب تو آپ نواب صاحب کے ہاں بنے ہیں نہ۔

خو: داگ، ہو کر آبنے ہوں گے آپ بنتے کوئی اور ہیں۔ بننا کیا معنی کوئی تفرہ مقرر کیا ہے ابے گیدی۔

نواب: بگڑ گئے، حضور۔ بگڑ گئے میاں گیدی خر۔

پیرومرشد یوں پوچھنا چاہیئے تھا کہ اب تو آپ نواب صاحب بہادر کے ہاں پھر اسی عہدے پر ممتاز ہوئے نہ۔ یہ سب بالائے طاق پوچھا تو کیا پوچھا کہ آپ یہیں بنے ہیں نہ۔

منشی: اچھا جناب معاف فرمایئے۔ اب یہ بتایئے کہ آپ کی تنخواہ کیا رہ گئی۔

خو: قسم ہے حضور کے قدموں کی ملکوں ملکوں گیا اور ہزار ہا قسم کے آدمی دیکھے مگر آج تک اس فیشن کا بدتمیز دیکھنے میں نہیں آیا۔ محض بدسلیقہ مردک پوچھتا ہے کہ آپ کی تنخواہ کیا رہ گئی ہے صحبت یافتہ لوگ یوں پوچھتے ہیں کہ اب آپ کو کچھ ترقی ہوئی یا نہیں۔ ؎

منت از خفائش اے شوخ پرفن

چراگشتہ، بامن زار دشمن

آزاد: واقعی جو باتیں خواجہ صاحب نے دیکھی ہیں وہ کسی اور کو کہاں نصیب ہوئیں۔ ع۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

اور خواجہ صاحب یہ آپ نے بیان کیا تھا کہ مس روز آپ کی عاشق زار تھیں جناب ایک پری اِن پر فریفتہ ہو گئی تھی۔

خو: ایک پری! ہونھ! ایک پری! یوں نہیں کہئے ہر مقام پر پریاں دل و جان سے عاشق ہو جاتی تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر پری چہم دم خو کرد ار تندرو رفتار۔ ؎

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام

قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

سب سے پہلے تو ہم پر بوا عفہ (ارے، لاحول (منہ پر تھپڑ لگا کر) لاحول ولاقوۃ۔

آزاد: (قہقہہ لگا کر) ہاں ہاں بُوا زعفران کہو کہو۔ ؎

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے

جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے

خو: (ہاتھ جوڑ کر) واسطے خدا کے معاف کرو۔ واللہ نہ کہو۔ ہے ہے غضب ہو گیا۔ یہ ہم نے کیا کیا۔

نواب: جناب آزاد صاحب۔ اگر آپ نے اس امر کو مخفی رکھا تو واللہ بڑا رنج ہو گا۔ (ہاتھ باندھ کر) میں بھی دستہ بستہ عرض کرتا ہوں۔ اب فرمایئے میرا زیادہ خیال ہے یا اس گیدی کا۔

خواجہ صاحب نے کل حاضرین کو مخاطب کر کے جنگ کے معاملات کا یوں حال باندھا۔ کہا جس روز

آزاد پاشا اور   قلعہ میں تھے اس روز کی کارروائی دیکھنے کے قابل تھی۔ چار پانچ طرف سے زور تھا۔

مصاحب : جی چار طرف سے محصور ہونا تو مشہور ہے۔ پانچواں کون طرف آپ نے پیدا کیا۔ جو بات کہو گے وہی انوکھی۔

خو : تم ہو گدھے۔ کسی نے بات کی اور تم نے کاٹ دی۔ کون نہیں۔ دون۔ دون نہیں یوں ایک طرف دریا تھا اور خشکی بھی تھی۔ اگر جنوب کی سمت دریا ہی سے محصور کرتے تو فوج قلعہ خشکی سے نکل جاتی۔ اور اگر صرف خشکی ہی پر قبضہ ہوتا دریا کی سمت سے نکل بھاگتی یہ خرابی تھی۔ مگر تم ایسے گوگھوں کو اس کا کیا حال معلوم کبھی جنگ پر گئے ہو۔ کبھی توپ کی صورت دیکھی ہو۔ کبھی   تک تو دیکھا نہ ہوگا اور چلے ہیں واں سے بڑے کڑیل کے بچے بن کے۔ کسی نے خوب کہا۔

سب گرمی نفس کی ہیں اعضا کی لڑیاں
دیکھو نہ زندگی ہے سراپا زبان شمع

راوی : سبحان اللہ۔ سبحان اللہ عین موقع پر شعر پڑھ دیا۔

خو : بس قبلہ وکعبہ اب کریں تو کیا کریں ہاتھ پانوں پھولے ہوئے یا الہی کیا ہونا ہے اب جائیں تو کدھر سے، اور بھاگیں تو کیسے۔

نواب : واقعی وقت تو بڑا نازک تھا۔

آزاد : جناب نازک کیا جان کے لالے پڑے تھے۔

خو : اور روسیوں کی یہ کیفیت کہ گولے برسا رہے تھے اور ہر طرف سے آگ برس رہی ہے۔ سب ترکی گھبرائے ہوئے کہ یا الہی اب ہوگا کیا۔ ؎

مجھ پہ عاشق ہے نہیں کچھ ظالم
صبر آخر کرے وفا کب تک

پس آزاد پاشا نے مجھ سے کہا کہ بھائی جان اب کیا سوچتے ہو۔ مدد دو گے یا نکل جاؤ گے۔ میں آگ بھبوکا ہو گیا۔ کہا نکل جانا کیا معنی۔ ؎

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من
آں منم کاندر میان خاک وخوں بینی شدے

آزاد نے کہا پھر نکل نہ جانا۔ میں نے کہا بسم اللہ چل کر دیکھ تو لو۔

اتنے میں قلعہ کی دیواریں چھلنی ہو گئیں۔ اور پچاس قسم کے گولے برسنے لگے۔ پس آزاد پاشا نے

سب فوج محصور سے کہہ دیا کہ اب قلعہ کی دیوار توڑ کر ہم لوگ نکلنے والے ہیں۔ یہ کہہ کر مجھ سے کہا کہ تم سب کے مقدمۃ الجیش ہو اور بندہ مسلح ہو کر تتلی عربی نژاد ہوا نہاد پر سوار ہوا تو گھوڑے کی یہ کیفیت کہ اُڑتا ہوا جاتا تھا۔ اس مقام پر یہ حال تھا کہ۔ع۔

بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

قلعہ کے باہر میری شمشیر خوش غلاف جو چمکی تو دو لاکھ روسیوں کو تہ تیغ کیا۔ دو لاکھ پورے دو لاکھ۔

رفیق: اس جھوٹ پر خدا کی مار۔ ارے کمبخت کیوں لُطفِ سخن کھوتا ہے۔ اور سب سچ کہا مگر یہاں پر آن کر منہ کے بھل گر پڑا۔ اے لعنتِ خدا۔

نواب: واللہ مجھے اب تک لطف آتا تھا۔ مگر اس نے دو لاکھ آدمیوں کا ذکر کر کے لُطف خاک میں ملا دیا۔

خو: اچھا آزاد سے پوچھیے بیٹھے تو ہیں سامنے۔

نواب: حضرت سچ سچ کہیے گا اور آپ سچ سچ تو ضرور ہی کہیے گا جھوٹ بولنے سے آپ ایسوں کو کیا واسطہ۔ بس فقط اتنا کہیے گا کہ یہ واقعات کہاں تک صحیح ہیں۔

آزاد: جناب والا۔ پلونا کا جو کچھ حال بیان کیا وہ تو سب صحیح ہے مگر دو لاکھ آدمیوں کا تہ تیغ کرنا یہ میاں خواجہ صاحب کا طغیان زبان ہے اور صاف یہ ہے کہ پلونا کی تو انھوں نے صورت بھی نہیں دیکھی۔ آج تک یہ تو اُن دنوں میں خاص قسطنطنیہ میں تھے۔ اس پر بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اور آواز دیر تک گونجا کی۔ بیگم صاحب نے قہقہے کی آواز سنی تو مہری کو بلا کر کہا جا کر دیکھنا تو یہ قہقہہ کیا پڑا اس وقت۔

مہری: اے حضور وہ آئے ہیں۔ وہ تھے خوبصورت سے آدمی۔

بیگم: اوئی تو تو پہیلیاں بجھواتی ہے۔

مہری: سرکار وہ آئے نہیں تھے گورے گورے آدمی۔

بیگم: غفورن۔ ذری باہر دریافت کرو کہ یہ قہقہہ کس بات پر پڑا۔

غفورن: میں عرض کروں حضور نے ابھی شاید نہیں سنا وہ آئے ہیں۔ میاں آزاد۔ حضور نے تو چقوں میں سے ان کو دیکھا ہے۔

بیگم: اخاہ۔ آزاد آئے ہیں۔ یہ موا خوجی جھوٹ ہی بکتا تھا کہ آزاد اب یہاں نہ آئیں گے جا کے خیر و عافیت تو دریافت کرو ہماری طرف سے نہ پوچھنا۔ ہاں کہیں ایسی بات نہ کرنا۔

غفورن: واہ حضور کوئی دیوانی ہوں کیا۔ (باہر سے آن کر) حضور صحیح سلامتی سے آئے۔ مجھ سے پوچھنے لگے غفورن اچھی تو ہے۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور کہا ہاں حضور اچھی ہوں۔ دعا دیتی ہوں۔ حضور با خیریت سے

آئے۔ کہا ہاں۔

بیگم : ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ نواب کہتے تھے کہ آزاد نے اُس ملک میں بڑا نام کیا۔ توپ کے منہ لڑنے۔ تم نے کبھی توپ دیکھی ہے غفورن۔

غفورن : اے اوئی اللہ نہ دکھائے حضور۔

مہری : ہم نے دیکھی ہے حضور اور ہم تو روز ہی دیکھتے ہیں۔

بیگم : توپ دیکھی ہے۔ تمہارے میاں کسی فرقے میں سواروں کے سائیس ہوں گے۔ توپ نہیں ایک وہ دیکھی ہے۔

مہری : حضور یہ سامنے توپ ہی لگی ہے یا کچھ اور۔

راوی : ان کے مکان میں منجملہ اور خواصوں کے ایک خواص تھی رحیمن نامی سب خواصوں اور محل کی عورتوں سے موٹی تازی۔ مہری نے جو اس کی طرف اشارہ کیا بیگم صاحب اور غفورن اور خواصیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

رحیمن : کیا پڑا پایا بہن غفورن۔

غفورن : آج ایک نئی بات دیکھنے میں آئی ہے بہن۔

رحیمن : ہم کو بھی دکھاؤ۔ آپ ہی آپ لطف اٹھانا کیا معنی ہم بھی دیکھیں کوئی مٹھائی ہے یا کھلونا ہے۔ کیا ہے کیا۔

غفورن : توپ کی توپ اور عورت کی عورت۔

رحیمن : (سمجھ گئی) تمہیں لوگوں نے تو مل کر ہمیں اتنا دُبلا کر دیا۔

بیگم : اے آگ لگے تیرے اس جھوٹ کو اب اور کیا موٹی ہوتی۔ پھول کے کپّا تو ہو گئی ہے۔

رحیمن : اے ہے سرکار نے اندھیر ہی کر دیا۔ گل کا نٹا تو میں ہو گئی۔ یہ کہتی ہیں موٹ اور پھول کے کپّا ہوئی ہے۔ ع۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

بیگم : یہ قہقہہ کس بات پر پڑا تھا غفورن۔

غفورن : حضور وہ نگوڑا افیمی دو دن کی لے رہا تھا کہ میں نے یہ کہا اور میں نے وہ کیا۔ اتنے میں نواب صاحب نے پوچھا۔ کیوں آزاد صاحب یہ سچ کہتا ہے۔ انھوں نے کہا یہ وہاں تھے کہاں اُس شہر کے قلعہ کی صورت تک دیکھی نہیں۔ یوں ڈینگ ہانکنا اور بات ہے۔ بس خوجی تو دانت پیس کے رہ گئے اور ادھر سب کے سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

بیگم : آزاد ویسے ہی ہیں یا کچھ جھٹک گئے۔

غفورن : وہ تو اور بھی سُرخ و سفید ہو کر آئے ہیں۔

مہری : مگر خوجی کو وہاں کی آب و ہوا بھی راس نہ آئی۔

غفورن : حضور لڑائی کے وقت رن کی زمین کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

بیگم : اے ہے آدمی کانپتے ہوں گے کہ اب ہونا کیا ہے بڑے سورما کا کام ہے کہ وہاں قدم جما سکے۔ اللہ بچائے۔

غفورن : آزاد کے دل جگرے کو دیکھیے ابھی نام خدا۔ کل کے بچے ہیں مگر دل وہ شیر پایا کہ واہ واہ۔

مہری : حضور سنتے ہیں دو شیروں سے انھوں نے تنہا مقابلہ کیا۔

غفورن : کیا کچھ جھوٹ بھی ہے اور دونوں کو مارا۔

بیگم : ہاں۔ افوہ۔ تم نے بھی کوئی شیر دیکھا ہے۔

غفورن : ہاں حضور بہتیرے۔ ایک تو شیرنی دیکھی ہے۔ جو نواب صاحب کے کٹہرے میں بند رہتی تھی۔ اور ایک شیر باغ میں دیکھا تھا اس کے لیے مکان بنا تھا اور بڑی حفاظت رہتی تھی۔ مگر حضور دیکھنے میں تو گھوڑے سے بھی چھوٹا جانور اور جو ذرا بپھرے تو انسان کے اوسان خطا ہو جائیں۔ ہاتھی کو ایک تھپڑ میں زمین دکھاتا ہے۔ ادھر تھپیڑ دیا اُدھر کان پکڑ کے زمین پر بٹھا دیا اتنے بڑے جانور کا جوڑ ہو کا ڈوہ بے پتہ نہیں لگتا آدمی کس گنتی میں ہے۔ یہ آزاد ہی کی طاقت تھی کہ دو دو شیروں کو مار ڈالا۔ اُف ری جواں مردی۔ خوجی نے دیکھا کہ یار لوگ رنگ نہیں جمنے دیتے سوچے کہ آزاد جب تک نہیں آئے تھے تب تک تو خیر بعض بعض آدمی مان بھی لیتے تھے مگر جیسے یہ آئے کوئی سمجھتا ہی نہیں کہ بک کیا رہا ہے اور لطف یہ کہ میں تو آزاد کی تعریف کرتا ہوں اور یہ ذات شریف میرے ہی دشمن ہوئے جاتے ہیں۔ موقع پا کر آزاد کے قدموں پر ٹوپی رکھدی۔ اور کہا برسوں تمہارا ساتھ دیا ہے دو دو باتیں سُن لو۔

آزاد : فرمائیے فرمائیے۔ آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔

خو : اب زمانہ سازی تو رہنے دو۔

آزاد : میں آپ کا مطلب سمجھ گیا مگر کہاں تک ضبط کروں۔

خو : اس دربار میں میرے ذلیل کرنے سے اگر کچھ پائیے تو اختیار ہے آپ کو۔

آزاد : لاحول ولاقوۃ آپ بزرگ ہیں۔

خوجی : (سر پیٹ کر، ہائے افسوس عمر بھر ساتھ دیا۔ جان لڑا دی۔ اور اب اس دربار میں جہاں رزق کا سہارا ہے آپ ہم کو اُلّو بناتے ہیں تاکہ روٹیوں سے جائیں۔

آزاد : بھئی اچھا۔ اب تمہاری ہی سی کہیں گے۔

خو : مجھے رنگ تو باندھنے دو ذرا۔

آزاد : آپ رنگ جمائیں بندہ تائید کرے گا۔

خواجہ صاحب کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ نہایت ہی بشاش کہ اب گپ کے پُل باندھ دوں گا۔ اور جب آزاد کی کمک ہوئی پھر کیا پوچھنا ہے۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔ خوجی بھئی یہ کیا سرگوشی ہو رہی ہے کچھ راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔

خو : خداوند ملکی معاملات پر بحث ہو رہی تھی۔

نواب : کیا! ملکی معاملات کیسے!

خو : حضور میری رائے ہے کہ اس ملک میں بھی ملک نواز یلینڈ کی طرح نہریں جاری ہونی چاہئیں، اور آزاد پاشا کی رائے اور ہے کہ نہروں کے ذریعہ سے آب پاشی تو ممکن ہے، مگر آب و ہوا خراب ہے گی۔

مسیتا : اخاہ تو یہ کہیے کہ آپ شہر کے اندیشے میں دُبلے ہیں۔

خو : تم گو کھے یہ باتیں کیا جانو۔ پہلے اتنا تو بتاؤ کہ ایک ہانڈی میں کتنی تو پیں ہوتی ہیں۔ چلے وہاں سے جالینوس کی دُم بن کے۔

نواب : ہم دیکھتے ہیں۔ گو سٹری ہے، مگر باتیں ٹھکانے کی کرتا ہے۔

آزاد : تو اِن اُمور میں تو واقعی ان کو دخل ہے۔

غفور : حضور ان کو بڑی بڑی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔

آزاد : صاحب سفر بھی تو اس قدر دور دراز کا کیا تھا۔ کجا ہندوستان کجا روم خیال تو کیجئے۔ مگر جائے تو کچھ سیکھ جائے۔

خو : اور کیا۔ اور نہ کہ ہم ایسے عالم و فاضل۔

بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ صَلُّوا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

مصاحبین : (زور سے قہقہہ لگا کر) واہ وا۔ پس علمیت کا پورا پورا ثبوت دیا۔

ایک : ارے میاں قرآن شریف یاد نہیں۔

دوسرا : ہاں! واللہ خوب سوجھی۔ ایک ایک بات پر ایک ایک آیت پڑھ دیا کرو۔ ناواقف آدمی سمجھیں کہ بڑا عالم متبحر ہے۔

تیسرا : جی باہر سے دو چار باتیں جاننے لگے ہیں بس۔

چوتھا : واہ اب آپ دیکھیے اسی اٹھوارے میں انشاء اللہ پنساری کی دوکان کھولا چاہتے ہیں۔ ہلدی گی گو؟

تو پاس ہی ہے۔

میر صاحب: کیوں خواجہ صاحب پہاڑ تو آپ نے کثرت سے دیکھے ہوں گے۔

خو: ایک دو۔ کروڑوں۔ مگر جو لطف ادن ہے اس سے زیادہ لطف اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ بلندی کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔

نواب: بھلا آسمان وہاں سے کس قدر دور رہ جاتا ہے۔

خو: حضور کوئی ایک دن کی راہ۔ مگر زینہ کجا۔

نواب: اور کیوں صاحب وہاں سے تو بخوبی معلوم ہوتا ہوگا کہ مینھ کس جگہ سے آتا ہے۔

خو: خداوند پہاڑ کی چوٹی پر میں تھا اور مینھ نیچے برس رہا تھا۔ یہ ایک ہی دفعہ نہیں دیکھا بلکہ صدہا بار ہم اوپر سے دیکھ رہے ہیں کہ نیچے مینھ برستا ہے اور جہاں ہم ہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔

نواب: کیوں صاحب یہ سچ ہے عجیب بات ہے بھئی۔

آزاد: جی ہاں پہاڑ کے نیچے بارش ہوئی اور ہم پہاڑ پر سے دیکھ رہے ہیں۔

مسیتا: اور یہ جو مشہور ہے کہ بادل تالابوں میں پانی پیتے ہیں۔

خو: یہ تم ایسے گدھوں میں مشہور ہوگا۔

نواب: (مسکرا کر) بدلہ نکالنے کا اچھا موقع ملا ہے۔

مسیتا: خداوند تمام زمانے میں مشہور ہے کہ بادل پانی پی پی کے اُڑتا ہے تو اس کے پَروں سے پانی گرتا ہے۔

نواب: بھئی یہ تجربہ کار لوگ ہیں جو بیان کریں وہ صحیح ہے۔

خو: اور خداوند دریا کے مخزن ہم نے دیکھے۔

نواب: (زبان دبا کر) مخزن؟ دریا کا مخزن۔؟

خو: ہاں خداوند جہاں سے دریا نکلتا ہے عجب مقام ہوتا ہے۔ دریائے ڈینوب کا نام آپ نے سنا ہی ہوگا اتنا بڑا دریا ہے کہ سمندر اس کے مقابلے میں شرما جائے۔ اور مخزن جو جا کے دیکھا تو ہوش اُڑ گئے۔ حضور اِتنا بڑا زخار دریا اور ایک رئیس کے دیوان خانے کے احاطے سے نکلا ہے۔

میر صاحب: ایں! ہمیں یقین نہیں آتا سب غلط ہے۔

خو: یہ لوگ واللہ کنوئیں کے مینڈک ہیں۔

نواب: مکان کے احاطے سے۔ جیسے یہ ہمارے مکان کا احاطہ۔

خو: بلکہ اس سے بھی چھوٹا۔ حضور خدا کی خدائی ہے۔ اس میں بندے کو کیا دخل ہے بیچارے کو۔ اے توبہ!

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و فہم — در ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندیم
دفتر تمام گشت و بیاباں رسید عمر — ما ہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

اور خداوند ہم نے ایک مقام پر دیکھا کہ جس قدر شہر ہے سب لب دریا ہی بسا ہے۔ اور صرف ایک قطار۔ ایک صف۔ اُسی میں دُکانیں اُسی میں مکان۔ اسی میں کوٹھیاں۔ اسی میں محل اور ایوان، سب اس میں اور دریا کے اس پار باغ۔ امیر اور غریب سب دریا کی روانی کے مزے اٹھاتے ہیں۔ اور سامنے باغ لہلہاتے ہیں اور دوسری سمت جنگل اور رسا اور خداوند استنبول میں ایک جانور خانہ ہے۔

میر صاحب: تم کو تو دھوکے سے کسی نے اس میں بند نہیں کیا۔

خو: بس ان جانگلوؤں کو اور کچھ نہیں آتا۔

نواب: اجی تم اپنا مطلب کہو۔ اس جانور خانے میں کوئی نئی بات تھی۔

خو: خداوند ایک تو ہم نے بھینسا دیکھا۔ بھینسا کیا ہاتھی کا پاٹھا تھا۔ اور ناک کے اوپر ایک سینگ۔ یہ ارنا اُرنا بھینسے سے بڑا ہوتا ہے۔ نہایت قوی ہیکل جانور۔ بڑا گرانڈیل اور طاقت ور، اتفاق سے جس مکان میں بند تھا اس کی سلاخوں میں سے تین سلاخیں ٹوٹ گئیں، اور وہ جناب سمٹ سمٹا کے نکلا تو معاذ اللہ کا مقام ہے۔ بس کچھ نہ پوچھو ہوش اُڑ گئے۔ دو ہزار آدمی گدپد، ایک کے اوپر دوسرا، اور دس پر سو، اس طرح گرے کہ بیہوش کوئی چار پانچ سو آدمی زخمی ہوئے۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا کسی کا مُنہ ٹوٹا کسی کا سر پھوٹا اور چوبیس آدمی جان سے گئے۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اگر تم بھی بھاگتے ہو تو بڑی ہنسی ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ یہ کمیدانی کیا کرتے تھے۔ ذرا سے ارنا بھینسے کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ گو ہزاروں آدمی بھاگے، مگر ان میں اور ہم میں فرق تھا نہ۔ خیر۔ قبلہ بس ایک دفعہ جھپٹ کے جو جاتا ہوں تو گردن ہاتھ میں آئی۔ بس بائیں ہاتھ سے گردن دبائی، اور دبوچ کر بیٹھ گیا۔ پھر لاکھ لاکھ زور مارے اس نے۔ بہت تڑپا مگر کیا مجال ہم نے قابو نہ دیا۔ میں نے جھنجھوڑ ڈالا۔ ذرا گردن ہلائی، اور میں نے دبوچا۔ جتنے آدمی کھڑے دور سے تماشا دیکھ رہے تھے سب دنگ ہو گئے۔ کہ واہ رے پہلوان اور چو طرفہ سے تعریفیں ہونے لگیں۔ ایک بولا۔

۱۔ آدمی کاہے کو دیو کا بچہ ہے۔

۲۔ شیر بچہ ہے شیر بچہ۔ کمال ہے۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

۳۔ بھائی پہلوان ہے قتل کیے نہ چھوڑتا۔

۴۔ وہ کب چھوڑنے والے ہیں۔ اُہو ہو ہو۔ ایک جھجھوتی بنا۔

۵۔ اللہ اللہ۔ اتنا سا آدمی اور اس ڈوہ کے ڈوہ کو دبائے ہوئے ہے۔ شاباش شاباش۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

جب میں نے دیکھا کہ حریف کا دم ٹوٹ گیا۔ تو با آواز بلند للکارا:

کب اپنے منہ سے عاشق شکوہ بیداد کرتے ہیں — دہانِ غیر سے ہم شل نے فریاد کرتے ہیں

رقم کرتا ہوں جب دم کاٹ تیری تیغ ابرو کا — گریباں چاک اپنا جامۂ فولاد کرتے ہیں

جو سچ ہے کہ نہیں ہے حکم جنبش ایک ذرّے کو — تو بس ہم وہ ہی کرتے ہیں جو آپ ارشاد کرتے ہیں

جسے یہ ذبح کرتے ہیں نہیں پھر دیکھتے اس کو

یہ بُت اللہ اکبر کس قدر بیداد کرتے ہیں

بس یہ کہہ کر میں نے گردن چھوڑ دی، اور کہا ابھلاہٹ تو کیا مجال۔ سٹپٹا کے گر گیا۔ چاہا کہ اُٹھے۔ مگر ہمس تک نہ سکا۔ میری طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لوگوں نے اس قدر غل مچایا کہ توبہ ہی بھلی۔ وہ شور تھا...

۱۔ ارے او پہلوان کیوں سب کی جان کا خواہاں ہوا ہے۔

۲۔ بھائی جان اس قدر احسان کیا ہے اتنا اور احسان کرو۔ کہ جس طرح ممکن ہو اس بلا کو کٹہرے ہی میں ڈال دو۔

۳۔ ذرا بپھرے تو سنم کر ڈالے۔

۴۔ اب کے ایسا نہ ہو کہ انھیں میاں کو ہضم کر جائے۔

بس اتنا سننا تھا کہ میں نے ایک تھپڑ لگایا۔ چوندھیا کے تڑ سے گرا۔

مسیتا: اس کے کیا معنی۔ تڑ سے گرا۔ آپ کے خوف کے مارے لیٹا تو تھا ہی پھر لیٹے لیٹے کیوں کر گر پڑا۔

خو: واہی ہو۔ بس حضور میں نے کان پکڑا تو اس طرح سانتھ ہوا جیسے بکری۔ اسی کٹہرے میں پھر بند کر دیا۔

نواب: کیوں صاحب سچ ہے روایت۔؟

آزاد: میں اس وقت موجود نہ تھا۔ شاید سچ ہی ہے۔

میر صاحب: بس بس قلعی کھل گئی غضب خدا کا جھوٹ ہی بولتا ہے کہ گردن دبائی اور ہم سے نہ دیا۔ اسس کفر پر تو جی چاہتا ہے کہ اُٹھ کے گدا دوں کہ دس گز زمین میں گڑ جائے۔ نامعقول، گینڈے سے تو پیچھے پڑے گا پہلے ہم سے تو ہاتھ ملائیے بڑے پہلوان بنے ہیں۔

قسم خدا کی ہے جو اب کی کوئی کلمہ زبان سے نکلا تو اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ تو اپنے دل میں سمجھا کیا ہے۔ یہ سوکھی ہڈیاں لوہے کی سلاخیں ہیں۔

نواب صاحب نے آزاد سے دریافت کیا کہ گو آپ اُس وقت وہاں نہ ہوں، مگر یہ تو فرمائیے کہ اتنے بڑے

جانور سے انسان ضعیف البُنیان مقابلہ کرسکتا ہے بھلا۔

آزاد تو خوجی سے وعدہ کر چکے تھے۔ ان کا رنگ پھیکا نہ ہونے دیں گے۔ انھوں نے کہا نواب صاحب بات یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو ملکہ حاصل ہے کہ ادھر جانور کو دیکھا اُدھر اُس کی گردن پکڑی، اور شہ رگ کو اس ترکیب سے دبایا کہ پھر جانور کسی مصرف کا نہ رہے۔ اگر خواجہ صاحب کو بھی یہ ترکیب معلوم ہے اور یہ بات سچ ہے تو استعجاب کا مقام نہیں۔

نواب: بس اب ہم کو یقین آگیا۔

مسیتا: ہاں خداوند کیا عجب ہے۔ ہو۔ ایسا ہی ہو۔

رفیق: ہو نہیں صاحب ہے کہیے۔ جب حضور کے ذہن میں ایک بات آگئی تو آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔

مصاحب: حق ہے یہی بات ہے۔ بھائی جان یہی بات ہے۔

میر صاحب: اور جب ایک بات کی لم بھی دریافت ہوگئی تو پھر اس میں انکار کیا معنی۔

نواب: کیوں صاحب جنگ میں تو آپ نے خوب نام پیدا کیا ہے۔ بتایئے کہ آپ کے ہاتھ سے کس قدر آدمیوں کا خون ہوگیا ہوگا۔

خو: غلام سے پوچھیے۔ انہوں نے کُل ملا کر کم سے کم دو کروڑ آدمیوں کو تہِ تیغ کیا ہوگا۔

نواب: دو کروڑ۔ شاباش شاباش۔

خو: جب ہی تو روم اور شام، اور توران اور مُلتان اور ابی سینا اور جرمنی، اور آسٹریا، اور انگلستان، اور فرانس میں ان کا نام ہے۔

نواب صاحب نے کہا۔ اُفوہ۔ خوجی کو کتنے ملکوں کے نام یاد ہیں۔

آزاد: نواب صاحب اب ان کو وہ خوجی نہ سمجھیے۔

خو: خداوند میں نے ایک دریا بر خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں وہ کام کیا کہ ساری خدائی عش عش کر گئی۔ صرف تنِ تنہا میں اور ہزاروں آدمیوں کا مقابلہ کیا۔

نواب: لاحَولَ ولاقوۃ۔ سب غلط محض غلط۔

مسیتا: حضور تین حصے جھوٹ اور ایک حصہ صحیح۔

میر صاحب: ہم تو کہتے ہیں سب ڈینگ ہے۔

رفیق: اور نہیں تو کیا، یہ مضغہ، گوشت بلکہ مُشتِ استخوان اور دعویٰ یہ کروڑوں آدمیوں سے مقابلہ کریں۔

آزاد: نواب صاحب اس بات کی تو ہم بھی گواہی دیتے ہیں، اس جنگ میں میں شریک نہ تھا۔ مگر میں نے اخبار میں

ان کی تعریف دیکھی تھی۔ اور وہ اخبار میرے پاس موجود ہے۔
منشی: اخاہ۔ خواجہ بدیع الزماں آپ ہی ہیں میں نے ایک اُردو اخبار میں اُس کا ترجمہ دیکھا تھا۔
نواب: تو اب ہم کو یقین آگیا جب جنرل آزاد صاحب نے کہا اور جب دوسرے صاحب نے گواہی دی تو صحیح ہے۔
آزاد: وہ موقع ہی ایسا تھا نہ۔
خو: یہ! موقع ہی ایسا تھا بجا ارشاد ہوا۔
آزاد: نہیں نہیں بھئی تم نے تو بڑا ہی کارنمایاں کیا۔ مگر موقع ایسا اچھا ملا کہ اگر دس کروڑ بھی ہوتے تو اس کے ہاتھ پانوں چھوٹ جاتے۔ یہ آپ کا کام تھا۔
خو: ان ہاتھ پانوں پر سب کچھ کیا اور پھر زندہ نکل آئے اور طرّہ یہ کہ ہر مقام پر خوبانِ مہ جبین عاشق زار اور یہاں فراقِ یار۔ ہجر کے صدمے غضب ہیں۔ ع

ہجر میں اُس گل کے ہر گل کا گریباں چاک ہے | چشم نرگس میں ہے آنسو قطرۂ شبنم نہیں
یار کی صورت کو رضواں دیکھ کر کہنے لگا | سچ تو ہے یہ آدمی بھی نور سے کچھ کم نہیں

حضور ہم بھی دوسرے رستم ہندی ہیں۔ واللہ۔
آزاد: کچھ اور بھی تم نے بیان کیا یا نہیں خواجہ صاحب۔
خو: حضور نے قطعی ممانعت کر دی تھی۔
نواب: کیا کیا۔ کیا ہم سے کچھ چوری کی بات ہے۔
آزاد: پیرو مرشد صف شکن علی شاہ وہاں ملے تھے۔
نواب: (بہ آواز بلند) واہ۔ لو صاحبو دوستو۔ ارے میرا صف شکن جنگ کے معرکے میں پہونچا۔
مصاحبین: (بآواز بلند) جزاک اللہ، جزاک اللہ۔ واہ رے صف شکن علی شاہ۔
خو: خداوند اس ڈانٹ ڈپٹ کا بٹیر بھی کم دیکھا ہوگا۔
نواب: دیکھا ہی نہیں کم کیسا۔
مصاحبین: حق ہے حق ہے۔ واللہ بہت صحیح ہے۔
نواب: ارے میاں غفور ذرا گھر میں اطلاع کر دو کہ صف شکن علی شاہ بخیریت ہیں۔ معرکہ دار وگیر میں ان کو لوگ دیکھ آئے ہیں۔
غفور: سرکار یہ کس نے کہا۔ یہ خوش خبری کس نے سُنائی۔

نواب :- ہمارے مہربان دوست آزاد پاشانے۔
غفور :- ڈیوڑھی پر آیا۔ خدمت گار، دربان۔ چپراسی۔ خواص سب یہاں نواب کی سادگی پر کھل کھلا کھیل کھلا کر ہنس رہے تھے۔
خدمت گار :- ایسا اُلّو کا پٹھا بھی کبھی نہ دیکھا ہوگا۔
غفور :- دیکھتے ہو نرا پاگل ہے۔ واللہ نرا پاگل۔
چپراسی :- ابھی دیکھیے تو کیا حاشیے چڑھائے جائیں گے۔
خواص :- اس میں کیا شک ہے میاں۔ ابھی جنگ میں شریک کیے جائیں گے۔ غفور نے مہری کو بلایا اور جا کے اندر کہہ دو کہ سرکار نے فرمایا ہے کہ ہماری صف شکن علی شاہ بخیریت ہیں، اور روم کی جنگ میں لوگوں نے ان کو دیکھا تھا۔ مہری نے اندر جا کر ہنستے ہنستے کہا۔ سرکار مبارک ہو۔ بڑی خوشی کی خبر غفور کے زبانی سننے میں آئی ہے۔ حضور نے کہلا بھیجا ہے کہ ہمارے صف شکن علی شاہ (مسکرا کر) روم کی لڑائی میں ہیں۔ معتبر لوگوں نے دیکھا ہے۔ بیگم صاحب نے سنتے ہی قہقہہ لگایا، اور ان موؤں نے پھر نواب کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا۔ جا کے کہدو کہ ذری ان کو یہاں بھیجدے کہ بیگم صاحب کھڑے کھڑے بلاتی ہیں۔

نواب صاحب کو اطلاع ہوئی آزاد کی طرف مخاطب ہو کر رخصت کے طالب ہوئے۔ کہا ابھی کوئی پل بھی دو گھڑی میں حاضر ہوتا ہوں۔

آزاد بسم اللہ آپ تشریف لیجائیے۔ سرکار نے یاد کیا ہے۔ خاکسار کی طرف سے آداب عرض کر دیجیے گا۔ نواب صاحب اُٹھے۔ مگر اٹھتے ہی پھر بیٹھ گئے، اور کچھ سوچ کر کہا۔ حضرت جانے کو تو میں جاتا ہوں مگر وہ دریافت کریں گی کہ مفصل حالات بیان کرو۔ تو میں کیا کہوں گا۔ کچھ حال تو بیان فرمائیے۔

مسیتا :- حضور اس میں حال کیا پوچھتے ہیں۔ سرکار جنگ پر کوئی منہ تاکنے دل لگی دیکھنے تو جاتا نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ لڑے اور مارے، اور مرے بس، اور عجب نہیں کہ جنگ کا حال سن سن کر دل میں جوش پیدا ہوا ہو۔
نواب :- بھئی کیا بات کہی ہے۔ بس یہی بات ہے۔
خو :- حق ہے پیر مرشد۔ اس وقت مسیتا بیگ کو خوب سوجھی۔
مسیتا :- اس وقت کیا معنی ہمیشہ ہی خوب سوجھتی ہے۔
آزاد :- خواجہ صاحب سے اس کا حال دریافت کیجیے خوب واقف ہیں۔

خو:۔ ساتھ تو سچ پوچھیے تو میرا ہی ان کا بہت رہا۔ ان کی انگریزی وضع سے بہت چکراتے تھے۔
نواب:۔ بھلا کسی مورچے پر گئے تھے یا نہیں۔ دور ہی سے دعا دیا کیے۔
خو:۔ خداوند غلام جو عرض کرے گا کسی کو باور نہ آئے گا۔ اور یہ آپ کے پاجی مصاحب مجھے جھوٹا بنائیں گے اور میں جھلاؤں گا۔ اور مفت کی ٹھائیں ٹھائیں ہوگی۔
نواب:۔ کیا مجال۔ خدا کی قسم اب تم میرے رفیق خاص ہوئے۔ تم نے جو تجربہ حاصل کیا ہے۔ بھلا دوسرا تمہارا مقابلہ کر سکتا ہے۔
خو:۔ یہ حضور کے اقبال کا اثر ہے خداوند۔ ورنہ من آنم کہ من دانم کا نقشہ ہے۔ اذلِ خلایق ہیچ پیرز۔ ہیچمداں۔ نالایق ردِ خلایق مردود مطرود نامعقول ہوں۔ ؎

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقول درد
جو کچھ کہ ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

حضور بات یہ ہوئی کہ غلام لب چشمہ سار ایک پیالی میں آہستہ آہستہ افیم گھول رہا تھا کہ بس درخت کی طرف سے نظر کرتا ہوں تو نور کا عالم یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے، یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ غور کر کے دیکھا تو روشنی پہلے تو میں سمجھا کہ چنار کا درخت ہے۔ مگر دم کے دم میں ہمارے حضور صف شکن پھر سے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے۔
نواب:۔ شکر خدا کا ہزار شکر خدا۔ بڑے خوش ہوئے ہوں گے۔
خو:۔ حضور جیسے کروڑوں روپیہ مل گیا۔ دنیا بھر کی اقلیم کے مالک بن بیٹھے۔ حضور کا حال بیان کیا۔ یہاں کا ذکر چھیڑا۔ سرکار کی بے قراری اور فراق میں نصیب اعدا گریہ وزاری کا حال کہا۔ بس حضور پھر تو یہ کیفیت تھی کہ کسی لڑائی میں غنیم جم نہ سکے۔ جنگ ہوئی اور روسیوں نے توپوں پر بتی لگالی اور ادھر میرے شیر نے کیل ٹھونک دی۔
نواب:۔ ایں! ہاہاہا۔ واللہ اے میرے صف شکن علی شاہ۔
میستا:۔ خداوند! جانور کیا جادو ہے۔ سحر ہے۔ پرکالۂ آتش ہے۔
خو:۔ بھلا اس کو کوئی بٹیر کہہ سکتا ہے، اور جانور آپ خود ہیں۔ ایسا ثقیل اور سخت اونا ملائم لفظ ان کی شان میں آپ استعمال کرتے ہیں۔ نامعقول!۔
نواب:۔ میستا بیگ اگر تم کو اچھی طرح رہنا ہے تو رہو ورنہ اپنے گھر کا راستہ لو۔ اس کے کیا معنی آج صف شکن کو جانور بنایا۔ کل کو مجھے جانور کہو گے۔ مصاحب ہو کہ آفا۔

مصاحب :- خداوند بجا ارشاد ہوا یہ نرے پھوہڑ ہیں۔
مسیتا :- حضور۔ یوں تو۔ مگر۔
غفور :- اچھا تو اب خاموش ہی رہیے۔ صاحب قصور ہوا۔
خو :- نہیں صریح کمالات کا حال سن چکے مگر تب بھی اپنی ہی سی کہے جائیں گے۔ دوسرا اگر اس وقت جانور ہوتا تو گلپھڑے چیر کے دھر دیتا مردک کے۔ نہ ہوئی قرولی۔
راوی :- واہ خواجہ بدیعا۔ واہ۔ اس فن کے تو بادشاہ ہو۔ جس مصاحب کو چاہو بات کی بات میں نکلوا دو۔ کمال حاصل ہے۔ نواب صاحب اب اس وقت خوجی کا جامہ پہنے ہوئے ہیں ایک مینا بیگ پر کیا فرض ہے جس کو کہو نکلوا دیں گے۔ مگر واہ رے صف شکن اللہ رے تیری جرأت۔ خواجہ صاحب نے ایک جنگ دریائی کا حال یوں بیان کیا خداوند نعمت خشکی میں تو سب لڑ سکتے ہیں، مگر تری میں لڑنا البتہ کارے دارد۔ سو حضور تری کی جنگ میں صف شکن اور بھی سب سے بڑھ کر ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چھوٹا سا دریا تھا۔ اِس طرف ہم۔ اُس طرف غنیم، لب دریا مورچہ بندی ہو گئی، اور گولیاں چلنے لگیں۔ دھنشا۔ بس خداوند میں کیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن موجود، آتے ہی دیکھا آؤ نہ تاؤ، ایک کنکری لے کے کچھ پڑھ کر اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ پھٹ گئی، اور ہزار ٹکڑے ہو گئے۔
نواب :- ایں! واہ واہ! کیا کہنا ہے۔ مصرعہ :-

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مسیتا :- سبحان اللہ سبحان اللہ۔ خداوند غور کا مقام ہے کہ ایک ذرا سی کنکری، کاکن کے دانے کے برابر، اور توپ کے بہتر ٹکڑے کر دیئے۔
مصاحب :- کیا پوچھنا ہے۔ اللہ ری کنکری۔
مسیتا :- کنکری نہیں تھی وہ۔ خدا جانے کیا تھا۔
خو :- ہونہہ! کنکری! - اب سنیے کہ دوسری کنکری جو پڑھ کے پھینکی تو ایک اور توپ پھٹی اور بہتر ٹکڑے اور کوئی تین چار ہزار آدمی مجروح اور مقتول ہوئے۔
نواب :- اس کنکری کو ملاحظہ فرمایئے گا۔ کیا بلا کی کنکری ہے۔ اللہ اللہ؟ دو سو ٹکڑے توپ کے اور چار ہزار روسی مجروح اور مقتول۔ خدا کی شان ہے۔ واہ رے میرے صف شکن۔ میری موت کے خواہاں تھے۔ کیا چپاک سے قبر بنوا دی ہے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ کھدوا ڈالوں

خداوند چودہ توپیں اڑادی گئیں اور جتنے آدمی بیٹھے تھے سب تربھر ہو گئے۔ کچھ پوچھیے نہ حضور آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہوا۔ اگر ایک گولہ بھی پڑا ہوتا تو لوگ سمجھتے کہ شاید اُس گولے میں کچھ سامان کچھ مصالح ہی ایسا تھا مگر ذراسی کنکری تو کسی کو معلوم بھی نہیں ہوئی۔

نواب : اور کیونکر معلوم ہو ماش کے دانے کے برابر کنکری معلوم کیسے ہو مگر بلا کی کنکری تھی کہ توپ کو اُڑا دیا اور دو ہزار ٹکڑے کر ڈالے۔ اور ہزار ہا آدمیوں کی جان لی۔ اللہ رے کنکری کے جمال۔ جادو ہے کہ کنکری ہے واہ بھئی کوئی جائے ذرا صف شکن کی کابک تو لاؤ۔

اتنے میں پھر مہری نے آن کر کہا حضور بڑا ضروری کام ہے۔ ابھی بُلایا ہے نوابصاحب خوجی کو لے کر زنان خانے چلے۔ خوجی کی آنکھوں میں دوہری پٹی باندھی گئی۔ نواب صاحب نے ان کو حکم دیا کہ پہلے ڈیوڑھے میں کھڑے رہو میں بیگم صاحب سے دریافت کروں تو بلاؤں جیسے ہی اندر قدم رکھا بیگم صاحب نے قہقہہ لگایا۔

نواب : ایک تم پر کیا فرض ہے سارا زمانہ آج خوش ہے۔

راوی : خوب سمجھے۔ ع۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

بیگم : صف شکن علی شاہ اَب کہاں ہیں۔

نواب : واللہ مجھے یہ حال معلوم ہی نہ تھا کہ جنگ و جدال میں بھی برق ہیں، میں تو سمجھتا تھا صرف خانہ جنگیوں ہی میں استاد ہے۔ مگر اس نے تو جا کے توپوں میں کیلیں ٹھونک دیں۔ اللہ اللہ! نہ جانے یہ سب سیکھا کس سے ہے۔؟

بیگم : یہ خدا کی دین ہے۔ سیکھنے سے کہیں ایسی باتیں آتی ہیں۔

نواب : واللہ سچ کہتی ہو بیگم صاحب۔ سچ ہے پیاری اس وقت تم سے جی خوش ہو گیا۔ اے غضب خدا کا کجا توپ۔ کجا کیل۔ کجا صف شکن۔ خیال تو کرو۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

بیگم : اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو صف شکن کو ہزاروں پردوں میں چھپا کے رکھتی۔ کبھی ہوا بھی نہ دیتی مگر اب تو جو ہوا سو ہوا۔ ہاں خوب یاد آیا سنو وہ تو ابھی جیتے جاگتے ہیں اور تم نے اُن کا مزار بنوا دیا یہ کیا۔

نواب : واللہ خوب یاد دلایا۔ پیش از مرگ واویلا۔

بیگم : یہ تو صریح کوسنا ہوا کسی بیچارے کو۔

نواب : کوسنے کے علاوہ اس میں اور فیہ بھی ہے۔ مجھ کو سیر کرتے ہوئے اس طرف آ نکلے اور پڑھے لکھے تو ہیں ہی نظر پڑ گئی کہ مزار پُر انوار میاں صف شکن علی شاہ تو اس وقت وہ کہیں گے کہ ماشاءاللہ یہ لوگ

ورنہ بُری بات ہو گی۔

نواب صاحب نے بیگم صاحب سے کہا۔ ہمارا پرانا رفیق خواجہ بدیع الزماں جس کو ہم لوگ خوجی کہتے ہیں جنگ کے میدان میں صف شکن سے ملا تھا۔ اگر اجازت دو تو یہاں بُلالوں پھر اس کی زبان سے اس کا حال سنو۔ دیکھو تو کہتا کیا ہے۔

بیگم: اوئی جہنم میں جائے موا۔ اور سنو اس اُفیمی کو گھر کے اندر لائیں گے۔ واہ ہم ایسا حال سننے سے درگزرے۔

نواب: سُن تو لو۔ اول تو بوڑھا۔ پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت۔ دوسرے معتبر۔ تیسرے دوہری دوہری پٹی بندھی ہے۔ اچھا ڈیوڑھی سے کہیے۔

بیگم: ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ مگر میں اُن موئے نگاروں خوشامد خوروں کے نام سے جلتی ہوں۔ انھیں لچوں کی صحبت میں دن دہاڑوں کو پہونچے۔

نواب: ایں! ماشاء اللہ۔ ؎

ہر دم آزردگی غیر سبب راچہ علاج
تا گذشتیم ز لطف تو غضب راچہ علاج

خو: خداوند غلام حاضر ہے۔

بیگم: ایں! کیا ڈیوڑھی میں بٹھا آئے تھے۔

خواص: اوئی۔ میں تو سمجھی کنوئیں میں سے کوئی بولا۔

بیگم: اے موا اُفیمی ہر دم پینک میں رہا چاہے۔

نواب: خواجہ صاحب کیا سو گئے ارے میاں خوجی۔

دربان: خواجہ صاحب۔ خواجہ صاحب۔ دیکھو سرکار کیا فرماتے ہیں۔

خو: (چونک کر) جی پیر و مرشد۔ حکم خداوند عالم۔

بیگم: دیکھا اللہ جانتا ہے اونگھ رہا تھا موا۔ میں تو کہتی تھی ہی کہ اونگھتا ہے۔ وہ تو ہر دم پینک ہی میں رہتا ہے۔

نواب: بھئی ذری صف شکن علی شاہ کا حال تو کہہ چلو۔

خو: خداوند نواب آنکھیں تو کھلوا دیجیے۔

بیگم: کیا کتیا کے پلّے کی آنکھیں ہی ابھی نہیں کھلی ہیں۔

نواب: پہلے حالات بیان کرو۔ ذرا توپ والا ذکر چھیڑو۔ یہاں کسی کو یقین ہی نہیں آتا ہے۔

خو: خداوند یہ وہی مثل ہوئی۔ ؎

یوسف نہیں ہے یار کٹیں جس پہ انگلیاں
کاٹیں گلے نگاہ جو سوئے گلو کریں

اور حضور یقین کیونکر آئے بھلا یقین آنے کی بھی کوئی بات ہے۔ جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں گے کبھی نہ مانیں گے۔

نواب: تو بھی ہم نے کیوں کر مان لیا۔ اتنا تو سوچو۔

خو: حضور اللہ نے سرکار کو چشم بینا دی ہے۔ آپ نہ سمجھیں تو کون سمجھے۔ خداوند کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

آئینہ دیکھتے تم بھی نہ صفائی ہوتی
اس سے بھی آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوتی

تو حضور کا دل تو مثال آئینہ ہے۔ خداوند کیفیت یہ ہوئی کہ دریا کے دونوں طرف آمنے سامنے گھوڑ چڑھی، توپیں اور سپاہی بندوقیں چھتیائے ہوئے گولیاں چلا رہے تھے بس صف شکن نے ٹانگیں اٹھا کر خدا جانے کیا افسون پھونک دیا کہ ادھر کنکری پھینکی اور ادھر توپ کے دو سو ٹکڑے اور ہر ٹکڑے نے سو سو روسیوں کی جان لی۔

بیگم: اس جھوٹ کو آگ لگے۔ افیم پی پی کے نگوڑوں کو کیا سوجھتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک کنکری سے توپ کے سو ٹکڑے ہو گئے۔ اوئی خدا ہی کا ڈر نہیں۔

خو: انھیں یقین ہی نہیں آتا تو اس کو کیا کرے۔

بیگم: (جھلا کر) چلو بس خاموش رہو۔ کاہے کا یقین آئے۔ ذرا سا موا بٹیر اور کنکری سے اس نے توپ کے دو سو ٹکڑے کر ڈالے۔ اللہ جانتا ہے تم اپنی فصد کھلواؤ جراح کو بلواؤ۔ کہو مفت اندام کی فصد کھولے۔

نواب: اب خدا جانے ہمیں جنون ہے یا تمہیں۔

خو: خداوند بحث سے کیا فائدہ۔ عورتوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہ آئیں گی۔ حضور وہ بیچاری کیا جانیں۔

بیگم: محبوبن دربان سے کہو اس نگوڑے خوشامد خورے کو جوتی مار کے نکال دو۔ خبردار جو کبھی اس کو ڈیوڑھی میں آنے دیا۔

خو: سرکار تو خفا ہی ہوتی ہیں ناحق بن ناحق۔

بیگم: ناحق بن ناحق: ہیں کہیں آج اس کو قتل نہ کروا دوں ارے محبوبن دربان کھڑی سنتی کیا ہے۔

محبوبن: حسینی او حسینی لے اس مونڈی کاٹے کے کان تو لے۔ کان پکڑ کے تھپڑ مارتا ہوا لے جا اور شنو یہ بھی اٹھے ہوئے۔

خو : بس بس۔ دیکھو کان وان کی دل لگی اچھی نہیں۔

محبوبن : (چپت لگاکر) اب چلتا ہے یا مچلتا ہے۔

خو : (ٹوپی زمین سے اٹھاکر) اچھا اگر آج جیتے بچ جایئے تو جب ہی کہنا۔ ابھی ایک تھپیڑ دوں تو دم نکل جائے۔

اتنا ہی کہنا تھا کہ دوسری مہری نے بھی کان پکڑ کے میاں خوجی کو خوب چپتیایا۔ یہ آگ بھبھوکا ہو گئے۔ مگر سوچے کہ نواب صاحب نے آج اس قدر اعزاز بخشا ہے اگر سب لوگوں پر کھل جائے گا کہ محبوبن کی جوتیاں کھائیں تو بات بے ڈھب ہوگی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ خاموش ہو رہو، جھاڑ پونچھ کے باہر آئے۔ برف کا پانی پیا۔ ٹھنڈے ہوئے۔ گلوری چکھی اور لیٹ رہے۔

اب ادھر کا حال سنیے کہ بیگم صاحب نے خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا اور دانت پیس پیس کر کہا۔ ذرا تو سوچو کہ تمہارے کو ہو کیا گیا ہے۔ کہاں بٹیر کہاں توپ۔ کہاں جنگ۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو بلی کھا گئی ہو یا انھیں دوزخی مصاحبوں میں سے کسی نے نکال کے بیچ لیا ہوگا۔ اور ان کو پٹی پڑھا دی کہ وہ نوصف شکن علی شاہ تھے۔ وہ ہنستے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ یہ کسی طرح یہاں سے نکالے جائیں تو گھر کا انتظام ہو ورنہ اللہ اللہ خیر صلاح ہے۔ آخر تم کسی اپنے دوست سے تو پوچھو دیکھو اور لوگوں کی کیا رائے ہے۔

ایک مولوی کو بُلوایا تھا تو پھر اُس نے کیا کہا۔ اس نے یہی کہا کہ کچھ جنون ہو گیا ہے۔ خود ہنستے ہو کہ مجھے بناتے ہو۔ بٹیر اور عالم بقا ہے بھلے چنگے پڑھے لکھے گورے چٹے آدمی مگر ان مصاحبوں پر آسمان پھٹ پڑے انھوں نے کہیں کا نہ رکھا۔

نواب : خدا کے لیے ان میرے مصاحبوں کو نہ کوسو چاہے مجھے بُرا بھلا کہہ لو۔ مگر ان بیچارے جاں نثاروں کی نسبت تو ایسی باتیں زبان سے نہ نکالیں۔

بیگم : خدا موئے مفت خوروں سے سمجھے اور کیا کہوں۔

نواب : از برائے خدا ذرا آہستہ آہستہ کہو۔ کہیں وہ سن نہ لیں تو بھڑ بھڑا کے اٹھ جائیں۔ پھر میں اکیلا ہی مکھیاں ہی مارا کروں۔

بیگم : اے ہے ایسے بڑے کھرے ہیں۔ اے تم تو جوتیاں مار کے نکالو تو چوں نہ کریں اور اس ڈر کو تو دیکھو۔ ہے ہے کوئی سُن نہ لے۔ جو بھڑ بھڑا کے نکل جائیں گے تو کیا ہوگا۔ اللہ کرے کل جاتے ہیں تو آج ہی چلے جائیں۔ اللہ کہیں اُن کو یہاں سے دفا تو کرے۔

مہری : (آہستہ سے) حضور تو چوک گئیں۔ ذری اس موئے خوجی کی کہانی تو سنی ہوتی۔ اور جو ذری آپ ہاں ہاں کرتی جائیں تو زمین اور آسمان کے قلابے ملادے۔

بیگم: اچھا اس کو بلاؤ تو ذری۔ کہو صف شکن کا کچا چٹھا کہہ سنائے مگر جھوٹ بولا اور میں آگ بھبوکا ہو گئی۔

نواب: یا الہٰی یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ خواہی نخواہی جھوٹ ہی بولے گا اتنے دن سے رفاقت کرتا ہے کبھی آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ اب ہی جھوٹ بولنے لگے گا اور آخر اتنا تو سمجھو کہ جھوٹ بولنے سے اس کو مل کیا جائے گا۔

بیگم: اچھا لاؤ۔ میں سنوں تو صف شکن نے کیا کیا سامان کیے۔ مہری نے باہر جا کر خوجی کو بلایا۔ خواجہ صاحب جھلائے ہوئے چھپر کھٹ پر دراز تھے۔ کہا جا کے کہدو اب ہم وہ خوجی نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ آنے والے اور جانے والے اور بلانے والے اور بلوانے والے اور بھیجنے والے اور بھجوانے والے سب کو کچھ کہنا ہوں۔ مہری نے جھلا کر داروغہ کو کہا۔ تم کھڑے دیکھتے کیا ہو۔ داروغہ جی اٹھ کے جہنم واصل نہیں کرتے موئے کو۔ داروغہ نے قریب آن کر آہستہ سے کہا خبردار اب ان کی شان میں ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالنا۔ ورنہ حضور بددماغ ہو جائیں گے۔ اب تو جو کچھ ہیں یہی یہ ہیں۔ مہری نے خوشامد کر کے کہا۔ اے خواجہ صاحب سرکار یاد کرتی ہیں۔ اور تم نہیں چلتے اور حضور بھی بلا رہے ہیں۔

لوگوں نے سمجھایا۔ داروغہ نے خوشامد آزاد نے فہمایش کی۔ ہارے بہزار خرابی خواجہ صاحب ڈیوڑھی میں آئے۔

مہری: حضور خواجہ صاحب ڈیوڑھی میں تشریف رکھتے ہیں۔

خو: آداب عرض کرتا ہوں سرکار۔ اب کیا پھر کچھ مہربانی کی نظر غریب کے حال پر ہو گی ابھی کچھ انعام باقی ہو تو اب مل جائے۔

بیگم: اگر ذرا بھی جھوٹ بولے گا تو تو جانے گا صف شکن کا حال بیان کر مگر سچا سچا۔ ذرا جھوٹ کا نام نہ ہو خبردار۔

خو: واہ ری قسمت ہندوستان سے بمبئی گئے وہاں سب کے سب حضور حضور کرتے تھے۔ عورتیں عاشق مرد غلام۔ مصر میں ہزارہا عورتیں کمربستہ حاضر۔ ٹرکی میں کوہ قاف کی پریاں نقد جان دے کر نثار۔ تقریر صورت نگاہ چتون۔ سب میں جادو بھرا۔ جس نے دیکھا دنگ ہو گیا۔ ؎

دم پھڑک جائے جسے سنتے ہی تقریر یہ ہے دیکھے تو جی ہی نکل جائے نگہ تیر یہ ہے
دیکھتے رہتے ہیں ہم خواب پریشاں اکثر پیچ میں پڑ گئے اس زلف کی تعبیر یہ ہے

قتل ہو گا کوئی اس تیغ سے یہ لکھا ہے
جوہر تیغ نہیں ہے خط تقدیر یہ ہے

مس روزنامی ایک مہوشس ہزار دا پر ہزاروں دعا دیتی تھی مگر۔ ؎

لگا دل اس بتِ نا آشنا سے
عبث ہم پھر گئے اپنے خدا سے

جب کبھی اس کی یاد میں نیند آتی ہے رات بھر عمدہ عمدہ خواب دیکھا کرتا ہوں اور جو زلف کی یاد میں آنکھ لگی تو پھر کچھ نہ پوچھو۔ ع

خواب میں اک نور آتا ہے نظر
یاد میں تیرے جو سو جاتے ہیں ہم

بیگم : اب بناؤ ہے پکّا افیمی موا یا نہیں۔ بھلا کہو۔ اس جھنجھٹ سے ہمیں کیا واسطہ۔ مطلب کی ایک بات نہ کہی۔ واہی تباہی بکنے لگا۔

خو : حضور ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پہاڑ کے اوپر تو روسی اور نیچے ہماری فوج اور ہم کو معلوم نہیں کہ روسی موجود ہیں۔ ہم نے دامن کوہ میں پڑاؤ کا حکم دیا۔ سپاہیوں اور سواروں نے وردیاں اتاریں اور کھانے پینے کی فکریں ہونے لگیں۔ اب سب بے فکری کے ساتھ انتظام کر رہے ہیں۔

اتنے میں حضور ایک سوار نے چونک کر کہا۔ روسی، روسی۔ پہاڑ پر روسی ہے۔ بیڑے بھر میں ہلڑ مچ گیا۔ سب کی نظریں پہاڑ کی چوٹی کی طرف۔ دو چار آدمیوں نے کہا۔ بھئی عجب دل لگی باز آدمی ہیں خواہ مخواہ ڈرا دیا۔ روسی یہاں کہاں۔ دو دو بار گرد آوری ہو چکی ہے۔ پہاڑ بالکل صاف ہے اور روسی آتے تو کہاں سے آتے کوئی راہ بھی کھلی ہے یا وہ ادھر اُدھر سے کود پڑتے پھر سب کے سب اپنے کاموں میں مصروف ہوئے۔ میں ایک ندی کے پاس بیٹھے افیم گھول رہا تھا۔

بیگم : ہنس کر وہ تو گھٹی میں پڑی تھی افیم کہاں چھوٹتی۔

مہری : مرتے دم بھی یہ افیم ہی افیم پکارے گا۔ اُف ری لت۔

محبوبن : حضور اُن کو تو میں کئی بار سویرے آگ کے ٹھیکرے کے پاس پڑا ہوا دیکھا ہے۔ دست پناہ ایک ہاتھ میں اور چلم دوسرے ہاتھ میں۔ تو اکہیں کا۔ اور تمباکو کہیں۔

مہری : اور باتیں کیسی تول تول کے کرتے ہیں کہ کوئی جانے بڑے وہ ہیں۔

خو : باتوں میں اور کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بیگم : اچھا ہاں سچ ہے تو۔ تم اپنی کہانی شروع کرو۔

خو : میں مزے مزے میں افیم گھول رہا تھا اور افسر اور سوار اور پیادے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کہ پہاڑ پر سے تالیوں کی آواز آئی۔ ایں! یا الٰہی! یہ تالیاں کس نے بجائیں۔ سب کے سب پھر غور سے

دیکھنے لگے۔ یہ پیالی ابھوں تک ہے پی گیا تھا کہ اوپر سے روسیوں نے باڑھ ماری کوئی چار سو بندوقیں ایک ہی دفعہ سر ہوئیں اور آدھے آدمی مجروح اور مقتول ہوئے مگر واہ رے نیں خدا گواہ ہے پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اب سنیے کہ فوراً صف شکن علی شاہ موجود اور میرے ہاتھ پر بیٹھ کر چونچ کو افیم سے تر کیا اور زور سے چونچ کھولی تو دو قطرے پہاڑ تک کی خبر لائے اور پہاڑ جو چٹا تو آہا را را دھوں اور لطف یہ ادھر کا ایک آدمی ضائع نہیں ہوا۔ بس میں نے صف شکن کا منہ چوم لیا اور کہا۔ یا خدا جانے وہ کون چیز نایاب شے ہے۔

تعریفش آں ابر کہ خوں بار انست ❊ وصفش آں ابر کہ زر افشانست

ذات او عقل مجسم آمد ❊ رائے او صائب و محکم آمد

نور قلبش ز علوم نافع ❊ مہر جرأت جبینش ساطع

باطنش از رہ تعیم ظاہر ❊ دامنش از گل دنیا طاہر

دست ہمت بہ اندازو دازان ❊ کہ بجز زر نبود جود عیان

ورنہ او کے سر دنیا دارد ❊ روئے دل جانب عقبیٰ دارد

وعدۂ اش صادق و عہدش واثق ❊ زیں حشم ہمت زیادہ لائق

سیم و زر بخشد و منت نہ نہد ❊ مزد بے رنج و مشقت بہ بد

صد و سی سال سلامت باشد ❊ ہر دم افزونی دولت باشد

دخل افراق بہ تقریرم نیست

یک قلم شبہ بہ تحریرم نیست

اب ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بزار بارود کا اڑا ہوا ہے۔ بندوقیں اور بارود اور گولی اور گولا اور سامان اور سب تباہ۔ کہاں پہاڑ کہاں چوکی۔ کہاں دامن کوہ۔ ایک قطرۂ آب واللہ اعلم بالصواب۔ کیا بات تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آئی اور لطف یہ کہ ایسے جو ہاتھ جوڑ کر دریافت کیا تو مسکرا کر خاموش ہو رہے میں نے پوچھا کہ اگر تم کو کوئی روسی کبھی گرفتار کرے جائے تو تم کیا کرو ہنس کر برجستہ جواب دیا۔

ہے ہمدوش سدا قید الم سے آزاد

کب گرفتار قفس مرغ نظر ہوتا ہے

بیگم : صف شکن باتیں کس زبان میں کرتا ہے اسی زبان میں نہ۔

خو : حضور ایک زبان ہو تو عرض کروں۔ اردو فارسی عربی ترکی انگریزی ولندیزی اور۔

بیگم : (قہقہہ لگا کر) انگریزی تو انگریزی مگر ولندیزی میں بھی بول سکتے ہیں یہ کس ملک کی زبان ہے۔ شاید

اسی طرف کوئی ملک ہوگا روس کے آس پاس۔

خو: اب حضور سے کون کہے۔ ؎

مٹ گیا جب میں تو اے مہ رُو نظر آیا مجھے
دست خم گشتہ مِرا ابرو نظر آیا مجھے

نواب: اب یقین آیا کہ اب بھی یقین نہیں آیا۔ اُف ری بدگمانی۔

راوی: اب بھی بیگم صاحب کو یقین نہیں آتا تعجب ہے۔

بیگم: چلو بس چپکے بیٹھے رہو۔ خدا گواہ ہے مجھے رنج ہوتا ہے کہ ان حرام خوروں کے پاس بیٹھ بیٹھ کے تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کس سے کہوں یا اللہ۔

نواب: ہائے افسوس۔ غضب کا سامنا ہے۔ بے بے۔ آخر یہ سب کے سب تم سے جھوٹ کیوں بولیں گے۔ خوجی کو میں کچھ انعام دے دیتا ہوں یا کوئی جاگیر لکھ دی ہے اس کے نام کہ بیگم صاحب کو جھوٹی کہانی سنایا کرو۔

خو: خداوند اگر اس میں ذرا بھی شک ہو تو خدا مجھے جھوٹی بات کبھی زبان سے نہ نکلے گی۔ چاہے کوئی مار ڈالے مگر بولوں گا سچ ہی۔

بیگم صاحب نے کہا ایمان سے کہنا۔ کبھی مورچے پر جانے کا بھی آج تک اتفاق ہوا تھا کہ جھوٹ موٹ فقرے ہی سنایا کرتا ہے۔ خواجہ اس پر بہت ہنسے فرمایا حضور مالک ہیں آقا ہیں جو چاہیں فرمالیں۔ مگر غلام نے جو بات اپنی آنکھوں سے دیکھی وہ عرض کی۔ اس میں اگر فرق ہو تو پھانسی کا حکم دیدیجئے۔ ایک بوڑھی مغلانی جو ضعیف الاعتقادوں کی نانی تھی خوجی کی کہانی سُن کر بولی سرکار اس میں آپ کو تعجب ہی کیا ہے یہ کون بڑی بات ہے۔ ہمارے محلے میں ایک کتا رہتا تھا بہت بڑا کتا۔ کالا بالکل کالا۔ لڑکے بالے محلے کے لونڈے چھوکریاں، تو میں یہ وہ سب اس کو جانتے تھے۔ لڑکے کان پکڑا کرتے تھے مارتے تھے۔ دق کرتے تھے۔ مگر وہ ذرا چوں نہیں کرتا تھا۔ ایک دن پڑوس کے چوکیدار نے اس کو زور سے ڈھیلا مارا۔ تو کان سے خون بہنے لگا۔ اٹھا اور آنکھیں نیلی پیلی کر کے بھونکنے لگا چوکیدار نے پھر چاہا کہ ڈھیلا مارے مگر ایک جوگی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا بس۔ کیوں جان کا دشمن ہوا ہے۔ بابا یہ کتا نہیں ہے۔ اسے اسی رات کو چوکیدار نے خواب دیکھا کہ کتا اس کے پاس آیا اور اپنا زخم دکھا کر کہا (بابو ہی نہیں یا ہم ہی نہیں) سویرے جو چوکیدار اٹھا تو اس نے پاس پڑوس والوں سے خواب کا ذکر کیا اب محلے بھر میں ڈھونڈ مارا کہیں کتے کا پتہ ہی نہیں۔ دوپہر کو چوکیدار کنوئیں پہ پانی بھرنے گیا پانی دیکھتے ہی بھونکنے لگا۔

بیگم: سچ! ہے ہے۔ کتے سے تو ہم بھی بہت ڈرتے ہیں۔

مہری : حضور اللہ بچائے اس بلا سے۔ بے بے دشمن کے بھی نہ کُتّا کاٹے توبہ ہی بھلی۔ اس طرح کی موت کسی کی نہ ہو خداوندا۔

مغلانی : حضور کتّے کے بھیس میں کیا جانے کون ہوتا ہے۔ ؎

اے نفسِ پلید آدمی بن

کتّے میں ولی کی خصلتیں ہیں

بس شہر میں تلاش کی کتا کہیں نہ ملا اور دو دن میں چوکیدار کی عجیب حالت ہو گئی۔ بابا جی بلوائے گئے۔ بندو نتھا۔ بیراگی۔ اس نے آن کر کہا۔ بچہ ہم نے تو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ کیا جانے کون ہے۔ پھر لاکھ علاج کیا نہ اچھا ہونا تھا نہ ہوا۔ چوتھے روز تڑپ تڑپ کے اور بھونک بھونک کے مر گیا۔

نواب : اب اس کو کیا کہو گی۔ اب بھی صف شکن کے کمال کو نہ مانو گی۔ یہ تو بات ہی اور ہے کہ نانی ہم کو بہت سمجھایا کیے ہیں نہ سمجھی۔

بیگم : ہاں ایسی باتیں تو ہم نے بھی سنی ہیں مگر۔

خو : اگر مگر کی گنجایش نہیں حضور غلام چشم دید کہتا ہے۔ ؎

ہم نہیں شمع ہوں جو اشک فشاں

کارِ عشاق جاں فشانی ہے

اور ایک روایت اور سنیے اس کا بھی شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ میرے سر پر آ کر بیٹھ گئے، اور کہار و سیوں کی فوج میں دھنش پڑو۔ ہوش اُڑ گئے۔ کہتا ہوں صاحب ہو کہاں میری جان جائے گی آپ کے نزدیک دل لگی ہے۔ وہ سنتے سب کی ہیں کہا چلو تو تم اور آدھی رات اور گھٹا چھائی ہوئی مجبوراً جانا پڑا۔ مگر مجھ سے کہہ دیا تھا کہ خبردار کسی آدمی کو چھو نہ جانا۔ ممکن نہیں کہ کوئی فرد بشر ہم کو دیکھ سکے۔ چلا اور حضور سر پر جمے بیٹھے ہیں۔ بس جناب والا پہونچے وہ ہزار ہا آدمی فوج ہی تھی۔ دل جمع کوئی گاتا ہے۔ کوئی بجاتا ہے کوئی سوتا ہے۔ کوئی منھ یا ہاتھ دھوتا ہے۔ مگر ہم سب کو دیکھتے ہیں ہمیں کوئی نہیں دیکھتا۔ بس صف شکن شاہ اصطبل کی طرف لے چلے اور پھدک پھدک کر ایک گھوڑے کی گردن پر بیٹھنے لگے۔ جس پر بیٹھے دھم سے گرا جس پر بیٹھے تڑ سے زمین پر لوٹنے لگا۔ میں نے کہا آپ تو میرے سر پہ ہیں نہیں اگر کوئی دیکھ لے تو میں کیا کروں۔ میں تو بے موت مرا کہا خاموش رہو نہ بولو۔ حضور باور کیجیے۔ سات ہزار گھوڑے اسی دم دھم دھم کر کے لوٹ گئے۔ واہ ری صفائی اور کمال ؎

کیا مری طبع کی روانی ہے   اس کی رفتار کے جو لکھے وصف

سر کٹائیں گے شمع ساں افسوس گر یہی اپنی بے زبانی ہے

بس پھر اُن کے پیچھے اور چپ چاپ چلے آئے۔ ایک مقام پر کسی روسی کو میری چاپ معلوم ہوئی۔ کہا کون؟ ہم نے جواب نہیں دیا۔ توصف شکن نے آہستہ سے کہا جواب نہ دینا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا پیچھے سے جاکے ایک دھپ جماؤ۔ دھپ پڑتے ہی ہوش اُڑ گئے۔ کون ہے۔ ادھر دیکھا کون ہے بھئی۔ اُدھر دیکھا کون ہے بھئی تپ تو چکر آیا اور مجھے زعم اور ایک دھپ دی۔ ؎

دکھاؤں حسرت دیدار اُسے اور رشک در پردہ
گل نرگس سے کردوں بند دیواروں کے روزن کو!

جب وہاں سے دور پہونچ گئے تو بڑی ہنسی ہوئی اور باہم ہم سے اور شاہ صاحب سے باتیں ہونے لگیں۔ بڑے لطف کے آدمی ہیں۔

شاہ صاحب: کہو آج کی دل لگی دیکھی۔ کتنے سوار بے کار ہوئے۔

ہم: پورے سات ہزار ایک کم نہ ایک زیادہ۔

شاہ: اور باایں ہمہ کہ آج کل سفر کی سختی سے بہت ضعیف ہوں۔ ؎

ناتوانی نے بنایا طائر نگہت مجھے !
صید وہ ہوں جس پہ صیادوں کا بھی قابو نہیں

ہم: خداوند آپ کا یاں قدم لینے کو جی چاہتا ہے۔

شاہ: خاموش رہو تم سیر دیکھتے جاؤ اور کچھ کہو سنو نہیں۔ چلتے چلتے جب تھک جاؤ ہم سے کہہ دو۔

ہم: واہ آپ سے کیوں کہوں۔ آپ کیا کریں گے بھلا۔

شاہ: بھئی مطلب یہ کہ اگر تھک جاؤ تو ہم اتر جائیں جس میں کم تھکو۔

ہم: (قہقہہ لگاکر) مٹھی بھر کے آپ اور دعویٰ یہ کہ اس بوجھ سے ہم تھک جائیں گے شان خدا آپ کیا اور آپ کا بوجھ کیا۔

بس اتنا میرا کہنا تھا کہ خدا جانے اور کیا جادو کیا سحر کیا افسوں پڑھ کر پھونکا کہ میرا قدم اٹھنا محال ہو گیا اب قدم رکھتا ہوں تو چلنا دوبھر۔ یا الٰہی کیا کیا جائے۔ کہا حضور اب تو بہت ہی تھک گیا، ایک قدم چلنا محال ہے۔ فوراً چھو سے اُڑ گئے تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے دس بیس کروڑ من بوجھ تھا وہ اتر گیا۔

شاہ: کہو بڑے بول کا سر نیچا۔

ہم: ہاں صاحب بڑے بول کا سر نیچا۔ ہزار دیں کہیں۔

نواب : واللہ مجھے اس قدر باتیں نہیں معلوم تھیں یہ تو نئی نئی باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں۔ واہ رے صف شکن۔

خو : غلام نے عرض کیا ناکہ ع

ذاتِ او عقل مجسم آمد
رائے او صائب و محکم آمد

نواب : واللہ تو کرامت کے درجہ کا ہے۔

خو : حضور خدا جانے کس بھیس میں ہے۔ اب سُنیئے صاحب ایک بندو بیراگی وہاں بھی ملا تھا۔ درخت کی شاخ پر اُن کو دیکھ کر سجدہ کیا جس طرح بتوں کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ میں نے کہا واہ اب تو جانوروں کا سجدہ کرنے لگے تم۔ کہا جانور تم خود ہو اس کو جو جانور کہے آپ جانور ہے۔ یہ خدا جانے کون ہے تم اندھے ہو کیا جانو ان کی عظمت کا حال کوئی ہم سے پوچھے۔

نواب : اللہ اللہ یعنی فقرا تک ان کی عظمت کے قائل ہیں۔

خو : بس حضور ایک مرتبہ ہی چلتے چلتے چونچ سے مجھے اٹھا لیا۔

نواب : ایں! ارے میاں صف شکن نے میرے صف شکن نے، شاباش شاباش۔ واہ رے صف شکن واہ۔ اہو ہو ہو۔

خو : خداوند میں دھک سے رہ گیا۔ اور اُس دن سے پھر تم کا لفظ میں نے نہیں استعمال کیا، حضور کے تصدق جو کچھ غلام نے دیکھ ڈالا کسی نے کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ عورتیں دیکھیں تو پریاں۔

بیگم : گھر کی ٹھیکی اور باسی ساگ پریاں نہیں وہ دیکھیں۔

خو : حضور۔ خیر۔

نواب : ذرا سنبھلے ہوئے خوجی ورنہ بگڑ ہی جاؤں گا۔

خو : کیا مجال غلام کی۔ کیا طاقت خادم کی۔ مگر حضور ہم کو جو کوئی جھوٹا کہتا ہے تو ہم جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

بیگم صاحب کو نواب صاحب کی تقریر اور سادگی اور خوجی کی بے سر و پا کہانی سے نفرت ہو گئی۔ اس وقت تو کچھ نہ کہا بلکہ عمداً اور قصداً صف شکن کی تعریف کی مگر ٹھان لی کہ آج شب کو تخلیے میں آڑے ہاتھوں لوں گی۔ نواب صاحب خوش خوش باہر آئے خوجی سے کہا شاباش۔ واللہ تم نے ایسا سماں باندھ دیا کہ اب بیگم صاحب کو عمر بھر شک نہ ہوگا اور صف شکن کی باتیں یاد کر کر کے غش غش کریں گی۔

خو : حضور یہ تو سب باتیں غلام نے بیان کی ہیں۔

نواب : دریں چہ شک۔ یہی تو ستم ہے کہ سچی باتوں کو بناوٹ سمجھتی ہیں مگر اس وقت دم بخود ہو گئیں اب شک نہ کریں گی۔

خو : میں نہیں سمجھتا کہ غلام سے کیوں اس قدر ناراض ہیں۔

نواب : ناراض نہیں ہیں مطلب یہ کہ اب اس بات کو تو سوائے پڑھے لکھے اور تجربہ کار آدمی کے اور کوئی سمجھ نہیں سکتا نہ اور بھئی میں سوچتا ہوں کہ آخر کوئی جھوٹ کیوں بولے گا۔ جھوٹ بولنے میں کسی کو فائدہ ہی کیا ہے۔

خو : (اُچک کر) اے سبحان اللہ اعجاز۔ اعجاز۔ خداوند کیا بات حضور نے پیدا کی ہے۔ میرا دل مزے لوٹ رہا ہے۔ واقعی کوئی جھوٹ کیوں بولے گا۔ ایک تو جھوٹا کہلائے۔ دوسرے کوئی اس کی بات کو سچ نہ سمجھے تیسرے ہچشموں میں بے آبرو۔ اور فائدہ خیر صلاح۔

راوی : ہمارا بھی صاد ہے۔ واقعی حضور کو خوب ہی سوجھی۔ لو صاحب جھوٹ دنیا سے کوچ کر گیا۔ حضور نے فتویٰ دے دیا کہ جھوٹ کوئی کاہے کو بولے گا۔

نواب : بھئی ہم انسان کو خوب پہچانتے ہیں۔ آدمی کا پہچاننا کوئی ہم سے سیکھے ایک نظر میں کھرا کھوٹا پہچان لیں گے۔ مگر دو کو ہم نے بھی نہیں پہچانا ایک تم کو دوسرے صف شکن کو۔ واللہ اس مقام پر ہم بھی چوک گئے۔

خو : خداوند میں نہ مانوں گا۔ حضور کی نظر بڑی باریک ہے۔ ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ما کنند

راوی : اور کچھ مطلب ہو یا نہ ہو۔ نظر کا لفظ تو شعر میں موجود ہے۔

خواجہ صاحب سے حضور اس درجہ محظوظ ہوئے کہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر باہر آئے۔ مصاحبوں اور رفیقوں نے جو اس قدر بے تکلفی دیکھی تو جل مرے اور باہم اشارے ہونے لگے۔ مصاحبین نے سروقد تعظیم کی۔ نواب صاحب خوجی کا ہاتھ پکڑے ہوئے خانہ باغ میں چہل قدمی کرنے لگے۔ ادھر آپس میں سرگوشی ہونے لگی۔

مسیتا : ایں!۔ ارے میاں خوجی نے تو جادو کر دیا یارو!

غفور : میاں یہ باہر کسی ملک سے سیکھ آئے ہیں جادو۔

مسیتا : بھائی تجربہ کار ہو گیا نہ۔ اب اس کا رنگ جم گیا۔

غفور : کیسا کچھ۔ بس اب سولھوں آنے کے مالک ہیں خوجی۔

مرزا : ارے میاں۔ ہاتھ میں ہاتھ دے کر نکلے۔ گویا لنگوٹیے یار ہیں۔ واہ واہ ری قسمت مگر آخر یہ خوش کس بات پر ہوئے۔

مصاحب: ان کو ابھی تک یہی نہیں معلوم ہوتا ہے بتایئے صاحب۔
میتنا: میاں عجب کوڑھ مغز ہو کہنے لگے خوش کس بات پر ہوے صف شکن کی تعریف کے پل باندھ دیے۔ اب لاکھ رنگ پھیکا کرنا چاہیں ممکن نہیں۔ اس کا رنگ تو خوب جما جمایا ہے۔
مصاحب: بھائی جان ہم کو بھی ایسا موقع ملتا تو ہمارا رنگ بھی جم جاتا۔ وہ تو ولایت ہو آئے۔ جو جھوٹ سچ کہہ دیں سرکار کو تہ دل سے یقین آجائے گا ہم کیا جھوٹ بولیں اور واللہ صف شکن ہی کے پھیر میں آزاد بھی اونٹنی اور اسباب لے کر رفو چکر ہوئے تھے اور اسی پھیر میں خوجی بھی بھیجے گئے تھے اور وہی دونوں اب پھر موجود ہیں اور یہ قدر افزائی ہے کہ خوجی اور نواب صاحب یار بنے ہوے باغ میں گلگشت کر رہے ہیں۔
مرزا: اس وقت خوجی کا دماغ چوتھے آسمان پر ہوگا حضرت۔
مصاحب: اجی بلکہ اور اس کے بھی پار۔ ساتویں آسمان پر۔
غفور: میں باغ میں گیا تھا۔ نواب صاحب مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور خوجی تپائی پر اور خاص سرکار کی گڑگڑی خوجی پی رہے ہیں۔ رحیم بخش میٹھا پلا رہا ہے۔ یہ وہی خوجی ہیں یا کوئی اور۔
مرزا: ارے میاں خوجی کو خدمت گار حقّہ لیے پلا رہا ہے۔!
غفور: چل کر دیکھ لیجیے۔ بس جادو کر دیا۔ نہیں آج تک کبھی سرکار نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ کیوں نہ دیا آج تک کبھی اپنا خاص حقّہ دیا تھا وہ خوجی ہیں جو چلمیں بھرا کرتے تھے۔ یا کوئی اور ہیں مگر جادو کا زور۔ جادو برحق ہے کرنے والا کافر۔ سب میں زیادہ یہی بنائے جاتے تھے مگر مسخر الدولہ بھی آج مصاحب الدولہ بن بیٹھے۔
مصاحب: خوجی کو سب کے سب مل کر مبارک باد دو اور ان سے دعوت معقول لو کہ اب اس سے بڑھ کر کون درجہ ہے کہ سرکار کے ولی دوست لنگوٹیے یار ہو گئے۔ کل تک بات بات میں للکار کے جاتے تھے آج تخلیے کی صحبت میں حقّے پی رہے ہیں اور واللہ جو میری سمجھ میں بھی آتا ہے کہ یہ بات کیا ہے۔ خوجی سے کون ایسی بات بن پڑی کون کار نمایاں سرزد ہوا جس سے اس قدر اعزاز حاصل کیا۔ خدا کی دین ہے۔ واللہ بس اس مقام پر عقل کام نہیں کرتی۔

اتنے میں نواب صاحب خوجی کو لیے ہوئے دربار میں آئے مصاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سروقد تعظیم کی۔ خواجہ صاحب کو سرکار نے قریب بٹھایا اور آزاد سے کہا۔ جنرل صاحب آپ کی صحبت اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب عالم بے بدل ہو گئے۔
آزاد: یہ سب آپ کے طفیل میں انھوں نے سیکھا ہوگا۔ میں کس لائق ہوں۔ من آنم کہ من دانم۔ اور میری صحبت تو چند ہی روز ہوئے ان کو۔ برسوں سے تو آپ کی شاگردی کر رہے ہیں۔

نواب : واہ اب تو خواجہ صاحب میرے استاد ہیں جناب!

میتا : نہیں خداوند خوجی کی حضور کے مقابل میں کیا اصل وحقیقت ہے۔ بھلا لاحول ولا قوۃ۔ خواجہ صاحب بھی کوئی چیز ہیں۔

نواب : (جھڑک کر) کیا بکتا ہے۔ تم لوگ جل مرتے ہو جب ہم خوجی کی تعریف کرتے ہیں۔ اور تم اس کے مقابل میں ہیچ ہو۔

مصاحب : بجا ہے خداوند۔ یہ میتا بیگ تو ہمیشہ کے حاسد ہیں۔

مرزا : لیجیے پرلے سرے کے حاسد۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔

رفیق : آخر خواجہ صاحب بیچارے نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کا باپ مارا ہے کوئی ضرر پہونچایا ہے۔ پھر یہ کیوں اس قدر خلاف ہیں۔

نواب : مجھ سے سنو صاحب مجھ سے سنو نہ۔ بغض للہ۔ اب کہیے۔

مصاحبین : سبحان اللہ۔ خداوند۔ واللہ بس یہی بات ہے۔ بغض للہ۔

خو : اب حضور اس کا خیال نہ کریں۔ جو چاہے کہہ لیں۔ ؎

زخاک آفریدت خداوند پاک

پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

بھئی غفور ذرا سا پانی پئیں گے جلدی لاؤ۔

نواب : ٹھنڈا پانی لاؤ جناب خواجہ صاحب کے واسطے۔ خدمت گار صراحی کا جھلا آبِ سرد لایا۔ چاندی کے آبخورے میں پانی دیا۔ رومال لے کر کھڑا رہا۔ خواجہ صاحب نے پانی پیا۔ خدا کا شکر کیا۔ نواب صاحب نے خاصدان سے دو گلوریاں نکال کر اپنے دست مبارک سے خوجی کو دیں۔ بندگی کر کے گلوریاں لیں اور چکھیں۔

مرزا : اور میں نے میتا بیگ سے ہزار بار کہا کہ بھئی تم کسی کو دیکھ کے جلے کیوں مرتے ہو۔ کوئی تمہارا حصہ نہیں چھین لے جاتا پھر خواہ مخواہ کے لیے ایک تو اپنی طبیعت کو ہلکان کرتے ہو۔ دوسرے ذلیل ہوتے ہو۔

نواب : مجھے اس وقت اس کا کلام سخت ناگوار گذرا۔

مصاحب : حضور وہ بات ہی ایسی پھوہڑپنے کی کی۔ ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب ست

گل ست سعدی و در چشم دشمناں خار ست

خوجی کے کروڑوں ہنر سے چشم پوشی کر کے خوشامد کی ایک بات کہہ اٹھے اور جانتے ہیں کہ اس دربار میں

خوشامد خوروں کی دال نہیں گلتی۔

نواب نامدار اور آزاد اور خواجہ صاحب میں تھوڑی دیر کے لیے تخلیہ ہوا جس میں نواب صاحب نے آزاد سے کہا کہ جس طرح یورپ کے رؤسا رہتے ہیں اور خواجہ جو اُمور ان کی ناموری کے باعث ہوتے ہیں ان سے آپ ہمیں اطلاع دیجیے تاکہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چلیں سبب اس کا یہ تھا کہ آزاد نے باتوں باتوں میں یورپ کے رؤساء اولوالعزم کی بڑی تعریف کی اور ایک بار یہ بھی کہا تھا کہ یورپ کے رئیسوں کی صحبت میں اچھے اچھے لوگ رہتے ہیں۔

ہم نشیں نواز تو بہ باید
تا ترا عقل و دیں بیفزاید

آزاد: اگر آپ ان کے نقش قدم پر چلیں تو سبحان اللہ۔

نواب: چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں یورپ کی رؤسا کی تقلید نہ چھوڑوں گا مگر مجھے دستورالعمل لکھ دیجئے۔

آزاد: اول تو آپ کی صحبت میں چانڈو باز۔ مدکیے۔ چرسیے۔ گنجڑیے۔ بھنگڑیے۔ اس کثرت سے ہیں کہ میں جانتا ہوں شاید ہی کوئی اس سے خالی ہو۔ یہ بات شایان شان ریاست نہیں۔

نواب: خواجہ صاحب کے سوا اور جیسے سب کو نکال دوں۔

خو: ان کو نکال دیجیے یا رہنے دیجیے۔ مگر اس قدر حکم ضرور دے دیجیے کہ حضور کے سامنے عین دربار میں نہ چانڈو کے چھینٹے اڑائیں نہ مدک کے دم لگائیں اور نہ افیم گھولیں۔ نادری حکم دے دیجیے کہ اب دربار میں اس کا چرچا نہ رہے۔

آزاد: دوسری بات یہ ہے کہ یہ خوشامد خورے جو آپ کو بھترے دے دے، اور جھوٹی تعریفیں کر کر کے خوش کرتے ہیں ان کو ایک بار جھڑک دیجیے اور بے ادبی معاف ان کی خوشامد سے اظہار مسرت نہ کیجیے۔

نواب: آپ صحیح فرماتے ہیں۔ واللہ آپ کی بات میرے دل میں کُھب گئی یہ مردود بھترے دے دے کر مجھے بلٹائے دیتے ہیں۔

آزاد: ایک عام بات بھی آپ نے کہی اور چوطرف سے اعجاز اعجاز کی آوازیں آنے لگیں یہ کیا لغو حرکت ہے۔

نواب: بھئی باوا جان کی روح پاک کی قسم کیا بات کہی ہے۔

آزاد: آپ کو خدا نے اس قدر دولت دی ہے۔ یہ اس واسطے نہیں ہے کہ آپ چانڈو بازوں، اور خوشامد خوروں اور نالائق بدمعاش آدمیوں میں ضائع کریں۔ اس کا نتیجہ یہ نکالیے کہ ساری دنیا میں نہیں تو ہندوستان میں

تو آپ کا نام ہو۔ خیرات خانے قایم کیجیے' اسپتال بنوائیے۔ طلبا کے لیے وظیفے مقرر فرمائیے۔ علما وفضلا کی قدر دانی کیجیے۔ میں نے کبھی آپ کے دربار میں کسی عالم کسی فاضل کسی کامل منطقی فلسفی تبار شاعر فارسی داں عربی خواں کو نہیں دیکھا۔ سوائے انھیں فقرہ باز بدمعاشوں کے جو کھائیں اور غرائیں۔

نواب : آج ہی سے ان کی صحبت ترک۔ اب کل سے آپ ذی استعداد اور ذی لیاقت آدمیوں کو اس دربار میں دیکھیے گا۔

آزاد : طرز معاشرت بھی بدل دیجئے آپ دن کو گیارہ بجے سو کے اُٹھتے ہیں تو وجہ کیا۔ وجہ یہ کہ جب دو بجے آپ بستر پر گئے تو تڑکے آنکھ کیوں کر کھلے گیارہ بجے اٹھ کے آپ منھ دھو کر چانڈو کا شغل کرتے ہیں۔ اُس کے بعد فقرہ بازوں سے چُہل ہوتی ہے وہ بے ادبی معاف آپ کو بناتے ہیں اور آپ سے روپیہ اینٹھنے کے لیے صدہا فکریں کرتے ہیں۔ دو تین بجے صبح کا کھانا آپ کو نصیب ہوتا ہے پھر آرام کرتے ہیں تو شام کے ادھر اٹھنا قسم ہے پھر نرت۔ بازی ہونے لگی داستان گو آیا اُس نے داستان چھیڑی۔ کوئی دو بجے کھانا کھایا اور تین بجے سو رہے اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ دنیا میں کون کام عمدہ آپ سے سرزد ہوتا ہے۔ افسوس ہے۔

نواب : سچ ہے۔ خدا گواہ ہے ان لوگوں نے مجھے تباہ کر دیا۔

ہر کہ شاہ آں کند کہ او گوید
حیف باشد کہ جُز نکو گوید

آزاد : سویرے تڑکے گجر دم اُٹھیے۔ رفع حوائج ضروری کے بعد حمام کیجیے' اور ورزش کا ہر روز شغل رکھیے اس کے بعد گھوڑے ہاتھی بگھی فٹن کی سواری پر ہوا کھانے جائیے۔ ہوا خوری کے بعد مطالعہ اخبارات کیجیے۔ بعد ازاں طعام نوش جان فرمائیے۔ علما فضلا ظرفا آپ کی صحبت میں ہوں۔ بذلہ سنجوں لطیفہ گو اور خوش مزاج ندیموں کی گفتگو اور لطائف و مطائبات سے دل بہلائیے کوئی کتاب ملاحظہ میں لائیے۔ دو گھڑی آرام کیجیے چار بجے سے پھر دربار میں آئیے۔ ضروری کاموں کو دیکھیے کا غذات بجیے انتظام خانہ داری کیجیے۔ شام کی پھر ہوا کھانے جائیے۔

نواب : خدا کی قسم کیا باتیں بتائیں۔ بس آج سے اسی کے مطابق کاربند ہوں گا' اچھا اور شب کو کیا کیا جائے۔

آزاد : شب کو آٹھ یا نو بجے کے بعد محلسرا میں تشریف لے جائیے۔

نواب : بہتر ہے کل ہی سے کیجیے ایک ایک حرف کی تعمیل نہ ہو تو کہیئے گا کہ بڑا چھوٹا آدمی ہے۔

خو : حضور مجھے تو برسوں اس دربار میں ہو گئے جب سرکار نے کسی بات کی ٹھان لی پھر چاہے زمین اور آسمان ایک طرف ہو جائے آپ اس کے خلاف نہ کریں گے میں تو برسوں سے یہی دیکھتا آیا ہوں۔

ہر چیز کہ دل بداں گراید
گر جہد کنی بدستت آید

یہ تو سب انسان کی طبیعت کے متعلق ہے۔

آزاد: ہاں ایک اور ضروری امر بھی ذہن نشین رہے۔ ایک اشتہار دیدیجئے کہ جو کوئی انگریزی خوان، کسی عمدہ اور مفید انگریزی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کرسکے اس کو بشرط پسند قرار واقعی انعام دیا جائے گا۔ بڑا نام ہو اور ہندوستان کے باشندے آپ کے ہم وطن والوں میں دعائیں دیں۔ کہ اس فیاضی کے جلدو میں خدا اُن کی دولت کی دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

نواب: مجھے کسی امر میں عذر نہیں۔ خواجہ صاحب آپ جرنیل آزاد صاحب سے کل اُمور دریافت کرکے قلمبند کر لیجیے اور مجھے وقتاً فوقتاً یاد دلاتے جائیے میں کل ہی سے ان پر کاربند ہوں گا۔

اب سنیے کہ نواب صاحب اور خوجی اور آزاد پاشا کا تخلیے میں گفتگو کرنا چھوٹے سے بڑے تک کل مصاحبوں کو ایسا شاق گذرا کہ آتشِ حسد میں جل مرے۔

مسیتا: آج تو واللہ ہے کہ اپنا خون پی کے رہ گیا۔ یارو۔

مرزا: دیکھتے ہو کس طرح جھڑک دیا معاذاللہ۔ معاذاللہ۔

مسیتا: جھڑک کیا بس کچھ نہ پوچھو۔ میں عمداً خاموش ہو رہا ورنہ بے ڈھب ہو جاتی۔ کسی نے اپنی عزت نہیں بیچی ہے۔

مرزا: اور اب تخلیہ ہو رہا ہے۔ خوجی نے سب کو بلتایا۔

مسیتا: کوئی لاکھ کہے ہم نہ مانیں گے۔ بیشک جادو کر دیا۔

غفور: میاں اس میں کیا شک ہے جادو نہیں تو اور کیا ہے۔

مصاحب: واللہ جو ہماری سمجھ میں کچھ بھی آیا ہو کہ یہ کیا بات ہے۔ خوجی ایک ذلیل آدمی مسخرہ۔ املا تک درست نہیں۔ چانڈو باز، افیمی۔ بد وضع شہدا۔ اس پر یہ نظر عنایت اور ہم لوگوں پر یہ عتاب خدا کی شان ہے۔

رفیق: اور طرہ یہ کہ ایسے بدمعاش کو زنانے میں بلوایا۔

غفور: جی نہیں۔ ڈیوڑھی میں پردے کے پاس کھڑے تھے اور آنکھوں میں دوہری دوہری پٹی بندھی تھی۔

رفیق: اجی کیا کہتے ہو۔ اُلو کا گوشت نواب کو نہ کھلا دیا ہو تو ناک کٹوا والوں ان لوگوں نے مل کر اُلو کا گوشت کھلا دیا۔ بس جب ہی تو اُلو بن گئے ورنہ اُلو پن کی باتیں کیوں کرتے۔ اب ان سے کہے کون۔

مسیتا بیگ: کہہ کے بہت خوش ہوئے کہ اب کسی دوسرے کو جرأت ہو گی۔ لاحول ولاقوۃ۔

دوسرا: اب تو کچھ دن خوجی نامعقول کی خوشامد کرنی پڑے گی۔

مسیتا: ہماری پیزار اُس گرگے پاجی کی خوشامد کرتی ہے۔

رفیق : پھر نکالے جاؤ گے۔ یہاں رہنا ہے تو خوجی کو باپ بناؤ اور ابا جان کہو ورنہ پھٹکنے تو پاؤ گے نہیں۔

دوسرا : اور نہیں کیا رہنا دریا میں اور مگر سے بیر۔

مرزا : دو چار روز رنگ ڈھنگ دیکھ کے ہم تو یہاں کا آنا جانا ترک کر دیں گے ہم چشم کی خوشامد بھلا ہم سے ہو سکے گی ہرگز نہیں ایسی نوکری سے درگذرے۔

مسیتا : کون ہم چشم ؟ ہم چشم کون۔ آپ کے ہم چشم ہوں گے۔ ہم تو خوجی کو ایک ذلیل آدمی سمجھتے ہیں۔

غفور : ارے صاحب اب تو وہ سب کے افسر ہیں اور ہم تو گڑگڑی پلا چکے ہم تو جیسے انھیں کے تابعدار ہیں۔ آپ لوگ ان کو مانیں یا نہ مانیں۔ ہمارے تو آقا ہیں جیسے سرکار ویسے خوجی اور یہ وہی خوجی ہیں جن کو ہم جھڑک دیا کرتے تھے۔

مرزا : سو برس بعد گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں بھائی جان۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی تھا کہ خوجی سا ذلیل آدمی اور اس کو سرکار اس تپاک سے اپنے پاس بٹھائیں گے۔ مگر اب آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔ یہی دنیا کے انقلاب ہیں۔ آزاد تو خیر رئیس زادے باکمال لائق فائق آدمی ہیں ان کا ہم کوئی کسی امر میں مقابلہ نہیں کر سکتے مگر یہ بدبخت خوجی تو خان ہیں نہ خان کے اونٹوں ہیں۔ ادھر ہیں نہ اُدھر ہیں بہ بلا کدھر ہیں۔

نواب صاحب باہر تشریف لائے تو اس قطع سے کہ حضور کے دست مبارک میں چھوٹی سی نازک گڑگڑی گنگا جمنی اور خواجہ صاحب کش لے رہے ہیں دیکھتے ہی رفقا جل مرے اور دنگ ہو گئے کہ اللہ اللہ سرکار کے ہاتھ میں گڑگڑی اور یہ ادنی ٹکلچی مسخرہ رئیس بنا ہوا دم لگا رہا ہے۔ خواجہ صاحب مسند کا کونا دبا کر بڑے غرور کے ساتھ بیٹھے مصاحبین ورفقا دم بخود کوئی چوں نہیں کرتا۔ سب کی نظر خوجی پر ہے۔ ایک بے تکلف مصاحب نے سکوت کا طلسم توڑا۔

بے تکلف : خداوند آج بہار کا دن ہے۔ اور کیسی بھینی بھینی خوشبو چمن سے آرہی ہے۔ اور ہوا بھی معتدل ہے۔ زیادہ نہ کم۔

نواب : ہاں آج کا دن اسی قابل ہے کہ منطقی بحث ہو۔

راوی : بہت ہی خوب اب تو مصاحب اور بھی چکرائے۔

مصاحب : خداوند آج کا دن تو گانا سننے کے لیے موزوں ہے۔

نواب : ہاں اگر سوزِ جوانی ہو تو کیا مضائقہ مگر سب سے بہتر یہ ہے کہ کوئی عالم آن کر بحث علمی چھیڑے۔ خواجہ صاحب آپ علمی بحث کیجیے۔

مسیتا : (اپنے دل میں) ان کے باپ نے بھی کبھی علمی بحث کی تھی۔

مرزا : ددرر، خوجی اور علمی بحث شانِ خدا۔ !!!

رفیق : خداوند خواجہ صاحب کی لیاقت میں کیا شک ہے مگر۔

نواب: اگر مگر کیا معنی۔ اگر مگر اس میں کیسا کیا جناب خواجہ صاحب کی علبیت میں آپ کو شک ہے۔

خو: میں کچھ سوال کروں۔ آپ جواب دیں۔ آپ پوچھیں میں بتاؤں۔

رفیق: کس علم کی بحث کیجیے گا علم کا نام تو معلوم ہو۔

خو: ہاں علم کا نام ہوا کون کون علم آپ جانتے ہیں۔ ہم علم جالوجی (جیالوجی) میں بحث کرتے ہیں علم جالوجی کا مونسوع کیا ہے۔

رفیق: جی مونسو۔ مونسو کیا۔ اور یہ علم کا کیا نام لیا آپ نے۔

مصاحب: کیوں خواہ مخواہ کج بحثی کرتے ہو صاحب لاحول۔

دوسرا: سچ جانتے ہیں کہ خواجہ صاحب عالم تبحر ہیں مگر کج بحثی سے باز نہ آئیں گے تمہارا ان کا مقابلہ کیا۔ اُن کی تقریر تو آپ کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔

تیسرا: خبط کو کیا کریں۔ پڑھے نہ لکھے اور بحث کو موجود۔

ہیں اپنے فن میں آج ہم بھی کامل | ہوگا نہ کوئی جہاں میں ہم سا فاضل!

لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل | سچ کہتے ہیں ہم کہ ہم ہیں اس کے مصداق

چوتھا: جی ہاں یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے ان کا ہمیشہ کا قاعدہ ہے کہ دخل در معقولات ضرور دیں گے بدن میں ذرا نام کو بھی طاقت نہیں مگر خم ٹھونک کے لڑنے کو تیار گانے میں ذرا معلومات نہیں مگر تان سین کی کسی نے تعریف کی اور حضرت بگڑ کھڑے ہوئے۔

پانچواں: جناب خواجہ صاحب سُنا کہ دریا میں جہازوں کے ڈبو دینے کے بھی آلے انگریزوں نے نکالے ہیں۔ کیوں صاحب معاذ اللہ۔ یہ تو خدائی کرنے لگے۔

خو: تارپیڈو اس آلے کا نام ہے دو جہاز ہمارے سامنے غرقاب کیے گیے۔ پانی کے اندر ہی اندر تاپیڈو چھوڑا جاتا ہے بس جیسے جہاز کے نیچے پہونچا ویسے پھٹا۔ پھر جناب ہے ہے خدا کی پناہ جہاز کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ کروڑ ٹکڑے۔

مسیتا: اور کیوں صاحب۔ یہ بم کا گولا کتنی دور کا توڑ کرتا ہے۔

خو: بم کے گولے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ آپ کس قسم کا حال دریافت فرماتے ہیں۔ بنیتو اونو جروا۔ تاکہ ویسا ہی جواب عرض کیا جائے۔

مصاحبین دل میں خوب ہنسے، کہ بنیتو او نو جروا کی یہاں کیا ضرورت تھی۔

مسیتا: یہی بم کے گولے۔ یہی جناب خوجی یہی۔

خو: بہت ہی خوب۔ ماشاء اللہ۔ اجی یہی یہی۔ واہ۔

نواب: کیوں خواجہ صاحب جنگ کے وقت انسان کے دل کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ ہر طرف سے موت ہی موت نظر آتی ہوگی۔ توبہ توبہ واللہ بڑے بہادروں کا کام ہے۔ سینہ سپر ہونا خالہ جی کا گھر نہیں۔

مرزا: میں عرض کروں حضور لڑائی کے میدان میں اگر ذرا۔۔۔۔

نواب: خاموش رہو صاحب تم سے کون پوچھتا ہے۔ کبھی بندوق کی صورت بھی دیکھی ہے یا لڑائی کا حال ہی عرض کرنے چلے ہو گویا ہمیشہ لڑائیوں ہی میں رہے ہیں۔

خو: جناب والا میدانِ جنگ میں جان کا ذرا بھی خوف نہیں معلوم ہوتا۔ مصرعہ

نامرد بھی ہو تو مرد ہو جائے

یہ ابھی موزوں ہوا ہے مصرعہ برجستہ۔

نواب: سبحان اللہ سبحان۔ ع۔

نامرد بھی ہو تو مرد ہو جائے

مسبیتا: جی ہاں حضور یہ گلزار نسیم کی مثنوی کا شعر ہے۔

نواب: آپ کا سر۔ اول تو شعر نہیں مصرع ہے دوسرے نسیم کی مثنوی کے اشعار اور اس مصرع کے وزن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

مصاحبین: بجا ارشاد ہوا ہے حضور وزن میں اختلاف ہے۔

آزاد: کجا وہ بحر کجا یہ بحر۔ کوئی تعلق ہی نہیں۔ ؎

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑیو دیوانے کا پانوں درمیاں ہے
ذرے کا بھی چمکے گا ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہے

کس سوچ میں ہو نسیم بولو
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

اور آپ کا مصرع ہے۔ ع۔

نامرد بھی ہو تو مرد ہو جائے

نواب: گلزار نسیم کی بحر منقصب کعب وہ ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن۔ فاعلن اور ان کا مصرع بحر طویل ہے۔ مفاعیلن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔

قریب تھا کہ آزاد بے اختیار ہو کر ہنس دیں مگر بہت ضبط کیا اور مصاحبوں نے اعجاز اعجاز کا وہ غل

مچایا کہ کان پڑی آواز کا سننا محال تھا نواب صاحب بہت خوش کہ سب کو اُلو بنایا منقصب اور مکعب فا اور فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کہا اور سب کو انگلیوں پر نچایا۔

خواجہ صاحب نے پھر تقریر شروع کی اور کہا نواب صاحب آپ کو یقین نہ آئے گا صحیح عرض کرتا ہوں کہ ادھر فوجی باجا بجا اور ادھر ولولہ و جوش و خروش کا سمندر اُمنڈنے لگا۔

نواب: واہ دل کا حال ہوتا ہوگا۔ بزن بزن ہے۔ نہ۔

خو: خداوند کیسا ہی بُزدل ہو ممکن نہیں کہ تلوار سوت کے فوج کے قلب میں نہ دھنس جائے تلوار برہنہ ہاتھ میں لی اور چمکائی اور دل بڑھا پھر اگر دو کروڑ گولے بھی سر پر آئیں تو کیا ممکن ہے کہ آدمی ہٹ جائے اے لاحول۔

ع۔ دل کو مرے آفریں وہ جو ڈٹا سو ڈٹا

اور آزاد کی جرأت کا حال۔ سبحان اللہ سبحان۔

خواجہ صاحب نے موقع پاکر آزاد پاشا کی تعریف کے پُل باندھ دیئے پلونا کی جنگ میں جو کار نمایاں آزاد سے سرزد ہوئے تھے ان کا تذکرہ کر ہی رہے تھے کہ ایک خدمتگار نے آن کر سلام کیا اور کہا خداوند باہر ایک صاحب آئے ہیں ٹم ٹم پر سوار ہیں۔ کہا نواب صاحب کو ہمارا سلام دو ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے نواب صاحب نے کہا خواجہ صاحب آپ تکلیف کرکے از راہ عنایت دریافت کیجیے کہ کون صاحب ہیں۔ خوجی بڑے غرور کے ساتھ اٹھے کہا میں ابھی دریافت کیے لاتا ہوں۔ یہ کون بات ہے۔ باہر جاکر صاحب کو سلام کیا معلوم ہوا کہ صاحب ضلع نے انسپکٹر پولیس کو بھیجا ہے کہ دریافت کرو۔ روم کے نامی گرامی جنرل آزاد پاشا آئے ہیں اور آپ ہی کے ہاں فروکش ہیں یا کہیں اور۔ خواجہ صاحب کمال مسرور ہوئے۔

خو: جی ہاں۔ جنرل آزاد پاشا آئے ہیں اور ان کے لفٹننٹ خواجہ بدیع پاشا بھی آئے ہیں۔ دونوں یہاں فروکش ہیں۔

انسپکٹر: ہم اور کسی کو نہیں پوچھتا۔ ہم آزاد کو پوچھتا ہے (گھوڑے سے اُتر کر اندر آئے)، ول نواب صاحب آپ کا مزاج اچھا۔ صاحب نے ہمیں بھیجا ہے کہ جنرل آزاد پاشا کو جس نے پلونا کی لڑائی میں نام کیا وہ آپ کے ہاں ٹکا ہے یا کسی اور کے ہاں صاحب اس سے ملے گا۔

نواب: بھلا اس قدر نامی گرامی رئیس کو (مسکرا کر) جیسا کہ میں ہوں چھوڑ کر کوئی نامی گرامی مسلمان کہیں اور بھی ٹک سکتا ہے کیسا طاقت۔ آزاد پاشا میرے مہمان ہیں۔

انسپکٹر: ول تو صاحب اس سے ملنے والا ہے آج۔ اگر اس کو فرصت ہو تو اچھا۔ نہیں اور روز جب منظور۔

خو: میں اُن سے دریافت کرکے ابھی ابھی لکھ بھیجوں گا۔

انسپکٹر : تو آپ سیدھا صاحب کو لکھے ہم بنگلے پر نہیں ہوگا۔

انسپکٹر صاحب رخصت ہو کر روانہ ہوئے تو سیتا بیگ نے جو خواجہ صاحب کے دشمن اور رقیب تھے کہا۔ کیوں حضرت اس کے معنی ہماری سمجھ میں نہیں آئے کہ آزاد صاحب سے اسی وقت کیوں دریافت نہ کر لیا۔ ایک عہدہ دار کو ایک حاکم نے اس قدر فاصلے سے بھیجا ہے اور اس کو آپ نے ٹال دیا یہ کون دانشمندی ہے۔ خواجہ صاحب نے نظرِ غیظ سے اُن کو دیکھا اور کہا تم سے ہزار بار منع کر دیا ہے کہ اس بارے میں نہ بولا کرو تم نہیں سنتے۔ تم تو ہو دشمنِ عقل ہم چاہتے ہیں کہ جنرل آزاد پاشا جب کسی حاکم سے ملیں تو برابری کے دعوے سے ملیں اس وقت جنگی وردی پہنے ہیں۔ کل جس وقت فوجی وردی ڈانٹ کے صاحب ضلع سے ملیں گے سر و قد تعظیم کرے گا۔

نواب : اب سمجھے یا اب بھی گدھے ہی بنے ہو۔ خواجہ صاحب کو ٹوکنے چلے ہیں۔ پہلے اتنے تو ہو لو وہ تُلی ہوئی بات کرتے ہیں اِدھر یا اُدھر۔ ع

سخن داں پروردہ پیر کہن
بیندیشد آنگہ بگوید سخن

خو : واللہ کیا معقول بات سوچی کہ ابھی دریافت کر کے لکھ بھیجوں گا۔ اگر اس وقت کہہ دیتے کہ آزاد یہ کیا بیٹھے ہیں تو بہت ہی بُرا تھا۔ لہذا سوچ سمجھ کے کہا کہ دریافت کر کے اطلاع دی جائے گی۔

میں نے سوچا کہ جب ان سے اور کسی یورپین سے انگریزی ہو یا اِسکاچ ہو آئرش ہو یا پولش یا آسٹرین یا جرمنی یا فرانسیسی یا ڈچ یا امریکن ہو جب ان سے ملے جھک کے ملے کہ یہ بھی کوئی ایسے ویسے آدمی نہیں بڑے مستعد اور معزز جنرل ہیں۔ وردی ڈٹی ہو۔ تمغے لٹکتے ہوں چمکتے ہوں تب البتہ لطف ہے ورنہ کیا اور حضور دیکھ لیجیے گا کہ یہ جہاں جائیں گے ان کی قدر ہوگی۔ ع

گفتم ایں منزلت از قدر تو می بینم پیش	دیدم	پر طاؤس در اوراقِ مصاحف
ہر کجا پائے نہد دست بداندیش پیش	دارد	گفت خاموش کہ ہر کس کہ جمالے

نواب : مگر واہ بھائی آزاد صاحب واہ۔ وہ نام پیدا کیا کہ حاسد جل مرے رقیبوں کے سینے آتش غضب سے جل رہے ہیں مگر شکر ہے کہ محسودِ خلائق ہوئے حاسد تو نہیں۔

نواب صاحب نے انگریزی خواں کلرک سے اُسی وقت خط لکھوا کر صاحب کے پاس بھیجا۔ جس کی عبارت یہ تھی۔

پیارے صاحب ڈیر سر، اس وقت انسپکٹر پولیس مسٹر چارلیس جن کو آپ نے میرے پاس بھیجا تھا مجھ سے ملے۔ جنرل آزاد پاشا میری کوٹھی پر مقیم ہیں اور ابھی دو ایک روز رہیں گے وہ بخوشی آپ ملنا چاہتے ہیں۔

اور دریافت کرتے ہیں کہ آپ خود تشریف لائیں گے یا وہ آپ کے بنگلے پر آپ سے ملیں۔ آپ کا سچا دوست الخ۔
خط لے کر سانڈنی سوار کو بھیجا اور ادھر خاصہ چنا گیا۔ نواب صاحب، آزاد، خوجی اور کل رفقا کھانے بیٹھے۔

خو: میں ایک چھوٹی سی چیز ہوں مگر شہزادوں تک کو رُلا سکتی ہوں۔ بتاؤ میں کون ہوں اس کا کوئی صاحب جواب دیں۔

نواب: کیا کوئی پہیلی ہے پیشتر ہم کو اس کا ملکہ تھا اب سب بھول بھال گئے خیال ہی نہیں کہ چیستاں کہتے کس کو ہیں۔

خو: میری دم میرے جسم سے دوچند طویل ہے میں کیا ہوں۔

مسیتا: (آہستہ سے) جانگلو آدمی تو ہو نہیں پھر بس جانگلو ہو۔

خو: وہ کون چڑیا ہے جس کے پاؤں نہیں ہوتے اور نہ بازو ہوتے ہیں نہ زمین پر رہتی ہے نہ ہوا میں مگر انسان کا گوشت اس کی روزمرہ کی غذا ہے۔

نواب: یہ کون مشکل بات ہے۔ ؎

نہ بر آسماں و نہ زیر زمیں
ہمیشہ خورد گوشت آدمی

خو: اچھا ایک اور سنیے۔ جب میں بھڑ بھڑا کے جاتا ہوں تو کُل جم۔ غفیر منتشر ہو جاتی ہے۔ عقلا فوراً پہچان لیتے ہیں مگر مسیتا بیگ کے سے اُلو احمق منہ ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

مسیتا: (زہر خندہ کرکے) تسلیم اچھی مثال دی واہ صاحب واہ۔ خواجہ صاحب نے پہلے تو میٹھی میٹھی چیزوں پر ہاتھ مارا اور جب سیر ہوئے تو نواب صاحب سے کہا خداوند ہو برٹ پاشا کے یہاں ایک اور افسر فوج بحری تھا۔ رابرٹ پاشا اس کی نسبت وہ بیان کرتے تھے کہ جنگ بحری میں جب ایک مرتبہ برٹش اور ڈچ سے مڈھ بھیڑ ہوئی تو نشان امیر البحر کے ہاتھ میں تھا مگر قرائن سے ایسا معلوم ہوا کہ غنیم فتح پا جائے گا۔ امیر البحر نے کہا کہ اگر کوئی شخص اور جہازوں کو جو جانب چپ فاصلے پر تھے اس طرف لے آئے تو آج فتح نصیب ہو ورنہ فتح و ظفر کی صورت دیکھنا غیر ممکن ہو بارہ ملاح کود پڑے اور ان کے ساتھ ہی ایک پانزدہ سالہ لڑکا بھی کود پڑا۔

نواب: سمندر میں! ارے میاں اُف فوہ۔! بڑے سورما۔

خو: خداوند ان سے بڑھ کر جری ہونا امر محال ہے۔

نواب: سچ ہے۔ دریں چہ جائے شک است۔ اب کوئی ان کے مقابلہ کا ہے کاہے کو۔ بس یہی یہ ہیں اور اب کون ہے۔

خو: بس حضور امیر البحر نے ملاحوں سے کہا کہ اس لڑکے کو روک لو۔ اور یوں سوال و جواب باہمی ہونے لگے۔

سوال : تم ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش بھلا مفت میں کیوں اپنی جان، وطن خطر میں ڈالتے ہو۔

جواب : واہ۔ میرے ملک پر اگر میری جان قربان ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے یہ کہہ کر وہ لڑکا پیرتا ہوا چلا۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

نواب : خواجہ صاحب کوئی ایسی فکر کیجیے کہ ہمارا آپ کا یارانہ ہمیشہ اسی طرح قائم رہے یک جان دو قالب۔

خو : بھئی سنو یار شاطر نہ بار خاطر۔ ہم کو یار کی یاری سے غرض ہے۔ اگر صاحب سلامت رکھنا منظور ہو تو ہوا طرا د۔ ورنہ آپ اپنے گھر خوش بندہ اپنے گھر خوش چشم ما روشن دل ماشاد۔

نواب : یار تم تو ذرا سی بات میں بگڑ کھڑے ہوتے ہو۔

خو : صاف تو یہ ہے کہ جو تجربہ ہم کو حاصل ہوا ہے اس پر ہم کو ناز ہے بھئی۔ چاہے بُرا مانو چاہے بھلا۔

نواب : ہاں اس میں کیا فرق ہے مگر بات تو سُن لو۔

خو : حضرت سنیے آپ خوب جانتے ہیں کہ عالم آدمی مستغنی ہوتا ہے۔ اور میری استغنا سے بھی آپ خوب واقف ہیں۔ مجھے دنیا میں کسی سے دب کے چلنا شاق گذرتا ہے اور وجہ کیا کہ ہم کسی سے دب نکلیں۔ جب طمع ہمارے مزاج میں چھو نہیں گئی۔ لالچ سے منزلوں بھاگتے ہیں۔ حرص کے قریب نہیں جاتے۔ بچوں کے نزدیک بادشاہ اور وزیر اور امیر اور غریب اور مفلس سب یکساں ہیں۔

ہر کس کہ بد ہر نیم نانے دارد — وز بہر نشست آشیانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے — گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

عالم آدمی کی سب کہیں قدر ہے بمبئی میں ہماری قدر ہوئی۔

راوی : اس میں کیا فرق ہے۔ بہروپیے نے آپ کی گت بنائی۔ زمین اور اس کے دیور نے آپ کو اُتو بنایا۔ کانسٹبل نے آپ کو حوض میں ڈھکیلا۔ اس سے زیادہ آپ کی قدر بمبئی میں کیا ہوتی ہے۔

خو : مصر میں وہ اعزاز ہوا کہ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

راوی : ہمیں بھی معلوم ہے۔ بہروپیئے نے یہاں بھی ناک میں دم کر دیا ہے اتنی چپتیں لگائیں کہ کھوپڑی پلپلی ہو گئی۔ بونے نے دوسری مرتبہ ٹھینگی بتائی۔ یہ سب قدر افزائی ہی تھی یا کچھ اور۔

خو : استنبول اور قسطنطنیہ میں تو وہ قدر افزائی ہوئی کہ زمانہ واقف ہے۔

راوی : زمانہ واقف ہو یا نہ ہو ہم تو آپ کی نس نس سے واقف ہیں۔

خو : حضور نواب صاحب اس بے ادبی کو آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ مستیا بیگ نالائق آپ کے سامنے چانڈو کے دم لگا رہا ہے واہ رے دربار اور واہ رے رعب۔

نواب : کوئی ہے اس نالائق بدتمیز کو نکال دو یہاں سے۔

مصاحبین : حضور تو آج کچھ بے طور خفا ہیں اس کا قصور کیا ہے اس دربار میں تو روز اس کا شغل ہوا کرتا تھا آج بھی اس نے چانڈو پیا تو کیا گناہ کیا۔

نواب : کیا بکتے ہو۔ چانڈو کا شغل ہمارے ہاں نہیں ہوا۔

خو : ہمیں یہاں آتے ہوئے اتنے دن ہوئے ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہم بھلے مانس شریف زادے بھلا چانڈو کا شغل کیوں کرنے لگے۔ یہ تو شرفا کا کام نہیں ہے۔

پی لیا حسن مدک نے ستم ایجادوں کا

اُڑ گیا رنگ دھواں بن کے پری زادوں کا

مرزا : تم تو غضب کرتے ہو خوجی۔ زمانہ بھر کے نشہ باز انیمی چانڈو باز کوئی نشہ نہیں چھوٹا۔ اور اب آئے ہیں وہاں سے بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے ذرا سرکار نے منھ لگایا کہ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتا۔

خو : او گیدی غفور ان کی گردن میں ہاتھ دے۔

نواب : غفور۔ ان سب بدمعاشوں کو نکال باہر کرو۔ خبردار جو آج سے کوئی یہاں آنے پایا۔ اگر ذرا اس طرف کا رُخ بھی کریں کھڑے کھڑے چنوا دو

مصاحبین : استادہ ہو کر۔ خداوند بس اب کوئی کلمہ نہ فرمایئے گا۔ ہم لوگوں نے اپنی عزت نہیں بیچی ہے نوکری کر کے بے عزت نہ ہوں گے ہم کو کوئی پاجی یا چمار آپ نے متقرر کیا ہے۔

نواب :۔ آگ بھبھوکا ہو کر۔ نکلوا ان سب کو ابھی ابھی نکال دو۔ خواجہ صاحب تنہ پا کر اٹھے اور ایک کٹارا لے کر مسیتا بیگ پر جمایا۔ رفقا تو جھلائے اور بھرائے ہوئے تھے ہی مسیتا بیگ نے کٹارا چھین کر خوجی کو ایک چانٹا دیا تو تیورا کے گرے اِن کا گرنا تھا کہ دو رفیقوں نے ان کو اور بھی ٹھیک بنایا۔

اتنے میں سپاہی آ گئے انھوں نے مسیتا بیگ اور ایک رفیق کو گرفتار کر لیا اور باقی سب کے سب چل دیئے۔ خواجہ صاحب جھاڑ پوچھ کے اُٹھے اور اٹھتے ہی انتظام کرنے لگے۔ مسیتا بیگ کو اس درخت کی ٹہنی میں باندھ دے اور دو سو چابک لگا۔ اور اس دیوانجی کو چورنگ کر بہت کھا کے پھولا ہے۔ نمکحرام بے ایمان اپنے آقا کے دوستوں سے لڑتا ہے بدن میں کیڑے نہ پڑیں تو سہی۔ الغرض مسیتا بیگ اور دیوانجی اس قدر پٹے کہ بھرکس نکل گیا اور سپاہیوں کے نام ہو گیا کہ بلا اجازت کوئی مصاحب نہ آنے پائے۔

اتنے میں میاں آزاد نے آن کر کہا کہ ہم صاحب ضلع کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے۔ عرصے تک جنگ کا ذکر رہا اور سب صاحب اپنی جبلّی لیاقت اور خُلق سے مدّاح تھے۔ کوئی بیس انگریز تھے اور گیارہ میں۔

یہ لوگ تو اخبار کے کمال شائق ہوتے ہیں۔ جنگ کا حال اور جنرلوں کا نام سب کو حفظ تھا۔

نواب :۔ حضرت آج سے ہم نے آپ کی صلاح کے مطابق چلنا شروع کیا۔

آزاد :۔ وہ حوالی موالی سب کہاں قفر دہو گئے۔

خو :۔ سب کو شہر بدر کر دیا۔ اب کوئی پھٹکنے نہیں پائے گا۔ نادری حکم ہو گیا ہے کہ کوئی نہ آنے پائے۔

نواب :۔ اب ہم حکام سے ملا کریں گے اور کوشش کریں گے کہ ہر ایک قسم کی کمیٹی میں شریک ہوں واہی تباہی آدمیوں کی صحبت میں اب بیٹھیں تو مردود۔ بہت وقت ضائع کیا اب کان پکڑے خیر گذشتہ را صلواۃ آئندہ را احتیاط۔

آزاد :۔ اب کتب کا مطالعہ شروع کر دیجئے۔ اخلاق جلالی۔ اخلاق ناصری۔ کیمیائے سعادت۔ دُرہ نادرہ۔ اکبر نامہ۔ تزک جہانگیری۔ دیوان سعدی۔ دیوان خاقانی وغیرہ۔

نواب :۔ بالضرور میرا چھبیسواں سال ہے ابھی مجھے پڑھنے لکھنے کا بہت موقع ہے اور مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ دولت موجود ہے خدا کے فضل سے چاہے تمام عمر پڑھوں۔

آزاد :۔ خدا توفیق دے۔ آمین آمین ثم آمین۔

خو :۔ بس اب آج سے حضور علما ہی کی صحبت رکھیں ایسا نہیں کہ اس وقت تو سب کچھ اقرار کر لیجئے۔ اور کل سے پھر رائے بدل جائے۔ اب کی مستقل رہیے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

نواب :۔ انھیں باتوں سے تو ہمارے ملک کے رئیس تباہ ہیں۔ چانڈو مدکہ چرس گانجا۔ بھنگ افیم۔ شراب کی کثرت۔ عیاشی کثرت ازدواج صحبت بد۔ رفقا کی شرارت۔ خوشامد خوروں کا ہجوم۔ ایک بات ہو تو کہوں مگر خدا نے چاہا تو سب باتیں نام کو نہ دیکھئے گا۔

خو :۔ انشاء اللہ ہمت مرداں مدد خدا سنا نہیں۔

بانگ بزرد کہ ہاں بگو چہ کسی	باکہ داری چو باد ہم نفسی
چہ کسی وچہ نام خوانندت	وزکدامی مقام خوانندت

راوی :۔ پھر وحشت کی لی۔ کیوں نہ ہو۔

آزاد :۔ اب صبح کو بندے کا کوچ ہے۔ مجھے بدل اجازت دیجئے۔

نواب :۔ واللہ ایسی جلد۔ دو چار روز تو اور رہو صاحب۔

آزاد :۔ اب تو ہندوستان میں ہوں۔ انشاء اللہ اکثر ملاقات ہوا کرے گی اور حاضر ہوا کروں گا۔

آزاد پاشانے دستور العمل طرز معاشرت کی نسبت ایک مختصر رسالہ لکھ کر نواب صاحب کو دیا اور شام ہی کو رخصت ہو کر ہوٹل میں مس کلیر سا اور مس میڈا کے پاس گییں اڑا کر شب کو وہاں آرام کیا اور سویرے مع ان مہ وشان پری تمثال کے بسواری ریل روانہ ہوئے اور داخل منزل مقصود ہو کر ان دونوں جادو جمال کو ہوٹل میں اتارا اور انتظام ضروری کر کے سیر گشت کو چلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مقام پر چند سفید پوش وضعدار شریف زادے عین چوک کی ایک چھت پر بیٹھے ہیں۔ اتنے میں ایک خدمت گار نے اسے آن کر کہا حضور اگر تکلیف نہ ہو تو ذرا چھت تک آیئے میاں کو حضور سے کچھ عرض کرنا ہے۔ آزاد نے کہا بہتر۔ چھت پر جو گئے تو ان سفید پوش وضع داروں میں ایک صاحب کو بالکل اپنا ہمشکل پایا۔ انھوں نے سرو قد تعظیم کر کے ان سے ہاتھ ملایا اور مصافحہ کرتے ہی کہا آیئے ہم آپ تخلیے میں کچھ باتیں کریں۔ آزاد کا ہاتھ پکڑ کر لے گئے اور یوں مکالمہ ہونے لگا۔

وضعدار:۔ آپ نے اپنی شکل آئینہ میں ہزاروں بار دیکھی ہوگی۔

آزاد:۔ (مسکرا کر)۔ ہاں۔ اور اس وقت تو بغیر آئینہ کے اپنی شکل دیکھ رہا ہوں۔

وضعدار:۔ میں نے آپ کو آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا مگر قیاس سے جانتا ہوں کہ آپ محمد آزاد صاحب ہیں اور لطف یہ کہ خاکسار کا نام بھی آزاد مرزا ہے۔

آزاد:۔ کیا خوب ہمشکل و ہم نام۔ مگر آپ نے مجھے کیونکر پہچان لیا۔

مرزا:۔ میں نے آپ کی تصویریں دیکھی ہیں اور اپنی تصویر کے دھوکے سے خرید لایا ہوں۔

آزاد:۔ بجا ارشاد ہوا اس وقت آپ کی ملاقات سے کمال مسرور ہوا۔

مرزا:۔ اور ابھی مسرور ہو جیئے گا بھلا ثریا بیگم کو بھی آپ جانتے ہیں۔

آزاد:۔ متحیر ہو کر۔ جی ہاں۔ اللہ۔

مرزا:۔ جی ہاں۔ اللہ رکھی۔ ثریا بیگم۔ نواب ثریا بیگم۔

آزاد:۔ آپ کو ان کا حال کیا معلوم ہے۔

مرزا:۔ فضل الٰہی ہے۔ آپ کے دھوکے میں اُن کے ہاں پہونچا تھا۔ ان کو دھوکا ہوا کہ یہی آزاد ہیں۔ تھیٹر میں ملی تھیں۔ دور سے دیکھتے ہی لونڈی بھیجی داروغہ آیا کہ بیگم صاحب آپ کا نام پوچھتی ہیں۔ میں نے کہا آزاد مرزا ہیں یقین واثق ہو گیا کہ وہی آزاد ہے۔ مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئیں اور شکایت کے دفتر کھولے بس بس جاؤ دیکھ لیا۔ ہم تو ہجر کے صدمے سے تڑپیں اِدھر اُدھر۔ تم مزے اور لطف اٹھاؤ۔ واہ کیسا انصاف ہے:۔

ما ڑیان چشم یاری داشتیم
خود غلط بود انچہ ما پندا شتیم

میں خاموش ہو رہا۔ عذر کیا کہ مجھے معاف فرمائیے۔

آزاد :۔ اب کہاں ہیں۔ آپ نے تو اس وقت وہ بات بتائی کہ دل خوش ہو گیا۔ افوہ۔ اللہ رکھی نے بھی ہمارے ساتھ۔ خیر مفتی

مرزا :۔ اب تو آپ کے امکان میں نہیں ہے کہ ان سے مل سکے۔ اب تو ایک نواب صاحب کے ساتھ اُن کا نکاح ہو گیا ہے۔ نواب میجر سطوت صاحب۔

آزاد :۔ آپ کو وہ کس حیثیت میں ملی تھیں۔

مرزا :۔ ایک محل عالیشان بیس روپیہ ماہواری کرایہ پر لیا تھا۔ ڈیوڑھی پر دُہرا دُہرا پہرا ہر دم۔ دو دو جوان تعینات۔ دروازے پر گھڑے اور گھنٹہ۔ ڈکرڈی جوڑی یا بو گھوڑے ویلا۔ فنس۔ کہار چوبدار خاص بردار مہریاں۔ خواصیں محلدار پیش خدمتیں۔ مغلانیاں۔ باورچی۔ مامائیں باغبان۔ دس بارہ کمرے دلہن کی طرح آراستہ۔ فرش مکلف بچھا ہوا۔ وہ ٹھاٹھ کہ باید و شاید۔

آزاد :۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے واللہ یہ سب آیا کہاں سے۔

مرزا :۔ خدائی دین۔ دم کے دم میں فقیر کو امیر اور امیر کو فقیر کر دیتا ہے۔ ادنٰی ادنٰی محتاجوں کو سیم وزر سے مالا مال کر دیتا۔ اس کے نزدیک کون بات ہے اور یہ تو ماشاء اللہ خاندانی امیرزادے ہیں مگر اب واقعی چین کرتے ہیں۔

آزاد :۔ مجھ پر تو جان دیتی تھیں۔ مگر میں مجبور تھا۔

مرزا :۔ آپ کے لئے تو وہ جوگن ہو گئی تھی۔ مہینوں جوگن بنی رہی اور اس طرح تا سختیاں ان پر ہوئیں کہ اللہ کسی کو نہ دکھائے مگر وہ آزاد کا نام لیے پاکبازی کے ساتھ رہی۔

آزاد :۔ کیا اب دور سے بھی دیدار نصیب نہ ہوں گے۔

مرزا :۔ ہرگز نہیں۔ مجھے تو ان کا حالِ مفصل پیچھے معلوم ہوا پہلے تو ایک معتبر عورت نے بیان کیا۔ لڑکپن سے کل تک کا حال سُن لیجئے۔ جب بڈھے کے ساتھ شادی ہوئی تب بھی پاک دامن رہی اور گو سو برس کا میاں پایا تھا مگر نیت کبھی ڈانواڈول نہیں ہوئی یا کسی نامحرم کی صورت دیکھی اور کمال تو یہ کیا کہ سرا میں رہ کر بھی پاک رہی۔ آفریں ہے۔

آزاد :۔ سرپنگ کا حال تو مجھے بھی معلوم ہے۔

مرزا :۔ بعد ازاں جوگن ہوئیں۔ وہاں ایک مالدار جوہری کا لڑکا سرپٹک پٹک کر مرگیا مگر اس کا دامن بے تو ث ہی رہا پھر ایک استانی جی کے ہاں جا کے رہیں وہاں تھانہ دار نے ناک میں دم کر دیا مگر وہاں بھی گو جان کے لالے پڑے تھے تاہم نیکی سے منہ نہ موڑا۔ اللہ رے خیال پاکدامنی۔ سچ ہے۔

نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

اس کے بعد ایک وکیل کے ہاں رہنے کا اتفاق ہوا وکیل صاحب عاشق زار ہو گئے۔ اچھی شے کے تو سب گاہک ہوتے ہیں نہ اور پھر ایسی شے کے۔ جوانی کا عالم جوبن قیامت ڈھاتا ہے۔ وضع قطع میں فرد۔ خوبصورتی میں یگانۂ آفاق۔ مگر یہاں سے بھی تاوہ نکلی۔

آزاد :۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے مقاموں پر جانے اور رہنے کا کیا سبب ہوا۔

مرزا :۔ یہ طول طویل قصہ ہے۔ پھر کہہ دوں گا مگر اس کی پاک دامنی کی واللہ قسم کھانی چاہیے وہاں سے ایک جنگل میں گئی ڈاکو کے ہاتھ لگی۔ اس نے سونے کی چڑیا پاکر خوشی کے شادیانے بجائے مگر اس کو بھی دھوکا دے کر چل دی راہ میں ایک تھانہ دار نے گرفتار کر لیا دو دن تک اس کے بس میں رہی۔ تیسرے دن اُسکے پنجے سے چھوٹی تو اسی نیکی اور عصمت کے ساتھ۔

آزاد :۔ واللہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ملوں اور باتیں کروں۔

مرزا :۔ سبحان اللہ سبحان اللہ عورت کیا سجدے کے قابل ہے (توبہ توبہ)

آزاد :۔ مگر آپ کو پوری تاریخ یاد ہے۔ مانتا ہوں، واللہ۔

مرزا :۔ یہاں سے پھر ایک پادری کے ہاں گئی وہاں پڑھنا لکھنا سیکھا مگر خدا جانے کس سبب سے وہاں سے بھی بھاگ گئی

آزاد :۔ حضرت مکان اور مقام اور شہر کا پتہ بتائیے۔

مرزا :۔ کاغذ لاکر۔ یہ پتہ لکھا ہے۔ جائیے مگر ملاقات محال ہے کوشش کیجئے شاید کوئی فکر کارگر ہو جائے۔ مگر امید نہیں۔

مرزا نے ثریا بیگم کا کچا چٹھا کہہ سنایا اور کہا کہ عرصہ دراز تک اس بیچاری دختِ گلفام صید مصائب و آلام کو تمہارا ہی نام وردِ زبان تھا اور یہی کہتی تھی کہ گو اب شادی ہونا تو غیر ممکن ہے مگر ہیں صرف اسقدر چاہتی

ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو سکے آزاد کا نام لیئے بیٹھی رہوں اور افعالِ نیک سے اپنے ملک کی نیک بیویوں کو فائدہ پہنچاؤں۔ بڑی بڑی مصیبتوں میں پڑی۔ بڑی بڑی سختیاں اٹھائیں۔ مگر اُف تک نہ کی۔ افسوس ہے کہ آپ کو اب تک اُس بیچاری کے حال کی اطلاع ہی نہ ہوئی۔

آزاد: اس وقت میرا دل بھر آیا۔ واللہ وہ واقعی عجب عفیفہ وعصمت مآب رئیس زادی ہے۔

زنِ نیک وخوش سیرت وپارسا

کند مرد درویش را پادشا

مرزا:۔ میں تو بالکل چکمے ہی چکمے میں گیا تھا۔ مگر جب میں نے جب ایک معتبر آدمی سے ان کے حالات سنے تب البتہ کمال افسوس ہوا۔ کہ ایسی عفیفہ اور یہ مصیبت پڑی۔ افسوس صد افسوس اور حسن آرا بیگم کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہوتا رہتا ہوگا۔ آج کل طبیعت داری بڑھی ہوئی ہے۔

آزاد:۔ جی۔ وہ حسن آرا بیگم۔ میں سمجھا۔

مرزا:۔ کیا خوب مجھ سے اُڑتے ہیں آپ۔ وہ اور یہ کیا ساری خدائی میں تو حسن آرا کا نام مشہور ہے۔ آپ جانتے ہی نہیں ہیں۔ پھر روم کس کے کہنے سے گئے تھے۔ جنگ کے میدان میں بھی یاد کر کے بُرا حال کرتے تھے۔ مس میڈا سے شادی کا پہلے کیوں انکار کیا تھا گویا ہم کو خبر ہی نہیں یا ہم کسی گاؤں میں رہتے ہیں۔

آزاد:۔ حسن آرا کا نام تو سُنا ہے مگر

مرزا:۔ اجی حضرت عقل کے ناخن لیجئے۔

آنکھیں عاشق کو نہ تو اے گلِ رعنا دکھلا

پتلیوں کا کسی ناداں کو تماشا دکھلا

یہ شعر کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا چوک میں کتب فروش حاجی نور محمد صاحب کی دکان پر ہے۔

آزاد:۔ اس شعر کا حسن آرا سے کیا تعلق ہے سبحان اللہ۔

مرزا:۔ ایک نواب صاحب نے کسی اخبار میں ایک مصرع چھپوایا تھا۔

ع:۔ بجلی گری فلک سے زمیں پر یہ غل ہوا

اور مشتہر کیا کہ اس کا دوسرا مصرع موزوں کیجئے۔

آزاد:۔ مہمل مصرع ہے اس کے معنی کیا۔ ع

بجلی گری فلک سے زمیں پر یہ غل ہوا

مرزا :- خیر ایک صاحب نے غلبۂ ذکاوت سے اس کا مصرعۂ ثانی یہ موزوں کیا۔

بجلی گری فلک سے زمین پر یہ غل ہوا
شمع حیات اہلِ جہاں آج گل ہوا

آزاد :- واہ وا۔ ایک مصرع لغو دوسرا مصرع اُس سے بدتر۔

مرزا :- حسن آرا نے اس کا جواب لکھا تھا کہ شمع گل ہوا خلاف محاورہ صرف نحو ہے۔ شمع مذکر نہیں مونث ہے اور گل ہوا مذکر لہٰذا مصرع بالکل لغو ہو گیا

آزاد :- یہ کوئی حسن آرا کی تعریف نہیں ہے۔

مرزا :- دل میں تو خوش ہو گئے ہو گے استاد۔ یوں چاہے زبان سے نہ کہو۔ خدا کی شان آپ اور ہم سے اُڑیں۔

آزاد :- آپ حسن آرا سے واقف ہی نہیں اس امیرزادے کی لیاقت اور ذکاوت و ذہانت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اس لغو مصرعہ پر اعتراض کرنے سے اس کو فخر کا باعث نہیں۔ ایک شاعر نے مشاعرے میں غزل پڑھتے پڑھتے یہ شعر پڑھا۔

پیس کر آسیۂ چرخ یہ کہتی ہے تجھے
میں نے دانہ یہ چُنا ہے کئی نادانوں میں

وہاں ایک اُستاد بھی پچاس ساٹھ شاگرد دلئے ہوئے بیٹھے تھے انہوں نے کہا سبحان اللہ۔ سبحان اللہ یہ شعر آپ کے حصہ کا ہے ذرا پھر فرمایئے۔ انھوں نے پھر پڑھا ہنس کر کہا یہ شعر گفتن چہ ضرور۔ آسیۂ چرخ کیا معنی۔ آسیائے چرخ کہو۔ آسیا کا مخفف آس ہے جیسے آسمان یعنی مانند اُس چکی کی صورت ہوتا ہے۔ حافظ نے کہا ہے۔

مزرع سبز فلک دیدم واس مہ نو
یادم از کشتہ خود آمد و ہنگام درو

آسیا کہو آس کا مخفف کہو۔ یہ آسیہ کیا معنی۔ اور مصرع ثانی بھی غلط ہے۔ میں نے دانہ یہ چنا ہے کئی نادانوں میں۔ نادانوں میں دانہ کیونکر چُنا۔ نادانوں میں جب چنو گے کسی نادان ہی کو چنو گے۔ اِدھر انھوں نے یہ اعتراض کیا اُدھر ایک شخص نے کہا اعتراض کرنا سب جانتے ہیں۔ آپ نے اس وقت حافظ کا شعر بالکل غلط پڑھا ہے۔ آس اس غزل بھر میں کہیں نہیں ہے مہ نو کو آس یعنی چکی سے کیا واسطہ کوئی پنساری کا لونڈا کہے تو مضائقہ نہیں۔ حافظ نے یوں کہا ہے :-

مرزع سبز فلک دیدم و داس مہ نو

یادم از کشتہ خود آمد و ہنگام درو

استاد کا منہ اتنا سا ہو گیا تب لوگوں نے کہا کہ آپ کو اعتراض کرنا ہے کیا فرض تھا۔ آپ اتنے بڑے اُستاد آپ کو تو کو لازم تھا کہ اگر آپ کا کوئی شاگرد اعتراض کرتا تو آپ اس کو للکارتے نہ خود معترض ہوں۔ اُستادی آپ نے پلٹا دی۔

مرزا :۔ اب فرمائیے ثریا بیگم سے پہلے ملیے گا یا حسن آرا سے۔

آزاد :۔ ایک ذرا سیر کرتے ہوئے جائیں گے اور حسن آرا سے ملنے کے لئے تو بقول شخصے جوئے شیر لائیے۔ اب بھی کچھ تعجب ہے۔ دل اُن کا جان ان کی تن اُن کا روح اُن کی ہم کس میں ہیں۔ جو کچھ ہے

وقف ہے۔

آزاد نے ثریا بیگم کا پتہ پھر مفصل پوچھا نواب سنجر سطوت کا نام ایک کاغذ پر لکھا اور آزاد مرزا کے اصرار سے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور رخصت ہوئے۔ اثنائے راہ میں حسنِ اتفاق سے اُن کو وہ چانڈو باز ملا جو اللہ رکھی کے پاس سرا میں اکثر آیا جایا کرتا تھا جُھک کر آداب بجالایا اور یوں ہمکلام ہوا۔

چانڈو باز :۔ آپ نے اللہ رکھی کا بھی کچھ حال سُنا۔ وہ تو اب بیگم ہو گئیں۔ اب بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ میں کئی بار گیا مگر بڑی مشکلوں سے اُن تک پیغام بھیج سکا وہاں پرندہ تو پر نہیں مار سکتا۔ اب فرمائیے کیا شغل ہے ہم نے سُنا آپ تو کرنیل ہو گئے اور بڑی بڑی لڑائیاں سر کیں۔

آزاد :۔ بھئی ہمیں ٹھیک پتہ بتاؤ تو ہم جائیں۔

چانڈو باز :۔ آپ آج یا کل روانہ ہوں پرسوں اسی شہر میں بندہ بھی ہو گا جہاں آپ ہوں وہاں آپ کو ڈھونڈھ نکالوں۔

آزاد :۔ اگر سچا وعدہ کرو تو نہال کر دوں میں پرسوں ہوٹل میں جاؤں گا۔ دو تین ہوٹل اس شہر میں ہونگے تم سب میں تلاش کرنا۔ دو میمیں بھی میرے ساتھ ہیں۔ مگر ضرور ملنا۔

چانڈو باز نے ان سے ساری سرگذشت بیان کی اور کہا تمہارے نام برس بھر تک جوگن ہو کے رہی اور شاعری کے وقت تک بالکل پاکبازی کے ساتھ بسر کی۔

آزاد فرخ نہاد اور مہ وش پریزاد ثریا بیگم سے نامہ و پیغام

میاں آزاد فرخ نہاد اُن دونوں تندرو رفتار گام دار باغ و بہار خاتونوں کو ہمراہ لے کر رعیت طاؤس زیب عابد فریب پری چہرہ ثریا بیگم کی تلاش میں روانہ اور آزاد مرزا کے اشتیاق دلانے سے آرزو مند نظارہ جمالِ جانانہ ہوئے۔ اللہ رکھی کی عفت و عصمت نے ان کے دل میں جگہ کرلی اور جب انہوں نے معتبر ذریعے سے سُنا کہ ان کا نام لے لے کر تڑپتی رہتی تھی تو اور بھی ہزار جان سے عاشق ہوگئے۔ آزاد نے مرزا سے پتہ تو پوچھ ہی لیا تھا اُسی پتہ سے معشوقۂ مطلوبہ کو ڈھونڈھنے نکلے اثنائے راہ میں مس کلیر سا نے ہندوستان کی قدرات عصمت سمات اور خواتین عفت مآب کی نسبت ان سے چند سوال کیے۔

(۱) کیا شادی کے قبل عورت مرد اور مرد عورت کو نہیں دیکھ سکتا۔ آزاد نے کہا کہ اس ملک میں یہ رسم ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی شادی ماں باپ کی رائے پر ہوتی ہے اگر لڑکا کوئی عذر کرے تو بے حیا سمجھا جاتا ہے اور کنواری لڑکی تو کوئی کلمہ زبان پر لا ہی نہیں سکتی اگر والدین کی رائے کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالے تو کُل ارباب قوم میں سخت بدنام ہو جائے کہ کنوار پنے ہی کے دنوں میں اس لڑکی کے یہ خم دم ہیں کہ ماں باپ سے لڑتی ہے۔ غضب خدا کا دوشیزہ اور یوں کھُلم کھلا تکرار کرے۔ عورتیں طعنے دیں کہ فوج کسی شریف کی بہو بیٹی ہو کیا دیدہ دلیل ہے۔ بہو بیٹی کے یہ معنیٰ کہ بے حیائی کا لفظ تک زبان پر نہ آئے کہ یوں ماں باپ چچا چچی کے سامنے بے جھجک صاف صاف بکے اور ابھی کیا ہے ابھی تو تیرہ صدی کا سمجھاؤ ہے اہلِ اسلام میں تو خیر اکثر رشتہ داروں اور اعزہ ہی میں شادی ہوتی ہے اور اگر میاں نے بیوی کو اور بیوی نے میاں کو نہ بھی دیکھا ہو تو دونوں کے ماں باپ اور قریب کے عزیزوں نے تو ضرور ہی دیکھا ہوگا، مگر ہندوؤں میں ستم، اُن کا بابا آدم ہی نرالا ہے۔ میاں راس کماری میں بیوی بنگلور میں بیوی کٹک میں میاں اٹک۔ جس دن تک بھونری پھیری جاتی ہے اُس دن تک ان دونوں کو نہیں معلوم کہ کیسا جوڑا پایا۔ یہاں دل میں دُعا مانگتے ہیں کہ یا الٰہی بیوی مہ پارہ پری وش غیرت حُور بہشتی ہو۔ خدا کرے کہ چار آنکھیں ہوتے ہی نور کا بکا نظر آئے بلکہ آنکھ بھی جھپک جائے بلا خیر کی نگاہ رُخ انور کی جھلک کی تاب نہ آئے دُعا تو مانگتے ہیں کہ چار آنکھیں ہوتے ہی بہ ہوا د روہ ہو مگر دل میں یہ سوچتے جاتے ہیں کہ خدا جانے چار آنکھیں ہوں گی یا تین ہی آنکھیں ہوں گی اور ادھر دُلہن کی آرزو کہ یارب میاں گلے ٹھلے کے گبھرو جوان نک سک سے درست پڑھے لکھے آدمی ہوں ہمجولیاں دیکھ کے عش عش کرنے لگیں کہ واہ کیا خوبصورت مرد ہے۔ بڑی خوش قسمت ہو بہن۔

کلیرسا :۔ میاں بیوی میں باہم محبت کیونکر ہوتی ہے۔ پھر ممکن ہی نہیں۔

آزاد :۔ اب آپ سے تو ہزار بار کہہ چکے کہ ہندو عورت کو اپنے میاں کی جس قدر محبت ہوتی ہے وہ اور کسی قوم میں نہ پاؤ گی۔ ساری خدائی میں۔ شاید ہی کہیں اور ہو۔ ان کو سکھایا جاتا ہے کہ تم اپنے میاں کے حکم کو معاذ اللہ خدا کے حکم پر ترجیح دو۔ اور ہندوؤں میں برہمن پنڈت لوگ مذہبی کتابوں کا خلاصہ کر کے اخلاق کی باتوں کو ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں اور مختلف تقریبوں میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کو کتھا کہتے ہیں۔

کلیرسا :۔ بھلا ہندوؤں مسلمانوں میں بیوہ کی شادی جائز ہے۔

آزاد :۔ شریف زادوں میں یہ رسم نہیں ہے۔ چاہے برس کی لڑکی ہو جس نے میاں کی صورت بھی اچھی طرح نہ دیکھی ہو اگر وہ بیوہ ہو جائے تو ممکن نہیں کہ تمام عمر اس کی شادی ہو سکے اور ہندوؤں میں تو بیوہ بیچاری کی مٹی ہی خراب ہے۔ سہاگنوں میں بیٹھنا بھی بعض اوقات ناجائز ہے۔ نہ کھانا اچھا کھائے نہ کپڑے اچھے پہنے۔ بہت سی تقریبیں ایسی ہیں جن میں وہ بے چاری بیٹھنے بھی نہیں پاتی ہیں۔

کلیرسا :۔ اچھا ہم دونوں اس بارے میں کوشش کریں کہ اس ملک کی عورتیں ادبار کی حالت سے بری ہو جائیں جس طرح مشن کی عورتیں ادھر اُدھر پڑھانے جاتی ہیں اسی طرح ہم بھی جایا کریں گے اور رفتہ رفتہ اُن کے دلوں پر اس امر کا نقش منقوش کریں گے کہ ہندوستان کی لیڈیاں طرزِ معاشرت نہیں جانتیں۔

میڈا :۔ تم نے تو بیان کیا تھا کہ اکثر بڑے بڑے شہروں میں مشن کی عورتیں نواب زادوں اور امیروں اور بنگالیوں اور ہندوستانیوں کے ہاں جاتی ہیں۔

آزاد :۔ ہاں برابر۔ سوئی کا کام سکھاتی ہیں اور انگریزی پڑھاتی ہیں حساب سکھاتی ہیں

میڈا :۔ ہم دونوں کی دلی خواہش ہے کہ اپنی ہندوستانی بہنوں کو یہ سب باتیں سکھائیں جن رسموں کا تم نے ابھی ذکر کیا ان کا حال سُنکر ہمیں افسوس ہوتا ہے۔

آزاد :۔ اچھا پھر تم دونوں بھی اسی طرح جایا کرنا ــــ

جب آزاد پاشا اس شہر میں داخل ہوئے جہاں ثریا بیگم رہتی تھیں تو ان دونوں گُل بدنوں کو ہوٹل میں لے جاکر ضروری انتظام کے بعد معشوقۂ مطلوبہ کی تلاش میں چلے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک دلکشا باغ میں چند سفید پوش ایک رئیس کی صحبت میں بیٹھے گپیں اُڑا رہے ہیں سوچنے کہ ان لوگوں سے شاید

رئیس نے جو آزاد کو دیکھا تو مصاحبوں سے کہا کہ اس شخص کو تم نے کہیں دیکھا ہے ــــ

مصاحبوں نے بھی آزاد پر غور سے نظر ڈالی۔

نواب :۔ ضرور کہیں دیکھا ہے۔ مگر اس وقت یاد نہیں آتا کہ کہاں دیکھا ہے۔ جس قدر غور کرتا ہوں اسی قدر اُلجھن ہوتی ہے اور گتھی نہیں سُلجھتی۔

مصاحب :۔ خداوند ہوں نہ ہوں آزاد پاشا ہوں جن کی تصویر اُس دن اخبار میں حضور نے دیکھی تھی۔ چھوٹے صاحب نے تصویر دکھائی تھی نہ وہی ہوں گے۔

نواب :۔ ہاں سچ کہا یہ وہی باحمیت مسلمان ہے جو وطن اور یار دوست سب چھوڑ کے روم گیا تھا۔ ان کو بُلانا چاہیئے بھئی۔ یہ قدر و منزلت کے قابل ہیں۔

ایک مصاحب نے جا کے ان سے کہا جناب نواب صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں اگر تکلیف نہ ہو تو مہربانی کر کے کوٹھے تک تشریف لے چلیئے بے تکلفی کی صحبت ہے آزاد نے فوراً منظور کر لیا۔

ادھر مصاحبوں نے باہم گفتگو کی کہ ایسا نہ ہو یہ صاحب بڑے متقی متشرع ہوں تو اُن کے آنے سے صحبت درہم برہم ہو جائے۔ اس پر ایک رفیق نے یوں کہا۔

رفیق :۔ جس شخص نے یہاں سے فرانس اور روم اور روس کا سفر کیا اور انگریزی خواں ہے وہ ایسی صحبت کو درہم برہم کرے گا۔ کیا مجال۔

مصاحب :۔ اچھا تو باتوں باتوں میں ان کو ٹٹول لو۔

رفیق :۔ چٹکیوں میں یہ کون بڑی بات ہے۔

اِدھر آزاد پاشا چھت پر آئے اُدھر نواب قمر رکاب نے سر دقد تعظیم کی پھر مصاحبین اور رفقا بھلا کس شمار قطار میں سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب صاحب نے مصافحہ کیا اور اپنے قریب جگہ دی۔

نواب :۔ واللہ کمالِ اشتیاق قدمبوسی تھا۔ کمال اشتیاق۔

رُفقا :۔ حق ہے قسم خدا کی حق ہے۔ واللہ کمال مشتاق تھے

نواب :۔ شُکر ہے کہ آپ ایسے باحمیت بزرگوار کی زیارت ہوئی۔

آزاد :۔ ان کلمات کو میں آپ کی ذاتی لیاقت اور حسنِ اخلاق پر محمول کرتا ہوں۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا بے شک یہ امر مجھ پر فرض عین تھا اور وہ فرض خدا کے فضل سے ادا کر دیا گیا۔

نواب :۔ اخباروں میں آپ کی جرأت و شجاعت کا حال پڑھ پڑھ کر ہم لوگوں کو وہ دلی مسرت حاصل ہوتی تھی کہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ خدا کرے اہل اسلام ایسے ہی اولوالعزم و عالی منزلت ہوں۔

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

اب فرمائیے اس وقت آپ کی کیا تواضع کروں۔

مصاحب :۔ حضور کوئی ایسی شے جنڈیل صاحب کو بلوائیے جس سے رُوح کو تازگی آئے اور طبیعت خوش ہو جائے اور بدن گرما جائے وہ شے حضور بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں۔

خانصاحب :۔ خداوند مجھے پارسال یرقان ہو گیا۔ دو مہینے ڈاکٹر کا علاج ہوا خاک فائدہ نہ کیا بیس دن تک حکیم صاحب نے تختۂ مشق بنایا اور بھی عارضہ بڑھ گیا۔ پڑوس میں ایک بید راج رہتے ہیں انہوں نے کہا ہم دو دن میں اچھا کرتے ہیں۔ دس دن اُن کا علاج رہا تو انہوں نے وہ گرم دوائیں دیں کہ توبہ ہی بھلی۔ سونٹھ اور کالی مرچ اور شہد اور اَلَم غلّم آخر کار ایک دوست نے کہا بھئی تم سب کا علاج چھوڑ دو جو ہم کہیں وہ کرو بس حضور صبح شام برانڈی پلائی۔ دو چھٹانک شام کو دو چھٹانک صبح کو اس سے یہ کیفیت ہوئی کہ بندہ خاصا ہٹا کٹا ہو گیا۔

نواب :۔ واللہ برانڈی اور یرقان کیا شانِ خدا ہے۔

دیوانجی :۔ سرکار ذیابیطس کے لئے تو برانڈی اکسیر ہے بجا ہے جس قدر دیتے جایئے جتنی زیادہ پیئے اُسی قدر زیادہ فائدہ اگر بوتل بھر ختم کر جائے تو مرض منزلوں دُور ہو۔

راوی :۔ بیجا اور جو ہر دم مخمور رہے تو مرض کی جڑ ہی کھو جائے۔

خانصاحب :۔ اور خداوند آنکھوں دیکھی کہتا ہوں کہ شاہی میں ناظم مردان علی خاں کے کمپو کے ساتھ خیر آباد میں رہنے کا اتفاق ہوا ایک سوار کو مرگی آتی تھی صدہا علاج کئے مرض نہ گیا آخر کار ایک شخص نے کمیدان سے کہا حضور حکم دیں تو ایک دوا بتاؤں اور دعویٰ کر کے کہتا ہوں کہ کل ہی مرگی نہ رہے ۔

کمیدان صاحب نے کہا۔ ازیں چہ بہتر نیکی اور پوچھ پوچھ بسم اللہ بتایئے۔ کہا خداوند دو چھٹانک شراب دیجیئے اور اس میں اس کا دونا پانی ملایئے مگر شراب دو آتشہ ہو اگر ایک دن کے استعمال میں فائدہ نہ ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ کمیدان نے کہا ہم اپنی زبان سے اجازت نہ دیں گے کہ مسلمان کو شراب پلائی جائے لیکن۔ بس لیکن کہہ کے رہ گئے۔ لوگ سمجھ گئے کہ حضور کا بھی منشا ہے اسی دن شام کو شراب اور پانی پلایا۔ دوسرے روز عارضہ کا کہیں پتہ ہی نہ تھا۔

نواب :۔ اللہ اللہ یہ وصف ہیں اس کے مگر حرام ہے۔

مصاحب :۔ حضور گنوار دل پاجیوں نے اس کو بدنام کر دیا ہے۔ ع

مے کہ بدنام کند اہل خرد غلط است بلکہ مے می شود از صحبت ناداں بدنام

آزاد :۔ درجۂ اعتدال سے تجاوز کیا اور گیا گزرا

نواب :۔ بھلا حرام اور حلال کی نسبت کیا رائے ہے۔

آزاد :۔ مذہبِ اسلام کی رو سے تو حرام مطلق ہے۔

نواب :۔ بھلا کیوں صاحب۔ وہیں کیا حال ہے۔

آزاد :۔ مسلمان اور عیسائی برابر ایک میز اور ایک دستر خوان پر کھاتے ہیں۔ ذرا فرق نہیں یہ صرف ہی ملک میں ہندوستان کی دیکھا دیکھی قاعدہ نکالا ہے کہ بالکل مغائرت کا برتاؤ ہو۔ مگر ماں خوک کا لحم اگر میز پر ہو تو مسلمان اس کمرے میں نہ بیٹھے گا۔

نواب :۔ اور بادہ گلگون اس کا بھی پرہیز ہے یا نہیں۔

آزاد :۔ نیک نیک۔ علماء اس کے قریب نہیں جاتے۔ مگر بعض بعض امرا زادوں میں اس کا شغل ہے۔ اور شاہِ ایران تو برابر جام پر جام لنڈھاتے ہیں ؏

چوں دانستم کہ مے عدوِ دین است
باللہ بجزم خون عدو را کہ روا است

مصاحب :۔ حضور ایک عالم کا مقولہ ہے کہ شراب لوٹنی جائز ہے۔

آزاد :۔ ہرگز نہیں وہ عالم نہیں گمراہ ہے اور گمراہ کرنے والا ہے۔ ؏

دوزخ میں جائیں گے مے کے پینے والے
توبہ خا در ہزار توبہ خا در

مصاحب :۔ حضور کو کبھی اتفاق ہوا ہے (دبے دانتوں)

آزاد :۔ (مسکرا کر) مجھے ! ہونہہ !!! کیا میں مسلمان نہیں ہوں۔

نواب :۔ تو ضرور ہوا ہے اتفاق۔ یہ بھی کیا خوب جواب دیا ہے۔

مصاحب :۔ خداوند اگر حکم ہو تو جنڈیل صاحب کے واسطے منگوایا جائے ضرور اس رنگ میں ہیں اور آج ہوا بھی خنک ہے۔

اتنے میں ایک مصاحب جن کو اور رفقا نے سکھا پڑھا کر بھیجا تھا چغہ اور عمامہ شرعی پائجامہ پہن کر آئیے جناب مولانا صاحب یوں تشریف لائیے۔ آخاہ حضور مزاج انور نواب صاحب بھی بڑے تپاک سے پیش آئے۔ اور رفیقوں نے بھی تعظیم و تکریم کی آزاد سمجھے کہ یہ کوئی بڑے مقدس بزرگ ہیں مگر وہ اصل میں منجلہ اور خوشامد خورے رفیقوں کے تھے اور صرف اس نظر سے کہ ان کے تقدس پر خیال کر کے شاید آزاد پر چکمہ ہو جائے ان کو مولوی

بنا کے لائے تھے۔

نواب :۔ مزاج اقدس جناب مولانا صاحب۔

مولانا :۔ الحمد اللہ۔ بندہ ام تازندہ ام۔ پشاور جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ع

بہر کجا کہ روم وصف دوستاں گویم
برائے یار فروشی دکان نمی باید

نواب :۔ میں تو آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں دوست تو برابر والے کو کہتے ہیں۔

مولانا :۔ آپ کی سعادت آپ کی بزرگی۔ آپ کی ریاست۔

مصاحب :۔ مولانا صاحب۔ حضور کس فرقے میں ہیں اثنا عشری یا سُنّت جماعت۔

مولانا :۔ اس جھگڑے سے کیا مطلب۔

مصاحب :۔ حضور کا دم بھی غنیمت ہے۔ ہاں خوب یاد آیا حضور ابھی یہاں ذکر ہو رہا تھا کہ شراب جائز ہے یا ناجائز ہے۔

مولانا :۔ یہ سوال تو متعلق بہ نیت و دل ہو۔ اگر تمہارا قلب صاف نہیں تو ہزار بار حج کرو اور دو سو ہزار بار خیرات کرو اور روز نماز پڑھو کچھ نہیں لیکن مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ جو کرے صدق دل کے ساتھ خدا اور رسول کے احکام کو دل سے بجالائے تو کبھی رنج و بلا میں گرفتار نہ ہو آزاد پاشا سمجھ گئے کہ محفل کی محفل شرابی ہے۔ ہندو مسلمان سب اس میں ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اور یہ غرض مند۔ ان کو یہ فکر کہ محبوب مطلوب کا پتہ ملے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے حضرت ہم نے تو اس سفر میں ہر قسم کے آدمی دیکھے۔ متشرع ایسے ایسے کہ شرع کے ایک ایک حرف کے پابند۔ جان جاتی ہے مگر کیا مجال کہ نماز قضا ہو۔ دیکھ رہے ہیں کہ غنیم کی فوج گلے پر آگئی مگر جا نماز بچھا کے مصروف عبادت ہوئے ممکن کیا کہ نماز کا وقت ٹل جائے اور ایسے آدمیوں سے بھی صحبت رہی ہے کہ نماز کے قریب نہیں پھٹکتے اُن کو روزہ نماز سے اصلا سروکار نہیں ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ انتہا سے زیادہ احکام شریعت کے پابند اور اس کے برعکس ایسوں سے بھی سابقہ رہا ہے جو بعث و نشر اور یوم الحساب اور قیامت اور آخرت کے قائل نہیں ہم سب صحبتوں میں رہے ہیں کسی صحبت سے پرہیز نہیں۔ آپ لوگ مزے سے شوق کریں۔ بندے کا کچھ خیال نہ کیجیے۔

نواب :۔ بھئی صحبت یافتہ آدمی کا کیا کہنا۔ واللہ آزاد صاحب آپ مشک ہیں۔ پندرہ لحافوں میں مشک کو لپیٹ کے اور بند کر کے لے جاؤ وہ اپنی خوشبو ضرور دے گا۔

مصاحبین :۔ حق ہے خداوند کیا مثال دی ہے سبحان اللہ۔

رُفقا :۔ واقعی کیا خوب فرمایا ہے۔ مشک اور بارہ لحاف

راوی :۔ اور جو پندرہ لحاف ہوں۔ تو کیسا۔ خوشبو آئے نہ آئے۔

آزاد :۔ میرا تو مطلق خیال ہی نہ کیجئے، میں خود اس شغل میں تھا۔

نواب :۔ واللہ پھر چھوڑ کیوں دیا۔ اے صاحب یہ تو اکسیر ہے اب آپ کو سکھانا تو حکمت بہ لقمان آموختن ہے مگر جس شئے میں اس قدر فوائد ہوں کہ یرقان کی مزیل اور نزلے کی دافع اور قلب کی مسکن ہو اس کا ترک کرنا کیا معنے۔

مصاحب :۔ خداوند غلام کے ناناجان حکیم مرزا محمد صاحب مبرور کے بیٹے تھے۔ منجھلے بیٹے۔ ان کا قول تھا کہ بھائی جان۔

رفیق :۔ ایک ذرا ٹھہرے ہوئے استاد۔ آپ کے والد کس کے بیٹے تھے۔

مصاحب :۔ اجی دل لگی رہنے دو صاحب۔ جب دیکھو دل لگی جب دیکھو مذاق ہر گھڑی کی چھیڑ خانی اچھی نہیں تو حضور بس ان کا قول تھا کہ بیٹا اس کو کبھی نہ چھوڑنا۔ مگر دوا کے طور پر۔ بس ذرا سی نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا بھئی ع

جب ملے دو دل مُخل پھر کون ہے
بیٹھ جاؤ خود حیا اُٹھ جائے گی

مصاحبوں نے آوازہ سُبحان اللہ بلند کیا۔ اے حضور سُبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ اعجاز۔ اعجاز۔ پیر و مرشد۔ واللہ اعجاز کیا شعر پڑھ دیا ہے۔ واہ رے پڑھنے۔ ع

جب ہوئے دو دل تو پھر کون ہے
بیٹھو صاحب آپ ہی اُٹھ جائے گی

راوی :۔ اہو، ہو، ہو۔ واہ رے پڑھنے۔ واہ رے پڑھنے۔ واہ ری اصلاح۔ واہ رے شعر کی مٹی خراب کرنے والے۔ واہ رے گو کھے نوابصاحب نے غیر موزوں شعر تو پڑھا تھا مصاحبوں نے غلبۂ ذکاوت سے اصلاح بھی۔ دیدی۔ ع

جب ہوئے دو دل تو پھر کون ہے

اور لطف یہ کہ غیر موزوں مصرع کو جو سکتا ہوتا تھا وہ ایک لفظ گھٹا بڑھا کر موزوں کر دیا اور دوسرا شوخی سے مملو ہے۔ ع

بیٹھو صاحب آپ ہی اُٹھ جائے گی۔

بیساختہ پن کے صدمے۔ مصرعہ

عالم اسے کہتے ہیں بیساختہ پن نکلے

اتنے میں ایک رفیق اُٹھ کر نیچے گئے اور وہاں سے سامان طرب لائے۔ تین بوتلیں۔ ایک الکشا نمبروں کی۔ دوسری ہوسکی۔ تیسری شیمپین۔ دس ٹمبلر بارہ گلاس۔ ایک درجن سوڈا کی بوتل۔ ایک بوتل پک مے اپ۔ ع

؎ برق چشمک زن ز ظرف کوہسارانمی رسد
ساقیا سامان ساغر کن کہ باراں می رسد

دوسرا :۔ واہ استاد بے پیئے ہی چڑھ گئی لگے جھوم جھوم کے پڑھنے۔

مصاحب :۔ اجی یہاں ہر دم کچے گھڑے کی چڑھی رہتی ہے ع

؎ پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ ایک بوتل و یک ساغر و سبو کیا ملے

راوی :۔ چلتے چلتے مرزا نوشہ غالب سرور کو اصلاح دے ہی دی۔

نواب :۔ فرمایئے حضرت برانڈی یا ترم چارہ بھی، برانڈی لنڈھایئے۔

آزاد :۔ مجھ سے ارشاد ہوا قبلہ۔ مجھے معاف ہی کیجئے حضرت۔

نواب :۔ معاف ایک کوڑی نہ ہوگی اجی ٹن جناب۔

مصاحب :۔ سبحان اللہ شراب کے لئے کوڑی بھی کیا خوب۔

راوی :۔ کیا شراب کے لئے کوڑی! یہ لطیفہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور سمجھے نوابصاحب بھی نہیں مگر مُسکرا دیئے۔ گویا بہت بڑا لطیفہ بولے تھے۔

آزاد :۔ میں صحیح عرض کرتا ہوں۔ میں نے اس سے توبہ کی ہے مجھے بدل آزاد کیجئے۔ میں ہرگز اس کا استعمال نہیں کرسکتا آپ شوق کیجئے۔

نواب صاحب نے کہا آپ کی خوشی۔ مگر ایک بات کہوں تو آپ بُرا مان جائیں گے۔ یہ فرمایئے کہ کسی مقام یا کسی موقع پر جمیکا رم پینے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔

آزاد :۔ (مسکرا کر) وہ موقع ہی اور تھا حضرت۔

مصاحب :۔ اللہ ری یادداشت۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ اللہ اللہ

دوسرا :۔ جو بات ہے بے نظیر اور لاجواب ہے۔ واللہ لاجواب ع

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی
پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی

راوی :۔ ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ کیا خوب تعریف کی ہے۔
تیسرا:۔ خیال تو کیجئے کیا خوب گرفت کی ہے۔
چوتھا :۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ اب جنڈیل صاحب کو شریک ہونا پڑا۔
آزاد :۔ نواب صاحب سچ کہئے گا وہ موقع اور تھا یا نہیں۔
نواب :۔ حضرت ہاں۔ تھا تو جان جوکھم کا موقع۔ مگر ہم اصرار نہ کریں گے وجہ یہ کہ یہ فعل فی نفسہ بد ہے اور خلاف شرع ہے مگر زبان اور صحبت اور لطف اس کو کیا کریں۔ اب یہ کیا ضرور ہے کہ ہم ڈوبے تو اپنے ساتھ سب کو لے ڈوبیں کسی مسلمان کو ہم گمراہ کیوں کریں۔ خود داخل معصیت ہوں اور اس کو اپنے ساتھ عذاب میں گرفتار کریں بھلا یہ کون سی مصلحت کی بات ہے ہم تو آزاد پاشا کی تندرستی کا جام پیتے ہیں۔
اتنے میں خدمت گار سلیقہ شعار نے ٹمبلر میں برانڈی لنڈھائی اور سوڈا کی بوتل دن سے کھول کر ملائی اور ٹیرز کے چند قطرے ملا کر حضور کو دیئے نواب صاحب نے چسکی لگائی اور شعر پڑھا۔ ع

شراب ایک ہے لندن کی ہو کہ کوثر کی
اک اپنے واسطے زاہد حلال کرتے ہیں

رُفقا :۔ اور کتنا سچا اور صحیح کلام ہے۔
آزاد :۔ میں اس بات سے خوش ہوا کہ آپ سوڈا ملا کے پیتے ہیں۔ جب پیئے بادہ مزوج۔ مگر گنواروں اور ناواقف لوگ خالی شراب کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ بالکل زہر ہلاہل ہے۔
مصاحب :۔ اس صحبت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو شے ہے اصول سے اور ممکن کیسا کوئی بے قاعدہ ہو جائے۔ کیا مجال سب اپنے اپنے درجے اور قاعدے کے مطابق۔
مصاحبوں نے بھی علی قدر مراتب رم اور لڈ ہوسکی برانڈی پانی مگر دو کے سوا اور سب نے سادے پانی کے ساتھ پی اور پی پی کر بلبل ہزار داستان کی طرح چہکنے لگے۔
ایک :۔ واللہ اب ہوش آیا۔ جان میں جان آئی۔
دوسرا:۔ کیسی کچھ اس وقت اگر نہ ملے تو غضب ہی ہو جائے۔
تیسرا: مقوی دماغ، مفرح قلب۔ مسکن دافع تشنگی اور لطف یہ کہ پی کر اگر شاعر ہے تو شعر اچھے نکلیں گے۔ نثار ہے تو مقفع مسجع لکھے گا۔ عالم ہے تو علمیت کو زور ہوگا۔

چوتھا :۔ مگر اعتدال کے ساتھ رہے تو معتدل ہے۔ ورنہ قلب کو حرارت ہو۔ دماغ کو پریشان کرے۔ جان عذاب میں ہو جائے اور صبح کو جب اٹھے تب دردِ سر دردِ کمر دردِ اعضا۔ پریشان جلال۔ پریشان روزگار۔ ع

پراگندہ روزی پراگندہ دل

خانصاحب :۔ خداوند ایک بار نیپال کی ترائی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ چودہ آدمی ہمراہ تھے۔ وہاں جنگل میں شہد کثرت سے ہے۔ اور شہد کی مکھیوں کی عجب خاصیت کہ چاہے جس عضو بدن پر بیٹھیں ممکن نہیں کہ درد نہ ہونے لگے۔ وہاں کے باشندوں سے پوچھا کیوں بھئی اس کا کچھ علاج بھی ہے کہا اگر ایک بار درد شروع ہوا تو پھر تمام سال رہے گا۔ گیارہ مہینے اچھے اور ایک مہینے علیل۔ جس مہینے میں درد شروع ہوا اُس مہینے میں ضرور عود کرے گا۔ لیکن اگر پہلے سے اس کا علاج کرے تو بڑا فائدہ ہو۔ پوچھا وہ کیا۔ کہا شراب کے ساتھ فلاں پتی کا استعمال کرے۔ ان چودہ آدمیوں میں دس ہندو تھے اور چار مسلمان۔ دس ہندوؤں میں آٹھ برہمن۔ وہ تو شراب چھو نہیں سکتے۔ مگر دو نے کہا کہ ہم کو شراب پینا کون ہے عمر بھر کا درد اور کرب گوں نہیں اور باقی دو کایستھ تھے اُن کو چارہ ملا۔ اور چار مسلمانوں میں ایک ہندہ۔ باقی تین اور۔ وہ تینوں تو گالیاں دینے لگے۔ اے توبہ کیا مجال اگر چھینٹ پڑ جائے تو بدن کٹوا ڈالیں۔ مگر ہندے نے اُڑائی۔ حضور یقین کیجئے ہم پانچوں مزے میں رہے اور وہ سب کے سب اب تک جھیکتے ہیں۔

نواب :۔ واللہ بھئی واقعی اس کے فائدے بڑے بڑے ہیں مگر ہے کیا کہ حرام ہے اگر حلال ہوتی تو کیا کہنا تھا۔

رند :۔ خداوند اب تو سب حلال ہے۔ کس کا حرام۔ بھلا شراب کو حرام کیوں کیا۔ اس سبب سے کہ اس کے افعال حرام ہیں یہ بذات خود حرام نہیں ہے۔

جب بادۂ تیز نے زور دکھایا تو مصاحبین زورِ طبیعت دکھانے لگے۔

1 ــــ جام مُنھ سے لگا کر نصف پی گئے اور یوں چہکے ع

مے میخورم و مخالفاں از چپ و راست	گویند مخور بادہ کہ دین را اعدا ست
چوں دانستم کہ مے عدوے دین ست	باللہ خورم خون عدو را کہ روا ست

2 ــــ واہ بس۔ ہم سے سُنو۔ (چسکی لگا کر) ع

ہر کجا حرفِ شرابِ ارغوانی می رود	از دہانِ خضر آبِ زندگانی می رود

۲ - نواب صاحب سنئے جزیل آزاد صاحب۔ ع

گرمی نہ خوری طعنۂ مزن مستان را | گرتو بہ دہی توبہ دہم نیردان را
تو خوبداں کنی کہ من می نخورم | صد کار کنی کہ مے غلام ست آن را

مصاحبین :- واہ واہ۔ کیا برجستہ فرمایا ہے۔ یہ طبع۔ او حضور ہے۔

نواب :- (اکڑ کر) اجی اب اس سے کیا مطلب۔

مصاحب :- خداوند غلام ایک نہ مانے گا۔ بے شک اور بے شبہ۔ حضور ہی کا کلام ہے۔ کلام الملوک کلیم الملوک۔

راوی :- اہو ہو عربی دانی کا بھی زعم ہے۔

دوسرا :- قابلیت عالم بالا معلوم شد۔ بس حضرت بس۔

آزاد :- کلامُ الملوک ملوک الکلام

مصاحب :- جی جناب اس وقت زبان قابو میں نہیں۔

یارو میری خطا معاف کردیں نشے میں ہوں
شیشے میں مے ہے مے میں نشہ میں نشے میں ہوں

نواب :- نشے کی بات ندارد۔ ہوش کی دوا ہوش کی دوا۔

مصاحب :- (آہستہ آہستہ) ہوش کی دوا ہوش کی دوا

خانصاحب :- خداوند یرقان کی دوا درد سر کی دوا۔ تپ کی دوا۔ ہیضے کی دوا۔ اسہال کی دوا۔ پیچش کی دوا۔ بواسیر کی دوا۔ دمے کی دوا۔ بس انتہا ہے کہ موت کی دوا۔

دیوانجی :- موت کی دوا۔ مردہ دو۔ پی لے۔ مرجا نہیں۔

آزاد :- چڑھی تو سب کو ہے مگر دیوانجی بہت دور چلے گئے ہیں۔

نواب :- آج صحبت میں یہ بے لطفی ہوئی۔ ورنہ اور کبھی نہیں ہوتی ہے۔ خبردار سب کے سب خاموش۔ بس کہدیا ہے۔

دیوانجی :- خامو۔ خا۔ خاموش نواب صاحب کی طرف مخاطب ہوکر۔ اُٹھائی گیرا۔ دور ہو یہاں سے کہتا ہے کہ گالیاں بکو کیا ہم پاجی نہیں ہیں۔

بلبن :- اجی تم پاجی۔ تمہارے باپ پاجی تمہارا دادا پاجی۔

ہندو :- سب پاجی جو یہاں ہے وہ پاجی اور جو نہیں وہ پاجی ـــ اس پر ایک مصاحب

بگڑ کھڑے ہوئے خداوند اس کے کیا معنی جو یہاں ہے وہ پاجی اور جو نہیں ہے وہ پاجی۔ جناب والا بھی یہاں نہیں ہیں۔ ان کو اس پاجی نے پاجی بنایا۔ خون آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔ کیوں بہ پاجی جناب والا کو پاجی کہتا ہے۔

دیوانجی :۔ (نشے میں) لَاحَولَ وَلَا قُوۃ۔ سچ ہے۔ ع

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است

بلکہ مے می شود از صحبت ناداں بدنام

ہم نے بھی تو آخر پی ہے اور جناب جنرل صاحب واللہ انہیں نابکاروں نے مجھے مطعون کیا ورنہ میں بدنام نہ ہوتا۔

آزاد :۔ ہاں پھر صحبت تو اپنے سے اچھے اور لائق کی چاہئے۔

نواب :۔ مجھے ایک عورت نے نصیحت کی تھی جناب۔

آزاد :۔ میں سمجھا نہیں۔ اے صاحب ایک برق دم زن جمیلہ نے ایک روز وہ جھپک دکھائی۔ میں ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ وہ بوٹا سا قد دلجو کہ کیا عرض کروں۔ ع

سرو را با قد دل جوے تو بودے نسبت

گر زگل عارض داز غنچہ دانے مبداشت

جب نواب صاحب نے دیکھا کہ آزاد سے مشہور آدمی کے سامنے محفل اور صحبت کی کرکری ہوتی ہے تو رمضان خان مصاحب کو بلوا کر کہا بھائی دیوانجی اور میں اور اس لالہ بدھو کو یہاں سے کسی حیلہ کسی بہانے سے لے جاؤ اور اوپر نہ آنے دو یہ مہمان بالکل اجنبی ہیں ان کی موجودگی میں محفل کی بدنامی بری بات ہے۔

رمضان خان نے دیوانجی کے کان میں کہا حضرت ذرا ادھر آیئے کچھ کہنا ہے۔

دیوانجی :۔ علم قسم اگر تنک گستاخی ہماری شان میں کر ہیو ہم سے تم سے اُس ہوئی کہ شب ورود ز پاپوش و پیزار کی۔ نواب صاحب سنت ہو سنو۔ ع

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

نمیدانم کہ من رشراب

داروی :۔ چلے بہکے۔ اب ہوش ففرد ہو گئے۔ واہ۔ ع

بہ دختر رز حرامزادی مردار

مینا بازار کی ہے رہنے والی

آزاد :۔ لاحول ولا قوۃ۔ جناب ہم نے انگریزوں اور فرانسیسیوں اور مختلف یوروپین قوموں

کی صحبتیں دیکھی ہیں مگر یہ بات کہیں دیکھنے میں نہیں آئی اس وقت عمدہ عمدہ باتیں ہوتیں شعر شاعری کا چرچا۔ یا پولیٹیکل امور یعنی معاملات ملکی کا ذکر ہوتا۔ لطیفے ہوتے۔ یہ نہیں کہ دیوانجی الگ بک رہے ہیں اور لالہ صاحب الگ پی کے بہک رہے ہیں اور خانصاحب اپنے آپے سے باہر ہیں معاذاللہ۔

اتنے میں ایک مصاحب نے کہا۔ کیوں حضور سات اور دس پچیس اور ساڑھے چودہ اکتالیس اور دو دس ہزار اور پچاس ہزار دو لاکھ ترسٹھ آنے کے ہوئے۔ مگر بات خاص یہ ہے کہ جان جان ہے اور مال مال ہے۔

نواب :۔ کوئی ہے ان سب کو جو بدمست ہو گئے ہیں نکال دو۔ اسی وقت اسی دم نکال دو۔ ہرگز نہ ٹھہرنے دو۔

لالہ :۔ ابھی نکال دو سب کو (نشے میں چور) سب کو اور سب کے پیچھے اس مردود کو (رمضان خان پر ٹیپ لگا کر) رمضان خان پٹھان آدمی ٹیپ پڑتے ہی آگ ہو گئے اور بگڑ کے پیٹے دو چار دھپیں زور زور سے لگا بیٹھا اس پر دو چار ادھر دو چار ادھر سے اٹھے اور لپا ڈگی ہونے لگی۔ آزاد نے نوابصاحب سے کہا خاکسار تو اب رخصت ہوتا ہے۔ نوابصاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور غل مچا کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ سب کو نکال دو۔ حکم پاتے ہی سپاہیوں نے تعمیل کی۔

اتنے میں نواب صاحب آزاد کو لے کر وہاں سے باغ میں آئے اور باہم مکالمہ ہونے لگا۔

نواب :۔ شیخ سعدی کا قول ہمیں تو دل سے پسند آتا ہے۔ ع

خوئے بد در طبیعتِ کہ نشست

نہ دہد خز بوقت مرگ از دست

ایک مہ وش زرین کمر نے وہ نصیحت کی تھی کہ اگر ہم آدمی ہوتے تو تمام عمر آسائش کے ساتھ بسر کرتے مگر ان مصاحبوں سے خدا سمجھے ہمیں پھر گھیر گھار کے پھندے میں پھانس لیا اب دیکھئے کہ گو ہزارہا مرتبہ خواہش ہوئی کہ ان سے کنارہ کش ہوں ان کو موقوف کر دیں۔ مگر ان کے بس میں آ گئے ہیں۔

آزاد :۔ تو جناب نواب۔ ایسے ادنیٰ ادنیٰ نوکروں کا اس قدر منہ چڑھانا ہرگز مصلحت نہیں ہے عقل بھی گواہی نہ دے گی کہ ایسے آدمیوں کو آپ صحبت میں بلائیں اور اس بے تکلفی سے صحبت گرمائیں۔

باید منشیں و باش بیگانہ او در دام افتی اگر خوری دانہ او

تیر از سر راستی کمان را کج دید

بنگر کہ چگونہ جست از خانہ او

نواب :۔ بھائی صاحب یہی باتیں اس عورت نے سمجھائی تھیں۔

آزاد :۔ آخر وہ کون عورت تھی اور آپ سے کیا تعلق تھا۔

نواب :۔ حضرت عرض کیا نہ کہ ایک روز مسافرانہ طور پر ایک باغ میں بیٹھا۔ مجمع یاراں بے تکلف اور احباب بذلہ سنج دوست آشنا اقارب۔ چہل پہل۔ مذاق دل لگی سب چہک رہے تھے اور چہچہے کر رہے تھے ایک نغز گفتار، گل عذار۔ تندرو رفتار کم سن عورت سفید دُلائی اوڑھے چمکتی ہوئی اُدھر سے نکلی گو وضع بالکل سادی تھی اور زروجواہر سے بھی آراستہ نہ تھی مگر اس کی سادگی ہی میں وہ جوبن تھا کہ کچھ نہ پوچھئے۔

شعر

حاجت بناؤ کی تجھے اے نازنین نہیں

زیور ہے سادگی ترے رُخسار کے لئے

اُس کا اس مستانہ چال سے جانا ستم ہو گیا۔ دو چار بگڑے دلوں نے بہ لطائف الحیل اُس کو بلایا۔ وہ بے تکلفی کے ساتھ آن کر بیٹھی تو مجھ سے گفتگو ہونے لگی۔

بلبن :۔ مسند پر پاس آن کر بیٹھو صاحب۔ وہاں کہاں بیٹھ گئیں۔

وہ :۔ (قریب بیٹھ کر) ہمیں اس میں کیا عذر ہے جہاں کہیئے۔

بلبن :۔ آپ کا اسم شریف بی صاحب۔

وہ :۔ حضور میرے نام سے کیا کام۔ مجھے اللہ رکھی کہتے ہیں۔

راوی :۔ یہ نام نواب صاحب کی زبانی سُن کر کان کھڑے ہوئے مگر ابھی کچھ نہ بولے چپ چاپ سُنتے ہی گئے۔

بلبن :۔ اس وقت آپ کے آنے سے بڑی دل بستگی ہوئی ہے۔

وہ :۔ آپ سب صاحبوں کی عنایت۔ آپ رئیس ہیں۔ بس جناب اتنے میں ایک مصاحب نے کہا۔ حضور نواب صاحب غلام ان کو جانتا ہے یہ تو بڑی خالی خاندان ہیں اس پر اُس پر کالۂ آتش نے اس طرح گھور کے دیکھا کہ اُن کے ہوش اُڑ گئے اور میں دھر دھر کے پوچھتا ہوں کہ ان بی صاحب کا جو کچھ حال ہو بیان کرو۔ وہ ایسا رُعب حسن میں آ گیا بولتا ہی نہیں سکتے کا عالم اور مصاحبوں میں دو چار مخبوط الحواس بھی تھے وہ بگڑ بگڑ کے ہماری شکایت کرنے لگے۔ دو بھئی کیا زمانہ ہے۔ یہ زن بازاری مسند پر نواب صاحب کے پاس بیٹھے اور ہم شریف زادے جوتوں پر جگہ پائیں۔ شانِ خدا۔ دو ہم اپنی کس سے کہیں۔ والدِ مرحوم ٹھیکہ دار تھے۔ جس کا چاہا ٹھیا سا سر اُڑا دیا۔ ڈنکا سامنے بجتا تھا، گُرم دھم۔ گُرم دُھم۔ آتی ہی سواری شیرانِ شیر کی۔ انہیں آنکھوں وہ بھی دیکھا کہ دور یہ فراشی سلام ہوتے

جاتے تھے اور انہیں آنکھوں اب یہ بھی دیکھ رہے ہیں۔

اور اب اس وقت اگر بولو تو للکارے بھی جاؤ بچہ جی۔

اجی ہم بولیں ہی کیوں کہ خواہ مخواہ کو للکارے جائیں۔

زمانے کا انقلاب اسی کا نام ہے۔ اگر اکبر بادشاہ کا وقت ہوتا تو رئیسوں کے پاس عالم فاضل شاعر بیٹھے ہوتے۔ اب انگریزی داں آدمیوں اور بنگالی بابوؤں کی صحبت مردم نوشت و خواند ہی کا چرچا ہے، مگر اس طرف اللہ کے فضل سے سناٹا ہے۔ ع

بیکسی ہم تو ادھر ہیں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

الغرض اب سُنئے کہ ایک مصاحب نے جو بی اللہ رکھی کے خلاف مزاج ایک بات کہی تو مجھے سخت رنج ہوا۔ میں نے اس کو نکلوا دیا اور وہ باہر جا کے مجھے گالیاں دینے لگا۔ لوگوں سے پوچھتا ہوں یہ غسل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں خداوند ایک سید کی بیوی نے انتقال کیا ہے۔ کفن کا بندوبست اس سے نہیں ہو سکتا حضور کچھ کفالت کریں ہم نے حکم دیا کہ دس روپیہ دلوا دو۔ ان حضرات نے دس روپیہ ناحق اڑائے اور ہم کو گالیاں کھلوائیں وہ اور زور سے بُرا بھلا کہنے لگا اور ہم سے آن کر کہا خداوندہ تو لاکھوں دُعائیں دیتا چلا گیا مگر گئی اور غریب شریف زادے حضور کا نام سُن کر حاضر ہوئے ہیں ہم تو بنے ہوئے تھے ہی حکم دیا کہ سو روپیہ دلوا دو۔ وہ سو بھی اُن لوگوں نے اُڑا لئے اور ہمیں بیوقوف بنایا۔

آزاد :۔ اللہ اللہ ایسے ایسے نمک حرام خدا ان سے پناہ میں رکھے۔

نواب :۔ سُنتے جائیے جناب اللہ رکھی کو وہ رفیق باہر سے گالیاں دے رہا تھا اور وہ بیچاری کہہ رہی تھی کہ حضور دیکھئے مجھے گالیاں دیتا ہے مگر میری عقل پر ایسے پتھر پڑے کہ مجھے ذرا نہ سوجھی میں نے لاکھ جتن کئے ہزارہا قسمیں دیں کہ اللہ رکھی تم یہاں ہی رہو مگر اُس زن پاکدامن نے انکار ہی کیا اور کہا یہ تو ممکن ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ تمہاری صحبت پاجیوں کے لائق ہے نہ کہ بھلے مانسوں کے۔

جب میں نے اصرار سے پوچھا کہ آخر یہ تو بتاؤ کہ تمہیں اس قدر رنج کاہے کو ہے۔ تو آبدیدہ ہو کر بولیں حضور آپ تو اس وقت نشے میں غین ہیں۔ ہزار باتیں اُس مصاحب نگوڑے نے مجھے سُنائیں اور آپ نے ایک نہ سُنی کہ کیا بک رہا ہے۔ بازاری عورت اور ریسوا اور ستر چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی۔ خدا جانے کیا کیا کہا مگر آپ خاموش بیٹھے رہے اور آنکھیں اشکبار تھیں یہ کہہ کر بے اختیار رونے لگی میں نے صحبت میں تخلیہ کیا اور منہ دُھلوایا اور پھر اصرار سے پوچھا کہ تم اُس جوانی میں اس قدر پریشان حال کیوں ہو تم جیسی خوبصورت عورت کے ہزارہا گاہک ہیں تو رو کے یوں جواب دیا۔ حضور یہ سب قسمت کے

کھیل ہیں۔ ہماری بے حیا زندگی نگوڑی کسی کی نہ ہو یہ سب اپنی کرتوتوں ہوا۔ ماں باپ نے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیا ایک بوڑھے کھپٹ کے ساتھ بیاہ کیا۔ آپ تو چین اُڑا گئے ہمیں بھاڑ میں جھوک گئے بوڑھے میاں شادی کرتے ہی بھاگ کے دوسرے شہر ہو رہے۔ ہم سر شام سے اکیلے روپیٹ کے سو رہتے تھے دن کو بیقراری رات کو اختر شماری اور ہر دم گریہ وزاری۔ ہمارا چودہ برس کا سن۔ اُن کے حلوا کھانے کے دن آج مرے کل دوسرا دن۔ ایک ایک ہڈی بدن کی گن لیجئے۔ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت اُن کی صورت سے مجھے نفرت تھی۔ مگر ایک ہی دفعہ عمر بھر میں موے کو دیکھا تھا۔ بس پھر دیکھا ہو تو آنکھیں پٹم ہو جائیں ایک دفعہ ہم نے خط بھیجا تو اُس کے جواب میں بہت کچھ للّو پتّو تتّو تھمبو، آؤ بھگت، مگر سب زبانی داخلہ بارے انٹا غفیل ہوئے تو ہماری اماں نے بڑا جشن کیا۔ ہم نے کہا اب ہمیں کسی جوان اور بھلے مانس کے ساتھ بیاہ دو۔ وہ تو راضی ہو گئیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ کوئی اسی روپیہ مہینے کا وثیقہ ہے۔ اور ان کا لڑکا بین جانیوں ایک بیس برس کا ہو گا۔ اسکول میں ماسٹر ہے۔ سو روپیہ مہینہ پاتا ہے اور پڑھا لکھا آدمی چال چلن اچھا، خندہ پیشانی۔ نک سک سے درست نشان خوش تقریر مکان کوئی دس بارہ ہزار کا اور اُس لڑکے کا کمرا بھی خوب سجا سجایا تھا آدمی خوش سلیقہ ہے بڑے باتمیز۔ ان کے باپ مولوی آدمی ہیں۔ اور دُور دُور سے اُن کے پاس پڑھنے کے لئے آدمی آتے جاتے ہیں عورتیں سب سلیقہ والیاں اور ملنسار۔ تین چار دفعہ مجھ سے اور اُس سے آنکھ لڑی تھی۔ ایک دفعہ اس نے اپنی مہری بھیجی اور کہلا بھیجا کہ ہم اپنے والد سے کہیں جو تم راضی ہو میں سوچی کہ غضب ہو جائے گا جو کہیں کھل گیا کہ نکاح کے پہلے ہی سے بات چیت تھی اور پیغام آتے جاتے تھے اور مہریوں کی زبانی معاملے بُھگتے تھے تو لوگ طوفان باندھیں گے اس سے میں چپکی ہو رہی مگر اماں سے کسی نے کہہ دیا کہ خبردار لڑکی کو اب نہ بیاہنا بیوہ کا بھلے مانسوں میں نہیں ہوا کرتا۔ کہاروں، جولاہوں، دھنیوں میں ہو تو ہو۔ تمہیں شرم نہ آئے گی کہ ایک کے ساتھ پہلے بیاہا۔ اب دوسرے سے نکاح ہو۔ واہ خاندان میں بٹا لگاؤ گی جس میں دل پشت تک کا نام بدنام ہو۔ کہیں ایسا بھی ہوا بھلا آج تک کسی بھلے مانس کی بیوہ کی شادی ہوتی ہے خدا ئی ہم میں بس وہ چٹ سے بدل گئیں اب کوئی سوچو کہ ہم تو دن رات جلیں بُھکیں مریں کھپیں۔ جوانی مفت میں برباد ہو جائے اور وہ کہیں کہ بھل منسی کا خیال ہے یا نہیں واہ اچھی بھل منسی ہے ۔۔۔ پٹکی پڑے ایسی بھل منسی نگوڑی ہم درگزر ے۔ اے بس میں تو ایک رات کو گھر سے نکل بھاگی لیکن اُس دن سے آج تک جیسی پاک پیدا ہوئی تھی ویسی ہی ہوں آج اُس آدمی نے جو ہزاروں باتیں سُنائیں اور کہا کہ یہ ٹکے کی عورت ہے یہ بیسوا ہے یہ ایسی اور ایسی اور کیا جانے کیا کیا کہا۔ تو میرا دل بھر آیا۔

عمر بھر میں تو ایک اس مولوی صاحب کے لڑکے سے آنکھ لڑائی۔ الغرض پڑی پاکباز ہے۔

اللہ رکھی کا نام سن کر آزاد نے بے پروائی سے باتیں کرنا شروع کیں، گویا کچھ جانتے ہی نہ تھے مگر دل میں سوچے کہ واہ ری اللہ رکھی جہاں جاؤ اس نام سے لوگ واقف ہیں۔ کچھ دیر بعد پوچھا اللہ رکھی کی شکل صورت کا حال تو بتایئے۔ فرمایا جسم فربہ گدازگدرایا ہوا رنگ ملیح سبز، آنکھیں بھوری۔ بال میمون کے سے۔ قد چھوٹا۔ کمر پتلی۔

آزاد سمجھ گئے کہ سنی سنائی کہتے ہیں، مگر جو باتیں انہوں نے بیان کیں کہ ضعیف آدمی کے شادی ہوئی تھی اور محلے کے ایک خوبرو پر جان جاتی تھی۔ یہ سب پتے پتے کی باتیں تھیں۔ اتنے میں نواب صاحب نے کسی قدر اور شغل کیا تو اسی چبوترے پر لیٹ گئے ایک مصاحب نے آن کر میاں آزاد کو سلام کیا اور کہا خدا سلامت رکھے حضور نے ہم کو نہیں پہچانا مگر ہم نے پہچان لیا۔ آزاد نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور ایک روش میں چبوترے سے علیحدہ لے گئے۔

آزاد :۔ مجھے نہیں یاد ہے کہ آپ سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔

مصاحب :۔ کسی ہاتھی پر سوار ہو کر کہیں گئے تھے جہاں راستے میں صف شکن کی قبر ملی تھی۔ بندہ بھی ہاتھی پر سوار تھا۔ یاد کیجیے۔

آزاد :۔ (کچھ سمجھ میں نہ آیا) حضرت کوئی اور پتہ دیجیے۔

مصاحب :۔ خیر اس کو جانے ہی دیجیے۔ یہ فرمایئے کہ ثریا بیگم سے ملنے کا عزم ہے یا نہیں۔ اگر عزم ہے تو ہم سے پوچھیے۔ یہ بالکل جھوٹے ہیں کہ مجھ سے یوں ملاقات ہوئی ہے۔ یہ فقرے انہوں نے جو بیان کیے سب لغو۔ وہ اور ایک نواب ہیں جب کے ہاں صف شکن بٹیر تھا۔ ان سے اور اللہ رکھی سے بات چیت ہوئی تھی اور ایک سال تک ان کی صحبت میں ایسا دلیسا رفیق جانے بھی نہیں پاتا تھا۔ مگر پھر وہی رنگ رلیاں ـــ

آزاد :۔ اللہ رکھی اب ہیں کہاں پہلے تو ہمیں یہ بتایئے۔

مصاحب :۔ اب تو نواب سنجر سطوت صاحب کی بیوی ہیں۔

آزاد :۔ بھلا پھر ملاقات کیونکر ہو، رنگ ڈھنگ بتایئے۔

مصاحب :۔ حضور وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ مجال کیا کوئی چوں تو کرے۔ اے توبہ کسی کی طاقت ہی نہیں مگر ایسی پاک دل عورت بھی کم دیکھی ہوگی اور ہماری سرکار تو جھوٹوں کے بادشاہ ایک دن دو بجے رات کو مجھے جگایا خود بدولت اس سامنے والی چھت پر بیٹھے اور بندہ پھاٹک کے

پاس چارپائی پر دراز تھا۔ اُٹھو اٹھو یا الٰہی۔ خیر یا الٰہی۔ خیر ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ایک غزل لکھی ہے ضرور سنو اٹھے کہا فرمایئے خداوند تو آپ نے غزل پڑھی:

جسم وہ حیراں جہاں آئینہ ادراک ہے	چاندنی اس ماہ کی اتری ہوئی پوشاک ہے
دست کوتہ عشق کا ہو کس قدر بیباک ہے	دامن پاک مہ کنعاں کو دیکھو چاک ہے
چہرہ گلگوں ہے گلشن قامت موزوں ہے سرو	گوش نازک ہیں گل تر غنچہ گل ناک ہے
جلوہ گر خال سیہ ہے روئے آتشناک پر	چشمۂ خورشید ہیں زنگی مگر تیراک ہے
دادے دل میں سمجھ کر پانوں رکھنا اے جنون	ہر بگولے میں نمایاں گردش افلاک ہے
جی ابھی نکلا نہ تھا تن سے کہ وہ راہی ہوا	توسن جاناں سمند عمر سے چالاک ہے
رو دیا بہزاد بھی تصویر میری کھینچ کر	صورت مژگان عاشق مو قلم نمناک ہے

اس جہان تنگ کو کہیئے نہ کیوں وحشت سرا
جس سحر کو دیکھئے اس کا گریباں چاک ہے

چُپ۔ اب کہوں تو کیا کہوں اور میں یہ غزل رسالدار فقیر محمد خاں گویا کی زبانی سُن چکا تھا ع

مے کشی میں مجھ سے آزردہ ہو وہ مست ناز
دور ساغر مجھ کو گویا گردش افلاک ہے

آزاد پاشا کو شک کی جگہ یقین ہو گیا کہ اس شخص کے ذریعے سے شاہد مراد کے ہم آغوش ہوں گے اور جب اس نے بیان کیا کہ فلاں مقام کے تھانے دار نے مجھ سے اُس جوگن کا حال بیا کیا تھا کہ با وصف خوشامد و اصرار اور با وجود حکومت وہ اُن کی راہ پر نہ آئی اور ایک بار کنوئیں میں ایک پاؤں لٹکا کر اس نے کہا کہ اگر ذرا قریب آئے تو میں کود ہی پڑوں گی تو آزاد کا دل بھر آیا اور آہ سرد کھینچ کر کہا۔

آزاد:۔ حضرت ہم اسے اس قدر پاکدامن نہیں سمجھتے تھے۔

مصاحب:۔ حضور کو میں سرا میں دیکھ چکا ہوں۔ یاد ہے جب اونٹ بھرٹ کا تھا اور سو رہے تھے اور جب چانڈ و باز کی نسبت آپ میں اور اللہ رکھی میں کچھ کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔

آزاد:۔ اخاہ آپ تو واقف کار معلوم ہوتے ہیں۔

مصاحب:۔ مجھ سے اکثر لوگ آپ کا ذکر کیا کرتے تھے اور میں آپ کی تعریفیں سُن سن کے دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا کہ بحمد اللہ ہمارے کرم فرما ایسے ہوئے۔ ع

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند

اسی طرح حضور کا نام بھی روشن رہے گا۔

آزاد :۔ پھر جوگن ہونے کے بعد بھی کبھی دیکھا تھا۔

مصاحب :۔ نہیں خداوند۔ مگر ایک چوڑی والی جو نواب سنجر سطوت کے ہاں آتی جاتی ہے اُس کا بیان ہے کہ ایسی حسین سیر چشم خوش سلیقہ اور پارسا عورت دیکھنے ہی میں نہیں آئی سارے شہر میں شہرہ ہے۔

آزاد :۔ میں بھی دُور دور سے سُنتا آیا ہوں۔

مصاحب :۔ اور جوگن بننے کی باتیں ایک جوہری بچہ سے سُنوا دوں گا۔

آزاد :۔ کیا وہ اُس زمانے میں وہاں آتے جاتے تھے۔

مصاحب :۔ جی ہاں حضور انہوں نے بھی بہت پاپڑ بیلے مگر بے سود۔ محض بے کار۔ اس کو کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ آزاد اور مصاحب میں وعدہ ہوا کہ کل کُل امور طے ہو جائیں اور کسی نہ کسی ذریعے سے ثریا بیگم کے پاس پیغام بھیجیں۔ آزاد رُخصت ہوئے ہوٹل میں گئے۔ تو دیکھا کہ مجسم وحشت مصدر حماقت خواجہ بدیع الزماں علیہ الرحمۃ والغفران ایک کرسی پر بڑے ڈھرّے سے متمکن ہیں اور وہ گپّیں اُڑا رہے ہیں کہ اللہ اللہ دونوں پریاں بناؤ چناؤ کرکے بیٹھی ہیں کھلکھلاتی جاتی ہیں اور حضرت بدیعا جھوٹ کے پل باندھ رہے ہیں آزاد آڑ میں کھڑے ہو کر ساری کیفیت سُن رہے تھے تقریر سے معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب اُسی وقت نازل ہوئے تھے۔

کلیرسا :۔ تم اپنی بیوی سے ملے بڑی خوش ہوئی ہوں گی۔

خوجی :۔ جی ہاں۔ محلے میں پہنچتے ہی مارے خوشی کے لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ لونڈوں نے ڈھیلے مارے غل مچا کہ آئے بھی آئے۔ اب کوئی گلے ملتا ہے۔ کوئی محبت کے مارے اُٹھا اُٹھا کے دے دے مارتا ہے۔ کوئی چمٹ جاتا ہے اور ہر فرد بشر مداح ہے کہ واہ خواجہ بدیع صاحب کیا کہنا ہے واللہ روم میں وہ نام کیا کہ جھنڈے گاڑ دیئے۔ روسیوں سے خوب خوب لڑے گھر میں جو خبر ہوئی تو بی صاحب جامے کے باہر۔ لونڈی پر لونڈی آتی ہے میاں سلام۔ میاں بندگی حضور اب کب تک ترسائے گا۔ چلئے بیگم صاحب بڑی دیر سے منتظر ہیں۔ چلتا ہوں صاحب چلتا ہوں۔ کیونکر چلوں جب یہ اتنے بھُوت چھوڑیں بھی۔ اب کوئی کہتا ہے ہمارے گھر چلئے آپ کے تشریف لے چلنے سے ہمارا اعزاز ہے۔ کوئی کہتا ہے چل کر غریب خانے پر ایک چلم تمباکو پی لیجئے بس پھر چلے جایئے گا۔ ایک اِدھر گھسیٹتا ہے۔ ایک اُدھر۔ اور یہاں جان عذاب میں ہے۔

میڈنڈا:۔ گھر کا حال بیان کرو وہاں کیا باتیں ہوئیں۔

خو:۔ دہلیز تک بیوی ننگے پاؤں اس طرح دوڑی آئیں کہ لپٹ گئیں۔

میڈنڈا:۔ پاؤں ننگے۔ کیا تم لوگوں میں جوتا نہیں پہنتے۔

خو:۔ ہائے ہائے اجی پہنتے کیوں نہیں۔ جوتا تو ہاتھ میں تھا۔

میڈنڈا:۔ ہاتھ سے اور جوتے سے کیا واسطہ۔ پاؤں میں جوتا پہنا جاتا ہے۔ آپ کی بیوی ہاتھوں میں پہنتی ہیں۔

خو:۔ آپ اس تہرک کو سمجھی ہی نہیں۔ ہونہہ۔ آپ روس اور کوہ قاف کی رہنے والی ہیں یہ باتیں کیا جانیں۔ یہ عین ناز ہے۔ ع

تم نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

میڈنڈا:۔ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ تو آخر کچھ کہو گے بھی۔

خو:۔ اجی صاحب پاؤں سے جوتیاں نکال کر ہاتھ میں رکھ لیں کہ میاں دہلیز پر قدم رکھیں اور دل لگی دل لگی میں ہم کھوپڑی سہلا دیں۔

میڈنڈا:۔ کیا یہ بھی کوئی رسم ہے کہ بیوی جوتیاں لگائے۔

خو:۔ یہ سب ناز و ادا این جانب نے سکھائی تھی۔ میں ادھر ہم گھر میں گھسے اُدھر انہوں نے پاپوش کاری کی۔ اب ہم چھپیں تو کہاں چھپیں۔ اتنا بڑا قد کوئی بونا یا متوسط قد کا آدمی ہو، یا پستہ قامت ہو تو ادھر ادھر چھپ رہے۔ ہم چھپیں تو کہاں چھپیں کوئی جگہ ہی نہیں۔

کلیرسا:۔ افوہ۔ اور سچ بھی ہے قد کیا تاڑ کا تاڑ ہے۔

میڈنڈا:۔ کیا تمہاری بیوی بھی تمہاری ہی سی دراز قد ہیں۔

خو:۔ اس کے سراپا کا حال نہ پوچھئے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب سر گول اور کنپٹی چوڑی۔

راوی:۔ جو مغزی ہے کیا، مگر کنپٹی کی تعریف خوجی ہی کا حصہ ہے۔

خو:۔ اور آنکھیں ہاتھی کی سی ذرا ذرا سی۔ برائے نام۔

راوی:۔ یہ عین حسن کی علامت ہے چشم بد دور۔ خدا عین الکمال کے اثر سے بچائے۔ بھلا دیکھتی ہیں یا نہیں آپ کی تو آنکھ کا تارا ہے۔

خو:۔ اور بال ملائم جیسے حلوا دود اور سفید جیسے بگلے کا پر۔

میڈنڈا:۔ اے ہے یہ اپنی والدہ کی تعریف کر رہے ہو کیا۔

خو :- خیر آپ خاتون ہیں۔ جو چاہیں کہہ لیں، مگر دوسرا کہے کیا مجال۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ کبھی ایسا ہو نہیں سکتا۔ اور آپ تو مالک ہیں چاہے ذبح کر ڈالیے :

عاشقاں کشتگان معشوق اند

بر نیاید ز کشتگان آواز

اِدھر بال میں موتی پروئے ہوئے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ موتیوں کی لڑی ہے اور ناک اور کان سُرخ۔ رُخسار کندن کے رنگ دمکتے ہوئے۔ رُوئے او گل او قند بلکہ شکر قند ع

ے رُوئے تو گل و لب تو قند ست

گل قند علاج دردمند ست

مجھ سے کہا اتنے عرصے کے بعد آئے کیا لائے۔ میں نے کہا نام نیک۔ تمغہ مجیدی تمغہ دکھایا تو کھل گئیں کہا ہمارے پاس آج کل بانٹ نہ تھے ترکاری لینے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ اب اس سے ترکاری تولا کریں گے۔

مَیڈا :- (ہنس کر) کیا پتھر کا تمغہ ہے۔ کیا خوب قدر کی ہے واہ۔

کلیریسا :- (قہقہ لگا کر) یہ نئی بات سُنی۔ اور تمغہ مجیدی تم کو کب ملا۔

خو :- واہ۔ واہ کہیں ایسا کہنا بھی نہیں۔ اور سُنئے گا باقی رہا یہ امر کہ۔ انہوں نے تمغے کی یہ قدر کی سُنو صاحب بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں کی جو باتیں ہیں وہ ہم نے اپنی زوجہ کو نہیں سکھائیں ہم نے تو اپنے مذاق کے موافق ان کو باتیں سکھائیں۔ تو وہ اب ایسی بھولی ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ اور یہاں کی عورتیں ع

ے ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور

کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

میں نے جس وقت اپنی بہادریوں کا حال بیان کیا فوراً میری پیٹھ ٹھوکی اور کہا شاباش برخوردار۔ ع

ے عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت ست

راوی :- ان کو یہ کہنے کا منصب ہی تھا۔

اتنے میں آزاد پاشا آگے بڑھے، اور کہا آداب عرض ہے۔

خو :- ہیو آزاد۔ ہیو ڈی یو ڈو دوسر۔

آزاد :- اُخاہ آج تو خواجہ صاحب امیرانہ پوشاک پہنے ہوئے ہیں۔

خو :- بھائی جان وہ رنگ جا کہ باید شاید۔ اب خوجی ہی خوجی نظر آتے ہیں اور سب تو صاحب کی صورت دیکھ کے نعلین جھانکنے لگتے ہیں اور اینجانب چاق۔ گئے اور ہاتھ ملایا اور گفتگو کرنے لگے۔

آزاد :- بھلا فرانسیسی بھی بولتے ہو۔

خو :- اس وقت ان دونوں پریوں سے چہل کر رہے تھے۔

آزاد :- بھائی ایک کام کے لئے یہاں ٹھہر گئے ہیں۔

خو :- جو حکم ہو بسر و چشم بجالاؤں :

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں و کار آساں کن

آزاد :- اللہ رکھی نامی ایک عورت نے جن کا اصلی نام ثریا بیگم ہے۔ کئی سال تک میرے صدمۂ ہجر میں جوگن پنے میں زندگی بسر کی۔ اور اب برسوں کے انتظار کے بعد ایک نواب کے ساتھ کہ وجیہ و خوبرو ہیں شادی کر لی۔ اب صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ ایک بار اس صنم شوخ سے مل لوں۔ بس۔

خو :- ہم سے سنو۔ اور ہم یہاں آئے کیا کرتے ہیں۔ اُن کی ساری داستان ہم سُن چکے کہ سرا میں رہتی تھی اور وہاں سے یہاں آئے۔ اور خیر بات کو اب کون بڑھائے۔ ثریا بیگم اب نواب سنجر سطوت کے محل میں ہیں۔ ان کی تعریف شہر بھر میں ہوتی ہے۔ ایک ذریعہ ان سے ملنے کا تھا۔ وہ بھی مسدود ہو گیا اگر نواب صاحب سے کہئے تو معاذ اللہ ستم ہو جائے مگر خیر رفتہ رفتہ سمجھا جائے گا۔

آزاد :- ایک شخص نے وعدہ کیا ہے کہ چوڑی والی کے ذریعے سے پیغام بھیجیں گے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

خو :- شاباش! واللہ بس یہی طریقے ہیں۔

یہ باتیں ہوتی تھیں کہ مصاحب ان کو ڈھونڈھتے ہوئے آئے مس کلیرسا اور میڈا دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور مصاحب مع چوڑی والی کے آئے۔

مصاحب :- لے حضور یہ حاضر ہیں جو کہنا سننا ہو کہہ سُن لیجئے۔ شکل و صورت تو اچھی ہے۔ شاید سیرت بھی اچھی ہو۔

چوڑی والی :- (پان کی پیک پھینک کر) ہماری شکل و صورت سے آپ کو کیا واسطہ اس کی فکر ہمارے میاں کو ہوگی۔

آزاد :- واللہ ان کے ذریعے سے مشکل آسان ہو جائے گی۔

خو :۔ ہاں آدمی لسّان ہیں اور تقریر پُر شوخ۔

چوڑی والی :۔ اے ہے۔ یہ اس بونے خوجی کو یہاں کون لایا اُس نے تو چھین کے ساتھ ٹال رکھی تھی۔ اس لکڑہارے کا یہاں کیا کام ہے۔

آزاد :۔ این! واہ ہے۔ یہ لکڑہارے ہیں۔

چوڑی والی :۔ لکڑہارے کے سر پر کیا دو سینگ ہوتے ہیں، کچھ اور لکڑہارے کیسے ہوتے ہیں جس نے تو جوتا بیچا وہ موچی ہے جس نے لکڑی بیچی وہ لکڑہارا ہوگیا، یہ یہاں شریف بنتے ہوں گے۔

خو :۔ خوبصورت آدمی چاہے گالیاں دے لے ہم سپاہی لوگ کہیں برُا مانا کرتے ہیں۔ کیا مجال ان شیریں لبوں کے صدقے :

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ وہ سب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ :

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

آزاد :۔ خیر صاحب یہ باتیں تو ہوا ہی کریں گی۔ اب یہ بتاؤ کہ ہمارے بھی کام آؤ گی۔ اگر کوئی نکلے تو کہیں ورنہ بیکار ہے۔

چوڑی والی :۔ (گلوری چبا کر) یا الٰہی ہم تو سمجھے تھے کہ یا خدا کیا کہیں گے۔ کہیں میاں تو رتجگے نہیں کہ گھڑا ڈالنے کی فکر کی ہو۔ میاں سنو بات یہ ہے کہ آپ کا تو وہاں گزر نہیں ہو سکتا۔ مگر ہاں جو بات کہئے میں اُن کے کان تک بات پہنچا دوں گی۔

آزاد :۔ بس تم اس قدر کہہ دینا کہ آزاد نامی کوئی آئے ہیں۔ انہوں نے سلام کہا ہے اور کچھ نہ کہا اس کا جو جواب دیں اس سے ہم کو مطلع کیجئے۔ مگر جلد صبح شام۔

چوڑی والی :۔ آزاد آپ کا نام ہے یا کسی اور کا نام ہے۔

آزاد :۔ ہاں ہاں کسی اور کے نام اور پیغام سے مجھے کیا واسطہ۔

چوڑی والی :۔ کیا کبھی کی ملاقات ہے کیا۔ واسطے خدا کے آپ ان کو بدنام نہ کیجئے گا۔ وہ یہاں بڑی نیک نام ہیں۔

آزاد :۔ مجھ سے اُن سے ملاقات ہے مگر پاک تم کو اُن کی خوبو سے خود ہی معلوم ہو گیا ہو گا، کہ وہ

بڑی نیک طبیعت اور دل کی پاک وصاف ہیں۔

چوڑی :۔ اے ہم خوب جانتے ہیں حضور، مگر نواب جان دیتے ہیں۔ ذرا خدانخواستہ پاؤں میں کانٹا چبھا اور گھبرا اُٹھے۔

آزاد :۔ صورت ہی ایسی پائی ہے۔ ایک نواب صاحب پر کیا فرض ہے جو دیکھے گا ہزار جان سے عاشق ہو جائے گا۔ سراپا سانچے کا ڈھلا ہے، جو عضو بدن ہے چومنے کے قابل ہے، مگر سب سے زیادہ اُس کی پاکدامنی دل پر اثر کرتی ہے۔

چوڑی :۔ والی کو آزاد نے اپنی تصویر دی اور وہ رخصت ہو کر چوڑی کے ٹوکرے میں تصویر رکھ کر بخت راست نواب سنجر سطوت بہادر کے دولت کدہ کو پہنچی محل سرا میں گئی معلوم ہوا کہ نواب ثریا بیگم کوٹھے کے کمرے سے بسر دریا کر رہی ہیں۔

چوڑی :۔ حضور بندگی عرض کرتی ہوں۔

ثریا بیگم :۔ کہو کوئی عمدہ شے لائی ہو۔ یا خالی خولی آئی ہو۔

چوڑی :۔ وہ شے لائی ہوں جسے دیکھ کے آپ غش غش کرنے لگیں۔

ثریا :۔ وہ کون شے ہے ذری دیکھیں تو۔

چوڑی :۔ جی حضور انعام بھرپور لوں گی آج۔

ثریا :۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیا جانے کون شے ہے۔

چوڑی :۔ ذری یوں تکلیف کیجئے اور تخلیہ کر دیجئے۔

مغلانی :۔ کچھ خیر ہے۔ کیا کوئی ہاتھی گھوڑا بغل میں دبا لائی ہو جو اہرات کی پوڑیا لے آئی ہو کہ کسی کے سامنے نہ دو گی کچھ معلوم تو ہو۔ اے واہ۔

چوڑی :۔ سرکار اتنا کہنا مانیں ان سب کو ذری ہٹا دیں۔ آنکھوں سے پیاری کوئی شے نہیں ہے ان آنکھوں ہی کی قسمیں کھا کے کہتی ہوں کہ سب کے سامنے دکھانے کی نہیں ہے۔

ثریا :۔ اچھا بی مغلانی ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ مہرو ذرا ہٹ جاؤ۔

چوڑی :۔ سرکار ذری اس چوڑی کو ملاحظہ کریں۔ تصویر دے کر۔

ثریا :۔ تصویر لے کر۔ کیا۔ چونک کے۔ سچ بتانا کہاں پائی۔

چوڑی :۔ پہلے یہ فرمایئے کہ یہ کون صاحب ہیں، اور آپ سے کبھی کی یاد اللہ، کبھی کی جان پہچان بھی ہے یا نہیں۔ خوب غور سے دیکھئے۔

ثریا :۔ بس یہ نہ پوچھو۔ یہ بتاؤ تم نے یہ تصویر کہاں پائی۔
چوڑی :۔ حضور ایک عورت کے پاس تھی۔ وہ صبح شام اس تصویر کو چوم لیا کرتی تھی۔ میں نے جو دیکھی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور حضور میں نے چوری کی۔ مگر حضور کے پسند ہو تو نذر ہے۔ کیا جانے کس پریرو جوان کی تصویر ہے۔

چوڑی والی نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ بیگم صاحبہ جن کی یہ تصویر ہے وہ اگر آج اس شہر میں آ جائیں تو کیسا اگر آپ کے سامنے لے آؤں تو کیا انعام پاؤں۔ ثریا بیگم سمجھ گئی کہ آزاد اس کو ملے ہیں اور جنگ سے واپس آئے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا، جیبن میں اس بارے میں اور کچھ گفتگو نہیں کرنا چاہتی، بجز اس کے اگر وہ صحیح سلامت آئے تو اللہ خوش رکھے اور ان کے دل کی مرادیں بر آئیں۔ لڑکپن میں ہم اور وہ ایک ہی جگہ مہینوں کھیلا کئے ہیں۔ اسی سبب ہم کو ان سے اسی قدر اُلفت ہے۔ جس قدر کسی کو اپنے بھائی سے ہوتی ہے

جیبن :۔ حضور یہ تصویر انہیں نے مجھے دی تھی اور کہا اگر موقع ہو تو ہم بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ ورنہ خیر کیا چارہ ہے۔

ثریا :۔ کہہ دینا کہ آزاد تمہارے لئے دل سے دُعا نکلتی ہے مگر ان باتوں کو جانے دو۔ اب ہم پرائے بس میں ہیں اور گو اب اچھی طرح دن دھاڑے دل کھول کر مل سکتے ہیں مگر بھلے مانس کی بہو بیٹی کو یہ باتیں نہیں لازم ہیں۔ مانا کہ اپنا دل پاک صاف ہونا چاہیئے۔ مگر دُنیا کو تو نہیں معلوم پھر مفت میں بدنام ہونا کون سی عقلمندی ہے۔ اور جو کہیں نواب صاحب کو معلوم ہو گیا تو اُن کا دل کس قدر دُکھے گا۔

جیبن :۔ حضور ایک دفعہ مکھڑا تو دکھا دیجئے۔

ثریا :۔ ارے چُپ چُپ۔ کہیں ایسا کہنا بھی نہ اب۔

جیبن :۔ حضور ان آنکھوں کی قسم ترس رہے ہیں۔

ثریا :۔ چاہے جو ہو۔ میں نے بھی برسوں ریاض کیا ہے مگر جو بات اللہ کو منظور تھی وہ ہوئی اور اسی میں کچھ بہتری ہوگی۔ اب ہم یہ نہ چاہیں گے کہ اپنے میاں کا دل دکھائیں۔ ہے ہے ایسا ہو سکتا ہے۔ بھلا یہ تصویر یہیں چھوڑ جاؤ چاہے میں اسے چھپا کے رکھوں گی۔

جیبن :۔ تو حضور کیا کہہ دوں۔ صاف ٹکا سا جواب۔

ثریا :۔ نہیں تم سمجھا کے کہہ دو کہ تمہارے آنے سے بہت خوشی ہوئی اُس کا حال خدا ہی جانتا ہے مگر یہاں تمہارا آنا معلوم اور میں کہیں جانے سے رہی، اور پھر اگر آنکھ بھر کر دیکھا بھی تو کیا۔ ہاں اگر بازار کی طرف سے نکلیں، تو میں دیکھ لوں گی۔ وہ چاہیں کہ اب مجھے دیکھ سکیں۔ یہ امر محال ہے۔

راوی:۔ یہ وہی اللہ رکھی ہیں جو سرا میں چمکتی ہوئی نکلتی تھیں جو جوگن بن کر کھلم کھلا میدان میں رہیں آج پردے اور حیا کا اس قدر خیال ہے۔ ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس قدر آزادی کے بعد اس قدر حیا و شرم کتنی مشکل بات ہے۔ مگر اس خاتون پر خدا کی اس درجہ مہربانی ہے۔

چوڑی والی نے آزاد سے جا کر ساری داستان بیان کی تو ثریا بیگم کی پاکدامنی پر گھنٹوں عش عش کیا کئے اور جب آخر میں جیین نے یہ مژدہ سنایا ہے کہ شادی کے دن ہم حسن آرا بیگم کے ہاں ضرور جائیں گے تو آزاد پاشا کی باچھیں کھل گئیں۔ چوڑ والی نے کہا گھنٹوں آپ کو دعائیں دیں اور کئی بار کہا کہ گود دیکھنے کو تڑپتی ہوں، مگر فصع کے خلاف کوئی کام کروں یہ امر محال ہے۔

آزاد پاشا کی توصیف بسالت اور حسن آرا کے آتش شوق کی تیزی۔ اب دوشیزۂ نازک ادا اور معشوقہ رنگین قبا حسن آرا بیگم کا ذکر خیر سنئے کہ جب بمبئی کی شوخ و شنگ بیگم یعنی ان کی ہمشیرۂ مہربان نے آزاد فرخ نہاد کے داخل ہندوستان ہونے کا مژدہ تار برقی اور خط کے ذریعے سے سنایا تھا ان کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ شوق دیدار دوچند اشتیاق وصل جاناں دن دونی رات چوگنی ترقی پر تھا:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک

آتش شوق تیز تر گردد

ہمجولیاں آن کر مبارکباد دیتی تھیں۔ بوڑھی مغلانیاں کھلائیاں بلائیں لے کر کہتی تھیں۔ اللہ وہ سبھ گھڑی نیک ساعت جلد دکھائے کہ آزاد پاشا سہرا لٹکائے گھوڑے پر سوار دروازے پر کھڑے ہوں۔ خوشی کے شادیانے بجیں، محفلیں سجیں۔ حسن آرا دل ہی دل میں خوش کہ اللہ نے چاہا تو اسی مہینے میں شاہد آرزو سے ہم آغوش ہوں، پہلے دو ہی تین اخبار ملاحظۂ انور سے گزرے تھے۔ اب اخباروں کی ڈاک بیٹھی ہوئی تھی اور کوئی دن خالی نہیں جاتا تھا کہ آزاد کی نسبت کوئی خبر یا تعریف یا مضمون یا رائے اخبار میں نظر سے نہ گزرے۔ اس رستم ثانی کی بسالت اور شجاعت کا حال پڑھ پڑھ کر جامے میں پھولی نہیں سماتی تھی کہ جو دلی مراد تھی وہ برآئی۔ خدائے پاک نے دعائے سحری و نیم شبی سن لی۔ ایک دن سویرے سے ہمجولیوں کی سواریاں آنا شروع ہوئیں آزاد کی واپسی کا مژدہ سہجت نیز سن کر فرط طرب سے دوڑی آئیں ہنسی دل لگی چہل ہونے لگی۔

نازک ادا:۔ بہن مبارک۔ میں نے آزاد پاشا کی تصویر دیکھی ہے۔

بہار:۔ آزاد پاشا۔ اوہ کون ہیں یہ تو نام ہی نیا سنا۔

نازک:۔ اے ہے۔ پسچ کہنا تم نے سنا ہو یا نہ سنا ہو مگر حسن آرا کی تو ورد زبان ہوگا

کیوں بہن (حسن آرا کی طرف مخاطب ہو کر) اے ہے تو اس قدر شرماتی کیوں ہو۔

مغلانی :۔ بوڑھی، اے حضور دلہن کے منہ سے کہلوایا چاہتی ہیں۔ وہ بیچاری کیا جانیں آزاد پاشا کون ہیں۔ شرمائیں نہ تو کیا کریں۔ شرم کی بات ہی ہے۔

نازک :۔ اے ہے (ہنہنا کر) وہ بیچاری کیا جانیں وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ ایک تم ننھی ہو دوسری وہ ننھی ہیں۔

گیتی :۔ تم اپنے میاں کا حال سب سے بتاتی پھرتی ہو۔ بد۔

نازک :۔ کیوں کیا کچھ چوری ہے۔ میاں کو ہمارے حال۔ کون بتائے، کیا آپ بھی ہمارے میاں کا کچھ حال جانتی ہیں دیکھو گیتی آرا بہن ان باتوں میں ہے تم سے نہ بنے گی۔ کسی کے میاں سے تم کو کیا سروکار ہے بھلا۔

گیتی :۔ (شرما کر) بڑی منہ پھٹ ہو بہن یہ بے حیائی کی باتیں تمہیں کو مبارک رہیں ہنسی مذاق اور شے ہے اور یہ نیچ قوموں کی طرح بیہودہ بکنا اور شے ہے۔

نازک :۔ حسن آرا ذری یہ کاغذ تو دیکھو (تصویر دے کر) نازک ادا بیگم نے ایک بہت بڑا لفافہ حسن آرا کو دیا۔ حسن آرا جو کھولتی ہیں تو آزاد کی تصویر جی میں تو آیا کہ تصویر ہی کو گلے لگائیں، مگر لحاظ مانع ہوا۔ اب تو نہ تصویر پھینکی جاتی ہے اور نہ اچھی طرح محبوب مطلوب کے جمال مبین اور رُخ رنگین پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ مسکرا کر تصویر رکھ دی تو نازک ادا بیگم بولیں۔ دیکھا وہ تو ان کو ہی نہیں چھپتی۔ خوشی ضبط نہ کر سکیں نہ۔ ہنس پڑیں نہ آخر۔ تصویر کو چوم کر اُس شوخ بے حجاب نے کہا۔ کیا شان خدا ہے۔ ایسے ایسے گبھرو جوان پیدا کئے ہیں کہ تصویر دیکھ کر جی چاہتا ہے اسی کاغذ کو گلے سے لگائیے۔ یہ فقرہ سُن کر بعض بیگمات اور پیش خدمتوں کو جو اس وقت وہاں موجود تھیں سخت حیرت ہوئی کہ یا الٰہی یہ کیسی شریف زادی ہے بہو بیٹیوں کی یہ تقریر ہی نہیں سنی کہ نامحرم کی تصویر دیکھ کر بوسہ لے اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہے کہ واہ کیا گبھرو جوان ہے۔ جو خواتین اور خواصین اُن کے مزاج اور خو بو سے واقف تھیں۔ اُن کو اس کلام سے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ نازک ادا کی زبان کسی مقام پر نہیں رکتی۔ مگر دل کی صاف ہیں اور نیت کی درست۔

نازک :۔ اللہ کرے ہمارے میاں بھی ایسے ہی سبزہ آغاز ہو جائیں۔

جہاں آرا :۔ کیا تم کو اپنے میاں پسند نہیں ہیں۔ کبھی تو وہ تعریفیں کرتی ہو کہ یوسف ثانی ہیں۔ لاکھ پچاس ہزار میں ایک اور کبھی اس قدر گھٹا دیتی ہو ابھی اُس روز تعریف کے پل باندھ دیئے تھے۔

نازک :۔ ہائے ہائے تم تو بالکل گنوارن ہی رہیں بس بہن اُن کے خوبصورت ہونے میں کوئی شک بھی ہے مگر حسن آرا کے سامنے اپنے میاں کی تعریف کیوں کریں۔ ان کو دیکھو تو گھنٹوں گھورا کرو۔ ابھی تم نے حسین دیکھے کہاں ہیں۔ ع

تم نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

اتنے میں ایک مہری نے آن کر کہا حضور ایک آدمی بمبئی سے آیا ہے وہ کہتا ہے وہاں جس گلی کوچے میں نکل جاؤ ہر طرف آزاد ہی آزاد کی دھوم ہے۔ اور وہ تو کہتا ہے کہ ولایت میں وہ بادشاہ ہوگئے تھے۔ بڑے مرزا صاحب سے باتیں ہو رہی ہیں اُس کے پاس ایک اخبار میں ان کی تصویر بھی ہے۔ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں اور آدمیوں سے مقابلہ کر رہے ہیں اور خون جسم سے بہہ رہا ہے۔

بہار النساء نے کہا بڑے مرزا صاحب سے جاکے تصویر مانگ لاؤ کہنا ابھی ابھی بھیج دیں گے۔ مہری جاکے تصویر لائی تو ارد گرد ہجوم ہوگیا اور تصویر دیکھی تو عش عش کرنے لگیں اور باہم طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔

نازک :۔ ہاں اس وقت تو پری بنا ہوا ہے۔ حسن آرا خدا گواہ ہے تم بڑی خوش نصیب ہو گھٹنا ٹیک کے تلوار لگا رہا ہے اس مردوے کے دل گردے کو تو دیکھو کچھ ٹھکانا ہے۔ یا اللہ ان کو ذرا جان کا خوف نہیں ہوتا۔

روح افزا :۔ اور چہرے سے جلال برستا ہے۔

بہار :۔ تین تین آدمیوں سے لڑنا اور جان بچانا۔ اف فوہ بڑے سورما کا کام ہے اور ادھر پانی سا کیا ہے۔ آزاد کے ہاتھ میں ہی ہے۔ اور اس سپاہی کے ہاتھ میں بھی کسی شے کا دھواں سا ہے۔

نازک :۔ عقل بڑی کہ بھینس۔ دھواں نہیں یہ خون بہہ رہا ہے۔

بہار :۔ ہاں سچ کہا۔ یہ خون بہتا جاتا ہے اور لڑتے جاتے ہیں۔

مہری :۔ اے حضور اس ورق کو الٹ کر دیکھئے تو کیسی تلوار چل رہی ہے۔ اور کیا گھمسان لڑائی ہو رہی ہے کہ تو بہ ہی بھلی۔ اس تصویر میں آزاد پاشا گھوڑے سے اتر کر تین روسیوں سے تن تنہا مقابلہ کر رہے تھے ایک روسی کو مجروح کر دیا تھا مگر دم میں دم باقی تھا وہ اپنی گھات میں تھے۔ یہ اپنی گھات میں آزاد نے گھٹنا ٹیک کے ایک رُوسی کو پالٹ کا ہاتھ دیا تھا اور وہ اس ضرب شمشیر کو بچا نہ سکا تھا۔ دوسرا ورق اُلٹا۔ تو کیا دیکھتی ہیں صدہا سواروں کی تصویریں ہیں سب کے سب دست بدست لڑ کے کٹ کٹ گئے کچھ مرے پڑے ہیں کچھ سسک رہے ہیں۔ کچھ ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ چند آدمی مجروح ہیں مگر ایسا ایک بھی

نظر نہیں آتا جو صحیح وسالم ہو۔ تصویر دیکھتے دیکھتے ایک مغلانی نے چلّا کر کہا۔ اے ہے سرکار یہ دیکھیے یہ آزاد پاشا پڑے ہوئے ہیں۔ آزاد لڑ بھڑ کے اس قدر مجروح ہوئے تھے کہ جنبش کی طاقت نہ تھی یہ وہ مقام ہے جہاں آزاد پاشا مس کلیرسا کے عاشق زار سے لڑ کر زخمی ہوئے تھے اور یہ وہ جنگ ہے جن میں ہزارہا بندگان خدا روسی اور ترک دونوں تلوار کے زخم سے جاں بحق تسلیم ہوئے تھے اور زخمیوں کے برابر زخمی اور مردوں کے برابر مردے اور لاشوں کے برابر لاشیں پڑی تھیں۔ ترک اور رُوسی دونوں ڈھیر۔ اس جنگ میں ایک آدمی محفوظ نہیں رہا تھا۔ میدانِ جنگ میں آزاد کو اس قدر بیکسی کے ساتھ زمین پر پڑے ہوئے تھے کہہ کر اکثر خاتونوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور حسن آرا کے سامنے سے تصویر ہٹا کر یوں گفتگو کرنے لگیں۔

نازک :- اللہ جانتا ہے دل بھر آیا۔ کیوں بہن اُس وقت اُن کی کیا کیفیت ہوگی۔ قلب ٹھکانے نہ ہوگا اور قلب کیا وہ بیہوش ہیں۔

بہار :- میری آنکھوں سے تو آنسو ٹپک پڑے۔ بڑے ریاضتوں کے بعد حسن آرا نے آزاد کو۔ خیر ہا۔

گیتی :- افوہ۔ یہ رَن کی زمین ایسی ہوتی ہے۔

مغلانی :- بیوی مجھ سے سُنو۔ مجھ پر سب تباہیاں پڑ چکی ہیں نہ اس سن میں کیا نہیں دیکھا۔ کوئی برس چوبیس ایک کا سن ہوگا کہ میں اپنے چچا اور بھائی اور ماں کے ساتھ پنجاب سے آئی تھی۔ میری چھوٹی بہن بھی ساتھ تھی۔ چار پانچ منزل کر کے ایک دن جھٹپٹے وقت سرا میں آن کر ٹکے۔ تب تک ریل ویل تو جاری ہوئی ہی نہ تھی۔ جس رات کو سُنا کہ یہاں لڑائی ہونے والی ہے۔ ہوش اُڑ گئے۔ ہمارے چچا بوڑھے آدمی بھائی بچہ بہن چھوٹی اماجان رونے لگیں کہ یہاں گولی چلے گی تو ہم کیا کریں گے مگر اللہ کو بچانا منظور تھا وہاں کا زمیندار گاؤں والوں کو مکان دوکان چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ بھٹیاری زمیندار کے ایک خالی مکان میں اُٹھ گئی اور ہم سب کو بھی ساتھ لیتی گئی۔ پھر حضور میں کیا عرض کروں میں نے تو یہ باتیں کبھی دیکھی بھی نہ تھیں۔ دونوں طرف گولا چلتا تھا۔ د اور پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ آدمی اس طرح گرتے تھے جیسے ہوا کے جھوکوں سے پت جھاڑ میں روز روز پتیاں گر جاتی ہیں۔

نازک :- بہن میں غور کر کے دیکھ رہی ہوں کہ صف کی صف میں کوئی ایسا نہیں جو صحیح وسالم ہو کیا جائے۔ کتنی جوان جوان عورتیں بیوہ ہو گئی ہوں گی۔ کتنی ماؤں کے لال اس مقام پر مردہ پڑے ہوں گے کتنے آدمیوں کی آرزوئیں خاک میں مل گئی ہوں گی اور سب کے سب تلوار ہی سے مرے ہیں کیوں بی مغلانی۔

مغلانی :- جی ہاں حضور دیکھئے نہ یہ سب تلواریں ہیں یا کچھ اور ہے۔ گھوڑے الگ کھڑے ہیں معلوم ہوتا ہے سوار گھوڑوں سے اُتر اُتر کے لڑے ہیں۔

بہار :- نہیں، نہیں، جب سوار گر گئے تو گھوڑے بھی الگ ہو گئے ادھر یہ گھوڑے بھی تو زخمی پڑے ہوئے ہیں اور یہ دیکھو سوار اور گھوڑا دونوں گرے ہیں۔ مگر آزاد کے پاس کئی زخمی اور بھی ہیں۔

گیتی :- حُسن آرا۔ آزاد اس قابل ہیں کہ اُن پر سے قربان ہو جائیے۔ دیکھو کیسی کیسی مصیبتوں سے بیچارہ دوچار ہوا۔ وہ تو کہو اللہ کو عزت رکھنی تھی انہیں تو اس لڑائی سے بچنا کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔ ایک اس لڑائی پر کیا فرض ہے کیا جانے کہاں کہاں کن کن مصیبتوں میں گرفتار ہوں گے۔

نازک :- حسُن آرا بہن قدم دھو دھو کے پئیں۔

بہار :- جان جوکھم سی جان جوکھم ہے۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ توپ کے مہرے پر چلے گئے تلوار کی آنچ سے ذرا نہ ڈرے۔

روح :- حسن آرا کے دل کا حال اس وقت سوا ہمارے اور کوئی جانتا ہی نہیں۔ بھلا کوئی جانتا ہو تو بتائے۔ میں چتوں سے تاڑ گئی۔

نازک اندام (آہستہ سے) ہم بتائیں ان کی دلی آرزو یہ ہو گی کہ سامنے والی مہتابی پر پلنگ بچھا ہو۔ اُس پر پھول پڑے ہوں، اور عطر کی لپٹیں آتی ہوں اور یہ ہوں اور آزاد ہوں۔

روح :- کیوں حسُن آرا یہ سچ کہتی ہیں۔

حسن :- ان کی باتیں تو ایسی ہی ہوتی ہیں پلنگ ہو اور مسہری ہو پھولوں کی بو باس ہو، اور عطر ہو اور نازک ادا بیگم ہوں (اور مسکرا کر) اب کیا کہوں۔

نازک :- نہیں کہو کہو۔ کہہ ڈالو ہم بُرا نہ مانیں گے۔

روح :- کہے کون بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا کون سی دانائی کی بات ہے۔ کوئی ایک کہے تم سو سُناؤ۔ پھر کیوں کوئی کہنے لگا۔

نازک :- خوش الحانی اور نازک آوازی کے ساتھ گاتی ہیں۔

ثانی ترا کوئی نہیں حسن و جمال میں	سورج بی قبضے میں ہے کرن چاند ڈھال میں
خالِ سیاہ یار جو دیکھیں تو ہوں خجل	ٹھہریں نہ پتلیاں کبھی چشمِ غزال میں
آنکھوں میں چھا رہا ہے کس انسان کا خیال	آتے نہیں فرشتے کبھی اپنے خیال میں
چلنے میں پائے یار سے آتی ہے یہ صدا	نسبت نہیں تدرو کو کچھ چال ڈھال میں

دھڑکا شبِ وصال کا دل سے نہ جائے گا　　ہو جائے گا وصال ہمارا وصال میں

تھا دل میں بوسہ اک لبِ جاناں کا مانگئے　　کانٹے سے پڑ گئے ہیں زبان سوال میں

بہار :- کیا پیارا گلا پایا ہے اور غزل بھی وہ چن چن کے نکالتی ہیں جو سب میں زیادہ چھٹی ہوئی ہو۔ اب آج رات کو نہ جاؤ تو ڈومینو نیکو بلوائیں بھلا حیدری کے مقابل میں گاؤ تو۔

نازک :- اے واہ۔ کل کو کہوگی کہ حیدری کے مقابل میں ناچو۔ ہم تو فقط شوقیہ گاتے ہیں۔ باقی اس سے کچھ یہ مطلب تھوڑا ہی ہے۔ ڈومینوں سے مقابلہ کریں۔

اِدھر اُدھر دو ایک صفحے اُلٹے تو پھر آزاد پاشا موجود۔

نازک :- ایں! یہ تو ہر ورق میں موجود ہیں حسن آرا تمہیں ہماری قسم اس تصویر کو ضرور دیکھنا۔ نہ دیکھے تو ہماری بھتی کھائے۔

حسن :- اے واہ یہ اچھا اصرار ہے۔

نازک :- تو تمہارا حرج ہی کیا ہے۔

بہار :- اب قسمیں دیتی ہیں دیکھ لو اک نظر۔

حسن :- (تصویر دیکھ کر) تو بس اب تو تمہاری خوشی ہوئی۔

بہار :- چلو بس تمہارا کیا حرج ہوا۔ گھوڑے پر سوار ہیں اور چابک وابک ندارد۔ یہ تلوار ہے اور یہ خدا جانے کیا شے ہے بندوق تو نہیں ہے کوئی وہیں کی شے ہے۔

گیتی :- اس وقت اور ہی رُعب ہے معلوم ہوتا ہے، یہ افسر ہیں اور سب اُن کے ماتحت ہیں جب ہی سب کے آگے آگے ان کا تھوڑا ہی ہے۔

مغلانی :- لو اور سُنو۔ اے حضور افسر نہ ہوتے تو اس قدر نام کہاں سے ہوتا اور کسی کا کیوں نہ اسقدر نام ہوا۔ سب میں مشہور ہیں آزاد پاشا۔

نازک :- یہی معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا اب اُڑا اب اُڑا۔

گیتی :- اے کسی سے کہو یہ تو پڑھ کے سُنائے۔ معلوم تو ہو یہ کیا لکھا ہے اس میں لڑائی کا کچھ بیان ضرور ہوگا۔ مگر انگریزی یہاں کون پڑھا ہے۔

حسن :- (آہستہ سے) باجی جان عسکری بھائی سے کہو کسی انگریزی خواں سے پڑھ والیں، اور اس کا ترجمہ اردو میں لکھ لیں بس میں پڑھ کے سب کو سنا دوں گی۔

نازک :- آخر انہوں نے یہ بات پیدا کی نہ۔ اُن کے تو دل سے لگی ہے۔ مہری کو بھیجدو باہر

داروغہ سے کہیئے اس کا ترجمہ کرا لاؤ۔ مگر جلدی سے آجانا۔

مہری اخبار لے کر باہر گئی، داروغہ صاحب کو دے کر حکم سے اطلاع دی۔ داروغہ اُسی وقت ایک انگریزی خواں کے پاس گیا اور ان کو ایک روپیہ دے کر ترجمہ کرا لایا۔ حسن آرا بیگم نے نازک ادا بیگم کو دیا اور انہوں نے یوں پڑھ کر سُنایا:

اس جنگ میں آزاد پاشا اور ایک جوان رُوسی لفٹنٹ سے بڑی سخت تلوار چلی۔ دو بار ایک روسی کا وار خالی گیا اور ایک مرتبہ اُس نے چوٹ ایسی بچائی کہ جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

بہار :۔ وہ رُوسی کہاں ہے۔ تصویر میں نہیں معلوم ہوتا۔

مغلانی :۔ شاید آگے اس کا کچھ حال لکھا ہو۔ ابھی تک تو کچھ نہیں لکھا ہے غور کرنے سے شاید تصویر میں بھی معلوم ہو جائے۔

نازک :۔ سُنتی جاؤ۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس رُوسی کو ایک خاتون رُوس نے بھیجا تھا اور یہ اقرار کر لیا تھا کہ اگر آزاد پاشا کے خون سے ہاتھ رنگین کر کے آئے گا تو فوراً تیرے ساتھ شادی کروں گی۔ یہ لفٹنٹ اس زنِ خوش جمال پر جان دیتا تھا۔ اس قدر اشارہ پاتا تھا کہ فوراً فوج میں بھرتی ہو کے میدان جنگ میں گیا۔

بہار :۔ اوہ۔ تو آزاد کی اور ان کی ایک حالت تھی۔

نازک :۔ نازک معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

مغلانی :۔ جب ہی وہ بھی خوب دل کھول کے لڑا ہے۔

گیتی :۔ اس کے بھی دل سے لگی تھی نہ۔ مگر یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ خوب دل کھول کے لڑا۔ دل تو گواہی دیتا ہے کہ جو شخص اس طرح پر جائے گا اور بیڑہ اُٹھا کے آئے گا وہ جان لڑا دے گا۔

نازک :۔ آگے تو سب لکھا ہے نہ سُنو۔ اور دوسرا لفٹنٹ ترکی جو اُس نوجوان رُوسی کا مقابلہ کرتا تھا وہ بھی بعینہٖ اسی صورت سے آیا تھا کہ ہندوستان کی کسی امیرزادی نے جو حُسن و جمال میں بے نظیر ہے اس سے کہا تھا کہ اگر تم روم کی جنگ میں شریک ہو کر نام پیدا کرو، اور رُوسیوں کو نیچا دکھاؤ تو میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں اور طرّہ یہ کہ ان دونوں کو یہ بات معلوم تھی کہ ہمارا افریق ایک دوشیزہ جادو جمال سے وعدہ کر کے آیا ہے۔

بہار :۔ چلو حُسن آرا کے حُسن کی تعریف لندن تک میں تو چھپ گئی۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو گا۔

نازک :- اور یہ بھی اسی قابل۔ جس قدر تعریف کرو زیب دے۔ لاکھ دو لاکھ میں ایک ہے۔

گیتی :- مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ دونوں ایک ہی طرح کے ملے۔

رُوح :- وہ بھی شادی کی فکر میں یہ بھی شادی کی فکر میں۔

بہار :- اُس وقت دونوں کے دلوں میں جوش ہوگا۔

نازک :- کیسا کچھ۔ مگر ہماری حسن آرا ہی کا جوش غالب رہا۔

بہار :- اس میں کیا شک ہے ظاہری ایک بات۔

نازک :- جس کو جتنا شوق ہو اتنا ہی جوش ہوگا۔ کسی نے خوب کہا ہے :

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

لوہے اور فولاد تک کی دیوار میں تو شوق کی نگاہ رخنہ کرتی ہے، نہ کہ اپنے جسم کی اذیت وہ تو کوئی شے ہی نہیں۔

اب سُنئیے کہ ادھر تو نازک ادا اور بہار النسا باتیں کرنے لگیں اُدھر حسن آرا نے چپکے سے اخبار کھولا اور پڑھنے لگی جب رُوح افزا کی نظر پڑی تو اس نے قہقہہ لگایا اور اسی کے ساتھ اور سب نے قہقہہ لگایا تو حسن آرا شرما گئیں۔

نازک :- یہ بیتابی ہے۔ اللہ ری بیتابی دل۔ اوہنہ ہونہہ۔

رُوح :- اللہ رے شوق۔ اُف ری جلد بازی۔ کچھ ٹھکانا ہے۔

گیتی :- پھر جس کا دل جس پر آتا ہے اُس کا تو یہی حال ہوتا ہے۔ یہ تو بنی بنائی بات ہے۔ اس میں کہنا سُننا کیا۔

حسن :- میں خدا جانے کیا پڑھتی تھی۔

نازک :- خدا جانے یا ہم جانیں۔ خدا سبھی کچھ جانتا ہے

حسن :- ہمارے خلاف جو کہے گا وہ خود ہی ہنسا جائے گا :

با صاف دل مجادلہ با خویش دشمنی ست
ہر کو کشد بر آئینہ خنجر بخود کشد

ہم تو صاف دل پاکدامن پاکباز پاک باطن ہیں ہم سے کوئی لڑکے کیا کرے گا۔ تم ایک نہیں ہزار کہو ہم کو شرمانے سے کیا واسطہ۔

نازک :- اے ہے یہ تو ہنسی ہنسی ہی میں رو دیں۔
بہار :- ہاں اس وقت کچھ مزاج درہم و برہم ہے۔
حسن :- بار بار چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کا قاعدہ ہے کہ ہر کسی کو خواہی نخواہی چھیڑتی ہیں اور جو کوئی بولے تو ڈھیٹ کہلائے نہ بولے تو بیوقوف بنے۔ لوگ ہنسیں۔

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

نازک :- اس پر تو غالب نے خوب کہا ہے: ع

ہے بسکہ کلام میرا مشکل اے دل	سن سن اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش	گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

یہ غالب کی رباعی ہے۔ سمجھیں حسن آرا بیگم (ہنس کر) اس وقت خفا اس سبب سے ہوئیں کہ ان کے پڑھنے اور مطالعے میں کیوں ہرج ہوا۔ نہ روح افزا ٹوکتیں نہ کوئی دیکھتا نہ ان کا ہرج ہوتا۔ مگر مجھے مفت میں کیوں مطعون کیا ہے کون خفا۔ مجھ سے ہوں۔ الٹی گنگا بہاتی ہو۔ اے واہ بہن واہ۔

بڑی دیر تک سب ہمجولیاں تصویریں دیکھا کیں اور جب ترجمے میں یہ فقرہ نظر سے گزرا کہ آخرکار آزاد پاشا نے بآواز بلند حسن آرا کا نام لے کر جان پر کھیل کے سر دہی کے ہاتھ لگائے اور روسی لفٹنٹ نے اپنی معشوقہ مطلوبہ مس کلیرسا کو یاد کر کے تلوار کے جواب میں ادھر سے چوٹ کی۔ مگر آزاد کا ہاتھ بھرپور اپڑا اور روسی لفٹنٹ کا سر تن سے جدا ہوگیا۔

حسن :- (افسوس کر کے) ہائے ہائے یہ بری سنائی سنائی۔
مغلانی :- پھر یہ تو سہی ہے۔ جنگ دو خسر واز د۔
بہار :- اس میم کے دل پر سانپ لوٹنے لگے ہوں گے۔
گیتی :- اس تصویر میں نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں پر ہے۔
مغلانی :- (غور کر کے) اخاہ میں جانتی ہوں یہ ہوں گے۔ آزاد کے سامنے اس طرف یہ لاش جو پڑی ہے یہی ہے۔
حسن :- ہاں یہی ہوگی۔ یہ دھڑ ہے بیچارے کا اور یہ سر ہے۔
نازک :- اس میم کو چاہئے تھا کہ اپنے ہاتھ سے دفناتی۔ اگر بیمروت عورت ہے تو اس وقت کسی اور کے بغل میں ہوگی اور اگر باوفا ہے اور عشق سچا تھا تو اس کی قبر ہی کو اپنا میاں سمجھے گی۔
گیتی :- (غور سے دیکھ کر) کیوں بہن جب اس میم نے اپنے عاشق زار کی لاش اس تصویر میں ہوگی

تو ہے کیا جانے دل کا کیا حال ہوگا۔

بہار :۔ اب اس خیال کو دل سے بھلا دو۔ رنج ہوتا ہے۔

نازک :۔ جب ہم تم کو سُننے سے رنج ہوتا ہے تو جس بیچاری پر گزری ہے۔ اُس کے دل کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اللہ سب مصیبتوں سے بچائے۔ ؎

فصل خزاں میں گل کا تو آنا محال ہے
بجلی ہی کاش آئے مرے آشیاں تلک

اتنے میں ایک مہری نے آن کر عرض کیا۔ سرکار پڑوس میں نواب صاحب کے ہاں پادری صاحب کی میم آئی ہیں۔ وہ جو لڑکیوں کو پڑھاتی ہیں اور بگھی پر چڑھ کر آتی ہیں۔ اگر حکم ہو تو اُن کو بلا لیں وہ سب پڑھ کر فرفر سُنا دیں گی، بہار النسا اور نازک ادا کو مہری کی صلاح پسند آئی۔ فوراً حکم دیا کہ جا کے اپنے ساتھ ہی لے آؤ خوب تدبیر بتائی۔ مہری نے جا کے نواب صاحب کے ہاں بیگم صاحب سے عرض کیا۔ انہوں نے مس پرسی سے کہا۔ مس پرسی وہاں سے رخصت ہو کر مہری کے ساتھ یہاں آئیں۔ بیگمات نے از سرتا پا نظر ڈالی۔ تپاک کے ساتھ کرسی پر بٹھایا۔ اٹھارہ انیس برس کا سن سرخ و سفید اور نمکینی لئے ہوئے۔ گیسو عنبر بو شب رنگ۔ آنکھیں رسیلی۔ بوٹا سا قد، لباس صاف اور خوش نما۔ باہم یوں مکالمہ ہونے لگا۔

بہار :۔ بڑی تکلیف ہوئی میم صاحب۔ آپ اردو سمجھتی ہیں۔ حضور مس بابا فارسی پڑھ لیتی ہیں اور اردو خوب بولتی ہیں۔ اردو میں تو مس بابا نے امتحان ہی دیا ہے اور انعام پایا تھا۔

مس :۔ ہم اُردو بولتے ہیں اور ہم اسی ملک میں پیدا ہوئے کلکتہ میں ہمارا اماں باپ تھا۔ دونوں وہیں مر گیا۔

بہار :۔ ذری اس اخبار کا مطلب تو سمجھا جائیے۔

گیتی :۔ جہاں آزاد پاشا کا ذکر ہو وہ مقام سُنائیے گا۔

مس :۔ دل آپ لوگ آزاد پاشا کو جانتا ہے گا۔

گیتی :۔ جی ہاں ہم خوب جانتے ہیں اور وہ اب عنقریب آنے والا ہے۔ کیا آپ آزاد پاشا کو جانتی ہیں

مس :۔ دل ہندوستان میں تو بیگم صاحب ایسا کوئی نہیں ہے جو ان کو نہ جانتا ہو، جو کام انہوں نے کیا وہ اس اتنی بڑی جنگ میں کسی سے نہیں ہوا۔ بڑا جاں باز آدمی ہے۔ اُس نے نام کیا ہے پید ا بڑی بڑی لڑائی میں اس نے کمانڈ لیا۔ جو افسر کا درجہ کرنل سے چھوٹا وہ کمانڈ نہیں لے سکتا۔ ہاں میجر لے سکتا اور یہ فقط ایک لفٹنٹ ہی تھا اور جس جگہ کمانڈ لیا اور جس جنگ میں گیا نام کیا۔ لیڈی لوگ آزاد کا تصویر بڑے شوق سے

خریدتا۔ فرانس میں آزاد کا بڑا ابڑا تصویر بھی اتنے دام کو بکا کہ ہندوستان کے ایک سو روپئے کے برابر اور جو تصویر بڑے آدمی کی لیڈی لوگ نے بنوایا وہ بڑے دام کا ہے۔ اور مس لوگ جن کا شادی نہیں ہوا وہ دوچار ہم سے کہتا تھا کہ آزاد آئے تو اس کے ساتھ شادی کا ڈھنگ ڈالے اور بڑے بڑے افسروں کی لڑکیوں کو دل سے لگی ہے کہ آزاد کے ساتھ شادی ہو۔ کوئی لیڈی اس اسٹیشن میں ایسی نہیں جو آزاد کے نام سے واقف نہ ہو یا جس نے آزاد کی تصویر نہ دیکھی ہو۔

بہار :۔ آزاد کی شادی کسی اور کے ساتھ کیونکر ہو سکتی ہے۔

مس :۔ ہاں بے شک۔ وہ تو ایک بیگم سے اقرار کر گئے تھے۔ اب اگر اور کسی کے ساتھ شادی ہو تو بدنامی کی صورت ہے یا نہیں ہم نے تو سب سے کہدیا ہے کہ یہ بات مشکل ہے۔

بہار :۔ اور یہ تو سب میں مشہور ہو گیا ہو گا۔

مس :۔ بے شک (حسن آرا کی طرف) یہ کون ہیں آپ کی۔

بہار :۔ یہ ہماری چھوٹی بہن ہیں ان کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔

مس :۔ ہم نے اس طرح کی خوبصورت ہندوستان کی بیبیوں میں کوئی صورت آج تلک نہیں دیکھی بہت اچھی شکل اور رنگ ایسا ہے کہ صاحب لوگوں کی میموں کا کم ہو گا۔ اگر جو آپ ان کو انگریزی کپڑے پہنائیے تو اس اسٹیشن میں شاید دو ہی ایک ایسا ہو میم جو برابری کرے۔

بہار :۔ حسن آرا بیگم۔ مس صاحب نے تو تمہاری بڑی تعریف کی ہے۔

مس :۔ دل۔ کیا۔ حسن آرا بیگم۔ اسی نام کی ایک بیگم نے تو آزاد کو وہاں بھیجا ہے۔ آپ اس کو جانتی ہیں کوئی۔

نازک :۔ وہ بیگم صاحب یہی پرکالۂ آتش ہیں۔ حسن آرا بیگم۔

مس :۔ اُو۔ ہم بہت خوش ہیں کہ ہم نے آپ کو دیکھا بیگم صاحبہ۔

حسن :۔ آپ کی عنایت ہیں تو اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتی ہوں۔ تعریف کے لائق آزاد پاشا البتہ ہیں جنھوں نے ایسے ایسے کارنمایاں کئے کہ تمام دُنیا اُن کی مداح ہے۔

نازک :۔ لے اب یاد رکھنا۔ آزاد کا نام لیا اور تعریف کی۔

مس :۔ دل۔ اس میں کون ڈر ہے یا حیا کا کون بات ہے۔

نازک :۔ میم صاحب آپ تو گانا بھی جانتی ہوں گی۔ یا نہیں ؟

مس :۔ ہم کو گانا برسوں سکھایا جاتا ہے۔ ہم گرجا میں گاتے ہیں۔ اور گھر میں گاتے ہیں اور جب

کھانا ہوتا ہے تب گاتے ہیں ۔ آپ بھی گانا جانتی ہیں ۔ کوئی غزل ہم کو سنائیں آپ ۔

نازک :۔ میم صاحب ہم کو گانا سکھایا نہیں جاتا ۔ بلکہ جو عورت ڈھول پر گائے اس کو حرف رکھتے ہیں ہم نے تو فقط شوقیہ گانا سیکھا کہ چوری سے گاتے ہیں کہ ہم جولیوں کے سوا اور کوئی سن نہ لے ۔ ؎

گو ہم قفس میں جا نہ سکے بوستاں تلک	اڑ اڑ کے چہرہ گیا پر وہاں تلک
کب پہنچی آہ ضعف سے گوش بتاں تلک	سو جا ٹھہر کے سینہ سے آئی زباں تلک
عالم ہوں علم عشق کا میں کر نہ ہمسری	اے عندلیب تو ہے پڑھی بوستاں تلک
اس مست کے ہیں گیسوؤں کے سلسلے میں ہم	ساقی مرید جس کا ہے پیر مغاں تلک
فصل خزاں میں گل کا تو آنا محال ہے	بجلی ہی کاش آئے مرے آشیاں تلک
اس درجہ فرط ضعف سے ہم پیچھے رہ گئے	پہنچی نہ آہ بھی جرس کارواں تلک
سو بار آ کے موت بھی فرقت میں پھر گئی	برگشتگی نصیب کی کہیے کہاں تلک

اب کچھ سنائیے ۔ مگر ہمارا گانا نہ تو آپ کی سمجھ میں آیا ہوگا اور نہ آپ کو اس میں کچھ لطف حاصل ہوگا ۔ مگر آپ کا گانا ہم کو پسند ہے اور جس کا جی چاہے جو کہے ۔ ہمارے مکان کے سامنے گرجا ہے ۔ اتوار کے دن وہاں صاحب لوگ اور میمیں جمع ہوتی ہیں تو ہزار کام چھوڑ کے ان کا گانا سنتی ہوں ۔

بہار :۔ اچھا ابھی تو بیٹھی ہیں پہلے اخبار سن لو ۔

مس :۔ (اخبار لے کر) اس میں آزاد کا بہت ذکر ہے ۔ لکھا ہے کہ آزاد پاشا نے ترکوں کے ساتھ بڑا احسان کیا ۔ گو ترکوں کی جواں مردی اور جرأت میں شک نہیں ، مگر آزاد پاشا سے کئی لڑائیوں میں وہ کارنمایاں سرزد ہوئے کہ تمام عالم کے دل پر نقش جم گیا کہ یہ بڑے بہادر جنرل ہیں آزاد پاشا نے اُن مقاموں پر دلیرانہ کارروائی کی ہے جہاں کسی فرد بشر سے ایسا کام نہ ہو سکتا ۔ آزاد نے ایک قلعہ کو غنیم کے حملے سے اس طرح بچایا کہ جس قدر تعریف کی جائے کم ہے ۔ گو اس افسر کا درجہ لفٹنٹ ہی کا تھا تاہم فوج قلیل لے کر قلعہ سے ایسے وقت میں باہر آیا جب غنیم کی سپاہ جرار تین طرف سے قلعہ کو محصور کئے ہوئے تھی ۔

بہار :۔ کیا ! ۔ اللہ ! تین طرف سے سپاہی قلعہ کو گھیرے تھے اور یہ قلعہ کے باہر نکل آئے ۔ افوہ یا اللہ ان کا دل کاہے کا بنا ہوا ہے ۔

گیتی :۔ جب تو اس قدر کی شہرت پائی کہ جو ہے آزاد ہی آزاد پکارتا ہے سوائے آزاد کے اور بھی کسی کا نام سنا ۔

مس :۔ ہم نے عین لڑائی کے دنوں میں ان کا حال پڑھا تھا اور کلب گھر اور کتب خانے میں صاحب لوگ اور لیڈیاں روز اسی لئے جاتی تھیں کہ آزاد کا تذکرہ پڑھیں۔

مغلانی :۔ آگے پڑھئے جب باہر آئے تو کیا دیکھا۔

بہار :۔ فوج سے لڑائی ہوتی ہوگی۔ میدان میں جہاں لڑائی ہوتی ہو اور کیا دیکھتے سوائے گولی بارود کے اور کیا ہے۔

مس پرسی نے بیان کیا کہ آزاد پاشا کے عشق میں کئی عالی خاندان خاتونیں اور کئی مشہور شہزادیاں جو اچھے اچھوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی تھیں ایسی بے خود ہو گئیں کہ ننگ و ناموس کا اصلاً خیال نہ رہا۔

نازک ادا بیگم بولیں۔ جی ہاں یہ حسن ایسی ہی شے ہے۔ ضبط کرنا بہت مشکل ہے۔ حسن و عشق کے جھگڑے میں انسان پڑا اور گیا گزرا پھر مفر کی صورت نہیں۔ اور حسن تو واقعی بلائے بیدرمان ہے

حسن ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را

مس پرسی نے پولینڈ کی شہزادی کا حال بیان کیا کہ اس جادو جمال، دوشیزہ مشتری خصال نے کئی معزز نوجوانوں کو صرف اس جرم میں قید کر لیا تھا کہ اس کی عاشقی کا دم بھرتے تھے۔ جہاں اس قدر معلوم ہوا کہ رئیس یا امیر زادہ ہم پر عاشق ہے فوراً اس کی تخریب کی فکر کی۔ وہ تو ان کی لگاوٹ سے سمجھے کہ اب شاہد آرزو سے ہمکنار ہوئے مگر دیکھا تو مصیبت سے دوچار ہوئے۔ کوئی ایسا نہیں۔ جو عاشق ہونے کے بعد ذلیل ہو کے اس آستاں سے نکلوایا نہ گیا ہو۔

نازک :۔ ہاں پھر عشق کے معنی ہی یہ ہیں اور معشوقی نام اسی کا ہے کہ عاشق کی ذلت و مایوسی میں کوئی دقیقہ نہ باقی رکھے۔

مر گیا ہوں میں وہ کہتا ہے کیا ہے کچھ فریب — دم سمجھتا ہے وہ اس کو ہائے مجھ میں دم نہیں
اس نے کوچے سے نکلوایا ہمیں اچھا کیا — جو نہ جنت سے نکالا جائے وہ آدم نہیں

مس :۔ اس شہزادی نے آزاد کو بڑی ترکیبوں سے اپنے ہاں پکڑوا بلوایا تھا۔ یہ سوتے کے سوتے رہے اور ان کے ساتھ کے سو روسی جوان کا سک جوان کی نگرانی کے لئے تعینات تھے وہ غافل ہی پڑے رہے، اور شہزادی کے سپاہی آزاد کو اس آسانی سے اور خوبصورتی کے ساتھ اٹھا لئے گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہوئی۔

نازک :۔ آزاد کو دیکھا بھی تھا یا نام ہی سُن سُن کے عاشق ہو گئیں۔ ایسا بھی اکثر ہوا ہے:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ؎

بسا کین دولت از گفتار خیزد

مس :۔ نہیں دیکھا نہیں تھا نام سنا تھا، اور تصویر دار اخباروں میں اُن کی صورت اور جوانی دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو گئی تھی۔ پس جس وقت آزاد اس کے روبرو گئے ان کی نازک نگاہ نے اس پریرو کے دل پر وہ اثر کیا کہ بیان سے باہر۔ شدہ شدہ ان سے باتوں باتوں میں پیغام شادی اپنی ہی زبان سے کہا۔ آزاد نے صاف انکار کیا کہ میں تو ہندوستان کی ایک مہ جبیں نازنین سے اقرار کر کے آیا ہوں۔ یہاں 'شادی کرنا کیا معنی'۔ اس مغرور سرکش تب پندار کو یہ تاب کہاں کہ خود شادی کا لفظ زبان پر لائے اور مرد انکار کرے اور وہ بد دماغ نہ ہو۔ فوراً ایک ایسے تیرہ و تار غار کوہستان میں بند کیا جہاں آدمی کا نام تک عنقا تھا۔ صبح کو کھانا بھیجا جاتا تھا وہ بھی کم اور کھانے کے قابل نہیں۔ دو ہفتے تک آزاد پاشا اس بھیانک مقام میں جہاں انسان کیا کسی پرند و درند تک کا گزر نہ تھا۔ قید رہے۔ حسن آرا بیگم کو دل میں غور کرنا چاہیئے کہ وہ ان کا کیسا سچا اور پکا عاشق ہے

نازک :۔ اس میں کیا فرق ہے۔ مگر طرفین سے عشق ہے خالی خولی انہوں نے ہی سچا عشق نہیں ظاہر کیا، بلکہ ان کا عشق بھی صادق ہے۔ وہ مرد ہیں۔ انہوں نے جنگ میں نام کیا۔ یہ عورت ہیں انہوں نے اپنی چار دیواری میں اظہار عشق صادق کیا۔

بہار:۔ حسن آرا سچ کہنا۔ یہ حال سن سن کے دل کیا خوش ہوا ہوگا۔

حسن :۔ باجی یہ کوئی تعجب کی بات ہو تو کہو۔ اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ مگر وہ دن یاد کرو جب تم ہم کو بے حیا اور بے شرم بناتی تھیں۔

بہار:۔ چلو اب اس کا ذکر جانے ہی دو۔ رنج ہوتا ہے۔

نازک :۔ آزاد کی صورت کیا دیکھی کہ ہزار جان سے آپ کی بہن عاشق ہو گئیں۔ گھر بھر ایک طرف اور یہ ایک طرف:

دام کاکل دکھا دیا کس نے　　　مرغِ دل کو پھنسا دیا کس نے

خم ابرو دکھا دیا کس نے　　　کعبۂ دل گرا دیا کس نے

حسن:۔ ملتے تو جب دو کہ تم خود نہ تعریف کرتی ہو۔

بہار:۔ واہ یہ تو کہتی ہیں کہ اللہ اللہ خدا نے ایسے گبھرو جوان بھی بنائے ہیں۔ یہ تو کوئی بات

چھپاتی ہی نہیں۔ ایسی صاف گو ہیں۔ اس صفائی کے صدقے۔

نازک :۔ کیا جھوٹ ہے۔ آزاد کو جو دیکھے گا گھنٹوں تعریف کرے گا۔ فرق بس اتنا ہے کہ ہم نے زبان سے کہدیا تم لوگ صاف دل تو ہو نہیں تم زبان سے نہیں کہتے ہمارا قلب آئینہ ہو رہا ہے۔ حسن آرا کو شہزادی کے حالات اس قدر دلچسپ معلوم ہوئے کہ مس پرسی سے خود فرمائش کی۔ اور انہوں نے کہا۔ ایک دن شہزادی جو حسن و جمال میں بے نظیر ہے۔ لباس گراں بہا زیب بدن کر کے قید خانہ کی طرف گئی۔ قید خانہ کیا پہاڑ کے ایک غار عمیق کو جس میں روشنی کا نام تک نہ تھا خاص اسی لئے اپنے طرز ظالمانہ پر مظلوموں کے لئے قید خانہ بنایا تھا۔ ادھر قیدی اس میں داخل ہوا ادھر آہنی دروازہ بند کر دیا اور تیس تیس سیر کے قفل ڈال دیئے اور کبھی بے قفل ہی بند کر دیا۔

حسن :۔ اُف (کانپ کر) ہے ہے وہاں زندگی کیونکر انسان بسر کر سکتا ہے۔

نازک :۔ جب پڑی تو کیا کرے۔ کچھ اپنا بس ہے۔

بہار :۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ نہ بولنے والا نہ چالنے والا، نہ کوئی ہمدرد نہ کوئی ہمراز۔ یہاں ایک دن بات چیت نہ کرے تو معاذ اللہ توبہ ہی بھلی —— ایک دن کیا گھنٹہ بھر نہ بولے تو کھانا نہ ہضم ہو۔

مغلانی :۔ بڑی بڑی سختیاں بے چارے نے اُٹھائی ہیں۔

گیتی :۔ اب اس سے بڑھ کر، ور کیا ہوگا۔ سختی سی سختی ہے۔

مس :۔ بس غار کی طرف جا کے اس سوراخ کے پاس کھڑی ہوئی۔ جدھر سے کھانا دیا جاتا ہے۔ اُس دن عمداً۔

حسن :۔ آپ کا قطع کلام ہوتا ہے کیا کھانا روشندان سے دیا جاتا تھا۔

مس :۔ اور نہیں تو کیا۔ یہی تو بڑی سختی تھی۔

مغلانی :۔ ہے ہے عورت کیا پتھر کے دل کی عورت تھی۔

گیتی :۔ اللہ سمجھے ایسی موئی عورت سے توبہ توبہ۔

مغلانی :۔ پھر آزاد نے بات مان لی یا نہیں مانی۔

مس :۔ اس غار کے پاس جو جا کے کھڑی ہوئیں اور کپڑوں کی بو باس اور ولایتی عطر کی خوشبو جو اُڑی تو آزاد کا دماغ معطر ہو گیا۔

نازک :۔ اور ابھی تک یہ نہ سمجھے ہوں گے کہ اسی معشوقہ جفا جو کی زلف عنبر بار کی لپٹیں آتی ہیں۔ کیا وقت تھا توبہ توبہ۔

آج ایسی جو تو معطر ہے   زلف کھولی ہے اے صبا کس نے

مس :- آزاد کو کیا معلوم۔ مگر اُس وقت خوشبو نے انہیں مست کر دیا۔

نازک :- وہ سمجھتے بھی تو کیا کرتے یہی سوچتے کہ ایک نگاہ میں تو اس حالت کو پہنچا اب کی خدا جانے کیا قہر ہو ؏

دل ربایانہ دگر بر سر ناز آمدہ

از دلِ ما چہ بجا ماند کہ باز آمدہ

حُسن آرا نے شہزادی کو دل ہی دل میں خوب کوسا مگر کوئی لفظ زبان پر نہ لائی۔ مس نے کہا بس جس وقت خوشبو نے آزاد کو مست کیا اس سرمایۂ نازنینی نے ایک کنیز باتمیز کو جو خوبروئی اور دل رُبائی میں عدیم التشبیہ تھی آزاد کے پاس بھیجا۔ انہوں نے بارہ چودہ روز کے بعد جو ہمجنس کی صورت دیکھی تو بہت ہی خوش ہوئے۔ سمجھے کہ شاید اس ستمگر جفا جو کا دل نرم ہوا ہو، اور یہ زن خوشخو، خوبرو پیغام لائی ہو۔ مگر جب اس نے حال کہا تو آہ سرد بھر کر رہ گئے۔ ؏

شاد باش اے دل کہ فردا روز بازا جسترا

مژدۂ قتل ست گرچہ وعدۂ دیدا نیست

کنیز :- اگر آپ نے اب کی پھر انکار کیا تو بہت ہی پچھتایئے گا۔

آزاد :- واہ ری قسمت کیا اچھا پیغام لائی ہو۔

کنیز :- میاں تمہارا سا مرد بھی نہیں دیکھا۔ ایسی خوبصورت دوشیزہ ملتی ہے جو لاکھوں میں انتخاب ہے۔ خود درخواست کرتی ہے۔ بھلا کہیں اس صورت کی کوئی دیکھی ہے۔

آزاد :- جس کو ہم نے دل دیا ہے۔ ہمیں وہی بھاتی ہے ؏

حُور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

کنیز :- پھر اچھا اس طرح کب تک زندگی بسر کرو گے۔ اگر یہ امید ہو کہ اس غار میں پڑے پڑے وہ مل جائے تو خیر جھکتا کرو۔ نہیں تو آدمی بنو اور چل کے ایسی پیاری دُلہن کی بغل میں بیٹھو۔

آزاد :- یہاں تو تپ ہجر نے آگ لگا دی ہے۔ از سر تا پا پھونک دیا ہے۔ اور تم کو مرنے داریوں کی سوجھتی ہے۔ ہم میں تم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

لگا دی آگ نالوں نے فلک پر   فرشتوں کی زباں پر الاماں ہے

کنیز :- ہائے ہائے ہم کیونکر اس کو سمجھائیں۔ دوسرا ہوتا سر کے بل جاتا اور خاک پا کو توتیائے چشم بناتا۔ مگر ان کی باتیں دنیا سے نرالی ہیں۔

آزاد :- اچھا تم جا کے اس قدر کہہ دو دو باتیں کرنے کی اجازت دیں۔

بلا کر اس سے دو باتیں تو سُن لو

یہ کہتی ہیں کہ گویا خوش بیاں ہے

کنیز :- اچھا یہ مانا مگر ان کے سامنے ذرا ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرنا وہ باتیں کرنا جن سے دل نرم ہو جائے۔ ہم نے ایسا مرد دیکھا ہی نہیں کہ ایسی پری کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کرے مگر طبیعت اپنا اپنا دل۔

مس پرسی نے بیان کیا کہ شہزادی بے تاب ہو کر اُس غارِ تار میں آزاد سے ملی، اور سمجھایا کہ اے مرد خوبرو تو ناحق اپنا دشمن ہوا ہے۔ جس پری سے وعدۂ شادی ہے، وہ اب خواب میں نظر نہ آئے گی۔ اُس کی صورت دیکھنے کو ترسے گا اور یاد رکھ کہ ابھی تک میں برسرِ خشم نہیں ہوں۔

حسن :- اللہ سمجھے۔ برسرِ خشم نہ ہونے پر یہ حال تھا۔

مغلانی :- اور جو ہوتی تو کیا جانے کیا غضب ڈھاتی۔

گیتی :- اُف رے ظلم۔ معلوم ہوتا ہے کسی ڈکیت کے ہاں پیدا ہوئی تھی اور بچپنے ہی سے اس کو ظلم کرنا سکھایا گیا تھا۔

مغلانی :- ہے تو ایسا ہی کوئی منہ جُھلسے کہ اور اب کیا کرتی ہو۔

حسن :- یہ برسرِ خشم نہیں برسرِ رحم تھیں۔ آگ لگے ایسے رحم کو۔

بہار :- تو اگر یہ حال تھا تو سیکڑوں کو کھڑے کھڑے چنوا دیا ہو گا

حسن :- ہاں باتوں سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

مس :- آزاد نے کہا۔ ع

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

اگر برسرِ خشم ہو تو کیا اور اگر رحم کرو تو کیا۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا ایذا پہنچاؤ گی بھلا۔ بس اب دل پکا ہو گیا۔ چاہے جان جائے اور چاہے تکلیف ہو۔

حسن :- (آہ سرد بھر کر خاموش ہو گئی۔)

مس :- اس پر بھی اس نے سمجھایا کہ اب جوان تو اپنی جان کا اپنے آپ دشمن ہوا ہے۔ اگر حسن آرا کا

نام زبان پر لایا تو کنوئیں میں قید کر دوں گی۔ آئندہ تجھے اختیار ہے۔

حسن :۔ (آہ سرد بھر کر رونے لگی۔)

نازک :۔ ہائیں ہائیں! حسن آرا کچھ خیر ہے۔

گیتی :۔ اے یہ تو پچھلی باتیں ہیں۔ ان باتوں سے کیا واسطہ ہے۔

مغلانی :۔ اب تو آزاد صحیح سلامت ہنسی خوشی واپس آئے۔ اب رونا دھونا خواہ مخواہ منحوس بات۔

حسن :۔ (مس سے) مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ یہ سختیاں سہیں۔

مس :۔ ابھی تم نے سنا کیا ہے بہن۔ اس سے زیادہ۔

بہار :۔ چلو انجام تو اللہ نے بخیر کیا۔ بس یہی ہزار بات کی ایک بات ہے۔ کہ انجام بخیر ہو۔ جس کا انجام بخیر ہو وہی بات بچی۔ اُن کا انجام اللہ کے فضل سے اچھا ہوا کہ لڑ بھڑ کے نام کر کے واپس آئے۔

اتنے میں سپہر آرا کے ہاں سے ایک مغلانی آئی۔ دروازے پر ڈولی لگائی گئی بی مغلانی پردہ کرا کے اُتریں اور بخط راست حُسن آرا بیگم کے پاس آئیں یہاں دیکھا تو میم صاحب بیٹھی ہیں۔ سب کو ادب کے ساتھ سلام کیا اور فرش کے ایک کونے پر بیٹھیں، حسُن آرا نے پوچھا۔ کہو وہاں خیر صلاح ہے کہا۔ جی ہاں خیریت ہے۔ دو روز سے بڑے حضور کو کھانسی اور زکام نے اس قدر پریشان کیا تھا کہ توبہ ہی بھلی بلغم کے مارے چھاتی بالکل جکڑ گئی تھی۔ گھر بھر سر پر اُٹھا لیا، رات رات بھر جاگتے ہی گذری۔ اور کل کی رات تو آنکھوں ہی میں کٹی۔ بارے خدا خدا کر کے گورے ڈاکٹر کے علاج سے ذرا ذرا طبیعت بحال ہوئی تو جان بچی۔ ان کا قاعدہ ہے کہ ذری اگر خدانخواستہ پاؤں میں پھانس بھی چبھی تو بس پھر کسی کو دم نہیں لینے دیتے۔ پوچھا سپہر آرا بیگم تو اچھی ہیں۔ مغلانی نے کہا جی ہاں حضور اللہ کی عنایت سے خوش و خرم ہیں۔ ایک بات کہلا بھیجی ہے تاکید کر دی ہے، کہ یا تو باجی جان کے کان میں کہنا یا روح افزا بیگم سے اور تیسرے کے کان میں بھنک نہ پڑنے پائے۔ نازک ادا بیگم نے بیقرار ہو کر دریافت کیا کہ انتشار کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کہا جی نہیں۔ انتشار کیسا۔ کچھ جلدی نہیں ہے کہہ دوں گی ایسی ہی ویسی بات ہے۔

حسن آرا اور رُوح افزا دونوں بے تاب ہو کر کمرے میں گئیں، اور تخلیے میں مغلانی کو بلایا اور استفسار حال کیا۔ مغلانی بولی حضور نواب صاحب نے کل آن کر سپہر آرا بیگم سے ایک نئی بات کہی۔ رات کو جب ہوا کھا کے آئے تو بیگم صاحب سے فرمایا کہ آزاد پاشا کے آنے کی خبر بہت گرم ہے۔ مگر ہم نے یہ بھی سُنا ہے کہ انہیں کی شکل و صورت کا ایک آدمی یہاں ہے اور اس کا نام بھی آزاد مرزا ہے۔ آزاد اور مرزا ایک ہی ہے۔ اور صورت قد و قامت چال ڈھال سب میں بعینہ ایک۔ فرق اتنا ہے کہ آزاد پاشا

انگریزی کپڑے پہنتے ہیں اور وہ شرتی جاندانی چکن کے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور کوئی بیگم ہیں ان پر آزاد لڑکپن میں عاشق تھے ثریا بیگم نام ہے ان کے ہاں آزاد مرزا آزاد کے دھوکے میں جا چکے ہیں تو اب ایسا نہ ہو کہ یہاں بھی وہ ایسا ہی رنگ جمانا چاہیں۔ آزاد مرزا ایک دفعہ کالے پانی جا چکے ہیں۔ وہاں سے اس طرح بھاگ آئے کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہوئی اور اب کھلے بندن سر باز اور رہتے ہیں۔ پولیس والے ذرا منکتے تک نہیں۔ ثریا بیگم کے ہاں اس شخص نے چوری بھی کرا دی تھی۔ یہاں ہرگز ہرگز نہ آنے پائے۔ ذرا بہت حفاظت رکھئے گا۔ میں نے تو پہلے ہی کہدیا تھا کہ وہاں اٹھارہ اٹھارہ پھرے ہیں، بھلا کسی کی دال کیونکر گل سکتی ہے، ثریا بیگم کے ہاں تو سنا کہ وہ بن بلائے نہیں گئے تھے۔ شاید مکان کے دروازے یا کسی تماشے میں آزاد مرزا پر نظر پڑی تو سمجھیں کہ آزاد ہی ہیں۔ فوراً داروغہ کو بلایا اور اشارے سے کہا کہ فلاں شخص جو سامنے بیٹھا ہے اس سے جا کے نام دریافت کرو مگر اس خوبصورتی سے کہ کسی اور کو نہ معلوم ہونے پائے۔ اور نہ وہ برا مانیں۔

داروغہ نے وہاں سے آن کر کہا کہ حضور ان کا نام آزاد ہے اور مغل ہیں۔ بس ثریا بیگم نے کہا فوراً جاؤ اور کہو ایک بیگم صاحب نے پیغام بھیجا ہے کہ اس وقت آپ ذرا کھڑے کھڑے دو باتیں سن جائیں ان کا کون سا ہرج تھا انہوں نے بخوشی منظور کیا جب بیگم صاحب کے پاس آئے تو گھل گھل کے مزے مزے کی باتیں ہونے لگیں۔ مگر پھر شاید کھل گیا کہ آزاد نہیں ہیں، اور دوسری بات یہ کہی ہے کہ آزاد پاشا کے پاس دو عورتیں ولایت سے آئی ہیں۔ دونوں کنواری اور بڑی حسین اور صاحب جمال ہیں۔ اس کی ٹوہ لگانی چاہیئے کہ یہ دونوں کون ہیں اور ان کے ہمراہ ولایت سے کیوں آئیں۔ جوان مرد اور جوان عورت کا ساتھ کیا۔ پھر جب رشتہ ہو نہ ناتا ہو نہ کبھی کی جان پہچان پر دیس پرائے ملک سے کیوں کر ساتھ چلی آئیں۔ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔ آخر ش وجہ کیا کہ اتنی حسین عورتیں اس قدر فاصلے سے ایک اجنبی کے ساتھ دور دراز ملک میں آئیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہیں۔ کوئی نہ کوئی فیہ اس میں ضرور ہے۔ اس پر حسن آرا بولی تم ان سے کہدینا کہ اطمینان رکھیں۔ بس اتنا کہدینا۔ مغلانی نے کہا بہت خوب میں عرض کر دوں گی کہ بیگم صاحب نے فرمایا ہے کہ آپ اس بارے میں کچھ فکر نہ کریں۔ اطمینان رکھیں ہم نے سب باتیں دریافت کر لی ہیں۔ اس میں کچھ اندیشہ نہیں ہے۔ مگر حضور بجائے خود دریافت بھی کر لیں حسن آرا نے کہا بھلا تمہارے کہنے کی بات ہے، بے دریافت کے کبھی بھی کہیں ایسا ہو سکتا ہے جس نے سب باتوں کی تحقیقات کر لی ہے۔

اتنے میں میم صاحب نے ورق الٹتے الٹتے کہا۔ ایں گل دیگر شگفت۔ ہم تو شہزادی ہی کا ذکر

کر رہے تھے یہاں دو اور کی تصویر چھپی ہے۔ مس میڈا اور مس کلیرسا۔ یہ مس میڈا ہیں، اور یہ مس کلیرسا۔ یہ فقرہ سن کر سب کی سب جھک پڑیں اور ان دونوں پریوں کو دیکھ کر عش عش کرنے لگیں۔ مس نے کہا ایک ان میں سے کوہ قاف کی پری ہے۔ مس میڈا یہ بانکی عورت اور دوسری روسی خاتون مس کلیرسا۔

منلانی نے یہ بھی بیان کیا کہ مرزا ہمایوں و بہادر آزاد کے استقبال کے لئے بمبئی جانے والے تھے، مگر صاحب نے منع کیا کہ یہاں جب آئیں گے تب مل لینا۔

حسن :۔ اب باہر ہوا خوری کے لئے آتے جاتے ہیں۔

مغلانی :۔ جی ہاں۔ حضور برابر جاتے آتے ہیں۔

حسن :۔ صاحب لوگ جس طرح پہلے آتے تھے اب بھی آتے ہیں یا نہیں، وہی چہل پہل رہتی ہے یا محلسرا سے باہر نہیں نکلتے۔

مغلانی :۔ نہیں حضور باہر نشست رہتی ہے، مگر ایسا عشق ہے کہ پورے ایک گھنٹے جم کر باہر نہیں بیٹھتے۔ دو گھڑی بیٹھے اور اندر چلے آئے پھر چلے گئے ایک ہی منٹ میں باہر چلے جائیں مگر بیوی کو ضرور دیکھ جائینگے اس قدر کا عشق ہے۔

بہار :۔ بہت ہنسے جاتے ہوں گے گھر میں! کہ نہیں۔

مغلانی :۔ حضور بھاوجیں بہت ہنسا کرتی ہیں اور وہ بیچارے شرما کے خاموش ہو دیتے ہیں۔ اور صحیح بات ہے۔ ان کو جیسا عشق ہم جانتے ہیں۔ کسی رئیس کو بیوی کا ایسا عشق نہ ہوگا۔

حسن :۔ اچھی بات ہے اس میں برائی کیا ہے بھلا۔

مغلانی :۔ کچھ نہیں یہ تو ہونا ہی چاہیئے۔

بہار :۔ جو میاں بیوی میں اس قدر محبت ہو تو کیا کہنا۔

نازک :۔ جیسی ہم سے اور ہمارے میاں سے محبت ہے کہ ادھر انہوں نے کوئی بات کی اور میں نے کاٹ کھایا۔ وہ مجھ پر عاشق، میں ان پر قربان۔ دونوں یک جان دو قالب۔

بہار :۔ تم سے اگر نہ بنے تو خدانخواستہ میاں کی تو جان ہی نصیب عذاب میں پڑے۔ تم کسی سے دبنے والی تو ہو نہیں۔ میاں ہو یا کوئی ہو۔

نازک :۔ سوار کو گھوڑے سے اتار لوں تو سہی۔

گیتی :۔ زبان کیا۔ مقراض ولایتی ہے۔ رکتی ہی نہیں کہیں۔

نازک :۔ بہن اللہ جانتا ہے ہمارے میاں ہم سے بہت خوش ہیں۔ مگر دن بھر چھیڑا کرتے ہیں۔ ان

کے مزاج میں چُل بہت ہے، اور ہم کو چُل سے عشق۔ وہ بھی زندہ دل ہم بھی۔

ع خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

جہان :۔ اُن کے سامنے اور مردوں کی تعریف کرتی ہو، خوش تو بہت ہوتے ہوں گے کہ ایسی بیوی ملی۔

نازک :۔ خدا کرے کوئی آزاد کی سوانح عمری لکھے۔

حسن :۔ تم کیوں نہیں لکھتی ہو۔ اللہ نے لیاقت دی ہے پڑھی لکھی ہو۔ طبیعت دار ہو۔ رنگین مزاج ہو تم اگر سوانح عمری لکھوں بہن تو آزاد اور بھی مشہور ہو جائیں۔

نازک :۔ اب آزاد کی بغل میں جب بیٹھوگی تب لکھیں گے۔

مغلانی :۔ (مسکرا کر) بیگم صاحب بھی ماشاء اللہ کتنی صاف گو ہیں۔

بہار :۔ لو۔ ان سے بڑھ کر اور بھی صاف گو کوئی ہوگا۔

نازک :۔ غرضکہ برسوں سے یہ فکر تھی کہ یا اللہ کسی طرح آزاد کی صورت دکھا تاکہ ادھر وہ سُرخرو ہوں۔ ادھر ہماری بہن سُرخرو ہو۔ کوئی کہتا تھا کہ حسن آرا بڑی ظالم معلوم ہوتی ہیں۔ کوئی کہتا تھا ہائے غضب اس جوان رعنا کی انہوں نے جان لی۔ بیٹھے بیٹھے مبتلائے بلا کیا۔

بہار :۔ اُوئی۔ تو جس طرح ہم اس شہزادی کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اسی طرح لوگ ان کو کہتے ہوں گے رائے تو ہماری بھی تھی اور سپہر آرا ائے دن بہن کو طعنے دیا کرتی تھیں کہ باجی تم نے غضب کیا۔

حسن :۔ چلئے انجام تو اللہ نے بخیر کیا۔ ہزار غنیمت ہے۔

نازک :۔ سب کی زبان پر یہی کلمہ تھا کہ حسن آرا بڑی ظالم ہیں۔

حسن :۔ اور ظلم کی تو بات ہی تھی مگر اللہ کو اچھا کرنا منظور تھا کہ آزاد نے ساری خدائی میں نام کیا اور ہم سرخرو ہوئے۔

بہار :۔ اس کے پہلے ان کو جانتا کون تھا۔ اب البتہ ان کو تم سے شادی کرنے میں اس قدر فخر نہیں ہے جس قدر تم کو فخر کی جگہ ہے۔

حسن :۔ (تنک کر) اے واہ باجی۔ آپ بھی خوب باتیں کرتی ہیں۔ اور سنئے اے واہ یہ اچھی بات ہے ہمیں کیا فخر ہے بھلا۔

نازک :۔ اے تمہیں فخر یہ ہے کہ ایسے جوان رعنا اور نامی افسر کی بیوی بنوگی یہ کوئی فخر ہی نہیں ہے، اور اس سے بڑھ کر فخر کیا ہوگا بھلا۔

منلانی :- تو حضور میں آداب عرض کرتی ہوں۔

حسن :- اچھا یہ خط لیتی جاؤ اور جو ہم نے کہا وہ سمجھا کے کہدینا۔

اتنے میں بُلاقن مہری باہر سے ایک اخبار لائی اور حسن آرا بیگم کی چوری سے بہار النسا کو دیکھ کر کہا حضور عسکری میاں یہ کاغذ لائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خبر کا کاغذ ہے۔ حسن آرا بیگم کو دیدینا وہ پڑھ کے بہت خوش ہوں گی۔ بہار النسا نے بلاقن سے اخبار لے لیا اور روح افزا اور گیتی آرا کو بلا کر یوں گفتگو کی۔

بہار :- عسکری نے یہ اخبار بھجوایا ہے اور کہلا بھیجا ہے کہ حسن آرا کو دیدو وہ پڑھ کے خوش ہوں گی اور ہمیں معلوم نہیں اس میں کیا ہے۔

روح :- نہیں نہیں باجی جان کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔

گیتی :- عسکری کے ہتھکنڈوں سے تو ہمیں نفرت ہو گئی ہے۔

بہار :- ہاں اوس باری جان ہی خدا نخواستہ لی تھی۔

روح :- بھلا پھر ایسے کی بات کا کون ٹھکانا ہے۔

گیتی :- پہلے کسی سے سب اخبار پڑھوالو پھر دو۔

بہار :- تو کیا عسکری اب ایسا ابلہ ہے کہ جان بوجھ کے پھر غلطی کرے اور اب اس سے اس کو ملے گا کیا خاک۔

روح :- اوس میم کو بلوا کے ادھر ادھر پڑھوالو جو کوئی ایسی ویسی بات ہو تو الگ کرو نہیں تو کیا ہرج ہے

مس پرسی بلوائی گئیں۔ بہار النسا نے کہا میم صاحب اس اخبار کو سرسری نظر سے ذری دیکھ جایئے کہ اس میں کہیں پر غلطی تو نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ کہ کہیں آزاد کے خلاف تو نہیں لکھا ہے۔

مس :- (پڑھ کر) جی نہیں۔ اس میں تو آزاد کی بڑی تعریف کی ہے۔

بہار :- ذری غور سے پڑھو۔

گیتی آرا :- ہاں میم صاحب۔ ایسا نہ ہو کوئی اینڈی بینڈی بات ہو۔

مس :- ہمارے ذمہ پر آپ اُن کو پڑھا دیں۔ بس۔

بہار :- بلاقن ذری حسن آرا کو یہیں بلالو۔

حسن :- مستانہ چال کے ساتھ آئیں اور مسکرا کر پوچھا۔ باجی یہ آج کیا سرگوشی ہو رہی ہے۔ کیا کوئی نیا گل کھلا ہے۔ یہ سرگوشی بلا وجہ نہیں ہے۔ جسے دیکھو کانا پھوسی کر رہا ہے۔

بہار :- یہ اخبار آیا ہے۔ پڑھو۔ خوش تو نہ ہو گی۔

حسن :۔ (اخبار لے کر دلی شوق کے ساتھ) پڑھنا شروع کیا۔ اخبار کا مضمون جس میں آزاد ہی آزاد کا ذکر تھا درج ذیل ہے۔

کب اپنے منہ سے عاشق شکوۂ بیداد کرتے ہیں
دہانِ غیر سے ہم مثل نے فریاد کرتے ہیں

یہی کہہ کہہ کے ہجرِ یار میں فریاد کرتے ہیں
وہ بھولے ہم کو بیٹھے ہیں جنھیں ہم یاد کرتے ہیں

اسیرانِ کہن پر تازہ وہ بیداد کرتے ہیں
رہی طاقت نہ جب اڑنے کی تب آزاد کرتے ہیں

جو ہم وہ مصحفِ رُخ دیکھ کر فریاد کرتے ہیں
تو کافر ہنس کے کیا کہتا ہے قرآں یاد کرتے ہیں

کسی کافر کے کوچے کا جو اکثر دھیان رہتا ہے
تو سوتے میں بھی سیر گلشن شداد کرتے ہیں

رقم کرتا ہوں جس دم کاٹ تیری تیغ ابرو کا
گریباں چاک اپنا جامۂ فولاد کرتے ہیں

جو یہ سچ ہے نہیں بے حکم جنبش ایک ذرے کو
تو بس ہم وہ ہی کرتے ہیں جو آپ ارشاد کرتے ہیں

پہن کر طوق منت کا وہ مہرو ہنس کے کہتا ہے
مہِ کنعاں کے زنداں کو ہم آج آباد کرتے ہیں

نازک :۔ اللہ کتنے شعر بھرے ہوئے ہیں یہ تو گانے کے قابل ہیں گا کر)

ع کب اپنے منہ سے عاشق شکوۂ بیداد کرتے ہیں
دہانِ غیر سے ہم مثل نے فریاد کرتے ہیں

بہار :۔ میں تو ان کے گلے پر عاشق ہوں اللہ جانتا ہے۔

نازک :۔ تمہارے عشق سے کیا بھلا ہوگا۔ خدا کرے آزاد ہمارے گلے پر عاشق ہو جائیں۔ پھر حسن آرا سے اور ہم سے روز لڑائی ہوا کرے۔

حسن :۔ (مسکرا کر) بڑی کہنے والی ہو توبہ توبہ۔

بہار:۔ یہ تمہیں آج معلوم ہوا۔ یہ تو آزاد کے سامنے کہیں۔
نازک:۔ دیکھنا کیسی دل لگی ہوتی ہے۔ شرما شرما کے نہ رہ جائیں تو جب ہی کہنا میں چوکنے والی تو ہوں نہیں۔

اس کے بعد حسن آرا نے مضمون پڑھنا شروع کیا۔ وھو ھٰذا۔

ہندوؤں کو نوید بشارت کہ ہمارے وطن مالوف و مانوس ہندوستان جنت نشاں کا ایک ہمدرد نوجوان محمد آزاد نامی محض اس غرض سے روم گیا تھا کہ ترکوں کا ہاتھ بٹائے اور جنگ روس و روم میں ترکوں کا شریک حال ہو کر داخل حسنات ہو۔ ہندوستان میں یہ صاحب اپنے کمال کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ لوگ ان کو سمجھتے تھے کہ یہ بادہ خوار اور رند عالم سوز قلندر مشرب آدمی ہیں مگر ان کی لیاقت اور قابلیت اور علمیت کے سب مداح و معرف تھے ایک مرتبہ ایک زاہد نے ان سے کسی مسئلہ علمی میں گفتگو کی تو ان کی منطقی تقریر سن کر دنگ ہو گیا۔ پھر شرع کی نسبت کچھ گفتگو ہوئی اس میں بھی آزاد نے اعلیٰ درجے کی واقفیت ظاہر کی۔ مگر عند التذکرہ ایک مرتبہ زاہد نے کہا کہ باوصف علمیت آپ کے مزاج میں تواضع اور فروتنی نہیں ہے۔ یہ کیا وجہ ہے۔ برجستہ جواب دیا:

تواضع چاہتے ہو زاہدو کیا بادہ خواروں سے
کہیں جھکتے بھی دیکھا ہے بھلا شیشے کی گردن کو

زاہد نے کہا یہ صرف زبانی داخلہ ہے، یا واقعی۔ کہا زبانی نہیں واقعی امر ہے۔ پوچھا کیا آپ اس کو شرع کے خلاف نہیں سمجھتے بے جھجک کہا:

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

زاہد کو سخت استعجاب ہوا۔ آزاد نے کہا میری زیست میری موت سب معشوقہ کے ہاتھ ہے۔ اگر زندہ رکھنا چاہے تو عذر نہیں اگر مار ڈالے تو شکایت نہیں۔

مثل فنا ہے غیر کے ہاتھوں مری بہار
سر سبز گرچہ ہوں چمن روزگار میں

جب آزاد نے ان سے دو گھنٹے کامل گفتگو کی تب یہ سمجھے کہ آزاد با کمال آدمی ہے اب اس کو درجۂ اعلیٰ حاصل ہوگا۔ اور اس کو شعار و دثار صوفیوں کا ہے:

جام جم رکھ دے طاق کسرے پر — میرا چلو شراب سے بھر دے

زاہد نے دریافت کیا کہ کسی ولی اللہ کی بیعت لائے ہو کہا اس سوال کا جواب نہ دیں گے۔ ع

آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیا مد

آزاد فرخ نہاد کا چہرہ اس امر کا شاہد ہے کہ وہ معقول بندۂ خدا ہے۔ اللہ جمیلٌ و یحبُّ الجمال۔ رُخِ انور سے نور برستا ہے:

ہے ترے رُخ سے آفتاب خجل — کفِ پا سے ہے ماہتاب خجل

جام پر ہنس رہا ہے ساغرِ لب — چشمِ می گون سے ہے شراب خجل

ہنستے ہیں جب وہ دانت دیکھ لئے — ہو گیا گوہر خوش آب خجل

دیکھتے ہی عرق عرق ہو جائے

آگے اوس گل کے ہو گلاب خجل

بہار :- کیا یہ سچ ہے حسن آرا۔ ہم نے تو آنکھوں بھی نہیں دیکھا۔

نازک :- اب دیکھ لینا۔ اسی مہینے میں دیکھ لوں گی بہن۔

مغلانی :- اللہ وہ دن دکھائے۔ آمین آمین۔

نازک :- پھر حسن آرا کے دماغ کاہے کو ملیں گے مگر ان میں کوئی بات ہے جو ان میں نہیں۔ وہ بھی خوبصورت حسین ماہرو زیبا اندام بلورین ذقن ہیں۔ یہ بھی حسن میں بے نظیر نسرین بدن غنچہ دہن سیم تن کروروں میں ایک ہیں۔ وہ لاجواب۔ یہ لاکھوں میں انتخاب۔ ان پر صدہا عورتیں اور پریاں عاشق ہوئیں تو ان پر یہ شعر صادق آتا ہے:-

سارا عالم ہے ترے دامِ محبت کا اسیر

صید کیا صیاد بندھتے ہیں تیری فتراک میں

اُن کو دیکھ کر کوئی کہے گا کہ یہ کیا حسین جوان ہے تو:

اُن کی صورت دیکھ کر رضواں یہی کہنے لگا

سچ تو ہے یہ آدمی بھی حور سے کچھ کم نہیں

یہ بھی عالی خاندان معالی دودمان ہیں اُن کے چہرے سے اگر شان ریاست عیاں ہے تو ان کے بشرے سے بھی شہزادگی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ راتوں کو فرطِ عشق سے تڑپ تڑپ کر یہ شعر زبان پر لاتے ہوں گے۔

تڑپتا ہوں مثالِ برق یادِ یار جانی ہے — مجھے ابرِ شبِ ہجراں بلائے آسمانی ہے

یہ دن رات اس بیت کو وردِ زبان کرتی ہوں گی:

بھلا اے عشق، یہ بھی کوئی اپنی زندگانی ہے

فغاں ہے درد ہے غم ہے الم ہے ناتوانی ہے

نازک ادا نے حسن آرا سے اخبار لے کر پڑھنا شروع کیا۔ آزاد پاشا جوان وجیہ وصبیح، جوان رعنا، خوش قطع، خوش پوش، سرخ وسفید، طاقتور، دراز قامت، فراخ پیشانی، ذی علم، ذی استعداد شاعر غرا نثار بے ہمتا ہونے کے علاوہ فنون سپہ گری سے بھی خوب واقف ہیں۔ بانک پٹا کشتی لکڑی بنوٹ کوئی فن ایسا نہیں جوان کو نہ آتا ہو اور پرلے کے ظریف اور بذلہ سنج آدمی —— ایک روز اوپچی بنے ہوئے ایک دریا کے کنارے کھڑے موجوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ کہ دو بتان طناز وسراپا انداز محبوبان یوسف لقا ورنگین ادا پر نظر پڑی اور آنکھ لڑتے ہی عاشق زار ہو گئے۔ اس روز تو وہاں سے تڑپتے ہوئے روانہ ہوئے مگر جس وقت زلفِ عنبر بار یاد آتی تھی سانپ کلیجے پر لوٹنے لگتا تھا:

صندلی رنگ کس کا ہے جو یاد آجاتا

درد سر اور بھی صندل سے سوا ہوتا ہے

دوسرے روز پھر یہ وہیں پہنچے اتفاق سے اُن بتان عربدہ جو کی ان پر نظر پڑی تو دو بہنیں جن میں ایک کا نام حُسن آرا دوسری کا فلک آرا ہے۔ آپس میں یوں گفتگو کرنے لگیں:

بہار:۔ حسن آرا تو ٹھیک لکھا ہے مگر سپہر آرا کا نام فلک آرا اچھا رکھا۔ یہ اخبار رہنے دو سپہر آرا کو دکھا دیں گے۔

نازک:۔ لو حُسن آرا اب ہندوستان بھر میں مشہور ہو گئیں۔

بہار:۔ پھر اس میں چڑھانے کی کیا بات ہے۔

نازک:۔ تم کو کسی اور کی تقریر میں دخل دینا کیا فرض ہے خواہی نخواہی چھیڑ کے لڑتی ہے یہ عورت اور جواب کی میں کچھ کہوں تو کیسی ہو صاحب۔

بہار:۔ آپ دل کھول کے کہئے منع کس نے کیا ہے۔

نازک:۔ اب سُنو۔ ایک کا نام حسن آرا، دوسری کا فلک آرا۔

حسن:۔ بہن ذری سامنے تو دیکھو وہ دریا کے کنارے۔

فلک:۔ باجی میں گھنٹہ بھر سے دیکھ رہی ہوں کیا صورت ہے۔

حسن:۔ چُپ چپ۔ ایسا نہ ہو کوئی سن لے۔

ع دیوار گوش دارد آہستہ لب بجنباں

دیکھو سر سے پا تک نور کا عالم ہے۔ تصویر کھنچی ہوئی ہے۔ سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

فلک :- باجی ایسا آدمی تو نہیں دیکھنے میں آیا:

وصف اُس عارض و گیسو کے کروں کیا واللہ
روز روشن ہے اگر وہ تو شبِ تار ہے یہ

حسن :- اور اسی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔

فلک :- باجی اس نے کسی روز ہم تم کو دیکھ لیا ہے۔ اب ذری اس طرح بے نقاب نہ نکلا کرو۔ زمانہ برا اور لوگ بد۔

حسن :- ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ جوان رعنا ہمارا دل لے لے گا:

نہ تھے ہم پیش ازیں آگاہ حال عشقبازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے

فلک :- (کھڑکی کھول کر) باجی وہ تو اسی طرف دیکھ رہا ہے۔

حسن :- اے ہے کیسی نادان ہے ارے کھڑکی نہ کھولنا۔

فلک :- میں نے تو کھول دی (بند کر کے) کیوں کیا کچھ ڈر پڑا ہے۔

تو پاک باش برادر مدار از کس باک
زنند جامۂ ناپاک گازران بر سنگ

حسن :- بہن تم تو سمجھتی نہیں ہو۔ یہ باتیں بس پڑھتے ہی میں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

اتنے میں وہ جوان رعنا کسی قدر قریب آکر بآواز بلند و لحن داؤدی اشعار فارسی اس طرح گاتے ہوئے پڑھنے لگا تو یہ دونوں بہنیں کمال شوق سے سُننے لگیں:

دردِ دلم کہ پیش تو افسانہ پیش نیست	چشم ستارہ را مژۂ خوں چکاں دہد
رنجد ز سیر باغ مگر در خیال دوست	از جوش لالہ خاک زخونم نشاں دہد
چوں دلستاں ربود بہ یغما دلے کہ بود	کام دلے کہ ہست ندانم چساں دہد
چوں خود ز نازکی رقم صنع برنتافت	سعی نظر چگونہ خبر زاں میاں دہد
خوشنودم از سپہر ندانند مگر کسے	کو دل چو من بدل بر نامہرباں دہد
رنگ از گل است و سایہ ز نخل و نوا ز مرغ	ہر جا بہار ہر چہ بود در خور آں دہد

حسن :- اس میں غلط بیانی بہت ہے۔ یہ غزل نہیں پڑھی تھی۔

بہار :- پھر کون غزل تھی یاد ہے تمہیں۔

حسن :- ہاں ہاں خوب یاد ہے پہلا شعر یہ تھا۔

از عاشقان صادقت اے دلستاں منم
اول کسے کہ بر تو فدا شد ز جاں منم

نہیں نہیں یہ تو اور شعر ہے۔ ہمیں غزل خود یاد نہیں آتی۔

گیتی :- اور سپہر آرا نے کھڑکی سچ مچ کھولی تھی۔

حسن :- ہم دونوں گھوڑوں پر سوار دریا کی طرف جاتے تھے کہ بجر دن پر سوار ہو کے ہوا کھائیں، پس راہ میں نظر پڑی پہلے تو تعجب کیا کہ گھوڑے کی سواری کیسی، مگر دوسرے تیسرے روز معلوم ہوا کہ ہندوستان بھر سے ان دونوں کی خو بو نہیں ملتی۔

نازک :- اے ہاں کبھی عورت کو بھی گھوڑے پر سوار ہوتے دیکھا ہے۔

حسن :- مرہٹوں کے ملک کی طرف سب سوار ہوتی ہیں۔

نازک :- اچھا ہوگا۔ سنو تو :

ہر صبح باد صبح بمرغاں شاخسار
سر مستی شمیم و نشاں فغاں دہد

یہ غزل سن کر وہ دونوں بہنیں مست ہو گئیں۔

حسن :- اے ہے کیا جھوٹ فضول لکھا ہے۔

نازک :- اے تو بہن اتنا نہیں سوچتی ہو کہ تمہارے گھر کی بات لکھی ہے۔ اس قدر بھی لکھا تو بہت لکھا۔

نازک ادا نے بقیہ مضمون سنایا۔ آخر کار ایک روز اس جوان رعنا کے طالع فرخ نے یاری کی اور بخت بیدار نے مددگاری کہ ان لعبتان چینی سرمایۂ نازنینی نے اس کو بلایا اور بہ لطف پیش آئیں۔ بڑی بہن نے باتیں کیں۔

حسن :- بڑے بے جھجک آدمی ہو جی۔ ماشاء اللہ۔

آزاد :- آہ سرد دل پر درد سے بھر کر :

غم عشق تو پایا می ندارد   چہ دردست ایں کہ پایا می ندارد

جنون را گو کہ سوی ما نیا ید — کسے ایں جا گریبانے ندارد
اثر در گریۂ مجنوں مجوئید — کہ لیلیٰ چشم گریانی ندارد
چہ داند رتبۂ خار سفیاماں
سیہ روزے کہ دامانے ندارد

دس بارہ روز کی آمد و رفت میں دونوں کا دل مل گیا! اور دونوں نے پاکبازی کے ساتھ کہا کہ بشرائط چند در چند شادی ہو۔ آخر کار اس عفت مآب بیگم نے یہ بات تجویز کی کہ آزاد۔ روم جائیں اور وہاں سے نیک نامی حاصل کر کے اور غنیم کو شکست دے کے واپس آئیں تو شادی ہو۔ وہ تو عاشق صادق تھا ہی فوراً اس رائے کو منظور کر لیا۔

اس کے بعد اخبار نویس نے آزاد کی کل کارروائیاں اور کارنمایاں اور سختیوں کو اس طرح پرادا کیا تھا کہ جس نے سنا پھڑک گیا۔ اور حسن آرا کے دل کا اس وقت عجیب حال تھا اور جب درد و الم اور مصائب و سختی کا حال حسن آرا نے سنا تو آنکھیں اشکبار اور وحشت کی سی حالت ہو گئی:

اَلحَذَر جوشِ جنوں سلسلہ جنباں پھر ہے — الاماں خاطر ناشاد پریشاں پھر ہے
دامن وادی وحشت مرا چاک گرداں پھر ہے — جادۂ دشت مرا چاک گریباں پھر ہے
موج اشکوں سے نظر آتی ہے زنجیر مجھے
پیچ تقدیر کا ہے طوقِ گلوگیر مجھے

ان روایتوں اور اخباروں نے حسن آرا کو آزاد فرخ نہاد کا اور بھی عاشق زار بنایا۔ ایک تو یوں ہی عشق صادق تھا اور یہ بیان اس پر طرہ ہوئے۔ جیسے سونے پر سہاگا۔ اب اور بھی شوق کی آگ بھڑکی کہ یا خدا جلد اس یوسف جمال کی صورت دکھا ایک ایک دن کی جدائی سخت گزرتی تھی دل کو ڈھارس دیتی تھی کہ:

غم مخور حافظ بہ سختی روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

حسن آرا بیگم دو روز تک اسی ادھیڑ بن میں رہیں۔ کہ آزاد سے خط و کتابت شروع ہو۔ اور اصرار کر کے لکھیں۔ کہ روم سے بعد خرابی بصرہ واپس آئے۔ تو اب ادھر ادھر کہاں مٹر گشت کرتے ہو۔ بخط راست آؤ۔ تو ہم تم دونوں صنم آرزو سے ہم آغوش ہوں۔ اس مصیبت اور پریشانی طرفین کے بعد شاہد مدعا جلوہ دکھائے اور لطفِ صحبت نصیب ہو۔ آخر کار جب عاشق زار اور محبوب مطلوب کا پتہ نہ

ملا تو اپنی ہمشیرہ مہربان کے نام بمبئی خط روانہ کیا۔ لکھا کہ باجی از برائے خدا تباؤ تو کہ اب وہاں سے کہاں چل دیئے۔ آئے ہیں تو یہ ترسانا کیا معنیٰ۔ خط لکھ کر بھیجا ہی تھا کہ ایک مہری دوڑتی ہوئی آئی اور کہا حضور بمبئی سے شمس النساء بیگم صاحب تشریف لائی ہیں۔ ممتاز دولہا (نواب صاحب) بھی آئے ہیں۔ ابھی گاڑیاں دروازے پر لگائی گئیں۔ پردہ کرایا گیا ہے۔ حسن آرا اور اوروں کو سخت تعجب ہوا۔

کہ اتنے میں بہار النساء نے آواز دی۔ تو شمس النساء بھی آگئی۔ بمبئی کی شوخ و شنگ بیگم صاحب گاڑی سے اتر کر چھما چھم کرتی ہوئی اندر تشریف لائیں۔ دو مغلانیاں، دو پیش خدمتیں، ایک محلدار، دو مہریاں جلو میں ہمراہ تھیں۔ جاتے ہی بہار النساء سے ملیں۔ بڑی بیگم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ وہ ان کو دیکھ کر نہایت ہی پیارے دعائیں دینے لگیں۔ حسن آرا اور روح افزا اور گیتی آرا کوٹھے سے اتریں۔

شمس النساء بیگم بہنوں سے بغل گیر ہوئیں اور تھوڑی دیر تک بڑی بیگم کے پاس بیٹھکر ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ بڑی بیگم نے دو بار مہری بھیجی کہ ممتاز دولہا کو بلا لاؤ۔ کہو مجھے صورت دکھا جائیں۔ پھر چاہے دن بھر اپنے یاروں دوستوں کے پاس رہیں۔ دوسری بار مہری نے آنکر کہا حضور تشریف لائے ہیں۔ حسن آرا وغیرہ لحاظ کے سبب سے اٹھ گئیں اور اوپر کمروں میں ان کی نشست ہوئی۔

نازک :۔ بہار النسا بہن تم نے ہم سے ان کے آنے کا ذکر ہی نہیں کیا۔ کبھی کچھ تذکرہ ہی اس بارے میں نہیں آیا۔

بہار :۔ لو اور سنو۔ کچھ سان گمان ہو تب تو کہیں۔

حسن :۔ اے باجی تو دفعتہً پہنچ گئیں اور ہم نے ابھی آپ کے نام ڈاک خانے خط بھیجا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہیں موجود ہیں۔

شمس :۔ پرسوں بیٹھے بیٹھے تم سب کے دیکھنے کا جی چاہا۔ بس میں نے بلا کے کہا اب جس طرح ممکن ہو چلو۔ تین دن کا تو راستہ ہے یہ بھی مو اکوئی بڑا سفر ہے۔ ان کے بھی دل میں کچھ آگئی اسباب بندھنے لگا۔ ریل پر سوار ہوئے اور کھٹ سے یہاں آن موجود۔

مغلانی :۔ حضور ریل کیا اڑن کھٹولا ہے۔ پرندوں کو بھی انسان نے مات کیا۔ اس ریل کے سبب سے آگو سنا کرتے تھے کہ انسان پنچھی ہے مگر اب آنکھوں دیکھا۔ کہاں بمبئی کہاں یہ شہر پرسوں چلیں آج پہنچ گئیں۔ واہ ری ریل۔

گیتی :۔ کچھ لائی ہو بمبئی سے یا خالی خولی آئی ہو۔

شمس :۔ کہتی جاتی ہوں کہ بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑی ہوئی۔

نازک :- یہ اسی واسطے کسی کو اطلاع نہیں دی۔

گیتی :- اور کیا کہ جس میں کوئی فرمائش نہ کرنے پائے۔

شمس :- اب یہی جو کچھ کہو منگوا دیں۔ ایک خط بھیجنے کی تکلیف ہے۔ دو پیسے کا خرچ۔ سو اب وہ دو پیسے بھی خرچ نہیں ہوتے۔ جیسے یہ نگوڑا پیسے والا لفافہ چلا ہے۔

نازک :- تو پیسلچے لفافہ پر آپ ہی خط لکھتی ہوں گی۔

شمس :- بہن ہم نے تمہیں اچھی طرح پہچانا نہیں۔ شاید۔

گیتی :- اے یہ آسماں جاہ ہیں ان کو اور نہ پہچانو۔

نازک :- کاہے کو پہچاننے لگیں غریبوں کو۔ اب تو بمبئی کی ہوا کھائی ہے نہ۔ اور برسوں ساتھ کھیلا ہے۔

شمس :- آسمان جاہ۔ یہ تو مردانہ نام ہے۔

حسن :- یہ تو سوا مرد ہیں۔ مرد سے کیا کچھ کم ہیں یہ۔

شمس :- اخاہ۔ ہیں اب سمجھی یہ نازک ادا ہیں۔ افوہ برسوں بعد دیکھا بہن۔ کہو وہ بیرو والا مکان یاد ہے۔

نازک :- (ہنس کر)۔ ہاں وہ بھلا بھولنے والا ہے۔

شمس :- اب آج کل جعفری خانم کہاں ہیں بہن۔

نازک :- ان کا ذکر نہ کرو۔ بس ناگفتہ بہ۔ وہ تو ایسی خراب نکلیں کہ خدا نہ کرے کسی کی بہو بیٹی ایسی نکلے میاں سے آئے دن جوتی بیزار ہوتی تھی۔ ساس کی ناک میں دم کر دیا۔ محلے بھر سے جھگڑا۔ ان کے خالو ابّا کے لحاظ سے کوئی بولتا نہ تھا۔ سب طرح دے جاتے تھے۔

بہار :- آزاد تو تمہارے وہاں کوئی چار پانچ روز ٹکے رہے تھے

شمس :- نہیں تو وہ اٹھوارے سے زیادہ بمبئی میں تھے۔ جس طرف گلی کوچے بازار کی طرف سے نکل جاتے تھے۔ انگلیاں اٹھتی تھیں۔ کہ وہ آزاد پاشا جاتے ہیں۔ پارسیوں نے ان کی دعوت کی تھی۔ اس دن کئی من پھول ان پر پڑے۔ پارسیوں کی عورتیں رنگ برنگی قیمتی ساڑیاں اور بیش بہا پوشاک پہن پہن کر ان پر پھول نکی برکھا کرتی تھیں۔ صاحب لوگوں نے بھی ان کی دعوت کی۔ بمبئی کے مولویوں نے ان کو بلوایا۔ اور بڑی تعظیم اور تپاک سے ان کی خاطر اور مہمان داری کی اور اتنی تعریفیں ہوئیں کہ وہ سنتے سنتے تھک گئے۔

نازک :- اللہ ری نازکی۔ کوئی ہماری تعریف کرے تو ہم عمر بھر سنتے سنتے نہ تھکیں۔ وہ ایک ہی دو دن میں تھک گئے۔ عورتوں سے بھی زیادہ نزاکت ہے۔

حسن :۔ تمہاری تعریف تو ایک زمانہ کرتا ہے حسن کی تقریر کی۔

نازک :۔ آپ بھی بولیں۔ ماشاء اللہ خیر۔ اور تمہاری

حسن آرا بیگم کسی بہانے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئیں۔ تو بہار النساء تاڑ گئی کہ تخلیے میں آزاد کا حال پوچھنے والی ہیں۔ باتوں باتوں میں شمس النساء سے کہا، جاؤ وہاں حسن آرا سے باتیں کرو، شاید کچھ پوچھنا گچھنا ہو۔ شمس النساء اس کمرے میں جا کے حسن آرا کے پاس بیٹھیں۔ حسن آرا نے کہا۔ باجی سچ کہنا تمہاری کیا رائے ہے۔ شمس النساء، تو آزاد کا دم بھرتی ہی تھی۔ کہا، بہن جس کی قسم کہو اس کی قسم کھاؤں۔ یہ جوڑی اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔ تمہارے لئے ایسا ہی میاں چاہیئے جو تمہاری طرح حسن میں لاکھوں میں ایک ہو۔ تو علم میں بھی کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ جس طرح ہم جولیوں میں تم سب سے زیادہ حسین اور سب سے زیادہ پڑھی لکھی ہو۔ اسی طرح مردوں میں وہ ہیں۔ ان کے مقابلے کا اور کون ہے۔ اس شہر کی بیگموں میں تم سے زیادہ تربیت کس نے پائی ہے۔ کسی نے نہیں۔ اور ایک اس شہر پر فرض کیا ہے میں تو جانتی ہوں ملک میں تم جتنا پڑھی ہو ہندوؤں مسلمانوں میں کوئی لڑکی نہ پڑھی ہو گی۔ ایسا ہی ان کا بھی حال ہے۔ پھر جیسے وہ پاکباز ہیں۔ ویسی ہی پاکدامن تم بھی ہو۔

حسن :۔ یہ تو بتایئے باجی جان کہ وہ دکرڑی ان کے ساتھ کیسی ہے۔

شمس :۔ اے ہے اس کا ہرگز ہرگز خیال نہ کرنا۔

حسن :۔ آخر کش یہ تو معلوم ہو کہ ان کے ساتھ وہ کیوں آئیں۔

شمس :۔ پہلے تو میں بھی کھٹکی تھی۔ میں سچ کہوں مجھے بھی شک ہوا کہ ایسی کم سن اور اس قدر خوبصورت اور طرح دار اور بانکی بن بیاہی چھوکریاں ان کے ساتھ وہاں سے کیوں کر آ گئیں۔ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے مگر جب میں نے خوب دریافت کیا اور ان دونوں کو بلوایا۔ اس نے باتیں کیں کئی دن ان کو اپنے ہاں رکھا تب میرا شک بالکل جاتا رہا، تم بھی دیکھو تو جی خوش ہو جائے۔ ایسی حسین ہیں ایک سے ایک بڑھی ہوئی۔ ایک تو آزاد کی عاشق زار ہے۔ اس نے آزاد سے پیغام شادی اپنے آپ کیا، مگر انھوں نے جواب دیا۔ صاف ٹکا سا جواب دیا کہ حسن آرا سے وعدہ کر کے آیا ہوں۔ اب بھلا تمہارے ساتھ کیوں کر شادی کر سکتا ہوں۔ بس وہ آگ بھبوکا ہو گئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ قید خانے بھجوا دیا۔

حسن :۔ باجی جان سچ کہنا ہے عاشقِ صادق یا نہیں۔

شمس :۔ اے لو اور سنو ہم سے پوچھتی ہو۔ اس میں شک ہی کیا ہے۔

حسن :۔ جہاں جہاں گیا۔ ہر مقام کی شہزادیاں، اور رئیس زادیاں عاشق ہو گئیں۔ اس نے انکار ہی کیا

اور ہمارا ہی نام لیا۔

شمس :۔ ایسے ہی سے تو دل مل جاتا ہے۔ ورنہ وہ کس کام کا۔ جو ہر دیگچی کا چمچا ہو۔ آج اس کو بیاہا، کل اس کو عقد میں لایا۔ ؎

نشاید ہوس باختن با گلی
کہ ہر بامداد اوشش شود بلبلی

حسن :۔ اچھا تو کچھ معلوم ہوا کہ آخر پھر کیا ہوا قید خانے سے کیونکر بچے۔

شمس :۔ اسی نے بچایا۔ ان سے اس نے کہا کہ اب میں تم کو اس زنداں بلا سے رہائی دلوائے دیتی ہوں۔ بس رہا ہو گئے اور پھر ان سے کہا کہ کیوں سٹرٹی ہوئے ہو اب بھی مان جاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ اس کے بعد آزاد کو فوج میں افسری کا عہدہ دلوا دیا۔ اب آزاد چکر میں آئے بغیر روپیہ کے وہاں کیا کر سکتے تھے بڑی مصیبت میں پڑے آخر کار وہی جا کے روپیہ لائی اور دست بستہ اُن سے کہا کہ میں تم پر مرتی ہوں تم مسلمان ہو۔ تمہارے یہاں چار شادیاں تک جائز ہیں مجھے بھی اپنی لونڈی بناؤ۔ آزاد کو اس بات سے نفرت کلی۔ مگر مجبور ہو کر منظور ہی کرنا پڑا۔

حسن :۔ تو کیا شادی ہو گئی ہے۔ کیا نکاح ہو گیا ہے۔

شمس :۔ ابھی نہیں۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ اگر حسن آرا بیگم اجازت دیں۔ تو شادی ہو۔ ورنہ ہم اصرار نہ کریں گے۔ بڑی صاف طینت اور نیک نیت ہے۔

حسن :۔ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم تو نہ چاہیں گے کہ اس مصیبت کے بعد آزاد کو کسی اور کی بغل میں دیکھیں

شمس :۔ مجبوری ہے۔ اس نے بھی کارنمایاں کیا ہے۔ نوکری اس نے دلوائی۔ اگر آزاد فوج میں بھرتی نہ ہوتے تو آج پاشا کا خطاب کس کو ملتا۔

حسن :۔ یہ تو سچ کہتی ہیں آپ۔ ہے تو ایسا ہی۔

شمس :۔ اچھا اور اگر روپیہ سے وہ مدد نہ کرتی تو کیا ہوتا۔

حسن :۔ بیشک یہ تمغے کون لٹکاتا اور نام کون کرتا۔

شمس :۔ پس پھر اب تم کو سوچنا چاہئے۔ کہ تم سے کچھ کم اس کا حق نہیں ہے۔ اس بارے میں زیادہ اصرار کرنا نادانی ہے۔ اور خبردار اب تو کہا خیر کہا۔ اب کسی کے سامنے زبان سے نہ نکالنا خبردار۔ خبردار۔

حسن :۔ اے توبہ اسی سے تو میں یہاں چلی آئی۔ یہ باتیں کسی کے سامنے کہنے کی ہیں۔ بھلا مجھے تو یہ بھی نہیں لازم ہے کہ آپ یا بہار النساء کے سامنے کہوں۔ مگر کیا کروں رہا نہ گیا تو مارا اگر دگستاخ۔

شمس :- آزاد اب آیا چاہتے ہیں۔ کیا صورت زیبا اور سراپا سانچے کا ڈھلا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

حسن :- (مسکرا کر) ع خاموشی از ثنای تو حد ثنای تست۔

شمس :- وہ دونوں سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔

حسن :- اس اجنبی ملک میں جائیں کہاں اور ہاں یہ تو بتائیے، زبان کون بولتی ہیں۔ ہماری آپ کی سمجھ میں ان کی بولی کاہے کو آئے گی۔

شمس :- توبہ توبہ۔ وہی گٹ پٹ کیا کرتی ہیں بس۔

حسن :- دولہا سے بھائی تو خوب نہ بنتی ہوگی۔

شمس :- بڑی موافقت ہے۔ شکر و شیر۔ دونوں ایک۔

حسن :- وہ کیا کہتے ہیں۔ ان دونوں کی نسبت ان کی کیا رائے ہے۔

شمس :- وہ تو آزاد کے بھائی بنے ہیں۔ جو ہیں آزاد ہیں۔

حسن :- اماں جان سے بھی ذری تعریف کر دیجیے گا جس میں وہ اور بھی زیادہ خوش ہوں کہ حسن آرا کی رائے غلط نہیں نکلی۔

شمس :- میں بخوبی کہہ دوں گی۔ اور تمہارے دولہا بھائی نے خود ہی کہہ دیا ہوگا۔ بھلا وہ کب چوکنے والے ہیں۔

ادھر یہ باتیں ہوتی تھیں ادھر نازک ادا بیگم کو شوخی خرام کہ کوئی غزل گائیں اور دو گھڑی دل بہلائیں۔ بہار النساء بیگم ان کے گانے پر عاشق تھیں۔ انھوں نے اور بھی پر چلک دی اور اس شوخ رنگین مزاج نے یہ غزل خوش الحانی سے گانا شروع کی۔

غلطیدنِ من بر درِ میخانہ ضرورست | بر تہمتِ مے لغزشِ مستانہ ضرورست
مشتی گہر از اشک فشاندیم بمستی | یعنی عوضِ جرمِ جبر پیمانہ ضرورست
تا نشہ دو بالا شودم بہرِ تفرج | لیسیدنِ دردِ تہِ پیمانہ ضرورست

اے آنکہ بہ یک دو حرفم نہ نوشتی
باد آوری ربط قدیمانہ ضرورست

شمس النساء بیگم نے جو یہ خوش آوازی سنی۔ تو بیقرار ہو گئیں۔ کہا یہ کون ڈومنی آئی ہے۔ کیا گلا پایا ہے ذری اس کو یہاں بلا لو۔

حسن :- اے باجی بہار النساء بہن۔ ذری اس ڈومنی کو بھیج دو۔

نازک :- بہت خوب سرکار۔ حاضر ہوئی۔ ابھی ابھی آئی۔

شمس :- یہ تو نازک ادا بیگم نے جواب دیا۔ ڈومنی کہاں ہے۔

حسن :- (مسکرا کر) اے بہن ڈومنی کو یہاں بھجوا دو ذری۔

نازک :- وہ بڑی ڈھیٹ ڈومنی ہے۔ کسی کی سنتی ہی نہیں۔

شمس :- منہ لگائی ڈومنی ہے گی بہن۔ جب ہی نہیں سنتی۔

نازک :- پھر بہ دستور گانا شروع کیا۔

چوں بادیہ قیس تہی مانند دراں جا

وحشت زدہ چوں من دیوانہ ضرورست

شمس :- اے ہے تم نے بھی کیسا بہکا دیا۔ میں سمجھی سچ مچ کوئی ڈومنی ہی ہے۔ یہ تو نازک ادا ہیں خوب گانے لگی ہیں۔

نازک :- ہم کو ڈومنی بنایا ہے آپ نے۔ یاد رکھیے گا۔

مے خوردن و خوش زیستن و توبہ شکستن

اینہا ہمہ در مشربِ رندانہ ضرورست

شمس :- اللہ جانتا ہے خوب گاتی ہو۔

اب سنیے کہ انھوں نے جو جوش میں آن کر گانا شروع کیا۔ تو نیچے تک آواز گئی۔ بڑی بیگم صاحب کے پاس اس وقت ان کے اعزہ میں سے کلثوم النسا نامی ایک بیگم صاحب بیٹھی تھیں۔ یہ بیگم صاحب گانے کی از بس شائق تھیں۔ بڑی بیگم صاحب سے معاً فرمائش کر بیٹھیں کہ اس ڈومنی کو بلاؤ۔ مگر بے ساز کے گانا ادھورا ہوتا ہے۔

بڑی بیگم :- (مہری سے) کیا کوئی ڈومنی آئی ہے۔ یہاں بلا لو۔

مہری :- (مسکرا کر) حضور ڈومنی یہاں کہاں ہے۔ یہاں تو کوئی ڈومنی ڈومنی نہیں آئی۔ اور نہ گانے کی آواز آتی ہے۔

بڑی :- میں نے بھی گانے کی آواز نہیں سنی۔ ڈومنی آتی تو مجھے بھی ضرور اطلاع ہو جاتی اور تمھیں گانے کی آواز کہاں سے آئی۔

کلثوم :- اے واہ ایسی بات ہے۔ بھلا ٹھہر جاؤ۔

مہری :- حضور کہیں پڑوس سے آئی ہوگی آواز۔

کلثوم :۔ کچھ پٹرن ہے کیا۔ صاف کوٹھے پر ڈومنی گاتی تھی۔
بڑی :۔ اچھا کوٹھے پر ڈومنی ہو تو بلا لو جا کے۔ کہو بلاتی ہیں۔
مہری :۔ بہت اچھا حضور۔ مگر آتی تو جاتی کدھر سے۔
مہری تو خوب واقف تھی کہ نازک ادا بیگم تانیں اڑا رہی ہیں۔ جلدی جلدی کوٹھے پر جانے لگی۔ کہ ادھر نازک ادا نے پھر بے تکلفی سے گانا شروع کیا۔

جشنِ شاہانہ باقبال مبارک باشاد
ثروت و حشمت و اجلال مبارک باشاد

کلثوم :۔ اب آواز آئی کہ اب بھی نہیں سنائی دیا۔
بڑی :۔ ہاں سچ تو ہے۔ لطیفن دیکھو تو کون ہے۔
لطیفن :۔ حضور مہری گئی ہے۔ بیشک کوئی گا رہا ہے۔
کلثوم :۔ کوئی! صاف ڈومنی کی آواز ہے۔ اور شہر ہی کی ہے۔
مہری جو چھت پر پہنچی تو زینے سے اشارہ کرنا شروع کیا کہ خاموش رہو۔ اب وہیں سے انگشت شہادت ہونٹوں پر رکھ کر اشارہ کرتی ہے۔ کہ چپ رہو۔ مگر یہاں سب کی سب ہنس رہی ہیں۔ کسی نے ائین اگری چڑھ گئی کیا۔ کوئی بولی آسیب ہے۔ اب اس زینے کی طرف سے ذرا سمجھ بوجھ کے جانا جب قریب آئی جھلا کر کہا حضور خاموش رہیئے۔ اشارے کیے جاتی ہوں کوئی سنتا ہی نہیں۔ بڑی بیگم صاحب کے پاس کلثوم النساء بیگم بیٹھی ہیں رو وہ جو وہاں رہتی ہیں چھتے کے پاس۔
نازک :۔ (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ارے!۔
بہار :۔ انھوں نے سنا تو نہیں۔ اب نہ گاؤ۔
مہری :۔ اے حضور آدھے گھنٹے تک بحث رہی۔ جب آپ نے گانا موقوف کیا تو میں نے کہا مجھے تو گانے کی آواز نہیں آتی۔ وہ خفا ہونے لگیں کہ واہ ڈومنی گا رہی ہے۔ مجھے کچھ تو ہنسی آئی اور کچھ دل میں شرم آئی تھی۔
نازک ادا بیگم کو سخت رنج ہوا۔ بہار النساء سے یہ جو آئی ہیں ان کا ہم کو بڑا لحاظ ہے اب از برائے خدا کسی طرح بات ٹالو۔ جو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ گاتی تھیں تو غضب ہی بپا ہو گا گانا سننے کی بڑی شوقین ہیں مگر جہاں بہو بیٹی ہیں کسی نے گانا سیکھا بس آگ ہو جاتی ہیں۔
اتنے میں لطیفن نے آن کر کہا۔ چلئے بلا رہی ہیں وہ آئی ہیں چھتے والی کلثوم النساء بیگم

کہیں آپ کا گانا سن لیا بس اب رولگائی ہے کہ اب ان کو بلالو مگر ان کو یہ نہیں معلوم ہے کہ آپ گاتی تھیں وہ تو ڈومنی سمجھی ہوئی ہیں۔

بہار النساء نے کہا روح افزا کو بھیج دو یہ سمجھ کے بات ٹال دیں گی۔ روح افزا مہری کے ساتھ گئی۔

بڑی :- بیٹا کیا ڈومنی بلوائی ہے۔ یہ گاتا کون تھا۔

روح :- اماں جان بغیر آپ کے حکم کے ڈومنی کبھی بھی آئی ہے۔

بڑی :- ہاں وہی میں نے کہا۔ اچھا پھر یہ گاتا کون ہے۔

روح :- یہی مغلانی کی چھوکری اور وہ جو پرسوں چھیٹن کی بہن آئی تھی۔ ابھی ابھی اپنے گھر گئی وہ چھیٹن سے بھی اچھا گاتی ہے۔

کلثوم :- اے ہے ناحق جانے دیا۔ میں تو بے چین ہو گئی تھی سن کر

بڑی :- بس اسی لئے بلایا تھا جاؤ بہنوں کے پاس۔

روح افزا خوش خوش آئیں۔ کل باتیں کہنے ہی کو تھیں۔ کہ گیتی آرا نے کہا۔ ہم چھجے کے پاس سے سب سن رہے تھے۔ آپ کے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔

مصنوعی مرزا ہمایوں فر

سپہر آرا بیگم نے اپنی بہن سے کمرے میں علیحدہ باتیں کیں۔ کہا باجی جان میری سمجھ میں آج تک خو نہیں آیا کہ یہ کیا اسرار ہے اور کیا ہوا اور تین چار دن سے راتوں کو بڑے بڑے خواب دیکھتی ہوں۔ کبھی دیکھتی ہوں کہ خدانخواستہ گھر میں کئی جنازے آئے ہیں۔ کبھی دیکھتی ہوں کہ اماں جان کو نصب اعدا لوگ زبردستی جلا رہے ہیں۔ بس یہ خواب پریشان دیکھ دیکھ کے چونک پڑتی ہوں۔ کئی دن سے دو تین فرنگی روز آتے ہیں کوئی تحریر دیکھتا ہے۔ کوئی باتیں کرتا ہے۔ کوئی پوچھتا ہے کہ فلاں سال ہم سے آپ سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔

اب کل کا دن اس امر کے فیصلے کا قرار پایا ہے کہ قبر کھودی جائے یا نہ کھودی جائے۔ جسن آرا کو یہ خبر سن کر بڑا رنج ہوا کہ ابھی تک وہ جھگڑا باقی ہے۔ سپہر آرا سے پوچھا سچ کہنا تم کو بھی کچھ شک ہوا یا نہیں۔ وہ مسکرا کر بولی باجی جان مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ شک کا ہے کا اور میں نے خیر دور سے

دیکھا ان کی اماں ان کی بہنیں ان کی کھلائیاں دائیاں کسی کو تو دھوکہ ہوتا۔ اب تو باہر آنے جانے کی اس قدر روک ٹوک نہیں ہے۔ جیسی پہلے تھی۔ کہتے تھے کہ آپ اگر بُلائیں تو کسی روز چلا جاؤں اماجان سے کہہ کر بلوا لیجئے۔

حسن آرا اُسی وقت بڑی بیگم کے پاس گئیں اور کہا اماں جان اب تو شہزادے دولہا باہر نکلتے ہیں کل بلوایئے نہ اس روز سے آج تک آتے ہی آتے رہ گئے اُسی دم بڑی بیگم نے مہری بھیجی۔ اب سنئے کہ حسن آرا اور سپہر آرا اور گیتی آرا اور جہاں آرا اور رُوح افزا اور بہار النسا اور شمس النسا اور دو تین اور ہمجولیاں مہتابی پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھا رہی تھیں کہ مہری بیتابی کے ساتھ دوڑتی ہوئی آئی اور ہانپتے ہوئے یوں کہنے لگی۔

مہری :۔ اے حضور۔ اُف۔ مارے۔

روح :۔ خیریت ہے یہ اس قدر دوڑ کے کیوں آئی نصیبن۔

مہری :۔ حضور مجھے بڑی بیگم صاحب۔ وہاں اُس وقت بھیجا تھا سمدھیانے۔ سو وہاں میں نے دیکھا کہ بہت سے آدمی جمع تھے۔ سنا کہ صاحب لوگوں نے سرکار سے لکھوا منگایا کہ مجھ سے کہا نہیں جاتا حضور۔

روح :۔ کہو تو کیا لکھوا منگوایا ہے۔ اَیں! اب چپ ہے اور یہاں دل بے قرار ہو گیا۔

مہری :۔ حضور میری زبان سے وہ لفظ نہیں نکلتا ہے۔

حسن :۔ سپہر آرا کے ہاں سے آتی ہو نہ پھر وہاں جماعت کیسی۔

مہری :۔ اس قدر کا جماؤ ہے کہ عرض نہیں کر سکتی۔

سپہر :۔ کلیجہ دہل گیا ہے، اور یہ کمبخت نہیں بتاتی۔ دور ہو میرے سامنے سے۔ اس کی صورت سے مجھے ہمیشہ سے نفرت ہے۔ کیا آگ لگ گئی کوئی جل مرا۔ ڈوب گیا۔ زمین پھٹ گئی۔ مکان ڈھے گیا۔ آخر ہوا کیا۔ بتانے میں کیا تامل ہے۔

مہری :۔ حضور سنا کہ تحقیقات جو کی گئی تو شہزادے ہمایوں ذرا نہیں ٹھہرے سو اب صاحب لوگ جمع ہوئے ہیں اور گھر بھر میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔

حسن :۔ (رنگ فق ہو گیا اور مثل پیکر تصویر خاموش۔)

روح :۔ (چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ دم بخود۔

بہار :۔ سکتے کا عالم۔ سکوت۔ مہر برلب۔

گیتی :۔ سب کے چہرے کی طرف حیرت کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

جہان :۔ باجی جان۔ یہ کیا غضب کی بات کہہ رہی ہے۔

بہار :۔ میرے تو حواس ہی ٹھکانے نہیں رہے ہیں۔

سپہر :۔ اماں جان سے کہو آدمی بھیجیں۔ دریافت کریں کہ کیا بات ہوئی۔ مگر تم لوگ ذرا دل کو مضبوط رکھو۔ از برائے خدا پریشان نہ ہو۔ نہیں تو میرا بہت بُرا حال ہو جائے گا۔

مغلانی :۔ (مہتابی پر آن کر) حضور کچھ سُنا۔ افوہ۔ ہے ہے۔

حسن :۔ اماں جان کو خبر ہوئی یا نہیں۔ اُن سے تو کوئی کہہ دو۔

مغلانی :۔ وہ کب کی سن چکی ہیں۔ نواب عظمت علی خاں اور آغا صاحب اور چھوٹے مرزا صاحب کو بلوایا ہے اور عسکری میاں ان کی (سپہر آرا کی طرف اشارہ کرکے) سسرال دوڑے گئے ہیں۔

اتنے میں ایک ماما نے آن کر کل حال بیان کیا۔

ماما :۔ حضور میں ابھی وہیں سے آتی ہوں۔

روح :۔ ہاں یہ کیا بات کیا ہے۔ کچھ ڈر تو نہیں ہے۔

ماما :۔ حضور ہوا یہ کہ آج دس دن سے ہر روز صاحب لوگ اور مجسٹر یا کیا جانے کیا عہدہ ہے وہ اور ان کے افسر جو ہیں وہ اور کئی ایک آیا کرتے تھے۔ سو اب وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مرزا ہمایوں فر نہیں ہیں اور اب قبر کھودی جائے گی۔

روح :۔ ہمیں اس کا حال کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ سپہر آرا آخر یہ معاملہ اتنا طول کھینچا اور تم کانوں میں تیل ہی ڈال کے بیٹھی رہیں۔

سپہر :۔ نہیں۔ بعضی بات زبان سے نکالی نہیں جاتی۔ بس سارا پھیر یہ ہے کہ کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے۔ گو مگو کا معاملہ ہے۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

حسن :۔ مجھے بڑی تسلی ہوتی ہے کہ جب سپہر آرا خود ایسا کلمہ زبان سے نکالے اور ذرا بھی نہ ہو تو سمجھ لو کہ اس میں گھبرانے کی بات نہیں ہے

روح :۔ سپہر آرا ذرا ادھر آنا۔ ہمیں تم سے کچھ کہنا ہے۔ روح افزا نے قسمیں دے دے کر پوچھا کہ صحیح صحیح حال بتا دو۔ اب جب سارے زمانہ میں ایک بات مشہور ہو گئی تو اس کا مخفی رکھنا کیا معنی۔ سپہر آرا بولی بہن۔ کئی دن سے اس کا کھٹکا تھا کہ یہ ہمایوں فر نہیں ہیں اور وہ ہر روز اسم پڑھواتے تھے

اور بھوکوں کو کھانا کھلواتے تھے دو دو سو بھوکے کھانا کھاتے تھے اور جس نے جو کہہ دیا وہ مان لیا کسی نے کہا ایک ہندو فقیر بڑا باکمال ہے اسی کو بلا بھیجا اور مجھ سے آن کر کہا کہ اس فقیر کا ایک تو کمال یہ ہے کہ زمین سے چار چار انگل اونچا ہو جاتا ہے بیٹھے بیٹھے چار انگل زمین سے اونچا ہوا اور کسی چیز کا سہارا نہیں۔ میں نے کہا اچھا پھر اس سے مطلب۔ تب مجھے قسمیں دے کر کہا لوگوں کو ہمارے ہمایوں ہونے میں شک ہے۔ اسی سبب سے ہندو، مسلمان جو ملے اور جو کہہ دے ہمیں انکار نہیں۔

روح:۔ تم نے اتنا تو پوچھا ہوتا تم کو اپنے ہمایوں فر ہونے میں شک نہیں ہے۔ یہ تو پوچھنا تھا کہ لوگ شک کیوں کرتے ہیں

سپہر:۔ شک کیوں کرتے ہیں۔ یہ تو اچھی بات آپ نے کہی۔ اے بہن تم ہو کہاں۔ ہمایوں فر گھوڑے سے گر ے۔ زخم ایسا لگا کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اسی دم روح پرواز کر گئی۔

روح:۔ اچھا تو لوگوں کو اس کی تحقیقات کی کیوں فکر ہے۔ وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ یہ لوگ بیکار کیوں خواہی نخواہی کسی کے پھٹے میں پاؤں ڈالتے ہیں۔ اور سرکار کو اس سے کیا واسطہ ہے۔

سپہر:۔ جس شخص نے ہمایوں فر بے چارے بے گناہ کو قتل کیا تھا۔ اس کو پھانسی دی جائے تو کس بنیاد پر۔ پھر سرکار کو یہی خیال ہے نہ کہ ایسا نہ ہو کوئی ایرا غیرہ۔ نتھو خیرا روپے کی طمع سے ہمایوں فر بن بیٹھے۔

روح:۔ تمہاری باتوں سے پایا جاتا ہے کہ تم کو خود شک ہے۔

سپہر:۔ اب تو جو ہے سو ہے۔ مگر بہن تمہیں ایمان کی قسم کسی سے ذرا بھی ذکر نہ کرنا۔ میں سچ کہتی ہوں میں نے ابھی تک باجی جان سے بھی ذکر نہیں کیا۔ شہزادی بیگم اور خورشید النسا اور قمر النسا سب کو معلوم ہے اور بھی کئی آدمی جانتے ہیں۔

روح:۔ یہ بھید ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ماجرا کیا ہے۔

سپہر:۔ بس اب جانے دو یہ گفتگو ہی نہ کرنا۔ اور صبح و شام تو سب کھل ہی جائے گا۔ جب سرکار دربار تک بات پہنچی پھر بھلا کچھ ہو سکتا ہے۔ باجی جان سے ابھی نہ تذکرہ کیجیے گا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک لونڈی نے آن کر کہا عسکری میاں آئے ہیں۔ بڑی بیگم صاحب نے حکم دیا ہے کہ جا کے بہار النسا بیگم کو بلا لاؤ۔ بہار النسا اور گیتی آرا دونوں گئیں۔

بہار:۔ عسکری بتاؤ تو یہ کیا ماجرا ہے بھائی۔

عسکری:۔ اصل میں حکام کو تو پہلے ہی سے شک تھا اور ایک ان پر کیا فرض ہے زمانے بھر کو شک تھا

کہ بعد وفات از سرنو اسی حیثیت میں پیدائش ہو اس کے کیا معنی! آخر کار دو حاکم جو ہمایوں فر کے بڑے دوست تھے باہر سے آئے۔ ایک تو بر ہما بدل دیئے گئے تھے وہ آئے اور ایک پہاڑ پر تھے۔ انہوں نے جوان سے باتیں کیں تو صاف کھل گیا کہ ہمایوں فر نہیں ہیں۔

بہار :- ہاں! تم نے کسی کی زبانی سنا ہے یا خود وہیں سے آتے ہو

عسکری :- ابھی سیدھا وہیں سے تو چلا آتا ہوں۔

بڑی :- اچھا پھر۔ اب وہ بھی قبولتے ہیں کہ میں ہمایوں فر نہیں ہوں۔

عسکری :- وہ تو ابھی تک خاموش ہیں مسکرا مسکرا کے رہ جاتے ہیں۔

بڑی :- آخر شہزادی بیگم کیا کہتی ہیں یہ حال کیا ہے اس سن میں آج تک ایسی بات سُننے میں نہیں آئی تھی۔ سو اب آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔ یا الٰہی ہمارے ہی لئے یہ سب باتیں تھیں۔

عسکری :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرنے کے بعد زندہ ہو جانا کیسا ہے اور یہ کایا پلٹ کے کیا معنی! کچھ عجب گومگو کا نقشہ ہے۔

بڑی :- میں نے آغا صاحب اور چھوٹے مرزا اور عظمت علی خاں کو بلوایا ہے کہ جا کے دیکھو تو یہ کیا گورکھ دھندا ہو رہا ہے۔

عسکری :- نواب عظمت علی خاں تو ملے تھے وہ بھی حیرت میں ہیں کہ یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور کیوں کر سمجھ میں آئے کہتے تھے کہ 'مجھے بلایا تھا۔ مگر میں جانتا ہوں اسی لئے بلایا ہوگا سو میں بلے کہے ہوئے نہ گیا۔

بڑی :- اب کیا ان کے واسطے ہوگا جو یہ ہمایوں فر نہ ٹھہرے۔

عسکری :- ہوگا کیا۔ سزا ہوگی۔ بڑی مصیبت ہے۔

بڑی :- سپہر آرا بیچاری کو زمانے کی گردش ایک دم چین نہیں لینے دیتی۔ ذرا مہلت نہیں ملتی۔

اب مرزا ہمایوں فر مصنوعی کا مفصل حال سُنئے دو یورپین جوان کے دلی دوست تھے، جن کا حال بیشتر درج ہو چکا ہے۔ وہ بلوانے گئے ایک میجر ڈاڈ دوسرے مسٹر رائیٹ یہ دونوں صاحب ضلع اور ان کے دو اسسٹنٹوں کو لے کر مرزا ہمایوں فر کے مکان پر آئے۔ شہزادے نے تپاک سے ہاتھ ملایا مگر بجز اپنے شہر کے حکام کے اور کسی کو نہیں پہچانا اور پہچانتے کیونکر کبھی دیکھا ہو تو پہچانیں۔

میجر ڈاڈ نے یوں گفتگو شروع کی

میجر :- اس مرتبہ پونے دو برس کے بعد ہم آپ سے ملا۔

شہزادہ :- (گھبرا کر) جی ہاں عرصہ ہو گیا۔ اب کی۔
میجر :- آپ نے شاید ہم کو پہچانا نہیں۔ ہمارا نام یاد ہے۔
شہزادہ :- اس قدر یاد آتا ہے کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔
میجر :- (حکام کی طرف اشارہ کر کے) شہزادہ صاحب ہمیں بھول گیا۔
صاحب ضلع :- آپ سے تو بہت بڑی ملاقات تھی۔ اردو بھی تو آپ نے شہزادے صاحب ہی سے سیکھی ہے مگر تعجب ہے کہ آپ کو بھول گیا۔
شہزادہ :- میری طبیعت آج کل نادرست ہے ذرا۔
رائیٹ :- دل شہزادہ ہم کو پہچانا یا نہیں پہچانا۔
شہزادہ :- غور سے دیکھ کر۔ مجھے آج کل ذرا کم نظر آتا ہے۔
میجر :- آپ کے سُننے کا طاقت تو کم نہیں ہوا
صاحب ضلع :- ہاں سن تو سکتا ہے آپ۔ تو جو دوست برسوں آپ کے پاس رہا اور جس سے اتنے برس یارانہ تھا اُس کو آپ بھول گئے اور اُس کی آواز تک نہیں سُن سکتے۔ ہم اب آپ سے صاف صاف کہتے ہیں کہ آپ کی نسبت پوری پوری تحقیقات ہو گی۔ ایک تو آپ نے سب کو یہ دھوکہ دیا کہ مرزا ہمایوں فر زندہ ہو گئے جس کے کچھ معنی نہیں اور پھر آپ لاکھوں روپیہ کی جائداد پر قابض ہو بیٹھے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ نے بے ایمانی کیا۔
شہزادہ :- بے سمجھے بوجھے ایسے کلمے ہماری نسبت آپ کو زبان سے نہ نکالنے چاہئیں۔
صاحب :- سچ ہے۔ اگر مرزا ہمایوں فر ہوتے تو ہم سے برابر کی ملاقات کرتے اور گو ہم سوچے کہ اس بات میں ہم دخل نہ دیں۔ مگر ہم کیونکر دخل نہ دیں مرزا ہمایوں فر مارہ ڈالا گیا۔ پھر زندہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی اس کا جانشین ہو گا۔ آپ کوئی چیز نہیں ہے۔
میجر :- ہمیں بڑا تعجب ہوا اور دنیا میں کسی کو یقین نہیں آتا کہ انیس صدی میں کوئی مردہ جی اُٹھے اور فقیر کی دُعا سے زندہ ہو جائے۔
صاحب :- (ہمایوں فر کے برادر خرد سے) شہزادی بیگم صاحب کو ہماری طرف سے جُھک کر سلام کرو اور بولئے کہ ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں پردہ ہو جائے۔

مرزا ہمایوں فر مبرور بردا اللہ مضجعہ کے چھوٹے بھائی نے

محل سرا میں جاکر اپنی والدہ سے کہا کہ صاحب ضلع آئے ہیں اور کل قلعی کھل گئی وہ آپ سے گفتگو کرنے والے ہیں پردہ
ہو جائے مگر اماجان کھو گی کیا، وہ تو بھائی کے گرفتار کرنے کی نیت میں ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے بے ایمانی
کی اور آپ سزا پائیں گے۔ اب تو صاف صاف کہے بغیر بات نہ بنے گی اور صاف کہنے میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے
مگر دو چار بزرگوں سے بھی صلاح لے لیجئے۔ شہزادی بیگم نے نواب عظمت علی خاں بہادر مرزا نادر حسین بیگ
اور شہزادہ گرامی قدر کو بلوایا اور ان سے رائے لی کہ اب کیا کرنا چاہئے معاملہ طول کھینچ گیا اور نازک ہو گیا
عظمت علی خاں نے کہا آپ خوب جانتی ہیں کہ میں آپ کا بھی رشتہ دار ہوں اور آپ کے سمدھیانے سے
بھی مجھے قرابت قریبہ ہے لیکن میں صلاح کیا دوں، مجھے تو آج تک خود ہی نہیں معلوم کہ یہ اسرار کیا ہے۔ مرزا
ہمایوں فر قتل کیئے گئے۔ اس میں شک نہیں ہو سکتا ہم لوگوں نے اپنی آنکھوں دیکھا، چونکہ ایک باران کے
ڈوب جانے کی خبر مشتہر ہوئی تھی۔ اور پھر دوسرے تیسرے روز زندہ جیتے جاگتے آئے تو اس مرتبہ بھی
لوگوں نے یقین کر لیا کہ وہ ابھی تک زندہ ہی ہیں لیکن دل سے کس کو یقین تھا دس پانچ بوڑھی عورتوں.
ضعیف الاعتقاد مردوں کو شاید پورا پورا یقین آگیا ہو گا مگر فیصدی دو چار کو اور جب ہم شہزادے کو دیکھتے
ہیں اور باتیں کرتے ہیں تو شک کی جگہ یقین ہوتا ہے کہ وہی ہیں عقل کام نہیں کرتی ہم صلاح کیا دیں اور صاحب
ضلع سے کیا کہیں، آپ مفصل حال بتائیے تو کچھ زنی کا موقع ہو شہزادۂ گرامی قدر نے بھی ان کی تائید کی اور
جو بات اس وقت صاحب نے کہی اس سے ہم کو خود اتفاق ہے کہیں، ہمایوں فر بیچارے کو خدا بخشے۔ وہ
جنت آشیاں فردوس مکاں ہیں اب زندہ ہونا کیا معنی۔

اتنے میں خبر ہوئی کہ بڑی بیگم صاحب کے داماد مرزا صاحب بمبئی سے آئے ہیں اور بڑی بیگم صاحب نے
ان کو بھیجا ہے۔ شہزادی بیگم نے کہا پردہ تو ہے ہی بلوا لو نہ مرزا صاحب بھی تشریف لائے حاضرین سے بغل
گیر ہوئے کسی سے مصافحہ کیا بیٹھے۔

مرزا: حضرت انوکھی بات انسان کو حیرت میں ڈالتی ہے۔ شہزادۂ ہمایوں فر کے زندہ ہونے کا دنیا میں کسی ذی عقل
کو بھی یقین آئیگا۔ ہاں اگر برات کے دن کسی اور کو گھوڑے پر بیٹھا دیا تھا۔ تو وہ اور بات ہے مگر اس کا
بھی خدائی بھر میں کسی کو یقین نہ آئے گا اس بھید کو خدا ہی جانتا ہے ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا کہ یہ کیا اسرار
ہے معاذاللہ۔

شہزادی: بیٹا مجھ سے کچھ کہا نہیں جاتا (رو کر) ہر طرح کی تباہی ہے۔

مرزا: ۔آپ اس موقع پر ذرا استقلال رکھیں۔

شہزادی: ۔ہے ہے دیکھتی ہو کہ میں کس طرح ہمایوں فر کے مرنے کا حال سنتی ہوں اور ذرا اُف نہیں کرتی ہی نے

تو کلیجے پر پتھر رکھ لیا ہے۔

عظمت علیخاں: ۔پھر اب کچھ مشورے کا نتیجہ بھی نکلنا چاہئے۔

مرزا: ۔اب کوئی بات مخفی تو رہ نہیں سکتی۔

نہاں کے ماند آن رازی کزو سازند محفلہا

نادر حسین: ۔کیا خوب بات آپ نے فرمائی ہے۔اب پوشیدہ اور مخفی رکھنا فضول ہے اور اس سے مطلب کیا نکلے گا۔

شہزادی: ۔پھر صاف ہی صاف کہہ دیا جائے نہ۔اچھا یوں ہی سہی اتنے میں صاحب ضلع نے پھر کہلا بھیجا کہ اب ہم زیادہ وقت نہیں دے سکتے اور جس قدر زیادہ توقف ہوتا ہے اسی قدر ہم کو زیادہ شک گذرتا ہے مجبور ہو کر شہزادی بیگم نے صاحب موصوف کو محل سرا میں ملایا۔

صاحب: ۔ہم سلام عرض کرتا ہے شہزادی صاحب

شہزادی: ۔زندہ رہو برخوردار (دبے دانتوں)۔

صاحب: ۔آپ ان کو ہمایوں فر سمجھتی ہیں اور آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ برات کے دن جو لوگ خاص اس بات کے مہتمم تھے کہ شہزادے کو خلعت پہنائیں اور نوشہ کے گھوڑے کے ہمراہ رہیں ان کو بلوا لیئے ان سے علیحدہ علیحدہ کل حال دریافت کیا جائے گا۔

شہزادی: ۔ایک تو ان کا خدمت گار تھا رحیم بخش۔دوسرے ان کے باپ کے وقت کا خواص پیر خاں یہ دونوں گھوڑے لئے ساتھ ساتھ تھے اور ایک سپاہی تھا اس کا نام مجھے نہیں معلوم اور گھر میں خلعت پنہایا گیا۔جب باہر گئے تو مرزا اسمو القدر اور مرزا دارا سر تبت اور منجھلے نواب ساتھ تھے صاحب ضلع نے ان سب کے نام لکھ لئے اور پوچھا کہ ان میں سے یہاں کوئی حاضر ہے۔کہا گیا کہ مرزا اسمو القدر اور اور چھوٹے نواب موجود ہیں۔عظمت علی خاں بہادر منجھلے نواب کہلاتے تھے صاحب نے اور سب کے نام طلبی کے خطوط بھیجے اور مرزا اسمو القدر کو علیحدہ کمرے میں لے گئے اور میجر ڈاور مسٹر رائٹ اور نواب احتشام الدولہ کے مواجہہ میں مرزا اسمو القدر سے سوال کئے۔

صاحب: ۔آپ نے دیکھا تھا کہ برات کے دن گھوڑے پر دولہا کون ؟

مرزا: ۔بخوبی تمام و کمال۔مرزا ہمایوں فر بہادر میرے سامنے سوار ہوئے تو میرے سامنے میں مذاق کی ایک بات کہی میں نے کہا اب اس وقت نوشہ بنے ہو ایسی بات نہ کرو کہ خواہ مخواہ ہنسی آئے۔بس خاموش ہو رہے۔

صاحب :۔ آپ شہزادے سے وہ بات پوچھیئے جو انھوں نے آپ کے کان میں کہی تھی اور خود ایک کاغذ پر لکھ دیجیئے۔ اور پھر ان سے کہیئے کہ وہ بھی علیحدہ کاغذ پر لکھ دیں۔

مرزا سمو القدر بہادر نے ایک کاغذ پر پنسل سے لکھ دیا اور صاحب ضلع نے اس کاغذ کو اپنی پاکٹ میں رکھا اور شہزادے کو بلا کر ان سے جو کہتے ہیں تو وہ آئیں بائیں شائیں بنانے لگے۔

صاحب :۔ آپ کو یاد ہونا چاہیئے ابھی کل کی بات ہے۔

شہزادی :۔ صاحب میرے ہوش وحواس ٹھکانے نہیں ہیں۔

صاحب :۔ اچھا تو آپ پھر تشریف لے جایئے ہم لوگ یہاں تحقیقات کر رہا ہے۔ مرزا صاحب سے دل شہزادہ صاحب آپ نے کس کو چھری لگاتے یا تلوار مارتے دیکھا تھا کہ کسی شخص نے مرزا ہمایوں فر کو چھری بھونکی۔

مرزا :۔ جی نہیں مگر جیسے ہی ہمایوں فر گھوڑے پر لڑکھڑائے اور میں دوڑا میرے جانے تک وہ گر چکے تھے۔ اور گرتے ہی سرد ہوگئے۔

صاحب :۔ آپ کو یقین ہے کہ وہ ہمایوں فر ہی تھے۔ آپ نے زخم لگنے کے بعد بھی ان کو اچھی طرح پہچانا تھا کہ ہمایوں فر ہیں۔

مرزا :۔ بیشک بہت اچھی طرح۔ اس میں ذرا شک نہیں ہوسکتا۔

صاحب :۔ تو آپ کو خوب یقین ہے کہ گھوڑے پر مرزا ہمایوں فر ہی سوار تھے اور زخم بھی انھوں ہی نے کھایا۔ اور وہ مر بھی گئے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

مرزا :۔ جو شک کرے وہ میرے نزدیک عقلمند نہیں۔ ہزاروں نے دیکھا یہ ایک دو تے دیکھا مرزا ہمایوں فر کا زخم کھانا اور لڑکھڑانا اور گرنا اور جان دینا ہزار ہا آدمیوں نے اپنی آنکھوں دیکھا۔

صاحب :۔ یہ جو مرزا ہمایوں فر بنتے ہیں۔ یہ کون ہیں۔ آپ جانتے ہیں۔

مرزا :۔ یہاں پر ہماری عقل بھی چکر میں ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔

صاحب :۔ ہمایوں فر ہیں یا نہیں ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے۔

مرزا :۔ ہرگز نہیں۔ ہمایوں فر کیسے۔ وہ بیچارے قبر میں میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ یہ سب بناوٹ ہے یہ کون شخص ہے اور اس میں کیا بھید ہے۔

صاحب ضلع نے اس کے بعد مرزا دارا مرتبت کو بلوایا اور مصافحہ کر کے کہا میں نے آپ کو اس وقت بڑی تکلیف دی۔ آپ معاف فرمائیے۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ شہزادی بیگم صاحب نے کیا سمجھ کر سب

میں مشہور کر دیا کہ یہ مرزا ہمایوں فر ہیں چونکہ آپ بھی برات کے مہتمم تھے اور شہزادی صاحب نے اور شہزادوں کے شمول میں آپ کا نام بھی لیا اس سبب سے آپ کو تکلیف دی آپ سے گواہی لی جائے گی۔ جو کچھ آپ کو معلوم ہو وہ آپ بتائیں۔

دارا سامر تبت: مجھے تو برات کا کل حال معلوم ہے جو سوال کیجئے اس کا جواب دوں۔ جہاں تک میں واقف ہوں جواب شافی دینے میں دریغ نہ کروں گا۔

صاحب: ۔ مرزا ہمایوں فر بہادر کہاں ہیں اس وقت۔

دارا: ۔ اس وقت اپنی کوٹھی میں ہیں مجھ سے ابھی ملاقات ہوئی تھی۔

صاحب: ۔ تو برات کے دن جان کس کی گئی اور کون زخمی ہوا۔

دارا سطوت: ۔ آپ سمجھتے نہیں، اصلیت یہ ہے کہ برات کی تیاری کے وقت ایک مخبر نے آن کر خبر دی کہ مرزا ہمایوں فر کا ایک جانی دشمن جوان کے خون کا پیاسا ہے ان کے قتل کی فکر میں ہے اور چلا ہے کہ دو پہر دوں میں ہو وہ بے قتل کیئے نہ رہے گا۔ صلاح ہوئی کہ گھوڑے پر سوار کرا کے مصلحت کے خلاف ہے اور پھر خبر آئی کہ وہ خنجر کو تیز کر چکا ہے اور کئی آدمیوں نے بیان کیا تو یہ رائے قرار پائی کہ یہاں سے دولہن کے مکان تک ایک فنس میں سوار ہو کر جائیں اور وہ بند رہے پردا پڑا رہے اور سپاہی مسلح ساتھ ہوں کسی کو کیا معلوم ہو گا چنانچہ گھوڑے پر ایک شخص کو خلعت پہنا کر بٹھایا اور شہرا اس کے چہرے پر اس طرح لٹکایا کہ منہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ برات چلی تو کسی کو کیا معلوم کہ ہمایوں فر ہیں یا کوئی اور گھوڑے کے ارد گرد ہم ہی سب لوگ تھے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔

صاحب: ۔ دل یہ نباہات سنا، یہ تو دوسری بات ہے میجر، مگر یہ کیا سبب ہے کہ شہزادہ اپنے دوست لوگ کو بھول گیا۔

دارا: ۔ صاحب ان کے تو حواس اب تک ٹھکانے نہیں ہیں۔

صاحب: ۔ اچھا جب گھوڑے پر ہمایوں فر کے عوض دوسرا آدمی سوار ہوا تو آپ وہاں تھا یا کہیں اور اس وقت چلا گیا تھا۔

دارا: ۔ میں ڈیوڑھی میں کھڑا تھا جس میں کوئی آنے نہ پائے۔

صاحب: ۔ اور جب گھوڑا برات میں چلا تب آپ ساتھ تھا۔

دارا: ۔ کچھ لوگوں کو جن سے بردہ تھا سوار کرا دیا کوئی گھوڑے پر کوئی ہاتھی پر کوئی تامدان پر کوئی کہیں کوئی کہیں اور ہم تین چار آدمی گھوڑے کے ساتھ تھے اور جس میں ہمایوں فر تھے اس کی حفاظت اور نگرانی

کا بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔

صاحب:۔ اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ اس گھوڑے پر ہمایوں فر ہی تھے تو آپ کو یقین آئے گا یا نہیں آپ کے سامنے تو کوئی اجنبی خلعت پہنکر سوار ہوا نہیں تھا آپ صرف ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔

دارا:۔ مجھے تو ہرگز یقین نہ آئے۔ میں نے اس آدمی کو بیشک نہیں دیکھا مگر یہ سب باتیں ہمارے علم و یقین میں ہوئی تھیں اور میں خود شریک مشورہ تھا۔

میجر:۔ شہزادے صاحب ایک بات غور کے قابل ہے۔ شاید مرزا ہمایوں فر کے دوستوں نے صرف اس خبر کے مشتہر کرنے کی غرض سے ایسا کہہ دیا ہو کہ اب ہمایوں فر گھوڑے پر نہیں ہیں تاکہ جو سنے اس کو یقین آجائے کہ گھوڑے پر شخص معرتھا بنا ہوا سوار ہے۔ اس کا قتل کرنا بیکار ہے۔ وہ تو ہمایوں فر ہی نہیں اس کے قتل کرنے سے کیا ملے گا اور اس تدبیر سے ہمایوں فر بچ جائے شاید وہ لوگ یہ امر سوچے ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

دارا:۔ بے شک مقتول ہمایوں فر نہ تھا ہرگز نہ تھا۔

صاحب:۔ اچھا تو آپ کے ذریعہ سے بالکل نئی بات معلوم ہوئی اب ہم نواب عظمت علی خاں کو بلاتا ہے۔

نواب عظمت علی خاں بہادر عرف منجھلے نواب تشریف لائے۔ صاحب نے حسب معمول ان سے کہا کہ آپ کی گواہی لی جائے گی جو بات آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھی اس کو بیان کر دیجئے اور جو بات بچشم دیکھی ہو اس کی نسبت کہہ دیجئے کہ فلاں شخص کی زبانی سنی سنائی کہتے ہیں یا اگر کسی خاص آدمی کا نام نہ یاد ہو تو یوں کہہ دیجئے کہ لوگوں نے ایسا کہا تھا۔ ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ مرزا ہمایوں فر جس وقت گھوڑے پر سوار ہوئے اس وقت آپ موجود تھے یا نہیں۔ نواب صاحب نے کہا۔ سنئے صاحب جو جو سوال کرتے ہوں لکھ دیجئے میں ان سب کے جواب لکھ دوں گا۔

صاحب نے یہ بات بہت پسند کی اور یہ سوال لکھ دلئے۔

(۱) مرزا ہمایوں فر کو آپ بخوبی پہچانتے ہیں یا نہیں۔

(۲) برات کے دن آپ کے سامنے گھوڑے پر سوار ہوئے یا نہیں۔

(۳) یہ صاحب جو اب ہمایوں فر بنے ہیں یہ کون ہیں۔

(۴) مرزا ہمایوں فر کے قتل کے وقت آپ کہاں تھے۔

(۵) آپ نے ان کو بالکل مردہ پایا یا کچھ کچھ جان باقی تھی۔

(۶) جس وقت مرزا ہمایوں فر گھوڑے پر سوار تھے آپ ان کی صورت اچھی طرح دیکھ سکتے تھے یا نہیں اور دیکھ سکتے تھے تو آپ کو شک تو نہ تھا۔

نواب صاحب نے ان چھ سوالوں کے جواب یوں لکھے :۔

(۱) میں ہمایوں فر کو بخوبی تمام و کمال پہچانتا ہوں۔

(۲) برات کے روز میرے سامنے گھوڑے پر سوار ہوئے۔

(۳) میری خود سمجھ سے خارج ہے کہ کون صاحب ہیں۔

(۴) میں گھوڑے کے قریب تھا مگر دیکھتا اور طرف تھا۔

(۵) بالکل سرد۔ ڈاکٹر نے میرے سامنے کہا کہ اب ذرا جان باقی نہیں ہے۔ گرتے ہی جان نکل گئی ادھر گرے ادھر ٹھنڈے ہو گئے۔

(۶) میں نے ان کی صورت دیکھی اور بخوبی پہچانا کہ یہ وہی ہیں وجہ کیا کہ میں ہمایوں فر کو نہ پہچان سکتا صورت صاف صاف نظر آتی ہے۔

صاحب :۔ دل۔ تو آپ نے ہمایوں فر کو دولہا بننے کی حالت میں قتل ہو کر گرتے دیکھا اور وہ گرے تو پھر بھی پہچانا کہ یہ مرزا ہمایوں فر ہیں۔

نواب :۔ بیشک۔ اس میں تو کسی طرح کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔

میجر :۔ بھلا نواب صاحب آپ یہ کہیے ہم سے بالکل صاف کہیے کہ یہ کون شخص ہے اور اس کو شہزادی بیگم نے کیونکہ ہمایوں فر سمجھ لیا۔ یہ کیا بات ہے۔

نواب :۔ جناب میجر صاحب میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ مجھے خود حیرت ہے میں کیا جواب دوں مگر اس قدر البتہ خیال ہے کہ سپہر آرا کے ساتھ نکاح ہوا ہے خدا اس بے چاری کی عزت رکھے اور یوں تو جو ہوا وہ ہوا۔

صاحب :۔ اچھا تو آپ کے نزدیک ہمایوں فر زندہ نہیں ہیں۔

نواب :۔ جناب اس میں تو کسی کو حجت اور انکار کا موقع ہی نہیں مل سکتا ہزاروں آدمیوں نے ہمایوں فر کی لاش دیکھی اور شہر بھر میں کہرام مچ گیا مگر خدا جانے کیا ترکیب کر کے ان سب نے مل مل کر ایک فرضی اور مصنوعی ہمایوں فر قایم کر دے۔ اس کا کچھ سر پیر ہی نہیں۔ لاحول ولاقوۃ بھئی عجیب زمانہ ہے۔

ان کے بعد میاں رحیم بخش کا اظہار لیا گیا۔ انھوں نے بیان کیا کہ (حضور مالک ہیں اور جو ہوا سو ہوا اور حضور خدا کے دوسرا کوئی نہیں کہ ہاں کوئی مقابلہ کر سکے۔ اس کا مقابلہ کون کرے اور جو کرے سو تباہ ہو جائے اور اس کی کریمی وہی جانے آج اٹھارہ اٹھارہ برس سے نمک کھاتے ہیں مگر نمک حرام نہیں کہلاتے بس بات ساری اتنی ہے کہ نمک حلال ہیں۔ صاحب اور شہزادے تو ایسے گئے کہ بس ہم لوگ دل مسوس کر رہ گئے۔ کچھ کرتے دھرتے ہی نبی ہی نہیں) صاحب نے کہا ہم تم سے اتنا بڑا قصہ نہیں پوچھتے۔ شہزادے کا سب حال بتاؤ۔ رحیم بخش بولے

حضور حال حوال کیا عرض کروں حال حوال سب یہ ہے کہ مزے مزے سے دولہابنے ہاتھی پرسوار ہوئے جب پلٹ ذرا دور نکل گئی تو بزار میں کسی نے اونپر سر دہی کا ہاتھ چھوڑا۔ ہم لوگ سب دیکھتے ہی رہے اب ہمیں کیا معلوم تھا خداوند کہ کیا ہونے والا ہے۔

صاحب:۔ تم نے ہمایوں فرہادر کی لاش دیکھی تھی۔

رحیم بخش:۔ (رو کر) ہاں خداوند دیکھی کیوں نہیں تھی۔

صاحب:۔ تم نے خوب پہچانا کہ وہی تھے یا کوئی اور۔

رحیم:۔ حضور وہی تھے ہمارے مالک ہمارے شہزادے۔

صاحب:۔ کوئی کوئی کہتا ہے کہ ان کی جگہ پر اور کوئی تھا

رحیم:۔ حضور غلام کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہا۔

احتشام الدولہ:۔ صاحب فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے ایسا بیان کیا ہے کہ مرزا ہمایوں فر گھوڑے پر سوار نہ تھے ان کی عوض کسی اور کو بیٹھا دیا۔

رحیم:۔ حضور یہ کون کہتا ہے۔ منہ پر ہمارے تو کہے۔

صاحب:۔ اچھا جب ہمایوں فر گرے سب کے پہلے ان کو کس نے روکا اور گرنے کے بعد کس قدر دیر تک زندہ رہے۔

رحیم:۔ حضور بس ایک دفعہ ہی گرے تو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اور جب ہم لوگوں نے دیکھا تو خون جاری تھا اور جان جاتی رہی تھی بس گرتے ہی دم مل گیا زخم بہت گہرا تھا اور چھری دو تہ تک پیر گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب آئے انھوں نے دیکھا کہ جان باقی ہے یا نہیں کہا سرد ہے (اب اس میں کیا ہے۔ چار پانچ منٹ ہوئے کہ یہ مر گئے (رو کر) حضور گھر پلٹ گیا شہر تباہ ہوگیا۔ اب کون رئیس ہے اس شہر میں۔

اس کے بعد پیر خاں بلوائے گئے اور ان کی اظہارات قلمبند ہوئے اُنھوں نے قتل کا حال اس طرح بیان کیا۔ میں گھوڑے کے پاس ساتھ ساتھ جاتا تھا جب گھوڑا سنہری مسجد کے پاس پہنچا تو میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ اگر کوئی سبیل پاس ہو جائے پانی پی آؤں میں اس سے باتیں کرتا ہی تھا کہ او مھر یہ حادثہ ہوا اور میں نے اس وقت مرزا ہمایوں فر بہادر کو دیکھا جب وہ گھوڑے پر سے گر پڑے اور خون برابر جاری تھا اور ڈاکٹر صاحب نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا اب بالکل ٹھنڈا ہے۔ بس حضور کہرام مچ گیا۔

صاحب:۔ گھوڑے پر سوار تھے شہزادے یا ہاتھی پر۔

پیر خاں:۔ حضور گھوڑے پر سوار تھے وہ تو بڑے ہی شہسوار تھے کیسا ہی شریر گھوڑا ہو قابو میں لے آتے تھے

لوگوں نے کہا تھا کہ ہاتھی پر سوار ہو جیسے فرمایا نہیں ہم گھوڑے پر ہی سوار ہونگے۔ مگر رہے نام اللہ کا
الغرض سب کے اظہار لے کر صاحب ضلع اور میجر ڈاڈ اور مسٹر رایٹ اور نواب احتشام الدولہ بہادر نے باہم مشورہ کیا تو ان چاروں میں رائٹ صاحب اور نواب صاحب نے شہزادہ دارام تبت کے بیان پر غور کرنے کی صلاح دی مگر میجر ڈاڈ صاحب ضلع نے اس رائے کو پسند نہ کیا کہا اس میں بناوٹ پائی جاتی ہے یہ بالکل بے اصل بات ہے ایسا ہرگز نہیں ہوا ہے بعد ازاں صاحب ضلع نے شہزادی بیگم کو کہلا بھیجا کہ اب آپ کو ذرا تکلیف ہوگی آپ دو دو باتیں سن لیں اور ان کا جواب دیں۔ پردہ گرا دیجئے تو کل باتیں چٹکیوں میں دریافت کر لی جائیں۔ انھوں نے نواب عظمت الدولہ کو بلوایا مگر صاحب موصوف نے کہا کہ ہم نواب صاحب کو نہیں جانے دے سکتے۔ کیوں کہ یہ ایک گواہ ہیں۔ آپ بھی اظہار دے لی جئے تو پھر مضائقہ نہیں۔
شہزادی بیگم کو فرط الم سے اس روز غش آگیا اور طبیعت اس قدر بے چین اور بے لطف ہوئی کہ ڈاکٹروں کی صلاح سے اس دن اظہارات ملتوی ہے۔ جب حکام نواب احتشام الدولہ اور پرنس دارام تبت اور شہزادہ گرامی قدر کی ضمانت لے کر روانہ ہوئے کہ مرزا ہمایوں فر کہیں بھاگ نہ جائینگے تو شہزادی بیگم نے ہمایوں فر کو گھر میں بلوایا اور تخلیے میں ان سے یوں ہمکلام ہوئیں۔
شہزادی: بتاؤ بیٹا اب کیا کیا جائے۔ جو رائے ہو۔
ہمایوں: اماں جان صاف صاف کہنا اچھا ہوتا ہے۔
شہزادی: کسی وکیل سے پوچھ لو اس میں کچھ ہرج تو نہیں۔
ہمایوں: مطلق ہرج نہیں۔ ہرج کیا ہے۔ آخر لڑکا تمہارا ہوں یا نہیں۔ بادشاہ کی اولاد ہوں۔ مال اسباب جائداد مکان زر زیور روپیہ سب میرا ہے یا نہیں۔ پھر اس میں چوری کاہے کی ہے آپ صاف صاف بیان کر دیں۔
شہزادی: اچھا راست راست بے کم وکاست کہہ دوں۔
ہمایوں: ضرور اور آپ کے کہنے کی نوبت ہی کاہے کو آئے گی میں خود ہی بیان کر دوں گا۔ سرکار کو فقط یہی خیال ہے کہ کوئی شخص آپ کو اور ہمایوں فر کے خاندان کو دھوکا دے کر مال اسباب پر قابض نہ ہو جائے اور اس کا یہاں ذکر ہی نہیں۔
شہزادی: چلو بس اب مجھے ڈھارس ہوئی در و کر، ہمایوں فر کا دشمن نہ تھا۔ ہائے کہیں کا نہ رکھا۔ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی۔
ہمایوں: اماں جان اب یہی بہتر ہے کہ صاف صاف بیان کر دو۔

راستی موجب رضائے خداست
کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

شہزادی :۔ تو اب تم خود صاحب سے کہدو جس میں ہم سے پوچھنے کی کسی کو ضرورت ہی نہ رہے۔ ہم اپنے منہ اور زبان سے کیوں کہیں۔ نہیں کہتے ہوئے اور بیان کرتے ہوئے بڑا رنج ہوگا ہائے کلیجے پر پتھر رکھ لیا سل رکھ لی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

ہمایوں :۔ (آبدیدہ ہوکر) ہائے۔ جوان بھائی سامنے سے اٹھ گیا۔ ہائے ہمایوں فر تو نے یہ کیا دغا دی دوست بن کر قوت بازو بن کر بھائی بن کے قتل کر گیا۔ اب رونا بھی اچھی طرح نہیں آتا آنسو بھی خشک ہو گئے۔

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال میتوان بہ تمنا گریستن

شہزادی :۔ اور لوگوں نے کیا اظہار دیئے سچ یا جھوٹ۔

ہمایوں :۔ دو ایک نے صاف صاف بیان کر دیا کہ ہمایوں فر مقتول ہوئے یہ ہمایوں فر نہیں کوئی اور ہیں مگر شہزادہ دلرا مرتبت نے وہ قصہ بیان کیا کہ الاماں جس کا سر نہ پیر۔

شہزادی :۔ کوئی بات ایسی تو نہیں کہی جو ان کی خود خلاف ہو۔

ہمایوں :۔ جی نہیں بہت بچاتے رہے اماں جان ہم تو اس وقت سے حکم دے دیتے ہیں کہ ہم کو ہمایوں فر کوئی نہ کہا کرے ہمارا نام صاحب عالم فریدوں سطوت مرزا نورالدین حیدر رہے۔

شہزادی :۔ ابھی نہیں جب حکام سے کہہ لو تب پھر سب میں آپ ہی شہرت ہو جائے گی مگر خیر پھر ہر چہ بادا باد سمجھا جائے گا۔

صاحب عالم فریدوں سطوت مرزا نورالدین حیدر شہزادی بیگم سے یہ باتیں کر کے باہر آئے ان کی ماں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آج کسی طرح سستی یا رنج ظاہر نہ کرنا ورنہ پھر رعب جاتا رہے گا باہر جا کر عمدا اور قصدا احباب سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔

شہزادہ :۔ اف آج بہت تھک گئے افوہ۔ (لیٹ کر)

احتشام الدولہ : سا ب کہیں لیسے نہ ہو جئے گا بندے کی ضمانت ہے۔

عظمت علیخاں : جی ہاں بندہ بھی پھنسا ہے اور آپ کا اعتبار کیا۔

احتشام :۔ بار خدا کے لئے کہیں فرانس ڈانٹے نہ ہو رہنا اس پر قہقہا پڑا یہاں تک کہ ایک بوڑھے بزرگ نے آنکھیں نیلی پیلی کر کے کہا۔ واہ واہ۔ ہو نہہ یہاں تو خون خشک ہو گیا ہے اور ان کو دل لگیاں سوجھتی ہیں۔

احتشام : قبلہ و کعبہ بہت رو چکے اور کہاں تک روئیں۔

یاران رفتگان کو کیا روئے مسرت
کیا تم روانہ سوئے ملک عدم نہ ہو گی

عظمت: قبلہ و کعبہ واقعی ہے تو یہی وقت کہ دن بھر روئیے۔

احتشام: بھائی جان دیکھو خدا کے لئے ہماری عزت رکھنا۔

شہزادہ: جاؤں گا تو کہاں جاؤں گا بھئی۔ کوئی ٹھکانا بھی ہے۔

بھاگے جہاں جہاں پہ بزن اور بکٹ ملا
لٹ پٹ کے گھر کو آئے تو گھر کا ٹکٹ ملا

یہی مثل صادق ہوگی۔

عظمت: بھئی تم یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو واللہ یہاں اب تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ حضور کا اسم شریف کیا ہے اور حضور کون ذات شریف ہیں۔

شہزادہ: واللہ آپ بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔

احتشام: اور میں تو اس کا قائل ہوں کہ جب سے داخل دفتر اب محل سرا سے نکلتے ہی نہیں۔ اچھا رنگ جمایا واہ استاد واہ اور مرزا دارا مرتبت نے تو وہ بے پر کی اڑائی کہ بس کچھ نہ پوچھو ایک بار صاحب خود چکرا گئے تھے

شہزادہ: حضرت کل تک آپ کو سب معلوم ہو جائے گا کہ بندہ کون ہے۔ ارے یار بڑی حیرت کا مقام ہے مگر مضیٰ ما مضیٰ جو شدنی امر تھا اس کو کوئی کیا کرے۔

ہوا جو کچھ سو ہوا بس گذشتہ را صلواۃ
کہاں تلک کوئی رویا کرے گلہ دل کا

شہزادی بیگم نے دوسرے روز اپنے اظہار میں صاف صاف بیان کر دیا کہ جس وقت میرے لال میرے نازوں کے پالے نرگسی آنکھوں والے شہزادے کو اس موئے سوار نے اللہ کرے کتے کی موت مرے اللہ کرے مرتے دم پانی نہ نصیب ہو۔ ہائے ٹھنڈی سانس بھر کر جب اسنے بے خبری میں ہمایوں فر پر تلوار چلائی اور اس نازوں کے پالے (اس قدر فقرہ کہہ کر بہت روئیں اور تھوڑی دیر کے بعد آنسو پونچھ کر یوں بیان کیا) اور مجھے خبر ہوئی تو قلب پر ایسا دھچکا لگا کہ میں کچھ۔ (رونا شروع کیا)

صاحب: بیگم صاحب سب کو بڑا رنج ہوا مگر خدا کا مرضی۔

شہزادی: صاحب مجھے تو اس پیرانہ سالی میں انگاروں پر لوٹنا پڑا ہے وہ میں لوٹ رہی ہوں اور خدا جانے میری قسمت میں کیا کیا لکھا ہے۔

صاحب :۔ صبر صبر حضور بیگم صاحب آپ صبر بہت صبر کریں۔

عظمت :۔ مختصر طور پر بیان کر دیجئے۔ یہ حال سنا نہیں جاتا۔

شہزادی :۔ بھائی غیروں غیروں کا سنکے کلیجا کانپتا ہے۔

انتظام الدولہ :۔ سچ ہے ہم تو ہمایوں فر کے عزیز رشتہ دار دوست بھائی ہیں۔ غیروں غیروں کا حال بس ناگفتہ بہ

شہزادی :۔ میں بے اختیار تڑپ کے قفس سے کود پڑی اور دوڑ کے دیوانی کی طرح کبھی ادھر گئی کبھی ادھر گئی۔ اتنے میں لوگ ہٹ گئے اور مجھے جگہ دی۔ بس میں نے ہنوز اچھی طرح لاش کو دیکھا بھی نہ تھا کہ تیورا کھا کے گر پڑی اور غش آگیا ہائے اگر اسی دم مر جاتی تو کیا بات تھی یہ دن کیوں دیکھتی مگر رسی مضبوط تھی جان کیونکر جاتی

صاحب :۔ کسی کا اختیار کا بات نہیں۔ کسی کے ہاتھ کا بات نہیں۔

شہزادی :۔ ہاں اختیاری امر ہوتا تو یہ کیوں ہونے پاتا بس اب آگے اور کیا کہوں اتنی ہی دیر میں گلے میں کانٹے پڑ گئے۔ تالو خشک ہو گیا۔

عظمت :۔ ہاں بہتر ہے کہ اختصار کے ساتھ یہ حال مصیبت بیان ہو۔

شہزادی :۔ بس اب اور کیا کہوں۔ ہمایوں فر اب کہاں ہے۔ مقبرہ بھی بن گیا اور اتنے دن بھی ہو گئے۔ اب ہمایوں فر کی ہڈیاں بھی نہ باقی ہوں گی۔ ہائے اف ری میری بے حیائی کس طرح استقلال کے ساتھ باتیں کرتی ہوں۔

صاحب :۔ بیگم صاحب دل بہت مضبوط رکھنا۔

شہزادی :۔ اب اور کیا مضبوط ہوگا دل تو فولاد ہو گیا۔

صاحب :۔ اور کیا ہو سکتا ہے۔ خدا کا بات۔ آدمی کیا ہے۔

شہزادی :۔ تو اب تو مجھ سے کچھ اور نہیں پوچھنا ہے۔

صاحب :۔ اب یہ پوچھنا ہے کہ یہ کون ہمایوں فر بنا کسی سوال ہے۔

(۱) یہ کون ہے جو ہمایوں فر اپنے کو کہتا ہے۔

(۲) آپ کو دھوکا دیا یا آپ نے اس کو اجازت دی۔

(۳) آپ کا چھوٹا کڑکا کا حق محروم رہے گا اور آپ کے بعد آدھی کا وہ اور آدھے کا یہ مالک ہو جائے گا اور یہ بُری بات۔

شہزادی :۔ ان تینوں باتوں کا جواب باصواب سنئے :

(۱) یہ ہمایوں فر نہیں ہے مگر اس سے کم بھی نہیں ہے۔

(۲) ہم نے اس کو اپنے آپ اجازت دی۔ اس نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے خود کہا کہ تم اپنے کو

ہمایوں فر کہو مگر لوگوں سے ابھی میل جول کم رکھو جس میں دفعتہً سب پہچان نہ لیں کہ ہمایوں فر نہیں ہے۔

(۳) چھوٹا لڑکا محروم نہیں ہو سکتا اس کا اس کا دونوں کا حق ہے آپ لوگ اس بات سے اطمینان رکھیں۔

صاحب: ۔دل۔ حضور بیگم صاحب ہم کو بڑا تسلی ہوئی۔ مگر کامل طور پر ہم ابھی نہیں سمجھا کہ یہ کون شخص ہیں۔

بیگم: ۔اب صاف صاف سنیئے۔ میرے تین لڑکے تھے اور دو لڑکیاں۔ پانچ اولادیں۔ ہمایوں فر کا بڑا بھائی سات برس کے سن میں گم ہو گیا زمانے بھر میں تلاش ہوئی کہیں پتہ نہ ملا۔ مجبور ہو کر رہ گئی کہ اب کیا ہوتا ہے۔ سمجھی کہ کوئی بہکا کے لے گیا برسوں اسی کا غم رہا۔ وہ لڑکا ہمالیہ کے پہاڑ پر کسی فقیر کے ساتھ رہنے لگا۔

ایک روز جبکہ وہ فقیر کسی ضرورت سے نینی تال میں آیا تو اس کو بھی ساتھ لئے آیا اور اسکول میں بھرتی کیا۔ چند سال کے بعد اس نے ایک اخبار میں اپنے بھائی کے قتل کا حال پڑھا۔

بھائی تھا جوش خون کہاں جائے

بس وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ یہاں آیا تو رات کے وقت ایک آدمی سے ملا جو اس کا کوکا ہے۔ کوکا نے اس کو نہیں پہچانا مگر وہ پہچان گیا باتوں باتوں میں اپنا نام لے کر پوچھا بھلا اس کو بھی جانتے ہو اگر وہ تمہارے سامنے ہوئے تو پہچان سکو یا نہیں کوکا نے غور کر کے دیکھا تو ؎

صورت وہی رنگ روپ وہی ہے

لہجہ وہی گفتگو وہی ہے

کوئی فرق نہیں گلے لگایا۔ اور مجھ سے آن کر پوشیدہ بیان کیا۔ اس کے بعد ہم سب کی یہ رائے ہوئی کہ اسی کو ہمایوں فر مشہور کریں اور اس میں کئی راز کی باتیں تھیں جن سے سرکار کو کوئی سروکار نہیں مگر سوچتے کہ اس طرح دفعۃً مشہور کر دینا اچھا نہیں لہٰذا اس میں بڑا اہتمام کیا گیا اور اب شادی بھی ہو گئی اور اتنے دن کے بعد آپ لوگوں کو معلوم ہوا۔

صاحب: ۔ہم بہت خوش ہیں بیگم صاحب اب آپ ان کو ہمایوں فر سمجھیں اور اس ہمایوں فر کو بھول جائیں۔

شہزادی: ۔اب مجھے اجازت ہو تو جا کر سو رہوں اس وقت میرا دل بھر آیا اور میرے حواس برجا نہیں ہیں۔

صاحب: ۔ہم بھی آداب سلام عرض کرتا ہے۔

باہر آ کر صاحب ضلع نے میجر ڈاڈا اور مسٹر رائٹ سے کل حال بیان کیا۔ ان دونوں کو یقین واثق ہو گیا کہ یہ بیان حلیۂ کذب سے معرا ہے مگر بنظر مصلحت خود ان سے دریافت کرنا پڑا اور لازم آیا کہ اس فقیر کو جہاں یہ برسوں رہے تھے بلوائیں اور جس اسکول میں شہزادہ پڑھتا تھا اس کے ماسٹروں اور پرنسپل سے دریافت کرے اور شہزادی بیگم کے اعزہ کا اظہار لیں کہ آیا کوئی لڑکا کھو گیا تھا یا نہیں۔ شہزادے کو بلا کر صاحب ضلع علیحدہ لے گئے اور کہا

اب ہم کو بخوبی معلوم ہوا کہ آپ مرزا ہمایوں فرہی ہیں مگر حیرت ہے کہ آپ مر کر کس طرح زندہ ہو گئے شہزادے نے کہا۔ آپ میرا امتحان کیا لیتے ہیں اماں جان نے آپ سے کہہ دیا ہو گا کہ اصل حال کیا ہے میں ہرگز ہمایوں فر نہیں ہوں ہمایوں فر میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔ اس بے چارے کے آنسو جاری ہو گئے زندگی نے (آنسو پونچھکر) وفا ہی نہ کی افسوس

تحقیقات ضروری کے بعد صاحب ضلع مع اور حکام کے رخصت ہوئے اور ادھر بمبئی والے مرزا صاحب شمس النسا بیگم سے شوہر اپنی سسرال آئے تاکہ یہاں سب کو کل امور سے مطلع کریں بڑی بیگم کے پاس جا کر انھوں نے کل چشم دید حالات بیان کئے۔

مرزا:۔ لیجئے راز سربستہ کھل گیا۔ صاف صاف۔

بڑی:۔ ہمایوں فر کی نسبت کیا سنا۔ سنایا سب ٹھیک ہے۔

مرزا:۔ کیفیت یہ ہے کہ صاحب لوگ آئے انھوں نے ایک ایک کا اظہار لیا کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ بیان کیا آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ شہزادی بیگم کے اظہار لئے جائیں۔

بڑی:۔ اے ہے کیا دربار میں بلائی گئی تھیں۔ کیا کچہری میں جانا پڑا۔ یہ زمانہ جو چاہے دکھلائے۔ میرے رونگٹے اس وقت کھڑے ہو گئے۔

مرزا:۔ جی نہیں خود صاحب آئے تھے اور پردہ کرا کے ان کے اظہار لئے۔

بڑی:۔ یہ اظہار کاہے کے تھے کہ ہمایوں فر ہیں یا کوئی اور۔

مرزا:۔ جی ہاں کئی سوال کئے کہ قتل ہوئے یا نہیں آپ کو اس شخص نے دھوکا دیا یا آپ خود دھوکے میں آ گئیں۔ انھوں نے کہا یہ تو ہمایوں فر کسی طرح نہیں ہیں۔

حسن:۔ ارے! صاف صاف بیان کر دیا۔ اب کیا ہو گا۔

روح:۔ میری کچھ عقل ہی نہیں کام کرتی کہ یہ ہے کیا ماجرا۔

بہار:۔ (پردے کے پاس) سب مفصل حال بیان کرو۔

مرزا:۔ جی ہاں کہتا ہوں۔ صاحب لوگوں نے سب کے اظہار شہزادی قلمبند کر لئے اور بڑی بیگم کے اظہار بہت خوشی سے لکھنے اور پوچھا کہ اگر یہ ہمایوں فر نہیں تو آپ نے مثل ہمایوں فر کے اس کو کیوں اجازت دی انھوں نے کہا صاحب اصل یہ ہے کہ جب ہمایوں فر کے قتل کا حال اخباروں میں چھپا تو ان کے بڑے بھائی نے جو کئی برس سے مفرور تھے نینی تال یا خدا جانے کہاں دیکھا اور بھائی کے حادثے کا حال سن کر خون خوشنز ہوا تو وہاں سے سیدھے بخط راست یہاں آئے۔

مغلانی:۔ اخاہ۔ حضور میں سمجھی۔ جب وہ بچہ بھاگا تو میں شہزادی بیگم صاحب ہی کے ہاں نوکر تھی۔ اس دن کیسا کہرام

مچا تھا کہ میں کیا عرض کروں اور اس کو تو کئی برس ہوئیں۔

بڑی بی: خدا کا شکر ہے کہ شہزادہ ہے اور وہی بات اس میں بھی ہے جو ہمایوں فر میں تھی ورنہ کوئی ایسا ویسا ہوتا تو اس وقت ہاتھ مل کر رہ جاتی۔ سپہر آرا کو اللہ نے بچایا۔

جب حسن آرا بیگم اور ان کی بہنیں اور نازک ادا بیگم یہ سب ایک مقام پر اس امر اہم کی نسبت گفتگو کرنے لگیں۔ سپہر آرا نے کہا بہن ہمیں تو پہلے ہی سے معلوم تھا مگر ہماری ساس نے ہمیں منع کر دیا تھا کہ خبردار کسی سے ذکر نہ کرنا اور ان کی بھی تاکید تھی۔ اسی سبب سے تو ہم کہیں آتی جاتی نہ تھی اور نہ وہ گھر کے باہر نکلتے تھے۔ مگر۔

نہاں کے ماند آن رازی کزو سازند محفلہا

ایسی باتیں کہیں پوشیدہ رہ سکتی ہیں۔ آخر کار بات کھل گئی۔ مگر مجھے اب چنداں اس کا خیال نہیں۔ ہاں ہمایوں فر بیچارے جس وقت یاد آتے ہیں کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں مگر ابھی طرح اُف بھی تو نہیں کر سکتی۔ نازک ادا بیگم نے کہا صحیح ہے اُف کیونکر کر سکو۔ صاحب عالم کی بغل میں بیٹھ کر ہمایوں فر کو یاد کرو یہ تمہیں کب زیبا ہے اب تو جو ہوا وہ ہوا مگر خیر پھر بھی ہم تو یہی کہیں گے کہ نتیجہ اچھا ہوا تمہارے حق میں انجام بخیر ہوا ہاں ہمایوں فر بیچارے کی جان مفت میں گئی۔ یہ بڑا سانحہ ہے مگر اس میں تمہارا کیا قصور یہ تو شدنی امر تھا تم شہزادے ہی کے ساتھ بیاہی گئیں وہی وہی حسب و نسب نجیب الطرفین۔ شریف النجابتین اولاد شاہ۔ حسن و جمال و وجاہت۔ قد و قامت شگفتہ روئی لیاقت تمیز سلیقہ میں ہمایوں فر سے کم نہیں۔ یہ تو سوچو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا وہ حالت سوچو گھر بھر کی زندگی تمہارے سبب سے تلخ ہو جاتی اور تم تو خدانخواستہ بس ناگفتہ بہ۔ سپہر آرا بولی تمام عمر گرداب بلا میں رہتے اور موج غم کے تھپیڑے ادھر سے اُدھر تہ و بالا کر دیتے مگر خواستۂ خدا نہ تھا کہ کسی معصومہ کو بے وجہ مصیبت میں گرفتار کرے۔ اب خدا نے وہ فکر کی کہ ہمایوں فر کا نام اچھی طرح زبان پر نہیں لا سکتیں۔ خوف ہے کہ مبادا جو سنے وہ بے حیا کہنے لگے۔

خوف سے لیتے نہیں نام کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں تمہیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

جب کبھی یاد آ جاتا ہے علیحدہ جا کے روتی ہوں۔ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے یہ تو آپ سے میں یہاں اس بے تکلفی سے کہہ رہی ہوں نہیں کسی اور کے سامنے بھلا اس طرح کیونکر صفائی کے ساتھ بیان کر سکتی اور ان کی روبرو تو کبھی آنکھ پر نمی یا ابرو پر میل ہی نہیں آنے دیتی۔ ادھر جا کے اُدھر جا کے ٹھنڈی سانس کھینچی اور پھر دل کو تسکین دی کہ گذشتہ الصلوٰۃ

نام لکھ لکھ کر ترا وصلی پہ زور ہجر میں یوں دل کو بہلاتے ہیں ہم

نازک :۔ اب ان باتوں سے بھلا فائدہ کیا ہوگا۔

حسن :۔ بیوقوفی کیونکر ثابت ہوگی۔ کہو جو تمہارے دل میں ہے وہ دل ہی میں رکھو اُس کا اظہار بیفائدہ ہے۔ دس کے منہ بات پڑی اور چلو زمانے بھر میں مشہور ہوگئی۔

گیتی :۔ جوان آدمی کے مرنے کا تو غیر غیر کو رنج ہوتا ہے نہ کہ اپنوں کو۔ ہمایوں فر کی وفات کا سوگ سارے زمانے کو ہے۔ کوئی ایسا نہیں جس کو ان کے مرنے سے قلق نہ ہوا ہو مگر اس کا چارہ کیا ہے اور جس شے میں مجبوری ہے جس میں بس ہی نہیں چلتا اس میں بجز سکوت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

سپہر :۔ بہن کہتی ہوں کہ اب تک درد فراق نے مجھے مار ڈالا ہوتا مگر اب تو اُف تک زبان پر نہیں لا سکتی کس منہ سے کہوں اور کہوں تو کیا کہوں۔ کچھ کہوں بھی تو نہیں کہہ سکتی۔

حسن :۔ یہ تو ہم سننا بھی نہیں چاہتے کہ تم کچھ کہو میں پوچھتی ہوں کہ تم کچھ کہنا ہی کیوں چاہو باقی رہا غم و الم کس کا عزیز نہیں مرا ہے اور کون نہیں مرے گا دنیا مر بگی ہاں اگر یہ بات نہ ہوئی ہوتی تو البتہ تمہارا رنج کرنا بجا تھا اب ظاہر کرنا اپنے کو مطعون کرنا ہے

سپہر :۔ سچ کہتی ہو باجی جان۔ مگر قسم لو جو اس وقت کے سوا اور کبھی یہ باتیں زباں پر لائی ہوں کیا مجھے آپ مجھے نادان سمجھتی ہیں

نازک :۔ ایسے مقام پر سب ناداں ہو جاتے ہیں اب ان باتوں کو جانے دو۔ ہم کچھ پڑھیں وہ سنو۔ مگر شرط یہ کہ دل کے کانوں سے سنو۔

سلامی دیکھو تو ہے رنگ آسماں کیسا ۔۔۔ غم حسین میں رہتا ہے سب جہاں کیسا
اسیر فوج عدو سر کھلے پریشاں حال ۔۔۔ چلا ہے شام کو زہرا کا کارواں کیسا
خدا سے شرم نہ کی ظالموں نے واویلا ۔۔۔ نبی کا کر دیا برباد وودمان کیسا
امام کہتے تھے اعدا سے دیکھو بن پانی
بلک رہا ہے مرا طفل نیم جان کیسا

نازک ادا بیگم نے ایسی ایسی نازک ادائی سے ان اشعار کو ادا کیا کہ سب بے اختیار رونے لگیں اور کئی منٹ تک آنسوؤں کے تار رو کے نہ رک سکے۔

نازک :۔ ہے ہے کسی روز بہت کچھ سناؤں گی کہ تم سب پھڑک پھڑک جاؤ۔ آج تو اس وقت خراش کے سبب سے ذرا گلا صاف نہیں۔

بہار :۔ تم جب پڑھو گی خوب پڑھو گی

حسن :۔ اس وقت اس قدر دل بھر آیا کہ بیان سے باہر۔

سپہر:۔ ہاں باجی۔ اللہ جانتا ہے میرے قلب کا عجب حال ہے۔
نازک:۔ میں گھنٹوں رویا کرتی ہوں گھر پر۔

گویا کو یہ کہیں کہ ہمارا ہے یہ محب
ہو روزِ حشر اتنی عنایت حسین کی

حسن:۔ اتنا پوچھنا بھول گئی کہ اب تو کسی بات کا ڈر نہیں ہے۔
سپہر:۔ کچھ نہیں باجی جان۔ اب ڈر اور خوف نہیں شمس النسا بیگم اور روح افزا اور سپہر آرا اور حسن آرا سب سے علیحدہ ایک کمرے میں جا کر آزاد کی نسبت گفتگو کرنے لگیں۔ شمس النسا سے سپہر آرا نے کھود کھود کر کل باتیں پوچھیں تو انھوں نے یوں بیان کیا: بہن بات ساری یہ ہے کہ وہ دل و جان سے ان پر فدا ہیں اور یہ ان کی خوش قسمتی ہے۔ میں نے جو آزاد کو دیکھا تو خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں ایسا جی خوش ہوا کہ بیان نہیں کر سکتی ہوں نک سک سے درست۔ نوخیز جوان۔ رعنا شمائل زیبا خصائل، پسندیدہ کردار۔ وجیہ شگفتہ رو۔ خوش تقریر اور شاعری کا حال تو حسن آرا سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ جتنے دن وہ بمبئی میں رہے میری روح کو فرحت حاصل ہوئی تھی اور میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں ان کو کسی طرح وہاں سے جانے دوں۔ مگر زیادہ اصرار کیونکر کر سکتی تھی۔
حسن: سپہر آرا کا بھی کبھی نہ کبھی ذکر کرتے تھے ان کو بہت یاد کرتے ہوں گے۔ جب ہم نے کہا تھا کہ تم جا کے روم میں نام پیدا کرو اور جنگ میں شریک ہو تو سپہر آرا نے ہم سے مخالفت ظاہر کی اور بڑی دیر تک رو رو کر اصرار کیا کہ باجی جان جس طرح ممکن ہو ہماری خاطر سے اس اصرار سے درگزرو۔ اف وہ بڑا رولاتی تھیں۔ مگر میں نے ایک نہ سنی۔ ایک بات نہ مانی۔ سپہر: واہ بڑا کام کیا تھا بڑی ہیں آپ۔ کہنا تو نہ چاہیے مگر برا نہ مانیے تو کہوں (دبے دانتوں) خیر تم تو نہیں آتی
روح:۔ ہاں کیا تو تم نے ظلم ہی تھا بہن کہاں لڑائی کمبخت کہاں گولی بارود اور کہاں میاں آزاد۔ یہ تم کو سوجھی کیا انوکھی۔
حسن:۔ اب انصاف کرو بہن اگر ہم اس قدر اصرار کرتے تو آزاد کو کون جانتا۔ دنیا میں کوئی اتنا بھی تو نہیں سمجھتا کہ آزاد ہیں کون۔
سپہر: تو اتنے ہی کے لئے آپ کو یہ کرنا پڑا کہ ان کو میدانِ جنگ میں بھیجا اور مورچے پر جانے کا فتویٰ لگایا۔
حسن:۔ اے ہے۔ یہ اتنے ہی کے لئے ہوا۔
گیتی:۔ اتنا تو ہم بھی کہیں گے کہ اگر آزاد روم نہ جاتے تو کبھی اتنا نام نہ ہوتا اور لوگ طعنے دیتے کہ غیر جگہ بھی شادی کی تو گمنام آدمی کے ساتھ۔

حسن :۔ اور اب۔ اب بھی کوئی کہہ سکے گا۔

سپہر :۔ اب کون کہہ سکتا ہے اب اُن سے زیادہ نیک نام اور کون۔ اب تو ہر طرف آزاد ہی آزاد کا نام ہے۔ وہ بھی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ کبھی اخبار پڑھ کر ہم کو سنائیے اور یہاں تک کہا کہ ہم کو فخر کا مقام ہے کہ وہ ہماری ساڑھو ہوں۔ ایسے ہم زلف کا ہم کو بیشک فخر ہے۔

روح :۔ بھلا اتنا بڑا شہزادہ کبھی اپنی زبان سے ایسا کہتا۔

حسن :۔ پھر آپ ہی سمجھیں۔ اب بتاؤ۔ آزاد کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیئے یا ہم کو ان کا یہ نام سب ہمارے سبب سے ہوا۔

روح :۔ اس میں تو شک نہیں مگر جان جوکھم تو تھی۔ وہ تو کہو خدا نے بچا لیا اور جو خدا نا کردہ کچھ اونچ نیچ ہوتی تو لوگ کیا کہتے۔ اب سنیئے کہ صاحب ضلع نے کامل تحقیقات کر کے شہزادی بیگم کو اطلاع دی کہ گورنمنٹ کو اب اس میں اصلاً شک نہیں کہ یہ ہمایوں فر کے بڑے بھائی ہیں۔ اب سرکار کو ان سے یا آپ سے کسی قسم کا مواخذہ نہیں ہے۔
صاحب عالم نے اپنے طرز پر گھر کا انتظام کیا اور دوسرے روز حسب الطلب اپنی سسرال آئے۔ بڑی بیگم نے لڑکیوں کو بلا کر سمجھا اور سکھا دیا تھا کہ خبردار کوئی کلمہ اس قسم کا زبان پر نہ لانا جس سے غم یار تازہ ثابت ہو اور نہ ہمایوں فر کا مطلق ذکر ہی نہ ہو ورنہ ان کے دل پر بڑا شاق گذرے گا اور بھائی کے غم کا زخم از سرِ نو تازہ ہو جائے گا حسن آرا نے سپہر آرا کو علیحدہ لے جا کر سمجھا دیا تو وہ بولیں۔ باجی تمہارے نزدیک تو آج یہ نئی بات ہے اور یہاں اتنے دن رہتے سہتے گذرے اب خیال ہی قریب نہیں آنے پاتا۔ تم مجھے سکھاتی کیا ہو۔ جب صاحب عالم کی سواری بڑی بیگم کے در دولت پر پہونچی اعزہ نے باہر کوٹھی میں بٹھایا۔ تواضع تکریم کی۔ محل سرا میں خبر آئی بڑی بیگم صاحب نے اندر بلوایا مگر جس خوشی اور تپاک سے داماد عروس کے گھر میں جاتا ہے اور جس شوخی اور پیار کے ساتھ سالیاں دل لگی مذاق اور چہل کرتی ہیں اس کا کہیں پتا ہی نہ تھا۔ شہزادے نے بڑی بیگم کو جھک کر سلام کیا اور قریب جا کے بیٹھے ادھر اُدھر سے سالیاں تانک جھانک کرنے لگیں۔ مگر کسی قدر افسردگی کے ساتھ ہمایوں فر کی تصویر سامنے کھنچ گئی۔ حسن آرا کا دل بھر آیا ہر در و دیوار سے مرزا ہمایوں فر ہی کی صورت نظر آتی تھی۔ روح افزا بار بار بہنوئی پر نظر ڈالتی اور دل ہی دل میں کہتی تھی کہ اللہ اللہ اس قدر مشابہت بالکل ہمایوں فر ہی ہیں ذرا فرق نہیں۔ گیتی آرا کی آنکھیں فرط الم سے پُرنم ہو گئیں مگر نیچی نظروں سے زمین کی طرف دیکھنے لگیں تاکہ مبادا اور بہنیں ان کو روتے ہوئے دیکھیں تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو جائیں۔ بہار النسا جو ہمایوں فر کے ساتھ بچپن میں کھیلی ہوئی تھیں ان کو غور سے دیکھا تو حسن آرا کے کان میں کہا۔ بہن ان کو تو میں جانتی ہوں اسے یہ صاحب عالم ہیں جب میں اور ہمایوں فر بچپنے میں کھیلتے تھے تو یہ ہم دونوں سے الگ الگ رہتے تھے ان

کی ماں شہزادی بیگم کہا کرتی تھیں کہ ہمایوں فرکی سب سے منتی ہے مگر اس سے کیا جائے کیسی طبیعت پائی ہے کہ کسی برائم
والے سے میل نہیں ہے۔

حسن: ۔پھر تم پرواہ کیوں کرتی ہو۔سامنے کیوں نہیں ہو تیں۔

بہار: ۔اے واہ۔ماں نہ ماں میں تیرا مہمان وہی مثل ہو۔

گیتی: ۔(آنسو ضبط کرکے) اے بہن سپہر آرا کہاں ہیں؟

حسن: ۔وہ پلنگ پہ بیٹھی ہوئی تصویریں دیکھ رہی ہیں۔

گیتی: ۔چلو انھیں کے پاس چل کے بیٹھیں۔ان کو اکیلا نہ چھوڑو۔

حسن: ۔آپ کی بھی کیا باتیں ہیں وہ تو اُف نہیں کرتی اور وجہ کیا آپ خواہی نخواہی چھیڑتی ہیں جس میں ملول نہ ہوتی
ہوں تو ہو جائیں۔

بہار: ۔ہاں یہ تم نے میرے دل کی بات کہی۔گھڑی گھڑی یہ کہنے سے کیا مطلب نکلتا ہے۔اب تو پرانی بات ہو گئی
اس کو دل سے بھلانا چاہیے یا بار بار اسی کا ذکر کرنا چاہیے۔

گیتی: ۔میرا اس وقت بے اختیار دل بھر آیا۔افوہ۔توبہ

روح: ۔ایسا نہ ہو وہ اپنے دل میں برا مانیں کہ یہاں کیا آ کے شہر خموشاں میں آیا۔کوئی بولتا ہے نہ چالتا ہے۔
امی جان بھی خاموش بیٹھی ہیں اور ہم سب الگ بیٹھے ہیں۔

حسن: ۔بہار النسا بہن کو ذرا دیر کے لئے جانا چاہیے جانے دیجئے بتایئے آخر اس میں عیب کی کون سی بات ہے اور آج
کوئی غیر تو یہاں ہے ہی نہیں کہ ہنسے گا۔ایک نازک ادا تھیں سو وہ بھی اب نہیں ہیں۔اماں جان برا ماننے سے رہیں۔

روح: ۔ہاں ہاں۔باجی جاؤ۔سچ تو کہتی ہیں۔

گیتی: ۔اے ہاں ہم ہی سب ہیں یہاں یا کوئی غیر ہے جو دس گھر میں جا کے ہنسے گا۔پھر جانے میں کیا چوری ہے تم کو تو یہ
سمجھنا چاہیئے کہ آج برات کا دن ہے اور دولہا گھر میں آیا ہے۔برات کے دن دولہا سے پردہ کرنا کیا معنی۔بہار
النسا نے کہا اچھا اگر تم سب کی یہی رائے ہے تو کیا مضائقہ پہلے تو آئینہ کے پاس گئیں اور کئی منٹ تک اپنی صورت
دیکھا کیں۔حسن آرا اور روح افزا اور گیتی آرا سب ان سے واقف تھیں کہ دن رات نکھرتے کے سوا ان کو اور کوئی کام
ہی نہیں ہے۔آئینہ میں صورت دیکھی تو پسند نہ آئی۔پانی منگوا کے منہ دھویا۔پھر بناؤ چناؤ کیا۔اب دوپٹے کے بدلنے کی
فکر ہوئی مغلانی سے کہا یہ دوپٹہ نہ پہنیں گے دوسرا لاؤ اس پر روح افزا اچھلا کر بولیں اے باجی از برائے خدا اس خبط
سے درگذرو۔اے واہ اس دوپٹے میں آخر ہوا کیا ہے۔خاصا اچھا دوپٹہ ہے مگر آپ سے کہے کون۔حسن آرا اور گیتی آرا
نے قہقہہ لگایا۔تو صاحب عالم نے ادھر نظر ڈالی اور خوش ہوئے کہ گھر سونا نہیں ہے قہقہے کی آوازیں آتی تھیں گو طرح

طرح کے خیالات نے ان کو از بس ملول کر دیا تھا اور ان کا دل بھی قابو میں نہ تھا مگر گھر سے عہد کر کے آئے تھے کہ انتہا سے زیادہ ضبط کروں گا۔ اتنے میں دوپٹہ بدل کر اور دولہن بن کر بہار النسا چھم چھم کرتی ہوئی کمرے سے نکلیں صاحب عالم نے دیکھا تو۔ س

پائجامہ گلابی اطلس کا
عطر جس میں لگا ہوا خس کا

نظر غلط انداز سے کئی بار دیکھا تو اس عروس نازنین کا جمال مبین بہت بھایا اور پسند آیا۔ بڑی بیگم کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو بہار النسا کا اس بے تکلفی سے باہر آنا برا معلوم ہوا بہار النسا نے صاحب عالم کی طرف مخاطب ہو کر کہا وہ پہچانا یہ ڈھنگ کے یا الٰہی یہ پری پیکر مجھے کیونکر جانتی ہے غور کر کے دیکھا کہا جی نہیں میں نے نہیں پہچانا لاکھ سوچتا غور کرتا ہوں کہ کہاں دیکھا تھا کب دیکھا تھا مگر ذہن نہیں لڑتا اور یوں تو جانتا ہوں کہ دھوکا ہی دھوکا ہے۔ بہار النسا نے مسکرا کر کہا (بجا ہے) اتنے میں بڑی بیگم بولیں۔ سچ تو کہتے ہیں بیٹا تم نے ان کو کہاں دیکھا ہوگا بھلا یہ پہچانیں تو کیونکر پہچانیں بہار النسا بولی۔ امی جان یہ چاہے بھول گئے ہوں ہم تو نہیں بھولے ہیں ابھی تک اونگلی میں نشان باقی ہے۔ یہ آپ ہی کی عنایت ہے۔ اب بھی نہیں یاد صاحب عالم نے غور کر کے کہا۔ ہاں ہاں سچ کہا ماشوہ برسوں کی بات ہے۔ میں نے اب بخوبی پہچان لیا۔ بہار النسا بیگم ہیں۔ دو بہنیں ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ کچھ ٹھکانا ہے کتنا عرصہ ہوا۔ بہار النسا گو دل کی پاک اور نیت کی صاف تھیں۔ مگر ان کے مزاج میں غرور حسن نے بہت دخل پایا تھا اور جس وقت اپنی پسند و مرضی کے موافق بناؤ چناؤ کرتی تھیں اس وقت حسن گلوز اور ادائے رنگین کے اظہار کا کمال شوق چراتا تھا اور یہی جی میں آتا تھا کہ کوئی دیکھے اور تعریف کرے صاحب عالم شہزادہ قمر طلعت کے دکھانے کے لئے کوئی ادا باقی نہ رکھی گو مارے شرم کے ذرا چار آنکھیں کرتے ہوئے لحاظ آتا تھا مگر نظر غلط انداز ہی ستم ڈھاتی تھی۔

بہار النسا:۔ ہماری بہن جب سے ان کے ہاں گئی بالکل دبلی ہو گئی۔

شہزادہ:۔ (مسکرا کر) جی درست ہے آپ تو ایسا ہی کہا چاہیں۔

بہار:۔ کیا کچھ جھوٹ بھی ہے۔ نہیں دبلی ہوئی ہے۔

شہزادہ:۔ خدا خدا کیجئے صاحب۔ دبلا ہونا کیا معنی۔

بہار:۔ اچھا سپہر آرا جو کہہ دیں وہ صحیح ہے بس۔

شہزادہ:۔ وہ تو خواہ مخواہ اپنی بہنوں کی سی کہیں گی۔

بہار:۔ یہ کلہ ہے سے معلوم ہوا واہ تو سسرال کا دم بھرتی ہو۔

شہزادہ:۔ واہ یہ باتیں ہیں اچھا خدانخواستہ آپ نے کیا دبلاپن دیکھا اور یوں تو قاعدہ ہی ہوتا ہے کہ سسرال

والے خواہ مخواہ موردِ طعن ہوتے ہیں۔

بہار :۔ تو ہم سسرال والوں میں نہیں ہیں۔جی۔

شہزادہ :۔ کوئی اور بھی کہتا ہے یا آپ ہی کی رائے ہے۔

بہار :۔ تو تم لڑتے کس بوتے پر ہو۔ ہماری بہن کا جو حال ہم کو معلوم ہے۔ تم کو معلوم ہو سکتا ہے۔ کبھی پہلے دیکھا تھا پھر بھلا ہم سے محبت کیا معنی۔

بڑی بیگم تو تھوڑی دور پر ایک اور بوڑھی عورت سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں اور ادھر ان کو باتیں کرنے کا موقع ملا۔ جیسے بہار النسا نے یہ فقرہ کہا (پھر ہم سے محبت کیا معنی)، ویسے ہی کمرے سے آواز آئی (گدھاپن کیونکہ ثابت ہو یہ گرما گرم فقرہ سنتے ہی بہار النسا ہنس پڑی اور کمرے سے بھی کئی کم سنوں کے قہقہے کی آواز آئی اور صاحبِ عالم منہ پر رومال رکھکر مسکرائے اور اسقدر جھیپے اور شرمائے کہ بیان سے باہر۔

شہزادہ :۔ جس نے ہمیں گدھے کا خطاب دیا ہے اس کی صورت تک سے ناواقف ہیں۔ شوخی اور بے تکلفی تو اسی کی مقتضی ہے۔ کہ رُخِ انور کی جھلک دکھا دیں۔

آواز :۔ پھر گدھے پن کی لے نے لگے۔ ایک نشد دو نشد۔

شہزادہ :۔ (بہار النسا سے) یہ کون ہیں بڑی گرماگرم بڑی تیز بڑی مقرر بے تکلف معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ ری شوخی و زباندرازی۔

آواز :۔ سپہر آرا کہتی ہیں ہم کو ان کی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔

شہزادہ :۔ یہ گھونگھٹ کیا معنی۔ اے صاحب۔ (خاموش)

آواز :۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ بس۔ خبردار۔ زبان سے بھی ان میاں کو کہنا نہیں ہے۔ کہتے کچھ ہیں منہ سے نکلتا کچھ ہے۔

شہزادہ :۔ آپ کا سا مقرر اور لسان تو کوئی شاید ہی ہوگا۔ ناظرین شاید سمجھ گئے ہونگے کہ یہ کون شوخ بے باک اس بے حجابی اور لگاوٹ بازی اور زبان درازی سے گفتگو کرتی تھی۔ حسن آرا کی یہ تقریر نہیں ان کی شوخی بھی تستعلیق ہے۔ سپہر آرا یہ کلمہ صاحب عالم کے حق میں بھلا کیونکر زباں پر لاتی اور روح افزا گو مزاج کی تیز ہیں مگر اسقدر بے جھجھک نہیں گیتی آرا کے زبان آور ہونے میں شک نہیں لیکن اس درجہ ڈھیٹ نہیں ہے۔ یہ نازک ادا بیگم ہیں۔ جانے کو تو گھر گئیں مگر نہ رہا گیا دوسرے ہی روز واپس۔ آج آئیں تو سنا کہ صاحب عالم تشریف رکھتے ہیں۔ یہ بھلا بے آوازہ کسے پھبتی کہے کب رہنے والی تھیں حسن آرا نے لاکھ لاکھ سمجھایا مگر انھوں نے ایک کی نہ سنی اور موقع پاکر تڑ سے بول ہی اٹھیں۔

اب سنیئے کہ جب نازک ادا اور صاحب عالم میں سوال و جواب ہونے لگے تو روح افزا نے کہا چاہے جو ہو میں تو تمہارا نام بتا دوں گی۔ خدا جانے وہ کیا سمجھیں۔

نازک :۔ اخاہ۔ کیا چوری پڑی ہے مجھے ہونہہ۔

روح :۔ اللہ جانتا ہے ہم نام لے دیں گے۔ جس میں تمہارے سبب سے کوئی اور تو مفت میں بدنام نہ ہو۔

نازک :۔ اے روح افزا بہن کہتی تو تم ہو اور نام سب کا بد ہوگا۔ کہو تو اپنا نام لے کر کہو یہ تمہارے سبب سے کوئی اپنے کو کاہے کو بدنام کرے گا۔

روح :۔ ہمارا نام تو نازک ادا بیگم ہے بہن۔

شہزادہ :۔ اخاہ۔ یہ کہئے۔ نواب آسمان جاہ تشریف فرما ہیں۔

حسن (ہنس کر آہستہ سے) ان کے نام سے کون نہیں واقف ہے۔

روح :۔ اب بولو۔ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بناتی تھیں۔

گیتی :۔ اچھی دھری گئیں۔ اس وقت روح افزا نے بڑا کام کیا۔

شہزادہ :۔ جب ہی میں سوچتا تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ کون شوخ و شنگ بیگم صاحب ہیں۔ چٹاخ پٹاخ زبان ہے کہ فراٹے بھرتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ نازک ادا بیگم صاحب تشریف رکھتی ہیں۔ مزاج شریف۔

نازک :۔ روح افزا دیکھو اللہ جانتا ہے تم کسی کا نام مفت میں لے کے لڑائی مول لیتی ہو اور پھر ہم اگر۔

روح :۔ وہ تو گفتگو ہی سے پہچان گئے ہوں گے۔

شہزادہ :۔ آپ کے کہنے کی ذرا ضرورت نہیں ہے میں ان سے خوب واقف ہوں ماشاء اللہ بڑی گویا ہیں اور مجھے تو اس وقت کمال مسرور کیا اس قدر تعریف کی کہ میری زبان اس کے شکریہ سے قاصر ہے (مسکرا کر) تسلیم عرض ہے۔

نازک :۔ اب کیا کچھ اور سننے کا مقصد ہے۔

شہزادہ :۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا کہئے گا۔

نازک :۔ پھر اب سننے کو جی چاہتا ہو تو ویسا ہی کہہ دو۔

شہزادہ :۔ آپ سے جیتنا یا عہدہ برآ ہونا یہ کو محال ہے۔

نازک :۔ سسرال میں آنکھے اور بے سنے جانا کیا معنی۔

شہزادہ :۔ اس میں کیا شک ہے پھر سنا تو بکیں آپ۔

بہار :۔ میں تو دنگ ہو گئی کہ یا اللہ یہ کون ہے۔ کیا بے دھڑک کہہ اٹھیں۔ پھر جب آواز سنی تو پہچان گئی کہ سوائے نازک ادا بیگم کے اور کون ہوگا۔

نازک :۔ میں نے سنا ہے آپ تو خوب نکھر سنور کے گئی ہیں۔

بہار النسا :۔ (جھیپ کر) اب تم سے کون۔ (شرما گئیں)

نازک :۔ ہاں ہاں۔ کہو کہو۔ (کون) کہہ کے رہ گئیں بس آخر جب دل میں چور نہیں ہے تو شرمائیں کیوں۔ یہاں سب کی سب ہنس رہی ہیں کہ بہار النسا بیگم نے تو بے نکھرے ہوئے قدم نہیں اٹھایا۔

بہار :۔ اچھا پھر تم کو کاہے سے رشک ہوتا ہے۔

شہزادہ :۔ چلی آیئے نہ۔ مضایقہ ہی کیا ہے۔

نازک :۔ اللہ اللہ اب تو وہی مثل ہوئی۔ کہ پہونچا دیتے ہی ہاتھ پکڑ لیا۔ ان ہی سے باتیں کیجئے بس۔ اگر ہوس ست ہمیں قدر بس ست۔

شہزادہ :۔ خیر خوشی آپ کی مگر ہم کو رنج ہوگا کہ ایک ذرا سی بات میں انکار کیا جیسے وہاں بیٹھی ہیں آپ ویسے یہاں بیٹھے

نازک :۔ پھر وہی۔ اب کہہ کے صلواتیں سناتی ہو۔

شہزادہ :۔ وہی کے بعد کہیئے نہ۔ وہی گدھا پن ہمارا۔ خیر پھر اب گدھے ہیں یا جو کچھ ہیں۔ مروت کے یہی معنی ہیں کہ اتنے ستانے کے بعد یہاں تشریف لایئے۔ ؎

زقدر و شوکت سلطاں نگشت چیزے کم

زالتفات بہ مہمان سرائے دہقانے

روح افزا نے نازک ادا کو چھیڑنا شروع کیا اور چونکہ سب ہمجولیاں روح افزا ہی کی طرف تھیں اس سبب سے نازک ادا کی دال نہ گلی۔

روح :۔ پھر ان کے دماغ کیوں نہ بگڑ ملیں۔ جب شہر بھر کے شہزادوں اور نوابوں کی زبان پر ان کا نام رہتا ہے تو یہ جس قدر غرور کریں بجا ہے۔

نازک :۔ اے تم کاہے کو رشک کرتی ہو۔

روح :۔ ان کے کہنے کا اس وقت کوئی برا نہ ماننا۔

گیتی :۔ ہاں اس وقت سب کو ہر طرف کہہ کے آئی ہیں۔

اس فقرے پر ایک قہقہہ پڑا اور سب کی سب بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑیں مگر ایک دیہاتن جو دو تین دن سے یہاں نوکر تھی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ قہقہہ کس بات پر پڑا۔ سادگی کے ساتھ گیتی آرا سے سبب دریافت کیا تو وہ ہنس کر بولیں۔ اے لو ان کو ابھی یہی نہیں معلوم کہ یہ ہنسی کاہے کی ہے۔

نازک :۔ کون۔ بی تکورن۔ یہ بیچاری بھلا کیا سمجھیں۔

روح: ۔کشمیری۔ (بھانڈ) نقل کیا کرتے ہیں کہ ایک رئیس کے دماغ پر گرمی جو چڑھ گئی تو سویرے اٹھتے ہی جو جاتا ہے اس کو پھاڑ کھاتے ہیں۔ خدمت گار نے جھک کر سلام کیا اور وہ چراغ پا ہوئے۔

شکورن: ۔کیا ہوئے۔ کیا ہوئے۔ چراغ۔ کیا!

نازک: ۔اب تو بہن ان سے وہ باتیں کہتی ہو جو اچھی اچھی شہر والیوں کی سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ کھڑی مردانی بولی۔

روح: ۔مطلب یہ کہ جس نے بات کی اس کو پھاڑ کھایا۔ خواص آئے بندگی حضور تو فوراً بگڑ کر کہا۔ تم برطرف۔ مصاحبوں نے فراشی سلام کیا۔ یہ بولے تم بھی برطرف۔ اسی طرح سب کو برطرف کرتے کرتے یہاں تک نوبت پہونچی کہ اپنی جورو تک کو برطرف کر دیا۔

شکورن: ۔یہ کس کو برطرف کر کے آئی ہیں۔ ان کو جورو کہا۔

روح: ۔واہ کیا یہ مرد ہی نہیں ہیں۔ اے یہ تو سوا مرد ہیں۔

نازک: ۔اے بہار النسا بہن کچھ باتیں کرو۔ خالی خوبی بیٹھے مکھیاں مار رہے ہیں نہ کچھ بولیں نہ چالیں اور کچھ نہیں چرخا ہی کہیں سے منگوا دیا۔ کاتا ہی کریں۔

شہزادہ: ۔اب آخر پردے ہیں سے گفتگو کب تک ہوا کرے گی۔ باہر آیئے روبرو دوبدو گفتگو ہو۔

اے بنّو کل تو ہے اللہ کو منہ دکھلانا
آج منہ ہم کو دکھاؤ گے تو احسان ہوگا

نازک: ۔یہ بے صبری۔ اب سوال کیا ہے تو مراد پا چکے
بے سوالی صبر کی دولت اگر پیدا کروں
مثلِ گل بے منتِ مخلوق زر پیدا کروں

شہزادہ: ۔واہ بنّو نیکی درگاہ سے سائل کہیں محروم جاتے ہیں؟
جو چاہے سو مانگ انش درگاہ الٰہی سے
محروم کبھی پھرتے دیکھا نہیں سائل کو

اور بنّوں پر یہاں ایمان لائے ہوئے ہیں۔

نازک: ۔مجھے تو کچھ بڑے لسان بڑے زبان آور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اب تک یوں ہی بھیگی بلی بنے ہوئے میٹھے تھے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ پیٹ میں گن بھرے ہوئے ہیں۔ مگر واہ ری ادا۔
کھپ گئی دل میں یہ کس خنجر مژگان کی ادا
دل تڑپتا ہے جدا ٹکڑے جگر ہوتا ہے

روح :۔ (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ہائیں

گیتی :۔ (متحیر ہو کر) بس حد ہو گئی!!! ارے توبہ!

شہزادہ :۔ صاحب ہم آپ سے ہارے ۔ بیشک ہار گئے ۔

روح :۔ افوہ ۔ یہ ان سے اسقدر بے جھجھک کہا کیونکر گیا۔

نازک :۔ اس کی سند نہیں کہ ہاری ہاری پکارنے لگے جب جانے کہ اس کے جواب میں کوئی ایسا ہی سمجھ کر لتا ہوا شعر کہو

ہم دمو کشتہ ہوں تیغ نرگسِ مخمور کا

ہر دہانِ زخم پر یاں خندۂ مستانہ ہے

سیکڑوں شعر یاد ہیں ۔ سے

پاسِ ادب رہا ہے جنوں میں بھی اسقدر

آتا ہوں سجدے کرتا تری آستاں تلک

فصلِ خزاں میں گل کا تو آنا محال ہے

بجلی ہی کاش آئے مرے آشیاں تلک

اس مہ کے وصف میں یہ ہوا مرتبہ بلند

پہونچی مری غزل کی زمین آسماں تلک

رکھیں ادب سے پانوں نہ ہم تری راہ میں

باہر جب آپ سے ہوں تو پہونچیں وہاں تلک

کب پہونچی آہ ضعف سے گوش جہاں تلک

سو جا ٹھہر کے سینے سے آئی زباں تلک

روح :۔ اس وقت گانے پر کچھ مہربانی کی ۔

بہار :۔ اب تو تم نے صاحب عالم کو بند کر دیا ۔

نازک :۔ تبھی تو خاموش بیٹھے ہیں ۔

اتنے میں صاحب عالم کو آزاد پاشا یاد آئے تو ان کی توصیف میں عرصہ دراز تک طب اللسان رہے

شہزادہ :۔ حسن آرا بیگم تو بخیریت ہیں ۔

بہار :۔ ہاں خیر و عافیت سے ہیں ۔ آپ کے اس استفسار اور پرستش کا شکریہ ادا کرتی ہیں کہ آپ کو اسقدر خیال ہا

شہزادہ :۔ اب تو انشاء اللہ بہت جلد جشن مسرت ہو گا ۔

بہار :۔ انشاء اللہ۔ اب کچھ تھوڑی ہی کسر باقی ہے۔

شہزادہ :۔ سنا دو رنگ آ گئے ہیں مگر چشم بد دور خوب نام پیدا کیا۔ جہاں سنا انھیں کا چرچا اور جس کو دیکھو انھیں کی تعریف کرتا ہے۔ ایک جلیل القدر انگریز کی زبان سے ہم نے بڑی توصیف سنی وہ مجھ سے کہنے لگے کہ ہندستان کے اکثر مشہور مشہور انگریزی اخباروں میں ہم نے آزاد کی تعریف پڑھی اور ولایت کے کل پرچوں میں اُن کی جرات و بسالت کا حال درج پایا ایسے نیک نام ہیں۔

بہار :۔ ان کے سب دوست ہیں کوئی نام کو دشمن نہیں۔

شہزادہ :۔ ایسے شخص کے سب دوست ہونے ہیں اور اسی سبب سے وہ اور بھی زیادہ مشہور رہتا ہے۔ ؎

بھر کجا کہ روم وصف دوستان گویم

برائے یار فروشی دکان نہی باید

نازک :۔ کسی اخبار میں آزاد کی تصویر بھی دیکھی ہے۔

شہزادہ :۔ کسی اخبار میں کیا معنی! کیا کوئی اخبار ایسا بھی ہے جس میں ان کی تصویر نہ ہو اور ہمارے البم میں تو کئی تصویریں ہیں۔

نازک :۔ بھلا حسن آرا بیگم کی تصویر بھی کہیں دیکھی۔

شہزادہ :۔ (ہنس کر) اب اس کا جواب وہ خود دیں گی۔

بہار :۔ تم اپنی تصویر کھینچواؤ تو کیا مضائقہ ہے بہن۔

نازک :۔ ہماری تصویر تو اس قابل نہ ہوگی کہ کوئی دیکھے روح افزا کو اللہ نے وہ صورت دی ہے کہ۔

(اسقدر کہا تھا کہ روح افزا نے جھلا کر اُن کا منہ پکڑ لیا اور نازک ادا دکہ) کہہ کر خاموش ہو گئیں اور ہنسنے لگیں۔

روح :۔ اے تو تم ہم کو کاہے کو بدنام کرتی ہو۔

نازک :۔ تمہاری تو اور تعریف ہوتی ہے بُرا کیوں مانتی ہو۔

گیتی :۔ اس قابل ہوں تو بُرا مانیں۔ ہاں تم البتہ اس لائق ہو کہ سب کے پاس تمہاری تصویر رہے۔

روح :۔ اور ہم کو جانتا ہی کون ہے تم البتہ شیطان سے زیادہ مشہور ہو۔

بہار :۔ نازک ادا کی زبان ولایتی مقراض سے کم نہیں۔

شہزادہ :۔ ہاں کیا اچھی مثال دی ہے آپ نے۔

نازک :۔ آپ کو بھی ہمارے لئے زبان آئی۔ شانِ خدا۔

صاحب عالم کچھ دیر کے بعد باہر دیوان خانے میں تشریف لائے یہاں بڑی بیگم کے اعزہ نے تعظیم و تکریم کے ساتھ

بٹھایا اور اُن کے سفر و سیر و سیاحت کا حال دریافت کیا انھوں نے کہا خدا جانے کیا بات ہوئی کہ ہم نے وطن کو ترک کر کے کوہستان پر رہنا اختیار کیا۔ عابد علی شاہ درویش نے وہاں ہم کو عربی پڑھائی منطق اور ریاضی اور فلسفہ اور علم ادب اور فقہ اور طب اور صرف و نحو میں خدا کے فضل اور استاد شفیق کی توجہ سے برق ہو گیا تو اسکول میں جاکر انگریزی پڑھی۔ اگر خدا روپیہ دے اور عقل دے تو سال میں کم سے کم چار مہینے پہاڑ پر ضرور رہے از سر نو جوانی آتی ہے خداداد لطف حاصل ہوتا ہے۔

این سبزۂ و این چشمۂ و این لالہ و این گل
آن شرح مدار و کہ بگفتار در آید

نواب:۔ آپ کو نہیں۔

شہزادہ:۔ نہ فرمائیے فرمائیے۔ آپ کو کہہ کے آپ رہ گئے۔ فرمائیے نہ۔

نواب:۔ کیا مطلب ہے۔ اب اِن باتوں کا ذکر ہی کیا ہوا۔ جو کچھ ہونا تھا خدا آپ کی زندگی میں برکت دے اور صد و سی سال کی عمر آپ کو عطا کرے۔ ہمارے سرتاج اور نورِ عین ہیں آپ۔

شہزادہ:۔ میں نے اِس سانحہ جگر دوز کا حال ایک اخبار میں پڑھا تھا گو گھر سے دل پھیکا پڑ گیا تھا مگر بھائی کی محبت جوش زن ہوئی اور بڑی دیر تک مثلِ ماہی بے آب تڑپتا رہا۔ کسی سے ہم نے کچھ کہا نہ سنا دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ یار دوست آشنا احباب سب متحیر کہ یا خدا آج ان کو بیٹھے بٹھائے کیا ہوا کسی نے کہا دماغ میں خلل ہو گیا ہے کوئی سمجھا ایک ساعت کا جنون ہے۔ کسی نے تشخیص کی کہ کوئی عارضہ ہے الغرض سب نے عقل کے گھوڑے دوڑائے مگر کوئی یہ نہ سمجھا کہ درد دل کیا ہے بس باآواز بلند بھائی کا نام لے کر اتنا البتہ کہا کہ اب مجھے کوئی تمنا نہیں ہے بجز اس کے کہ اپنی مادر ضعیفہ کو تسکین دوں اور مزار پر سر پھوڑ دل سے

کنون نماند تمنا دگر امیر شوم
سرِ مزار تو بنشینم و فقیر شوم

نواب:۔ ہائے افسوس اس کی جوانی مفت برباد ہو گئی۔ ہائے ہائے۔

رفیق:۔ خداوند باغ میں تشریف لے چلئے وہاں فرحت ہے۔

نواب:۔ ہاں چلئے سب صاحب وہیں چل کر بیٹھیں اب دل کو بہلانا چاہئے۔ خدا کی خدائی میں کس کو دخل نہیں مشیت ایزدی کو وہی سمجھ سکتا ہے بس۔

رفیق:۔ حضور ایسے سانحے ہوتے ہیں کہ میں کیا عرض کروں۔

نواب:۔ اسی کا نام دنیا ہے اور دنیا کسے کہتے ہیں۔ تفریح طبع کے لئے باغ میں گئے اور بات ٹالنے کی غرض

ے نواب صاحب نے شعر خوانی شروع کی۔ ؎

ترا سمند کرے دوڑنے کا کیونکر عزم
تمام عرصۂ دہر اُس کو تنگ میدان ہے

قدم قدم جو چلے وہ تو سب لگیں کہنے
کبھی نظر سے ہے پنہاں کبھی نمایاں ہے

شہا نہیں ہے یہ بے وجہ آسماں پہ ہلال
بتاؤں کیا کہ منجم کی عقل حیراں ہے

تری سمند نے اوڑکر وہاں جو ماری ٹاپ
نشاں نعل کا نوں آج تک نمایاں ہے

ہر ایک اسپ سمجھتا ہے اپنی زیست اسے
ترا کمیت تو حیوان کو آب حیوان ہے

کہوں غزال ترے بادپا کو میں کیونکر
کہ اُس کے سامنے بے حس رم غزالاں ہے

پھر آئے جلد وہ ایسا ہی ربع سکوں میں
کہ اس کا عکس جہاں تھا وہیں نمایاں ہے

کہوں میں شب ترے فیل سیہ کو پھر شب تار
اور اُس پہ ہودج زریں مہ درخشاں ہے

یہ تیز رو ہے کہ پل میں نگہ سے غائب ہو
اگرچہ ڈیل میں وہ مثلِ چرخ گرداں ہے

شہزادہ :۔ ع۔ اگرچہ ڈیل میں وہ مثلِ چرخ گرداں ہے انگریز چرخ کے قائل ہی نہیں وہ اُس کو حد ابصر بتاتے ہیں اور ہم لوگ آسمان کے قائل ہیں۔

رفیق :۔ خداوندا ان لوگوں کی نہ کہیئے۔ وہ تو سوائے عقل کے بس اور شے کے قائل ہی نہیں۔

نواب :۔ اچھا اس میں تو عیب نہیں۔ عقل تو مقدم ہے مگر ہاں حکم خدا میں عقل دوڑانا اور جو شے انسان ضعیف البنیان کی فہم سے خارج ہو اُس کو باور نکرنا یہ البتہ قیامت ہے۔ ؎

معقول اُس کا جو نہیں معقول خود نہیں
حکم خدا میں دخل نہیں ہے دلیل کا

رفیق :۔ کیا خوب فرمایا ہے حضور نے اور سرکار سنتے ہیں کہ یہ جو سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے اُس کے بھی لوگ قائل نہیں ہیں۔

شہزادہ :۔ اس کے کیا معنی۔ جوار بھاٹا آتا ہے اور اُس کے قایل نہیں یہ نئی بات ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ قمر اور شمس ان دو کروں کی کشش سے جوار بھاٹا آتا ہے قمر چونکہ کرۂ شمس کی نسبت زمین سے قریب ہے اس سبب سے اس کی کشش کا زیادہ اثر پہونچتا ہے یہی اس کے اسباب خاص ہیں۔

نواب :۔ ماشاء اللہ علوم انگریزی میں بھی دخل ہے۔

رفیق :۔ خداوند شہزادگی چھوڑ کے علم کے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

نواب :۔ اس میں کیا فرق ہے۔ اسی طرح علم حاصل ہوتا ہے۔

شہزادہ :۔ جناب علم تو دریائے زخار بلکہ بحرنا پیداکنار ہے۔

نواب :۔ یہ سچ مگر کوئی زیادہ جانتا ہے کوئی کم کوئی بالکل ناواقف ہے۔ اُس کو علم سے کوئی واسطہ ہی نہیں اسقدر فرق ہے۔

سامعین کے دلوں پر صاحب عالم کی علمیت اور قابلیت کا نقش منقوش ہوگیا پہلے سب کو گمان تھا ان میں اور مرزا ہمایوں فر بہادر میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ مگر یہ خیال دور ہوگیا۔ مرزا صاحب اور شہزادے میں کبھی کی ملاقات اور جان پہچان نہ تھی نواب حشمت علی خاں نے ان دونوں میں ملاقات کرائی اور یوں تعریف کی۔

حشمت علیخاں :۔ (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کرکے) آپ سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی! آپ کے ہم زلف ہیں۔ بغلگیر ہو جئے آپ خرد ہیں ان کے۔

شہزادہ :۔ (استادہ ہوکر) مجھے آپ کی خدمت میں نیاز نہیں حاصل ہے۔

مرزا :۔ (بغلگیر ہوکر) جی ہاں۔ مجھے بھی کبھی نیاز نہیں حاصل ہوا تھا۔ آپ کی تعریف بہت سنی ہے اور اس وقت آپ کی تقریر سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ واقعی عالم اور ذی لیاقت ہیں۔

شہزادہ :۔ جناب یہ سب آپ اپنی ہی تعریف کرتے ہیں کل انا یترشح بما فیہ۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ آپ کا قیام تو بمبئی میں رہتا ہے۔

مرزا :۔ جی ہاں کئی سال سے بمبئی میں ہی قیام ہے۔

شہزادہ :۔ آپ سے تو حضرت آزاد پاشا سے ملاقات ہوئی ہوگی۔

مرزا :۔ جی ہاں۔ جب روانہ ہوئے تھے تب بھی اُسی جانب سے گئے تھے۔ اور آتے ہوئے بھی اور دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

شہزادہ :۔ ملاقات میں آپ نے ان کو کیسا پایا۔ بے نظیر۔

مرزا :۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔ جواب کا ہے کو رکھتے ہیں فرد ہیں۔ کوئی علم۔ کوئی فن۔ کوئی امر ایسا نہیں جس میں طاق نہ ہوں اور بڑے مذاق کے آدمی ہیں شکل و صورت سبحان اللہ سبحان اللہ نہایت وجیہ اور خوبرو جوان رعنا ہیں۔

شہزادہ :۔ جنگ کے حالات ان کی زبان سے کمال دلچسپ معلوم ہوتے ہوں گے۔

مرزا :۔ کئی لکچر دیئے بمبئی کے لوگوں نے ان کی بڑی قدر کی اور اس کے تو وہ ہر آئینہ مستحق ہیں۔ ہنگام تقریر منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ بڑے گویا اور زبان آور آدمی ہیں۔

شہزادہ :۔ سُنا ان کے ساتھ دو فرنگنیں آئی ہیں۔ یہ صحیح ہے۔

مرزا :۔ ایک روسی لیڈی ہے۔ دوسری کوہ قاف کی۔

شہزادہ :۔ اس میں کچھ لم تو نہیں ہے اور سنا دونوں جوان ہیں۔

مرزا :۔ نوخیز۔ دوشیزہ۔ صبیحن۔ نازنین۔ مہ جبیں اور شوخ۔

شہزادہ :۔ وہ بھی آپ ہی کے ہاں فروکش ہوئی تھیں یا کہیں اور۔

مرزا :۔ وہ ہوٹل میں فروکش ہوئی تھیں مگر ہم نے ان کی دعوت کی تھی۔ اردو بالکل نہیں سمجھتیں۔ ایک میم کو بلوایا تھا اس کے ذریعے سے کچھ کچھ مطلب سمجھ میں آتا تھا۔

شہزادہ :۔ یہاں تو خبر گرم تھی کہ ایک کے ساتھ عقد ہو گیا ہے مگر کسی کو اس امر کا یقین نہیں آتا تھا اب آپ کو مفصل حال معلوم ہو گا۔

مرزا :۔ حضرت ان دونوں نے ان کی جان بچائی اور اگر یہ دونوں نہ ہوتیں تو آزاد کا اسقدر نام بھی نہ ہوتا۔ اول تو یہ مفلس اور روپے کے بغیر کام چلنا معلوم بے زر عیش میں ٹیں۔ دوسرے اکثر امور میں انھیں دونوں کی مدد کی خاص ضرورت تھی۔ اب محل سرا کا حال سنئیے کہ شمس النساء بیگم جو عرصے کے بعد خواب ناز سے بیدار ہوئیں اور سب ہمجولیوں میں آئیں اور معلوم ہوا کہ صاحب عالم عرصہ دراز تک بڑی بیگم کے پاس بیٹھ کر باہر گئے ہیں تو ان کو بڑا رنج ہوا کہ کسی نے بھی نہ جگایا مغلانیوں پر خفا ہوئیں۔ مہریوں پر جھلائیں۔ حسن آرا اور روح افزا سے بگڑ کر کہا۔ اے بہن واہ سبحان اللہ ذرا جگا یا تک نہ گیا۔

روح :۔ تو سو کاہے کو رہی تھیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ جگاتا پھرتا۔ بمبئی سے یہاں تک تو اشتیاق میں آئیں اور یہاں جان بوجھ کے سو رہیں تو سانس ڈکار تک نہ لی۔

حسن :۔ اور ہم کو کچھ خیال بھی نہ رہا کہ باجی یہیں ہیں ورنہ ضرور جگاتی۔

روح :۔ کوئی دن کو سوئے ہی کیوں۔ رات سونے کے لئے خدا نے بنائی ہے یا دن۔

شمس :۔ یہ۔ ایک تو شرماتی نہیں دوسرے اوپر سے ہم کو باتیں سناتی ہیں۔

روح :۔ جا کے سو رہیں۔ مجھے یاد تھا مگر میں نے کہا سونے دو دن کا سونا بڑا منحوس ہوتا ہے بہن۔

بڑی :۔ کیا ہے۔ کیا منحوس ہوتا ہے۔ نحوست کیسی۔

حسن :۔ اب بتاؤ۔ کسی کی زبان سے نحوست کا نام نکلا اور ان کے کان کھڑے ہوئے۔ یا الٰہی بڑا اتنک اماں جان کے مزاج میں ہے۔

روح :۔ اماں جان دن کا سونا لوگ کہتے ہیں منحوس ہوتا ہے۔

بڑی :۔ لوگ کہتے ہیں کیا معنی۔ کیا تم نہیں جانتی ہو۔

شمس :۔ اماں جان میری طبیعت ذرا یوں ہی سی بے لطف تھی تو دو گھڑی کے لئے سو رہی۔

بڑی :۔ بیٹا دو گھڑی سونے کی آج عادت ڈالی کل دوپہر سوؤ گی پرسوں دن بھر سوتی ہی رہو گی۔ سونا نہ ہوا ہماری ہو گئی خدا نخواستہ۔

روح :۔ جتنی دیر تک صاحب عالم بیٹھے رہے یہ سویا کیں ان کو ہوش بھی نہیں کہ وہ کب آئے اور کب گئے اور جو میں کہتی ہوں تو خفا ہوتی ہیں۔

بڑی :۔ بڑی بات ہے، سمدھنے کے سئے بات کیا کم ہے

شمس :۔ (آہستہ سے) روح افزا کی طرف۔ اچھا اِس وقت تو ہم قائل ہو گئے اب کبھی اور موقع کیا نہ ملے گا۔ ایسی کہوں کہ یاد ہی کرو۔

بہار :۔ تو یہ جھگڑا کیوں کرتی ہو۔ ابھی تو باہر بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ دیکھ لینا۔ اب تو تم یہاں۔ رہنے کے لئے آئی ہی ہو۔ کیا آج ہی بھاگی جاتی ہو۔

نازک :۔ تم تو کہا ہی چاہو۔ رو برو اور دو بدو باتیں کر چکی ہوں نہ۔

شمس :۔ کیا کیا۔ کیا بہا النسا بیگم سامنے ہوئیں۔

روح :۔ پھر پھر کیا کچھ ہرج ہے۔ آپ تو کہتی تھیں کہ بمبئی میں ہم ہوا کھایا کرتے ہیں۔ وہاں اسقدر پردہ نہیں ہے اور اب ایسی باتیں کرنے لگیں۔

حسن :۔ ہاں اس میں ہرج ہی کیا ہے کیا کوئی غیر ہیں۔

شمس :۔ اور آج ہی تو وہ دولہا بن کر آئے ہیں۔ پھر دولہا کے سامنے ہونا تو شہر میں جائز ہے اور خصوصاً پہلے دن کچھ چھیڑ چھاڑ بھی ہوئی تھی یا نہیں۔

شمس النسا بیگم نے بڑی بیگم سے باصرار کہا کہ اماں جان ضرور بلوائیے اتفاق سے آنکھ لگ گئی اور ان سب نے شرارت کی کہ ہم کو اطلاع تک نہ کی اور میری نیند ایسی ہلکی ہے کہ ذری آہٹ ہوئی اور نیند اچاٹ اگر ذرا قریب آن کر نام ہی لے دیتی تو میں جاگ اٹھتی۔ مگر سب نے ایکا کر لیا کہ اس کو نہ جگانا۔ بڑی بیگم نے مہری باہر بھیجی کہ جا کے دریافت کر آؤ کہ صاحب عالم کیا کرتے ہیں۔ مہری نے آکر عرض کیا حضور گنجفہ کھیل رہے ہیں اور ورق ہوتا ہے دو روپیہ پتا یاد آگیا ہے۔

شمس :۔ تو بھلا گنجفہ چھوڑ کے کیوں آنے لگے۔

روح :۔ اب تو اس وقت نہیں جلدی کیا ہے اور تھوڑی دیر سہی۔

نازک :۔ جب جانے کہ اتنوں میں کوئی ان کی ساتھ گنجفہ کھیلے۔

روح :۔ سوائے تمہارے اور کون کھیل سکتا ہے بہن۔

نازک:۔ جیسے گنجفہ ہو تو دونوں ہاتھوں سے لوٹ لوں۔

روح:۔ وہ بھی کوئی کچے نہیں ہونگے کہ کوئی اُن سے لوٹ لے۔

نازک:۔ اچھا پھر کوئی ان کو اس بات پر راضی کر لے۔

گیتی:۔ اس میں کسی کے کہنے سننے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم کو اس میں حیا نہیں کہ نامحرم کے ساتھ گنجفہ کھیلو تو انکو کیا شرم ہے

حسن:۔ اور ان سے کیا کچھ بعید بھی ہے ان سے بعید نہیں ہے۔

مہری:۔ حضور ماما سب کہتے ہیں کہ جو باتیں شہزادوں میں ہونی چاہئیں وہ اُن میں سب حاصل ہیں اور شکل و صورت تو شہزادوں کی سی ہے۔ بڑی بڑی دور کا سفر کر آئے ہیں۔

نازک:۔ اے سپہر آرا تم اپنے میاں کا کچھ حال نہیں بتاتی ہو۔

سپہر:۔ اے بہن پہلے تم بتاؤ تو پھر ہم بھی کچھ کہیں۔ تم بڑی ہو۔ بڑوں ہی کا تتبع چھوٹے بھی کرتے ہیں۔

روح:۔ تو کیا ان کو اس میں کچھ غدر بھی ہے۔

نازک:۔ جو پوچھو وہ بیان کریں۔ اللہ جانتا ہے بہن اس وقت اتنا جی خوش ہوا ہے کہ بیان نہیں کر سکتی ہوں۔ خدا جوڑی قایم رکھے۔ اف وہ سپہر آرا ہم کو تمہارا دل سے پیارا ہے۔ گنجفے میں بڑی دل لگی رہی۔ نواب احتشام الدولہ اور نواب عظمت علیخاں ایک طرف۔ صاحب عالم اور مرزا صاحب ایک طرف اور تیسرے میاں مذاق یہ صاحب بڑے با مذاق آدمی تھے نقل محفل ظریف طبع۔ بذلہ سنج لطیفہ گو۔

جادہ بیان مرنج مرنجان پہلے دور میں سب نے پتے اٹھائے تو تقسیم کرنے میاں مذاق کے گلے پڑا اور اس سے اُن کو نفرت کلی۔ بہت ہی جھلائے۔

مذاق:۔ (سر پیٹ کر) واللہ اوس پڑ گئی۔ برا شگون ہے جو سب کے پہلے تقسیم کرتا ہے وہی ہارتا ہے یہ بندھی ٹکی چوٹیں ہیں۔

مرزا:۔ یہ نئی بات سنی مگر ہاں القاسم محروم۔

مذاق:۔ بندہ پرور ایک تصویر کی صورت دکھائی دے تو کچھ جرمانہ دوں۔ میرے ہاتھ تو اس قابل ہیں کہ تراش ڈالے جائیں۔

مرزا:۔ (احتشام الدولہ سے) تراشوں حضرت۔

احتشام الدولہ:۔ بسم اللہ سر عدد (تکبیر کھینچ کر)

مرزا:۔ لیجیئے چنگ کا دہلا تراشا ہے۔ نہ کھینچے گا۔

مذاق:۔ اے لو صاحب۔ چنگ ترشی اور خلال برسی۔

احتشام:۔ ہمارے لئے تو اچھا شگون۔ (گنجفے کا خالی خانہ میاں مذاق کی طرف کھسکا کر) حضرت کچھ لائیے۔ میاں مذاق نے پہلے چار پتے دئے تو شمشیر کا چوا تاج کا دوا۔ چنگ کا اٹھا اور برات کا دہلا۔ بہت خوش ہوئے اور ان چاروں پر پتے رکھکر کہا یہی ہو ادھر بھی۔ دوسرے پتے تقسیم کئے تو چنگ کا پنجا۔ چھکا قماش کا چوا اور شمشیر کا اکا بہت ہی خوش ہوئے۔

مذاق:۔ یہ ہاتھ چومنے کے قابل ہیں (ہاتھ چوم کر)

مرزا:۔ لاحول ولاقوۃ۔ کبار رو دے خدو دے پتے دیئے ہیں۔

مذاق:۔ قبلہ۔ بندہ تو یوں ہی کھیلتا ہے۔ چاروں میر۔ چاروں وزیر ا پنے پتے لیتے ہیں تو برات کا میر۔

مرزا:۔ اُف۔ پہلے ہی ہاتھ میر وزیر آنے لگے۔ لاحول ولا۔

احتشام:۔ بُری ہوئی۔ اب کی صفایا ہوگا انشا اللہ۔

مرزا:۔ انشا اللہ۔ آمین آمین۔ اب کی تاج کی نادری مذاق نے پتہ کھول کر شکر ہے خداوندا شکر ہے تیرا۔ برات کا میر اور چنگ کا میر۔ اب کی پھر کچھ ہونا چاروں میر (پتہ کھول کر) برات کا اکا۔ کچھ پروا نہیں۔ ٹیپ اوڑا آ ونگا دھر دونوں فریق کا رنگ فق اور میاں مذاق کی باچھیں کھلی ہوئی۔ چوتھا پتہ لیا تو مرزا صاحب اور احتشام الدولہ بہادر اور عظمت علی خاں اور صاحب عالم اور کل حاضرین نے باواز بلند قہقہہ لگایا اور اچھل پڑے۔ آفتاب۔ آفتاب لے پتے ملایئے اور پھر سے بانٹیے۔

مذاق:۔ واہ اس کی سند نہیں۔ پہلے سے شرط نہیں ہوئی تھی۔

احتشام:۔ کیسی شرط۔ ہوش کی دوا کرو۔ شرط لائے وہاں سے۔

مذاق:۔ اجی حضرت اب ہم تو واللہ رو دیں گے اور اپنے نہ دیں گے نہ دیں گے۔ غضب خدا کا برات کا میر اور اکا ٹیپ زبردست کی اور چنگ کا میر بھلا ہم کیونکر پتے آپ کے حوالے کر دیں۔ کیا مجال۔

عظمت علیخاں:۔ اب پتے ملاتے ہو یا روتے ہو۔ رو دو نہ۔

مذاق:۔ (سر پیٹ کر) دل زور رہا ہے چھ آفتاب اور چھ چنگ کے میر کے۔ اس میں بھی ٹیپ اوڑانا اور چھ برات کے میر اور لے کے سب ملا کر ہوئے چھ اور چھ بارہ اور چھ اٹھارہ تو ہیں ہو گئے جی اب فرمایئے میں کیونکر آپ کے حوالے کر دوں۔

الغرض بعد وقت گنجفہ از سر نو تقسیم ہوا تو آفتاب پھر میاں مذاق ہی کے پاس آیا اور یہ اچھل پڑے۔

مذاق:۔ وہ مارا غرہ آفتاب آیا ہے سورج کنڈ میں۔

احتشام:۔ کیا چھیچھڑے کھلا دیئے ہیں جب دیکھو تمہارے ہی پاس موجود رہتا ہے۔ پالو کر لیا ہے آفتاب کو بھی

مذاق :۔ حضرت ۔ آفتاب مذاق پسند ہے روشن دلوں کے پاس آفتاب جاتا ہے ایسے ولیسوں کے پاس ؎

تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں
جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

مرزا :۔ تو سہی جو اسی کے سبب سے نحوست بازی سہہ رہے ہو۔

مذاق :۔ اب آپ بافی پی پی کے کو سیئے بندہ تو یوں ہی کھیلتا ہے۔

احتشام :۔ کبھی بازی ذرا نہیں آتی رہ خم۔ رکھو خم۔

مذاق :۔ تو سہی جو خم سٹر جائے ۔ ایک ورق عمدہ نہ نکلے۔

عظمت :۔ لائیے اب کی دست ہم لیں گے ۔ چاروں میر چاروں وزیر۔

مذاق :۔ دہ او پر کی بازی کے دوے اور دو دہلے نیچے کی بازی کے۔

عظمت :۔ ابھی پتے دکھاؤں تو دہل جائیں میاں مذاق۔

مذاق :۔ آپ بھی عجب قماش کے آدمی ہیں ۔ مگر ہمارے سرتاج ہیں آپ۔

گنجفہ تقسیم ہو چکا تو میاں مذاق نے کہا یارو تین خم رکھے ہیں اور دعوی کر کے کہتا ہوں کہ بارہ میر اور بارہ وزیر اس میں نکلیں گے۔ ایک کم نہ ایک زیادہ تینوں خم اعلے سے اعلے ہوں تو سہی۔

مرزا :۔ بارہ نو ورق اور چوبیں پتے ۔ بہت ہی خاصے۔

احتشام :۔ جی ہاں بارہ میر اور بارہ وزیر گھر کی پھیکی پاسی ساگ۔

مذاق :۔ میاں میرے ورق اٹھائے دیتے ہیں اب بتائیے۔

عظمت :۔ بھلا ایک بات پوچھیں بتاؤ گے یہ خم کس کے نام کے ہیں ؟

مذاق :۔ حضرت یہ خم تو اس کے نام کا ہے جو (ایک ورق دیکھکر) سبحان اللہ سبحان اللہ ۔ تاج کا دہلا نکلا (دوسرا پتہ) نہ بتاؤں گا۔ (تیسرا ورق) سبحان اللہ ایک سے بڑھکر (چوتھا پتہ) خیر نظر بد کے لئے ۔ لو دیکھو شمشیر کا نہلا ہے۔

شہزادہ :۔ اللہ اللہ شمشیر کا نہلا ایسا گیا گذرا کہ نظر بد کے واسطے ہے تو معلوم ہوتا ہے اور سب میری میری ہیں۔

عظمت :۔ اجی گپ سنا کرو ۔ اور وہ میر ہوں چاہیں نہ زیرہ ہوں سب سوخت ہوں گے ۔ ٹیپ لئے لغیر رہیں گے نہیں او عقل سے کام لینا جانتے نہیں بس فراغت ہوئی ۔ ادھر ٹیپ لی ادھر سوخت۔

مذاق :۔ چاہے جو کچھ ہو ۔ ع ۔ بزن ٹیپے کہ کفرستان بلرزد۔

شہزادہ :۔ زبردست زیر دست سب کی ٹیپ بے سمجھے بوجھے جاتا ہے۔

مذاق :۔ جی خداوند ۔ غلام کے ہاں سب جائز ہے ؎

تاج ست زر سفید و شمشیر و غلام
چنگ ست و رز سرخ و برات ست و قماش

مرزا :۔ ابھی الف بے ہی پڑھتے ہیں ۔ آپ لاحول ولا قوۃ

عظمت :۔ اور وہ بھی خیر سے یاد نہیں ۔ بار بار نوک زبان کرتے ہیں ۔

مذاق :۔ جی حضرت بسم اللہ آفتاب بر آمد ۔ ہمراہ غلام ۔

عظمت :۔ کیوں صاحب ہم ایک پتہ آفتاب کے اٹھانا چاہتے ہیں ۔

مذاق :۔ بسم اللہ ۔ بسم اللہ دو دو چہرہ شاہی حوالے کیجئے ۔

عظمت :۔ یہ السیٹھ ہے ۔ یار ۔ ہم نہ مانیں گے ۔

مذاق :۔ واہ آپ نہ مانیں گے تو ہم کب مانیں گے ۔ پتہ نہیں اٹھانے پائے گا حضرت اور اگر اٹھائے تو دو دو چہرہ شاہی ادھر حوالے کیجئے ۔ ورنہ اللہ اللہ خیر صلاح ۔

عظمت :۔ اجی میں دل لگی کرتا تھا کیسے پتے ۔ کھیل شروع ہوا پہلا دور ۔ اب سنئے کہ میاں مذاق خوش ہوئے کہ آفتاب کے پتے لیکر ٹر سے سر کر دیا ۔

مذاق :۔ قماش کا میر چوپے سے آیا ہوں ٹیپ نہ دوں گا ۔

مرزا :۔ (میر سے ٹیپ کر) لیجئے خداوند ۔ لیجئے بسم اللہ ۔

مذاق :۔ کھیل چلے بھائی کیا سوچ رہے ہو اللہ ری سستی ۔

مرزا :۔ (تاج کا سر کر کے) حضرت آپ کے یکلو سب سوخت ہو گئے ۔ (قہقہہ لگا کہ صاحب عالم کی طرف) ہاتھ لائیے گا دو سو یکلو سوخت کر دیئے ۔ یوں گنجفہ کھیلتے ہیں جی ۔

مذاق :۔ (دانتوں کے تلے انگلی دبا کر) ارے ۔ !

عظمت :۔ ہم نے تو کہا ہی تھا بھائی کہ وہ ان کے پاس اگر گنجفہ پھر چلا جائے تو ان کے تائے کیا بنایا جائے گا خاک وہی ڈھاک کے تین پات ۔

احتشام :۔ بہت اُچھل کود مچائی تھی ۔ اب بولو ہات تیرے کی ۔

مذاق :۔ اُف مار ڈالا ظالم ۔ بالکل سر ہی مٹے واللہ ۔

مرزا :۔ دو سو یکلو سوخت ہوئے ۔ لائیے خرچ ہیں ۔

احتشام :۔ کاہے کے یکلو تھے بھئی چنگ کے ہوں گے ۔

مذاق :۔ دیکھئے چنگ کا میر گھوڑیا ۔ ایکا ۔ دوا ۔ پتا ۔ چوا ۔ پنجا ۔ یہ تو ایک بازی کے ہیں ۔ اب اور لیجئے برات کا میر گھوڑیا

اِکّا۔ دوا۔ گیارہ یکلو سوخت ہو گئے۔

مرزا:۔ گیارہ کاہے کو نو سوخت ہوئے۔

مذاق:۔ خدا ان لوگوں کے گنجفے سے سمجھے جنہوں نے کوس کوس کے ہمارے یکلو سوخت کیئے۔ واللہ کمال رنج ہوا مگر خیر دیکھو تو سہی۔

عظمت:۔ اور ہم اشارے سے کہتے جاتے تھے کہ چنگ ادھر مار دہی اِکّا دوا کچھ دیدو نہ مانا۔ اب بھگتو۔

انچہ دانا کند کند نادان

لیک بعد از خرابی بسیار

بس اتنا سا فرق ہے۔

احتشام:۔ میں تو ایسا ہی گنجفہ کھیلتا ہوں۔ چاہے کوئی کھیلے چاہے نہ کھیلے۔

عظمت:۔ جی ہاں بات بات پر یہی فقرہ تھا۔

مرزا:۔ ایسی ترکیب کیجیئے کہ ان کو تکو بھی نہ پہونچے۔

پہلی بانٹ میں میاں مذاق نے چھ پتے پائے مگر ایک نادری چڑھی اور ایک چور چل گیا۔ اس سبب سے پورے تیسوں ورق ہاتھ سے گئے اور چونسٹھ روپیہ جیب سے نکالنے پڑے اس وقت میاں مذاق نے بڑا مذاق کیا آدمی بڑے متمول اور سیر چشم تھے مگر دل لگی باز اور ظراف۔ چونسٹھ روپے جو گرہ سے گئے تو گنجفے کو اٹھا اٹھا کے پٹک پٹک مارا۔

احتشام:۔ حضرت ہم تو ایسا گنجفہ کھیلتے ہیں چاہے کوئی کھیلے چاہے نہ کھیلے ہم تو ایسا گنجفہ کھیلتے ہیں۔ شرماؤ شرماؤ اب

مرزا:۔ اور اتنا بھونڈا چکما کھا گئے۔ سرخ کا ایکا نہ روکا گیا۔

عظمت:۔ اجی یہ نہیں کہتے کہ بدے ہوئے گنجفے میں نادری کیسی۔

مذاق:۔ این! اُف اُف۔ واللہ دونوں نے مل کر لوٹ لیا مجھ سیدھے سادے آدمی کو۔ اُفوہ۔

شہزادہ:۔ یکلو کے یکلو سوخت ہوئے اور نو نو۔ اور ورق میں نادری چڑھی اور سرخ کا اِکّا نہ روکا گیا۔

عظمت:۔ اور ابھی طرّار بنے تھے کہ میں تو چھیاسے نو پتے پورے یاد رکھتا ہوں کیا مجال کہ ذرا بھول جاؤں۔

احتشام:۔ کیا غل مچایا تھا ایک دو تین بوجھ کو لاجھیں۔

مذاق:۔ حضرت اچھا ہوا بدا ہوا گنجفہ نہ تھا۔

احتشام:۔ رو دو۔ رو دو۔ بس اتنے ہی ہیں۔

رفیق:۔ حضور میں اس وقت سے بیٹھا دیکھ رہا ہوں کہ دو چار سو بیضا بلکیاں اس گنجفے میں ہوئیں اور کوئی پوچھتا

سے رتی رتی حال کہدیا ہے۔

صنم :۔ اچھا ہجھو ملیں تو کیسا آڑے ہاتھوں لیتی ہوں۔

ہمجولی :۔ آج آتے ہی ہونگے مگر بڑے خلیق اور ملنسار آدمی ہیں۔

شیریں :۔ اے بہن یہ کون صاحب ہیں۔ (آزاد کی طرف اشارہ کرکے)

صنم :۔ تمہارے ہی فراق میں دور سے آئے ہیں۔ ہم نے ان کی خاطر کی بٹھایا گلوری کھلائی۔ حقہ پلایا۔ اب تم جانو یہ جانیں۔

شیریں :۔ ہمارے فراق میں تو کوئی کاہے کو آنے لگا۔ ہاں تمہارے حسن کی شہرت سن کر آئے ہوں تو کیا عجب ہے ہزاروں ہی آیا کہتے ہیں۔

صنم :۔ اچھا انھیں سے نہ پوچھ لو۔ کیوں میاں ادھر کہاں آنکلے۔

آزاد :۔ بتوں کی بندگی کے لئے۔ بتوں کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

شیریں :۔ ماشاء اللہ آدمی لسان اور مقرر معلوم ہوتے ہیں مگر نظر بے ڈھب ہے نگاہ کہے دیتی ہے کہ دل صاف نہیں ہے۔

آزاد :۔ ایک نظر غلط انداز دعاقبت سوز نے تو خرمن صبر پر بجلی گرائی اب تقریر کیا جانے کیا ستم ڈھائیگی۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ سجدہ کروں اور قدم لوں اور خاک پا کو توتیائے چشم بناؤں۔ دل ہاتھ سے جاتا رہا ؎

بتے کہ بردو لم راکفِ نگار ینش

خمیر مایۂ صبح ست ساق سیمینش

شیریں :۔ (مسکرا کر) خیر سے رنگین مزاج اور موزوں طبع بھی ہیں اب یہ بتاؤ کہ کس کے مشتری ہو سودا کرنا مدنظر ہے یا سودائے خام ہے۔

آزاد :۔ ہم پختہ مغزوں کو کہیں سودائے خام ہوتا ہے ؎

نقد دل دیجئے اور زلف کا بوسہ لیجیے اے جنون خوب ہے اس سودے میں وارا اپنا

یہاں تو اس خیال پر تلے رہتے ہیں

یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ ایک اور ناظورہ مہ طلعت قمر پیکر نوخیز دنو خاستہ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ آئی صنم اور شیریں سے گلے ملی اور ہمجولی سے بوسہ بازی ہونے لگی۔ اتفاق سے آزاد پر نظر پڑی تو اس جوان مشین اور مہ جبیں کو دیکھ کر عش عش کرنے لگی۔

ناظورہ :۔ اے بہن آج یہ نئی نئی صورت کہاں سے دیکھنے میں آئی۔

صنم :۔ تمہارا نام سن کے بڑی دور سے آئے ہیں اور تمہارے مہمان ہیں۔ ان کی خاطر کرو۔ آدمی رنگین معلوم ہوتے ہیں مگر شہر والوں کی باتیں کیا جانیں۔

آزاد نے مسکرا کر صنم کی طرف نظر ڈالی اور

ہنس کے کہنے لگا وہ بدنق عذار | واقعی سچ ہے اے قمر رخسار
گو بھلا میں غریب و بے چارہ | غم زدہ ہرزہ گرد آوارہ

شہر والوں کی بات کیا جانوں
ان کا سا التفات کیا جانوں

ناظورہ : بہن کم سن ہوں تو کیا ہوا سچ کہتی ہوں ایسے مردوں سے ارتباط بڑھانے میں ضرر ہی ضرر ہے سان کی جنون دیکھو یہ کسی اور کا عاشق زار

یہ کسی اور کا ہے عاشق زار
الفت کا اس کے ہے شرشار

آزاد :۔ دل ہی تو ہے وعدہ کرنا آسان مگر ایفا مشکل ہے اور وہ لوگ ہیں جو ایک مرتبہ کے وعدے پہ جان دیں مگر وعدہ خلافی نہ کریں۔ ہاں۔ ؎

مجھ سے فرقت زدہ سے چشم وصال
محض بے سود ہے کمال محال

اس قدر فقرہ سنا تھا کہ شیریں جو ہزار جان سے آزاد کے گل رخسار کی بلبل تھی۔ بیتاب ہوئی اور ضبط نہ کر سکی اور یہ اشعار حسرت بار زباں پر لائی۔

ارے ظالم یہ کیا ستاتا ہے | کیوں غریبوں پر قہر ڈھاتا ہے
سن تو او بے مروت ادبی دید | تیغ الفت سے ہم کو کر کے شہید

اور کی عاشقی جتاتا ہے
کیوں ہمیں خاک میں ملاتی ہے

صنم :۔ ہائیں۔ ہائیں : بہن اسقدر جامے سے باہر نہ ہو جاؤ۔

شیریں :۔ پھر تم نے اس کو یہاں کیوں بلایا۔ یہ کانٹے سب تمہارے ہی بوئے ہوئے ہیں۔ خیر صاحب ہم پر ظلم ڈھاؤ۔

صنم دل ربا شیریں حرکات نے آہ سرد بھر کر آزاد سے کہا۔ جان من جس وقت تمہارے رخسار تاباں پر نظر پڑی دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہ سمجھی کہ بخت برگشتہ نے یاوری کی۔ تمام عمر شربت وصل سے شیریں کام رہوں گی۔ ؎

گل خوشی سے پھولے ہیں نخل گلستاں ہیں نہال

مژدہ باد اے دل زار آمد جانانہ ہے

ہمجولی :۔ اور وہ تم کو چٹکیوں میں اڑاتے ہیں۔ وہ ادھر رخ ہی نہیں کرتے خدا جانے کس کامنی پر دل آیا ہے۔

صنم :۔ ارے تو ظالم یہاں کیا کرنے آیا۔ خواہی نخواہی ہمارا دل دکھایا اور مفت میں ہم کو رنج دیا۔ ہائے کوئی ایسا کرتا ہے۔ اگر سچ مچ کسی اور کا عشق ہے تو صاف صاف بتا دو۔

آزاد :۔ ہاں ہے تو ایسا ہی۔ ؎

دوستو عشق نہفتہ نے ستایا ہے مجھے ... آتش شوق نہانی نے جلایا ہے مجھے

کیا کہوں کیا غم یہاں نے دکھایا ہے مجھے ... ضبط وحشت نے یہ دیوانہ بنایا ہے مجھے

چہرۂ راز سے پردہ نہ اٹھاؤں کب تک

گو غم پردہ نشیں ہے یہ چھپاؤں کب تک

صنم :۔ ع۔ تو بھی ٹھنڈا نہ رہے جی کے جلانے والے۔

ہمجولی :۔ تم تو کوسنے لگیں بہن۔ پانی پی لو (مسکرا کر)

صنم :۔ کوسوں نہ تو کیا کروں۔ جی بھر آیا ہے۔ ؎

کیونکہ خالی نہ کروں دل جی کہ بھر آتا ہے

پیش چلتی جو نہیں غصہ چلا آتا ہے

ہمجولی :۔ اور تم تو بے خبری میں غزل گاتی تھیں۔ میں نے ہی تم کو دکھایا کہ بہن دیکھو وہ کون مرد نامحرم کھڑا ہے۔

صنم :۔ یہ کانٹے تمہارے ہی بوئے ہوئے ہیں اور اوپر سے بڑے غرور کے ساتھ کہتی ہیں ہمیں نے دکھایا تھا۔ کوئی جانے بڑا کارنمایاں کیا اور اللہ جانتا ہے بہن ہمیں اس جوان نوخاستہ کا پیار ہے اسقدر حسن آرا کو اپنے آزاد کا نہ ہوگا۔

راوی :۔ یہ فقرہ سن کر آزاد کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

ناظورہ :۔ اے ہاں۔ خوب یاد آیا۔ آزاد تو یہاں آئے ہوئے ہیں۔ شہر بھر میں دھوم مچی ہے کہ آزاد یہاں کسی فرنگی کے یہاں ٹکے ہیں۔

آزاد :۔ آزاد! آزاد کیا معنی۔ کیا کسی کا نام ہے۔

ہمجولی :۔ (متحیر ہو کر) اوئی۔ اے تم نے آزاد کا نام نہیں سنایا۔

صنم :۔ برسوں سے ان کا نام مشہور رہے۔ گلی گلی لوگ جانتے ہیں۔ حسن آرا اور آزاد لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد سے

کم نہیں۔

شیریں :۔ (ہنس کر) اسے تو ہمارا نام کیوں بار بار لیتی ہو۔

صنم :۔ تمہارے بیسیوں فرمانے ہیں۔ ایک وہ تھوڑا ہی ہیں۔

آزاد :۔ حسن آرا کا نام تو ہم نے سنا ہے۔ مگر آزاد کا نام نہیں سنا تھا کیا حسن آرا کے عاشق کا نام آزاد ہی ہے؟

صنم :۔ جی ہاں۔ ایک وہ خوش قسمت عورت ہے اور ایک ہم ہیں کہ کوئی آزاد آج تک نہ بر آئی دل کی دل ہی میں رہی۔

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے	جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے
یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے	کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے
قیامت مرتے دم آئی فغاں سے	جہاں دے کر چلے ہیں ہم جہاں سے
شب وصل آپ کا عذر نزاکت	بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جاں سے
بُرا ہے عشق کا انجام یارب	بچانا فتنۂ آخر زماں سے

نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد
نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

آزاد نے دیکھا کہ صنم دلبر با رنگین ادا واقعی پروانۂ شمع جمال ہے تو علیحدہ لے جا کر یوں مکالمۂ دلاویز کیا۔

آزاد :۔ میں نے تو اپنا حال صاف صاف تم سے کہدیا۔

صنم :۔ یہ سچ۔ مگر جب اپنا دل بھی قبول کرے صاحب۔

آزاد :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون مقام ہے۔ اور یہاں تم سب پریاں اس مطلق العنانی اور آزادی کے ساتھ کیونکر رہتی ہو۔

صنم :۔ اس کا حال ہم ابھی نہ بتائیں گے۔ پہلے دل کو ڈھارس دو دل تو قابو ہی میں نہیں ہے۔ سوال وجواب کی دماغ کہاں

آزاد :۔ اور لطف یہ کہ جس پر نظر پڑتی ہے نو خاستہ۔ خوبرو نسرین بدن غنچہ دہن۔ کم سن اور آزاد۔

صنم :۔ تم یہ بتاؤ کہ کس کے ناوک نگاہ کے گھائل ہو۔

آزاد :۔ کوئی ایسی ہی حور دو راز قصور ہے جسنے ہمیں گھائل کر دیا اور جب زبان دی قول ہار ی پھر بیوفائی اپنی وضع کے خلاف ہے اس میں ہر چہ باد اباد۔

صنم تو تمہاری طرف سے ہاتھ دھو رکھیں بس۔

گر بہ و آہ بے اثر دونوں	کس نے کشتی مری نباہ نہ کی

آزاد نے تھوڑی دیر کے بعد ناظورہ مہر سیما سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ یہ کیا اسرار ہے یہ مکان ہے یا پرستان ہے اور تم سب کون ہو خدارا کچھ بتاؤ تو۔ ناظورہ مہ لقا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہا ہمارا حال زار قابل بیان نہیں۔ ؎

اللہ سینہ کوبیوں سے ہاتھ تھک گئے
پلٹیں گے اپنی جان کو یوں ہم کہاں تلک

آزاد اور اس سیم بدن سے دیر تک گفتگو رہی اور آزاد کی باتوں سے وہ گلعذار اس قدر خوش ہوئی کہ کل حال بیان کرنے پر آمادہ ہوگئی لیکن اس کی ہمجولی نے اشارے سے منع کیا تو بدرجۂ مجبوری وہ آفتاب جبین بتانے لگی۔

آزاد:۔ تم تینوں بہن ہو یا نہیں۔

ناظورہ:۔ ہم میں کسی میں باہم رشتہ نہیں ہے۔

آزاد:۔ اچھا اتنا تو بتاؤ گھر گرست ہو یا نہیں؟

ناظورہ:۔ مسکرا کر۔ آپ کے سوال کے صدقے۔

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

آزاد:۔ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔

ناظورہ:۔ ہم تو سب کچا چٹھا کہہ سناتے۔ مگر ہماری ہمجولی ہم کو اشارے کرتی جاتی ہے۔ باغ میں چلو تو تنہائی اور تخلیے میں کل راز سے تمہیں واقف کر دیں۔ مگر اس بات کی قسم کھالو کہ چاہے جان جاتی رہے مگر کسی اور سے نہ بیان کرو گے۔

آزاد:۔ افسوس ہے کہ تم ہمارے مزاج سے واقف نہیں ہو۔

ناظورہ:۔ بے جانے بوجھے کوئی کیونکر واقف ہو۔

آزاد اور وہ معشوقہ پری نژاد کسی بہانے سے باغ میں جا کر گلگشت چمن کرنے لگے جب ان کو خوب معلوم ہوگیا کہ باغ میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ؎

فغاں کیا دم بھی لینا پارہ ہائے دل اڑاتا ہے
کہوں کیا درد پنہاں کی کلیجہ منہ کو آتا ہے
سنا اس نے مرا نالہ اثر بھی کچھ ہوا شاید
کہ دشمن کہہ گیا بے فائدہ کیوں غل مچاتا ہے
پری لوٹے ہے انگاروں پہ دوزخ میں پڑی جو یہ
تمہارا حسن عالم سوز کس کس کو جلاتا ہے
گراں خوابی وہی ہے بجنت خوابیدہ کی اے ظالم
مرا شور فغاں کا ہے کو سوتوں کو جگاتا ہے

گر آئے آسمک پر تاثیر کیوں خلق میں آئے آنکھ | کوئی یوں خاک میں ایسے گہر کو بھی ملاتا ہے
کہہ کر اُٹھ گئیں آنکھیں فرشتے بھی نظر آئے | تمہارا منہ دکھا نا دیکھئے کیا کیا دکھاتا ہے

میں ایسا ہوں کہ دونگا تجھ کو طعنہ بے وفائی کا
بگڑنا گر نہیں دشمن سے کیوں باتیں بناتا ہے

آزاد نے کہا وہ دونوں تو گانے میں مشغول ہیں اب یہاں کسی کے آنے کا خوف نہیں وعدہ وفا کیجئے اور اس بھید سے ہمیں اطلاع دیجئے۔

ناظورہ: ۔ یہ بڑا خراب مقام ہے اور یہاں سب کی سب اسی قسم کی رہتی ہیں ۔ ایک بوڑھی مکارہ کندن نامی برسوں سے یہی پیشہ کرتی ہے خدا جانے اس نے کتنے گھر تباہ کئے اگر مجھ سے پوچھو کہ تیرے ماں باپ کہاں ہیں تو میں کیا جواب دوں خاک ۔ مجھ سے کندن نے فقط اتنا کہا ہے کہ کسی گانوں سے مجھے پکڑ لائی تھی میرے ماں باپ نے میری بڑی تلاش کی مگر اس نے مجھے گھر سے نکلنے نہ دیا ۔ میرا سن وقت چار پانچ برس کا تھا جب یہ مجھے گھر سے بھگا لائی تھی۔

آزاد: ۔ لا حول ولا قوۃ تو یہاں سب ایسی ہی جمع ہیں۔

ناظورہ: ۔ یہ جو میری ہمجولی ہیں کسی بڑے آدمی کی بیٹی ہیں ۔ ان کے یہاں لیکن دین ہوتا تھا کندن بھی ان کے یہاں آنے جانے لگی اور ان سب سے اس طرح کی سانٹھ گانٹھ کی کہ عورتیں دوسرے تیسرے دن اس کو بلوا نے لگیں ان کو کیا معلوم تھا کہ کندن کے یہ ہتھکنڈے ہیں۔

آزاد: ۔ توبہ توبہ ۔ مگر اس بڑھیا کندن کو ہم نے نہیں دیکھا۔

ناظورہ: ۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں آتی ہوں گی۔

آزاد: ۔ توبہ توبہ ۔ مگر اس بڑھیا کندن کو ہم نے نہیں دیکھا۔

ناظورہ: ۔ اے لو ۔ یہ ایک ہی کہی نیکی اور پوچھ پوچھ اسی پر تو ان کی روٹیاں ہیں ۔ وہ تو اور خوش ہوں گی۔

آزاد: ۔ بھلا ملوں تو کس قسم کی باتیں کروں۔

ناظورہ: ۔ وہ تم کو اس کا موقع ہی نہ دیں گی کہ تم کچھ کہو جو کچھ کہنا ہوگا وہ خود کہہ چلیں گی لیکن جو تم سے پوچھیں کہ تم یہاں کیونکر آئے تو تم کیا کہو گے۔

آزاد: ۔ میں کہہ دوں گا کہ تمہارا نام سن کے اور شہرت سن کے یہاں آیا تھا۔

ناظورہ سرو قامت نے آبدیدہ ہو کر کہا میاں ایک مصیبت ہو تو کہیں بادی النظر میں جو ہمیں دیکھتا ہے سمجھتا ہے کہ یہ بڑی خوش نصیب ہیں ۔ پہننے کے لئے عمدہ سے عمدہ پوشاک گراں بہا ۔ کھانے پینے

لئے اغذیہ لذیذ و نفیس رہنے کے لئے فرح بخش اور عالی شان عمارتیں سیر کے لئے باغ فرحت انتما دل لگی مذاق کے لئے ہمجولیاں ایک سے ایک پری پیکر رنگین ادا دل بستگی کے لئے جوانانِ طناز مہ طلعت سراپا انداز ہر دم دل لگی اور چہل ہر وقت ہنسی مذاق۔

صبح تو جام سے گذرتی ہے　　　سب دلا رام سے گذرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے

اب تو آرام سے گذرتی ہے

اور جب دیکھو بدن سے بوئے عطر و عنبر آئے۔ زلف سے مشک تتارا و رعنبر سارا کی خوشبو اور مہک چلی آتی ہے

کھولی ہے کس نے کاکل مشکین یہ اے صبا

آتی ہے بو دماغ میں مشک تتار کی

مگر دل وحشت کدہ ہے۔ دل کو خوشی اور چین نہیں بڑی خوش نصیب وہ بیبیاں ہیں جو ایک میاں کے ساتھ تمام عمر بسر کرتی ہیں۔

مگر ہم دوزخی عورتوں کے ایسے نصیب کہاں۔ اس کٹنا ن بدبخت بڑھیا کو خدا غارت کرے جس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا اور یہاں جتنی دیکھتے ہو سب ایسی ہی ہیں ایک سے ایک بڑھکر سب کے دل روتے ہیں یہاں سوائے ایک کے ایسی کوئی نہیں ہے جو اس زندگی سے خوش ہو۔ ہائے ؎

قابل ستم کے چرخ نہ میں خاکسار تھا

پیسا عبث کہ آپ ہی مشتِ غبار تھا

اتنے میں صنم خوش گلو نے لہرالہرا کر کوٹھے سے گانا شروع کیا۔

ہر جنبش مژگان سے ہے مقتول زمانہ　　　کیا تیز ہے خنجر تری بیدادگری کا

اٹھا ہے یہ کس کے رُخ پر نور سے پردہ　　　خورشید میں عالم ہے چراغ سحری کا

اندر کا اکھاڑہ ہے چمن موسم گل میں　　　ہر پھول پہ ہر شاخ پہ عالم ہے پری کا

یاد آئی مجھے اپنے دم باز پسیں کی

دم ٹوٹتے دیکھا جو چراغ سحری کا

آزاد واقعی اجنبی آدمی تو یہی سمجھے کہ یہ پریاں ہر دم خوش و خرم رہتی ہیں۔ ان کو کسی طرح کا تردد اور فکر نہیں ہے کوئی گاتی ہے کوئی بجاتی ہے کوئی کھلکھلاتی ہے۔ کوئی تالیاں بجاتی ہے۔ جب دیکھو قہقہے اور چہچہے۔ مگر تمہارے بیان سے معلوم ہوا کہ معاملہ برعکس ہے۔

ناظورہ:۔ اے میاں ہزاروں آدمی سے بات چیت ہے۔ مگر ہمارے ساتھ شادی کرنے کو کوئی بتیاتا ہی نہیں اول اس کندن سردار سے ڈرتے ہیں۔ دوسرے صاحب عظمت آدمی ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ شہدے لقے کی بات کا اعتبار کیا دو ایک نے نکاح کا وعدہ کیا بھی تو ایفا نہ ہوا ۔

کس سے کس میں جا بجا نہ ملا پر کہیں دل کا مدعا نہ ملا

دلربا سیکڑوں ملے لیکن

کوئی معشوق باوفا نہ ملا

یہ کہہ کر ناظورہ دلفریب کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور عرصے تک روتی رہی۔ آزاد نے کہ ازبس رحم دل آدمی تھے رومال سے اشک پریشان روزگار پونچھ کر سمجھایا کہ دل کو ڈھارس دو مگر اس کی آنکھوں سے بدستور جھڑنے اشک جاری رہی ۔

بھرے آتے ہیں آنسو آنکھ میں اے یار کیا باعث نکلتے ہیں صدف سے گوہر شہوار کیا باعث

نہ وہ شوخی کی باتیں ہیں نہ وہ گرمی طبیعت کی لبوں پر دم بدم ہے آہ آتشبار کیا باعث

نظر آتا ہے پژمردہ گل رخسار کیا باعث

پریشان اندنوں ہیں گیسوے خمدار کیا باعث

ناظورہ :۔اس کی رحمت اگر ہم کو گناہوں سے پاک کر ڈالے تو اس کی کریمی ہے ورنہ ہم تو آلودہ ہیں ہی۔

آزاد :۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ۔ اس پر شاکر رہو۔

ناظورہ :۔ خدا کی رحمت تو بڑی ہے اور اس کو کرم کرتے دیر نہیں لگتی مگر اپنے گناہوں کو جب دیکھتے ہیں تو دل گواہی نہیں دیتا کہ ہم کو بہشت نصیب ہو۔

صنم نازک ادا کو معلوم ہو گیا کہ ناظورہ گلبدن نے اس جوان رعنا سے یہاں کا کچا چٹھا بیان کر دیا۔ کوٹھے سے باغ میں آئی اور آزاد سے کہا آپ تو بڑے فقرے باز معلوم ہوتے ہیں صاحب۔ دم دے کے سارا حال دریافت کر لیا۔ ہم پر فقرہ نیز کرتے تو ہم جانتے کہ آپ بڑے فقرے باز آدمی ہیں۔

آزاد نے کہا مجھے بڑا خلجان تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ باغ آراستہ مکان عالی شان۔ فرش مکلف۔ کمرے سجے سجائے۔ شیشہ آلات قیمتی پریاں چہل کے لئے مستعد۔ ایک سے ایک نازک بدن۔ بستہ دہن۔ سرو قامت ماہ طلعت۔ خدمت کے لئے مہربان خواصیں۔ زیور بیش بہا زیب بدن۔ آفت کا جوبن اور یہ مطلق العنانی سخت حیرت تھی کہ یا خدا یہ کس کا مکان ہے اور یہ کیسا سامان ہے۔ بارے خدا خدا کر کے حیرت کا طلسم ٹوٹا یہ تو اپنی سرگذشت کہہ چکی ہیں اب آپ اپنا حال کہیئے

صنم :۔ یہ تو ہیں کچی پختہ معز نہیں یہ ہم اپنا درد دل آپ کو سنائیں تو بجز اس کے کہ آپ سن لیں اور چلیں جائیں اور کیا نتیجہ ہے۔ خاک

آزاد :۔ خیر اب اس کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔

صنم :۔ خدا تو سب کچھ جانتا ہے میاں۔ لیکن جس کی ہم نے تابعداری کی ہے اور جس کے ہاتھ ہم بک گئے ہیں اگر اس پر کھل گیا کہ ہم نے اس بھید سے کسی غیر آدمی کو اطلاع دی ہے تو ستم ہی ہو جائے گا۔

آزاد :۔ شریف زادوں کا شیوہ نہیں کہ کسی کا راز افشا کریں اور مجھے اس سے ملے گا کیا مگر آپ کو مجھ اجنبی کی باتوں کا کیوں کر اعتبار ہو۔ بہر کیف اگر اعتبار کے قابل سمجھو تو کہو۔

صنم :۔ ہمارا کچھ فائدہ ہو یا اس قید خانے سے چھٹکارا ہو تو بیشک کہیں ورنہ بیکار ہے۔

آزاد :۔ میں تو اپنی طرف سے ضرور کوشش کروں گا۔

صنم :۔ تم مردوں کی بات کا اعتبار کرنا بے وقوفی ہے۔

آزاد :۔ واہ کیا پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں ؟

صنم :۔ میاں ہمارا حال کیا پوچھتے ہو۔ ہمیں اپنا حال خود ہی نہیں معلوم۔ خدا جانے ہندو کے ہاں جنم لیا۔ یا مسلمان کے گھر پیدا ہوئے ع۔ آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ صیاد آیا۔

اتنا ہی جانتی ہوں کہ مجھے لڑکپن ہی کے زمانے میں کسی نے ماں باپ سے جدا کیا مگر قسم لو جو (آبدیدہ ہو کر) مجھے کسی نے جھانسہ بھی دی ہو کہ ماں کون تھی اور باپ کون تھا اور میں کہاں پیدا ہوئی۔ اکثر خیال آتا ہے کہ اس مکان کی مالک ایک بوڑھی عورت ہے۔ اس بڑھیا کے کاٹے کا منتر نہیں۔ ایک دن کے لئے بھی کہیں جائے تو محلے والے عزت دار آدمی کا تپ اتر جائے۔ اس کا یہی پیشہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو کم سن اور خوبصورت لڑکیوں کو پھسلا کر پکڑ لائے۔ سارا زمانہ اس کے ہتھکنڈوں سے واقف ہے مگر کسی سے آج تک ذرا بھی بندوبست نہیں ہو سکا اچھے اچھے مہاجن جن کے ہاں لاکھوں کا لین دین اور بیوپار ہے اس کے مکان پر مری ٹیک کرتے ہیں اور بڑے بڑے متمول شریف زادے اس کا دم بھرتے ہیں۔ شہزادوں تک کے پاس اس کا گذر ہے مگر ہم نے اس کو روز بروز فروغ ہی حاصل کرتے دیکھا سنتے تھے کہ نتیجہ کار بدکار برا ہوتا ہے مگر اس کار بد میں جس سے زیادہ برا اور کوئی کام نہ ہوگا اس مکارہ نے خوب روپیہ جمع کیا اور اس قدر نام کیا کہ دور دور تک مشہور ہوئی۔

آزاد :۔ تم سب کی سب مل کر بھاگ کیوں نہیں جاتیں۔

صنم :۔ بھاگ جائیں تو پھر کھائیں کیا۔ یہ تو سوچو۔

آزاد:۔ اللہ اکبر اس نایک دیرینہ روز نے اپنی مکاری اور زور سے اسقدر تم سب کو بیوقوف بنا رکھا ہے۔
صنم:۔ بیوقوف نہیں۔ یہ صحیح بات ہے۔ کھانے بھر کا سہارا ہوتو آج چل دیں مگر جب سہارا ہو نہ روٹی کپڑا کون دے گا۔
آزاد:۔ (ہاتھ پٹک کر) افوہ تمہاری آنکھوں پر غفلت کی پٹی باندھ دی ہے۔ تم اتنا نہیں سوچتیں کہ تمہاری بدولت تو اس نے اس قدر روپیہ پیدا کیا اور تم کھانے کو محتاج رہو گی بھلا۔ واہ واہ واہ جو پسند ہو اس کے ساتھ شادی کر لو اور عیش و آرام سے زندگی بسر کرو۔
صنم:۔ یہ سچ۔ مگر اس کا رعب مارے ڈالتا ہے۔
آزاد:۔ اف رے رعب۔ یہ بڑھیا بھی دیکھنے کے قابل ہے۔
صنم:۔ اس طرح کی میٹھی میٹھی باتیں کرے گی کہ تم بھی اس کا کلمہ پڑھو گے۔ سیکڑوں گر ایسے یاد ہیں کہ آدمی بس میں آجائے۔
آزاد:۔ اگر مجھے اجازت دو تو میں کوشش کروں۔

صنم دلربا اور ناظورہ رنگین ادا دونوں نے بڑی لجاجت اور منت سے کہا کہ آپ کا بڑا احسان ہوگا ہماری زندگی تلخ ہے اوّل تو ہمیں ہر روز گالیاں دیتی اور بُرا بھلا کہتی ہے اور ہمارے ماں باپ کو کوسا کرتی ہے گو ہم نے ان کو آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے مگر خون کا جوش کہاں جائے۔ اس فقرے سے آزاد بھی آبدیدہ ہو گئے اور انھوں نے ٹھان لی کہ صاحب ضلع کو جن کے یہاں وہ مہمان تھے فوراً اس حال کی اطلاع دیں گے اور ان سے التجا کریں گے کہ اس ضعیفہ مکارہ کو سخت سزا دیں۔

اتنے میں ہجولی نے آن کر کہا آہستہ آہستہ باتیں کرو وہ آگئی ہے وہ دونوں آزاد سے رخصت ہو کر مکان میں گئیں اور ہجولی سے کہا کہ تم آن کر کندن سے کہنا کہ کوئی نواب صاحب دروازے پر کھڑے آپ کو پوچھ رہے ہیں آزاد کو تو پہلے ہی سے سکھا پڑھا دیا تھا۔ مکان میں گئیں تو کندن نے کہا کہ بیٹا آج ایک اور شکار کیا مگر ابھی ہم بتائیں گے نہیں۔ یہ دونوں اوپر کے دل سے خوشی ظاہر کرنے لگیں۔ اتنے میں ہجولی دوڑی آئی اور کندن کے پاس جا کر کان میں کہا اماں جان کوئی نواب صاحب آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں کندن نے ان تینوں کو حکم دیا کہ کوٹھے پر جاؤ اور مہری بھیج کر ان کو بلوایا۔ آزاد داخل ہوئے۔

کندن:۔ تم کس کے پاس آئے ہو اور کیا کام ہے؟
آزاد:۔ میں خاص آپ کے پاس آیا ہوں اور کام۔
کندن:۔ اچھا بیٹھو۔ آج کل بے فصل کی بارش سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اچھی وہ فصل کی ہر شئے قرینے کے موافق ہو برسات ہو تو منھ برسے۔ نہ اتنا کہ کھیت طغیانی کے سبب سے سڑ جائیں اور نہ اس قدر کم کہ لوگ پانی کو ترسیں سردی کے موسم میں سردی خوب ہو اور گرمی میں گرمی لوں چلنے کے دن ہو تو لوں چلے

در پتے گریں۔ مگر جہاں کوئی بات بے فصل ہوئی اور بیماری پیدا ہو گئی۔

آزاد :۔ جی ہاں اس میں کیا شک ہے۔ قاعدے کی بات ہے۔

کندن :۔ اور بیٹا ہزار بات کی ایک بات یہ ہے کہ آدمی بُرائی سے بچے اور نیکی کرے۔ جو نیک کام کرے گا وہی اچھا رہے گا۔

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

انسان کو اس قدر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک دن اس کو منہ دکھانا ہے جس نے پیدا کیا ہے۔ بد آدمی کس منہ سے منہ دکھائے گا۔

آزاد :۔ کیا خوب بات آپ نے کہی ہے واقعی ایسا ہی ہے۔

کندن :۔ میں نے تمام عمر اسی میں صرف کی کہ لاوارث بچوں اور یتیموں اور بن ماں باپ کے لڑکیوں کی پرورش کروں ان کو کھلاؤں پلاؤں اچھی اچھی باتیں سکھاؤں۔ خدا مجھے اس کا اجر عطا کرے تو واہ واہ ورنہ اور کچھ فائدہ نہیں اس قدر تو فائدہ ہے کہ ان بے کسوں اور بے بسوں کی میری ذات سے پرورش ہوئے۔

آزاد :۔ خدا ضرور اجر دے گا (دل میں) اگر دوزخ اور بہشت اور سزا جزا صحیح ہے تو انشاء اللہ سب سے پہلے جہنم میں جائے گی ان کو اور خدا اجر عطا کرے!!! ماشاء اللہ۔

کندن :۔ تم نے میرا نام کہاں اور کس سے سنا تھا۔

آزاد :۔ آپ کے اخلاق کی خوشبو دور تک بلند ہے۔

کندن :۔ واہ۔ میں تو کبھی کسی سے اپنی تعریف ہی نہیں بیان کرتی۔

ثنائے خود بخود گفتن نشاید مرد دانا را

جو لڑکیاں میں پالتی ہوں ان کو بالکل مثل اپنے خاص جگر گوشہ بیٹیوں کے سمجھتی ہوں۔ ممکن کیا کہ ذرا فرق ہو اور جب دیکھا کہ وہ سیانی ہوئیں تو کسی اچھے گھران کو بیاہ دیا۔ مگر خوب دیکھ بھال کے جانچ پڑتال کے اور بیٹا ہم نے ایک بات فرنگیوں سے سیکھی ہے پوچھو وہ کیا وہ یہ کہ جب شادی ہو۔ مرد اور عورت کی رضامندی سے۔

آزاد :۔ سبحان اللہ شادی کے معنی ہی یہ ہیں۔

کندن :۔ تمہاری عمر خدا دراز کرے۔ دیکھو جو کام انسان کرے عقل کی رو سے کرے۔ ہر پہلو کو دیکھ بھال کے۔

آزاد :۔ بغیر اس کے میاں بیوی میں کما حقہ محبت نہیں ہو سکتی۔ اور یوں مجبوری کی تو بات ہی اور ہے۔

کندن :۔ سچ ہے۔ میرا یہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کو پڑھا لکھا اور چال چلن کا اچھا سمجھتی ہوں اس کے علاوہ اور کسی ایسے ویسے کے ساتھ نہیں بیاہتی اور لڑکی سے پوچھ لیتی ہوں کہ بیٹا اگر تم کو پسند ہو تو اچھا نہیں کچھ

زبردستی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر مہری کو اشارہ کیا آزاد نے اشارہ کرتے تو دیکھا مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ مہری فوراً کوٹھے پر گئی اور تھوڑی ہی دیر میں کوٹھے سے گانے کی آواز آنے لگی۔

پھرا یہ آنکھوں میں اُس زلفِ عنبریں کا سانپ　　　کہ موجِ اشک ہوئی اپنی آستیں کا سانپ
کھجوری چوٹی یہ کس کی تھی جس کے دھوکے میں　　　جگر کو کاٹ گیا شاخِ یاسمیں کا سانپ

بلا کے زلف نہیں کس نے کی تھی بوسے پر
کہ پھر گیا مری چھاتی پہ اس نہیں کا سانپ

کندن :- میں نے ان سب کو گانا بھی سکھایا ہے گو یہاں اس کا رواج نہیں۔ مگر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ علم موسیقی ایک بہت بڑا علم ہے۔

آزاد :- تمام دنیا میں عورتوں کو گانا سکھایا جاتا ہے۔

کندن :- ہاں بس ایک اسی ملک میں نہیں ہے اور سب جگہ کی عورتیں کم وبیش گا سکتی ہیں۔

آزاد :- یہ تو تین کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ مگر ایک ان سب میں خوش گلو ہے۔ اس کی گلے بازی اور نازک آوازی کے ہم بھی قائل ہیں اور یوں تو سب ہی خوش آواز ہیں۔

کندن :- ایک تو ان کا دل بہلتا ہے دوسرے جو سنے اس کا دل بہلے اور چیز اچھی۔ اس میں کچھ بُرائی نہیں ہے۔

آزاد :- مگر تعلیم بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ کچھ آپ نے پڑھایا بھی ہے نہیں، عورتوں کو کسی قدر حرف آشنا بھی ہونا چاہئے۔

کندن :- دیکھو بلواتی ہوں مگر بیٹا نیک نیتی عجیب شے ہے۔

آزاد :- آپ کیا فرماتی ہیں۔ میں آپ کی باتوں ہی سے سمجھ گیا کہ آپ نیک نیت اور نیک مزاج ہیں۔

اُس ٹھگوں کی بڑھیا نے سب سے پہلے صنم جادو جاں کو بلوایا۔ وہ شرماتی اور لجاتی اور گردن نیوہڑاتی ہوئی آئی اور ضعیفہ کے قریب اس طرح گردن جھکا کے بیٹھی جیسے نئی شرمیلی دلہن کندن بہت خوش ہوئی کہ اس صنم کو جس طرح غیر مرد کے سامنے بیٹھنا سکھایا تھا اسی طرح نازک ادائی اور حیا کے ساتھ بیٹھی اور یہ معلوم ہی نہ تھا کہ آزاد سے گھنٹوں چہل ہو چکی ہے۔

آزاد :- اے صاحب سر اونچا کر کے بیٹھو۔ یہ کیا بات ہے۔

کندن :- (مسکرا کر) بیٹا اچھی طرح بیٹھو سر اٹھا کر۔

آزاد :- جس طرح آدمی کی نشست ہے اسی طرح بیٹھنا چاہئے۔

کندن :- ہماری سب لڑکیاں شرمیلی اور حیا پرور ہیں۔

آزاد :۔ یہ آپ ادپر کیا گا رہی تھیں۔ ہم بھی کچھ سنیں۔

کندن :۔ نور۔ وہی غزل گاؤ بیٹا۔ گاؤ

نور :۔ (گردن اور نیچی کر کے آہستہ سے) اماں جان ہمیں شرم آتی ہے۔

کندن :۔ کہتی ہے ہمیں شرم آتی ہے۔ شرم کی کیا بات ہے غزل ہماری خاطر سے گاؤ۔

کیوں نہ وہ پردہ نشیں پھر مجھے سمرن مارے
منے تھے پھول گئی جانب چلوں مارے

نور :۔ (آہستہ سے کندن کے کان میں) اماں جان ہم سے نہ گایا جائے گا۔

آزاد :۔ یہ نئی بات ہے۔

اجی چشم جادو پہ اتنا گھمنڈ — لبِ لعل و گیسو پہ اتنا گھمنڈ
ابھی سر اٹھا کر ادھر دیکھنا — اِسی چشم و ابرو پہ اتنا گھمنڈ
نسیم گل اس زلف میں ہو تو — نہ کر اپنی خوشبو پہ اتنا گھمنڈ
شبِ مہ میں کہتا ہے وہ ماہ سے — رکابی سے اس رو پہ اتنا گھمنڈ

اکڑتا ہے کیا دیکھ دیکھ آئینہ
حسین گرچہ ہے تو یہ اتنا گھمنڈ

کندن :لو انھوں نے گا کے سنا دیا اب تم کچھ کہو۔

مہری :۔ کہیے حضور۔ یا الہٰی۔ سرکار آپ تو چاہتی ہیں کہ پردے اور نقاب سے کام ہی نہ رکھیں۔ دل کا پردہ کیا کم ہے مگر یہ مارے لحاظ اور شرم کے اور بھی زیادہ پردہ کیا کرتی ہیں۔ اے بیوی گردن اونچی کرو۔ معلوم ہے اللہ کے فضل و کرم سے خوب صورت ہو۔ تم اچھی طرح بیٹھو جس دن عروس ہو گی اس دن البتہ اس طرح بیٹھنا تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

کندن :۔ ہاں بات تو یہی ہے۔ اس میں کیا فرق ہے۔

آزاد :۔ الحمدللہ ذرا گردن تو اٹھائی۔

بات سب ٹھیک ٹھاک ہے پر ابھی
کچھ سوال و جواب باقی ہے

کندن : (ہنسکر) اب تم جانو یہ جانیں۔

آزاد :۔ اے صاحب ادھر دیکھئے یا الہٰی (دل میں) اللہ رے زور۔ ابھی گھڑی بھی نہیں ہوئی کہ باغ میں

اٹھکھیلیاں کررہی تھی اور اب یہ پردہ اور شرم و حجاب ہے شانِ خدا۔

کندن :۔ اب تو از برائے خدا گردن اونچی کرو۔

آزاد :۔ اے صاحب بُرا بھلا کہہ لو۔ کوس لو۔

گالی سہی ادا سہی چیں جبیں سہی
یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی!

صنم :۔ اماں جان اب ہم یہاں سے جاتے ہیں اجازت دیجئے۔

آزاد :۔ اب دل قابو سے جاتا رہا۔

آفریں تجھ کو اے دلِ بے صبر
آ پھنسایا مجھے کہاں تو نے

کندن نے چٹکی لے کر اشارہ کیا کہ کچھ بولو اتنا عرصہ ہوا اب کچھ باتیں کرو۔ جس میں ان کا دل بھی خوش ہو۔

صنم :۔ (نقاب ذرا ہٹا کر) اماں جان حیا مانع ہے۔

آزاد :۔ اس حیا کے صدقے۔ اللہ ری حیا۔

عشق تا خام ست باشد بستۂ ناموس و ننگ
پختہ مغزان جنوں را کے حیا زنجیر پاست

کندن :۔ کچھ جواب دو بیٹا۔ یہ کیا بات ہے واہ۔

صنم :۔ اماں جان کس کو جواب دوں جان نہ پہچان۔

کندن اِن امور میں آٹھوں گانٹھ کمیت۔ کسی بہانے سے اُٹھ گئی۔ اس کے اُٹھتے ہی صنم نے بھی بناوٹ کے ساتھ چاہا کہ چلی جائے اس پر کندن نے ڈانٹ بتائی۔ ہائیں ہائیں!۔ اس کے کیا معنی۔ بھلے مانس ہیں یا کوئی نیچ قوم۔ شریف زادوں سے خوف یعنی۔ چہ بیٹھو یہ حیلہ ہے یا جنون۔ اے ہاں۔ حیا بھی تو کتنی۔ صنم عربدہ جو شرما کر ادا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ مہری پنکھا جھلنے لگی۔ ادھر کندن نظر سے غائب ہوئی اُدھر مہری بھی بہانہ کر کے چنپت۔

آزاد :۔ اللہ اللہ یہ بوڑھیا تو ایک ہی کائیاں ہے۔

صنم :۔ (بہت آہستہ سے) ابھی دیکھتے جاؤ۔

آزاد :۔ اس کے کاٹے کا منتر نہیں یہ وہ افعی ہے۔

صنم :۔ اب یہ اپنے نزدیک تم کو عمر بھر کے لئے غلام بنائے لیتی ہے اور جو ہم نے پہلے سے اس کا حال بیان نہ کر دیا ہوتا تو تم بھی چنگ پر چڑھ جاتے۔

آزاد :- بھلا یہ کیا وجہ ہے کہ تم ان کے سامنے شرمایا کیں۔

صنم :- ہم کو جو سکھایا ہے وہ ہم کرتے ہیں کیا کریں !!!

آزاد :- ہاں مجبوری ہے اس میں کیا شک۔ مگر ان دونوں کو کیوں نہ بلایا۔ تمہیں کو سب کے پہلے یاد کیا۔

صنم :- اے ہے ابھی دیکھتے جاؤ۔ سب کو بلائے گی۔

آزاد :- میں تو اس کی باتوں سے دنگ ہو گیا۔ اے توبہ۔

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

اتنے میں مہری پان اور الائچی اور عطر لے کر آئی۔ آزاد نے کہا بی مہری صاحب یہ کیا اندھیر ہے آدمی آدمی سے بولتا ہے یا نہیں۔ مہری تیکھی ہو کر بولی۔ اے یہ کیا ماجرا ہے واہ۔ اور سنو۔ یا چپ پیر کار دز ہے۔ دیکھو تو کیسے قبول صورت گبھرو ہیں۔ اب تو مسکرایئے۔ ذرا گردن اٹھا کے تو دیکھ لو اب ہم سے تو بہت نہ اڑو۔ اللہ جھوٹ نہ بلائے تو بات چیت تک کی نوبت آئی ہو گی اور ہمارے سامنے گھونگھٹ کی لیتی ہیں یا الٰہی۔ صنم نے بہت آہستہ سے کہا مہری ہم کو چھیڑو گی تو ہم اماں جان سے کہہ دیں گے۔

راوی :- اللہ رے تیرا بھولاپن۔ اس الھڑپن کے صدقے۔

آزاد :- ذری گردن تک تو اونچی نہیں کرتیں بولنا چالنا کس کا۔ یا تو بنتی ہیں اور یا اپنی اماں جان کا خوف ہے۔

مہری :- واہ واہ حضور واہ واہ۔ بھلا یہ کاہے سے جان پڑا کہ بنتی ہیں یا اماں جان کے ڈر سے نہیں بولتیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ خود دل ہی کی شرم اور آنکھوں کی حیا کے سبب سے اس قدر لجاتی ہوں۔

آزاد :- واہ آنکھیں کہے دیتی ہیں کہ نیت بدی کی طرف مائل ہے۔

صنم :- (تیوری چڑھا کر) خدا کی سنوار جھوٹے پر۔

مہری :- (قہقہہ لگا کر) شاباش۔ بس یہ اسی بات کی منتظر تھیں اور میں تو سمجھی ہی بیٹھی تھی کہ جب یہ زبان کھولیں گی پھر بند ہی کر چھوڑیں گی سو ویسا ہی ہوا۔

صنم :- ہمیں بھی کوئی گنوارن مقرر کیا ہے کیا۔

آزاد :- واللہ اس وقت ان کا تیکھی ہو کر تیوری چڑھانا عجب لطف دیتا ہے ان کے جوہر تو اب کھلے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ بالکل کچھ جانتی ہی نہیں ہیں آزاد۔ یہ کہاں چلی گئیں۔ ان کو بلوایئے صاحب۔

ع

طاقت مہمان نداشت

خانہ بہ مہمان گذاشت

معقول رہا۔

مہری :۔ حضور ان کا قاعدہ ہے کہ اگر دو دل مل جاتے ہیں تو پھر نکاح پڑھوا دیتی ہیں مگر مرد قاعدے سے چلے۔ بھلا مانس ہو۔ شریف ہو چار پیسے پیدا کرتا ہو آپ پر تو کچھ بہت ہی مہربان نظر آتی ہیں کہ دو باتیں ہوتے ہی اُٹھ گئیں ورنہ مہینوں آزمایش ہوا کرتی ہے اور آپ کی شکل وصورت اور وضع ہی سے ماشاء اللہ برستا ہے کہ آپ رئیس ہیں۔

صنم :۔ واہ اچھی پھبتی کہی بوا۔ بے شک ریاست برستی ہے۔

اتنے میں مہری نے آزاد سے پوچھا۔ کیوں میاں حسن آرا بیگم کے عاشق میاں آزاد کو بھی تم نے کبھی دیکھا ہے؟ حسن آرا بیگم کو تو ہم دیکھ چکے ہیں۔ ان کے ہاں ایک چھوکری نوکر ہے پیاری۔ اس کی آنکھیں اُٹھیں تو ہمارا بلوا ہوا! وہاں ہم نے حسن آرا کو دیکھا تو دنگ ہو گئی۔ وہ نورانی صورت پائی ہے اور گالوں پر وہ رضائی ہے کہ میں کیا عرض کروں جب ایسے معشوق نے آزاد کو پسند کیا تو بس اب اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ کروڑ دو کروڑ میں فرد ہے۔ ورنہ حسن آرا کبھی نہ ریجھتیں وہ تو جیسا حسین ہو گا ویسا ہی مغرور بھی ہو گا

بے جا نہیں حسینوں کی ہیں لن ترانیاں

اے غافلو یہ حسن امانت خدا کی ہے

آج کل تو یہاں بہت خبر گرم ہے کہ آزاد آنے والے ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ داخل ہو گئے۔ خدا جانے کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے مگر جو آئیں تو ہزاروں ہی آدمی اُن کے دیکھنے کو جائیں کیونکہ زمانہ بھر میں ان کا نام روشن ہے۔

آزاد :۔ بھلا حسن آرا خود بھی ویسی ہی حسین ہیں جیسے آزاد ہیں دونوں میں زیادہ خوب صورت کون ہے یہ یا وہ۔

مہری :۔ اب اے میاں میں کیا جانوں ان کو میں نے دیکھا نہیں، حسن آرا بیگم کو البتہ دیکھا ہے۔ اُن کے حسین ہونے میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔

صنم :۔ حسن آرا بیگم، حسن کا حال تو جب معلوم ہو کہ مقابل میں ہوں اور یوں نام نکل جانا اور بات ہے۔

آزاد :۔ اے ہے کیا الھڑ پن ہے۔ اب کسی حسین کے حسن کا حال سننا اچھا نہیں معلوم ہوتا ان کے سامنے کسی کی تعریف ہی نہ کرو کہ فلاں شخص حسین ہے۔

صنم :۔ پھر کیا جھوٹ بھی ہے (آہستہ)

لاش پر آنے کی شہرت شب غم دیتے ہیں
اے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں

دھیان آتا ہے ترے منہ میں زباں لینے کا
جی ہم اے شوخ پے سیر عدم دیتے ہیں

کر دیا خانہ اغیار ہوسناک خراب
داد رنگینی مرے دیدۂ نم دیتے ہیں

دم نہ لے اے اثر آہ کہ معلوم ہوا

جن پہ دم دیتے ہیں ہم وہ نہیں دم دیتے ہیں

آزاد :۔ میں تو ان کی آواز پر عاشق ہوں واللہ۔

صنم :۔ خدا کی شان۔ آپ کیا اور آپ کی قدردانی کیا۔

آزاد :۔ بجا ہے دل میں تو خوش ہوئی ہوں گی۔ کیوں مہری۔

مہری :۔ اب یہ آپ جانیں اور وہ جانیں ہم سے کیا۔

اتنے میں آزاد پاشا نے مہری سے تخلیے میں پوچھا کہ یہ تینوں لڑکیاں ان کی چھوکریاں ان کی لڑکیاں ہیں یا انھوں نے مول لی ہیں مہری مسکرا کر بولی کہ حضور نے مجھے پہچانا یا نہیں۔ بندگی۔ اور میں حضور کو چٹکیوں میں پہچان گئی جب حضور دو ایک باری ثریا بیگم کے ہاں آئے تھے اور اُن کے بوڑھے میاں کا خط لاتے تھے۔ ان کے ہاں میں ہی اس وقت تھی اور ایک دفعہ ان کی فنس مٹھسے سے جارہی تھی اور لونڈی فنس کا کونا پکڑے ساتھ تھی جب بھی حضور کو دیکھا تھا۔ اب یاد آیا۔ آزاد متحیر ہوکر مہری کی طرف دیکھنے لگے۔ کہاں بیشک اب یاد آیا کہ تم وہی مہری ہو کہو معلوم ہے کہ اب وہ کہاں ہیں۔ مہری مسکرائی۔ حضور اب وہ وہاں ہیں جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا مگر کچھ انعام دیجیئے تو دکھا دوں۔ مگر دور ہی دور سے بات چیت ہوگی اور وہ تو آزاد کے لئے جوگن ہوگئیں تھیں اُن کا تو بڑا افسانہ ہے۔ کہاں تو وہ ٹھاٹھ تھے کہاں سرا میں جا کے قیام کیا اور پھر جو طبیعت نے پلٹا کھایا تو جوگن ہوگئیں۔ آزاد نے کہا۔

در بت خانۂ عشق بتاں اور آپ اے مومن

یہ حضرت آگئی اک بار کیا طبع مقدس ہیں

کجا سرا۔ کجا جوگن یہ نئی بات ہے۔ ان کی عشق بازی کا حال اگر مشہور ہو تو لوگ سخت متحیر ہوں۔ کبھی جڑ کبھی پھُنگی۔ یا تو بیگم صاحب کے مزاج ہی نہیں ملتے تھے یا طبیعت نے وہ پلٹا کھایا کہ سرا میں بھٹیاری بن کے رہیں۔ اللہ رکھی نام رکھا اور یہ سب ایک طرف جوگن کا بھیس دفعتہً بدلا۔

مہری :۔ آزاد نے سینکڑوں کو گھائل کردیا حضور۔

آزاد :۔ خدا جانے اس میں کیا بات ہے۔ ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا مگر جسے پیا چاہے وہی سہاگن کیا سانورا کیا گورا اسے۔

مہری :۔ حضور کوئی بات تو ضرور رہی ہوگی مگر سچ کہتی ہوں حضور نے بھی وہ صورت پائی ہے کہ لاکھوں میں ایک کروروں میں دو۔

آزاد :۔ اگر ثریا بیگم کو دکھا دو تو انعام دوں اور بھرپور انعام دوں مگر ہم نے ایک جگہ خبر پائی تھی کہ وہ آجتک

نیکی کے ساتھ رہا کی اور آخر کار جب آزاد نے بالکل خبر ہی نہ لی اور حسن آرا کے ساتھ عقد ہونے کی خبر سنی تو کسی نواب صاحب سے عقد کر لیا اب وہاں سے نکلنا محال ہے۔

مہری :۔ حضور آزاد نے بھی برا کیا۔ جو اپنے پر جان دے اس کے ساتھ اس قدر بے رحمی سے پیش آنا نہ چاہیئے

آزاد :۔ ہم نے سنا ہے کہ وہ اس وجہ سے ملتفت نہ ہوئے کہ اُس زمانے میں یہ اللہ رکھی کے نام سے مشہور تھیں اور بھٹیاری کے ساتھ نکاح کرنا وضع دار کب گوارا کریں گے۔

مہری :۔ خیر تو سرکار اگر کچھ دلوائیں تو بیڑا اٹھاتی ہوں کہ ایک نظر اچھی طرح دکھا دوں گی۔ اسی ہفتے میں آزما لیجیے۔

آزاد :۔ منظور۔ مگر بے ایمانی کی سند نہیں ہے۔

مہری :۔ کیا مجال۔ انعام پیچھے دیجئے گا۔ پہلے ایک کوڑی نہ دیجئے گا۔

آزاد :۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ مگر کب تک جلد دکھاؤ

مہری نے آزاد سے یہاں کا کچا چٹھا کہا۔ میاں یہ عورت جتنی اوپر ہے اتنی ہی نیچے ہے اس کے کاٹے کا منتر نہیں یہ وہ افعی ہے۔ اسکا کاٹا منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے لہر تک نہ آئے۔ ایسا زہر چڑھتا ہے۔ باتیں تو اس طرح کی کریں گی کہ کوئی جانے ان سے بڑھ کر نیک دنیا میں کوئی عورت نہ ہوگی اور جس سے کہیں گی یہی کہیں گی کہ میں اپنی بیٹیوں کو پردہ وردہ نہیں سکھاتی۔ پردہ دل کا ہے۔ اگر عورت بد ہے تو سات پردوں سے نکل جائے گی۔ اور اگر نیک ہے تو لاکھ بے حجاب ہو لاکھ گھونگھٹ سے واسطہ نہ رکھے ممکن نہیں کہ اس کی عصمت میں فرق پڑے اور باتیں کرنے میں ایسی برق ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ دنیا بھر جھکیے میں آجائے مگر اس کے ہتھکنڈوں سے خدا بچائے۔ اللہ نہ کرے کہ کوئی بھلا مانس اس کے ہتھے چڑھے۔ اب آج ایک اور غریب شریف کو بہکایا ہے۔ یہاں ایک مرد آدمی رہتے ہیں ان کی ایک لڑکی ہے کوئی پانچ چھ برس کا سن ہوگا اور کوئی اولاد نہیں۔ میاں اندھے بیوی بیچاری سلائی سے اپنا اور گھر بھر کا پیٹ پالتی ہے۔ سو میاں سلائی میں ایسے کون چھپن ٹکے ملتے ہیں اور پھر اس زمانے میں اے توبہ۔ بس ان کے ہاں آنا جانا شروع کیا۔

آزاد :۔ بھلا ان کا مکان ہم دیکھ سکتے ہیں۔

مہری :۔ یہ کیا سامنے ہے۔ وہ کھپریل۔

آزاد :۔ ہائے ہائے پڑوس ہی میں مکان ہے۔ گئی گذری۔

مہری :۔ اب کیا یہ چھوڑتی تھوڑا ہی ہیں۔

آزاد :۔ اور یہ جتنی یہاں ہیں سب اسی فشن کی ہوں گی۔

مہری : کسی کو چرا لائی ہیں کسی کو مول لیا ہے کچھ پوچھئے نہ۔

آزاد :۔ تو کیا وہ عورت بھی اپنی لڑکی کو بیچے گی۔

مہری :۔ اس سے آج کہا کہ ہمیں یہ لڑکی بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے اور وہ بیشک بڑی قبول صورت ہے بڑھ کے قیامت کی ہوگی۔ اس کی ماں سے دو ایک باتیں ایسی کہیں کہ وہ مان گئی۔ روپیہ تو بڑی چیز ہے۔ بے زری انسان کو کہیں کی نہیں رکھتی۔ اس سے کہا ہم اس کو گود بٹھائیں گے اور اپنی لڑکی بنائیں گے اس میں تمہاری مصیبت بھی دور ہو جائے گی اور لڑکی ٹھکانے رہے گی اور دروازے سے دروازہ ملا ہے۔ دن میں چاہے ہزار بار اپنے بچے کو دیکھ لو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

آزاد :۔ اچھا گہرا چکما دیا اور نیت کچھ اور ہی ہے۔

مہری :۔ نیت کا حال ظاہر ہے یہ تو برس کی سوچتی ہیں۔

آزاد :۔ اب اس وقت ٹال کے کیوں چلی گئی اور اس صنم تند خو کو کیوں بلوا لیا۔

مہری :۔ اب وہ بن ٹھن کے بناؤ چناؤ کر کے آئیں گی اور خود اس کے ساتھ آ کے لگاوٹ کی باتیں کرے گی۔

اتنے میں کسی نے سیٹی بجائی اور مہری فوراً ادھر چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں کندن آئی کہا۔ ایں یہاں تم کرتے بیٹھے ہو توبہ توبہ۔ معاف کرنا یہ مہمان نوازی کے خلاف ہے مگر لڑکیوں کو کیا کروں اِس درجہ شرمیلی اور حیادار ہیں کہ جس کی حد نہیں۔ مہری کو پکار کر کہا۔ اے ان کو بلاؤ کہو یہاں آن کے بیٹھیں۔ واہ یہ کیا بات ہے جیسے کوئی کاٹے کھاتا ہے اس پر وہ صنم عنبریں موچھم چھم کرتی ہوئی آئی۔ دیکھتے ہی آزاد کے ہوش اُڑ گئے اس مرتبہ غضب کا نکھار تھا۔

ہے جنبش مژگاں سے مقتول زمانہ
کیا تیز ہے خنجر تری بیداد کریگا

زلف چلیپا پریشان اور عنبر فشاں آزاد مست ہو گئے۔

کھولی ہے کس نے کاکل مشکیں یہ اے صبا
آتی ہے بو دماغ میں مشکِ تتار کی

زلف کا بکھرنا اور بھی ستم ڈھاتا تھا از سرتا پا جوبن ہی جوبن تھا وہ سنگار اور بناؤ چناؤ کہ زاہد صد سالہ تک کی نیت ڈانواں ڈول ہو جائے۔

وہ ابروئے خمدار مثلِ مہِ نو
وہ رخسار ہے ماہِ کامل کی صورت

آزاد اپنے دل میں سوچ کہ یہ صورت اور یہ پیشہ۔ یہ حسن اور یہ طریقہ۔ اے کاش یہ قمر رخسار کسی شریف زادے امیرزادے کی چاہتی بیوی ہوتی اور عصمت اور عفت کے ساتھ زندگی بسر کرتی۔ ٹھان لی کہ صاحب ضلع کو اس مقام پر کسی تدبیر سے ضرور لائیں گے اور ان سے التجا کریں گے کہ از برائے خدا اس زن مکارہ و دلالہ کے ظلم سے ان پریوں کو بچاؤ اور تہذیب کی اشاعت میں ساعی ہو۔

کندن نے آ کر صنم مہ لقا کے ہاتھ میں پنکھیا دی اور کہا ہماری جھوڈلائے جاؤ بنیا) صنم نے اس چوتالے کو بڑی خوش گلوئی سے ادا کیا اور آزاد کو یہ سماں ایسا بھایا کہ وجد کرنے لگے۔ بیچ میں صنم ماہ طلعت کا لبدرفی النجوم اور ادھر خوبرو اور کم سن پریوں کا ہجوم۔ بارش کا تار لگا ہوا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اور گھنگھور گھٹائیں اور اس لطف میں صنم مہر سیما کا تانیں لینا اور بھی ستم ڈھاتا تھا۔

برق چشمک زن ز طرف کوہساران می رسد

ساقیا سامان ساغر کن کہ باران می رسد

کندن :۔ اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو بیان کر دو۔

آزاد :۔ اس وقت دل وہ مزے لوٹ رہا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

کندن :۔ میرے ہاں صفائی اور پاکی اور نیکی سے کام لیا جاتا ہے۔

آزاد :۔ آپ کے کہنے کی اصلاً حاجت نہیں ہے۔

کندن :۔ یہ جتنی ہیں سب باتمیز باسلیقہ شعوردار ہیں۔

آزاد :۔ ان کے شوہر بھی انھیں کے سے ہوں تو بات ہے۔

غالب ان سیمیں تنوں کے واسطے

چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

کندن :۔ اس میں کسی کے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے میں ان کے لئے وہ لوگ منتخب کروں گی جو خدائی میں فرد ہوں ان کو کھلایا پلایا پرورش کی گانا سکھایا۔ اب ان پر ظلم کیونکر گوارا کروں گی۔

آزاد :۔ اور تو اور مگر ان کو تو آپ نے واقعی اس وقت۔

کندن :۔ میں سمجھی۔ اپنا اپنا دل ہے۔ آپ دو چار روز یہاں رہیں اگر ان کی طبیعت گوارا کرے تو ان کے ساتھ آپ کا نکاح ہو جائے۔

مہری :۔ ہاں حضور مگر شرطیں تو وہ دیکھئے آپ۔

کندن :۔ خبردار بیچ میں نہ بول اٹھنا اب۔ سمجھی۔

مہری :۔ ہاں حضور مجھ سے بیشک خطا ہوئی۔

آزاد :۔ پھر اب تو شرطیں بیان ہی فرمائیے۔

کندن :۔ اطمینان کے ساتھ بیان کروں گی۔

آزاد :۔ (صنم سے) تم نے تو ہمیں درم ناخریدہ غلام بنالیا۔

صنم :۔ جواب ندارد۔ خاموشی اختیار کی۔

آزاد :۔ اب ان سے کیا کوئی بات کرے۔

گوارا نہیں ہے جنھیں بات کرنا
سنیں گے وہ کاہے کو قصہ ہمارا

کندن :۔ اے ہاں۔ یہ تم میں کیا عیب ہے۔ باتیں کرو بیٹا۔

صنم :۔ اماں جان کوئی بات ہو تو کیا مضائقہ اور یوں خواہی نخواہی ایک نامحرم سے باتیں کرنا بھلا کوئی دانائی ہے۔

کندن :۔ اللہ کو گواہ کر کے کہتی ہوں یہ سب کی سب بڑی شرمیلی ہیں۔

صنم :۔ اس وقت پتوں کی شبنم سے معلوم ہوتا ہے کہ نونہالان چمن نے موتیوں کے ہار پہنے ہیں۔ عروس بہار کا جوبن قابلِ دید ہے۔

آزاد :۔ اللہ اللہ یا وہ سکوت و بے زبانی یا یہ رنگیں بیانی اور بھی ستم ڈھایا اور آتشِ عشق کو بھڑکایا۔

عشق ست بہ ملک بے نیازی	سلطان حقیقے و مجازے
آن شعلہ کہ سرکشد بنا راج	عشقست کہ می نہد بسر تاج

یہ کہہ کر آزاد نے کندن سے رخصت چاہی اور کہا کہ آج معاف فرمائیے کل تک انشاء اللہ تعالیٰ حاضر ہوں گا اور اگر اب کی آیا تو یہیں مقیم رہوں گا مگر تنہا آؤں یا دو ایک احباب بذلہ سنج کے ساتھ۔

کندن نے بہت اصرار کیا کہ اس قدر جلد پھر جانا اور ما حضر تناول نہ کرنا خلاف عقل ہے۔ آپ یہاں قیام کیجئے اور کھانا کھا کے جایئے۔ مگر آزاد نے کہا اس وقت تو یہ بدل اجازت دیجئے کیونکہ بڑا ضروری کام ہے۔ کل انشاء اللہ باتیں ہوں گی۔

میاں آزاد نے ہنوز باغ کے باہر قدم نہیں رکھا تھا کہ مہری دوڑی آئی اور کہا کہ حضور کو ہماری بی بی بلاتی ہیں کہا کہہ دو ذرا کھڑے کھڑے ہو جائیں۔ آزاد بی کندن کے حسب الطلب گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ناظورۂ غارت قریب ادر صنم دلربا اور خوبرو ہجولی کے علاوہ ایک اور طاؤس زیب عدوئے صبر و شکیب نوجوان غیرت حوران جناں بکصد شان برنائی و انداز دلربائی بی کندن کے پاس متمکن ہیں۔ یہ رشک لیلیٰ ان سب سے نکیلی سجیلی۔

حسن و جمال میں وہ چند شوخی اور آن بان میں بدرجہا زیادہ تھی۔

کندن :۔ یہ ایک جگہ گئی ہوئی تھیں۔ ابھی ڈولی اتری ہے۔ میں نے کہا کہ تم کو ذرا دکھا دوں کہ میرا گھر سچ مچ پرستان ہی ہے۔

آزاد :۔ اس میں تو شک نہیں۔ واقعی پری خانہ ہے۔

کندن :۔ اور لطف یہ کہ بدی قریب نہیں آنے پاتی۔

راوی :۔ ماشاء اللہ! ایسی نیکی پر خدا کی مار۔

آزاد :۔ بیشک بدی کا یہاں ذکر ہی کیا ہے۔

کندن :۔ سب سے مل جل کے چلنا کسی کا دل نہ دکھانا یہ میرا شعار ہے مجھے آج تک کسی نے کسی سے لڑتے بھڑتے ہی نہ دیکھا ہوگا۔

آزاد :۔ یہ جادو جمال بت پندار واقعی۔

کندن :۔ اے ہے تم تو لگے کھُلی کھُلی کہنے۔

راوی :۔ اس فقرے پر اس رغیدہ مہ پارہ نے جس کا نام نور رکھا گیا تھا لجا کر گردن نیوہڑائی اور کندن کی طرف اشارہ کیا کہ ہم جاتے ہیں۔

کندن :۔ بیٹھو بیٹھو (آزاد کی طرف) بیٹا یہ لوگ ہنسی دل لگی کیا جانیں۔ گھر گرہست بہو بیٹیاں پھر کہیں آئیں نہ جائیں۔

مہری :۔ حضور کوئی دو برس کے بعد باہر نکلی ہیں۔

آزاد :۔ بیشک نہیں آپ کے ہاں کا قرینہ ہمیں بہت پسند آیا۔ (دل میں) تو آزاد جو دڑبا ہی نہ پھونک دوں۔

کندن :۔ بولو۔ بٹیا۔ منھ سے کچھ بولو۔ دیکھو ایک مرد آدمی بیٹھے ہیں اور تم بولتی ہو نہ چالتی ہو۔ یہ کیا بات ہے۔ واہ

نور :۔ (گردن جھکا کر) کیا آپ ہی آپ بکوں۔

کندن :۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ تمہاری طرف مخاطب ہو کر بات چیت کریں تو بولو یا یوں ہی آپ ہی آپ۔ اب تو صاحب آپ ہی کا قصور ٹھہرا۔

آزاد :۔ بھلا سنیے تو مہمان نوازی بھی کوئی شے ہے یا نہیں۔

کندن :۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ اب بتاؤ بیٹا۔

نور :۔ اماں جان ہم تو سب کے مہمان ہیں ہماری جگہ سب کے دل میں ہے ہم اور کسی کی میزبانی کریں۔ یہ انوکھی بات ہے۔ ہماری میزبانی جور و جفا۔ ہماری تواضع بے وفائی اور کج ادائی اس میں ماشاء اللہ سے طاق ہیں

کندن :۔ اب فرمائیے حضرت۔ جواب پایا!۔

آزاد :۔ وہ جواب دنداں شکن پایا کہ لاجواب ہوگیا۔

نور :۔ نہیں اگر ابھی تشفی نہ ہوئی ہو تو کچھ اور فرمائیے۔

آزاد :۔ واقعی ان کی تواضع جور و جفا اور بے وفائی و کج ادائی ہے۔ دریں چہ شک۔ خیر صاحب ہم موردِ عتاب ہی ہوں۔

نور :۔ چہ خوش مورد عتاب ہونے کے لئے بھی بڑی قسمت درکار ہے اپنی لذت یہاں بھی نہ چھوڑی۔ کوئی اتنا خوش نصیب ہو تو لے پہلے کہ ہم اس پر عتاب کریں۔

راوی :۔ میاں آزاد تو بڑے مقرر اور لسان تھے مگر اس تیز طبیعت اور زبان دراز حاضر جواب بت گل رخسار کے سامنے سٹی بٹی بھول گئے۔

کندن :۔ اب کچھ فرمائیے یہ خاموش رہنا کیا معنی۔

نور :۔ اماں جان آپ کی تعلیم ایسی ویسی نہیں ہے۔ کہ ہم بند رہیں۔

صنم :۔ تم بند کیوں رہنے لگیں۔ مگر میاں کی قلعی کھل گئی۔

کندن :۔ اے صاحب کچھ تو فرمائیے۔

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

آزاد :۔ آپ شعر بھی کہتی ہیں یہ کہیئے۔

نور :۔ (قہقہہ لگا کر) اے وا۔ ایسے گھبرائے۔ غالب کا تخلص موجود ہے اور پوچھتے ہیں (آپ شعر بھی کہتی ہیں۔

صنم :۔ آدمی ہیں حواس ہی حواس تو ہیں اور ہے کیا؟

آزاد :۔ دریں چہ شک۔

صنم :۔ دریں چہ شک دریں چہ شک۔ بس اب اور کچھ نہیں سوجھتی۔

نور :۔ ہم جو گردن جھکائے گربہ مسکیں بنے بیٹھے تھے تو حضرت بہت شیر تھے مگر اب ہوش اڑے ہوئے ہیں۔ حواس غائب غلہ۔

صنم :۔ تم پر ریجھے ہوئے ہیں بہن۔ دیکھتی ہو کن انکھیوں سے گھور رہے ہیں۔

نور :۔ اے ہٹو بھی۔ ع

ایڑی چوٹی پہ موئے دیو کو قربان کروں

آزاد :۔ اللہ اللہ۔ اب ہم ایسے گئے گذرے ہوئے۔

نور : اوچھا۔ آپ اپنے نزدیک سمجھے کیا ہیں اپنے کو۔

کندن :۔ یہ نہ کہو۔ یہ ہم ہرگز نہ مانیں گے۔ ہنسی دل لگی اور بات ہے۔ مگر یہ بھی لاکھ دو لاکھ میں دیدار و جوان اور ایک ہی ہیں۔ آنکھیں نشیلی۔

نور : اب اماں جان کل تک تعریف کیا کریں گی۔

آزاد :۔ پھر جو تعریف کے قابل ہوتا ہے اس کی تعریف ہوتی ہے۔

نور :۔ اونھ! اونھ دگھر کی پٹکی باسی ساگ۔

آزاد:۔ رشک ہوتا ہوگا کہ ان کی تعریف کیوں کی۔

نور :۔ ہم تعریف سے مستغنی ہیں ابلہ را ستایش پسند می آید۔

کندن :۔ یہ تو خوب کہی۔ اب اس کا جواب دیجئے۔

راوی :۔ واہ ری ٹھگوں کی بڑھیا تو بھی موقع موقع پر خوب داد دیتی جاتی ہے۔ داد کیا دیتی ہے مول بڑھاتی ہے۔

آزاد :۔ نہیں اصلیت بس اتنی ہی ہے کہ تعریف سے دل میں رشک پیدا ہوا خیر صاحب اپنی اپنی سمجھ۔

نور :۔ بھلا خیر آپ اس قابل ہوئے تو کہ آپ کے حسن سے لوگوں کے دلوں میں رشک ہونے لگا۔

کندن :۔ (صنم سے) بڑی دیر سے تم نے ان کو کچھ سنایا نہیں بیٹا۔

صنم :۔ ہم کیا کچھ ان کے نوکر ہیں۔ اماں جان واہ۔

آزاد :۔ (دست بستہ) از برائے خدا کوئی پھڑکتی ہوئی غزل گاؤ اور اگر آپ کی عنایت ہوئی کندن صاحب تو ان سب کو حکم دیجئے کہ مل کر گائیں۔

صنم :(آہستہ سے) حکم! ماشاء اللہ!! ہونھ!!!

ناظورہ :۔ حکم تو بادشاہ وزیر کا بھی نہ مانیں گے ہم لوگ۔

ہمجولی :۔ کے آدمی دکے پیر شدی۔ ابھی سے حکم چلانے لگے۔

صنم :۔ جی ہاں۔ اب اسی بات پر جو کوئی گائے۔

کندن :۔ اچھا حکم کہا تو کیا گناہ کیا۔ کتنی ڈھیٹ لڑکیاں ہیں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ کچھ ٹھکانا ہے۔

صنم :۔ (نور سے) اچھا بہن آؤ مل مل کے کوئی غزل گائیں۔

اے رشکِ قمر دل کا جلانا نہیں اچھا۔

نور :۔ واہ۔ اماں جان سے بھی بوڑھی غزل نکالی ڈھونڈھ کے (اس فقرے پر بڑا قہقہہ پڑا۔ پڑوس سے

جلد چہارم کا باقی حصہ، جلد چہارم حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیں۔